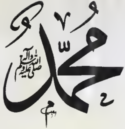
صلی اللہ علیہ وسلم

رسول نمبر

نقوش

۵




محمد
صلی الله علیه وآله وسلم

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلی فون نمبر ۵۲۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

رسُول نمبر

جلد پنجم

شمارہ نمبر ۱۳۰

دسمبر ۱۹۸۳ء

مُدیر:

محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اُردو ۔ لاہور

قیمت لائبریری ایڈیشن : ۱۰۰ روپے

ترتیب

عہدِ نبویؐ میں ریاست کا نشو و ارتقاء

بعثتِ نبویؐ کے وقت دُنیا کا سیاسی نظام

تاسیسِ ریاست

توسیعِ ریاست

استحکامِ ریاست

انتظامِ ریاست

عہدِ نبویؐ میں تنظیمِ ریاست و حکومت

شمالی قبائل عرب، ۴۸۰

جنوبی قبائل عرب، ۴۹۲

قبائل پراگندہ عرب، ۵۱۰

فوجی تنظیم عہدِ رسالت میں

اسلامی ریاست کا شہری نظم ونسق

اسلامی ریاست کا مالی انتظام

عہدِ نبویؐ کا مذہبی نظام

○

محمد طفیل پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اردو لاہور سے شائع کیا۔

اہلِ علم نے فرمایا

نقوش کی چار جلدیں، میرے چار امتحان، اُن کے متعلق نامور حضرات کے فیصلے!

شیخ آفتاب حسین (چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت) نے لکھا ——— نقوش کا رسولؐ نمبر بلاشبہ قیمتی علمی مواد پر مشتمل ہے۔ ان شاء اللہ یہ نمبر قبولِ دوام کی مسند پر فائز ہوگا۔ آپ نے اس سمت میں نہایت موزوں، بروقت اور صحیح اقدام اٹھایا ہے۔"

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے لکھا ——— "اسے نمبر کیوں کہیے، یہ تو اردو زبان کی، سیرتِ طیبہ پر انسائیکلو پیڈیا ہے۔ سبحان اللہ آپ نے کیا دلکش اور دل آفرین نمبر شائع کیا ہے۔"

مولانا نعیم صدیقی نے لکھا ——— "علامہ شبلی اور سلیمان ندوی نے سیرت نگاری کے میدان میں ایک سنگِ میل قائم کیا تھا، اب ویسا ہی دوسرا سنگِ میل، شاید کچھ زیادہ بڑا اور اونچا آپ نے قائم کیا۔"

مولانا سید محمد متین ہاشمی نے لکھا ——— "سیرتِ پاک سے متعلق مواد کا ایک ایسا گلدستہ اور مجموعہ اُردو تو کیا، دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملے گا۔ ان جلدوں کو دیکھ کر آپ کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔"

شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلوی نے لکھا ——— "نقوش کا رسولؐ نمبر سیرتِ نبویؐ کے موضوع پر ایک عظیم ترین خدمت ہے۔ اس میں جمع کردہ مضامین مستند اور بلند پایہ تحقیقی مضامین ہیں۔"

سید صباح الدین عبد الرحمٰن نے لکھا ——— "رسولؐ نمبر دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ کیا عجب کہ آپ کے لیے عاقبت میں زادِ راہ سفر ہو جائے۔ یہ نمبر ظاہری اور معنوی حیثیت سے بھی راحتِ دل ہے۔"

سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ——— "اس مبارک، قیمتی، قابلِ قدر اور تاریخی نمبر کے ذریعہ آپ نے سعادتِ دارین کا اچھا سامان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قبولیت بخشے اور آپ کی محنت ٹھکانے لگے۔"

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے فرمایا ——— "رسولؐ نمبر کی چاروں جلدیں کل شام پہنچیں۔ عنایت کے بوجھ سے کچل گیا۔ خدا آپ کو حسناتِ دارین سے نوازے!"

مولانا سید مرتضیٰ حسین نے لکھا ——— "محمد طفیل کی عاجزانہ اور منکسرانہ پیش کش کا سلیقہ اور طریقہ ان کی عقیدت و محبت، ان کا عشق اور جذبہ جو رنگ لایا ہے وہ ان کے چہرے اور لبوں سے بول رہا ہے۔ یہ سرخروئی مبارک ہو۔"

اب ایک جملہ اس عاجز کی طرف سے بھی، اہلِ علم نے سراہا، اہلِ دل نے نوازا، میں ممنون! میں احسان مند! ——— مگر میرے ارمان ابھی پُورے نہیں ہوئے۔

محمد طفیل

انتساب

ایک صحابی نے سرورِ کائنات سے پُوچھا: ادائیگیٔ حقوق کے سلسلہ میں پہلا حقدار کون ہے؟ تو حضورؐ نے فرمایا:
"اُمّکَ" (تیری ماں)۔
دُوسری مرتبہ پوچھا تو دوبارہ فرمایا "اُمّکَ" (تیری ماں)۔
تیسری مرتبہ پوچھا تو سہ بارہ فرمایا: "اُمّکَ" (تیری ماں)۔
چوتھی مرتبہ پوچھا تو فرمایا "اَبُوکَ" (تیرا باپ)۔

جب میں نے رسولِ اکبر کا ڈول ڈالا تو ماں کی قبر پہ گیا، کیونکہ وُہ زاہدہ اور عابدہ تھیں، بڑی کنی والی تھیں۔ دُعا مانگی: مولا! مدد کیجئے، مدد کیجئے۔

ماں کی قبر پر اِس لیے گیا تھا کہ وہ میرے بارے میں بڑے اونچے خواب دیکھا کرتی تھیں، مگر کبھی کبھی پوچھ لیا کرتی تھیں
"میرا سبق یاد ہے؟"
"یاد ہے!"
"بھلا کیا؟"
"اپنی زندگی کو دوسروں کے لیے مفید بنانا!"

محمد طفیل

طلوع

قرآن کی آیت ہے:

مَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِیْبٍ ٥ (سورۃ الشوریٰ)

(جو کوئی آخرت کی کھیتی کا طالب ہے ہم اُسے اُس کی کھیتی میں ترقی دیں گے، اور جو کوئی دنیا کی کھیتی کا طالب ہے ہم اُسے کچھ دنیا میں سے دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصّہ نہ ہوگا)

ایک دن عجیب واقعہ ہوا۔

میں نے دیکھا کہ کئی بزرگ ہستیاں میرے سامنے کھڑی ہیں۔ کمرہ بھر گیا، میں کرسیاں ڈھونڈنے لگا۔ بتایا گیا، ڈیوڑھی میں بھی آدمی کھڑے ہیں —— باہر سڑک پر بھی کھڑے ہیں —— حدِّ نگاہ یہی ایسا ہی تھا۔

میں نے پوچھا: "میرے لیے حکم؟"

"رسولؐ نمبر دیکھا تھا، دُعا مانگنے آ گئے ہیں۔"

کون تھے وہ لوگ؟

میں کون ہوں —— شاید ایک گواہ!

ہر چند کہ میں نے زندگی کے ہر دن کو یومِ حساب جانا، اس کے باوجود یومِ حساب سے ڈر لگتا ہے۔ حجۃ الوداع کے خطبے کو یاد کیجئے، لوگو! گواہ رہنا، گواہ رہنا۔

گواہ رہنا!

محمد طفیل

اس شمارے میں

میں بیمار رہنے لگا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے کچھ جلدی ہے۔ ڈرتا ہوں خواب کہیں ادھورا نہ رہ جائے۔ یہ سارا قصّہ خواب ہی کا تو ہے۔ نہ اپنے کیے پر یقین، نہ ہونے والے کام پر بھروسا، بہرحال دربارِ رسالت میں یہ میرا تیرھواں سال ہے۔ خوشی ہے تو اتنی!

جب ابتدائی چار جلدیں چھپی تھیں تو دوست سوال کرتے تھے "باقی جلدوں میں کیا چھاپو گے؛ سب کچھ تو ان جلدوں میں آگیا!"

اُنھیں اپنے سوال کا جواب موجودہ جلدوں سے مل جائے گا۔ یہ موضوع تو سمندروں جیسی گہرائی اور آسمانوں جیسی وسعت رکھتا ہے۔ ایسے میں، مَیں بھاگتے وقت کو جتنا روک سکوں گا اُتنا روکوں گا تاکہ حضوری میں زیادہ سے زیادہ وقت گزار سکوں۔

اس جلد میں دو بڑے قیمتی مقالے پیش کیے جا رہے ہیں۔ موضوع "عہد نبویؐ کا نظامِ حکومت" ہے۔ مقالات کے سلسلے میں 'قیمتی' کا لفظ میں نے ایسے نہیں لکھ دیا پوری ذمہ داری کے ساتھ لکھا ہے۔ آپ صاحبِ نظر ہیں خود فیصلہ کر لیں۔

یہ جلد اپنی جگہ مکمل ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر کے مضمون کے حواشی باقی ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ اسی طرح کے بنیادی مضامین اور بھی ہیں جو اس جلد کے دوسرے حصّہ کی صورت میں آیندہ پیش کروں گا۔ یعنی آپ دیکھیں گے کہ انتہا کی بھی انتہا ہوتی ہے۔

اگر میں نے اور کچھ بھی نہ کیا ہوتا اور صرف یہی دو (غیر مطبوعہ) مقالے پیش کیے ہوتے تو بھی میرے اطمینان کے لیے بہت تھے۔

صراحت:

ہرچند کہ میں نے بیچ میں ایک دوسرے موضوع پر ایک اور شمارہ بھی چھاپا۔ مگر میں نے اسے شمارہ نمبر ۱۳۰ ہی لکھا، اس لیے کہ پہلی چار جلدیں اسی شمارہ نمبر سے چھپی تھیں۔ بہرحال جلدیں دو مختلف وقفوں سے چھپی ہیں۔ بس اتنی بات ذہن میں رہنی چاہیے اللہ نے توفیق دی تو جملہ جلدوں کو نئی ترتیب کے ساتھ پیش کروں گا۔ اور جو مشورے اہلِ علم نے دیے اُن کی روشنی میں پیش کروں گا۔

محمد نقوش

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ
عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○

وہ (اللہ) وہی ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے
تاکہ اس دین کو تمام دینوں پر غالب کر دے، گو مشرکوں کو (کیسا ہی) گراں گزرے

عہدِ نبویؐ میں
ریاست کا نشو و ارتقا



عہدِ نبویؐ میں

ریاست کا نشو و ارتقاء

ڈاکٹر نثار احمد

افتتاحیہ

(۱)

انسان کی اجتماعی زندگی کی تہذیب وترتیب میں ریاست کا ادارہ ہمیشہ سے اہم رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا نام اس کی ہیئت اور نوعیت، حالات، وقت اور زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی۔ مگر ریاست کا جوہری کردار بہرحال انسان کی تہذیبی زندگی کے آغازِ سفر سے اب تک ایک ہی رہا ہے۔ ریاست یا مملکت کے لیے انگریزی زبان میں اسٹیٹ (STATE) کا لفظ مستعمل ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یونانی زبان کے لفظ (STATUS) سے ماخوذ ہے[۱]۔ اس لفظ کے بنیادی مفہوم میں حالتِ قائمہ اور ماحول داخل ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی دوسرے متعدد معانی اس لفظ سے وابستہ ہیں۔ البتہ ایک مخصوص سیاسی ہیئت یا حکومت یا منظم سیاسی شخصیت کے معنی میں تاریخی طور پر اس لفظ کا استعمال سولھویں صدی عیسوی (۱۵۳۸ء) میں شروع ہوا۔ اور اس کے تضمنات کی تکمیل غالباً اٹھارھویں صدی عیسوی (۱۷۰۱ء) تک ہوئی[۲]۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے پہلے "اسٹیٹ" کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے دوسرے الفاظ کا سہارا لیا جاتا تھا۔ چنانچہ یونانیوں کے یہاں بالعموم پولس (πολις) کا لفظ مستعمل رہا، جس کے لفظی معنی شہر (CITY) کے ہیں۔ یہ اس امر کی علامت ہے کہ ان کا تصورِ ریاست "شہر" پر مبنی اور انتہائی محدود تھا[۳] اور اس سے محض ایک "میونسپل ریاست" کا تصور قائم ہوتا تھا نہ کہ ایک قومی یا ملکی ریاست کا[۴]۔ رومیوں نے ریاست کے مفہوم کو سیویٹاس (CIVITAS) کے ذریعہ نسبتاً وسعت کے ساتھ ظاہر کیا۔ رومیوں کے یہاں ایک دوسرا لفظ ریس پبلیکا (RESPUBLICA) بھی ملتا ہے۔ جو ریاست کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔

۱- Shipley, Joseph, T., Dictionary of Word Origins, Philosophical Lib., New York, 1945, p. 334.

۲- William Little, H.W. Fowler, J. Coulson,(edd), The Shorter Oxford English Dictionary. The Clarendon Press,London,1965,p.2005.

۳- بلنچلی۔ جے۔ کے۔ نظریۂ سلطنت۔ ترجمہ قاضی تلمذ حسین۔ جامعہ عثمانیہ۔ دکن ۱۹۲۸ء۔ ص ۲۲۔

۴- Barker, Sir Earnest, Greek Political Theory, University Paperbacks, Methuen, London, 1960, p.22.

کیونکہ اس سے نہ صرف شہریت بلکہ ریس پوپلی (RESPOPULI) یعنی ایک قوم اور اس قوم کے مفادات کی طرف بھی نشان دہی ہوتی ہے[1]

اب جہاں تک ریاست کی تعریف کا تعلق ہے تو قدیم و جدید مفکرین سیاسیات نے بے شمار تعریفیں کی ہیں اور ان لاتعداد تعریفات میں سے کوئی ایک بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح علم سیاسیات کے دوسرے موضوعات اختلافی نوعیت رکھتے ہیں اسی طرح ریاست کی تعریف بھی اختلافات کا مرکز رہی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے، ہر سیاسی مفکر نے تعریف کا دائرہ اپنے علم، ذاتی خیالات، ماحول اور اپنی سمجھ و بصیرت کے مطابق قائم کیا ہے۔ چنانچہ ماہرین عمرانیات نے اسے ایک خالص معاشرتی ادارہ قرار دیا تو فقہا اور قانون دان طبقہ نے اسے ایک قانونی ادارہ سمجھا، بین الاقوامی قانون کے علماء نے اپنے ذوق کے لحاظ سے حیثیت متعین کی تو فلسفیوں نے اسے اپنے نظریات کے مطابق بیان کیا۔ اس کی تائید ارسطو، سسرو، گروشیس، بودین، ہالینڈ، ہال، برجیس، بلنٹشلے، اسمیتھ، ڈرگٹ، مالبرگ، فلیمور، بوسانکے، ہیگل وغیرہ کی تعریفات سے بخوبی ہو جاتی ہے[2]۔ یہاں یہ حقیقت بھی نہیں بھلائی جا سکتی کہ کوئی بھی سیاسی نظریہ یا عمل اپنے دور کے مخصوص حالات سے الگ نہیں کیا جا سکتا[3]۔ نیز یہ کہنے میں ہم کوئی حرج نہیں سمجھتے کہ جملہ تعریفات کی روشنی میں ریاست کا اطلاق سیاسی ماحول، سیاسی تنظیم، سیاسی اقتدار کی مختلف اشکال، تمام سیاسی سرگرمیوں، تخصیات اور ہر اس چیز پر کیا جا سکتا ہے جو حکومت سے متعلق ہو یا کسی ملک کی با اختیار سیاسی قوت سے مربوط و متعلق ہو[4]۔

بہرحال لفظی اختلافات اور تعریفات کی کثرت سے قطع نظر ریاست کے چار عناصر ترکیبی ایسے ہیں جن پر علمائے سیاسیات زیادہ تر متفق نظر آتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک ان عناصر کا وجود ایک ریاست کی تشکیل و ترتیب کے لیے بہر صورت لازمی امر ہے یعنی آبادی، رقبہ، حکومت اور اقتدار اعلیٰ[5]۔ مندرجہ بالا بیان سے مقصود یہ وضاحت ہے کہ آئندہ صفحات میں ہم نے ریاست

---

[1] بلنچلی - ص ۲۶-

[2] مثلاً دیکھئے: Greaves, H.R.G., The Foundations of Political Theory, Allen and Unwin Ltd., London, 1958, p. 11.

[3] - Barker, p. 16.

[4] - William Little & Others, p. 2005

[5] - Gilchrist, R.N., Principles of Political Science, Orient Longmans, Madras, 1955, p. 21.

نیز ملاحظہ ہو: Holland, Sir Thomas Erskine, The Elements of Jurisprudence, Clarendon Press, London, 1924, pp. 19, 46, 47, 48.

کا مطالعہ کرنے میں ریاست کے لفظی، معنوی اور اصطلاحی اختلافات اور اس کی فنی پیچیدگیوں میں پڑے بغیر ریاست کے ادارہ کو اس کے حقیقی، علمی اور عمومی خدوخال کے لحاظ سے دیکھا ہے۔ اور آبادی، رقبہ، حکومت اور اقتدارِ اعلیٰ کے لزوم میں اس کا مطالعہ کیا ہے۔

(۲)

اگر یہ صحیح ہے کہ "ریاست ایک منظم معاشرہ کا نام ہے اور یہ اس وقت وجود پذیر ہوتا ہے جب ایک طرف افراد پر اقتدار قائم کرنے اور دوسری طرف افراد کی جانب سے اطاعت کرنے کا دوگونہ رابطہ عمل میں آجاتے۔ اور اطاعت کا امر واقع ہونا اس بات کو مستلزم ہے کہ ریاست وجود میں آگئی"۔ تو ریاست نبوی کے باب میں اس قسم کا پہلا رابطہ بیعتِ عقبۂ کبیرہ میں استوار ہوا۔ جبکہ ریاست کے جائے قیام یعنی مدینہ کی معتدبہ آبادی کے ایک نمائندہ گروہ نے رسول اللہؐ کو اپنا دینی و مذہبی رہنما، سیاسی قائد اور مطاع تسلیم کیا اور اس کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کا عہد کیا۔ اسی معاہدہ کے نتیجہ میں ہجرت کے بعد ہی (سنہ ۱ھ / ۶۲۲ء) ریاست مدینہ کا قیام عمل میں آگیا۔ پھر یہی ریاست رفتہ رفتہ توسیع و ترقی کے مدارج طے کرتی ہوئی بالآخر وصال نبوی (سنہ ۱۱ھ / سنہ ۶۳۲ء) کے وقت پُورے جزیرہ نمائے عرب پر پھیل گئی۔ اور بقول ڈاکٹر حمید اللہ: "دس سالہ مدنی زندگی میں رسول اللہؐ کا اقتدار شہر مدینہ سے پھیل کر جزیرہ نمائے عرب اور جنوبی فلسطین کے دس لاکھ مربع میل پر محیط ہو گیا۔ اس عرصہ میں آپ کو بہت سی لڑائیاں بھی لڑنی پڑیں، لیکن اس پوری فتح کے لیے دشمن کے بمشکل ڈھائی سو آدمیوں کا خون بہایا گیا اور (اگر بئر معونہ میں دھوکے سے اور اُحد میں فوجی نافرمانی کے نتیجے میں قتل شدہ ۱۳۰ آدمی مستثنیٰ کر دیے جائیں تو) مسلمانوں کے بمشکل ایک سو آدمی مارے گئے تھے۔ غرض عہدِ نبویؐ میں دس سال تک اوسطاً روزانہ دو سو چھتر مربع میل کا رقبہ فتح ہوا۔ اور مسلمان فوج سے دس سال تک اوسطاً ماہانہ صرف ایک آدمی مارا جاتا رہا"[۱]

(۳)

ہمارے پیشِ نظر اسی ریاست کا مطالعہ ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ریاست نبوی کی تاسیس کس ماحول اور کن حالات میں کیونکر ہوئی؟ اور پھر کس طرح توسیع و ارتقاء کے مراحل طے کر کے وصالِ نبویؐ کے وقت کس حد تک جا پہنچی۔ اور پھر یہ کہ ریاست کے ضمن میں رسول اللہ کے سیاسی کارنامہ کی قدر و قیمت کیا ہے۔

(۴)

ریاست نبوی کو موضوع تحقیق کی حیثیت سے منتخب کرنے کی وجوہ دو ہیں:

---

[۱] حمید اللہ - قانون بین الممالک - مکتبہ ابراہیمیہ - دکن - سنہ ۱۳۶۴ھ - ص ۳۴ -

(الف) اس معاملہ پر اختلاف رائے نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور آپ کے کارناموں پر دنیا کی تقریباً ہر زبان میں اتنا کام ہو چکا ہے کہ فی الواقع اس کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ لیکن ہماری معلومات کی حد تک ریاست نبوی کے بارے میں کوئی قابلِ ذکر مفصل اور وقیع کام اب تک سامنے نہیں آیا۔ جہاں تک مسلمان مورخین کا تعلق ہے انہوں نے یا تو اس پہلو پر کوئی توجہ ہی نہیں دی، یا پھر زیادہ سے زیادہ واجبی ذکر سے کام لیا ہے۔ رہے مغربی علماء اور مستشرقین تو اول تو اپنے خاص تہذیبی پس منظر، نیز اسلام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے بارے میں مخصوص زاویۂ نظر کی بدولت اس موضوع پر ان کا مطالعہ بھی معروضی، فراخدلانہ اور مکمل نہیں۔ ریاست اسلامی (ISLAMIC STATE) کو بیان کرتے وقت ریاست نبوی کو یا تو وہ سرے سے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے یا پھر اس سے محض سرسری طور پر گزر جاتے ہیں اور سارا زورِ قلم آپ کے بعد کی تاریخ پر صرف کر دیتے ہیں، اور ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مستشرقین کے یہاں رسولؐ اللہ کے بارے میں بالعموم یہ موقف پایا جاتا ہے کہ جب تک آپ کا قیام مکہ میں رہا آپ کی حیثیت ایک مبلغ اور پیغمبر کی رہی لیکن ہجرتِ مدینہ کے بعد آپ نے ایک سیاستدان اور ایک حکمران کی حیثیت اختیار کر لی[ل] لیکن پھر یہ واضح نہیں کرتے کہ سیاست و حکمرانی کے منصب پر فائز ہونے کے بعد آپ نے کون کون سے کام انجام دیے۔ محض چند اشارات سے بحث مکمل نہیں ہوتی۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ ریاستِ نبوی پر ایک مفصل اور جامع مطالعہ پیش کیا جائے۔ کیونکہ رسولؐ اللہ کی قائم کردہ ریاست ہی نے بعد کے تمام اسلامی ادارات کو جنم دیا اور آپ کے بعد آنے والے تمام خلفاؓ آپ ہی کے سیاسی جانشین تھے۔

(ب) جدید مسلمان مورخین میں سے البتہ علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی (سیرت النبی)، حامد الانصاری غازی (اسلام کا نظامِ حکومت) اور ڈاکٹر حمید اللہ (عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی، رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی) وغیرہ نے ریاست نبویؐ کے بعض پہلوؤں پر قلم اٹھایا ان فضلاؑ میں بطور خاص ڈاکٹر حمید اللہ نے چند مسائل پر بلاشبہ محققانہ اور سیر حاصل بحث کی ہے حقیقت یہ ہے کہ ان تمام حضرات کی کاوشیں انتہائی وقیع اور قابلِ قدر ہونے کے باوجود ریاستِ نبویؐ کے تمام پہلوؤں پر محیط نہیں ہیں۔ اس لئے یہ ضرورت سمجھی گئی کہ ریاست نبویؐ کی تاسیس، اس کے نشو و ارتقاؑ اور دیگر پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی جائے اور اسلامی تاریخ کی روشنی میں اس کے امتیازات اور مقام و مرتبہ کا تعین کیا جائے۔

زیرِ نظر مقالہ میں ان ہی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس ضمن میں سب سے پہلے یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسولؐ اللہ نے تاریخ کے جس دور میں ریاست کی تاسیس فرمائی، اس وقت سیاسی اعتبار سے دنیا کے مختلف حصوں میں کس قسم کے رجحانات پائے جاتے تھے خصوصاً عرب میں سیاسی ماحول کیا تھا۔ یہ بیان کئے بغیر ظاہر ہے ریاست نبویؐ کے آغاز کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ ریاست نبویؐ کو دین کی کن فکری بنیادوں پر استوار کیا گیا۔ معاشرہ کی تشکیل اور

ل Hell, Joseph. The Arab Civilization, Tr.S.K.Baksh, Sh.M.Ashraf, Lahore, 1943. p.22.

تنظیم کے مراحل کس طرح طے ہوئے۔ اور پھر قیامِ ریاست کی منزل کیسے آئی۔ اس کے بعد ریاست کے توسیع وارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے ان اقدامات سے بحث کی گئی ہے جن کے نتیجہ میں اسے توسیع واستحکام حاصل ہوا۔ اور پھر آخر میں انتظامِ ریاست سے بحث کی گئی ہے۔

(۵)

یہ بات اہلِ فکر ونظر سے مخفی نہ ہوگی کہ زیرِ نظر مقالہ کا موضوع "ریاست عہدِ نبویؐ میں" بلا مبالغہ ایک نہایت اہم مگر وسیع موضوع ہے۔ عہدِ نبوی میں ریاست کے نشوو ارتقاء کے مراحل سلہ ہ تا سلاہ ہ کے دوران تکمیل پذیر ہوئے اس لحاظ سے اگرچہ مطالعہ اسی دس سالہ دَور کا ہے لیکن یہ مختصر عرصہ بجائے خود مختلف النوع مباحث کا حامل ہے۔ پھر سیرت پر بے شمار تصنیفات کی موجودگی نے اس کو مزید مشکل بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اگر ایک طرف ان تمام کتابوں سے استفادہ کیا ہے جو ہمیں دستیاب ہوسکیں تو دوسری طرف ہماری کوشش یہ رہی کہ مطالعہ کو اسلامی تاریخ کے اہم اور قدیم ترین مآخذ کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ ہاں اگر کسی بحث کے سلسلے میں قدیم مآخذ سے مدد نہیں مل سکی تو اس کے بعد بتدریج دوسرے مآخذ سے فائدہ اٹھایا گیا۔ یہاں تک کہ ریاست کی قدروقیمت کو متعین کرنے میں جدید مصنفین اور ان کی تصانیف کو بھی سامنے رکھا گیا ہے۔ یہ بیان کر دینا بھی ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ عہدِ نبویؐ میں ریاست کے نشوو ارتقاء کا جائزہ لینے میں اگرچہ ہم نے تاریخ کے بنیادی مآخذ کو استعمال کیا ہے۔ لیکن اپنی بحث کا تمام تر دارومدار قرآن اور احادیثِ نبویؐ پر رکھا ہے۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ رسولؐ اللہ کی زندگی کا انتہائی اہم اور سب سے زیادہ مستند ماخذ قرآن ہے اور حدیث تو خود رسولؐ اللہ کے قول، فعل اور تقریر سے عبارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں مآخذ کو ہم نے اپنے مطالعہ میں ہر جگہ اولیت دی ہے۔ نیز آخر میں یہ وضاحت بھی مناسب ہے کہ ہم نے سہولت کی خاطر متن کے حوالوں کو (علاوہ افتتاحیہ اور اختتامیہ) ہر باب کے آخر میں شامل کیا ہے۔

اگر مندرجہ بالا گزارشات کی روشنی میں اس مقالہ کا مطالعہ کیا گیا تو مجھے امید ہے کہ صاحبانِ فکر ونظر اسے مفید، محققانہ اور فکر انگیز پائیں گے۔

ڈاکٹر نثار احمد

باب اوّل

بعثتِ نبویؐ کے وقت دنیا کا سیاسی نظام

عہدِ نبویؐ میں ریاست کے نشوو ارتقاء کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے سیاسی رجحانات اور دُنیا کے مختلف حصّوں میں پائے جانے والے نظام ہائے حکومت کا مختصر سا جائزہ پیش کر دیا جائے تاکہ ریاستِ نبویؐ کو اس کے صحیح پس منظر میں سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس کی نوعیت اور قدر و قیمت کا بھی اندازہ لگایا جا سکے۔

زیرِ بحث دَور یعنی چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں دنیا آج سے بہت کم تھی۔ نہ امریکہ کے دونوں براعظم دریافت ہوئے تھے اور نہ آسٹریلیا سے لوگ واقف تھے۔ افریقہ کے بڑے حصہ پر تاریکی کا تسلط تھا۔ اور ایشیا و یورپ کے انتہائی شمالی علاقے بھی انسانی دسترس سے باہر تھے۔ البتہ عرب، چین، ہندوستان، وسطِ ایشیا، ایران، عراق، شام، مصر، مغرب اقصیٰ، حبشہ، نیز جنوبی یورپ کے کچھ ممالک مثلاً یونان، اطالیہ، فرانس، اسپین اور وسطی و شمالی یورپ کے چند علاقے ایسے ضرور تھے جہاں آفتابِ تمدن ضوفگن تھا۔ مگر کہیں اس کی روشنی تیز تھی اور کہیں بہت مدھم۔ اور خاص بات یہ ہے کہ اس روشنی اور چمک دمک کے سب جلوے دراصل ظاہری اور سطحی تھے۔ جن کی تہ میں تاریکی ہی تاریکی تھی اور اسی تاریکی میں انسان بھٹک رہا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ ہمارے لیے مذکورہ بالا تمام علاقوں کے سیاسی رجحانات و میلانات کا مطالعہ نہ تو ممکن ہے اور نہ ضروری۔ لہٰذا ہم اپنی توجہ صرف ان ملکوں اور خطوں تک محدود رکھیں گے جو تمدن و حضارت جہانگیری و جہانبانی اور حکومت و سلطنت کے باب میں نہایت اہمیت رکھتے تھے اور جن کے پرچم اقتدار کے سائے میں دنیا کی مختلف قومیں آباد تھیں۔ نیز عرب کی وہ سرزمین بھی ہمارے جائزہ کی خصوصی مستحق ہے۔ جہاں رسول اللہؐ کی بعثت ہوئی، جہاں آپ نے ۱ھ میں ریاست کو قائم فرمایا اور جو پھر کم و بیش دس سال کے قلیل عرصہ میں نشوو ارتقاء کے مراحل طے کر کے تقریباً تمام عرب پر محیط ہو گئی۔

روم

سلطنت رومہ کی تاریخ اگرچہ بہت طویل اور ایک بڑے عرصہ پہ پھیلی ہوئی ہے اور اسے ہم کئی ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں لیکن مختصراً یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ رومی شہنشاہیت کا آغاز دراصل جولیس سیزر (JULIUS CEASAR) سے ہوتا ہے جس نے اپنے دورِ اقتدار میں پُورے طور پر استبداد اور مطلق العنانی کا مظاہرہ کیا۔[1] اور اسی وقت سے دراصل اس عقیدہ کا بھی آغاز ہوا کہ "قیصر صفاتِ الوہیت کا مالک ہے" لیکن وہ شخص جس نے رومی شہنشاہی کو استوار کیا اور جس نے بعد کی تمام

سیاسی نشو و نما پر بہت گہرا اثر ڈالا وہ اغسطس (AUGUSTUS) تھا۔[2] اس نے بادشاہت کو موروثی کرنے کی تدابیر کیں۔[3] اس کی قوت کا راز دولت، فوج پر قبضہ اور عنانِ حکومت پر مضبوط گرفت میں پوشیدہ تھا۔[4] اس کی وفات کے بعد ٹائبر یس (۱۴ء تا ۳۷ء) برسرِ اقتدار آیا۔[5] اس کی تخت نشینی کے وقت مطلق العنانیت کا دعویٰ پھر کیا گیا کہ "ناقابلِ تقسیم شے کو تقسیم کرنا غیر ممکن ہے۔ سلطنت ایک جسمِ واحد ہے اور صرف ایک ہی شخص کا دماغ اس پر حکمرانی کر سکتا ہے"۔[6] اس کے بعد سلطنت پر جنگی عنصر کا غلبہ بہت زیادہ بڑھ گیا۔ چنانچہ کلاڈیس (CLAUDIUS) اور نیرو ( ) دونوں کی تخت نشینی رومہ کے مقامی عساکر کی تائید کا نتیجہ تھی۔ پھر ۶۹ء کے واقعات سے یہ بات اور بھی ظاہر ہو گئی کہ بادشاہ کا بنانا اور بگاڑنا فوج کا کام ہے۔[7]

بہرحال مارکس آریلیٹس ( ) کی موت کے بعد ۱۸۰ء سے رومیوں کے زوال کی ابتداء ہوئی۔[8] رومی سلطنت برابر انتشار سے دوچار ہوتی رہی اور پیہم خارجی حملوں کو سہتی رہی یہاں تک کہ جب ۳۰۶ء میں "قسطنطین اعظم" قیصر ہوا[9] تو گویا سلطنت میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوا۔ اس نے رومی سلطنت کی از سرِ نو تنظیم کی اور اسے متحد کیا، اس نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ سیاسی و جنگی مصالح کی بناء پر پایہ تخت کو روم سے قسطنطنیہ منتقل کیا۔[10] یونانی زبان کو دفتری زبان قرار دیا۔ اس سے ایک طرف تو بازنطینی سلطنت کی بنیاد پڑی اور دوسری طرف روم میں ایک سیاسی خلا پیدا ہو گیا جسے بعد میں پاپائے روم نے پُر کیا۔ اس نے دوسرا اہم ترین قدم یہ اٹھایا کہ عیسائیت کو خود بھی اپنایا[11] اور قانونی طور پر اس کو سلطنت کا مذہب بھی قرار دیا۔[12] تاریخ سلطنت رومہ میں یہ ایک ایسا موڑ ہے جس کی بنا پر نہ صرف سلطنت کا ارتقاء متاثر ہوا بلکہ عیسائیت نے ازمنۂ وسطیٰ کے سیاسی افکار و ادارات کو بھی اس درجہ مغلوب کیا کہ ان کو عیسائی اعتقادات سے جدا کر کے سمجھنا ناممکن ہے[13] اور ایک افکارِ سیاسی پر ہی کیا موقوف پوری مغربی تہذیب پر اس کے اثرات نمایاں ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ "قسطنطین اعظم" کے یہ سارے اقدامات بھی سلطنت رومہ کے انتشار و زوال کو نہ روک سکے۔ سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے، مشرقی اور مغربی حصے اور ان کے تاج دار الگ الگ ہو گئے اور قسطنطین کی موت (۳۳۷ء) کے بعد ہی سیاسی خانہ جنگیوں کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ سلطنت کی تقسیم کا آغاز باقاعدہ طور پر اگرچہ ولنٹینین (VALENTINIAN) کے زمانہ (۳۶۴ء) سے ہی ہو چکا تھا[14] لیکن قطعی تقسیم سلطنت ۳۹۵ء میں اس طرح ہو گئی کہ مشرقی حصوں کا آرکیڈیس (ARCEDIUS) اور مغربی حصوں کا ہونوریس (HONORIUS) تاجدار بن گیا۔[15] اعیانِ سلطنت میں گروہ بندیاں قائم ہو گئیں۔ باہمی نفاق اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو گیا اور دُور افتادہ صوبوں کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہو گئی۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر وحشی اقوام نے حملے شروع کر دئے۔ چنانچہ روم قسطنطین کے بعد پوری طرح سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ ۴۱۰ء میں وزی گاتھ نے روم کو بڑی حد تک تاخت و تاراج کر دیا۔[16] رومہ کی اس تباہی و بربادی کی عام وجہ دورِ حاضر کے ایک مصنّف نے یہ بیان کی کہ "یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ عیسائیت کا زوال اس کے عروج کے فوراً بعد شروع ہو گیا۔ جس کا نظارہ عیسائی اور غیر قوموں نے بھی کیا کہ عیسائیت کی تحریک "تباہ کن" ثابت ہوئی اور اس نے رومی سلطنت کو کمزور کر دیا۔ رومیوں کے اعلیٰ طبقہ کو دیکھتے ہوئے

یہ نظر آتا ہے کہ عیسائیوں میں دنیاوی اور مادی خواہشات، نفسانی اغراض، عیش و عشرت کی ہوس، سرد مہری، عوامی معاملات کی طرف سے بے توجہی، قومی معبودوں اور خداؤں کے لیے ذلت و حقارت ایسی خصوصیات ہیں جنہوں نے مستقلاً رومی طاقت کو رفتہ رفتہ رُو بہ زوال کر دیا۔ پھر عیسائیوں کا یہ اصرار کہ وہ وفاداری میں اوّلیت روم کو نہ دیں گے مزید بدنامی کا باعث ہوا۔"(۱۷)

اس تباہی و بربادی کے ٹھیک ۴۵ سال بعد ۴۵۵ء میں ونڈال نے پھر رومہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس طرح سلطنت رومہ کی حالت دگرگوں ہوتی چلی گئی۔ پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں اس کا مغربی حصہ جو برطانیہ، فرانس وغیرہ پر مشتمل تھا بالکل کٹ گیا اور خود روم کا دارالحکومت دشمنوں کے حملوں سے محفوظ نہ رہ سکا اور تقریباً ۵۶۰ء میں سلطنت کے مغربی حصہ پر وحشی اقوام کا مکمل قبضہ ہو گیا جسے جسٹینین (JUSTINIAN) جیسا بہادر فرمانروا بھی دوبارہ حاصل نہ کر سکا، حالانکہ اس کی بہادری یورپ میں ضرب المثل تھی۔(۱۸)(۱۹)

مغربی حصہ نکل جانے کے بعد مشرقی صوبوں پر مشتمل سلطنت کی حالت بھی روز بروز نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی۔ سلطنت کی عدم مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ خود رعایا حکمرانوں سے اس حد تک نفرت کرتی تھی کہ وحشی اقوام کو رومیوں پر ترجیح دی جاتی تھی۔ امراء، وزراء اور سلاطین میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ عوام کو بغاوت سے روک سکیں۔ ان اندرونی بدنظمیوں سے ملک کا جو حال ہو گیا تھا اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر روم کے تمام بیرونی مخالفین ختم بھی ہو جاتے تب بھی سلطنت زوال و انحطاط سے اپنا دامن نہیں بچا سکتی تھی۔ مزید برآں ان کے پاس ایسی کوئی اخلاقی قوت اور ذہنی وسائل بھی نہیں تھے جو ان حالات میں ان کی دلجمعی اور قوت کا سہارا بن سکتے۔ چنانچہ ڈننگ نے لکھا ہے کہ "رومی و یونانی علم و ادب کے حیرت انگیز افلاس نے (جو روم کی سیاسی فنا سے صدیوں پہلے ظاہر ہو چکا تھا) اس پُرآشوب زمانے کے لیے کوئی ذہنی وسائل باقی نہ چھوڑے اور یورپ مایوسانہ اور شرمناک وہم پرستی میں مبتلا ہو گیا۔ زمانۂ وسطیٰ، غیر سیاسی، زمانہ تھا اور اس کے عزائم و تصورات مذہبی عقیدے کی شکل و معنی کے گرد مرکوز تھے۔"(۲۰)

بہرصورت چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر (یعنی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے چند سال بعد) روم بقول گبن زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ گیا تھا۔ گبن کے الفاظ کا خلاصہ یہ ہے کہ "اس کی مثال بعینہٖ اس عظیم الشان درخت کی ہو گئی تھی جس کے سائے میں ایک وقت تک تمام اقوام عالم آباد تھیں مگر اب ایسی خزاں آئی کہ برگ و بار کے ساتھ ساتھ اس کی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہو گئی تھیں اور اب خالی تنا خشک ہو رہا تھا۔"(۲۱)

غرض رومہ کا یہ مختصر سا تاریخی و سیاسی جائزہ اس بیان پر مہرِ صداقت ثبت کر دیتا ہے کہ "شہنشاہی رومہ کی تاریخ اگرچہ جزءً جزءً نہایت عظیم الشان معلوم ہوتی ہے مگر دنیا کو وہ یہ سبق دے گئی کہ ایسا لامتناہی اختیار نہ حکمران کے لیے مفید ہے اور نہ اس کی رعایا کے لیے۔"(۲۲)

اب جہاں تک سلطنت کے نظریہ، تخیّل اور نظام وغیرہ کا تعلق ہے تو اصولی طور پر مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ:

(الف) سلطنت رومہ کا اصل الاصول "بادشاہت" تھا۔ بادشاہ کے اختیارات غیر محدود تھے اور وہ تمام سیاسی

اور مذہبی عہدوں کا سرچشمہ تھا۔ سلطنت کا تمام طرزِ عمل شاہی مرضی کے تابع اور تمام تنظیمات کا تعلق بادشاہ سے ہی تھا[۲۳] اسی لیے جو ادارے مثلاً امراء کی مجلس (SENATE) یا مجلس جمہور (CONCILIUM PLABIS) وغیرہ بظاہر جمہوری نظر آتے ہیں وہ بالکل مصنوعی تھے۔ بادشاہت صرف ایک مخصوص گروہ، جماعت اور وطن کے اندر محصور تھی۔ حکمرانوں کی یہی وہ مخصوص جماعت تھی جس کی خاطر داری سلطنت کا مقصود تھی۔[۲۴] اسی لیے رابرٹ بریفالٹ (ROBERT BRIFFAULT) لکھتا ہے کہ "جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، رومی سلطنت . . . . انسانوں سے (ظلم و زیادتی کے ذریعہ) ناجائز فائدہ اٹھا کر انسانوں کی مخصوص جماعت (حکمرانوں) کی راحت رسانی اور عیش و آرام کا سامان فراہم کرتی تھی۔"[۲۵]

(ب) سلطنت رومہ کا تخیل اگرچہ "بہبودِ عامہ" کے اصول پر مبنی تھا لیکن یہ اصول خیال سے نکل کر عمل میں بہت کم آتا تھا۔[۲۶] اس کے تخیل میں یونانی اثرات بھی کار فرما نظر آتے ہیں۔ چنانچہ سسرو نے اپنی سیاسی تحریروں میں ایتھنز کے نمونے کو برابر پیشِ نظر رکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود رومی تصور میں چند امتیازات بھی موجود ہیں مثلاً رومیوں نے سلطنت کی قانونی حیثیت زیادہ واضح کی۔ قانون کو اخلاق سے ممیز کیا۔ رومیوں کا خاندان، یونانیوں کی بہ نسبت سلطنت کی مداخلت سے زیادہ آزاد تھا۔[۲۷] نیز رومی سلطنت شہری اور مقامی نہیں بلکہ قومی سلطنت تھی اور اس کا نصب العین ایک عالمگیر سلطنت کا تھا۔[۲۸] اس کی نوعیت کے بارے میں سسرو کا خیال تھا کہ سلطنت رومہ ایک ایسی سلطنت ہے جو نام نہاد "ممزوج" سلطنت کا نمونہ ہے یعنی وہ بادشاہی، اعیانیت اور جمہوریت سب شکلوں کا مجموعہ اور سب سے بہتر ہے۔ لیکن ٹاسی ٹس نے کیا خوب کہا ہے کہ "اول تو اس قسم کی سلطنت کا وجود میں آنا ہی ناممکن ہے اور اگر آجائے تو برقرار رہنا ناممکن ہے۔"[۲۹]

(ج) رومی شہنشاہ کو کلیسا (CHURCH) کی حمایت حاصل تھی۔ چنانچہ یہ عقیدہ پختہ ہو گیا کہ "رومی شہنشاہیت عطیہ خداوندی ہے" تاکہ اس کی حکومت تمام دنیا پر "تا ابد قائم رہے۔"[۳۰] پھر جب مسیحیت رومی سلطنت کا سرکاری مذہب قرار پائی تو اس کا استعمال بالکل سیاسی زور آزمائی کے لیے ہونے لگا۔[۳۱] اگر ایک طرف بادشاہ نے مذہب کے معاملہ میں بھی سند قطعی حاصل کر لی اور سب کچھ اسی کے حکم کا محتاج ہو گیا تو دوسری طرف پاپائیت کو فروغ حاصل ہوا اور اس نے اصل طاقت حاصل کر لی۔ پھر کلیسا اور ریاست کے درمیان کشمکش اور چپقلش کا آغاز ہوا جو پورے ازمنۂ وسطیٰ کی بڑی نمایاں اور اہم خصوصیت ہے۔ اس کشمکش کی داستان ہے تو بہت طویل مگر یہاں اس کی ایک جھلک ملاحظہ کر لیجئے۔

ڈننگ لکھتا ہے: "(پوپ) گریگری کی پیشوائی مذہبی کے وقت (سنہ ۵۹۰ء تا سنہ ۶۰۴ء) سے معقول حد تک پاپائیت کے تغیر کا اظہار ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں سیاسی معاملات قطعی طور پہ پاپاؤں کی توجہ کے محتاج ہو گئے۔ اولاً یہ صورت صرف روم کے لیے ہوئی اور بعد ازاں کل اطالیہ کے لیے۔ کچھ زمانے تک قسطنطنیہ کا اقتدار اعلیٰ اور اس کے نائب مملکت (مقیم رومہ) کا اختیار زور و قوت کے ساتھ تسلیم کیا جاتا رہا۔ مگر جب اطالیہ میں اہلِ لمبارڈی کی مداخلتوں کے ساتھ، ساتویں صدی میں، مشرق میں مسلمانوں کے فاتحانہ حملوں کا بھی شمول ہو گیا تو شہر روم کے بارے میں شہنشاہی دربار کی دلچسپی اور اس کا اثر برائے نام رہ گیا۔ قدیم اور جدید روم کے تعلقات کے ٹوٹنے میں کلیسائی اسباب نے مدد دی۔ دربار سے قریبی تعلق رکھنے کی وجہ سے قسطنطنیہ کا بطریق

وقتاً فوقتاً یہ دعویٰ کیا کرتا تھا کہ اسے کلیسا کے تمام دوسرے حکام پر تقدّم و تفوّق حاصل ہے۔ شہنشاہ بھی اس ادعا کو کسی قدر تسلیم کرتا تھا مگر پوپ نہایت شدت کے ساتھ اسے ناپسند کرتے تھے اور اس سے سیاسی معاملات میں ان کی خود مختاری کے میلان کی تصدیق ہوتی تھی۔ بالآخر میں بت پرستی کے متعلق اختلافِ عظیم برپا ہوا، جس سے یونانی اور رومی مسیحیت کے تمام منافر میلانات نازک حد کو پہنچ گئے۔ کلیسا دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔"(۳۲)

یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے: "پوپ کی سیاسی حیثیت میں سب سے زیادہ کمزور نقطہ اس کا وہ تعلق تھا جو اسے روم کی آبادی کے ساتھ تھا۔ قدیم شہنشاہی کے زمانے سے نئے اسقف کے انتخاب کے موقع پر اکثر عام شورش اور خونریزی ہو جایا کرتی تھی ازمنۂ وسطیٰ کو جنم دینے والے حالات کی بدولت یہ عہدہ ان امیر خاندانوں کے تحت اقتدار آ گیا جنھوں نے شہر کو باہم تقسیم کر لیا تھا۔"(۳۳)

پھر بطور نتیجہ رقمطراز ہے کہ: "عام طور پر یہ کہنا چاہیے کہ زمانۂ وسطیٰ کی اس ختم ہونے والی صدی کا فلسفہ ان تصورات پر محتوی تھا جو اقتدارِ اعلیٰ، حکومت کی عمومی بنیاد، فطری قانون و حقوق اور معاشرتی معاہدے سے متعلق تھے۔ یہ وہی تصورات ہیں جو مادی زندگی کے تغیر شدہ حالات کے زیرِ اثر دورِ جدید کی خصوصیت قائم کرنے والے تھے۔ مگر جن لوگوں نے اپنے کو باقاعدہ تخیل و تفکر کے لیے وقف کر دیا تھا وہ ہنوز پاپائیت و شہنشاہیت کے قدیم تصورات کے اس قدر زیرِ اثر تھے کہ وہ اپنے فلسفے کے طرزِ بیان یا مطالب کو ازمنۂ سابقہ کے معیار سے آزاد نہیں کر سکتے تھے۔ سیاسی نظریات کی کل رو کے متغیر کر دینے کا آوازہ پندرھویں صدی کے ختم ہونے کے عین بعد میکاویلی (۱۴۶۹ء تا ۱۵۲۷ء) کی طباعی نے بلند کیا۔"(۳۴)

(د) کشمکش صرف ریاست و کلیسا ہی میں نہیں، شہنشاہ پاپائیت اور ٹیوٹنی بربریت(۳۵) کے درمیان بھی برپا ہوئی اور ان سب میں تصفیہ کی ایک شکل نظام جاگیرداری (FEUDALISM) میں تلاش کی گئی(۳۶) - مگر وہ بجائے خود ایک سیاسی مصیبت ثابت ہوا۔ ٹیوٹنوں کے سیاسی تصورات کا اثر زیادہ تر ادارات پر پڑا تو مسیحیت کا رومی سیاسی فلسفہ پر(۳۷)۔ جبکہ نظام جاگیرداری کا دائرہ بالکل عملی تھا۔ لہٰذا ایک مصنف کے بقول "کسی دو نظاموں میں اتنی زیادہ مغایرت نہیں پائی جا سکتی جتنی کہ مغایرت مقدس رومی سلطنت (جو لوگوں کے صرف ذہنوں پر حاوی تھی) اور واقعی جاگیردارانہ حکومت (جس میں عملاً لوگ رہتے تھے) میں پائی جاتی تھی(۳۸) - اس کے بعد ان دونوں کے درمیان جو لطیف اختلافات تھے ان کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی ہو سکتا ہے: "(ان میں) سے ایک (طاقت) مرکزی تھی تو ایک مقامی، ایک بلند و عظیم نظریہ پر مبنی تھی تو دوسری زراعیت کی غیر مہذب اولاد (RUDE - OFFSPRING) ایک نے تمام قوت غیر ذمہ دار حکمران کے ہاتھوں میں مرتکز کرنے کی کوشش کی تو دوسری نے اس کے حقوق کو محدود کرنے اور اس کے احکام کے خلاف شدید مزاحمت کی سعی کی، ایک کا مطالبہ تمام شہریوں کی برابری اور مساوات کا تھا، کیونکہ وہ (مالک سماوات کی یکساں مخلوق ہیں تو دوسرے نے "اشرافیہ" کے افتخار اور دوسرے درجات کے امتیازات (چشم یورپ نے جواب تک نہ دیکھے تھے) تک محدود رکھا۔(۳۹)

سلطنت روما کے سلسلے میں نسبتاً تفصیلی گفتگو ہم نے اس لیے کی ہے کہ یورپ میں قرونِ وسطیٰ کے سیاسی افکار، نظریات، مزاج اور ادارات کو سمجھنے کے لیے یہ انتہائی اہم ہے کیونکہ سلطنت روما کے احوال و ظروف کا مطالعہ دراصل یورپ کا

مطالعہ ہے اور نظری و عملی اعتبار سے جو خصوصیات عہدِ رومہ کی ہیں وہی خصوصیات قرونِ وسطیٰ میں پورے یورپ کی ہیں۔ البتہ ازمنۂ وسطیٰ میں بحیثیت مجموعی جب ہم پورے یورپ کے افکارِ سیاسی کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کا اختتام مندرجہ ذیل امور کے ضروری اضافے کے بغیر نہیں ہو سکتا یعنی یہ کہ :

۱۔ بنیادی طور پر ازمنۂ وسطیٰ میں کوئی خاص سیاسی فکر یا کوئی بڑا سیاسی فلسفی پورے یورپ میں خصوصاً اور تمام دنیا میں عموماً نظر نہیں آتا۔[۴۰]

۲۔ قرونِ وسطیٰ کے سیاسی نظریات و ادارات نہ تو واقعی اور حقیقی حالات کے مطالعہ و تجربہ پر مبنی تھے اور نہ ہی کلیۃً ماضی کے تصورات و تجربات سے ماخوذ تھے۔ یہ کچھ تو یونانی و رومی دنیا سے وراثتاً ملے تھے اور کچھ ما بعد الطبیعیاتی تصورات مذہبی سے مستنبط تھے۔[۴۱] اور اسی لیے اس میں جا بجا فکری اور علمی دونوں اعتبار سے تضادات نظر آتے ہیں۔

۳۔ ازمنۂ وسطیٰ کے افکارِ سیاسی کا سرمایہ، غیر تاریخی، غیر سائنٹیفک، غیر منطقی، غیر تنقیدی اور مذہبی و تخیلاتی ہے جس کو تجربہ و تحقیق اور واقعہ سے قریب کا واسطہ نہ تھا۔ تعلیم و تعلم محدود اور نظریات و افکار تنگ نظری اور متعصبانہ مذہبی محدودیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے، تضاد و انتشار کا شکار تھے۔[۴۲]

فارس

فارس اپنی قدامت تہذیب کے لحاظ سے دُنیا کے ان چند حصّوں میں شامل ہے جن کی تاریخ انتہائی قدیم اور طولانی ہے۔[۴۳] عام طور پر اس کی تاریخ کا مطالعہ دو حصّوں میں کیا جاتا ہے۔ ایک افسانوی دور اور دُوسرا تاریخی دور۔ اگر افسانوی دور کو پیشِ نظر رکھا جائے تو شاید اس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہو جاتی ہے جتنا کہ خود انسان ہے لیکن اس کا خالص تاریخی دور بھی ایک زمانہ دراز پر محیط ہے۔ فارس کئی سو سال قبل مسیح میں ہی رفعت و سربلندی حاصل کر چکا تھا اور وہ زمانہ جبکہ یونان میں افلاطون و ارسطو کا طوطی بول رہا تھا۔ یا یُوں کہیے کہ جب یونان بڑی حد تک عروج سے ہمکنار تھا تو اس وقت فارس انحطاط و زوال کی سرحدوں کو چُھو رہا تھا۔ مختصر یہ کہ فارس نے جریدۂ عالم پر بہت گہرا نقش ثبت کیا تھا اور ملوک فارس اپنے دائرہ اقتدار و حاکمیت کو اس قدر وسیع اور مستحکم کر چکے تھے کہ اس وقت کی معلوم دنیا کے بیشتر ممالک ان کے حضور نذرانہ اطاعت پیش کرنے پر مجبور تھے۔[۴۴] مزید برآں اس زمانے میں بھی جبکہ ان کا آفتابِ اقتدار گہنا گیا تھا اور "ملوک طوائف" فارس پر حکمرانی کر رہے تھے، وہ دنیا کے دُوسرے حکمرانوں کے مقابلہ میں زیادہ قوت و جبروت کے مالک تھے۔ چنانچہ ان ہی ملوک طوائف[۴۵] کے زمانے میں یونان و روم پر حملے اور آس پاس کے علاقوں (مثلاً عراق و عرب) پر فوج کشی وغیرہ ہوئی۔ ان کے بعد ساسانیوں کے زمانے (سنہ ۲۲۶ء تا سنہ ۶۵۲ء) میں بھی یہ روایت باقی رہی۔[۴۶]

بہر صورت قدامت تہذیب اور قدامت حکومت دونوں کے اعتبار سے فارس کی بادشاہی، تاریخ سیاست کے نہایت اہم باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور جیسا کہ ہم اُوپر اشارہ کر چکے ہیں اس کی تاریخ بہت طویل ہے جسے مختلف ادوار میں

تقسیم کیا جاتا ہے۔[۴۷] لیکن ہم بالفعل جس دور کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اس کا تعلق ان کے چوتھے طبقہ یعنی "ساسانیہ" سے ہے۔ اس دور میں ملوک ساسانیہ کی ایک چھوٹی سی تعداد تو بلاشبہ ایسی ہے جس نے اپنے حکم و اقتدار کا سکہ کافی عرصہ تک چلایا[۴۸] اور اس زمانے میں کوئی ان کی ہمسری کا دعویٰ بھی بمشکل کر سکتا تھا لیکن تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ساسانی جاہ و جلال بھی ماند پڑتا چلا گیا اس کے اوراق عظمت منتشر اور پراگندہ ہوتے چلے گئے۔ نااہل حکمرانوں، مسلسل بغاوتوں، سفاکانہ خونریزیوں، سیاسی بدامنیوں، اختلافات و ہنگاموں اور آپس کی ریشہ دوانیوں نے آہستہ آہستہ ان کے شجر اقتدار کو کھوکھلا اور ان کی قبائے سیاست کو تار تار کر دیا۔

روم کی طرح فارس میں بھی شخصی، موروثی اور مطلق العنان بادشاہت تھی، اور یہی ایرانی نظام فکر و سیاست میں محور کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ایک طرف حکمران یہ دعویٰ کرتے تھے کہ "ان کی رگوں میں خدائی خون ہے"۔ تو دوسری طرف اہلِ فارس بھی انہیں اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ گویا وہ خدا ہیں۔ ان کا اعتقاد تھا کہ ان حکمرانوں کی فطرت میں ایک مقدس آسمانی چیز موجود ہے۔ چنانچہ یہ لوگ ان کے آگے سربسجود ہوتے تھے ان کی الوہیت کے ترانے گاتے تھے اور انہیں قانون، تنقید اور بشریت سے بالاتر تصور کرتے تھے۔[۴۹]

ملک و قوم پر حکومت کرنے کے لیے ایک خاص گھرانہ متعین تھا۔ اہلِ فارس سمجھتے تھے کہ صرف اسی گھرانے کے افراد تخت و تاج کے وارث اور ملک و سلطنت کے مالک ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ لوگ بادشاہ پر ایمان رکھتے اور حکومت کو شاہی خاندان کا موروثی حق سمجھتے تھے[۵۰] اور اسی لیے اگر اس خاندان میں کوئی سن رسیدہ شخص نہ ملتا تو کسی نابالغ اور بچہ کو اپنا شہنشاہ تسلیم کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہ سمجھتے تھے[۵۱] بلکہ اگر خاندان میں کوئی مرد باقی نہ رہتا تو عورت کو ہی تاجِ شاہی پہنا دیتے تھے۔[۵۲] پھر تماشہ یہ کہ تختِ شاہی پر نصب و عزل کا یہ کھیل اس شان سے کھیلا جاتا تھا کہ اس میں کسی اصول اور ضابطے کی قید، اخلاق و کردار کی کوئی پابندی، رشتہ و علائق کی کوئی پروا، چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز اور حلال و حرام، جائز و ناجائز اور حق و ناحق کا کوئی لحاظ نہ تھا، بس فکر صرف تخت کی اور ہوس محض اقتدار کی تھی اور مقصود صرف یہ تھا کہ تختِ حکومت حاصل ہو جائے خواہ اس کے لیے کوئی بھی راستہ کیوں نہ اختیار کرنا پڑے اور خواہ اس کے لیے اپنے دشمنوں سے ہی مدد کیوں نہ مانگنی پڑے۔ اسی لیے ہرمز سوم (۴۵۷ء تا ۴۵۹ء) کے مقابلہ پر اس کے بھائی فیروز اوّل (۴۵۹ء تا ۴۸۳ء) نے تاتاریوں (سفید ہن قبائل) سے مدد مانگی تھی۔[۵۳] اور جب قباد اوّل (۴۸۷ء تا ۵۳۱ء) نے مزدکی مذہب کی سرپرستی قبول کی تو ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا جس کے نتیجہ میں قباد کو تخت سے معزول کر دیا گیا اور اس نے قید سے بھاگ کر تاتاریوں کے پاس پناہ لی اور بالآخر ان ہی کی مدد سے دوبارہ تخت نشین ہوا۔[۵۴] اسی اقتدار کی خاطر بلاش (۴۸۳ء تا ۴۸۷ء) کو معزول کیا گیا۔ اسی تخت کی ہوس میں نوشیرواں سے (۵۳۱ء تا ۵۷۹ء) دعویدار سلطنت کے قتل کی حرکتِ قبیحہ سرزد ہوئی۔ اسی کے لیے ہرمز چہارم اور خسرو پرویز (۵۹۰ء تا ۶۲۸ء) قتل ہوئے اور اردشیر بن شیرویہ بمشکل ڈیڑھ سال حکمران رہا۔[۵۵] شہر براز (یا شہر یار)[۵۶] صرف چار دن حکومت کے مزے لوٹ سکا۔[۵۷] اس کی جانشین بوران بنت کسریٰ پرویز

صرف ایک سال چار ماہ تک بادشاہت کر سکی۔[۵۸] اس کے بعد آنے والے حکمران جشندہ کی مدتِ ریاست تو ایک ماہ سے بھی کم رہی۔[۵۹] آزرمیدخت محض چھ ماہ حکمرانی پر متمکن رہی۔[۶۰] اس کا جانشین کسریٰ بن مہر جشنس چند دن بعد ہی قتل ہوگیا۔[۶۱] یہی انجام فیروز بن مہر جشنس کا ہوا۔[۶۲] فرخزاد خسرو کی سلطانی چھ ماہ سے آگے نہ بڑھ سکی[۶۳] اور آخری بادشاہ[۶۴] (یزدجرد یا) یزدگرد بن شہریار کی عمر قتل کے وقت صرف ۲۲ سال تھی جبکہ اس کی حکمرانی کو دو یا چار سال گزرے تھے[۶۵] اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اقتدار کی یہ ہوس صرف خاندان شاہی کے افراد تک محدود نہ تھی بلکہ بوران سے پہلے بعض دوسرے لوگوں نے بھی طالع آزمائی کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ مذکورہ شہر براز (یا شہریار) کا تعلق خاندان شاہی سے نہ تھا۔[۶۶]

سلطنت فارس اگرچہ شخصی، موروثی اور مطلق العنان تھی اور بادشاہ اپنے حکم اور فیصلہ میں کسی کا پابند نہ تھا مگر اسی کے ساتھ ساتھ متعدد تاریخی واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں "علمائے فارس" پر مشتمل ایک نوع کی "مجلسِ مشاورت" بھی تھی جو اگرچہ درباری اور شاہی خاندان کے افراد پر مشتمل تھی لیکن اپنی نوعیت میں وہ کتنی ہی محدود سہی بہرحال بادشاہ وقتاً فوقتاً احکام کے اجراء و نفاذ، والیوں کے تقرر اور دوسرے اہم مواقع پر اس کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ مثلاً جس زمانے میں یمن پر "مسروق" کی حکمرانی قائم تھی سیف بن ذی یزن نامی ایک شخص اپنی قوم کی طرف سے پہلے قیصر روم کے دربار میں فریادی ہوا اور مسروق سے نجات دلانے کی درخواست کی لیکن وہاں سے مایوسی ہوئی تو عامل حیرہ نعمان بن منذر کی وساطت سے سیف نے نوشیرواں کے دربار میں بھی اس درخواست کو دُہرایا۔ نوشیرواں نے سیف کی درخواست کو ہمدردی سے سُنا اور مدد کے لیے آمادہ ہوگیا۔ مگر مدد کا طریقہ کار کیا ہو اور کیا صورت اختیار کی جائے تو اس سلسلے میں اس نے اہلِ دربار سے مشورہ کیا[۶۷] اور اسی مشورہ کے مطابق وہرز کی سرکردگی میں ایک لشکر یمن روانہ کیا گیا جس نے مسروق کو قتل کر کے سیف کا یمن پر اقتدار قائم کر دیا۔[۶۸] اسی طرح اردشیر بن شیرویہ کو جس وقت شہنشاہ بنایا گیا تو اس کی عمر مشکل سے سات سال تھی اور ظاہر ہے کہ اس عمر میں حکمرانی کے لیے وہ دوسروں کی مدد کا سخت محتاج بھی تھا۔ چنانچہ اس کی رہنمائی اور مشورہ کے لیے "مہاذر جنشس" کو منتخب کیا گیا تھا۔[۶۹]

سلطنت فارس کی تاریخ کا یہ ایک مختصر سا عمومی جائزہ تھا۔ اب جہاں تک چھٹی صدی عیسوی کے ربع آخر اور ساتویں صدی عیسوی میں بالخصوص اس سلطنت کی نوعیت و ماہیت کا تعلق ہے تو ہمیں مندرجہ ذیل اہم باتیں نظر آتی ہیں:

(الف) فارس میں شخصی، موروثی اور مطلق العنان شہنشاہیت کی روایت اپنے پورے التزام کے ساتھ جاری تھی۔ ایران کے حکمران جو اس زمانے میں انسانی قیادت کے دعویدار تھے ایک پُرفریب اور مصنوعی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے رؤسا، امراء اور وزراء کو لذت اندوزی کے سوا کسی بات کی فکر نہ تھی "عیاشی کی وہ انتہا تھی کہ قیاس کام نہیں کرتا۔ تکلفاتِ زندگی، تعیشات اور سامانِ آرائش کی وہ بہتات تھی اور اس میں ان باریکیوں اور نکتہ سنجیوں سے کام لیا جاتا تھا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔"[۷۰] اس بے پناہ عیاشی اور امور سلطنت سے غفلت کا نتیجہ یہ

نکلا تھا کہ سازشیں، بغاوتیں اور خونریزیاں روز کا معمول بن گئیں اور بدامنی و بے چینی عام ہو گئی اور یوں نظم مملکت روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا۔

(ب) مجموعی طور پر سلطنتِ فارس روبہ زوال تھی۔ اگرچہ بعض حوصلہ مند حکمرانوں کے زمانے میں اس نے وقتی طور پر سنبھالا لیا لیکن یہ شمع زیادہ عرصہ تک اپنی تابانی نہ پھیلا سکی اور ایک مختصر سے عرصہ میں ہی بادشاہوں کی ایک بڑی تعداد زوال کے ناقوس بجاتی گزر گئی۔ سلطنت فارس کے اواخرِ عہد کا سب سے جلیل القدر حکمران 'نوشیرواں تھا جس نے تقریباً ۴۸ سال تک[۷۱] ایک بڑے علاقے کو اپنے زیرِ نگیں رکھا اور اس کی حکومت کے ختم ہونے میں ۷ سال باقی تھے کہ انسانیت کا آخری نجات دہندہ، دنیا کی ظلمتوں کو چیرتا ہوا اس عالمِ آب و گِل میں تشریف لایا۔ نوشیرواں کا جانشین ہرمز بنا پھر بارہ سال کے بعد[۷۲] تختِ فارس پر کسریٰ پرویز نامی وہ آخری حوصلہ مند بادشاہ متمکن ہوا جس کی ۳۲ سالہ فرمانروائی[۷۳] کے بعد انحطاط و زوال سلطنت کی رفتار انتہائی تیز ہو گئی[۷۴]۔ اسی کسریٰ پرویز کے دورِ حکومت میں آفتابِ رسالت طلوع ہوا[۷۵]۔ اسی کے عہد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی[۷۶] اور اسی کے عہد میں "ذی قار"[۷۷] کا وہ فیصلہ کن واقعہ پیش آیا جس کے بعد عرب و عجم کے درمیان تفریق ہو گئی[۷۸] اور رسالت محمدی کے ایک ادنیٰ سے مظاہرے نے سلطنت فارس کے عظیم سلسلہ حکومت کو فی الواقع منقرض و منقطع کر دیا[۷۹] اور چند ہی برس میں فتوحاتِ اسلامی کا سیلاب ایرانی شوکت و سطوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا[۸۰]۔

(ج) سلطنت فارس کے انحطاط و زوال میں جن عوامل نے حصہ لیا اور اس کی سیاسی تنظیم و ادارت کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ ان میں سے ایک ایران کی معاشرتی و اخلاقی حالت ہے جسے سیاسی تاریخ کے مطالعہ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہاں ایک طبقہ مسرفانہ اور عیش پسندانہ زندگی میں مشغول ہو کر دوسرے مشاغل و فرائض سے غافل ہو چکا تھا اور اس کا بار دوسرے طبقہ پر تھا جو محصولات اور حکومت کے بے جا مطالبات کی چکی میں پس رہا تھا نیز تیسرا طبقہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ اس کشمکش نے یقیناً اجتماعی بدنظمی اور انتشار کو دعوت دی کیونکہ رعایا زیادہ عرصہ تک ظلم و تشدد اور بنیادی حقوق سے محرومی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے اخلاقی زوال اور مذہبی انتشار کی تاریخ بھی ابتداء سے شانہ بشانہ چل رہی تھی۔ زمانہ قدیم میں اہلِ فارس مظاہرِ قدرت کے پرستار تھے۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں زرتشتی مذہب کا آغاز ہوا اور ساسانی حکمرانوں کا بھی سرکاری مذہب یہی تھا۔ تیسری صدی عیسوی میں شہوت پرستی اور جنسی تحریکات نے مذہب کا چولہ اختیار کیا۔ مانی مذہب کا آغاز ہوا جو مسیحت و مجوسیت کی آمیزش کا مرقع تھا اور جس میں نور و ظلمت کا ایسا گورکھ دھندا تھا جس سے آخر تک نکلنا اس قوم کو نصیب نہ ہوا[۸۱]۔ بہرام نے ۲۷۶ء میں مانی کو یہ کہتے ہوئے قتل کر ڈالا کہ تو دنیا کو تباہی کی طرف دعوت دیتا ہے[۸۲] اس کے قتل ہو جانے کے باوجود اس مذہب کے اثرات صدیوں فارس میں قایم رہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ایک دوسرا مذہب پیدا ہوا جس کا بانی مزدک تھا۔ عیش پرستوں اور ہوس رانوں نے اس کو خوشی خوشی قبول کیا اور بہت جلد اس مذہب کو حکمران وقت قباد

(۴۸۸ء تا ۵۳۱ء) کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورا ملک جنسی بحران میں ڈوب گیا[۸۳] مگر اہلِ فارس جلد ہی اس سے عاجز آگئے۔ چنانچہ نوشیرواں نے برسرِ اقتدار آتے ہی اس مذہب کے ایک لاکھ سے زاید پیروؤں کو قتل کر ڈالا۔ ان مشہور مذاہب کے علاوہ شاہ پرستی نے بھی تقریباً ایک مذہب کی شکل اختیار کر لی تھی۔

مختصر یہ کہ ان معاشرتی اور اخلاقی بدحالیوں نے سیاسی حالات کو ابتر کرنے میں موثر کردار ادا کیا اور ایرانی سیاست کی قبائے دراز کو کرم خوردہ کر دیا۔

ہندوستان

اختصار کی خاطر ہندوستان کے مطالعہ کو ہم مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں پیش کرنا چاہتے ہیں:

(ا) اپنے انتہائی قدیم زمانے سے قرونِ وسطیٰ تک ہندوستان میں حاکمیت کا ایک ہی تصور ہمیشہ قایم رہا کہ راجہ ہی سیاسی تنظیم کا سربراہ، خدائی ارادہ کا مظہر، دیوتاؤں سے نسلی تعلق رکھنے والا اور اپنے ہم عصر فارسیوں کی طرح ہر قسم کی تنقید اور رائے زنی سے بالاتر ہوتا ہے۔ راجہ ہی تمام طاقتوں کا سرچشمہ اور دیوتاؤں کا محبوب و نائب ہے اس کا حکم قانون ہے اس کا دربار سب سے بڑی عدالت ہے اور اس کی ذات غلطیوں سے پاک و منزّہ ہے۔ اخلاقیات کے گورکھ دھندوں سے دور محض سیاسی غلبہ کا حصول راجہ کا مقصود ہے جس کے ضمن میں ہر جائز و ناجائز ذریعہ اختیار کر سکتا ہے۔ بہر صورت یہ بات طے ہے کہ ازمنۂ قدیم سے ہندوستان میں عام طرزِ جہانبانی "بادشاہت" اور ملوکیت رہا ہے۔[۸۴] البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ بادشاہتیں بذریعہ انتخاب عمل میں آتی تھیں یا بذریعہ نامزدگی۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ عام اصول نامزدگی اور موروثیت کا ہی تھا۔ اور بعض اوقات جو کچھ انتخابی عمل نظر آتا ہے وہ محض نمائشی اور مصنوعی تھا۔[۸۵]

(ب) راجہ اگرچہ تمام انتظامی، عدالتی اور فوجی شعبوں کا مالک تھا لیکن تمام کاموں کو اکیلا انجام نہیں دے سکتا تھا اس لیے اس نے مشیروں کی ایک مجلس قایم کر رکھی تھی جو اسے اہم امور میں مشورہ دیتی تھی اور اس کے کام میں ہاتھ بٹاتی تھی بلکہ ویدوں کے زمانے میں تو مقامی کونسل (سبھا) اور مرکزی کونسل (سمتا) کی بنا پر بادشاہ کے اختیارات نسبتاً محدود ہو گئے تھے۔ یاں ویدوں کے آخری زمانے میں "سمتا" کا نام و نشان بالکل مٹ گیا تھا۔[۸۶] اسی طرح ہرش کے عہد میں بھی راجہ فرمانروائے مطلق نہ تھا بلکہ اس کے اختیارات میں وزراء کا بھی عمل دخل تھا۔[۸۷]

(ج) ہندوستان میں "اشرافیہ" (ARISTOCRACY) طرز کی فرمانروائی کا آغاز کم از کم شمالی حصّے میں تقریباً اسی زمانہ میں ہوا جس زمانہ میں کہ یونان میں ہوا تھا۔ یہ "اشرافی جمہوریتیں" بہر حال بادشاہت کے شانہ بشانہ قائم ہوئیں کیونکہ عام چلن بہرکیف "بادشاہت" ہی تھا۔[۸۸]

(د) سیاسی اعتبار سے ہندوستان کی حالت بھی روم اور ایران سے کچھ کم خراب نہیں تھی۔ پانچویں صدی عیسوی کے اختتام سے ساتویں صدی عیسوی کے آغاز تک کا زمانہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ابتری اور گمنامی کا زمانہ شمار

کیا جاتا ہے۔[۸۹] ۳۲۰ء میں جس عظیم الشان گپت سلطنت کی بنیاد پڑی تھی وہ پانچویں صدی کے پہلے نصف تک ہندوستان کی مرکزی حیثیت سے قائم رہی لیکن پھر روم اور ایران کی طرح وسطِ ایشیا کی وحشی اقوام نے گپت سلطنت کو بھی زمانہ شباب میں زوال سے ہمکنار کر دیا اور اس طرح ہندوستان بھی ان کی عظیم الشان سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا جو ایشیا اور یورپ پر پھیلی ہوئی تھی۔[۹۰] گپت سلطنت کے زوال کے بعد سے ہرش وردھن کے تخت نشین ہونے تک کا زمانہ (۵۰۰ء تا ۶۰۶ء) ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک تاریک باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ گپت سلطنت کا زوال اور وردھن حملہ آوروں کی آمد ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں دراصل ایک نہایت اہم موڑ تھا۔[۹۱]

(۵) گپت سلطنت کا زوال بہت سے ناگزیر نتائج کا سبب بنا۔ صوبائی راجاؤں، گورنروں اور جاگیرداریاستوں نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ پورا شمالی ہندوستان بہت سی آزاد ریاستوں میں منقسم ہو گیا۔[۹۲] ہندوستان کی اس سیاسی صورتِ حال کے بارے میں اسمتھ لکھتا ہے: ”چھٹی صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں ہندوستان کی تاریخ کے متعلق بہت ہی کم معلومات فراہم ہوتی ہیں، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہاں کسی کامل اقتدار رکھنے والی طاقت کا وجود نہیں تھا اور وادیِ گنگا کی تمام ریاستیں ہن قبائل کے حملوں سے تہ و بالا ہو چکی تھیں۔“[۹۳]

ایک اور مصنف کا بیان ہے کہ:

”قرونِ وسطیٰ کے آخری حصہ پر ہندوستان کی ملکی حالت بہت قابلِ اطمینان نہ تھی۔ چھوٹے چھوٹے راج بنتے جاتے تھے ہرش اور پل کیشی کے بعد تو ان کی سلطنتیں کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی تھیں۔ سولنکی، پال، سین، پرتیہار، جادو، گوھل، راٹھور، متعدد خاندان اپنی اپنی ترقی میں کوشاں تھے۔ اس لیے ہندوستان کی مجموعی طاقت کوئی نہ تھی۔ صدہا ریاستوں میں بٹ جانے کے باعث ملک کی طاقت بکھری ہوئی تھی۔ قومیت کا احساس بالکل نہ تھا۔ ان راجاؤں میں برابر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں اور سیاسی کیفیت روز بروز نازک ہوتی جاتی تھی۔ ملک کی سیاسیات اور دیگر انتظامی شعبہ جات پر ان حالات کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ سب ریاستیں رفتہ رفتہ زیادہ آزاد اور مطلق العنان ہوتی گئیں۔ راجاؤں کو رعایا کی بہبود کا خیال نہ رہا۔ رعایا کی رائے پیروں سے ٹھکرائی جانے لگی۔ آپس کی لڑائیوں سے اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ رعایا کی آسائش کا خیال کریں۔ ہاں لڑائیوں کے لیے جب روپے کی ضرورت ہوتی رعایا پر محصول کا اضافہ کر دیا جاتا تھا۔“[۹۴]

ایک اور مصنف صورتِ حال کی عکاسی یوں کرتا ہے:

”پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہن کے حملوں نے گپت سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور شاہانِ گپت ایک مقامی راجہ کی حیثیت میں ڈوب گئے جو محض ایک محدود علاقے پر حکومت کر سکتا تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں شمالی ہندوستان کی سیاسی قیادت ہرش وردھن کے تحت قنوج کو منتقل ہو گئی جس نے اپنی سیاسی لیاقت اور فتحمندی سے آخری بار شمالی ہندوستان کے منتشر اجزا کو جوڑنے کی کامیاب کوشش کی۔“[۹۵]

مزید براں جو خودمختار ریاستیں گپت سلطنت کے کھنڈرات پر قائم ہوئیں ان میں سے کسی ایک کو بھی مرکزی

حیثیت حاصل نہ تھی۔ صرف وسط ہندوستان میں نو خود مختار ریاستیں قائم تھیں۔ بنگال کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا اور اسمتھ کے بقول کشمیر، سندھ، آسام اور نیپال میں الگ الگ ریاستیں قایم تھیں۔ ان ریاستوں کی آپس کی کشمکش کے نتیجہ میں بالآخر ہرش وردھن کی حکومت نے مخالفین کو مغلوب کرکے اپنے آپ کو مستحکم کیا اور اس کے بعد کے دور کو ہم ہندوستان کی سیاسی یکجہتی کا عارضی زمانہ کہہ سکتے ہیں۔

(د) ملک کے اندرونی و بیرونی خلفشار میں معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی عناصر کا کردار بھی بہت اہم رہا ہے۔ وہی طبقاتی کشمکش جو روم اور ایران میں تھی ہندوستان میں بھی موجود تھی بلکہ ہندوستان طبقہ داریت میں تمام اقوامِ عالم سے بڑھ گیا تھا۔ امرا اور متقدر طبقہ متوسط اور غلام تو خیر موجود ہی تھے اونچ نیچ کا فرق اور ذاتوں کی تقسیم اس پر مستزاد تھی بلکہ راجہ کے دیگر فرائض میں سے ایک فرض یہ بھی تھا کہ وہ ذاتوں کے فرق کو قائم رکھے۔ منوشاستر میں چار ذاتیں بیان کی گئی ہیں :

۱۔ برہمن یا مذہبی پیشوا
۲۔ چھتری (حکمران اور لڑنے والے)
۳۔ ویش (زراعت و تجارت پیشہ) اور
۴۔ شودر (۹۶) جن کا کوئی خاص پیشہ نہیں تھا اور جو دُوسری ذاتوں کے صرف خادم تھے۔

یہ تقسیم ذات اور الہامی سمجھی جاتی تھی۔ مزید برآں ایسے قوانین وضع کیے گئے تھے جس سے علانیہ بعض ذاتوں کی پاسداری و حمایت اور بعض پر جبر و ستم مقصود تھا۔ مثلاً :

(الف) برہمن کو کسی حالت میں خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرائم کا مرتکب رہ چکا ہو سزائے موت نہیں دی جا سکتی۔
(ب) کسی اونچی ذات کے مرد کا نیچی ذات کی عورت کے ساتھ زنا کرنا کوئی جرم نہیں۔
(ج) کسی بُدھ راہبہ تک کی عصمت دری کی سزا میں کچھ جرمانہ کافی تھا۔
(د) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات والے کو چھُو لے تو اس کی سزا موت ہے۔
(ہ) اگر کوئی نیچی ذات والا اپنے سے اونچی ذات والے کو مارے تو اس کے اعضا قطع کر ڈالنا چاہئیں۔ اگر اسے گالی دے تو اس کی زبان کاٹ ڈالنی چاہیے اور اگر اس کو تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو گرم تیل اس کے منہ میں ڈالنا چاہیے (۹۷)۔

ہندوستانی معاشرہ میں مظاہر پرستی اور بت پرستی بنیادی حیثیت رکھتی تھیں۔ عوام کا مذاق اور مزاج کسی ایسے مذہب کو قبول کرنے پر تیار ہی نہ ہوتا تھا جس میں بت پرستی نہ ہو۔ ہندوستان کی تاریخ میں چھٹی صدی عیسوی کا زمانہ معبودوں کی کثرت کا زمانہ ہے۔ وید میں دیوتاؤں کی تعداد ۳۳ تھی لیکن اس زمانہ میں ۳۳ کروڑ ہو گئی تھی۔ دنیا کی ہر پسندیدہ شے قوت والی چیز اور ہر ناقابلِ تسخیر طاقت اہلِ ہند کے نزدیک عبادت اور پرستش کے لائق تھی۔ اسی طرح بُتوں، دیوتاؤں، دیویوں کا کوئی شمار نہیں تھا اور قابلِ پرستش اشیا میں معدنیات و جمادات، اشجار و نباتات، پہاڑ، دریا، حیوانات حتیٰ کہ اعضائے مخصوصہ وغیرہ سب ہی

شامل تھے۔ اس طرح یہ قدیم مذہب افسانوی روایات اور عقاید و عبادات کا ایک دیو مالا بن کر رہ گیا تھا۔[۹۸] یہی وجہ ہے کہ روز افزوں بت پرستی سے متاثر ہو کر جین مت اور بدھ مت نے بھی بت پرستی کو اپنے مذہب کا جزو قرار دیا اور اپنی ترقی اور استحکام کا ذریعہ سمجھا اور عبادات کے طریقوں میں سحر و اوہام داخل کر لیے۔[۹۹] ادھر ہندوؤں نے بدھ کو وشنو کا نواں اوتار مان لیا، اور بدھ عوام کی نظروں میں مقبولیت حاصل کی یہاں تک کہ دونوں مذاہب میں اس قدر یک رنگی پیدا ہو گئی کہ بُدھ اور ہندو دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔[۱۰۰]

چین

چین کی تہذیب اور اس کا تمدن اتنا قدیم ہے کہ صحیح معنوں میں اس کے آغاز کا تعین اب تک نہیں ہو سکا۔[۱۰۱] چین کے تاریخی دور کی ابتدا، جیسا کہ کہا جاتا ہے یاؤ (YAO) کے زمانہ (۲۰۸۵ء تا ۲۰۰۴ء قم) سے ہوئی۔[۱۰۲] اس کے بعد بتدریج شون (SHONE)، ہیا (HAIA)، شانگ (SHANG) اور اینگ کے خاندان برسرِ اقتدار آئے۔[۱۰۳] پھر طوائف الملوکی کا طویل دور شروع ہوا جو ہان (HAN) خاندان کی حکومت کے قیام تک جاری رہا۔ ہان کا پہلا فرمانروا کوٹی (KAO-TI) تھا۔[۱۰۴] اس کے زمانے میں ملک کی علمی و سیاسی قوت نے فروغ پایا۔ اس خانوادہ کو تیسری صدی عیسوی تک حکومت کا موقع ملا۔ لیکن آغاز سے کچھ ہی عرصہ بعد ضعف و انحطاط کا عمل جاری ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ خانہ جنگیاں، بغاوتیں اور دوسرے فتنے بڑھ گئے یہاں تک کہ ایک فوجی سردار نے بغاوت کر کے ۲۲۱ء میں اس کا خاتمہ کر دیا۔[۱۰۵] اس کی وجہ سے اندرونی خلفشار اور افراتفری مزید بڑھ گئی اور صورتِ حال اس حد تک خراب ہو گئی کہ چالیس سال سے زائد عرصہ تک تختِ شاہی خالی رہا اور کوئی حکومت وہاں قایم نہ ہو سکی۔ آخر کار ۲۶۵ء میں خاندان شی چیو (SHEE-CHEU) نے حالات پر قابو پایا اور اپنی بساطِ اقتدار کو چھٹی صدی عیسوی تک پھیلا دیا۔[۱۰۶] بظاہر حکومت و سیادت کا یہ ایک طویل عرصہ ہے لیکن فی الحقیقت چین کی تاریخ میں اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ کیونکہ ساڑھے تین سو سال کا یہ دور سخت انتشار و اضطراب سے عبارت ہے[۱۰۷] اور طوائف الملوکی سے مختلف نہیں ہے۔ بہرحال عرصۂ دراز کے افتراق کے بعد ۵۸۹ء میں سوئی (SUI) خاندان سریر آرائے سلطنت ہوا۔ تو کچھ مدت کے لیے ملک کے حالات سُدھر گئے۔ اس کے باشندوں کو امن و امان میسر آیا اور ایک گونہ سیاسی اتحاد قائم ہونے کے علاوہ ملک کا وقار بھی بلند ہوا۔ مگر ۶۱۸ء میں یعنی ہجرت نبویؐ سے چار سال پہلے سوئی خاندان کو تانگ خاندان کے لیے جگہ خالی کرنا پڑی۔[۱۰۸] تانگ کا دور ۶۱۸ء سے ۹۰۶ء تک رہا۔[۱۰۹]

اس تفصیل سے یہ واضح ہے کہ حضور کی بعثت کے وقت چین میں سوئی خاندان مسندِ اقتدار پر فائز تھا اور تانگ خاندان نے اس وقت زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی جبکہ رسول اللہ کی بعثت کو آٹھ سال ہو چکے تھے اور آپ قریش کے معاشی و معاشرتی مقاطعہ کا سامنا کر رہے تھے۔ تانگ کا دورِ حکومت بہت طویل رہا۔ اس کا دوسرا فرمانروا تائی تسنگ (TAI TSUNG) تھا۔[۱۱۰] اس نے ۶۲۷ء سے ۶۴۹ء تک حکومت کی۔[۱۱۱] اسی کے زمانے میں حضورؐ نے رحلت فرمائی اور خود جب وہ مرا تو اس وقت حضرت عثمانؓ

تختِ خلافت پر متمکن تھے۔[112] بہرحال مجموعی طور پر یہ کہنا چاہیے کہ خاندان تانگ سے چین کی سیاست میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ مزید برآں چین نے بت پرستی، کنفیوشس ازم اور بدھ مت کے عروج و زوال اور نسطوری و مانوی مذہب کے بعد اسلام کا جلوہ بھی اسی دور میں دیکھا۔"[113]

روم، ایران اور ہندوستان کی طرح چین میں بھی آمریت اور مطلق العنانیت کا دور دورہ تھا۔ ان کی حکومت شخصی، استبدادی اور موروثی تھی۔ بادشاہ ان کا فرمانروا اور مطلق تھا۔ اسی کو تمام اختیارات حاصل تھے۔ اس کا حکم قانون تھا اور اس کا ایوان ملک کی سب سے بڑی عدالت تھی۔ اہلِ چین اپنے بادشاہ کو "شہنشاہ فرزند آسمان" کہتے تھے کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ آسمان نر ہے اور زمین مادہ۔ اور کائنات کو انہیں دو قوتوں نے جنم دیا ہے اور شہنشاہ خطا اول زمین و آسمان کے جوڑے کی پہلی اولاد ہے۔"[114] اسی بنا پر شاہِ وقت کو قوم کا تنہا باپ تصور کیا جاتا تھا۔ اس کو حق تھا کہ جو چاہے کرے۔ لوگ اس سے کہتے تھے کہ "آپ ہی قوم کے مائی باپ ہیں۔"[115] لیکن اوپر کے سیاسی جائزہ سے یہ عجیب بات سامنے آتی ہے کہ اتنی سخت شاہ پرستی کے باوجود بعثتِ نبویؐ سے قبل چین میں سلطنت کو استحکام حاصل نہیں ہو سکا۔ خانہ جنگیاں معمول بن چکی تھیں اور بیرونی حملہ آوروں نے پورے نظامِ سیاست کو برباد کر رکھا تھا۔

دوسرے ممالک

عرب کا مطالعہ تو ہم آیندہ صفحات میں کریں گے۔ یہاں ہم مختصراً دنیا کے بعض دوسرے ممالک کی سیاسی و تمدنی کیفیت پر بھی ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ دنیا کے سیاسی نظام کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آجائے۔ البتہ یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ اب تک ہم جن ممالک کا جائزہ لے چکے ہیں ان کے علاوہ دوسرے ممالک کے بارے میں تفصیلات بہت کم ملتی ہیں مثلاً کمبوڈیا کے بارے میں صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ بعثتِ رسولؐ کے وقت وہاں کھمبر خاندان کی حکومت تھی جو ۶۰۰ء سے ۱۳۰۰ء تک قائم رہی۔ مصر کی تاریخ اگرچہ بہت قدیم ہے لیکن ملکہ قلوپطرہ کے انتقال (۳۰ ق م) کے بعد سے آغازِ اسلام تک مصر کی حیثیت سلطنت رومہ کے ایک صوبہ کی رہی۔ یہی صورت رسول اللہؐ کی ولادت اور بعثت کے وقت تھی۔ قیصرِ روم کی طرف سے مقرر کردہ مصر کا گورنر اسکندریہ میں رہتا تھا۔ مقوقس بھی مصر کا گورنر ہی تھا جسے رسول اللہؐ نے نامۂ مبارک بھیجا تھا۔ حبشہ بھی اس وقت سلطنتِ رومہ کے زیرِ اثر تھا پہلی صدی عیسوی میں جب یمن میں حمیر خاندان کی حکومت قائم ہوئی تو حبشہ کے باشندوں نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور اکسوم کو اپنا دار الحکومت قرار دیا۔ اس وقت سے یہاں بھی عیسائیت کو قبول کر لیا گیا۔ چنانچہ رسول اللہؐ کی ولادت اور بعثت کے وقت یہاں عیسائیت رائج تھی اور یہاں کے بادشاہ کو نجاشی کہتے تھے۔[116] دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح اسپین کی سیاسی حالت بھی اس زمانے میں ابتر تھی۔ وہ رومی حکومت کے زوال کے بعد سے وحشی اقوام کی گزرگاہ بن گیا تھا یہاں پہلے گاتھ فرمانروا ہوئے پھر ونڈال آئے اور پھر دوبارہ گاتھ قوم حکمران ہوئی۔ گاتھ قوم کا سیاسی نظام شاہی کونسل اور مذہبی کونسل کے اشتراک سے رُو بہ عمل آیا۔ راہب اور پادری ہر وقت اپنے اپنے اقتدار کی فکر میں رہتے تھے۔ سیاسی

رہنہ کشی اور معیشت و معاشرت میں ابتری عام تھی۔[۱۱۷] ابنِ خلدون کے بیان کے مطابق اسپین کے ملوک میں سے شیشوط رسول اللہؐ کا ہمعصر تھا۔[۱۱۸] جزائر برطانیہ میں رسول اللہؐ کی ولادت سے ایک صدی قبل تین قبیلے اینگل، سیکسن اور جوٹ، جٹ لینڈ اور جرمنی کے شمالی علاقے سے آکر انگلینڈ پر قابض ہو گئے تھے۔ یہی قبیلے انگریزوں کے مورثِ اعلیٰ ہیں اور تاریخ میں اینگلو سیکسن کہلاتے ہیں۔ رسول اللہؐ کی بعثت کے وقت جزائر برطانیہ متعدد آزاد ریاستوں میں منقسم تھا جن پر مختلف بادشاہ حکومت کرتے تھے۔[۱۱۹] رسول اللہؐ کی ولادت کے وقت قبیلہ جوٹ کا فرمانروا اینظلبرٹ تھا۔ ۶۱۶ء میں وہ مرگیا تو اینگل کے ایڈون نے اقتدار سنبھالا تاہم ملک میں نہ تو کوئی مرکزیت قائم ہو سکی اور نہ تہذیب و تمدن نے کوئی خاص ترقی حاصل کی۔ سیاسی، اخلاقی اور روحانی پستی پورے ملک میں تھی۔ باقی یورپ تمدن سے قطعاً ناآشنا تھا۔ وحشی اور غیر مہذب قبائل براعظم کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ اب جہاں تک مشرق اور وسط ایشیا کی دوسری قوموں کا تعلق ہے تو ان کا حال بُرا تھا۔ نہ کوئی علمی دولت ان کے پاس تھی نہ کوئی نظام سیاست ان کے ہاں موجود تھا۔ فی الحقیقت یہ قومیں (مغل، ترک، جاپانی وغیرہ) اپنے عبوری دور میں تھیں۔ جاہلانہ بت پرستی سے نکل کر تمدن کی طرف آرہی تھیں اور چند قومیں ایسی بھی تھیں جو اس وقت تک شہریت اور زندگی کی ابتدائی منزل میں تھیں اور عقلی و تمدنی حیثیت سے ان کا دور طفولیت تھا۔[۱۲۰] اور وہ مغربی قومیں جو بالکل شمال و مغرب میں آباد تھیں جہالت و ناخواندگی کا شکار اور خونی جنگوں سے زار و نزار تھیں اور جنگ و جہالت کی پیدا کی ہوئی تاریکی میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ ان ممالک میں اب تک علم و تمدن کی صبح نمودار نہ ہوئی تھی۔[۱۲۱]

عرب

اب ہم اخیر میں سرزمینِ عرب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں کہ اس کا ہمارے موضوع سے براہِ راست تعلق ہے اور اس کا جائزہ لئے بغیر پیشِ نظر ریاست کے نشو و ارتقا کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ عرب کی تہذیب اور اس کی تاریخ اتنی ہی پُرانی ہے جتنی قدیم کہ اس خطہ ارضی پر انسانی آبادی کیونکہ اس خطہ کو اقوام سامیہ کا مسکن ہونے کا شرف حاصل ہے۔[۱۲۲] یہ علاقہ مدتِ مدید سے مختلف اقوام و ملل کی آماجگاہ اور ان کے عروج و زوال کا امین رہا ہے۔ بقول سید سلیمان ندوی کہ ”عرب کے ملک میں پانی کا دریا نہیں لیکن وہاں انسانوں کا دریا ہے۔ تاریخ نے چار بار اس دریا میں طوفان آتے دیکھا ہے۔ ایک مسیح سے ڈھائی یا تین ہزار برس پہلے جب یہاں سے قبائل کا سیلاب موجیں مارتا ہوا بابل و اسیریا، مصر اور فنیشیا (کنعان) میں پھیل گیا۔ اس سیلاب کا زور کم ہو رہا تھا کہ ۱۵۰۰ ق م میں ایک اور طوفان آدمی، موآبی اور مدیانی قبائل کا اٹھا اور پاس کے ملکوں میں پھیل گیا۔ لیکن اس کا دائرہ پہلے سے کم تھا۔ تیسری بار معینی، سبائی وغیرہ اُٹھے اور پھیلے، لیکن سب سے آخری طوفان جو پہلی صدی ہجری میں مسیح سے چھ سو برس بعد اُٹھا وہ سب سے زیادہ وسیع الاثر تھا۔ جو ایک طرف گنگا کے دہانے سے مل گیا اور دوسری طرف بحر محیط سے۔“[۱۲۳]

قوم نوح کی بربادی کے بعد عرب میں جو سب سے پہلی مقتدر اور حکمران جماعت ظہور پذیر ہوئی قرآن کی زبان میں اس کا

نام عاد ہے۔[۱۲۴] جس کا تعلق عرب مورخین کے نزدیک اُمم بائدہ (برباد ہوجانے والے قبائل) سے ہے۔[۱۲۵] لیکن عاد محض ایک محدود و مختصر قبیلہ نہ تھا بلکہ ایک عظیم الشان قوم تھی جو دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی۔ ایشیا اور افریقہ کا کثیر حصّہ اس کے زور و قوت کا تماشہ گاہ تھا۔ بڑی بڑی عظیم الشان عمارتیں اس کے دستِ صنعت کا نتیجہ تھیں۔ اس لیے قرآن نے عرب کے لیے اُسے عبرت و بصیرت کا ایک نمونہ بنا کر پیش کیا اور اس کی داستان بار بار دُہرائی۔[۱۲۶] عاد کی عظمت اور ترقی کا زمانہ ۲۲۰۰ ق م سے ۱۷۰۰ ق م تک ہے اور صالحین عاد کا وجود اس کے بعد بھی ابتدائے عہدِ مسیح تک باقی رہا ہے۔[۱۲۷] عاد کی مرکزی آبادی، عرب کے بہترین حصّہ یعنی یمن و حضرموت میں سواحل خلیج فارس سے حدودِ عراق تک پھیلی ہوئی تھی۔[۱۲۸] مرکزِ حکومت ملک یمن ہی تھا لیکن خلیج فارس کے کنارے کنارے وہ عراق تک وسیع تھی۔[۱۲۹] عاد کی سیاسی تاریخ کی دو جولانگاہیں تھیں، ایک بیرونِ عرب اور دوسری اندرونِ عرب۔[۱۳۰] بیرونِ عرب ان کی حکومتیں پہلے مرحلہ میں (۲۰۰۰ تا ۱۹۰۰ ق م) بابل، مصر اور دیگر ممالک میں قائم ہوئیں۔[۱۳۱] اور دوسرے مرحلہ میں حضرموت سواحل خلیج فارس کے طول میں عراق تک عاد ثانیہ، عرب میں حجاز سے حدودِ سینا تک ثمود، یمامہ میں طسم وجدیس اور یمن میں اہلِ معین نے حکومتیں قائم کیں۔[۱۳۲] لیکن ہمیں باوجود کوشش کے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ان کے اقتدار و نظمِ حکومت کی نوعیت کیا تھی۔

عاد کے بعد شہرت اور سیاسی جانشینی ثمود کو حاصل ہوئی۔[۱۳۳] ثمود عرب کے شمالی و مغربی علاقے پر قابض تھے جس کا نام اس زمانے میں وادی القریٰ تھا۔[۱۳۴] ثمود کے ملک کا دار الحکومت حجر تھا۔ یہ شہر اس قدیم راستہ پر واقع ہے جو حجاز سے شام کو جاتا ہے۔ اس قوم کے سیاسی حالات کا علم نہیں ہو سکا ہے لیکن اتنا معلوم ہے کہ یہ شمالی عرب کی ایک زبردست قوم تھی۔ فنِ تعمیر میں عاد کی طرح اس کو بھی کمال حاصل تھا۔ پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بنانا، پتھروں کی عمارات و مقابر تیار کرنا اس قوم کا خاص پیشہ تھا۔ یہ یادگاریں اب تک باقی ہیں۔ ان پر آرامی و ثمودی خط میں کتبے منقوش ہیں لیکن ان میں سے اکثر آرامی کتابت نبطی اقوام کی ہے جنھوں نے قبل مسیح و بعد اسی مقام پر حکومت قائم کی تھی۔[۱۳۵] ان کا زمانہ تقریباً ۱۸۰۰ ق م تا ۱۶۰۰ ق م تک ہے۔[۱۳۶] اس قوم کی اصلاح و تعلیم کے لیے حضرت صالح کو مبعوث کیا گیا تھا۔[۱۳۷] ثمود اولیٰ کے جانشین اہلِ مدین ہوئے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۹۰۰ یا ۱۰۰۰ ق م میں اہلِ مدین جب بنی اسرائیل کے ہاتھ سے کلیتاً برباد ہو گئے تو ثمود ثانیہ نے پھر ایک بار سنبھالا لیا اور یہ وہی زمانہ ہے جس میں شاہ اشور نے شمالی عرب پر حملہ کر کے ثمود سے ۷۰۰ ق م میں خراج وصول کیا اس کے بعد ظہورِ مسیح سے پہلے انباط نے ثمود کو فتح کر لیا اس کے بعد جب رومیوں نے انباط پر حملہ کیا تو ثمود دشمنوں کے ساتھ ہو گئے اور اس خصوصیت سے تاریخ روم میں ثمود کا ذکر آیا۔ اسلام جب آیا تو ثمود کا نام و نشان نہ تھا۔ یہاں قبائل جہینہ، وبلی اور یہود اس وقت آباد تھے۔[۱۳۸] اب جہاں تک دوسری قدیم ترین حکومتوں مثلاً معینی[۱۳۹]، سبائی[۱۴۰]، حمیری[۱۴۱] وغیرہ کا تعلق ہے جن کا غلبہ او روجود ایک عرصہ تک قائم رہا تو ان کی تفصیلات کا جاننا اس وقت طوالت کا باعث اور غیر ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ عرب کے سلسلہ میں ان قدیم تاریخی صداقتوں کا ذکر ہم نے اس لیے کیا ہے کہ کچھ باتیں بطور مقدمہ معلوم کر لی جائیں۔ یعنی:

(الف) عرب کا علاقہ ازمنۂ قدیم سے تہذیب و ثقافت کا گوارہ رہا ہے اور اپنے ثقافتی اثرات اس نے دنیا کے دوسرے

حقوں تک منتقل کیے ہیں۔

(ب) اہلِ عرب ابتدائے عہدِ تاریخ سے تمدن وحضارت اور حکومت وسلطنت سے واقف رہے ہیں اور ان میں سیاست کا واضح تصوّر اور شعور موجود رہا ہے اور شاید اسی لیے مارگولیتھ کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ :

"کتبات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عرب میں منظم ریاستوں کا ایک سلسلہ نا معلوم زمانے سے چلا آرہا ہے۔"[۱۴۲] مزید برآں وہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس علاقے سے "ایک منظم سیاسی تنظیم کی یادیں وابستہ ہیں جو اپنی روایات ورسوم رکھتی ہیں اور جن کے پیچھے ایک تاریخ موجود ہے۔"[۱۴۳]

(ج) عرب میں اگرچہ ریاستوں کا وجود قدیم ہے لیکن کسی زمانے میں بھی کوئی ایک ہمہ گیر، ملک گیر اور متحدہ ریاست عرب میں قائم نہیں ہو سکی (دنیا کے دُوسرے بہت سے علاقوں کی طرح مثلاً یونان) اور نہ کبھی پُورا عرب ایک پرچم تلے جمع ہوا۔ بہرصورت رفتہ رفتہ تمام قدیم حکومتیں تباہ و برباد ہو گئیں۔ البتہ ظہورِ اسلام سے کچھ پہلے، چند حکومتیں کسی نہ کسی شکل میں باقی تھیں۔ مثلاً :

(۱) حیرہ وعراق میں آلِ منذر (لخمیوں) کی موروثی حکومت تھی[۱۴۴] جو سلطنت فارس کے ماتحت تھی اور عرب وایران کے درمیان ایک طفیلی ریاست (BUFFER STATE) کی حیثیت سے قائم تھی۔ آلِ منذر نے ساسانی دور میں بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی تہ اسی کے توسط سے ساسانی خاندان نے عربوں پر اپنی برتری ثابت کی اور اسی کے ذریعہ شام کے وسیع وشاداب علاقوں کو بار بار روندا۔ ساسانی خاندان سرحدی امور میں ان ہی پر تکیہ کرتا تھا۔ خصوصیت سے منذر اوّل اور منذر ثالث کے دور میں تو ساسانی خاندان نے لخمیوں کی ناز برداری بھی کی۔ انھیں بڑے بڑے انعامات سے نوازا اور ان کی فوجوں سے شام کی تباہی وبربادی میں کام لیا۔ اسی خاندان کے حکمران عمرو بن المنذر کے دورِ حکومت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت ہوئی جبکہ اس کی حکومت کے ۸ سال، ۸ ماہ گزر چکے تھے۔[۱۴۵] بروایت ابن خلدون اس کا جانشین شقیقہ قابوس اور اس کا جانشین منذر رہا اور اس کے بعد نعمان بن منذر برسرِ اقتدار آیا۔[۱۴۶] نعمان کی کل مدّتِ حکومت ۲۲ سال ہے یعنی ۸ سال ہرمز کے زمانہ میں اور ۱۴ سال کسریٰ پرویز کے زمانہ میں۔ کسریٰ پرویز نے نعمان کو قتل کیا اور لخمی خاندان کا اقتدار ختم کیا۔ اور حیرہ اور اس کے ساتھ اس سارے علاقہ کو جہاں تک لخمی خاندان کی ردائے اقتدار پھیلی ہوئی تھی براہِ راست اپنے تسلّط میں لے لیا۔ گویا نعمان ملوکِ حیرہ کا آخری بادشاہ اور خاندان لخم کا آخری تاجدار تھا۔[۱۴۷] اس کے بعد کسریٰ نے ایاس بن قبیصہ الطائی[۱۴۸] کو وہاں کا حاکم بنایا اور یُوں حیرہ کی ریاست مرزبانانِ فارس کے قبضہ میں چلی گئی[۱۴۹] یہاں تک کہ مسلمانوں نے حیرہ کو فتح کیا۔[۱۵۰]

(۲) عرب کے شمال میں شام کی سرحد پر آلِ غسّان (بنو جفنہ) کی حکومت قائم تھی اور مدتِ دراز سے چلی آرہی تھی اور جیسا کہ مشہور ہے کہ یہ ریاست انتداب روم کے ماتحت تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ قیصرِ روم نے اس اندیشہ سے کہ مبادا غسّانی اہلِ فارس کی مدد کردیں، ان کے سردار ثعلبہ بن عمرو اور اس کے بھائی جذع بن عمرو کو بلایا اور ان سے اس بات پر معاہدہ کر لیا کہ اگر کوئی عرب قبیلہ غسّان پر حملہ کرے گا تو قیصر ۴۰ ہزار رومی فوج

کے ساتھ ان کی مدد کرے گا۔" اور اگر کوئی دشمن قیصرِ روم پر حملہ آور ہوگا تو غسانی ۲۰ ہزار سپاہ کے ساتھ اس کی مدد کو پہنچیں گے۔[151] چنانچہ اس معاہدہ سے غسانیوں کی حکومت مضبوط و مستحکم ہوگئی اور ایک حکمران سے دوسرے حکمران کو ورثہ میں ملتی رہی۔[152] ہمارے خیال میں ابن خلدون کا یہ بیان اس کی نوعیت کو اور واضح کر دیتا ہے کہ ملوک غسان کی کل تعداد ۳۲ اور ان کی مدتِ حکومت تقریباً ۶۰۰ سال ہے۔[153] ان کا مرکزِ حکومت بصری تھا۔[154] غسانسہ کے ایک حاکم "حارث بن ابی شمر" کے عہدِ حکومت میں بعثتِ نبویؐ ہوئی۔ یہ نعمان بن منذر حاکمِ حیرہ کا ہم عصر تھا۔ ان دونوں میں کشمکش ہوتی رہتی تھی۔ غسانسہ کا آخری فرمانروا جبلہ بن ایہم تھا۔[155]

آلِ غسان کی تاریخ تمام تر ایران و روم کی تاریخ کا خلاصہ ہے اور اسی تعلق سے غسان ہمیشہ حیرہ کے بادشاہوں سے لڑتے رہتے تھے۔ ایرانیوں کے مقابلہ میں رومیوں کو اگر کبھی کامیابی ہوئی تو وہ ہمیشہ غسانیوں کی امداد کا ہی نتیجہ تھی اور خود رومی بھی شکرگزاری کے ساتھ اس نتیجہ کا احساس رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں چھٹی صدی کی ابتدا سے ربع صدی تک (۶۰۱ء تا ۶۲۵ء) مشرق و مغرب میں یا مجوسیت اور عیسائیت میں جو زور آزمائیاں ہوئیں ان سے غسانیوں کی یہ چھوٹی سلطنت بھی مستثنیٰ نہ تھی۔ خسرو پرویز کی اولوالعزمیوں نے پندرہ برس میں دامنِ فرات سے وادیٔ نیل اور ساحل باسفورس تک ہر جگہ خاک اڑا دی تھی پھر شام میں رومیوں کی شکست نے غسانیوں کی بساط الٹ دی۔ رومی اپنی شہنشاہی کا تمام مشرقی حصہ کھو چکے تھے۔ آرمینیہ، شام، مصر، ایشیائے کوچک ہر جگہ صلیبی علم کے بجائے درفش کاویانی لہرا رہا تھا۔ ایرانی قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے ہوئے پڑے تھے۔ ہرقل، قیصرِ روم قسطنطنیہ سے فرار کا سامان کر چکا تھا کہ دفعۃً ہوا کا رخ بدل گیا[156] اور کچھ ہی عرصہ میں قرآن کی یہ پیشگوئی پوری ہوگئی کہ:

الٓمّٓ غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین۔[157]

(الٓم۔ رومی قریب کے ملک میں مغلوب ہوگئے وہ مغلوبی کے بعد عنقریب چند سالوں کے اندر غلبہ پالیں گے)

اور پھر یہی ہوا کہ رومیوں نے ایک ایک کر کے اپنے تمام علاقے واپس لے لیے۔

بہرحال بعثتِ نبویؐ تک کا یہ مختصر سا تاریخی جائزہ ہماری اس بات کی تصدیق کرنے کے لیے کافی ہے کہ غسانیوں کی حکومت رومیوں کے زیرِ سایہ تھی اور ان ہی کے مفاد کا تحفظ اس کا مقصدِ اولیں تھا۔ آلِ غسان کی تاریخ میں ایک اور اہم بات یہ نظر آتی ہے کہ رومی نہ صرف یہ کہ ان کے بادشاہوں کو نامزد یا مقرر کر دیتے تھے بلکہ ان تاجداران بالاستقلال کے علاوہ اپنی طرف سے ایسے عامل و حاکم بھی مقرر کرتے تھے جو غالباً خودمختار حیثیت رکھتے تھے ممکن ہے بیک وقت دو قسم کے حکمرانوں کا تقرر کرنے سے ان کا مقصد یہ ہو کہ اگر ایک حکمران رومی مفادات کے تحفظ سے گریز کرے تو مقامی طور پر دوسرے حکمرانوں کے ذریعہ اس کی سرکوبی کر دی جائے۔ چنانچہ "معان" میں بنو فاخرہ (بطن نفاثہ) کی ریاست تھی اور جب ان میں سے ایک شخص فروہ بن عمر بن الفاخرہ حکمران ہوا تو اس کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا نامۂ گرامی بھیجا تھا اس کے جواب میں اس نے اپنے قبولِ اسلام کی اطلاع حضورؐ کو دی اور ایک سفید خچر بھی بطور ہدیہ ارسال کیا۔ قیصر نے یہ سن کر

حارث بن ابی شمر غسانی کو اس کی گرفتاری کے لیے روانہ کیا۔ چنانچہ حارث نے اس کو گرفتار کیا اور فلسطین میں مصلوب کر دیا۔[۱۵۸] اسی طرح ایک اور حاکم ابوجبلہ بن عبداللہ کو بھی رومیوں نے ہی مقرر کیا تھا۔[۱۵۹] یہ وہی ابوجبلہ ہے جس سے مالک بن عجلان نے مدینہ کے یہود کے خلاف مدد مانگی تھی۔[۱۶۰] اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ سرحدی حکومتیں عرب کے اندرونی علاقوں پر اپنے اثرات ڈالنے کے مواقع حاصل کرنے میں غفلت نہیں برتتی تھیں۔

(۳) بنو قضاعہ کی ایک اور حکومت بھی تھی جس کی باگ ڈور کلب بن وبرہ کے ہاتھ میں تھی۔ مگر زمامِ حکومت کبھی کبھی کندہ کی شاخ سکون کے ہاتھ میں چلی جاتی تھی۔ چنانچہ دُومۃ الجندل اور تبوک کے مقامات، بنوکلب کے قبضہ میں تھے اور وہ نصرانیت اختیار کر چکے تھے۔ ظہورِ اسلام میں دُومۃ الجندل کا حکمران اکیدر بن عبدالملک بن سکون تھا۔ یہ کندی تھا اور ان حکمرانوں کی ذریت میں سے تھا جن کو ملوک تبابعہ نے بنوکلب کا حاکم مقرر کیا تھا اور اس کو خالد بن ولید گرفتار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے تھے۔[۱۶۱]

(۴) عمان قبیلہ دوس کا وطن اور ان کا جائے قرار تھا۔ ان کے بعد عمان کی حکومت ان کے بھائیوں بنو نصر زہران کی طرف منتقل ہو گئی۔ ظہورِ اسلام سے ذرا پہلے ان کا حکمران مستکبر بن مسعود بن جرار تھا۔ مگر ان میں سے جس نے اسلام کا زمانہ دیکھا وہ جیفر بن الجلندی اور اس کا بھائی عیاذ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کی طرف ایک مراسلہ بھیجا تھا جس پر انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور رسول اللہؐ نے ان کے علاقے پر عمرو بن العاص کو عامل مقرر فرمایا تھا۔[۱۶۲]

(۵) ایک اور قدیم حکومت جو ولادتِ نبویؐ سے کچھ عرصہ پہلے ہی (امرأ القیس کے دورِ حکومت کے بعد) چھٹی صدی عیسوی کے وسط (وفات امرأ القیس ۵۴۰ء) میں پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ "دولت کندہ" تھی۔[۱۶۳] ان کا اصلی وطن تو غالباً یمن کے مشرقی حصہ میں تھا[۱۶۴] اور ابتداءً یہ بنو حمیر کے ساتھ ملک و حکومت میں شریک تھے لیکن بعد میں زمامِ حکومت صرف بنو حمیر کے قبضہ میں آ گئی تو یہ ان کے ماتحت رہے۔[۱۶۵] ملوک یمن ان کے ساتھ رشتہ ناطے کرتے رہے اور ان کو حجاز کے قبائل معد (بن عدنان) کا حاکم مقرر کرتے رہے۔[۱۶۶] پھر جب بنو حمیر کی حکومت منقرض ہو گئی تو عرب بادیہ پر یہی لوگ یکے بعد دیگرے حکمران ہوئے۔[۱۶۷] دولت کندہ کا آخری حکمران امرأ القیس تھا۔ یہ اپنے باپ حجر بن الحارث (م ۵۵۰ء) کا بدلہ لینے اور امداد حاصل کرنے کے لیے قیصر روم کے پاس بھی پہنچا مگر اسی نے امرأ القیس کی زندگی کا چراغ بھی گُل کرا دیا اور یوں دولت کندہ منقرض ہو گئی۔ شاہانِ کندہ کے بعد حکومت بنو جبلہ بن عدی بن ربیعہ کی طرف منتقل ہو گئی۔ اس خاندان میں سے قیس بن معدیکرب نے خاص شہرت حاصل کی۔[۱۶۸]

(۶) حضرموت میں، خاندان حضرموت کے یہاں حکومت و ریاست عہد اسلام تک قائم رہی۔ ان میں سے ہی وائل بن حجر ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرفِ ملاقات نصیب ہوا۔[۱۶۹] جب وائل ۱۰ھ میں بنو کندہ کے وفد کے ساتھ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو رسول اللہؐ نے وائل کو حضرموت کی حکومت کا فرمان عطا فرمایا تھا۔[۱۷۰]

(۷) یمن کی تاریخ انتہائی طویل اور قدیم ہے۔ مختصر یہ کہ یہ علاقہ بڑی بڑی تہذیبوں کا گہوارہ اور حکومت و سیاست کا مدت مدید تک مرکز رہا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف سلطنتیں یہاں قائم ہوئیں۔ چنانچہ پہلے مرحلہ میں دولت معینیہ قائم ہوئی (جو

اصلاً بابل سے تعلق رکھتی تھی مگر دولت حورابی کے بعد ہجرت کے نتیجہ میں قائم ہوئی۔[۱۶۱] دوسرے مرحلہ میں دولت سبائیہ آتی ہے جس کا حقیقی دور ۸۵۰ ق م تا ۱۱۵ ق م ہے اور تیسرے مرحلہ میں دولتِ حمیریہ کا قیام ہوا اور جس کی مدتِ حکومت ۱۱۵ ق م سے ۵۲۵ء تک ہے۔

آخری سلطنت حمیر کے بھی دو حصے کیے جا سکتے ہیں:

(الف) پہلی صدی قبل مسیح سے تیسری صدی عیسوی کے اواخر تک حمیر کا طبقہ اول یا سبا کا طبقہ ثالث فرمانروائی کرتا رہا۔[۱۶۲] اس حصہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس دور کے سلاطین کا لقب "ملک سبأ و ذوریدان" ہے نیز اس زمانے میں حمیر کا رقبہ حکومتِ یمن تک محدود تھا۔[۱۶۳] اس مدت میں یہاں عموماً کواکب پرستی رائج تھی۔[۱۶۴] معاصر حکومتوں میں ایک طرف حبش تھا تو دوسری طرف مصر و شام پر رومی اقتدار کا سکہ رواں تھا اور تیسری طرف ساسانی فارس میں حکومت کر رہے تھے۔

(ب) دوسرا دور تیسری صدی عیسوی کے اواخر سے ۵۲۵ء تک جاری رہا۔[۱۶۵] لیکن اس دوران تقریباً ۳۴۰ء سے ۳۷۸ء تک اکسومیوں کی عارضی حکومت قائم رہی اور پھر ۵۲۵ء میں انھوں نے ہی دوبارہ حملہ کر کے سلطنت حمیر کا خاتمہ کر دیا اور اس طرح یمن و حضرموت پر ان کی حقیقی حکومت قائم ہوگئی۔[۱۶۶] چنانچہ اس دور میں سلاطین کا لقب "ملک سبأ و ذوریدان و حضرموت" ہوگیا۔[۱۶۷] کیونکہ اس دور میں رقبۂ حکومت حضرموت تک ممتد ہوگیا تھا۔ نیز اسی دور میں سلاطینِ حمیر میں سے بعض عیسائی اور اکثر یہودی المذہب تھے۔[۱۶۸] ان سلاطین یعنی "ملک سبأ، ذوریدان و حضرموت" کو عرب مورخین "تبع" کہتے ہیں اور اسی کی جمع تبابعہ ہے۔ حبشی زبان میں اس کے معنی قادر و جبار اور صاحبِ قوت کے ہیں۔[۱۶۹]

بہر حال حمیر کا آخری بادشاہ[۱۷۰] "ذو نواس" تھا۔[۱۷۱] اس کے دور کا خاص واقعہ یہ ہے کہ وہ یہودیت کے تعصب میں دیوانہ ہوگیا اور نجران کا محاصرہ کر کے شہر فتح کیا۔ بعد ازاں بڑے بڑے گڑھوں میں آگ دہکائی اور ایک ایک کر کے عیسائیوں کو بلوایا جس نے بھی یہودیت کو قبول کرنے سے انکار کیا اس کو نذرِ آتش کر دیا۔[۱۷۲] قرآن میں "اصحاب الاخدود" کے نام سے اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔[۱۷۳] ذو نواس کی اس ظالمانہ حرکت نے اطراف کے تمام عیسائیوں کو بھڑکا دیا۔ چنانچہ دوس بن ثعلبان نامی یمن کے ایک عیسائی امیر نے نجاشی کے یہاں فریاد کی۔[۱۷۴] نجاشی نے قیصر روم کے اشارہ سے یمن پر فوج کشی کی اور بالآخر ۵۲۵ء میں یمن کو فتح کر لیا۔

یمن کے فاتح اور پہلے حبشی حکمران کا نام مسلمان مورخین کے نزدیک "اریاط" ہے۔[۱۷۵] اریاط کے خلاف "ابرہہ" نے قیادت کی اور اسے قتل کر کے خود اقتدار سنبھال لیا۔[۱۷۶] ابرہہ کے دورِ حکومت کا سب سے بڑا اور عظیم الشان واقعہ یہ ہے کہ اس نے ہاتھیوں کی ایک بڑی فوج (اصحاب الفیل)[۱۷۷] کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کی اور خانہ کعبہ کو منہدم کرنا چاہا۔[۱۷۸] مگر منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی اسے خائب و خاسر اور ناکام لوٹنا پڑا۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اسی واقعہ کے کوئی چالیس روز بعد ۵۶۹ء میں پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ ہوئی۔[۱۷۹]

ابرہہ کا جانشین اس کا بیٹا یکسوم اور پھر اس کا جانشین مسروق ہوا۔[۱۸۰] اس دوران حالات خراب ہوئے اور اہلِ یمن

تکالیف و مصیبت میں گرفتار ہوئے تو ایک شخص جس کا نام سیف بن ذی یزن حمیری اور کنیت ابو مرۃ تھی۔ اپنی قوم کی طرف سے بادشاہ روم کے پاس فریادی ہوا اور حبشی حکمرانوں کی شکایت کی۔ مگر وہاں سے اسے مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ تو پھر نعمان بن منذر عامل حیرہ کے توسط سے کسریٰ تک رسائی حاصل کی اور اس سے امداد کا خواہاں ہوا۔[191] کسریٰ نے غور و خوض اور مشاورت کے بعد مدد کا وعدہ کیا اور "وھرز" کی سرکردگی میں ایک لشکر یمن روانہ کر دیا جس نے مسروق کو قتل کر کے سیف بن ذی یزن کو حکمران کر دیا[192] اور یمن کا علاقہ انتداب فارس کا امین بن گیا۔[193] سیف کے بعد کچھ عرصہ وھرز نے حکومت کی، پھر مرزبان مقرر ہونے لگے، چنانچہ بالترتیب ابن وھرز، تیغجان بن مرزبان اور باذان کسریٰ کی طرف سے ہی برسر اقتدار آئے تھے۔ باذان آخری گورنر ثابت ہوا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت یہی باذان یمن کا گورنر تھا[195] اور یہ حضورؐ کی صداقت سے متاثر ہو کر اسلام لے آیا تھا۔ اپنے اسلام کی اطلاع باذان نے حضورؐ کو دی تو آپؐ نے فرمایا:

انتم منا و الینا اھل البیت۔[196]

(اب تم میری طرف منسوب ہو اور میرے اہلِ بیت ہو)

اب جہاں تک اہلِ یمن کے اجتماعی و سیاسی نظام کا تعلق ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ریاست و مملکت "قصور" و "محافد"[197] کے مجموعہ کا نام تھا۔ ہر قصر اور محفد کا ایک الگ مالک یا شیخ یا امیر ہوتا تھا۔ ہر محفد میں ایک ہیکل یا معبود کا ہونا بھی ضروری تھا کیونکہ اس علاقے یا قصر کی نسبت اس کے مالک یا اس کے معبود کی طرف ہی کی جاتی تھی۔

سربراہِ ریاست "بادشاہ" (ملک) تھا[198] جس کا حکم مطلق تھا، حکومت موروثی تھی، جو اس کے لڑکوں اور بھائیوں وغیرہ میں منتقل ہوتی چلی جاتی تھی[199] (سوائے حضر موت کے جہاں حکومت اشراف (اوّل مولود) کی طرف منتقل ہوتی تھی)۔ بادشاہوں کے القاب و آداب مختلف ہوتے تھے۔[200]

اہلِ یمن نے ایسا سکہ بھی جاری کیا تھا جس پر بادشاہ کی صورت نقش ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا نام اور دار الضرب کا نام بھی کندہ ہوتا تھا۔ مختلف سیاسی و مذہبی اشکال و حروف اور رموز و اشارات بھی کندہ کرائے جاتے تھے۔[201]

یمنی معاشرہ چار عناصر سے مرکب تھا:

۱۔ فوجی

۲۔ کسان

۳۔ صناع اور کاریگر اور

۴۔ تجار۔

ان میں سے ہر ایک طبقہ کے حقوق و فرائض اور حدود متعین تھے جن سے کوئی تجاوز نہیں کر سکتا تھا۔[202] بنیادی طور پر اہلِ یمن تجارت میں خصوصیت و شہرت عام رکھتے تھے۔ ان کی درآمد و برآمد کا سلسلہ برسہا برس سے قائم تھا اور تجارتی تعلقات اس وقت کی معلوم دنیا کے تمام حصوں سے برّی اور بحری دونوں طرح سے استوار تھے۔[203] اہلِ یمن تمدن و معاشرت اور حضارت ہر معاملہ میں عرب کے

دوسرے تمام حصوں سے بہت آگے تھے وہ محلات، مکانات، قلعے، محافد اور ہیکل کے مالک تھے۔ ریشم اور حریر و دیبا کے قیمتی ملبوسات اور میوہ جات، مرغن غذائیں اور سونے چاندی کے بیشمار اقسام کے ظروف استعمال کرنا ان کے لیے غیر معمولی بات نہ تھی کہ وہ محض محاورتاً نہیں بلکہ واقعتاً سونے چاندی اور زر و جواہرات سے کھیلنے والے لوگ تھے۔"[۲۰۴]

اس تفصیل کے ساتھ ہی ہماری وہ بحث مکمل ہو جاتی ہے جو عرب کا سیاسی جائزہ لیتے وقت ابتدا میں کی گئی تھی۔ یعنی پہلے درجہ میں ملوکیت اور بادشاہی کا رواج عرب کے متعدد علاقوں میں بہت مدت سے چلا آ رہا تھا اور ظہورِ اسلام کے وقت بھی یہ بادشاہتیں اور حکومتیں کسی نہ کسی شکل میں موجود تھیں۔ یمن کے سلسلے میں ہم یہ بیان بھی کر چکے ہیں کہ ملوک بالاستقلال کے علاوہ ازواء اور اقیال کی خودمختار حکومتیں بھی قایم تھیں۔

بہرحال اب دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان بادشاہتوں اور حکومتوں کے علاوہ دوسرے درجہ میں اعیانیت بھی عرب کے مختلف حصوں میں مکمل یا نامکمل صورت میں موجود تھی۔ یعنی وہ رؤسائے قبائل جو اپنے اپنے قبیلوں کے امیر مانے جاتے تھے اور انہوں نے کہیں کہیں کسی حد تک خودمختار اور آزاد چھوٹی چھوٹی شہری مملکتیں قائم کر رکھی تھیں۔ چنانچہ " مکہ، مدینہ، ینبوع، جرش، عدن، صحار، دبی، یمامہ، دومۃ الجندل، فدک، ایلہ اور مشرقی ساحل پر اچھی خاصی بستیاں تھیں جو کم و بیش شہری مملکتیں کہی جا سکتی ہیں۔" (۲۰۵)

مگر ان میں سب سے زیادہ مشہور و معروف، اہم اور منظم ترین مکہ کی شہری مملکت (CITY STATE) تھی۔[۲۰۶] جسے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ امجد قصی بن کلاب نے مکہ پر قبضہ کر کے ۴۴۰ء میں قائم کیا تھا۔[۲۰۷] قصی بہت ہی جلد ایک مقبول حکمران بن گئے تھے حتیٰ کہ ابنِ سعد کے الفاظ میں "جس طرح مذہب کی پیروی کی جاتی ہے اہلِ مکہ اسی طرح قصی کے حکم کی پیروی کرتے تھے اور زندگی تو زندگی مر جانے کے بعد بھی ان کے حکم پر عمل ہوتا تھا۔"[۲۰۸] قصی نے مملکت کے نظم و نسق کو بہترین حالت میں رکھنے کے لیے مختلف محکموں کو قایم کیا۔ پھر قصی کے بعد امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہوتا رہا[۲۰۹] بہرحال مجموعی طور پر اگر ان عہدوں کی فہرست مرتب کی جائے[۲۱۰] تو مندرجہ ذیل عہدوں کا پتا چلتا ہے:

۱ - حجابہ (خانہ کعبہ کی دربانی)
۲ - سقایہ (حاجیوں کو پانی پلانا)
۳ - رفادہ (حاجیوں کے لیے کھانے کا انتظام اور مالی بندوبست)
۴ - لواء (جھنڈا - جنگی عہدہ)
۵ - ندوہ (اجتماع گاہ - مشورت گاہ)
۶ - مشورہ (امورِ مہمہ میں مشورہ)
۷ - قیادہ (جنگ میں لشکر کی قیادت)
۸ - قبہ (شامیانہ - فوجی معسکر کا انتظام)

۹ - اعنہ (گھوڑے کی لگام۔ سواروں کے رسالے کی سپہ سالاری)
۱۰ - اموال المحجرہ (بتوں کے چڑھاوے، نذرانے اور جائداد کا انتظام)
۱۱ - ایسار و ازلام (بتوں سے استخارہ)
۱۲ - اشناق (خون بہا، جرمانے اور مالی تاوان، دیت وغیرہ کا انتظام)
۱۳ - حکومتہ (مقدمات کا فیصلہ وغیرہ)
۱۴ - سفارہ (سفارت)
۱۵ - عقاب (جھنڈا۔ جنگ کے وقت نشان قومی کی علمبرداری)
۱۶ - سدانہ (کعبہ کی دربانی، کلید برداری اور رکھوالی)
۱۸ - افاضہ
۱۹ - اجازہ
۲۰ - نسئی (مہینے بدل دینا)
۲۱ - حلوان النفر (بدلے میں دُوسرا فوجی بھیج دینا۔ جنگی عہدہ)

یہ تمام عہدے اگرچہ اپنی ایک اہمیت و حیثیت رکھتے تھے مگر ان سب میں اہم ترین اور قابلِ ذکر "ندوہ" تھا جسے یقیناً قصی نے ہی قائم کیا تھا[۲۱۱] دار الندوہ قریش کا منتدا، محلِ اجتماع سبھی کچھ تھا اور مکہ کی سیاسی و معاشرتی اور تہذیبی و ثقافتی اور معاشی و تجارتی زندگی میں اس نے انتہائی موثر کردار ادا کیا۔ قریش کے تمام معاملات اسی دار الندوہ میں طے پاتے تھے۔ جنگ و صلح، ثقافتی و انتظامی امور اور دیگر پیش آمدہ معاملات میں مشورہ اسی عمارت میں ہوتا تھا۔ حتّٰی کہ نکاح و بلوغ کا اعلان بھی اسی گھر سے ہوتا تھا۔[۲۱۲]

اپنی زندگی میں مذکورہ بالا تمام عہدوں میں ربط و ارتباط اور ہم آہنگی کو قصی نے پوری طرح برقرار رکھا۔ لیکن قصی کی وفات کے بعد ایک اعیانیت قایم ہوگئی[۲۱۳]۔ کیونکہ اپنی وفات کے وقت اس نے اپنے سیاسی فرائض اپنے بیٹوں کو بانٹ دیے تھے اور وہ پھر کسی ایک فرد میں دوبارہ جمع نہ ہو سکے بلکہ منتشر ہی ہوتے چلے گئے[۲۱۴]۔ اور ظہور اسلام تک یہی حال رہا۔ تمام عہدے قریش کی مختلف شاخوں میں تقسیم تھے۔ اس کی وجہ سے مختلف شاخوں کو مختلف دوسری بطون پر سیاسی و مذہبی برتری حاصل تھی۔ خصوصاً تولیتِ کعبہ ایک ایسا معزز عہدہ تھا جس کی وجہ سے حامل عہدہ کی نہ صرف مکّہ بلکہ پُورے عرب میں مذہبی و سیاسی برتری تسلیم کی جاتی تھی۔

بعثت نبویؐ کے وقت مکّہ میں صورت یہ تھی کہ کل چودہ عہدے باقی تھے اور یہ دس مختلف قبائل میں اسی طرح تقسیم تھے کہ سقایہ بمعہ عمارہ بنو ہاشم، رفادہ بنو نوفل، لوائندوہ اور سدانہ بمعہ حجابہ بنو عبد الدار، مشورہ بنو اسد، عقاب بنو امیہ، اموال المحجرہ اور حکومتہ بنو سہم، ایسار و ازلام بنو جمح، اشناق بنو تیم، قبہ اور اعنہ بنو مخزوم اور سفارت کے عہدے

بنو عدی کے پاس تھے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اپنے طور پر ہر قبیلہ اپنے متعلقہ انتظامی شعبہ کا ذمہ دار تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ہر ایک نے انتظامی حسن و کارکردگی کا ثبوت فراہم کر دیا تھا اور ان کی کارکردگی کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہلِ مکہ انتظامِ ریاست کا بڑی حد تک سلیقہ رکھتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خود سری اور آپس کی چپقلش یا عصبیت کی بنا پر ان کے درمیان ارتباط و ہم آہنگی میں کمی تھی اور قبائلی و معاشرتی امتیازات ان کے اتحاد میں مانع تھے۔[۲۱۵]

بہرحال اب ہم تیسرے مرحلہ میں عرب کی ایک تیسری سیاسی اکائی "قبائل" کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ عرب کا سیاسی جائزہ لیا جائے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ وہاں اگرچہ ملوکیت، امیرانیت اور دوسری سیاسی تنظیمات و ادارے موجود تھے لیکن بنیادی طور پر "قبائل" کا نظم ان سب ادارات پر حاوی تھا۔ گویا حکومت سے زیادہ فرد اور قبیلہ کو اہمیت حاصل تھی۔

پورے ملک میں چھوٹے بڑے سیکڑوں قبائل آباد تھے۔ ہر قبیلہ آزاد و خود مختار تھا۔ اس کی بنیاد خون کے رشتوں پر تھی۔ اسی لیے حسب و نسب بہت اہمیت رکھتے تھے۔ ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا جو شیخ کہلاتا تھا۔ سرداری کے لیے باہم رقابت بھی ہو جاتی تھی۔ قبیلہ کی سرداری اور سیاست کے لیے چند شرائط کا ہونا اکثر ضروری سمجھا جاتا تھا۔ مگر کبھی کبھی اس سے گریز بھی کر لیا جاتا تھا۔[۲۱۶] مزید برآں ہر قبیلہ کے نزدیک بعض شرائط و صفات لازمی درجہ رکھتی تھیں تو دوسروں کے نزدیک وہی صفات اضافی حیثیت کی مالک تھیں۔ مثلاً مضر کے نزدیک "صاحب رائے" آدمی کا ہونا ضروری تھا۔ ربیعہ سیادت کے لیے ایسے لوگوں کو پسند کرتے تھے جو لوگوں کو کھانا کھلائے جبکہ اہلِ یمن کے یہاں اصل معیار "حسب و نسب" تھا۔[۲۱۷] لیکن اس بات پر بہرحال سب کا اتفاق تھا کہ ایک شیخ قبیلہ کو خصوصیات و فضائل عرب سے ضرور متصف ہونا چاہیے۔ یعنی سخاوت، شجاعت و بہادری، صبر و استقلال، حلم، تواضع، قادر الکلامی اور قوتِ بیان۔ نیز کبر سنی، عطا و بخشش، عقلمندی، کثرتِ تعداد اور تونگری وغیرہ۔[۲۱۸]

عرب چونکہ جمہوری مذاق رکھتے تھے اس لیے قبیلہ کا سردار اہلِ قبیلہ میں سے منتخب کر لیتے تھے اور جمہوری اصول کے مطابق وہی اس منصب کا اہل ہو سکتا تھا جسے عمر، عزت، اولاد، مال اور قابلیت کے علاوہ عرب کی فطری خصوصیات میں دوسروں پر تفوق حاصل ہو اور جس کے حامی سب سے زیادہ ہوں۔ کبھی کبھی اگر ان ہی خصوصیات کا حامل کسی سردار کا لڑکا ہوتا تو اسے بھی سرداری موروثی طور پر مل جاتی تھی۔

ایک شیخ قبیلہ یا کبیر کو اہلِ قبیلہ پر اختیار حاصل تھا اور وہ امور سیاسی و انتظامی کے علاوہ قانونی معاملات میں بھی مختار تھا۔ وہی قانون بناتا، یا پہلے سے بنے ہوئے قوانین یا شریعت سے اخذ کر کے ان کا نفاذ کرتا اور قانون کی خلاف کی صورت میں جرمانہ اور سزا (مثلاً مکوں یا سلاخ کی ضربیں) بھی دے سکتا تھا۔[۲۱۹] سرداروں کو قبیلہ میں حقوق کے اعتبار سے کوئی خاص امتیاز حاصل نہ تھا لیکن اس کے برعکس ان کے فرائض سب سے زیادہ تھے ان کا سب سے بڑا فریضہ قبیلہ میں اتحاد و یکجہتی کا قائم رکھنا تھا۔ قبیلہ کے معاملات اجتماعی طور پر باہم مشاورت کے ذریعہ بھی طے کئے جاتے تھے۔[۲۲۰]

ہر قبیلہ میں ہر دس آدمیوں پر ایک عریف اور ہر ایک سو پر ایک قائد یا نقیب ہوتا تھا۔ قبیلہ میں بطن، فخذ

شعب وغیرہ کی شاخ در شاخ تنظیم و تقسیم پائی جاتی تھی۔[۲۲۱] موالی بنانے اور قبائل کو حلیف بنانے کا طریقہ رائج تھا۔ کسی قبیلہ کے خلاف کوئی بیرونی حاکم اصولی طور پر کسی طرح کا اختیارِ سماعت نہ رکھتا تھا۔ بعض قوی قبیلے کمزور قبیلوں کو زیر کر کے ان سے خراج وصول کرتے تھے۔ قبائل پر بیرونی اثرات بھی ہوتے تھے۔ مگر ایک بہترین قبیلہ بیرونی اثر سے بالکل آزاد ہوتا تھا۔

شہروں میں جتنے محلّے یعنی قبائلی آبادیاں تھیں اتنی ہی مجالس محلہ بھی تھیں، جن کو "نادی" کہا جاتا تھا۔ ان نادیوں یا قبائل کی مجلس محلہ میں ہی اجنبیوں کو معاہدے کے ذریعہ مولا یعنی فردِ خاندان بنانے کی رسم ادا کی جاتی تھی اور کسی فرد یا خاندان سے طرد و خلع وغیرہ کرنے کا اعلان بھی وہیں سے کیا جاتا تھا۔ شبانہ قصہ گوئی، انتظامی تجارتی معاملات، کاروانوں کی آمد و رفت وغیرہ قبائلی نادیوں سے ہوتی تھی۔[۲۲۲] علاوہ ازیں ہر قبیلہ میں چند مناصب یا کچھ اہم اور ذمہ دار اشخاص بھی ہوتے تھے۔[۲۲۳] مثلاً:

۱۔ نقیب: جسے منادی یا موذن کہتے تھے۔ جس کا کام یہ ہوتا تھا کہ مجالس کے انعقاد کا ڈھنڈورا پیٹے۔ اس کے علاوہ ہر قبیلہ کے سردار کے پاس اپنے خصوصی منادی بھی ہوا کرتے تھے کسی تقریب یا دعوت کا بلاوا یا کسی خاندان یا فرد کے طرد و خلع کی اطلاع دُوسرے محلّوں کو کرنا بھی ان ہی سے متعلق تھا۔[۲۲۴]

۲۔ عریف: قبیلے اور محلّے کا منتظم۔ تمام امور کا انتظام اسی کے ذمہ ہوتا تھا۔ اہم لوگوں کے حالات اسی سے دریافت کئے جاتے تھے۔[۲۲۵]

۳۔ رائد: عرب کے ہر قبیلے کا ایک رائد ہوتا تھا جسے زمینوں اور پانیوں وغیرہ کے حالات سے تجربہ و واقفیت ہوتی تھی۔ وہی پانی اور گھاس کی تلاش میں اپنی قوم سے پہلے جاتا تھا تاکہ اس کی قوم وہاں پہنچ کر اطمینان سے اتر سکے۔[۲۲۶]

۴۔ شاعر: عربوں کے یہاں ایک رسم یہ بھی تھی کہ جب ان کے کسی قبیلے میں شاعر کا ظہور ہوتا تو دیگر قبائل آکر مبارکباد دیتے پھر دعوت ہوتی اور مجلس رقص و سرور جمتی، گویا شادی کی تقریب ہے پھر ایک دوسرے کو مبارک سلامت کہتے اور بشارت دیتے تھے کیونکہ شاعر:

(الف) ان کی عزتوں کا بچانے والا۔

(ب) ان کے حسب و نسب کا دفاع کرنے والا۔

(ج) ان کے کارناموں کو ہمیشگی اور دوام بخشنے والا۔ اور

(د) ان کی شہرت کو بلند کرنے والا ہوتا تھا۔

نیز یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عرب صرف تین مواقع پر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے ایک لڑکے کی پیدائش پر، دُوسرے گھوڑے کے بچہ جننے پر اور تیسرے شاعر کے ظاہر ہونے پر۔[۲۲۷]

۵۔ خطیب: ہر قبیلے میں ہوتا تھا۔[۲۲۸]

۶۔ نساب: کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جس میں کوئی ایسا نسب دان نہ ہو جو فرع کو اصل سے ملا دے اور ایسے لوگوں کو باہر نہ نکال دے جو قبیلے میں سے نہ ہوں۔[۲۲۹]

۷۔ منصف یا حاکم : ہر قبیلے کا ایک منصف ہوتا تھا جس کے پاس وُہ اپنے مقدمات لے کر جاتے تھے۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔[۲۳۰] بعض اوقات منصف کو مقبولیت حاصل ہو جاتی تھی اور اپنی قابلیت و اہلیت کی بناپر وہ دُوسروں کے لیے بھی واجب التسلیم بن جاتا تھا۔ اور ان پر بھی اس کا حکم نافذ ہوتا تھا۔ مشہور حکام میں اکثم بن صیفی بن رباح (بنی تمیم)، حاجب بن زرارہ، اقرع بن حابس، ربیعہ بن مخاشن، ضمرہ بن ضمرہ (بنی تمیم)، عامر بن الظرب العدوانی (قیس)، غیلان بن سلمہ ثقفی (قیس) اور ابو طالب بن عبدالمطلب (قریش) وغیرہ شامل ہیں۔[۲۳۱] اور دلچسپ بات یہ ہے کہ منصف و حاکم کے منصب پر نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی متمکن تھیں چنانچہ حکیمات العرب میں سے ہند بنت الخس الایادی، خمعہ بنت حابس الایادی، صحر بنت لقمان، خصیلہ بنت عامر بن الظرب العدوانی اور حذام بنت الریان مشہور ہیں۔[۲۳۲] لیکن تعجب خیز امر یہ ہے کہ عرب میں بے شمار منصف اور حاکم . . . . ہونے کے باوجود وہاں کے معاشرہ میں عدل قائم نہیں ہو سکا۔ بلکہ دنیا کے دوسرے تمام معاشروں کی طرح ظلم و عدوان کا پرچم وہاں بھی انتہائی بلندی پر لہراتا رہا۔ علاوہ ازیں قاتل یا مجرم کو بجائے اس کے کہ کوئی ریاست یا قوتِ قاہرہ مناسب سزا دیتی، ثار و انتقام کے ذریعہ عداوت و نفرت کی آگ اور ظلم و تعدّی کے سلسلے کو اور دراز کر دیا جاتا تھا۔

اب آخر میں اہلِ عرب کے ایک ایسے ادارہ کا سیاسی پہلو بھی دیکھ لینا چاہیے جو بنیادی طور پر معاشی و اقتصادی مقاصد رکھتا تھا یعنی وہ مجامع، بازار اور میلے جو عرب کے مختلف حصّوں میں سال بھر تک جاری و ساری رہتے تھے۔ بڑے بڑے بازار (اسواق) عرب کے تیرہ مقامات (یعنی دومۃ الجندل، مشقر، صحار، دبیٰ، شجرہ، عدن، صنعاء، حضرموت، عکاظ، ذوالمجاز، منیٰ، خیبر اور یمامہ) پر لگا کرتے تھے۔[۲۳۳] سیاسی طور پر ان کی اہمیت اس لیے معلوم ہوتی ہے کہ یہی وہ مواقع تھے کہ جہاں ایک ہی وقت میں بہت سے قبائل جمع ہوتے تھے۔ آپس کے معاملات کو طے کرتے، باہمی خون کے مقدمات، سرداروں کے اختلافات، مقدمات کے فیصلے وغیرہ کو شہرت یہیں حاصل ہوتی تھی۔ اس اعتبار سے ان مجامع کو ایک قسم کی بین القبائلی عدالت (INTER-TRIBAL COURT) کا نام دیا جا سکتا ہے۔

ان اسواق و مجامع میں سب سے زیادہ اہم اور ایامِ جاہلیت کا سب سے بڑا بازار "عکاظ" تھا۔ یہاں قریش، ہوازن، غطفان، خزاعہ، حارث، ابن عبد مناف، عضل، مصطلق وغیرہ جمع ہوتے تھے۔[۲۳۴] اس میں حسب تذکرہ امور کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا تھا مثلاً "اس بازار کو اہلِ عرب کی لیاقت کی امتحان گاہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو شخص جس فن میں قابل ہوتا تسلیم کر لیا جاتا اور پھر اس کے ذریعہ تمام ملک میں اس کی شہرت ہو جاتی تھی۔" شعرا اپنے قصائد یہیں سناتے تھے، خطبا تقریریں کرتے تھے، حکام اپنے فیصلے سناتے تھے اور شیوخ معاہدہ کی دفعات طے کرتے تھے۔[۲۳۵] ان بازاروں کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ ان بازاروں نے پُورے عرب میں جغرافیائی اور معاشی مشکلات کے باوجود نہ صرف یہ کہ ایک معاشی وفاق قائم کر دیا تھا بلکہ اس وفاق کی بدولت آئندہ کے لیے سیاسی وفاق کی راہ بھی ہموار کر دی۔

مجموعی طور پر عرب کی پُوری آبادی بدوی اور حضری میں منقسم تھی۔ شہروں میں رہنے والوں کو حضری اور صحراؤں میں بسنے والوں کو خانہ بدوش یا بدوی کہا جاتا تھا اور مستقل سیاسی زندگی اور سیاسی طور پر اہمیت فی الواقعہ حضری آبادی کو ہی حاصل تھی۔ بعض اوقات یہ دلچسپ صورتِ حال بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک ہی قبیلے میں بیک وقت بدوی اور حضری آبادی پائی جاتی تھی۔ یعنی قبیلہ کے کچھ لوگ تو خانہ بدوشانہ یا بدویانہ زندگی گزارتے تھے تو کچھ بستیوں میں مستقل قیام کر کے حضری زندگی گزارتے تھے۔[۲۳۶]

حضری باشندوں کا ایک مستقل مقام اور مسکن تھا اور چونکہ عرب کے مختلف حصے تہذیب و تمدن کے لحاظ سے مختلف تھے اس لیے ان کے شہری رواج و رسوم اور عادات و اطوار میں بھی اختلاف پایا جاتا تھا۔ صنعت و حرفت، تجارت و زراعت، نظم و حکومت اور ریاست و مملکت کے مراکز "حضری آبادی" میں ہی پائے جاتے تھے۔

اہلِ عرب میں سے بڑی تعداد بدویانہ طریقِ زندگی کو اپنائے ہوئے تھی۔ ان کا نہ تو کوئی مسکن تھا نہ مرکز۔ یہ لوگ خیموں میں رہا کرتے تھے اور زیادہ تر ان کے پڑاؤ ریگستان کے کنارے شاداب مقامات پر ہوا کرتے تھے۔[۲۳۷] لیکن یہ سرسبزی و شادابی چونکہ عارضی ہوتی تھی اس لیے ان کا قیام بھی مختصر ہوتا تھا۔ بدویوں کا گزارا اکثر مویشیوں کے گوشت اور دودھ پر تھا نیز ان کی معاش کا ایک ذریعہ لُوٹ مار بھی تھا جس کو وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ ان کی عزیز ترین چیز اونٹ تھی۔ فی الحقیقت اونٹ کے بغیر بدویت کا تصور ہی محال ہے۔ اونٹ ان کا سب کچھ تھا۔[۲۳۸] ایک جگہ جم کر نہ رہنے کی وجہ سے بدوی تجارت، زراعت، صنعت و حرفت اور تمدن و سیاست سے بے نیاز اور بیگانہ تھے بلکہ انھیں ایسے کاموں سے نفرت تھی اور انھیں اپنی آزادی اور حریت کے منافی سمجھتے تھے۔[۲۳۹]

ہمارے خیال میں عرب اور اہلِ عرب کے سیاسی میلانات و رجحانات کا یہ جائزہ ہمارے آئندہ مطالعہ کے لحاظ سے کافی ہے۔ اس جائزہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عرب میں اس وقت نہ تو کوئی منظم اور ہمہ گیر ریاست قائم تھی، نہ ان میں اتحاد، یک جہتی اور قومیت کا تصور تھا بلکہ اس کی جگہ مذہبی، اخلاقی، روحانی اور بالخصوص سیاسی دائرہ میں سخت انتشار و تشتت، افراتفری، لامرکزیت تھی اور نزاج کا دور دورہ تھا۔ اب ہم یہ مطالعہ کریں گے کہ رسول اللہؐ نے اپنے جہد و عمل سے ان حالات کو کس حد تک منقلب کیا اور ان حالات میں کس طرح ایک ریاست کو قائم کر کے اسے نشو و ارتقاء کی بلندیوں سے ہمکنار کیا۔

باب دوم

تاسیس ریاست

(۱) ریاست کی فکری بنیادیں

پچھلے مباحث میں دنیا کے مختلف علاقوں کی صورتِ حال کا عموماً اور عرب کے حالات کا خصوصاً جائزہ لینے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کا زمانہ ایک ایسا پُر آشوب دَور تھا جبکہ عالمِ انسانی کا نظامِ فکر و عمل مجموعی طور پر منتشر اور پراگندہ تھا۔ معاشرہ کی اخلاقی و روحانی قدریں پامال ہو چکی تھیں۔ ہیئت اجتماعیہ کا سیاسی مزاج بگڑ گیا تھا۔ آئین سیاست کی بنیاد عدل و انصاف کے بجائے مطلق العنانی، آمریت، استبداد، ظلم و جبر، فتنہ و فساد اور کُشت و خون پر قایم تھی۔ سلطنت کا تمام تر استحکام طاقت پر تھا اور سیاست کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ مخالف کو تمام اختیارات سے محروم کر دیا جائے۔ مختصر یہ کہ نسل آدم تباہ کن ذہنی و سیاسی خلفشار میں مبتلا تھی اور نقشۂ حیات زیر و زبر ہو چکا تھا۔

دوسری طرف جزیرہ نمائے عرب کا حال تو اور گیا گزرا تھا۔ وہ ایک ایسی سرزمین تھی جہاں نہ تو کوئی مرکزی حکومت تھی اور نہ ہی عرب معاشرہ کسی ایک بالاتر قوت و اختیار سے متعارف تھا۔ وہاں کے بسنے والے بے قید آزادی کے سوا اطاعتُ انقیاد کی روش سے ناواقف تھے۔ اتحاد و یگانگت مفقود اور وحدتِ ملّی پارہ پارہ تھی۔ ہر طرف انتشار اور قبائلی جنگوں کے غیر مختتم سلسلے جاری تھے۔ قبیلہ قبیلہ کے مقابل، طبقہ طبقہ کے مقابل اور فرد فرد کے مقابل کھڑا تھا اور ایک ناقابل علاج انفرادیت اہلِ عرب کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ ان وجوہ سے عرب کو محض ایک جغرافیائی حد سے تعبیر کرنا اور محض ایک انسانی اجتماع کہنا غلط نہیں ہے۔

ان حالات میں یہ توقع بہت مشکل تھی کہ انسانیت کا کوئی ایسا نجات دہندہ بھی آئے گا جو دنیا کو غیر الٰہی حاکمیت، جبر و استبداد، ظلم اور مطلق العنانیت کے حلقہ ہائے تنگ سے آزاد کرے گا اور عرب جیسی سرزمین کے حالات بھی منقلب ہوں گے۔ یعنی ایک نئی زمین و آسمان کی از سرِ نو تخلیق ہوگی۔

مگر تاریخ بتاتی ہے کہ یہ بالکل غیر متوقع واقعہ بالآخر رونما ہوا۔ دنیائے انسانیت کو ماسوائے اللہ ہر قسم کی غلامی سے نجات ملی، امن و صلح، عدل و انصاف کی حکمرانی قائم ہوئی۔ عرب میں بھی انقلاب برپا ہوا اور دنیا نے دیکھا کہ جہاں کبھی کوئی ملک گیر مملکت قایم نہ ہوئی تھی، جہاں نظم و ضبط اور قاعدہ و قانون اجنبی تھے اور جہاں تنظیم اور سیاسی وحدت ناپید تھی، وہاں ایک ملک گیر بلکہ ہمہ گیر ریاست قایم ہوئی۔ پورا عرب ایک پرچم کے سائے میں آیا۔ حکومت، نظم و ضبط، قانون، تنظیم اور سیاسی وحدت قائم ہوئی اور یہ سب کچھ اتنی قلیل مدت میں انجام پذیر ہوا کہ تاریخ عالم میں اس کی کوئی نظیر موجود نہیں ہے۔

عالمِ انسانیت کا یہ عظیم انقلاب اس محسنِ انسانیت کے ہاتھوں برپا ہوا جو نہ صرف ایک انسان بلکہ اللہ کے آخری نبی اور رسول تھے اور جنھوں نے ایک عالمگیر و ہمہ گیر مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

انقلاب کا یہ عمل ظاہر ہے کسی درجہ آسان نہ تھا آپ کے سامنے مشکلات کے ناقابلِ تسخیر پہاڑ تھے۔ آپؐ کو تاریکی میں سے روشنی کو نکالنا تھا، موت میں سے زندگی کو جنم دینا تھا، انتشار میں سے نظم کو پیدا کرنا تھا، ضعف میں سے قوت حاصل کرنا تھی اور اختلافات کو اتحاد سے بدلنا تھا۔ یہ تمام کام اگرچہ بہت مشکل تھے تاہم آپ نے انھیں انجام دیا اور پوری کامیابی کے ساتھ مطلوبہ نتائج حاصل کیے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بدترین ماحول، انتہائی مایوس کن حالات اور بہت ناساز گار فضا میں عظیم ترین انقلاب کا پیغام لے کر یکہ و تنہا اُٹھے اور ایک سوچے سمجھے منصوبے، ایک نقشۂ فکر و عمل، ایک متعین رہنمائی اور ایک ہمہ گیر اصلاح کے پروگرام لے کر آگے بڑھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انقلاب کامل کی بنیاد رنگ، نسل، وطن، زبان، قوم یا پاپائیت و شہنشاہیت وغیرہ جیسے کسی نظام پر رکھنے کے بجائے "دین" پر رکھی[۱]۔ اس دین پر جس کا نام اسلام ہے[۲] اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ دین زندگی کا ایک جزو نہیں بلکہ تمام تر زندگی ہے۔ زندگی کی رُوح اور اس کی قوتِ محرکہ ہے۔ فہم و شعور اور فکر و نظر ہے۔ پُوری زندگی کا ضابطہ ہے۔ دستورِ حیات ہے اور زندگی کے لامتناہی سفر میں دنیا سے لے کر آخرت تک کا راہنما ہے۔ یہ انسان کی پوری زندگی سے بحث کرتا ہے اور جس قدر اللہ اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے اسی قدر انسان اور انسان کے تعلق اور انسان اور کائنات کے تعلق سے بھی کرتا ہے، اسلام کے نزدیک تعلقات کے یہ شعبے الگ اور ایک دوسرے سے بیگانہ نہیں ہیں بلکہ ایک مجموعہ کے مربوط اور مرتّب اجزا ہیں اور ان کی صحیح ترکیب ہی پر انسان کی فلاح کا مدار ہے[۳]۔ یہ دین انسانی زندگی کی تمام مساعی اور فکر و عمل کے تمام شعبوں کو ایک ایسی وحدت بنا دیتا ہے جس کے افراد میں ایک مقصدی ہم آہنگی اور ایک ارادی ربط پایا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب آپ نے اس "دین" کو لوگوں کے سامنے پیش کیا تو عرب جاہلیت کے ادنیٰ سے ادنیٰ دماغ رکھنے والے نے بھی یہ محسوس کر لیا کہ یہ دین ہمارے آبائی مذاہب میں چند تبدیلیاں یا صدیوں کے متعین رسوم و رواج سے انحراف کا ہی داعی نہیں ہے بلکہ پُوری زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ وہ جلد سمجھ گئے کہ یہ تبدیلی صرف عقیدہ کی حد تک نہیں بلکہ تمام نظریۂ حیات اور نظامِ فکر و عمل کی ہمہ گیر تبدیلی ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہے کہ رسول اللہؐ کے پیشِ نظر جہاں اعتقادی اور اخلاقی انقلاب تھا وہاں پُوری اہمیت کے ساتھ سیاسی انقلاب بھی تھا اور جہاں فرد کی اصلاح مطلوب تھی وہاں تمدّن کی درستی بھی مقصود تھی۔ چنانچہ قرآن نے آپؐ کی بعثت و رسالت کے مقاصد پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ:

لقد ارسلنا رسلنا بالبیّنٰت وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط۔[۴]

(ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا تاکہ

لوگ انصاف پر قایم ہوجائیں)

اور ایک جگہ ارشاد ہے کہ:

ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلّہ و لوکرہ المشرکون۔[۵]

(وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو)

مطالعۂ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ اللہ نے اپنا پیغام اگرچہ انتہائی سادہ الفاظ اور آسان و مختصر لب و لہجہ میں پیش کیا لیکن مخاطبین نے اس کی کُنہ و حقیقت کو فوراً پہچان لیا اور اس کے پیچھے انقلاب کی جھلک دیکھ لی۔ رسولؐ اللہ کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ آپ کی پیش کی ہوئی دعوت کو ہلکا نہ سمجھیں بلکہ اس کی ہمہ گیری و جامعیت کا ادراک کرلیں۔ چنانچہ بعثت کے بعد تبلیغ کے بالکل ابتدائی مرحلہ میں ہی قریش کے ایک وفد سے بات چیت کرتے ہوئے یہ سمجھا دیا تھا کہ:

فان تقبلوا منی ما جئتکم بہ فھو حظکم فی الدنیا و الاٰخرۃ۔[۶]

(اگر تم وہ قبول کرلو جسے میں پیش کر رہا ہوں تو اس میں تمہاری دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری ہے)

پھر اسی ابتدائی دور میں ایک موقع پر حضورؐ یہ معنی خیز جملہ ادا کرتے ہیں کہ:

کلمہ ان انتم تکلمتم بہا ملکتم بہا العرب و دانت لکم بہا العجم۔[۷]

(ایک کلمہ ہے، اگر تم اسے اختیار کرلو تو اس کے نتیجے میں سارا عرب تمہارے زیرِ نگیں ہوجائے گا اور تمام عجم تمہارے پیچھے چلے گا)

قریشِ مکّہ کو یقین تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت دین کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ اس سے بڑے عظیم نتائج پیدا ہونے والے ہیں۔ ایک مرتبہ عتبہ کو سردارانِ مکّہ نے حضورؐ سے گفتگو کے لیے بھیجا۔ عتبہ نے ترغیب و ترہیب کا ہر انداز اختیار کرکے آپ کو اپنی انقلابی مہم اور دعوتی سرگرمیوں سے روکنا چاہا تو حضورؐ نے جواب میں سورۂ حٰمٓ کی کچھ آیات اسے سنا دیں۔ اس پر عتبہ منفعل ہوکر اٹھا اور رؤسا سے جاکر کہا کہ:

فواللہ لیکونن لقولہ الذی سمعت منہ نباء عظیم فان تصبہ العرب فقد کفیتموہ بغیرکم وان یظھر علی العرب فملکہ ملککم و عزہ عزکم وکنتم اسعد الناس بہ۔[۸]

(واللہ اس کی جو بات میں نے سنی ہے اس میں ایک نباء عظیم مضمر ہے۔ اگر عربوں نے اس پر قابو پالیا تو سمجھ لینا کہ انہوں نے تمہیں اس سے بے نیاز کردیا۔ اور اگر اس نے عربوں پر غلبہ حاصل کرلیا تو اس کی حکومت تمہاری حکومت اور اس کی عزت تمہاری عزت ہوجائے گی۔ تم اس کے طفیل تمام لوگوں میں سب سے زیادہ خوش بخت ہوگے)

اس کے معنی یہ ہیں کہ عتبہ اور اس جیسے دُوسرے صاحبانِ نظر رسولؐ اللہ کی دعوت کے جلو میں انقلاب کے آثار صاف طور پر

دیکھ رہے تھے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ دین کی بنیاد پر یہ انقلاب کیونکر برپا ہُوا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب جاہلیت کے معاشرہ کو کس طرح بدلا، اور پھر یہ کہ ریاست کی تاسیس کیسے ہوئی!

سیرت کا مطالعہ کرنے سے مجملاً یہ بات سامنے آتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے کام کا نقشہ یُوں مرتب کیا کہ :

۱ - پہلے تو دین کی بنیادوں یعنی عقاید کی تعلیم دی۔
۲ - پھر اس تعلیم کی بنیاد پر ایک گروہ منظم کیا۔ اور جب ایک تنظیم بن گئی تو
۳ - پھر اسی کی بنیاد پر ایک ریاست کی تاسیس فرمائی۔ اسی لیے ہمیں ولہازن کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ "اسلام کا سیاسی اجتماع، دینی اجتماع سے ظہور پذیر ہوا۔"[۹]

ترتیب کار میں رسولؐ اللہ کا عقاید کی تعلیم کو اولیت دینا بالکل منطقی، فطری اور ضروری تھا۔ عقاید انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا صدور ہوتا ہے" یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرۂ حیات کا ہر خط اسی پہ جا کر ختم ہوتا ہے۔"[۱۰] انسانی سیرت کی تعمیر و تخریب کا تمام تر مدار عقائد پر ہی ہوتا ہے کیونکہ اگر ذہن پراگندہ خیالی کا شکار ہو، مختلف نظریات کی آماجگاہ بن جائے اور اعمال بھی اس کے زیرِ اثر منتشر طور پر سرزد ہوں تو اصطلاحی حیثیت سے اسے "سیرت" نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اگر مخصوص خیالات دل کی گہرائیوں میں جم جائیں اور وہی قوت و عمل کا محرک بھی ہوں۔ ایک مخصوص طرزِ زندگی اور مستقل نظریہ اختیار کر لیا جائے تو یہی سیرت کی تعریف ہے۔ لہٰذا " انسان کی عملی زندگی کا ایک قابلِ اعتماد نظم و ترتیب اختیار کرنا اس بات پر منحصر ہے کہ اس کی ایک مستقل سیرت بن جائے اور سیرت بننے کا انحصار اس پہ ہے کہ اس کا ذہن پراگندہ خیالی کی حالت سے نکل جائے۔"[۱۱] چنانچہ اگر مختلف افراد مختلف قسم کے عقاید و افکار پہ ایمان رکھتے ہوں اور ان کی سیرتیں مختلف و متضاد بنیادوں پر قائم ہوں تو کوئی اجتماعی ہیئت نہیں بن سکتی۔ ان کی مثال ایسی ہو گی جیسے ایک میدان میں بہت سے پتھر بکھرے پڑے ہوں، ہر پتھر بلاشبہ اپنی جگہ مضبوط ہے مگر ان کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے بخلاف اس کے اگر ایک ہی مشترک تخیل بہت سے افراد کے دلوں میں ایمان بن کر جم جائے تو اشتراک ایمانی کا رابطہ ان کو ایک قوم بنا دے گا۔ گویا وہی پتھر جو بکھرے پڑے تھے چُونے سے جوڑ دیے گئے اور ایک مضبوط دیوار قایم ہو گئی۔ اب ان کے درمیان تعاون شروع ہو جائے گا جس سے ترقی کی رفتار تیز اور تیز تر ہوتی چلی جائے گی۔ ایک قسم کا ایمان ان کی سیرتوں میں ہم آہنگی اور ان کے اعمال میں ایک رنگی پیدا کر دے گا۔ اس سے ایک خاص تمدن پیدا ہو گا۔ ایک خاص شان کی تہذیب ظاہر ہو گی۔ ایک نئی قوم، نئی سیرت، نئی ذہنیت، نئے خیالات، نئے طریقِ عمل کے ساتھ اُٹھے گی اور اپنی حضریت کا قصر ایک نئے انداز پر تعمیر کرے گی۔"[۱۲]

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرہ کی اصلاح اور تعمیرِ نَو کے لیے سب سے پہلے عقاید کی تعلیم دی۔

یہ عقاید پانچ ہیں جو نہ صرف مذہبی و روحانی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام اپنے روحانی، اخلاقی، سیاسی اور

معاشرتی و تمدنی نظام کی بنیاد بھی ان ہی پر رکھتا ہے۔ اس بنا پر یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ ان ہی عقاید پر اسلامی ریاست کی فکری بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ درحقیقت ان ہی عقاید نے ریاست کی تعمیر کے لیے زمین بھی ہموار کی اور انہی کی بدولت لوگوں کے اذہان و قلوب بدلے۔ ان کی فکر و نظر میں انقلاب آیا، ان کی عادات و رسوم میں تبدیلی ہوئی، ان کے اندر ہم آہنگی، اتحاد و یک رنگی پیدا ہوئی اور پھر دلوں کے جڑنے سے اجتماع منظم ہوا جس نے بالآخر ریاست کو جنم دیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جن عقاید و ایمانیات سے اتنا بڑا کام لیا گیا ان کی حقیقت و ماہیت کیا ہے۔

الف - ایمان باللہ

عقاید میں سب سے مقدم عقیدۂ توحید ہے۔ توحید اپنی اہمیت و اصل کے اعتبار سے تمام دین کا خلاصہ اور دوسرے تمام عقاید و اعمال کا سرچشمہ ہے۔ "سب اسی اصل کی فرع ہیں اور جتنے اخلاقی احکام اور تمدنی قوانین ہیں سب اسی مرکز سے قوت حاصل کرتے ہیں۔"[۱۳] اسلام میں جو چیز بھی ہے خواہ وہ عقیدہ ہو یا عمل اس کی بنیاد صرف ایمان باللہ پر قائم ہے۔

اس عقیدہ کا مطلب جو اسلام کے عظیم الشان فکری و عملی نظام میں مرکز اور منبع قوت کی حیثیت رکھتا ہے، صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اللہ کے وجود کا اقرار کر لیا جائے بلکہ اس کے تحت اللہ کی صفات کا ایک مکمل اور صحیح تصور رکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ اسی سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو انسان کے قوائے فکر و عمل پر محیط ہو جاتی ہے۔ مزید برآں جاہلی تصور الٰہ اور اسلامی تصور الٰہ میں یہی تصور صفات، حقیقی فرق پیدا کرنے والا ہے ورنہ محض ہستی باری تعالیٰ کا اثبات دورِ جاہلیت میں بھی پایا جاتا تھا۔[۱۴] اسلام کے تصورِ الٰہ کا اصل امتیاز یہ ہے کہ "اس نے صفاتِ باری کا صحیح، مکمل اور مفصل علم بخشا اور پھر اسی علم کو ایمان بلکہ اصل الایمان بنا کر ان سے تزکیۂ نفس، اصلاح اخلاق، تنظیم اعمال، نشر خیر و منع شر اور بنائے تمدن کا اتنا بڑا کام لیا ہے جو دُنیا کے کسی مذہب و ملت نے نہیں لیا۔"[۱۵]

عقیدۂ توحید کے اقرار سے انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی پر ہمہ گیر اثرات رونما ہوتے ہیں۔ آدمی میں وسعتِ نظر پیدا ہوتی ہے۔ انسان پستی و ذلت سے اُٹھ کر خودداری و عزتِ نفس کے بلند ترین مدارج پر پہنچتا ہے۔ انکسار و تخشع، رجائیت و اطمینانِ قلب، صبر و توکل، شجاعت، امانت و دیانت، قناعت و استغنا کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ غلط توقعات، اوہام و خرافات کا ابطال ہو جاتا ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اس عقیدہ سے نفوس میں پاکیزگی اور اعمال میں پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ معاشرہ کے افراد کے باہمی معاملات درست ہوتے ہیں۔ پابندیٔ قانون کی حس پیدا ہوتی ہے اور ایک بالاتر قوت کی نگرانی و گرفت کو آدمی دل و جان سے محسوس کرتا ہے۔ اطاعت امر اور نظم و ضبط کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور افراد ایک زبردست باطنی قوت سے اندر ہی اندر سدھر کر ایک صالح اور منظم سوسائٹی بنانے کے لیے مستعد ہو جاتے ہیں۔[۱۶]

توحید کی انقلاب خیز تعلیم کا صحیح اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ یہ پیش نظر رہے کہ افقِ تاریخ پر جب اسلام طلوع ہوا تو

دنیا کی بیشتر مہذب قومیں کثرت پرستی اور اوتار پرستی میں مبتلا تھیں۔ تمام دُنیا میں بالعموم اور جزیرہ نمائے عرب میں بالخصوص آدمی چاند سورج، ستارے، سیارے، شجر، حجر، غرض دنیا کی ہر حقیر سے حقیر چیز کے آگے سرنگوں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ آدمی آدمی کے آگے جھکتا تھا۔ توحید کے فعال تصور نے طلسمِ جاہلیت کو توڑا اور تسخیر قدرت کی تعلیم اسی معاشرہ میں پیش کی جہاں خود انسان صدیوں سے مسخر ہوتا چلا آرہا تھا۔ اس عقیدہ نے انسان کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دی۔ طبعی پابندیوں اور حیاتیاتی کائنات سے آزادی بخشی۔ انسان کی عظمت و رفعت کو تمام مخلوقات پر ثابت کیا۔ شرک و بُت پرستی کے تمام بندھنوں کو کاٹ دیا۔ انسانیت کو افتخارِ آدمیت کی نئی تعبیر سے روشناس کرایا اور یہ بتایا کہ ملکیت و حکمرانی کا اصل حق اللہ تعالیٰ رب العالمین کو حاصل ہے۔

علاوہ ازیں اس عقیدہ توحید نے انسانیت کو عدل و مساوات کی اقدار عطا کیں۔ انسانی معاشرت کی بنیاد کامل عدل اور صحیح مساوات کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی اور کامل عدل اور صحیح مساوات وحدت الٰہ اور وحدت آدم کے بغیر ناممکن ہے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اس وقت اقوام و ملل میں افراتفری اور انتشار کا یہ عالم تھا کہ ان میں نہ خدا مشترک تھا نہ آدم۔ ہر ایک کا خدا الگ تھا۔ ہر ایک کی نسل، زبان، رنگ، وطن، ذات پات، شہریت، معتقدات اور اخلاق جُدا تھے۔ اس صورتِ حال میں صرف ایک ہی رشتۂ توحید ایسا رشتہ ہو سکتا تھا جو تمام لوگوں کو ایک مرکز پر متحد کر دے یعنی یہ کہ سب ایک ہی الٰہ کو مانیں، اسی کے اتارے ہوئے قانون و شریعت کو تسلیم کریں اور ایک ہی آدم کے مشترک گھرانے کا اپنے آپ کو فرد سمجھیں۔ اس اساس پر بلاشبہ ایک عالمگیر سیاسی تنظیم کی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔ اسی نظریۂ توحید نے مختلف و متضاد انسانی عناصر کو جمع کیا ان کو ملا کر ایک ملت بنایا۔ ان کے تخیلات، اعمال و اطوار میں غایت درجہ کی یکجہتی پیدا کی اور ان کے اندر اختلافِ ظروف و احوال کے باوجود ایک تہذیب کی نشوونما کر کے ایک انتہائی اعلیٰ نصب العین کے لیے جینے و مرنے کا حوصلہ عطا کیا۔

مزید برآں چونکہ عقیدۂ توحید کی رُو سے سب کا اللہ ایک ہے اور سب خدا کے بندے ہیں اس لیے بربنائے عبدیت و انسانیت ایک انسان کو دُوسرے پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔ اس بات نے ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان تمام اختلافات کو مٹا دیا اور انسانیت کو شہنشاہیت، پاپائیت، آمریت، مطلق العنانیت، استبداد اور غیر الٰہی حاکمیت کے ہر بندِ غلامی سے نجات دلادی۔

(ب) ایمان بالملائکہ

فرشتوں پر ایمان دراصل ایمان باللہ کا تتمہ اور اس کا ضمیمہ و لازمہ ہے۔ اس عقیدہ کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ ملائکہ کے وجود کا اثبات و اقرار کیا جائے بلکہ یہ کہ نظامِ وجود میں ان کی صحیح حیثیت کو سمجھ لیا جائے "تاکہ ایمان باللہ خالص توحید پر قایم ہو اور شرک و عبادت ماسوائے اللہ کے تمام شائبوں سے پاک ہو جائے۔"[۱۲] دورِ جاہلیت میں اہلِ عرب کے یہاں ملائکہ کا تصور موجود تھا[۱۳] لیکن اس میں سخت افراط و تفریط تھی۔ قرآن نے ایک طرف تو ملائکہ کا صحیح تصور پیش کیا اور دوسری طرف ان کے اس عقیدہ کی بھی تردید کی کہ فرشتے اللہ کی اولاد ہیں یا اس کی خدائی میں شریک یا لائق عبادت ہیں۔ کیونکہ اس وقت وہاں یہ عقیدہ

پایا جاتا تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں اور الوہیت میں اس کے شریک ہیں۔[۱۹] قرآن نے بتایا کہ فرشتے اللہ کے معزز بندے ہیں، اطاعت گزار ہیں، اس کے حکم پر چلتے ہیں اور صرف وہی کرتے ہیں جس کا وہ حکم دیتا ہے[۲۰]۔ اس کی حمد و ثنا بیان کرتے ہیں[۲۱] اور کسی حال میں اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔[۲۲]

ایمان بالملائکہ سے انسان میں عزتِ نفس کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اس کے تمام جذبات عبودیت اللہ پرستی کے مرکز پر سمٹ آتے ہیں۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ موجوداتِ عالم میں کوئی چیز اس سے افضل نہیں ہے اور فرشتے تو خود انسان کے آگے سربسجود ہو چکے ہیں تو بھلا وہ انسان کے مسجود و معبود کس طرح بن سکتے ہیں؟ اس عقیدہ نے یہ تعلیم بھی دی کہ انسان کائنات کی کارکن طاقتوں میں سے کسی کو کارفرما نہ سمجھ بیٹھے جس طرح تمام کائنات اور خود انسان کی زندگی کے غیر اختیاری شعبہ میں اللہ کی حکومت ہے اسی طرح انسان اپنی زندگی کے اختیاری شعبہ میں بھی اللہ کی حکومت تسلیم کرے ہر معاملہ میں اللہ کو واضع قانون اور اپنے آپ کو صرف تبع قانون سمجھے اور اپنے اختیارات کو ان حدود کے اندر محدود کر دے جو اللہ نے مقرر کیے ہیں جس طرح فرشتوں کا یہ طرز عمل ہے۔[۲۳] فرشتوں پر ایمان اس لیے بھی لازمی ہے کہ ان پر ایمان لائے بغیر وہ پیغام بھی قابلِ اعتبار نہیں ٹھہر سکتا جسے وہ رسول اللہ کے پاس لے کر آتے ہیں۔

(ج) ایمان بالرسالت

امام راغب کا بیان ہے کہ "جو سفارت اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان ان سے امور دنیوی اور اُخروی میں خرابیوں کو دُور کرنے کے لیے جاری ہوتی ہے اسے نبوت (النبوہ) کہا جاتا ہے"[۲۴] اور اصطلاحِ شریعت میں رسالت اس سفارت کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنے تشریعی احکام پہنچانے اور انہیں اپنی مرضی کی راہ بتانے کے لیے قائم کیا ہے۔ ایمانیات میں عقیدہ رسالت کا شمار اگرچہ ایمان باللہ کے بعد ہوتا ہے لیکن عملاً رسول کے بغیر اللہ کے احکام اور اس کی ذات و صفات کا علم نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے عقیدۂ رسالت کی حیثیت مقدم ہے۔

عقیدۂ رسالت کا ایک جزو تو یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں۔[۲۵] اور دوسرا یہ کہ آپ خاتم النبیین ہیں[۲۶]۔ آپ کی رسالت سارے انسانوں تمام عالم کے لیے ہے[۲۷] اور آپ کے ہاتھوں دین کی تکمیل ہو گئی ہے[۲۸]۔ اس لیے اب آئندہ نہ کسی نبی اور رسول کے آنے کی گنجائش ہے اور نہ ہی کسی نئی شریعت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ایمان بالرسل کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ تمام گزشتہ انبیاؑ و رسل پر ایمان لایا جائے۔ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ مسلمانوں سے گویا تمام اقوامِ عالم میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لیے کہا گیا اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ تمام انبیاء و رسل الگ الگ جو پیغامِ الٰہی لائے تھے وہ ہمیشہ سے یکساں اور ایک رہا ہے۔[۲۹] پیغام میں یکسانیت آدمی کو اس طرف بھی راغب کرتی ہے کہ اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے البتہ پچھلے انبیاؑ و رسل اور آنحضرتؐ کی رسالت میں یہ فرق موجود ہے کہ گزشتہ انبیاؑ و رسل . . . .

. . . . کا پیغام مقامی اور محدود تھا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت عام اور تام ہے۔ تمام انسانوں، تمام عالم اور آنے والے تمام زمانوں کے لیے ہے۔[۳۰] گویا آپ کا لایا ہوا پیغام ہدایت، ابدیت اور عالمگیریت کا

حامل ہے۔ علاوہ ازیں آپ دیگر رسولوں کی طرح صفات بشریت[۳۱] وہبیت[۳۲] اور عصمت سے متصف ہیں، نیز آپ مطاع[۳۳]، شارح کتاب الٰہی[۳۴]، معلّم و مربّی[۳۵]، پیشوا اور نمونہ تقلید[۳۶]، شارع اور قانون ساز[۳۷]، قاضی حکم[۳۸]، غرض سب ہی کچھ ہیں کیونکہ معاشرہ کی صلاح و فلاح اور ریاست کی تعمیر میں یہ تمام صفات ناگزیر ہیں اور یہ امر تو بہت واضح ہے۔ آپ کو وحی[۳۹] کے ذریعہ ایک ایسا ذریعہ علم عطا کیا گیا جو ہر قسم کے خطا و نسیان اور تخمین و ظن سے ماوراء ہے۔

یہ آخری خصوصیت ایسی ہے جو بعض دوسری حقیقتوں کو بھی واضح کرتی ہے ایک تو یہ کہ صرف ایمان بالرسل ہی وہ چیز ہے جو بنی نوع انسان کو ایک مرکز پر جمع کر سکتی ہے کیونکہ اختلاف کی بنا در اصل جہالت ہوتی ہے۔[۴۰] دوسری یہ کہ رسول اللہ جو طریق فکر یا اصولِ اخلاق و سیاست یا اصولِ قانون و معاش مقرر کرتے ہیں وہ قومی رجحانات یا زمانی خصوصیات پر نہیں بلکہ علم، حق اور صداقت پر مبنی ہوتے ہیں اور علم، حق و صداقت وہ اقدار ہیں جو مشرق و مغرب، سیاہ و سفید اور قدیم و جدید کے دائرۂ امتیاز میں نہیں آتیں۔ لہذا رسول کے لائے ہوئے ضابطۂ حیات میں ہی یہ قابلیت ہو سکتی ہے کہ اپنے اصول و اساس کو بدلے بغیر ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانے کے لیے مناسب حال ہو اور رسولؐ اللہ یہ ضابطۂ حیات انتہائی موزوں اور مناسب وقت پر لے کر آئے۔ آپ بلا شبہ آخری نبی تھے لیکن آپ سے پہلے آنے والے انبیاء جب اپنی تعلیم و تربیت سے قوموں کا اخلاقی شعور اس حد تک بیدار کر چکے کہ وہ ایک عالمگیر نظام کے تحت زندگی بسر کر سکیں۔ علاوہ ازیں دنیا کے مادی وسائل اجتماع و تمدن نے اس حد تک ترقی کر لی کہ ایک ہادی کا پیغامِ ہدایت دنیا کے ہر گوشہ میں بسہولت پہنچ سکے تو خاتم الانبیاء محمدؐ رسول اللہ کی بعثت ہوئی۔ اور جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ آپ کی دعوت تمام بنی نوع انسان کے لیے ہے اور اس لحاظ سے یہ عالمگیر دعوت، کاملیت و ابدیت بھی رکھتی ہے کہ اس کے بعد کوئی اور دین یا دعوت یا شریعت آنے والی نہیں ہے۔ آپ کی رسالت، رسالت عام اور آپ کی دعوت، دعوت عام ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمۃ للعالمین کہا ہے۔[۴۱]

جہاں تک اہلِ عرب کا تعلق ہے تو عربوں میں ایسے افراد کی کمی نہ تھی جو رسولوں کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات رکھتے تھے اور اسی لیے جب رسولؐ اللہ نے اپنی رسالت کا اعلان کیا تو انھوں نے مختلف قسم کے اعتراضات وارد کیے۔ مثلاً یہ کہ:

وقالوا مال هذا الرسول يأكل الطعام ويمشي في الاسواق لولا انزل اليه ملك فيكون معه نذيرا۔[۴۲]

(یہ ایسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا جو اس کے ساتھ لوگوں کو ڈراتا)

انکارِ رسالت کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ حضورؐ کو پاگل و مجنون اور ساحر کہہ کر مخاطب کرتے تھے[۴۳] تاکہ اقرارِ رسالت کے بار سے سبکدوش ہو جائیں۔ کچھ لوگ بعثتِ انبیاءؑ کے تو قائل تھے مگر یہ چاہتے تھے کہ کوئی فرشتہ نبی بنا کر بھیجا جائے، عام انسان کو رسول کی حیثیت سے قبول کرنے کو ان کا ذہن آمادہ نہ تھا۔

وما منع الناس ان یؤمنوا اذ جآءھم الھدیٰ الا ان قالوا أبعث اللہ بشراً رسولا۔ [۴۴]

(اور جب ان لوگوں کے پاس ہدایت پہنچ چکی تو انہیں ایمان لانے سے صرف یہ بات مانع ہوئی کہ انہوں نے کہا کہ کیا اللہ نے ایک انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے ؟)

ان تمام شکوک وشبہات اور اعتراضات کا مسکت و مدلل جواب دیا گیا۔ چنانچہ ایک طرف تو یہ بتا دیا گیا کہ اصولی طور پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنے احکام و ہدایات بھیجنے کا ذریعہ ہمیشہ انسانوں کو ہی بنایا ہے تاکہ انسانوں پر انسانی فطرت کے مقتضیات انسانوں کے ذریعہ سے واضح ہوں اور لوگوں کے لیے یہ کہنے کا موقع باقی نہ رہے کہ انسان کے لیے کسی غیر انسان کا علم وعمل کیسے نمونے کا کام دے سکتا ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی رسول بھیجا گیا نوعِ انسانی میں سے ہی بھیجا گیا۔ ما ارسلنا من قبلک الا رجالاً نوحی الیھم۔ [۴۵]

(اے محمد! ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بنا کر صرف آدمیوں کو ہی بھیجا تھا جن پر ہم اپنی وحی نازل کرتے تھے)

اور دوسری طرف رسالت کے بارے میں اللہ کا ایک متعین ضابطہ بتا دیا گیا جس کی تائید عقل عام بھی کرتی ہے کہ رسول کو اسی جنس اور اسی مخلوق میں سے ہونا چاہیے جس کے پاس جا کر اسے رسالت کا فرض انجام دینا ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ :

قل لو کان فی الارض ملٰئکۃ یمشون مطمئنین لنزلنا علیھم من السمآء ملکا رسولا۔ [۴۶]

(اے نبی! ان سے کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے اور آباد ہوتے تو ہم ضرور ان پر آسمان سے کسی فرشتے (ہی) کو رسول بنا کر بھیجتے)

ایک اعتراض اہلِ عرب کا یہ بھی تھا کہ ایسے شخص کو رسول کیوں بنایا گیا جس کے پاس نہ مال ہے نہ اولاد، نہ عزت نہ مرتبہ۔ اگر اللہ کو رسول بنا کر بھیجنا ہی تھا تو مکہ یا طائف کی بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی کو بناتا۔ [۴۷] اس کا جواب یہ دیا گیا کہ :

اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ۔ [۴۸]

(اللہ خوب جانتا ہے کہ رسالت کا محل کون سا ہے اور اپنی پیغمبری کسے عنایت فرمائے)

بہرحال رسالت پر ایمان نے ایک طرف تو اہلِ عرب کے شکوک و شبہات کو رفع کر کے رسول کی حیثیت و عظمت کو متعین کیا اور دوسری طرف اہلِ عرب کے تمام اوہام اور افسانوں کا خاتمہ کر دیا۔ علم کی روشنی میں اچھائی اور برائی کے غلط معیارات کی بیخ کنی ہوگئی اور رسول کے منبع علم قرار پا جانے سے تمام پاپائیت کا اور نامعلوم مدت سے چلی آنے والی روایاتِ باطلہ اور غیب و الہام کی مفسدانہ صورتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ کاہن و عراف اور غیبی خبریں بتانے والوں کی قدر و قیمت خاک میں مل گئی اور لوگوں کو اعتقاد و یقین کی دولت سے مالا مال کر دیا گیا۔

یہاں یہ بات نہ بھولنا چاہیے کہ رسول پر ایمان و اطاعت کا حکم سب سے پہلے ایک ایسے معاشرہ میں دیا گیا جہاں اطاعت و انقیاد کا کوئی تصور نہ تھا۔

(د) ایمان بالکتب

"اسلام کی اصطلاح میں کتاب سے مراد وہ کتاب ہے جو بندوں کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول پر نازل کی جاتی ہے۔ اور جسے لوگوں تک پہنچانے اور جس کی توضیح و تشریح کرنے اور جس کو عمل کا جامہ پہنانے کے لیے رسول دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ رسول اس کلام کو ایک امانت دار قاصد کی حیثیت سے لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ پھر خدا کی عطا کی ہوئی حکمت و بصیرت سے اس کے معانی و مطالب کی تشریح کرتا ہے اور ان ہی الہامی اصولوں پر تمدن و اخلاق، معاشرت و سیاست کا نظام قایم کرتا ہے۔"[49]

ایمان بالکتب در اصل ایمان بالرسالت کا ایک ضروری تقاضہ اور لازمہ ہے۔ چنانچہ کتاب کو رسالت سے جُدا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ کتاب لفظی بیان ہے اور رسول اس کا عملی نمونہ و مظہر۔ اس لیے انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے دونوں کی یکساں ضرورت ہے۔

ایک مسلمان کو اگرچہ عقیدہ کے طور پر تمام کتب آسمانی پر ایمان لانے کی تلقین کی گئی ہے[50]۔ مگر عمل کے میدان میں اسے صرف قرآن کا مکلّف بنایا گیا۔ خود قرآن تمام اہلِ ایمان کو یہ دعوت دیتا ہے کہ اسی کتاب کو اپنا دستور العمل بنائیں[51] کیونکہ یہ کتاب منزل من اللہ ہے[52] پوری طرح محفوظ و مامون ہے[53]۔ ہر قسم کی کمی بیشی اور تحریف و تبدیلی سے پاک ہے[54]۔ تمام انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہے[55]۔ اس میں ہر زمانے اور ہر عالم کے لیے نصیحت ہے[56] اور جو کچھ بھی اس کتاب کے خلاف ہے وُہ ہرگز قابلِ اتباع نہیں ہے[57]۔ یہ کتاب گزشتہ رسولوں کی تعلیمات کی محافظ و نگران اور جامع ہے[58]۔ یہ کتاب سراسر حق ہے[59]۔ باطل کو اس میں قطعی کوئی راہ نہیں ملی[60]۔ نہ اندازہ یا گمان کا اس میں دخل ہے[61] اور نہ کسی شیطانی قوت[62] یا نبی کی ذاتی خواہش و مرضی کا[63]۔

مختصر یہ کہ اللہ کی کتاب پر ان لوازمات کے ساتھ ایمان لانے سے اور پھر ایک رسول پر ایمان و اتباع سے آدمی کے سامنے راستہ متعین ہو جاتا ہے اور ذہنیت ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب ان ہی مآخذ سے تمام اعتقادات، عبادات، اخلاق و معاملات اور جملہ سیاسی و تمدنی اور تہذیبی و ثقافتی قوانین ماخوذ ہوں گے اور اسی ایمان، اطاعت اور اتباع کے رشتہ میں تمام اہلِ ایمان منسلک ہو جائیں گے تو ایک مستقل تہذیب بنے گی اور ایک ایسی امت کی تشکیل ہو گی جہاں نسل و رنگ اور زبان و وطن کے بجائے عقاید کی کارفرمائی ہے۔

(ہ) ایمان بالآخرت

آخرت اس دنیا کے بعد آنے والی (دوسری) زندگی کا نام ہے جس پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا[64]۔ اور عقیدۂ آخرت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس پر یقین رکھے کہ "جس طرح دنیا کی ہر چیز فرداً فرداً" ایک عمر رکھتی ہے اسی طرح پورے نظامِ عالم کی بھی ایک عمر ہے جس کے تمام ہونے پر یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا اور دُوسرا نظام اس کی جگہ لے گا جس کے قوانین طبیعی اس نظام کے قوانین طبیعی سے مختلف ہوں گے اس نظام کے درہم برہم ہونے پر ایک زبردست عدالت قایم ہو گی

جس میں ہر چیز کا حساب لیا جائے گا۔ انسان کو اس روز پھر ایک نئی جسمانی زندگی ملے گی وہ اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو گا اس کے تمام اعمال جانچے اور تولے جائیں گے حق اور انصاف کے ساتھ اس کے مقدمے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اچھے اعمال کی اچھی جزا اور بُرے اعمال کی بُری سزا دی جائے گی۔"[۶۵]

اس عقیدہ کو تسلیم کر لینے سے دنیوی زندگی اور اس کے معاملات کے متعلق انسان کا نقطۂ نظر بنیادی طور پر منقلب ہو جاتا ہے انسان اپنے آپ کو ایک ذمہ دار اور جواب دہ ہستی سمجھتا ہے اور اپنی زندگی کے تمام معاملات کو یہ سمجھتے ہوئے انجام دیتا ہے کہ وہ اپنی ہر حرکت اور ہر فعل کا ذمہ دار ہے پھر چونکہ اس کی نظر اپنے افعال و اعمال کے صرف دنیاوی اور ظاہری و مادی نتائج پر ہی نہ ہو گی بلکہ آخرت پر ہو گی اس لیے یہ احساس ایک ایسے طاقتور ضمیر کی شکل میں ظاہر ہو گا جو انسان کو معروفات پر قائم اور منکرات سے مجتنب رکھے گا۔ اس لحاظ سے یہ عقیدہ انسان میں تقویٰ و طہارت، پاکیزگی و پاکبازی، سرفروشی، بے خوفی اور بہادری، مصائب پر صبر، نیک کاموں میں جان و مال خرچ کرنے کی ترغیب، اچھے کاموں کو اختیار کرنے اور بُرے کاموں سے بچنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔

آخرت پر ایمان نے دنیا کو عموماً اور اہلِ عرب کو خصوصاً انسانیت و آدمیت کی تعلیم دی۔ زندگی کو منضبط و محتاط بنایا۔ ذاتی مفاد پرستی اور خود غرضی و جارحیت کی فضا کو تبدیل کیا۔ اس کی وجہ سے غیر مختتم سلسلہ ہائے جنگ کا بھی خاتمہ ہوا جو محض فخر و مباہات یا قبائلی انتقام و عداوت پر مبنی تھیں۔ اب ان کے سامنے اس دنیا کے تجملات بے وقعت ہو گئے اور اصل توجہ انجام و آخرت پر مرکوز ہو گئی۔ ایک متعین راہِ عمل اور عالمگیر مشن کے لیے لگن پیدا ہوئی اور اس مقصد یا نصب العین کے حصول کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں کو اس طرح وقف کر دیا کہ اپنی جان تک کی پرواہ نہ کی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ دنیا کی موت اخروی مسرت کا پیش خیمہ ہے ایمانیات نے ایک کمزور آدمی کو بھی دلیر بنا دیا اور طاقتوروں کے حوصلے پست کر دیے کیونکہ دونوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ ایک دن حق کی عدالت میں حاضر ہو کر جواب دہی کرنی پڑے گی۔ نظریہ آخرت و معاد نے اہلِ عرب کو بالغ نظری عطا کی اور وہ یہ سمجھ گئے کہ اس دنیا کی خوشحالی و بدحالی اور منفعت و مضرت اصل نہیں ہے۔ مطلوب حقیقی تو اللہ کی رضا و خوشنودی ہے۔[۶۶]

بہرحال دین کی یہ وہ بنیادیں ہیں جن پر اسلام کا نظامِ تہذیب و تمدن، نظامِ معیشت و معاشرت اور نظامِ سیاست قایم ہے۔ عہد نبویؐ میں ان ہی فکری بنیادوں پر ایک معاشرہ کی تشکیل ہوئی اور ان ہی عقاید کو تسلیم کرنے والے ایک مجتمع جدید کی شکل میں ظاہر ہوئے اور پھر اسی مجتمع جدید پر ریاست نبویؐ کی عمارت تعمیر کی گئی۔

(۲) تشکیلِ معاشرہ

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں یہ تھے وہ بنیادی اصول جن پر نہ صرف دین کی عمارت قایم ہوئی بلکہ ان ہی اصولوں پر ایک سوسائٹی کو منظم کیا گیا اور پھر معاشرتی و سیاسی نظام کی تمام ترتیب و تہذیب بھی ان ہی عقاید و ایمانیات کے ذریعہ کی گئی۔ ان اصولوں اور

عقاید کی حقیقت و ماہیت پر پچھلے اوراق میں بحث کی جا چکی ہے اس لیے اب دوسرے مرحلہ میں یہ دیکھنا ہو گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اصولوں پر ایک نئے معاشرہ کی نشوونما کا کام کس طرح انجام دیا۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے تین بنیادی نکات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے:

(۱) اوّل یہ کہ اسلامی تاریخ کی روشنی میں تاسیس ریاست کے جو تین مراحل ہم نے مقرر کیے ہیں (یعنی پہلے فکری بنیادوں کی تعلیم، پھر سوسائٹی کی تشکیل و تنظیم اور اس کے بعد ریاست کی تاسیس) ان کے پیشِ نظر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ عہدِ رسالت میں ریاست کی تاسیس اور معاشرے کا قیام چند بنیادی اصولوں کا مرہونِ منت ہے اس کو ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ عقاید و نظریات پہلے وجود میں آئے اور ریاست بعد میں۔ یہ نکتہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ سیاسی افکار و اعمال کی تاریخ میں عموماً اور مغرب کے فلسفۂ سیاسی میں خصوصاً یہ ترتیب نظر نہیں آتی۔ اس کی رُو سے پہلے سوسائٹی اور ریاست کا قیام عمل میں آتا ہے اور پھر ان کے زیرِ اثر نظریات جنم لیتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ احوال و ظروف کی تبدیلی اور معاشرہ یا ریاست کی ہیئت میں ہر تغیر کے ساتھ سیاسی نظریات میں بھی انقلاب آتا رہا۔ اس کے برعکس ریاست نبوی کے سیاق و سباق میں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ یہاں معاشرہ اور ریاست دونوں کا ظہور تمام تر عقاید و نظریات کا مرہونِ منت ہے۔

(۲) دوم یہ کہ افرادِ معاشرہ کے اتحاد و انجذاب کے لیے دین کو بنیاد بنایا گیا حالانکہ دنیا اس وقت تک سیاسی و معاشرتی اتحاد کی جن بنیادوں کا عملی تجربہ کر چکی تھی ان میں زبان، رنگ، نسل، وطن اور قومیت خاص ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ معاشرہ کے اتحاد کے لیے ان بنیادوں کو استعمال نہیں کیا بلکہ رنگ و نسل و زبان اور وطن و قومیت کے تمام معیارات کو باطل قرار دے دیا[۶۷] اور ہر قسم کی عصبیت کو حرام ٹھہرایا[۶۸] کیونکہ یہ امتیازات اگر ایک طرف وحدت انسانیت کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور ان کی بنیاد پر کوئی عالمگیر معاشرہ قایم نہیں کیا جا سکتا تو دوسری طرف یہ معیارات انسانیت کو مختلف طبقات میں تقسیم کرتے ہیں اور ایک انسان اور دُوسرے انسان کے درمیان نفرت و ذلت کی دیوار کھڑی کرتے ہیں۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم و تلقین کا ہدف عقیدہ، ایمان اور دین کو قرار دیا اور ان معیاراتِ باطلہ کو پر کاہ کی حیثیت بھی نہ دی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رسول اللہؐ ایک عالمگیر پیغام کے علمبردار تھے۔[۶۹] آپ کا مقصد تمام انسانیت کو ایک رشتہ میں جوڑنا، انھیں ایک اُمت بنانا اور ایک عالمی اخوت میں منسلک کرنا تھا۔[۷۰] وہ نہ تو امتیازات رکھنے والے طبقات کے خلاف کسی سیاسی یا معاشی تعصب میں مبتلا تھے اور نہ گرے ہوئے طبقات کے لیے ان کے دل میں کوئی بے جا عصبیت تھی کہ طبقاتی جنگ برپا کر کے مقدم الذکر کو پست اور موخر الذکر کو بلند کرنے کی کوشش کریں۔ رسولؐ اللہ ایک فساد کو دُوسرے فساد سے بدلنے کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ آپ کی پوری دعوت سرتاسر مثبت تھی۔

(۳) معاشرہ کی بنیاد عام طور سے مادیت بتلائی جاتی ہے۔ یعنی انسانی جہد و سعی کا مقصود یہ ہے کہ انسان کو تین بنیادی ضروریات (غذا، مکان اور لباس) حاصل ہو جائیں جبکہ رسولؐ اللہ نے سوسائٹی کی بنیاد مادیت کے بجائے روحانیت پر رکھی اور یہ امر واضح کیا کہ اگرچہ مادیت زندگی کے قیام و بقا کے لیے ناگزیر ہے اور اسے بہر حال حاصل کرنا چاہیے[۷۱] لیکن

انسانی جد و جہد کا اصل ہدف فلاحِ آخرت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تبلا دیا گیا کہ دنیاوی مال و متاع کو زندگی کا مقصود نہ بنا لیا جائے[42] کہ مادی خود غرضیں انسان کی روحانی اقدار کو پامال کر دیں۔

بہرحال آنحضرتؐ نے اپنے کام کا آغاز کیا اور لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلایا جس نے اس دین کو تسلیم کیا وہ صاحبِ ایمان ہوا اور نئی برادری کا رکن بن گیا، خواہ اس کی زبان، نسل، وطن، رنگ وغیرہ کچھ ہی ہو اور جس نے اس کو نہیں مانا وہ اس مجمع کی رکنیت سے محروم رہا خواہ وہ قریشی و ہاشمی ہی کیوں نہ ہو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نسل و نسب کی بنیاد منہدم ہو گئی۔ دین کے سوا کوئی دوسرا رشتہ ایسا نہ تھا جس کے ذریعہ افراد کو اُمت کی شکل میں جوڑا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداءً اہلِ مکہ میں سے جن لوگوں نے اس دعوت پر لبیک کہا ان کا تعلق مختلف شعوب و قبائل سے تھا۔ وہ تمام امتیازات کو پامال کرتے ہوئے پرانے معاشرہ سے کٹ کر نئے مرکز پر جمع اور خالص عقیدہ کی بنیاد پر ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے چلے گئے اور اس طرح ایک نئے معاشرہ کا آغاز ہو گیا۔

اب ہم ان اسباب و عوامل سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو اس معاشرہ کے قیام اور اس کی توسیع میں ممد و معاون ثابت ہوئے اور وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) پہلا سبب جسے ہم فطری سبب کہہ سکتے ہیں یہ تھا کہ زندگی کے ہر میدان میں پستی و زوال اور انتشار و افتراق کی جو کیفیت اس زمانے میں طاری تھی اس نے لوگوں کو ذہنی طور پر تبدیلئ حالات پر آمادہ کیا۔ جیسا کہ ہم پچھلے باب میں مطالعہ کر چکے ہیں کہ یہ انحطاط و زوال مجموعی طور پر دنیا کے تمام متمدن علاقوں میں پایا جاتا تھا اس لیے حالات جتنے زیادہ خراب تھے کرب و اضطراب بھی اسی قدر زیادہ تھا۔ ہدایت و اصلاح کی شدید پیاس لوگوں میں پیدا ہو چکی تھی اور وہ ایک حیات بخش ضابطۂ حیات کا خیر مقدم کرنے کے لیے بالکل تیار تھے بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت بحر و بر میں مفاسد کی یورش اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ بعض نیک دل افراد تو گھبرا کر تلاشِ حق میں نکل کھڑے ہوئے[43]۔ چنانچہ ابن ہشام نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے حضرت سلمان فارسی کی جو سرگذشت نقل کی ہے[44] اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہدایت کی تلاش میں کہاں کہاں پھرتے رہے بالآخر عموریہ کے ایک راہب کی وصیت کے مطابق رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے[45]۔ اسی سے متصل ابنِ ہشام کا ایک دوسرا بیان نہایت قابلِ توجہ ہے وہ کہتا ہے کہ ایک موقع پر قریش اپنے ایک بُت کے گرد جمع ہو کر تقریبِ عید منا رہے تھے عین اس وقت چار آدمی یعنی ورقہ بن نوفل، عبیداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث اور زید بن عمرو بن نفیل اس ہنگامہ سے بیزار الگ تھلگ بیٹھے یہ گفتگو کر رہے تھے کہ:

واللہ ما قومکم علیٰ شئ۔ لقد اخطئوا دین ابیھم ابراھیم۔ ما حجر نطیف بہ، لا یسمع ولا یبصر ولا یضرو لا ینفع۔ یاقوم، التمسوا بانفسکم (دیناً) فانکم واللہ ما انتم علیٰ شئ۔ فتفرقوا فی البلدان یلتمسون الحنیفیہ دین ابراھیم[46]۔

(خدا کی قسم ہماری قوم ایک بے بنیاد مسلک پر چل رہی ہے۔ اپنے باپ ابراہیم کے دین کو انہوں نے

گنوا دیا۔ جس پتھر کا ہم طواف کر رہے ہیں وہ نہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے، نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ ساتھیو! اپنے دلوں (دین) کو ٹٹولو۔ خدا کی قسم تم محسوس کرو گے کہ تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے، ملک ملک گھومو اور کھوج لگاؤ دین ابراہیم کے سچے پیروؤں کا)

چنانچہ حق کی تلاش و جستجو میں بقول ابن ہشام ورقہ بن نوفل عیسائی ہوگیا۔ عبیداللہ بن جحش عالمِ اضطراب میں پہلے اسلام لایا پھر اسی اضطراب میں مرتد ہو کر عیسائی ہوا[۷۶]۔ عثمان نے قیصرِ روم کے یہاں جا کر عیسائیت اختیار کر لی اور زید نے یہودیت قبول کی نہ نصرانیت البتہ اپنی قوم کا دین ترک کر دیا۔ بت پرستی چھوڑ دی۔ مردار اور استخوان کے ذبیحوں سے پرہیز کرنا شروع کر دیا۔ بیٹیوں کے قتل سے لوگوں کو باز رکھنے کی تلقین کرتا اور کہا کرتا:

اعبد رب ابراہیم۔[۷۸]

(میں تو ابراہیم کے رب کا پرستار ہوں)

ابن ہشام اس سے آگے جو کچھ لکھتا ہے وہ بھی پڑھنے کے لائق ہے وہ کہتا ہے کہ:

اسمأ بنت ابوبکر کا بیان ہے کہ میں نے بُوڑھے سردار زید بن عمرو کو کعبہ کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے دیکھا، وہ کہہ رہا تھا کہ اے قریشیو! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں زید بن عمرو کی جان ہے، میرے سوا تم میں کوئی بھی ابراہیم کے دین پر قایم نہیں رہا۔ پھر کہنے لگا کہ اے اللہ! اگر مجھ کو معلوم ہو کہ میں کس طرح سے تیری عبادت کروں تو میں اس کو بجا لاؤں مگر افسوس کہ میں تیری عبادت کا طریقہ نہیں جانتا۔[۷۹]

مکہ اس نیک نفس آدمی کے وجود کو بھی برداشت نہ کر سکا اور بالآخر زید کو شہر بدر کر دیا اور مکہ میں اس کا داخلہ ممنوع قرار دیا۔ نتیجتاً زید بن عمرو نے وطن چھوڑا اور دین ابراہیمی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ موصل، الجزیرہ، شام وغیرہ کی خاک چھانتے ہوئے میفعہ (بلقا) کے ایک راہب کے پاس پہنچا اور اس سے گم گشتہ مسلک ابراہیمی کا سراغ پوچھا۔ راہب نے کہا:

"آج تجھے اس مسلک پر چلنے والا کوئی ایک متنفس بھی نہ ملے گا البتہ ایک نبی کے ظہور کا وقت آ پہنچا ہے جو اس جگہ سے اُٹھے گا جہاں سے تو نکل کر آیا ہے۔ وُہ دین ابراہیمی کا علمبردار بن کے اُٹھے گا۔ جا کر اس سے مل۔ اس کی بعثت ہو چکی ہے۔"[۸۰]

زید راہب کی ہدایت کے مطابق مکہ کی طرف روانہ ہوا مگر منزل پر پہنچنے سے پہلے بلاد لخم میں قتل ہوگیا۔[۸۱]

ان روایات کو ہم نے اس لیے نقل کیا تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ بعثتِ نبوی کے وقت اذہان و قلوب میں سخت اضطراب پیدا ہو چکا تھا اور فطرت انسانی ماحول کے خلاف جذبہ احتجاج کے ساتھ بیدار ہو رہی تھی اور کم از کم عرب میں تو حنفاء کا ایک طبقہ ایسا ضرور موجود تھا[۸۲] جو صنم پرستانہ جاہلی طرزِ فکر سے بغاوت کر چکا تھا۔ اس صورتِ حال میں رسولؐ اللہ کی بعثت اور آپ کی دعوت وقت کی آواز بن گئی۔ زمینوں کی طرح روحوں اور دلوں کے بھی موسم ہوتے ہیں اس لیے وہ موسم آ پہنچا تھا جب کہ

دلوں میں ایمان کے بیج ڈالے جائیں ان کے اضطراب کو سکون سے بدلا جائے اور رُوحوں کو عقیدہ کی لذت سے آشنا کیا جائے۔ بہرحال رسول اللہؐ نے ٹھیک وقت پر زمانہ کی نبض پر ہاتھ رکھا اور دلوں کے احساس کو حقیقت کے طور پر پیش کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جب لوگوں کے سامنے آپ کی دعوت واضح ہوئی تو انھوں نے اسے فوراً قبول کرلیا۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ گویا اپنے ہی دل کی آواز سُن رہے ہیں ان کے قبولِ حق میں نہ تو معجزات کی ضرورت پیش آئی اور نہ اس بات کی کہ قرآن ان کے سامنے بار بار پیش کیا جائے۔ درحقیقت وہ پیاسے تھے اس وجہ سے جوں ہی ان کے سامنے پانی پیش کیا گیا وہ اس کی طرف دوڑ پڑے۔[۸۳] ان کی آنکھیں طلبِ ہدایت کے لیے کھلی ہوئی تھیں، اور جن کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں ان کو روشنی سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہیں ہوا کرتی۔ پس جس طرح آئینہ روشنی میں چمک جاتا ہے یہ بھی روشنی پا کر چمک اُٹھے۔[۸۴] البتہ جو لوگ ضد، ہٹ دھرمی اور فریبِ نفس میں مبتلا تھے یا جن کو اپنے ذاتی مفادات عزیز تھے انھوں نے جانتے بُوجھتے انکار و کفر کی روش اختیار کی۔[۸۵]

غرض ایک طرف تو حالات کے رُخ نے لوگوں کے اذہان و قلوب میں مدوجزر پیدا کیے اور دُوسری طرف اہلِ کتاب کی وساطت سے یہ روایات عرب میں بالعموم اور مکہ میں بالخصوص عام تھیں کہ ایک نئے نبی کی بعثت ہونے والی ہے۔[۸۶] رسول اللہؐ سے پہلے جو انبیاؑ و رسل اس دنیا کے مختلف حصوں میں تشریف لائے انھوں نے متواتر یہ خوشخبری سُنائی کہ ایک نبیِ رحمت کی آخرکار بعثت ہوگی۔ ان انبیاؑ و رسل میں سے کم از کم حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی پیش گوئیاں تو اب تک محفوظ ہیں۔[۸۷] اسی بنا پر اندرون و بیرون عرب بعثتِ محمدی کا چرچا عام تھا جیسا کہ ہم زید بن عمرو کے واقعات اور سلمان فارسی کی سرگزشت میں دیکھ چکے ہیں کہ مختلف علاقوں کے رہبان و احبار نے یکساں پیش گوئی کا اظہار کیا تھا۔ ابنِ ہشام نے آنحضرتؐ کی تبلیغی مساعی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ طائف سے واپسی کے بعد جب بھی کہیں کوئی مجمع دکھائی دیتا یا حج کا موسم آتا تو آپ حج پر آنے والے تمام قبائل کا دورہ کر کے انھیں اسلام سے روشناس کراتے، توحید و رسالت کی دعوت دیتے اور ان کو دینِ خداوندی کی نصرت و اعانت پر آمادہ کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔ چنانچہ یہ دعوت آپ نے قبیلہ بنو عامر کو بھی دی۔ بنو عامر جب اپنے علاقے میں واپس پہنچے تو وہاں ان کے ایک بڑے بوڑھے نے حج کے حالات دریافت کیے۔ بنو عامر نے کہا :

"اس دفعہ ایک عجیب واقعہ ہم نے یہ دیکھا کہ قریش میں سے بنی عبدالمطلب کے ایک نوجوان نے ہم سے کہا کہ " میں خدا کا رسول ہوں " اور ہم کو اس بات کی طرف بلایا کہ ہم اس کے ساتھ ہو کر اس کے مخالفوں سے مقابلہ کریں اور اس کو اپنے شہر میں لے آئیں۔"

اس بوڑھے نے یہ بات سُن کر دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیے اور کہا کہ " اے بنی عامر! اس بات کی کیا تلافی ہو سکتی ہے کہ تم ایک نبی کو چھوڑ آئے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس سے بڑھ کر کوئی مطلوب ہی نہیں اور بیشک وُہ نبی جو کچھ کہتے ہیں حق کہتے ہیں۔"[۸۸]

ہم نے اُوپر جو پیشگوئیاں اور صداقتیں نقل کی ہیں ان کی خاص تاریخی اہمیت بھی ہے۔ کیونکہ ان کی بازگشت عہدِ رسالت کے تاریخی واقعات میں صاف سنائی دیتی ہے۔ مثلاً بیعت عقبہ کے موقع پر انصار کی سبقت ایمانی اس وجہ سے تھی کہ وُہ یہود پر فوقیت

حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کی تفصیل تو ہم آئندہ بیان کریں گے البتہ یہاں یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ مذکورہ پیشگوئیوں کے اثرات اہلِ کتاب اور انصار دونوں پر مرتب ہوئے۔[۸۹]

(ب) پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ دین کا آغاز کیا تو آپ کی عمر چالیس سال تھی۔ چالیس سال کی مدت تھوڑی نہیں ہوتی۔ اس پوری مدت میں آپ کی زندگی اہلِ مکہ اور دوسرے اہلِ عرب کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح تھی جس کی تحریر کا ہر حرف پاکیزہ، روشن اور مستحکم تھا۔ آپ کے بے داغ اخلاق و کردار، آپ کی امانت، دیانت، صداقت اور عالی نسبی و عالی ظرفی کا ہر شخص معترف تھا۔ اہلِ مکہ بچشم سر یہ دیکھ چکے تھے کہ اس صادق اور امین نے پوری زندگی ایسی شرافت، پاکیزگی اور احتیاط کے ساتھ گزاری ہے کہ اس سے زیادہ پاکیزگی کا تصور ممکن نہیں ہے۔ شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا، جذبات کبھی بے قابو نہیں ہوئے، بےحیائی کا کبھی مظاہرہ نہیں کیا، بدکاری و فحاشی اس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آئی۔[۹۰] کسی موقع پر عصمت و عفت کا سودا یا لڑائی جھگڑا نہیں کیا، کسی کا ناحق خون نہیں بہایا، چوری، ڈکیتی، بُت پرستی، غیر اللہ کے سامنے نذر و نیاز، مراسم جاہلیہ اور لہو و لعب سے وہ کوسوں دور رہا۔ غرض جاہلیت کے اس دور میں جو مفاسد بھی موجود تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب سے اپنے آپ کو بچا کر عظمت و شرافتِ نفس کا ایسا نمونہ پیش کیا جو اس ماحول میں ایک "عجوبہ" سے کم حیثیت نہ رکھتا تھا۔

یہ تو ایک پہلو تھا، اسی کے ساتھ ساتھ اخلاقِ محمدیؐ کا دوسرا پہلو بھی اہلِ مکہ کی نظروں سے اوجھل نہ تھا وہ جانتے تھے کہ ابو طالب کا بھتیجا فضول ولا یعنی مشاغل سے اپنی توجہ ہٹا کر مظلوموں کی دادرسی، غریبوں کی مدد، مسکینوں کی اعانت اور خیر و صلاح کے فروغ میں صرف کرتا ہے۔ چنانچہ حربِ فجار میں شرکت[۹۱] اور حلف الفضول کا عہد[۹۲] اسی قبیل سے ہے۔ اسی طرح تعمیر کعبہ کے سلسلہ میں تنصیب حجرِ اسود کے موقع پر بھی اہلِ مکہ صادق و امین کے جذبۂ امن و آشتی اور حکم و سیاست کا مظاہرہ دیکھ چکے تھے جبکہ قریش میں سخت کشمکش پیدا ہو گئی تھی "لعقۃ الدم" ہو چکا تھا اور تلواریں چلنے میں کچھ دیر نہ رہ گئی تھی کہ اس عقدۂ لاینحل کو محمد رسول اللہ نے اپنے ناخنِ تدبیر سے ذرا دیر میں سلجھا دیا یہاں تک کہ سب کے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز نکلتی تھی کہ:

"ھذا الامین قد رضینا بما قضی بیننا۔"[۹۳]

(یہ امین ہیں ہم ان کے فیصلے پر راضی ہیں)

پھر خاص بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرزِ عمل وقتی نہ تھا بلکہ مستقل تھا۔ آپ کا اخلاقِ کریمانہ ہر آن و ہر گام یہی رہا چنانچہ جب آپ پر پہلی وحی غارِ حرا میں نازل ہوئی اور آپ نے گھر آ کر حضرت خدیجہؓ سے کچھ اندیشوں کا اظہار کیا تو حضرت خدیجہؓ نے آپ کے اخلاق و کردار کی شہادت دیتے ہوئے جو کچھ کہا تھا اس کا مفہوم یہ تھا کہ اے محمدؐ! آپ بالکل نہ ڈریں۔ اللہ آپؐ کو رُسوا نہ کرے گا بلکہ آپ تو نبی بنائے جا رہے ہیں۔ اور پھر آپؐ تو سچ بولتے ہیں، رشتوں کو جوڑتے ہیں اور امانتیں ادا کرتے ہیں۔[۹۴] غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کی عظمت اہلِ مکہ اور اہل عرب سب کے نزدیک مسلّم تھی۔[۹۵] یہی وجہ ہے کہ جب آپ نے انقلابِ نو کی دعوت دی اور لوگوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی بلکہ اپنے ذاتی مفادات کی بنا پر انکار کی روش اختیار کی تو قرآن کے الفاظ میں رسول اللہؐ نے بطورِ دلیل ان سے کہا کہ:

فقد لبثت فیکم عمراً من قبلہ - افلا تعقلون۔[۹۱]

(میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں۔ کیا تم سمجھتے نہیں ؟)

اسی طرح کوہ صفا پر کھڑے ہو کر پہلی مرتبہ قوم کو مخاطب کیا تو یہ فرمایا تھا کہ :

"اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک حملہ آور فوج چلی آرہی ہے تو کیا تم میری بات پر یقین کر دگے ؟"

اس پر اہل مکہ کے پورے مجمع نے بالاتفاق و بیک آواز یہ جواب دیا تھا کہ :

قالوا نعم انت عندنا غیر متھم وما جربنا علیك كذبًا قط۔[۹۵]

(ہاں ہم ضرور یقین کریں گے۔ تمہارے کردار پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ تم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا)

پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کی یہی وہ رفعت و بلندی ہے کہ ابوجہل جیسا دشمن خدا و رسول بھی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرتے ہوئے اعتراف کرتا ہے کہ :

انا لا نکذبك و لکن نکذب ما جئت بہ۔[۹۸]

(ہم آپ کو تو جھوٹا نہیں کہتے مگر جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں اسے جھوٹا قرار دیتے ہیں)

جنگ بدر کے موقع پر اخنس بن شریق نے تخلیہ میں ابوجہل سے پوچھا کہ یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی تیسرا موجود نہیں ہے۔ سچ بتاؤ کہ محمد کو تم سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا ؟ تو ابوجہل نے جواب دیا کہ :

"خدا کی قسم محمد ایک سچا آدمی ہے۔ عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا، مگر جب لواء اور سقایت اور حجابت اور نبوت سب ہی کچھ بنی قصی کے حصے میں آجائے تو بتاؤ باقی سارے قریش کے پاس کیا رہ گیا۔"[۹۹]

ان حقائق کی تاریخی شہادت خود قرآن اس طرح دیتا ہے کہ :

فانھم لا یکذبونك و لکن الظالمین بآیات اللہ یجحدون۔[۱۰۰]

(لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں)

بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بے داغ سیرت نے بہت سے لوگوں کو متاثر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مسلمان ہو گئے۔ چنانچہ ابتدائی ایام میں بہت سے لوگ آپ کی اسی سیرت کے پیش نظر ایمان کا اقرار کر کے جدید معاشرہ کے رکن بنتے تھے۔[۱۰۱]

(ج) واقعہ یہ ہے کہ آدمی کی ذہنیت کو تبدیل کرنا اور اس کے نقطۂ نظر یا نصب العین کو منقلب کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے غیر معمولی ذہانت، حکمت و تدبر اور سب سے بڑھ کر ایسے استدلال سے کام لینا پڑتا ہے جو مخاطب کو ذہنی طور پر ہموار کر کے نئی بات قبول کرنے پر آمادہ کر سکے۔ جس طرح ایک بیج کی نشو و نما کے لیے تنہا بیج کی صلاحیتوں پر ہی نظر نہیں رکھنی پڑتی بلکہ زمین کی آمادگی و مستعدی اور فصل و موسم کی سازگاری و موافقت کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ایک داعی انقلاب کو بھی لازماً تخم ایمان کی آبیاری کے لیے قلوب و اذہان کی آمادگی و موافقت کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے اور یہ آمادگی اسی وقت

پیدا ہو سکتی ہے جبکہ استدلال محکم اور پائدار ہو۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقاید اور تعلیماتِ دین کو دلوں میں اتارنے کے لیے ایک طرف تو ایسے دلائل و براہین سے کام لیا جن کا ادراک ایک ادنیٰ سے ادنیٰ عقل رکھنے والا آدمی بھی کر سکتا ہے نیز ان دلائل و آثار میں تنوع کا خیال بھی رکھا تاکہ افہام و تفہیم کا حق ادا ہو سکے اور دُوسری طرف رسولؐ اللہ نے اہلِ عرب کی تمام خوبیوں اور خرابیوں، ان کی انفرادی و قومی روایات اور ان کے عادات و خصائل کی رعایت رکھتے ہُوئے کشتِ ایمان کی آبیاری کی۔ جس طرح ایک طبیب مریض کی کیفیت و مرض کی ٹھیک ٹھیک نشان دہی کرنے کے بعد دوا تجویز کرتا ہے اسی طرح رسولؐ اللہ نے قوم کی حالت و کیفیت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر کے پوری حکمت و دانائی کے ساتھ لوگوں کی صلاح و فلاح کا کام انجام دیا۔

رسولؐ اللہ نے تبلیغ دعوت اور اشاعت تعلیم کے سلسلے میں مخاطب کی ذہنی نزاکتوں کا پورا پورا خیال رکھا۔ عرب کے مشرکین اور اہلِ کتاب پر جس طرح آنحضرتؐ نے اتمامِ حجت فرمایا ہے اس کی تمام تفصیلات قرآن میں موجود ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے کسی ایسی بات کا مطالبہ نہیں کیا گیا جو ان کے لیے بالکل نادر اور انوکھی ہو اور ان کی تاریخ، ان کی روایات، ان کے معروف و منکر اور ان کے عقاید و اخلاق میں اس کی کوئی اصل یا شکل موجود نہ ہو۔ اس لیے آنحضرتؐ کا مطالبہ یہ تھا کہ اصول و جزئیات میں جو تناقض اور کجی پیدا ہو گئی ہے اس کو دُور کیا جائے بلکہ اپنے پیغمبرانہ کام کی تکمیل میں آپ کی مستقل سیاست ہی یہ رہی ہے۔ آپ نے پہلے درجہ میں تو بعض مراسم جاہلیت کو جو بہت پہلے سے چلے آ رہے تھے متعدد ترامیم و اصلاح کے بعد قبول کر لیا۔ دوسرے درجہ میں بعض دساتیر جاہلیہ پر کلیۃً خطِ تنسیخ پھیر دیا۔ اور تیسرے درجہ میں بالکل نئے اصول و قوانین عطا فرمائے۔

اس موقف کی وضاحت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بہتر طور پر اس طرح کی ہے کہ:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ملتِ حنیفیہ اسماعیلیہ کی کجی کو درست کرنے، اس کی تحریف کو دُور کرنے اور اس کی روشنی کو پھیلانے کے لیے تھی۔ اور اللہ کے اس قول میں یہی مراد ہے کہ "ملة ابیکم ابراهیم"۔ اور جبکہ حالت ایسی ہے تو ضروری ہے کہ ملت ابراہیم کے اصول قابلِ تسلیم اور اس کا طریقہ مقرر رہو، اس لیے کہ نبی جب ایسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے جن میں عمدہ طریقے باقی ہیں تو ان طریقوں میں تغیر و تبدّل بے معنی ہے بلکہ ان کو قایم رکھنا ضروری ہے کیونکہ ان لوگوں کے نفوس ان کو اچھی طرح سے قبول کر لیتے ہیں اور ان سے ان پر خوب حجت قائم ہو سکتی ہے۔"[۱۰۲]

شاہ صاحبؒ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی کج روی کو درست کرنے اور ان کی خرابیوں کی اصلاح کے لیے مبعوث فرمایا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسماعیل کی شریعت میں غور کیا اور اس میں جو طریقہ حضرت اسماعیل کے مسلک کے موافق یا منجملہ شعائر الٰہی کے مطابق پایا اس کو باقی رکھا اور جس میں تحریف ہو گئی تھی یا اس میں خرابی پیدا ہو گئی تھی یا اس میں شرک و کفر کی علامات تھیں اس کو مٹا دیا اور اس کا بطلان مستحکم کر دیا اور جو امور عادات وغیرہ کی قسم سے تھے ان کی خوبیاں اور برائیاں اس طرح بیان کر دیں کہ ان سے احتراز کیا جا سکے، بُری رسموں سے آپ نے منع فرما دیا اور عمدہ رسموں کا

حکم دیا اور جو مسائل اصلی یا عملی زمانہ فترت میں متروک ہو گئے تھے ان کو ویسا ہی شاداب و تر و تازہ کر دیا جیسا کہ وہ تھے اس طرح خدا کا انعام مکمل اور اس کا دین مستقیم ہو گیا۔" (۱۰۳)

آگے چل کر شاہ صاحبؒ اپنے دعوے کے ثبوت میں زمانہ جاہلیت کے بعض رسوم و رواج، اور اصول و فروعات کو پیش کر کے لکھتے ہیں کہ:

"اگر تم کو ہمارے مذکورہ بیان میں شبہ ہو تو ان مضامین میں غور کر لو جن کو اللہ نے قرآن میں بیان فرمایا اور اس باقی علم کے ذریعہ جو ان کے پاس رہ گیا تھا ان پر دلیل قایم کی اور ان شکوک و شبہات کو دُور فرمایا جو انہوں نے اپنی معلومات میں داخل کر لیے تھے بالخصوص اس آیت کو دیکھو،

قل من انزل الکتاب الذی جاء به موسیٰ۔

اور جب ان لوگوں نے کہا،

مال هذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق۔

تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ:

قل ماکنت بدعاً من الرسل۔

(آپ کہہ دیجئے کہ میں رسولوں میں سے کوئی انوکھا اور عجیب نہیں ہوں)

ایسی ہی بہت سی مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اگرچہ راہِ راست سے دُور ہٹ گئے تھے لیکن جو علمی حصّہ ان میں باقی رہ گیا تھا اس کے ذریعہ سے ان پر حجت قائم ہو سکتی تھی۔ اہلِ جاہلیت میں جو لوگ حکیم ہوئے ان کے خطبوں کو دیکھو مثلاً قس بن ساعدہ، زید بن عمرو بن نفیل اور عمرو بن لحی سے پیشتر کے نیک لوگوں کے کلام کو دیکھو گے تو سب میں یہ بات مفصلاً معلوم ہو گی بلکہ ان کے کلام میں اگر نہایت غور و خوض کرو گے تو ان کے فضلاء اور حکماء کو پاؤ گے کہ وہ عالم معاد اور فرشتوں وغیرہ کا اعتقاد رکھتے تھے۔" (۱۰۴)

آگے لکھتے ہیں:

"اور یہ سب وہ باتیں تھیں جو ان میں حضرت اسماعیل کے طریقہ سے وراثتہً چلی آئی تھیں اور اہل کتاب سے ان کو حاصل ہوئی تھیں۔ ان کو بخوبی علم تھا کہ انسان کا اصلی کمال یہی ہے کہ وہ اپنے رب کے سامنے سرنگوں ہو اور انتہائی کوشش سے خدا کی عبادت کرے اور عبادت کے ابواب میں سے ان کے ہاں ایک طہارت بھی تھی اور غسلِ جنابت تو ان کے یہاں کا ایک معمول تھا اور اسی طرح ختنہ اور تمام فطری خصائل ان میں تھے۔ توریت میں ہے کہ اللہ نے ختنہ کو حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد کے لیے ایک نشان قرار دیا تھا اور اس وضو کو مجوس اور یہود وغیرہ سب کیا کرتے تھے اور حکماء عرب بھی اس کے پابند تھے اور ان میں نماز بھی مروج تھی۔ حضرت ابو ذرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے نماز پڑھا کرتے تھے اور قس بن ساعدہ الایادی بھی نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہود، مجوس اور بقیہ عرب میں نماز کے تعظیمی افعال مروج تھے خاص

طور پر سجود کے پابند تھے اور دعا و ذکرِ الٰہی سے متعلق اقوال بھی تھے اور وہ لوگ زکوٰۃ بھی دیا کرتے تھے اور مہمان کی ضیافت کرنا، مسافر کو کھانا کھلانا، کسی کے اہل و عیال کا نفقہ مساکین کو صدقہ دینا اہلِ قرابت سے صلہ رحمی کرنا اور مصائبِ حق میں مدد کرنا ان کا دستور تھا اور یہ سب زکوٰۃ میں داخل تھے۔ انھی امور سے ان کی مدح ہوتی تھی اور انہی امور کو انسان کا کمال اور اس کی سعادت سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے آپ سے عرض کیا تھا کہ "اللہ آپ کو رسوا نہ کرے گا کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ مہمانوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ دوسروں کے عیال اور ضعفاء کے کفیل ہوتے ہیں۔ حوادث میں لوگوں کی اعانت کرتے ہیں۔" ایسا ہی ابنِ دغنہ نے حضرت ابوبکرؓ کی نسبت کہا تھا اور وہ لوگ صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک روزہ رکھا کرتے تھے اور مسجد میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ اور حضرت عمرؓ نے زمانۂ جاہلیت میں ایک شب کے اعتکاف کی نذر کی تھی اور رسولؐ اللہ سے اس بارے میں استفسار کیا تھا۔ اور عاص بن وائل نے وصیت کی تھی کہ میری جانب سے فلاں فلاں غلام آزاد کیے جائیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اہل جاہلیت مختلف تعظیمات کے ذریعہ اللہ کی عبادت کیا کرتے تھے لیکن حجِ بیت اللہ اور اس کے شعائر کی تعظیم اور اشہر حرم تو اہلِ عرب میں ایسے مشہور رہے تھے جو کسی پر مخفی نہیں۔ ان کے پاس کئی قسم کے منتر اور تعویذات بھی تھے لیکن ان میں شرک کی باتیں داخل کر دی تھیں۔ ذبح کرنا اور گردن میں برچھا مارنا ان کا طریقہ تھا، نہ وہ ذبیحہ کا گلا گھونٹتے تھے اور نہ پیٹ چاک کرتے تھے۔ وہ بقیہ دین ابراہیمؑ پر قایم تھے۔" (۱۰۵)

اور اسی سلسلۂ بیان میں آگے لکھتے ہیں،

"ان لوگوں کے کھانے میں، پینے میں، لباس میں، دعوتوں میں، مردوں کے دفن کرنے میں، نکاح، طلاق، عدت، سوگ اور خرید و فروخت و معاملات میں نہایت مستحکم طریقے متعین تھے جن کے ترک کرنے پر لوگوں کو ملامت کی جاتی تھی اور ہمیشہ سے وہ محارم کو جیسے بیٹیاں، مائیں، بہنیں وغیرہ حرام سمجھتے تھے۔ ظلم اور تعدی کے موقع پر ان کے ہاں سزائیں مقرر تھیں جیسے قصاص، دیت اور قسامت۔ اسی طرح زنا اور چوری کی سزائیں مقرر تھیں۔ نیز ایران و روم کی سلطنتوں کے ذریعہ سے ان میں منزلی اور تمدنی تدابیر و علوم بھی آ گئے تھے۔ لیکن ان میں بدکاری کی کثرت ہو گئی تھی۔ آپس میں ایک دوسرے کو قید کر کے اور لوٹ مار کر کے ظلم کرتے تھے۔ زنا، فاسد نکاح اور سود خوری خوب پھیل گئی تھی۔ نماز اور ذکرِ الٰہی کو بالکل ترک کر دیا تھا اور ان کی طرف کچھ توجہ نہ کرتے تھے۔ پس ان حالات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ آپ نے ان کے تمام امور میں غور و خوض کیا۔ ان میں سے جو حصہ ملتِ ابراہیمی کا صحیح تھا اس کو باقی رکھا اور اس پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی اور آپ نے اسباب و اوقات، شروط و ارکان، آداب و مفسدات، رخصت و عزیمت اور ادا و قضا کی تعلیم دے کر انھیں منضبط کر دیا اور گناہوں کی روک تھام کے لیے حدود، سزائیں اور کفارات معین فرمائے۔ ترغیب اور ترہیب کے ذریعہ دین کو ان کے لیے آسان کر دیا، گناہوں کے تمام ذرائع بند کر دیے اور ان امور پر آمادہ کیا جن سے نیکی کی تکمیل ہوتی ہے..... ان کی تمام تحریفات کو مٹا دیا اور ان کے مٹانے میں انتہائی کوشش کی اور جو رسوم صحیح تھیں ان کو باقی رکھا اور ان کا حکم فرمایا اور جس قدر ان کی رسوم فاسدہ تھیں ان سے روک دیا اور خلافتِ کبریٰ کو ان میں قایم کیا۔" (۱۰۶)

بہرحال اس طرزِ استدلال سے فائدہ یہ ہوا کہ داعی کے متعلق یہ بدگمانی پیدا نہیں ہوتی کہ یہ کوئی ایسا شخص ہے جو انفرادیت کے زعم میں تمام ماضی پر خطِ تنسیخ پھیرنا چاہتا ہے اور اپنی شخصیت کا سکہ جمانا چاہتا ہے بلکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ہمارے ہی اگلوں کا ورثہ ہماری طرف منتقل کرنے آیا ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے مخاطب سے لڑائی لڑنے یا براہِ راست چوٹ کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش فرمائی کہ جن اصولوں پر اشتراک و اتحاد ہے اس کے مشترک پہلوؤں کو استدلال کے ذریعہ واضح کر دیا جائے تاکہ مخاطب داعیِ حق کی بات سننے کی طرف راغب ہو۔ اس میں ضد اور ہٹ دھرمی کا مادہ کم سے کم پیدا ہو اور پھر اس کے سامنے ان نتائج کو رکھا جائے جو اس کے اپنے اقرار کردہ اصولوں سے لازمی طور پر نکلتے ہیں تاکہ وہ ان کو اپنی بات سمجھ کر قبول کرنے کی طرف مائل ہو۔ چنانچہ سورۂ عنکبوت میں یہ ہدایت موجود ہے کہ:

ولاتجادلوا اھل الکتاب۔ (۱۰۷)

(اہلِ کتاب سے مجادلہ نہ کرو!)

اور ایک جگہ قرآن میں اس طرح ارشاد ہوا کہ:

قل یٰاھل الکتاب تعالوا الیٰ کلمۃ سواءٍ بیننا وبینکم۔ (۱۰۸)

(اے اہلِ کتاب! اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے)

بہرصورت رسول اللہؐ نے اپنے اور مخاطب کے درمیان قدرِ مشترک کو تلاش کیا اور اس کو بنائے بحث و استدلال بنایا۔ کیونکہ نوعِ انسانی اپنے ظاہری اختلافات کے لحاظ سے کتنی ہی متفرق اور پراگندہ کیوں نہ نظر آئے لیکن اس کے اس تفرق اور پراگندگی کی تہہ میں بے شمار اصول و قواعد ایسے بھی ہیں جن میں سب متحد ہیں۔ آفاق کے قوانین و ضوابط، فطرت کے یقینیات، تاریخ کے مسلمات اور بنیادی اخلاقیات میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں شرق و غرب اور عرب و عجم سب ایک ہی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ (۱۰۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ استدلال اور طریق دعوت کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ وہ لوگ جو ایمان قبول کرتے گئے ان کو ذہنی و فکری طور پر مزید اطمینان حاصل ہوا اور وہ اس پر پوری طرح جم گئے۔ پھر معاشرہ کا وہ طبقہ جو شک و تذبذب اور شبہات و احتمالات کا شکار تھا اور قبولِ حق میں چند رکاوٹوں کے سبب ہچکچا رہا تھا۔ اس طرزِ استدلال سے مطمئن ہو کر داخلِ اسلام ہونے لگا۔ اور تیسرا طبقہ جس میں شامل لوگوں نے اپنی فطری صلاحیتیں بالکل برباد کر ڈالی تھیں اور جن کی فطرت کا قالب بالکل ٹیڑھا ہو چکا تھا۔ ان لوگوں نے البتہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں، پیغام نبویؐ کے سننے اور سمجھنے سے انکار کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ رسول کی تعلیمات بالکل انوکھی ہیں، ان کا یہ انکار بقول قرآن درحقیقت ان کے بہت سے سابق انکاروں کا لازمی نتیجہ تھا۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں آتا ہے کہ:

تلک القریٰ نقص علیک من انباءھا ولقد جاءتھم رسلھم بالبینٰت فما کانوا لیؤمنوا
بما کذبوا من قبل کذٰلک یطبع اللہ علیٰ قلوب الکافرین۔ (۱۱۰)

(یہ بستیاں ہیں جن کے کچھ حالات ہم تم کو سناتے ہیں اور ان کے پاس ان کے رسول نشانیاں لے کر آئے
مگر وہ ایسے نہیں تھے کہ جس چیز کو جھٹلا چکے ہوں اسے مان لیں اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے)

یہود کے معاملہ میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ یہود کی اکثریت نے تعلیماتِ رسولؐ کا انکار کیا۔[۱۱۱] ٹھیک یہی حال نصاریٰ کا ہوا۔ ان کی جماعت کے بڑے حصے نے جو اپنے اگلوں کی تقلید و پیروی میں گمراہ ہو کر دین کی اصل تعلیمات سے محروم ہو چکا تھا اسلام کو نہیں سمجھا بلکہ وہ اس کا دشمن بن گیا۔[۱۱۲] الغرض اس گروہ کا طرزِ عمل جو کچھ بھی رہا ہو۔ اس سے یہ بات سب کے سامنے کھل کر آگئی کہ یہ لوگ جان بوجھ کر تکذیبِ حق کر رہے ہیں۔[۱۱۳] اس طرزِ استدلال کا یہ لازمی اثر بھی ہوا کہ ایک عام عقلی و ذہنی بیداری پیدا ہوئی، صدیوں کا جمود ٹوٹا۔ اب ہر ایک کو جھنجوڑ دیا گیا اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

(د) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ میں دعوت و تبلیغ کا جو فریضہ انجام دیا اس کا جائزہ لینے سے طرزِ تخاطب کا ایک خاص فرق سامنے آتا ہے یعنی ہجرت سے پہلے دعوت و تبلیغ کے ابتدائی دور میں طرزِ تخاطب بالکل عام ہے اور اسی لیے مکی سورتوں میں زیادہ تر "یآیہا الانسان"[۱۱۴] ، یآیہا الناس"[۱۱۵] ، یا قوم"[۱۱۶] وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، اس سے دعوت دین کی عمومیت و ہمہ گیری ثابت ہوتی ہے۔ البتہ جب ایک مدت کی دعوت و تبلیغ کے بعد قوم پر اللہ کی حجت پوری ہو گئی اور نہ ماننے والے اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ خود پیغمبر کے قتل کے منصوبے بنانے لگے تو اس وقت صاف صاف یآیہا الذین کفروا کے ذریعہ خطاب کا رُخ بدل دیا گیا۔[۱۱۷] کیونکہ اب حق و باطل واضح ہو چکا تھا اور مکہ کی سرزمین سے تمام سعید روحوں کو ایک رشتۂ ایمانی میں پرو کر بالکل علیحدہ گروہ کی شکل دے دی گئی تھی۔[۱۱۸] اس لیے اس کے بعد خطاب کا رُخ بھی یآیہا الذین اٰمنوا کے الفاظ میں ڈھل جاتا ہے اور پھر مدنی زندگی میں زیادہ تر اسی انداز پر ہر گروہ کی تفریق کر کے علیحدہ علیحدہ خطاب کیا جاتا ہے۔

طرزِ تخاطب کے سلسلہ میں ایک اہم پہلو یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ رسولؐ اللہ نے اپنی تعلیم و تلقین کے لیے جو زبان اور انداز اختیار کیا وہ انتہائی مؤثر اور دلنشین تھا۔ کلام میں نامانوس الفاظ، پیچیدہ عبارات، قواعدِ صرف و نحو اور محاورات عام کی مخالفت، دُور از کار استعارات، بعید از فہم تلمیحات، غیر واضح تشبیہات و کنایات اور جملوں کی ترکیب و ترتیب میں ایچ پیچ بالکل نہیں۔ بلکہ اندازِ بیان اور کلام بالکل صاف، آسان، شستہ، پاکیزہ اور مختصر ہے۔[۱۱۹] اور اس کی دُوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کلام میں محض استدلال ہی نہیں ہے اور نہ صرف یہ کہ خشک فلسفیوں کی طرح عقل ہی کو خطاب کیا گیا بلکہ کلام میں براہِ راست انسان کے اعلیٰ جذبات سے اپیل موجود ہے۔ مزید برآں خطاب کا انداز سرد نہیں بلکہ اس میں گرمی ہے، جوش و جذبہ ہے اور اس پیمانے پر ہے کہ جس کی تہہ میں اخلاص کی شدت کو ہر مخاطب محسوس کر سکتا تھا۔[۱۲۰] اگرچہ کلام میں شاعر کی طرح کوئی ہیر پھیر نہیں،[۱۲۱] کاہنوں کی طرح کوئی راز اور سریت نہیں[۱۲۲] اور جھوٹوں اور کاذبوں کی طرح تصنع اور بناوٹ نہیں[۱۲۳]، اس کے باوجود کلام میں بلا کی شیرینی، صداقت، اخلاص اور تاثیر ہے۔[۱۲۴] اس طرزِ کلام نے بلاشبہ لاتعداد دلوں کی کایا پلٹ دی اور انسانوں کے اس انبوہِ عظیم کو جو اس سے پہلے بالکل اندھا، بہرا اور گونگا تھا اور گنتی کے چند نفس پرست انسانوں کے پیچھے لگا ہوا خدا فراموشی اور دنیا پرستی کی

راہ پر چلا جا رہا تھا۔ دفعۃً اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کانوں سے سننے کے قابل بنا دیا جو بھی ایک مرتبہ گفتگو کرنے گیا متاثر ہوئے بغیر نہ لوٹ سکا۔[۱۲۵]

(۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس میں شک نہیں کہ تمام انسانوں کے لیے ہوئی تھی لیکن ظاہر ہے کہ پہلے مرحلہ میں اہل عرب کی اصلاح کے بغیر کسی عالمگیر اصلاح کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ آغاز کار میں رسول اللہ کا سب سے پہلے اپنی ہی قوم کے ارباب اثر کا انتخاب کرنا بالکل فطری اور منطقی تھا۔ یہ بات بالکل صاف ہے کہ عوام الناس علم و عمل اور اخلاق و کردار میں ان لوگوں کے تابع ہوتے ہیں جو سوسائٹی میں اثر و اقتدار رکھتے ہیں۔ چنانچہ ضرب المثل مشہور ہے کہ:

الناس علیٰ دین ملوکھم۔

یعنی لوگ ارباب اقتدار کے طریقے پر چلتے ہیں۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر ارباب اقتدار اصلاح قبول کر لیں تو عوام الناس خود بخود ٹھیک ہو جاتے ہیں[۱۲۶]۔ اور درحقیقت یہی اونچے طبقات وہ ہوتے ہیں جن کی بیماریوں کی چھوت سے دوسرے بھی بیمار ہو جاتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ان کے علاج کی فکر پہلے کی جائے تو دوسروں کے علاج میں زیادہ زحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔[۱۲۷]

مزید برآں جو طبقہ قوم میں اونچا ہوتا ہے عموماً ذہنی اعتبار سے بھی وہی برتر ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ذہنی برتری ہی اس کو قیادت کی جگہ دلاتی ہے۔ پھر اس طبقہ میں سبھی جو لوگ ذہانت کے ساتھ ساتھ سیرت کی بلندی بھی رکھتے ہیں وہ جب اس دعوت کو قبول کر لیتے ہیں تو ان کی تائید سے دعوت کی قوت دوچند ہو جاتی ہے اور اگر کسی صحیح فکر کو قبول کر لیتے ہیں تو اس کی اساس پر بڑے نظام کو چلا سکتے ہیں۔

ان وجوہات کی بنا پر کوئی دعوت جس کا مقصد ایک اہم فکری و عملی انقلاب ہو اس طبقہ سے اغماض نہیں برت سکتی۔ چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اولین درجہ میں یہ حکم دیا گیا کہ:

فاصدع بما تومر۔[۱۲۸]

(اور تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے صاف صاف سنا دے)

اور یہ کہ:

انذر عشیرتک الا قربین۔[۱۲۹]

(اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ)

اور تاریخ کا ہر طالب یہ جانتا ہے کہ قریبی رشتہ دار قریش کے وہ لوگ تھے جو مکہ کی اعیانی حکومت کے ارباب حل و عقد تھے اور اس کے واسطے سے گویا اہل عرب کی اخلاقی و سیاسی رہنمائی کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم الٰہی کے مطابق قریش کو دعوت دی[۱۳۰]۔ قریش کے سرداروں میں سے ایک ایک کے سامنے دین پیش کیا اور جب ان کی طرف سے شدید نفرت و مخالفت کا اظہار ہوا تو انتہائی جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ ان کے قبول اسلام کے لیے دعائیں بھی کیں[۱۳۱]۔ یہاں

یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ رسول اللہؐ کی مثبت دعوت کے مقابلے میں قریش کے اعلیٰ طبقہ نے یہ منفی رویہ کیوں کر اختیار کیا۔ تو اس کے جواب میں ایک جدید العہد مصنف کا یہ بیان ہمارے نزدیک درست ہے کہ:

"دعوتِ حق کی مخالفت بالعموم وہ کرتے ہیں جو روایتی دینداری یا روایتی مالداری کی وجہ سے نظام جاہلی کے اندر پیشوائی اور سرداری کے مقام پر متمکن ہوتے ہیں۔ یہ ایک طرف تو یہ لوگ آگے چلتے رہنے کی وجہ سے آگے چلنے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ حق کے پیچھے چلنے میں بھی انھیں عار محسوس ہوتا ہے۔ اور وہ بجائے اس کے کہ حق کے پیچھے چلیں کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ حق کو اپنے پیچھے چلائیں۔" (۱۳۲)

پھر آگے لکھتے ہیں کہ:

"اس طرح کی ذہنیت کے لوگوں کو جب کوئی ایسی دعوت چیلنج کرتی ہے جو ان کی روایتی دینداری کے خلاف ہوتی ہے یا جس کی زد ان کی خواہشوں پر پڑتی ہے تو یہ تلملا کے اس کی مخالفت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں بالخصوص اس صورت میں ان کی مخالفت بہت ہی سخت و شدید ہو جاتی ہے جب یہ دعوت ان کے حلقہ کے سوا کسی اور حلقہ سے بلند ہوئی ہو۔" (۱۳۳)

بہر حال قریش کی مذہبی اجارہ داری اور دینی قیادت کو جو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا وہ ان کی مخالفت کا ایک بنیادی سبب بن گیا۔ لیکن مذہبی قیادت کے تحت دراصل مادی وسائل اور مالی آمدنی کا معاملہ بھی قریش کو سخت خطرے میں نظر آ رہا تھا کیونکہ کعبہ کی مجاوری و کلید برداری اور خانہ کعبہ سے متعلق دوسرے اہم مناصب ذریعۂ منفعت بنے ہوئے تھے۔ دوسرا اہم سبب ان کی مخالفت کا یہ تھا کہ رسول اللہؐ جو دین پیش کر رہے تھے وہ ان کے اپنے آبائی دین کے خلاف تھا اور اس آبائی دین اور اس کی روایات کا ان کو اس قدر پاس تھا کہ اس کے خلاف کسی حلقہ سے کوئی بات سننا انھیں گوارا نہ تھا۔ علاوہ ازیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن نے ان کی ایک ایک بات کو کھول کر رکھ دیا۔ ان کے اخلاق و معاشرت پر سخت گرفت کی اور ان کی خرابیوں کی نشاندہی کی۔ (۱۳۴) اس سے یہ تو ضرور ہوا کہ اچھائی اور برائی کا فرق واضح ہو گیا۔ کھرا اور کھوٹا سب کے سامنے آ گیا لیکن کفار و مشرکین کو یہ بات سخت ناگوار گزری کہ ہمارا سارا بھرم اپنے تمام غرور و وقار کے باوجود کھلتا جا رہا ہے اور ملمع کاری کا نقاب ہٹ کر اصل بھیانک کردار لوگوں کے سامنے آتا جا رہا ہے۔ اس چیز نے فطری طور پر ان کو سخت ترین مخالفت پر آمادہ کر دیا۔ ہمارے نزدیک قریش کی مخالفت کا سب سے اہم اور بنیادی سبب یہ تھا کہ رسول اللہؐ کی تعلیمات کے نتیجہ میں دراصل جاہلی معاشرہ کا تار و پود بکھر رہا تھا۔ اس وقت تک حال یہ تھا کہ ان کی اصل معاشرتی تنظیم قبائلی تھی۔ معاشرہ میں کوئی آدمی کسی نہ کسی قبیلہ سے کسی نہ کسی نوع کا تعلق پیدا کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا اور ہر شخص کے لیے یہ بھی لازمی تھا کہ قبیلہ کے نظم کی سختی سے پابندی کرے۔ شیخ قبیلہ کی اطاعت اور قبیلہ کی روایات کا احترام بھی اس کے لیے لازمی تھا۔ بصورتِ دیگر وہ معتوب، مستحق عذاب اور طرد کے قابل تھا۔ ادھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو اس کے نتیجہ میں لوگ پرانے جاہلی معاشرہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس نئے معاشرہ کے رکن بننے لگے جس کی داغ بیل رسول اللہؐ نے دین کی بنیاد پر ڈال دی تھی اور دین کا رشتہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں ایسا رشتہ تھا جس نے تمام آدابِ جاہلیت کو پامال کر ڈالا تھا۔ جو لوگ اسلامی معاشرہ کے رکن

بن رہے تھے انھوں نے اپنے سارے جاہلی مراسم اور معاشرتی آداب کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ وہ ایک طرف تو شیخ قبیلہ، عزیز اقارب، دوست احباب سب کی نصیحتوں اور مرضی و خوشنودی کے علی الرغم مجتمع جدید کے رکن بنتے جا رہے تھے اور دوسری طرف نتائج و عواقب کی پروا کیے بغیر اس میں جڑتے چلے جا رہے تھے اور وہ بھی اس اولوالعزمی اور ثابت قدمی کے ساتھ کہ پھر اس رشتہ کو کوئی چیز منقطع نہ کر سکتی تھی۔ اب باپ بیٹے کے لیے غیر اور بیٹا باپ کے لیے اجنبی بن گیا۔ حسب و نسب کے تمام بت سجدہ ریز ہو گئے۔ امتیاز و افتخار کے جھوٹے معیار باطل قرار پائے۔ گویا اجتماعیت کی ایک نئی بنیاد اور اتحاد و تعلق کی نئی اساس پر جو گروہ بن رہا تھا وہ اہلِ عرب کے لیے کھلا چیلنج بھی تھا اور اس نے ان کے صدیوں پرانے معاشرتی نظم کو بھی درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔

اس صورتِ حال نے اہلِ عرب کو عموماً اور قریش کو خصوصاً انتہائی پریشانی اور سخت غم و اندوہ میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ابن ہشام کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ زمانہ حج کے قریب چند اشخاص ولید بن مغیرہ سے یہ مشورہ لینے آئے کہ:

"اب حج کے دن آ رہے ہیں ہر چہار جانب سے اہلِ عرب تمہارے ہاں آئیں گے اور تمہارے صاحب یعنی حضور کا حال وہ سُن چکے ہیں۔ پس اب تم رائے دو کہ اس کا کیا بند و بست کرنا چاہیے؟" (۱۳۵)

اس کے جواب میں ولید بن مغیرہ نے حضورؐ کے لیے کاہن، مجنون، شاعر وغیرہ کے الزامات کی تردید کرتے ہوئے کہا:

"اے قریش! جس قدر باتیں تم نے بیان کیں ان میں سے جو بات تم کہو گے فوراً معلوم ہو جائے گا کہ یہ جھوٹ اور باطل ہے مگر یہی بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ تم ساحر کہو کہ اس سحر ہی کے سبب سے محمد نے لوگوں میں تفرقہ ڈال دیا ہے اور اس کا قول ایسا ہے کہ اس سے میاں بیوی اور باپ بیٹے اور بھائی اور بھائی اور کنبے اور برادری میں جُدائی ہو جاتی ہے۔" (۱۳۶)

اسی طرح ایک مرتبہ قریش نے عقبہ بن ربیعہ کو حضورؐ سے گفتگو کے لیے بھیجا تو اس نے آ کر کچھ الزامات لگاتے ہوئے یہ کہا کہ:

"اے میرے بھتیجے! تم جانتے ہو کہ ہمارا خاندانی شرف کیا ہے اور نسب میں مقام و مرتبہ کیا ہے اور تم یہ بھی دیکھتے ہو کہ تم اپنی قوم کے پاس ایک ایسی چیز لائے ہو جس کے ذریعے سے تم نے اسے متفرق و منتشر کر دیا ہے۔" (۱۳۷)

ایک اور موقعہ پر تمام سردارانِ قریش حضورؐ سے مباحثہ کرنے کے لیے جمع ہوئے پھر حضورؐ کو اپنے پاس بلوایا اور جب آپ اس مجلس میں تشریف لے آئے تو سب نے متفق اللفظ یہ شکایت کی کہ:

"اے محمد! ہم نے تم کو گفتگو کرنے کے لیے بلایا ہے کیونکہ واللہ ہم عرب میں سے کسی اور شخص کو ایسا نہیں جانتے کہ جس نے اپنی قوم کو ایسی آفت میں مبتلا کیا ہو۔ تم ہمارے باپ دادا کو بُرا کہتے ہو، ہمارے معبودوں کو گالیاں دیتے ہو، ہمارے نوجوانوں کو بیوقوف بناتے ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم نے ہماری جماعت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں۔" (۱۳۸)

رسول اللہؐ پر باپ کو بیٹے سے، بیٹے کو باپ سے اور بھائی سے بھائی کو جُدا کرنے کا یہ الزام اس قدر مستحکم تھا کہ بدر کے موقع پر جب ابُوجہل نے دیکھا کہ اس نئے دین نے قریش کو قریش ہی کے خلاف صف آرا کر دیا ہے تو اس نے میدانِ جنگ میں

پورے جوش کے ساتھ اللہ سے یہ دعا کی کہ :

اللھم اقطعنا للرحم و اٰتنا بما لا یعرف فاحنه الغداۃ۔ [۱۳۹]

(اے اللہ! ہم میں سے جو سب سے زیادہ رشتہ رحم کا توڑنے والا اور اس بدعت کا باعث ہوا ہو
اس کو کل شکست دیجیو!)

بہر حال قریش کی مخالفت کا انداز کوئی بھی ہو اور انھوں نے رسول اللہؐ کی عداوت میں خواہ کسی بھی الزام کا سہارا لیا ہو واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہؐ کی دعوت کے جواب میں ان کے طرزِ عمل سے نہ صرف یہ کہ خود ان پر حجت قائم ہو گئی بلکہ قریش کے روّسا بلکہ کہنا چاہیے کہ اربابِ ریاست کا انکار پوری قوم پر اظہر من الشمس ہو گیا اور ہر صاحبِ عقل یہ سمجھ گیا کہ ان کا انکار کن اسباب کا نتیجہ ہے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ عقل و شعور رکھنے والے لوگوں کی کثیر تعداد پیغامِ نو کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئی اور دوسرا فائدہ ان لوگوں کے حق میں ظاہر ہوا جو اس وقت تک خاموش تبلیغ کے نتیجہ میں حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے تھے مزید برآں جو لوگ اسلام قبول کرتے جا رہے تھے[۱۴۰] ان کے دلوں میں بڑوں کی مخالفت سے جھجکنے اور ڈرنے کے بجائے حق کی حمایت میں ایک غیر معمولی رفعت کا احساس پیدا ہوا اور اس چیز نے ان کو ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے اتنا اونچا کر دیا کہ وہ اپنی بے سرو سامانی کے باوجود بڑے بڑے غرق آہن سورماؤں اور حسب و نسب اور جاہ و جلال رکھنے والے صنادید کے مقابلہ میں ڈٹ گئے۔

(۵) ابن خلدون کے نزدیک چونکہ اہلِ عرب تہذیب و تمدن سے گریزاں، مدنی زندگی کے لوازمات سے عاری تھے اور ان کی فطرت انتہائی سادہ تھی اس لیے وہ تمام اقوامِ عالم میں قبولیتِ حق و خیر کی استعداد سب سے زیادہ رکھتے تھے[۱۴۱] ابن خلدون کا یہ نظریہ بجا طور پر تاریخی صداقت کا حامل ہے۔ دنیا کی متمدن ترین مملکتوں اور جزیرہ نمائے عرب کے درمیان لق و دق صحرا اور بے آب و گیاہ میدان حائل تھے۔ اسی وجہ سے تہذیب و تمدن کی نیرنگیاں اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اثرات سے سرزمین عرب محفوظ تھی۔ اور پھر سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عرب وہ قوم تھی جو کسی بیرونی تہذیب کے قدموں سے پامال نہ ہوئی تھی اس کے تمام قوائے فطری علیٰ حالہٖ قائم تھے۔ نیز ان کی طبیعت پر جوش اور فطرت بے نقش تھی اس لیے ان کی لوحِ حیات پر نقش تازہ ثبت کیے جانے کی گنجایش موجود تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین کو پیش کیا وہ بجائے خود انسان کی فطرت اور اس کی حاجیات و ضروریات کے عین مطابق ہے جس کی تائید قرآن کے ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ :

فاقم وجھك للدین حنیفا۔ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا۔ [۱۴۲]

ہر طرف سے کٹ کر اپنے رُخ کو دین کی طرف سیدھا کر لو اور اللہ کی بنائی ہوئی اس فطرت کی پیروی کرو
جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے)

گویا اس دین کا سرچشمہ فطرت کے چند بنیادی حقائق ہیں اور اس کی صحیح نوعیت "دینِ فطرت" کی ہے۔ چنانچہ رسول اللہؐ کے

لائے ہوئے دین کی یہی وہ بنیادی صفت تھی جس نے اہلِ عرب کی ایک بڑی تعداد کو اس کی طرف مائل کیا اور اس کے لیے ان کے دلوں کو کھول دیا۔ اس دین کو قبول کر لینے کے بعد ان کی زندگیوں میں جو انقلاب واقع ہوا اس نے بجائے خود معاشرہ کے دوسرے افراد کو متاثر کیا اور اس طرح یہ دائرہ بڑھتا چلا گیا۔ دین کی تعلیمات کی اثر انگیزی اور انقلاب آفرینی کا سب سے بڑا ثبوت ہمیں اس وقت ملتا ہے جب نجاشی (شاہِ حبش) کے دربار میں تقریر کرتے ہوئے جعفر طیار یہ اعتراف کرتے ہیں کہ:

"اے بادشاہ! ہم لوگ پہلے سخت جاہل تھے، بُتوں کی پرستش ہمارا مذہب تھا مردار خوری ہم کرتے تھے، خواہش اور گناہ کا ارتکاب ہمارا وطیرہ تھا، قطع رحم اور پڑوسی کی حق تلفی اور ظلم و ستم کو ہم نے جائز کر رکھا تھا جو زبردست ہوتا وہ کمزور کو کھا جاتا، پس ہم ایسی ہی ذلیل حالت میں تھے کہ اللہ نے ہم پر کرم کیا اور اپنا رسول ہمارے پاس بھیجا جس کے نسب اور شرف اور صدق اور امانت اور عفاف سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ اس رسول نے ہم کو توحیدِ الٰہی اور معرفت کی طرف بلایا اور بت پرستی جو ہمارے باپ دادا سے چلی آتی تھی اس سے ہم کو منع کیا اور صدق مقال اور اداے امانت اور صلہ رحم اور ہمسائے کے حقوق اور گناہوں سے بچنے اور خواہش کے ترک کرنے کا حکم دیا اور یتیم کا حق تلف کرنے اور عورتوں پر تہمت لگانے سے منع فرمایا اور اللہ واحد کی عبادت اور نماز اور روزہ اور زکوٰۃ کو ہم پر فرض کیا۔ . . . ہم نے اس رسول کی تصدیق کی اور ان پر ایمان لائے اور ہم نے شرک و کفر کو چھوڑ دیا اور جس چیز کو رسول نے حلال بتایا ہم نے حلال سمجھا اور جس کو حرام بتایا ہم نے حرام سمجھا۔" (۱۴۳)

حضرت جعفر کی یہ تقریر کم از کم یہ بات تو صاف طور پر ثابت کر رہی ہے کہ رسول اللہ کی تعلیمات کو بہر حال لوگوں نے قبول کیا اور ان تعلیمات کو تسلیم کر لینے والوں کی زندگیوں پر انقلابی اثرات رونما ہوئے۔ اب ظاہر ہے کہ جو لوگ معاشرہ میں ایسی واضح تبدیلیاں دیکھ رہے تھے اس کی طرف فوری طور پر متوجہ ہونے پر مجبور ہو گئے۔ یہاں ایک اہم نکتہ قابلِ لحاظ ہے کہ رسول اللہ کی پیش کردہ تعلیمات کے اثرات سے زندگیوں میں تبدیلیاں صرف اسی لیے نہیں آئیں کہ ان کی فطرت سادہ تھی بلکہ فی الحقیقت زندگی میں تبدیلی اقتضائے ایمانی تھی۔ یعنی جو لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے ان کو رسومِ جاہلیت کا ترک کرنا اور اخلاق فاضلہ کو اختیار کرنا بر بنائے ایمان ضروری تھا۔ بخاری کی متعدد روایتوں میں رسول اللہ نے یہ فرمایا ہے کہ جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اُسے چاہیے کہ پڑوسی کو نہ ستائے، مہمان کی ضیافت اور توقیر کرے، اچھی بات کہے یا خاموش رہے، زنا نہ کرے، شراب نہ پئے اور چوری نہ کرے۔ (۱۴۴)

مختصر یہ کہ رسومِ جاہلیت کو کمی زندگی میں اوّلاً تقاضائے ایمانی کے طور پر مٹا دیا گیا اور پھر جب مدینہ میں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آگیا تو قانونی و دستوری طور پر ختم کر دیا گیا۔

(نمر) اوپر ہم نے جعفر بن ابی طالب کی تقریر کے بعض حصے نقل کیے تھے۔ انہوں نے اس تقریر میں یہ بھی کہا تھا کہ ہماری قوم نے اس دین حق کے اختیار کرنے پر ہم کو تکلیفیں پہنچائیں اور ہم کو بہت ستایا تاکہ ہم اس دین کو ترک کر دیں اور دوبارہ بُتوں کی پرستش اختیار کریں اور جس طرح کہ وہ خبائث کو حلال سمجھتے ہیں ہم بھی حلال سمجھیں۔ پس جب ان کا ظلم

ہم پر حد سے زائد ہُوا اور انہوں نے ہمارا وہاں رہنا دشوار کر دیا تو ہم وہاں سے نکل کھڑے ہُوئے اور آپ کے دامنِ پناہ میں آ گئے۔" (۱۴۵)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آغازِ اسلام کے بعد ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والے اصحاب کو شدید تکالیف، بے انتہا مظالم اور بہت سی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ترغیب و ترہیب کا کوئی انداز ایسا نہیں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صاحبانِ ایمان پر نہ استعمال کیا گیا ہو۔ ان کو ڈرایا دھمکایا گیا،[۱۴۶] ان پر طرح طرح کے الزامات اور پھبتیاں کسی گئیں، متہم کیا گیا اور دعوتِ محمدی کو روکنے کی ہر ممکن کوششیں کی گئیں۔ قریش نے رسول اللہ کو عاجز کرنے کے لیے یُوں تو بہت سے حربے استعمال کیے لیکن شاید مکی دَور کے دو واقعات قابلِ ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ سنہ ۷ نبوی میں قریش نے بنو ہاشم کا معاشرتی مقاطعہ کر دیا۔ اس سے زیادہ شدید اذیت پہلے کبھی نہ دی گئی تھی۔ محرم سنہ ۷ نبوی سے لے کر سنہ ۱۰ نبوی تک تین سال کا عرصہ قریش کی ظالمانہ تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ ایک حلف نامے کے ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خاندان بنو ہاشم کو غیر معینہ مدت کے لیے معاشی و معاشرتی دونوں اعتبار سے مفلوج کر دینے کا منصوبہ بنایا گیا۔[۱۴۷] لیکن وہ تین سال سے زیادہ برقرار نہ رہ سکا اور اس مقاطعہ کے نتائج اگرچہ کفّارِ قریش کی توقعات کے مطابق نہ نکل سکے، لیکن اس دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور بنو ہاشم کو بہر حال مبتلائے عذاب رکھا گیا۔

اور دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ہجرت سے کچھ پہلے رسولؐ اللہ کے قتل کا منصوبہ کفّارِ قریش کے ایک خصوصی اجلاس میں تیار کیا گیا۔ دار الندوہ میں مکّہ کے اعاظم و اکابر کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں تمام خاندانوں کے سر برآوردہ لوگوں نے شرکت کی[۱۴۸] حاضرین نے مختلف تجاویز پیش کیں۔ کسی نے کہا آپ کو قید کر دیا جائے، کسی کی تجویز یہ تھی کہ جلا وطن کیا جائے۔ آخر میں ابو جہل نے نہایت غور و خوض کے بعد کہا کہ محمد کو قید یا جلا وطن کرنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ مناسب بات یہ ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ قتل میں بھی سب قبیلوں کے لوگ حصّہ لیں۔ ہر قبیلہ میں سے ایک ایک جوان منتخب کیا جائے اور یہ سب مل کر محمد کی شمعِ حیات کو گُل کر دیں۔ اس صورت میں قتل کی ذمہ داری تمام قبیلوں پر آ پڑے گی اور محمد کے قبیلہ میں اتنی ہمت نہ ہوگی کہ وہ ان کے خُون کا بدلہ لینے کے لیے سب قبیلوں سے جنگ کر سکے۔ زیادہ سے زیادہ خون بہا ادا کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا جائے گا۔"[۱۴۹] "ملاءِ قریش" کا یہ منصوبہ اگرچہ بڑی مستعدی سے بنایا گیا تھا تاہم تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ مخالفین و کفّار کی یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی اور رسولؐ اللہ بحفاظت تمام مدینہ تشریف لے گئے۔

قریش کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب پر مظالم کا یہ دور مختلف نتائج بروئے کار لایا۔ مثلاً:

(۱) مسلمان آزمائشوں کی بھٹّی سے گزر کر کندن بن گئے۔ ان کے ایمان و اسلام کو جانچ لیا گیا اور سب پر یہ واضح ہو گیا کہ ایمان کی قوت کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ یہ بھی عیاں ہو گیا کہ ایمان و اسلام سے زندگی میں کیسی انقلابی تبدیلیاں آجاتی ہیں۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا اخلاص وللّٰہیت الم نشرح ہوگئی۔ دُنیا نے دیکھ لیا کہ داعیِ حق اور اس کے متبعین نہ کسی اجر کے طالب ہیں نہ داد و دہش یا منصب وجاہ، یا مال ومنال کے خواہشمند ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ کسی لالچ یا خوف سے بھی متاثر نہیں ہوتے۔ اور تمام دنیاوی محبتوں سے بالاتر سب کی فلاح وصلاح چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کے اس کھرے اخلاص نے لوگوں کے دلوں میں بالآخر ہمدردی کے جذبات پیدا کیے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنو ہاشم کے معاشی ومعاشرتی مقاطعہ پر کم از کم پانچ آدمیوں یعنی ہشام بن عمرو (بنو عامر) زہیر بن ابی امیہ (بنو مخزوم) مطعم بن عدی (بنو نوفل) اور ابوالبختری وزمعہ بن الاسود (بنو اسد) نے اس ظلم وتشدد کے خلاف آواز بلند کی اور سراپا احتجاج بن گئے۔ انہوں نے صاف صاف کہا:

یا اھل مکہ، أنا کل الطعام ونلبس الثیاب وبنو ھاشم ھلکی لایباع ولا یبتاع منھم، واللّٰہ لا اقعد حتی تشق ھٰذہ الصحیفۃ القاطعۃ الظالمۃ۔(۱۵۰)

(اے اہلِ مکہ! یہ کیا انصاف ہے کہ ہم کھائیں، پہنیں، آرام سے بسر کریں اور بنو ہاشم کو آب ودانہ نصیب نہ ہو؟ خدا کی قسم جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا ہم چین سے نہ بیٹھیں گے)

اور پھر بالآخر انہی لوگوں کی کوششوں سے یہ معاہدہ ختم ہوا۔(۱۵۱)

(۳) ان مظالم اور مخالفت کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ رسولؐ اللہ کی دعوت کا چرچا نہ صرف مکّہ اور پُورے عرب بلکہ دوسرے بلاد وممالک میں بھی پھیل گیا۔ ایک طرف مخالفانہ طور پر قریش اور دوسرے زائرینِ مکّہ نے اطراف وجوانب میں اسلام کا پیغام پہنچایا اور دُوسری طرف اہلِ مکّہ کی سرد مہری اور مخالفت نے رسولؐ اللہ اور آپ کے اصحاب کو مکّہ سے باہر تعلقات استوار کرنے کا موقع عطا کیا۔ ان ہی وجوہ سے صحابہؓ نے دُو مرتبہ حبشہ کی طرف ہجرت کی اور پھر مدینہ کی طرف کوچ کیا۔ علاوہ بریں رسولؐ اللہ نے مکّہ سے باہر طائف میں مضافاتِ مکّہ میں اور حج پر آنے والے دوسرے قبائل کو دعوتِ اسلام دی۔ اور اس طرح اسلام کی تبلیغ وشیوع کا دائرہ بڑی تیزی کے ساتھ دُور دور پھیل گیا۔ اس سلسلہ میں مدینہ کے قبائل اوس وخزرج نے اس دعوت کو سُن کر لبیک کہا نتیجتاً بیعت ہائے عقبہ کا انعقاد ہوا جن کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ آپ مدینہ تشریف لے گئے بلکہ ایک ریاست کی تاسیس فوری طور پر عمل میں آگئی۔ (اس بیعت کا ہم مطالعہ آیندہ کے صفحات میں کریں گے)

غرض یہ تھے وہ بنیادی اسباب وعوامل جو اس نئے معاشرہ کے قیام وتوسیع میں ممد ومعاون ثابت ہوئے اور یہی وہ حالات تھے جن کے تحت اس نوزائیدہ اسلامی معاشرہ نے فروغ پایا۔ بہ الفاظِ دیگر یہ دراصل وہ اقدامات تھے جن کو اختیار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے جاہلی معاشرہ میں انقلاب آفرین تبدیلیاں لائے۔ ان کے ذریعہ اس معاشرہ کے ایک ایک آدمی کو توڑا اور خالص دین کی بنیاد پر نئی وحدت میں جوڑ دیا اور یوں ایک علیحدہ منظم معاشرہ کی تشکیل ہوگئی۔ یہ نیا معاشرہ جاہلی معاشرہ سے بالکل ممتاز ومیز تھا اور اس کے ارکان یعنی صاحبانِ ایمان بھی جاہلی معاشرہ کے ارکان یعنی اہل کفر سے بالکل جداگانہ نظریۂ حیات رکھتے تھے

ایمان اور کفر کی بنیاد پر بننے والے یہ دو علیحدہ علیحدہ گروہ متضاد و مخالف افکار و اعمال کے اعتبار سے مکہ میں ہی متشکل ہو کر سامنے آ گئے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم کی جو سورتیں ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہوئیں ان میں ان دونوں گروہوں کی واضح نشان دہی موجود ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک یہ کہنا غلط ہوگا کہ مکی دور میں ایمان و کفر کی واضح اجتماعیت سامنے نہ آئی تھی۔ اس کے ثبوت میں مکی سورتوں کے متعدد فقرے اور الفاظ قابلِ غور ہیں جن میں نہ صرف اہلِ ایمان و کفر کا امتیاز موجود ہے بلکہ ان دونوں گروہوں کی خصوصیات بھی بتادی گئی ہیں۔[۱۵۲] علاوہ ازیں اوپر کے مباحث میں حضرت جعفر طیار کی جو تقریر نقل کی جا چکی ہے اس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ صاحبانِ ایمان کا ایک علیحدہ گروہ جاہلی معاشرہ سے اُبھر کر سامنے آ رہا تھا۔

مجتمع جدید کی یہ تشکیل و ترتیب اور اہلِ ایمان کا ثبات و استقلال اگرچہ بجائے خود اس بات کا کھلا اعلان تھا کہ بننے والا نیا معاشرہ حسب و نسب، نسل و وطن، لون و لسان اور جاہلی عزّ و افتخار یا دوسرے قسم کے امتیازات و تعصبات سے پاک ہے اور صرف اساسِ ایمان پر قائم ہے۔ اس معاشرہ ایمانی کی تشکیل و تنظیم کے سلسلے میں رسول اللہ نے ایک اہم قدم اور اٹھایا۔ اور وہ یہ کہ دعوت و ارشاد کے بالکل ابتدائی مکی دور میں ہی ان افراد کے درمیان ایک "عقد مواخاۃ" قایم کیا جو اس وقت تک حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے تھے۔ تاریخی شہادت کی رُو سے اس پہلی "مواخاۃ" کا انعقاد مکہ میں ہوا اور جن لوگوں کے درمیان ہوا ان میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کے درمیان
(۲) حضرت حمزہؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ کے درمیان
(۳) حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بن الخطاب کے درمیان
(۴) حضرت عثمانؓ بن عفان اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے درمیان
(۵) حضرت زبیرؓ بن العوام اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے درمیان
(۶) حضرت عبیدہؓ بن الحارث اور حضرت بلال مولیٰ ابی بکر کے درمیان
(۷) حضرت مصعبؓ بن عمیر اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے درمیان
(۸) حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح اور حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ کے درمیان
(۹) حضرت سعیدؓ بن زید اور حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ کے درمیان[۱۵۳]

ٹھیک یہی فہرست ابنِ سید الناس نے بھی نقل کی ہے[۱۵۴] البتہ زرقانی علی المواہب میں یہ لکھا ہے کہ حضرت زبیرؓ بن العوام کی مواخاۃ حضرت طلحہؓ سے کرائی گئی تھی۔[۱۵۵]

بہرحال یہ تو چند نام تھے ورنہ بقول زرقانی مواخاۃ ان کے علاوہ اور دوسرے صحابہ کے درمیان بھی ہوئی تھی۔[۱۵۶] مکہ کی یہ مواخاۃ کہاں ہوئی تھی اس کا ذکر مورخین نے نہیں کیا ہے۔ لیکن یہ بالکل واضح ہے کہ اس کا انعقاد یقیناً دارِ ارقم میں ہوا ہوگا۔ اس لیے کہ مذکورہ صحابہ میں سے حضرت عمرؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت مصعبؓ بن عمیر کے بارے

میں مشہور اور صحیح بات یہ ہے کہ حضرات اسی وقت ایمان لائے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دار ارقم میں مقیم تھے۔
مذکورہ مواخاۃ نے مکہ کی اجتماعی و سیاسی زندگی میں اہم کردار ادا کیا اور اس سے متعدد نتائج برآمد ہوئے، جن میں سے مندرجہ ذیل کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا:

(۱) اس مواخاۃ کے ذریعہ ایک آدمی کو دوسرے آدمی کا بھائی محض دین و ایمان کی بنیاد پر اور بغیر کسی ذاتی یا نفسانی غرض و غایت کے، صرف اللہ کی خاطر بنایا گیا اور اس طرح ایک قبیلے اور دوسرے قبیلے، ایک نسل اور دوسری نسل اور ایک رنگ اور دوسرے رنگ پر اللہ کا رنگ غالب آ گیا اور اللہ کے رنگ سے بہتر بھلا کون سا رنگ ہے۔[۱۵]

(۲) اس مواخاۃ کے ذریعہ گویا رسول اللہ نے اپنے تمام دعووں کو ایک طرح کی قانونی شکل دے دی اور عملاً اس بات کا ثبوت فراہم کر دیا کہ ایمان کی اساس پر بننے والا معاشرہ سب سے الگ ہے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جاہلی معاشرہ کی تمام اقدار کو پامال کرتے ہوئے حضرت حمزہ کا بھائی ایک آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کو بنایا جاتا ہے۔ ابو عبیدہ بن الجراح کو سالم مولیٰ ابو حذیفہ سے وابستہ کیا جاتا ہے اور عبیدہ بن حارث، بلال حبشی کے بھائی بنائے جاتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ پستی و بلندی، اشرافت و رذالت اور خوب و ناخوب کے پیمانے بدل گئے۔ سب نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ لیا کہ دین کے رشتہ میں منسلک ہونے والے مندرجہ بالا تمام افراد اگرچہ بالکل متضاد معاشرتی منصب کے مالک تھے مگر اخوت کے نظم میں مساوی طور پر پرو دیئے گئے۔ مواخاۃ نے سب کو ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا۔ امیر و غریب، شریف و رذیل، عالم و جاہل، عام و خاص، غلام و آقا یا کسی بھی ایک اور دوسرے طبقہ کے درمیان نہ تو نفرت و غرابت پیدا کی گئی اور نہ ان طبقات کو آپس میں لڑا کر کوئی مادی منفعت یا دنیاوی مقصد حاصل کیا گیا۔

(۳) اس اخوت و مساوات کے نتیجہ میں اصولی طور پر ایک جدید سیاسی مجتمع ممتاز و ممیز ہو گیا۔

(۴) مواخاۃ نے مکہ کے سخت شکن حالات میں اہل ایمان کو ایک دوسرے کے نفع و نقصان، رنج و غم اور خوشی و مسرت میں برابر کا شریک قرار دیا اور حالات کے مقابلہ کا انفرادی و اجتماعی حوصلہ بخشا۔

مختصر یہ کہ مندرجہ بالا اقدامات کے ذریعہ رسول اللہ نے اوّلاً مکہ میں تمام جانبازان ایمان کی ایک وحدت بنائی اور پھر ہجرت مدینہ کے فوراً بعد اسی وحدت ایمانی کو اور زیادہ وسیع اور مضبوط بنیادوں پر قائم فرما دیا۔ اہل ایمان کے درمیان عہد مواخاۃ کی تجدید ثبوتی اور بالآخر رسول اللہ معاشرہ کی تکمیل سے فارغ ہو گئے اور پھر یہی وہ مرحلہ ہے جب کہ مدینہ میں ریاست کا قیام عمل میں آتا ہے۔

(۳) تنظیم معاشرہ

(الف) پہلا مرحلہ

یہ بحث پہلے گذر چکی ہے کہ رسول اللہ نے اسلامی معاشرہ کے نشو و ارتقاء کے لیے نقشۂ کار کس طرح مرتب کیا

اور پھر اس کے مطابق پیش آمدہ حالات و وسائل کا بہترین استعمال کرکے اسے کس حد تک عملی جامہ پہنایا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قیامِ معاشرہ سے آگے بڑھ کر قیامِ ریاست کی راہ کس طرح ہموار ہوئی۔ اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہجرتِ نبویؐ سے ذرا پہلے مکہ میں ہی "بیعتِ عقبہ" کا ایک عظیم واقعہ پیش آیا۔ جو نہ صرف انسانی تاریخِ اجتماعیت کا بالکل منفرد واقعہ ہے بلکہ وُہ درحقیقت ریاستِ نبویؐ کا سنگِ بنیاد ہے۔ ان وجوہ سے مذکورہ واقعہ کی ضروری تفصیلات کا بیان کر دینا انتہائی اہم ہے کیونکہ اس کے بغیر تاسیسِ ریاست کی بحث نامکمل رہے گی۔

تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ مدینہ[158] میں اسلام کی تخم ریزی اور اشاعت کا آغاز ہجرت سے کئی سال قبل ہو چکا تھا[159] اور وہاں کے لوگ عرب کے دُوسرے قبیلوں کی بہ نسبت زیادہ آسانی اور تیز رفتاری کے ساتھ اسلام قبول کرتے جا رہے تھے۔ نیز یہ بات طے ہے کہ مدینہ کے مخصوص سیاسی ماحول میں تغیرّ و تبدل کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔

مدینہ کی آبادی مختلف عناصر پر مشتمل تھی۔ خصوصاً ایک طرف تو وہاں اوس اور خزرج[160] کے قبائل اپنی تمام تر تقسیمات کے ساتھ موجود تھے تو دوسری طرف یہود[161] کے متعدد قبائل بھی رہتے تھے۔ لیکن عددی کثرت کے اعتبار سے ابنائے قیلہ یعنی اوس اور خزرج ہی فوقیت رکھتے تھے۔ بلکہ کچھ عرصہ پہلے تک ان ہی کو سیاسی و اجتماعی لحاظ سے یہود پر واقعی برتری حاصل تھی۔ لیکن جنگِ بعاث[162] کے نتیجہ میں اوس اور خزرج اس قدر تباہ ہو گئے کہ آخر کار یہود، جو مذہبی برتری کے پہلے ہی مدعی تھے، اقتصادی و سیاسی لحاظ سے بھی ان سے آگے بڑھ گئے۔ اور اس طرح مدینہ کی سیادت و قیادت اوس اور خزرج کے ہاتھ سے نکل کر یہود کو منتقل ہو گئی۔

اس صورتِ حال نے مدینہ کے معاشرہ پر گہرے اثرات مرتب کیے اور مدنی سیاست کو ایک نیا رُخ عطا کیا۔ اس میں شک نہیں کہ جنگِ بعاث سے پہلے بھی وہاں قبائلی خود مختاری و آزادی، باہمی عصبیت و عداوت، مزاج اور افتراق و انتشار کا دور دورہ تھا۔ کوئی مرکزی اقتدار، کوئی قوتِ قاہرہ، کوئی عدالتِ مرافعہ نہ تھی اور نہ ہی کوئی متعین ضابطہ وہاں مروّج تھا۔ مختصر یہ کہ "زندگی وہاں ناممکن تھی"[163] پھر بھی لوگ زندہ تھے۔ البتہ جنگِ بعاث کے تاریخی حادثہ نے اہلِ مدینہ کے ضبط و تحمّل کے بند توڑ دیے اور انھیں اس حد تک پراگندہ خاطر کر دیا کہ وہ بالآخر عبداللہ بن اُبی[164] کو تقریباً متفقہ طور پر تاجدار بنانے پر آمادہ ہو گئے۔[165] ابن ابی اگرچہ فی الواقع تاجدار نہ بن سکا مگر یہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اہلِ مدینہ اس حالت سے بالکل بیزار ہو کر امن و آشتی کے طلبگار، انقلاب کے متمنّی اور ایک منظم حکومت کے خواہشمند تھے اور ان کی اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت "اتحاد" تھی۔ چنانچہ سنہ ۱۱ نبوی میں جب اہلِ خزرج کا ایک قافلہ موسمِ حج پر زیارتِ کعبہ کے لیے مکہ پہنچا تو رسولؐ اللہ نے ان سے ملاقات کی جس کے نتیجہ میں چھ آدمی حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ اس پہلی ملاقات میں اہلِ مدینہ نے جو کچھ کہا وہ انتہائی قابلِ غور ہے۔ انہوں نے کہا تھا:

انا قد ترکنا قومنا و لا قوم بینھم من العداوۃ و الشر ما بینھم ، فعسٰی ان یجمعھم
اللہ بک فسنقدم علیھم ، فندعوھم الٰی امرک و نعرض علیھم الذی أجبناک الیہ

من هٰذا الدین فان یجمعهم الله علیه فلا رجل اعز منك۔ (۱۶۶)

دیا رسول اللہ! ہم اپنے پیچھے ایسی قوم کو چھوڑ کر آئے ہیں جس میں فتنہ و عداوت اس قدر ہے کہ کسی دوسری قوم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ شاید آپ کے ذریعہ سے اللہ انہیں باہم متحد کر دے۔ ہم ان کے پاس جائیں گے اور آپ کے معاملہ (نبوت) کی جانب بھی مدعو کریں گے اور انہیں بھی آپ کے اس دین کی طرف دعوت دیں گے جو ہم نے قبول کر لیا ہے اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں آپ پر متفق و متحد کر دیا تو آپ سے زیادہ باعزت کوئی دوسرا نہ ہوگا)

مختصر یہ کہ جنگ بعاث کے بعد نہ صرف یہ کہ مدینہ کے سیاسی حالات میں توجّہ پیدا ہوا اور وہ بتدریج رسول اللہ کے حق میں سازگار ہوتے چلے گئے بلکہ اہل مدینہ بھی نئی تبدیلی کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گئے۔ گویا جنگ بعاث مدینہ میں رسول اللہ کی آمد کی تمہید تھی۔ اس کی تائید حضرت عائشہؓ کے اس بیان سے ہوتی ہے جس میں آپ نے یہ فرمایا ہے کہ:

کان یوم بعاث یومًا قدمه الله لرسوله صلی الله علیه وسلم فقدم رسول الله وقد افترق ملؤهم وقتلت سرواتهم وجرحوا۔ (۱۶۷)

(جنگ بعاث ایسی جنگ تھی جسے اللہ نے اپنے رسول کی آمد کا مقدمہ بنا دیا تھا پس جس وقت رسول اللہ نے قدم رنجہ فرمایا تو انصار کے معززین متفرق و منتشر، اور ان کے سردار قتل ہو چکے تھے اور زخم کھا کھا کر بہت خستہ و نزار ہو گئے تھے)

بہر حال عقبہ میں رسول اللہ سے اہل مدینہ کی پہلی ملاقات اسلامی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ اہل مدینہ نے اسلام قبول کیا تو گویا یہ حقیقت بھی مان لی کہ دین و ایمان کے آگے رنگ و نسل، زبان و وطن اور قومیت و عصبیت بے وقعت ہیں۔ اور اتحاد کا سب سے مستحکم ذریعہ "دین" ہی بن سکتا ہے۔ پھر انھیں یہ اطمینان و فخر بھی حاصل ہو گیا کہ وہ یہودیوں سے زیادہ مؤقر اور ان سے بہتر دین و کتاب کے حامل ہو گئے ہیں۔ اس موقع پر اہل مدینہ کے الفاظ ہماری بات پر دلالت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ:

والله انه النبی الذی توعدکم به یهود فلا تسبقنکم الیه۔ (۱۶۸)

(واللہ یہ تو وہی نبی ہیں جن کا ذکر تم سے یہودی کرتے تھے۔ دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے معاملہ میں وہ تم پر سبقت لے جائیں)

یہاں یہ وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ اگرچہ اہل مدینہ کی سب سے اہم اور بنیادی ضرورت "اتحاد" تھی اور اس کے تحت وہ اپنے لوگوں میں سے ہی کسی کو اپنا حاکم بھی بنا سکتے تھے لیکن ان کی صدیوں پرانی قبائلی روایات اور گہرے تعصب کے پیش نظر یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کا کوئی قبیلہ کسی دوسرے قبیلہ کے کسی شخص کو مستقلاً حاکم تسلیم نہیں کر سکتا تھا اور ان کی غیرت یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ وہ اپنے دشمنوں کے آگے سر اطاعت خم کریں اور ظاہر ہے کہ یہ صورت عبد اللہ بن اُبی کے ساتھ بھی

پیش آسکتی تھی جسے اگرچہ مدینہ کی آبادی تاجدار بنا لینے پر آمادہ تھی مگر یہ دراصل ایک اضطراری کیفیت کا نتیجہ تھا۔ یا شاید اس کی مقبولیت وقتی طور پر اس لیے بڑھ گئی تھی کہ عبداللہ بن ابی جنگِ بعاث میں غیر جانبدار رہا تھا۔[۱۶۹] بہر حال عبداللہ بن ابی کی حکومت بالاستقلال کا کوئی قطعی جواز مہیا کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ بات اس لیے بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ابن ہشام کی روایت کے بموجب اوس و خزرج کے قبائل نماز تک میں ایک دوسرے کی امامت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔[۱۷۰] یہ حال تو اسلام لانے کے بعد کا ہے۔ اور وہ بھی خالص دینی مسئلہ میں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سیاسی دائرہ میں وہ ایک دوسرے کی قیادت و سیادت کو کہاں تک تسلیم کر سکتے تھے۔ غالباً ان ہی تمام موافقات کی بنا پر اہلِ مدینہ نے رسول اللہؐ کو اپنا حاکم و فرمانروا تسلیم کر لینے میں عافیت زیادہ محسوس کی۔ کیونکہ ایک طرف تو رسول اللہؐ کا پیغام بجائے خود ہر قسم کی عصبیت کی نفی کرتا تھا۔ اور دُوسری طرف آپ محض حق و انصاف کے داعی اور بالکل غیر جانبدار تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مدینہ کے مشہور متحارب قبائل میں سے کسی سے بھی آپ کا تعلق نہ تھا۔ علاوہ ازیں نبی و رسول اللہؐ ہونے کی بنا پر آپ ایک معزز و محترم شخصیت تھے۔

غرض اب تک کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر منفی طور پر جنگِ بعاث نے رسول اللہؐ کے لیے راہ ہموار کی تو مثبت طور پر مدینہ کے ان چھ افراد کی ملاقات بہت اہم ہے جو انھوں نے آنحضرتؐ سے عقبہ کے مقام پر کی تھی۔ جنگ بعاث کے نتائج کا تو مختصر جائزہ ہم پہلے لے چکے ہیں۔ جہاں تک عقبہ کی ملاقات کا تعلق ہے تو اس کے اثرات بھی مدینہ کے سیاسی ماحول پر بہت گہرے پڑے۔ وُہ چھ افراد[۱۷۱] جو اسلام لا چکے تھے اور اس کی اشاعت کا وعدہ بھی کر چکے تھے (ان کے الفاظ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں) وہ جب مدینہ واپس آئے تو پورے جذبہ و خلوص کے ساتھ اپنے اسلام کا برملا اظہار کرنے لگے۔ مدینہ میں جس نے اس پیغام کو سنا متاثر ہوا اور پھر کچھ ہی عرصہ میں اوس و خزرج کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ذکر نہ ہوا ہو۔[۱۷۲] رسول اللہؐ کی شخصیت سال بھر ان کا موضوعِ گفتگو بنی رہی۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ مدینہ کے مخصوص حالات نے لوگوں کے دلوں میں جو تمنائیں پیدا کر دی تھیں، لوگوں نے محسوس کیا کہ ان کے پورا ہونے کا وقت جلد آنے والا ہے۔ اور دُوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے اوس اور خزرج رسول اللہؐ کے زیادہ قریب آگئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سنہ ۱۱ نبوی میں اوس و خزرج کے افراد مقامِ عقبہ میں حضورؐ سے ملے' اور شرک، چوری، زنا، قتلِ اولاد، ناحق افترا پردازی سے بچنے اور حضورؐ کے حکم سے کسی حال میں سرتابی نہ کرنے کا عہد استوار کیا تو ان کی تعداد پہلے سے زائد یعنی بارہ تھی۔[۱۷۳]

اس موقع پر اہلِ مدینہ نے رسول اللہؐ کے سامنے جن باتوں سے مجتنب رہنے کا عہد کیا تھا وہ باتیں درحقیقت ایسی بنیادی خرابیاں تھیں جن سے مدینہ کا جاہلی معاشرہ بالکل "غیر سیاسی کیفیت اور نزاج کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔ اس بعیت کے ذریعہ گویا وُہ اپنے آپ کو اس بات کا پابند بنا رہے تھے کہ ایک ایسے صحت مند سیاسی معاشرہ کے قیام کے لیے جد و جہد کریں گے جس کی بنیاد توحید پر قایم ہو، جہاں امانت و دیانت ہو اور جہاں دوسروں کی

جان و مال اور عزت و آبرو کو محترم سمجھا جائے۔ لیکن چونکہ اس قسم کے معاشرہ کے لیے جدّوجہد تعلیم اور تربیت کے بغیر نہیں ہو سکتی اس لیے اہلِ مدینہ نے آنحضرتؐ سے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ ان کے یہاں کوئی معلّم بھیجا جائے۔"[۱۶۴] چنانچہ آنحضرتؐ نے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے حضرت مصعب بن عمیرؓ[۱۶۵] کو مدینہ روانہ فرما دیا۔

حضرت مصعب بن عمیرؓ نے مدینہ آ کر اپنی شبانہ روز کوششوں سے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا حق اس طرح ادا کیا کہ رفتہ رفتہ مدینہ سے قبا تک گھر گھر اسلام پھیل گیا۔ صرف بنی اوس میں سے چند گھرانے باقی رہ گئے۔"[۱۶۶] تعلیم قرآن و حدیث اور اشاعتِ اسلام کے ساتھ ساتھ حضرت مصعب مدینہ کے اہلِ ایمان کی نمازوں کی امامت بھی فرماتے تھے۔ یہ امامت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ان کی اقتداء میں اوس، خزرج اور ایسے قبائل کے افراد شانہ بشانہ کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے تھے جو ابھی چند سال قبل تک ایک دُوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ اور جو اپنی عداوت کو اس حد تک نہیں بھلا سکتے تھے کہ آپس میں ہی ایک دُوسرے کی امامت قبول کر لیں۔"[۱۶۷] لیکن حضرت مصعب کی امامت ان کے لیے نقطۂ اتحاد ثابت ہو رہی تھی۔

تاریخی مطالعہ کی رو سے بدترین دشمنوں کا ایک جگہ ایک صف میں اس طرح مجتمع ہو جانا اتنا بڑا انقلاب تھا جس کا جاہلی معاشرہ میں تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ اسی لیے قرآن نے بطور احسان خداوندی کے اس خوشگوار انقلاب پر یوں تبصرہ کیا ہے کہ،

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعدآءً فالّف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا
وکنتم علی شفا حفرۃٍ من النّار فانقذکم منہا۔[۱۶۸]

(یعنی اور تم اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پس اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی اور اپنی نعمت سے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا اور تم آگ سے بھرے گڑھے کے قریب تھے تو اس نے تم کو بچا لیا)

اور ایک جگہ یہ بھی ارشاد ہوا کہ،

ولو انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الّفت بین قلوبھم۔[۱۶۹]

(اور اگر آپ جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے بہت خرچ کر ڈالتے تب بھی ان کے دلوں میں محبّت والفت کا پیدا کر دینا آپ کے لیے ممکن نہ تھا)

مدنی معاشرہ کے ایک اہم اور با اثر عنصر یہود نے بھی اس انقلاب کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ یہود کو یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ اوس اور خزرج کے جنگجو اور خونخوار قبائل یُوں آسانی سے اسلام و ایمان کی بنیاد پر متحد و متفق ہو لیں گے اور کفر و شرک قتلِ اولاد، زنا اور اس قسم کی دوسری عاداتِ قبیحہ کو ترک کر کے اطاعت و انقیاد کی روش اختیار کر لیں گے۔ چنانچہ سر ولیم میور نے لکھا ہے کہ:[۱۷۰]

"The Jews looked on in amazement at the people, whom they had in vain endeavoured for generations to convince of the errors of Polytheism and to dissuade from the abominations of idolatory, suddenly and of their own accord casting away their idols, and professing belief in the One True God".

(یہود نے ان لوگوں کو بڑی حیرت سے دیکھا، جنھیں شرک والحاد کی غلطیوں پر قائل کرنے اور بت پرستی سے ہٹانے کی سخت ناکام کوششیں وہ نسلاً بعد نسل کرتے چلے آئے تھے، وہی لوگ اب یکایک اور برضا ورغبت اپنے بتوں کو چھوڑ کر صرف ایک سچے خدا پر ایمان کا اظہار کر رہے تھے)

یہود نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ اب وہ پہلے کی طرح اوس وخزرج کے درمیان نفرت وعداوت پیدا نہیں کر سکتے اور نہ انھیں لڑا سکتے ہیں۔ دُوسری طرف اوس وخزرج کے قبائل میں بھی بلند حوصلگی پیدا ہوگئی اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ جس طرح اسلام قبول کر کے وہ یہود کے مقابلہ میں دینی و مذہبی برتری حاصل کر چکے ہیں اسی طرح ان سے قیادت بھی چھین سکتے ہیں۔ تیسری طرف اوس وخزرج کے درمیان جوں جوں اتحاد وموافقت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا رسولؐ اللہ کی شخصیت ان کے نزدیک محبوب سے محبوب تر ہوتی چلی جا رہی تھی کیونکہ وہ اس بات کا اظہار پہلے خود ہی کر چکے تھے کہ اگر رسولؐ اللہ نے ان کے اختلافات کو دُور کر دیا تو آپ سے زیادہ معزز ان کے نزدیک کوئی دُوسرا نہ ہوگا۔

بہرکیف حضرت مصعب بن عمیر جن کا قیام مدینہ میں تقریباً ایک سال تک رہا نہ صرف تعلیم وتبلیغ اسلام کے فریضہ میں منہمک رہے بلکہ اس تمام مدت میں وہ مدینہ کے سیاسی، اجتماعی، تہذیبی وتمدنی اور معاشی ومعاشرتی حالات کا بھی بغور جائزہ لیتے رہے۔ غالباً ان کی ماموری میں رسولؐ اللہ نے یہ رعایت بھی رکھی کہ وہ سابقین اسلام میں ہونے کی وجہ سے دین کی تعلیم وتربیت بھی بخوبی کر سکتے ہیں اور ذہین و ہوشمند ہونے کی وجہ سے مدینہ کے حالات ومسائل کا براہِ راست مطالعہ و تجزیہ کر کے حضورؐ کو مطلع کر سکتے ہیں کیونکہ یہ معلومات رسولؐ اللہ کو اگلے اقدامات کے تعین میں انتہائی مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ جب دوسرے سال حج کا موقع آیا تو مصعب مدینہ سے مکہ واپس آئے[۱۸۱]۔ ملاقات کر کے حضورؐ کو تمام حالات سے مطلع کیا اور پھر غالباً مصعب نے ہی اہلِ مدینہ کی اس جماعت سے حضورؐ کی ملاقات کا انتظام کیا جو اپنے دیگر ہم وطنوں کے ساتھ حجِ بیت اللہ کے لیے آئی تھی۔ مورخین کی تصریح کے مطابق ملاقات کے لئے ایام تشریق کا درمیانی عرصہ مقرر کیا گیا جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

یہی وہ تاریخی موقع ہے جبکہ مقام عقبہ پر رسولؐ اللہ اور اہلِ مدینہ کے درمیان وہ تاریخی عہد استوار ہوا جس نے نہ صرف عرب بلکہ بعد کی پوری عالمی تاریخ پر فیصلہ کن اثرات مرتب کئے اور ریاست نبویؐ کے قیام کو فیصلہ کن مرحلہ میں داخل کر دیا۔

بیعت عقبہ کا انعقاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ مدینہ کے درمیان ذی الحجہ سنہ ۱۲ نبوی کی ۱۲ویں شب کو بمقام عقبہ (منیٰ) عمل میں آیا۔[۱۸۲] اہلِ مدینہ کا وفد ستر سے زائد نفوس پر مشتمل تھا۔[۱۸۳] وہ حسب قرارداد ایک تہائی رات گذر جانے کے بعد رسولؐ اللہ سے ملا۔[۱۸۴] وقت چونکہ بہت کم تھا اور قریش کی جاسوسی کا خطرہ بھی پوری طرح موجود تھا اس لیے مصلحتاً مذاکرات کو طول نہیں دیا گیا۔[۱۸۵] اور مختصر بحث و مباحثہ کے بعد انصار نے اس بات پر رضامندی ظاہر کر دی کہ وہ تمام خطرات کے علی الرغم، رسول اللہ اور آپ کے اصحاب کو اپنے شہر میں جگہ دیں گے، ان کی حمایت و نصرت اور حفاظت کریں گے، ہر حال میں اسلام پر قائم رہیں گے اور ہر موقع پر سمع و طاعت سے کام لیں گے۔[۱۸۶]

اس عہد یا بیعت کا ایک اہم اور قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ یہ عہد فریقین کے درمیان انتہائی غور و خوض کے بعد وجود میں آیا تھا۔ اگر ایک طرف رسولؐ اللہ گرد و پیش کی دنیا کا جائزہ لینے اور اہل مدینہ کے دو سالہ طرزِ عمل کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس مرحلہ تک پہنچے تھے تو دوسری طرف اہلِ مدینہ نے بھی بلا سوچے سمجھے محض تکلفاً اپنی رضامندی کا اظہار نہ کیا تھا بلکہ نتائج کا پوری طرح ادراک کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا۔ چنانچہ عین اس وقت جبکہ یہ معاہدہ ہو رہا تھا تو عباس بن نضلہ انصاریؓ[۱۸۷] نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ:

هل تدرون علام تبايعون هٰذا الرجل ؟ قالوا نعم، قال انكم تبايعونه على حرب الاحمر والاسود من الناس فان كنتم ترون انكم اذا نهكت اموالكم مصيبة و اشرافكم قتلاً اسلمتموه فمن الآن فهو والله ان فعلتم خزى الدنيا والآخره وان كنتم ترون انكم وافون له بما دعوتموه اليه على نهكة الاموال وقتل الاشراف فخذوه فهو والله خير الدنيا والآخرة۔[۱۸۸]

(جانتے ہو کہ اس شخص سے کس بات کا پیمان باندھ رہے ہو؟ انھوں نے کہا ہاں! پھر اس نے کہا تم اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے لوگوں میں سے سُرخ و سیاہ سے جنگ یعنی دُنیا بھر سے لڑائی مول لے رہے ہو پس اگر تمہارا خیال یہ ہو کہ جب تمہارے مال تباہی کے اور تمہارے اشراف ہلاکت کے خطرے میں پڑ جائیں تو تم اسے دشمنوں کے حوالے کر دو گے تو بہتر ہے کہ آج ہی اسے چھوڑ دو، کیونکہ خدا کی قسم یہ دنیا اور آخرت کی رسوائی ہے اور اگر تمہارا ارادہ یہ ہے کہ جو دعوت تم اس شخص کو دے رہے ہو اس کو اپنے اموال کی تباہی اور اشراف کی ہلاکت کے باوجو نباہو گے تو بے شک اس کا ہاتھ تھام لو۔ کیونکہ خدا کی قسم یہ دنیا و آخرت کی بھلائی ہے)

اسی بات کو مدنی وفد کے ایک انتہائی کم سن رکن اسعد بن زرارہ[۱۸۹] نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

رويداً يا اهل يثرب انا لم نضرب اليه اكباد المطى الا ونحن نعلم انه رسول الله وان اخراجه اليوم مفارقت العرب كآفة وقتل خياركم وان تعضكم السيوف فاما انتم قوم تصبرون عليها اذا مستكم بقتل خياركم ومفارقة العرب كآفة



فخذوه واُجرکم علی اللہ واما انتم تخافون من انفسکم خیفة فذروہ فھو اعذر لکم عند اللہ۔ (۱۹۰)

(اے اہلِ یثرب! ٹھہرو، ہم ان کی طرف اونٹوں پر بار بار نہیں آتے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ یہ اللہؐ کے رسول ہیں اور آج یہاں سے انھیں نکال کر لے جانا تمام عرب سے دشمنی مول لینا ہے۔ اس کے نتیجہ میں تمہارے لوگ قتل ہوں گے اور تلواریں تم پہ برسیں گی لہٰذا اگر اس کو برداشت کرنے کی طاقت تم اپنے اندر پاتے ہو تو ان کا ہاتھ تھام لو اور اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور اگر تمہیں اپنی جانیں عزیز ہیں تو پھر انھیں چھوڑ دو اور صاف صاف عذر کر دو کیونکہ اس وقت عذر کر دینا اللہ کے نزدیک زیادہ قابلِ قبول ہے)

اس پر اہلِ وفد نے پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ جواب دیا تھا کہ:

فانا ناخذہ علی مصیبة الاموال وقتل الاشراف۔ (۱۹۱)

(ہم اسے لے کر اپنے اموال کی تباہی اور اپنے اشراف کو ہلاکت کے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہیں)

اور پھر اس اعلان کے بعد مذکورہ بیعت منعقد ہوئی۔

ہم نے اوپر اہلِ مدینہ کی جو تقاریر نقل کی ہیں ان کا ایک ایک لفظ اس امر کی شہادت دینے کے لیے کافی ہے کہ یہ بیعت نہ تو اظہارِ عقیدت کے لیے تھی اور نہ اس کا مقصد محض قبول ایمان و اسلام تھا۔ حتیٰ کہ اس میں کوئی مذہبی رسم بھی ادا نہیں کی گئی اور نہ دعائیہ کلمات کا تبادلہ ہوا بلکہ علم سیاسیات کے حوالہ سے اس بیعت کو ایک معاہدہ کہنا چاہیے جسے فریقین نے پوری رضا و رغبت کے ساتھ قبول کیا تھا اور جس کے سیاسی مضمرات کا اظہار بھی فریقین کے قول و عمل سے ہو رہا تھا بالفاظِ دیگر اپنے موقف کو اصطلاحی طور پر ہم اس طرح پیش کر سکتے ہیں کہ اب معاملات ایمان و اسلام کے اقرار سے بہت آگے بڑھ کر "بیعت الحرب" تک جا پہنچے تھے۔ (۱۹۲)

اس دو طرفہ معاہدہ کی رُو سے جہاں ایک طرف اہلِ مدینہ نے اپنے شہر میں رسولؐ اللہ کو جگہ دینے، ہر حال میں آپ کی اطاعت، حمایت اور حفاظت کی ذمہ داری لی تھی تو دوسری طرف اُنھوں نے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ رسولؐ اللہ بھی نہ تو انھیں چھوڑیں گے نہ مکہ واپس آئیں گے۔ چنانچہ جب اہلِ مدینہ کی طرف سے یہ کہا گیا کہ:

یارسول اللہ ان بیننا و بین الرجال حبالاً و انا قاطعوھا یعنی الیھود فھل عسیت ان نحن فعلنا ذٰلک ثم اظھرک اللہ ان ترجع الیٰ قومک وتدعنا؟ (۱۹۳)

(یارسول! ہمارے اور لوگوں کے درمیان پیمانِ وفا قائم ہیں اور ہم اس کو قطع کر دیں گے۔ مگر کہیں یہ تو نہ ہوگا کہ ادھر ہم یہود سے معاہدہ ختم کر دیں اور ادھر آپ کو غلبہ و قوت حاصل ہو تو آپ ہمیں بے یار و مددگار چھوڑ کر اپنی قوم سے آ کر مل جائیں)

آنحضرتؐ یہ سُن کر مسکرائے اور انتہائی یقین افروز انداز سے فرمایا کہ:

بل الدم! الدم! والھدم الھدم! انا منکم وانتم منی! احارب من

حارب تم و اسالم من سالمتم۔ (۱۹۴)

(نہیں، بلکہ میرا خون تمہارا خون، اور تمہاری حرمت میری حرمت ہے میں تم سے ہُوں اور تم مجھ سے ہو تم جس سے لڑو گے میں بھی لڑوں گا اور جس سے تم صلح کرو گے میں بھی صلح کروں گا)

رسول اللہؐ کی اس یقین دہانی پر گویا معاہدہ کی تکمیل ہوگئی تو آنحضرتؐ نے معاہدین ومبایعین سے فرمایا کہ حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل میں سے بارہ نقیب منتخب کئے تھے تم بھی اپنی جماعت میں سے بارہ آدمی منتخب کر لو۔(۱۹۵) پھر جب نقبا کا انتخاب ہو چکا تو آنحضرتؐ نے ان کو مخاطب کر کے انھیں اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا۔ اس پر بلاذری کی روایت کے مطابق ایک نقیب نے کھڑے ہو کر حمد وثنا اور اتباع نبویؐ کا اقرار کیا اور اس بات کا حلف اٹھایا کہ وہ آنحضرتؐ کی دعوت پر لبیک کہیں گے ان کی مدد و نصرت کریں گے اور اپنے عہد و وفا کا پاس و لحاظ کریں گے۔(۱۹۶)

نقبا کا یہ تقرر ممکن ہے بادی النظر میں رسمی کارروائی سمجھا جائے لیکن اگر نقیب کے لغوی و اصطلاحی معنی، اور اس وقت مدینہ کے بدلتے ہوئے حالات کو سامنے رکھا جائے تو مذکورہ تقرر و انتخاب کے بعض اہم معاشرتی و سیاسی مضمرات بڑی حد تک واضح ہو جائیں گے۔

علامہ ابن جوزی کی تصریحات کے مطابق نقیب کے معنی میں ضمانت، ماتحتوں کے حال سے مکمل واقفیت، کفالت، شہادت اور امانت داخل ہے۔ اور یہ لکھا ہے کہ بہر صورت نقیب کے معنی میں گہرائی اور دخول پایا جاتا ہے۔ اور نقیب کو نقیب اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ قوم کے مزاج میں دخیل ہوتا ہے۔ ان کی خامیوں اور خوبیوں کو جانتا ہے اور حالات و معاملات سے پوری طرح واقف ہوتا ہے۔(۱۹۷) علامہ زمخشری نقیب کو تجسس سے تعبیر کرتے ہیں(۱۹۸)۔ اور ابن کثیر نے نقبا کو عرفا کا مرادف قرار دیا ہے۔(۱۹۹)

نقیب کے مقام و مرتبہ کے تعین میں اس بات سے بھی مدد ملتی ہے کہ بیعت عقبہ مذکورہ میں نقبا کا تقرر کرتے وقت رسول اللہؐ نے یہ فرمایا تھا کہ:

ان موسٰی اخذ من بنی اسرائیل اثنی عشر نقیبا و انی اخذ منکم اثنی عشر فلا یجدن احد منکم فی نفسہ شیئا فانما یختار لی جبریل فلما سماھم قال انتم کفلاء علیٰ قومکم ککفالۃ الحواریین۔(۲۰۰)

(حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل میں سے بارہ سردار منتخب کئے تھے اور میں بھی تم میں سے بارہ کا انتخاب کر رہا ہوں۔ پس تم میں کسی کے دل میں کوئی خیال پیدا نہ ہو کیونکہ میرے لیے اسے جبریل نے کیا ہے۔ پھر جب ان کے نام گنائے تو آپ نے فرمایا کہ تم لوگ اپنی قوم کے ذمہ دار ہو حواریوں کی طرح)

توضیحات بالا کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اہل یثرب کی تجویز پر آنحضرتؐ نے جن بارہ آدمیوں کو نقیب مقرر کیا تھا(۲۰۱) وہ مقتدر افراد تھے جو اپنے قبائل وبطون میں غیر معمولی اہمیت رکھتے تھے۔ مدنی معاشرہ میں اثر و رسوخ

کے مالک تھے اور اپنے قبیلہ کے سردار یا کسی اہم ذمہ داری پر فائز تھے۔ مثلاً قبائل اوس میں معزز ترین قبیلہ عبدالاشہل کا تھا اور سیادتِ عامہ اوس میں وراثۃً چلی آتی تھی۔ ان کا نقیب حضرت اسید بن حضیر[۲۰۲] کو بنایا گیا جن کے باپ حضیر الکتائب چند سال قبل جنگِ بعاث میں اوس کے قائد و سپہ سالار تھے اور دادِ شجاعت دیتے ہوئے اسی جنگ میں مارے گئے تھے۔ اپنے باپ کے بعد اپنی قوم میں سب سے معزز تھے اور صاحبانِ عقل و رائے میں شمار ہوتے تھے۔[۲۰۳] دوسری طرف قبائل خزرج میں سب سے زیادہ معزز قبیلہ بنو نجار کا تھا۔ ایک روایت کے مطابق اہلِ مدینہ میں سب سے پہلے ایمان لانے والے، سب سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرنے والے یہی اسعد بن زرارہ تھے[۲۰۴] جنھیں بنو نجار کا نقیب بنایا گیا۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے انھیں نہ صرف یہ کہ بنو نجار کا نقیب مقرر کیا بلکہ ابنِ سعد کے الفاظ میں "رأس النقباء"[۲۰۵] اور البلاذری کے الفاظ میں "نقیب النقباء"[۲۰۶] بنایا۔ اس منصب پر اسعد بن زرارہ کا فائز ہونا اس لحاظ سے اور زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ وہ اہلِ مدینہ کے وفد میں سب سے کم عمر تھے۔[۲۰۷] لیکن نقباء کے امیر غالباً ایک تو اس لیے بنائے گئے کہ ذاتی عادات و خصائل، اسلام کے لیے جذبات و خدمات اور مدینہ میں اپنے اثر و رسوخ نیز تقدمِ ایمانی کی وجہ سے اس کا استحقاق رکھتے تھے۔ ہمارے نزدیک دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چونکہ متابعین کی بڑی تعداد خزرجی قبائل سے تعلق رکھتی تھی اور خزرجی قبائل میں سے بنو نجار کو معزز ترین مقام حاصل تھا اس لیے اس کے نقیب کو تمام نقیبوں کا رئیس بنایا گیا۔ "نقیب النقباء" کے منصب کا اجراء اس امر کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے کہ حضرت مصعب کی تعلیم و تربیت سے اوس و خزرج کے درمیان قبائلی تعصب اور نفرت کی دیوار گرتی جا رہی تھی کیونکہ ایک طرف تو ان کا یہ عالم تھا کہ نماز کی امامت میں بھی ایک دوسرے کی امامت کو پسند نہ کرتے تھے لیکن اب صورتِ حال مختلف ہو چکی تھی اور وہ "نقیب النقباء" کی صورت میں ایک شخص کی اعلیٰ ترین ذمہ داری کو تسلیم کر رہے تھے۔ اور اس کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ ان نقباء یا صاحبانِ اثر و اقتدار کا رسولؐ کی سمع و طاعت پر عہد کر لینا یہ معنی رکھتا ہے کہ انھوں نے رسول اللہؐ کو اپنا سیاسی قائد بھی تسلیم کر لیا۔ کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ یہ نقباء اور دوسرے متابعین اہلِ مدینہ کی نمائندگی کر رہے تھے۔ چنانچہ واٹ کا یہ بیان درست ہے کہ "مدنی قبائل کے وہ با اثر افراد جو اگرچہ بیعتِ عقبہ کے موقع پر موجود نہ تھے تاہم اپنے اسلام کا اظہار کر چکے تھے اور اپنے قبائل کے ساتھ ساتھ اس میثاق (عقبہ) کے فریق بن چکے تھے۔ حتیٰ کہ عبداللہ بن اُبی بھی (جو مدینہ کا تاجدار بننے والا تھا) اس عہد و پیمان میں شریک ہو چکا تھا۔"[۲۰۸] چنانچہ تفصیلاتِ بالا کی روشنی میں ہم معاہدۂ عقبہ کو اگر ایک "معاہدہ عمرانی"[۲۰۹] سے تعبیر کریں تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ مدینہ کے باشندے اور ان کے نمائندے اپنی رضا و رغبت سے رسول اللہؐ کو ایک دینی رہنما، ایک سیاسی قائد اور مطاع تسلیم کر چکے تھے۔ پھر نقباء کا تقرر گویا رسول اللہؐ کی مذکورہ حیثیت کا ہی ایک تقاضا تھا۔ اسی معاہدہ کی وجہ سے رسول اللہؐ نے ہجرت کی اور اسی کی بنیاد پر ایک ایسی سرزمین پر ایک شہری مملکت وجود پذیر ہوئی جہاں اس سے پہلے نراج تھا یا بالفاظِ دیگر ایک غیر سیاسی معاشرہ موجود تھا۔

بہر حال جیسا کہ ہم نقیب کے مفہوم کے تحت بیان کر چکے ہیں نقباء کے فرائض میں جہاں مجموعی طور پر ان کے اپنے

قبیلوں کی کفالت اور ذمہ داری شامل تھی اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی نگرانی کرسمع و طاعت سے کسی حال میں انحراف نہ ہونے پائے، جو کچھ معاہدہ میں طے ہوچکا ہے اس کی حسبِ موقع تعمیل، اور اپنی اپنی آبادی اور علاقے کے لوگوں کی ذہنی و اخلاقی نگہداشت کرنا بھی نقباء کا ہی کام تھا۔ اور یہ بھی فرض ان ہی کا تھا کہ تفتیش و تجسس کے ذریعہ ایک طرف تو رفتارِ کار کا اندازہ لگائیں اور دوسری طرف تحقیقِ حال کر کے نئی ریاست کی تاسیس کے لیے زمین ہموار کرنا بھی نقباءُ کے منصب کا تقاضہ تھا۔ مختصر یہ کہ معاہدۂ عقبہ کے ساتھ ساتھ نقباءُ کے تقرر کا فائدہ یہ ہوا کہ مدینہ میں باقاعدہ طور پر اجتماعی نظم کی بنیاد قائم ہوگئی اور نقیبوں کے ذریعہ منظم سیاسی معاشرہ کی تعمیر کا کام پوری طرح شروع ہوگیا۔

اب رہا معاملہ بیعتِ عقبہ کے اثرات کا، تو جہاں تک اہلِ مدینہ کا تعلق ہے، ان کے بارے میں اوپر تفصیل سے بحث آچکی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس تاریخی معاہدہ کے بعد اہلِ مدینہ سراپا شوق و انتظار بن گئے۔[۲۱۰] چنانچہ جب انھیں یہ اطلاع ملی کہ رسولؐ اللہ جادہ ہجرت طے کر کے اب مدینہ پہنچنے والے ہیں تو ان کے جذباتِ شوق اپنی انتہا کو پہنچ گئے جس کا واضح ثبوت اس موقع پر مل جاتا ہے جبکہ رسولؐ اللہ مدینہ میں داخل ہوئے اور آپ کا انتہائی والہانہ گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اہلِ مکہ پر اس بیعتِ عقبہ کے جو اثرات متوقع تھے وہ کسی بھی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہ تھے اور قریش خود بھی اس کی خطرناکیوں کو اچھی طرح محسوس کر رہے تھے اسی لیے جس رات عقبہ کی بیعت منعقد ہوئی علی الصبح ہی قریش اہلِ مدینہ کے خیموں میں آدھمکے[۲۱۱]۔ اور اہلِ مدینہ سے یہ پوچھنے لگے کہ "ہم نے سنا ہے تم نے ہمارے خلاف جنگ پر معاہدہ کرلیا ہے اور ہمارے آدمی کو تم یہاں سے نکال کر لے جانا چاہتے ہو۔"[۲۱۲] اس استفسار کا ایک ایک لفظ ان کے اندرونی خدشات کی پردہ دری کر رہا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ مدینہ میں اہلِ ایمان اور اوس و خزرج کی قوت کا مجتمع ہونا ان کے لیے پیغامِ موت سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ اوس اور خزرج ایک جنگجو قوم ہے اور وہ آنحضرتؐ اور دوسرے مسلمانوں کی حفاظت کرنے پر پوری طرح قادر ہے نیز مدینہ کی طرف سے مکہ پر حملہ بھی غیر متوقع نہیں ہوسکتا تھا بلکہ اس سے زیادہ بڑا خطرہ اہلِ مکہ کے نزدیک یہ تھا کہ شام کی تجارتی شاہراہ چونکہ مدینہ سے ہو کر گزرتی ہے اس لیے مدینہ سے اس شاہراہ کی ناکہ بندی کی جاسکتی ہے اور اس طرح وہ معاشی شہ رگ بھی کاٹی جاسکتی ہے جس کے محفوظ رہنے پر قریش اور دوسرے بڑے بڑے قبائل کی معاشی زندگی کا انحصار تھا۔ اس راستہ کے کٹ جانے کے بعد تجارت کا حشر اور معاشی بدحالی کا تصور ہر ایک آسانی سے کرسکتا تھا علاوہ ازیں یہ احساس بھی قریشِ مکہ کے لیے کم سوہانِ روح نہ تھا کہ رسول اللہ یوں آسانی کے ساتھ ان کے دستِ تظلم سے بچ کر ایک محفوظ ٹھکانہ پالیں اور شجرِ اسلام نئی زمین اور نئی فضا میں پرورش پا کر ایسا تناور درخت بن جائے کہ جسے کوئی بادِ مخالف پھر نقصان نہ پہنچا سکے۔

اس واقعہ کے بعد قریش کو یہ یقین ہوگیا کہ اب رسولؐ اللہ مکہ میں زیادہ عرصہ نہیں رہیں گے اور جلد سے جلد مدینہ جانے کا موقع تلاش کریں گے۔[۲۱۳] لہٰذا مکہ کے اعاظم و اکابر رسولؐ اللہ کے متعلق آخری فیصلہ کرنے کے لیے دار الندوہ میں جمع ہوئے۔[۲۱۴] اور

بالآخر اپنے اس خصوصی اجلاس میں انھوں نے ابُو جہل کی یہ تجویز منظور کر لی کہ :

"اریٰ ان ناخذ من کل قبیلہ فتی شابًا جلیدًا نسیبًا وسیطًا فینا ثم نعطی کل فتی منہم سیفًا صارمًا ثم یعمدوا الیہ فیضربوہ بہا ضربۃ رجل واحد، فیقتلوہ فنستریح منہ فانہم اذا فعلوا ذٰلک تفرق دمہ فی القبائل جمیعًا فلم یقدر بنو عبد مناف علیٰ حرب قومہم جمیعًا فرضوا منا بالعقل، فعقلناہ لہم۔" (۲۱۵)

(میری رائے یہ ہے کہ ہم ہر قبیلے میں سے ایک جوان مرد، نوعمر، قوی، شریف النسب لے لیں۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک تیز تلوار دے دیں۔ یہ سب اس کے پاس پہنچیں اور تلواروں سے اس طرح ایک ساتھ ضرب لگائیں کہ گویا یہ ایک ہی شخص کا وار ہے اور اس طرح اس (محمدؐ) کی شمعِ حیات گل کر دیں۔ پھر ہم اس کی طرف سے چین پا سکیں گے کیونکہ اس طرح اس کا خون تمام قبیلوں پر بٹ جائے گا۔ بنی عبد مناف (ظاہر ہے) اپنی قوم کے تمام افراد سے جنگ نہ کر سکیں گے اور ہم سے خونبہا لینے پر راضی ہو جائیں گے اور ہم انھیں خونبہا ادا کر دیں گے)

قرآن نے کفارِ مکہ کے اس سیاہ کارانہ فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک ویمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین۔ (۲۱۶)

(وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جبکہ منکرینِ حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ کی تدبیر سب سے بڑھ کر ہوتی ہے)

اگرچہ دارالندوہ کے اس اجلاس کی کارروائی صیغۂ راز میں رکھی گئی تھی لیکن رسولؐ اللہ کو اسی دن بذریعہ وحی اس کی اطلاع ہو گئی۔ (۲۱۷) قرآن کی یہ آیت اس صورتِ حال پر کس قدر چسپاں نظر آتی ہے کہ:

ام ابرموا امرًا فانا مبرمون، ام یحسبون انا لا نسمع سرہم ونجوٰہم بلیٰ ورسلنا لدیہم یکتبون۔ (۲۱۸)

(کیا ان لوگوں نے کوئی (فیصلہ کن) قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ اچھا تو ہم بھی پھر ایک فیصلہ کیے لیتے ہیں کیا انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم ان کی راز کی باتیں اور ان کی سرگوشیاں سُنتے نہیں ہیں؟ ہم سب کچھ سُن رہے ہیں اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں)

اور اللہ کی طرف سے فیصلہ یہ ہوا کہ آپ کو ہجرت کا حکم دے دیا گیا۔ (۲۱۹)

بہرحال اس میں شک نہیں کہ بیعت عقبہ کے فوراً بعد سے ہی مسلمان برابر ہجرت کر رہے تھے اور فی الواقع رسولؐ اللہ

قبیلوں کی کفالت اور ذمہ داری شامل تھی اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی نگرانی کہ سمع و طاعت سے کسی حال میں انحراف نہ ہونے پائے، جو کچھ معاہدہ میں طے ہو چکا ہے اس کی حسبِ موقع تعمیل، اور اپنی اپنی آبادی اور علاقے کے لوگوں کی ذہنی و اخلاقی نگہداشت کرنا بھی نقباء کا ہی کام تھا۔ اور یہ بھی فرض ان ہی کا تھا کہ تفتیش و تجسس کے ذریعہ ایک طرف تو رفتارِ کار کا اندازہ لگائیں اور دوسری طرف تحقیقِ حال کر کے نئی ریاست کی تاسیس کے لیے زمین ہموار کرنا بھی نقباء کے منصب کا تقاضہ تھا۔ مختصر یہ کہ معاہدۂ عقبہ کے ساتھ ساتھ نقباء کے تقرر کا فائدہ یہ ہوا کہ مدینہ میں باقاعدہ طور پر اجتماعی نظم کی بنیاد قائم ہو گئی اور نقیبوں کے ذریعہ منظم سیاسی معاشرہ کی تعمیر کا کام پوری طرح شروع ہو گیا۔

اب رہا معاملہ بیعتِ عقبہ کے اثرات کا، تو جہاں تک اہلِ مدینہ کا تعلق ہے، ان کے بارے میں اوپر تفصیل سے بحث آ چکی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تاریخی معاہدہ کے بعد اہلِ مدینہ سراپا شوق و انتظار بن گئے۔[۲۱۰] چنانچہ جب انھیں یہ اطلاع ملی کہ رسول اللہ جادہ ہجرت طے کر کے اب مدینہ پہنچنے والے ہیں تو ان کے جذباتِ شوق اپنی انتہا کو پہنچ گئے جس کا واضح ثبوت اس موقع پر مل جاتا ہے جبکہ رسول اللہ مدینہ میں داخل ہوئے اور آپ کا انتہائی والہانہ گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اہلِ مکہ پر اس بیعتِ عقبہ کے جو اثرات متوقع تھے وہ کسی بھی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہ تھے اور قریش خود بھی اس کی خطرناکیوں کو اچھی طرح محسوس کر رہے تھے اسی لیے جس رات عقبہ کی بیعت منعقد ہوئی علی الصبح ہی قریش اہلِ مدینہ کے خیموں میں آ دھمکے۔[۲۱۱] اور اہلِ مدینہ سے یہ پوچھنے لگے کہ "ہم نے سنا ہے تم نے ہمارے خلاف جنگ پر معاہدہ کر لیا ہے اور ہمارے آدمی کو تم یہاں سے نکال کر لے جانا چاہتے ہو۔"[۲۱۲] اس استفسار کا ایک ایک لفظ ان کے اندرونی خدشات کی پردہ دری کر رہا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ مدینہ میں اہلِ ایمان اور اوس و خزرج کی قوت کا مجتمع ہونا ان کے لیے پیغامِ موت سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ اوس اور خزرج ایک جنگجو قوم ہے اور وہ آنحضرتؐ اور دوسرے مسلمانوں کی حفاظت کرنے پر پوری طرح قادر ہے نیز مدینہ کی طرف سے مکہ پر حملہ بھی غیر متوقع نہیں ہو سکتا تھا بلکہ اس سے زیادہ بڑا خطرہ اہلِ مکہ کے نزدیک یہ تھا کہ شام کی تجارتی شاہراہ چونکہ مدینہ سے ہو کر گزرتی ہے اس لیے مدینہ سے اس شاہراہ کی ناکہ بندی کی جا سکتی ہے اور اس طرح وہ معاشی شہ رگ بھی کاٹی جا سکتی ہے جس کے محفوظ رہنے پر قریش اور دوسرے بڑے بڑے قبائل کی معاشی زندگی کا انحصار تھا۔ اس راستہ کے کٹ جانے کے بعد تجارت کا حشر اور معاشی بدحالی کا تصور ہر ایک آسانی سے کر سکتا تھا علاوہ ازیں یہ احساس بھی قریشِ مکہ کے لیے کم سوہانِ روح نہ تھا کہ رسول اللہ یوں آسانی کے ساتھ ان کے دستِ تظلم سے بچ کر ایک محفوظ ٹھکانہ پالیں اور شجرِ اسلام نئی زمین اور نئی فضا میں پرورش پا کر ایسا تناور درخت بن جائے کہ جسے کوئی بادِ مخالف پھر نقصان نہ پہنچا سکے۔

اس واقعہ کے بعد قریش کو یہ یقین ہو گیا کہ اب رسول اللہ مکہ میں زیادہ عرصہ نہیں رہیں گے اور جلد سے جلد مدینہ جانے کا موقع تلاش کریں گے۔[۲۱۳] لہٰذا مکہ کے اعاظم و اکابر رسول اللہ کے متعلق آخری فیصلہ کرنے کے لیے دار الندوہ میں جمع ہوئے۔[۲۱۴] اور

بالآخر اپنے اس خصوصی اجلاس میں انھوں نے ابوجہل کی یہ تجویز منظور کر لی کہ:

"اری ان ناخذ من کل قبیلۃ فتی شابًا جلیدًا نسیبًا وسیطًا فینا ثم نعطی کل فتی منھم سیفًا صارمًا ثم یعمدوا الیہ فیضربوہ بھا ضربۃ رجل واحد، فیقتلوہ فنستریح منہ فانھم اذا فعلوا ذٰلک تفرق دمہ فی القبائل جمیعًا فلم یقدر بنو عبد مناف علیٰ حرب قومھم جمیعًا فرضوا منا بالعقل، فعقلناہ لھم" (۲۱۵)

(میری رائے یہ ہے کہ ہم ہر قبیلے میں سے ایک جوان مرد، نوعمر، قوی، شریف النسب لے لیں۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک تیز تلوار دے دیں۔ یہ سب اس کے پاس پہنچیں اور تلواروں سے اس طرح ایک ساتھ ضرب لگائیں کہ گویا یہ ایک ہی شخص کا وار ہے اور اس طرح اس (محمدؐ) کی شمع حیات گل کر دیں۔ پھر ہم اس کی طرف سے چین پا سکیں گے کیونکہ اس طرح اس کا خون تمام قبیلوں پر بٹ جائے گا۔ بنی عبد مناف (ظاہر ہے) اپنی قوم کے تمام افراد سے جنگ نہ کر سکیں گے اور ہم سے خونبہا لینے پر راضی ہو جائیں گے اور ہم انھیں خونبہا ادا کر دیں گے)

قرآن نے کفار مکہ کے اس سیاہ کارانہ فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک ویمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین۔ (۲۱۶)

(وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جبکہ منکرین حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ کی تدبیر سب سے بڑھ کر ہوتی ہے)

اگرچہ دارالندوہ کے اس اجلاس کی کارروائی صیغۂ راز میں رکھی گئی تھی لیکن رسولؐ اللہ کو اسی دن بذریعہ وحی اس کی اطلاع ہو گئی۔ (۲۱۷) قرآن کی یہ آیت اس صورت حال پر کس قدر چسپاں نظر آتی ہے کہ:

ام ابرموا امرًا فانا مبرمون، ام یحسبون انا لا نسمع سرھم ونجوٰھم بلیٰ ورسلنا لدیھم یکتبون۔ (۲۱۸)

(کیا ان لوگوں نے کوئی (فیصلہ کن) قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ اچھا تو ہم بھی پھر ایک فیصلہ کیے لیتے ہیں کیا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم ان کی راز کی باتیں اور ان کی سرگوشیاں سنتے نہیں ہیں؟ ہم سب کچھ سن رہے ہیں اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں)

اور اللہ کی طرف سے فیصلہ یہ ہوا کہ آپ کو ہجرت کا حکم دے دیا گیا۔ (۲۱۹)

بہرحال اس میں شک نہیں کہ بیعت عقبہ کے فوراً بعد سے ہی مسلمان برابر ہجرت کر رہے تھے اور فی الواقع رسولؐ اللہ

نے بھی سفر کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔[۲۲۰] لیکن اہلِ مکہ کی طرف سے بیعتِ عقبہ کے شدید ردّعمل کے طور پر آپ کے قتل کا فیصلہ آنحضرتؐ کی فوری روانگی کا سبب بن گیا۔ چنانچہ معاہدۂ عقبہ (۱۲ ذی الحجہ سنہ ۱۲ نبوی) کے بعد محرم اور صفر کے صرف دو ماہ گزرے تھے کہ ربیع الاول (۱۳ نبوی) میں رسولؐ اللہ حضرت ابوبکرؓ کی معیت میں مدینہ طیبہ روانہ ہو گئے۔

(ب) دُوسرا مرحلہ

گذشتہ بحث سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ رسولؐ اللہ اپنی ذاتی اور نجی حیثیت میں مدینہ تشریف نہیں لے گئے تھے بلکہ اہلِ مدینہ کے تسلیم شدہ سیاسی قائد اور پیغمبر کی حیثیت سے پہنچے تھے۔ اس قیادت و پیشوائی کا تقاضا ایک تو یہ تھا کہ مدینہ کے تمام باشندوں کی قیادت و رہنمائی فرمائیں۔ اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے اپنا گھر بار، مال و متاع سب کچھ قربان کر کے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی ان کی معاشی آسُودگی اور آبادکاری کا انتظام کریں۔[۲۲۱] علاوہ ازیں اسلامی معاشرہ کی تنظیم اور اس کی سالمیت و اتحاد کا مسئلہ بھی توجہ طلب تھا۔

یہ مسائل وُہ تھے جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے فوری حل کے متقاضی تھے۔ ان پُرپیچ مسئلوں اور مشکلات پر قابو پانے کے لیے رسولؐ اللہ نے انتہائی تدبّر اور حکمت سے کام لیا۔ اور ان کو حل کرنے کے لیے نہ تو کسی جبر و زور کا مظاہرہ کیا، نہ کوئی قانون مسلط کیا اور نہ ہی اہلِ مدینہ پر بے جا بار ڈالا، بلکہ اس جانب بظاہر معمولی لیکن فی الحقیقت ایک جامع اور موثر قدم یہ اٹھایا کہ "انصار و مہاجرین" کے درمیان "عقدِ مواخاہ" کو قایم فرما دیا۔ یہ عقد جس انداز سے رو بہ عمل آیا اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ محض ایک اخلاقی اپیل تھی لیکن تاریخ کے پیمانے سے اگر اس اقدام کے نتائج و ثمرات کا اندازہ کیا جائے تو بلاشبہ اسے ایک غیر معمولی کارنامہ کہا جائے گا۔ لیکن اس اقدام کے اثرات اور دوسرے اہم پہلوؤں پر غور کرنے سے پہلے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عقدِ مواخاہ کی نوعیت اور اس کے زمانۂ وقوع کا تعین کر لیا جائے۔

اس کی نوعیت تو یہ ہے کہ یہ عقد "بر بنائے حقِ مواسات اور توارث"[۲۲۲] مہاجرین اور انصار کے درمیان منعقد ہوا۔[۲۲۳]
ابنِ ہشام کے بیان کے مطابق رسولؐ اللہ کا فرمان یہ تھا کہ "خدا کی راہ میں دو دو آدمی آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔"[۲۲۴]

رسولؐ اللہ کے مندرجہ بالا ارشاد کی تعمیل میں مہاجرین و انصار نے برضا و رغبت ایک دوسرے کو اپنا بھائی بنایا اور اس سے اسی طرح تعلقات استوار کیے جس طرح حقیقی بھائیوں سے ہوتے ہیں (۲۲۵) بلکہ بعض صورتوں میں تو انھوں نے حقیقی بھائیوں سے زیادہ حقِ برادری ادا کیا۔ چنانچہ کوئی انصاری وفات پاتا تو اس کی جائداد اور مال کا وارث مہاجر بھائی قرار پاتا تھا اور اس کے دوسرے متعلقین محروم رہتے تھے۔ یہ حقِ توارث جنگِ بدر تک جاری رکھا گیا البتہ جنگِ بدر کے بعد ایک قرآنی حکم[۲۲۶] کے بموجب وراثت کو حقیقی رشتوں کے لحاظ سے دیا جانے لگا اور عقدِ مواخاۃ کے تحت ملنے والے حقِ ولایت و وراثت کو موقوف کر دیا گیا۔ لیکن ان برادرانہ تعلقات و مراسم اور مذہبی اخوت کو بعد میں بھی جاری رہنے دیا گیا۔

اب جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ عقدِ مواخاۃ کس زمانے میں ہوا[۲۲۷] تو اس سلسلے میں بعض مورّخین نے

یہ تصریح کی ہے کہ مواخاۃ کا واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے پانچویں مہینے یعنی رجب سنہ ۱ ہجری میں پیش آیا[۲۲۸] اس کے معنی یہ ہیں کہ مسجد نبویؐ کی تعمیر مکمل ہونے سے پہلے مواخاۃ کا انعقاد عمل میں آ گیا[۲۲۹] یہ زمانۂ وقوع اس لحاظ سے بعید از قیاس نہیں ہے کہ مواخاۃ کا معاہدہ حضرت ابوطلحہ انصاری یعنی حضرت انس بن مالک کے گھر طے پایا[۲۳۰] جس کی ایک وجہ تو غالباً حضورؐ کی قیام گاہ سے قربت ہو سکتی ہے اور دُوسری یہ کہ اس وقت تک مسجد نبویؐ کی تکمیل نہ ہوئی تھی ورنہ یہ مواخاۃ بھی اغلباً مسجد نبویؐ میں کرائی جاتی۔ بہرحال چونکہ ہم مسجد نبویؐ کی تعمیر اور مواخاۃ دونوں ایک ہی زمانے میں پاتے ہیں اس لئے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ دونوں واقعات حضورؐ کی آمدِ مدینہ کے فوراً بعد ہوئے اور میثاقِ مدینہ سے یقیناً تقدم زمانی رکھتے ہیں۔

عقدِ مواخاۃ کی نوعیت اور زمانۂ وقوع معلوم کر لینے کے بعد ہم اس مسئلہ کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ مواخات نے مدینہ کی سیاسی و معاشرتی زندگی میں کیا کردار ادا کیا۔

سرسری نظر ڈالنے سے تو محسوس ہوتا ہے کہ مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات کا یہ عمل ایک عارضی اور وقتی عمل تھا جو مہاجرین کو مدینہ کے ماحول سے مانوس کرنے اور ان کی دلدہی و پاسِ خاطر کے تحت کیا گیا تھا[۲۳۱] لیکن بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے بلکہ مواخاۃ کا یہ عمل اپنے دامن میں چند مستقل اور پائدار فوائد و مصالح رکھتا ہے اور تاریخی و سیاسی اعتبار سے اس نے مدنی معاشرت و سیاست پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے جن کو ہم مختصراً حسب ذیل نکات کی صورت میں بیان کر سکتے ہیں :

(۱) اس واقعہ سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مہاجرین و انصار کے درمیان مواخاۃ کی وجہ سے ایک طرف تو بے سر و سامان، غریب الدیار مہاجرینِ مکہ کی آباد کاری کا مسئلہ حل ہو گیا اور دوسری طرف ان کی معاشی کفالت کی ایک سبیل پیدا ہو گئی۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ مہاجرین نے ضرورت سے زیادہ کوئی عطیہ قبول نہ کیا اور اپنے انصاری بھائی پر بار بننے کے بجائے اپنی قوتِ بازو سے معاش کا بندوبست کیا[۲۳۲] اور جُوں جوں ان کے حالات بہتر ہوتے گئے۔ مثلاً زمینیں مل گئیں یا مکانات بن گئے تو وہ جلد سے جلد وہاں منتقل ہو گئے۔ بہرصورت مہاجرین کی آباد کاری کا یہ مسئلہ جو فی الحقیقت ایک پریشان کن مسئلہ تھا وہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا کہ جس پر شاید ان لوگوں کو حیرت ہو جو قوموں کی تعمیر و تشکیل کے مطالعہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

(۲) مہاجرین کو یہ فائدہ بھی پہنچا کہ ان کا احساسِ غربت دُور ہو گیا۔ وطن کی یاد، گھر بار، عزیز و اقارب سے چھٹنے کا فطری احساس و ملال اور مدینہ کی اجنبیت وغیرہ کا جو کچھ تھوڑا بہت خیال ہو سکتا تھا اپنائیت میں تبدیل ہو گیا۔ انصار نے عقبہ کی بیعت اور عہد کے مطابق صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی ہاتھوں ہاتھ نہیں لیا بلکہ آپ کے تمام جاں نثاروں کی خیر خواہی اور دلدہی بھی انتہائی ہمدردی، فراخدلانہ محبت، خلوص، ایثار اور جذبۂ رفاقت سے کی اور اپنے پرائے کی تمیز کا شائبہ بھی پیدا نہ ہونے دیا اور اس کی انتہا یہ ہے کہ مہاجرین کو اس طرح وصیت اور وراثت تک میں شامل کر لیا جس طرح ذوی الارحام حق دار ہوتے ہیں، اور یہ صورتِ حال اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ غزوۂ بدر کے بعد سنہ ۲ھ میں

سورہ انفال کی یہ آخری آیت نازل نہ ہوگئی کہ:

وا ولوا الارحام بعضھم اولٰی ببعض فی کتاب اللہ ان اللہ بکل شیءٍ علیم۔ [۲۳۳]

(اور رشتہ دار خدا کے حکم کی رُو سے ایک دُوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے)

(۳) مواخاۃ کے ذریعہ ایک مناسب ٹھکانہ میسر آجانے، بنیادی مادّی ضروریات کی تکمیل اور ایک گونہ معاشی آسودگی حاصل ہو جانے کے بعد مہاجرین نے مدینہ کی معاشی و تجارتی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ جیسا کہ معلوم ہے، مدینہ میں معاشی طور پر تفوق اور برتری یہود کو حاصل تھی۔ یہود مدینہ کی زراعت، تجارت اور صنعت پر چھائے ہوئے تھے [۲۳۴] خوشحال اور فارغ البال تھے زرخیز زمینیں، گھنے نخلستان اور باغات ان کے قبضہ میں تھے تجارت پر ان کی اجارہ داری تھی، منڈی اور بازار ان کے دستِ تصرف میں تھے۔ غرض ان تمام وجوہ سے وُہ بڑے سرمایہ دار بن گئے تھے اور اپنے اس مقام و مرتبہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معاشی استحصال کے ذریعہ انھوں نے اوس و خزرج (جن کا نام اب انصار ہو گیا تھا) کو اپنا دستِ نگر بنا لیا تھا۔ انصار کا حال بُرا تھا، جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ انصار واقعۂ ہجرت سے پہلے ہی بعاث اور دیگر جنگوں میں نہ صرف اپنی قوتیں ضائع کر چکے تھے بلکہ معاشی اعتبار سے اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ وُہ یہودیوں کے مقروض بن کر [۲۳۵] سود در سود کے چکروں میں گرفتار، اور پھر اس معاشی دباؤ کی وجہ سے بڑی حد تک ان کے زیرِ اثر تھے۔ اس میں شک نہیں کہ انصار تھوڑا بہت تجارت کا شغل بھی رکھتے تھے۔ ان کے بازار مراکز خرید و فروخت بھی تھے [۲۳۶] مگر فنِ تجارت سے فی الواقع وُہ بالکل نابلد تھے اور کم از کم یہ بات طے ہے کہ مدینہ کی تجارت پر ان کا کوئی اقتدار نہ تھا۔ اگرچہ زراعت ان کا آبائی پیشہ اور اصل فن تھا مگر مالی اعتبار سے کمزور ہونے اور زرخیز زمینوں کی قلّت کے سبب، اس میں بھی وہ خاطر خواہ ترقی نہ کر سکتے تھے۔

اب جہاں تک مہاجرین کا تعلق ہے تو یہ بات مسلّمات میں سے ہے کہ وہ سیکڑوں برس سے فنِ تجارت میں مشغول، اس کی نزاکتوں سے واقف، اور اس پیشہ کے امام تھے۔ اُنھوں نے مدینہ آنے کے فوراً بعد ہی بازاروں کا رُخ کیا، کچھ ہی عرصہ میں تجارت و کاروبار پر اس حد تک چھا گئے کہ منڈی سے یہودیوں کی اجارہ داری ختم ہو گئی اور ان کا سارا زور ٹوٹ گیا۔

بہرحال معاشی طور پر یہود کو جو ضرب کاری لگی تھی، اس نے اُن کی حیثیت کو بُری طرح متاثر کیا اور اس کی رہی سہی کسر اس طرح پُوری ہو گئی کہ مواخاۃ کے چند ماہ بعد سنہ ۱ ھ میں منشورِ مدینہ کے نتیجہ میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حکمران اور آخری عدالت مرافعہ مان لیا (جس کی تفصیل آگے آئے گی)۔ پھر اگلے سال یعنی سنہ ۲ ھ میں یہود کے قبیلۂ بنو قینقاع کا، سنہ ۴ ھ میں بنو نضیر کا اخراج عمل میں آیا اور سنہ ۵ ھ میں ان کے قبیلۂ بنو قریظہ کا استیصال کر دیا گیا [۲۳۷] اور اس طرح پانچ سال سے بھی کم عرصہ میں نہ صرف یہ کہ مدینہ کی تجارت و صنعت پر سے ان کی اجارہ داری ختم ہو گئی بلکہ منڈی اور بازار بھی ان کے معاشی تسلّط سے کلیتاً آزاد ہو گئے۔ اس صورت حال کے خوشگوار

نتائج ایک طرف تو یہ ہُوئے کہ معاشی اور معاشرتی دونوں اعتبار سے انصار کا مرتبہ بلند ہوگیا اور انھوں نے اپنی ساری توجہ تجارت وغیرہ سے ہٹا کر زراعت پر مرکوز کر دی بلکہ وہ رفتہ رفتہ زراعت کے میدان میں آگے بڑھنے لگے۔ اور اس طرح آخرکار مہاجرین و انصار کے اتحاد نے کچھ ہی عرصہ میں مدینہ کی چھوٹی سی بستی میں خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ کر دیا۔ مزید برآں اس سے جو معاشرتی بنیادیں استوار ہوئیں، جو تحریک پیدا ہوئی اور جو اجتماعی فضا طاری ہوئی اس نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی تشکیل، عام برادرانہ تعلقات کے قیام اور اسلامی تہذیب کی آبیاری میں انتہائی موثر حصہ لیا۔

۴۔ عقدِ مواخاۃ نے اس بنیادی اصول کو "عہد تازہ" کی صورت میں پھر پیش کیا کہ انسانوں کے باہمی تعلق و ہم آہنگی، وابستگی اور اتحاد کی حقیقی بنیاد وطن، رنگ، نسل زبان وغیرہ نہیں بلکہ صرف دین اور حق ہے۔ اسی نکتہ کی تعلیم توحید کی پہلی دعوت میں دی گئی۔ اسی کے ذریعہ رسول اللہؐ نے اجنبی انسانوں کو اپنا بنایا، اسی کی بنیاد پر ایک نئے معاشرہ کا وجود و قیام عمل میں آیا اور اب اسی کی بنیاد پر اس کی تنظیم کی جا رہی تھی۔ نیز یہ عقد لوگوں کو مزاج و طبائع، رنگ و نسل اور قومیت و وطنیت کے ہزاروں اختلافات کے علی الرغم سب کو ہم مرتبہ و ہم رتبہ بنا کر ایک ہی رشتۂ اخوت میں منسلک کر رہا تھا۔ آرنلڈ (ARNOLD) نے صحیح لکھا ہے کہ،

"اس رشتہ سے تمام قبیلوں کے اختلافات معدوم ہو گئے اور ایک مشترک مذہبی زندگی نسلی رشتوں کی جگہ قائم ہوگئی۔" (۲۳۸)

۵۔ اس مواخاۃ نے مہاجرین و انصار دونوں کو باہمی تربیت، تعلیمِ دین و دنیا اور اخلاق فاضلہ کے اظہار کا بہترین موقع فراہم کیا۔ مہاجرین چونکہ سبقت ایمانی رکھتے تھے اور علم و اکتساب کی جملہ صلاحیتیں بہم پہنچا چکے تھے اس لیے ان کو انصار کا بھائی بنایا گیا تاکہ ہر گھر میں ایک تربیت یافتہ، فاضل و متقی، دینی معلّم موجود ہو اور وہ معلّم اس گھر کی خیر و فلاح میں شریک رہنے کے علاوہ تعلیم و تربیت کے فرائض بھی انجام دے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اصلاح و تربیت کے ان مواقع کو انتہائی سلیقہ کے ساتھ فراہم کیا گیا اور تربیت پذیری کے لیے جس اتحادِ مذاق کی ضرورت ہے وہ رعایت پُوری طرح رشتہ ہائے مواخاۃ میں رکھی گئی۔(۲۳۹) مزید برآں مہاجرین و انصار دونوں کے اتحاد و تعاون اور باہمی تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں تعلیمات اسلامی کو کچھ ہی عرصہ میں گھر اور بازار، مسجد اور مدرسہ، منبر اور دفتر، جلوت اور خلوت غرض ہر جگہ پہنچا دیا گیا۔ گویا اشاعت اسلام آسان فطری طریقے اور انتہائی سرعت سے ہونے لگی اور تعلیمات اسلامی کے زندہ نسخے اسلامی معاشرہ میں ہر طرف چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔

۶۔ اور مجموعی طور پر سب سے بڑا فائدہ اور عقد مواخاۃ کا انتہائی گہرا اثر یہ ہوا کہ جس اسلامی معاشرہ کی داغ بیل مکہ میں پڑ چکی تھی اس کی ترتیب و تنظیم مکمل ہوگئی اور اس کے تمام ارکان تعلیم و تربیت پا کر اس قابل ہو گئے کہ اپنے جملہ معاشرتی، تمدنی اور سیاسی فرائض کی بجا آوری، اور اپنے حقوق کا تحفظ بہ احسن وجوہ کر سکیں۔ اور ایک ریاست کے اربابِ حل و عقد ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکیں۔ علاوہ بریں اس مواخاۃ کے ذریعہ مہاجرین و انصار

"بنیان مرصوص" (سیسہ پلائی ہوئی دیوار) بن گئے[۲۴۰] اور ایک محسوس قوت بن کر ہر خطرہ کے آگے سینہ سپر ہو گئے (جس کا ادنیٰ سا مظاہرہ کچھ ہی ماہ بعد جنگِ بدر میں نظر آجاتا ہے) عقدِ مواخاۃ کے بعد اسلامی جماعت میں اتحاد، تعاون و ہم آہنگی کی فضا اور مرکزیت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مدینہ میں یہود و منافقین اور ان کے ہم نواؤں کے سوا پُوری آبادی گویا ایک ایسے جسم کی مانند ہو گئی جس کی رگ رگ میں اطاعتِ رسولؐ کا خون پُوری قوت سے گردش کر رہا تھا اور جو آپ کے ہر اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار تھا۔

۷۔ جیسا کہ ہم اس بحث کے آغاز میں بتا چکے ہیں کہ ممکن ہے اپنی روح کے اعتبار سے یہ ایک اخلاقی اپیل کی صورت ہے، لیکن اگر حضرت انسؓ کی روایت سامنے رکھی جائے (جن کے گھر میں مواخاۃ کا انعقاد ہوا) تو اس میں اخلاقی سے زیادہ قانونی جھلک پیدا ہو جاتی ہے[۲۴۱]۔ گویا معاشرہ کی تنظیم و ترتیب میں اخوت و مساوات[۲۴۲] کی روح جاری و ساری کرنے کی کوشش، احساس ذمہ داری اور سنجیدگی کے ساتھ کی گئی۔ بہرحال ان معروضات کا مدعا یہ ہے کہ مواخاۃ کے ذریعہ معاشرہ کی تنظیم، ترتیب اور صورت گری مکمل ہو جانے کے بعد مہاجرین و انصار کی مشترکہ جماعت کو مدنی سیاست میں کارفرما حیثیت حاصل ہو گئی۔ لیکن یہاں قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ فراستِ نبویؐ سے یہ امر پوشیدہ نہ تھا کہ یہود اور ان کے ہمنواؤں کو اپنے ساتھ ملائے بغیر مدنی سیاست پر مکمل قابو اور ریاست کا قیام و استقلال ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ لہٰذا آپ نے یہود سے اغماض برت کر انھیں ڈھیل دینے کے بجائے "رشتۂ اتحاد" میں اس طرح کس لیا کہ انہیں طوعاً و کرہاً رسول اللہؐ کی سیاستِ قیادت کو قبول کرنا پڑا۔ چنانچہ منشورِ مدینہ کا اجرا و نفاذ اس سلسلہ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور ہم اگلے صفحات میں اسی کا مطالعہ کریں گے۔

(۴) آغازِ ریاست

بیعتِ عقبہ کے ذریعہ رسول اللہؐ اور اہلِ مدینہ کے درمیان جس انداز اور پیمانے پر سیاسی رابطہ استوار ہوا اور انہوں نے رسول اللہؐ کی قیادت کو مکمل سمع و طاعت کے ساتھ جس طرح قبول کر لیا تھا۔ اس کے بعد تو فی الواقع ضرورت اس امر کی رہ گئی تھی کہ کوئی قطعۂ اراضی زیرِ اثر آجائے جس میں کوئی اور سیاسی اقتدار کارفرما نہ ہو تو معاً ایک ریاست رُو بہ عمل آسکتی ہے۔

چنانچہ ہجرتِ مدینہ کے بعد ایک طرف تو مسلمانوں کی جماعت کو عقدِ مواخاۃ کے ذریعہ ایک منظم معاشرہ کی شکل دے دی گئی اور دوسری طرف ایک سرزمین بھی حاصل ہو گئی جہاں نزاج کی وجہ سے کوئی باقاعدہ سیاسی اقتدار موجود نہ تھا۔ گو یا ریاست کے کل عناصر و لوازم میسر آگئے تو ابتدائی مسائل سے فارغ ہوتے ہی رسول اللہؐ نے ہجرت کے پہلے ہی سال میں "ہئیت سیاسیہ" کی تکمیل کر لی اور ایک نوشتۂ خاص کے ذریعہ مدینہ کی اسلامی ریاست کو وجود بخش دیا۔

دنیا کی تاریخ میں کسی ریاست کا قیام تھوڑی بہت قوت استعمال کئے بغیر شاید ہی ہوا ہو، لیکن یہ تاریخ کی کتنی بڑی حقیقت ہے کہ رسول اللہؐ نے بالکل اجنبی ماحول میں باہم متضاد و منتشر عناصر کے تعاون سے نہ صرف ریاست بلکہ ایک نظریاتی

ریاست کو قائم فرمایا اور پھر خاص بات یہ ہے کہ اس تعاون کو آپ نے کسی طاقت و تشدّد یا جبر و ظلم کے بل بوتے پر نہیں بلکہ محض ایک نوشتہ کے ذریعے حاصل کیا تھا۔

یہ نوشتہ یا دستاویز جس کے ذریعہ مدینہ ایک مکمل شہری ریاست کی شکل اختیار کر گیا، اور جس میں حکمران ریاست اور اس کی رعایا کے حقوق و فرائض اور دیگر فوری ضروریات کا تفصیلی ذکر ہے، عام معنوں میں کوئی تحریر یا معاہدہ نہ تھا ورنہ یوں تو قبائل آپس میں مختلف معاہدے پہلے بھی کر ہی لیا کرتے تھے اور "محالفہ" کر کے زندگی کے سرد و گرم میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے تھے۔ حضورؐ نے باشندگانِ مدینہ کے لئے جو دستاویز مرتّب فرمائی اس کے خد و خال یقیناً وہ نہیں ہیں جو دو قبیلوں کے درمیان محالفہ وغیرہ کے ہوتے ہیں بلکہ اس کا انداز صریحاً اس منشور کا سا ہے جو حکمران کی طرف سے رعایا کے لیے جاری کیا جاتا ہے۔

اس کی تصدیق دستاویز کے مکمل متن سے ہوتی ہے جسے قدیم ترین سیرت نگار ابنِ اسحاق نے پُوری طرح نقل کیا اور بعد میں ابو عبید نے بھی بعض معمولی اختلافات کے ساتھ اپنی کتاب "الاموال" میں اسے محفوظ کر لیا۔ ہم نے ذیل میں اس متن کو ابن ہشام سے اخذ کیا ہے اور حواشی میں ان اختلافات کو واضح کر دیا ہے جو ابو عبید[۲۴۳] کے یہاں پائے جاتے ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هذا كتاب من محمد النبی[۲۴۴] صلی اللہ علیہ وسلم بین المومنین والمسلمین من قریش[۲۴۵] ویثرب، ومن تبعهم، فلحق بهم[۲۴۶]، وجاهد معهم، انهم امة واحدة من دون الناس[۲۴۷]، المهاجرون من قریش علیٰ ربعتهم[۲۴۸] یتعاقلون بینهم[۲۴۹] وهم یفدون عانیهم بالمعروف والقسط بین المومنین[۲۵۰] وبنو عوف علی ربعتهم[۲۵۱] یتعاقلون معاقلهم الاولیٰ وكل طائفة[۲۵۲] تفدی عانیها بالمعروف والقسط بین المومنین[۲۵۳]، وبنو الحارث علیٰ ربعتهم یتعاقلون معاقلهم الاولیٰ، وكل طائفة منهم تفدی عانیها بالمعروف و القسط بین المومنین، وبنو ساعدة علیٰ ربعتهم یتعاقلون معاقلهم الاولیٰ، وكل طائفة تفدی عانیها بالمعروف والقسط بین المومنین، وبنو جشم علیٰ ربعتهم یتعاقلون معاقلهم الاولی، وكل طائفة منهم تفدی عانیها بالمعروف والقسط بین المومنین، و بنو النجار علی ربعتهم یتعاقلون معاقلهم الاولیٰ وكل طائفة منهم تفدی عانیها بالمعروف والقسط بین[۲۵۴] المؤمنین، وبنو عمرو بن عوف علی ربعتهم یتعاقلون معاقلهم الاولیٰ وكل طائفة تفدی عانیها بالمعروف والقسط بین المؤمنین، وبنو النبیت علی ربعتهم یتعاقلون معاقلهم الاولیٰ، وكل طائفة تفدی عانیها بالمعروف والقسط بین المومنین وبنو الاوس علی ربعتهم یتعاقلون معاقلهم الاولی، وكل طائفة

منهم تفدی عانیها بالمعروف والقسط بین المومنین[255] وانّ المومنین لا یترکون مفرحاً بینهم أن یعطوه بالمعروف فی فداء أو عقل[256]، و ان لا یحالف مومن، مولی مومن دونہ، وان المومنین المتقین[257] علی من بغی منهم أو ابتغی دسیعه ظلم أو اثم أو عدوان أو فساد بین المومنین[258] و ان أیدیهم علیه جمیعاً[259] ولوکان ولد أحدهم ولا یقتل[260] مومن، مومناً فی کافر ولا ینصر کافراً علی مومن، و ان ذمّه الله واحده، یجیر علیهم أدناهم[261] و ان المومنین بعضهم موالی بعض دون الناس و أنه من تبعنا من یهود[262] فان له النصر والاسوة غیر مظلومین ولا متناصرین علیهم[263] وان سلم المومنین واحده[264] لایسالم[265] مومن، دون مومن فی قتال فی سبیل الله الا علی سواء و عدل بینهم، وان کل غازیه غزت معنا یعقب بعضها بعضاً[266] وأن المؤمنین یبئ بعضهم عن بعض بما نال دماءهم فی سبیل الله[267] وان المومنین المتقین علی أحسن هدیٰ و أقومہ، وانه لا یجیر مشرک مالاً لقریش ولا نفساً ولا یحول دونه علی مومن[268] وانه من اعتبط مومناً قتلاً عن بیّنه[269] فانہ قود به الا أن یرضی ولی المقتول[270] وان المومنین علیه کافّة ولا یحل لهم الاقیام علیه[271] وانه لا یحل لمومن اقربما فی هذه الصحیفه و آمن بالله والیوم الأخر أن ینصر محدثاً أو یوویه، وانه من نصره[272] أو آواه فان علیه لعنة الله وغضبه یوم القیامة ولا یوخذ[273] منه صرف ولا عدل، وانکم مهما اختلفتم فیه من شئ فان مردّه الی الله عزّوجلّ والی محمد صلی الله علیه وسلم[274]۔

وأن الیهود ینفقون مع المومنین ما داموا محاربین، وأن یهود بنی عوف امة مع المومنین[275] للیهود دینهم وللمسلمین دینهم[276]، موالیهم وانفسهم[277] الامن ظلم و أثم فانه لا یوتغ الا نفسه واهل بیته، و أن لیهود بنی النجار مثل ما لیهود بنی عوف، وأن لیهود بنی الحارث مثل ما لیهود بنی عوف، وأن لیهود بنی ساعده[278] مثل ما لیهود بنی عوف، و أن لیهود بنی جشم مثل ما لیهود بنی عوف، و أن لیهود بنی الاوس[279] مثل ما لیهود بنی عوف، و أن لیهود بنی ثعلبه مثل ما لیهود بنی عوف[280] الامن ظلم و أثم[281] فانه لا یوتغ الا نفسه وأهل بیته، وان جفنه بطن من ثعلبه کانفسهم، وأن لبنی الشّطیبه مثل ما لیهود بنی عوف وأنّ البر دون الاثم، وان موالی ثعلبه کانفسهم، وأن بطانه یهود کانفسهم[282] وأنه، لا یخرج منهم احد[283] الا باذن محمد صلّی الله

علیه وسلم وانه لا ینحجز علی ثار جرح، وانه من فتك فبنفسه فتك واهل بیته الا من ظلم وان الله علی أبر هذا، وأن علی الیهود نفقتهم وعلی المسلمین نفقتهم[۲۸۴] وان بینهم النصر علی من حارب أهل هذه الصحیفه، وان بینهم النصح والنصیحة[۲۸۵] والبر دون الاثم[۲۸۶]، وانه لم یأثم امرؤ بحلیفه وان النصر للمظلوم[۲۸۷]، وان الیهود ینفقون مع المؤمنین ماداموا محاربین[۲۸۸] وأن یثرب حرام جوفها لاهل هذه الصحیفة[۲۸۹] وأن الجار کالنفس غیر مضار ولا آثم وانه لا تجار حرمه الا باذن اهلها[۲۹۰] وانه ما کان بین اهل هذه الصحیفة من حدث أو اشتجار یخاف فساده فان مردّه الی الله عزّ وجلّ والی محمد رسول الله صلی الله علیه وسلم[۲۹۱] وأن الله علی أتقی ما فی هٰذه الصحیفه وابرّه، وأنه لا تجار قریش، ولا من نصرها[۲۹۲] وان بینهم النصر علی من دهم یثرب، واذا دعوا الی صلح یصالحونه ویلبسونه فانهم یصالحونه ویلبسونه وأنهم إذا دعوا الی مثل ذلك فانه لهم علی المومنین الا من حارب فی الدین[۲۹۳] علی کل اناس حصتهم من جانبهم الذی قبلهم[۲۹۴] وأن یهود الاوس موالیهم وأنفسهم علی مثل ما لأهل هذه الصحیفه مع البرّ المحض من اهل هذه الصحیفة[۲۹۵] وأن البرّ دون الاثم لا یکسب[۲۹۶] کاسب الا علی نفسه وأنّ الله علی اصدق ما فی هذه الصحیفة وأبرّه، وانّه لا یحول هٰذا الکتاب[۲۹۷] دون ظالم أو آثم وانه من خرج آمن ومن قعد آمن، بالمدینة[۲۹۸] الا من ظلم وأثم وأنّ الله جار لمن برّ واتقی، ومحمد رسول الله صلی الله علیه وسلم[۲۹۹]

مندرجہ بالا منشور کو سمجھنے اور آئندہ حوالوں میں آسانی کے لیے مناسب یہ ہے کہ مندرجہ بالا دستاویز کا مطلب (حسب سابق قوسین میں دینے کے بجائے) دفعات کی صورت میں لکھا جائے۔ چنانچہ اسے ہم یُوں ترتیب دے سکتے ہیں:

۱ - یہ تحریری دستاویز ہے اللہ کے نبی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قریش اور یثرب کے اہلِ ایمان اور ان لوگوں کے باب میں جو ان کے اتباع میں ان کے ساتھ شامل ہوں اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصّہ لیں۔

۲ - یہ (تمام گروہ) دنیا کے (دُوسرے) لوگوں سے ممتاز و ممیز ایک علیحدہ (سیاسی) وحدت متصور ہوں گے۔

۳ - مہاجرین جو قریش میں سے ہیں علیٰ حالہ دیتوں اور خون بہا وغیرہ کے معاملات میں اپنے قبیلہ کے طے شدہ رواج پر عمل کریں گے، اپنے قیدیوں کو مناسب فدیہ دے کر چھڑائیں گے اور دُوسرے مسلمانوں کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ کریں گے[۳۰۰]

۴ - اور بنو عوف بھی اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے اور خون بہا وغیرہ کا طریقہ ان میں حسبِ سابق قائم رہے گا۔ ہر گروہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا۔

۵ - اور بنو ساعدہ بھی اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے اور خون بہا کا طریقہ ان میں حسبِ سابق قائم رہے گا۔ ہر گروہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا۔

۶ - اور بنو حارث بھی اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے اور خون بہا کا طریقہ ان میں حسبِ دستور سابق رہے گا۔ ہر گروہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا۔

۷ - اور بنو جشم اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے اور حسبِ سابق اپنے خون بہا مل کر ادا کریں گے اور ہر گروہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا۔

۸ - اور بنو نجار اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے اور حسبِ دستورِ سابق اپنا خون بہا مل کر ادا کریں گے اور ہر گروہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا۔

۹ - اور بنو عمرو بن عوف اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے اور خون بہا وغیرہ کا طریقہ ان میں حسبِ سابق جاری رہے گا۔ ہر گروہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا۔

۱۰ - اور بنو النبیت اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے اور خون بہا حسبِ سابق مل کر ادا کریں گے اور ہر گروہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا۔

۱۱ - اور بنو الاوس اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے اور خون بہا وغیرہ کا طریقہ ان میں حسبِ سابق قائم ہوگا۔ ہر گروہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا۔

۱۲ - اہلِ ایمان اپنے کسی زیر بار قرضدار کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے بلکہ قاعدہ کے مطابق فدیہ، دیت اور تاوان ادا کرنے میں اس کی مدد کریں گے۔

۱۳ - اور کسی مومن کے آزاد کردہ غلام کو کوئی مومن حلیف نہ بناتے گا۔

۱۴ - اور یہ کہ تمام تقویٰ شعار مومنین متحد ہو کر ہر اس شخص کی مخالفت کریں گے جو سرکشی اختیار کرے، ظلم، گناہ اور تعدی کے ہتھکنڈوں سے کام لے اور ایمان والوں کے درمیان فساد پھیلائے۔ ایسے شخص کی مخالفت میں ایمان والوں کے ہاتھ ایک ساتھ اٹھیں گے اگرچہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

۱۵ - کوئی مومن، کسی دوسرے مومن کو، کافر کے عوض قتل نہیں کرے گا اور نہ مومن کے خلاف وہ کسی کافر کی مدد کرے گا۔

۱۶ - اور اللہ کا ذمہ (اور پناہ سب کے لیے یکساں اور) ایک ہے۔ ادنیٰ ترین مسلمان بھی کافر کو پناہ دے سکتا ہے۔ اہلِ ایمان دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں باہم بھائی بھائی اور مددگار و کارساز ہیں۔

۱۷ - یہودیوں میں سے جو بھی ہمارا اتباع کرے گا تو اسے مدد اور مساوات حاصل ہوگی۔ ان (یہود) پر نہ تو ظلم کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے خلاف کسی (دشمن) کی مدد کی جائے گی۔

۱۸ - تمام اہلِ ایمان کی صلح یکساں اور برابر کی حیثیت رکھتی ہے۔ کوئی مومن قتال فی سبیل اللہ میں دوسرے مومن کو چھوڑ کر (دشمن سے) صلح نہیں کرے گا۔ اور اسے مسلمانوں کے درمیان عدل و مساوات کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔

۱۹ - جو لشکر ہمارے ساتھ جہاد میں شریک ہوگا اس کے افراد آپس میں باری باری ایک دوسرے کی جانشینی کریں گے۔

۲۰ - اہلِ ایمان کفار سے انتقام لینے میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

۲۱ - تمام تقویٰ شعار مسلمان اسلام کے احسن اور اقوم طریق پر ثابت قدم رہیں گے۔

۲۲ - اور (مدینہ کا) کوئی مشرک (غیر مسلم اقلیت) قریش کے کسی شخص کو مالی یا جانی کسی طرح کی پناہ نہ دے گا، اور نہ مسلمان کے مقابلہ پر اس (قریشی) کی حمایت و مدد کرے گا۔

۲۳ - اور جو شخص ناحق کسی مومن کا خون کرے گا اسے مقتول کے عوض (بطور قصاص) قتل کیا جائے گا الا یہ کہ اس مقتول کا ولی اس کے عوض خوں بہا لینے پر رضامند ہو جائے اور تمام اہلِ ایمان قاتل کے خلاف رہیں گے۔

۲۴ - کسی ایمان والے کے لیے جو اس دستور العمل کے مندرجات کی تعمیل کا اقرار کر چکا ہے اور اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، یہ ہرگز جائز نہ ہوگا کہ وہ کوئی نئی بات نکال کر فتنہ انگیزی کے ذمہ دار کی حمایت کرے یا اسے پناہ دے جو ایسے کسی (مجرم) کی حمایت و نصرت کرے گا یا اسے پناہ دے گا تو وہ قیامت کے دن اللہ کی لعنت اور اس کے غضب کا مستوجب ٹھہرے گا اور (جہاں) اس کی نہ توبہ قبول کی جائے گی نہ (عذاب کے بدلے) کوئی فدیہ۔

۲۵ - اور جب تم مسلمانوں میں کسی قسم کا تنازعہ ہوگا تو اسے اللہ اور (اس کے رسول) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

۲۶ - اور یہ کہ جب تک جنگ رہے یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ مل کر مصارف اٹھائیں گے۔

۲۷ - اور یہود بنی عوف اور ان کے اپنے حلفاء و موالی، سب مل کر مسلمانوں کے ساتھ ایک جماعت (فریق) متصور ہوں گے۔

۲۸ - یہودی اپنے دین پر (رہنے کے مجاز) ہوں گے اور مومن اپنے دین پر کاربند رہیں گے۔ البتہ جس نے ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کیا تو وہ محض اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو مصیبت میں ڈالے گا۔

۲۹ - اور بنی النجار کے یہودیوں کے لیے بھی وہی کچھ مراعات ہیں جو بنی عوف کے یہودیوں کے لیے ہیں۔

۳۰ - اور بنی الحارث کے یہودیوں کے لیے بھی وہی کچھ ہے جو بنی عوف کے یہودیوں کے لیے ہے۔

۳۱ - اور بنی ساعدہ کے یہودیوں کے لئے بھی وہی کچھ ہے جو بنی عوف کے یہودیوں کے لئے ہے۔

۳۱ - اور بنی ساعدہ کے یہودیوں کے لئے بھی وہی کچھ ہے جو یہود بنی عوف کے لئے۔

۳۲ - اور بنی جشم کے یہودیوں کے لئے بھی وہی کچھ ہے جو یہود بنی عوف کے لئے۔

۳۳ - اور بنی الاوس کے یہودیوں کے لئے بھی وہی کچھ ہے جو یہود بنی عوف کے لئے۔

۳۴ - اور بنی ثعلبہ کے یہودیوں کے لئے بھی وہی کچھ ہے جو یہود بنی عوف کے لئے ہے البتہ جو ظلم یا عہد شکنی کا مرتکب ہو تو خود اس کی ذات اور اس کے گھرانے کے سوا کوئی دوسرا مصیبت میں نہیں پڑے گا۔

۳۵ - اور جفنہ (جو قبیلہ) ثعلبہ کی شاخ ہے اسے بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو حاصل ہیں۔

۳۶ - اور بنی الشطبیہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہود بنی عوف کے لئے ہیں اور ہر ایک پر اس (دستاویز) کی وفا شعاری لازم ہے نہ کہ عہد شکنی۔

۳۷ - اور ثعلبہ کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کے لیے ہیں۔

۳۸ - اور یہودی (قبائل کی) ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کے ہیں۔

۳۹ - اور یہ کہ ان قبائل میں سے کوئی فرد (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اجازت کے بغیر نہیں نکلے گا۔ (اصل عبارت سے نکلنے کا مقصد واضح نہیں ہوتا اگرچہ ڈاکٹر حمید اللہ نے اسے فوجی کارروائی کے لئے لکھا ہے)[۱]

۴۰ - اور کسی مار یا زخم کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔ اور ان میں سے جو فرد (یا جماعت) قتل ناحق اور خونریزی کا ارتکاب کرے تو اس کا وبال اور ذمہ داری اس کی ذات اور اس کے اہل و عیال پر ہوگی (ورنہ ظلم ہوگا)۔ اور اللہ اس کے ساتھ ہے جو اس سے بری الذمہ ہو۔

۴۱ - اور یہودیوں پر ان کے مصارف کا بار ہوگا اور مسلمانوں پر ان کے مصارف کا۔

۴۲ - اور اس صحیفہ والوں کے خلاف جو بھی جنگ کرے گا تو تمام فریق (یہودی اور مسلمان) ایک دوسرے کی مدد کریں گے نیز خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں گے اور ان کا شیوہ وفاداری ہوگا نہ کہ عہد شکنی۔

۴۳ - اور ہر مظلوم کی بہر حال حمایت و مدد کی جائے گی۔

۴۴ - اور یہ کہ جب تک جنگ رہے۔ یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ مل کر مصارف اٹھائیں گے۔

۴۵ - اور اس صحیفہ والوں کے لیے حدود یثرب (مدینہ) کا داخلی علاقہ (جوف) حرم کی حیثیت رکھے گا۔

۴۶ - پناہ گزین، پناہ دہندہ کی مانند ہے۔ نہ کوئی اس کو ضرر پہنچائے اور نہ وہ خود عہد شکنی کر کے گناہ گار بنے۔

۴۷ - اور کسی پناہ گاہ میں وہاں والوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی۔

۴۸ - اور اس صحیفہ کے ماننے والوں میں اگر کوئی نئی بات پیدا ہو (جس کا ذکر اس دستاویز میں نہیں) یا کوئی اور

---

[۱] حمید اللہ (عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی) ص ۱۰۸

جھگڑا جس سے کسی نقصان اور فساد کا اندیشہ ہو تو اس متنازعہ فیہ امر میں فیصلے کے لئے اللہ اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اور اللہ (کی تائید) اس شخص کے ساتھ ہے جو اس صحیفہ کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور وفاشعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

۴۹ - اور قریش (مکہ) اور اس کے حامیوں کو کوئی پناہ نہیں دی جائے گی۔

۵۰ - اور یثرب (مدینہ) پر جو بھی حملہ آور ہو تو اس کے مقابلہ میں یہ سب (یہودی اور مسلمان) ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

۵۱ - ان (مسلمانوں) میں سے جو اپنے حلیف کے ساتھ صلح کرنے کے لئے یہود کو دعوت دے تو یہود اس سے صلح کر لیں گے۔ اسی طرح اگر وہ (یہود) کسی ایسی ہی صلح کو دعوت دیں تو مومنین بھی اس دعوت کو قبول کر لیں گے۔ الّا یہ کہ کوئی دین (و مذہب) کے لئے جنگ کرے۔

۵۲ - تمام لوگ (فریق) اپنی اپنی جانب کے علاقے کی مدافعت کے ذمہ دار ہوں گے۔

۵۳ - اور (قبیلہ) اوس کے یہود کو، خواہ موالی ہوں یا اصل، وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس تحریر کے ماننے والوں کو حاصل ہیں اور وُہ بھی اس صحیفہ والوں کے ساتھ خالص وفاشعاری کا برتاؤ کریں نیز قرارداد کی پابندی کی جائے گی نہ کہ عہد شکنی۔

۵۴ - ہر کام کرنے والا اپنے عمل کا ذمہ دار ہوگا۔ زیادتی کرنے والا اپنے نفس پر زیادتی کرے گا اور اللہ اس کے ساتھ ہے جو اس صحیفہ کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ صداقت اور وفاشعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

۵۵ - یہ نوشتہ کسی ظالم یا مجرم (کو اس کے جُرم کے عواقب سے بچانے کے لئے) کے آڑے نہ آئے گا۔ جو جنگ کے لئے نکلے (کسی اور جگہ نقلِ مکانی کرے) وہ بھی اور جو گھر (مدینہ) میں بیٹھا رہے (سکونت رکھے) وُہ بھی امن کا حقدار ہوگا (اس پر کوئی مواخذہ نہیں) البتہ اس سے صرف وہ لوگ مستثنٰی ہوں گے جو ظلم یا جُرم کے مرتکب ہوں۔

۵۶ - اور جو اس نوشتہ کی وفاشعاری اور احتیاط سے تعمیل کرے گا تو اللہ اور اس کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اس کے نگہبان (اور خیر اندیش) ہیں۔

یہ تاریخی دستاویز جس کا متن اور ترجمہ ہم نے اُوپر نقل کیا ہے۔ تاسیسِ ریاست کے ضمن میں رسولؐ اللہ کا وہ انقلابی اقدام ہے جس کی نظیر پوری تاریخِ سیاست میں مشکل سے ہی ملے گی۔ اس نوشتہ کی بنا پر، جیسا کہ تمہید میں عرض کیا گیا، نہ صرف یہ کہ مدینہ میں ایک ریاست کی تاسیس باضابطہ طور پر ہوگئی بلکہ اس نوشتہ نے مدنی سیاست و معاشرت بلکہ پُورے عرب کی سیاست و مدنیت پر انتہائی دور رس اثرات مرتب کیے۔ چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے کہ "اصل میں شہر مدینہ کو پہلی دفعہ "شہری مملکت" قرار دینا اور اس کے انتظام کا دستور مرتب کرنا تھا۔"[۳۰] بہرحال اس

اجمال کی تفصیل اور اس کے مندرجات کی وضاحت مندرجہ ذیل نکات کے تحت کی جاسکتی ہے:

(۱) اس دستاویز کا مجموعی طور پر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی زبان، اس کی عبارت، اس کی تحریر کا سیاسی سلیقہ، اس کا محتاط و قانونی اندازِ بیان اور اس کے مندرجات وغیرہ (ایک معمولی نوشتہ یا معاہدہ کے نہیں بلکہ) غیر معمولی نوعیت کے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس دستاویز پر بحث کرتے ہوئے اس کا عنوان "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور" قائم کیا (۳۰۲)۔ اسی مضمون میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ "زیرِ بحث دستاویز ایک معاہدہ کی شکل نہیں رکھتی بلکہ ایک فرض اور حکم کی صورت میں نافذ کی جاتی ہے۔ چنانچہ سب لوگ جانتے ہیں کہ "کتاب" کے معنی فرض اور حکم کے ہیں۔" (۳۰۳) اور پھر حوالے دے کر آگے ثابت کرتے ہیں کہ "جرمن، فرانسیسی، انگریزی اور ہسپانوی زبانوں میں بھی اس کے کم و بیش یہی معنی ہیں۔" (۳۰۴)

چنانچہ اس دستاویز کی اس "دستوری" نوعیت کے پیشِ نظر یہ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ اس کے کسی ایک فریق کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ جب چاہے علیحدگی اختیار کرلے یا اس کی خلاف ورزی کر ڈالے۔ ایسا کرنا گویا اس "حقِ شہریت" کو ختم کر دینا ہے جسے ریاست نبویؐ کے حدود میں یہی دستور عطا کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جن یہودی قبائل نے بعد میں اسے پامال کیا ان کے خلاف وہ کارروائی کی گئی جو غداروں اور باغیوں کے خلاف کی جاتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس دستاویز کو معاہدہ یا میثاق کے بجائے "فرمان" اور "منشور" کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ (۳۰۵) اس کے مندرجات پر غور کرنے سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ اسے اللہ کے نبی و رسول اور ریاست مدینہ کے حکمران کی جانب سے جاری کیا گیا، اس میں یک طرفہ طور پر (معاہدہ کے برخلاف) تمام رعیت کے حقوق و فرائض کو متعین کیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ کمال تدبر سے اس وقت مدنی سیاست و معاشرت کی تمام فوری ضروریات (مثلاً مسلمانوں اور دیگر عناصر آبادی کے درمیان تعلقات کا مسئلہ، قریش کی ناکہ بندی، مدینہ کا دفاع وغیرہ) کا تسلی بخش انتظام بھی کر دیا گیا۔ (۳۰۶)

علاوہ ازیں اس منشور میں یہ امر بھی واضح ہے کہ اس کا دائرہ اطلاق مدینے میں رہنے والے تمام باشندوں اور تمام جماعتوں پر یکساں طور پر عائد ہوتا ہے۔ یعنی مہاجرین، انصار، مشرکین اور یہود وغیرہ۔ اس منشور کے ابتدائی فقرے اس کی وسعت اور ہمہ گیری کو متعین کر کے اس بات کی نفی کر دیتے ہیں کہ یہ "یہودیوں سے معاہدہ" قسم کی کوئی چیز ہے۔ (۳۰۷)

(۲) اس دستاویز کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے اور اس کا سرعنوان ہے "ھذا کتاب من محمد النبی صلی اللہ علیہ وسلم" (یہ کتاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے جو اللہ کے رسول اور نبی ہیں)۔ گویا پیرائیہ آغاز میں ہی نظریہ اساسی کی بنیاد رکھ دی گئی اور اس کی دیگر دفعات میں اللہ کی حاکمیت اور رسولؐ کی نیابت کی طرف بہر حال مراجعت (۳۰۸) اور دنیاوی و اُخروی عذاب و ثواب کی تلقین (۳۰۹) کر کے

اسلام کو اس دستور کی اساس اور رُوح بنا دیا گیا ہے۔

(۳) دفعہ دوم کی رُو سے اس دستاویز کے تمام مخاطبین کو ایک سیاسی وحدت (امۃ واحدہ)[۳۱۰] قرار دیا گیا۔ اور بھی اس شکل میں کہ ہیئت اجتماعیہ کا مرکزی اور غالب عنصر بہرصورت مسلم جماعت ہی ہے۔ چنانچہ اس دستوری نوشتہ کا دائرہ نامزد کرتے ہوئے پہلے تو یہ کہا گیا کہ "بین المومنین والمسلمین من قریش ویثرب" اور پھر اس پر اضافہ یہ کیا گیا کہ "ومن تبعھم فلحق بھم وجاھد معھم" گویا ریاست کا مرکزی عنصر مکہ اور مدینہ کے اہلِ ایمان میں اور بقیہ ان کے تابع، لاحق اور حامی ہونے کی صورت میں شہریت سے بہرہ مند ہیں۔ یہاں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ منشور کے اس پہلے حصہ میں اصل تخاطب مہاجرین و انصار کی جماعت سے ہے۔ جو نظری اور عملی دونوں طرح دین کی اساس پر بھائی بھائی بنائے جا چکے تھے۔ اور جنہیں منشور زیربحث کی دفعہ میں بھی یہی حیثیت دی گئی۔ چنانچہ تصریح ہے کہ "اہلِ ایمان دوسرے انسانوں کے بالمقابل آپس میں بھائی بھائی ہیں"[۳۱۱] اس سے ایک طرف تو یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے باہمی روابط جو پہلے ہی سے "اخوت" کے سائے میں پروان چڑھ رہے تھے اب ان کو قانونی تحفظ بھی دے دیا گیا۔ اور دوسری طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہاجرین و انصار مجموعی طور پر ایک مکمل جماعت ہیں جیسا کہ خود لفظِ اُمت سے مترشح ہے۔ بلکہ ہمارے نزدیک اگر یہاں اس لفظ کا اطلاق مصطلحہ "قوم" (NATION) کے معنوں میں کیا جائے تب بھی یہ جماعت اس کا مصداق بن جائے گی کیونکہ اس کی ترتیب و تنظیم کا مدار دین پر ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اُمتیں اور قومیں اوطان سے نہیں بنا کرتیں بلکہ مخصوص جذبات، رسوم و عقاید اور افکار و نظریات سے بنتی ہیں۔[۳۱۲]

(۴) اسلام جس قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے اس کی مرکزی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ اس میں معروفات (نیکیاں) فروغ پائیں اور منکرات (برائیوں) کا استیصال ہو۔[۳۱۳] چنانچہ اسلامی حکومت کے فرائض و مقاصد کا تعین کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہے کہ:

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔[۳۱۴]

(یہ مسلمان وُہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحبِ اقتدار کر دیا تو وہ نماز قائم کریں گے، ادائے زکوٰۃ میں سرگرم ہوں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے اور برائیوں سے روکیں گے)

اسلام کے نظامِ قانون کا مطالعہ یہ امر واضح کرتا ہے کہ اسلام میں حلال و حرام کے معیارات قائم کرنے میں بھی اصل رعایت معروف و منکر کی ہی رکھی گئی ہے، چنانچہ جو چیز انسانی معاشرہ کے لیے سمِ قاتل ہے، برائیوں کی اصل ہے، اور جس میں سب سے بڑا گناہ ہے اسے شریعت نے بالکل حرام قرار دیا ہے۔ مثلاً قتل ناحق، کیونکہ بقول ایک مصنف "انسان کے تمدنی حقوق میں اس کا اوّلین حق زندہ رہنے کا اور اس کے تمدنی فرائض میں اولین فرض زندہ رہنے دینے کا ہے جس قانون اور مذہب میں اسے تسلیم نہ کیا گیا ہو وُہ نہ تو مہذب قانون بن سکتا ہے اور نہ اس کے ماتحت رہ کر کوئی انسانی

جماعت پُرامن زندگی بسر کر سکتی ہے۔"(۳۱۵) اسی طرح جو چیز انسانیت کے لیے رحمت، بھلائیوں کی اصل اور جس میں سب سے بڑا ثواب ہے اسے شریعت نے بہرحال "فرض" قرار دیا ہے۔ مثلاً عبادات و معاملات کی ادائیگی وغیرہ۔ اس اصول کی روشنی میں یہ امر محتاجِ بیان نہیں ہے کہ اس وقت چونکہ رسولؐ اللہ کے سامنے ایک ایسے ہی مثالی معاشرہ کی تعمیر درپیش تھی۔ چنانچہ منشور میں بھی یہ رعایت پُوری طرح رکھی گئی کہ مدینہ کی بستی امن و سلامتی کا گہوارہ بن سکے اور وہاں کے تمام باشندے عملاً اس قسم کی فضا قائم کرنے میں اپنا اپنا حصہ ادا کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نوشتہ میں جگہ جگہ "نیکی اور انصاف" سے کام لینے کی تاکید موجود ہے اور جس کا اظہار متعدد دفعات سے ہوتا ہے۔(۳۱۶) نیز یہ بھی مطالبہ کیا گیا ہے کہ برائیوں کی جڑ کاٹی جائے۔ چنانچہ اس ضمن میں ظلم و تعدی، طغیان و فساد، سرکشی، استحصال بالجبر(۳۱۷) اور قتل(۳۱۸) کو سخت ممنوع بلکہ ناقابلِ معافی جُرم قرار دیا گیا اور یہی وجہ ہے کہ فدیہ و خُون بہا(۳۱۹)، قصاص(۳۲۰)، ذمہ و پناہ(۳۲۱)، صلح(۳۲۲)، اخوت(۳۲۳)، خدا کی راہ میں انتقام(۳۲۴)، اُخروی عذاب و لعنت سے بچنے(۳۲۵) اور رجوع الی اللہ والرسول(۳۲۶) کو فرض و ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہاں ہم یہ بات بڑے اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ زیرِ بحث منشور کے یہی بنیادی مقاصد تھے۔ کیونکہ ہر آبادی فی الجملہ پُرسکون زندگی بسر کرنے کی خواہاں ہوتی ہے اور اہلِ مدینہ میں تو یہ خواہش بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں ریاست کا داخلی امن و امان اور معاشرہ کے مختلف اعمال و وظائف اور ادارات کا قیام و استحکام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ فتنہ و فساد کے ہر سرچشمے کا دہانہ بند نہ کر دیا جائے اور بیرونی حملوں اور یورشوں کی روک تھام کا بندوبست نہ کیا جائے۔ منشور میں چونکہ ان تمام باتوں کی ضمانت موجود ہے اس لئے اسے اپنے مقاصد میں بجا طور پر کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ تفصیلاتِ بالا سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ رسولؐ اللہ نے اپنے منشور ریاست کی اساس ان اخلاقی قدروں پر رکھی جن کی افادی اور انسانی حیثیت سے عقلِ سلیم انکار نہیں کر سکتی۔ سیاست اور اخلاق کا یہ امتزاج اس وقت اور بھی معنی خیز ہو جاتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جدید تصورِ ریاست و سیاست میں اخلاق کو بالکلیہ خارج کر دیا جاتا ہے۔(۳۲۷)

(۵) منشور کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ ایک مکمل دستاویز اور جامع فرمان کی حیثیت رکھتا ہے اور اسے ایک ہی دفعہ یعنی سنہ ۱ھ میں جاری کیا گیا جیسا کہ تمام قدیم و جدید مآخذ میں اس کی تصریح موجود ہے اور بعض جدید العہد مصنفین نے بھی (جنہوں نے اس دستاویز کو اپنی تحقیق و کاوش کے لئے منتخب کیا) یہ اعتراف کیا ہے کہ "پُوری دستاویز ایک ہی کل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی عبارت و اندازِ اسلوب سے بھی ایک ہی مرتب کنندہ کا ہونا پایا جاتا ہے اور مسلمان مورخ عام طور پر یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ دستاویز سنہ ۱ھ کی ابتدا میں مرتب ہُوئی(۳۲۸)" لیکن آگے چل کر ان کا بیان یہ ہے کہ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سنہ ۱ھ میں دستاویز کا حصہ اول مرتب ہوا اور بقیہ حصہ سنہ ۲ھ میں جنگِ بدر کے بعد مرتب کر کے حصہ اول کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہو۔"(۳۲۹) پھر اپنے اس قیاس پر استدلال اس طرح پیش کرتے ہیں کہ "یہودیوں کا بھی اسی ابتدائی زمانہ میں آنحضرتؐ کے سیاسی اقتدار کو مان لینا قرینِ قیاس نہیں۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دستور کا حصہ دوم یعنی یہودیوں کا دستور العمل جنگِ بدر کے بعد کا واقعہ ہے جبکہ ایک زبردست فتح سے مسلمانوں کی دھاک ہر طرف بیٹھ گئی تھی۔

اہلِ مدینہ نے اپنے سابقہ معاہدات حلیفی جو یہودیوں کے ساتھ تھے منسوخ کر لئے تھے۔ آنحضرتؐ نے آس پاس کے قبائل مثلاً بنی ضمرہ، جہینہ وغیرہ سے حلیفیاں کر کے مسلمانوں کی قوت کو بے حد مضبوط و مستحکم بنا دیا تھا۔ یہودیوں کے دو بڑے گروہ آپس کے حریف و رقیب تھے ان کا مل کر رہنا اور الگ مستقل رہ کر محفوظ رہنا ممکن نہ تھا اور وہ ہر طرف سے بچھڑ کر بے یار و مددگار اور ہر قوی کا شکار بنے ہوئے تھے۔ ان حالات نے انھیں مجبور کیا کہ اپنی مذہبی آزادی اور اندرونی خود مختاری برقرار رکھتے ہوئے آنحضرت سے ماتحتانہ تعاون کریں اور جیسا کہ عرض کیا گیا میرے خیال میں یہ جنگِ بدر کے بعد کا واقعہ ہو سکتا ہے اس سے پہلے کا ہونا قرینِ قیاس نہیں۔"[۳۳۰] اسی طرح مشہور مستشرق منٹگمری واٹ بھی کیتانی اور ولہازن کی متابعت میں ایک طرف تو اسے ایک ہی مکمل دستاویز قرار دیتا ہے[۳۳۱] اور دوسری طرف یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ چونکہ اس کی کئی دفعات میں ضمائر و تخاطب کا اختلاف ہے مثلاً کہیں مومنین کا لفظ استعمال ہوا کہیں مسلمین کا' اس لیے ممکن ہے کہ یہ دو یا اس سے زائد مواقع پر طے کی گئی ہوں لیکن پھر یکجا کر دی گئی ہوں[۳۳۲]۔ مزید برآں چونکہ اس میں مشہور یہودی قبائل کا نام نہیں ہے اس لئے ممکن ہے کہ یہ اخراج بنو قریظہ کے بعد کا واقعہ ہو۔[۳۳۳]

ڈاکٹر حمید اللہ اور واٹ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں فی الحقیقت دستاویز کے مندرجات اور تاریخی واقعات کی روشنی میں کچھ زیادہ قابلِ قبول قرار نہیں دیا جا سکتا چنانچہ اپنے موقف کی تائید میں ہم مندرجہ ذیل نکات کی وضاحت مناسب سمجھتے ہیں:

(ل) قدیم و جدید مورخین اور اربابِ سیر عام طور پر یہی بیان کرتے ہیں کہ یہ دستاویز سنہ ۱ھ سے تعلق رکھتی ہے اور یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ڈاکٹر حمید اللہ اور واٹ دونوں مصنفین اس دستاویز کو اس کی داخلی و خارجی شہادتوں کی بنا پر ایک "کل" تصور کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے جب اس کے ایک جزو کا زمانہ متعین ہے تو دوسرے جزو کا بھی زمانہ منطقی طور پر متعین ہو جاتا ہے اور (قرآن کی سورتوں کی طرح) سیرت کے واقعات میں غالباً اس کی نظیر نہیں ملتی کہ ایک ہی مکمل دستاویز کو دو مختلف زمانوں میں مکمل کر کے بغیر کسی تصریح کے یکجا کر دیا گیا ہو۔

(ب) جہاں تک اس بیان کا تعلق ہے کہ بیرونِ مدینہ قبائل سے معاہدات کر کے رسول اللہؐ ایک مستحکم حیثیت حاصل کر چکے تھے اور جنگِ بدر سے یہود پر دھاک بیٹھ گئی تھی اس لئے انھوں نے رسول اللہؐ کی سیاست کو قبول کرتے ہوئے ماتحتانہ تعاون پیش کیا۔ تو اس سلسلے میں درج ذیل پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا:

(۱) سوال یہ ہے کہ بیرونِ مدینہ قبائل نے رسولؐ کی سیادت کو کیوں قبول کر لیا؟ یہودِ مدینہ نے آپ کی سیادت کو تسلیم نہ کیا ہوتا تو اس صورت میں قبائل سے رسول اللہؐ کے حلیفانہ معاہدات موثر نہ ہو سکتے تھے کیونکہ وہ قبائل کہہ سکتے تھے کہ مدینہ کا ایک قابلِ ذکر عنصر تو آپ کی گرفت سے بالکل باہر ہے پہلے ان کو زیرِ اطاعت لائیے اس کے بعد ہم سے مطالبہ کیجئے۔ علاوہ بریں بیرونِ مدینہ جن قبائل سے اس وقت یا بعد میں معاہدات ہوئے ان کے مضامین سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ چند کے سوا تمام فرامین اور امان نامے ہیں اور فرامین و امان ناموں کا اجرا بجائے خود رسول اللہؐ کی قیادت اور اندرونی سیاسی

خود مختاری کو مزید موکد کرتا ہے۔

۲۔ اس دستاویز کے دوسرے حصّہ کو جنگِ بدر کے بعد فرض کرنے کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ بنی قینقاع کے اخراج سے پہلے تک مدینہ کے تمام منتشر و متفرق عناصر میں اتحاد پیدا نہ ہو سکا تھا جبکہ واقعہ اس کے برعکس ہے یعنی یہ کہ اس سے پہلے تمام مدنی عناصر میں اتحاد ہو چکا تھا اور مدنی معاشرہ کے بعض عناصر (مثلاً منافقین اور یہود) کی جملہ سرگرمیوں کا اوّلین ہدف ہی یہ تھا کہ کسی طرح مدنی معاشرہ کے اتحاد پر ضرب لگائی جائے اور انتشار و تشتت کو ہوا دی جائے۔

۳۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے موقف کو تسلیم کیا جائے تو پھر جنگِ بدر کے بعد محض بنی قینقاع کا اخراج اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حد سے حد بنی قینقاع پر رسول اللہؐ کے اقتدار کی دھاک بیٹھی تھی باقی یہودی قبائل یعنی بنی نضیر اور بنی قریظہ پر اس کا کوئی اثر نہ تھا اور اس صورت میں شاید واٹ کی یہ بات صحیح ہوگی کہ دستاویز کو بنی قریظہ کے استیصال کے بعد ۵ھ کا واقعہ مانا جائے۔ حالانکہ تاریخ سے ان باتوں کی تائید نہیں ہوتی۔

۴۔ اگر ہم اس تحریر کا زمانہ بدر کے بعد کا مان لیں تو غالباً بنی قینقاع کے اخراج کو کچھ اور بڑھانا پڑے گا اور وہ ناممکن ہے کیونکہ غزوۂ بدر کے لئے رسول اللہؐ بقول ابنِ ہشام ۸ رمضان ۲ھ کو اور بروایت ابن سعد ۱۲ رمضان ۲ھ کو روانہ ہوئے[۳۳۴] اور آخر رمضان ۲ھ یا اس کے بعد مدینہ مراجعت فرمائی[۳۳۵] اور پھر غزوۂ بنی قینقاع کے لئے ۱۵ شوال ۲ھ کو نکلے[۳۳۶] اور ۱۵ دن کے محاصرہ کے بعد یعنی ۳۰ شوال ۲ھ کو فارغ ہوئے۔[۳۳۷] اس کا مطلب یہ کہ غزوۂ بدر اور غزوۂ بنی قینقاع کی درمیانی مدّت ۱۵ دن ہے اور اس قلیل ترین مدّت میں تمام یہود کا بدر کے اثرات کو قبول کر کے آمادۂ طاعت ہو جانا اور پھر اس دستاویز کی تحریر ناقابلِ فہم معلوم ہوتی ہے۔

۵۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ جنگِ بدر کی دھاک یہود پر بیٹھ گئی اور انہوں نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ وہ بے یار و مددگار ہو گئے ہیں تو پھر انہوں نے رسول اللہؐ کے خلاف جارحانہ اقدام کی جرأت کیوں کی؟ اور نہایت گستاخی سے یہ کہہ کر دعوتِ مبارزت کیوں دی کہ،

یا محمد انك ترى أنّا قومك؟ لا یغرّنّك انك لقیت قوماً لا علم لهم بالحرب فاصبت منهم فرصةً انّا واللہ لئن حاربناك لتعلمنّ أنّا نحن الناس۔[۳۳۸]

(اے محمد! تم سمجھتے ہو کہ ہم بھی تمہاری قوم کی طرح ہیں؟ تم کہیں گھمنڈ میں مبتلا نہ ہو جانا! تم نے تو ایسے لوگوں سے مقابلہ کیا تھا جو جنگ سے واقف نہ تھے۔ اس لئے ان پر غلبہ پا لیا۔ لیکن ہم ایسے نہیں ہیں۔ واللہ! ہمیں تم سے لڑنے کی نوبت آئے گی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کون لوگ ہیں!)

حالانکہ کم و بیش تمام مورخین (جو عام تاثر کے تحت اس منشور کو معاہدہ سمجھتے ہیں) اس بات پر متفق ہیں کہ بنی قینقاع نے یہ گستاخی کر کے دراصل عہد شکنی کا ارتکاب کیا تھا اور اس منشور کو پسِ پشت ڈال دیا تھا جسے انھوں نے رسول اللہؐ کی آمدِ مدینہ کے بعد خود تسلیم کیا تھا۔[۳۳۹]

ظاہر ہے کہ بنی قینقاع کے خلاف بدعہدی اور دستور شکنی وغیرہ کا الزام اسی صورت میں قابلِ فہم ہو سکتا ہے

جبکہ بدر سے پہلے وُہ کسی عہد کے پابند ہُوئے ہوں۔ اگر بدر سے پہلے وہ کسی تحریر کے پابند نہیں ہیں تو پھر بدعہدی کا الزام کس بات پر ہے؟ حالانکہ ان پر یہ الزام غزوۂ بدر کی وجہ سے عائد کیا گیا۔ کیونکہ اس جنگ میں منشورِ مدینہ کی رُو سے یہود نے مسلمانوں سے نہ تو تعاون کیا اور نہ ہی خیر خواہی برتی۔ اور اسی پر متنبہ کرنے کے لئے رسول اللہؐ صحابہ کے ساتھ جب ان کے محلہ میں تشریف لے گئے تو انہوں نے وہ گستاخانہ جواب دیا جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ پھر معاً ایک مسلمان عورت کی بے حُرمتی ان کے خلاف چارہ جوئی کا فوری سبب بن گئی۔

۶۔ واقعات کی منطقی ترتیب کے اعتبار سے بھی جیسا کہ میور نے واضح کیا ہے کہ یہ تحریر ہجرتِ مدینہ کے زیادہ دنوں بعد کی نہیں ہو سکتی کیونکہ بہت تھوڑے سے ابتدائی عرصہ کے لئے یہودِ مدینہ اور رسول اللہؐ کے تعلقات دوستانہ رہے لیکن کچھ ہی مدت کے بعد یہ ظاہر ہو گیا کہ یہودیت اور اسلام میں کوئی مطابقت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے یہودِ مدینہ نے جانتے بُوجھتے اپنی ضد، ہٹ دھرمی اور اپنے مذہب کی اندھی تقلید میں رسول اللہؐ کو مسترد کر دیا۔[۳۴۰] قرآن کے وُہ حصے جو اس زمانے میں نازل ہُوئے ان میں بھی اس کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ یہود نے جانتے بُوجھتے رسول اللہؐ اور آپ کے لائے ہوئے دین سے اعراض کیا تھا[۳۴۱] چنانچہ اس کے بعد نہ صرف یہودیت اور اسلام کا تصادم صاف ظاہر ہو گیا بلکہ اس سے یہودیوں کو اپنی بے جا توقعات کا انجام بھی معلوم ہو گیا۔ (کہ شاید رسول اللہؐ ان ہی کے دین کی حمایت و نصرت کریں گے یا ان ہی کے دین کے علمبردار بنیں گے) اسی لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہود کا طرزِ عمل مخالفانہ، معاندانہ اور مخاصمانہ ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ پھر یہ خلیج اتنی بڑی ہو گئی جس کا پُر ہونا ممکن نہ تھا۔ بالآخر یہود کو شہری مملکت مدینہ سے نکلنا پڑا۔ بہرحال ان دلائل کی روشنی میں یہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ یہ تحریر جنگِ بدر کے بعد کی ہے۔

(ج) اب جہاں تک واٹ کی اس دلیل کا تعلق ہے کہ چونکہ اس منشور میں یہودیوں کے تین مشہور قبائل کا نام مذکور نہیں ہے، اس لیے اس کا زمانۂ تحریر بنو قریظہ کے استیصال کے بعد ہو گا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ قیاس بھی مندرجہ ذیل وجوہ سے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

۱۔ اگر یہود کے بعض قبائل کا ذکر نہیں ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہودی بحیثیت جماعت کے اس منشور کے مخاطب نہیں ہیں کیونکہ پھر اس صورت میں تو مہاجرین کے قبائل کا بھی انفرادی اعتبار سے ذکر موجود نہیں ہے اور انصار کے جن قبائل کا ذکر کیا گیا ہے وہ اوس اور خزرج کی محض چند شاخیں ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انصار میں سے وُہ لوگ جو دوسرے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے گویا رسول اللہؐ کے دائرہ اطاعت سے خارج ہیں اگر یہ استدلال صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ جس طرح انصار کے چند قبائل گنا کر تمام مراد لئے گئے اسی طرح یہود کے چند قبائل کا تذکرہ کیا پُوری جماعت یہود کا قائم مقام نہیں بن سکتا؟

۲۔ اس دستاویز کا سرنامہ اصولی طور پر جن جماعتوں پر رسول اللہؐ کے سیاسی، قانونی اور معاشرتی اقتدار کو ثابت کرتا ہے۔ اس کے الفاظ میں اتنی عمومیت موجود ہے کہ بغیر نام لئے اس میں وہ تمام افراد شامل ہو جاتے ہیں جن کے بارے

میں کہا گیا ہے کہ:

ومن تبعهم فلحق بهم و جاهد معهم۔

اس صریح کنایہ کے علاوہ اس دستاویز کی ایک دفعہ[۲۸] دلالت کرتی ہے کہ یہود کو کُلّی حیثیت سمجھا گیا ہے۔ اسی شق میں مذہبی اعتبار سے یہود کو آزادی دی گئی ہے اور اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو ظلم و عہد شکنی کا ارتکاب کرے گا تو اس کے تمام نتائج کی ذمہ داری اور وبال خود اس کے اور اس کے خاندان کے علاوہ کسی دوسرے پر نہ ہوگا۔ چنانچہ آئندہ پیش آنے والے تاریخی واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں مثلاً جب کسی بھی ایک یہودی قبیلہ یعنی بنو قینقاع یا بنو نضیر یا بنو قریظہ کے خلاف رسولؐ اللہ کی طرف سے کارروائی کی گئی تو دوسرا قبیلہ خاموش رہا اور اس نے کسی قسم کا احتجاج یا تعرض نہیں کیا۔ یہ واقعات اس بات کا مزید ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ خود یہودی بجا طور پر اس دستاویز کا اپنے آپ کو پابند سمجھتے تھے اسی لئے ان میں سے کسی بھی متاثرہ قبیلہ نے رسولؐ اللہ سے یہ اعتراض نہیں کیا کہ وہ ان کے خلاف کس ضابطہ اور اختیار کی رُو سے اقدام کر رہے ہیں؛ نہ انہوں نے رسولؐ اللہ سے یہ کہا کہ "ہم تو آپ کے حکم کے پابند نہیں ہیں"۔ حالانکہ اگر واٹ کا قیاس درست مانا جائے تو اس صورت میں ایک طرف تو اس قسم کا اعتراض یہود کی طرف سے لامحالہ پیش کیا جا سکتا تھا اور دوسری طرف یہ تینوں مشہور یہودی قبائل رسولؐ اللہ کے خلاف مشترکہ محاذ بنا کر پیش قدمی یا کارروائی کر سکتے تھے اور ایک دُوسرے سے اقدام کی صورت میں مدد بھی طلب کر سکتے تھے لیکن چونکہ اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا اس لئے واٹ کا قیاس تاریخی اعتبار سے ناقابل قبول ٹھہرتا ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس منشور کے پہلے حصہ میں (جو عام تقسیم کے مطابق مہاجرین و انصار وغیرہ سے متعلق ہے) یہ دفعہ (۱۷) موجود ہے کہ:

"یہودیوں میں سے جو بھی ہمارا اتباع کرے گا تو اسے مدد اور مساوات حاصل ہوگی۔ ان (یہود) پر نہ تو ظلم کیا جائے گا اور نہ ان کے خلاف کسی (دشمن) کو مدد دی جائے گی نیز یہ دفعہ (۴۴) بھی شامل منشور ہے کہ مومنین جب تک جنگ میں مصروف رہیں گے جنگی اخراجات میں یہودی ان کے شریک رہیں گے۔"

منشور کی اس دفعہ کے ضمن میں ابو عبید نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یہ شرط اسی لئے رکھی گئی کہ ان یہود پر آپ کے دشمنوں کے خلاف آپ کی مدد لازم ہو جائے۔"[۳۴۲]

پھر آگے لکھتے ہیں کہ:

"اور ہمارا خیال ہے کہ اس خرچ کرنے کی شرط کے باعث آپ مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے والے یہود کو غنیمت میں سے حصہ دیا کرتے تھے ورنہ بصورتِ دیگر وہ مسلمانوں کی غنیمت میں سے کسی حصّہ کے مستحق نہ ٹھہرتے۔"[۳۴۳]

اس مسئلہ کو یہ روایت بھی واضح کرتی ہے کہ زہری کہتے ہیں کہ:

"یہود رسولؐ اللہ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے تھے تو آپ غنیمت میں ان کا حصہ بھی لگاتے تھے۔"[۳۴۴]

۳۔ یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ یہ منشور بالفرض محال اگر استیصال بنی قریظہ کے بعد منعقد ہوا تو خود بنی قینقاع بنی نضیر اور بنی قریظہ کے مدینے سے نکالے جانے کی بنیاد کیا ہے؟ نیز بجائے اس کے کہ تمام یہود کا اخراج ایک ہی بار ہو اس طرح دو یا تین وقفوں کے ساتھ ان کے خلاف کارروائی کیوں کی گئی؟ یہ بنیاد ظاہر ہے منشور مدینہ ہی ہو سکتی ہے جو یقیناً ان سب واقعات پر تقدم زمانی رکھتا ہے۔

(۶) اگرچہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ یہ نوشتہ ایک مکمل دستاویز ہے تاہم اس کے مضامین و مندرجات کے پیش نظر اور بغرض مطالعہ ہم اس منشور کو بآسانی دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ منشور کی یہ تقسیم بہت عام اور مشہور ہے۔ منشور کا ابتدائی حصہ مہاجرین و انصار کے حقوق و فرائض سے متعلق ہے اور ہماری ترتیب کے لحاظ سے اس میں ۲۵ دفعات ہیں۔[۳۴۵] جبکہ دوسرا حصہ یہود مدینہ کے حقوق و فرائض سے بحث کرتا ہے اور اس میں ہماری ترتیب کے مطابق ۲۱ دفعات ہیں۔[۳۴۶]

اس تقسیم کی رُو سے پہلے حصہ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک طرف تو مسلمانوں کے مختلف عناصر کو حقوق و فرائض میں مساوی سمجھا گیا۔ صلح و جنگ کے معاملات مشترکہ قرار دئے گئے اور دوسری طرف یہ سیاسی تنظیم اس صراحت کے ساتھ وجود میں آئی کہ اس کے تمام شرکاء رسول اللہ کے احکام کی تعمیل کریں گے اور آپ کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوگا۔

جہاں تک انصار کا تعلق ہے ان کے متعدد قبائل تھے انھیں اسی شکل میں تسلیم کر لیا گیا اور اس کے بالمقابل تمام مہاجرین کو بھی ایک قبیلہ کے مماثل مانا گیا اور یہ واضح کر دیا گیا کہ جملہ مسلم طبقات کو یکساں حقوق و واجبات حاصل ہوں گے۔ جنگ و صلح کو مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا۔ البتہ پناہ دہی کا حق، حسبِ سابق انفرادی طور سے چھوٹے بڑے سب کے لیے یکساں رکھا گیا۔ نظام قضا و عدالت میں اس حد تک انقلاب پیدا کیا گیا کہ اب یہ ایک شخص یا اس کے قبیلہ کا معاملہ نہ رہا بلکہ ایک اجتماعی اور معاشرتی معاملہ بن گیا۔ عدالتی اختیارات کو مرکزیت دے دی گئی اور انصاف کے معاملات میں جانبداری برتنے کو ممنوع قرار دے دیا گیا اور اس سلسلے میں اپنے اعزہ و اقارب حتیٰ کہ خود حقیقی بیٹے تک کو راستے سے ہٹا دیا گیا۔ اور اس طرح انصاف رسانی میں ہر قسم کی مداخلت کو سختی سے بند کر دیا گیا اور یہ لازم کیا گیا کہ تمام مسلمان مل کر ہر ضرر رسان آدمی کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں گے۔ ضمانِ دیت اور قصاص و فدیہ وغیرہ کے معاملات میں اگرچہ بہت سی باتیں حسبِ سابق قائم رکھی گئیں لیکن یہ کیا کم تھا کہ انھیں حقیقی اور عملی شکل دے دی گئی۔ چنانچہ ولہاوزن نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:[۳۴۷]

"There for the first time the talio becomes effective, there it can be enforced. The community, at the head of which God stands, and the Prophet as God's representative, has power to deliver the shedder of blood over to avenger, and it is the duty of the community to see that this is done".

(قصاص و دیت کا ضابطہ وہاں پہلی مرتبہ اتنا موثر بنا کہ اسے نافذ کیا جا سکے۔ وُہ سیاسی وحدت جس کی سربراہی اللہ کے ذمہ تھی اور جہاں رسولؐ کی حیثیت اللہ کے نمائندے کی تھی، یہ اختیار رکھتی تھی کہ قاتل کو منتقم کے حوالے کر سکے اور اس بات کی نگرانی کرنا بھی پُوری جماعت کا کام تھا کہ ضابطہ کی تعمیل کر دی گئی ہے)

بہرحال منشور میں اس قسم کے متعدد اقدامات کے ذریعہ اس نوزائیدہ سیاسی وحدت میں اخوت و مساوات، حریتِ فکر اور آزادیٔ عمل کو بالفعل جاری و ساری کر دیا گیا۔

منشور مدینہ کا دُوسرا حصہ یہودیوں سے متعلق ہے جس میں تمام یہود (مہاجرین و انصار کی طرح) ایک جماعت (امت) کی حیثیت سے شہری ریاست مدینہ سے منسلک کیے گئے۔[۳۴۸] یہود کو ایک علیحدہ فریق سمجھا گیا جس میں تمام اصل و موالی قبائل وغیرہ شامل تھے۔ رسولؐ اللہ کے حکم فیصلے اور سیاسی اختیار کا پُورا اطلاق یہودیوں پر بھی کیا گیا اور ہر اختلاف کی صورت میں رسولؐ اللہ کو آخری عدالت مرافعہ قرار دیا گیا۔[۳۴۹]

اس حصہ سے متعلق پہلی دفعہ (۲۶) میں ہی بتا دیا گیا کہ اگر جنگ میں مسلمان و یہود کے درمیان اتحاد عمل ہوا تو ہر فریق اپنے مصارفِ جنگ خود برداشت کرے گا۔ اسی بات کو دُوسری دفعات (۴۱ اور ۴۴) میں بھی دُہرایا گیا ہے صلح و جنگ کو مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا (۵۰) اور دفاعی سیاست کے لحاظ سے بھی بالادستی رسولؐ اللہ کی رکھی گئی۔[۳۵۱] پھر مدینہ پر قریش کے حملہ کی صورت میں مشترکہ جنگ اور باہمی امداد ضروری قرار دی گئی۔[۳۵۲] البتہ دینی جنگوں میں انھیں رعایت دی گئی۔ دفاع ہی کے سلسلے میں یہ بات طے کر دی گئی کہ "نہ تو قریش کو پناہ دی جائے گی نہ اس کے مددگاروں کو۔"[۳۵۳]

اس طرح قریشِ مکہ کو ان کے ایک اہم حلیف یعنی یہودیوں کی اعانت سے اصولی طور پر محروم کر دیا گیا اگرچہ اس پر یہود نے نیک نیتی سے عمل نہیں کیا اور نہ ہی مسلمانوں سے خیر خواہی برتی جیسا کہ منشور میں ان پر لازم کیا گیا تھا۔[۳۵۴] علاوہ ازیں یہودیوں کو مسلمان رعایا کے ساتھ سیاسی و تمدنی حقوق میں مساوات عطا کی گئی اور یہودیوں کے معاہداتی رشتہ داروں (موالی، بطن اور بطانہ) کو حقوق اور ذمہ داریوں میں عام اور اصلی یہود کے برابر مان لیا گیا۔[۳۵۵] یہودیوں کے معاشرتی و خانگی مسائل میں رسولؐ اللہ نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ ان کو دین اور عقیدہ و مذہب، دیت اور دُوسرے رسوم و رواج میں بالکل آزاد رکھا۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مخاطبین نوشتہ خصوصاً یہود نے آنحضرتؐ کے اختیار و حاکمیت کے علاوہ شہر مدینہ اور اس کے مضافات کو "حرم" کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔[۳۵۶] حرم کے مفہوم میں جائے امن، جائے پناہ، اور ایک ایسے علاقہ کا تصوّر لازماً شامل ہے جہاں قتل و غارت گری ممنوع ہو۔[۳۵۷] اس لحاظ سے حرم بن جانے کے بعد مدینہ میں بھی قتل و غارت گری حرام ٹھہری اور وہ تمام لوگوں کے لئے مامن بن گیا۔ اور ہمیں نہ بھُولنا چاہئے کہ یہ انقلاب اس سرزمین میں آ رہا تھا جہاں قتل و غارت گری کی وارداتیں روزمرہ کا معمول تھیں۔ اور جہاں خون آشام جنگوں کی طویل روایت صدیوں سے چلی آ رہی تھی نیز وہی علاقہ امن و عافیت کا سب سے زیادہ محتاج تھا۔

منشور کے اس دوسرے حصے کا جائزہ ختم کرنے سے پہلے اس کے دو اہم پہلوؤں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(الف) اس حصّہ کی جملہ دفعات پر غور و فکر یہ امر واضح کرتا ہے کہ ان دفعات کا تعلق اگرچہ یہود کے عام شہری حقوق و فرائض سے ہے لیکن دفعات کا ایک بڑا حصّہ یہود سے جنگی و دفاعی معاملات پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اس حصّہ کی کم از کم دس دفعات براہِ راست جنگ و صلح کی حالت میں یہود کے کردار سے بحث کرتی ہیں[۳۵۸] اور ضمنی طور پر تقریباً چار دفعات بھی بہر طور اسی سے متعلق ہو جاتی ہیں[۳۵۹]۔ غالباً اسی پہلو کے پیشِ نظر بعض مصنفین نے اسے یہودیوں سے "اصل میں ایک جنگی حلیفی" یا "فوجی اتحاد" قرار دیا ہے جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہود اپنے دین پر رہیں گے، دونوں کی تمدنی و سیاسی ہیثیتیں الگ الگ رہیں گی البتہ ایک فریق پر جب کوئی حملہ کرے گا تو دونوں فریق مل کر لڑیں گے اور دونوں اس جنگ میں اپنا اپنا مال خرچ کریں گے۔[۳۶۰]

مدینہ کے حالات پر غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہود سے اس قسم کا "دفاعی تعلق" رکھنے کی ضرورت سیاسی اور عسکری دونوں اعتبار سے ناگزیر تھی کیونکہ ایک طرف تو قریش کی طرف سے ممکنہ حملہ کا دفاع مقصود تھا اور دوسری طرف خود یہود کی سرکشی و بغاوت کا سدِّ باب اخلاقی طور پر کرنا تھا۔ علاوہ ازیں اس انتظام سے ایک فائدہ رسول اللہؐ نے یہ بھی حاصل کر لیا کہ علیحدہ ایک مستقل فوج رکھنے اور دفاعی ضرورتوں کے لئے اخراجات مختص کرنے کی زحمت سے بچ گئے اور وہ بھی اس وقت جبکہ وسائل بالکل نایاب تھے۔

(ب) اس حصّہ کی دفعات صراحت سے ریاست نبوی میں یہودیوں کی اس حیثیت کو متعین کر دیتی ہیں کہ وہ مسلمانوں کے "تابع اور لاحق" ہونے کی صورت میں حقوقِ شہریت سے متمتع تھے۔ چنانچہ سرنامہ میں اس کی نشان دہی کے علاوہ اس خاص حصّہ میں بھی "امّة مع المؤمنين"[۳۶۱] (اہلِ ایمان کے ساتھ ایک جماعت) کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں کہ اصل جماعت مومنین کی ہے جس کے ساتھ یہودی بھی وابستہ ہیں لیکن وہ وابستگی سیاسی ضرورت اور دفاعی بنیادوں پر استوار ہوئی۔ کیونکہ اسی سے متصل فقرے میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ:

"لليهود دينهم وللمسلمين دينهم"[۳۶۲] (یہودیوں کے لئے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لئے اپنا دین) مطلب یہ ہے کہ جماعت یہود بر بنائے مصلحت و ضرورت مسلمانوں سے ملحق تھے اور آئندہ کے تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ جب جماعتِ یہود نے ان ذمہ داریوں کو پورا نہ کیا جو اس منشور کی رُو سے ان پر عائد ہوتی تھیں تو پھر اسی منشور کی قرار دادوں کے مطابق ان کو عہد شکنی کی سزا بھی دی گئی اور ان کے تین مشہور قبائل یعنی بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ کو مدینہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا۔

اس وضاحت کا مدعا یہ ہے کہ یہاں "امّت" کے اصطلاحی مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے یہود کو "امتِ مسلمہ" کا جزوِ لاینفک قرار نہیں دیا جا سکتا[۳۶۳] کیونکہ یہ مسلمات میں سے ہے کہ "امتِ مسلمہ" کی بنیاد خالص دین پر رکھی گئی ہے (جیسا کہ ہم باب کے ابتدائی مباحث میں بتا چکے ہیں) اور جس کی تائید قرآن کے بیان اور رسول اللہؐ کے اُسوہ و عمل سے ہوتی ہے اور ہم یہ اُوپر بیان کر چکے ہیں کہ جس دفعہ کی رُو سے یہود کو امتِ مسلمہ کا جزوِ لاینفک قرار دیا جا سکتا ہے اس سے متصل فقرے میں ہی یہ صراحت بھی موجود ہے کہ "دین کے معاملہ" میں یہود و مسلمان الگ الگ ہوں گے۔ اس سے دلیل کی عنکبوتیت بھی واضح ہو جاتی ہے پھر تاریخی طور پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس منشور کے اجرأ پر پورا ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ

ان کے ایک قبیلہ بنو قینقاع کا مدینہ سے اخراج عمل میں آیا اور پھر آئندہ تقریباً چار سال کے عرصہ میں یہودِ مدینہ کا انخلاء مکمل ہو گیا اور ادیان و ملل کا ہر طالب علم یہ جانتا ہے کہ اس طرح عنصر "یہود" کے اخراج سے "امتِ مسلمہ" میں کسی قسم کا کوئی نقص یا خلل واقع نہیں ہوا۔

(۷) اس منشور میں یہ بات طے کر دی گئی ہے کہ مدینہ کی پوری آبادی میں ایک بھی متنفس علی الاعلان قریش کی مدد و اعانت کرنے والا نہ ہو گا۔ اور اس کے خلاف پورا مدینہ جسمِ واحد کی طرح اٹھ کھڑا ہو گا۔ تاریخ کے ادنیٰ سے ادنیٰ طالبعلم کے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ رسول اللہؐ اور مہاجرین کو ذاتی طور پر بھی اور آپ کی قائم کردہ ریاست کو مجموعی طور پر سب سے بڑا خطرہ قریش کی طرف سے لاحق تھا اس لیے ریاست میں محض اندرونی طور پر امن و امان اور استحکام قائم کر دینا ہی کافی نہ تھا بلکہ اس سے زیادہ ضرورت قریش کے متوقع حملہ کی روک تھام کی تھی۔ چنانچہ رسول اللہؐ کی نگاہِ دوررس نے اس خطرہ (بلکہ فوری ضرورت) کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے منشور کی متعدد دفعات کے تحت یہ انتظام کر دیا کہ اہلِ یثرب کے لئے قریش کے ساتھ حلیفانہ تعلقات یا دوستانہ روابط کا کوئی موقع نہ رہے اور قریش کی حیثیت اہلِ یثرب کے مشترکہ دشمن کی ہو جائے (۳۶۴) چنانچہ اس منشور میں یہ دفعات موجود ہیں کہ اگر یثرب پر حملہ ہوا تو معاہدہ کے جملہ شرکاء کے لئے باہمی امداد و اعانت لازمی ہو گی۔ کوئی شخص حتیٰ کہ ایک مشرک بھی قریش کی جان و مال کو کوئی پناہ دے گا نہ اس سلسلے میں وہ کسی مومن کے آڑے آئے گا (۳۶۵) اور یہ کہ نہ تو قریش کو کوئی پناہ دی جائے گی نہ اس کے حامی کو۔" (۳۶۶)

پھر سیاستِ نبویؐ کا اعجاز یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے صرف مدینہ کی تمام جماعتوں سے ہی قریش کے خلاف یہ ضمانت حاصل نہیں کی بلکہ اس سے بہت آگے بڑھ کر بہ کمال تدبر و فراست مدینہ سے لے کر براہِ راست ینبوع کی بندرگاہ تک کے علاقے میں رہنے والے قبائل کو یا تو معاہدات کے ذریعہ اپنے ساتھ ملا لیا یا امان نامے دے کر اپنے اختیار کو منوا لیا اور یا پھر انھیں کم از کم قریش کی امداد و اعانت سے کنارہ کش رہنے پر آمادہ کر لیا۔ یہ اہم کارنامہ آپ نے صفر تا جمادی الاخریٰ ۲ھ کی قلیل مدت میں انجام دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قریش سے پہلی باقاعدہ جنگ یعنی غزوۂ بدر سے تقریباً ڈھائی ماہ پہلے اور منشورِ مدینہ کی تحریر و تسوید کے بعد چھ ماہ کے دوران یہ تمام کام طے پا گیا۔

(۸) اس منشور پر ایک نظر ڈالنے سے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس منشور کے ذریعہ نہ تو کسی کے ادنیٰ سے ادنیٰ حق کو غصب کیا گیا، نہ کسی متنفس پر کسی قسم کی کوئی زیادتی کی گئی بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ اس منشور کو مدینہ کے رہنے والے تمام باشندوں اور اس میں آباد جملہ متفرق جماعتوں نے اس وجہ سے بھی قبول کر لیا کہ اس میں نہ ان کے کسی حق کو غصب کیا گیا نہ فرائض و واجبات کا بے جا بار ڈالا گیا اور نہ ان سے کوئی بے موقع مطالبہ کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی قابلِ غور ہے کہ ان کے معاشرتی رسوم و رواج (مثلاً فدیہ جوار یا پناہ دہی) اور اسی قسم کے دوسرے معاملات میں مداخلت بے جا سے احتراز کیا گیا۔ نیز چونکہ مدینہ میں امن و سکون کی تلاش، عافیت کی طلب اور اتحاد کی دیرینہ تمنا ہر دل کی آواز اور وہاں کی سب سے بڑی ضرورت تھی اور یہ منشور ان کی مذکورہ تمام ضروریات کو بدرجۂ اتم پورا کر رہا تھا اور یہ

ضمانت بھی فراہم کر رہا تھا کہ انسانی جماعت اب پُر امن زندگی بسر کر سکتی ہے کیونکہ ایک طرف تو اس علاقے اور اس آبادی میں اب خُونریزی، دنگا فساد، قتل و غارت گری کرنا سخت ممنوع ہے اور دُوسری طرف لوگوں کی جان یا مال عزت و آبرو کی حفاظت کسی ایک فرد یا قبیلہ کا نہیں بلکہ پُورے معاشرہ کا ذمّہ ہے۔ عرب کے جاہلی معاشرہ میں یہ اتنا تعجب خیز انقلاب تھا جسے ہیل (HELL) سیاستِ نبویؐ کا اعجاز قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ:[۳۶۷]

"Hitherto the individual Arab had no other protection than that of his family or that of his patron. Mohammed rid himself, at one stroke, of the old Arab conception which had kept the Mekkans themselves back from adopting a drastic policy of suppression and repression against him. And with it he dissolved the old ties; broke down old barriers; and placed every Muslim under the protection of the entire community of the Faithful".

(ایک عرب باشندہ کو پہلے اپنے خاندان یا سرپرست کے علاوہ کسی اور کی پناہ یا تحفظ حاصل نہ تھا۔ لیکن (حضرت) محمد نے بیک جنبش اپنے آپ کو اس دائرہ سے نکال لیا اور اس قدیم جاہلی تصوّر سے بھی نجات پا لی جس کے زیرِ اثر اہلِ مکہ ان کے خلاف جبر و تشدد کی انتہائی پالیسی اختیار کرنے سے ہچکچاتے رہے۔ اور اس طرح انھوں نے پُرانے رشتوں کو معطّل کر دیا، قدیم خلیجوں کو پاٹ دیا اور ہر مسلمان کو پُوری اُمّتِ مسلمہ کا اجتماعی تحفظ عطا کیا)

وہ اصولِ انفرادیت جو اسلام سے قبل عرب کی طرح مدنی معاشرہ کا بھی طُرّۂ امتیاز تھا اسے اس نوشتہ کے ذریعہ اجتماعیت سے بدل دیا گیا اب ہر معاملہ محض شخصی نہیں بلکہ مرکزی و اجتماعی بن گیا۔[۳۶۸] اور ہر جماعت کو مجموعی طور پر ذمہ دار بنایا گیا۔[۳۶۹]

اسی اجتماعیت کا ایک قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ رسول اللہؐ کی آمد سے پہلے اگرچہ مدینہ کی سربرآوردہ جماعتوں کے افراد اسلام قبول کر کے باہم منسلک ہو گئے تھے اور پھر آمدِ رسولؐ کے بعد تو مسلمانوں کی ایک مضبوط و مستحکم جماعت بھی بن گئی تھی لیکن مدینہ کی کثیر الاجناس آبادی اور اس کے تمام متفرق و منتشر عناصر میں ابھی ایک وحدت قائم نہ ہوئی تھی۔

اس ضرورت کو منشورِ مدینہ نے پُورا کیا اور اس کی وجہ سے ایک طرف تو قبائلی طوائف الملوکی کا خاتمہ ہوا اور نسلی و مذہبی لحاظ سے بے حد متضاد و منتشر افراد ایک نظم میں پرو دیئے گئے اور دوسری طرف تاریخِ عرب میں پہلی بار اتحاد و سالمیت کا

عجیب و غریب مظاہرہ یہ ہُوا کہ اس منشورِ مدینہ نے ایسے لوگوں کو جو نہ کبھی کسی قوتِ قاہرہ کے سامنے جُھکے تھے اور نہ جنھوں نے کسی مرکزی نظم و اقتدار کا جُوا اپنے گلے میں ڈالا تھا۔ ایک قانون، ایک ضابطے اور ایک نظم پر متفق و متحد کر دیا۔ تمام مرکز گریز قوتیں ایک کل میں ختم ہو گئیں۔ سارے امتیازاتِ جاہلیہ کو نظر انداز کرتے ہوئے تمام باشندوں کے حقوق کو یکساں قرار دیا گیا اور ان کے فرائض و واجبات کو متعین کر دیا گیا۔ غرض وہاں کے تمام عناصر کے تعاون و اشتراک سے مدینہ میں ایک ایسا سیاسی نظام قائم ہو گیا جو آگے چل کر دنیا کے تمام نظام ہائے سیاست کے لئے نظیر بن گیا۔ لہٰذا ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا یہ تبصرہ ہے کہ " ایک چھوٹی سی بستی کو جو بیس ایک محلوں پر مشتمل تھی شہری مملکت کی صورت میں منظم کیا گیا اور اس کی قلیل لیکن بوقلموں و کثیر الاجناس آبادی کو ایک لچکدار اور قابلِ عمل دستور کے تحت ایک مرکز پر متحد کیا گیا اور ان کے تعاون سے شہر مدینہ میں ایک ایسا سیاسی نظام قائم کر کے چلایا گیا کہ وُہ بعد میں ایشیاء، یورپ اور افریقہ کے تین براعظموں پر پھیلی ہوئی ایک وسیع اور زبردست شہنشاہیت کا بلا کسی وقت کے صدر مقام بھی بن گیا۔" (۳۷۰) اور ولہازن لکھتا ہے کہ: (۳۷۱)

"The first Arabic community with sovereign power was established by Mohammed in the city of Medina, not upon the basis of blood which naturally tends to diversity, but upon that of religion which is equally binding on all".

(مکمل حاکمانہ اختیارات کے ساتھ پہلا عربی معاشرہ (حضرت) محمد کے ہاتھوں شہر مدینہ میں قائم ہوا۔ لیکن خُون کی بنیاد پر نہیں جو لامحالہ اختلافات کو جنم دیتا ہے بلکہ دین کی بنیاد پر، جس کا اطلاق ہر فرد پر یکساں طور پر ہوتا ہے)

اور منشورِ مدینہ پر نکلسن کا تبصرہ یہ ہے کہ: (۳۷۲)

"Ostensibly a cautious and tactful reform, it was in reality a revolution. Muhammad durst not strike openly at the independence of the tribes, but he destroyed it, in effect, by shifting the centre of power from the tribe to the community; and although the community included Jews and pagans as well as Moslems, he fully recognised, what his opponents failed to foresee, that the Moslems were the active, and must soon be the predominant, partners in the newly founded state".

(مبینہ طور پر یہ ایک محتاط اور ماہرانہ اصلاح بلکہ درحقیقت ایک انقلاب تھا۔ (حضرت) محمدؐ نے قبائل کی خود مختاری پر نہ صرف یہ کہ کھلم کھلا ضرب لگائی بلکہ اسے ختم کر دیا۔ اور انجام کار مرکزِ قوت قبیلہ سے معاشرہ کو منتقل کر دیا۔ معاشرہ میں اگرچہ مسلمان، یہود اور مشرک سبھی شامل تھے۔ اور وہ اسے اچھی طرح جانتے تھے اور جسے ان کے دشمن نہ دیکھ سکے مگر ان کی نگاہِ دوررس نے دیکھ لیا تھا کہ نئی بننے والی ریاست میں مسلمان ہی نہ صرف فعّال بلکہ اس کا غالب حصّہ ہوں گے)

اور آخر میں وان کریمر کا یہ بیان قابلِ ملاحظہ ہے کہ:

"آنحضرتؐ کی یہ خواہش تھی کہ ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالیں۔ اور اس میں وہ کامیاب ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ملکی انتظام بھی انہوں نے پیدا کر دیا جو بالکل جدید اور خالص صورت رکھتا تھا۔ پہلے ان کی صرف یہ خواہش تھی کہ اپنے ملک والوں کو ایک خدا یعنی اللہ کے ایمان پر لائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے وطن کی قدیم طرزِ حکومت کو بدل دیا اور ایسی عملداری کی جگہ جس میں قبیلوں کے امیر اور سردار حکومت کا کام کریں اور با اختیار خاندان پبلک کے کاموں میں حصّہ لیں۔ انہوں نے ایک خالص خود مختار بادشاہی کو قائم کر دیا اور خود اس کے بادشاہ بطور زمین پر خدا کے نائب کے ہو گئے۔" (۳۴۳)

ہمیں اگرچہ اس بیان کے ہر حصّہ سے کلی اتفاق نہیں ہے مگر اس کا مدعا اور ہمارے پچھلے مباحث کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ رسول اللہؐ نے بہرحال ایک ریاست کو بالفعل قائم فرما دیا اور وہ منشورِ مدینہ کے اجرأ سے ایک صحیح اور متعین خطوط پر گامزن ہو گئی۔

باب سوم

توسیعِ ریاست

گزشتہ مباحث میں یہ بات آگئی ہے کہ سنہ ۱ھ میں اس ریاست کی تاسیس عمل میں آگئی جسے رسول اللہؐ نے حاکمیتِ الٰہی کے تحت مدینہ میں قائم فرمایا۔ ابتدائی طور پر اس کا مرکز و مصدر مدینہ ہی تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کے حدود میں وسعت پیدا ہوتی گئی یہاں تک کہ اس کا دائرۂ حکومت مدینہ کے حدود سے بہت آگے بڑھ کر کم و بیش تمام جزیرہ نمائے عرب تک پھیل گیا۔ لیکن توسیع و ارتقائے اس دور کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ کسی ریاست کے حدود اور اس کے رقبہ میں اضافہ بھی اگرچہ توسیع و ترقی کا جزو لاینفک ہے۔ مگر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ محض رقبہ اور حدود میں توسیع کو "ارتقاء" سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ریاست کا ارتقا ایک ایسی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جس میں اس کے استحکام اور پائیداری کا پہلو نمایاں ہو۔ اس کے مقابلہ میں کمیت کو غالباً اس لئے زیادہ اہمیت حاصل نہیں کہ وہ دراصل کیفیت ہی کا ایک لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر ریاست میں استحکام ہوگا تو حدود میں اضافہ و توسیع کی راہ خود بخود ہموار ہوگی اور ریاست کا ارتقا بھی ناگزیر ہو جائے گا۔ اس لئے ارتقائے ریاست کا اصل مدار اس بات پر ہے کہ ریاست اپنے قیام و بقاء اور اتحاد و تحفظ کی کتنی صلاحیت رکھتی ہے اور وہاں داخلی و خارجی طور پر ایسے انتظامات کس حد تک موجود ہیں جو مقاصدِ ریاست کی تکمیل اور اس کے استحکام کے ضامن ہوتے ہیں۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ریاست نبویؐ میں توسیع و استحکام کا عمل ساتھ ساتھ واقع ہوا۔ بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے اپنی ساری توجہ ایسے مثبت اقدامات پر صرف فرمائی جن کا تعلق داخلی استحکام، معاشرتی تنظیم، رعایا کی فلاح و صلاح، باشندوں کے حقوق و فرائض کے تعیّن، عدل و انصاف کے قیام، تشریع و قانون سازی، عام نظم و نسق، تبلیغِ دین اور احکام کے اجرا اور نفاذ وغیرہ سے تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ توسیع و استحکام کے دوسرے تقاضوں کو بھی رسول اللہؐ نے کما حقہٗ ادا کیا۔ چنانچہ ریاست کے داخلی و خارجی امن و امان، اس کے دفاع اور حفاظت و خود مختاری کے ضمن میں بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ، اندرونی دشمنوں کا دفعیہ اور مفسد عناصر کی بیخ کنی کی طرف سے بھی آپ نے کوئی ادنیٰ سی غفلت بھی نہیں برتی۔ مختصر یہ کہ توسیع و ارتقائے ریاست کے باب میں ریاست نبوی ایک معیاری و مثالی نمونہ قائم کرتی ہے۔ اس کے استحکامی پہلوؤں کا مطالعہ تو ہم آئندہ باب میں کریں گے البتہ زیرِ نظر باب میں اس کی توسیعی سرگرمیوں کا جائزہ لیں گے۔

اپنے مطالعہ کی غرض سے ہم توسیع ریاست کو مندرجہ ذیل دو ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) دورِ اوّل تو وُہ ہے جبکہ ریاست نے اپنے قیام و بقاء اور سلامتی و تحفظ کا بھرپور مظاہرہ کیا اور تمام دُنیا نے دیکھ لیا کہ یہ نوزائیدہ ریاست بیشمار داخلی و خارجی مزاحمتوں کے باوجود قائم و دائم ہے۔ یہ دور ابتدائی پانچ سالہ عرصہ (سلہ تا ۵ھ) پر پھیلا ہوا ہے۔ اس دَور میں چونکہ ریاست کے حدود بنیادی طور پر مدینہ اور اس کے مضافات تک وسیع تھے اس لئے اس دور میں اسے "ریاستِ مدینہ" یا "شہری مملکت مدینہ" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

(۲) دورِ دوم میں ریاست مدینہ کی حدود سے آگے بڑھ جاتی ہے اس کی تمام مزاحم قوتیں دم توڑ دیتی ہیں اور آخر کار ریاست نبویؐ کا پرچم پُورے عرب پر لہرانے لگتا ہے۔

اب اگلے صفحات میں ہم ان پر علیحدہ علیحدہ بحث کریں گے۔

(۱) دورِ اول (سلہ تا ۵ھ)

مدینہ میں ریاست نبوی کا قیام، اس کے باشندوں کے حقوق و فرائض کا تعین اور شہر کی حفاظت و مدافعت کے انتظامات اگرچہ ہجرت کے بعد چند ماہ کے اندر ہی طے پا گئے تھے لیکن یہ بات تاریخ کی مُثبت حقیقت ہے کہ مدینہ کی اندرونی حفاظت و مدافعت، استحکام و ترقی اور معاشرہ کی تنظیم اس وقت تک بے معنی تھی جب تک کہ قریش کی طرف سے متوقع حملوں اور مفسدانہ کارروائیوں کا انتظام نہ کر لیا جاتا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ قریش کی مخالفت کا آغاز مکہ میں اُس وقت ہی ہو گیا تھا جبکہ آنحضرتؐ نے اسلام کی تبلیغ شروع کی تھی لیکن اس میں خالص سیاسی رنگ اہلِ مدینہ کی بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد پیدا ہُوا۔ گویا اگر بیعت عقبہ کے سیاسی معاہدہ کو ریاست مدینہ کا سنگِ بنیاد قرار دیا جائے تو قریش کی مخالفت و عداوت کا نیا رُخ بھی اسی وقت متعین ہو گیا۔ قریش کی غیرت و حمیت کے لئے اوّل تو یہی بات ناقابلِ برداشت تھی کہ رسولؐ اللہ اور آپ کے اصحاب کو اہلِ مدینہ نے اپنے سر آنکھوں پہ بٹھایا ہے۔ اور دوسری جانب انھیں اس بات پر بھی سخت طیش تھا کہ مکہ میں ان کے زیر دست رہنے والے مفلوک الحال لوگ ان کی مرضی کے بغیر پناہ لے کر ان ہی کے خلاف صف آرا ہو گئے ہیں۔ اور یہ امر بھی ان پر بہت شاق گزرا کہ وہ خستہ حال افراد ایک ایسے ماحول میں پہنچ گئے ہیں جو اجنبی ہونے کے باوجود ان کے لئے نہایت سازگار ثابت ہوا ہے۔ اب قریش اہلِ مدینہ کو بھی برابر کا دشمن سمجھتے تھے کیونکہ اُنھوں نے رسولؐ اللہ کے لئے اپنے شہر کے دروازے کھول کر ناقابلِ معافی جُرم کیا تھا۔ بہر حال ان وجوہ سے ان کے سینوں میں آتشِ حسد اور تیز ہو گئی۔ اور انھوں نے بہر قیمت اپنے مجرموں کو سزا دینے کی ٹھان لی۔

اس کا آغاز انھوں نے اس طرح کیا کہ رسولؐ اللہ کے مدینہ پہنچتے ہی ابُو سفیان اور ابی بن خلف الجمحی کی طرف سے انصار کو یہ خط لکھا گیا کہ:

امّا بعد فانہ لم یکن حی من احیاء العرب أبغض الینا ان یکون بیننا و بینھم نائرۃ منکم، و انکم عمدتم الیٰ رجل منا، اشرفنا فی الموضع و أعرقنا فی قومنا منصبا، فاویتموہ و منعتموہ

ان هذا علیکم لعار ومنقصه فخلوا بیننا وبینه فان یك خیرا فنحن أسعد به وان یك سوی ذٰلك فنحن أحق من ولی ذٰلك منه[۱]

(اما بعد! ہمارے لئے اس سے زیادہ ناپسندیدہ بات کوئی اور نہیں ہے کہ قبائل عرب میں سے کسی قبیلہ اور ہمارے درمیان محض تمہاری وجہ سے عداوت کی آگ بھڑک اُٹھے۔ تم نے جان بُوجھ کر ہمارے آدمی کو رکھا ہے۔ جو ہمارے درمیان نہایت معزز اور ہماری قوم میں ذی حیثیت و منصب تھا۔ تم نے اس کو اپنے یہاں ٹھکانہ مہیا کیا اور اس کی حمایت وحفاظت کا بیڑا اٹھایا۔ بلا شبہ یہ بات خود تمہارے لئے باعثِ ذلّت ہے۔ اس لئے تم ہمارے اور اس کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ پس اگر وہ ٹھیک رہتا ہے تو ہم اس سے بہتر طریقے سے پیش آئیں گے اور اگر اس کے علاوہ دُوسرا طرزِ عمل دکھایا تو پھر ہم ہی اس کے ولی ہونے کا زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اس کے ساتھ جو چاہیں کریں)

اس خط کا مضمون بتا رہا ہے کہ قریش نے انصار کی جاہلی غیرت وحمیت کو خوشامد و چاپلوسی کے ذریعہ لیکن تحکمانہ لب ولہجہ میں بھڑکانا چاہا۔ لیکن ظاہر ہے انصار پر ان کے تملق یا دھمکی کا کیا اثر ہو سکتا تھا؟ وہ رسولؐ اللہ کے حضور دل وجان نذر کر چکے تھے، اور آپ کی خاطر عرب وعجم سے جنگ کا پختہ عہد کر چکے تھے۔ کفار قریش کی یہ کوشش بے نتیجہ رہی تو انہوں نے ایک اور چال چلی۔ اور جنگِ بدر سے کچھ پہلے اُنھوں نے عبداللہ ابن اُبی اور اس کے ہم مشرب ساتھیوں (یعنی اوس اور خزرج کے بت پرستوں) کو ایک تنبیہی خط روانہ کیا، جس کا متن یہ ہے:

انکم آویتم صاحبنا وانا نقسم باللہ لتقاتلنه اولتخرجنه اولنسیرن الیکم باجمعنا حتی نقتل مقاتلتکم ونستبیح نسائکم۔[۲]

(تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے ہم اللہ کی قسم کھا کر تم سے کہتے ہیں کہ یا تو لوگ اس کو قتل کر ڈالیں یا اپنے شہر سے نکال باہر کریں۔ ورنہ ہم سب مل کر تم پر چڑھ دوڑیں گے یہاں تک کر تمہیں بُری طرح موت کے گھاٹ اُتار دیں گے اور تمہاری عورتوں کو اپنے لئے مباح سمجھیں گے)

اسے خط کے بجائے "حکمنامہ" کہنا حقیقت سے زیادہ قریب ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی اور دوسرے بت پرستوں کی جماعت نظریاتی طور پر کفارِ قریش ہی سے میل کھا سکتی تھی۔ اور دوسری طرف کفارِ قریش کو اس جماعت پر یہ اعتماد و وثوق ہو سکتا تھا کہ وہ ان کے مفاد کا تحفظ اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں ان کے حکم کی تعمیل کر سکتی ہے۔ شاید اسی بھروسہ پر قریش نے ابن ابی اور اس کے حامیوں کو مندرجہ بالا خط تحریر کیا۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ابن ابی اور اس کے ساتھیوں نے بھی قریش کو مایوس نہیں کیا۔ چنانچہ ابو داؤد کی روایت کے مطابق مذکورہ خط کے ملتے ہی وہ ہتھیار سجا کر جنگ کے لئے تیار بھی ہو گئے۔ رسولؐ اللہ کو تو پل پل کی خبر ملتی رہتی تھی۔ آپ کو ابن ابی وغیرہ کے اس منصوبہ کی اطلاع ملی تو آپ اس گروہ کے پاس گئے اور یہ معنی خیز جملے ارشاد فرمائے جن کے بین السطور آپ کے عزم وحوصلہ، جرأت

بے خوفی، حقیقت پسندی اور خیر خواہی کو صاف پڑھا جا سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا تھا:

لقد بلغ وعید قریش منکم البالغ ماکانت تکید کم باکثر مما تریدون ان تکیدوا به انفسکم تریدون ان تقاتلوا ابناء کم و اخوانکم[۳]

(قریش نے تم سے ایسی زبردست چال چلی ہے کہ اگر تم ان کی دھمکی میں آگئے تو تمہارا نقصان بہت زیادہ ہوگا بہ نسبت اس کے کہ تم ان کی بات رد کر دو۔ کیا تم اپنے ہی فرزندوں اور بھائیوں سے لڑنا چاہتے ہو؟)

رسول اللہؐ نے بڑے مختصر لیکن بلیغ انداز میں یہ سمجھایا کہ مسلمانوں سے لڑنے کی صورت میں وہ اپنے ہی لوگوں کے خلاف محاذ آرا ہو جائیں گے اجبکہ قریش سے لڑائی میں بالکل غیروں کا مقابلہ ہوگا۔ غرض کچھ تو رسول اللہؐ کی فہمائش اور کچھ اس بنا پر کہ اب مدینہ کا ماحول مزید کسی خانہ جنگی کا بہر حال متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ عبداللہ ابن اُبی اور اس کی جماعت اپنے ارادے سے باز آگئی اور اس طرح رسول اللہؐ کے تدبر سے ایک ایسا خطرہ ٹل گیا جو ریاستِ مدینہ کی سالمیت و خود مختاری کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ قریش نے اپنی اس تدبیر بلکہ سازش کے ناکام ہو جانے کے بعد ایک اور ناتمام کوشش کی۔ اور جنگ بدر کے بعد یہود مدینہ کے جذبات کو یہ خط لکھ کر ابھارا کہ:

انکم اهل الحلقة والحصون وانکم لتقاتلن صاحبنا اولنفعلن کذا ولا یحول بیننا و بین خدم نسائکم شئ[۴]

(تم لوگ توساز و سامان اور قلعوں کے مالک ہو۔ لہٰذا تم کو ہمارے آدمی سے ضرور جنگ کرنی چاہئے، ورنہ ہم ایسا کریں گے۔ اور پھر ہمارے اور تمہاری عورتوں کو لونڈیاں بنانے کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو سکے گی)

لیکن اس سے پہلے کہ یہود اس کو عملی جامہ پہناتے خود رسول اللہؐ نے ان کے استیصال کا انتظام کر دیا۔ اُوپر کی تفصیلات پر ایک ہی نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہجرتِ مدینہ کے بعد سے یہود مدینہ کے اخراج تک کفار قریش نے مدینہ میں خانہ جنگی برپا کرنے، ریاستِ مدینہ کو اندر ہی اندر سبوتاژ کرنے اور انتشار و تفرقہ پھیلانے کی سیاسی اور سفارتی سطح پر مسلسل کوششیں کیں وہ رسول اللہؐ کی انتہائی بیدار مغزی اور سوجھ بوجھ کی بدولت کامیاب نہ ہو سکیں بلکہ آپ نے اسی سیاسی اور سفارتی سطح پر ان کا دفیعہ بھی کر دیا۔

قریش مکہ کے ذہین، تجربہ کار اور جہاندیدہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے جہاں ایک طرف سیاسی و سفارتی سطح پر ریاستِ مدینہ کے خلاف ایک محاذ قائم کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ دُوسری طرف اپنے مجرموں کو سزا دینے، انھیں پریشان و پراگندہ خاطر کرنے، مدینہ کو تاخت و تاراج کرنے اور اپنی قوت اور وسائل کا مسلمانوں پر سکہ جمانے کے لئے، ہجرت کے فوراً بعد سے عملی کارروائیوں کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ اس غرض سے چھوٹے چھوٹے مسلح دستے مدینہ کی جانب بھیجنا شروع کرتے تھے۔ قریش کی ان عملی کارروائیوں کا آغاز یُوں تو رسول اللہؐ کی ہجرتِ مدینہ کے فوراً ہی بعد

ہوگیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس سلسلہ میں ان کی دیدہ دلیری اس حد تک بڑھی کہ ربیع الاوّل ۲ھ میں کرز بن جابر الفہری کی قیادت میں قریشِ مکہ کا ایک دستہ مدینہ کی چراگاہ پر حملہ آور ہوا۔ چراگاہ کو لُوٹا اور اس کے مویشی ہنکا لے گیا۔[۵] گویا یہ پیغام دے گیا کہ ہم ڈھائی تین سو میل دور تمہارے گھر پر آکر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ غالباً اس زمانے میں قریش کے حملوں کا ڈر اتنا بڑھ گیا تھا کہ اہلِ مدینہ کے لئے اکثر راتوں کو آرام کی نیند سونا ممکن نہیں رہا تھا۔[۶]

ظاہر ہے کہ رسولؐ اللہ کے سیاسی تدبّر اور آپ کی پُر حکمت قیادت سے یہ قطعی بعید تھا کہ قریش کی ان ریشہ دوانیوں کی طرف توجہ اور مدینہ کی حفاظت اور دفاع کا انتظام نہ کریں۔ نیز یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ قریش کے جواب میں موثر کارروائی کئے بغیر مدینہ کا اندرونی استحکام کسی وقت بھی ختم ہو سکتا تھا۔ لہٰذا قریش کے متوقع حملوں کی پیش بندی اور مدینہ کے دفاع کی خاطر ایک طرف تو رسولؐ اللہ نے منشورِ مدینہ کے ذریعہ اصولی طور پر مدینہ کی پُوری آبادی کو قریش کے خلاف جسمِ واحد بنا دیا تھا اور سب سے یہ اقرار لے لیا تھا کہ ایسی صورت میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے (حالانکہ مدینہ کے بعض عناصر نے اس عہد سے صریحاً انحراف کیا۔ مگر پھر بھی اخلاقی دباؤ کے تحت علی الاعلان قریش کا ساتھ نہ دے سکے) اور دوسری طرف آپ نے صحابہ کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کو جن میں اکثر و بیشتر مہاجرین ہوتے تھے) مدینہ سے باہر مختلف سمتوں میں بھیجنا شروع کر دیا تھا بڑا مقصد یہ تھا کہ دشمن کم از کم اتنا جان جائے کہ ریاستِ مدینہ کی قیادت اس کے عزائم سے بے خبر نہیں ہے۔ اور اس میں تابِ مقاومت بدرجۂ اولیٰ موجود ہے۔

مورخین ایسی مہم کو جو کسی صحابی کی سرکردگی میں بھیجی گئی سریہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ابتدائی دور کے سرایا میں سریۂ حمزہؓ[۷]، سریۂ عبیدہ بن حارثؓ[۸] اور سریۂ سعد بن ابی قاصؓ[۹] قابلِ ذکر ہیں۔[۱۰] ان میں کوئی جنگ نہیں ہوئی صرف سریۂ عبیدہ میں، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ[۱۱] نے مشرکین پر ایک تیر چلایا اور یہی وُہ پہلا تیر تھا جو مسلمانوں کی طرف سے مشرکین پر چلایا گیا۔[۱۲]

واقعہ یہ ہے کہ رسولؐ اللہ نے ان طلایہ گرد جماعتوں (سرایا) کے بھیجنے میں انتہائی تدبر، منصوبہ بندی، ذہانت، عسکری مہارت اور ملکی و جغرافیائی واقفیت سے بھرپور کام لیا۔ اور پھر ان کے ذریعہ مکمل سیاسی و فوجی فوائد حاصل کئے۔ چنانچہ سرایا کی تعداد، ان کے سپہ سالاروں کا انتخاب اور ان کی منزلوں کا تعیّن وغیرہ ثابت کرتا ہے کہ آپ نے ان مہمّات کو عرب و حجاز کے تمام ضروری مقامات کی طرف روانہ کیا اور پوری بے خوفی، بہادری اور مستعدی سے دشمن کے اپنے علاقے میں بھی فوجی دستے بھیج کر فوجی اہمیت کی کامیابیاں حاصل کیں۔ جس کی ایک روشن مثال نخلہ کا واقعہ ہے۔ جبکہ رسولؐ اللہ نے حضرت عبداللہ بن جحشؓ[۱۳] کو کچھ مجاہدین کے ہمراہ مقام نخلہ کی جانب روانہ کیا اور یہ ہدایت فرمائی کہ وہاں پہنچ کر قریش کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھیں اور پھر اس کی فوری اطلاع رسولؐ اللہ کو پہنچائیں۔[۱۴] جیسا کہ ظاہر ہے سریہ کی نوعیت خالص جاسوسانہ تھی لیکن یہ محض اتفاق تھا کہ یہی مہم اسلامی فوجی دستے کی پہلی سرحدی جھڑپ ثابت ہُوئی اور اس نے ایک اور فیصلہ کن جنگ (بدر) کو جنم دینے میں اہم کردار ادا کیا (جس کی تفصیل آگے آئے گی)

مذکورہ بالا سرایا کو بھیجنے کے علاوہ رسول اللہؐ جہاں ضرورت محسوس کرتے وہاں خود بھی تشریف لے جاتے تھے۔ چنانچہ ہجرت کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ نے مدینہ کے قرب وجوار کے قبائلی علاقوں کا دورہ فرما کر ان سے حلیفانہ تعلقات قائم کرنا شروع کر دیے۔ اس قسم کا پہلا سیاسی و فوجی سفر رسول اللہؐ نے صفر ۲ھ (ہجرت کے گیارھویں مہینے) میں ودّان کی جانب پیش قدمی کر کے اختیار فرمایا۔[۱۵] اس غزوہ میں اگرچہ جنگ کی نوبت نہیں آئی لیکن آپ نے بنو ضمرہ سے معاہدہ کر کے وقتی فائدہ اٹھالیا۔[۱۶] سرحدی اور مضافاتی قبائل سے معاہدات کا انعقاد توسیع ریاست کے ضمن میں اہمیت رکھنے کے ساتھ ساتھ قریش کے حلفاء طرفداروں اور متوقع حامیوں کو توڑنے میں خاص مقام رکھتا ہے۔

اسی طرح کی دوسری مہم ربیع الاول ۲ھ میں ہوئی، جس میں آپ بہ نفسِ نفیس بواط تک تشریف لے گئے۔[۱۷] پھر اسی ماہ وادی السفوان تک (جس کا حوالہ پہلے بھی آچکا ہے) سفر فرمایا۔[۱۸] نیز جمادی الآخر ۲ھ میں ینبوع کے قریب ذی العشیرہ تک مہم سر کر آئے۔[۱۹]

غرض اس طرح تقریباً پانچ ماہ کے قلیل عرصہ میں ہی مدینہ سے ینبوع تک کے علاقہ میں رہنے والے متعدد قبائل (بنو ضمرہ، بنو مدلج اور باشندگانِ بواط (جہینہ) وغیرہ) نے اسلام قبول نہ کرنے کے باوجود اس بات پر آمادگی ظاہر کر دی کہ اگر کوئی مدینہ پر حملہ آور ہوا تو یہ مسلمانوں کو مدد دیں گے اور اگر ان کے علاقوں پر کسی نے چڑھائی کی تو مسلمان ان کو مدد دیں گے۔[۲۰] اس علاقے کی آبادیوں کو سیاسی اعتبار سے اپنے ساتھ ملا کر رسول اللہؐ نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے الفاظ میں "یہ وہی علاقہ ہے جہاں سے کاروانی قافلے گزرا کرتے تھے اور مکہ والے شام، مصر یا عراق جانا چاہتے تھے تو اسی راستے سے گزرتے تھے۔ اس راستہ کی بندش قریش پر معاشی دباؤ ڈالنے میں اتنی مؤثر ثابت ہوئی کہ بدر کی فاش شکست بھی انھیں اتنا بے بس نہ کر سکی"۔[۲۱] غرض رسول اللہؐ کے ان اسفار و مہمات کا نتیجہ صرف اتنا ہی نہ نکلا کہ متذکرہ بالا علاقے اور ان میں آباد قبائل نے مدینہ کی مدافعت و دفاع میں رسول اللہؐ کی امداد کرنے پر اقرار کر لیا بلکہ ان سے ہونے والے معاہدات اور ان کو عطا کئے جانے والے فرامین کی زبان اس بات کا صاف اظہار کر رہی ہے کہ یہ علاقے بھی دراصل ریاستِ مدینہ کے زیرِ اثر آگئے تھے۔[۲۲]

رسول اللہؐ کو ان سیاسی و دفاعی انتظامات سے فراغت پائے بمشکل تین ماہ ہی ہوئے تھے کہ وہ فیصلہ کن وقت آپہنچا جس کی تیاریاں قریش برسوں سے کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف مسلمان بھی جس کی بہر حال توقع رکھتے تھے۔ دراصل مسلمانوں کا قریش کے دستِ تظلم سے بچ جانا، ان کے ایک اہم شخص عمرو بن الحضرمی کا قتل اور ان کی معاشی شہ رگ پر زبردست دباؤ نے بالآخر قریشِ مکہ کو آمادۂ پیکار کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ نشۂ طاقت میں چُور تقریباً ایک ہزار کا لشکر لے کر رمضان ۲ھ میں مدینہ کو تاخت و تاراج کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

رسول اللہؐ کو بھی لشکرِ قریش کی آمد کی اطلاع مل گئی۔ آپ نے صحابہ کو جمع کیا اور مشورہ کے بعد شہر سے باہر نکل کر لڑنے کا فیصلہ کیا پھر مہاجرین و انصار پر مشتمل ایک چھوٹا سا لشکر لے کر ۸ رمضان ۲ھ کو مدینہ سے روانہ ہوئے[۲۳] اور

بدر کے قریب پہنچ کر عدوۃ الدنیا کے مقام پر خیمہ زن ہوگئے۔

ادھر قریش بھی اپنے لشکر کو عقنقل کے ٹیلے سے نکال کر بدر کے اس مقام پر پہنچ گئے جو "عدوۃ القصویٰ" کہلاتا ہے۔[۲۳]

اس طرح دونوں لشکر آمنے سامنے آگئے۔ ۱۷ رمضان ۲ھ کی شب کے آخری حصے میں آنحضرتؐ نے اپنی مختصر سی فوج کی ترتیب قائم کی اور ہدایات دیں۔ دوسری طرف قریش نے بھی اپنی فوج کا میمنہ و میسرہ درست کیا۔ جنگ کا آغاز انفرادی مقابلوں سے ہُوا لیکن قریش نے اپنے تین آدمیوں (عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ) کو قتل ہوتے دیکھ کر جنگِ مغلوبہ شروع کر دی۔ بالآخر سخت جنگ کے بعد قریش نے راہِ فرار اختیار کی۔ ان کے ستر آدمی قتل اور ستر قید ہوئے مسلمانوں میں سے شہید ہونے والوں کی تعداد چودہ تھی۔[۲۵] جنگ کے بعد رسولؐ اللہ نے بدر سے مراجعت کی اور مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

اگر جنگوں کی خونریزیوں، ہولناکیوں اور واقعات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو جنگِ بدر کو یقیناً عظیم الشان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اس جنگ نے مسلمانوں اور قریش دونوں کے مطلعِ قسمت پر بالخصوص اور پورے عرب کی سیاست و معاشرت پر بالعموم جو گہرے اثرات مرتب کئے ان کی بنا پر اسے بلاشبہ تاریخِ عالم کی انتہائی اہم اور تاریخ ساز جنگوں میں شمار کیا جا سکتا ہے اس اجمال کی تفصیل کے لئے دیکھنا ہوگا کہ ان فریقوں کے حق میں جنگِ بدر کے نتائج کس طرح ظاہر ہوئے۔

جہاں تک قریشِ مکہ کا تعلق ہے تو اس جنگ کی وجہ سے ان کی طاقت کو مجموعی طور پر بے حد صدمہ پہنچا۔ ان کے چوٹی کے سردار، سربرآوردہ شیوخ اور باثر افراد مارے گئے جن میں سے اکثریت ان لوگوں کی تھی جو اسلام دشمنی میں سب سے آگے تھے اور اہلِ مکہ کے یہاں ان کا اثرو رسوخ، فراست و تدبر، بصیرت و اہلیت اور جنگی قابلیت معروف تھی۔[۲۶] علاوہ ازیں اس جنگ کے بعد سے مکہ میں طاقت کا توازن بنو امیہ کے حق میں ہوگیا اور ابوسفیان کی قیادت مسلم ہو گئی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ جنگ ریاستِ نبوی اور قریش کے درمیان آئندہ جنگوں کا مقدمہ بن گئی اور قریش پے بہ پے نقصان اٹھانے کے باوجود ریاستِ مدینہ پر بار بار حملہ کرتے رہے اور اپنی آتشِ انتقام کو بھڑکاتے رہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کی فتح اور کامرانیوں کا نقطۂ آغاز بھی جنگِ بدر ہے۔ اسی جنگ سے شوکتِ اسلام کا مادی اظہار شروع ہوا اور بقول شبلی بدر کا معرکہ "حقیقت میں اسلام کی ترقی کا قدم اوّلین تھا"۔[۲۷] مسلمانوں کی قوت میزانِ عمل پر کھری ثابت ہوئی اور ان کے حوصلے بڑھ گئے کیونکہ اب وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ اپنے مقابلہ میں کم و بیش تگنی قوت رکھنے والے دشمن کو پسپا کر دیں۔ قرآن میں مسلمانوں کی اس قوت و شوکت کی طرف اشارہ کر کے بطور احسان فرمایا گیا کہ:

واذکروا اذانتم قلیل مستضعفون فی الارض تخافون ان یتخطفکم الناس فاٰوٰکم وایدکم بنصرہ[۲۸]

(یاد کرو وہ وقت جبکہ تم تھوڑے تھے، زمین میں تم کو ناتواں سمجھا جاتا تھا تم ڈرتے رہتے تھے کہیں لوگ

تمھیں اُچک نہ لیجائیں۔ پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کی اور اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کئے)

اور دوسری جگہ فرمایا گیا کہ:

ولقد نصرکم اللہ ببدر وانتم اذلۃ۔[۲۹]

(بلاشبہ جنگِ بدر میں اللہ نے تمہاری مدد فرمائی اور اس وقت تم بہت کمزور و بے سہارا تھے)

جنگِ بدر کے نتیجہ میں کفر اور اسلام کے غلبہ کا رُخ بڑی حد تک متعین ہو گیا کیونکہ فتح بدر نے اسلام کو نصرت و فوقیت بخشی اور باطل کو زیر کر دیا۔ اسی لئے قرآن اس کو "یوم الفرقان"[۳۰] سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی جس دن حق و باطل کے درمیان فرق کر دیا گیا اور جس دن اس حقیقتِ کبریٰ کا عملی اعلان کیا گیا کہ قوموں کی تمیز و تفریق کی اصل علت "ایمان" اور "عقیدہ" ہے کیونکہ اس روز دو صفیں جو ایک دوسرے کے مقابل شمشیر بکف کھڑی تھیں ان کے درمیان حسب و نسب، رنگ و نسل، قوم و وطن کی یکسانیت کے باوجود فرق صرف "ایمان" کا تھا۔ اسی لئے حضرت ابو بکرؓ اپنے بیٹے کے مقابل آ جاتے ہیں۔ حضرت حذیفہؓ اپنے باپ عتبہ، حضرت عمرؓ اپنے ماموں اور حضرت علیؓ اپنے بھائی عقیل کے خلاف صف آرا ہیں اور اسی وجہ سے خود رسولؐ اللہ ایک کیمپ میں اور آپ کے حقیقی چچا حضرت عباس اور داماد ابو العاص دشمن کے دُوسرے کیمپ میں موجود ہیں۔

اس جنگ نے ایک طرف تو اندرونِ مدینہ کے غیر مسلم عناصر پر مسلمانوں کا خاطر خواہ رعب قائم کر دیا۔ چنانچہ اسی وجہ سے عبداللہ بن ابی اور اس کے اعوان و انصار نے جو ابھی تک کافر تھے، بظاہر حلقۂ اسلام میں داخل ہونے کو غنیمت جانا اور عمر بھر اسی نفاق میں مبتلا رہے جبکہ دوسرے عنصر یہود نے منشور کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عین وقت پر غیر جانب داری کا اعلان کیا اور جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمان اپنی تمام تر بے سرو سامانی کے باوجود کفارِ قریش پر غالب آ گئے ہیں تو ان کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھی اور ادب و لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر وہ مسلمانوں سے کُھلم کھلا دشمنی پر اُتر آئے چنانچہ اس کا جواب دینا پڑا اور آخر کار جنگِ بدر پر ایک ماہ بھی نہ گذرا تھا کہ یہود بنی قینقاع کو مدینہ چھوڑنا پڑا۔[۳۱]

دوسری طرف جنگِ بدر کا اثر قبائل پر بھی پڑا۔ چنانچہ بعض قبائل تو مرعوب ہو کر مثبت طور پر رسولؐ اللہ کی امداد و اعانت پر آمادہ ہو گئے۔ مثلاً جنگِ اُحد کے لئے قریش نے پیش قدمی کی تو خزاعہ کے آدمیوں نے رسولؐ اللہ تک اطلاعات بہم پہنچائیں۔[۳۲] نیز مدینہ کے آس پاس رہنے والے قبائل نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ ریاستِ مدینہ اپنے دفاع کے سلسلے میں موثر کارروائی کرنے پر قادر ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ بدر کی فتح کا ایک منفی اثر یہ مرتب ہوا کہ عرب کی وہ تمام قوتیں بیک جنبش بیدار ہو گئیں جو ریاستِ مدینہ کا قیام و استقلال پسند نہیں کرتی تھیں چنانچہ اطرافِ مدینہ کے متعدد قبائل کی ہمتیں بڑھیں اور انہوں نے ریاستِ مدینہ پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ لہٰذا جب رسولؐ اللہ کو یہ اطلاع ملی کہ بنی سلیم و غطفان کا ایک گروہ

کچھ شرارت پر آمادہ ہے تو آپ نے ان کے کسی اقدام سے پہلے ان کا استیصال کرنا مناسب سمجھا۔ آپ محرم ۳ھ میں دو سو مجاہدین کا لشکر لے کر قرقرۃ الکدر (یا قرارۃ الکدر) تک تشریف لے گئے۔[۳۳] پھر تقریباً ایک ماہ کے بعد رسول اللہؐ کو اطلاع ملی کہ بنی ثعلبہ و محارب کی ایک جماعت نے ذی امر میں جمع ہو کر یہ قصد کیا ہے کہ آپ کو تمام اطراف سے گھیر لیں۔ تو آپ نے صحابہ کو جمع کیا اور سب کے مشورہ سے ان پر حملہ آور ہونے کا قصد فرمایا۔ ربیع الاول ۳ھ میں چار سو پچاس صحابہ کے ہمراہ سفر اختیار کیا لیکن دشمن سے مڈبھیڑ نہ ہوئی اور آپ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔[۳۴] جمادی الاول ۳ھ میں قبیلہ بنی سلیم کے متعلق اطلاع ملی کہ بحران کے مقام پر آپ کے خلاف مجتمع ہو رہے ہیں اور ان کے استیصال کے لئے آپ روانہ ہوئے لیکن وہ لوگ آپ کی آمد کی اطلاع پا کر منتشر ہو گئے اور اس طرح جنگ کی نوبت نہیں آئی۔[۳۵]

ان واقعات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ جنگِ بدر کے بعد ہر طرف سے طوفان کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مدینہ کی نوزائیدہ ریاست کو مٹا ڈالنے کے لئے سارا عرب تیار ہو گیا ہے۔ مزید برآں اندرونی طور پر بے انتہا خطرات پیدا ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ رسول اللہؐ کی جان کے متعلق ہر وقت اندیشہ لگا رہتا تھا۔ کیونکہ یہ واضح ہو چکا تھا کہ یہود و منافقین اپنی شرارتوں اور عداوتوں سے باز نہیں آ سکتے اور ہر چھچھوری حرکت کر سکتے ہیں نیز قریشِ مکہ کا بھی بدلہ لئے بغیر چین سے بیٹھنا ممکن نہ تھا کیونکہ انھیں جنگِ بدر میں جو جراحت پہنچی تھی اس کا اندمال انتقام سے ہی ممکن تھا۔[۳۶]

اور پھر یہی ہوا کہ انتقام کی گھڑی آ پہنچی۔ شوال ۳ھ میں تین ہزار کا عظیم الشان لشکر، سامانِ حرب سے لیس، ابوسفیان کی قیادت میں مکہ سے روانہ ہوا۔[۳۷] ابوسفیان اگرچہ اپنی کچھ کارگذاری سویق کی مہم میں دکھا چکا تھا۔[۳۸] لیکن اب ایک طرف تو یہ ضروری تھا کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکا جائے اور دوسری طرف مکہ کے جگر پاروں کا بدلہ اور اپنے عزیزوں کا انتقام لینا بھی ان کے لئے لازمی تھا۔ قریش کے لئے یہ بھی ناقابلِ برداشت تھا کہ مسلمانوں کے قلیل سے گروہ نے ان کے عزت و ناموس کے بت کو سرنگوں کر کے جو چیلنج دیا ہے اسے قبول نہ کریں۔ اس پر مزید تیل منافقین و یہود نے چھڑک کر عداوت کی آگ کو قریش کے سینوں میں اور بھڑکا دیا تھا۔

رسول اللہؐ کو ۵ شوال ۳ھ کو اطلاع دی گئی کہ دشمن اتنے قریب پہنچ گیا ہے کہ اس کے گھوڑوں نے وادیٔ عقیق کی چراگاہوں کو صاف کر دیا ہے۔[۳۹] چنانچہ رسول اللہؐ صحابہ سے صلاح و مشورہ کے بعد ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ مقابلے کے لئے روانہ ہوئے۔ اس موقع پر بھی منافقین نے صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے مقام شوط پر پہنچ کر یہ بہانہ کیا کہ "تم لوگوں نے جنگ کے بارے میں میرے مشورہ کو قبول نہ کیا اس لئے میں تمہارے ساتھ جانے اور جنگ میں شریک ہونے سے معذور ہوں۔"[۴۰] یہ کہہ کر وہ اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر الگ ہو گیا اور اسلامی فوج صرف سات سو رہ گئی۔[۴۱] منافقین کی یہ حرکت ان کی بدنیتی کو صاف ظاہر کر رہی تھی لیکن رسول اللہؐ نے صبر و تحمل سے کام لیا اور مسلمانوں کے عزم میں بھی کوئی فرق نہ آیا اور بالآخر ۷ شوال کو اُحد کے میدان میں معرکہ کارزار گرم ہوا۔[۴۲]

اس غزوہ میں ذرا سی بے احتیاطی کی وجہ سے مسلمانوں کو اس صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا کہ ان کا جانی نقصان قریش کے مقابلہ میں زیادہ ہوا۔ اس کے باوجود قریش کو کچھ حاصل نہ ہوا۔ شاید اسی لئے ابوسفیان میدانِ اُحد سے چلتے چلتے یہ کہہ گیا تھا کہ: "اگلے سال پھر ہمارا تمہارا مقابلہ بدر میں ہوگا۔"[۴۳]

غزوۂ اُحد کے بعد ریاستِ مدینہ کے لئے خطرات میں مزید اضافہ ہوگیا کیونکہ جنگِ بدر کی وجہ سے مخالفین و معاندین کی جو حوصلہ شکنی ہوئی تھی اس غزوہ کے بعد ان کی ہمتیں پھر سے بڑھ گئیں اور وہ اہلِ مکہ کی طرح یہ سمجھنے لگے کہ نہ صرف ریاستِ مدینہ بلکہ اسلام کی بیخ کنی میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔ اور فی الحقیقت غزوۂ اُحد سے غزوۂ خندق تک پیش آنے والے واقعات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے ان عزائم کی تکمیل کے لئے انھوں نے بڑی منظم جدوجہد کا منصوبہ بنایا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حوادث پے بہ پے یہی رُخ اختیار کرتے ہیں مثلاً غزوۂ اُحد پر دو ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ نجد کے قبیلہ بنی اسد نے مدینہ طیبہ پر چھاپہ مارنے کی تیاریاں کیں۔ پھر صفر ۳ھ میں قبائل عضل اور قارہ نے حضورؐ سے بغرضِ تبلیغ آدمی مانگے۔ حضورؐ نے چھ اصحاب[۴۴] کو ان کے ساتھ کر دیا مگر رجیع پہنچ کر وہ قبیلہ ہذیل کے کفّار کو ان بے بس مبلغین پر چڑھا لائے۔ چار کو قتل کر دیا گیا اور دو اصحاب مکہ میں لا کر دشمنوں کے ہاتھوں فروخت کئے گئے۔[۴۵] پھر اسی ماہ میں بئرِ معونہ کا دردناک واقعہ پیش آیا جس میں چالیس مبلغینِ اسلام کو قبائل بنی سلیم نے شہید کر دیا۔[۴۶] اسی دوران یہود بنو نضیر مسلسل بدعہدیاں کرتے رہے یہاں تک کہ ربیع الاول ۴ھ میں خود رسول اللہؐ کو شہید کرنے کی سازش کر ڈالی۔[۴۷] مزید برآں جمادی الاول ۴ھ میں بنی غطفان کے دو قبیلوں بنو ثعلبہ اور بنو محارب نے ریاستِ مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں۔[۴۸] مختصر یہ کہ غزوۂ اُحد کے بعد ریاستِ مدینہ کے ارد گرد فتنوں کا ایسا جال پھیلا دیا گیا تھا جس سے باہر نکلنے کے لئے بے پناہ سیاست و تدبّر، جرأت، حوصلہ مندی اور قوتِ فیصلہ درکار تھی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تمام صفات رسول اللہؐ میں موجود تھیں۔ چنانچہ آپ نے ان سے کام لے کر تھوڑے ہی عرصہ میں حالات کا رُخ یکسر بدل دیا اور ان فتنوں کی کامیابی کے ساتھ سرکوبی کر دی۔ البتہ جس طرح مسائل یکے بعد دیگرے پیدا ہوتے چلے گئے اسی طرح ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کو حل کرنے کے لئے اقدامات بھی اس سرعت اور تسلسل کے ساتھ کئے جائیں تاکہ ریاستِ مدینہ کا دفاع ہو سکے اور اس کے استقلال کو مستحکم کیا جا سکے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ رسول اللہؐ نے پوری مستعدی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اور ہر موقع پر بروقت قدم اٹھا کر مخالفینِ ریاست کو کچل دیا مثلاً غزوۂ اُحد کے دُوسرے ہی دن جبکہ رسول اللہؐ اور دوسرے بکثرت مسلمان زخمی حالت میں تھے اور بہت سے گھر اُجڑ چکے تھے۔[۴۹] رسول اللہؐ نے جاں نثارانِ اسلام کو لشکرِ کفار کے تعاقب کا حکم دیا تاکہ وُہ کہیں راستہ سے پلٹ کر پھر مدینہ پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔[۵۰] بہرکیف دُوسرے دن رسول اللہؐ نے اس خستہ حال جماعت کو ساتھ لیا اور لشکرِ قریش کے تعاقب میں حمراء الاسد تک تشریف لے گئے۔[۵۱] اس مہم کو غزوۂ اُحد کا تکملہ کہا جا سکتا ہے، کیونکہ جب رسول اللہؐ نے غیر متوقع طور پر لشکرِ قریش کو میدانِ اُحد سے جاتے ہوئے دیکھا تو آپ کو خیال ہوا کہ ممکن ہے وہ لوگ مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہے ہوں یہ صرف آپ کا قیاس ہی نہ تھا بلکہ حقیقت بھی تھی۔ ابوسفیان نے مدینہ سے کچھ دُور جا کر

اپنی غلطی محسوس کی اور پلٹ کر مدینہ پر حملہ کرنے کی فکر میں تھا کہ اسے یہ علم ہوگیا کہ رسولؐ اللہ اس کے تعاقب میں آرہے ہیں تو ارادہ ترک کردیا اور مکہ چلا گیا۔[۵۲] بہر حال رسولؐ اللہ نے حمراٗ الاسد پر تین دن تک قیام فرمایا اور جب یہ یقین ہوگیا کہ اب دشمن واپس نہیں آئے گا تو آپ نے مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی۔[۵۳]

رسولؐ اللہ کی یہ مہم نہ صرف یہ کہ آپ کی بصیرت، پیش بینی اور جنگی مہارت کو ثابت کرتی ہے بلکہ آپ کی ہمت و جرأت پر دلالت کرتی ہے کہ اس خستہ حالی اور پریشانی کے عالم میں کفار و مشرکین کے اتنے بڑے لشکر کا تعاقب کیا اور وہ بھی اس صورت میں کہ جب کہ ایک دن پہلے آپ ان کے ہاتھوں کافی نقصان اٹھا چکے تھے۔ اس کارروائی سے دُو فائدے اور ہوئے۔ ایک تو یہ کہ قریش کے بڑھتے ہوئے حوصلے پست ہو گئے اور دُوسرے ریاست مدینہ کے نواحی دشمنوں کو یہ علم ہوگیا کہ ریاست اپنے دفاع کے سلسلہ میں پُوری طرح چوکس ہے اور اس کی قیادت ایک انتہائی بیدار مغز اور اولوالعزم ہستی کر رہی ہے۔

اس کے بعد آپ نے بنی اسد گروہ کی خبر لی جو غالباً قریش کی شہ پر مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تیاریاں کر رہا تھا اور اس کی سرکوبی کے لئے ابو مسلمہ کی قیادت میں ڈیڑھ سو آدمیوں کا ایک لشکر روانہ کیا۔ یہ فوج اچانک ان کے سروں پر پہنچ گئی چنانچہ وہ بدحواسی کے عالم میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے اور ان کا سارا مال و اسباب مسلمانوں کے ہاتھ آگیا۔[۵۴]

بئرِ معونہ کا واقعہ نہایت المناک تھا۔ اس میں چالیس صحابہ کو تبلیغ کے بہانے لے جا کر قتل کر دیا گیا تھا۔ البتہ ایک صحابی عمرو بن امیہ بچ کر مدینہ واپس آرہے تھے تو راہ میں انہوں نے بنی عامر کے دو شخصوں کو سوتے میں قتل کر دیا۔ جب مدینہ پہنچے اور حضور کو معلوم ہوا تو آپ نے بہت افسوس ظاہر کیا اس لئے کہ بنو عامر سے آپ کی صلح تھی، اس بنا پر آپ نے دونوں مقتولین کی دیت دینی چاہی۔ چونکہ یہود بنو نضیر، بنو عامر کے حلیف تھے لہٰذا آپ نے بنی نضیر کو بیچ میں ڈال کر اس معاملہ کو طے کرانا چاہا۔[۵۵] اس سلسلے میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود بنی نضیر کی بستی میں تشریف لے گئے اور وہاں ان سے گفتگو فرمائی۔ دورانِ گفتگو آپ ایک دیوار سے تکیہ لگائے بیٹھے تھے کہ ان لوگوں نے ایک شخص عمرو بن جحاش کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ پیچھے کی طرف سے دیوار پر چڑھ کر ایک بڑا سا پتھر گرا کر رسولؐ اللہ کو ہلاک کر دے۔[۵۶] ان کے ایک سردار سلام بن مشکم نے اس تجویز کی سختی سے مخالفت کی اور کہا کہ اوّل تو اس کی خبر ان کو بذریعہ وحی ہو جائے گی اور دوسرے یہ اس عہد کے قطعاً خلاف ہے جو ہمارے اور ان کے درمیان ہو چکا ہے۔[۵۷] لیکن وہ لوگ اپنے ارادے سے باز نہ آئے اور بدعہدی پر آمادہ ہو گئے۔

رسولؐ اللہ گفتگو کے دوران ان کی آپس کی سرگوشیوں سے ان کے ارادے کو بھانپ گئے نیز بذریعہ وحی آپ پر ان کی اسکیم واضح ہوگئی۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ وہ اس کو عملی جامہ پہناتے رسولؐ اللہ اپنے گھر تشریف لے آئے۔[۵۸]

جس روز بنی نضیر نے رسولؐ اللہ کو شہید کرنے کی سازش کی اسی روز آپ نے حضرت محمد بن مسلمہ کے ذریعہ یہود بنی نضیر کو کہلا بھیجا کہ :

اخرجوا من بلدی فلا تساکنونی بہا وقد ھممتم بما ھممتم بہ من الغدر وقد اجلتکم

عشراً فمن رائی بعد ذالك ضربت عنقه۔ (۵۹)

(تم نے جو بدعہدی کی ہے اس کی وجہ سے اب تمہیں ہمارے ساتھ مدینہ میں رہنے کا حق نہیں ہے۔ بس تمہیں دس دن کی مہلت دیتا ہوں کہ اپنا انتظام کر کے جس طرف چاہو نکل جاؤ۔ اس کے بعد تمہارے قبیلہ کا کوئی فرد مدینہ کی حدود میں نظر آئے گا تو اس کو قتل کر دیا جائے گا)

رسول اللہ کے اس فرمان پر اگرچہ بنو نضیر نے مدینہ چھوڑنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں لیکن عبداللہ بن ابی نے اُنھیں یہ کہہ کر روک لیا کہ:

لا تخرجوا من دیارکم واقیموا فی حصنکم فان معی الفین من قومی وغیرھم من العرب یدخلون معکم حصنکم فیموتون عن اٰخرھم وتمدّکم قریظة وحلفاؤکم من غطفان۔ (۶۰)

(تمہیں مدینہ سے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے قلعوں میں مقیم رہو۔ میرے ساتھیوں کے علاوہ دو ہزار عرب اور بنو قریظہ اور غطفان کے لوگ مرتے دم تک تمہاری مدد کریں گے)

چنانچہ ابن ابی کی اس ہمت افزائی پر بنی نضیر نے رسول اللہ کو کہلا بھیجا کہ آپ کے جو جی میں آئے کیجئے ہمیں مدینہ سے کوئی نہیں نکال سکتا۔ (۶۱) اس پر رسول اللہ نے فرمایا کہ اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔ (۶۲)

لہٰذا رسول اللہ نے نوٹس کی میعاد ختم ہوتے ہی ان کا محاصرہ کر لیا اور ان کے حامیوں میں سے کسی کی یہ ہمت نہ پڑی کہ مدد کو آتے۔ انجام کار انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور کہہ دیا کہ ہم آپ کا شہر خالی کر کے چلے جائیں گے اور اپنی املاک میں سے اسلحہ کے علاوہ صرف وہ چیزیں لے جائیں گے جو اونٹوں پر لادی جا سکتی ہیں اور باقی تمام چیزیں اسلحہ، زرہیں، نخلستان اور اراضی وغیرہ رسول اللہ کا حق ہوں گی۔ (۶۳) اس پر محاصرہ اٹھا لیا گیا اور بنی نضیر کو شہر سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ انہوں نے مال و اسباب اونٹوں پر بار کیا کچھ نے اپنے مکانوں کو خود ہی منہدم کیا اور چوکھٹ بھی نکال لیں اور گاتے بجاتے خوشیاں مناتے مدینہ سے نکل کر بعض لوگ شام کی طرف لیکن اکثر لوگ خیبر کی جانب چلے گئے۔ (۶۴) اس طرح مضافاتِ مدینہ کا وہ پورا محلہ جس میں بنی نضیر رہتے تھے ان کے باغات، گڑھیاں اور دیگر سامان رسول اللہ کے ہاتھ آ گیا۔ (۶۵)

یہودِ بنی نضیر سے فراغت پا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی طرف ایک مرتبہ پھر توجہ دی تاکہ ابو سفیان کے اس چیلنج کا جواب دیا جاتے جو اس نے اُحد سے پلٹتے ہوئے بدر پر ایک اور جنگ کے لئے دیا تھا۔ اور جسے آنحضرت نے بھی بخوشی قبول کر لیا تھا۔ (۶۶) سال کی مدت پوری ہوئی تو رسول اللہ نے تمام خطرات سے بلند ہو کر جہاد کا اعلان فرما دیا اور مسلمانوں کو یہ ہدایت بھی کر دی کہ وہ سامانِ تجارت بھی ساتھ لے چلیں تاکہ ذیقعدہ کے پہلے ہفتہ میں بدر کے مقام پر جو بازار لگتا ہے اس میں شرکت کر سکیں۔ پھر ذی قعدہ ۴ھ کی چاند رات کو رسول اللہ پندرہ سو مسلمانوں کی جمعیت لے کر بدر الصفرا پہنچ گئے۔ دوسرے دن صبح سے وہاں بازار لگ گیا اور مسلمانوں نے ساتھ لایا ہوا سامان فروخت کر کے سو فیصد نفع کمایا۔ (۶۷)

ادھر ابو سفیان دو ہزار قریشیوں کا لشکر لے کر بادلِ ناخواستہ مکّہ سے روانہ ہوا لیکن مرالظہران سے آگے بڑھنے کی ہمّت نہ کر سکا اور اپنی خفت مٹانے کے لئے اپنے ساتھیوں سے یہ عذر کیا کہ اس مرتبہ خشک سالی کی وجہ سے ہمیں جانوروں کے لیے چارہ اور پانی کی فراہمی میں کافی دقّت اور دشواری کا سامنا ہے لہٰذا مناسب ہے کہ ہم اس وقت مکّہ لَوٹ جائیں اور آئندہ اس مہم پر چلیں[۶۸]۔ ادھر رسول اللہؐ آٹھ دن تک ابو سفیان کا انتظار کر کے مدینہ واپس آ گئے[۶۹]۔

اس واقعہ سے ایک طرف تو مسلمانوں کی وہ دھاک جو میدانِ اُحد میں اُکھڑ گئی تھی پہلے سے زیادہ جم گئی۔ اور دوسری طرف پُورے عرب پر یہ واضح ہو گیا کہ اب تنہا قریش رسول اللہؐ کے مقابلے کی ہمّت نہیں رکھتے اور حقیقت بھی یہی تھی۔

قریش جنگِ اُحد کے موقع پر اپنی بیشتر طاقت صرف کر چکے تھے نیز ساز و سامان اور افرادی قوت کے اعتبار سے بھی انہوں نے تمام ذرائع اور وسائل کو استعمال کر لیا تھا۔ جنگوں میں ان کے بہترین افراد مارے گئے تھے اور ان تمام کارروائیوں کا حاصل صرف یہ تھا کہ وہ بمشکل تمام مسلمانوں کا کچھ جانی نقصان ہی کر سکے تھے۔ علاوہ بریں اپنی انتہائی جد و جُہد کے باوجود نہ تو وہ رسول اللہؐ کو خاطر خواہ زک پہنچا سکے تھے، نہ ریاستِ مدینہ کو ختم کرنے کی تدبیر سے کوئی فائدہ اٹھا سکے تھے۔ اور نہ سازشوں اور چالبازیوں سے مسلمانوں کے دامنِ اتحاد کو پارہ پارہ کر سکے تھے۔

اس صورتِ حال میں قریشِ مکّہ کے لئے غالباً ایک راستہ باقی بچا تھا کہ وہ آخری بار ایک بہت بڑی قوت کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہو کر تلافیٔ مافات کر لیں یا بالفاظِ دیگر انتقام کی پیاس بجھا لیں۔ لیکن ایک بڑی فوج کی تیاری کے لئے بھی صرف یہی شکل ممکن تھی کہ قریش اپنے وسائل پر اکتفا کرنے کے بجائے دوسروں سے مدد لیں۔ بنی نضیر کے یہود تو ان کے ساتھ پہلے سے ساز باز رکھتے تھے۔ بلکہ خود قریش کو ایک آخری فیصلہ کن جنگ کے لئے ابھارنے میں اصل محرک بنی نضیر اور بنی وائل سے تعلق رکھنے والے یہود ہی تھے[۷۰]۔ مزید برآں قریش کو جنگ کی نشاط افزا دعوت دے کر یہی لوگ مدینہ کے گرد و نواح میں بسنے والے دُوسرے قبائل کے پاس بھی گئے اور انھیں ریاستِ مدینہ کے خلاف آمادۂ پیکار کر دیا[۷۱]۔ یہود عداوتِ رسولؐ میں اس حد تک پہنچ گئے کہ انہوں نے آپ کے خلاف بعض قبائل کو آمادۂ جنگ کرنے میں رشوت پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کیا[۷۲]۔ بہر طور ریاستِ مدینہ کے خلاف تمام دشمن عناصر مجتمع ہو گئے اور قریش بھی پُوری تیاری کرنے لگے کیونکہ ان کی عزت و ناموس کے لئے بڑا نازک لمحہ آ گیا تھا۔

قریش کے برعکس مسلمانوں کا معاملہ یہ تھا کہ ہر آزمائش انہیں اور زیادہ ثبات و استقلال عطا کر دیتی تھی۔ ان کی قوت روز بروز مستحکم ہو رہی تھی اور ریاستِ مدینہ اپنے دفاع کے معاملہ میں خود کفیل ہوتی جا رہی تھی۔ مدینہ پر چاروں طرف سے یلغار کے باوجود رسول اللہؐ اور مسلمان قطعاً ہراساں نہیں ہُوئے اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ غزوۂ بدر ثالث کی وجہ سے مسلمانوں کی دھاک پھر سے بیٹھ گئی تھی اور قریشِ مکّہ کے لئے تنہا ان سے مقابلہ کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لئے وہ ایک بہت بڑے لشکر کو مدینہ پر چڑھا لانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ مسلمانوں اور قریش کے اتحادی لشکر میں کوئی تصادم واقع ہو چند واقعات اور ایسے پیش آ گئے جن سے مسلمانوں کی قوت و شوکت میں

مزید اضافہ ہو گیا۔

ایک تو یہ اطلاع مدینہ پہنچی کہ بنی محارب و ثعلبہ کے غطفانی قبائل مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لئے پر تول رہے ہیں[۷۳]۔ رسول اللہؐ تو ویسے بھی ہر سرکش قوت کو کچلنے، اور کسی بغاوت یا خطرہ کا دفعیہ کرنے میں ہمیشہ مستعد رہتے تھے۔ چنانچہ یہ اطلاع ملتے ہی آپ بغیر کسی توقف کے مجاہدین کے ایک بڑے لشکر کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے اور ذات الرقاع تک پیش قدمی فرمائی[۷۴]۔ اس اچانک فوج کشی نے دشمن کے حوصلے پست کر دیئے اور وہ حواس باختہ ہو کر پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ چنانچہ جدالؐ قتال کی نوبت نہیں آئی اور وہاں کئی دن ٹھہر کر مدینہ واپس آ گئے۔[۷۵]

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ عرب کی شمالی سرحد پر دومۃ الجندل کا جو اہم مقام تھا اور جہاں کا حاکم اکیدر بن عبدالملک مذہباً نصرانی اور فرمانروائے روم کا اطاعت گزار تھا وہ اور اس کے علاقے کے آدمی مدینہ سے آنے والے آدمیوں اور قافلوں کو لُوٹ لیتے تھے اور مسلمان تاجروں کو بہت پریشان کرتے تھے۔ ان کی زیادتی کی مسلسل اطلاعات مدینہ پہنچنے لگیں تو رسول اللہؐ اس کی سرکوبی کے لئے ربیع الاول ۵ھ میں ایک ہزار صحابہ کے ساتھ دومۃ الجندل کی جانب روانہ ہوئے[۷۶]۔ منزل مقصود پر پہنچے تو وہ لوگ آپ کے مقابلہ کی ہمت نہ کر سکے اور بستی چھوڑ کر بھاگ گئے۔[۷۷]

ان مہمات کے نتیجہ میں ایک طرف تو مدینہ کے اطراف و جوانب بلکہ پورے شمالی عرب پر ریاست مدینہ کی ہیبت بیٹھ گئی۔ اور دوسری طرف قریش کے ساتھ ساتھ مدینہ کے دوسرے نواحی قبائل نے بھی اچھی طرح سمجھ لیا کہ حرم مدینہ کو تاخت و تاراج کرنا ایک دو قبیلوں کے بس سے قطعی باہر ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب کے بہت سے قبائل کا متحدہ لشکر شوال ۵ھ میں ریاست مدینہ کو پامال کرنے کے لئے آندھی طوفان بن کر آ گیا۔ اس میں بنی نضیر اور بنی قینقاع کے جلا وطن یہود بھی تھے۔ غطفان کے قبائل بنی سلیم، فزارہ، مرہ، اشجع، سعد اور اسعد وغیرہ بھی تھے۔ اور جنوب کی طرف سے قریش تو بہر حال اپنے حلیفوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ آ گے آ گے تھے[۷۸]۔ اس اتحاد میں کفار قریش کی شرکت کی وجہ صاف ہے وہ نہ تو اپنے مقتولین کا انتقام لے سکے تھے نہ حسب وعدہ بدر ثالث کے موقع پر مسلمانوں سے آنکھ ملا سکے تھے اور نہ ہی اپنی بے عزتی و بدنامی کا داغ مٹا سکے تھے۔ اس لئے تلافی کا موقع اس سے بہتر کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ بنی نضیر اور بنی قینقاع وغیرہ جس طرح مدینہ سے نکالے گئے تھے وہ سب کو معلوم تھا اور اس کے نتیجہ میں وہ مسلمانوں کی دشمنی میں جس حد تک بڑھ جاتے کم تھا۔ بنو غطفان پہلے سے زخم خوردہ تھے انہوں نے اس موقع پر اپنے حلیف بنو اسد کو بھی آمادہ کر لیا تھا۔ ادھر قریش نے بنو سلیم کو اور یہود نے بنو سعد کو شرکت کی دعوت دی اس طرح بڑی آسانی کے ساتھ اتحادیوں کا یہ لشکر گراں بار ہوتا چلا گیا، جو کم و بیش دس ہزار افراد پر مشتمل تھا[۷۹]۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے قبل عرب میں اتنی بڑی جمعیت کبھی مجتمع نہ ہوئی تھی۔ قرآن نے بھی اس لشکر کی کثرت اور وحشت ناک نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ:

اذ جاءوکم من فوقکم و من اسفل منکم و اذ زاغت الابصار و بلغت القلوب الحناجر و تظنون باللہ الظنونا۔ ھنالک ابتلی المومنون و زلزلوا زلزالاً شدیداً۔[۸۰]

(جب وہ (اور ان کے لشکر) اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے۔ جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں
کلیجے منہ کو آ گئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت ایمان والے
خوب آزمائے گئے اور بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیے گئے)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ پہلے سے ہی اندازہ تھا کہ آپ کے گرد ایک بڑا طوفان اٹھ رہا ہے جو کسی وقت بھی مدینہ کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے اور پھر شوال ۵ھ کے اوائل میں آپ کو اطلاع بھی مل گئی کہ اب تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں تو آپ نے صحابہ کے مشورہ سے دفاعی انتظامات شروع کر دیے۔ اور اس سلسلے میں قبل اس کے کہ لشکر اعدا حملہ آور ہوں آپ نے چند ہی دنوں میں مدینہ کے شمال اور مغرب کے رخ پر یعنی جہاں سے حملہ ہو سکتا تھا ایک خندق تیار کر لی۔[81] اور کوہ سلع کو پشت پر لے کر تین ہزار فوج کے ساتھ مدافعت کے لئے تیار ہو گئے۔[82] لشکر کفار کی آمد کی تاریخوں کا متعین کرنا اگرچہ دشوار ہے اور محاصرہ کی مدت کے بارے میں بھی مورخین مختلف الخیال ہیں تاہم قرینِ صحت یہی بات ہے کہ جنگ کی مجموعی مدت چوبیس دن تھی[83] جس میں فوجوں کی آمد و اجتماع، محاصرہ اور جنگ سب ہی شامل ہیں۔ اگر ابنِ سعد کی اس روایت کو تسلیم کر لیا جائے کہ بنو قریظہ کا محاصرہ ۲۳ ذی قعدہ کو شروع ہوا تھا[84] تو پھر جنگِ خندق کی تاریخِ اختتام ۲۱، ۲۲ ذی قعدہ سمجھی جائے گی اور کفار کی فوجوں کی آمد ۲۷، ۲۸ شوال ۵ھ متصور ہو گی۔

بہر حال اپنے اپنے مورچوں پر جمنے کے بعد جنگ کا آغاز ہوا، جنگ کا معرکہ کارزار گرم تھا کہ مدینہ کے بعض عناصر نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی سوچی ان میں سے منافق تو شروع ہی سے اپنے نفاق کا اظہار کر رہے تھے نہ خندق کھودنے میں انہوں نے دلچسپی لی نہ دورانِ جنگ کوئی نمایاں کام انجام دیا، ہاں مسلمانوں میں طرح طرح کی بدگمانیاں ضرور پھیلاتے تھے۔ ان کی طرف سے ہر وقت ہی خطرہ رہتا تھا۔ اسی زمانے میں مدینہ کے مشرقی گوشے میں رہنے والے اہم یہودی قبیلہ بنی قریظہ نے بھی منشورِ مدینہ سے بغاوت کا مظاہرہ کر دیا۔ یہود کا یہ قبیلہ اگرچہ جنگِ خندق تک منشورِ مدینہ کا پابند چلا آ رہا تھا لیکن بنی نضیر نے جو اس جنگ کے خاص طور پر محرک بنے تھے حیی بن اخطب کو بھیج کر بنو قریظہ کو مشتعل کر دیا تھا۔[85] کیونکہ دیگر یہود اور منافقین یہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ بنی قریظہ مسلمانوں سے وفاداری نبھاتے رہیں۔ علاوہ ازیں ان کی نظر دفاعی پہلو سے اس جانب بھی تھی کہ جنوب کی طرف سے بنو قریظہ کے حملہ آور ہونے کی صورت میں مسلمان دو جانب سے اس طرح گھر جائیں گے کہ ان کی شکست بالکل یقینی ہے۔

دشمنانِ ریاستِ مدینہ کا یہ منصوبہ بظاہر بڑا مناسب اور کامیاب نظر آتا تھا لیکن دوسری طرف رسول اللہؐ ان معاملات سے بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ ان سب باتوں کی بروقت اطلاع مل گئی، آپ نے اتمامِ حجت کی غرض سے چند صحابہ[86] کو بنو قریظہ کے پاس بھیجا وہاں کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ پورا قبیلہ مخالفت پر آمادہ تھا انہوں نے فہمائش پر کان دھرنا تو در کنار متکبرانہ انداز میں رسول اللہؐ کے فرستادوں کو یہ جواب دیا کہ "ہم نہ محمد کو جانتے ہیں نہ ان کو رسول مانتے ہیں اور نہ ہی ہمارے اور ان کے درمیان کوئی عہد ہے۔"[87]

بہرحال بنو قریظہ کے اس واضح جواب اور عہد شکنی سے جو سنگین صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی اس میں ایک نو مسلم نعیم بن مسعودؓ[۸۸] سے رسول اللہؐ نے جنگی تکنیک کے اعتبار سے ایک ایسا کام لیا جس نے نقشہ حالات پلٹ کر رکھ دیا۔ انہوں نے رسول اللہؐ کی ہدایت پر بنو قریظہ اور لشکرِ کفار میں پھوٹ ڈلوا دی۔[۸۹] اس کارروائی سے جہاں بیک وقت دو جانب سے حملہ کا خطرہ ٹل گیا جو ریاست مدینہ کے لئے تباہ کن ثابت ہو سکتا تھا اسی کے ساتھ ساتھ لشکرِ کفار کے حوصلے بھی پست ہو گئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ محاصرہ بیس دن سے زیادہ طویل ہو چکا تھا پھر چند غیر معمولی واقعات نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ یعنی اگرچہ مہینہ ایسا تھا جب نہ شدید سردی کا موسم تھا نہ سخت آندھیوں کا زمانہ، اس کے باوجود ایک دن یکایک ایسی آندھی چلی کہ دشمن کی فوج جو کھلے میدان میں خیمہ زن تھی سخت انتشار میں مبتلا ہو گئی۔ خیمے اکھڑ گئے، دیگیں اور برتن الٹ گئے، اور کھانے پینے کا سارا سامان طوفان کی نذر ہو گیا۔ اس کے ساتھ سردی اتنی بڑھی کہ کفار کا ٹھہرنا مشکل ہو گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ راتوں رات لشکرِ کفار میں شامل تمام جماعتوں نے اپنی اپنی راہ لی اور صبح ہوتے ہوتے میدان دشمنوں سے خالی ہو گیا۔[۹۰]

یہ دراصل قدرتِ خداوندی کا ایک مظاہرہ تھا جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا کہ:

وکفی اللہ المومنین القتال۔[۹۱]

(اور جنگ میں اللہ ہی مومنین کے لئے کافی ہو گیا)

اب جنگِ احزاب کے اثرات کا مطالعہ کرنے سے پہلے غزوۂ بنی قریظہ کے بارے میں بعض حقائق کا جاننا بھی ضروری ہے کیونکہ اسے جنگِ احزاب کا ہی تتمہ کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جیسے ہی حملہ آور فوجیں مدینہ سے رخصت ہوئیں اور ان کی جانب سے اطمینان ہو گیا تو ریاستِ مدینہ کے اندرونی دشمن یعنی یہود بنی قریظہ کی سرکوبی کے لئے رسول اللہؐ نے اس قدر عجلت سے کام لیا کہ آپ میدانِ جنگ سے واپس آ کر اپنے گھر میں آئے ہی تھے کہ حضرت بلال کے ذریعہ دوبارہ منادی کرا دی کہ "سب لوگ دوبارہ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں کیونکہ بنو قریظہ کی بستی کا محاصرہ کرنا ہے"۔ آپ نے لوگوں کو مسجدِ نبویؐ میں نماز ادا کرنے کی بھی اجازت نہیں دی بلکہ حکم فرمایا کہ سب لوگ بنو قریظہ کے محلہ میں چل کر نماز (عصر) ادا کریں۔[۹۲]

بنو قریظہ کے استیصال میں اتنی عجلت و مستعدی کا سبب غالباً یہ تھا کہ ان کے قبیلہ نے سنگین جرائم کا ارتکاب کیا تھا ان کی فردِ جرم میں عین لڑائی کے وقت ریاست سے سرکشی و بغاوت منشورِ مدینہ کی خلاف ورزی و عہد شکنی، دشمنانِ ریاست مدینہ سے ساز باز، مسلمانوں پر عقب سے حملہ آور ہونے کے لئے ۱۵ سو تلواروں، ۳ سو زرہوں، ۲ ہزار نیزوں اور ۱۵ سو ڈھالوں کی فراہمی[۹۳] اور حملہ آوروں سے مل کر مدینہ کی پوری آبادی کو ہلاکت میں مبتلا کر دینے کی کوشش کرنا شامل تھا۔ اس لئے ان کی جانب سے ذرا بھی غفلت نہیں برتی جا سکتی تھی۔ لہٰذا ان کا محاصرہ کر لیا گیا۔ محاصرہ کی شدت کو بنو قریظہ دو تین ہفتوں سے زیادہ برداشت نہ کر سکے۔[۹۴] اور آخرکار انہوں نے اس شرط پر اپنے آپ کو رسول اللہؐ کے حوالے کر دیا کہ قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ ان کے حق میں جو فیصلہ بھی کریں گے انہیں منظور ہو گا۔[۹۵] حضرت سعد

بن معاذ نے فیصلہ دے دیا کہ بنو قریظہ کے تمام قابلِ جنگ مرد قتل کر دیے جائیں، ان کے اموال تقسیم کر دیئے جائیں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا جائے[۹۶]۔ چنانچہ اس فیصلے پر عمل کیا گیا۔ بنی قریظہ کے استیصال کے ساتھ ہی مدینہ سے یہودیوں کی آبادی کا کم و بیش خاتمہ ہو گیا۔

اب جہاں تک جنگِ احزاب کے نتائج و اثرات کا تعلق ہے تو تاریخی اعتبار سے غزوۂ احزاب کا واقعہ اسلامی تاریخ میں بالعموم اور ریاستِ مدینہ کے باب میں بالخصوص غیر معمولی مقام و اہمیت رکھتا ہے۔ جنگِ خندق میں کفار و مشرکین اور ان کے اتحادیوں کی پسپائی و ناکامی اور عبرتناک شکست نے کئی قابلِ دید تاریخی نتائج کو جنم دیا۔ مثلاً:

۱۔ اتنے طویل محاصرہ کے باوجود مسلمانوں کا جانی نقصان زیادہ نہیں ہوا صرف حضرت سعد بن معاذ کے تیر لگا جس کی وجہ سے وہ تقریباً ایک ماہ بعد انتقال کر گئے۔

۲۔ بنو قریظہ کے نقضِ عہد سے یہودیوں پر سے بھروسا بالکل اُٹھ گیا۔

۳۔ ریاستِ مدینہ کے مخالفین نے آخری بار اپنا پورا زور صرف کر کے دیکھ لیا کہ اس نوزائیدہ ریاست کو ختم کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر کسی دشمن نے مدینہ پر حملہ کرنے کی قابلِ ذکر جرأت نہیں کی۔

۴۔ غزوۂ احزاب کے ساتھ ہی مسلمانوں کے ابتلاء و آزمائش کے دور کا خاتمہ ہو گیا۔

۵۔ اس بے نتیجہ فوج کشی اور محاصرہ نے پورے عرب کو یقین دلا دیا کہ مسلمان اب ایک ایسی قوت بن چکے ہیں جس کو مختلف قبائل کا اتحاد بھی شکست نہیں دے سکتا۔

۶۔ ریاستِ مدینہ کے ازلی دشمن قریش کا خطرہ ہمیشہ کے لئے ٹل گیا۔ چنانچہ جنگ کے اختتام پر رسول اللہ نے یہ ارشاد فرمایا کہ:

لن تغزوکم قریش بعد عامکم هذا ولکنکم تغزونهم۔[۹۷]

(اب قریش کے لوگ تم پر کبھی چڑھائی نہ کر سکیں گے بلکہ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے)

اور فی الحقیقت یہ حالات کا بالکل صحیح اندازہ تھا۔

۷۔ یہ سال دشمنانِ اسلام کے لئے جارحیت کا آخری سال ثابت ہوا۔ اس غزوہ کے بعد ہی مسلمانوں نے مدینہ سے باہر قدم نکال کر اطراف و جوانب میں پیش قدمی شروع کی۔ اس غزوہ کے بعد ہی ریاستِ مدینہ کی حدود میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور ریاستِ مدینہ اپنے توسیع و ارتقاء کے دوسرے دور میں داخل ہوتی ہے جس کا مطالعہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

(۲) دورِ دوم (۶ھ تا ۱۱ھ)

ہم یہ پہلے بیان کر چکے ہیں کہ غزوۂ احزاب میں مسلمانوں کے مقابل متحدہ عساکر کی ناکامی کے بعد ریاستِ مدینہ

توسیع کے ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ریاست کی حدود مدینہ اور اس کے قرب وجوار سے بہت آگے بڑھ کر تقریباً تمام جزیرۃ العرب تک پھیل گئی۔ سطوت یہود کا خاتمہ، قریش مکہ کا استیصال، عرب کے ان بڑے بڑے قبائل کا اظہار اطاعت جنہیں قریش سے بھی زیادہ داعیہ تھا، جملہ مخالفین ریاست کی فوری سرکوبی اور سرحدی علاقوں کے سرکش قبائل کی تادیب اور ریاست کی سالمیت وخود مختاری کی مکمل حفاظت اس دور کے خاص واقعات ہیں۔ پھر یہی وہ دور ہے جبکہ ریاست کو داخلی وخارجی طور پر استحکام حاصل ہوا۔ اس کا نظم ونسق پوری طرح مرتب ہوا۔ عرب سے باہر کی دنیا میں اسلام کا تعارف اور آپ کے عالمگیر مشن کا آغاز ہوا۔ رومی سلطنت کے منطقۂ اثر میں نفوذ کیا گیا۔ ایران کی برتری کا طلسم ٹوٹا۔ دنیا کے فرمانروایان مطلق سے خطاب کر کے انہیں اسلام کی دعوت دی گئی مختصر یہ کہ زیر نظر میں امور ریاست، امور رفاہ، امور دین ودنیا اور تہذیب وتمدن کے باب میں اتنا کام ہوا کہ ان کی تفصیل کے یہ اوراق متحمل نہیں ہو سکتے اس لئے اس اجمال کی تفصیل میں بھی آئندہ بھی اختصار سے کام لینا ہوگا۔

یہاں یہ وضاحت کردینا ضروری ہے کہ زیر بحث دور میں ریاست نبوی کے ارتقائی پہلوؤں کا مطالعہ کرتے وقت واقعات کی سن وار ترتیب کے بجائے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ توسیع کے نقطۂ نظر سے جو واقعہ جس ضمن میں اثر و اہمیت رکھتا ہے اسے وہاں بیان کر دیا جائے اور یہ کہنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ توسیع وارتقاء کا فطری عمل نہ تو راستہ کے مزاحمات کو دور کئے بغیر جاری رہ سکتا ہے اور نہ حالات کی مساعدت کے بغیر تکمیل پذیر ہو سکتا ہے۔ لہذا ریاست مدینہ کی توسیع وترقی کے لئے بھی یہ ضروری تھا کہ:

(ا) ریاست کے خلاف اُٹھنے والی ہر تحریک کا قلع قمع اور ہر مزاحمت کا خاتمہ کر دیا جائے اور ریاست کی طرف حریصانہ نگاہیں اُٹھانے والوں کی پوری طرح خبر لی جائے تاکہ انہیں دوبارہ اس کا حوصلہ نہ ہو سکے۔

(ب) غزوۂ احزاب متحدہ قبائل کی اسلام دشمنی اور ریاست دشمنی کا نقطۂ عروج تھا۔ اس میں شکست نے اتحادیوں کو ہمیشہ کے لئے منتشر کر دیا تھا اس لئے اب اس بات کا امکان تو ختم ہو چکا تھا کہ عرب کی کوئی طاقت یا سب طاقتیں مل کر ریاست نبوی کو ختم کر دیں۔ البتہ اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ ان کی دشمنی اور مخالفت ختم ہوگئی ہے بلکہ وہ اب بھی اپنی عداوت اور بدنیتی کا مظاہرہ کسی بھی موقع پر کر سکتے تھے اس لئے ریاست کی توسیع کا انحصار اس بات پر تھا کہ اندرون عرب جو طاقتیں ریاست کے لئے خطرہ بن سکتی ہیں ان کو اول تو آپس میں متحد ہونے کا کوئی موقع نہ دیا جائے اور پھر دوسرے مرحلہ میں ان کی علیحدہ علیحدہ اکائیوں کو سرنگوں کر دیا جائے۔

(ج) اندرون عرب کی تمام قابل ذکر مزاحمتوں کو ختم کرنے کے بعد بیرون عرب بھی اسلام کے مشن کو پہنچایا جائے اور حاکمیت الٰہی کی طرح ڈالی جائے کہ یہ رسول اللہ کی بعثت کا عین تقاضا تھا۔

اب ہم اسی ترتیب سے ان نکات پر بحث کریں گے:

(الف) جہاں تک ریاست کے خلاف اُٹھنے والی ہر تحریک کے قلع قمع کرنے کا تعلق ہے تو واقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ اللہ نے اس ضمن میں خاص تدبر اور حکمتِ عملی سے کام لیا۔ یہ بات تو بالکل صاف ہے کہ مزاحمت خواہ کسی جانب سے ہو اور فتنہ کہیں سے بھی اُٹھے، رسولؐ اللہ اس کے فرو کرنے میں کسی قسم کی تاخیر گوارا نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی اطلاع ملتے ہی پُوری سرگرمی، مستعدی اور پیش بینی کے ساتھ فوری اقدام فرماتے تھے۔

دفاعی سیاست کا یہ اصول بڑا معروف ہے اور اسے عقلِ عام کی تائید بھی حاصل ہے کہ ناگہانی حملہ سے طاقتور دشمن بھی مجبور و بے بس ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب شعبان ۶ھ میں[۹۸] رسولؐ اللہ کو یہ اطلاع ملی کہ بنو مصطلق مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں[۹۹] تو اس سے قبل کہ وہ لوگ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنائیں رسولؐ اللہ نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ مریسیع[۱۰۰] کے مقام پر اچانک انہیں جا لیا اور معمولی سے حملہ کے بعد پُورے قبیلے کو مال و اسباب سمیت گرفتار کر لیا۔[۱۰۱] اسی ماہ آپ کو بمقام فدک، بنو سعد بن بکر کے اجتماع کی خبر ملی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ یہودیوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں اس پر آپ نے فوری کارروائی کی اور حضرت علی کو سو آدمیوں کا لشکر دے کر ان کی طرف روانہ کیا۔ حضرت علی وہاں پہنچے اور حملہ کر کے انہیں منتشر کر دیا[۱۰۲]۔ یہی حکمتِ عملی آپ نے ان دوسری مہموں میں بھی اختیار کی جو حضرت عمر بن الخطاب[۱۰۳]، ابوبکر صدیق[۱۰۴]، بشیر بن سعد الانصاری[۱۰۵]، غالب بن عبد اللہ اللیثی[۱۰۶]، ابن ابی العوجا السلمی[۱۰۷]، شجاع بن وہب الاسدی[۱۰۸]، ابو عبیدہ بن الجراح[۱۰۹] اور ابو قتادہ بن ربعی[۱۱۰] کی سرکردگی میں دارالحکومت مدینہ سے روانہ کی گئیں۔ ان مہمات کا انجام چاہے کچھ ہی رہا ہو (دشمن ہاتھ نہ آیا یا مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا یا انھیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی وغیرہ وغیرہ) لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ رسولؐ اللہ نے ان کو بھیج کر سیاسی و عسکری اعتبار سے بے شمار فوائد حاصل کئے مثلاً ان غزوات و سرایا کا پہلا اہم ترین فائدہ معلومات کا حصول تھا اور اس مقصد کے لئے غالباً وہ فوجی دستے زیادہ موثر ثابت ہوئے جو نفری کے اعتبار سے مختصر تھے لیکن دُور بین و تیز رفتار تھے اور جنگ میں اُلجھے بغیر اہم معلومات حاصل کر کے دارالحکومت مدینہ پہنچ جاتے تھے۔ اسی مقصد کے لئے زیادہ بڑے دستے بھی کار آمد تھے لیکن وہ حسبِ ضرورت لڑنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ یہ معلومات دشمن، ان کی نقل و حرکت، علاقے، جنگی رازوں اور عزائم وغیرہ کے بارے میں ہوتی تھیں ان مہمات کا دوسرا فائدہ یہ تھا کہ اسلامی افواج کو تیز رفتاری اور ناگہانی حملہ کرنے کی مشق و تربیت حاصل ہو گئی۔ ان مہمات کی وجہ سے مسلمان ان راستوں سے بخوبی واقف ہو گئے جو عرب کے مختلف علاقوں کو گھیرے ہوئے تھے اور خصوصاً جو مدینہ تک پہنچ جاتے تھے۔ مزید برآں ان طلایہ گرد دستوں کے باعث مسلمان ان قبائل سے بھی متعارف ہوئے جو ان راستوں پر قابض تھے۔ شاید اسی تعارف کا نتیجہ تھا کہ جو آگے چل کر متعدد قبائل کے قبولِ اسلام یا معاہداتِ صلح کی صورتوں میں ظاہر ہوا۔ ان غزوات و سرایا کی بنا پر دو بڑے مقاصد اور حاصل ہُوئے۔ یعنی ایک تو قریش کی ناکہ بندی اور دوسرے ریاست کی اس کارکردگی اور صلاحیت کا اظہار کہ اس کے خلاف اُٹھنے والی ہر تحریک کو، مقام پر اور ہر حالت میں نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ اور واقعات نے ثابت کر دیا کہ

رسول اللہؐ ان دونوں مقاصد میں پوری طرح کامیاب رہے۔ پہلے مقصد کی کامیابی کی ایک شکل تو یہ تھی جو غزوۂ احزاب تک نظر آگئی کہ چند ہی سال میں قریش ہمت و حوصلہ کھو بیٹھے اور ہجوم و اقدام کے بجائے دفاع کی پوزیشن میں آگئے اور پھر اگلے ڈھائی تین سال میں بالکل مفتوح ہو گئے۔ اب جہاں تک دوسرے مقصد کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں مختلف النوع محاذوں پر اس انداز سے فوجی نقل و حرکت کرنا کہ دیگر امورِ ریاست میں کوئی خلل واقع نہ ہو، رسول اللہؐ کی حیرت انگیز سیاسی و عسکری مہارت، دفاعی پیش بینی اور تدبر و حکمت پر دال ہے اور جس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔[۱۱۱]

اسی سلسلہ میں رسول اللہؐ کی حکمتِ عملی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ریاست کے سرکشوں، باغیوں اور غداروں سے بدلہ لینے یا محاسبہ کرنے میں کسی قسم کا ظلم یا کسی نوع کی زیادتی نہیں کی بلکہ الہامی ہدایت وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم[۱۱۲] (اور اگر تم بدلہ لو تو بس اسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہے) کی روشنی میں ریاست، مرکزِ مدینہ یا مسلمانوں کو جراحت پہنچانے والوں سے محض قصاص عادل پر ہی اکتفا کیا گیا۔ چنانچہ زیرِ نظر دور میں غزوات و سرایا کی ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن کا مقصد مجرموں کا محاسبہ اور ان سے برابر کا بدلہ لینا تھا۔

اس ضمن میں سب سے پہلا موقع وہ ہے جبکہ غزوۂ بنی قریظہ سے فارغ ہو کر چند ماہ بعد ہی رسول اللہؐ نے بنی لحیان سے نمٹنے کا فیصلہ کیا[۱۱۳]۔ یہ دراصل واقعۂ رجیع کا ردِ عمل تھا۔ عضل اور قارہ کے لوگ اس تعلیمی و تبلیغی وفد کے ارکان کے قاتل تھے جنہیں رسول اللہؐ نے انہی کی درخواست پر قرآن و اسلام کی تعلیم کے لئے روانہ فرمایا تھا مگر رجیع پہنچ کر ان لوگوں نے بدعہدی کی اور بنی ہذیل کی شاخ بنی لحیان کو ساتھ ملا کر ان اصحاب میں سے چار کو شہید کر دیا اور دو کو اہل مکہ کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا اور اہلِ مکہ نے ان دونوں کو بھی شہید کر دیا تھا[۱۱۴]۔ رسول اللہؐ کو اپنے ان اصحاب کے اس طرح شہید کئے جانے کا بہت صدمہ تھا لیکن دیگر مسائل کی مصروفیت کی وجہ سے اس طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سلسلے میں بنی لحیان سے بات چیت ہو رہی ہو اور جب وہ بے نتیجہ رہی تو آپ نے مجبوراً فوج کشی فرمائی۔ اس قیاس کا ایک قرینہ یہ ہے کہ اس غزوہ میں آپ کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ لوگ اپنے مقام سے فرار ہو چکے تھے حالانکہ آپ نے اس رازداری سے سفر شروع کیا تھا کہ خود اہلِ مدینہ کو اس کی خبر نہ تھی نیز توریہ سفر شام کا فرمایا تھا[۱۱۵]۔ اس احتیاط کے باوجود بنی لحیان کا فرار یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ لوگ مذاکرات کی ناکامی پر آپ کا حملہ متوقع سمجھتے تھے۔ بہر حال واقدی کے علاوہ دوسرے تمام مورخین اس پر متفق ہیں کہ اس غزوہ میں لڑائی کی نوبت نہیں آئی اور دشمن نے آپ کی آمد کی اطلاع پا کر راہِ فرار اختیار کی اور مقابلہ کی تاب نہ لا کر پہاڑوں کی چوٹیوں میں روپوش ہو گیا[۱۱۶]۔ جب حضور نے دیکھا کہ دشمن دسترس سے باہر ہو چکا ہے تو آپ نے اور آگے بڑھ کر عسفان میں قیام کیا اور دو سواروں کو آگے بھیجا۔ وہ کراع الغمیم تک گئے مگر کسی سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ اس لئے چند دن بعد آپ واپس مدینہ آ گئے[۱۱۷]۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عسفان تک رسول اللہؐ کی پیش قدمی قریش کو مرعوب کرنے میں بڑی کارگر ثابت ہوئی[۱۱۸]۔ اس کی وجہ جیسا کہ ہم

پہلے کہہ چکے ہیں یہ تھی کہ اب تک قریش سے جتنے معرکے ہوئے انہوں نے عموماً اور غزوۂ خندق نے خصوصاً انھیں بالکل چور کر کے رکھ دیا تھا اور وہ آسانی سے مسلمانوں کے مقابلہ کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔

رسول اللہؐ کو غزوہ بنی لحیان سے واپس آئے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے کہ عُیینہ بن حصن بن حذیفہ بن بدر الفزاری غطفان کے سواروں کو لے کر الغابہ کی سرکاری چراگاہ پر حملہ آور ہوا[۱۱۹]۔ ابو ذر کے بیٹے کو شہید کیا اور رسول اللہؐ کی بیس اونٹنیاں ہنکا کر لے گیا[۱۲۰]۔ دشمن کی یہ بہت بڑی جسارت تھی جس پر گرفت کرنا لازمی تھی۔ رسول اللہؐ مجاہدین کی معیت میں تعاقب کے لئے نکلے۔ حضرت سلمہ بن الاکوع آپ سے قبل ہی روانہ ہو چکے تھے[۱۲۱]۔ مسلمانوں نے لٹیروں کا دور تک پیچھا کیا۔ دس اونٹنیاں بھی حاصل کر لیں[۱۲۲] اور ان میں سے کئی آدمیوں کو تہ تیغ بھی کر دیا لیکن بالآخر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے[۱۲۳]۔

پھر اس واقعہ پر بمشکل دو ہفتہ ہی گزرے تھے کہ رسول اللہؐ کو حضرت زید بن حارثہؓ کی سرکردگی میں پانچ سو آدمیوں کا لشکر بنو جذام کو سزا دینے کے لئے جمادی الآخر ۶ھ میں روانہ کرنا پڑا۔ سبب یہ تھا کہ دحیہ بن خلیفہ الکلبی قیصر روم سے مل کر آرہے تھے۔ قیصر نے ان کو خلعت اور انعام سے سرفراز کیا تھا۔ جب یہ واپسی میں حسمیٰ پہنچے تو بنی جذام کے لوگوں نے راستہ میں ہی ان کو لُوٹ لیا۔ کوئی چیز ان کے پاس باقی نہ چھوڑی اسی حالت میں رسول اللہؐ کی خدمت میں شکایت لے کر آئے تو رسول اللہؐ نے بنی جذام کی تادیب کے لئے حضرت زید کو روانہ فرمایا[۱۲۴]۔ زید بن حارثہ نے انتہائی سرعت لیکن رازداری سے کام لے کر دشمن کو جا دبوچا۔ جن لوگوں نے حضرت دحیہ پر ڈاکہ ڈالا تھا انھیں قتل کیا۔ کافی مالِ غنیمت حاصل کیا اور بہت سوں کو قیدی بنا لیا[۱۲۵]۔ اسی طرح کی کامیابی زید بن حارثہ کو رمضان ۶ھ میں اس وقت بھی حاصل ہوئی جبکہ ان کو رسول اللہؐ نے وادی القریٰ کے نواح میں بنو بدر کی سرزنش کے لئے بھیجا تھا[۱۲۶]۔ یہی زید تجارت کے سلسلے میں شام کی طرف گئے تھے۔ ان کے ہمراہ اصحابِ رسولؐ کا مال بھی تھا جب وہ وادی القریٰ کے قریب پہنچ گئے تو بنو بدر کی شاخ فزارہ کے کچھ لوگ ملے جنھوں نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو مارا اور جو کچھ پاس تھا لے لیا تھا[۱۲۷]۔

پھر شوال ۶ھ میں قبیلہ عرینہ کے آٹھ آدمی رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے۔ مدینہ کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی اور بیمار پڑ گئے تو رسول اللہؐ نے صحت کی غرض سے انھیں نواحِ قبا میں اس چراگاہ کی طرف بھیج دیا، جہاں آپ کے اونٹ چرائے جاتے تھے۔ وہ لوگ وہاں رہے یہاں تک کہ تندرست اور فربہ ہو گئے۔ اس کے بعد ان کی نیت اچانک خراب ہو گئی چنانچہ ایک دن سرکاری چرواہے یعنی رسول اللہؐ کے آزاد کردہ غلام یسار کو پکڑا اس کی آنکھوں میں گرم سلائی پھیری، بے رحمانہ طریقے سے اس کے ہاتھ پیر کاٹ کر قتل کیا اور رسول اللہؐ کی اونٹنیاں ہنکا کر لے گئے[۱۲۸]۔

یہ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑا عجیب و غریب تھا کیونکہ بیک وقت ارتداد، ڈاکہ، قتل، محاربہ اور بے رحمانہ سلوک کے جرائم کا ارتکاب کیا گیا تھا اور گویا عین دار الحکومت مدینہ میں جہاں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری رسول اللہؐ نے لے رکھی تھی وہاں امن و امان خراب کرنے کے علاوہ اس نظام صالح کو بھی مجروح کرنے کی کوشش کی گئی جسے قائم کرنا رسول اللہؐ کے فرائض میں داخل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہؐ نے اس کا فوری نوٹس لیا اور ان کو قرار واقعی سزا

دینے کے لئے پہلے تو ۲۰ سواروں کے ساتھ کرز بن جابر الفہری کو تعاقب میں بھیج کر گرفتار کرایا اور اس کے بعد قصاص عادل کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ کے حکم کی تعمیل میں ان کے بھی ہاتھ پیر کاٹے گئے، آنکھوں میں سلائیاں پھیری گئیں اور پھر وہیں سُولی پر لٹکا دیا گیا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔[۱۲۹]

ابنِ سعد کے بیان کے مطابق[۱۳۰] قرآن کی یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی تھی کہ :

انما جزآء الذین یحاربون اللّٰہ ورسوله ویسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض۔[۱۳۱]

(جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے دوڑ بھاگ کرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کئے جائیں یا انھیں سُولی دے دی جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے)

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مذکورہ بالا لٹیروں کے تعاقب میں آپ نے جو دستہ روانہ کیا تھا اس کی قیادت کرز بن جابر الفہری کے سپرد تھی جو ایک زمانے میں اسلام لانے سے قبل خود بھی اسی قسم کا مظاہرہ کر چکے تھے اور ڈاکہ زنی اور ڈاکوؤں کے اسرار و رموز سے بہمہ وجوہ واقف تھے۔ اس لحاظ سے اس خاص مہم کے لئے ان کا انتخاب رسول اللہؐ کی بہترین انتظامی صلاحیت اور گہرے نفسیاتی مطالعہ دونوں پر صریح دلالت کرتا ہے۔

(ب) ریاست نبویؐ کی توسیع و ترقی کی راہ میں اب جو طاقتیں سنگِ گراں بنی ہوئی تھیں ان کے خاتمے کی غرض سے رسول اللہؐ نے یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ اوّل تو ان کو آپس میں متحد ہونے کا کوئی موقع نہ دیا جائے اور پھر ان سے علیحدہ علیحدہ طور پر نمٹ لیا جائے۔ تاریخی اعتبار سے اندرونِ عرب ریاست کی قابلِ ذکر مخالفانہ طاقتیں تین تھیں، ایک مشرکینِ مکہ، دوسرے یہود اور تیسرے قبائلِ عرب۔ خصوصاً اس علاقے کے قبائل جو مدینہ کے شمال مشرق، جنوب مشرق اور مکہ کی جانب جنوب مغرب میں آباد تھے۔ اور جن کی ہمدردیاں یہود خیبر اور مشرکینِ مکہ میں باہم تقسیم تھیں یا دونوں کے لئے یکساں تھیں۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر یہی تینوں طاقتیں مل کر مدینہ پر حملہ آور ہوئی تھیں۔ ان طاقتوں کو اگرچہ اس موقع پر ناکامی ہوئی تھی اور اس نے ان کے وقار کو بہت سخت صدمہ پہنچایا تھا نیز یہ تمام عناصر ایک دوسرے سے بڑی دل شکستگی اور بیزاری کی حالت میں منتشر ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود الکفر ملّة واحدة کے مصداق کسی موقع پر ان کے دوبارہ متحد ہو جانے کے امکان کو نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا۔[۱۳۲] لہٰذا مسئلہ یہ تھا کہ ان طاقتوں کو باہم ملنے سے روکنے کی تدبیر کیا کی جائے اور ان تینوں میں سے پہلے کس سے نبرد آزما ہوا جائے۔

غزوۂ احزاب اور صلح حدیبیہ کے درمیانی عرصہ میں رسول اللہؐ کا عرب کے جن قبائل سے مسلسل سابقہ پیش آیا اور ان کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا اس کا اندازہ ان مہمات سے لگایا جا سکتا ہے جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ ان کارروائیوں میں اگرچہ صد فی صد کامیابی اس معنیٰ میں نہیں ہو سکی کہ دشمن کو بہر صورت مغلوب کر دیا جاتا کیونکہ بعض مواقع پر ایسا ہوا کہ دشمن

مقابلہ کی تاب نہ لاکر فرار ہوگیا یا اسلامی لشکر مختلف موانعات کی بنا پر اپنا گوہرِ مقصود حاصل نہ کرسکا۔ لیکن یہ بات بہرحال طے ہے کہ ان سرگرمیوں سے یہ ثابت ہوگیا کہ قبائل عرب سخت پریشان ہیں اور ان کے حوصلے پست ہو چکے ہیں اس لئے ریاست نبوی کو فوری طور پر ان سے کوئی بڑا خطرہ متوقع نہیں تھا نیز ان سے فیصلہ کن معرکہ کو موخر بھی کیا جا سکتا تھا۔

دوسری بڑی طاقت یہود کی تھی ان کی اگرچہ متعدد بستیاں تھیں لیکن مرکزی طاقت خیبر میں مرکوز تھی۔ مدینہ سے نکلنے والے یہود بنی قینقاع اور بنی نضیر کی ایک بڑی تعداد بھی یہیں آبسی تھی۔ ان میں سب سے زیادہ فعّال یہود بنو نضیر تھے جو نہ صرف یہود خیبر بلکہ ہمسایہ عرب قبائل میں بھی اپنے سرمایہ دارانہ اثرات ڈال کر ریاست نبوی کے خلاف جذبات مسلسل ابھارا کرتے تھے غرض خیبر یہودی طاقت کا سب سے بڑا گڑھ، ریاستِ نبویؐ کے خلاف ایک نہایت ہی فعال اڈہ اور جنگی سازشوں کا مرکز تھا۔

اس دوران رسولؐ اللہ دوسرے محاذوں پر بہت مصروف رہے لیکن یہودیوں کی طرف سے بھی غفلت نہیں برتی چنانچہ ان کا زور توڑنے کے لئے آپ نے پہلے تو رمضان ۶ھ میں حضرت عبداللہؓ بن عتیک کی سرکردگی میں ایک سریہ بھیج کر رئیس خیبر ابورافع سلام بن ابی الحقیق کو اس کے کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔[۱۳۳] اس کا قتل یہود خیبر کے لئے غیر معمولی نقصان تھا لیکن اس وار کو وہ سہہ گئے اور پھر اپنا امیر اسیر بن زارم کو بنا لیا وہ بھی ریاستِ نبوی کے خلاف سرگرم ہوگیا اور عرب قبائل خصوصاً غطفان وغیرہ سے سازش کرکے مدینہ پر حملہ کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔[۱۳۴] آنحضرت کو اطلاع ملی تو تحقیقِ حال کے بعد عبداللہؓ بن رواحہ کی کمان میں تیس آدمیوں کا ایک دستہ اسیر کی فہمائش اور اسے راہِ راست پر لانے کی غرض سے شوال ۶ھ میں خیبر روانہ کیا۔ اسیر ملاقات کے بعد رسولؐ اللہ کے پاس آنے کے لئے آمادہ ہو کر عبداللہ کے ساتھ چل بھی دیا لیکن راستہ میں اس نے ایک مسلمان مجاہد (عبداللہؓ بن انیس) کی تلوار چھیننے کی ناکام کوشش کی۔ تلوار پر قبضہ کرنے کی کوشش نیتِ قتل پر صاف دلالت تھی چنانچہ اسیر بن زارم اور اس کے بیشتر ساتھی مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔[۱۳۵] اسیر اور اس کے ساتھیوں کے قتل سے یہودیوں پر جو افتاد آپڑی تھی اس سے سنبھلنے کے لئے اور مدینہ پر حملہ کا نئے سرے سے منصوبہ بنانے میں کچھ نہ کچھ وقت کا لگنا فطری بھی تھا۔ رسولؐ اللہ نے اسی مختصر سی مہلت سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ کچھ ہی روز بعد ذی قعدہ کا مہینہ شروع ہونے والا تھا جو اہل عرب کے نزدیک حرام مہینہ تھا۔ گویا ذی الحجہ اور ذی قعدہ دو ماہ کا عرصہ التوائے جنگ کا از خود سبب بن گیا اور ٹھیک اسی زمانہ میں قبائل عرب اور یہود خیبر کی طرف سے تمام اندیشوں سے بے نیاز ہو کر رسولؐ اللہ نے حرم مکہ کا رُخ کیا جہاں صلح حدیبیہ کا عظیم الشان واقعہ ظہور پذیر ہوا۔

صلح حدیبیہ کا واقعہ مختصراً یہ ہے کہ شوال ۶ھ میں ایک اشارہ خداوندی (خواب) کی تعمیل میں رسولؐ اللہ نے زیارتِ کعبہ کے لئے مکہ روانگی کا فیصلہ کیا[۱۳۶] اور اس کا اعلانِ عام بھی کر دیا کہ جو ساتھ چلنا چاہے کاروانِ زیارت میں شامل ہو جائے۔[۱۳۷] اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً چودہ سو افراد اس سفرِ سعادت میں آپ کے ہمراہ ہو گئے۔[۱۳۸] قریشِ مکہ کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ مسلمانوں کا ارادہ لڑائی جھگڑے کا نہیں صرف زیارت اور عمرہ کا ہے۔ آپ کے حکم سے سب نے ذوالحلیفہ (مدینہ) سے ہی احرام باندھا۔[۱۳۹] قربانی کے جانور ساتھ لئے، نیام کی ہوئی تلوار کے سوا کوئی ہتھیار نہ لیا اور ماہ ذی قعدہ میں مکہ کی جانب

روانہ ہوئے۔[۱۴۰] تمام صلح جویانہ تدابیر کے باوجود قریشِ مکّہ کو آپ کی آمد سخت ناگوار ہوئی اور انہوں نے جمع ہو کر یہ طے کیا کہ آنحضرت یا کسی اور مسلمان کو حدودِ حرم میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ اس کے لئے وہ مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے باقاعدہ سوار فوج خالد بن ولید کی سرکردگی میں کراع الغمیم کی طرف بھیج دی۔[۱۴۱] آنحضرت کو ان باتوں کی اطلاع عسفان کے مقام پر ملی۔[۱۴۲] لہٰذا آپ نے مکّہ کا عام راستہ چھوڑ کر ثنیۃ المرار کی راہ اختیار کی اور دشوار گذار راستے سے ہو کر حدیبیہ پہنچ گئے۔[۱۴۳] اسی مقام پر آپ کے اور قریش مکہ کے درمیان متعدد سفارتوں کے تبادلے اور مذاکرات کے بعد بالآخر ایک تحریری معاہدہ مرتب ہوا،[۱۴۴] جسے صلح حدیبیہ کہتے ہیں۔

بادی النظر میں یہ واقعات بہت زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتے لیکن فی الحقیقت اس صلح کے اتنے گہرے مذہبی، سیاسی، عسکری اور تہذیبی و تمدنی اثرات رُونما ہوئے جس نے اسے آئندہ کی تاریخ میں ایک لازوال مقام عطا کیا۔ اس کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں اس واقعہ کی بعض تفصیلات اور چند دوسرے پہلوؤں پر بطور خاص نگاہ ڈالنی ہو گی۔

سب سے پہلی قابلِ غور بات رسول اللہؐ کی عمرہ کی نیت اور اس کا اعلان عام ہے۔ کسی بھی مہم پر روانگی کے ضمن میں رسول اللہؐ کا بالعموم طریقہ یہ تھا کہ منزلِ مقصود کے تعین کو مبہم رکھتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس طریقہ کار میں جہاں بہت سی حکمتیں ہیں اسی طرح اس موقع پر آپ کا عام منادی کرانا اور منزلِ مقصود کا تعین بھی معنی خیز ہے۔ تاریخی روایات سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اس اعلان نے مسلم اور غیر مسلم عناصر پر متضاد اور نمایاں اثرات مرتب کئے۔ رسول اللہؐ اور مسلمانوں کا معاملہ تو یہ تھا کہ حرمِ مکّہ ان کا قبلہ تھا[۱۴۵] اور تحویلِ قبلہ کے بعد سے تو بیت اللہ سے مذہبی اور قلبی لگاؤ شوق کی تمام حدود کو عبور کر چکا تھا کہ وہ اب ان کی تمام سعی و کاوش اور جدوجہد کا مرکز، حرکت و عمل کا منتہا، ان کی تمناؤں کا محور اور قبلۂ مقصود تھا۔ اس لئے ایک طرف خواب زیارت نے رسول اللہؐ کی آتشِ شوق کو بھڑکا دیا اور ان کو گویا مکہ کی جانب کوچ کرنے کا اشارہ دے دیا اور آپ بغیر کسی توقف کے امتثالِ امر میں نکل کھڑے ہوئے تو دوسری طرف وفورِ شوق میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بھی شرفِ ہم رکابی کے لئے تیار ہو گئی۔ دوسری جانب عمرہ و زیارت کا یہ اعلان منافقین اور اعراب پر بجلی بن کر گرا۔ اعلان کے مطابق یہ لوگ بھی شریکِ کارواں ہو سکتے تھے لیکن کانما یساقون الی الموت[۱۴۶] (گویا موت کے مُنہ میں ہنکائے جا رہے ہیں) کے مصداق ان کی ایک بڑی تعداد نے اس سفر پر جانے کو موت کے منہ میں جانے سے تعبیر کرتے ہوئے کنارہ کشی اختیار کی۔ بل ظننتم ان ینقلب الرسول والمومنون الی اھلیھم ابداً و زین ذٰلك فی قلوبکم وظننتم ظن السوء وکنتم قوماً بوراً۔[۱۴۷] (بلکہ تم نے یوں سمجھا کہ رسول اور ان کے ہمراہ مومنین اپنے گھر والوں میں کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے اور یہ بات تمہارے دلوں کو اچھی بھی معلوم ہوتی تھی اور تم نے بڑی بدگمانی کی اور تم برباد ہونے والے لوگ ہو گئے)

حقیقت یہ ہے کہ اعراب و منافقین کے یہ خدشات بے وجہ نہ تھے دوسرے ظاہر پرستوں کی طرح وہ لوگ بڑی حیرت سے یہ دیکھ رہے تھے کہ آنحضرت یہ قدم اس وقت اٹھا رہے ہیں جبکہ ریاست نبوی کے لئے خطرات ہی خطرات ہیں۔ اور مدینہ کے چاروں طرف اس کے دشمنوں کے مسکن موجود ہیں پھر سفر بھی قریش مکّہ کی سرزمین کا در پیش ہے جن سے کچھ بعید نہیں کہ

اشہر حرم کی تمام حرمت کو بالائے طاق رکھ کر اپنے علاقے میں آئے ہوئے (دشمن) کو واپس نہ جانے دیں[۱۴۸]۔ اس صورت حال میں سفرِ مکہ میں شرکت منافقین کے نزدیک اپنے آپ کو خواہ مخواہ ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھی۔ اعراب و منافقین کے اس طرزِ فکر کی تصدیق قرآن کے متعدد ارشادات سے بھی ہوتی ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ صرف اپنے مفاد کی پرستش کرنے والے تھے اسی لئے سورہ فتح میں مذکورہ بالا آیت سے متصلاً یہ فرمایا کہ:

سیقول لك المخلفون اذا انطلقتم الی مغانم لتاخذوھا ذرونا نتبعکم[۱۴۹]۔

(جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے وہ عنقریب جب تم (خیبر کی) غنیمتیں لینے چلو گے کہیں گے کہ ہم کو بھی اجازت دو کہ ہم تمہارے ساتھ چلیں)

غرض ان ہی وجوہ سے اعراب و منافقین نے بالعموم خاموش تماشائی بنے رہنے اور کنارہ کش رہنے میں زیادہ عافیت محسوس کی۔

عمرہ کے لئے رسول اللہ کے اعلان نے قریش کو بھی سخت امتحان میں ڈال دیا اور ایک جدید العہد مصنف کے بقول ان پر پروپیگنڈے کی زبردست جنگ مسلط کردی[۱۵۰]۔ قریش کے لئے مشکل یہ تھی کہ اگر وہ قافلہ رسول کو بیت اللہ کی زیارت سے روکتے ہیں تو پورا عرب اسے دیکھ لے گا اور ہر ایک کہہ اُٹھے گا کہ یہ سراسر زیادتی ہے۔ اس سے ہر قبیلہ تشویش میں مبتلا ہو جائے گا کہ نہ معلوم اس کو کب حرمِ کعبہ کے داخلہ سے محروم کردیا جائے۔ اگر جنگ کرتے ہیں تب بھی یہ بات مشتہر ہوتی ہے کہ قریش نے ذی قعدہ کے حرام مہینہ کا احترام خاک میں ملا دیا جو صدیوں سے حج و زیارت کے لئے متبرک و محترم سمجھا جاتا ہے اور اگر رسول اللہ کو اتنے بڑے قافلے کے ساتھ شہرِ مکہ میں بخیریت داخل ہونے دیتے ہیں تو پورے ملک میں قریش کا رعب و دبدبہ ختم اور اس کی ہوا اکھڑ جائے گی۔ چنانچہ قریش کے اس ذہنی ردِ عمل اور کشمکش کی جھلک بعد کے واقعات میں صاف نظر آتی ہے۔ اسی کشمکش کی بنا پر ان کے زعماء کو کسی ایک نتیجہ پر پہنچنے اور آخری فیصلہ کرنے میں ہفتوں لگ گئے[۱۵۱]۔

مختصراً رسول اللہ کے اعلان پر ردِ عمل کی یہ مختلف لہریں تھیں جو مختلف سمتوں سے اُبھر رہی تھیں۔ ان حالات میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ کا عمرہ کے لئے روانگی کا اعلان غیر معمولی نوعیت کا تھا اور پھر بحالت احرام اور سر بکف ہو کر دشمن کے علاقے میں جانا رسول اللہ کی سیاسی و عسکری ذہانت، تدبر، معاملہ فہمی، دُور اندیشی، بے جگری، بے خوفی، قائدانہ بصیرت، ہمت و حوصلہ، دلسوزی و پرسوزی اور نگاہ بلند پر بہت بڑی شہادت فراہم کرتا ہے۔

تاریخی واقعات کے مطالعہ سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ کسی اندیشہ ہائے خام میں مبتلا نہیں تھے۔ بلا خوف و خطر آپ کی پیش قدمی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آپ کو قریش کی اصل حالت کا پوری طرح علم تھا اور آپ کی نگاہِ دور رس زمانے کی رفتار کو اچھی طرح جانچ رہی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دورانِ سفر عسفان کے مقام پر بشر ابن سفیان الکعبی[۱۵۲] ملا اور اس نے کہا:

"یا رسول اللہ! قریش آپ کی آمد کی اطلاع پا چکے ہیں۔ عورتوں بچوں سمیت نکل آئے ہیں۔ چیتے کی کھالوں میں

ملبوس ہیں۔ ذی طویٰ میں اپنے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ اور انہوں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ آپ کو ہرگز داخل نہ ہونے دیں گے۔ اور سواروں کے رسالے کو خالد بن ولید کی کمان میں کراع الغمیم کی طرف بھیج دیا ہے۔"(۱۵۳)

اور کتاب الخراج کی روایت کے مطابق اسی مقام پر بنی کعب کے چند افراد نے یہ اطلاع دی کہ:

"یا رسولؐ اللہ! ہم دیکھ کر آرہے ہیں کہ قریش نے اپنے احابیش کو جمع کر لیا ہے اور انہیں تحریر کھلا رہے ہیں۔ ان کا ارادہ یہ ہے کہ آپ کو بیت اللہ جانے سے روک دیں۔"(۱۵۴)

لیکن ان اطلاعات کی بنا پر نہ تو رسولؐ اللہ پر ایک لمحہ کے لئے بھی رعب طاری ہوا اور نہ آپ کے عزم میں فرق آیا بلکہ اس موقع پر آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ آپ کی بے باکی اور بے پناہ قائدانہ صلاحیت، جرأت اقدام اور مخالف کی نفسیاتی کیفیت کا پوری طرح اندازہ کر لینے کو ظاہر کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

یا ویح قریش لقد اکلتھم الحرب ماذا علیھم لو خلّوا بینی و بین سائر العرب ، فان ھم اصابونی کان ذٰلك الذی ارادوا ، وان اظھرنی اللہ علیھم دخلوا فی الاسلام وافرین ، وان لم یفعلوا قاتلوا وبھم قوۃ ، فما تظن قریش ، فواللہ لا ازال اجاھد علی الذی بعثنی اللہ بہ حتی یظھرہ اللہ او تنفرد ھذہ السالفہ۔(۱۵۵)

(قریش کا برا ہو (کہ راستہ روکتے ہیں!) جنگوں نے ان کا کچومر نکال دیا ہے۔ ان کا کیا حرج ہے کہ وہ بیچ میں سے ہٹ جائیں اور مجھے اور پورے عرب کو نمٹ لینے دیں۔ اگر عرب مجھے ختم کر دیں تو قریش کی مراد بر آئے گی اور اگر اللہ نے مجھے عربوں پر غلبہ عطا کر دیا تو ایسی صورت میں اگر قریش چاہیں تو جوق در جوق اسلام میں داخل ہو جائیں ورنہ وہ قوت رکھتے ہیں، اس وقت لڑ لیں (اور اگر یہ بھی پسند نہیں تو پھر) قریش میرے متعلق کس مغالطہ میں ہیں؟ خدا کی قسم میں اس حق کو لے کر جس کے ساتھ مجھے خدا نے مبعوث کیا ہے آخر دم تک لڑوں گا یہاں تک کہ یا تو اس حق کو خدا غالب کر دے یا میری گردن کٹ جائے)۔

آنحضرتؐ کے اس ارشاد کی تہہ میں اہل مکّہ کے لئے رحم و خیر خواہی کا ایک سیلِ رواں موجزن ہے۔ چاہے اس کی وجہ یہ ہو کہ مکّہ میں رسولؐ اللہ اور دیگر مسلمانوں کے اعزّہ و اقارب موجود تھے اور ان کے بارے میں یہ توقع ہو سکتی تھی کہ اپنی کج روی سے باز آجائیں یا دوسرے الفاظ میں اہل مکّہ کی تباہی سے زیادہ ان کا اسلام مفید ہو سکتا تھا اور ان کا اسلام اہلِ عرب پر بھی یقیناً اثر انداز ہو سکتا تھا۔ نیز خواہ اس کی وجہ اشہر حرم اور بیت اللہ کی حرمت و محبّت ہو، اور خواہ اس میں یہ حکمت ہو کہ اگر قریش دشمنی سے دست کش ہو جائیں تو دوسرے دشمنوں سے نمٹنا آسان ہو گا اور چاہے اپنے مقصد یعنی اعلائے کلمۃ الحق پر یقین کامل کا اظہار چاہتے ہوں۔ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ رسولؐ اللہ نے تمام اہم اور پیچیدہ معاملات کی عقدہ کشائی کے لئے جنگ کے بجائے امن کی راہ اختیار کی اس لئے اصولاً یہ ارشاد فرما دیا تھا کہ صلح آپ کو ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔(۱۵۶) نیت بھی عمرہ کی تھی (جس پر پورا عرب شاہد تھا) مسلح بھی نہ تھے، قریش سے فوری تصادم

سے بچنے کے لئے حدیبیہ پہنچنے کا راستہ بھی بدل دیا تھا۔[۱۵۷] حدیبیہ کے قریب اونٹنی کے بیٹھ جانے پر یہ مدعا ظاہر کیا تھا کہ آج اہلِ مکہ انسانیت کی بھلائی کے لئے مجھ سے جس شرط کا مطالبہ کریں گے میں اسے تسلیم کر لوں گا۔[۱۵۸] قریش کے سفراء (مثلاً عروہ بن مسعود) کی گستاخیوں پر بھی ضبط و تحمل سے کام لیا تھا۔[۱۵۹] یہاں تک کہ جب قریشِ مکہ کا ایک دستہ معسکرِ رسول کا چکر لگانے اور موقع ملنے پر کسی صحابی یا خود رسول اللہؐ پر ہاتھ صاف کر لینے کی ہدایت لے کر آیا بلکہ اس نے کچھ تیر برسائے اور سنگ باری بھی کی تھی تب بھی آپ نے ان کی یہ شرارت برداشت کر لی اور پھر صلح کی آخری کوشش کی علامت کے طور پر گرفتار ہونے والوں کو معاف کر کے آزاد کر دیا۔[۱۶۰] علاوہ ازیں اپنے سفیروں کو بھیج کر بھی قریش کو بار بار یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کا ارادہ قطعاً مسالمانہ ہے اور وہ جنگ کے ارادے سے یہاں نہیں آئے ہیں چنانچہ بدیل بن ورقاؓ نے قریش سے جا کر یہ کہا تھا کہ "تم لوگ عجلت سے کام لے رہے ہو محمد قتال کے لئے نہیں آتے، زیارت کے لئے آئے ہیں"۔[۱۶۱] اور حضرت عثمان کے ذریعہ جو پیغام یا خط[۱۶۲] رسول اللہؐ نے قریش کے نام بھیجا تھا اس سے بھی مقصود ان کی فہمائش تھی اور مدعا یہی تھا کہ آپ کی آمد جنگ کے لئے ہرگز نہیں ہے بلکہ خاص زیارتِ بیت اللہ کے لئے ہے۔[۱۶۳] اسی خواہش کا اظہار آپ بمقام عسفان بشر بن سفیان الکعبی[۱۶۴]، بدیل بن ورقاء[۱۶۵]، مکرز بن حفص[۱۶۶] اور عروہ بن مسعود ثقفی[۱۶۷] کے سامنے بھی فرما چکے تھے۔ تمام لوگوں سے ایک ہی قسم کی بات کہنے کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ رسول اللہؐ امن و عافیت کے سب سے زیادہ متمنی تھے اور اپنے مقصد زیارت کو بار بار موکد کر رہے تھے۔

بہر صورت رسول اللہؐ کی ان تمام صلح جویانہ تدابیر کے باوجود بھی جب قریش کی شر پسند طبیعت نے حضرت عثمان کو مکہ میں روک لیا اور یہ خبر مشہور ہو گئی کہ ان کو شہید کر دیا گیا ہے[۱۶۸] تو آپ کا پیمانۂ صبر چھلک اٹھا۔ اس خبر کو تسلیم کر لینے کی ایک معقول وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمان سے پہلے رسول اللہؐ نے اپنے ایک سفیر خراش بن امیہ الخزاعی کو قریش کے پاس بھیجا تھا تو ان کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا تھا کہ اشرافِ قریش نے ان کے اونٹ کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور خود خراش کے قتل کا بھی ارادہ کر لیا لیکن احابیش کی مداخلت سے ان کی جان بچ گئی اور وہ رسول اللہؐ کے پاس واپس آ گئے۔[۱۶۹] ظاہر ہے کہ جو لوگ ایک دفعہ اس قسم کی حرکت کر چکے تھے ان سے دوبارہ اسی قسم کا سلوک غیر متوقع نہ تھا۔ لہٰذا حضرت عثمان کی خبرِ شہادت ملتے ہی رسول اللہؐ نے اپنے صحابہ سے جان نثاری و جان سپاری کی وہ بیعت لی[۱۷۰] جو تاریخ میں "بیعت رضوان" کے نام سے مشہور ہے۔[۱۷۱] کیونکہ رسول اللہؐ کے سفیر کا قتل کر دیا جانا آدابِ سفارت کے لحاظ سے بھی ناقابلِ برداشت تھا اور غیرت و حمیت کے خلاف بھی اور آپ کو یہ حکم بھی مل چکا تھا کہ:

ولا تھنوا ولا تدعوا الی السلم وانتم الاعلون واللہ معکم۔[۱۷۲]

(اور کمزوری کا اظہار کرتے ہوئے صلح کی طرف نہ بلاؤ حالانکہ تم ہی سب سے بلند ہو اور اللہ تمہارے ساتھ ہے)

اس لئے اس موقع پہ کمزوری دکھانے کا مطلب سیاسی شکست سے کم نہ تھا اس لئے رسول اللہؐ نے لڑنے مرنے اور

اہلِ مکہ کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ اس کا تمام تر جواز قریش خود مہیا کر چکے تھے اور قرآن اس موقع پر رسولؐ اللہ کو حرمت پامال کرنے کی اجازت یہ کہہ کر دے چکا تھا کہ:

الشھر الحرام بالشھر الحرام والحرمات قصاص۔[۱۷۳]

(حرمت والا مہینہ، حرمت والے مہینے کے بدلہ میں ہے اور یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں)

مطلب یہ ہے کہ اشہر حرم کا احترام، احترام کے بدلہ میں ہے یعنی اگر کوئی تم سے ماہ محترم میں جنگ کرے تو تم بھی اس سے جنگ کرو کیونکہ جب اس نے اس کی حرمت کا خیال نہ کیا تو یہ تم پر بھی واجب نہیں ہے۔ اس جواز کے علاوہ قرآن اس بات کی بھی صراحت کر دیتا ہے کہ اگر اس وقت بالفعل جنگ واقع ہو جاتی تو رسولؐ اللہ اور مسلمانوں کو یقیناً فتح حاصل ہوتی اور اہلِ کفر کو ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہ ملتا۔ الفاظ یہ ہیں کہ:

ولو قاتلکم الذین کفروا لولّوا الادبار ثم لایجدون ولیاً ولا نصیرا۔[۱۷۴]

(اور اگر تم سے یہ کافر لڑتے تو ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے۔ پھر نہ ان کو کوئی دوست ملتا نہ مددگار)

بہت ممکن ہے کہ قریش نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر کو محض رسولؐ اللہ اور مسلمانوں کا ردِ عمل دیکھنے کے لئے اڑائی ہو یا اس کی وجہ کوئی اور ہو۔[۱۷۵] بہر صورت جب ان تک بیعتِ رضوان کی اطلاع پہنچی اور انہیں رسولؐ اللہ کے عزمِ صمیم کا پتہ چل گیا تو آخر کار وہ صلح پر آمادہ ہو گئے[۱۷۶] اور انھوں نے سہیل بن عمرو کو یہ اختیار دے کر بھیجا کہ:

ائت محمداً فصالحه ولایکن فی صلحه الا ان یرجع عنا عامه ھذا، فواللہ لا تحدث العرب عنا انه دخلھا علینا عنوةً ابداً۔[۱۷۷]

(تم محمد کے پاس جاؤ اور ان سے مصالحت کرو، لیکن یہ یاد رکھنا کہ یہ اس شرط کے بغیر نہ ہو کہ وہ اس سال یہاں سے واپس چلے جائیں ورنہ خدا کی قسم عرب باتیں بنائیں گے کہ وہ بزور داخل ہوئے تھے)

گویا اس موقع پر بھی قریش کوئی سیاسی یا حربی فائدہ حاصل نہ کر سکے اور ہر دو قسم کی کامیابی رسولؐ اللہ کے حصہ میں آئی اور اس طرح فریقین کے صلح پر آمادہ ہو جانے سے ایک فیصلہ کن جنگ ٹل گئی۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ قرآن نے یہ تصریح کی ہے کہ جنگ کی صورت میں اہلِ مکہ کا نقصان بہت زیادہ ہوتا لیکن خونریزی کی وجہ سے کفار کے علاوہ ان اہلِ ایمان کو بھی گزند پہنچنے کا احتمال تھا جنہوں نے اپنے ایمان و اسلام کو ظاہر نہیں کیا تھا۔[۱۷۸]

اب دوسرا اہم اور قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ ان شرائط و دفعات کا مطالعہ کیا جائے جو فریقین یعنی رسولؐ اللہ اور قریش کے وکیل سہیل بن عمرو کے درمیان طے پائیں۔ یہاں اصل عبارت یا متن کو نقل کرنے کے بجائے بہتر ہوگا کہ صلح نامہ حدیبیہ کی مرکزی دفعات کو مختلف مآخذ کی روشنی میں بیان کر دیا جائے۔ ان کو ہم اس طرح پیش کر سکتے ہیں:

(۱) اوّل یہ کہ —— (اس مرتبہ) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اہلِ مکہ نے جہاں (حدیبیہ میں) روک دیا ہے۔ وہ قربانی کے جانور وہیں حلال کر دیں۔ اور نہ تو مکہ میں داخل ہوں، نہ (خانہ کعبہ کا) طواف کریں۔[۱۷۹]

(۲) دوم یہ کہ —— فریقین نے اس بات پر صلح کر لی ہے کہ جنگ اس سال تک کے لئے روک دی جائے۔[۱۸۰] اور اس دوران لوگ امن و امان کی زندگی گزاریں۔ اور ایک دوسرے (پر اقدام) سے رُکے رہیں۔[۱۸۱]

(۳) سوم یہ کہ —— قریش میں سے جو آدمی اپنے ولی (یا سرپرست) کی اجازت کے بغیر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جائے گا تو وہ اسے واپس کر دیں گے۔ اور اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آدمیوں میں سے کوئی قریش کے پاس آ جائے تو وُہ اسے واپس نہیں کریں گے۔[۱۸۲]

(۴) چہارم یہ کہ —— باہم کینے ہر طرح بند رہیں گے۔ اور اس سلسلے میں نہ تو خفیہ بد عہدی ہوگی اور نہ کھلی خیانت کا ارتکاب کیا جائے گا۔

(۵) پنجم یہ کہ —— جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاہدہ اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہے، وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اور جو قریش کے معاہدے اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے وہ بھی ایسا کر سکے گا۔[۱۸۳]

(۶) ششم یہ کہ —— آپ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس سال واپس (مدینہ) چلے جائیں اور ہمارے یہاں مکہ میں نہ داخل ہوں۔ ہاں آئندہ سال آئیں گے تو ہم آپ کے لئے (مکہ سے) نکل کر باہر چلے جائیں گے۔ پھر آپ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مکہ میں داخل ہوں اور تین دن قیام کر لیں۔ اور اس وقت آپ کے پاس صرف ایک مسافر کا ہتھیار یعنی تلوار ہونی چاہیے اور وُہ بھی نیام میں ہو۔ دُوسری صورت میں داخلہ ممکن نہ ہوگا۔[۱۸۵]

(۷) ہفتم یہ کہ —— (مسلمانوں میں سے) جو کوئی حج یا عمرہ کے ارادے سے یا یمن یا طائف جاتے ہُوئے مکہ سے گزرے تو اسے امان حاصل ہوگا۔ اور مشرکوں میں سے جو کوئی شام یا مشرق (عراق) جانا چاہے گا تو اسے بھی امان حاصل ہوگا۔[۱۸۶]

مندرجہ بالا دفعات کے ظاہری اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش نے اپنی ضد پُوری کر لی اور وُہ اپنے منصوبے کے مطابق رسول اللہؐ کو حرمِ کعبہ میں داخل ہونے سے روکنے میں بھی کامیاب ہو گئے نیز اپنے اصرار کے بموجب انہوں نے معاہدہ کے متن سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور محمد رسول اللہ حذف کرا کے بالترتیب باسمک اللّٰھم اور محمد بن عبد اللہ لکھوا لیا۔[۱۸۷] اور دوسری دفعات بھی حسبِ منشا مرتب ہوئیں۔ اپنی دانست میں انہوں نے اسے بڑی کامیابی خیال کیا اور شرائطِ صلح کی معنویت اور اطلاقات پر غالباً وہ اس لئے غور نہ کر سکے کہ جذباتی طور پر مغلوب تھے اور شاید ابو سفیانؓ[۱۸۸] اور دوسرے زعماء کی باہم مشورت میں بھی صرف اسی رُخ پر گفتگو ہُوئی کہ کسی طرح رسول اللہؐ اور مسلمانوں کو حرم میں داخلہ سے روک دیا جائے کیونکہ "پُورے عرب کی نگاہوں میں رُسوا ہونے سے وہ اسی صورت میں بچ سکتے تھے"۔[۱۸۹] شرائطِ صلح کی ترتیب و تبویب کے وقت مسلمانوں میں سے بھی بعض افراد نے اسے قبول کرنے میں سخت تامل کیا کیونکہ اس کا مضمون غیرتِ ایمانی کے خلاف نظر

آتا تھا اور حضرت ابُوجندل کا واقعہ بطور پس منظر موجود تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس کا اظہار بھی بڑی بے باکی سے کر دیا تھا۔[۱۹۰] لیکن رسولؐ اللہ کی طرف سے جواب یہ تھا کہ:

انا عبد اللہ و رسولہ لن اخالف امرہ و لن یضیعنی۔[۱۹۱]

(میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہُوں۔ میں اس کے حکم کی خلاف ورزی کسی حال میں نہیں کر سکتا۔ اور نہ وہ کسی صورت میں مجھے ضائع ہونے دے گا)

آپ کا یہ جواب صرف وقتی تسلی و تشفی کے لئے یا واجبی نہ تھا بلکہ بعد میں ہونے والے واقعات اور تاریخ نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ اللہ کے رسول اور اس کے بندے نے جس دُور اندیشی سے بازی کو پلٹ دیا وہ بلاشبہ سیاستِ نبویؐ کا بہت بڑا اعجاز ہے چنانچہ حدیبیہ سے مدینہ کی جانب رُخ موڑا ہی تھا[۱۹۲] کہ وحیِ الٰہی نے یہ مژدہ سنا دیا کہ:

انا فتحنا لک فتحاً مبینا۔[۱۹۳]

ابنِ سعد نے بروایت مجاہد ان الفاظِ خداوندی کو "انا قضینا لک قضاءً مبینا"[۱۹۴] کے مترادف قرار دے کر بجا طور پر مدعا کو واضح کر دیا ہے۔ یعنی ہم نے آپ کے لئے کھلا ہوا فیصلہ کر دیا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس میں قریش کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا اور یہ فیصلہ ہو گیا کہ پرچمِ فتح اب صرف مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے گا۔ براُ ابن عازب کا یہ قول کتنی تاریخی صداقت کا حامل ہے کہ جس کو لوگ فتح مکہ کہتے ہیں ہم تو اسے یوم الحدیبیہ (بیعت الرضوان) کہتے ہیں۔[۱۹۵] (کیونکہ یہی باعث فتح مکہ ہے) اور پھر ایسا ہی ہُوا کہ مسلمان مسلسل پیشقدمی کرتے رہے اور ریاست نبویؐ کے حدود میں بھی انتہائی تیز رفتاری سے اضافہ ہوتا چلا گیا۔

صلح نامہ حدیبیہ کی مذکورہ دفعات میں سے اس دفعہ کو جس میں جنگ کو ایک خاص مدت کے لئے ملتوی کرنے پر اتفاق رائے ہوا، سرسری انداز سے لینا مناسب نہیں۔ اس دفعہ کی رُو سے مسلمانوں کا صلح پر راضی ہو جانا تو بالکل منطقی ہے کیونکہ اس طرح وہ دو مخالف سمتوں میں اپنے طاقتور دشمنوں میں سے ایک کو خاموش کر کے دوسری جانب پُوری توجہ دے سکتے تھے اور واقعہ بھی یہی ہُوا کہ صلح حدیبیہ کے ذریعہ قریش کی تلوار نیام میں چلی گئی تو اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر رسولؐ اللہ نے مدینہ کے شورش پسند غداروں کی سرکوبی کی اور شمال میں یہود کو سرنگوں کر کے ان کے یکے بعد دیگرے تمام مراکز توڑ ڈالے اور ساتھ ہی ساتھ متفرق قبائل کی شوریدہ سری کا بھی خاتمہ کر دیا۔ ان تمام کاموں کے لئے یکسوئی اور وقت کی ضرورت تھی جسے صلح حدیبیہ سے التوائے جنگ کی صورت میں رسولؐ اللہ کو مل گیا۔

البتہ قابلِ غور امر یہ ہے کہ قریش نے اس صلح کو اور ایک خاص مدت تک اپنے سب سے بڑے حریف کو آزاد چھوڑنا کیوں گوارا کر لیا؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قریش سے صلح مسلمانوں کی ایک بڑی ضرورت تھی اسی طرح رسولؐ اللہ سے صلح قریش کی سب سے بڑی ضرورت تھی کیونکہ اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ قریش کی عسکری اور فوجی طاقت کو ناقابلِ اندمال چرکے لگ چکے تھے۔ معیشت کا دامن بُری طرح پارہ پارہ تھا۔ ریاست نبویؐ کی طرف سے تجارتی راستوں پر دباؤ ناقابلِ برداشت حد تک بڑھتا چلا جا رہا تھا۔[۱۹۶] قریش کی معاونت کرنے والے قبائل بھی ریاستِ نبویؐ کے خلاف

منفی کارروائیوں میں ناکام ہو چکے تھے۔ مسلمان اپنی حربی و سیاسی برتری کا ثبوت متعدد بار دے چکے تھے۔ شاید اسی لئے قریش کے سب سے زیادہ با اثر سردار ابوسفیان نے جھنجھلا کر خود رسولؐ اللہ پر اوچھا وار کرنا چاہا اور واقعہ حدیبیہ سے ذرا پہلے ایک آدمی کو لالچ دے کر آنحضرت کو قتل کرنے کے لئے بھیجا لیکن وہ اپنے ارادہ میں ناکام رہا اور پھر رسولؐ اللہ کی طرف سے عمرو بن امیۃ الضمری کے ذریعہ جوابی کارروائی[۱۹۷] نے ابوسفیان کی غلط فہمیوں کو دُور کر دیا تھا۔

علاوہ بریں رسولؐ اللہ کی اب تک کی تگ و تاز میں مشرکین، یہود، منافقین اور متربصین غرض سبھی یہ سمجھ چکے تھے کہ ریاست نبوی کی نوخیز طاقت کو محض ہتھیاروں اور فوجوں کے بل پر شکست نہیں دی جا سکتی اور اس واقعہ حدیبیہ کے سلسلے میں بھی قریش رسولؐ اللہ کی پامردی اور مسلمانوں کا عزم و استقلال متعدد پہلوؤں سے جانچ چکے تھے۔ مثلاً جب خالد بن ولید کی سرکردگی میں کفارِ مکّہ کے مقدمۃ الجیش کا رسولؐ اللہ سے آمنا سامنا ہوا تو رسولؐ اللہ کی طرف سے مقابلہ کے لئے عباد بن بشر کی کمان میں بیس سواروں کا ہراول دستہ بھی پوری طرح مستعد تھا[۱۹۸] اور وقتِ ضرورت کے لئے بقول طبری مخزن بھی رسول اللہ کے ساتھ تھا۔[۱۹۹] مسلمانوں کے جوش و جذبہ کا عالم یہ تھا کہ جب حدیبیہ آتے ہوئے ایک مقام پر رسولؐ اللہ نے خطاب کر کے مشورہ طلب کیا اور یہ کہا کہ :

"تم لوگ مجھے مشورہ دو کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ تمہاری رائے میں ہمیں سیدھے مکّہ کی طرف بڑھنا چاہیے یا ان لوگوں کی طرف چلیں جو ان کی مدد کر رہے ہیں اور ان کی پیٹھ پیچھے ان کی عورتوں اور بچّوں کو جا لیں۔ پھر اگر یہ (مکّہ میں) بیٹھے رہ جاتے ہیں تو شکست خوردہ ہو کر بیٹھیں گے اور انتقام لیا جا چکا ہوگا۔ اور اگر ہمارا پیچھا کرتے ہیں تو کمزور ہو کر پیچھا کریں گے اور اللہ انھیں ذلیل کر دکھائے گا۔"[۲۰۰]

اس پر کسی آدمی نے بھی اپنا قدم پیچھے نہیں ہٹایا اور عزیمت کا انتہائی مظاہرہ کرتے ہوئے رسولؐ اللہ سے یہ عرض کیا کہ :

"یا رسولؐ اللہ ! ہماری رائے یہ ہے کہ سیدھے اہلِ مکّہ کی طرف چلیں کیونکہ اللہ ضرور آپ کی مدد کرے گا، معاونت فرمائے گا اور آپ کو غلبہ عطا کرے گا۔"

اور مقداد نے کہا کہ خدا کی قسم ہم آپ سے وہ بات نہیں کہیں گے جو بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہی تھی کہ اذھب انت وربك فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون۔"[۲۰۱]

اس گفتگو کے پیشِ نظر ہر شخص کی طرح قریش نے بھی اندازہ کر لیا کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار افراد کا یہ عزم و حوصلہ، صبر و ثبات اور اپنی فتح پر یقینِ کامل کیا معنی رکھتا ہے۔ پھر قریش عین موقع پر ایک اور مشکل میں گرفتار ہو گئے یعنی اس روز احابیش[۲۰۲] (مختلف قبائل کے لشکروں) کے سردار حلیس بن علقمہ نے قریش کی طرف سے بے جا ضد اور اپنے سامنے ہدی و شعائر اللہ کی بے حرمتی دیکھی تو وہ عالمِ طیش میں قریش پر برس پڑا اور یہ کہہ کر دست کش ہو گیا کہ :

یا معشر قریش ! واللہ ما علی ھذا حالفناکم ولا علی ھذا عاقدناکم ایصد عن بیت اللہ من

جاء معظماً له - والذی نفس الحلیس بیده لتخلن بین محمد و بین ما جاء له ، أو لأنفرن بالاحابیش نفرۃ رجل واحد "[۲۰۳]

(اے قریش کے لوگو! خدا کی قسم اس بات پر ہم تم ایک دوسرے کے حلیف نہیں بنے تھے اور نہ اس بات پر ہمارا تمہارا معاہدہ ہوا تھا کہ جو شخص زیارتِ بیت اللہ اور اس کی عزت و تکریم کی غرض سے آیا ہو اسے روکا جائے گا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں حلیس کی جان ہے! یا تو محمد جس مقصد سے آئے ہیں انھیں پُورا کرنے دو یا میں تمام حبشیوں کو لے کر ایک ساتھ الگ ہو جاتا ہُوں)

قریش نے اس کا غصہ دیکھ کر اس سے درخواست کی کہ :

"مہ کف عنا یا حلیس حتی ناخذ لأنفسنا ما نرضیٰ۔"[۲۰۴]

(ذرا ٹھہرو ہمیں اتنی مہلت تو دے دو کہ ہم اپنے لئے کوئی ایسی بات تو طے کر لیں جس پر ہم سب راضی ہوں)

ان الفاظ سے قریش کی کمزوری صاف جھلک رہی ہے احابیش عسکری اعتبار سے ان کا بہت بڑا سرمایہ تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ جن اخلاقی وجوہ سے حلیس نے قریش سے تعاون نہ کیا وہی وجوہ قریش کے دوسرے اعیان و انصار کے لئے بھی عدمِ تعاون کا سبب بنے۔ نیز حدیبیہ میں قیام کے دوران رسول اللہؐ نے ہر معاملہ میں جس صبر و وقار، بر و تقویٰ، عفو و درگذر، ایفائے عہد کا ثبوت دیا اور ایک رسول کے شایانِ شان طرزِ عمل اختیار کیا تھا[۲۰۵] اور اس کے برعکس قریشیوں کی طرف سے حمیت و جاہلیۃ کا جو مظاہرہ ہُوا[۲۰۶] اس نے دوست و دشمن سب کے قلوب کو مسخر کرنے میں اہم حصّہ لیا اس قسم کے حوصلہ شکن حالات میں ظاہر ہے قریش کے پاس نہ تو مادی وسائل اتنے وافر تھے کہ وہ مسلمانوں سے لڑ سکیں اور نہ اخلاقی قوت ان کے پاس تھی اور نہ ہی ان کا موقف معیارِ صداقت پر پورا اترتا تھا ان اسباب نے جنگ کے بجائے قریش کو صلح کے لئے مجبور کر دیا، نیز مدتِ صلح متعین ہو جانے سے قریش کو آئندہ کی جنگ کے لئے زیادہ تیاریوں کا موقع بھی مل رہا تھا۔

صلح نامہ حدیبیہ کی بعض دفعات کو قریش اپنے لئے خاص طور پر مفید سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ یہ دفعات رسول اللہؐ کے لئے ضرور پریشان کن ثابت ہوں گی۔ مگر واقعہ اس کے برعکس ہُوا۔ معاہدہ حدیبیہ نے دونوں مصافی جماعتوں کو دم لینے کی فرصت دے دی اور اس کا تمام فائدہ آنحضرتؐ کو پہنچا۔ یہ صلح قریب دو سال تک قائم رہی اور اس دوران میں اہلِ مکہ کے لئے پیہم ناکامیوں اور مسلسل ذلتوں کا باعث ہوئی۔ وُہ شرط جس کی رُو سے محمد نے یہ عہد کر لیا تھا کہ مکہ کے آدمیوں کو ان کے پاس واپس کر دیا جائے گا اور جو بالکل قریش کے حق میں تھی تمام توقعات کے خلاف ان کے لئے باعثِ نقصان ثابت ہُوئی اور بالآخر انھیں خود بھی درخواست کرنی پڑی کہ اس شرط کو بدل دیا جائے۔[۲۰۷] اس کا سب سے بڑا محرک ابوبصیر کا واقعہ تھا۔[۲۰۸]

شرائطِ معاہدہ کی رُو سے ہی خزاعہ نے آنحضرتؐ سے اور بنوبکر نے قریش سے علی الاعلان الحاق کر لیا تھا۔[۲۰۹]

فریقین پر قرارداد کا احترام اور امانت و دیانت برتنا لازم تھا۔ لیکن قریش نے اس کو بھی پامال کر ڈالا، خیانت کے مرتکب ہوئے اور بغیر کسی جواز کے بنوخزاعہ پر حملہ میں بنوبکر کی آدمیوں اور اسلحہ دونوں سے مدد بھی کی۔[۲۱۰] اس طرح شرائط مذکورہ کی صریح خلاف ورزی بالآخر صلح نامہ حدیبیہ کے خاتمہ کا باعث ہوئی۔ رسول اللہؐ کو ان شرائط سے اس لئے کوئی تشویش لاحق نہیں ہوئی کہ آپ کے پاس سے قریش کی طرف جانے کی کوشش صرف وہی شخص کر سکتا تھا جسے اسلام ناپسند ہو ورنہ ایک مسلمان جیتے جی یہ گوارا نہ کر سکتا تھا۔[۲۱۱]

ان شرائط کا قریش پر ایک الٹا اثر یہ بھی ہُوا کہ ایک عرصہ کی کشیدگی اور سلسلہ جنگ و جدال نے کفار اور مسلمانوں کے باہمی میل جول کا سلسلہ منقطع کر رکھا تھا۔ ان شرائط نے آتشِ مبارزت کو فرد کیا تو مخالفین و مشرکینِ مکہ نے مدینہ آنا جانا شروع کر دیا۔ اس یک طرفہ آمدورفت سے کفار و مشرکین کی غلط فہمیاں دُور ہوئیں۔ انھیں مسلمانوں اور اسلام کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعوری اور غیر شعوری دونوں طریقوں پر اسلام نے ان کے دلوں کو فتح کرنا شروع کر دیا۔ مشہور بات ہے کہ حدیبیہ کے بعد سے فتح مکہ کے عرصہ میں اسلام کی اشاعت اتنی تیزی سے ہُوئی کہ اس سے قبل ۱۹ سال میں بھی اتنی نہ ہوئی تھی۔

دفعہ ہفتم کی ضرورت بھی فی الحقیقت قریش کو ہی تھی۔ ان کے تجارتی روابط شمال کے تمام علاقوں خصوصاً شام سے کم و بیش منقطع ہو چکے تھے اور معاشی طور پر وہ اتنے بے بس ہو گئے تھے جتنے بے بس وہ عسکری شکست سے بھی نہ ہوئے تھے، گویا اس شق کو انہوں نے اپنی قومی ضرورت اور تجارتی آمدورفت کے پیشِ نظر شامل کیا تھا۔ جنگوں کے پیہم سلسلے نے پہلے ہی قریش کی ہمتیں پست کر رکھی تھیں اور ان میں ان کے جان و مال کا بے حد اتلاف ہو چکا تھا۔ نیز رسول اللہؐ کی طرف سے اقتصادی ناکہ بندی نے ان کو جس صورتِ حال سے دوچار کر دیا تھا ان کی ساری توجہ اسی صورتِ حال کو بہتری سے بدلنے کی طرف تھی۔ اس لئے اس شرط سے یہ مقصد انہوں نے حاصل کرنا مناسب سمجھا اور مسلمانوں کے لئے اس میں دعوتی نقطہ نظر سے یہ گنجائش پیدا ہو گئی کہ وُہ جنوب کے علاقوں میں اپنی سرگرمیاں جاری کر سکیں۔ اس کا قرینہ یہ بھی تھا کہ اس زمانہ میں شاہِ ایران شہر براز نے رومیوں سے شکست کھائی اور قرآن میں مذکور الٓمّ غلبت الروم کی پیشگوئی[۲۱۲] پوری ہو گئی۔ اس کا نتیجہ اور کچھ نہ سہی تو یہ بہر حال ہوا کہ بقول ڈاکٹر حمید اللہ "لاوارث ایرانی صوبے یمن، بحرین، عمان کے متعلق حسبِ دلخواہ کارروائی کرنے کا ایک خداداد موقع ہاتھ آ گیا۔"[۲۱۳]

صلح نامہ حدیبیہ کی اہم دفعات و شرائط اور اس کے بعض اثرات کا جائزہ لینے کے بعد اب آخر میں ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ صلح حدیبیہ سے سیاست پر کیا اثرات مرتب ہوئے اور ریاستِ نبویؐ کے لئے توسیع و ترقی کی راہ کس حد تک ہموار ہوئی۔ چنانچہ اس سلسلے میں چند نکات قابلِ ذکر ہیں:

(۱) صلح نامہ حدیبیہ کا ایک اصولی اور بنیادی نتیجہ یہ نکلا جیسا کہ ایک جگہ مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ:[۲۱۴] "اس میں پہلی مرتبہ اسلامی ریاست کا وجود باقاعدہ تسلیم کیا گیا۔ اس سے پہلے تک عربوں کی نگاہ میں حضور کی حیثیت محض قریش اور قبائل عرب کے خلاف خروج کرنے والے ایک گروہ کی تھی اور وہ آپ کو برادری باہر (OUT LAW) سمجھتے تھے۔[۲۱۵] اب خود قریش ہی نے آپ سے معاہدہ کر کے سلطنت اسلامی کے مقبوضات پر آپ کا اقتدار مان لیا اور قبائل عرب کے لئے

یہ دروازہ بھی کھول دیا کہ ان دونوں سیاسی طاقتوں میں سے جس کے ساتھ چاہیں حلیفانہ معاہدات کر لیں۔"[۲۱۶]

(۲) صلح نامہ حدیبیہ میں قریش نے مسلمانوں کے لئے بیت اللہ کا راستہ روک کر ایک فاش سیاسی غلطی کی تھی۔ اس کی وجہ سے رائے عامہ مسلمانوں کے حق میں ہموار ہو گئی اور بہت سے قبائل مسلمانوں کی طرف جھک گئے اور قریش کے قرب و جوار کا علاقہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان تمام چیزوں نے بعد میں عملی طور پر فتح مکہ کو آسان بنا دیا۔[۲۱۷] صلح حدیبیہ پر بحث کے بعد اب ہم پھر اس بات کی تمہید کے مطابق اس دور توسیع میں تیسرے پہلو کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

صلح حدیبیہ سے رسولؐ اللہ کو اپنی اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کا موقع میسر آگیا کہ مخالف طاقتوں کو پہلے درجہ میں تو متحد ہی نہ ہونے دیا جائے اور پھر دوسرے درجہ میں علیحدہ علیحدہ بننے والی سیاسی اکائیوں کو سرنگوں کر دیا جائے۔ صلح حدیبیہ نے ریاست نبوی کے دو زبردست مخالف یعنی قریشِ مکہ اور یہودی حلیفوں کے مابین تفریق کر دی۔ اب یہ بات طے تھی کہ یہود کی جانب پیش قدمی کی صورت میں نہ تو قریش ان کی مدد کر سکیں گے اور نہ ان سے دار الحکومت مدینہ کو خطرہ لاحق ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے باعث جنوب کی طرف سے اطمینان حاصل ہو جانے کے بعد رسولؐ اللہ نے شمالی عرب اور وسط عرب کی تمام مخالف طاقتوں کو بآسانی مسخر کر لیا۔

چنانچہ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے صلح حدیبیہ پر بمشکل ڈیڑھ ماہ ہی گزرا تھا[۲۱۸] کہ رسولؐ اللہ نے یہودیوں کے سب سے بڑے مستحکم اور مضبوط مرکز[۲۱۹] خیبر کو فتح کر لیا۔ بہت ممکن تھا کہ خیبر کو مزید مہلت مل جاتی مگر ایک طرف تو مدینہ کے منافقین، اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے دوسری طرف اس سے یہود کی ہمت بڑھی تو انہوں نے ایک سفارت کے ذریعہ بنی غطفان سے مدد و تعاون کی درخواست کی جسے فوراً قبول کر لیا گیا تھا۔[۲۲۰] اس طرح ان تین گروہوں (منافقین، یہود اور قبائل عرب) کی مشترکہ سازش سے مدینہ پر حملہ کا منصوبہ بن گیا لیکن اس سے قبل کہ وہ شرمندۂ تکمیل ہوتا رسولؐ اللہ یہودِ خیبر کی سرکوبی کے لئے بغیر کسی توقف کے روانہ ہو گئے کیونکہ جارحیت کو روکنے کے لئے اس قسم کے اقدامات کرنا کسی بھی ضابطۂ قانون و اخلاق کی رو سے ممنوع نہیں اور آپ کی تو شروع سے یہ حکمتِ عملی رہی ہے کہ دشمن کو اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی کچل دیا جائے۔

چنانچہ خیبر کے لئے رسولؐ اللہ محرم کی آخری تاریخوں میں[۲۲۱] چودہ سو مومنین کی جماعت لے کر نکلے[۲۲۲] اور منزلِ مقصود سے پہلے مصلحتاً غطفان و خیبر کے درمیان واقع ایک میدان رجیع میں قیام کیا۔ تاکہ یہود خیبر کے درمیان حائل ہو کر خیبر کے لئے مدد و کمک کا راستہ روک دیں۔[۲۲۳] چنانچہ اہلِ غطفان رسولؐ اللہ کی آمد پر یہود کی مدد کے لئے نکلے بھی تھے لیکن ایک منزل سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ کر سکے۔[۲۲۴] ایک تو اس لئے کہ انہیں یہ اطلاعات مل تھیں کہ خود ان کی آبادی خطرہ میں ہے[۲۲۵] اور دوسرے رسولؐ اللہ کا رجیع میں قیام ان کے آگے جانے میں مزاحم تھا۔ بہرحال آنحضرتؐ کا جنگی منصوبہ نتیجہ خیز رہا۔ یعنی آپ دشمنوں کے اتحاد اور ان کی کمک کا راستہ روکنے میں کامیاب ہو گئے اس کے بعد خیبر کی مہم سر کرنے میں تقریباً دو ماہ صرف ہوئے۔ لڑائی کا سلسلہ اوائل صفر سے ربیع الثانی کے آخر تک جاری رہا لیکن بالآخر فتح مسلمانوں کو حاصل ہوئی[۲۲۶] اور اس طرح یہود کا سنگین خطرہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ خیبر کی فتح کے ساتھ ہی سورہ فتح کے مطابق فتح قریب[۲۲۷]

مغانم کثیرہ[۲۲۸] اور غنائم اخروی[۲۲۹] کا وعدۂ خداوندی بھی پورا ہوا۔

فتح خیبر نے بعض دوسری فتوحات کو جنم دیا۔ مثلاً خیبر کے انجام کی اطلاع قریب کی یہودی آبادی "فدک" پہنچی تو وہاں کے لوگوں نے بغیر لڑے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی نصف اراضی پیش کر کے صلح کر لی[۲۳۰] البتہ وادی القریٰ کے یہودیوں نے تھوڑی سی مزاحمت کی لیکن جلد ہی ہتھیار ڈال دیئے اور ان ہی شرائط پر صلح کر لی جن پر خیبر والوں نے کی تھی اور جزیہ دینا منظور کر لیا[۲۳۱] اسی سے متصل تیماء کا یہودی مرکز بھی جمادی الثانی ۷ھ میں ٹوٹ گیا اور اس طرح یکے بعد دیگرے یہ تمام بستیاں ریاستِ نبویؐ کے زیرِ نگیں آگئیں۔

یہودیوں کے مفتوح ہو جانے سے عرب کی سیاسی صورتِ حال میں واضح تغیر رونما ہوا۔ اسلامی ریاست کے دشمنوں میں سے ایک دشمن کا بالکل استیصال ہو گیا جو دراصل دوسرے تمام دشمنوں مثلاً قبائل عرب خصوصاً غطفان اور قریش وغیرہ کی نہ صرف پشت پناہی کرتا تھا بلکہ ان کو آمادۂ فساد بھی کرتا تھا۔ اور ان سب کے اتحاد سے خطرناک صورت پیدا ہو جاتی تھی لیکن اب ایک طرف تو قریشِ مکہ اور یہود نیز دیگر قبائل کا جنگی اتحاد صلح حدیبیہ کی بنا پر ٹوٹ چکا تھا۔ اور دوسری طرف خیبر کے مغلوب ہو جانے سے قبائلِ عرب بھی بے یار و مددگار رہ گئے۔ اس طرح قریشِ مکہ کا ایک انتہائی اہم بازو ٹوٹ گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ علاقہ جو یہود اور قریش کا منطقہ اثر تھا اسلام کی سیاسی اور حربی برتری سے مرعوب و متاثر ہو گیا اور ان قبائل کے ذہن و فکر تک اسلام کی رسائی ہو گئی جو اب تک اس روشنی سے محروم تھے۔

اس بیان کی تائید تاریخی طور پر اس طرح سامنے آتی ہے کہ جب قریش نے بنی خزاعہ پر حملے میں بنی بکر کی مدد کر کے حدیبیہ کے معاہدہ کو پامال کر دیا[۲۳۲] جس پر قریش کو خود بھی بہت ندامت تھی[۲۳۳] تو رسول اللہؐ نے دس ہزار آدمیوں کا لشکرِ جرار لے کر رمضان ۸ھ میں ان کی جانب کوچ کیا[۲۳۴] اسلامی لشکر کی اتنی بڑی تعداد بجائے خود اس پر دلالت کرتی ہے کہ عرب کے دیگر قبائل نے معاونت و شرکت کی اور قدیم و جدید تاریخی مآخذ میں بھی اس کی تصریح ہے کہ اس لشکر میں قبیلہ سلیم، مزینہ، غفار، اسلم کے بالترتیب ایک ہزار، ایک ہزار، چار سو اور چار سو آدمی اور اسد، تمیم، اشجع اور جہینہ کے بھی کافی افراد شریک تھے۔[۲۳۵] اس کا مطلب یہ ہے کہ عرب کے وہ قبائل جو صلح حدیبیہ سے پہلے عموماً اور غزوۂ خیبر سے پہلے خصوصاً ریاستِ نبویؐ کے خلاف محاذ آرا تھے۔ صلح حدیبیہ اور فتح خیبر کے بعد اس کے معین و مددگار بن گئے گویا صلح حدیبیہ کے بعد اشاعتِ اسلام کی تحریک نے جیسا کہ پہلے کہا گیا روز افزوں ترقی کی اور بے شمار افراد حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ اس بنا پر نہ تو یہ امر تعجب خیز ہے کہ مکہ کی پیش قدمی میں دس ہزار افراد کیسے شریک ہو گئے جبکہ اس سے پہلے اسلامی لشکر نسبتاً بہت مختصر ہوتا ہے اور نہ اس پر حیرت کی کوئی وجہ ہے کہ اتنی بڑی فوج کے ساتھ مدینہ سے مکہ تک کا طویل سفر اس خاموشی اور رازداری کے ساتھ کیسے کیا گیا کہ قریش کو خبر نہ ہو سکی اور نہ قریش کے ممد و معاون قبائل ان کی مدد کو پہنچ سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہؐ راستہ میں پڑنے والے کم و بیش تمام قبائل کو یا تو اپنا ہمنوا بنا چکے تھے یا آپ نے غیر جانبدار رہنے پر ان کو راضی کر لیا تھا۔ نیز پیش قدمی میں آپ نے ایسی رازداری برتی تھی کہ دشمن بے خبر تھا۔ پھر یہود خیبر، ان کی ہمسایہ بستیاں اور قبائل کی ایک بڑی تعداد مغلوب

ہو چکی تھی اس لئے قریشِ مکہ تنہا رہ گئے اور تنہا رہ کر قریش یا عرب کی کسی بھی طاقت کے لئے ریاست نبویؐ سے ٹکرانے کا حوصلہ نہ تھا اس لئے رمضان ۸ھ میں مکہ بڑی آسانی سے فتح کر لیا گیا۔(۲۳۶)

ایک ایسے شہر کی فتح عمل میں آئی جس کی آغوش میں رسول اللہؐ اور ریاستِ نبویؐ کی دشمنی پروان چڑھی، جو آٹھ سال تک مدینہ کے خلاف محاذ آرائی کا مرکز رہا اور جس کے باشندوں نے جسم و جان کی ساری صلاحیتیں، اپنا مال و متاع اور اپنے مادی وسائل عداوتِ خدا و رسول کے لئے وقف کر رکھے تھے۔ اس کی فتح اس امن و سلامتی کے ساتھ ہو جاتی ہے کہ نہ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوتا ہے نہ گھروں کو نذرِ آتش کیا جاتا ہے اور نہ آبروئیں لُوٹی جاتی ہیں۔ رسول اللہؐ کی اس فیاضی اور رواداری کو دنیا کی تاریخ فتوحات میں یقیناً ایک گرانقدر اضافہ قرار دیا جائے گا۔

ان تفصیلات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قریش کی طرف سے عہد شکنی کے باوجود رسول اللہؐ نے صلح حدیبیہ کی معنویت یعنی "امن و سلامتی" کو فتح مکہ کے موقع پر بھی برقرار رکھا اور اس طرح صلح حدیبیہ میں جس فتح مبین کا اعلان ہوا تھا اس کی تعبیر "فتح مکہ" کی صورت میں سامنے آگئی۔ گویا "صلح حدیبیہ" نے دو ہی سال کے اندر عرب میں طاقت کا توازن اتنا بدل دیا کہ قریش اور مشرکین کی طاقت دب کر رہ گئی اور اسلام کا غلبہ یقینی ہو گیا۔

مندرجہ بالا مباحث کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کا واقعہ سیاستِ نبویؐ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا جس نے سہ طرفہ مقاصد کو حاصل کرنے میں ریاست کی مساعدت کی۔ اس کے ذریعہ پہلے درجہ میں قریش کو خاموش کرنے اور دوسرے درجہ میں ان کی طاقت حتمی طور پر ختم کرنے میں مدد ملی، دوسری طرف یہود کے متعدد اہم مراکز زیرِ نگین کرنے کے مواقع اسی صلح نے فراہم کئے اور پھر اسی صلح کے باعث قبائل عرب کی ایک بڑی تعداد ریاست نبویؐ کی مطیع و فرمانبردار بن گئی اور انہوں نے رسول اللہؐ کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کر لیا۔

زیرِ نظر مباحث کی تمہید میں ہم نے قبائل عرب کی جس طاقت کا ذکر کیا تھا اس کی کیفیت اس کے بارے میں ریاست نبوی کے رویہ پر متعدد مقامات پر بحث آ چکی ہے لیکن آگے بڑھنے سے پہلے قبائلِ عرب کے بارے میں چند مزید وضاحتیں بے محل نہ ہوں گی۔

عام قبائل عرب (علاوہ یہود و قریش) کے بارے میں رسول اللہؐ کی حکمتِ عملی بنیادی طور پر یہ تھی کہ قبائل سے بگاڑ مول لینے کے بجائے صلح کے ذریعہ کام نکالا جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہؐ طبعاً صلح جو، امن پسند تھے اور آپ جس دین یعنی اسلام کو لے کر آئے تھے اس کا لفظی معنوی اور عملی تقاضا بھی یہی تھا کہ تمام معاملات میں امن و سلامتی کی راہ اختیار کی جائے۔ رسول اللہؐ نے بے فائدہ جنگ و جدال سے سروکار نہیں رکھا اور نہ دشمن کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے نیچا دکھانا آپ کا مقصود تھا۔ آپ اس کے علاقے پر تسلط جمانا اور دنیوی حکمرانوں کی طرح قوت و طاقت اور شان و شوکت کا اندھا دھند یا غیر ضروری مظاہرہ بھی پسند نہ کرتے تھے۔ اس کے برعکس دشمن سے اس کی کمزوری کی حالت میں رحمت و شفقت کا سلوک کر کے ہدایت کا سامان بہم پہنچانا اور احسان کی روش اختیار کرنا آپ کا معمول تھا۔ غرض رسول اللہؐ کی شروع سے ہی

کوشش یہ رہی کہ مصالحت اور مذاکرات کے ذریعہ مقصد کو حاصل کیا جائے۔ مدینہ آنے کے بعد بنوضمرہ اور بنو مدلج وغیرہ سے معاہدات اس کا کافی ثبوت ہیں۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر بھی آپ نے اہلِ مکہ کو ان کے کرتوتوں کا مزا چکھانے کے بجائے رحم و مروّت کا سلوک کیا۔ البتہ جب آپ کو جنگ پر مجبور کر دیا جاتا تھا، امن کی تمام راہیں مسدود ہو جاتیں اور امن و سلامتی، اسلام اور ریاست اسلامی کو ہدف بنایا جاتا تو اس وقت مدافعت سے کام لینا اور خاموشی اختیار کر لینا فرائضِ حکومت کے لحاظ سے بھی غلط تھا اور فرائض رسالت کے تقاضوں کے خلاف بھی۔ اسی لئے آپ ایسے قبائل کی سرکوبی کے لئے ہر آن مستعد رہتے تھے جو یا تو مسلمانوں کے خلاف سازش کر کے دار الحکومت مدینہ پر حملہ آور ہوتے تھے یا اس کے منصوبے بناتے تھے اور جس کی کافی مثالیں صلح حدیبیہ سے پہلے بیان کی جا چکی ہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ لا اکراہ فی الدین اسلام کا اصل الاصول ہے اس لئے آپ نے کسی قبیلہ کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا۔ البتہ اسلام کی سیاسی حاکمیت کے آگے سرنگوں کرنے میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور اس سلسلے میں آپ نے اس درجہ رعایت سے کام لیا کہ قبائل کے محض ظاہری اقرار ایمان کو کافی سمجھا۔ اسی لئے اس وقت ایسے قبائل بھی نظر آتے ہیں جو اپنے اسلام میں مخلص تھے، ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو صرف ظاہری طور پر اسلام لائے تھے اور ایسے بھی تھے جنھوں نے اسلام کا قلادہ اپنے گلے میں تو نہ ڈالا البتہ ریاستِ نبوی کی اطاعت قبول کر لی تھی۔

صلح حدیبیہ سے پہلے تک عرب قبائل کی سرگرمیاں سامنے آ چکی ہیں اور صلح حدیبیہ کے نتیجہ میں فتح مکہ تک ان کا کردار بھی واضح ہو چکا ہے۔ فتح مکہ تک پہنچتے پہنچتے یہ بات تو صاف نظر آتی ہے کہ قبائل عرب کا زور بالکل ٹوٹ گیا ہے کیونکہ ان کی پشت پناہی کرنے والی یہود خیبر اور قریشِ مکہ کی دونوں طاقتیں ختم ہو گئیں۔ جو قبائل "انتظار کرو اور دیکھو" کا مسلک رکھتے تھے فتح مکہ کے بعد انہوں نے بھی ہوا کا رُخ دیکھ لیا اور ریاست نبوی کے تابع ہو گئے۔ قبائل عرب پر فتح مکہ کا اثر پڑنا بھی لازمی تھا۔ مسلمانوں کا مکہ پر فتحیاب ہو جانا بہت سے قبائل کے لئے صداقت کی علامت بن گیا کیونکہ سیکڑوں سال سے عرب کی روایت یہ چلی آ رہی تھی کہ مکہ پر اسی کا قبضہ ہو سکتا ہے جو اللہ کا فرستادہ اور اس کا محبوب ہو۔ بصورتِ دیگر اس کا انجام "اصحابِ فیل" (۲۳۷) سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بخاری نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

فیقولون اترکوہ وقومہ فانہ ان ظہر علیہم فھو نبی صادق۔ (۲۳۸)

(وہ کہتے ہیں اس کو اور اس کی قوم کو چھوڑ دو (بے اعتنائی برتو) پس اگر یہ ان (اپنی قوم) پر غالب آ گیا تو سمجھنا کہ وہ سچا نبی ہے)

اس کے باوجود جن قبائل کو یہ صورتِ حال بھی متاثر نہ کر سکی اور انہوں نے انتظار یا مزاحمت کا رویہ جاری رکھا وہ بالآخر بعد کے واقعات و حوادث سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد جب ہوازن، ثقیف، نصر، جشم اور بعض دُوسرے جاہلیت پرست قبائل نے اپنی ساری طاقت حنین کے میدان میں لا کر جھونک دی (۲۳۹) تاکہ اس اصلاحی انقلاب کا آخری بار راستہ روک دیں جو فتح مکہ کے بعد مرحلۂ تکمیل میں داخل ہو گیا تھا تو ان کی یہ آخری کوشش بھی ناکام ہوئی۔ (۲۴۰) غزوۂ حنین پر عربوں کے ساتھ رسولؐ اللہ کی جنگوں کا تقریباً خاتمہ ہو گیا۔ وہ تمام بڑے بڑے قبائل جو اپنے آپ کو قریش کا ہمسر سمجھتے تھے مغلوب

ہو گئے اور اسی کے ساتھ عرب کی قسمت کا بھی قطعی فیصلہ ہو گیا کہ اسے دار الاسلام بن کر رہنا ہے اور یہ ثابت ہو گیا کہ "دین حق دوسرے تمام ادیانِ (باطلہ) پر غالب آ کر رہے گا کیونکہ اللہ کے رسول کو اسی لئے بھیجا گیا تھا۔"(۲۴۱) لیکن یہ غلبہ، یہ سلطانی نفس کی تسکین اور شان و شکوہ کے اظہار کے لئے نہ تھی بلکہ "لیظهره علی الدین کله"(۲۴۲) کا تقاضا تھی۔ شاید اسی لئے جب ابو سفیان نے رسولؐ اللہ کے لشکرِ فتح کو دیکھا اور حدِ نظر تک آدمی ہی آدمی دکھائی دئے تو حضرت عباس سے یوں اظہارِ تاثر کیا کہ: "ابو الفضل! تمہارے بھتیجے کی سلطنت تو بہت بڑھ گئی!"

عباس نے کہا: "تمہاری خرابی ہو، یہ سلطنت نہیں ہے یہ تو نبوت ہے۔"

ابو سفیان نے کہا: "بے شک!"(۲۴۳)

یہ حقیقت سامنے آ جانے کے بعد کہ اسلام کے سیلِ رواں کو روکنے والی کوئی قوت نہیں رہی ہم دیکھتے ہیں کہ قبائل عرب کا میلان اسلام کی طرف بڑھ جاتا ہے اور وہ جوق در جوق(۲۴۴) مدینہ آ کر اظہارِ اطاعت کرنے لگے بلکہ ابھی آپ مکہ ہی میں مقیم تھے کہ ہوازن کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پھر ثقیف، بنو عبد القیس، طے، کندہ اور دیگر قبائل کے وفود نے بھی ایمان و اسلام میں دیر نہیں لگائی۔(۲۴۵) اس طرح حنین کے بعد در اصل اندرون عرب، ریاست نبوی کی قابلِ ذکر مخالف قوتوں نے دم توڑ دیا اور اب "صرف چند پراگندہ عناصر ملک کے مختلف گوشوں میں باقی رہ گئے" اور جن کا استیصال کرنے میں بھی مزید ایک سال سے زیادہ کا عرصہ نہ لگا۔

(ج) اب ہم تیسرے نکتہ کی طرف آتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اندرونِ عرب کی تمام قابلِ ذکر مزاحمتوں کے ختم ہو جانے کے بعد ایک مسئلہ تو ان علاقوں کا تھا جو ابھی تک ریاست نبوی کے مطیع نہ ہوئے تھے۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ بیرونِ عرب اسلام کے پیغام کو پہنچایا جائے اور وہاں بھی حاکمیت الٰہی کی طرح نو ڈالی جائے کہ یہ رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا واضح مقصد تھا۔

رسولؐ اللہ سے پہلے جتنے انبیاؑ و رسل اس دنیا میں تشریف لائے ان کی رسالت خاص تھی ان کی نبوت ان کی اپنی قوم اور اپنے قبیلے تک محدود تھی۔ لیکن یہ امتیاز صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ کی بعثت روئے زمین کی ہر قوم اور ہر جنس کے لئے ہوئی۔ تمام انسانوں کے لئے، تمام دنیا کے لئے ہوئی۔ یعنی آپ کی رسالت و نبوت عام ہے اور بعثت، بعثت تام ہے۔ اس پر دلالت قرآن میں بھی موجود ہے(۲۴۶) اور احادیث میں بھی اس کی وضاحت و صراحت پائی جاتی ہے۔(۲۴۷)

چنانچہ بر بنائے رسالت رسولؐ اللہ پوری دنیا کو دعوتِ اسلام دینے پر مامور کئے گئے تھے۔ یوں تو آغاز کار سے ہی رسولؐ اللہ نے اپنی دعوت کو محدود و مخصوص نہیں کیا تھا(۲۴۸) آپ کی دعوت ہر شخص، ہر قوم، ہر نسل، ہر قبیلے اور ہر مقام اور ہر زمانے کے لئے تھی۔ اسلام کی بنیاد بھی توحید پر ہے جو ایک عالمگیر وحدت کا نشان ہے۔ آپ کے ماننے والوں میں ایسے لوگوں کی تعداد شروع سے ہی اچھی خاصی رہی ہے جن کا نسبی و نسلی تعلق عرب سے نہ تھا اور رنگ، زبان اور وطن کے

لحاظ سے بھی مختلف تھے۔ اس سلسلے میں حضرت سلمان فارسی، صہیب رومی، بلال حبشی وغیرہ کا نام روشن مثال ہے۔ جو کے زمانے میں دنیا کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے لوگوں تک تبلیغ کرنا آپ کی مکی زندگی کا خاصہ ہے اور پھر انہی لوگوں کے ذریعہ نیز جاں نثارانِ اسلام کے تجارتی سفروں کے وسیلہ سے اسلام کا پیغام عرب سے باہر پہنچ رہا تھا اور پھر مدینہ آنے کے بعد تو ریاست نبوی کے قیام و فروغ اور پیہم فتح کاموں نے اسلام کا نام اطراف و جوانب میں پھیلا دیا تھا لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کی عالمی حیثیت کے قیام و استحکام کے حوالے سے یہ تمام سرگرمیاں عمومی نوعیت کی تھیں البتہ صلح حدیبیہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عالمی دعوت کے سلسلے میں بطور خاص اہتمام فرمایا۔

چنانچہ اس واقعہ کو تمام مورخین اور اصحابِ سیر نے صراحتہً لکھا ہے کہ صلح حدیبیہ سے فارغ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد شاہانِ عالم، فرمانروایانِ عرب اور دیگر امراء و رؤسائے قبائل کے نام خطوط و مکاتیب ارسال فرمائے[۲۴۹] (جن کی تفصیل آئے گی) ان مکتوبات گرامی کا بنیادی مقصد تبلیغ و ہدایت تھا[۲۵۰] اور ان خطوط کو سب سے پہلے محرم ۷ھ میں مدینہ سے جاری کیا گیا۔[۲۵۱]

ابنِ سعد کے بیان کے مطابق رسول اللہؐ نے ایک ہی دن میں چھ قاصدوں کی ایک جماعت کو مراسلات دے کر روانہ کیا۔[۲۵۲] ان کو بھیجتے وقت آپ نے ان پر یہ امر واضح کر دیا تھا کہ میں چونکہ پوری دنیا کے لئے رسولِ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں اس لئے اب موقع آگیا ہے کہ میں سارے انسانوں سے خطاب کروں۔[۲۵۳] ہمارے نزدیک یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ مراسلات نبوی کا یہ سلسلہ یہیں ختم ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کی اس جماعت کے علاوہ متعدد دوسرے سفیروں اور قاصدوں کو بھی رسولؐ اللہ نے عرب کے مقامی رؤسا اور بیرونی انتداب کے ماتحت ملوک و امراء کے پاس خطوط و فرامین دے کر بھیجا تھا۔ اس لئے تاریخی شہادت کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرتؐ کے ان دعوتی و تبلیغی خطوط کا سلسلہ محرم ۷ھ سے ۱۱ھ کے اواخر تک جاری رہا۔ شاید اسی لئے طبری نے مدتِ مراسلت کو وفاتِ نبوی تک شمار کیا ہے۔[۲۵۴] اور ترمذی کی ایک روایت سے بھی یہی متبادر ہوتا ہے کہ سلسلۂ مراسلت آپ کے وصالِ مبارک سے کچھ پہلے تک جاری رہا۔ اصل الفاظ یہ ہیں،

> ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتب قبل موتہ الی کسریٰ والی قیصر والی النجاشی والی کل جبّار یدعوھم الی اللہ۔[۲۵۵]
>
> (رسولؐ اللہ نے اپنی وفات سے قبل ہی کسریٰ، قیصر، نجاشی اور (دنیا کے) ہر صاحبِ اقتدار و اختیار کے نام (خط) لکھا اور انہیں اللہ کی طرف دعوت دی)

بہر حال ہمارے متذکرہ بالا بیان کا خلاصہ یہ ہوا کہ:

۱ - مراسلت کم و بیش تین سال تک جاری رہی اس لئے مکاتیب کی تعداد ہمارے قدیم مورخین (ابن ہشام ج ۴، ص ۲ - ابنِ سعد ج ۱، ص ۲۵۹) کے اندازے سے محض چھ یا نو تک محدود نہیں ہے۔

۲ - مراسلت محض سلاطینِ روم و فارس سے ہی نہیں کی گئی بلکہ اس کے مخاطب دنیا کے تمام صاحبانِ اقتدار و

سیاست تھے۔ اور

۲ - ان مکاتیب کا بنیادی مقصد دعوت و تبلیغ تھا۔

رسولؐ اللہ کے تمام مکتوبات و مراسلات کے جملہ پہلوؤں کا جائزہ لینا ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے اور اس کی بالفعل ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ لہٰذا ہم مذکورہ خطوط کی سیاسی اہمیت اور ان کے بعض اہم نکات کی طرف توجہ صرف کریں گے جن کا براہِ راست تعلق ریاستِ نبوی کی توسیع و ترقی سے ہے۔

مکاتیب کی تحریر اور ترسیل کا آغاز جیسا کہ ہمیں معلوم ہے صلح حدیبیہ کے فوراً بعد ہوا یعنی جبکہ ریاست نبوی کے حالات بڑی نزاکت کے حامل تھے۔ لیکن اسی دور اور ان ہی حالات میں آنحضرتؐ نے دنیا کے بڑے بڑے صاحبانِ اختیار و اقتدار کو حاکمیتِ الٰہی کی طرف بلایا اور ایسے انداز سے بلایا کہ آپ کے لب و لہجہ میں ذرہ برابر نیاز مندی نہیں، ذاتی مفاد کی تلویث، مرعوبیت یا کمزوری نہیں بلکہ ایک خاص طنطنہ ہے، وقار ہے، استغنا ہے، عزم و ثبات ہے اور ایک خاص تحکم ہے۔ جس طرح ایک پُر اعتماد اور پُر خلوص بات مخاطب پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ اسی طرح مکتوب کے اس انداز خاص نے مخاطبین کو مرعوب کئے بغیر نہیں چھوڑا۔ چنانچہ تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے فرمانروا و شہنشاہ یعنی قیصرِ روم نے مکتوب نبوی پر جس قسم کے ردِّ عمل کا اظہار کیا اس کو ابوسفیان کے اس معنی خیز جملہ میں صاف دیکھا جا سکتا ہے جو سراسر عینی شہادت پر مبنی ہے کہ :

ای عباد اللہ لقد أمر امر ابن ابی کبشہ ، اصبح ملوک بنی الاصفر یھابونہ فی سلطانھم بالشام۔ [۲۵۶]

(اللہ کے بندو! دیکھو، ابن ابی کبشہ کا معاملہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے کہ ملوک بنی الاصفر بھی اپنی اپنی سلطنتوں میں شام (جیسے دُور دراز مقام) پر بیٹھے ڈرتے ہیں)

خطوط پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا ایک خاص اسلوب ہے یعنی ہر خط کا آغاز بسم اللہ سے پھر مرسل کی حیثیت سے اپنا نام پھر مکتوب الیہ کا نام اور پھر کم سے کم الفاظ اور انتہائی جچے تُلے انداز میں اپنے مدعا کا اظہار ایسی زبان میں ہے جو اندازِ سفارت کی تمام نزاکتوں اور جامعیت کی حامل ہے اور جو فی الواقع آنحضرتؐ کی ذہنی و نفسی برتری کو ثابت کرتی ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسولؐ اللہ نے یہ مکاتیب شاہی درباروں اور امرائے وقت کو کیوں بھیجے اور ان کا تخاطب عام آدمیوں سے کیوں نہیں ہے؟ اس کا ایک سیدھا سادہ جواب تو یہ ہے کہ مکتوب ہمیشہ خاص آدمی کے لئے ہی ہوتے ہیں عام اشخاص کے لئے نہیں۔ نیز بین الاقوامی قوانین کی رُو سے خطوط ہمیشہ سربراہانِ ریاست کو بھیجے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ اس دور کی بات ہے جبکہ عوام الناس کے شہری حقوق بادشاہوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھے اور نہ انہیں وہ سیاسی آزادی حاصل تھی جس سے کام لے کر وہ اپنے بارے میں خود کوئی فیصلہ کر سکیں۔ اس دور کی بادشاہی قیادتیں خداد:ی

کے ہم پلہ تھیں۔

دنیا کے سیاسی نظام کے تحت ہم یہ مطالعہ کر چکے ہیں کہ روم و فارس کی ہمسایہ سلطنتوں کے سربراہ خدائی حقوق کے دعویدار تھے۔ ملوکیت اور جاگیردارانہ نظام کا وہاں تسلّط تھا اور اس کے تحت قوتِ حاکمہ بالآخر ایک مطلق العنان شخصیت میں مرتکز تھی۔ اس ارتکازِ قوت کا اہم ترین سیاسی نکتہ یہ تھا کہ حاکم کے مُنہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون ہے اور خود حاکم ہر قانون سے بالاتر ہے۔ اسلام کا نظامِ حیات اور اس کا تصورِ سیاست ان سب کی ضد ہے۔ رسولؐ اللہ نے تحریری طور پر "اسلام" کی طرف دعوت دی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ مطلق العنان فرمانرواؤں سے کہا گیا کہ وُہ اپنے اس حق کو ترک کر دیں کہ ان کے منہ سے نکلا ہُوا ہر لفظ قانون ہے اور وُہ خود قانون سے مستثنیٰ ہیں۔ اس کے بجائے مطالبہ یہ تھا کہ وہ حاکمیتِ الٰہی کا اقرار کریں اور ایک ایسے قانون و آئین کے تحت آ جائیں جس میں کسی کے ساتھ رو رعایت نہیں کی جاتی۔

علاوہ ازیں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان ملوک و امرا کو حاکمیتِ الٰہی تسلیم کرنے کی دعوت محض ان کی انفرادی حیثیت میں نہیں دی تھی بلکہ (راعی اور رعایا کی پوری اجتماعی ذمہداری کا احساس دلاتے ہوئے) ان کی قوم کے لئے بھی تھی۔ چنانچہ رسولؐ اللہ نے قیصر کو لکھا کہ:

فان تولیت فعلیك اثم الاریسیین۔[۲۵۷]

(اگر تم نے رُوگردانی کی تو تمہارے اُوپر تمہاری قوم کا بوجھ گناہ بھی ہوگا)

اور حاکمِ مصر (اسکندریہ) کو تحریر کیا تھا کہ:

اثم القبط۔[۲۵۸]

اور کسریٰ کو رقم کیا تھا:

فان ابیت فعلیك اثم المجوس۔[۲۵۹]

مجموعی طور پر اس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر تم نے اسلام قبول نہ کیا تو اس صورت میں تمہاری رعایا کا وبال بھی تمہاری گردن پر ہوگا اور اس کے برعکس اگر اسلام قبول کر لو گے تو یوتك اللہ اجرك مرتین[۲۶۰] یعنی اجر و ثواب بھی دوہرا ہوگا۔

مکاتیبِ نبویؐ کا مطالعہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ ملوک و سلاطین کو دعوتِ اسلام دیتے ہُوئے رسولؐ اللہ نے سیاست و تدبر اور بالغ نظری کا حد درجہ ثبوت فراہم کیا۔ اس مرحلہ پر جبکہ ریاست نبوی کا بتدریج ارتقا ہو رہا تھا یہ بھی ضروری تھا کہ ریاستِ نبویؐ کو عرب کی سرحدی ریاستوں اور بڑی طاقتوں دونوں کے دست بُرد سے محفوظ کر لیا جائے۔ اس لئے رسولؐ اللہ نے صرف مرکزی قوتوں کو ہی نہیں جھنجھوڑا بلکہ ان مراکز سے قوت پانے والے تمام دوسرے عناصر کو بھی بے اثر کرنا ضروری خیال کیا۔ یعنی ایران و روم کے ماتحت عرب کے جن علاقوں یا سرحدوں پر طفیلی ریاستیں قائم تھیں ان کو نظر انداز کر کے شاہانِ ذی اقتدار کو دعوت دینا ریاست نبویؐ کے لئے بجائے خود مفید و موثر نہ ہو سکتا تھا اور اندرونِ عرب ان کی نمائندہ اقتدار کی موجودگی ریاست کے لئے پریشان کن ثابت ہو سکتی تھی۔ چنانچہ رسولؐ اللہ نے جہاں روم و فارس

اور دوسری سلطنتوں کے بااختیار حکمرانوں کو مخاطب کیا تو اسی کے ساتھ ساتھ ذیلی امرأ اور رؤسا کو بھی اسلام کی دعوت پیش کی۔ اس میں یہ حکمت بھی موجود تھی کہ اعوان و انصار کے علیحدہ ہو جانے سے بڑی قوتیں بھی یقیناً متاثر ہوں گی۔

بہرحال تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ جب رسولؐ اللہ نے اپنے سفیر حضرت دحیہ کلبی کے ذریعہ قیصرِ روم کو مکتوب روانہ کیا[۲۶۱] تو اس کے ساتھ ساتھ انتدابِ روم کے ماتحت تمام علاقوں کے فرمانرواؤں کو بھی خطوط روانہ کئے۔ ان میں نجاشی[۲۶۲] (حاکمِ حبشہ) مقوقس[۲۶۳] (حاکمِ اسکندریہ)، حارث بن ابی شمر الغسانی[۲۶۴] (حاکمِ دمشق)، جبلہ بن الایہم[۲۶۵] (حاکم شام) فروہ بن عمرو الجذامی[۲۶۶] (عامل بلقاء یا معان) ضغاطر اسقف[۲۶۷] اور سرداران قبیلہ لخم، کلب، داریون اور بلی وغیرہ[۲۶۸] کے نام مراسلات قابلِ ذکر ہیں۔ گویا سلطنتِ روم اور اس کے پورے منطقہ اثر کو رسولؐ اللہ نے اپنی دعوت کا ہدف بنایا۔ دوسری جانب سلطنت فارس اور اس کے ماتحت تمام امرأ و رؤسا کو بھی مخاطب کیا اور اس سلسلے میں کسریٰ پرویز[۲۶۹] (شاہ فارس) ثمامہ بن اثال اور ہوذہ بن علی[۲۷۰] (حاکمانِ یمامہ) منذر بن ساوی اور ہلال بن امیہ[۲۷۱] (حاکمان بحرین) اہلِ بحرین[۲۷۲]، ہرمزان[۲۷۳] (حاکم رامہرمز) اور سرداران قبیلہ بکر بن وائل[۲۷۴] وغیرہ کے نام خطوط قابلِ توجہ ہیں۔

مذکورہ بالا اشخاص کے نام مکاتیب ارسال فرما کر رسولؐ اللہ نے اسلام کی عالمی حیثیت کے قیام کے جس عظیم الشان کام کا آغاز کیا اس کے اثرات عالمی سیاسی حالات پر بھی بہت گہرے پڑے اور ریاست نبویؐ کے توسیع و ارتقاء کے باب میں بھی انہوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں مخاطبین اور ریاستِ نبویؐ دونوں پر مکاتیب کے اثرات کا جائزہ لینا ہوگا۔

اس وقت کی دنیا کے ان ملوک و سلاطین اور رؤسا، کا رویہ جنہیں رسولؐ اللہ نے مخاطب کیا، خواہ کچھ ہی رہا ہو یعنی انہوں نے دعوتِ اسلام کو قبول کیا یا ٹھکرا دیا لیکن یہ بہرحال طے ہے کہ آپ کی یہ خط و کتابت اپنے نتائج کے لحاظ سے یقینی طور پر کامیاب رہی مثلاً عمان[۲۷۵]، بحرین[۲۷۶] اور یمن[۲۷۷] کے امرأ اسی مراسلت کے نتیجے میں حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ یہ علاقے اپنی زرخیزی اور دولت و اثرات کے لحاظ سے عرب کے دیگر تمام علاقوں سے بڑھے ہوئے تھے اور دراصل ان عرب قبائل کو جو ریاست نبویؐ سے برسرِپیکار رہتے تھے ان ہی علاقوں سے غلہ اور اسلحہ فراہم کیا جاتا تھا۔ اس طرح یہ قبائل مسلمانوں کے خلاف ان کے دشمن کو بالواسطہ مدد پہنچاتے رہتے تھے۔ رسولؐ اللہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کے دشمن قبائل کو ان علاقوں سے غلہ اور اسلحہ فراہم ہوتا رہے گا جنگ و جدل کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اس لئے ان امارتوں کے ریاست نبویؐ کے زیرِ اثر آجانے سے رسولؐ اللہ کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اس کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ریاست نبوی کے حدود مدینہ کے جنوب اور جنوب مشرق میں پُرامن طریقے سے عمان، بحرین اور یمن کے علاقوں تک پھیل گئے۔

بعض حکمرانوں نے بین بین رویہ اختیار کیا یعنی نہ دعوت کو رد کیا نہ قبول مثلاً یمامہ کا ایک امیر ہوذہ بن علی تھا۔ سلیط بن عمرو العامری اس کے پاس خط لے کر پہنچے[۲۷۸] تو اس نے قبولِ دعوت کے لئے کچھ شرطیں پیش کیں لیکن رسولؐ اللہ نے اس کو نامنظور فرما دیا اور یہ پیشگوئی بھی کر دی کہ:

بادو باد ما فی یدیہ۔[279]

(وہ بھی برباد ہوا اور وہ بھی جو اس کے ہاتھوں میں ہے)

چنانچہ ہوذہ کو زیادہ مہلت نہ مل سکی اور ۸ھ میں ان دنوں جبکہ آپ فتح مکّہ سے فارغ ہو کر مدینہ واپس ہو رہے تھے کہ ہوذہ کا انتقال ہو گیا۔[280] مقوقس جو شاہِ روم کے ماتحت مصر (اسکندریہ) کا حکمران تھا اسے رسولؐ اللہ کا خط حاطب بن ابی بلتعہ نے پہنچایا۔[281] خط پڑھ کر وہ بہت متاثر بھی ہوا اور قاصد اور خط دونوں کی تعظیم و تکریم بھی کی اور رسولؐ اللہ کے لئے ہدایا بھی ارسال کئے لیکن اسلام لانے پر بخل کیا۔[282] گویا مذکورہ خطوط و مکاتیب نے اخلاقی اعتبار سے ان علاقوں میں نرم گوشے پیدا کر دئے۔

مکاتیب پر ردِ عمل کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ مخاطبین نے اسلام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جیسا کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا اپنے آپ کو تباہی کی دعوت دے دی۔ مثلاً شہنشاہِ فارس کسریٰ پرویز نے نامۂ مبارک چاک کر ڈالا اور اپنے عامل باذان کو رسولؐ اللہ کی سرزنش کے لئے لکھا۔[283] اس کا نتیجہ ایک طرف تو یہ نکلا کہ یمن سلطنتِ ایران سے کٹ کر خود بخود رسول اللہ کے زیرِ سیادت آ گیا اور دُوسرے یہ کہ کسریٰ پرویز شیرویہ کے ہاتھوں قتل ہوا[284] اور پھر اس کے بعد ایران میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور دُور افتادہ سرحدات کا تحفظ کمزور ہو گیا۔ سلطنتِ روم اسی انتظار میں تھی چنانچہ رومی فوجیں حرکت میں آئیں اور ایران کے اکثر علاقے رومیوں کی سلطنت میں شامل ہو گئے۔

فارس کے علاوہ روم کی طرف سے بھی شدید ردِ عمل کا اظہار کیا گیا۔ رسولؐ اللہ نے ایک خط حضرت حارث بن عمیر کے ہاتھوں شاہِ بصریٰ کے پاس بھی بھیجا تھا۔[285] حاکم بصریٰ عیسائی تھا اور براہِ راست قیصر روم کے احکام کا تابع تھا۔ رسولؐ اللہ کے قاصد موتہ تک پہنچے تھے کہ انھیں شرحبیل بن عمرو الغسانی نے روکا اور قتل کر دیا۔[286] تمام بین الاقوامی سفارتی آداب کو پسِ پشت ڈال کر ایک خود مختار ریاست کے سفیر کا قتل معمولی جُرم نہ تھا۔ لہٰذا اس سانحہ کی اطلاع ملتے ہی رسولؐ اللہ نے جمادی الاوّل ۸ھ میں تین ہزار مجاہدین کی ایک فوج سرحد شام کی جانب روانہ کی[287] تاکہ یہ علاقہ بھی آئندہ مسلمانوں کے لئے پُر امن ہو جائے اور یہاں کے لوگ مسلمانوں کو بے زور سمجھ کر ان پر زیادتی کی جرأت نہ کریں۔[288] جنگِ موتہ کی تفصیلات سے قطع نظر تین ہزار مجاہدین کی مٹھی بھر جماعت موتہ کے مقام پر شرحبیل بن عمرو کی ایک لاکھ سے زائد فوج سے جا ٹکرائی۔[289] اس پر تبصرہ کرتے ہوئے عصرِ حاضر کے ایک مصنف نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

"اس تہور کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ مجاہدینِ اسلام بالکل پس جاتے لیکن سارا عرب اور تمام مشرق قریب یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ایک اور ۳۳ کے اس مقابلہ میں بھی کفار مسلمانوں پر غالب نہ آ سکے۔ یہی چیز تھی جس نے شام اور اس سے متصل رہنے والے نیم آزاد عربی قبائل کو بلکہ عراق کے قریب رہنے والے نجدی قبائل کو بھی جو کسریٰ کے زیر اثر تھے اسلام کی طرف متوجہ کر دیا اور وہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہو گئے۔ بنی سلیم (جن کے سردار عباس بن عمرو السلمی تھے) اور اشجع اور غطفان اور ذبیان اور فزارہ کے لوگ اسی زمانہ میں داخلِ اسلام ہوئے اور اسی زمانہ میں سلطنت روم کی عربی فوجوں کا ایک کمانڈر فروہ بن عمرو الجذامی مسلمان ہوا۔"[290]

اس معرکہ کا ایک نتیجہ اور بھی نکلا جسے اکثر و بیشتر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ جنگِ موتہ سے پہلے کم از کم پانچ سو سال کی پچھلی تاریخ میں اہلِ عرب نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ وہ شہنشاہِ روم اور اس کی عظیم الشان قوت سے ٹکرا سکتے ہیں۔ لیکن جنگِ موتہ نے عربوں کی اجتماعی نفسیات بدل ڈالی۔ نتیجہ خواہ کچھ ہی رہا ہو یہ سب نے دیکھ لیا کہ ریاست نبوی کی ۳۳ گنا مختصر فوج نے اپنی بے سروسامانی اور قلت کے علی الرغم رومیوں پر حملہ کیا اور بے جگری و بے خوفی کے ساتھ لڑ کر یہ ثابت کر دیا کہ اہلِ عرب رومیوں سے برسرِپیکار ہو سکتے ہیں اور ان کی عددی برتری سے مرعوب نہیں ہو سکتے۔ اسلامی فوج نے اپنے اس سیاسی موقعت کو بھی مخالف پر پوری طرح واضح کر دیا کہ ریاست نبوی کی آزادی و خود مختاری کو برقرار رکھنے کے لئے ہر سطح پر مقابلہ کیا جائے گا اور فی الحقیقت حربی نتیجہ سے زیادہ بھی اخلاقی و سیاسی نتائج زیادہ اہم ہیں اور ہمارے نزدیک ان کا حصول جنگِ موتہ کے افادی پہلو کو مزید بڑھا دیتا ہے۔

جنگ موتہ نے بہر حال تمام اہلِ عرب، اطراف و جوانب کے قبائل اور خود قیصر روم کو پوری طرح چوکنا کر دیا تھا۔ جنگِ موتہ کے ظاہری نتیجہ نے ممکن ہے ان کی ہمت افزائی کی ہو اور اسی لئے ان عربی قبائل نے بھی مزید مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں جو انتداب روم کے حلقہ میں شامل تھے اور موتہ کے موقع پر جنہوں نے رومیوں کی اعانت بھی کی تھی۔ مثلاً قضاعہ کی ایک جماعت اس ارادہ سے روانہ ہوئی کہ مدینۃ النبی پر حملہ آور ہو۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادہ میں کامیاب ہو، رسولؐ اللہ نے حسبِ سابق جمادی الآخر ۸ھ میں حضرت عمرو بن العاص کی سرکردگی میں ایک مہم ذات السلاسل کی طرف بھیج کر اس کی سرزنش کر دی۔ (۲۹۱)

لیکن اس کے باوجود رومی خطرہ کم نہیں ہوا اور چند ہی روز بعد یہ اطلاعات ملنے لگیں کہ "شام میں رومیوں کا اجتماعِ عظیم ہو گیا ہے اور ہرقل نے اپنے آدمیوں کو ایک سال کی (پیشگی) تنخواہ دے دی ہے، اس کے ہمراہ قبیلہ لخم، جذام و عاملہ و غسان وغیرہ کو بھی لایا گیا ہے اور اپنے مقدمات الجیوش کو بلقاء تک بھیج دیا ہے۔" (۲۹۲) رسولؐ اللہ ہمیشہ کی طرح اب بھی مستعد تھے، آپ رومیوں کی ان تیاریوں کا مطلب اچھی طرح سمجھتے تھے۔ آپ نے بغیر کسی تامل کے ان سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اس موقع پر کمزوری دکھانا مسلمانوں کی ہوا خیزی کا باعث ہوتا اور شہنشاہِ روم کے اس رعب و دبدبہ میں مزید اضافہ ہو جاتا جو ایرانیوں کو شکست دے کر وہ پہلے ہی قائم کر چکا تھا۔ پھر دار الحکومت مدینہ پر پیش قدمی تو ظاہر تھی۔ ان حربی و سیاسی نقصانات کے علاوہ یہ بھی اندیشہ تھا کہ ایک طرف تو وہ عصبیت جاہلیہ ان واقعات سے شہ پا کر پھر سے جی اُٹھے گی اور کفر و شرک کی ان طاقتوں کو تازہ خون مل جائے گا جن پر آخری ضرب جنگِ حنین میں لگائی جا چکی تھی۔

دوسری طرف مدینہ کے منافقین تھے جو ابو عامر راہب (۲۹۳) کے واسطے سے غسان کے عیسائی امرا اور خود قیصر کے ساتھ اندرونی سازباز رکھتے تھے اور جنہوں نے اپنی ریشہ دوانیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے مدینہ سے متصل ہی مسجد ضرار تعمیر کر رکھی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ ریاست نبویؐ کو جلد سے جلد تباہ کر دیا جائے ان وجوہ سے رسولؐ اللہ نے موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے رومیوں کے خلاف فوج کشی کا اعلان فرما دیا اور اس سلسلے میں اتنی عجلت سے کام لیا کہ نہ ملک میں قحط سالی کی پروا کی، نہ موسم کی شدت اور

بے پناہ گرمی کا خیال کیا اور نہ مجاہدین کی بے سروسامانی کو خاطر میں لائے۔ اور ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی دشمن کی نقل و حرکت سے قبل ہی رجب ۹ھ میں تیس ہزار فوج کے ساتھ شام کی جانب روانہ ہوگئے[۲۹۴] اور تقریباً دو ہفتہ کے دشوار ترین سفر کے بعد تبوک پہنچ کر خیمہ زن ہوگئے۔ تبوک میں آپ کا قیام بیس دن تک رہا[۲۹۵] اس اثناء میں نہ رومیوں کا کوئی لشکر مقابلہ پر آیا اور نہ لڑائی ہوئی۔ اس موقع پر رومیوں کے سامنے نہ آنے کی ہمیں یہ توجیہہ مناسب معلوم ہوتی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رومیوں کی تیاریاں مکمل ہونے سے پہلے ہی مقابلہ پر پہنچ گئے تو انھوں نے سرحد سے فوجیں ہٹا لینے کے سوا کوئی چارہ نہ پایا۔ جنگ موتہ میں ۳ ہزار اور ایک لاکھ کے مقابلہ کی جو شان وہ دیکھ چکے تھے اس کے بعد ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ خود رسولؐ اللہ کی قیادت میں جہاں ۳۰ ہزار فوج آرہی ہو وہاں لاکھ دو لاکھ آدمی لے کر میدان میں آجاتا[۲۹۶]

تبوک کے قیام میں رسولؐ اللہ نے ایک جرأت مندانہ اقدام یہ بھی کیا کہ ایک مکتوب قیصرِ روم کو یہ تحریر فرمایا کہ "میں تمھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں اگر تم اسلام قبول کر لیتے ہو تو جو مراعات مسلمانوں کو حاصل ہوں گی وہ تمھیں حاصل ہوں گی اور جو واجبات ان پر عائد ہوتے ہیں وہی تم پر عائد ہوں گے لیکن اگر تم دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہونا چاہتے تو پھر جزیہ ادا کرو۔ اس لئے کہ اللہ فرماتا ہے کہ:

قاتلوا الذین لا یؤمنون باللّٰہ و بالیوم الاٰخر ولا یحرمون ما حرم اللّٰہ و رسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتٰب حتیٰ یعطوا الجزیہ عن یدوھم صاغرون۔

(اہلِ کتاب میں سے جو لوگ اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ اللہ و رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں اور نہ دین حق کی اطاعت قبول کرتے ہیں ان سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ وہ ماتحتی قبول کرتے ہوئے خود آخر جزیہ ادا کریں)

بصورتِ دیگر تم فلاحین اور اسلام کے درمیان حائل نہ رہو۔ وہ چاہیں تو دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں یا پھر جزیہ دیں۔[۲۹۷] شاید اس مکتوب کا جواب رسولؐ اللہ کو مطلوب نہ تھا۔[۲۹۸] مقصود تو تھا صرف اظہارِ جرأت اور اخلاقی فتح۔ پھر اس اخلاقی فتح سے رسولؐ اللہ نے جو مزید سیاسی اور حربی فوائد حاصل کئے ان میں سے ایک فائدہ تو تبوک کے قیام ہی میں حاصل ہوگیا یعنی وہ سرحدی ریاستیں جو اب تک رومیوں کے زیر اثر تھیں ریاست نبوی کی باجگذار بن گئیں۔ چنانچہ حاکم ایلہ یحنہ بن روبہ خود آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جزیہ دینا منظور کیا۔[۲۹۹] رسولؐ اللہ نے اس پر یہ شرط لگائی کہ ان کی آبادیوں میں سے جو مسلمان گزرے گا وہ اس کی مہمان داری کریں گے۔[۳۰۰] اہلِ جرباء و اذرح نے بھی جزیہ پر صلح کرلی[۳۰۱] اس کے بعد رسولؐ اللہ نے دُومۃ الجندل کو مطیع بنایا۔ آپ نے ایک دستہ فوج دے کر حضرت خالد بن ولید کو اکیدر بن عبدالملک کی طرف بھیجا۔ ایک معمولی سی جھڑپ کے بعد وہ قید ہوا اور آخر کار اس نے جزیہ پر صلح کرلی۔[۳۰۲] پھر اہلِ مقنا کے عیسائی رؤسا نے بھی جزیہ کی شرط پر مصالحت کرلی۔[۳۰۳]

ان سرگرمیوں کا صاف نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست نبویؐ کے حدود و اقتدار براہِ راست جزیرہ نمائے عرب کی انتہائی شمالی

سرحدوں تک پہنچ گئے اور وہ عرب قبائل اب خود ان کے حریف بن گئے جن کو رومی سلطنت اب تک عرب کے خلاف استعمال کرتی رہی تھی۔ اور جواب مسلمانوں کے حلیف بن چکے تھے۔ مذکورہ بالا عیسائی قبائل کو ریاست نبویؐ کے زیر اثر لاکر رسولؐ اللہ نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ اس سے رومی سلطنت کے منطقہ اثر میں گہرے شگاف پڑ گئے جن کی وجہ سے صفر ۱۱ھ میں اسامہ بن زید کی وہ مہم بالآخر حضرت ابوبکرؓ کے دور میں کامیابی سے ہمکنار ہوئی جسے ابتدائی طور پر رسولؐ اللہ نے روانہ کیا تھا[۳۰۴] اور پھر آگے چل کر اسی بنا پر بلاد روم میں اسلام کے اثر و نفوذ، توسیع و اشاعت اور فتوحات کے دروازے کھل گئے۔ اسلام مستقبل قریب کی بین الاقوامی طاقت کی حیثیت سے محسوس کیا جانے لگا اور جنگِ موتہ میں مسلمانوں کی عارضی پسپائی کے آثار و نقوش بھی محو ہو گئے۔ علاوہ ازیں مذکورۃ الصدر عیسائی سرحدی ریاستوں کی اطاعت نے رقبہ جنگ پر مسلمانوں کے غلبہ اور تسلط کو قائم کر دیا اور اس طرح "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدود شمال پر مرکزی نقاط کی تنظیم میں پوری طرح کامیاب رہے۔"[۳۰۵]

غزوۂ تبوک کے نتیجہ میں عیسائیوں، رومیوں اور غسانیوں کا زور ٹوٹا تو ریاست نبوی کے ایک اہم اور خطرناک گروہ کا منصوبہ بھی ناکام ہو گیا۔ منافقین کی تمام ہمدردیاں آغاز سے ہی ریاست نبوی کے دشمنوں کے لئے تھیں اور وہ کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے جس کے ذریعہ اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرہ کو نقصان پہنچایا جا سکے۔ غزوۂ احد، محاصرہ بنو نضیر، غزوہ احزاب، غزوہ بنو قریظہ، غزوہ بنی مصطلق کے مواقع پر انہوں نے مسلمانوں میں بے دلی پھیلانے، ان میں عصبیت جاہلیت کی آگ بھڑکانے، ان کے خلاف سازشیں کرنے، ریاست نبوی کے دشمنوں کے لئے جاسوسی کرنے اور اسلام و رسولؐ اللہ پر الزامات و اعتراضات کرنے میں کبھی بخل نہیں کیا تھا (مزید تفصیل استحکام کے سلسلے میں آئے گی) ان کی یہ حرکتیں اگرچہ اکثر اوقات سنگین نتائج کی راہ ہموار کر دیتی تھیں تاہم رسولؐ اللہ نے ان کے شر و فساد کا دفعیہ کرنے پر ہی اکتفا کیا اور غزوۂ تبوک سے پہلے تک ان کے ساتھ نرمی و ملاطفت اور عفو و درگذر کا سلوک فرماتے رہے۔ رسولؐ اللہ کے اس نرم رویّہ کا سبب غالباً ایک تو یہ تھا کہ منافقین زبان سے بہر حال اسلام و ایمان کا اقرار کرتے تھے اور ان کا شمار بھی زمرہ مسلمین میں ہوتا تھا اس لئے ان کے خلاف تادیبی کارروائی خود مسلمانوں میں بد دلی اور ناگواری کے جذبات پیدا کر سکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ ان کے ہم قبیلہ اور ہم محلہ افراد کی جماعت بھی موجود تھی جو اسلام کے معاملہ میں انتہائی مخلص تھے اور اپنے رشتہ دار منافقین پر خود ہی شاہد عادل بنتے جا رہے تھے۔ تیسرے یہ کہ ریاست کے لئے اندرونی و بیرونی طور پر اتنے خطرات درپیش تھے کہ ان سے عہدہ برآ ہوئے بغیر منافقین کا قلع قمع کرنا مناسب نہ تھا۔ لیکن اب جبکہ رسولؐ اللہ داخلی و خارجی اور سیاسی و حربی ہر محاذ پر پوری طرح فتحیاب ہو چکے تھے۔ وہ مناسب وقت آ گیا تھا کہ اس گروہ کو قرار واقعی سزا دی جائے اور منافقت کی فصل کاٹ کر رکھ دی جائے۔ حاکم حقیقی کی طرف سے بھی ہدایت آ گئی تھی کہ:

یاایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم۔[۳۰۶]

(اے پیغمبر! کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کیجئے اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آئیے)

گویا کہا یہ گیا کہ جو سخت برتاؤ کھلے ہوئے منکرین حق کے ساتھ ہو وہی سخت برتاؤ ان چھپے ہوئے منکرین حق کے ساتھ بھی روا رکھا جائے۔ چنانچہ اس کی تعمیل میں غزوۂ تبوک پر جانے سے پہلے ہی رسولؐ اللہ نے اس یہودی کے گھر میں آگ لگوا دی تھی[۳۰۷]

جہاں منافقین کا گروہ مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے کے لئے جمع ہوتا تھا اور پھر ہدایتِ خداوندی کے تحت ہی تبوک سے واپس تشریف لاتے ہوئے رسول اللہ نے مدینہ میں داخلہ سے پہلے چند صحابہ کو یہ حکم دے دیا تھا کہ مسجد ضرار کو منہدم کر دیں [۳۰۸]

واقعہ یہ ہے کہ منافقین کو کم و بیش نو سال تک سوچنے سمجھنے اور دین حق کے بارے میں مطمئن ہو جانے کا موقع دیا جا چکا تھا اور اگر وہ واقعی خیر خواہی اور اخلاص برتتے اور اپنے طرزِ عمل کو درست کر لیتے تو ظاہر ہے ان سے تعرض کا سوال نہ تھا مگر اس طویل مہلت سے بھی انہوں نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس لئے لامحالہ ان کے خلاف کارروائی کی گئی۔ اب ان کے ساتھ نہ تو مزید رعایت کی کوئی گنجائش موجود تھی اور نہ منشائے خداوندی ان کے حق میں تھی یہاں تک کہ تبوک سے واپسی پر کچھ ہی دنوں بعد عبداللہ بن ابی انتقال ہو گیا۔ رسول اللہ نے ازراہِ ترحم نماز اور دعائے مغفرت کرنی چاہی تو آپ کو اس سے بھی روک دیا گیا۔[۳۰۹] واقعہ یہ ہے کہ عبداللہ بن اُبی کی موت سے منافقین کو دوہرا نقصان اٹھانا پڑا ایک تو یہ کہ ان کی فعال قیادت ختم ہو گئی اور دوسرے یہ کہ ان کی ساری تگ و دو ابنِ اُبی کی ناجوشی کے لئے ہی تھی اس کا موقع غزوۂ تبوک میں رسول اللہ کی اخلاقی فتح اور رومیوں کی خاموشی، نیز یہود، کفار قریش اور دیگر قبائل عرب کے مفتوح و مغلوب ہو جانے اور سب سے بڑھ کر ابن ابی کی موت سے حاصل نہ ہو سکا اب ان کے سارے منصوبے بکھر چکے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ غزوۂ تبوک کے بعد سورۂ توبہ میں منافقین کے کردار، ان کی ایک ایک حرکت اور طرزِ عمل کی پوری قلعی کھول دی گئی۔[۳۱۰] یہاں تک کہ کسی منافق کے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ اپنے آپ کو پوشیدہ رکھ سکے۔ اب تازہ الہامی احکام کی روشنی میں ان سے کسی قسم کی رو رعایت کا سوال بھی نہ تھا۔ ان وجوہ سے بحیثیت ایک گروہ کے منافقین کا خاتمہ ہو گیا اور یہ دراصل غزوۂ تبوک ہی کا ایک نتیجہ ہے۔

تبوک کی مہم سے عصبیت جاہلیہ اور کفر و شرک کی تحریک بھی بُری طرح متاثر ہوئی اس کا مستقبل تاریک ہو گیا اور مولانا مودودی کے الفاظ میں "تبوک کی بلا جنگ فتح نے عرب میں ان لوگوں کی کمر توڑ دی جو اب تک جاہلیت قدیمہ کے بحال ہونے کی آس لگائے بیٹھے تھے خواہ وہ علانیہ مشرک ہوں یا اسلام کے پردہ میں منافق بنے ہوئے ہوں۔ اس آخری مایوسی نے ان میں سے اکثر و بیشتر کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہنے دیا کہ اسلام کے دامن میں پناہ لیں اور اگر خود نعمت ایمانی سے بہرہ ور نہ بھی ہوں تو کم از کم آئندہ نسلیں بالکل اسلام میں جذب ہو جائیں۔ اس کے بعد ایک برائے نام اقلیت شرک و جاہلیت میں ثابت قدم رہ گئی۔ وہ اتنی بے بس ہو گئی تھی کہ اس اصلاحی انقلاب کی تکمیل میں کچھ بھی مانع نہ ہو سکتی تھی جس کے لئے اللہ نے اپنے رسول کو بھیجا تھا۔"[۳۱۱]

یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ سورۂ توبہ کی ابتدائی ۳۷ آیات اسی مرحلہ پر یعنی ذی قعدہ ۹ھ میں نازل ہوئیں۔[۳۱۲] ان آیات میں چند ایسے اقدامات کا حکم دیا گیا تھا جن کی تعمیل سے عرب مکمل طور پر دار الاسلام بن رہا تھا۔ اگرچہ فتح مکہ کے موقع پر بھی کچھ مرکزی مقاماتِ کفر و شرک منہدم کئے گئے تھے[۳۱۳]۔ لیکن اب تقریباً پورے عرب کا نظم و نسق بالکلیہ اہلِ ایمان کے ہاتھ میں آ گیا تھا اور تمام مزاحم قوتیں بے بس ہو کر رہ گئی تھیں اس لئے حکم یہ دیا گیا کہ مشرکین سے اظہارِ برأت کیا جائے[۳۱۴] ان کے ساتھ معاہدات ختم کر دئے جائیں[۳۱۵]، قدیم مشرکانہ نظام کا مکمل استیصال

کر ڈالا جائے [۳۱۶]، کعبہ کا انتظام صرف مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونا چاہئے [۳۱۷]، نیز بیت اللہ کے حدود میں شرک و کفر کی تمام رسمیں بند کر دی جائیں [۳۱۸] اور عرب کی تمدنی زندگی میں جو بھی آثارِ جاہلیت باقی رہ گئے ہیں انھیں محو کر دیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک اہم جاہلی رسم نسئی کا قاعدہ موقوف کر دیا گیا۔ [۳۱۹]

مہمِ تبوک کا آخری لیکن اہم ترین نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ عرب کے گوشے گوشے سے وفود آنے لگے اور رسولؐ اللہ کی سیاسی قیادت پر صاد کرنے لگے۔ وفود کتنے تھے اور عرب کے کس کس گوشے سے آ کر مدینہ حاضر ہوئے اس کا تفصیلی بیان ابنِ سعد کے یہاں موجود ہے۔ ابنِ سعد کے شمار کے مطابق کل ۱۰ وفود آئے لیکن مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ سب سے پہلا وفد قبیلہ مزینہ کا تھا جو رجب ۵ھ میں رسولؐ اللہ کی خدمت میں آیا [۳۲۰] اور آخری وفد غالباً محارب کا تھا جو حجۃ الوداع یعنی ذی الحجہ ۱۰ھ میں رسولؐ اللہ سے ملا تھا۔ [۳۲۱]

ابنِ سعد کی تصریحات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک سے پہلے تک جو وفود خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہو چکے تھے ان کی تعداد پندرہ کے لگ بھگ ہے۔ [۳۲۲] ان کے علاوہ فزارہ، مرہ [۳۲۳] اور داریین [۳۲۴] کا وفد تبوک سے رسولؐ اللہ کی واپسی پر مدینہ آیا۔ خولان [۳۲۵]، سلامان [۳۲۶]، غسان [۳۲۷]، حارث بن کعب [۳۲۸]، الرہاویین [۳۲۹] اور بجیلہ [۳۳۰] کے وفود ۱۰ھ کے مختلف مہینوں میں آئے۔ جبکہ وفد تمیم [۳۳۱]، کلاب [۳۳۲]، بنی البکا [۳۳۳]، بنی تجیب [۳۳۴]، حمیر [۳۳۵] کے وفود نے ۹ھ میں اظہارِ اطاعت کیا اور تقریباً چالیس وفود ایسے ہیں [۳۳۶] جن کی آمد کو ابنِ سعد نے متعین تو نہیں کیا ہے لیکن غالب امکان یہی ہے کہ ان کی آمد بھی ۹ھ میں واقعہ تبوک کے بعد ہوئی۔ بہرصورت زمانہ کا فرق کچھ ہی ہو جس طرح یہ بات طے ہے کہ مذکورہ وفود نے اسلام کی سیاسی حاکمیت اور ریاستِ نبویؐ کی سیادت کو تسلیم کر لیا۔ اسی طرح ان وفود کی آمد اس امر کو بھی ثابت کر دیتی ہے کہ عرب کے ہر گوشے اور ہر جانب ریاستِ نبوی کا سکّہ رواں ہو گیا۔ یہ تو ہو سکتا ہے اور اس کی تائید بھی تاریخی واقعات سے ہو جاتی ہے کہ عرب میں رہنے والے تمام لوگوں نے اسلام قبول نہ کیا تھا۔ مگر اس میں کسی کو کلام نہیں کہ یہ سب کے سب ریاستِ نبوی کے باشندے تھے خواہ آزاد حیثیت سے اور چاہے ذمّی کی حیثیت سے، اور جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ آخری وفد ذی الحجہ ۱۰ھ میں رسولؐ اللہ کے پاس آیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ریاستِ نبویؐ کے حدود میں توسیع کا عمل آپ کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے تک جاری رہا اور پھر حجۃ الوداع [۳۳۷] کے موقع پر الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا [۳۳۸] (آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت دین کے پسند کر لیا) کے ارشادِ خداوندی کے بموجب دین کے اتمام و اکمال کے ساتھ ہی ساتھ ریاستِ نبوی کا ارتقاء بھی مکمل ہو گیا۔ گویا ۱ھ میں ریاست کی تاسیس سے ۱۰ھ میں ریاست کی تکمیل تک کے دس سالہ عرصہ میں رسولؐ اللہ کا اقتدار بلا شرکتِ غیرے پورے عرب پر قائم ہو گیا اور رسولؐ اللہ کی ریاست و بعثت کا مقصد (جس کے لئے آپ کو مبعوث کیا گیا تھا) یعنی غلبہ اسلام اور دعوت الی اللہ بھی اتمام کو پہنچا۔ اور اللہ کا یہ ارشاد تاریخ کی پوری روشنی میں ظاہر ہو گیا کہ:

یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھھم ویابی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ

الکافرون ۔ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدٰی و دین الحق لیظہرہٗ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون ۔ (۳۳۹)

(یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں مگر اللہ اپنے نور کو اتمام کو پہنچائے بغیر نہ رہے گا ۔ خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے دوسرے تمام ادیان پر غالب کر دے)

باب چہارم

استحکامِ ریاست

چونکہ توسیع ریاست کا مطالعہ ہم نے دو ادوار کے تحت کیا ہے اس لئے استحکامِ ریاست کے لئے بھی مناسب ہوگا کہ دور کی حسب سابق تقسیم کے مطابق مطالعہ کیا جائے۔

(۱) دورِ اوّل

گزشتہ مباحث سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس عرصہ میں ریاست مدینہ نے اپنے وجود و قیام کو پوری طرح ثابت کر دیا اور یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ دنیا کی ہر مخالفت اور ہر منفی کوشش کا بھرپور مقابلہ کر کے اپنی سالمیت و خود مختاری کی بخوبی حفاظت کر سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس دور کا ابتدائی پانچ سالہ عرصہ تاریخی اعتبار سے بہت ہنگامہ خیز، بڑا اہم جو یانہ اور انتہائی صبر آزما ثابت ہوا۔ اس دوران اندرونی و بیرونی شورشوں، مخالفتوں اور عسکری حملوں کی وجہ سے رسول اللہ کو ایک دن بھی امن و سکون حاصل نہ ہو سکا۔[۱] تاہم ان تمام شدائد کے باوجود نہ تو رسول اللہ کے عزم و حوصلہ میں کوئی فرق آیا اور نہ ان فرائض اور ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں کوئی کوتاہی صادر ہوئی جو بحیثیت رسول اللہ و بحیثیت حکمران کے آپ پر عائد ہوتی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین عرب، یہودِ مدینہ، کفارِ قریش اور دوسرے مخالفین کی سرگرمیوں کو کچل کر ریاست مدینہ کی آزادانہ حیثیت کو بھی برقرار رکھا اور اسی کے ساتھ ساتھ مدینہ میں جس اسلامی معاشرے کی تشکیل و تنظیم ہو چکی تھی اس کی ترتیب اور حرکت پذیری کے عمل میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ ان باتوں کے علاوہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بے شمار مزاحمتوں کے علی الرغم اشاعتِ اسلام کے کام کو بھی رسول اللہ نے انتہائی سرگرمی سے جاری رکھا اور اس پر مستزاد یہ کہ فرائضِ حکومت یعنی قانون سازی، عام نظم و نسق، تنفیذِ احکام اور عدل و انصاف کے قیام کے سلسلے میں بھی کوئی معمولی سی غفلت نہیں برتی۔

ان تمام فرائض و اعمال کا مرکز و منبع آنحضرت کی ذات تھی۔ آپ ہی تمام شعبوں کے صدر اور نگران تھے اس سے جہاں ایک طرف یہ فائدہ ہوا کہ ہر چیز میں نظم و مرکزیت پیدا ہوئی وہاں دوسری طرف تہذیب و تمدن کا فروغ اور ریاست و سلطنت کا استحکام و ارتقاء وحی کی روشنی میں ہوا۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے تقریباً ایک سال قبل رسول اللہ کو ایسے رہنما اصول دے دئے گئے تھے جن پر آئندہ اسلامی ریاست اور معاشرہ کی تعمیر پیشِ نظر تھی۔ یہ اصول جن کو سورہ الاسراء میں بیان کیا گیا ہے[۲] ان کا خلاصہ اور مفہوم ہم اپنی زبان میں اس طرح پیش کر سکتے ہیں:

(۱) نہ صرف یہ کہ مذہبی نظامِ زندگی کا محور "توحید" ہوگا[۳]۔ بلکہ سیاسی نظام کی بنیاد بھی بلا شرکتِ غیرے حاکمیت و اقتدارِ الٰہی پر ہوگی[۴]۔

(۲) چونکہ معاشرہ کے استحکام کے لئے اس کے اداروں کا مضبوط ہونا ضروری ہے اور تمدن و معاشرت کا اوّلین ادارہ اور سب سے پہلی اکائی خاندان ہے اس لئے ایک طرف تو ماں باپ کے حقوق و فرائض اور ان کا ادب و احترام لازمی قرار دیا گیا[۵]۔ تو دوسری طرف معاشرہ کو منکرات سے بچانے اور خاندان کے ادارہ کو محفوظ کرنے کے لئے زنا اور فواحشات کو سخت مکروہ اور ناپسندیدہ بتایا گیا[۶] اور تیسری طرف قتلِ اولاد کی ممانعت کر دی گئی[۷]۔

(۳) معاشرہ کے استحکام و بقا اور امن و امان کی ضمانت کے لئے انسانی جان کا احترام لازمی شرط ہے اس لئے یہ طے کر دیا گیا کہ کوئی شخص نہ اپنی جان لینے کا حق رکھتا ہے اور نہ دوسرے کی جان۔ البتہ اللہ کی مقرر کی ہوئی یہ حرمت صرف اسی صورت میں ٹوٹ سکتی ہے جبکہ اللہ ہی کا مقرر کیا ہوا کوئی حق اس کے خلاف قائم ہو جائے اور اس میں بھی ظلم و تعدی جائز نہیں ہے[۸]۔

(۴) اجتماعی زندگی میں تعاون، فیاضی، ہمدردی اور امداد و اعانت کی فضا قائم کرنے کے لئے حق شناسی اور حق رسانی ضروری ہے اور معاشرتی عدل بھی افرادِ معاشرہ میں حقوق و فرائض کے تعین اور حسنِ سلوک کے بغیر جاری و ساری نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہا گیا کہ اقربا، اعزہ، مساکین، مسافر اور دوسرے حاجت مند حسنِ سلوک، ہمدردی اور احسان و ملاطفت کے مستحق ہیں[۹]۔ یتامیٰ کے حقوق و مفادات کی حفاظت کا حکم اس وقت تک کے لئے دیا گیا جب تک کہ وہ اپنے پیروں پر خود کھڑے نہ ہو جائیں[۱۰]۔ ایفائے عہد کو انفرادی زندگی کے معاملات کے ساتھ ساتھ خارجی و داخلی سیاست کا بھی سنگِ بنیاد بنایا گیا اور عہد کی خلاف ورزی قابلِ مواخذہ قرار دی گئی[۱۱] اور ہر معاملے میں ہر پیمانے پر وہم و گمان کی پیروی کے بجائے علم و آگہی کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا[۱۲] اور یہ ہر ایک جانتا ہے کہ معاشرہ میں باہمی تعاون اور اعتماد کی روایت قائم کرنے کے لئے یہ نکتہ کتنا اہم ہے۔

(۵) معاشی اصولوں کے ضمن میں بنیادی طور پر اس تخیل کی نفی کی گئی کہ فطری معاشی تفاوت کو ختم کر کے رزق و وسائل کے اعتبار سے معاشرہ میں لازماً جبری مساوات نافذ کی جاسکے، بلکہ یہ تعلیم دی گئی کہ فطری معاشی فرق کو مصنوعی طور پر ختم نہیں کرنا چاہیے کیونکہ "اللہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے"[۱۳]۔ صحت مند معیشت کے فروغ کے سلسلے میں کہا گیا کہ فضول خرچی سے بچا جائے[۱۴]، بخل و اسراف سے پرہیز کیا جائے[۱۵] گویا دولت کو غلط طریقوں سے ضائع کرنے یا اس کی گردش کو روک دینے کے بجائے اعتدال و میانہ روی کی تلقین کی گئی[۱۶]۔ لین دین میں صحیح ناپ تول کرنے کی ہدایت کی گئی[۱۷]۔

(۶) یہ بھی ہدایت کی گئی کہ زمین پر اکڑ کر نہ چلو[۱۸]، اس طرح جباروں اور متکبروں کی روش پر چلنے کی ممانعت کی گئی۔ جو زندگی کے ہر انفرادی و اجتماعی دائرہ پر یکساں حاوی ہے۔

بہر حال تعلیم کے پہلو میں اخلاق و تمدن کے وہ بڑے بڑے اصول ہیں جن پر زندگی کے نظام کو ہجرتِ مدینہ کے بعد قائم کرنا تھا۔

مدینہ طیبہ تشریف لانے کے بعد رسول اللہؐ نے ان اصولوں کو عملی جامہ پہنایا اور حالات و ضروریات کے تقاضوں کے مطابق بتدریج نافذ فرماتے رہے۔ یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہجرتِ مدینہ کے بعد ریاست کی تشکیل کس طرح ہوئی اور یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ منشورِ مدینہ اور مواخاۃِ صحابہ کے ذریعہ اہلِ مدینہ کے درمیان عموماً اور اہلِ ایمان کے مابین خصوصاً حقوق و فرائض کے تعین، ربط و ارتباط اور تعاون و ہم آہنگی کی جو کوششیں رسول اللہؐ نے فرمائی تھیں ان کے کیا اثرات و نتائج مرتب ہوئے۔

ان اقدامات کے علاوہ ایک بنیادی کام جو رسول اللہؐ نے انجام دیا وہ مسجد نبویؐ کی تعمیر تھی۔ تاریخی ترتیب کے اعتبار سے تعمیرِ مسجد کا کام مواخاۃ صحابہ اور منشورِ مدینہ دونوں پر تقدمِ زمانی رکھتا ہے کیونکہ مسجد نبویؐ کی تعمیر کا آغاز رسول اللہؐ نے آمدِ مدینہ کے فوراً بعد ہی کر دیا تھا[۱۹]۔ اور تقریباً سات ماہ کے عرصہ میں جب وہ مکمل ہو گئی تو آپ وہاں مستقلاً فروکش ہو گئے[۲۰]۔
مسجد نبویؐ نے مدنی معاشرے میں بڑا اہم کردار ادا کیا وہ نہ صرف عبادت گاہ، فرودگاہ رسول اور مرکزی اجتماع گاہ تھی بلکہ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کا بھی مرکز تھی مسجد نبوی کے ذریعہ ایک طرف تو اسلام کی تعلیم و تعلم اور تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ دراز ہوا، مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی تربیت اور کردار سازی کا ضروری کام انجام پایا۔ مسلمانوں کو اخوت، ہمدردی، غمخواری اور توافق و تعاون کا سبق ملا۔ بلکہ ان ثقافتی و معاشرتی فوائد سے آگے بڑھ کر دوسری طرف مسجد نبوی نے مسلمانوں کی پاکیزہ سیاسی و شہری تربیت میں بھی اہم حصہ لیا۔ مسجد میں نظام، جماعت کا اہتمام اور وہ بھی ایسا مستحکم کہ صف بندی میں ذرا سا بھی رخنہ گوارا نہیں۔ گویا کسی طور تنظیم میں کھوکھلا پن پیدا نہ ہو، پھر ایک امام کی اقتدا، اطاعت کا حکم اور ظاہری و باطنی پاکی و نظافت ایسی چیزیں ہیں جو صرف نماز کی صحت مند ادائیگی کے لئے ضروری نہیں ہیں بلکہ ان کی ضرورت اس سے زیادہ سیاست و حکومت کے معاملات اور بہتر بن شہری زندگی کی تشکیل میں پڑتی ہے۔ یہی صفات، مساوات، رواداری اور معاشرتی عدل کا موجب بنتی ہیں اور ان ہی سے ایک اچھی حکومت، منظم معاشرہ اور پختہ و مستحکم اجتماع وجود میں آتا ہے۔ مسجد نبوی نے ان بنیادوں کی تعلیم بھی دی اور ان کا دن میں پانچ بار عملی سبق بھی سکھایا جن پر ریاست نبویؐ کو قائم کرنا مقصود تھا۔ بلکہ غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مسجد کا ادارہ بجائے خود ایک ریاست کی عکاسی کرتا ہے۔ مثلاً ایک ریاست کے چار عناصر ترکیبی عام طور پر بیان کئے جاتے ہیں یعنی آبادی، علاقہ، حکومت اور اقتدارِ اعلیٰ۔ اب ظاہر ہے کہ مسجد ایک متعین علاقے یا خطہ پر واقع ہوتی ہے اس کی آبادی اس میں آنے والے نمازیوں سے پوری ہوتی ہے۔ مقتدیوں کا امام کے حکم کا اتباع اور اس کے اشارہ کی پیروی حکومت کی ہم معنی ہے اور اللہ کی کبریائی و حاکمیت اور اقتدار و حکم کا اعتراف و اعلان تو امام و مقتدی سب ہی مل کر بہر صورت کرتے ہیں۔ مسجد نبوی کی تعمیر میں مذکورہ بالا سیاسی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی مضمرات کے

علاوہ دفاعی اور جنگی مصالح کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً یہی بات کہ مسجد نبویؐ مدینہ میں بالکل مرکزی جگہ تھی اور قبائل و باشندوں کی چھوٹی چھوٹی بستیوں کا ایک زنجیرہ چاروں جانب پھیلا ہوا تھا۔ اس لئے یہ جگہ بہت محفوظ اور چاروں طرف آبادی سے گھری ہوئی تھی۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مسجد نبوی کا ادارہ محض رسمی نوعیت کا نہ تھا۔ دین و دنیا کی تمام تعلیمات مسلمانوں کو یہیں سے دی جاتی تھیں۔ قوانین کا اجرأ و اعلان یہیں سے ہوتا تھا۔ لشکرِ اسلام کو قواعدِ جنگ کی تعلیم بھی یہیں سے ملتی تھی اور جہاد میں فوج کی روانگی بھی اسی مقام سے عمل میں آتی تھی۔ وفود اور مہمان بھی یہیں اترتے تھے۔ اسی میں مدینہ کا پہلا دار العلوم "صفہ" تھا۔ اسی میں سربراہِ حکومت کا دفتر تھا۔ اسی میں فصل مقدمات ہوتے تھے اور بعض اوقات اسی جگہ مجرموں کو بطور قیدی رکھا جاتا تھا۔[۲۱]

مختصر یہ کہ اس ادارہ نے بکھرے ہوئے انسانوں کو بتدریج جمع کرنے اور انتشار و تشتت کا قلع قمع کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں باہمی یگانگت و محبت اور اتحاد و اتفاق کی ناقابلِ تسخیر قوت پیدا کرنے میں بے مثال کردار انجام دیا۔ چنانچہ اجتماعیت و مرکزیت اور نظم و انتثال امر کی اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ شریعت نے مسلمانوں کی شیرازہ بندی کو توڑنے کی کسی حال میں اجازت نہیں دی حتیٰ کہ میدانِ کارزار میں بھی نظمِ جماعت کو درہم برہم نہ ہونے دیا۔[۲۲] اور عام حالات میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ جب بھی ایک سے زیادہ آدمی ہوں تو لوگوں کو چاہئے کہ ایک کو اپنا قائد منتخب کر لیں۔[۲۳]

مزید برآں مسجد نبویؐ کی یہ افادیت و اہمیت اگرچہ پہلے دن سے ہی مسلّم تھی لیکن جب ۲ھ میں اذان[۲۴] اور تحویل قبلہ کا حکم[۲۵] بھی نافذ ہو گیا تو اس کی حیثیت دوچند ہو گئی۔ قبلہ متعین ہو جانے کا مطلب صرف اتنا ہی نہ تھا کہ نماز یا رکوع و سجود کی ایک سمت مقرر ہو گئی بلکہ یہ بھی کہ روحانی، معاشی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی و تمدنی نظامِ حیات کا مرکزِ توجہات وہ دینِ خداوندی ہے جسے پہلے حضرت ابراہیم نے پیش کیا تھا اور اب رسولؐ اللہ پیش کر رہے ہیں۔ قرآن میں تحویل قبلہ کی ایک بڑی مصلحت کو لنعلم من یتبع الرسول[۲۶] کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے یعنی دیکھیں رسولؐ کا اتباع کون کرتا ہے؛ گویا یہ ایک امتحان تھا جس میں اہلِ ایمان تو کامیاب رہے مگر سفہاء[۲۷] ناکام ہوئے۔ علاوہ بریں اسی موقع پر یہود و منافقین کے چہرے بھی بے نقاب ہو گئے۔

رسولؐ اللہ ان اقدامات سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ دوسری طرف سے قریشِ مکہ کی مخالفانہ سرگرمیاں شروع ہو گئیں اس لئے ایک ضرورت تو یہ تھی کہ دفاع کا ظاہری ساز و سامان فراہم کیا جائے اور مادی طاقت اکٹھی کی جائے۔ اس ضرورت کو رسولؐ اللہ نے کس طرح پورا کیا، اس کا مفصل جائزہ ہم گزشتہ صفحات میں لے چکے ہیں۔ دوسری ضرورت اس بات کی تھی کہ اخلاقی اعتبار سے بھی مسلمانوں کو تیار کیا جائے تاکہ وہ میدانِ جنگ کی طرح زندگی کے ہر میدان میں پیشقدمی کر سکیں اور اسلام پر جاہلی نظامِ زندگی کے ہر وار کو روکنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں بلکہ آگے بڑھ کر مسلح مزاحمت کے لئے بھی دل کی قوت مجتمع کر سکیں کہ اس کے بغیر مادی ساز و سامان بھی بیکار ہو جاتا ہے۔ اور

کسی بھی جنگ میں کامیابی کے لئے یہ شرط ہمیشہ کی طرح آج بھی ضروری ہے۔ نپولین کا قول ہے کہ "اخلاقی طاقت جسمانی طاقت سے کم از کم تین گنا زیادہ اہم ہے۔ چونکہ فوج ہر لحاظ سے اپنے ملک و قوم کی علمبردار ہوتی ہے اس لئے جس فوج میں سچائی، بُردباری، ایثار و جاں نثاری اور صلاحیت و استعداد کی خوبیاں اور عشرت رانی کے بجائے نفس کشی کے اوصاف ہوں گے، وہ ہر جد و جہد میں کامیاب رہے گی۔"[28] یہی وجہ ہے کہ قرآن کی جو سُورتیں مدینہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئیں[29] ان میں ایمانیات[30]، خصوصاً ایمان باللہ[31]، ایمان بالرسولؐ[32] اور ایمان بالآخرت[33]، اتباعِ حق[34]، اطاعتِ خدا اور رسولؐ[35]، اعتماد و توکل علی اللہ[36]، تقویٰ[37]، صبر و استقامت[38]، ثابت قدمی یا استقلال و پامردی[39]، ذکر اللہ[40]، امر بالمعروف و نہی عن المنکر[41]، عملِ صالح[42]، اقامتِ صلوٰۃ[43]، سمع و طاعت[44]، تسلیم و رضا[45]، احسان[46]، شہادتِ حق[47]، خشیتِ باری[48]، توبہ و انابت[49]، ایفائے عہد، اقرباء، یتامیٰ، مساکین، مسافروں، ضرورت مندوں کی امداد و اعانت، قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک[50] اور اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دی گئی اور بعد میں بھی وقتاً فوقتاً ان کو دُہرایا جاتا رہا۔ اسی ابتدائی زمانہ میں اپنے پرایوں دونوں سے ہوشیار و محتاط رہنے کی تاکید[51] اور معاملات میں باہمی مشورہ[52] نیز ہوشیاری[53] سے کام لینے کی تلقین انتہائی معنی خیز اور قابلِ ذکر ہے اس کے ساتھ ساتھ جہاد فی سبیل اللہ[54] اور قتال فی سبیل اللہ[55]، کافروں کی گردن مارنے[56]، منافقت سے پرہیز[57]، نافرمانیِ رسولؐ سے اجتناب[58]، کفار و اعدا کی کثرت سے نہ گھبرانے یا ہمت نہ ہارنے[59]۔ بخل سے بچنے[60]، انفاق فی سبیل اللہ[61] کرنے، نصرتِ خداوندی[62] پر یقین رکھنے، ہر معاملہ میں امانت و دیانت اختیار کرنے[63] اور دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر قسم کی تیاری کرنے[64] کی واضح تعلیمات دی گئی ہیں۔

ان احکام و ہدایات سے مسلمانوں کو چند دوسرے فوائد بھی حاصل ہُوئے۔ مثلاً ان اوصافِ حمیدہ کی بناء پر مسلمانوں نے اس وقت کے عرب جاہلی معاشرہ میں اپنی انسانی برتری ثابت کی اور پھر اپنے طرزِ عمل سے اچھے انسان اور اچھے مسلمان ہونے کا نقش اپنے ہر مخالف کے دل پر نقش کیا۔ مسلمانوں کے یہی وہ اصل ہتھیار تھے جن سے کام لے کر انہوں نے ایک طرف میدانِ جنگ میں اپنی برتری کا ثبوت پیش کیا، تو دُوسری طرف لوگوں کے قلوب کو مسخر کیا۔ مزید برآں میدانِ سیاست میں بھی سرفرازی حاصل کر کے یہ دکھا دیا کہ اسلام معتقدات کو جن اخلاقی اقدار کے تابع کرتا ہے، سیاست بھی ان ہی کے تابع ہے اور یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ اس تعلیم نے مسلمانوں کو ریاستِ نبوی کے اچھے شہری بننے کے لئے ضروری تربیت فراہم کی نیز معاشرہ کی شیرازہ بندی، فلاح و ترقی اور تربیت و تنظیم میں بھی مؤثر کردار ادا کیا۔

یہاں ایک اہم اور قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ اگرچہ مندرجہ بالا احکام کی فہرست بہت طویل ہے اور موقع و محل کے لحاظ سے ان سب کی اہمیت مسلّم ہے تاہم قرآن یہ بتاتا ہے کہ اس وقت معاشرہ کے تنظیمی مراحل میں سب سے زیادہ ضرورت اطاعتِ خدا و رسول، اتحاد و اتفاق اور صبر و استقامت کی تھی۔ چنانچہ ہجرت کے بعد سے کم و بیش پانچ سال تک جتنی سورتیں بھی نازل ہُوئیں ان میں ان موضوعات کو بار بار ذہن نشین کرایا گیا ہے بلکہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ان کی تاکید میں اضافہ ہوتا گیا۔ مثلاً بالکل ابتدائی سورتوں میں تو خدا اور رسولؐ کی اطاعت کا سادہ سا حکم موجود ہے۔ لیکن سورۂ انفال میں

(جو سنہ ۲ھ میں غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوئی) اس کے دوسرے حضرات کو بھی اسی طرح بیان کیا گیا کہ: واطیعوا اللّٰہ و رسولہ و لا تنازعوا فتفشلوا و تذھب ریحکم و اصبروا[۶۵] (خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں تنازعہ نہ کرو کہ ایسا کرنے سے تو تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی اور صبر سے کام لو) علاوہ ازیں اس کے بعد نازل ہونے والی سُورت، سورہ آل عمران میں جنگِ اُحد پر تبصرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کی عارضی ہزیمت کا سبب اس طرح بیان کیا گیا کہ:

حتی اذا فشلتم و تنازعتم فی الامر و عصیتم من بعد ما اراکم ما تحبون۔[۶۶]

(یہاں تک کہ جو تم چاہتے تھے اللہ نے تم کو دکھا دیا۔ اس کے بعد تم نے ہمت ہار دی اور حکمِ رسول میں تنازعہ کرنے لگے اور اس کی نافرمانی کی)۔

چنانچہ اصولی ہدایت یہ دی گئی کہ:

یاایھا الذین امنوا اصبروا و صابروا و رابطوا و اتقوا اللّٰہ لعلکم تفلحون۔[۶۷]

(اے اہلِ ایمان! ثابت قدم رہو اور استقامت رکھو اور مورچوں پر جمے رہو اور اللہ سے ڈرو تاکہ مراد حاصل ہو)

اس کے بعد سورۂ نساء میں کہا گیا کہ:

اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم[۶۸]

(اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں سے صاحبانِ امر و اختیار ہیں)

یہ آیت اللہ و رسول کو محض رسمی طور پر مطاع ماننے اور اولی الامر کی فرمانبرداری کا سرسری حکم ہی نہیں دیتی بلکہ فی الواقع اس میں گہری معنویت پائی جاتی ہے اور اسی لئے یہ آیت در اصل اسلام کے مذہبی، تمدنی اور سیاسی نظام کی حقیقی بنیادوں کو پُوری طرح متعین کر دیتی ہے۔ پھر اسی سورت میں کچھ آگے رسولؐ اللہ کی اطاعت اور آپ کے حکم و فیصلے کو تقاضائے ایمان و اسلام بتایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ:

فلا و ربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت و یسلموا تسلیما۔[۶۹]

(تمہارے رب کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں حکم نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کر دو اس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں اور راضی بہ رضا ہو جائیں اس وقت تک مومن نہ ہوں گے)

اور سورۂ حشر میں جو سنہ ۴ھ میں نازل ہوئی یہ طے کر دیا گیا کہ:

ما اتٰکم الرسول فخذوہ و ما نھاکم عنہ فانتھوا۔[۷۰]

(رسول جو کچھ تمہیں دیں، لے لو، اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ)

پھر غزوۂ خندق کے بعد نازل ہونے والی سورت "الاحزاب" میں رسولؐ اللہ کی ذاتِ گرامی کو نمونہ اور مثال (لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ)[1] اور خاتم النبیین (ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین)[2] قرار دے کر اطاعت و انقیاد کی تمام نزاکتوں کو واضح کر دیا گیا۔

اگر ہم ان آیات محولہ بالا پر عمرانی نقطۂ نظر سے غور کریں تو ہمارے سامنے یہ بات آئے گی کہ فی الجملہ اسلامی معاشرہ کے خدوخال متعین ہو گئے اور اس کی عمومی صورت گری بھی ہو گئی۔ کیونکہ اسی دور میں معاشرتی بنیادیں، معاشرتی ادارے، معاشرتی اقدار اور معاشرتی عناصر کے حقوق و فرائض کا تعین عمل میں آیا۔ معاشرہ کے مقاصد طے ہوئے اور نہ صرف یہ کہ معاشرہ کی حرکت پذیری کے لئے جہت مقرر ہو گئی بلکہ معاشرہ کے لئے ایک مثال اور نمونہ کی تعیین بھی ہو گئی اور یہ بات عمرانیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ بغیر کسی نمونہ اور مثال کے نہ تو کوئی معاشرہ قوت نمو پا سکتا ہے اور نہ صحیح سمت میں اس کا ارتقاء ممکن ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریاست مدینہ کے ابتدائی پانچ سالہ دور میں اسلامی معاشرہ کی تکمیل ہو جاتی ہے اور اس کے استحکام و ارتقاء میں بھی غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرہ کی تنظیم اور نشوو ارتقاء کے تمام مراحل میں رعیت کے تمام طبقات و عناصر سے تعلقات کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور جس کے ساتھ جیسا برتاؤ ضروری تھا اس کا لحاظ ہر موقع پر رکھا۔ مدینہ کے باشندوں میں سے جہاں تک مہاجرین و انصار کا تعلق ہے تو اوّل تو وہ اسی معاہدے پر کاربند رہے جو بیعت عقبۂ کبیرہ کے موقع پر کیا گیا تھا اور جس کی رُو سے انصار پر مہاجرین کی حفاظت و دفاع واجب تھا البتہ مہاجرین کی طرف سے کسی پیش قدمی کی صورت میں وہ مدد کرنے کے پابند نہ تھے۔ غالباً رسولؐ اللہ نے بھی معاہدۂ عقبہ کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے ان ابتدائی مہمات میں انصار کو شریک نہیں کیا جو قریش کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے اور مناسب کارروائی کرنے کے لئے روانہ کی گئیں۔ یہاں تک کہ جب قریش کا ایک رئیس کرز بن جابر الفہری (ربیع الاول ۲ھ میں) مدینہ میں وادی العقیق سے متصل چراگاہ پر چھاپہ مار کر کچھ مویشی لے گیا تب بھی رسولؐ اللہ مہاجرین ہی کی ایک جماعت لے کر اس کی سرکوبی کے لئے تشریف لے گئے تھے۔[3] اور حسنِ سیاست و تدبر کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اہل مدینہ سے صرف ان ہی مواعید کے پورا کرنے کا مطالبہ کیا جاتا جو بیعت عقبہ کے موقع پر انہوں نے اپنی رضامندی سے کئے تھے اور اس وقت تک ان سے مزید کوئی مطالبہ نہ کیا جاتا جب تک کہ اسلامی جذبہ سے متاثر ہو کر وہ از خود ایسا کرنے پر آمادہ نہ ہو جاتے۔[4] اس کے بعد معاہدۂ مواخاۃ مہاجرین و انصار دونوں گروہوں کے درمیان رشتہ و تعلق کو مزید مستحکم کرنے کا موجب بنا اور ان کے درمیان نفاق و شقاق پیدا کرنے کی تمام مخالفانہ کوششیں ناکام ہو گئیں۔ اور جس کا تفصیلی بیان پہلے ہم کر چکے ہیں۔ بہرحال ہجرت سے غزوۂ بدر تک کی مدت، مہاجرین و انصار کے درمیان تعلقات کے استحکام، آپس کے اعتماد و اعتبار اور ایک دوسرے میں جذب ہو جانے کے لئے کافی نہیں۔ اور واقعات کا مطالعہ کرنے سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ کرز بن جابر الفہری کی ڈاکہ زنی نے

انصار کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ مہاجرین سے اشتراکِ عمل ضروری ہے کیونکہ اب خود ان کے اموال و نفوس کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ شاید اسی لئے رسول اللہؐ بدر کے لئے مدینہ سے نکلے تو یہ پہلا موقع تھا کہ انصار بھی ساتھ تھے۔ رسول اللہؐ کی مشورہ طلب نگاہوں پر انصار کی طرف سے حضرت سعد بن معاذ کی تاریخی تقریر[۵] اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اب انصار نے رضاکارانہ طور پر اپنے اوپر یہ لازم کر لیا کہ وہ ہر لڑائی میں خواہ مدینہ کے اندر ہو یا مدینہ سے باہر مہاجرین کا ساتھ دیں گے۔

مہاجرین و انصار کے معاملات کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے رسمی و غیر رسمی تمام معاہدات کو پُورے طور پر نبھایا اور منشورِ مدینہ کی رُو سے ان پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں انہیں بھی کما حقہ، پُورا کیا۔ نیز چونکہ یہی عناصر ریاست کی مرکزی ہیئت متصور ہوتے تھے اس لئے انہوں نے اپنی اس حیثیت کا جواز اپنے طرزِ عمل سے مہیا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں دکھائی۔

مہاجرین و انصار کے علاوہ مدینہ میں رہنے والوں میں سے جو لوگ منشورِ مدینہ کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے اسلامی ریاست کے ارتقاء میں ممد و معاون تھے ان سے تعرّض کا تو سوال ہی نہ تھا البتہ جنگِ بدر کے بعد منافقین کا جو گروہ منظرِ عام پر آیا تھا اس سے نمٹنے کے لئے بڑی حکمت اور دُور اندیشی کی ضرورت تھی۔ منافقین کے سلسلے میں خالص مذہبی نقطۂ نظر سے جو کچھ لکھا گیا ہے اور حقیقت نفاق، منافقین کے مختلف الخیال افراد اور ان کے مقاصد اور ان کی اقسام وغیرہ کے ضمن میں جو تفصیلات پائی جاتی ہیں[۶]۔ ان کا نہ تو استقصاء ممکن ہے اور نہ ہمارے موضوع سے ان کا براہِ راست تعلق۔ اس لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریاست نبوی میں بحیثیت ایک جماعت منافقین کے کردار، ان کے طرزِ عمل اور مقاصد پر تاریخی نقطۂ نظر سے غور کریں اور پھر یہ جائزہ لیں کہ ریاست نبوی کی پالیسی اس گروہ کے بارے میں کیا رہی ہے!

ایک گروہ کی حیثیت سے منافقین کا اطلاق عموماً ان لوگوں پر ہوتا ہے جو بظاہر ایمان و اسلام کے مدعی ہوں لیکن بباطن ان کے دعوے میں اخلاص و صداقت موجود نہ ہو[۷] اس گروہ میں شامل ہونے والے افراد کا تعلق اگرچہ زیادہ تر اوس اور خزرج کے قبائل سے تھا[۸] اور ان کی قیادت بھی ایک خزرجی سردار عبداللہ بن ابی کے سپرد[۹] تھی لیکن واقعات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کی پشت پناہی کرنے، ان کو مواد فراہم کرنے اور ان کو مہمیز لگانے والے "یہود" تھے۔ بلکہ اسی گروہ منافقین میں جیسا کہ ابن ہشام نے تصریح کی ہے کم از کم آٹھ افراد بنو قینقاع کے شامل تھے[۱۰]۔ نیز اغراض و مقاصد اور طریقہ کار میں بھی یہود و منافقین کے درمیان حد درجہ مماثلت[۱۱] پائی جاتی تھی۔ یہود کو اسلام سے شدید نفرت، رسول اللہؐ سے للّٰہی بغض اور مسلمانوں سے انتہائی سخت عداوت تھی اور وہ اسلامی معاشرہ میں انتشار و افتراق پھیلانے کی انتہائی خواہش رکھتے تھے۔ اب یہ دُوسری بات ہے کہ رسول اللہؐ کے بروقت اقدامات، اور آپ کی ذہانت و فراست کی وجہ سے یہود کو کم و بیش ہر موقع پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہود اور منافقین دونوں نے اپنی سعی کوشش کرنے میں کبھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

ہمارے اوّلین تاریخی مآخذ میں منافقین کے کچھ نام مل جاتے ہیں ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ منافقین کے

گروہ میں زیادہ تر معمر با اثر اور خوشحال افراد شامل تھے[۸۲] ۔ نوجوان آدمی قیس بن عمرو بن سہل[۸۳] کے علاوہ شاید ہی کوئی ہو ۔ زیادہ تر منافقین خوشحال ہونے کے ساتھ ساتھ خوش شکل، خوش رو، خوش وضع، دراز قد، بلکہ لحیم شحیم افراد تھے[۸۴] ۔ ان کے خیالات مستحکم، عقاید پختہ، طرزِ عمل سوچا سمجھا اور مفادات متعین تھے۔ ان کے شب و روز رسول اللہؐ، آپ کے اصحاب، ریاستِ نبوی اور عام مسلمانوں کے خلاف سعی و جہد کے لئے وقف تھے۔ ان کی تمام کوششوں کا مدعا یہ تھا کہ مدینہ کی فضا کو بگاڑا جائے۔ وہاں کی سرزمین پر فساد[۸۵] پھیلایا جائے اور حسد و نفاق کی سرنگیں لگا کر ریاستِ نبوی کو سبوتاژ کر دیا جائے۔ انہوں نے مصلحتاً اسلام قبول کر لیا تھا اور دکھاوے کے لئے نماز وغیرہ بھی علانیہ پڑھتے تھے[۸۶] مگر دشمنانِ اسلام سے ساز باز کرکے[۸۷] اسلام کی اجتماعی قوت کو توڑنے، دین کی ہوا خیزی کرنے اور عام لوگوں یا کمزور مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے نہ تو وہ تفرقہ انگیزی[۸۸] سے چوکتے تھے اور نہ دشمنانِ اسلام کی جاسوسی[۸۹] سے باز آتے تھے بلکہ اسلام قبول کرکے علی الاعلان عجیب و غریب حرکتیں کرتے تھے تاکہ لوگوں کو دینِ حق سے بدظن کیا جا سکے۔ سنجیدہ معاملات میں بھی تضحیک و استہزاء، مسلمانوں کی مجلسوں، مساجد اور اجتماعات میں شرکت اور پھر دشمنانِ اسلام کو اس کی اطلاع و مخبری اور سازشیں کرنا منافقین کا روزمرہ کا معمول تھا[۹۰] ۔ علاوہ ازیں مدینہ کی فضا کو مسموم کرنے، معاشرہ کی یکجہتی مٹانے اور امن و امان کو غارت کرنے کے لئے افواہ طرازی، شوشہ بازی، فتنہ جوئی، طعن و تشنیع اور غلط خبریں اڑانے میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ جھوٹ بولنا اور جھوٹی قسمیں کھانا[۹۱] ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

یہود کی طرح منافقین کے گروہ پر بھی منشورِ مدینہ کا احترام سخت شاق گزرتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھی (یہود کی طرح) اس منشور کو پامال کرتے ہوئے قریش سے تعلقات استوار کئے۔ ان کے لئے جاسوسی کے فرائض انجام دئے اور انہیں فتح کی امید دلا کر مسلمانوں پر فوج کشی کے لئے ابھارا۔ گویا یہ کہنا چاہئے کہ منافقین ہر آن اور ہر لمحہ محض اپنے ذاتی و مادی مفادات کی ہی پرستش کرتے رہے۔ اب جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ان کوششوں یا مقاصد میں منافقوں کو کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی تو تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ بلاشبہ وقتی طور پر تو انہیں بعض مواقع پر کچھ کامیابیاں ضرور حاصل ہوئیں لیکن انجام کار انہیں اپنے ہر مقصد میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ قرآن نے یہ کہہ کر شاید اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ:

وھموا بما لم ینالوا۔[۹۲]

لیکن یہ جان لینے کے باوجود کہ اپنے مقاصد میں انہیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی یہ حقیقت ہے کہ منافقین نے شرارت کا کبھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور رسول اللہؐ مسلمانوں اور ریاست کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے میں پوری تندہی سے کام لیتے رہے۔ مثلاً ایک مرتبہ رسول اللہؐ کسی راستے سے گزر رہے تھے کہ عبد اللہ بن اُبی آپ کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آیا۔ اس کی شکایت رسول اللہؐ نے حضرت سعد بن عبادہ سے فرمائی تو انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! اس کے ساتھ نرمی برتئے آپ کی تشریف آوری سے پہلے ہم اس کے لئے تاجِ شاہی

تیار کر رہے تھے۔ اب یہ سمجھتا ہے کہ آپ نے اس سے بادشاہی چھین لی ہے[۹۳]۔ اس سے یہ سمجھنا آسان ہے کہ منافقین کے قائدِ اعلیٰ کے دل میں رسول اللہؐ اور مسلمانوں کے خلاف بغض و عداوت کا آتش فشاں لاوا ہجرتِ مدینہ کے پہلے ہی روز سے پکنا شروع ہو گیا تھا اور یہ واضح ہے کہ نفاق کی پوری تاریخ کا مرکزی کردار یہی شخص ہے۔ اسی طرح سرخیلانِ نفاق میں سے زید بن الصلت بنو قینقاع کے بارے میں حضرت عمرؓ سے نبرد آزما ہوا[۹۴] اور ایک موقع پر جبکہ رسول اللہؐ کی اونٹنی کھو گئی تھی تو اس نے رسول اللہؐ سے بطور طنز یہ کہا تھا کہ "غیب کی خبریں تو بتلاتے پھرتے ہو لیکن اتنی خبر نہیں کہ اونٹنی کہاں گئی!"[۹۵] رسول اللہؐ کے قیامِ مدینہ کے بالکل ابتدائی دور میں منافقین کا ایک اعتراض یہ تھا کہ رسول اللہؐ پر ایسی سورت کیوں نازل نہیں ہوتی جس میں جنگ و جہاد کا صریح حکم ہو۔ لیکن جب ان کا مطلوبہ حکم واقعی نازل ہو گیا تو ان کے ہوش اُڑ گئے اور میدانِ جنگ سے جی چُرانے لگے[۹۶]۔ جنگِ بدر کے بعد بنو قینقاع کی علانیہ بدعہدی اور بلا اشتعال سرکشی پر رسول اللہؐ نے ان کا محاصرہ کیا تو عبد اللہ بن اُبی ان کی حمایت پر کھڑا ہو گیا اور رسول اللہؐ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا کہ: "یہ سات سو مردانِ جنگی جو ہر دشمن کے مقابلہ پر میرا ساتھ دیتے رہتے ہیں، آج ایک دن میں آپ انہیں ختم کر ڈالنا چاہتے ہیں؛ خدا کی قسم میں آپ کو ہرگز نہ چھوڑوں گا جب تک کہ آپ میرے ان حلیفوں کو معاف نہ کر دیں گے۔"[۹۷]

اس گروہ کا نفاق اس وقت بالکل ظاہر ہو گیا جب جنگِ اُحد کے موقع پر لشکرِ اسلامی روانہ ہُوا تو عبد اللہ ابن اُبی نے مسلمانوں سے کھلی ہوئی غدّاری کرتے ہوئے تقریباً تین سو ساتھیوں سمیت انتہائی نازک گھڑی میں علیحدگی اختیار کی اور مسلمانوں کے حوصلوں کو پست کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کا اندازہ لوگوں کو اچھی طرح ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب جنگِ اُحد کے بعد پہلا جمعہ آیا اور عبد اللہ بن ابی حضورؐ کے خطبہ سے پہلے حسبِ معمول تقریر کرنے کے لئے اُٹھا تو لوگوں نے اس کا دامن کھینچ کر بٹھا دیا اور کہا کہ: "بیٹھ جاؤ، یہ باتیں کرنے کے تم اہل نہیں ہو!"[۹۸] مدینہ میں یہ پہلا موقع تھا جبکہ قائدِ منافقین کی علانیہ تذلیل کی گئی۔ چنانچہ اس پر وہ برہم ہو کر فوراً مسجد نبوی سے باہر نکل گیا اور رسول اللہؐ سے کسی قسم کی معذرت بھی طلب نہ کی[۹۹]۔ پھر اس گروہ منافقین نے غزوۂ بنو نضیر کے موقع پر جس طرح یہود کی کھلی حمایت و پشت پناہی کی تھی وہ ایک مشہور بات ہے[۱۰۰]۔ انہوں نے یہودِ بنو نضیر کو انتہائی بے باکی سے جو پیغام بھیجا تھا اسے قرآن نے ان ہی کے الفاظ میں یوں نقل کیا ہے کہ:

الم تر الی الذین نافقوا یقولون لاخوانھم الذین کفروا من اھل الکتاب لئن اخرجتم
لنخرجن معکم ولا نطیع فیکم احداً ابداً وان قوتلتم لننصرنکم واللہ یشھد انھم
لکاذبون۔[۱۰۱]

پھر آگے یہ الہامی جواب بھی دے دیا گیا کہ:

لئن اخرجوا لا یخرجون معھم ولئن قوتلوا لا ینصرونھم ولئن نصروھم لیولن الادبار
ثم لا ینصرون۔[۱۰۲]

پھر منافقین کے لئے فتنہ پردازی کا ایک اور سنہری موقع اس وقت آیا جبکہ ایک طرف تو شمال کی جانب سے ریاستِ نبوی کے

تمام مخالفین کا ایک لشکرِ گراں حملہ آور ہوا اور دُوسری طرف جنوب کی سمت میں رہنے والے یہود بنو قریظہ نے عہد شکنی کا اعلان کر دیا تھا۔ یہ وقت مسلمانوں کے لئے بڑا نازک تھا۔ دو طرف سے دشمنوں کا نرغہ، مٹھی بھر مسلمان، مخالفین کا اجتماعِ عظیم، عورتوں اور بچوں کا بنو قریظہ کی جانب کے قلعہ میں قیام وغیرہ نے بجا طور پر پریشان کن صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ منافقین کے گروہ نے ان نازک لمحات میں اہلِ ایمان میں خوف و ہراس پھیلانے، اسلام و رسول کے متعلق بے سروپا باتیں کہنے اور پست حوصلگی کی تدابیر اختیار کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ کبھی تو یہ بات پھیلائی گئی کہ مسلمان سخت خطرے میں ہیں اور انہیں یہود و مشرکین یا کفار وغیرہ میں سے کسی نہ کسی فریق سے سمجھوتہ کر لینا چاہیے کبھی پروپیگنڈے کا یہ طرز پیرایہ اختیار کیا گیا کہ "محمد نے ہم سے وعدہ تو قیصر و کسریٰ کے خزانوں کا کیا تھا مگر اس وقت حال یہ ہے کہ ہم بعافیت رفعِ حاجت کے لئے بھی باہر نہیں جا سکتے"[۱۰۳]

اسی کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ:

وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ، مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا۔[۱۰۴]

منافقین نے اسی پر بس نہیں کیا۔ رسول اللہؐ نے تبنیت کی جاہلی رسم کو مٹانے کے لئے غزوۂ احزاب کے بعد حضرت زینب سے نکاح فرمایا۔ منافقین نے اس واقعہ کو ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ وُہ رسول اللہؐ کی اس اخلاقی برتری کو ختم کر دیں گے جو مسلمانوں کی کامیابی کا اصل سرچشمہ ہے۔ چنانچہ اصل حقیقت کو چھپاتے ہوئے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بے سروپا باتیں اور افسانے تراشے اور آپ پر بہو سے بیاہ رچا لینے کا الزام تھوپ دیا۔ ان کے پروپیگنڈے کا یہ طوفان اس قدر شدید تھا کہ بعض مسلمان بھی غلط فہمی کا شکار ہو گئے لیکن اسی مرحلہ پر الہامی ہدایات اور اصلاحی احکام نے مسلمانوں کی مشکل آسان کر دی اور معاشرہ تباہی سے بچ گیا۔

بہرصورت یہ تو صرف چند مثالیں تھیں ورنہ ان کی حرکاتِ قبیحہ کی فہرست بڑی طویل ہے جس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ریاست نبوی کی جانب سے ان کی سخت گرفت کی جاتی مگر رسول اللہؐ نے ان کے ساتھ نرمی اور ملاطفت کا معاملہ کیا اور مسلسل چشم پوشی و درگزر سے کام لیتے رہے۔ منافقین کے ساتھ رسول اللہؐ کی یہ پالیسی مندرجہ ذیل وجوہات پر مبنی نظر آتی ہے یعنی:

(۱) جو لوگ محض شکوک و شبہات، کج فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اس گروہ میں شامل ہو گئے تھے ان کی نفسیاتی اصلاح کی غرض سے بار بار معافی و درگزر سے کام لیا گیا اور اس طرح انہیں راہِ راست پر آنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ ظاہر ہے اس قسم کی نفسیاتی اصلاح کے لئے ایک مدت درکار ہوتی ہے۔

(۲) منافقین کی تمام منفی سرگرمیاں چونکہ اسلام کے پردہ میں تھیں اور ان کے خلاف کوئی سخت قدم اس وقت تک نہیں اٹھایا جا سکتا تھا جب تک کہ ان کی طرف سے کسی کھلی بغاوت یا علانیہ جُرم کا ارتکاب نہ ہو۔ اس لئے مہلت دی گئی تاکہ وُہ اپنے جرائم پر خود ہی شاہد بن جائیں۔ انتظار و مہلت کی اسی توجیہ کو بعد میں رسول اللہؐ نے حضرت عمرؓ سے خود بھی ارشاد فرمایا تھا کہ:

فَکَیْفَ یَا عُمَرُ اِذَا تَحَدَّثَ النَّاسُ اَنَّ مُحَمَّدًا یَقْتُلُ اَصْحَابَهٗ۔[۱۰۵]

(عمر! دنیا کیا کہے گی کہ محمد خود اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کر رہا ہے)۔

(۳) عفو و درگزر کی پالیسی اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ منافقین کا گروہ مختلف النوع مقاصد اور اختلافات[۱۰۶] کے باوجود، تعداد میں خاصا بڑا تھا[۱۰۷] اور اس میں شامل افراد کا تعلق کم و بیش قبائل اوس و خزرج کی ہر شاخ[۱۰۸] سے تھا۔ ایسی صورت میں یہ کسی طرح مناسب نہیں تھا کہ ریاست کے بیرونی دشمنوں اور یہود سے لڑائی کے ساتھ ساتھ اس بڑے گروہ سے بھی جنگ شروع کر دی جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی منافقت کا حال جانتے ہوئے بھی رسولؐ اللہ ایک مدت تک ان کے ساتھ ظاہری دعویٰ ایمان کے لحاظ سے معاملہ فرماتے رہے۔[۱۰۹] علاوہ ازیں یہ (منافقین) اتنی طاقت اور اخلاقی جرأت بھی نہ رکھتے تھے کہ علانیہ کافر بن کر اہلِ ایمان سے لڑ لیتے یا کسی حملہ آور دشمن کے ساتھ مل کر کھلم کھلا میدان میں آ جاتے۔[۱۱۰] قرآن نے بھی اس کی وضاحت یُوں کر دی ہے کہ:

لا یقاتلونکم جمیعاً الا فی قریً محصنة او من وراء جدر ۔ باسھم بینھم شدید ، تحسبھم جمیعاً و قلوبھم شتی ، ذٰلک بانھم قوم لا یعقلون ۔[۱۱۱]

(۴) منافقین کی پشت پناہی اور حمایت کرنے بلکہ شہ دینے والا عنصر یہود کا تھا۔ مدینہ سے یہود کا مکمل اخراج غزوۂ بنو قریظہ کے بعد عمل میں آیا اس وقت تک منافقین سے بھی سختی نہ برتی گئی تھی۔ اس میں یہ حکمت تھی کہ یہود کا قلع قمع ہو جانے کے بعد منافقین کا زور بھی ٹوٹ جائے گا اور ان سے نمٹنا بھی آسان ہو گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ منافقین یہود کے انجام سے عبرت پکڑ لیں۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ سورۂ احزاب میں جو غزوۂ بنی قریظہ کے بعد نازل ہوئی منافقین کو متنبہ کر دیا گیا کہ وہ اپنی روش بدل لیں اور اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں ورنہ اب ان کے ساتھ سختی برتی جائے گی۔ کیونکہ اسلامی معاشرے اور ریاست میں اس طرح کے مفسدین کو مزید پھلنے پھُولنے کا موقع نہیں دیا جا سکتا۔ الفاظ یہ ہیں کہ:

لئن لم ینتہ المنافقون والذین فی قلوبھم مرض والمرجفون فی المدینة لنغرینك بھم ثم لا یجاورونك فیھا الا قلیلا ۔ ملعونین اینما ثقفوا اخذوا و قتلوا تقتیلا ۔[۱۱۲]

یعنی اگر منافقین اور وُہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے اور وُہ جو مدینہ میں ہیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے ہیں اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کے لئے تمہیں مقرر کریں گے پھر وہ اس شہر میں تمہارے ساتھ مشکل ہی سے رہ سکیں گے۔ ان پہ ہر طرف سے لعنت کی بوچھاڑ ہو گی جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور بُری طرح مارے جائیں گے۔

(۵) منافقین کے بیشتر افراد کا تعلق اوس اور خزرج سے تھا ان کے رشتہ دار اور قریبی عزیز نہ صرف یہ کہ اسلام لے آئے تھے بلکہ اخلاص و محبت کے قابلِ رشک جذبات رکھتے تھے اور انہوں نے رسولؐ اللہ و مہاجرین سے حسنِ سلوک کا بے مثال معاملہ بھی کیا تھا۔ چنانچہ حُسنِ سیاست اور مروّت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اوس اور خزرج کے مخلص اور صادق الایمان لوگوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کے بعض نادان رشتہ داروں کی قبیح حرکات سے درگزر کیا جائے۔[۱۱۳]

بہرصورت ان وجوہات کے پیشِ نظر رسولؐ اللہ نے ان سے نرمی و درگزر کا سلوک کیا۔ ان کی مذمت کرنے پر اکتفا کیا

ان کی مذمت کرنے پر اکتفا کیا اور ان کی طرف سے ہر مخالفانہ چال کا اپنی حسنِ تدبیر سے دفیعہ کرتے رہے۔ اس کے بعد ان سے جس قسم کا سلوک کیا گیا اس سے آئندہ بحث کی جائے گی۔

اب جہاں تک یہود کا تعلق ہے تو یہ واضح ہے کہ ان سے رسول اللہؐ کو سابقہ ہجرت کے بعد سے مسلسل پیش آ رہا تھا یہ لوگ اہلِ مذہب اور اہلِ کتاب تھے۔ اس لئے فخر و غرور اور تفاخر میں مبتلا تھے۔ یہود نے بالکل ابتدائی زمانے میں ہی منشورِ مدینہ کو تسلیم کر کے رسول اللہؐ کی حکمرانی و قیادت کو بھی مان لیا تھا اور اپنی اطاعت کا عہد استوار کیا تھا۔ لیکن تاریخی شہادتوں کے مطابق انہوں نے اس عہد کا ذرہ برابر پاس نہ کیا بلکہ ہمیشہ ریاست کے خلاف سرگرمِ عمل رہے اور دوسرے عناصر سے مل کر ریاست کو ختم کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ آخر کار جب ان کی سرکشی حد سے زیادہ بڑھ گئی اور ریاست کے خلاف وہ پوری بے باکی سے جرائم کا ارتکاب کرنے لگے تو رسول اللہؐ کو ان کے خلاف سخت قدم اٹھانا پڑا۔ سب سے پہلے یہود بنو قینقاع سے نمٹا گیا، پھر بنو نضیر کی باری آئی اور آخر میں بنو قریظہ کا استیصال کیا گیا۔ رسول اللہؐ کے ان تمام اقدامات کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ زیرِ مطالعہ دور میں معاشرتی اصلاح اور ریاست کی دستوری ضروریات کے لئے تشریع و قانون سازی یا اجرائے احکام کے سلسلے میں رسول اللہؐ نے کس نہج پر کام کیا۔ اس ضمن میں اگرچہ تفصیلات بہت ہیں لیکن مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہؐ نے حاکمیتِ الٰہی کے تحت فرائضِ حکومت انجام دیئے[114] اور دین و دنیا کے اہم معاملات میں اصحابِ رائے سے مشورہ[115] کرنے کے بعد عمل کیا، مثلاً مسئلۂ اذان، بدر کے لئے روانگی، جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک، جنگِ بدر کے لئے مقامِ جنگ کے انتخاب اور دوسرے اہم معاملات میں آپ نے یہی طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ سرایا اور دوسری جنگوں میں امیرِ لشکر مقرر کرنا، ائمہ و مؤذنین کا تقرر، جہاد کا اعلان، مالِ غنیمت کی تقسیم، فوجوں کی آراستگی و قیادت، جنگ و صلح کا اعلان، معاہدات کا انعقاد، فرامین کا اجراء، اصلاح بین الناس اور سیاسی تحکیم[116] وغیرہ کی ذمہ داریاں براہِ راست رسول اللہؐ کے اوپر تھیں۔ نمازوں کی امامت بھی آپ نے فرمائی اور تشریع و قانون سازی کی ضروریات کو بھی آپ ہی نے پورا فرمایا۔ عدل و انصاف کا صرف حکم ہی نہیں دیا بلکہ اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے مقدمات کا فیصلہ بھی کیا[117] اور نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ غیر مسلموں کے تنازعات بھی بطور حکم فیصلہ دیا[118]۔ کیونکہ اول تو منشورِ مدینہ کی رُو سے بھی آخری عدالت مرافعہ آپ کی ذات تھی۔ بحیثیت رسولؐ بھی آپ حکم اور فیصلہ کنندہ تھے اور سربراہِ ریاست ہونے کی حیثیت سے بھی یہ آپ کا کام تھا، نیز آپ کے فیصلے اتنے مبنی بر انصاف ہوتے تھے کہ غیر مسلم از خود اپنے فیصلے رسول اللہؐ سے کرانے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔

پانچ سال کا یہی ابتدائی عرصہ وہ ہے جس میں معاشرتی اصلاح کے لئے احکام کا اجرا ہوا۔ تحویلِ قبلہ کا حکم آیا[119]۔ اذان فرض ہوئی[120]، صیام کو فرض کیا گیا[121]، امتناعِ شراب کا ابتدائی حکم آیا[122]، سُود خوری کی بطور ترغیب ممانعت کی گئی[123]۔ وراثت کے مفصل قانون کا اجراء ہوا[124] اور مواخاۃ کی بنا پر ارث کا قاعدہ موقوف کیا گیا[125]۔ قانون ازدواج میں حقوق الزوجین

مقرر کئے گئے۔ مشرک عورتوں اور مردوں سے نکاح کی ممانعت کر دی گئی [۱۲۶]، نکاح و طلاق، مہر، عدت کے احکام [۱۲۷]، پردہ کے احکام [۱۲۸]، قانونِ جنگ و صلح [۱۲۹]، اسیرانِ جنگ کے ساتھ سلوک کا قانون [۱۳۰]، مالِ غنیمت کا قانون [۱۳۱]، اراضی مفتوحہ کا قانون [۱۳۲]، شہادتوں کو چھپانے کی ممانعت کا قاعدہ [۱۳۳] اور ارتداد کی خاص شکل کا ضابطہ [۱۳۴] جاری ہوا اور حدود و تعزیرات کے سلسلہ میں مختلف قوانین مثلاً جان کی حرمت قصاص و دیت [۱۳۵]، لعان، ظہار [۱۳۶] وغیرہ مرتب ہوئے۔ عدالت و قضا کے اختیارات و حدود کا تعین کیا گیا۔ تبنیت کے مسئلہ [۱۳۷] کو حل کیا گیا اور رسول اللہؐ کے بعض مستثنیات و مراعات کا تعین بھی کر دیا گیا [۱۳۸]۔ غرض اس پوری مدت میں ریاست نبوی کی ترقی و استحکام، اسلامی معاشرہ کی تعمیر اور زندگی کے ہر پہلو میں اصلاح کا کام برابر جاری رہا۔

اب تک کے تمام مباحث کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ابتدائی پانچسالہ دور میں اندرونی و بیرونی دونوں سطح پر ریاستِ نبوی کو ترقی و استحکام حاصل ہوا۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس عرصہ میں رسول اللہؐ نے آئندہ آنے والے زمانے کے لئے سیاسی تیاری (مثلاً ہمسایہ قبائل سے دوستی و معاہدات وغیرہ) بھی کر لی اور اس کے ذریعہ ریاست کے باشندوں کا کامل اعتماد حاصل کر لیا۔ اخلاقی و مادی لحاظ سے بھی مسلمانوں کو اتنا مستحکم کر دیا کہ ریاستِ مدینہ کا کوئی اندرونی و بیرونی دشمن اس پر بے باکانہ حملہ کی جرأت نہیں کر سکتا تھا اور تہذیبی و تمدنی معیار سے بھی معاشرہ کو صحیح رُخ پر گامزن کر دیا۔

(۲) دَورِ دوم

اب ہم دُوسرے دَور میں داخل ہوتے ہیں جو دَورِ ماقبل کے اختتام سے وصالِ نبوی تک جاری رہتا ہے۔ اس دَور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ریاستِ نبوی توسیع و ترقی کے مراحل طے کرتی ہوئی مدینہ کے چہار جانب عرب کی آخری سرحدوں تک پہنچ گئی اور پُورا جزیرہ نما اس کے پرچم تلے آگیا۔ دُوسری طرف اس عرصہ میں مسلمانوں کی ایک مستقل تہذیب بن گئی جو اپنی تمام تفصیلات میں دُوسروں سے بالکل ممتاز و ممیز تھی۔ اسلام کا دامن اجتماعی زندگی کے ہر گوشے تک پھیل گیا اور بوجوہ احسن معاشرہ کی تنظیم مکمل ہو گئی۔

قرآنِ کریم کا جو حصہ غزوۂ احزاب کے بعد نازل ہوا اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کی تعمیر و ترقی کے لئے جو باتیں اہم ہیں ان کے بارے میں وقتاً فوقتاً آیات و احکام کا نزول ہوتا رہا اور موقع و محل کی مناسبت سے کلیات و جزئیات کی تعلیم دی جاتی رہی۔ رسول اللہؐ کا بحیثیت رسولؐ اور بحیثیت تابع امرِ الٰہی ان پر خود بھی عمل پیرا ہونا ضروری تھا اور حکمرانِ ریاست ہونے کی بنا پر ان کی تنفیذ بھی آپ کے ذمہ تھی۔

معاشرہ کا قیام اور اسلامی نظامِ معاشرت کی کچھ تفصیلات پچھلے دور میں طے ہو چکی ہیں۔ اب اس تنظیم کو مزید مستحکم کرنے اور ہر اعتبار سے اس کو مکمل کرنے کے لئے جو اقدامات کئے گئے ان کا جائزہ لینا مناسب ہوگا۔

افرادِ معاشرہ کے بنیادی حقوق میں سے ایک اہم حق عزت و ناموس کی حفاظت کا حق ہے، اور جو خاندان

کی بقا کے لئے بھی ناگزیر ہے۔ ریاست کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایسے انتظامات کرے جن سے باشندوں کے دوسرے حقوق کے ساتھ ساتھ عزت و حرمت کا پاس و لحاظ قائم ہو۔

تاریخی روایات کی روشنی میں سورۂ مجادلہ، سورۂ منافقون اور سورۂ نور کا نزول یکے بعد دیگرے غزوۂ احزاب کے بعد تقریباً چھ سات ماہ کے دوران ہوا۔ ان سورتوں میں اور باتوں کے علاوہ ان امور کو بھی بیان کیا گیا ہے جو اسلامی معاشرہ کے فروغ اور افراد کے حق عزت و ناموس کے باب میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ مثلاً زنا کی کراہت اور ایک معاشرتی جرم کی حیثیت سے اس سے بچنے کا حکم تو پہلے دور میں ہی دے دیا گیا تھا[۱۳۹] لیکن اب زنا کو ایک فوجداری جرم قرار دے دیا گیا۔[۱۴۰] اور سو کوڑے کی باقاعدہ سزا رکھی گئی۔ الزام و تہمت کو بھی قابلِ تعزیر ٹھہرایا گیا[۱۴۱] اور ثبوت نہ ملنے کی صورت میں ۸۰ کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی تاکہ معاشرہ میں کوئی شخص کسی دوسرے کی عزت سے نہ کھیل سکے۔ حتیٰ کہ اگر شوہر بیوی پر زنا کا الزام لگائے تو اس کے لئے لعان کا قاعدہ مقرر کیا گیا۔ پھر اسی ضمن میں قحبہ گری کی قانونی بندش[۱۴۲]، نکاح ایامیٰ و بے زوج کی ہدایت[۱۴۳]، غضِ بصر[۱۴۴]، حفظ فرج[۱۴۵]، اظہارِ زینت کی ممانعت[۱۴۶]، استئذان[۱۴۷] اور پردہ کے تکمیلی احکام[۱۴۸] وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان احکام و ہدایات کی معنویت اس صورت میں اور واضح ہو جاتی ہے جبکہ پس منظر میں منافقین کی شرارتوں خصوصاً واقعۂ افک[۱۴۹] کو نگاہ میں رکھا جائے۔

منافقین اچھی طرح جانتے تھے کہ اس وقت تک مسلمانوں کے عروج و ترقی کی اصل وجہ نہ اسلحہ کی برتری تھی اور نہ ساز و سامان اور مادی وسائل کی فراوانی۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ رسول اللہ کی سیرت بے داغ اور صحابہ کا کردار بالکل پاکیزہ تھا۔ اس لئے منافقین نے اسی اصل محاذ کو کمزور کرنے کے لئے ایک حملہ تو پچھلے دور میں نکاحِ زینب کے موقع پر کیا تھا اور اس پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔ پھر اس میں ناکامی ہوئی تو غزوۂ بنی مصطلق کے موقع پر انہوں نے مہاجرین و انصار کے درمیان عصبیت جاہلہ ابھار کر مسلمانوں کے اخلاقی تفوق کو ختم کرنے کی کوشش کی[۱۵۰] لیکن جب اس میں بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی تو اسی نہج پر انہوں نے ایک اور بڑا حملہ کیا جس سے خود رسول اللہ اور آپ کے ازواجِ مطہرات کی عزت و ناموس کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ واقعہ کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس مسئلہ پر رسول اللہ نے مشاورت طلب کی اور خطبہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ :

"مسلمانو! کون ہے جو اس شخص کے حملوں سے میری عزت بچائے، جس نے میرے گھر والوں پر الزامات لگا کر مجھے اذیت پہنچانے کی حد کر دی ہے۔ بخدا میں نے نہ تو اپنی بیوی ہی میں کوئی برائی دیکھی ہے اور نہ ہی اس شخص میں جس کے متعلق تہمت لگائی جاتی ہے بلکہ وہ تو کبھی میری غیر موجودگی میں گھر آیا بھی نہیں[۱۵۱]۔" اس ارشادِ نبوی کے ایک ایک لفظ سے کرب کا اظہار ہو رہا ہے۔ منافقین کا پیدا کردہ یہ فتنہ اتنا خطرناک تھا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جان نثار صحابہ انتہائی ضبط و تحمل اور حکمت و دانائی سے کام نہ لیتے تو مدینہ کا نوخیز اسلامی معاشرہ اخلاقی بحران اور خانہ جنگی کا شکار ہو جاتا۔ اس لئے اس موقع پر ان احکام و ہدایات کا نزول عین ضرورت تھا جن کی نشان دہی ہم اوپر کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ قوانین و احکام کی تنفیذ بھی ساتھ ساتھ ہوتی جا رہی تھی لہٰذا اس واقعۂ افک کے سلسلہ میں بھی ملوث افراد پر حد جاری کر دی گئی[۱۵۲]۔

پھر حالات نے جو رُخ اختیار کر لیا تھا اس کی مناسبت سے وحی الٰہی میں قانونِ ظہار کا مفصل بیان[۱۵۳]، منافقین کی روش پر

سخت گرفت[۱۵۴]، اخلاص کی ترغیب[۱۵۵]، نفاق کی تردید[۱۵۶] اور نجویٰ کی تحدید[۱۵۷] کی گئی۔ اسی زمانہ میں اصولاً یہ طے کر دیا گیا کہ،

للہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین۔[۱۵۸]

(عزت و مرتبہ کے اصل مستحقین اللہ، اس کا رسول اور اہلِ ایمان ہیں)

دوسرے الفاظ میں معاشرہ میں توقیر و تکریم کا اصل معیار دین و تقویٰ ہے نہ کہ دولت، عزت، شہرت وغیرہ۔ اسی دَور میں یہ بھی کہا گیا کہ جو لوگ بیہودہ اور بُری افواہیں پھیلاتے ہیں اور معاشرہ میں فواحش و منکرات کے فروغ میں ممد و معاون ہوتے ہیں وہ عزت افزائی کے نہیں بلکہ سزا کے مستحق ہیں۔[۱۵۹] فواحش پر پابندی کا یہ اصول منافقین کی حرکات کے سیاق و سباق میں بھی بہت اہم تھا اور اسلامی معاشرہ کی ذہنی و اخلاقی تربیت کے باب میں بھی اس کی اہمیت یکساں تھی۔ اسلام کے نزدیک معاشرہ کی عام فضا بہر حال معروفات کے قیام و فروغ اور منکرات و فواحش کے استیصال (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) پر قائم ہونی چاہیے۔ کم و بیش اسی زمانہ میں ایک طرف تو انفرادی و اجتماعی معاملات کی بنیاد حسنِ ظن پر رکھی گئی[۱۶۰] تو دوسری طرف گھریلو معاشرت میں خانگی ملازموں اور نابالغ بچوں کے لئے اوقاتِ خلوت میں اجازت لینے کا قاعدہ مقرر کیا گیا۔[۱۶۱] معاشرہ کے افراد کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا گیا اور ان کے درمیان سے بیگانگی کے تمام پردے ہٹا دئے گئے تاکہ آپس کی محبت بڑھے اور باہمی اخلاق کے رابطے مضبوط ہوں۔ اس مقصد کے لئے قریبی عزیزوں اور دوستوں کو بے تکلفی کی اجازت دے دی گئی۔[۱۶۲] مجلسی تہذیب کے آداب کی تعلیم بھی اسی دَور میں دی گئی۔[۱۶۳] بہر حال مذکورہ بالا احکام و ہدایات نے مسلمانوں کے داخلی محاذ کو پُوری طرح مضبوط کر دیا، اسلامی ریاست اور معاشرہ دونوں کو تباہ کرنے کی منافقانہ سازش ناکام ہو گئی اور وُہ مدنی معاشرہ جس کو منافقین پستی میں گرانا چاہتے تھے اور اُبھر کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا اور اللہ کا یہ قول پُورا ہوا کہ:

کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی[۱۶۴]

(اللہ نے یہ لکھ دیا تھا کہ میں اور میرا رسول غالب رہے گا)

اور یہ بھی کہ اللہ و رسولؐ کی مخالفت کرنے والوں کو بالآخر ذلت و رسوائی نصیب ہو گی۔[۱۶۵] چنانچہ اس کے بعد پیش آنے والے تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ رسول اللہؐ اور آپ کے اصحاب کو ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے غلبہ و تمکن حاصل ہوتا چلا گیا۔ مثلاً صلح حدیبیہ کا مشہور واقعہ ظہور پذیر ہوا، جس پر مفصل بحث ہم پچھلے صفحات میں کر چکے ہیں اور جیسا کہ سورۂ نور میں مومنین سے وعدہ استخلاف کرتے ہوئے یہ کہا گیا تھا کہ" اللہ ان کی موجودہ حالت خوف کو امن سے بدل دے گا۔"[۱۶۶] چنانچہ اس کے مطابق ریاستِ نبوی بتدریج ضعف سے قوت اور دفاع سے اقدام کی طرف بڑھنے لگی غلبہ قوت کی یہ تبدیلی جس رفتار سے جاری تھی اس کا اندازہ اس مثال سے لگایا جا سکتا ہے جسے سورۂ فتح کی آخری آیت میں اس طرح بیان کیا گیا کہ:

کزرعٍ اخرج شطأہ فآزرہ فاستغلظ فاستوٰی علٰی سوقہٖ یعجب الزراع لیغیظ بہم الکفار
وعد اللہ الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت منہم مغفرۃً و اجراً عظیماً۔[۱۶۷]

اس کا مفہوم ایک جدید العہد مصنف کے بقول یہ ہے کہ " شروع میں یہ کیفیت تھی کہ ایمان کی زمین صالح سے اعمال کا تخم حسنہ

نرم و نازک پتی کی شکل میں منصۂ شہود پر آیا پھر اس میں تقویت پیدا ہوئی تو وہ ایک شاخ نو دمیدہ کی صورت اختیار کر گیا۔ پھر اس میں اور توانائی پیدا ہوئی تو وہ دیکھو ایک لہلہاتی کھیتی بن گیا جسے دیکھ کر کسان کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا اور حاسدوں کے سینے پہ سانپ لوٹنے لگے۔ یہ تھے مغفرت اور اجرِ عظیم کے وہ درخشندہ وعدے جو اللہ نے ایمان اور عمل صالح کے بدلہ میں جماعت مومنین سے کئے تھے اور جو اس کی عاجز نوازیوں نے اس طرح پُورے کئے۔"[168]

صلح حدیبیہ کے بعد ریاست نبوی میں چند نازک قانونی و معاشرتی مسائل پیدا ہوئے اور جنہیں رسول اللہؐ نے اپنی ذہانت و تدبر سے بآسانی حل کر لیا۔ پہلا مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جبکہ بعض مسلمان عورتیں ہجرت کر کے مکّہ سے مدینہ آنے لگیں بقول ابن اسحٰق ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط نے اسی زمانہ میں ہجرت کی اور حدیبیہ کی قرارداد کے بموجب ان کے دو بھائی عمارہ اور ولید انہیں واپس لینے کے لئے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔[169] لیکن رسول اللہؐ نے صلح نامہ کی تمام قانونی باریکیوں کو سامنے رکھتے ہوئے ساتھ بھیجنے سے انکار کر دیا۔ آپ کا استدلال یہ تھا کہ،

کان الشرط فی الرجال دون النساء۔[170]

(شرط مردوں کے بارے میں تھی نہ کہ عورتوں کے بارے میں)

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ بظاہر یہ شرط صلح نامہ حدیبیہ میں مردوں (رجل) کی صراحت کے ساتھ موجود نہ تھی۔ ہم نے بھی صلح حدیبیہ پر بحث کے سلسلہ میں ابن ہشام کے یہ الفاظ نقل کئے تھے کہ:

من اتی محمدًا من قریش بغیر اذن ولیہ ردہ علیہم۔[171]

لیکن مذکورہ بالا واقعہ کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بالمعنیٰ ہے ورنہ اصل میں یہ شرط کفارِ قریش کی طرف سے تھی اور ان کی جانب سے یہ الفاظ معاہدے میں لکھوائے گئے تھے کہ:

علی انہ لا یاتیک منا رجل وان کان علی دینک الا ردتہ الینا۔[172]

(یہ کہ تمہارے پاس ہم میں سے کوئی بھی مرد آئے اگرچہ وہ تمہارے دین ہی پر ہو تو تم اسے ہماری طرف واپس کر دو گے)

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے شرط صلح کے الفاظ سے جو فائدہ اٹھایا تھا اس انداز پر خود قریش کے لوگوں نے بھی نہ سوچا تھا پھر رسول اللہؐ نے مدینہ آنے والی مسلمان عورتوں کے بارے میں جو موقف اختیار کیا تھا اس کی تصدیق وحیِ الٰہی سے بھی ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمان مہاجرات کے بارے میں تفصیلی ضابطہ اور اس کے ضمن میں قانونِ شہادت کو سورۂ ممتحنہ[173] میں بیان کر دیا۔ ارشاد یہ ہوا کہ:

یٰآیہا الذین اٰمنوا اذا جاءکم المومنات مہاجرات فامتحنوھن اللہ اعلم بایمانھن فان علمتموھن مومناتٍ فلا ترجعوھن الی الکفار لاھن حل لہم و لا ھم یحلون لھن۔[174]

(اے اہلِ ایمان! جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو (ان کے مومن ہونے کی) جانچ پڑتال کر لو۔ اور ان کے ایمان کی حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو، نہ تو وہ کفار کے لئے حلال ہیں اور نہ کفار ان کے لئے حلال)۔

اسی کے ساتھ ساتھ دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ جب عورتیں ایمان لا کر بیعت کے لئے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوں تو آپ ان سے کن باتوں کا عہد لیں، اس کا جواب وحیِ الٰہی نے یہ دیا کہ:

یایھا النبی اذا جاءك المومنات یبایعنك علٰی ان لا یشرکن باللہ شیئًا ولا یسرقن ولا یزنین ولا یقتلن اولادھن ولا یاتین ببھتانٍ یفترینہ بین ایدیھن وارجلھن ولا یعصینك فی معروفٍ فبایعھن واستغفر لھن اللہ۔[۱۷۵]

(اے نبی! جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لئے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی اور کسی امرِ معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کرو)

ان دونوں مسائل کے سلسلے میں مندرجہ ذیل احکام بھی سورۂ ممتحنہ میں بیان کر دئے گئے جن کا تعلق اسلام کے عائلی قانون سے بھی ہے اور بین الاقوامی قانون سے بھی:

۱ - اوّل یہ کہ جو عورت مسلمان ہو جائے وہ اپنے کافر شوہر کے لئے حلال نہیں رہتی اور نہ کافر شوہر اس کے لئے حلال رہتا ہے۔

۲ - دُوسرے یہ کہ جو منکوحہ عورت مسلمان ہو کر دار الکفر سے دار الاسلام میں ہجرت کر آتے اس کا نکاح آپ سے آپ ٹوٹ جاتا ہے اور جو مسلمان بھی چاہے اس کا مہر دے کر اس سے نکاح کر سکتا ہے۔

۳ - تیسرے یہ کہ جو مرد مسلمان ہو جائے اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کی بیوی اگر کافر ہے تو وہ اسے اپنے نکاح میں روکے رکھے۔

۴ - چوتھے یہ کہ اگر دار الکفر اور دار الاسلام کے درمیان صلح کے تعلقات موجود ہوں تو اسلامی حکومت کو دار الکفر کی حکومت سے یہ معاملہ طے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ کفار کی جو منکوحہ عورتیں مسلمان ہو کر دار الاسلام میں ہجرت کر آتی ہوں ان کے مہر مسلمانوں کی طرف سے واپس دے دیتے جائیں اور مسلمانوں کی منکوحہ کافر عورتیں جو دار الکفر میں رہ گئی ہوں ان کے مہر کفار کی طرف سے واپس مل جائیں۔[۱۷۶]

بہرحال صلح حدیبیہ کے بعد سورۂ ممتحنہ نے مسلمانوں اور کفار و مشرکین کے درمیان سابق کے ازدواجی رشتوں کو ختم کر دیا اور آئندہ کے لئے ان کے بارے میں ایک قطعی اور واضح قانون بنا دیا۔[۱۷۷]

ایک اور اہم تاریخی معاملہ حاطب بن ابی بلتعہ کا ہے جو اسی سورۂ ممتحنہ میں بیان کیا گیا ہے وہ اپنے زمانہ وقوع کے اعتبار سے اگرچہ کچھ موخر ہے لیکن دراصل صلح حدیبیہ کے نتائج و ثمرات کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس لئے اس پر مختصراً گفتگو نامناسب نہ ہوگی۔ حاطب نے فتح مکہ سے کچھ پہلے ایک خفیہ خط کے ذریعہ رسولؐ اللہ کے اہم جنگی رازوں سے قریشِ مکہ کو مطلع کرنا چاہا، مقصد اپنے اہل و عیال کو جنگ کی عقوبت سے محفوظ رکھنا تھا۔ انہوں نے مکہ پہنچانے کے لئے ایک عورت کی خدمات حاصل کیں۔[178] رسولؐ اللہ کو اس مخبری کی اطلاع بذریعہ وحی ہو گئی۔ چنانچہ آپ نے حضرت علیؓ اور زبیر بن العوام کو اس عورت کو پکڑنے کے لئے بھیجا جس کے پاس حاطب کا خط تھا۔ چنانچہ ان دونوں حضرات نے مقام خلیقہ[179] پر اس کو پا لیا۔ خط اس کے سر کے بالوں میں سے نکلا، خط لے کر رسولؐ اللہ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ رسولؐ اللہ نے استفسار کے لئے حاطب کو بلوایا۔ حاطب نے اپنی صفائی پیش کر دی اور رسولؐ اللہ نے اسے قبول فرما لیا۔[180] بقول ابنِ ہشام اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے حاطب کے معاملہ میں یہ نازل فرمایا کہ:[181]

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْھِمْ بِالْمَوَدَّۃِ ..... الخ[182]

(اے اہلِ ایمان! اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لئے اور میری رضا جوئی کی خاطر وطن چھوڑ کر گھروں سے نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ ..... الخ)

حضرت حاطب کا یہ فعل خواہ ذاتی طور پر ان کی خیر خواہی پر کتنی ہی دلالت کیوں نہ کرتا ہو بہرحال ایک جاسوسی اور مخبری کا تھا اور حالت جنگ (کیونکہ صلح حدیبیہ ٹوٹ چکی تھی) کے جس نازک موقع پر ہوا تھا اس سے ہو سکتا تھا کہ ریاست نبوی سنگین نتائج سے دوچار ہو جائے۔ اس لئے حاکمِ حقیقی کی طرف سے اس پر بڑے سخت الفاظ میں گرفت کی گئی البتہ زجر و توبیخ کر کے چھوڑ دیا گیا اور کوئی مالی یا جسمانی سزا تجویز نہیں کی گئی۔ ہاں اگر یہ فعل حضرت حاطب جیسے بدری صحابی سے سرزد نہ ہوتا جن کا ایمان و اخلاص شک و شبہ سے بالاتر تھا تو ایسی حرکت کرنے والے کو قتل کیا جا سکتا تھا جیسا کہ حضرت عمرؓ کی اجازت طلب کرنے سے معلوم ہوتا ہے[183] اور "اس سے فقہا کے ایک گروہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ مسلمان جاسوس کے لئے عام قانون یہی ہے کہ اسے قتل کیا جائے الّا یہ کہ بہت وزنی وجوہ اسے کمتر سزا دینے یا محض ملامت کر کے چھوڑ دینے کے لئے موجود ہوں مگر فقہا کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی اور بعض دوسرے فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مسلمان جاسوس کو تعزیر دی جائے گی مگر اس کا قتل جائز نہیں۔ امام ابو حنیفہ اور امام اوزاعی کہتے ہیں کہ اسے جسمانی عقوبت اور طویل قید کی سزا دی جائے گی۔ امام مالک کہتے ہیں اسے قتل کیا جائے گا۔"[184]

اوپر کی تفصیلات یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں کہ ابتدائی پانچ سال کے عرصہ میں جو اسلامی معاشرہ اپنی ایک مستقل حیثیت سے وجود پذیر ہو چکا تھا، جس کا تشخص بھی بہت کچھ ہو چکا تھا اور جہاں بہت سی معاشرتی اصلاحات جاری ہو چکی تھیں، نیز نکاح و طلاق اور دیگر دیوانی و فوجداری قوانین بڑی حد تک تفصیل کے ساتھ مدوّن کر نافذ ہو چکے تھے اب وہ معاشرہ مزید ترقی کرتا ہے اور پردہ کے تکمیلی احکام، استئذان، زنا اور قذف وغیرہ کی سزاؤں کا اجراء، نشست و برخاست،

گفتگو، وضع قطع اور رہنے سہنے کے طریقوں کی تلقین وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اب اسلامی معاشرہ میں ہر چیز نے اپنی ایک مستقل شکل اختیار کر لی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ اندرونی طور پر معاشرتی ارتقاء کی یہ کیفیت بیرونی طور پر ریاست کی بتدریج توسیع کا ذریعہ بنتی گئی۔

توسیع و ترقی کے اس سلسلے میں اس واقعہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جبکہ رسول اللہؐ نے ہمسایہ ممالک کے سلاطینؒ امراء کو اسلام کی تحریری دعوت دی۔ اسلام کے عالمگیر مشن کو متعارف کرانے کا یہ کام اتنا عظیم الشان تھا جس نے آگے چل کر اس وقت کی عالمی سیاست پر دُور رس اثرات مرتب کئے اور دنیا کو ایک نئی تہذیب و ثقافت اور نظریۂ حیات سے روشناس کرایا۔ رسول اللہؐ کا یہ اقدام ایک مصنف کے بقول "دنیا میں نظریاتی تہذیب کی صبح اول کا طلوع تھا۔ اسی مبارک دن سے دنیا نے جاگیرداری اور زمینداری کے نظامِ فکر سے نکل کر انسانی اخوت اور حریت کے نظریات کی طرف اپنے طویل سفر کا آغاز کیا۔"[۱۸۵] اس کے معاً بعد فتح خیبر کا تاریخی واقعہ پیش آیا۔ غزوۂ خیبر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں متعدد فقہی احکام کا اعلان اور اجراء ساتھ ساتھ ہوا۔ مثلاً گدھے اور خچر حرام ہو جانے کی منادی رسول اللہؐ نے میدانِ خیبر ہی میں کی اور اس کی تعمیل میں فوراً وہ ہانڈیاں اوندھا دی گئیں جن میں گدھے کا گوشت پک رہا تھا۔[۱۸۶] گوشت ضائع کر دیا گیا حالانکہ لوگ بھوکے تھے۔[۱۸۷] یہ ایک ادنیٰ ثبوت اس بات کا ہے کہ احکام و قوانین کا اجراء اور ان کی تنفیذ کس طرح بیک وقت عمل میں آ رہی تھی۔ خیبر کے اسی موقع پر پنجہ دار پرندے، درندے اور تقسیم سے قبل غنیمت کی فروخت کو حرام قرار دیا گیا،[۱۸۸] چاندی سونے کا بہ تفاضل خریدنا موقوف[۱۸۹] اور متعہ ممنوع ٹھہرایا گیا[۱۹۰] ان احکام کے اجراء و نفاذ سے ریاست نبویؐ کی پُر امن اور مستحکم حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اب مسلمانوں کی اندرونی حالت اتنی سنبھل چکی تھی کہ وہ بآسانی تہذیب و تمدن کے جدید تقاضوں کو پورا کر سکتے تھے۔ غالباً اسی لئے سورۃ المائدہ میں بیک وقت تین قسم کے مضامین پائے جاتے ہیں۔[۱۹۱] یعنی ایک تو مسلمانوں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی زندگی سے متعلق مزید احکام و ہدایات دی گئیں، دوسرے چونکہ مسلمان اس وقت ایک حکمران گروہ بن چکے تھے اور وہ وعدۂ استخلاف جو سورۂ نور میں کیا جا چکا تھا[۱۹۲] اب حقیقت بن کر سامنے آ رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں طاقت تھی اور اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں اس کا نشہ انہیں راہِ راست سے بھٹکا نہ دے جیسا کہ پچھلی قوموں خصوصاً بنی اسرائیل کی گمراہی و تباہی کا سبب بن چکا تھا اس لئے یہ کہنا بجا ہو گا کہ آزمائش کے ایک دَور سے نکل کر مسلمان ایک دوسرے عہدِ آزمائش میں داخل ہو رہے تھے اس سلئے ضروری ہدایات اور نصیحتیں سورۂ مائدہ میں شامل ہیں۔ تیسرے یہ کہ یہود کا زور بالکل ختم ہو چکا تھا اس لئے اس موقع پر اہلِ کتاب کو ایک بار پھر غلط رویہ پر تنبیہ کرنا اور انہیں راہِ راست پر آنے کی دعوت دینا مناسب تھا۔ اب جہاں تک مسلمانوں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی زندگی کے متعلق احکام و ہدایات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں سفرِ حج و عمرہ کے آداب[۱۹۳]، شعائر اللہ کا احترام اور زائرین سے عدمِ تعرض کا حکم[۱۹۴]، کھانے پینے کی چیزوں میں حرام و حلال کا قطعی تعین[۱۹۵]، دورِ جاہلیت کے خود ساختہ قاعدوں کے خاتمہ کی ہدایت[۱۹۶]، پھر وضو، غسل، تیمم کے ضابطے[۱۹۷]، قسم توڑنے کا کفارہ[۱۹۸]، قانونِ شہادت کی مزید دفعات[۱۹۹]، ڈکیتی اور فتنہ و فساد پھیلانے والوں کے لئے سزا کا قانون[۲۰۰]، چوری کی تعزیر[۲۰۱]، قصاص عادل[۲۰۲] اور ارتداد[۲۰۳] سے متعلق

احکام اور اہلِ کتاب کے ساتھ اکل و شرب اور نکاح کی اجازت[۲۰۴] لیکن دوستی کی ممانعت[۲۰۵] شامل ہے۔ دوسرے حصہ یعنی ایک حکمران گروہ کی حیثیت سے مسلمانوں کو نصائح کے سلسلے میں عدل پر قائم رہنے کا حکم[۲۰۶]، اہلِ کتاب کی روش سے بچنے کی ہدایت[۲۰۷]، اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری اور احکام کے اتباع کے عہد پر ثابت قدم رہنے[۲۰۸] کی نصیحت اور اپنے جملہ معاملات کے فیصلوں میں کتابِ الٰہی کی پابندی[۲۰۹] کا حکم قابلِ ذکر ہے۔ اب رہا معاملہ یہود و نصاریٰ کو نصیحت کا تو ایک طرف تو یہود کو ان کے غلط رویہ پر توجہ دلا کر راہِ راست پر آنے کی دعوت دی گئی[۲۱۰] دوسری طرف عیسائیوں کو تفصیل سے خطاب کیا گیا[۲۱۱] اور اس کے بعد ان سے مطالبہ کیا گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں[۲۱۲]۔

مائدہ کے بعد نازل ہونے والی سورۂ تحریم کا موضوعِ بحث اگرچہ ازواجِ مطہرات ہیں لیکن ان کے پردہ میں رسول اللہ کی قانونی و دستوری حیثیت اور ریاست نبوی میں آپ کے مقام کو بھی متعین کر دیا گیا۔ مثلاً یہ کہا گیا کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حدود مقرر کرنے کے اختیارات قطعی طور پر اللہ کے ہاتھوں میں ہیں۔ نبی بحیثیت نبی اگرچہ کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دے سکتا ہے لیکن صرف اس صورت میں جبکہ اللہ کی طرف سے اس کا حکم ہو۔ علاوہ ازیں یہ بتایا گیا کہ ایک معمولی بات بھی اگر نبی کی زندگی میں پیش آجائے تو وہ قانون کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی ایسا فعل بھی نبی سے صادر ہو جو منشائے الٰہی سے ہٹا ہوا ہو تو اس کی فوراً اصلاح کر دی گئی تاکہ اسلامی قانون اور اس کے اصول اپنی صحیح صورت پر رہیں[۲۱۳]۔

غزوۂ تبوک تک پہنچتے پہنچتے حالات بہت کچھ منقلب ہو چکے تھے۔ اندرونِ عرب کی وہ تمام قوتیں جو ریاستِ نبوی کے ارتقا میں مزاحم تھیں بالکل بے بس ہو چکی تھیں اور فتح خیبر، فتح مکہ، فتح حنین، محاصرۂ طائف، سرایا برائے انہدام معبودانِ باطل اور موتہ کا نتیجہ خیز معرکہ ہو چکا تھا اور رسول اللہ کا پرچم فتح یکے بعد دیگرے عرب کے تمام علاقوں پر اڑتا چلا جا رہا تھا۔ یہ اس بات کی صاف علامت تھی کہ اب اسلام کا غلبہ یقینی اور ریاست کا پھیلاؤ ناگزیر ہے۔ لہٰذا اس موقع پر یہ برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا کہ عرب میں شرک و کفر کے مراکز، جاہلی ادارے اور تعصبات زندہ رکھے جائیں۔ ان انتظامات کا سب سے بڑا محرک سورۂ توبہ کا نزول تھا جس میں کفار و مشرکین سے اعلانِ برأت[۲۱۴] اشہرِ حرم کے بعد ان کا استیصال[۲۱۵] نقضِ میثاق پر ان کو قطعاً معاف نہ کرنے کا حکم[۲۱۶]، اللہ کے گھروں سے ان کا حق ختم کرنے[۲۱۷] اور حج کے سلسلہ میں ان سے اظہارِ برأت کرنے کا حکم دیا گیا[۲۱۸] اور یہ کہہ دیا گیا کہ مشرکین نجس ہیں اس لئے اس سال (۹ھ) کے بعد ان کو مسجد حرام کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا جائے[۲۱۹] اور حکم دیا گیا کہ اہلِ کفر سے قتال کرو یہاں تک کہ وہ مطیع ہو جائیں یا جزیہ پر راضی ہو جائیں[۲۲۰]۔ اس آیت کے بارے میں ابو عبید کی رائے یہ ہے کہ تبوک میں قیام کے دوران رسول اللہ نے قیصرِ روم کو ایک مکتوب (علاوہ مکتوب سابق) روانہ کیا تھا جس میں اسے اسلام کی دعوت دی تھی اور اسلام تسلیم نہ کرنے کی صورت میں سرنگوں ہو جانے اور جزیہ ادا کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے بطور استدلال آیت مذکورہ تحریر کی تھی[۲۲۱] اور غالباً یہ رسول اللہ کی غایت تدبر کی دلیل ہے کہ جس زمانہ میں شمالی سرحد پر عیسائی رومیوں سے خطاب کیا گیا اور ان کے آس پاس کے قبائل سے صلح کی گئی کم و بیش اسی زمانہ میں جنوب کی سمت نجران کے علاقے سے ایک وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا[۲۲۲] اس وقت نجران کا

علاقہ عیسائیوں کے تابع تھا اور ان کے تین سردار تھے۔[223] ایک عاقب کہلاتا تھا جس کی حیثیت امیرِ قوم کی تھی۔ دوسرا سیّد کہلاتا تھا جو ان کے تمدنی و سیاسی امور کی نگرانی کرتا تھا۔ اور تیسرا اسقف تھا جس سے مذہبی پیشوائی متعلق تھی۔[224] رسول اللہؐ نے انہیں ان کے عقائد کی غلطیاں سمجھائیں۔[225] ان کی سابقہ روش پر متنبہ کیا[226] اور پھر اسلام لانے کی دعوت دی۔[227] ان لوگوں نے انکار کیا اور آپس میں بہت گفت گو اور بحث و مباحثہ ہوا آپ نے انہیں قرآن سنایا اور فرمایا کہ: "میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں اگر تم انکار کرتے ہو تو آؤ میں تم سے مباہلہ کروں گا۔"[228] اس پر وہ مجبور ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہمیں یہ مناسب معلوم ہوا کہ آپ سے مباہلہ نہ کریں، آپ جو چاہیں حکم دیں ہم مان لیں گے اور آپ سے صلح کر لیں گے۔[229] چنانچہ آپ نے ان سے صلح کی اس شرط پر کہ وہ سالانہ کپڑوں کے دو ہزار جوڑے دیا کریں گے، ہر سال رجب میں ہزار جوڑے اور صفر میں ہزار جوڑے۔ ہر جوڑا ایک اوقیہ چاندی (یا اس کی قیمت) کے مساوی ہوگا اور یہ بھی طے ہوا کہ جب بھی یمن میں کوئی شورش یا ناگہانی حادثہ واقع ہوگا تو وہ مسلمانوں کو ۳۰ زرہیں، ۳۰ گھوڑے اور ۳۰ اونٹ بطور عاریت فراہم کریں گے۔ علاوہ ازیں نجران اور اس کے آس پاس والوں کی جان، مال، مذہب، ملک، زمین، حاضر، غائب اور ان کی عبادت گاہوں کو اللہ کی پناہ اور محمد نبی رسول کی ذمہ داری حاصل ہوگی۔[230]

مدینہ میں رسول اللہؐ کے قیام کا نواں سال جس میں پیش آنے والے بعض واقعات کو اوپر بیان کیا گیا ہے کچھ اور واقعات کے لحاظ سے بھی تاریخ اسلام، تاریخ رسالت، ریاست نبوی کے فروغ و استحکام، اسلامی قانون کی تدریج اور ریاست نبوی کے ارتقاء میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ تطہیرِ کعبہ کے ساتھ ساتھ حجِ بیت اللہ کی فرضیت اسی ۹ھ میں ہوئی،[231] سود کی باقاعدہ حرمت[232] اور اس کے تفصیلی احکام کا نزول، فرضیت زکوٰۃ کا حکم،[233] اور اس کی تعمیل میں محصلین زکوٰۃ کا تقرر،[234] تعلیم و تبلیغ اسلام کے لئے مبلغین و دعاۃ کی روانگی،[235] سورۂ حجرات کا نزول[236] اور نظامِ معاشرت کے بعض اہم تکمیلی احکام کا اجرا[237] وغیرہ ۹ھ میں ہی ہوا۔ یہ واقعات زبانِ حال سے حاکمیتِ الٰہی کے تحت رسول اللہؐ کی انتظامی و سیاسی اہلیت، قانونِ اسلامی کی بتدریج تکمیل اور ریاست نبوی کے مسلسل ارتقاء کو بیان کرنے کے لئے کافی ہیں۔ علاوہ ازیں مذکورہ سال مورخین کی عام اصطلاح میں "عام الوفود" بھی کہلاتا ہے یعنی اسی سن میں عرب کے تقریباً ہر گوشے سے بے شمار وفود نے آ آ کر ریاستِ نبویؐ کے سامنے سرِ اطاعت خم کیا اور جب یہ وفود اپنے اپنے علاقوں کو واپس گئے تو ان کی گردنوں میں ریاست نبوی کا قلادہ پڑا ہوا تھا۔ آخری وفد ۱۰ھ میں رسول اللہؐ کی خدمت میں حجۃ الوداع کے موقع پر حاضر ہوا تھا۔[238] گویا رسول اللہؐ کے وصالِ مبارک سے تقریباً دو ماہ پیشتر پورا عرب ریاستِ نبوی کے پرچم تلے آ گیا اور اس طرح اس کی نشو و ارتقاء کا عمل تکمیل پذیر ہوا۔

متذکرہ بالا تاریخی حقائق سے چند امور کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے یعنی:

(۱) چونکہ ریاست نبوی کا مکمل ارتقاء اور اس کا استحکام وصالِ مبارک سے چند ماہ پیشتر ہی ہوا تھا اس لئے استحکامِ ریاست کے گہرے رسوخ کا پورا موقع رسول اللہؐ کو میسر نہ آ سکا۔

(۲) رسول اللہؐ کی گزشتہ دس سالہ شبانہ روز مساعی کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورے عرب نے اسلام کی سیاسی حاکمیت کو تسلیم کر لیا اور پورا عرب ایک مرکزی اقتدار کے تحت آ گیا یہ تاریخ عرب میں پہلا حیرت انگیز اور انقلاب آفریں موقع تھا۔

البتہ یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ پورے عرب نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ تاریخ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت عرب میں غیر مسلم آبادی بہرحال موجود تھی جس میں یہود، نصاریٰ، مجوس اور مشرکین وغیرہ شامل ہیں۔ غیر مسلم رعایا اور دیگر شورش پسند عناصر کا اسلام کی سیاسی حاکمیت کو تسلیم کر لینے کا غالب بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے تھے کہ اب اسلام محض دین اور عقیدہ نہیں رہا ہے بلکہ ایک ایسی زندہ و متحرک سیاسی قوت بھی بن گیا ہے جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اسلامی ریاست کے اقتدار کو تسلیم کر لینے میں انہیں اپنے مفادات کا تحفظ اور جان و مال کی عافیت زیادہ محسوس ہوئی۔ یہاں یہ وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ قبائل عرب میں سے جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا ان میں سے اگرچہ ایک تعداد اپنے ایمان و اسلام میں مخلص بھی تھی لیکن ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جنہوں نے اسلام کو رسماً قبول کیا تھا اور قرآن کے بیان کے مطابق اسلام ان کے حلقوں سے نیچے نہ اترا تھا۔[۲۳۹] چنانچہ تاریخ میں ارتداد کی جو انفرادی و شخصی یا قبائلی و جماعتی مثالیں پائی جاتی ہیں[۲۴۰] ان کا بڑا سبب نفسی و نفسیاتی ہونے کے علاوہ یہی تھا کہ اسلام فی الحقیقت ان کے قلوب میں جاگزیں نہ ہوا تھا۔ بعض لوگوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا تو خود ساختہ پیغمبر بن بیٹھے۔ مثلاً مسیلمۃ الکذاب۔ وہ وفد بنی حنیفہ کے ساتھ ایک مرتبہ مدینہ آیا اور رسول اللہؐ سے اس کی گفتگو بھی ہوئی۔ اس نے حرص و طمع کا مظاہرہ کیا تو دوران گفتگو آپ نے اسے سختی سے جھڑک دیا:

لو سألتني هذا العسيب ما أعطيتك۔[۲۴۱]

(اگر تو مجھ سے کھجور کی یہ چھڑی بھی مانگے تو نہ دوں گا)

واپس گیا تو مرتد ہو گیا اور دعوئ نبوت بھی کر دیا۔[۲۴۲] مسیلمہ نے بہت بے باکی سے رسول اللہؐ کو خط بھی لکھا تھا لیکن رسول اللہؐ نے اپنے جواب میں اس کو لاجواب کر دیا۔[۲۴۳] یہ سنہ ھ کے اواخر کی بات ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ رسول اللہؐ کو اس کے خلاف بھی تادیبی کارروائی کا وقت میسر نہ آسکا۔ اسود بن کعب العنسی دوسرا شخص تھا جس کے جرائم مسیلمہ کے ہی مماثل تھے اس کو ٹھکانے لگانے کے لئے رسول اللہؐ نے جن لوگوں کو مقرر کیا تھا انہوں نے اگرچہ اپنی کارروائی مکمل کر لی اور رسول اللہؐ کے وصال مبارک سے ایک دن پہلے وہ قتل بھی کر دیا گیا لیکن اس کے قتل کی اطلاع مدینہ بعد میں پہنچی۔[۲۴۴]

رسول اللہؐ کے وصالِ مبارک کے بعد حضرت ابوبکر جانشینِ ریاست منتخب ہوئے اور انہوں نے مرتدین وکذابین وغیرہ کا پوری طرح قلع قمع کیا اور اس طرح استحکام ریاست کا جو گوشہ وقت و مہلت کی کمی کے باعث عہد نبوی میں مکمل نہ ہو پایا تھا اسے عہدِ صدیقی میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا گیا۔

رسول اللہؐ کے بعد ارتداد اور مدعیانِ نبوت کی سرگرمیوں سے ریاست نبوی پر کوئی الزام نہیں آتا کیونکہ دن رات کا تجربہ بتاتا ہے کہ ہر نئی چیز کے قیام و فروغ اور استحکام کے لئے وقت درکار ہے اور جب کوئی ریاست از سرِ نو قائم ہوتی ہے اس کو اس قسم کے حالات سے سابقہ پیش آتا ہی ہے بلکہ دنیا کی تاریخ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب دوسرے نو قائم شدہ ریاستوں کے ایسے مراحل درپیش ہوتے ہیں تو ملک میں بڑی افراتفری، خانہ جنگی اور انتشار پیدا ہوتا ہے اس عہدِ صدیقی کے ابتدائے ایام میں اس قسم کا خلفشار باعثِ الزام نہیں ہے۔ آخر کار چند ماہ کے بعد استحکام ریاست اپنے داخلی و خارجی تمام پہلوؤں کے ساتھ قائم و دائم ہو گیا تھا۔

باب پنجم

انتظامِ ریاست

ریاست نبویؐ کے نشو و ارتقاء کا مطالعہ کرنے کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ مذکورہ ریاست کا نظم و نسق کن بنیادوں پر قائم تھا اور اس کے مختلف انتظامی ادارات کی نوعیت، طریقِ کار، مقاصد اور کارکردگی کیا رہی؛ نکات بالا پر بحث تو ہم آئندہ صفحات میں کریں گے یہاں بطور مقدمہ چند باتیں قابلِ ذکر معلوم ہوتی ہیں:

(۱) پہلی بات تو مجموعی طور پر یہ کہی جا سکتی ہے کہ عہدِ نبویؐ کے تمام ادارات میں ایک خاص ارتباط اور تسلسل پایا جاتا ہے اور جملہ سیاسی اور انتظامی تنصیبات کا ارتقاء ایک خاص ترتیب کے ساتھ ہُوا۔ نیز وہ ادارے جو بالکل ابتدائی زمانے میں قائم ہوئے بے شمار موانعات کے باوجود نمو پاتے رہے اور ان میں اس وقت بھی عمل ارتقاء جاری رہا جبکہ سیاسی مخالفوں اور دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ لیکن خود ریاست نبوی کا استحکام بہت معمولی تھا۔ اس لحاظ سے ہر قسم کے سرد و گرم حالات کو انگیز کر جانا بھی ان ادارات کا ایک غیر معمولی امتیاز ہے اور اس حقیقت سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا کہ جملہ ادارات کے مسلسل ارتقاء کے باوجود ان کا معیارِ کارکردگی دن بدن بہتر ہوتا چلا گیا اور مدینہ کی مرکزی قیادت ان کو لمحہ بہ لمحہ تقویت پہنچاتی رہی۔

(۲) دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان ادارات کا نشو و نما یکایک نہیں ہوا بلکہ حالات و ضروریات کے پیشِ نظر ادارات کی تاسیس یا توسیع عمل میں آتی رہی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ روزہ (صوم) کا ۲ھ میں اور زکوٰۃ کا ادارہ اس کے سات سال بعد ۹ھ میں قائم ہوا یا مثلاً مالی ادارات میں سے مالِ غنیمت کے قوانین کا اجرا ۲ھ میں ہوا اور جزیہ کا حکم اس کے سات سال بعد آیا، یا مثلاً بجائے خود ریاست کا ادارہ ۱ھ میں قائم ہوا اور پھر شوریٰ کا آغاز بھی بہت جلد ہو گیا لیکن غیر مسلموں یا ذمیوں کے حقوق و فرائض کا تعین فتح خیبر کے بعد ہوا۔ بہر حال حقیقت یہ ہے کہ ریاست نبوی کا کوئی ادارہ نہ تو غیر ضروری تھا اور نہ اس کے اچانک زوال پذیر ہونے کا امکان تھا بلکہ تاریخ کی رُو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عہدِ خلافتِ راشدہ میں اور اس کے بعد ریاست کے ادارات جس ترقی یافتہ شکل میں نظر آتے ہیں ان میں سے اکثر کی اساس دورِ رسالت میں ہی پڑ چکی تھی۔

(۳) جس طرح یہ کہنا درست نہیں ہے کہ عہدِ نبویؐ کے تمام ادارات جاہلی ورثہ تھے اور ریاست کا نظم و نسق کلیتاً اندرونِ عرب یا بیرونِ عرب کے نظام ہائے سیاسی سے مستعار تھا اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح نہ ہو گا کہ تمام تنصیبات عہدِ نبوی ہی کی پیداوار ہیں کیونکہ بعض سیاسی، سماجی اور مذہبی انتظامات ایسے ہیں جو عہدِ نبوی سے قبل بھی

پائے جاتے تھے۔ مثلاً امورِ ریاست کی انجام دہی میں مشورہ کا اصول (اس کی نوعیت خواہ کوئی بھی ہو)، نیز صوبوں میں گورنروں یا والیوں کا تقرر، یا خراج و جزیہ کا اصول روم و فارس کی سلطنتوں میں بھی موجود تھا اور خود عرب میں مکہ کی اعیانی حکومت میں مشورہ کا شعبہ اور دار الندوہ کا پایا جانا معروف بات ہے۔ نیز عرب جاہلیت میں نماز، روزہ وغیرہ کی رسوم کسی نہ کسی شکل میں پہلے سے موجود تھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی تاریخ کے طالب علم سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ کسی اور نظام میں بعض ادارات کی محض موجودگی اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ دونوں نظام مماثل ہیں یا ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں۔ مزید برآں اصل چیز ظاہری خطوط کی مماثلت نہیں ہے بلکہ ان مقاصد کی مماثلت ہے جن کی خاطر کوئی ادارہ تشکیل پاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک ادارہ ظاہری شکل و صورت میں اسی قسم کے دوسرے ادارے سے مشابہ ہو لیکن ان دونوں کے مقاصد مختلف ہوں مقاصد کا اختلاف ادارات کی یکسانیت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ بعض ادارات ہر ملک اور ہر زمانے میں نظم و نسق کو قائم رکھنے اور ریاست کی بقاء کے لئے بالکل ناگزیر رہے ہیں۔ مثلاً اقتدارِ اعلیٰ، رئیسِ مملکت اور امورِ ریاست کے شعبے ایسے ہیں جنہیں در اصل کسی بھی نظام سیاسی میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ گویا ان کی مثال بالکل تعمیراتی مواد کی ہے۔ تعمیراتی مواد کی یکسانیت کے باوجود معمار کا نقشہ اور تعمیر ایک عمارت کو دوسری عمارت سے مختلف بنا دیتی ہے۔ اسی طرح محض چند ادارات کی مماثلت اہم نہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ ان ادارات کا ایک خاص نظام یا نقشہ میں کیا مقام ہے اور معمار اس کو کس طرح مرتب کرتا ہے۔ علاوہ ازیں معمار کا کام یہ ہے کہ تعمیر کے سلسلے میں زمین کی ساخت و نوعیت، آب و ہوا اور طبعی و جغرافیائی محلِ وقوع کا پورا پورا حافظ رکھے۔ چونکہ رسولؐ اللہ کے پیشِ نظر بھی ایک ریاست کی تعمیر تھی اس لئے آپ نے بھی ادارات کی تاسیس میں مذکورہ باتوں کا بے حد خیال رکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے سربراہ اور حکمرانِ اعلیٰ تھے۔ آپ نے دُنیا کے سامنے جو سیاسی نظام پیش کیا اور پھر ریاست قائم کر کے جن ادارات کا اجرا فرمایا وہ یقینی طور پر تمام نظام ہائے سیاسی سے ممتاز و ممیز ہیں اس کی تفصیل ہم آئندہ صفحات میں پیش کریں گے۔ ابن الطقطقی نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "اسلامی حکومت اپنی غایت، اپنی سادگی اور اپنی عمومیت کے اعتبار سے ایک مستقل اور جُداگانہ شے ہے۔ وہ ایک ایسی حکومت ہے جو عام دنیاوی حکومتوں سے بالکل الگ اور پیغمبرانہ اوصاف سے مستفید ہے"[1]۔

(۴) ریاست نبوی کے نظم و نسق کے مآخذ وحیِ الٰہی، رسولؐ اللہ کے احکام و ارشادات، آپ کی تقریر، عمل اور اجتہاد، صحابہ کے آزادانہ مشورے، اور اسلامی معاشرہ کی ضروریات تھیں۔ رسولؐ اللہ ریاست نبوی کے سربراہ تھے اور آپ کی قیادت کو بالآخر پورے عرب نے تسلیم کر لیا تھا۔ نیز اقتدارِ اعلیٰ اور حاکمیت کا منصب اگرچہ اللہ کو حاصل تھا لیکن تمام قانونی، تنفیذی اور انتظامی اختیارات رسولؐ اللہ کی ذات میں مجتمع تھے۔ رسولؐ اللہ کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ سیاسی شرعی قوانین کا اظہار انتظامی اداروں سے بھی ہو اور اعمال کا دائرہ شریعت سے متجاوز نہ ہونے پائے۔ آپ کی سیاسی اطاعت اگرچہ تمام باشندگانِ ریاست پر واجب تھی لیکن مسلمانوں پر اطاعت کا وجوب دوہرا تھا۔ یعنی وُہ بربنائے حکمران بھی اطاعت کے مکلف تھے اور بربنائے رسول بھی۔ دُوسری طرف رسولؐ اللہ کی نافرمانی ان کے حق میں موجب گناہ و معصیت

بھی تھی اور سیاسی جُرم و بغاوت بھی۔

(۵) یہ واضح ہے کہ رسول اللہؐ حاکمیتِ الٰہی کے پابند تھے۔ اور حاکم حقیقی کی طرف سے آپ کی ریاست کا مقصد بھی متعین کر دیا گیا تھا اور جسے قرآن نے متعدد مقامات پر بیان کیا ہے۔ مثلاً سورۂ حدید میں ارشاد ہے کہ:

"ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب و میزان کو نازل کیا تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔" (۲)

دُوسری جگہ یہ آتا ہے کہ:

"یہ وُہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین پر تمکن و حکومت عطا کریں گے تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔" (۳)

ان ارشادات کا مفہوم ایک ایسی ریاست کا تصور پیش کرتا ہے جو بنیادی طور پر ایجابی مقاصد اپنے سامنے رکھتی ہے اور جس کا دائرۂ عمل محدود نہیں ہے بلکہ وُہ ایک مخصوص نقطۂ نظر کے مطابق پوری زندگی کی اصلاح کرنا چاہتی ہے۔ گویا سرحدوں کی حفاظت یا امن و امان کا قیام یا عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا ہی اس کا انتہائی اور آخری مقصد نہیں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب مقاصدِ ریاست متعیّن ہیں تو اس ریاست میں قائم ہونے والے تمام ادارات بھی لازماً مقاصد بالا کو ہی پورا کرنے کے لئے قائم کئے گئے۔ رسول اللہؐ کے نزدیک اصل چیز ادارات کی کثرت نہیں تھی بلکہ ان کی بہتر کارکردگی تھی۔ اس لئے اس زمانے میں اگرچہ انتظامی ادارات کی بہتات نہیں ہے اور نہ اعضائے ریاست علیحدہ علیحدہ ہیں۔ لیکن اس کے تمام امورِ ریاست اور مقاصد کی تکمیل پُوری تیزی اور تندہی سے ہُوئی۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ فرائض ریاست کی انجام دہی کے لئے رسول اللہؐ نے علم و تجربہ میں پختہ افراد اور باصلاحیت و باکردار اشخاص کا تقرر کیا اور ہر ذمہ داری کو سونپتے وقت مقام، ماحول اور موزونیت کی بہر حال رعایت رکھی۔

مندرجہ بالا مقدمات کے بعد اب ہم ریاست کے انتظامی اداروں کا جائزہ لیں گے۔ انتظامی ادارے دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک مرکزی اور دُوسرے صوبائی۔ اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے مرکزی نظم کا مطالعہ کریں گے۔

(۱) مقتدرِ اعلیٰ

ریاست نبوی میں حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ کا منصب اللہ کے لئے خاص ہے اس کی تشریح اور اس کے اطلاقات کا مفصل مطالعہ کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جس توحید کی تعلیم رسول اللہؐ آغازِ بعثت سے دے رہے تھے اور جس تصورِ حاکمیت کی توضیح آپ اپنی مکّی زندگی میں فرماتے رہے اس کی عملی تعبیر اس وقت سامنے آئی جبکہ رسول اللہؐ نے اسی تصورِ حاکمیت کی بنیاد پر مدینہ میں ایک ریاست قائم کی اور تمام امورِ ریاست کو خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے انجام دیا۔ حاکمیتِ الٰہی کا یہی وُہ بنیادی اصول ہے جس نے ریاست نبوی کو دنیا کی دوسری ریاستوں میں انفرادیت عطا کی اور

اس کے نظم و نسق کو ایک خاص نہج پر استوار کیا۔

تاریخ و سیاسیات کا ہر طالب علم اس حقیقت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ کے اہم مسئلہ کو ریاستِ نبوی میں اللہ کے ساتھ مخصوص کر کے جس آسانی کے ساتھ حل کر دیا گیا وہ انتہائی حیرت انگیز ہے۔ پھر یہ تحیر اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جبکہ ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کارنامہ اس ماحول اور اس ملک میں انجام دیا گیا جہاں نظم و مرکزیت کا تاریخ کے کسی دَور میں پتا نہیں چلتا۔ اور جہاں کے لوگ ہر چیز کو "پیکرِ محسوس" میں دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے اس کے برعکس حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ کا یہی مسئلہ تاریخ عالم خصوصاً تاریخ یورپ میں ہمیشہ ایک عقدہ لاینحل بنا رہا اور اس سوال پر کہ حاکمیت کس کی ہو اور اقتدارِ اعلیٰ کس کا تسلیم کیا جائے۔ مغرب کے فلاسفۂ سیاسیات و اجتماع کے درمیان کبھی اتفاقِ رائے نہ ہو سکا۔ ان میں بیحد اختلافات پائے جاتے ہیں بلکہ اب تو بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اگر مغربی فلاسفہ اور مفکرینِ سیاست کا ایک گروہ نظریۂ حاکمیت کا علمبردار ہے اور ریاست کے لئے حاکمیت کو ناگزیر سمجھتا ہے تو دوسری طرف ایک باقاعدہ گروہ ان فلاسفہ کا بھی موجود ہے جو سرے سے کسی حاکمیت کے ہی قائل نہیں ہیں بلکہ انہوں نے حاکمیت کے خلاف علمِ بغاوت بھی بلند کیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں علی الترتیب فرانس کے مفکر ڈیوگی (DUGUIT) اور انگلستان کے پروفیسر لاسکی (LASKI) کو نمائندہ حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک ان میں سے اول الذکر گروہ کا نظریہ تاریخی حقائق کی روشنی میں درست نظر آتا ہے۔ ازمنۂ قدیم سے اب تک ہر زمانے میں حاکمیت ریاست کا جزوِ لازم رہی ہے۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ حاکمیت مختلف ادوار میں مختلف ممالک میں، مختلف اجسام میں جلوہ گر ہوتی رہی۔ اور ایسا بھی ہوا کہ زمامِ حکومت کبھی تو بادشاہت و شہنشاہیت یا استبداد و آمریت کی شکل میں صرف ایک شخص کے ہاتھ میں رہی تو کبھی ایک مذہبی گروہ "پاپائیت" کے روپ میں مسندِ حاکمیت پر فائز ہوا۔ کبھی چند اشراف مقتدرِ اعلیٰ بن گئے اور کبھی جمہور کا اجتماعی وجود مستحقِ حاکمیت سمجھا گیا۔ غرض احوال و ظروف کے اعتبار سے حاکمیت کا نام اور اس کی ہیئت تو بدلتی رہی لیکن اس کا وجود بہرحال تاریخ کے ہر دور میں ثابت ہے۔

ہر نظمِ سیاسی کے لئے حاکمیت کی اہمیت مسلّم ہے اور فی الواقعہ ریاست کا قیام و بقا اس کے بغیر ناقابلِ تصور ہے البتہ یہ کہنا عین حقیقت ہے کہ ایک "تصورِ سیاسی" کی حیثیت سے حاکمیت کا نظریہ محض دورِ جدید کی پیداوار ہے[۴]۔ حتیٰ کہ یونان و قرونِ وسطیٰ کے مفکرین کے یہاں بھی یہ تصور نہیں پایا جاتا۔ اس کی صاف وجہ یہ ہے کہ "وہ مخصوص حالات جنہوں نے اس قسم کے نظریہ کی ضروریات کا احساس دلایا۔ دورِ جدید کے آغاز میں ہی پیدا ہوئے"[۵]۔

لیکن اسلام میں حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ کا تصور اتنا ہی قدیم ہے جتنی پرانی خود اسلام کی تاریخ ہے۔ نیز اسلام میں تصوراتی یا عملی اختلافات بھی نہیں پائے جاتے۔ چنانچہ جیسا کہ کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاکمیتِ الٰہی کا نظریہ پیش بھی کیا اور اسے اپنی ریاست میں بہ تمام و کمال نافذ بھی فرمایا[۶]۔ اور اسلام کے علمائے سیاسیات بھی صدہا سال سے اسی نظریۂ حاکمیت کو پیش کرتے آ رہے ہیں۔ اسلام کے نظریۂ حاکمیت پر مفصل بحث کا یہاں موقع نہیں ہے، علاوہ بریں

مسلمان مفکرین کا اس مسئلہ پر بے انتہا تحریری مواد موجود ہے۔ لہٰذا مختصراً یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اگر حاکمیت کے لغوی معنی اور علم سیاسیات کی رُو سے اس کی تعریف اور خصوصیات کا مطالعہ کیا جائے [۷] تو یہ ثابت ہوگا کہ کوئی انسان یا انسانی ادارہ فی الحقیقت صفات حاکمیت سے متصف نہیں ہو سکتا۔ یعنی کوئی انسان یا انسانی ادارہ ایسا نہیں ہو سکتا" جس کا ہر حکم علی الاطلاق قانون کا درجہ رکھتا ہو، اسے افرادِ ریاست پر حکم چلانے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہوں اور تمام باشندے اس کی غیر مشروط اطاعت پر مجبور ہوں۔ اس کے اختیاراتِ حکمرانی کو اس کے اپنے ارادے کے سوا کوئی خارجی چیز محدود کرنے والی نہ ہو۔ افراد کو اس کے مقابلہ میں کوئی حق حاصل نہ ہو۔ وُہ اپنی ذات میں قادرِ مطلق ہو جو کچھ کرے وہی چیز صحیح ہو، کوئی تابع اس کو غلط قرار نہ دے سکے اس لیے ناگزیر ہے کہ اسے سبوح و قدوس اور منزہ عن الخطا مانا جائے خواہ وہ ایسا ہو یا نہ ہو۔" [۸]

اس لئے یہی بات زیادہ منطقی اور حقیقت سے قریب ہو سکتی ہے کہ مقتدر حقیقی اور حاکم و قانون ساز، انسان کے بجائے اللہ کو تسلیم کیا جائے۔ صفات حاکمیت کا اطلاق و انطباق اسی ذات عالی کے لئے اس لئے بھی سزاوار ہے کہ غیر محدود حاکمیت فی الواقع نہ تو کسی انسانی اقتدار کو حاصل ہو سکتی ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ کسی بادشاہ یا پارلیمنٹ یا قوم یا پارٹی کو ایک محدود دائرہ میں جو حاکمیت حاصل ہو وہ اسے بے عیب اور بے خطا طریقے سے استعمال کر سکے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ ایسا علم جو تمام متعلقہ حقائق پر حاوی اور زمان و مکان کی حدود سے متجاوز ہو، ایک انسان یا ایک ادارہ کو تو کجا، پوری نوع انسانی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ [۹]

مختصر یہ کہ حاکمیتِ الٰہی کا وہ اصول جو ریاستِ نبوی کا سنگِ بنیاد ہے ریاست نبوی کے تمام ادارات کا جامع و انھیں باہم مربوط کرنے والا ہے۔ درحقیقت اپنی تمام جزئیات و تفصیلات کے ساتھ ایک مکمل اور جامع نظریہ ہے چنانچہ پروفیسر گبّل کا یہ کہنا درست ہے کہ :

"حاکمیت کے اصول کا براہِ راست نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حاکم اعلیٰ کے جتنے محکوم ہوتے ہیں ان میں بڑائی چھوٹائی نہیں رہتی اس لئے کہ وُہ سب ایک ہی قانون کے پابند ہوتے ہیں۔" [۱۰]

پھر آگے لکھتے ہیں کہ :

"اسلام نے انتہائی مرکزیت کا پرچار کیا اور سب سے بڑا مرکز ایک خدا کو قرار دے کر اسی کو ملک یعنی تمام اقتدار کا سرچشمہ بنایا۔ اسی لئے جتنی مساوات اسلام میں پائی جاتی ہے اس سے زیادہ مساوات مشکل ہی سے کسی دوسرے سلسلے میں نظر آئے گی۔" [۱۱]

ہر نظم کی کیفیت یہ ہے کہ جب تک اس کا ایک مرکز نہ ہو، جب تک کوئی ایسی ذات نہ ہو جس کا حکم ماننا ہر شخص اپنا ذہن سمجھے جو اپنے احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دے سکے۔ جس کی اطاعت محض قانونی طور پر ہی نہیں مذہبی تقدس کے ساتھ کی جائے اس وقت تک یہ تنظیم قائم نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حاکمیتِ الٰہی کا نظریہ ان تمام ضرورتوں کو کما حقہٗ

پُورا کرتا ہے کیونکہ اس کے تحت ایک ہی مبنی اعتقاد کا مرکز، اعمال کا محور، ضابطہ دستور کا سرچشمہ، سیاست و سلطنت کا مبدأ نیز عادلانہ تدبر اور حکیمانہ انصاف کا مرجع اوّل ہے۔ وُہ ایک ایسی حقیقی وحدت ہے جس کے نام پر قوموں، اُمتوں، ملتوں، ملکوں اور مملکتی طبقوں اور جماعتوں، مذہبوں اور سیاسی مسلکوں کی تمام تقسیمیں سمٹ کر ایک ہو جاتی ہیں اور عالمگیر وحدت کے رجحان کو پوری طرح ظاہر کرتی ہیں۔ لہٰذا حاکمیتِ الٰہی کے نظریہ پر قائم ہونے والی تنظیم اپنے اندر غایت درجہ کی مرکزیت رکھتی ہے۔

ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حاکمیتِ الٰہی کے اسلامی اصول میں جو قطعیت پائی جاتی ہے وہ اصولِ حاکمیت کی پُوری تاریخ میں بالکل منفرد ہے۔ وقت اور حالات کی تبدیلی، سیاسی و تمدنی ماحول کے فرق اور زمانہ کے تغیّرات سے حاکمیتِ الٰہی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کی یہ خصوصیت اس وقت اور نمایاں ہو جاتی ہے جبکہ ہمارے سامنے یہ رہے کہ یورپ میں افکارِ سیاسی کی تاریخ پیہم انقلابات کا شکار رہی ہے اور اصولِ حاکمیت مسلسل متغیر ہوتا رہا ہے[12]۔ حتّٰی کہ خود حاکمیت کا جسم واحد بھی متعدد قالبوں میں بانٹ دیا گیا مثلاً کائناتی حاکمیت، سیاسی حاکمیت[13]، قانونی حاکمیت[14]، عومی حاکمیت[15]، حقیقی و غیر حقیقی حاکمیت[16] اور خارجی حاکمیت وغیرہ[17]۔ بدیہی طور پر اصولِ حاکمیت کی تقسیمات اور تغیّرات کا اثر دوسرے سیاسی اصولوں پر بھی پڑا جس کے نتیجہ میں مغرب کے نظریاتی انتشار کا دائرہ عہد بہ عہد وسیع ہوتا رہا۔

اس کے برعکس اسلام کا موقف یہ ہے کہ اللہ کی حاکمیت جس طرح کائناتی ہے اسی طرح سیاسی، قانونی و تشریعی، اخلاقی و اعتقادی اور فطری و حقیقی بھی ہے بلکہ قرآن کی رُو سے اگر کوئی اللہ کی سیاسی و قانونی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا تو اس کا محض اللہ کی فطری و کائناتی حاکمیت کو مان لینا بے فائدہ ہے[18]۔ اسلام ہر قسم کی حاکمیت کا مبدأ اور مرکز ذات واحد کو قرار دیتا ہے اور کائناتی، سیاسی، قانونی، اخلاقی و اعتقادی اور حقیقی جملہ اقسام کی حاکمیت کا سرچشمہ اللہ کو ٹھہراتا ہے۔ چنانچہ سورۂ زمر میں پیرایۂ بیان یہ اختیار کیا گیا ہے کہ،

ذٰلکم اللہ ربکم لہ الملک لا الٰہ الا ھو فانّٰی تصرفون۔[19]

(وہی اللہ تمہارا رب ہے، بادشاہی اسی کی ہے کوئی الٰہ اس کے سوا نہیں ہے پھر تم کدھر پھرے جا رہے ہو؟)

گویا استدلال یہ قائم کیا گیا کہ جب وہی تمہارا رب ہے اور ساری بادشاہی اسی کی ہے تو پھر لازماً تمہارا معبود بھی وہی ہے۔ کوئی دوسری ذات اس منصب پر کیونکر سرفراز ہو سکتی ہے جبکہ نہ پروردگاری میں اس کا کوئی حصّہ ہے نہ بادشاہی میں۔ چنانچہ سورۂ یونس میں دعوتِ فکر دیتے ہوئے کہا گیا کہ:

"اللہ تمہارا رب ہے تم اسی کی عبادت کرو۔"[20]

یعنی جب واقعہ یہ ہے کہ ربوبیت بالکلیہ اللہ کی ہے تو اس کا لازمی تقاضا بھی یہی ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو۔ بالفاظِ دیگر عبادت کا استحقاق تو اس کو حاصل ہو سکتا ہے جو اقتدار رکھتا ہے اور اقتدار اسی کو حاصل ہوتا ہے جو عبادت کا

مستحق ہوتا ہے۔ اس منطقی ربط کو مزید واضح کرتے ہُوئے کہا گیا کہ:

الا لہ الخلق والامر۔[۲۱]

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ محض خالق ہی نہیں آمر اور حاکم بھی ہے۔ علاوہ ازیں کائنات کو تخلیق کر کے وہ معطل نہیں ہو گیا بلکہ اس پر حکمرانی کر رہا ہے اور اس کا انتظام و انصرام پورے تدبر و حکمت سے کر رہا ہے[۲۲]۔ قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ اللہ ہی پُوری کائنات کا حاکم حقیقی ہے[۲۳]، حاکمیت اس کے سوا کسی کی نہیں، یعنی اس کی حاکمیت میں کوئی شریک نہیں ہے[۲۴]۔ حلال و حرام کرنے کا کُلّی اختیار یعنی قانون سازی کا حق صرف اسی کے لئے خاص ہے[۲۵]۔ وہ جس طرح رب العالمین[۲۶] اور رب الناس[۲۷] ہے اسی طرح ملک الناس[۲۸] بھی ہے۔ اس کی قوت لامحدود اور اس کی طاقت و وسعت سب پر حاوی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[۲۹]۔ ساری طاقتیں اور سارے اختیارات اللہ ہی کے قبضے میں ہیں[۳۰]۔ وہ بالا دست ہے[۳۱] کسی کا ماتحت نہیں اور ہر شے پر تصرف کلّی اور اپنے بندوں پر کامل اقتدار رکھتا ہے[۳۲]۔ وہ حاکم مطلق ہے اسے پُورا اختیار ہے کہ جو چاہے حکم دے[۳۳]۔ اس کی حاکمیت کو محدود کرنے والی بجز اس کے اپنے ارادہ کے کوئی خارجی چیز نہیں ہے[۳۴]۔ یعنی کوئی بالاتر قانون ایسا نہیں ہے جو اس کے اختیارات کو محدود کرتا ہو کیونکہ اپنے قانون کا وہ خود ہی واضع ہے، کوئی دوسری ہستی اس کے حکم یا فیصلے کو نفاذ سے روکنے یا بدلنے یا نظرثانی کرنے والی نہیں ہے[۳۵]۔ وہ خود مختار ہے اور اجرائے حکم کی پُوری آزادی کا مالک ہے اور کوئی چیز اسے عاجز کرنے والی نہیں ہے[۳۶]۔ وہ غیر مسئول اور غیر جواب دہ ہے[۳۷] وہ مجرموں اور ملزموں سے پُورا انتقام اور بدلہ لینے پر قادر ہے[۳۸]۔ جلالت عامہ اسی کے لئے مخصوص ہے کوئی دوسرا اس کا سزاوار نہیں ہے[۳۹]۔ اللہ کی حکومت و اقتدار محض وقتی اور عارضی نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لئے ہے کیونکہ وہ خود زندہ و قائم ہے اور ازلی و ابدی حیات اس کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہے[۴۰]۔ وہ زمین و آسمان اور پُوری کائنات میں ہر جگہ، ہر لمحہ، ہر آن حکومت کر رہا ہے[۴۱]۔ یعنی اس کی حاکمیت ہمہ گیر ہے، دین و دنیا پر محیط ہے اور شرکت یا دوئی سے پاک ہے[۴۲]۔ اس کی ذات ہر نقص و عیب یا کمزوری سے پاک اور منزہ عن الخطا ہے، یعنی وہی سبوح و قدوس ہے[۴۳]۔ اس کا حکم اور فیصلہ اٹل ہے[۴۴] اور صرف اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ انسانی اختلافات کا تصفیہ کرے اور حق و باطل کی حقیقت واضح کرے[۴۵]۔ اس کا ہمہ گیر اقتدار ایک بے عیب حکمت اور بے خطا علم کے ساتھ پوری انسانیت پر محیط ہے[۴۶]۔ مختصر یہ کہ جملہ اختیارات، فرمانروائی اور ہر قسم کی حاکمیت اور ہر طرح کی ملکت و مالکیت کے تمام حقوق صرف اللہ تعالیٰ رب العالمین کو حاصل ہیں[۴۷]۔ پوری کائنات اسی کی ولایت[۴۸] اور اسی کی میراث ہے[۴۹]۔ اس لئے اشیائے کائنات پر مخلوق کا قبضہ و تصرف محض عارضی ہے اور اگر کسی انسان کو کہیں حکمرانی کے اختیارات حاصل ہیں تو وہ بھی اللہ کے دئے ہوئے ہیں[۵۰]۔ لہٰذا دنیا میں کیا جانے والا ہر دعویٰ حاکمیت خواہ وہ کسی بادشاہ یا آمر یا طبقہ یا خاندان یا گروہ وغیرہ کی طرف سے کیا جائے، بہرحال باطل قرار پائے گا کیونکہ حاکمیت اس حکومت کو نہیں کہتے جو کسی کا عطیہ ہو جو کبھی باقی ہو اور کبھی سلب ہو جاتی ہو[۵۱] جسے کسی دوسری طاقت سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہو، جس کا قیام و بقاء عارضی ہو اور جس کے دائرۂ اختیار کو بہت سی دُوسری متصادم قوتیں محدود کرتی ہوں لہٰذا

فی الواقع اللہ کی حاکمیت اپنے کسی محدود یا مجازی معنی میں نہیں بلکہ اس کے پُورے مفہوم کے لحاظ سے حاکمیتِ بادشاہی ہے، بلکہ حاکمیت درحقیقت جس چیز کا نام ہے وُہ اگر نہیں پائی جاتی ہے تو صرف اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ ہی میں پائی جاتی ہے۔ وُہ کائنات کے تمام حاکموں کا حاکم اور سب سے بڑا حاکم ہے (۵۳) اس کا نہ کوئی مماثل ہے نہ ہمسر (۵۴) نہ اس کی ذات و صفات، اختیارات اور حقوق میں سے کسی چیز میں بھی کوئی دوسرا حصّہ دار ہے۔

یہی وہ عقیدہ تھا جس نے فراموش کار دنیا کو ایک نئے معاشرہ اور نئے نظریہ ریاست سے آگاہ کیا اور دنیا میں خدائے واحد کو فرمانروائے مطلق ماننے کی طرح ڈالی، یہی وُہ خیال تھا جس نے ایک ایسی خداترس قوم کی تشکیل کی جس کا ہر فرد امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا علمبردار اور ایک کلمہ کی بنا پر آزاد دوسرے کلمہ گو کے برابر اور اس کا بھائی تھا، جس کے تمام کام اور حکومت کی ذمہ داریاں، تدبیر و تنظیم، تعلیم و تبلیغ، تعمیر و اصلاح، صلح و جنگ، معاہدے اور میثاق اللہ ہی کے نام سے شروع ہوتے تھے اور اللہ ہی کی ضمانت پر ختم کئے جاتے تھے۔ اور خدا کے حقیقی تصوّر اور سچے عرفان نے ان کو یہ یقین دلایا تھا کہ خدا کی حاکمیت کا انکار کر کے دنیا میں کوئی اچھی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔

اُوپر کی تفصیلات سے ایک طرف تو اس تصوّرِ حاکمیت کی وضاحت ہو جاتی ہے جو اسلام پیش کرتا ہے اور جس کو سلہ میں ایک ریاست قائم فرما کر رسول اللہؐ نے عملاً نافذ فرمایا تھا اور جس کی مزید تاکید و توضیح نیز عملی تعبیر رسول اللہؐ کی مدنی زندگی میں بتدریج ہوتی رہی۔ دوسری طرف مندرجہ بالا جائزہ سے رسول اللہؐ کی اصل حیثیت بھی نکھر کر سامنے آجاتی ہے یعنی آپ مقتدرِ اعلیٰ نہ تھے بلکہ مقتدرِ اعلیٰ کے نائب و نمائندہ اور اس کے فرستادہ تھے۔ جیسا کہ تفصیلی بیان آگے آرہا ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ تصوّرِ حاکمیت کے خصائص و تصوّرات کا یہ مطالعہ بیشتر مکّی سورتوں پر ہی مبنی ہے۔ اس میں محض چند تائیدی حوالے مدنی سُورتوں کے بھی ہیں لیکن بنیادی مواد مکّی سورتوں سے ہی ماخوذ ہے۔ یہ اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ اسلام کے نظامِ سیاست میں اصول پہلے دے جاتے ہیں اور پھر نفاذ و عمل ان کی مطابقت میں انجام پاتا ہے۔

(۲) رئیسِ مملکت

یہ بات طے ہو جانے کے بعد کہ ریاستِ نبویؐ میں اقتدارِ اعلیٰ اور حاکمیت صرف اللہ کو حاصل تھی رسول اللہؐ کی حیثیت حاکمِ حقیقی اور مقتدرِ اعلیٰ کے نائب اور خلیفہ کی قرار پاتی ہے۔ یعنی آپ کی حکومت دنیا میں اللہ کی حکومت بالادست کے ماتحت تھی اور اسے سیاسی تنظیم کے اعتبار سے "خلافت"، (۵۴) کہنا چاہیئے۔ کیونکہ جو ادارہ سیاسی طاقت سے اللہ کی قانونی حاکمیت کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہو اور جس کے اختیارات کو پہلے ہی وحیِ الٰہی کی صورت میں ایک برتر قانون (۵۵) نے محدود اور پابند کر دیا ہو اسے قانون و سیاست کی کسی اصطلاح میں حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔

رسول اللہؐ کے اُسوۂ حسنہ کی شہادت اس بات پر موجود ہے کہ آپ کی تمام زندگی کی تمام جدّ و جہد کا محور یہ تھا کہ

دنیا میں کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ حکومت کا اصل حق صرف اللہ کو حاصل ہے اس کے سوا کسی کی محکومیت جائز نہیں۔ اسی حقیقتِ کبریٰ کا ابلاغ آپ کی دعوت کا خلاصہ اور آپ سے پہلے آنے والے رسولوں کی تعلیم کا ماحصل تھا[56]۔ نیز آپ کی جملہ انفرادی مساعی اور ریاست کی ساری کوششیں اللہ کے قانون کی برتری کو ہی قائم کرنے کے لئے وقف تھیں اور آپ کا اصل کام احکم الحاکمین کے قانون کا غلبہ و نفاذ تھا[57] اور مختصراً آپ کا مشن حضرت عیسٰی کے الفاظ میں یہ تھا کہ :

"تیری بادشاہی آئے اور تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو"[58]

قرآن کی تصریحات کے مطابق رسول اللہ انسانیت کے معلم و مربی[59] اور پیشوا اور نمونۂ تقلید[60] ہونے کے علاوہ شارح کتاب اللہ بھی تھے[61]۔ یعنی آپ مقتدرِ اعلیٰ کے قانون کی تشریح و تعبیر کا حق رکھتے تھے نیز آپ کے فرائض رسالت میں یہ بات داخل تھی کہ آپ قانونِ الٰہی کی توضیح فرمائیں اور اس کے مطابق حکم جاری کریں[62]۔ آپ کو یہ بھی حکم ملا تھا کہ الہامی بصیرت کی روشنی میں قوانین کا اطلاق کرنے میں کوئی کوتاہی نہ دکھائیں[63]۔ علاوہ بریں لوگوں کے درمیان اختلافات کی صورت میں فیصلہ کرنے[64] اور ایک محدود دائرہ میں تشریع و قانون سازی کے اختیارات بھی آپ کو مقتدرِ اعلیٰ کی طرف سے سونپے گئے تھے[65] لیکن اسی کے ساتھ ساتھ آپ کو یہ اجازت نہ تھی کہ اپنے آپ کو کسی حال میں اس بالاتر قانون سے مستثنیٰ کر لیں جو مقتدرِ اعلیٰ کی طرف سے جاری کیا گیا تھا[66]۔ حتیٰ کہ نجی معاملات میں بھی رسول اللہ کو من مانی کرنے کا اختیار نہ تھا۔ اس کی روشن مثال وہ واقعہ ہے جسے قرآن کی سورۂ تحریم میں بیان کیا گیا ہے[67]۔ اس سے خود بخود یہ مضمون مترشح ہوتا ہے کہ اللہ نے جس کو حلال کیا اسے حرام کرنے کا اختیار کسی کو بھی نہیں اور رسول اللہ نے اس چیز کو شرعاً یا عقیدۃً حرام نہ سمجھا تھا بلکہ صرف اپنی ذات پر اس چیز کے استعمال کو حرام کر لیا تھا جس کی طرف سورہ کی پہلی ہی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ چونکہ رسول کی حیثیت سے آپ کا منصب ایک عام آدمی سے مختلف تھا۔ اس لئے آپ کی ذمہ داریاں بھی بہت نازک تھیں۔ آپ کا معمولی سے معمولی فعل بھی خواہ وہ کتنی ہی ذاتی یا نجی نوعیت کا ہو اپنے نتائج و عواقب کے اعتبار سے بہت اہم تھا[68]۔ علاوہ ازیں آپ کے لئے تو ضروری یہ تھا کہ حاکمیتِ الٰہی کو سب سے پہلے تسلیم کریں اور سب سے پہلے عمل پیرا ہوں۔ چنانچہ قرآن میں یہ الفاظ پوری صراحت کے ساتھ موجود ہیں کہ :

انی امرت ان اکون اوّل من اسلم[69]۔

(مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں سب سے پہلے تابعداری اختیار کروں)

ایک اور جگہ بیان کیا گیا ہے کہ :

انما امرت ان اعبد رب ھذہ البلدۃ الذی حرمھا ولہ کل شئ وامرت ان اکون من المسلمین وان اتلوا القراٰن[70]۔

(کہہ دو کہ مجھے یہی حکم ملا ہے کہ اس شہر مکہ کے مالک کی عبادت کروں جس نے اس کو محترم بنایا ہے اور سب چیز

اسی کی ہے اور مجھے یہی حکم ملا ہے کہ اسی کا حکم بردار رہوں اور یہ بھی کہ قرآن پڑھوں)

اور قرآن میں ایک جگہ اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرنے کو ظلم فسق اور کفر سے تعبیر کیا گیا ہے[۴۱]

ان ہدایات کے پیشِ نظر رسول اللہ نے انسان کی سیاسی تاریخ میں یہ کارنامہ انجام دیا کہ مہبطِ وحی اور شارح کتاب ہونے کے باوجود قانونِ الٰہی کے نفاذ و عمل سے اپنے آپ کو بھی مستثنیٰ قرار نہ دیا بلکہ سب سے پہلے ان احکام کا اطلاق اپنی ذات پر کیا[۴۲] خود اپنے ہی خلاف متعدد بار لوگوں سے یہ کہہ کر گویا مقدمہ کی دعوت دی کہ اگر ان کی طرف سے کوئی زیادتی ہوئی ہو تو اس کا بدلہ لے لیا جائے۔[۴۳] حضرت عمر بھی شہادت دیتے ہیں کہ:

رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقص من نفسہ۔[۴۴]

(میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ اپنی ذات سے بھی قصاص لیتے تھے)

یہ کسی معمولی کردار کا مظاہرہ نہیں تھا۔ آپ نے اس کے ذریعہ اگر ایک طرف بادشاہوں اور حکمرانوں کے خدائی حقوق کی جڑ کاٹ دی تو دوسری طرف ریاست میں قانونِ الٰہی کی بالادستی و حکمرانی کو پوری قوت کے ساتھ نافذ فرما دیا۔

یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ اگرچہ رسول اللہ بجائے خود قاضی و حکم تھے اور اُمت کے لئے بہترین نمونۂ عمل ہونے کی بنا پر اپنے وقت میں آپ جن مذہبی اور سیاسی و اجتماعی احکام پر عمل پیرا ہوئے وہ سب کے سب آنے والے زمانوں کے لئے نظیر بن گئے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ریاست کی تاسیس عمل میں آجانے کے بعد معاشرہ کی اصلاح کے لئے آپ کو مقتدرِ اعلیٰ کی طرف سے وسیع اختیارات عطا کر دیئے گئے تھے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود آپ قانون سازِ حقیقی کے مقرر کئے ہوئے حدود سے سرِ مُو تجاوز نہ کر سکتے تھے اور اگر بالفرضِ محال کوئی ایسا حکم جاری بھی فرما دیتے تو لوگوں پر اس کی اطاعت کا وجود قائم نہ ہو سکتا تھا کیونکہ قرآن کی رُو سے آپ کی اطاعت پر بھی اطاعت فی المعروف کی قید ہے۔[۴۵] گویا دنیا میں کسی مخلوق کی اطاعت قانونِ الٰہی کی حدود سے باہر نہیں کی جا سکتی۔ پھر جب اللہ کے رسول کی اطاعت بھی معروف کی شرط سے مشروط ہے تو ظاہر ہے کہ دوسرے صاحبانِ امر کے لئے غیر مشروط اطاعت کا حق کسی طرح قائم نہیں ہو سکتا۔ اور ان کے کسی ایسے حکم یا قانون کی پیروی نہیں کی جا سکتی جو قانونِ الٰہی کے خلاف ہو۔ اس اصول کی وضاحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے متعدد ارشادات میں فرمائی ہے، مثلاً:

لا طاعة فی معصیة اللہ، انما الطاعة فی المعروف۔[۴۶]

(اطاعت اللہ کی نافرمانی میں نہیں ہے اطاعت صرف معروف میں ہے)

ایک حدیث میں یہ تفصیل ہے کہ:

السمع والطاعة علی المرء المسلم فی ما احب وکرہ ما لم یؤمر بمعصیة فاذا امر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة۔[۴۷]

(مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سُنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند،

تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ سننا لازم ہے نہ ماننا)

تفصیلاتِ بالا سے رسول اللہؐ کا سیاسی و قانونی مقام متعین ہو جاتا ہے۔ ریاست میں آپ کی حیثیت ایک خودمختار اور مطلق العنان حکمران کی نہ تھی بلکہ آپ اللہ کی حاکمیت کے تابع اور اس کے حکم کے پیرو تھے اور جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ رسولؐ اللہ کو بلاشبہ ایک خاص دائرہ کے اندر تصرف کا حق حاصل تھا مگر یہ اختیار بھی آپ کا ذاتی نہیں بلکہ اللہ کا تفویض کردہ تھا اور یہ بالعموم آپ اس وقت استعمال فرماتے تھے جبکہ قرآن خاموش ہو۔[۷۸] ایسی صورت میں آپ اجتہاد فرما کر پیش آمدہ مسئلہ حل فرما دیتے تھے۔ اجتہادِ نبوی اگرچہ قرآن سے موخر اور اس کے تابع ہے لیکن بعد میں آنے والوں کے لئے پابندی یہ ہے کہ وہ قانونِ سنت سے بھی انحراف نہیں کر سکتے۔ کیونکہ رسولؐ کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے ہم معنی ہے[۷۹] قرآن میں جگہ جگہ اللہ کے ساتھ ساتھ رسولؐ کی اطاعت و اتباع کا حکم اور ان کی معصیت و نافرمانی سے مجتنب رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔[۸۰] قرآن کی رُو سے پُوری اُمتِ مُسلمہ کے لئے اطاعتِ رسول واجب ہے اور اس کے لئے یہ اصول متعین کر دیا گیا ہے کہ اول الذکر کی اطاعت مشروط بہ اطاعتِ الٰہی ہوگی اور اولی الامر سے اختلاف کی صورت میں ہمیشہ اللہ اور اس کے رسول سے ہی فیصلہ طلب کیا جائے گا۔[۸۱] نیز آپ کے اوامر و نواہی کی پوری پوری پیروی کی جائے گی۔[۸۲]

اب جہاں تک سربراہِ حکومت کی حیثیت سے رسول اللہؐ کی عملی و انتظامی ذمہ داریوں کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں مختصراً ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ آپ ریاست کی سب سے زیادہ ذمہ دار شخصیت، اس کے قائد و منتظم اور حکمرانِ اعلیٰ تھے۔ تمام داخلی و خارجی معاملات کے نگران اور دینی و مذہبی پیشوا ہونے کے ساتھ ساتھ دنیوی امور کے بھی سربراہ تھے۔ شارحِ قانون اور شارع، سپہ سالارِ افواج اور قاضی القضاۃ وغیرہ سبھی کچھ تھے اور اس طرح آں حضرت بیک وقت انتظامیہ مقننہ اور عدلیہ تمام شعبوں کے صدر نشین تھے۔ عہدِ رسالت میں ان اعضائے ریاست میں اس قسم کی تحدید و تخصیص نہ تھی جو بعد کو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں پیدا ہوئی اور انہوں نے انتظامیہ مقننہ اور عدلیہ کو الگ الگ کر دیا۔ ریاستِ نبوی میں یہ تمام ذمہ داریاں ذاتِ رسالت میں مجتمع تھیں۔ ایک تو اس وقت ریاست کا آغاز تھا اور دوسرے اس زمانہ میں سیاسی ضرورتوں کا تقاضا بھی اتنا ہی تھا۔ بعد میں جب اسلامی ریاست میں پھیلاؤ واقع ہوا اور ریاست کی ضرورتیں بھی بہت زیادہ بڑھ گئیں تو مذکورہ شعبوں کو الگ الگ کر دیا گیا۔ تمام اعضائے ریاست یا مذکورہ شعبوں کے ایک ہی شخصیت میں مجتمع ہونے کا سب سے بڑا نقصان وہ پہلو یہ ہوتا ہے کہ ایک شعبہ دُوسرے شعبہ کے زیرِ اثر آ جاتا ہے اور آزادانہ عمل کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں جبکہ عہدِ نبوی میں تمام ذمہ داریاں ذاتِ واحد میں مجتمع ہو جانے سے یہ خطرہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ایک طرف تو آپ براہِ راست اللہ کی نگرانی میں تھے اور وہاں کوئی فروگزاشت نظر انداز نہ کی جاتی تھی۔[۸۳] علاوہ بریں رسول اللہؐ طبعاً ایسے نہ تھے کہ کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھائیں یا اپنے مقصد کا بے جا استعمال کریں۔ چنانچہ آپ کے اُسوہ حسنہ میں کوئی ایک مثال بھی خلافِ عدل نہیں مل سکتی۔ آپ کو تو ہر حال میں عدل برتنے کا الہامی حکم ملا تھا۔[۸۴]

اس لئے آپ اس سے پہلو تہی نہیں کر سکتے تھے بلکہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ آپ نے کبھی اپنے خلاف کسی تنقید کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔ بحیثیت رسول آپؐ کو چند مراعات ضرور حاصل تھیں (مثلاً یہ کہ چار سے زیادہ نکاح کی رعایت، حضورؐ کے بعد ازواجِ مطہرات سے کسی اور کے نکاح کی ممانعت اور میراث کے متعلق کہ آپ کی میراث تقسیم نہ ہو سکتی تھی وغیرہ وغیرہ) لیکن دُوسرے تمام معاملات میں عام مسلمانوں سے زیادہ ادنیٰ استحقاق بھی آپ کو حاصل نہ تھا۔

درحقیقت کسی جمہوری نظامِ حکومت کی معراج یہ ہے کہ حکمران اپنے ذاتی حقوق و معاملات میں عوام کے مساوی ہو اور کسی قسم کا امتیاز یا استثناءً اسے حاصل نہ ہو اور عام شہری زندگی میں بھی کوئی امتیاز اس وجہ سے نہ رکھتا ہو کہ وہ حکمران ہے۔ اس کے اختیارات محدود ہوں اور ریاست کے باشندے اس پر تنقید و احتساب کے لئے آزاد ہوں۔ یہ تمام اصول فی الحقیقت ایک صحت مند سیاسی نظام میں نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن انہیں پوری رُوح اور فعالیت کے ساتھ عہدِ رسالت میں ہی اپنایا گیا بلکہ معراجِ کمال تک پہنچایا گیا۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ چونکہ ریاست نبوی کی تاسیس ایک معاہدہ عمرانی پر ہوئی تھی جس کی رُو سے راعی اور رعایا کے تعلقات کی نوعیت جبر و استبداد یا آمریت کے نظام سے مختلف تھی۔ نیز معروف کے مطابق جس طرح باشندوں پر رسولؐ اللہ کی اطاعت و خیر خواہی اور تعاون لازمی تھا اسی طرح رسولؐ اللہ کے لئے بھی ضروری تھا کہ ان کی فلاح و بہبود میں سرگرمِ عمل رہیں اور اگر ان کو شکایات پیدا ہوں یا آپ پر کوئی اعتراض کریں تو اس صورت میں آپ انہیں مطمئن کریں۔ واقعاتِ سیرت میں اس کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں مثلاً صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابہ کی بے چینی خصوصاً حضرت عمرؓ کا رسولؐ اللہ سے بڑے تلخ لہجے میں سوال اور رسولؐ اللہ کا جواب دے کر انہیں مطمئن کرنا[۸۵] یا مثلاً جب حنین کی تقسیم کے سلسلے میں انصار کو کچھ شکایات پیدا ہوئیں تو رسولؐ اللہ نے اس مسئلہ کو پوری سنجیدگی کے ساتھ حل کیا اور ایک خطبہ میں وضاحتیں فرما کر انصار کو مطمئن کر دیا[۸۶] مختصر یہ کہ عہد نبوی میں لوگوں کو اظہارِ رائے اور اختلاف رائے کی آزادی حاصل تھی البتہ وہ اعتراض و تنقید کرنے میں بے لگام نہ تھے۔ نیز رسولؐ اللہ سے یہ بات پہلے دریافت فرما لیا کرتے تھے کہ:

"یا رسولؐ اللہ! آپ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ کس حیثیت سے کیا ہے؟ اور اس کی نوعیت کیا ہے؟"

مثلاً جنگِ بدر کے موقع پر پڑاؤ کے لئے جگہ کا انتخاب رسولؐ اللہ نے از خود کیا تھا لیکن بعد میں حباب بن منذر کے استفسار و مشورہ پر دوسری جگہ کو منتخب فرمایا۔[۸۷]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سربراہِ ریاست کی حیثیت سے اپنے فیصلے کبھی آمرانہ انداز سے مسلط نہیں کئے بلکہ امورِ ریاست کی انجام دہی میں ہمیشہ مشاورت کے بعد اقدام فرمایا۔

وشاورھم فی الامر۔[۸۸]

(معاملات میں ان سے مشورہ کیجئے)

تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ سننا لازم ہے نہ ماننا)

تفصیلاتِ بالا سے رسول اللہؐ کا سیاسی و قانونی مقام متعین ہو جاتا ہے۔ ریاست میں آپ کی حیثیت ایک خودمختار اور مطلق العنان حکمران کی نہ تھی بلکہ آپ اللہ کی حاکمیت کے تابع اور اس کے حکم کے پیرو تھے اور جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ رسول اللہؐ کو بلاشبہ ایک خاص دائرہ کے اندر تصرف کا حق حاصل تھا مگر یہ اختیار بھی آپ کا ذاتی نہیں بلکہ اللہ کا تفویض کردہ تھا اور یہ بالعموم آپ اس وقت استعمال فرماتے تھے جبکہ قرآن خاموش ہو۔[۷۸] ایسی صورت میں آپ اجتہاد فرما کر پیش آمدہ مسئلہ حل فرما دیتے تھے۔ اجتہادِ نبوی اگرچہ قرآن سے موخر اور اس کے تابع ہے لیکن بعد میں آنے والوں کے لئے پابندی یہ ہے کہ وہ قانونِ سنّت سے بھی انحراف نہیں کر سکتے۔ کیونکہ رسولؐ کی اطاعت اللہؐ کی اطاعت کے ہم معنی ہے[۷۹] قرآن میں جگہ جگہ اللہ کے ساتھ ساتھ رسولؐ کی اطاعت و اتباع کا حکم اور ان کی معصیت و نافرمانی سے مجتنب رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔[۸۰] قرآن کی رُو سے پُوری اُمتِ مُسلمہ کے لئے اطاعتِ رسول واجب ہے اور اس کے لئے یہ اصول متعین کر دیا گیا ہے کہ اولی الذکر کی اطاعت مشروط بہ اطاعتِ الٰہی ہو گی اور اولی الامر سے اختلاف کی صورت میں ہمیشہ اللہ اور اس کے رسول سے ہی فیصلہ طلب کیا جائے گا۔[۸۱] نیز آپ کے اوامر و نواہی کی پوری پوری پیروی کی جائے گی۔[۸۲]

اب جہاں تک سربراہِ حکومت کی حیثیت سے رسول اللہؐ کی عملی و انتظامی ذمہ داریوں کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں مختصراً ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ آپ ریاست کی سب سے زیادہ ذمہ دار شخصیت، اس کے قائد و منتظم اور حکمران اعلیٰ تھے۔ تمام داخلی و خارجی معاملات کے نگران اور دینی و مذہبی پیشوا ہونے کے ساتھ ساتھ دنیوی امور کے بھی سربراہ تھے۔ شارح قانون اور شارع، سپہ سالار افواج اور قاضی القضاۃ وغیرہ سبھی کچھ تھے اور اس طرح آں حضرت بیک وقت انتظامیہ مقننہ اور عدلیہ تمام شعبوں کے صدر نشین تھے۔ عہدِ رسالت میں ان اعضائے ریاست میں اس قسم کی تحدید و تخصیص نہ تھی جو بعد کو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں پیدا ہوئی اور انہوں نے انتظامیہ مقننہ اور عدلیہ کو الگ الگ کر دیا۔ ریاست نبوی میں یہ تمام ذمہ داریاں ذاتِ رسالت میں مجتمع تھیں۔ ایک تو اس وقت ریاست کا آغاز تھا اور دوسرے اس زمانہ میں سیاسی ضرورتوں کا تقاضا بھی اتنا ہی تھا۔ بعد میں جب اسلامی ریاست میں پھیلاؤ واقع ہوا اور ریاست کی ضرورتیں بھی بہت زیادہ بڑھ گئیں تو مذکورہ شعبوں کو الگ الگ کر دیا گیا۔ تمام اعضائے ریاست یا مذکورہ شعبوں کے ایک ہی شخصیت میں مجتمع ہونے کا سب سے بڑا نقصان دہ پہلو یہ ہوتا ہے کہ ایک شعبہ دُوسرے شعبہ کے زیرِ اثر آ جاتا ہے اور آزادانہ عمل کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں جبکہ عہد نبوی میں تمام ذمہ داریاں ذاتِ واحد میں مجتمع ہو جانے سے یہ خطرہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ایک طرف تو آپ براہِ راست اللہ کی نگرانی میں تھے اور وہاں کوئی فروگزاشت نظر انداز نہ کی جاتی تھی۔[۸۳] علاوہ بریں رسول اللہؐ طبعاً ایسے نہ تھے کہ کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھائیں یا اپنے مقصد کا بے جا استعمال کریں۔ چنانچہ آپ کے اُسوہ حسنہ میں کوئی ایک مثال بھی خلافِ عدل نہیں مل سکتی۔ آپ کو تو ہر حال میں عدل برتنے کا الہامی حکم ملا تھا۔[۸۴]

اس لئے آپ اس سے پہلوتہی نہیں کر سکتے تھے بلکہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ آپ نے کبھی اپنے خلاف کسی تنقید کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔ بحیثیت رسول آپؐ کو چند مراعات ضرور حاصل تھیں (مثلاً یہ کہ چار سے زیادہ نکاح کی رعایت، حضورؐ کے بعد ازواجِ مطہرات سے کسی اور کے نکاح کی ممانعت اور میراث کے متعلق کہ آپ کی میراث تقسیم نہ ہو سکتی تھی وغیرہ وغیرہ) لیکن دُوسرے تمام معاملات میں عام مسلمانوں سے زیادہ ادنیٰ استحقاق بھی آپ کو حاصل نہ تھا۔

درحقیقت کسی جمہوری نظام حکومت کی معراج یہ ہے کہ حکمران اپنے ذاتی حقوق و معاملات میں عوام کے مساوی ہو اور کسی قسم کا امتیاز یا استثناء اسے حاصل نہ ہو اور عام شہری زندگی میں بھی کوئی امتیاز اس وجہ سے نہ رکھتا ہو کہ وہ حکمران ہے۔ اس کے اختیارات محدود ہوں اور ریاست کے باشندے اس پر تنقید و احتساب کے لئے آزاد ہوں۔ یہ تمام اصول فی الحقیقت ایک صحت مند سیاسی نظام میں نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن انہیں پوری رُوح اور فعالیت کے ساتھ عہدِ رسالت میں ہی اپنا یا گیا بلکہ معراجِ کمال تک پہنچا یا گیا۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ چونکہ ریاست نبوی کی تاسیس ایک معاہدہ عمرانی پر ہوئی تھی جس کی رُو سے راعی اور رعایا کے تعلقات کی نوعیت جبر و استبداد یا آمریت کے نظام سے مختلف تھی۔ نیز معروف کے مطابق جس طرح باشندوں پر رسولؐ اللہ کی اطاعت و خیر خواہی اور تعاون لازمی تھا اسی طرح رسولؐ اللہ کے لئے بھی ضروری تھا کہ ان کی فلاح و بہبود میں سرگرمِ عمل رہیں اور اگر ان کو شکایات پیدا ہوں یا آپ پر کوئی اعتراض کریں تو اس صورت میں آپ انہیں مطمئن کریں۔ واقعاتِ سیرت میں اس کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں مثلاً صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابہ کی بے چینی خصوصاً حضرت عمر کا رسولؐ اللہ سے بڑے تلخ لہجے میں سوال اور رسولؐ اللہ کا جواب دے کر انہیں مطمئن کرنا۔[۸۵] یا مثلاً جب حنین کی تقسیم کے سلسلے میں انصار کو کچھ شکایات پیدا ہوئیں تو رسولؐ اللہ نے اس مسئلہ کو پوری سنجیدگی کے ساتھ حل کیا اور ایک خطبہ میں وضاحتیں فرما کر انصار کو مطمئن کر دیا۔[۸۶] مختصر یہ کہ عہد نبوی میں لوگوں کو اظہارِ رائے اور اختلاف رائے کی آزادی حاصل تھی البتہ وہ اعتراض و تنقید کرنے میں بے لگام نہ تھے۔ نیز رسولؐ اللہ سے یہ بات پہلے دریافت فرما لیا کرتے تھے کہ:

"یا رسولؐ اللہ! آپ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ کس حیثیت سے کیا ہے؟ اور اس کی نوعیت کیا ہے؟"

مثلاً جنگِ بدر کے موقع پر پڑاؤ کے لئے جگہ کا انتخاب رسولؐ اللہ نے از خود کیا تھا لیکن بعد میں حباب بن منذر کے استفسار و مشورہ پر دوسری جگہ کو منتخب فرمایا۔[۸۷]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سربراہِ ریاست کی حیثیت سے اپنے فیصلے کبھی آمرانہ انداز سے مسلط نہیں کئے بلکہ امورِ ریاست کی انجام وہی میں ہمیشہ مشاورت کے بعد اقدام فرمایا۔

وشاورھم فی الامر۔[۸۸]

(معاملات میں ان سے مشورہ کیجئے)

اور وامرھم شوریٰ بینھم (۸۹)

(اور ان کے معاملات باہم مشورہ سے طے پاتے ہیں)

کے قرآنی ارشادات کے بموجب تمام معاملات میں مشورہ عہد نبوی کا طرۂ امتیاز تھا۔ تاریخی اعتبار سے مشورہ اور ندوہ کے ادارے عہدِ جاہلیت میں بھی پائے جاتے تھے اور اسلام نے بھی ان اداروں یعنی مشورت و مشاورت کو جاری رکھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اجتماعی معاملات میں انسانوں کا ذہنی میلان ہمیشہ سے مشورہ کی جانب رہا ہے اور شاید اسی لئے امورِ ریاست میں مشاورت کی مثالیں (خواہ مشورہ کی نوعیت کچھ ہو، مشاورت کا دائرہ کتنا ہی تنگ ہو اور اصحاب کی تعداد کچھ ہی رہی ہو) ہم کو قدیم ترین شہنشاہیت، مطلق العنانیت اور دوسرے نظام ہائے استبداد میں بھی ملتی ہیں۔ قرآن کے بیان کے مطابق (یمن کی) ملکۂ سبا نے حضرت سلیمان (حکومت ۹۶۵ تا ۹۲۶ ق م) کا خط موصول ہوتے ہی اپنے درباریوں سے مشورہ کیا تھا (۹۰) یا مثلاً روم و ایران میں شاہی کونسلیں موجود تھیں جو بادشاہ کو حسب خاطر مشورہ دیتی تھیں البتہ مذکورہ مجلسوں کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مجالس اپنی حقیقت اور روح کے اعتبار سے محض رسمی تھیں اور اقتدار شاہی کے دائرہ میں ان کا رسوخ نہ ہونے کے برابر تھا۔ عرب جاہلیت میں البتہ مشورہ اور ندوہ کے ادارات زیادہ عملی حیثیت رکھتے تھے اور اجتماعی ضرورت کے وقت ان سے کام لیا جاتا تھا۔

اسلام میں مشاورت نہ تو رسمی حیثیت رکھتی ہے اور نہ محض وقتی و اجتماعی ضروریات کی تکمیل اس کا منشا ہے بلکہ اس سے بہت آگے بڑھ کر اسلام میں مشاورت ایک لازمۂ ایمان ہے، ایک طرزِ زندگی ہے، ایک مستقل روایت ہے۔ اللہ کا مقرر کیا ہوا ایک ضابطہ ہے اور حکومت و خلافت کا ایک اہم اصول ہے۔

یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ شوریٰ سے متعدد سیاسی فوائد حاصل ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ سربراہِ حکومت کو اپنی من مانی کارروائی کرنے کے مواقع نہیں ملتے۔ مشورہ ذاتی اغراض کے لئے دوسروں کا حق مارنے کی کوششوں کو بھی ناکام بناتا ہے اور اس جذبہ کی بھی بیخ کنی کر دیتا ہے کہ اربابِ حل و عقد اپنے آپ کو اعلیٰ اور دوسروں کو حقیر سمجھیں۔ مشورہ کے بعد اقدام کی صورت میں ذمہ داری ایک فرد کی بجائے تمام شرکائے مشورہ کی ہو جاتی ہے اور اس میں ان لوگوں کی رائے بھی شامل ہو جاتی ہے جن کا مفاد زیرِ غور معاملات سے وابستہ ہوتا ہے۔ مگر ان تمام باتوں سے زیادہ اہم نکتہ یہ ہے کہ شوریٰ کی کارکردگی صرف اسی صورت میں بہتر ہو سکتی ہے جبکہ شرکاء کو اظہارِ رائے کی پوری آزادی حاصل ہو اور وہ یہ بھی حق رکھتے ہوں کہ معاملات کی سربراہی میں خامی یا کوتاہی پر ٹوک سکیں۔ نیز یہ کہ اصحابِ شوریٰ اپنے علم، ایمان اور ضمیر کے مطابق رائے پیش کریں۔

جہاں تک رسول اللہ کا تعلق ہے آپ نے ایک مثالی شوریٰ کے تمام تقاضوں کو پورا فرمایا۔ آپ مشورہ کرتے وقت شرکاء کو اظہارِ رائے کی پوری آزادی دیتے اور تنقید و تبصرہ کی بھی اجازت عطا فرماتے تھے۔ رسول اللہ شوریٰ کو اس حد تک اہمیت دیتے تھے کہ اس کے فیصلے کے نفاذ میں اپنی ذاتی خواہش تک کو نظر انداز فرما دیتے تھے اور ہر اہم معاملہ میں صحابہ سے مشورہ کرنے میں اتنے مستعد تھے کہ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے زیادہ رائے اور مشورہ کرنے والا انسان نہیں دیکھا[۹۱]۔ حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ :

ما رأیت احداً اکثر مشورۃ لاصحابہ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم[۹۲]

(میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو اپنے رفقائے مشورہ کرنے میں اتنا زیادہ سرگرم ہو جس قدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے)

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ کی مدنی زندگی میں شوریٰ کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں اور عہدِ نبوی میں اکثر معاملات کو شوریٰ کے ذریعہ طے کرنے کی روایات تاریخ کے صفحات میں جا بجا محفوظ ہیں ۔ مثلاً :

(۱) اذان کے سلسلے میں شوریٰ کا اجتماع (سلہ میں) ہوا[۹۳]۔

(۲) غزوۂ بدر کے موقع پر (سلہ ھ) معرکۂ بدر سے متعلق شوریٰ کا انعقاد[۹۴]۔

(۳) شوریٰ برائے اسیران بدر (سلہ ھ)[۹۵]۔

(۴) غزوۂ اُحد سے پہلے (سلہ ھ) محاذ جنگ کے تعین کے لئے اجتماع شوریٰ[۹۶]۔

(۵) غزوۂ خندق پر (سلہ ھ) جنگ کی تیاریوں کے سلسلے میں مشورہ[۹۷]۔

(۶) واقعۂ افک کے سلسلے (سلہ ھ) میں حضرت عائشہ پر تہمت والزام کے بعد شوریٰ[۹۸]۔

(۷) صلح حدیبیہ سے پہلے دوران سفر مشاورت (سلہ ھ)[۹۹]۔

(۸) شوریٰ برائے اسیران ہوازن (سلہ ھ)[۱۰۰]۔

(۹) رسول اللہ نے (سلہ میں) حضرت معاذ بن جبل کو والی یمن مقرر کرنے کے لئے شوریٰ طلب فرمایا[۱۰۱]۔

شوریٰ کے سلسلے میں رسول اللہ کا تعامل یہ تھا کہ جب ایک مرتبہ مشاورت کے نتیجہ میں کوئی فیصلہ ہو جاتا تھا تو پھر آپ اس کی پابندی کرتے تھے ۔ چنانچہ محاذ اُحد کے سلسلہ میں جب شہر سے باہر لڑنے کا فیصلہ ہو گیا تو اپنی ذاتی رائے کے برخلاف تیار ہو گئے ۔ رسول اللہ کا یہ طرز عمل حاکم حقیقی کے اس ارشاد کے مطابق تھا کہ :

وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ[۱۰۲]

(معاملات میں اپنے اصحاب سے مشورہ کیجئے اور جب آپ مسئلہ متعلقہ میں عزم کر لیں تو پھر اعتماد اللہ پر ہی رکھئے)

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح مشورہ ضروری ہے اسی طرح اس کے فیصلہ کی پابندی بھی ۔ مندرجہ بالا آیت میں عزم سے پہلے شوریٰ کے حکم کا آنا واضح کرتا ہے کہ شوریٰ کے نتیجہ میں فیصلہ عزم کی بنیاد قرار پائے گا ۔ ابن کثیر کی بیان کردہ روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا گیا کہ عزم سے کیا مراد ہے ؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ :

مشاورۃ اھل الرای ثم اتباعھم[۱۰۳]

(پہلے اہل رائے کا باہمی مشورہ اور اس کے بعد شوریٰ کے فیصلہ کی پیروی)

اور امام ابوبکر الجصاص آیت مذکورہ کی تفسیر کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

وفی ذکر العزیمة عقیب المشاورة دلالة علی انها صدرت عن المشورة[۱۰۴]

(عزم کو شوریٰ کے بعد ذکر کیا گیا ہے یہ اس امر کی دلیل ہے کہ فیصلہ اور عزم وہی معتبر ہو سکتا ہے جو شوریٰ کا نتیجہ ہو اور شوریٰ سے صادر ہوا ہو)

آخر میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ شوریٰ بہرحال ان حدود کے اندر ہی ہوگا جن کا تعین شریعت نے پہلے سے کر دیا ہے۔ نیز شوریٰ کے اجلاس کے لئے اگرچہ جگہ کی کوئی قید نہ تھی تاہم مدینہ میں مسجد نبوی ہی دراصل دار المشوریٰ کی حیثیت رکھتی تھی۔

یہ بات علیٰ حقیقت ہے کہ تنہا حکمران، ریاست کے تمام کام انجام نہیں دے سکتا لہٰذا مختلف امور کی انجام دہی میں لوگوں کی مدد و اعانت کا محتاج ہوتا ہے اور پھر ریاست کی کارکردگی اس کی نشوونما اور فلاح وخسران کا مدار ان ہی کارکنانِ ریاست پر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک سربراہِ ریاست کی انتہائی اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ریاست کے انتظامی مناصب پر ایسے لوگوں کا انتخاب کرے جو ریاست کے مقصد وجود کو سمجھتے ہوں اور اپنی صلاحیتوں کو ٹھیک ٹھیک استعمال کر کے اپنے عہدوں سے انصاف کر سکتے ہوں۔

رسول اللہؐ نے بحیثیت حکمران اس مسئلہ پر اپنی پوری توجہ صرف کی اور حکومت کے عہدوں اور مناصب پر ایسے خدا ترس، باصلاحیت، بے لوث، پاکیزہ کردار اور مخلص افراد کا تقرر کیا جو اسلام کی رُوح سے واقف، دین کے مزاج شناس، راہِ حق میں شدائد برداشت کرنے والے، تجربہ کار اور پختہ طور پر تربیت یافتہ تھے۔ ان کارکنانِ ریاست کو آپ نے یہ بات ذہن نشین کرا دی کہ حکومت کے عہدے اور مناصب حصولِ عزت وجاہ اور کسبِ دنیا کے ذرائع نہیں ہیں۔ اس لئے ان کے حصول کی جدوجہد ہی غیر مستحسن ہے۔ یہی نہیں اس سے آگے بڑھ کر رسول اللہؐ نے ان مناصب کا رشتہ اخلاق سے جوڑا اور یہ فرما دیا کہ:

انا واللہ لا نولی علی عملنا هذا احداً سئاله او حرص علیه۔[۱۰۵]

(خدا کی قسم ہم کسی ایسے شخص کو اپنی حکومت کے کسی منصب پر مقرر نہیں کرتے جس نے اس کی درخواست کی ہو یا جو اس کا حریص ہو)

اور آپ کا ارشاد یہ بھی ہے کہ:

ان اخونکم عندنا من طلبه۔[۱۰۶]

(ہمارے نزدیک سب سے بڑا خائن وہ شخص ہے جو اس کا خود طالب ہو)

ایک صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ کو رسول اللہؐ نے ہدایت فرماتے ہوئے کہا:

"اے عبدالرحمٰن! امارت کے طالب نہ بنو، اگر یہ بن مانگے تمہیں ملی تو اس کام میں اللہ کی طرف سے تمہاری مدد کی جائے گی، اور اگر اس کو خود مانگ کر حاصل کرو گے تو تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیا جائے گا۔"[۱۰۷]

ایک مرتبہ حضرت ابوذر نے آنحضرتؐ سے حکومت کے کسی عہدے پر مقرر کرنے کی درخواست کی تو اس کے جواب میں

فرمانِ نبوی یہ تھا کہ :

"ابوذر! یہ ایک بھاری امانت ہے اور تم ایک کمزور آدمی ہو۔ قیامت کے دن یہ امانت ندامت اور رسوائی کا سبب ہوگی مگر اس شخص کے لئے نہیں جو اس کے حق کے ساتھ اس کو اٹھائے اور اس سلسلے میں اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوں ان کو ادا کرے۔" [۱۰۸]

ان ہدایات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ نے ایک طرف تو عہدوں کے لالچ اور حرص و طمع کی تحریک کا خاتمہ کیا اور دوسری طرف لوگوں کی نفسیاتی اصلاح کر کے ان کے نفوس کا تزکیہ کیا۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ مناصب کی آزمائشوں میں پڑنے کے لئے از خود پیش ہونے والا یا تو ان مناصب کے تقاضوں سے ناواقف ہے اور یا ان سے غیر معمولی منفعت کا حصول اس کے پیشِ نظر ہے علاوہ ازیں حکومت کے عہدوں اور مناصب کو رسول اللہ نے آدمی کے حقوق کی فہرست میں شمار کرنے کے بجائے امانت کی حیثیت دی اور اپنے دَور میں صرف ان ہی لوگوں کا تقرر فرمایا جو اس بارِ امانت کو اٹھا سکتے تھے۔ قرآن سے اس کی تائید اللہ کے اس حکم میں ملتی ہے کہ :

ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الیٰ اھلھا۔ [۱۰۹]

(اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو)

امام ابنِ تیمیہ نے اس آیت کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"ادائے امانات کی دو قسمیں ہیں، امانت فی الاموال۔ آیت بالا امانت فی الولایات سے متعلق ہے اور یہی اس کی شانِ نزول ہے۔" [۱۱۰]

پھر آگے لکھتے ہیں کہ :

چنانچہ رسول اللہ نے فرمایا کہ جو شخص مسلمانوں کے کسی کام کا والی ہو اور اس نے یہ جانتے ہوئے کہ ایسا شخص بھی میسر آسکتا ہے جو مسلمانوں کے حق میں اس سے بہتر ہو سکے گا کسی دوسرے شخص کو حکومت دے دی تو اس نے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور مومنوں سے خیانت کی۔ [۱۱۱]

اور اسی مفہوم کی ادائیگی اس آیت سے بھی ہوتی ہے کہ :

یاایھا الذین اٰمنوا لا تخونوا اللہ والرسول وتخونوا اماناتکم وانتم تعلمون۔ [۱۱۲]

(اے اہلِ ایمان! نہ تو اللہ اور رسول کی امانت میں خیانت کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو اور تم ان باتوں کو جانتے ہو)

بہرحال کارکنانِ ریاست کے انتخاب، اربابِ حل و عقد کے تقرر اور اولی الامر کے تعین میں رسول اللہ کا معمول یہ تھا کہ آپ ان کلیدی مناصب پر صرف اس شخص کو مقرر فرماتے تھے جو واقعی اس کا مستحق ہو۔ صاحبِ ایمان ہو اور ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم [۱۱۳] (اللہ کے نزدیک تم میں معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے) کی روشنی میں تقویٰ کا

حامل ہو، دین و شریعت کا عالم، صاحبِ بصیرت، بے نفس و بے غرض، امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر عامل، ریاست اور عوام دونوں کا خیر خواہ ہو[۱۱۴] اور معاملات کو عدل و انصاف سے انجام دینے کا اہل ہو۔ مختصر یہ کہ حکومت و سیاست کے خالص مادی و دنیوی مناصب پر انتخاب کے یہ اصول جہاں رسول اللہ کی سیاسی بصیرت، نکتہ رسی، معاملہ فہمی اور افراد کے ذہنی و نفسیاتی مطالعہ پر دلالت کرتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی کرتے ہیں کہ دین و سیاست میں باہم کوئی تناقض نہیں ہے بلکہ ان کا امتزاج اچھے سیاستدان اور اچھے منتظم پیدا کر سکتا ہے۔

یہاں یہ وضاحت کر دینا مناسب ہے کہ نظم و نسقِ ریاست کے سلسلے میں مختلف انتظامی مناصب پر محتاط افراد کے تقرر اور امورِ ریاست کی احساسِ ذمہ داری کے ساتھ کڑی نگرانی کا نتیجہ یہ تھا کہ ریاست نبوی کو ایک مضبوط انتظامی ڈھانچہ مل گیا اور پھر اس کا مزید خوشگوار نتیجہ یہ تھا کہ معاملاتِ ریاست جس طرح رسول اللہ کی دار الحکومت میں موجودگی میں چلتے تھے اسی طرح آپ کی مدینہ سے غیر حاضری کی صورت میں بھی معمولاً جاری رہتے تھے۔ رسول اللہ کا طریقہ یہ تھا کہ جب آپ مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تو اپنا ایک نائب اور قائم مقام بھی متعین فرما دیتے تھے تاکہ نظم و نسق کے امور میں کسی قسم کی بدنظمی، خلل یا تاخیر پیدا نہ ہو اور آپ کی عدم موجودگی میں معاملاتِ ریاست جاری و ساری رہیں۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ رسول اللہ کی نیابت اور قائم مقامی کا شرف مختلف اوقات میں مختلف حضرات کو ملتا رہا۔[۱۱۵] رسول اللہ کے ان نائبین کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں سے بیشتر حضرات معمر، تجربہ کار، تربیت یافتہ اور مہاجرین میں سے تھے نیز یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مدینہ سے باہر تشریف لے جانے کی صورت میں کسی نائب یا قائم مقام کا تقرر رسول اللہ کا مستقل انتظام تھا خواہ وہ موقع جنگ کا ہو یا صلح کا، حج کا ہو یا عمرہ کا۔[۱۱۶]

کسی بھی ریاست کا نظم و نسق چلانے کے لئے افرادِ کار کے علاوہ اس کے سیکریٹریٹ یا ایک مرکزی دفتری نظام کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا خواہ اس کی ہیئت اور شکل کچھ ہی ہو لیکن یہ بات مسلّمہ ہے کہ سیکریٹریٹ ریاست کا مرکزِ تعقل اور اس کے سربراہ کا حافظہ ہے اور جس طرح حافظہ کے بغیر انسانی زندگی منضبط نہیں رہ سکتی اسی طرح نظام دفاتر کے بغیر ریاستی زندگی کا انضباط بھی ممکن نہیں ہے۔ رسول اللہ نے شاید اس کا اندازہ عہدِ رسالت کے آغاز پر ہی کر لیا تھا لہٰذا ایک طرف وحی کا نزول ہوا تو دوسری طرف آپ نے اس کی املاء و کتابت کا آغاز بھی کر دیا اور ایسے معتمد علیہ، امانت دار اور ہنرمند افراد کو اس پر مامور کیا جنہوں نے اس فریضہ کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ اصطلاحی طور پر ایسے افراد کو کاتبانِ وحی کہا جاتا ہے۔ کتابتِ وحی پر جن لوگوں کو مامور کیا گیا ان کی تعداد مختلف اوقات میں کم و بیش ہوتی رہی لیکن مجموعی طور پر ان کی تعداد تقریباً چالیس ہے۔[۱۱۷] کتابتِ وحی کے نتیجہ میں قرآن کی حفاظت و تدوین عمل میں آتی چلی گئی اور وہ قانون بھی محفوظ ہوتا چلا گیا جو سیاستِ دین و دنیا کا اولین ماخذ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سیکریٹریٹ کی وہ شکل تو نہیں تھی جو بعد کے ادوار میں متشکل ہوئی البتہ اتنا ضرور تھا کہ علیحدہ علیحدہ امور کے لئے الگ الگ افراد ذمہ دار بنائے جاتے تھے، وہ متعلقہ شعبہ کا ریکارڈ رکھتے، سربراہ

حکومت کے احکام کو ضبطِ تحریر میں لاتے اور ان کو متعلقہ افراد تک پہنچاتے بھی تھے۔ اس قسم کا تمام دفتری نظام اور تحریرات کا کام ارباب انشا کی ایک باصلاحیت اور ذمہ دار جماعت کے سپرد تھا۔ اس جماعت میں شامل جملہ افراد کے نام اور ان کی ذمہ داریوں کی تفصیل اگرچہ ہمارے تاریخی مآخذ میں بہت کم ملتی ہے لیکن جو کچھ معلومات پائی جاتی ہیں ان کی روشنی میں مندرجہ ذیل صیغہ جات کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔

۱۔ صیغۂ خاص

رسول اللہؐ ایک ایسی ریاست کے سربراہ تھے جس کے حدود انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ بڑھتے چلے گئے اور جیسا کہ ہم توسیع ریاست کے باب میں لکھ چکے ہیں کہ انتہائی کم عرصہ میں عرب ریاست نبوی کے پرچم تلے آگیا۔ اور پھر اس ریاست کے امور و وظائف نے بھی اسی تیز رفتاری کے ساتھ ترقی پائی۔ علاوہ ازیں چونکہ رسول اللہؐ کی مصروفیات اپنی مختلف حیثیتوں میں روز بروز دو چند ہوتی چلی گئیں اس لئے رسول اللہؐ کے ذاتی و نجی معاملات اور شخصی امور کار کے تحت مختلف صحابہ میں تقسیم ہو جانا فطری امر تھا لہٰذا اس ذمہ داری کے پیشِ نظر اگر اس صیغہ کو پرسنل ڈیپارٹمنٹ سے تعبیر کریں تو بے جا نہ ہوگا۔

تاریخ و سیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان امور کی انجام دہی کے سلسلے میں متعدد افسران آپ کے عملۂ خاص میں شامل تھے اور مندرجہ ذیل ذمہ داریاں ان کے سپرد کی گئی تھیں۔

(۱) آپ کی ذاتی اشیاء کی حفاظت و نگرانی [۱۱۸]

(۲) آپ کے اسفار کا انتظام [۱۱۹]

(۳) آپ کے لئے سواری کا بندوبست [۱۲۰]

(۴) رازداری اور خفیہ خبریں پہنچانے کا انتظام [۱۲۱]

(۵) ذاتی معتمد یا پرسنل سکریٹری [۱۲۲]

(جن کا کام یہ تھا کہ وہ ہمیشہ رسول اللہؐ کے ساتھ رہیں اور اگر آپ کسی کام کو کرنا بھول جائیں تو آپ کو یاد دلادیں [۱۲۳] اگر کوئی کاتب یا سکریٹری کسی وجہ سے غیر حاضر ہوتا تو اس کے فرائض کی بجا آوری بھی انہیں کے ذمہ ہوتی تھی۔ [۱۲۴])

(۶) سرکاری مہر کی حفاظت و نگرانی [۱۲۵]

(۷) حجابت یعنی رسول اللہؐ کے اجلاس میں لوگوں کو پیش کرنا۔ [۱۲۶]

(۸) آنحضرتؐ کی ذاتی و نجی مراسلت [۱۲۷]

(۹) رسول اللہؐ کے اخراجات کی دیکھ بھال [۱۲۸]

(۱۰) کاشانۂ رسالت یا ازواج مطہرات کی حفاظت و نگرانی [۱۲۹]

(۱۱) مجرموں کی گردن مارنے کے لئے جلاد [۱۳۰]

(۱۲) ذاتِ رسالت مآب کی محافظت اور پہرہ داری[۱۳۱]
(۱۳) کسی خبر یا حکم کا اعلان یا منادی۔[۱۳۲]

۲۔ صیغہ توقیعات و فرامین

اس صیغہ کے تحت رسولؐ اللہ کے رُوبرو پیش آمدہ مقدمات و معاملات کے احکام و فیصلے لکھے جاتے، ہر قسم کی دستاویزیں، وثیق اور شرائط و معاملات کی کتابت ہوتی تھی۔ قبیلوں کا ریکارڈ، ان کے چشموں کی تفصیل، مردم شماری[۱۳۳]، عمّال و محصلین کے لئے تحریری فرامین کا اجرا[۱۳۴] اور مسلمان قبائل کو سرکاری ہدایات بھیجنا بھی اسی شعبہ کا کام تھا۔[۱۳۵] رسولؐ اللہ اور عام لوگوں کے ادھار قرض، لین دین کے معاملات[۱۳۶] اور آنحضرتؐ و اہلِ عرب کے مابین خط و کتابت[۱۳۷]، فرمائشی تحریرات[۱۳۸]، رسولؐ اللہ کی حاجات و ضروریات کی کتابت[۱۳۹] نیز اموال صدقات اور کھجور کے درختوں سے آمدنی کا تخمینہ ضبطِ تحریر میں لانا[۱۴۰] اسی شعبۂ توقیعات کے ذمہ تھا۔

۳۔ صیغۂ احتساب

اس کے تحت لوگوں کے عام اخلاق کی نگرانی و اصلاح، عمّال کی تربیت اور ان کا محاسبہ، نیز تجارتی بدعنوانیوں کا انسداد شامل ہے۔ اس صیغہ کی براہِ راست نگرانی خود رسولؐ اللہ فرمایا کرتے تھے۔

عوام الناس کے اخلاق کی نگرانی کا یہ کام سرکاری پیمانے پر غالباً اس ارشادِ الٰہی کے بموجب تھا کہ:

الذین ان مکنّاھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر[۱۴۱]

(اگر ہم ان لوگوں کو اقتدار دیں گے تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور لوگوں کو اچھائیوں کا حکم دیں گے اور برائیوں سے روکیں گے)۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام طور پر لوگوں کے اخلاق اور فرائض مذہبی کے متعلق وقتاً فوقتاً داروگیر فرماتے رہتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان کو اس بات پر توجہ دلاتے تھے کہ وہ احکامِ خداوندی کی پوری طرح پابندی کریں۔ چنانچہ اسلام کی بنیادی اور اصولی چیزوں کی تعلیم و تربیت کے لئے حضورؐ نے تمام قبائل سے کہا کہ ان میں سے ہر ایک قبیلہ کے کچھ لوگوں کو منتخب کر کے مدینہ بھیجے۔ رسولؐ اللہ کا یہ طرزِ عمل بھی سورہ توبہ کی اس آیت کی تفسیر تھا جس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

فلولا نفر من کل فرقۃٍ منھم طآئفۃ لیتفقّھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلّھم یحذرون۔[۱۴۲]

(تو یُوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تاکہ دین (کا علم سیکھتے اور اس) میں سمجھ پیدا کرتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈر سناتے تاکہ وہ حذر کرتے)۔

جہاں تک عمال کی تربیت اور ان کے محاسبہ کا تعلق ہے تو اس کے دو پہلو کئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جن لوگوں کو کوئی اہم ذمہ داری سونپی جاتی مثلاً صدقہ یا زکوٰۃ وغیرہ کی وصولیابی کے لئے بھیجا جاتا ان سے رسولؐ اللہ اس بات کی پوچھ گچھ کرتے تھے کہ کہیں وصولی میں انہوں نے بے جا ظلم یا زیادتی یا ناجائز طریقہ تو اختیار نہیں کیا۔ چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے ابن اللتیبہ کو بنوسلیم کے صدقات پر عامل بنا کر روانہ کیا جب وہ وصول کر کے واپس آئے تو انہوں نے دو قسم کا مال رسولؐ اللہ کے سامنے یہ کہہ کر رکھ دیا کہ یہ مال مسلمانوں کا ہے اور یہ مال مجھ کو تحفۃً ملا ہے۔ آپ نے یہ ملاحظہ فرمایا تو کہا کہ "گھر بیٹھے تم کو یہ ہدیہ کیوں نہ ملا؟" اس کے بعد آپ نے ایک خطبہ میں اس قسم کے لین دین کی سختی سے ممانعت فرما دی۔[۱۴۳]

رسولؐ اللہ ایک عظیم مصلح اور بیدار مغز حکمران تھے آپ کو جہاں یہ خیال تھا کہ عہدیدار اپنے فرائض و واجبات کی بجا آوری صحیح طور پر کریں اس سے زیادہ اہتمام اس بات کا تھا کہ عمال و حکام زیورِ اخلاق سے آراستہ ہوں تاکہ جہاں بھی ان کا تقرر کیا جائے وہ کامیاب ثابت ہوں اور کم از کم وہاں کے باشندے ان کے اخلاق کے شاکی نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ رسولؐ اللہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری اور معاذ ابن جبل کو یمن کی جانب روانہ کیا تو فرمایا تھا کہ:

يسرا ولا تعسرا و بشرا ولا تنفرا[۱۴۴]

(تم دونوں سختی نہ کرنا بلکہ آسانی سے کام لینا اور لوگوں کو اچھی باتیں سنانا، نفرت نہ دلانا)

رسولؐ اللہ کے اس ارشاد سے اس طرزِ حکومت کی نشان دہی بھی ہو جاتی ہے جو اس وقت اسلامی ریاست میں جاری و ساری تھا۔ عہدیداروں کی اہلیت و قابلیت کے ضمن میں یہ بتانا تحصیل حاصل معلوم ہوتا ہے کہ عہدیدار چاہے گورنر ہو یا قاضی، معلّم ہو یا مبلغ، امام ہو یا مفتی اس کے لئے بنیادی شرط یہ تھی کہ اسلام کے نظریۂ حیات پر یقین اور اس کی تعلیمات سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ احادیث و سیر کی یہ روایت بہت مشہور ہے کہ جب رسولؐ اللہ نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کے لئے مامور فرمایا تو روانگی سے پہلے ان کے تبحر علمی اور واقفیت شرع کا امتحان لیا یہاں تک کہ آپ مطمئن ہو گئے۔[۱۴۵] اعلیٰ عہدیداروں مثلاً گورنر یا والی کو نہ صرف زبانی بلکہ بعض اوقات تحریری ہدایات اور فرامین رسولؐ اللہ کی طرف سے عطا کئے جاتے تھے۔[۱۴۶] افسرانِ محاصل کو ہر قسم کے محاصل کی تفصیل اور اس کے عوض نصاب کی تعلیم دی جاتی، قضاۃ کو فرائضِ عدل و قضا سے مطلع کیا جاتا اور انہیں دیوانی و فوجداری مقدمات میں طرزِ عمل کی ہدایت رسولؐ اللہ بنفس نفیس عطا فرماتے تھے۔[۱۴۷]

اب رہا معاملہ تجارتی بدعنوانیوں کے انسداد کا تو اس سلسلے میں بھی نگرانی و اہتمام سے رسولؐ اللہ غافل نہ تھے۔ بدعنوان تاجروں کو دین و دنیا کی وعید سنانے کے علاوہ آپ نے اچھے اور ایماندار تاجروں کو اُخروی اجر کی بشارت بھی سنائی۔[۱۴۸] نیز چیزوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں آپ نے بات بات پر حلف اٹھانے، جھوٹی قسمیں کھانے، ناپ تول میں کمی کرنے اور اسی قسم کی دوسری نازیبا حرکات کی سخت ممانعت کر دی[۱۴۹] اور پھر اس ترہیب و ترغیب کے ساتھ ساتھ عملی اقدامات بھی فرمائے۔ مثلاً رسولؐ اللہ بعض اوقات بازاروں اور منڈیوں کا دورہ کرتے اور موقع پر ہی تحقیق و تفتیش فرما کر ضروری تنبیہ یا کارروائی عمل میں لے آتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ بازار تشریف لے گئے تو غلہ کے ایک ڈھیر میں ہاتھ ڈال کر

دیکھا۔ غلّہ اندر سے گیلا تھا۔ آپ نے دکاندار سے دریافت فرمایا: یہ کیا؟ اس نے جواب دیا: بارش سے بھیگ گیا ہے۔ آپ نے فرمایا: تو پھر اس کو اوپر کیوں نہیں رکھا تا کہ ہر شخص کو نظر آئے۔ پھر فرمایا کہ جو لوگ دھوکہ فریب کریں وہ ہم میں سے نہیں ہیں[۱۵۰]۔ وزن اور ناپ تول کو ٹھیک رکھنا قرآن کی بنیادی تعلیمات میں شامل ہے[۱۵۱] جبکہ رسول اللہؐ نے بھی اشیاء کو محض اندازہ کے بجائے تول سے دینے اور وزن کرنے کی ہدایت کی ہے۔[۱۵۲] معلوم ہوتا ہے کہ منڈیوں اور بازاروں کی مجموعی نگہداشت اور تجار کے بے جا تصرف سے لوگوں کو محفوظ رکھنے کے لئے رسول اللہؐ نے بازاروں کے لئے باقاعدہ محتسب (مارکیٹ انسپکٹرز) کا تقرر بھی کیا تھا۔[۱۵۳] بلکہ تاریخ تو یہ بھی بتاتی ہے کہ بعض اوقات عورتیں بھی بازاروں میں کوڑا لے کر گھومتی تھیں اور لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم دیتی اور بُری باتوں سے روکتی تھیں۔[۱۵۴]

ان اقدامات سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ رسول اللہؐ عوام کی معاشی فلاح و بہبود اور ان کے لئے اشیائے صرف کی مناسب شرح اور مناسب نرخوں پر فراہمی کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔ نیز اس سے ریاست نبویؐ کے فلاحی پہلو پر بھی بخوشی روشنی پڑجاتی ہے۔

۴۔ صیغہ جات امورِ داخلہ

استقبال و مہمانداری، عیادت مرضیٰ، جاسوسی اور شرطہ وغیرہ کا انتظام اس شعبہ کے تحت آتا ہے۔

جو لوگ رسول اللہؐ کی خدمت میں اپنی نجی یا سرکاری حیثیت سے حاضر ہوتے تھے ان کے حسبِ حیثیت استقبال اور قیام و طعام کے لئے ایک منتظم کا باقاعدہ تقرر کیا گیا تھا۔[۱۵۵] استقبال و مہمانداری کے سلسلے میں رسول اللہؐ کی ذاتی دلچسپی اور مستعدی کا عالم یہ تھا کہ آپ افراد یا وفود کی آمد پر بنفسِ نفیس پیش قدمی فرماتے ان کی خاطر مدارات میں حصہ لیتے اور استقبال پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ کرتے تھے۔[۱۵۶] کبھی مہمانوں کو مسجد نبوی میں خیمے نصب کرا کر ٹھہرایا جاتا،[۱۵۷] اور کبھی میزبانی کے لئے مختلف صحابہ کو متعین کر دیا جاتا اور پھر وہ مہمانوں کو اپنے گھروں میں ٹھہرا لیتے[۱۵۸] استقبال و مہمانداری کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ رسول اللہؐ دُور دراز سے آنے والے مہمانوں کی نہ صرف یہ کہ تواضع کرتے بلکہ ان کی واپسی کے وقت زادِ سفر اخراجات اور وظائف کا بھی انتظام کر دیتے تھے۔[۱۵۹] نیز ان باتوں کا خود بھی اہتمام کرتے اور دوسروں سے بھی کرواتے تھے بلکہ حضرت ابنِ عباس کی روایت کے مطابق اپنی وفات کے وقت رسول اللہؐ نے جو آخری تین وصیتیں فرمائی تھیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ:

وجیزا الوفود بنحو ماکنت اجیزھم۔[۱۶۰]

(جس طرح میں وفود کو عطیہ دیا کرتا تھا تم بھی اسی طرح دیا کرنا)

مہمانوں اور وفود سے رسول اللہؐ کا یہ سلوک جہاں آپ کی انسانی ہمدردی اور احترامِ آدمیت پر دلالت کرتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ دُور دراز سے آنے والوں کے اذہان و قلوب کو مسخر کرنے میں آپ کے اس حسنِ سلوک نے

بہت اہم اور موثر کردار ادا کیا تھا۔ اوّل تو ایک ایسے علاقے کے لوگوں کی مالی اعانت ہی متاثر کرنے کے لئے کافی تھی جہاں وسائلِ معاش کی سخت قلت تھی اور سفر انتہائی دشوار تھا اور دُوسرے یہ کہ مہمان نوازی اور تواضع کا یہ انداز نفسیاتی سے زیادہ سیاسی حکمت عملی کا آئینہ دار تھا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ادارات کی تنظیم و ترتیب میں حالات کی پوری رعایت رکھی اور ان سے بھرپور فائدہ بھی اٹھایا۔[۱۶۱]

اہل حاجت اور ضرورت مندوں کے لئے ادھار قرض کا بندوبست بھی آپ کے اسی صیغہ کے ماتحت ہوتا تھا اگر کوئی شخص آپ کو ذاتی طور پر کوئی ہدیہ پیش کرتا تو وہ بھی اسی شعبہ کے زیر انتظام صرف کیا جاتا تھا۔[۱۶۲]

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے نزدیک استقبال و مہمانداری کی خاص اہمیت تھی، غالباً اسی لئے جب اہلِ تبالہ و جرش نے بغیر جنگ اسلام قبول کیا تو رسول اللہؐ نے انہیں اسی حالت پر جس پر کہ وہ مسلمان ہوئے تھے برقرار رکھا اور ان میں سے جو اہلِ کتاب تھے ان کے ہر بالغ پر ایک دینار جزیہ عائد کیا اور یہ معنی خیز شرط بھی لگائی کہ وہ مسلمانوں کی ضیافت بھی کریں گے۔[۱۶۳] پھر جب ۹ھ میں ایلہ کے سردار سے مصالحت فرمائی تو ان پر جزیہ کے علاوہ یہ شرط بھی عائد کی کہ ان کی آبادیوں میں سے جو مسلمان گزرے گا وہ اس کی مہمانداری کرے گا۔[۱۶۴]

جہاں تک مریضوں کی عیادت اور مسلمانوں کے انتقال کی صورت میں ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت کا تعلق ہے تو اس پہلو سے بھی رسول اللہؐ نے پُوری سرگرمی کا مظاہرہ کیا، نیز ایک مسلمان کے دُوسرے مسلمان پر حقوق کی فہرست میں عیادت کو بھی شامل فرمایا اور بیمار پرسی کو واجب قرار دیا۔[۱۶۵] عیادت کرنے میں آپ نے رنگ و نسل اور مذہب و ملت کے تمام امتیازات کو پسِ پشت ڈال دیا حتیٰ کہ مشرکین تک کی عیادت کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا اور حجۃ الوداع تک کے انتہائی معروف موقع پر بھی مریضوں کی عیادت کرنے میں تساہل نہیں برتا۔[۱۶۶] جب بھی کسی مریض کے پاس تشریف لے جاتے تو اسے ہمت و حوصلہ کی تلقین کرتے اس کی ہمت کے لئے دعا فرماتے اور لا بأس طہور ان شاء اللہ (گھبراؤ نہیں انشاءاللہ جلد ہی اچھے ہو جاؤ گے) کہہ کر اس کی دلجوئی کا سامان بہم پہنچاتے تھے[۱۶۷] نیز عیادت کے معاملہ میں اپنے پرائے کی تمیز یا مذہب و ملت کا فرق آپ کے نزدیک بے معنی تھا۔[۱۶۸] کسی مسلمان کا انتقال ہو جانے کی صورت میں تجہیز و تکفین میں شرکت، جنازہ کے ساتھ مشایعت اور پھر میت کے پسماندگان کو صبر کی تلقین کرنا بھی رسول اللہؐ کے روزمرہ کے معمولات میں داخل تھا۔[۱۶۹]

ریاست کے مندرجہ بالا وظائف سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ جس طرح رسول اللہؐ کی ریاست عالمگیر تھی اسی طرح آپ کی قائم کردہ ریاست کا مطمحِ نظر بھی یہ تھا کہ پُوری انسانیت کو فائدہ پہنچایا جائے جیسا کہ ایک خاندان یا برادری کے افراد کے ساتھ ہوتا ہے۔[۱۷۰]

ملک میں امن و امان قائم رکھنے، نظم و ضبط برقرار رکھنے اور اسے سیاسی و معاشرتی انتشار سے بچانے کے لئے شرطہ یا پولیس وغیرہ کا انتظام ہر ریاست کی ایک بنیادی ضرورت ہے یہ ضرورت اگرچہ ریاست نبوی کو بھی لاحق تھی لیکن اتنی شدید نہ تھی جتنی عام طور پر دنیوی ریاستوں میں ہوتی ہے۔ کیونکہ اوّل تو اسلام اپنے لغوی مفہوم اور صوری

معنوی شکل میں امن و سلامتی ہے اور اپنی تمام تعلیمات میں اس کا داعی بھی ہے۔ دُوسرے رسول اللہ کا سیاسی کارنامہ ہی یہ تھا کہ آپ نے عرب کے جنگجو قبائل اور متحارب گروہوں میں ہر قسم کے تصادم اور انتقام کی روایات کو ختم کر کے امن و سلامتی کی نئی فضا قائم کی تھی۔ مزید برآں قیامِ مدینہ کے بالکل آغاز ہی میں رسول اللہ نے منشورِ مدینہ کے ذریعہ مدینہ کو حرم قرار دے دیا تھا اور جس کے بارے میں تفصیلات زیرِ نظر مقالہ کے باب "تاسیس" میں آچکی ہیں۔ حرم کا مطلب صاف ہے یعنی متعینہ علاقے میں لڑائی جھگڑا، دنگا فساد، خون خرابہ، قتل و غارت گری اور بدامنی پھیلانا حرام ٹھہرا اور اس طرح مدنی معاشرہ کو امن و سلامتی کی دولتِ بے بہا مل گئی۔ ان ابتدائی انتظامات کے نتیجے میں یہ بات لازمی تھی کہ امن و امان کو کم سے کم خطرہ درپیش ہو۔ لیکن بہر حال امن و امان کی صورتِ حال کو خراب کرنے والوں کی تادیب کے لئے بھی رسول اللہ نے باقاعدہ انتظام کر رکھا تھا۔ اس غرض سے نہ صرف یہ کہ پولیس کا محکمہ اپنی ابتدائی شکل میں موجود تھا[۱۷۱] اور وہ سرگرمِ عمل رہتا تھا۔ بلکہ خود رسول اللہ ذاتی طور پر بھی اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ کسی قسم کے خطرہ کی بُو سُونگھ کر تحقیقِ حال کے لئے راتوں میں خود بھی گشت پر نکل جاتے[۱۷۲]۔ علاوہ ازیں رات کی پہرہ داری اور چوکیداری کے لئے مدینہ میں ایک "صاحب العسس" بھی مقرر فرمایا تھا جس کا کام یہ تھا کہ راتوں کو گشت کرے، آواز لگائے اور مشکوک افراد کا پیچھا کرے[۱۷۳]۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام نے کسی بھی شخص کے ذاتی معاملات میں تجسس کو منع کیا ہے[۱۷۴]۔ لیکن سیاسی مصالح اور معاشرتی ضرورتوں کے تحت بقدرِ ضرورت تحقیق و تفتیش اور تلاش و تجسس کی اجازت ہے اور جس کی تائید سیرت کے متعدد واقعات سے ہوتی ہے۔ رسول اللہ نے بہر حال وقت اور حالات کے تحت مخبری اور جاسوسی کے ضروری انتظامات کئے اور ایک "متجسس" کا تقرر فرمایا[۱۷۵]۔ اس عہدے دار کا کام یہ تھا کہ مخالفین ریاست کی دشمنانہ سرگرمیوں کی اطلاع بہم پہنچائے[۱۷۶] اور دار الحرب میں رہنے والے مسلمانوں کے متعلقین کی خیریت سے مطلع کرے[۱۷۷]۔ جاسوسی و مخبری کے سلسلے میں مزید تفصیلات ہم آئندہ رسول اللہ کے عسکری انتظامات کے تحت بیان کریں گے۔

اندرونِ ریاست جُرم کا ارتکاب کرنے والوں سے نمٹنے کے لئے رسول اللہ انہیں تنبیہ بھی کرتے، ضروری سزا دیتے[۱۷۸] اور اگر مناسب سمجھتے تو انھیں محبوس فرما دیتے۔ اس غرض سے کبھی تو مسجد نبوی ہی دار الحبس یا قید خانہ کا کام دیتی[۱۷۹] اور کبھی کسی کا گھر استعمال کیا جاتا تھا[۱۸۰] بلکہ تاریخ سے تو یہ بھی پتا چلتا ہے کہ عہدِ رسالت میں مردوں اور عورتوں کو علیحدہ علیحدہ قید خانوں میں رکھا جاتا تھا[۱۸۱]۔ جنگی قیدیوں کے معاملہ میں بھی یہی صورت تھی[۱۸۲]۔ قیدیوں پر نگرانی کے لئے بھی افسروں کو مقرر کیا جاتا تھا[۱۸۳] جن کو آج کل کی اصطلاح میں جیلر کہا جا سکتا ہے۔ مجرموں پر حدود اللہ قائم کرنے کے لئے افسران علیحدہ تھے[۱۸۴]۔ مختصر یہ کہ حدودِ ریاست میں امن و امان کی فضا قائم کرنے کے لئے رسول اللہ نے بھرپور کوششیں کیں، اور اس میں آپ اتنے کامیاب ثابت ہُوئے کہ آپ کے عہدِ حکومت میں امن و امان کا مسئلہ قابلِ ذکر طور پر کبھی پیدا نہیں ہوا۔

۵۔ صیغۂ تعلقاتِ خارجہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوششیں صرف داخلی امن و امان کے قیام، عدل کے فروغ اور فتنہ و فساد کے دفعیہ تک محدود نہ تھیں اور نہ آپ کا منشأ محض قومی مفاد کا تحفظ تھا بلکہ آپ کی حکومت کا قیام تمام انسانوں کی فلاح و نجات کے لیے عمل میں آیا تھا۔ آپ کی بعثت سارے عالم کے لئے تھی اور آپ تمام دنیا کو امن و سلامتی سے ہمکنار کرنے آئے تھے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے رسول اللہؐ نے اندرونِ عرب اور بیرونِ عرب کی چھوٹی بڑی طاقتوں، معاصر بادشاہوں اور امراء و رؤسا سے مناسب موقع ملتے ہی ربط پیدا کیا، انہیں دینِ حق کی دعوت دی، ضرورت کے تحت ان سے معاہدے کئے اور خط و کتابت کے ذریعہ انہیں باضابطہ امن و سلامتی کا پیغام پہنچایا۔ چنانچہ ہجرت کے کچھ ہی عرصہ بعد بنو ضمرہ اور جہینہ سے معاہدے، نجاشی سے خطوط کا تبادلہ، ہرقل اور کسریٰ کے نام خطوط کی ترسیل وغیرہ کا مدعا یہی تھا (جیساکہ ہم اسی مقالہ کے بابِ توسیع میں واضح کرچکے ہیں)

ریاست نبویؐ کی ان سرگرمیوں کا اجرا "صیغۂ تعلقاتِ خارجہ" سے ہوتا ہے اور اس کے تحت بیرونی ملکوں سے خط و کتابت، سفارتی تبادلہ اور معاہدات کا انعقاد جیسے اہم امور انجام دئے جاتے تھے۔ اس شعبہ میں ایسے لوگ خاص طور پر مقرر کئے گئے تھے جو غیر ملکی زبانوں کے ماہر اور ان کے بہترین ترجمان تھے۔ ان کا کام غیر ملکی دستاویزات و خطوط کا مطالعہ و ترجمہ، گفتگو کی صورت میں ترجمانی اور امراء و رؤسا کے نامہ و پیام کا جواب دینا تھا۔ اس سلسلے میں دو اشخاص قابلِ ذکر ہیں۔

ایک حضرت عبداللہ بن ارقم[۱۸۵] جو ملوک و امراء کو خطوط لکھنے پر مامور تھے اور رسول اللہؐ کو ان پر اس درجہ اعتماد تھا کہ آپ ان کو صرف مضمون بتادیتے تھے اور پھر ابن ارقم خط لکھ کر بغیر سنائے ہوئے اس پر حضورؐ کی مہر ثبت کردیتے تھے۔[۱۸۶] دوسرے حضرت زید بن ثابت تھے جو وحیِ الٰہی کی کتابت کے علاوہ اوّل الذکر کی طرح ملوک و رؤسا کو خطوط بھی لکھتے تھے۔[۱۸۸] جب یہ دونوں حضرات موجود نہ ہوتے تھے تو رسول اللہؐ یہ خدمت کسی اور تربیت یافتہ شخص کے سپرد کردیتے تھے۔[۱۸۹] جہاں تک غیر ملکی زبانوں کو جاننے اور سیکھنے کا تعلق ہے تو مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے اس کی ترغیب دی بلکہ بعض اوقات حکم بھی دیا جس کے نتیجہ میں مختلف صحابہ نے پوری تندہی سے آپ کے ارشاد کو عملی جامہ پہنایا۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت نے بعض غیر ملکی زبانوں کو صرف سترہ دنوں میں سیکھ لیا تھا[۱۹۰] اور کتابِ یہود کی تعلیم پندرہ دنوں سے کم مدت میں مکمل کرلی تھی[۱۹۱] ان کے علاوہ بھی دوسرے متعدد صحابہ نے ملکی و سفارتی ضرورتوں کے تحت مختلف زبانوں کو بڑی مستعدی کے ساتھ سیکھا تھا۔[۱۹۲]

چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہؐ نے بیرونِ عرب ملوک و سلاطین کو دعوتِ اسلام دینے کے لئے جو سفارتیں روانہ فرمائی تھیں روایات کے مطابق ان کے تمام سفراءؓ ان زبانوں میں گفتگو کرسکتے تھے جن علاقوں میں انہیں بھیجا گیا تھا۔[۱۹۳] مزید برآں چونکہ سفارت صیغۂ تعلقاتِ خارجہ کا اہم ترین عنصر ہے اس لئے منصبِ سفارت پر رسول اللہؐ نے صرف ان ہی لوگوں کا تقرر فرمایا جو اس کا حق ادا کرسکتے تھے اور جیساکہ بعد میں پیدا ہونے والے تاریخی نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام سفارتیں انتہائی کامیاب

ثابت ہوئیں اور ان کی وجہ سے جہاں وقت کے جبر و ظلم کے مقابلہ میں امنِ عالم کو فروغ ہوا اسی کے ساتھ ساتھ داخلی امن کو بھی بہت تقویت پہنچی اور جس کے نتیجہ میں جلد ہی عرب کے گوشہ گوشہ سے سفارتیں دار الحکومت مدینہ آنے لگیں۔[۱۹۴] ایک خاص بات یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے مختلف دیار و امصار میں جتنے سفراء بھی روانہ فرمائے وہ آدابِ سفارت سے کما حقہٗ واقف اور صورتِ حال کے مطابق کارروائی کرنے میں ماہر تھے۔ روابط کے استحکام اور تعلقاتِ خارجہ کی بہتری کے سلسلے میں ہدایا اور تحائف کا بھیجنا بھی عالمگیر روایات میں شامل ہے۔ رسول اللہؐ نے تحفے اور ہدایا کا تبادلہ نہ صرف یہ کہ دوست ممالک یا ہم خیال حکمرانوں سے ہی کیا[۱۹۵] بلکہ دشمن ممالک اور مخالفوں کو بھی ارسال ہدایا میں تکلف نہیں برتا۔ مثلاً عمرو بن امیہ ضمری کو ابوسفیان بن حرب کے پاس مکہ میں ہدایا دے کر بھیجا۔[۱۹۶] علاوہ بریں سفراء کا تقرر رسول اللہؐ نے جنگ، صلح اور پُرامن حالات ہر زمانے میں کیا۔[۱۹۷]

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ باہر سے وفود آتے تھے تو رسول اللہؐ ان کا شایان استقبال کرتے۔ ان سے اہم مسائل پر بات چیت کرتے اور ضرورت پڑنے پر ترجمان اور خطیب کی مدد بھی حاصل کیا کرتے تھے۔[۱۹۸]

جہاں تک معاہدات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں بھی رسول اللہؐ نے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور معاہدہ کے ذریعہ سیاسی کامیابیاں حاصل کرتے چلے گئے۔ اس ضمن میں معاہدہ جہینہ، معاہدہ حدیبیہ، معاہدہ ثقیف، معاہدہ دومۃ الجندل، معاہدہ مقنا اور معاہدہ نجران وغیرہ کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔[۱۹۹] یہاں یہ بتا دینا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ معاہدات کی تحریر و تسوید کے لئے بھی متعدد اشخاص اس شعبہ سے وابستہ تھے۔ چنانچہ کم و بیش تمام معاہدات کے اخیر میں کاتبِ معاہدہ کا نام دیکھا جا سکتا ہے۔[۲۰۰] اخیر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مجموعی طور پر اس شعبہ کی کارکردگی بہت اچھی رہی اور اس کی بناء پر ریاست نبوی کی توسیع و ترقی کے مراحل انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ طے ہوتے چلے گئے۔

۶۔ صیغہ ہائے مالیات

قرآنی احکام کی روشنی میں رسول اللہؐ کے پیشِ نظر ایک ایسے معاشرے کا قیام تھا جہاں اچھائیاں فروغ پائیں اور برائیوں کا استیصال ہو۔[۲۰۱] جہاں لوگوں کے حقوق محفوظ ہوں اور جہاں معاشی ظلم و نا انصافی کا خاتمہ کر کے اخلاقی فضائل کا نشو و نما ہو سکے۔ قرآن جس طرح اپنے نظامِ سیاست کی بنیاد حاکمیتِ باری تعالیٰ پر رکھتا ہے اسی طرح نظامِ معیشت کو بھی الہامی ضابطوں اور خدا پرستانہ تصورِ اخلاق پر استوار کرتا ہے۔[۲۰۲] اسلامی تعلیمات اور رسول اللہؐ کی تمام تر کوششیں اس بات پر مرکوز تھیں کہ معاشی انصاف کو بغیر کسی جبر کے قائم کیا جائے۔ اس غرض کے لئے زیادہ زور اس بات پر تھا کہ افراد معاشرہ کی ذہنی و اخلاقی تربیت ہو اور قانون و ریاست کی مداخلت کم سے کم ہو۔[۲۰۳] نیز آپ کی مساعی کا رُخ یہ تھا کہ لوگوں کے اندر ایمان بیدار کرنے اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ ان کو بہتر انسان بنانے کی تدابیر کی جائیں تاکہ افراد ایک دوسرے کے ساتھ رضاکارانہ تعاون اور بے غرضانہ فیاضی، ہمدردی اور احسان کا سلوک کرنے کے عادی ہوں۔ پھر جو کسر رہ جائے

اس کو پورا کرنے کے لئے ریاست و قانون کی طاقت کو استعمال میں لا کر اجتماعی فلاح کا سامان بہم پہنچایا جائے۔

مقاصد بالا کو حاصل کرنے کے لئے رسول اللہؐ نے ایک طرف تو تمام ضروری تدابیر اختیار کیں اور اصولی احکام جاری فرمائے مثلاً شخصی گروہی یا قومی اجارہ داریوں کی حوصلہ شکنی[۲۰۴]، اکتسابِ رزق کے لئے سب کو یکساں اور زیادہ سے زیادہ مواقع کی فراہمی۔ افراد کو شخصی ملکیت کا حق، مگر لامحدود نہیں بلکہ فرد کے حقِ ملکیت پر دوسرے افراد اور معاشرہ کے مفاد کی خاطر ضروری پابندیوں کے ساتھ دیا گیا۔[۲۰۵] نیز عورت اور مرد دونوں کو کمائی ہوئی دولت اور میراث یا دوسرے جائز ذرائع سے حاصل شدہ آمدنی کا یکساں مالک اور دونوں کو اپنے حقِ ملکیت سے متمتع ہونے کا حق دیا گیا۔[۲۰۶] پھر معاشرہ میں معاشی توازن برقرار رکھنے کے لئے ایک جانب لوگوں کو بخل اور رہبانیت سے تو دوسری جانب اسراف اور فضول خرچی سے روکا گیا۔[۲۰۷] ایک اہم اصول یہ مقرر کیا گیا کہ دولت زیادہ سے زیادہ گردش میں رہے اور اس کے ذریعہ ان لوگوں کو بطور خاص حصہ دیا جائے جو کسی وجہ سے معاشی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں اور معاشی امداد و اعانت کے محتاج ہیں۔[۲۰۸]

رسول اللہؐ کے جاری کردہ ان اصولوں کے تھوڑی ہی مدت میں بہت خوشگوار نتائج برآمد ہوئے۔ جیسا کہ ہم تاسیسِ ریاست کے باب میں لکھ چکے ہیں کہ ہجرتِ مدینہ کے فوراً بعد رسول اللہؐ نے مہاجرین و انصار کے درمیان عقدِ مواخاۃ قائم فرمایا اور اس کے جہاں دوسرے نتائج نکلے اس کے ساتھ ساتھ معاشی اعتبار سے بھی مسلمانوں کی حالت بہت جلد سنبھل گئی۔ پھر رفتہ رفتہ ریاست کے فروغ و استحکام، جنگوں کے سلسلہ اور فتوحات وغیرہ کے نتیجہ میں معاشی ترقی بھی ظاہر ہوتی چلی گئی۔

انتظامِ ریاست کے سیاق و سباق میں یہ بات واضح ہے کہ محاصل کے بغیر کوئی حکومت اور اس کا نظم و نسق نہیں چلایا جا سکتا کیونکہ جس طرح ہر شخص کو اپنی زندگی گزارنے کے لئے دولت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح حکومت کو بھی اپنے فرائض کی انجام وہی کے لئے رقم کی ضرورت ہے۔ رسول اللہؐ کی قائم کردہ ریاست کے لئے بھی محاصل ناگزیر تھے۔ ان محاصل کے مداخل و مخارج پر گفتگو سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ریاست کی آمدنی و اخراجات وغیرہ کی تنظیم و ترتیب کے لئے بھی ایک باقاعدہ صیغہ محاصل قائم تھا۔ اس شعبہ کے تحت ریاست کی آمد و خرچ کا حساب رکھا جاتا اور پھر اس کی محاسبی و تنقیح بھی ہوتی تھی۔ یہ شعبہ بجائے خود مختلف شاخوں میں تقسیم تھا اور ہر شاخ کے ذمہ دار اور ہر محاصل کے افسران الگ الگ تھے۔ کسی کا کام یہ تھا کہ وہ درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کا جائزہ لے اور ان کے حساب سے ان پر جس قدر زکوٰۃ واجب ہو اسے باقاعدہ تحریر کرے تاکہ اس کی وصولی کا انتظام کیا جا سکے۔[۲۰۹] کسی کے ذمہ مغانم ریاست کا حساب رکھنا تھا۔[۲۱۰] اس میں اموالِ غنیمت کی تقسیم کا کام بھی شامل ہے۔ صدقات و زکوٰۃ کی املاک کا ریکارڈ علیحدہ رکھا جاتا تھا۔[۲۱۱]

مختصر یہ کہ چونکہ صیغۂ مالیات انتظامِ ریاست کے باب میں انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے رسول اللہؐ نے اس شعبہ کی بہتر کارکردگی کی طرف پوری توجہ دی اور ایسے لوگوں کو ذمہ داریاں سپرد کیں جو اس کے سب سے زیادہ اہل تھے اور اخلاق و کردار، علمِ دین و دنیا، حساب کتاب اور انشاء و کتابت میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ معلوم ایسا

ہوتا ہے کہ مالیاتِ ریاست کی تنظیم کے لئے ایک طرف تو یہ شعبہ مستقل بنیادوں پر قائم تھا اور اس کے افسران اپنے متعینہ فرائض انجام دیتے تھے اور دوسری طرف رسول اللہ وقت اور موقع کی مناسبت سے ایسے افسران کا تقرر بھی کر دیتے تھے جو عارضی طور پر مالیاتی شعبہ کی مختلف ذمہ داریاں سنبھال لیتے تھے۔ مثلاً میدانِ جنگ میں مالِ غنیمت کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لئے افسر[۲۱۲] خمس رسول کے نگران[۲۱۳]، صاحب الجزیہ[۲۱۴]، صاحب الاعشار[۲۱۵]، متولیٔ خراج[۲۱۶] خارص[۲۱۷] وغیرہ کا تقرر قابلِ ذکر ہے۔

یہاں یہ واضح کر دینا بھی نہایت ضروری ہے کہ محاصل کے باب میں رسول اللہ نے کوئی نیا اضافہ نہیں کیا بلکہ دنیا کے مختلف حصوں میں جو محاصل پہلے سے معروف و متداول تھے آپ نے ان میں سے ہی چند کو حسبِ ضرورت اختیار فرمایا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان ادارات کو من و عن اخذ کر لیا گیا تھا کیونکہ یہ بات معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ شکل و صورت کی مشابہت اصل نہیں ہے بلکہ ان کے مقاصد اور رُوح کا ائتلاف و اختلاف حقیقی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام سے قبل دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کی رعایا اپنے حکمرانوں کی حرص و ہوس کا شکار تھی۔ عرب، روم، ایران اور دوسرے علاقوں میں رعایا محصولوں کے سنگین شکنجوں میں جکڑی ہوئی تھی[۲۱۸] اور مذکورہ تمام سلطنتوں میں محاصل کا مقصد محض حکمرانوں کا عیش و تنعم تھا۔ عوام سے جو رقم مختلف مدّات میں وصول کی جاتی تھی اس کا کوئی فائدہ خود عوام کو نہیں پہنچتا تھا۔ اس کے برخلاف ریاست نبوی کی بنیادی پالیسی یہ تھی کہ لوگوں پر محصول کم سے کم عاید کئے جائیں لیکن فائدہ زیادہ سے زیادہ بہم پہنچایا جائے۔

ریاستِ نبوی ایک فلاحی اور خادمِ خلق ریاست تھی جو عوام کی معاشی کفالت و معاونت، قیام انصاف، ادائیگی حقوق اور غربت و افلاس کو مٹانے کے لئے وجود میں آئی تھی۔ تمام افرادِ ریاست کی بنیادی ضروریات کا بندوبست اور مجبور و اپاہج لاچار و بے سہارا افراد کی مدد اس کا اہم فریضہ تھا اور محاصل کی تحصیل و تصریف کے یہی مرکزی عوامل تھے۔ اس اعتبار سے گویا سرمایہ دارانہ نظام کے برعکس معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں کے لئے سہارا بھی تھا اور سعی و جہد کے مواقع میں باشندوں کے درمیان کوئی رکاوٹ بھی نہ تھی۔ مزید برآں ریاست نبوی کی یہ پالیسی اشتراکیت سے بھی اس معنی میں مختلف تھی کہ یہ کفالت کی ضمانت آزادی اور انفرادیت کو بھینٹ چڑھا کر نہیں دیتی اور کلی قومی ملکیت بھی اس کے مزاج میں داخل نہیں تھی۔ یہ اس قسم کی جدید فلاحی ریاست سے بھی مختلف تھی جس میں سماجی خدمات اور بنیادی کفالت محض سیاسی ضرورتوں کے تحت کی جاتی ہے۔ بہرحال ان توضیحات کی روشنی میں اب ہم یہ مطالعہ کریں گے کہ ریاست نبوی میں بیت المال کے مالی وسائل یا محاصل کیا تھے۔

(الف) غنیمت

تاریخی اعتبار سے چونکہ ریاست نبوی کو سب سے پہلی آمدنی مالِ غنیمت سے حاصل ہوئی اس لئے ہمارے

خیال میں اس کا مطالعہ اوّلیت رکھتا ہے۔ مالِ غنیمت دراصل ایک اتفاقی آمدنی ہے جو میدانِ جنگ میں بزور حاصل ہوتی ہے۔ عہد نبوی میں غنیمت کی سب سے پہلی آمدنی اگرچہ سریہ عبداللہ بن جحش میں ہوئی لیکن اسے رسول اللہ نے قبول کرنے سے انکار فرما دیا تھا[۲۱۹] اس لئے غنیمت کی باضابطہ آمدنی کو جنگِ بدر میں ہی شمار کرنا چاہئے البتہ اس کے بعد عہد نبوی کی دوسری جنگوں میں یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ غنیمت میں قیدی، عورتیں، اموال وغیرہ سب ہی شامل ہیں[۲۲۰]۔ عرب جاہلیت میں بھی مالِ غنیمت کا رواج تھا اور اس مال کو بالعموم شرکائے جنگ میں تقسیم کر دیا جاتا تھا البتہ مالِ غنیمت کا بڑا حصہ قبیلہ کے سردار کو ملتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کی غنیمت کو تمام مسلمانوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا تھا، لیکن جنگِ بدر کے بعد قرآن کے حکم کی تعمیل میں آپ اس کے پانچ حصّے کرتے تھے[۲۲۱]۔ اس میں سے ⅘ حصہ تو شرکائے جنگ میں تقسیم فرما دیتے تھے اور ⅕ حصہ بیت المال کے لئے محفوظ رکھا کرتے تھے[۲۲۲] جسے اصطلاحاً خمس کہتے ہیں۔ اس حکم کے تحت بنو قینقاع کی پہلی غنیمت تھی جس کو آپ نے پانچ حصّوں میں تقسیم فرمایا تھا[۲۲۳]۔ خمس کے مصارف کو قرآن نے متعین کر دیا ہے[۲۲۴] یعنی خمس اللہ کے لئے، رسول کے لئے، قرابت داروں کے لئے، مساکین اور مسافروں کے لئے مختص ہے۔ اس سے اس امر پر بھی بخوبی روشنی پڑ جاتی ہے کہ پہلے پہل جب بیت المال قائم ہوا تو ابتدائی آمدنی کے وقت سے ہی غریب و مسکین اور نادار لوگوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مزید برآں اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بیت المال کے خمس کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ملّت ہی کے مفادات و مصالح اور ضرورت مندوں کی امداد و اعانت پر صرف ہوتا تھا اور کل غنیمت کے ⅕ کا ⅕ یعنی غنیمت کا صرف ۲۵ واں حصہ رسول اللہ کے ذاتی صرف میں آتا تھا۔[۲۲۵]

امام ابو یوسف نے تصریح کی ہے کہ خمس کے پانچ حصّے کئے جاتے تھے ایک اللہ و رسول کے لئے دوسرا قرابت داروں کے لئے تیسرا یتیموں کے لئے چوتھا مسکینوں کے لئے اور پانچواں مسافروں کے لئے ہوتا تھا۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ رسول اللہ کے حق میں خمس کا جو پانچواں حصہ آتا تھا رسول اللہ اس کو بھی تین حصّوں میں بانٹ دیتے تھے یعنی:

(۱) اللہ کی راہ میں خرچ فرما دیتے۔

(۲) قوم میں حضور کا جو نائب ہوتا تھا اس کو بھی اس میں سے دیتے تھے پھر مال زیادہ ہو گیا تو

(۳) یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو بھی دینے لگے۔[۲۲۶]

ان تفصیلات کی روشنی میں رسول اللہ کا یہ ارشاد بالکل صحیح تھا کہ:

لیس لی من مغنکم الا الخمس والخمس مردود علیکم۔[۲۲۷]

(تمہارے مالِ غنیمت میں سے میرے لئے صرف پانچواں حصہ ہے اور یہ بھی تم ہی لوگوں کو واپس دے دیا جاتا ہے)

اس اعتبار سے یہ کہنا چاہئے کہ مالِ غنیمت میں سے رسول اللہ کا اصل حصہ صرف وہی ہوتا تھا جسے صفی کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ حق خاص جو رسول اللہ مالِ غنیمت میں سے منتخب فرما لیتے تھے مثلاً گھوڑا یا تلوار یا لونڈی۔ چنانچہ خیبر کے موقع پر

سیّدہ صفیہ بطور صفی خاص کی گئی تھیں۔[۲۲۸] رسولؐ اللہ کے علاوہ دیگر سپاہیوں کو مالِ غنیمت کا حصہ اس طرح ملتا تھا کہ ہر گھوڑے سوار کو تین حصّے اور پیادہ کو ایک حصہ اور ایک روایت کے اعتبار سے سوار کو دو حصّے اور پیادہ کو ایک حصّہ ملتا تھا۔[۲۲۹]

(ب) فَے

ریاست نبوی کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ فَے بھی تھا۔ محدود معنوں میں فَے سے مراد وہ مفتوحہ زمینیں تھیں جو بغیر جنگ اور فوج کشی کے براہِ راست ریاست کی ملکیت میں آتی تھیں۔[۲۳۰] مثلاً رسولؐ اللہ نے سکہ ھ میں بنو نضیر کو جلا وطن کیا تو ان لوگوں کے باغات اور کھیت رسولؐ اللہ کے قبضہ میں آ گئے۔[۲۳۱] اسی طرح بعد میں بنو قریظہ کا مال و اسباب اور علاقہ ہاتھ آیا[۲۳۲] نیز خیبر کے قریب کئی علاقے بغیر جنگ رسولؐ اللہ کو مل گئے۔[۲۳۳] چونکہ یہ مال غنیمت سے بالکل الگ نوعیت کا تھا اس لئے رسولؐ اللہ نے قرآن کی روشنی میں اس کو سرکاری ملکیت قرار دیا[۲۳۴] اس کو خاص اپنے انتظام میں رکھا اور بعد میں اپنے اختیار سے بنو نضیر کا کچھ علاقہ مہاجرین اور نادار انصار میں تقسیم کیا۔[۲۳۵] بنو نضیر کے اموال میں سے ہی رسولؐ اللہ اپنے گھر کا سالانہ خرچ نکالتے تھے اور جو کچھ باقی رہ جاتا تھا اس کو ہتھیاروں، گھوڑوں اور اللہ کی راہ میں جہاد پر صرف کرتے تھے۔[۲۳۶] اگرچہ مجملاً قرآن میں مالِ فَے کا مصرف اللہ، رسول، اہلِ قرابت، یتامٰی، مساکین، مسافروں اور مہاجرین کے لئے مخصوص کیا گیا ہے[۲۳۷] لیکن اس بارے میں اصولی طور پر فقہاؒ کے نزدیک اس میں خمس نہیں ہے لیکن امام شافعی اس سے اختلاف رکھتے ہوئے خمس کے قائل ہیں۔[۲۳۸]

(ج) خراج

وہ محصولِ اراضی ہے جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا تھا۔ یہ سب سے پہلے خیبر سے حاصل ہوا۔ فتح خیبر کے وقت چونکہ ایک طرف تو خود مسلمانوں کے پاس اتنے وسائل نہ تھے کہ وہ مفتوحہ زمینوں کی دیکھ بھال اور کاشت وغیرہ بآسانی کرا سکیں دُوسری طرف یہود نے یہ پیشکش کی تھی کہ وہ ریاست نبوی کے اسامی کی حیثیت سے اس زمین پر کاشت کریں گے اس لئے رسولؐ اللہ نے ان کی اس پیشکش کو قبول کرتے ہوئے پیداوار کا نصف بطور خراج مقرر فرما دیا۔[۲۳۹] خراج کی یہ رقم جزیہ کی طرح مجاہدین کی تنخواہوں اور دُوسری قومی ضروریات پر خرچ کی جاتی تھی۔ جو کچھ وصول ہو کر آتا آنحضرتؐ سب کو اسی وقت تقسیم فرما دیتے تھے۔ سب سے پہلے آپ ان کو عطا فرماتے جو پہلے غلام رہ چکے تھے۔[۲۴۰] خراج کا محصول بھی کوئی نیا محصول نہ تھا۔ اسلام سے قبل مصر، شام، عراق، ایران، روم وغیرہ کی تمام سلطنتوں میں خراج اور جزیہ کے محصولوں کا رواج موجود تھا۔[۲۴۱]

(د) جزیہ

بقول ماوردی جزیہ جزاء سے مشتق ہے اور یہ امن دینے کی جزا یا اس کا معاوضہ ہے۔[۲۴۲] جزیہ کی وصولی کا حکم خود قرآن میں موجود ہے[۲۴۳] بہرحال جزیہ وہ محصول تھا جو غیر مسلموں سے ان کی جان، مال، آبرو کی حفاظت اور عقیدے رائے ضمیر کی آزادی اور فوجی خدمت سے استثناء کے بدلے میں وصول کیا جاتا تھا۔ نیز جزیہ غیر مسلموں کے صرف آزاد مردوں پر واجب تھا، عورتوں اور بچوں پر نہیں[۲۴۴]۔ اسی طرح بوڑھے آدمی جو کام کرنے سے معذور ہوں اور مفلس اور فاتر العقل افراد پر سے جزیہ ساقط تھا[۲۴۵] غریب، اندھے، مفلوج اور راہب بھی اس سے مستثنیٰ تھے۔[۲۴۶] علاوہ ازیں غیر مسلموں کو جزیہ کی ادائیگی پر بعض دُوسرے محاصل سے استثناء بھی حاصل ہو جاتا تھا۔ مثلاً فوجی خدمت کی صورت میں[۲۴۷] یا اگر کوئی ذمی مسلمان ہو جاتا تب بھی یہ محصول ساقط ہو جاتا تھا۔[۲۴۸] جزیہ رقم اور اشیاء دونوں کی شکل میں قبول کیا جا سکتا تھا جیسا کہ رسول اللہؐ نے اہلِ یمن کے لئے اپنے مکتوب میں شرح جزیہ کی توضیح کرتے ہوئے لکھا تھا۔[۲۴۹]

یہاں یہ وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ اگرچہ جزیہ کا محصول کوئی نیا محصول نہ تھا اور اسلام سے قبل بھی رومی اور ایرانی سلطنتوں میں اس کا رواج تھا[۲۵۰] لیکن اس کی وصولی کے سلسلے میں جس ظلم و ناانصافی کا سلوک مذکورہ حکومتیں اپنی رعایا سے کرتی تھیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے اس کے برعکس رسول اللہؐ نے اہلِ ذمہ کے ساتھ جو محتاط رویہ اختیار کیا اور جس سلوک و رواداری کا مظاہرہ کیا وہ تاریخِ سیاست میں یقیناً نیا باب ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ریاست نبوی میں رعایا کے حقوق کی نگہداشت میں بلا تفریقِ مذہب و ملت کس حد تک مساوات برتی جاتی تھی۔

(ہ) زکوٰۃ

زکوٰۃ اسلام کا ایک بنیادی رُکن، اس کے فرائض میں سے ایک اہم فرض اور مالی عبادت ہے۔ اقتصادی پالیسی کے ذیل میں یہ گویا ایک قسم کا محصول تھا جو صرف مسلمانوں پر واجب الادا تھا اور صرف ان لوگوں سے وصول کیا جاتا تھا جو بالغ، خود کفیل اور صاحبِ نصاب ہوں۔ زکوٰۃ کی حقیقی غرض و غایت خود رسول اللہؐ کے الفاظ میں یہ تھی کہ :

توخذ من اغنیائھم فترد علی فقرائھم۔[۲۵۱]

(زکوٰۃ مالداروں سے لی جائے اور ان کے ناداروں میں تقسیم کی جائے)

فقہاء کے بیان کے مطابق زکوٰۃ ہر اس مال میں واجب ہوتی ہے جو خود بڑھتا ہو یا کام کر کے بڑھایا جا سکتا ہو تاکہ صاحبِ مال پاک ہو جائے اور حاجت مندوں کی حاجت روائی ہو۔[۲۵۲] زکوٰۃ کے بارے میں عام رائے یہی ہے کہ اس کی فرضیت سنہ ۹ھ میں ہوئی لیکن ایک مصنف نے نقل کیا ہے کہ زکوٰۃ سنہ ۲ھ میں فرض ہوئی[۲۵۳] بہرصورت زکوٰۃ بالعموم درج ذیل مدات سے وصول کی جاتی تھی یعنی :

۱ - نقدی (یعنی سونا اور چاندی)،
۲ - پھل اور زرعی پیداوار
۳ - مویشی اور
۴ - اسبابِ تجارت سے۔ (۲۵۴)

ان مدات میں سے سونا کم از کم ساڑھے سات تولہ اور چاندی ساڑھے باون تولے ہو تب زکوٰۃ کا اطلاق ہوگا۔ زرعی پیداوار پر زکوٰۃ جسے اصطلاحاً عشر بھی کہا جاتا ہے اور بعض اوقات ایک الگ آمدنی کی مد کہلائی جاتی ہے اس کی شرح خود رسول اللہؐ نے حضرت معاذ بن جبل کے لئے اپنے مکتوب میں متعین فرما دی تھی۔ اس کے مطابق بارانی زمینوں پر محصول عشر ۱/۱۰ تھا جبکہ چاہی زمینوں پر یہ شرح نصف عشر یعنی ۱/۲۰ تھی۔ (۲۵۵) جانوروں کا نصابِ زکوٰۃ مختلف تھا۔ جانوروں کو تین اقسام میں بانٹ دیا گیا۔ اس میں اونٹ کا شمار پہلی قسم میں، مویشی دُوسری قسم میں اور چھوٹے چوپائے تیسری قسم میں داخل کئے گئے۔ زکوٰۃ کے لئے کم از کم ۵ اونٹ ضروری تھے جبکہ مویشی کی تعداد کم سے کم تیس تھی اور بھیڑ بکریاں کم از کم چالیس ہونا ضروری تھیں۔ (۲۵۶) سامانِ تجارت پر زکوٰۃ کا وجوب ثابت ہے چاہے کسی قسم کا مال ہو شرط یہ ہے کہ اس سامان کی قیمت نصاب کے معیار پر پوری اُترے۔ (۲۵۷)

قرآن کریم میں زکوٰۃ کے مصارف کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ (۲۵۸) اس کی رُو سے زکوٰۃ کو فقراء اور مساکین، عاملین صدقات، مولفۃ القلوب، رقاب، قرض داروں، فی سبیل اللہ اور مسافروں پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ ان پر ایک نظر ڈالنے سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معاشی و اقتصادی سطح پر زکوٰۃ کا ادارہ معاشرہ میں ضرورت مند و بے سہارا افراد کی مدد سے تقسیمِ دولت، حقوق و فرائض کے تحفظ نیز غربت، فقر و افلاس کو دُور کرنے، معاشرتی عدل قائم کرنے اور افراد معاشرہ کے دینی، دنیاوی اور نفسیاتی اصلاح کے لئے ایک موثر ذریعہ تھا اور فی الحقیقت اس کو اس تاثیر کے ساتھ عہد نبوی میں استعمال بھی کیا گیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ریاستِ نبوی نے اپنے کسی باشندے کو یہ محسوس تک نہ ہونے دیا کہ وہ تنہا یا لاوارث ہے۔ اسی لئے رسول اللہؐ نے اعلان فرما دیا تھا کہ: "جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسولؐ ہے۔" (۲۵۹)

ایک جدید العہد مصنف کے بیان کے مطابق فقراء و مساکین کے دائرہ میں بے روزگاری اور معذوروں کا سماجی تحفظ بھی آجاتا ہے "تاکہ مدافعت اور مسابقت کی قوت بخش کر ان کی خوشحالی بڑھائی جائے۔" (۲۶۰) صدقات کے عاملین میں وصول کرنے والے اور تقسیم کرنے والے دونوں شامل ہیں جبکہ تالیفِ قلوب کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ مال و زر سے کام لے کر مخالفت کی قلب ماہیت کر دی جائے نیز اشاعتِ اسلام میں وسعت پیدا ہو۔ (۲۶۱) غارمین یا قرضداروں کی مدد و اعانت کی شق اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ ریاست نبوی کی یہ ایک مستقل روایت رہی ہے کہ جو لوگ اپنے قرضوں کو ادا نہیں کر سکتے ان کی مدد کی جاتے۔ اس سلسلے میں ریاست کا سلوک قرضداروں کی زندگی تک ہی محدود

نہ تھا بلکہ انتظامات اس حد تک کر دئے گئے تھے کہ اگر کوئی شخص وفات پا جائے اور اپنے پیچھے قرض یا اولاد چھوڑ جائے تو اس کی کفالت حکومت کے ذمہ ہو جاتی تھی[۲۶۲] اور رسول اللہؐ کے ارشاد گرامی کا خلاصہ یہ ہے کہ "جو شخص کچھ چھوڑ جائے تو وہ اس کے گھر والوں کے لئے ہے۔ لیکن جو کسی کو بے سہارا چھوڑ جائے تو میں اس کا کارساز و منتظم (مولیٰ) ہوں"[۲۶۳]

مختصر یہ کہ زکوٰۃ کے اس نظام کو نافذ کر کے رسول اللہؐ نے معاشی سطح پر انقلاب آفرین اصلاحات کیں اور ایک ایسا معاشرہ قائم کر دیا جس میں نہ کوئی فرد اپنی زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم تھا اور نہ کوئی فرد دوسرے کی محنت پر عیش کی زندگی بسر کر سکتا تھا۔

(و) صدقات

زکوٰۃ اور صدقات میں باریک فرق صرف یہ ہے کہ صاحبِ نصاب پر زکوٰۃ کی ادائیگی لازمی تھی جبکہ صدقات مسلمان اپنی خوشی سے ریاست کو دیا کرتے تھے۔ البتہ کچھ ان میں ضروری بھی تھے۔ مثلاً صدقۃ الفطر۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ۲ھ میں زکوٰۃ کی فرضیت سے بہت پہلے صدقۂ فطر کا حکم دیا تھا[۲۶۴] اور آپ ہی نے فطرہ کی مقدار بھی معین فرما دی تھی کہ "ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو مسلمانوں میں سے ہر آزاد اور غلام مرد اور عورت پر فرض ہے۔"[۲۶۵]

قرآن کی رُو سے صدقات کے مصارف بھی وہی ہیں جو زکوٰۃ کے ہیں اور زکوٰۃ کی طرح اس کی وصولی کا انتظام بھی ریاست نبوی میں سرکاری طور پر ہوتا تھا۔ اس غرض سے رسول اللہؐ نے ۹ھ میں زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے کے لئے ہر قبیلہ کے لئے الگ الگ محصلین مقرر فرمائے تھے جو قبائل کا دورہ کر کے لوگوں سے وصول کرتے تھے۔ رسول اللہؐ کا طریقۂ کار یہ تھا کہ جب کسی کو عاملِ زکوٰۃ کی حیثیت سے متعین فرماتے تو زکوٰۃ کی مقدار، اس کی شرح، اس کے حصول کا طریقہ اور دوسری ضروری ہدایات بھی تحریری طور پر اس کے سپرد کر دیتے تھے۔ اور جب عاملین آپ کی خدمت میں واپس آتے تھے تو آپ ان سے باقاعدہ حساب طلب کرتے تھے اور یہ اطمینان کر لیتے تھے کہ زکوٰۃ و صدقات کی وصولیابی میں کسی قسم کا ظلم یا جبر نہیں برتا گیا ہے رسول اللہؐ زکوٰۃ و صدقات کے محصلین یا عمال کو بقدرِ ضرورت معاوضہ بھی ادا کرتے تھے۔[۲۶۶]

صیغۂ مالیات پر بحث ختم کرنے سے پہلے یہ بتا دینا انتہائی ضروری ہے کہ آمد و خرچ اور دوسرے انتظامات کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ رسول اللہؐ نے معاشرہ میں معاشی خوشحالی و فارغ البالی کے لئے بھی متعدد تدابیر اختیار کیں۔ مثلاً بے روزگاری کے مسئلہ کو ختم کرنے کے لئے پہلے بیان کی ہوئی صورتوں کے علاوہ قانونِ وراثت کا اجراء کیا[۲۶۷] (جس کا ذکر ہم استحکام کے باب میں کر چکے ہیں) انسدادِ گداگری کے سلسلے میں آپ نے متنبہ کر دیا تھا کہ جو بھیک مانگتا ہے وہ جب خدا کے سامنے جائے گا تو اس کے چہرے پر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ ہو گی۔[۲۶۸] ملک کی معدنی دولت اور بے کار زمینوں کو زیرِ استعمال لانے کے لئے بھی آپ کے بعض اقدامات قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً مختلف اشخاص کو کانیں اور جاگیریں عطا فرمائیں۔[۲۶۹] موات یا بنجر اراضی کو آباد کرنے کے سلسلے میں رسول اللہؐ کا فرمان یہ تھا کہ "جو شخص کسی زمین کو آباد کرے اور وہ کسی اور کی مملوکہ نہ ہو تو آباد کار اس کا زیادہ حقدار ہے۔"[۲۷۰] اسی طرح دُومۃ الجندل کے اطراف کے جنگلات کو

آپ نے بیت المال کی ملکیت قرار دیا تھا۔[۲۷۱]

بہر حال اب تک ہم نے مالیات کے سلسلے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ رسول اللہ نے تقسیمِ دولت کے پیچیدہ مسائل کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ حل فرمایا کہ انفرادی حقوق کے تحفظ کے ساتھ ساتھ جماعت اور معاشرے کو زیادہ سے زیادہ ترقی حاصل ہوئی اور کسی گوشہ میں بھی تصادم کی کوئی صورت پیدا نہیں ہونے پائی۔

(۷) صیغہ ہائے عسکری

اس میں شک نہیں کہ اسلام سے قبل جنگ، وحشت، بربریت، بہیمیت اور ہوسِ ملک گیری کا دوسرا نام تھا اور انتقام، تفاخر یا مال و متاع کا لالچ ہی اس کا اصل محرک تھا۔ عرب ہو یا عجم جب جنگ کے شعلے بھڑکتے تو مقاتلین و غیر مقاتلین کا امتیاز اُٹھ جاتا دشمن قوم کا ہر فرد دشمن بن جاتا۔ جنگ میں عورتیں، بچے بوڑھے اور بیمار ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا۔ اور یہ سمجھا جاتا کہ دشمن کو ایذا دینے اور ضرر پہنچانے کا غیر محدود حق حاصل ہے، یہاں تک کہ آگ کا عذاب دینے میں بھی تامل نہ برتا جاتا۔ نیز وحشیانہ افعال، لاشوں کا مثلہ، اسیرانِ جنگ کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک اور بسا اوقات جوشِ انتقام میں انہیں انتہا درجہ کی اذیتیں دے کر مار ڈالنا اس زمانہ کی عام روایات تھیں۔[۲۷۲]

لیکن اسلام آیا تو اس نے جنگ کو بھی ایک پاکیزہ چیز بنایا اور باعثِ رحمت ٹھہرایا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے بارے میں یہ ارشاد فرما کر حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ:

انا النبی الرحمہ انا النبی الملحمہ۔[۲۷۳]

(میں رحمت کا پیغمبر ہوں، میں جنگ کا پیغمبر ہوں)

اور فتح مکہ کے عظیم الشان موقع پر جب مسلمانوں میں سے ہی الیوم یوم الملحمہ الیوم تستحل الحرمۃ[۲۷۴] (آج کا دن جنگ کا دن ہے، آج کے دن حُرمتیں پامال ہوں گی) کا نعرہ بلند کیا گیا تو رسول اللہؐ نے اس کی تردید ان الفاظ میں کی:

فقال کذب سعد ولکن ھذا یوم یعظّم اللّٰہ فیہ الکعبۃ۔[۲۷۵]

(سعد نے غلط کہا۔ بلکہ آج کے دن تو اللہ کعبہ کی عظمت کو دوبالا کرے گا)

اور پھر تنبیہ کے طور پر اس نعرہ لگانے والے سے عَلم چھین لیا گیا۔[۲۷۶]

مطالعہ تاریخ و سیر کے پیشِ نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے اگرچہ جنگ کے آداب و قوانین کو بھی بہت کچھ بدلا اور طریقۂ جنگ میں بھی بعض نئے تجربات کئے مثلاً خندق کی تدبیر۔ لیکن آپ نے اصل انقلابِ جنگ کے مقاصد، نقطۂ نظر اور نصب العین میں پیدا کیا۔ نصب العین کی تبدیلی اور ہدف کے بدل جانے سے ظاہر ہے عسکری ادارات بھی متاثر ہوئے اور اس طرح پورے فوجی نظام میں بحیثیت مجموعی انفرادیت پیدا ہو گئی ورنہ اہلِ عرب فوج کی صورت میں

پہلے بھی جنگ میں حصہ لیتے تھے۔ جنگ کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم کا بھی انتظام تھا اور اس کے لئے باقاعدہ اصطلاحیں رائج تھیں۔ مثلاً مرباع، نشیطہ، فضول اور صفی وغیرہ۔[۲۷۷] سامانِ حرب میں تلوار، نیزہ، ڈھال، زرہ، تیر، کمان اور محاصرہ کے آلات میں منجنیق، دبابہ، کبش وغیرہ کا استعمال عام تھا۔[۲۷۸] فوجی مراتب کا رواج بھی ان کے یہاں پایا جاتا تھا مثلاً میدانِ جنگ کے لئے جو امیر منتخب کیا جاتا اس کو منکب کہتے تھے اور ہر منکب کے ماتحت پانچ عریف ہوتے۔ ایک عریف بہت سے نفروں پر افسر ہوا کرتا تھا۔[۲۷۹] غرض عسکری سرگرمیاں تو عرب جاہلیت میں بھی پائی جاتی تھیں البتہ اخلاقی اصول و ضوابط اور نصب العین وہ نہ تھا جسے رسولؐ اللہ نے پیش کیا۔ نیز یہ فقدان روم و ایران جیسی مہذب و متمدن اقوام میں بھی موجود تھا۔[۲۸۰] اس صورتِ حال میں رسولؐ اللہ کا یہ کارنامہ بہت وقیع ہے کہ آپ نے جنگ کے محرکات اور اس کے مقصد کو بالکل نیا رنگ عطا کیا۔

اسلام میں جنگ کا مقصد نہ آتش انتقام بجھانا ہے، نہ مال و منال کا حصول ہے، نہ ہوس ملک گیری کی تسکین ہے اور نہ شوقِ حکمرانی کی تکمیل ہے۔ اسلام نے پہلے ہی قدم پہ اپنے فوجی نظام کو اخلاقی حدود کا پابند کیا اور ظلم و سفاکی کے جملہ طریقوں کو ختم کر کے جنگ کا ایک نیا تصور پیش کیا اور اسے "جہاد فی سبیل اللہ" کا حسین قالب عطا فرمایا۔[۲۸۱] جہاد کسی کام یا مقصد کے حصول میں انتہائی کوشش صرف کرنے کو کہتے ہیں[۲۸۲] جبکہ فی سبیل اللہ کی تحدید نے واضح کر دیا کہ یہ جہاد نفس کی کسی خواہش ملک کی تسخیر، کسی عورت کے وصال، عداوت کے انتقام، دولت یا اقتدار یا شہرت و ناموری کے حصول کے لئے نہیں ہے بلکہ اللہ کی راہ میں محض دفعِ شر کے لئے ہے۔[۲۸۳] جہاد کے وسیع دائرہ میں اگرچہ ہر قسم کی جدوجہد شامل ہے لیکن اس کی اعلیٰ ترین شکل قتال ہے جس میں آدمی اللہ کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔

رسولؐ اللہ نے جنگ کے سلسلے میں ایک مکمل ضابطہ اور قانونِ جنگ و صلح دیا۔ جنگ کے آداب، اس کے اخلاقی حدود، محاربین کے حقوق و فرائض، مقاتلین و غیر مقاتلین کا فرق، معاہدین، مفتوح قوموں، سفرا اور اسیرانِ جنگ کے حقوق وغیرہ کی تعلیم دی اور غفلت میں حملہ کرنے، آگ لگانے، لوٹ مار، تباہ کاری، مثلہ، قتل اسیر، بدعہدی، بدنظمی، انتشار اور دوسرے وحشیانہ افعال کو قطعاً ممنوع قرار دیا۔ نیز اس کے مقابلہ میں تقویٰ، خوفِ خدا، ایفائے عہد، غنیمت میں خیانت سے احتراز وغیرہ کی ہدایت فرمائی۔ ان باتوں کا اندازہ اس خطبہ سے لگایا جا سکتا ہے جو جیشِ موتہ کو رخصت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا۔[۲۸۴]

بہرحال یہی وہ فلسفہ اور بنیادی اصول تھے جن پر رسولؐ اللہ نے ہجرتِ مدینہ کے بعد ایک باقاعدہ فوجی نظام قائم فرمایا۔ فوج کے کمانڈر انچیف اور سربراہِ اعلیٰ کی حیثیت خود آپ کی تھی۔ آپ نے بنفسِ نفیس تقریباً ستائیس جنگوں کی قیادت فرمائی جبکہ دوسری فوجی مہمات میں اپنے نائبوں کو اجرائے جہاد کے لئے روانہ فرمایا۔ سرحدوں کی نگرانی، ریاستی علاقوں کی حفاظت اور دشمن کو مرعوب کرنے کے لئے طلایہ گرد جماعتیں بھی آپ ہی کے حکم سے روانہ ہوتی تھیں۔ مطالعہ تاریخ کی رو سے رسولؐ اللہ کے بعد حضرت عمرؓ کے دور میں خصوصاً فوج کے نظام میں جو توسیع نظر آتی ہے وہ عہدِ رسالت کے

فوجی انتظامات کا ہی نتیجہ ہے۔ مثلاً ایک اہم کام مردم شماری اور جنگ کے قابل افراد کا رجسٹریشن ہے۔ اس کی اولیت کا سہرا مورخین عموماً حضرت عمرؓ کے سر باندھتے ہیں[۲۸۵] جبکہ یہ درحقیقت عہدِ نبوی کی پیداوار ہے اور جس کی تائید بخاری کی ایک حدیث سے ہو جاتی ہے۔[۲۸۶] اس حدیث میں اگرچہ مردم شماری کے مقصد کی صراحت نہیں کی گئی ہے تاہم کتانی نے اسے "باب فی کتاب الجیش" کے تحت نقل کر کے اسے بالکل واضح کر دیا ہے۔[۲۸۷] گویا رسولؐ اللہ کے دور میں ہی ابتدائی قسم کا ایک دیوان مرتب ہو گیا تھا۔ نیز فوج کے لئے اسلحہ کی فراہمی، رسد کا انتظام، مجاہدوں کی بھرتی، اعلانِ جنگ اور لشکر کی روانگی کا اہتمام، سپاہ کی مشق و تربیت، نگہداشت وغیرہ کے تمام فرائض بھی آپ کے حکم کے تحت انجام دئے جاتے تھے۔

فوج یا لشکر کی فہرست میں گویا تمام تندرست مسلمانوں کا شمار ہوتا تھا۔ تمام شرکا جوشِ ایمان اور جذبۂ جہاد سے سرشار، ہر قسم کی نفسانی حرص و ہوس سے آزاد تھے اور میدانِ جنگ میں دین کی ترقی و حفاظت اور اس کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دینے کے عزم سے اترتے تھے۔ پھر یا تو شہادت پا کر کامیابی و کامرانی کے بلند ترین مرتبہ پر فائز ہوتے یا غازی بن کر مالِ غنیمت میں سے اپنا حصہ پاتے تھے۔ ایسی تاریخی مثالیں بھی ملتی ہیں جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ بعض اوقات مالِ غنیمت میں سے حصہ ان لوگوں کو بھی دیا جاتا تھا جو اگرچہ محاذِ جنگ پر موجود نہ ہوں مگر عملاً کسی نہ کسی نوع سے جہاد میں حصہ لے رہے ہوں۔[۲۸۸]

اسلامی فوج پانچ حصوں یعنی قلب یا مرکز، میمنہ، میسرہ، مقدمہ اور عقبی فوج یا ساقہ پر مشتمل ہوتی تھی۔ لشکر کی یہ تقسیم اگرچہ دورِ جاہلیت میں بھی موجود تھی لیکن رسولؐ اللہ نے ظاہری شکل و صورت اختیار کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان تمام حصوں میں جدید نظم و ترتیب پیدا کی، نئی روح پھونکی اور ان حصوں کو ظاہری و معنوی ہر اعتبار سے پہلے سے کہیں زیادہ متحد و متفق کر کے ایک ناقابلِ تسخیر اکائی یا قرآن کے الفاظ میں "بنیان مرصوص" بنا دیا۔[۲۸۹] میدانِ جنگ میں صف بندی کا رسولؐ اللہ کو اتنا اہتمام تھا کہ موقع پر خود ہاتھ میں چھڑی لے کر صفیں درست فرماتے تھے[۲۹۰] بلکہ بقول طبری فتح مکہ کے وقت تو صف آرائی ایک مخصوص افسر کے سپرد ہو گئی تھی جو وازع کہلاتا تھا۔[۲۹۱] ہر فوج کا مہم پر روانگی سے پہلے شہر کے باہر معائنہ (عرض) ہوتا تھا اور کم عمر، ضاکار یا سواری یا اسلحہ نہ رکھنے والے یا نامناسب افراد واپس کر دیئے جاتے تھے۔[۲۹۲] جنگِ بدر میں صف آرائی کے بعد جو جامع ہدایات دی گئی تھیں وہ یہ تھیں کہ "جب تک میں حکم نہ دوں، کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے، دشمن دور ہو تو تیر چلا کر بے کار ضائع نہ کرے بلکہ جب نزدیک آئے تو مارے، اس سے قریب آئے تو پتھر پھینک کر مارے، اس سے بھی قریب آئے تو نیزہ اور پھر تلوار چلائے۔"[۲۹۳] ان ہدایات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ رسولؐ اللہ اسلحہ اور سامانِ حرب کے محتاط استعمال اور اس کے بے جا صرف پر کتنی کڑی نظر رکھتے تھے۔

سپہ سالارِ فوج یا امیرِ لشکر کے حکم سے جنگ شروع ہوتی۔ اجرائے حکم کے بعد تکبیر یا دعا کے ذریعہ اللہ کی امداد و استعانت طلب کی جاتی۔[۲۹۴] محاذِ جنگ پر سپاہ کے دلوں میں جوش و جذبہ اور ہمت و حوصلہ پیدا کیا جاتا کیونکہ ترغیب جہاد بھی ایک اہم ضرورت ہے۔[۲۹۵] عام طور پر پہلے انفرادی مقابلے ہوتے اور پھر جنگ مغلوبہ۔ لشکر میں دو قسم کے دستے ہوتے تھے، ایک پیادہ اور دوسرے سوار۔ جنگِ بدر میں اسلامی فوج کے ساتھ صرف دو سوار تھے پھر اُحد میں مستقل

سوار فوج قائم ہوئی جس کے کمانڈر حضرت زبیر بن العوام تھے جبکہ تبوک کے محاذ پر سوار فوج کی تعداد دس ہزار تک جا پہنچی تھی۔[۲۹۶] ان دو قسم کے دستوں کے علاوہ بعد میں زرہ پوش پلٹن کا بھی اضافہ ہوگیا۔ احد میں پہلی مرتبہ ۱۰۰ سپاہیوں کی زرہ پوش پلٹن تھی جبکہ فتح مکہ کے موقع پر فوج کا ہر سپاہی فولاد میں غرق تھا۔[۲۹۷] میدانِ جنگ میں سپہ سالار فوج کا مستقر علیحدہ کسی محفوظ اور اونچی جگہ پہ بنایا جاتا تھا تاکہ وہ فوجوں کی نقل و حرکت اور محاذِ جنگ کے نقشہ پہ نظر رکھتے ہوئے ہدایات جاری کر سکے جیسا کہ غزوۂ بدر میں رسول اللہؐ کے لئے "عریش" تیار کیا گیا تھا۔[۲۹۸] سالارِ فوج کی حفاظت اور پہرہ داری کے لئے بھی افسر الگ الگ تھے بلکہ دو قسم کے افسر تھے، ایک "صاحب اللواء" کہلاتا اور دوسرا "صاحب الرایہ"۔ کتانی کی وضاحت کے مطابق لواء، رایہ کے علاوہ ہوتا تھا۔ لواء بڑا جھنڈا تھا اور امیرِ فوج کے مستقر پر بطور علامت لہراتا تھا، جبکہ رایہ اس سے الگ جھنڈا تھا۔[۲۹۹] رسول اللہؐ کا جھنڈا "عقاب" سے موسوم تھا۔[۳۰۰] معلوم ہوتا ہے کہ سپاہ فوج میں جوشِ جہاد اور حمیت و غیرت کو بیدار رکھنے اور اپنے آدمیوں کو دور سے پہچان لینے کے لئے لشکر میں شامل قبائل کے جھنڈے الگ الگ ہوتے تھے اور ان کا رنگ بھی علیحدہ علیحدہ ہوتا تھا۔ مثلاً ایک موقع پر انصار کے جھنڈے کا رنگ پیلا تھا۔[۳۰۱] محاذ پر دوست دشمن کی تمیز جنگی ضرورتوں اور خفیہ نقل و حرکت کے پیشِ نظر مسلمان فوجیوں کے لئے شعار (یا علامتی نعرہ) بھی مقرر کیا گیا تھا اور رسول اللہؐ نے اس سلسلے میں عسکری تدبر کا یہاں تک ثبوت دیا تھا کہ ہر جنگ میں شعار کے خفیہ الفاظ کو تبدیل فرما دیتے تھے۔[۳۰۲]

میدانِ جنگ میں کامیابی، دشمن کی سرگرمیوں پر کڑی نظر اور فوج کی صحیح نقل و حرکت کے لئے نظامِ جاسوسی ناگزیر ہے رسول اللہؐ نے اس سلسلہ میں جو انتظامات کئے تھے اس کی کچھ وضاحت ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ فوجی جاسوسی کے لئے رسول اللہؐ نے جن افراد کو مقرر کیا تھا ان کا کام یہ تھا کہ مطلوبہ معلومات سے رسول اللہؐ کو مطلع کریں۔[۳۰۳] یوں تو ہر چھوٹی بڑی مہم میں رسول اللہؐ جاسوسوں سے کام لیتے تھے لیکن غزوۂ احزاب کے معرکہ میں نعیم بن مسعود اشجعی نے جتنا کامیاب کردار ادا کیا تھا اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جاسوسوں کے ذریعہ خبر رسانی کا یہ کام رسول اللہؐ نے جنگ سے پہلے اور جنگ کے دوران نہیں ہی لیا بلکہ عام حالات میں بھی خطرات کے پیشِ نظر یہ نظام موثر طور پہ کام کرتا تھا۔ اس سلسلے میں رسول اللہؐ نے "حبس الطریق" سے بھی کام لیا۔ چنانچہ وہ واقعہ تاریخ و سیر میں بہت مشہور ہے جبکہ مدینہ کے ایک مخلص مسلمان کی طرف سے مشرکینِ مکہ کو رسول اللہؐ کی جنگی تیاریوں کی تحریری اطلاع دینے کی ناکام کوشش کی گئی لیکن سخت ناکہ بندی کے باعث وہ تحریر پکڑی گئی۔[۳۰۴]

مخالف قوتوں اور دشمنوں پر قابو پانے کے لئے رسول اللہؐ نے یہ تدبیر بھی اختیار کی کہ ان کے دوستوں اور حلیفوں کو توڑ لیا جائے۔ اس میں بھی رسول اللہؐ کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور جس کی سب سے روشن مثال صلح حدیبیہ ہے۔ علاوہ ازیں جنگ جیتنے کے لئے رسول اللہؐ نے بعض نئے تجربات بھی کئے مثلاً غزوۂ احزاب کے موقع پر خندق میں محصور رہ کر جنگ کرنا اہلِ عرب کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ اسی طرح خیبر کی لڑائی میں منجنیق سے دشمن کے محصور قلعہ پہ پتھر برسائے گئے۔ طائف کے محاصرہ میں دبابے استعمال کئے گئے۔ نیز منجنیق کے علاوہ عرادہ بھی استعمال کیا گیا۔[۳۰۵]

عہدِ نبویؐ میں لشکر کے ساتھ ساتھ ضروری عملہ بھی جاتا تھا۔ اسس عملہ میں راستہ بتانے والے[۳۰۶]، سپہ سالارِ فوج پر سایہ کرنے والے[۳۰۷]، لشکر سے آگے لشکر کے انتظامات کرنے والا دستہ یا " طلیعۃ الجیش "[۳۰۸]، جاسوس[۳۰۹]، صاحبِ مغانم[۳۱۰]، صاحبِ الخمس[۳۱۱]، صاحب الثقل[۳۱۲] (مسافروں کا سامان اٹھانے والے) اور حراس عسکر یعنی لشکر کے پہرہ دار[۳۱۳] وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

جنگ کے نتیجہ میں جو مال و متاع ہاتھ آتا اور جسے مالِ غنیمت کہا جاتا ہے اس کی تقسیم و مصارف ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔ جنگی قیدیوں کے بارے میں قرآن کی ہدایت یہ ہے کہ شدید اور فیصلہ کن جنگ کے بعد انہیں اسیر کیا جا سکتا ہے البتہ یہاں اس تفصیل کا موقع نہیں ہے کہ جنگی قیدیوں کے باب میں اسلام نے کس سلوک کی تعلیم دی ہے۔ اور یہ امر بھی باعثِ طوالت ہے کہ اس وقت کی متمدن دنیا میں اس حسنِ سلوک کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔

سپہ سالارِ فوج یا کمانڈر کے فرائض میں جس طرح فوج کی نگہداشت، جنگی امور کا انتظام اور لڑائی کی قیادت شامل ہے اسی طرح صلح کے لئے گفت و شنید، صلح ناموں پر دستخط اور دُوسرے جنگی فیصلے کرنا بھی اسی کا کام ہے۔ مسلمان مجاہدین کے لئے جہاں ایک طرف یہ ممنوع کہ میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھائیں، تو دُوسری طرف یہ حکم بھی ہے کہ:

وان جنحوا للسلم فاجنح لہا و توکل علی اللہ۔[۳۱۴]

(اور دیکھو اگر دشمن صلح کی طرف جُھکے تو چاہیے کہ تم بھی اسس کی طرف جُھک جاؤ اور ہر حال میں اللہ پر بھروسا رکھو)

اس قرآنی ہدایت کے تحت رسولؐ اللہ کا معمول یہ رہا کہ آپ دشمن کی طرف سے معمولی سا اشارہ پاتے ہی صلح پر آمادہ ہو جاتے اور حتی الوسع جنگ سے مجتنب رہتے۔ چنانچہ اسس کی واضح ترین مثال حدیبیہ کے موقع پر نظر آتی ہے۔ صلح حدیبیہ پر مفصل گفتگو ہم پہلے کر چکے ہیں اس لئے یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ رسولؐ اللہ صلح کے حد درجہ متلاشی تھے اسی لئے آپ بظاہر مغلوبانہ شرائط پر بھی رضامندی کا اظہار کر دیتے تھے تاکہ ہر ممکن طریقے سے جنگ کو ٹال دیا جائے۔ آپ کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اختلافات کو سفارتی بنیادوں پر طے کر کے جنگ کو ملتوی کر دیا جائے لیکن جب یہ ساری کوششیں رائیگاں جاتیں تو پھر جنگ کے معاملہ میں بھی آپ کی مستعدی میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔

۸۔ صیغۂ عدالت

عدل و انصاف کا قیام ہر مہذب و متمدن انسانی معاشرہ کی اوّلین ضرورت اور ہر مہذب و متمدن حکومت کا سب سے اہم فریضہ ہے۔ عدل کے بغیر نہ لوگوں کے درمیان حقوق و فرائض کا تعین ہو سکتا ہے اور نہ ظلم و استحصال کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ ہر زمانہ میں قانون سازی اور تشریع کا بنیادی مقصد اسی کو سمجھا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ایک مقام پر مختصراً پیغمبروں اور رسولوں کے مشن پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے کہ:

لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط۔ [۳۱۵]

(ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں)

اس اعتبار سے رسول اللہؐ بحیثیت رسول اور بحیثیت سربراہ ریاست معاشرہ میں عدل و انصاف کے قیام و اجرا کے ذمہ دار تھے اور اسی لئے صیغۂ عدالت ریاستِ نبویؐ کا ایک مستقل اور اہم ترین شعبہ تھا۔

عہد نبویؐ میں عدالت و قضا کے تمام اختیارات اور قانونِ اسلامی کا نفاذ رسول اللہؐ کے ہاتھ میں تھا اور آپ شارعِ حقیقی کے حکم کے بموجب فیصلے فرماتے تھے۔ آپ کے لئے حکم یہ تھا کہ:

وان حکمتم فاحکم بینھم بالقسط ان اللہ یحب المقسطین۔ [۳۱۶]

(اور آپ فیصلہ کریں تو ان کے درمیان عدل و انصاف سے فیصلہ کیجئے کہ بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)

اور اسی سے متصل یہ بھی آتا ہے کہ:

فاحکم بینھم بما انزل اللہ۔ [۳۱۷]

(ان کے درمیان اسی (قانون) کے مطابق فیصلہ کیجئے جو اللہ نے نازل کیا ہے)

متعدد مقامات پر رسول اللہؐ کو یہ تاکید بھی کی گئی ہے کہ فیصلہ حق و انصاف کے ساتھ کیا جائے اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی سرزد نہ ہو۔ [۳۱۸] بلکہ وہ ٹھیک ٹھیک میزان عدل پر پورا اترے۔ [۳۱۹] اور سورۂ شوریٰ میں زبانِ رسالت مآب سے یہ کہلایا گیا کہ:

امرت لاعدل بینکم۔ [۳۲۰]

(مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ تمہارے درمیان عدل قائم کروں)

ان ہدایات کے پیشِ نظر رسول اللہؐ نے ریاست نبوی میں انصاف رسانی کے موثر اقدامات فرمائے۔ مرکز میں آپ خود ہی گویا قاضی القضاۃ اور مفتیِ اعظم تھے۔ تمام مقدمات آپ کی عدالت میں پیش ہوتے تھے اور بالعموم مسجد نبوی کو ہی ایوانِ عدالت کی حیثیت حاصل تھی۔ نیز چونکہ لوگوں کے درمیان اختلافات کو ختم کرنا اور ان کے نزاعات کا فیصلہ کرنا آپ کا فرض منصبی تھا [۳۲۱] اور ریاست میں امن و اتحاد کی فضا قائم کرنے کے لئے بھی یہ امر ناگزیر تھا اس لئے ہجرتِ مدینہ کے فوراً بعد ہی رسول اللہؐ نے متحارب گروہوں کو شیر و شکر کرنے کے بعد سب سے بڑا کارنامہ یہ انجام دیا تھا کہ عدل و انصاف کو شخصی اور قبائلی سطح سے اٹھا کر مرکزی معاملہ بنا دیا۔ اور انصاف رسانی کے لئے سادہ لیکن موثر طریقۂ کار اختیار کیا۔ پھر یہی وہ موقع تھا جبکہ رسول اللہؐ کو آخری عدالت مرافعہ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس سلسلے میں یہاں مواخاۃ مہاجرین و انصار اور منشورِ مدینہ کا حوالہ دینا مناسب ہے جس پر تفصیلی بحث اس مقالہ کے گزشتہ ابواب میں کی جا چکی ہے۔

قاضی اور حکم کی حیثیت سے آپ کا معمول یہ تھا کہ جب بھی کوئی مسئلہ آپ کے سامنے پیش کیا جاتا تو آپ اس کا جواب

دے دیتے۔ اس قسم کے سوال وجواب کے لئے (جس کو ہم فتویٰ کہہ سکتے ہیں) کوئی وقت اور مقام مقرر نہ تھا۔ ہر لمحہ اور ہر آن آپ اس فریضے کو انجام دیتے رہتے تھے۔ رسولؐ اللہ کے یہ فتاوی احادیث میں پُوری طرح محفوظ ہیں۔ اور جس پر بحث ہمارے دائرہ سے خارج ہے۔ رسولؐ اللہ کا طریقۂ کار یہ تھا کہ جب کسی معاملہ میں کتاب اللہ کا کوئی حکم موجود نہ ہوتا تو آپ اپنی بصیرت اور اجتہاد سے فیصلہ دے دیتے تھے یا صحابہ سے مشورہ فرما کر کسی نتیجہ پر پہنچ جاتے اور پھر وہی فیصلہ اسلام کا قانون اور حکم بن جاتا تھا۔ لیکن اپنے ذاتی اجتہاد اور فیصلے کے سلسلے میں رسولؐ اللہ نے علی الاعلان یہ وضاحت کر دی تھی کہ:

انما انا بشر وانکم تختصمون الیّ ولعلّ بعضکم ان یکون الحن بحجتہ من بعض فاقضی لہ علی نحو ما اسمع منہ فمن قضیت لہ بشیٔ من حق اخیہ فلا یاخذ منہ شیئاً فانما اقطع لہ قطعۃً من النار۔[۳۲۲]

(میں بھی ایک انسان ہُوں اور تم میرے پاس لڑتے جھگڑتے آتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تم میں سے ایک اپنی چرب زبانی سے یا باتیں بنا کر اپنے دعوے یا دلیل کو ثابت کر دے اور میں اس کی باتیں سُن کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ پس اگر میں اس طرح ایسے شخص کے لئے اس کے بھائی کے حصہ میں سے حق دلا دوں تو اسے چاہیے کہ وہ اس میں سے کچھ نہ لے کیونکہ میں اسے آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں)

جہاں تک فیصلے کے نفاذ کا تعلق ہے تو اس کے لئے آپ اپنی طرف سے نائبین بھی مقرر فرماتے تھے۔ مثلاً ایک زانیہ کے مقدمہ میں انیس الاسلمی کا تقرر فرمایا تھا۔[۳۲۳]

مقدمات کے باب میں اثبات دعویٰ کی بڑی اہمیت ہے۔ چنانچہ رسولؐ اللہ کا ارشاد ہے کہ:

لو یعطی الناس بدعواھم لادعی ناس دماء رجال واموالھم۔[۳۲۴]

(اگر لوگوں کے دعوے یُوں ہی تسلیم کر لئے جائیں تو عدالتوں میں خُون کے اور مال کے بہت سے دعوے دائر ہو جائیں)

بہر حال قانونی نقطۂ نظر سے صرف وہی دعوے معتبر ہیں جو ثابت ہو جائیں اس لئے رسولؐ اللہ لوازمات ثبوت کے طور پر جن ذرائع اور وسائل کو اختیار فرماتے تھے ان میں سے ایک بیّنہ یعنی شہادت ہے۔ شہادت یا بیّنہ کا قاعدہ نہ صرف دورِ جاہلیت میں معروف ومتداول تھا بلکہ دورِ جدید میں بھی۔ چنانچہ المجلہ کی عبارت یہ ہے کہ:

البیّنۃ للمدعی والیمین علی من انکر۔[۳۲۵]

اور جس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ:

البیّنۃ علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ او علی من انکر۔[۳۲۶]

(مدعی ثبوت پیش کرے اور مدعا علیہ یا انکار کرنے والا حلف اٹھائے)

گویا رسولؐ اللہ نے بیّنہ کے ساتھ ساتھ یمین کو معتبر ٹھہرایا۔[۳۲۷] علاوہ ازیں قیافہ شناسی اور فراست کو بھی رسولؐ اللہ نے

لوازمات ثبوت میں شمار کیا ہے اور بعض اوقات اس سلسلہ میں ظاہری حالات و دلائل، قرعہ اندازی اور قسامت[۳۲۸] کا بھی اعتبار فرمایا ہے۔

غرض رسولؐ اللہ کی تمام تر کوشش اس بات پر مرکوز تھی کہ انصاف سہل الحصول ہو اور اس معاملہ میں تعصب یا جانبداری سے کام نہ لیا جائے۔ قرآن میں بھی متعدد مقامات پر غیر جانبدارانہ عدل کی جو ہدایات دی گئی ہیں[۳۲۹] اس کے پیشِ نظر آپ کے نزدیک قانون ہر ایک پر یکساں طور پر عائد ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ آپ نے یہ کہہ کر عدل و انصاف کے معاملہ میں ہر قسم کی بدعنوانیوں کا خاتمہ کر دیا کہ:

والذی نفس محمد بیدہ لو ان فاطمہ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا۔[۳۳۰]

(اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد نے بھی چوری کی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا)

اور یہ اس سیاسی اور قانونی مساوات کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے جسے رسولؐ اللہ نے ریاست میں قائم فرمایا تھا۔ اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صیغہ عدالت کے ذریعہ ریاست کے تمام شہریوں کے حقوق امن و آزادی اور مساوات کا تحفظ رسول اللہ کیسی تندہی کے ساتھ فرماتے تھے۔

یہاں یہ وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ رسولؐ اللہ کے دور میں مقدمات بہت کم تعداد میں آتے تھے۔ اس کی خاص وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ریاست نبوی میں قانون کا اجراء و نفاذ معاشرہ کے اخلاقی ارتقا کے ساتھ ساتھ ہوا اور یوں قانون کے ساتھ اس کی اصل رُوح عمل کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئی۔ غالباً اسی لئے جب بھی رسولؐ اللہ کی طرف سے کوئی حکم جاری ہوتا یا کوئی فیصلہ کر دیا جاتا تو اسے فی الفور تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ کیونکہ یہ محض ایک قانونی معاملہ تھا بلکہ دین و ایمان کا ایک اہم تقاضہ بھی تھا جس کی شہادت قرآن ان الفاظ میں دیتا ہے کہ:

فلا وربّک لایؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثمّ لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مّمّا قضیت و یسلّموا تسلیما۔[۳۳۱]

(تمہارے رب کی قسم یہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم کو اپنا حکم تسلیم نہ کریں ان معاملات میں جس میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔ پھر جس بات کا تم فیصلہ کر دو اس کے بارے میں ان کے دلوں میں کوئی تنگی واقع نہ ہو اور تمہارے فیصلہ کو بسر و چشم قبول کر لیں)

گویا نفاذِ قانون کے لئے ریاست کی طاقت کو استعمال کرنے کی ضرورت شاذ و نادر ہی پڑتی تھی اور اپنی روح تقدس کی وجہ سے ہر ایک اس قانون پر از خود عمل پیرا ہو جاتا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ رسولؐ اللہ کی کوشش یہ بھی ہوتی تھی کہ تنازعہ یا مقدمہ عدالت میں باقاعدہ طور پر آنے سے پہلے ہی فریقین کی رضامندی سے ختم ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ قرآن نے بھی اس کی طرف والصلح خیر[۳۳۲] فرما کر توجہ دلائی ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ اگر مسلمانوں میں باہم کوئی اختلاف یا نزاع کی صورت پیدا

ہو جائے تو صلح کی اجتماعی کوششوں میں کمی نہ کرنی چاہیے۔[۳۳۳] ہاں اگر نچلی سطح پر معاملات طے نہ ہو سکیں تو پھر عدالت عالیہ سے رجوع کیا جائے تاکہ انصاف کے تقاضے پُورے ہوں۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں جو جیسا جُرم کرے گا اس کی سزا بھی ویسی ہی پائے گا۔[۳۳۴] اور کسی فرد کو دُوسرے کے جُرم کی سزا نہیں دی جا سکے گی۔[۳۳۵] پھر انصاف کے تقاضوں کو کما حقہٗ ادا کرنے کے لئے آپ کی یہ ہدایت بھی موجود ہے کہ:

لا یقضین حکم بین اثنین وھو غضبان۔[۳۳۶]

(کوئی حاکم دو آدمیوں کے درمیان غصّہ کی حالت میں فیصلہ نہ کرے)

کیونکہ اس صورت میں آدمی عدل سے تجاوز کر سکتا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ توسیعِ ریاست کے ساتھ ساتھ نظامِ عدالت میں بھی توسیع پیدا ہوئی۔ مرکز میں تو آپ خود منصبِ قضا پر فائز تھے لیکن اس کے علاوہ صوبائی سطح پر بھی رسول اللہ نے قاضیوں کا تقرر کیا۔ اور عدالت و قضا کی ذمہ داریاں بھی بالعموم صوبائی سربراہوں یا والیوں کے سپرد کیں۔ گویا والی اپنے عہدہ کے لحاظ سے قاضی بھی تھا۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا حاکم اور عتاب بن اسید کو مکہ کا والی مقرر کیا تو یہ حضرات حکومت عامّہ کے ساتھ ساتھ فصل خصومات اور عدالت کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ ان دونوں اوارات انتظامی کو یکجا کرنے کا سبب غالباً یہ تھا کہ ایک طرف تو انتظامِ ریاست اپنے ابتدائی مراحل میں تھا اور دوسری طرف مقدمات بہت کم آتے تھے۔ صوبائی قضاۃ اپنے فیصلوں میں پہلے کتاب اللہ اور پھر سنّتِ رسول کو پیشِ نظر رکھتے تھے اور جب ان دونوں مآخذ میں کوئی راہنمائی نہیں ملتی تو بالآخر اپنے اجتہاد اور بصیرت سے کام لیتے تھے جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل کی اس مشہور حدیث سے معلوم ہوتا ہے جس کا تذکرہ ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔[۳۳۷] اسی طرح جب آپ نے حضرت علی کو یمن کی جانب روانہ فرمایا تو یہ وصیت بھی فرمائی کہ جب تک تم فریق اوّل کی طرح فریق ثانی کا بیان نہ سُن لو فیصلہ نہ دینا۔[۳۳۸] اور آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر تم نے اجتہاد کیا اور اس میں ثابت قدم رہے تو دوہرا اجر ہوگا اور اگر خطا کر گئے تب بھی ایک اجر ضرور ملے گا۔[۳۳۹] کتانی کا بیان ہے کہ رسول اللہ نے صحابہ میں سے جن لوگوں کو منصبِ قضا پر سرفراز فرمایا تھا ان میں حضرت عمر بن الخطاب، عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود، اُبَیّ بن کعب، زید بن ثابت اور ابو موسیٰ اشعری شامل ہیں۔[۳۴۰] لیکن یہ وضاحت نہیں کی کہ ان لوگوں کو کن مقامات پر قاضی کی حیثیت سے متعیّن کیا گیا تھا۔

یہاں یہ بتا دینا برمحل ہے کہ جس زمانے میں رسول اللہ نے یہ نظامِ عدالت قائم فرمایا تھا اس وقت دنیا عدالت و قضا کی حقیقتوں سے بہت دُور تھی۔ بظاہر روم و ایران کی متمدن سلطنتوں میں عدالتی ادارے موجود تھے اور عرب جاہلیت میں بھی بلاشبہ شیخ قبیلہ، حکم کاہن اور عراف وغیرہ نزاعات کے فیصلے کیا کرتے تھے اور یہ بھی صحیح ہے کہ لوازماتِ ثبوت کے ضمن میں قیافہ شناسی، فراست، قسامت، قرعہ اندازی اور شہادت کا بھی رواج تھا اور قس بن ساعدہ کا یہ قول کہ:

البینۃ علی من ادعی والیمین علی من انکر۔[۳۴۱]

(مدعی ثبوت پیش کرے اور انکار کرنے والا حلف اٹھائے)

زبان زدِ خاص و عام تھا لیکن قضا کی یہ تمام صورتیں کسی قاعدے اور ضابطے کی پابند نہ تھیں اور عرب میں خصوصاً ایسی کوئی با اختیار انتظامیہ بھی موجود نہ تھی جو تنفیذ احکام کی ذمہ دار ہو جو شخص طاقت، قوت اور اثر و رسوخ کا مالک ہوتا وہ فیصلوں پر اثر انداز ہونے اور انہیں بدلنے کی بھی پوری صلاحیت رکھتا تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ فیصلوں کی پابندی کی صورت میں بھی اہلِ عرب کے درمیان غیر مختتم لڑائیوں کے دروازے کھل جاتے تھے اور "ایام العرب"(۳۴۲) کی صورت میں جن کا تاریخی ریکارڈ آج بھی موجود ہے۔ نظامِ عدالت کے سیاق و سباق میں رسولؐ اللہ نے سب سے بڑا انقلاب یہ پیدا کیا کہ سیاسی و معاشرتی اتحاد کے ساتھ ساتھ عدالتی اختیارات کو بھی مرکزیت عطا کی۔ عدالت ایک شخص یا قبیلہ کا معاملہ نہ رہا بلکہ وہ اجتماعی اور معاشرتی بن گیا۔ قانونی انتشار کے بجائے قانونی مساوات قائم ہوئی اور ہر اختلاف کی صورت میں مرجع خدا اور رسول کی ذات ہو گئی۔(۳۴۳)

(۹) صیغہ ہائے تعلیم و تربیت

قرآن کی رُو سے رسولؐ اللہ بنیادی طور پر معلمِ انسانیت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ اس کے تحت تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفس آپ کا بنیادی کام تھا۔(۳۴۴) آپ نے خود بھی یہ اعلان کیا تھا کہ:

انما انا بعثت معلما۔(۳۴۵)

(بلاشبہ میں تو معلّم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں)

رسولؐ اللہ کی تعلیم زندگی کے کسی ایک گوشہ سے متعلق نہ تھی بلکہ ہر لحاظ سے جامع اور ہر شعبۂ حیات پر حاوی تھی۔ ہجرتِ مدینہ سے پہلے کی مکی زندگی اور جدّ و جہد کو نوعیت کے اعتبار سے علمی کہا جا سکتا ہے۔ آپ پر نازل شدہ پہلی وحی میں اسی حقیقت کی جھلک نظر آتی ہے۔(۳۴۶) پھر ہجرتِ مدینہ کے بعد تو رسولؐ اللہ نے بطورِ خاص تعلیم و تعلّم کی سرگرمیاں سرکاری حیثیت سے جاری فرمائیں۔ اسلامی نظریۂ حیات کی تعلیم، ان تعلیمات کا عملی سبق سکھانے اور ان بنیادوں کو واضح کرنے کے لئے جن پر اسلامی ریاست کو قائم کیا گیا تھا حضورؐ نے مسجد کو اپنی تمام سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ آپ نے تمام مسلمانوں پر جماعت سے نماز ادا کرنا لازم کیا تاکہ ایک طرف تو مسلمان مساوات، اخوت، تعاون اور نظم و اطاعت کا عملی سبق سیکھیں اور دوسری طرف جمعہ اور دیگر مواقع پر خطبات کے ذریعہ دین و دنیا کی تعلیم دی جا سکے۔ مسجد نبوی میں بڑے پیمانے پر تعلیم و تربیت کے انتظامات کے سلسلے میں مسجد سے ملحق "صفہ" کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مدینہ تشریف آوری کے بعد سب سے پہلے مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی تھی اور اسی کے ساتھ ساتھ صفہ یا چبوترہ بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ بقول ڈاکٹر حمید اللہ صفّہ کو اوّلین اسلامی اقامتی جامعہ کہا جا سکتا ہے۔(۳۴۷) اس اقامتی جامعہ میں قرآن کی تعلیم، حفظ و ناظرہ، تجوید اور دیگر اسلامی علوم کی تعلیم کا بند و بست تھا جس کی نگرانی خود رسولؐ اللہ فرماتے تھے اور وہاں پر مقیم طالبانِ علم کی غذا وغیرہ کا اہتمام بھی کیا کرتے تھے۔(۳۴۸) درسگاہِ صُفّہ میں نہ صرف مقیم طلباء کی تعلیم کا انتظام تھا بلکہ ایسے لوگوں کی تعلیم کا بھی جن کے گھر مدینہ میں تھے اور وہ صرف درس کے لئے وہاں حاضر ہوا کرتے تھے۔(۳۴۹) مقیم طلباء کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت ان کی تعداد

ستر بھی تھی۔ (۳۵۰)

مختصر یہ کہ تعلیم و تعلم کے لئے رسولؐ اللہ نے مستقل انتظامات فرمائے تھے اور اس سلسلے میں آپ ہمہ وقت سرگرم اور زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے یہاں تک کہ اسیرانِ جنگِ بدر کے لئے فدیہ کے طور پر رقم کے علاوہ یہ بات طے کی تھی کہ جو قیدی لکھنا پڑھنا جانتا ہو وہ دس مسلمان بچوں کو اس فن کی تعلیم دے۔ (۳۵۱) بعض مورخین کی تصریحات کے مطابق مدینہ میں صفہ کے علاوہ ایک اور اقامتی درس گاہ بھی تھی جو مخرمہ بن نوفل کے مکان میں "دار القراء" کے نام سے قائم تھی۔ (۳۵۲) علاوہ ازیں جس طرح مسجد نبوی علم کی نشر و اشاعت کا بڑا ذریعہ تھی اسی طرح مدینہ کی دیگر مساجد بھی اس باب میں خاصی اہمیت رکھتی ہیں، جن کی تعداد نو تک پہنچ گئی تھی۔ (۳۵۳) مسجد قبا کے مدرسہ کی نگرانی بقول ڈاکٹر حمید اللہ شخصی طور پر خود رسولؐ اللہ فرمایا کرتے تھے۔ (۳۵۴)

مدینہ سے باہر تعلیم کی غرض سے رسولؐ اللہ وقتاً فوقتاً معلمین، قرآء اور دعاۃ کو روانہ فرمایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں تاریخ کے دو واقعات بہت مشہور ہیں یعنی ایک تو بئر معونہ کا واقعہ جس میں رسولؐ اللہ نے ستر قرآء کو قبائل نجد میں تعلیم و تربیت کے لئے صفر ۴ھ میں روانہ کیا تھا۔ (۳۵۵) دوسرا واقعہ رجیع کا ہے۔ یہ دوسری تعلیمی مہم تھی۔ عاصم بن ثابت انصاری کو نو صحابہ کے ساتھ عضل و قارہ کی جماعتوں کی درخواست پر روانہ فرمایا تھا۔ (۳۵۶) یہ مہمات اگرچہ افسوسناک واقعات پر ختم ہوئیں لیکن اس سے مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ قبائل کی تعلیم و تربیت اور ریاست میں علمی ترقی کے لئے رسولؐ اللہ کی مستقل سیاست یہ تھی کہ معلموں اور قاریوں کو برابر ملک کے مختلف حصوں میں بھیجا جاتا رہے۔ یہاں خاص طور پر یمن کا ذکر کیا جا سکتا ہے جہاں اسلام کی ترویج و اشاعت بالکل پرامن ذرائع اور معلمین کے ذریعہ ہوئی۔ رسولؐ اللہ نے یمن میں جند کا قاضی بنا کر حضرت معاذ کو بھیجا تاکہ وہ قضا کے ساتھ ساتھ لوگوں کو قرآن اور شرائع اسلام کی تعلیم دیں۔ (۳۵۷) نجران پر عمرو بن حزم کو عامل بنایا اور ان کا کام بتایا گیا کہ "لوگوں کو فقہ کی تعلیم دیں، قرآن سکھائیں اور ان سے صدقات وصول کریں۔" (۳۵۸) اس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم دین کے لئے کوششیں اور انتظامات رسولؐ اللہ نے بالکل سرکاری پیمانے پر کئے۔ نیز تعلیم دین کو تربیت یافتہ معلمین کے علاوہ صوبہ کے گورنروں کے فرائض منصبی کا حصہ بنایا۔ اور یہ انتظامات صرف یمن یا ملک کے کسی ایک حصہ کے لئے مخصوص نہ تھے بلکہ تمام حدود مملکت میں اس قسم کا اہتمام کیا گیا تھا۔ چنانچہ عتاب بن اسید کو مکہ پر عامل بنایا تو ان کے ساتھ معاذ بن جبل کو بھی مقرر کیا تاکہ وہ لوگوں کو دین کی تعلیم دیں اور قرآن سکھائیں۔ (۳۵۹) علاوہ ازیں جہاں ضروری سمجھا انفرادی طور پر بھی معلمین کا تقرر فرمایا (۳۶۰) بلکہ رسولؐ اللہ کی تعلیمی سیاست میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی اہمیت دی گئی چنانچہ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ عہد نبوی میں نہ صرف معلمین بلکہ معلمات بھی اشاعتِ تعلیم میں حصہ لیتی تھیں۔ (۳۶۱)

ڈاکٹر حمید اللہ کے بیان کے مطابق "صوبائی درس گاہوں کا معیار بلند کرنے کے لئے رسولؐ اللہ نے صوبہ یمن میں ایک صدر ناظر تعلیمات بھی مقرر کیا تھا جس کا کام یہ تھا کہ مختلف اضلاع و تعلقات میں ہمیشہ دورہ کرتا رہے اور وہاں کی تعلیم اور تعلیم گاہوں کی نگرانی کرے۔ کوئی تعجب نہیں کہ اور صوبہ جات میں بھی اسی طرح کے افسر مامور کئے گئے ہوں۔" (۳۶۲)

مختصر یہ کہ اشاعتِ اسلام اور تبلیغِ دین رسولؐ اللہ کا فرض منصبی بھی تھا اور آپ دینی سربراہ اور سیاسی قائد ہونے کی حیثیت سے جس طرح اشاعتِ اسلام کے ذمہ دار تھے اسی طرح ائمہ اور مؤذنین کا تقرر، ارکانِ اسلام نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا انتظام اور نگہداشت بھی آپ کے ذمہ تھی۔ چنانچہ یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ نماز کے سلسلے میں مساجد کی تعمیر، زکوٰۃ کے ضمن میں مصلین کا تقرر سنہ ۹ھ میں بسلسلہ حج ایک امیر الحاج کا تقرر اور احکام برآت کا اعلان[۳۶۳] بھی آپ ہی کے حکم سے عمل میں آیا تھا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تمام سرگرمیاں جیسا کہ ہم صیغہ احتساب میں بیان کر چکے ہیں براہِ راست رسولؐ اللہ کی نگرانی میں جاری و ساری تھیں۔

صُوبائی نظام

مرکزی نظامِ ریاست کا مطالعہ کرنے کے بعد صُوبائی نظام کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ رسولؐ اللہ ایک منظم و مرتب حکومت کے سربراہ تھے۔ مدینہ پوری ریاست کا صدر مقام تھا اور اس کا نیز اس سے ملحق علاقوں کا انتظام و انصرام براہِ راست رسولؐ اللہ کے سپرد تھا۔ تاہم انتظامِ حکومت کو بہتر طور پر چلانے کے لئے آپ نے پُوری ریاست کو مختلف حصّوں یا صوبوں میں منقسم کر دیا تھا اور ہر علاقہ پر ایک گورنر مقرر کیا تھا۔ یہ امر بالکل بدیہی ہے کہ چونکہ ریاست کی نشوونما بتدریج مکمل ہُوئی اس لئے صوبوں کی تشکیل اور انتظامیہ میں بھی حالات و ضروریات کے لحاظ سے تبدیلی کی گئی۔ اس کی واضح ترین مثال یہ ہے کہ یمن کا جو صوبہ ریاست نبوی کے قیام سے پہلے چلا آ رہا تھا۔ رسولؐ اللہ نے اسے حسبِ سابق ایک صوبہ رہنے دیا اور اس پر باذان بن ساسان کو والی متعین کیا[۳۶۴] جبکہ باذان کے انتقال کے بعد رسولؐ اللہ نے اس کے لڑکے شہر کو والی بنایا لیکن اس کی ولایت کو صنعاً اور اس کے مضافات تک محدود کر دیا[۳۶۵] اور پھر شہر بن باذان کے قتل کے بعد آپ نے خالد بن سعید بن ابی العاص کو صرف صنعاً کی حد تک والی بنایا۔[۳۶۶] مزید برآں پُورے یمن کو پانچ حصّوں میں تقسیم کر کے ان پر علیحدہ علیحدہ والیوں کا تقرر کیا۔ بہرحال ہمارے اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ صوبائی نظم اور ہیئت دونوں میں وقتاً فوقتاً ضروری تغیرآت واقع ہوتے رہے۔ مجموعی طور پر عہد نبوی میں صوبائی تقسیم کافی وسیع نظر آتی ہے جس کی کچھ نہ کچھ تفصیل اگرچہ اوّلین ماخذ میں بھی ملتی ہے لیکن ابنِ حزم نے اپنی کتاب جوامع السیرۃ میں صوبوں اور ان کے والیوں کا ذکر اتنے سلیقے اور تفصیل سے کیا ہے کہ ہم اسی سے استفادہ کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

ابنِ حزم کی تصریح کے مطابق رسولؐ اللہ نے مدینہ کے علاوہ پُوری ریاست کو چودہ صوبوں میں تقسیم فرمایا تھا اور جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں یمن کو ایک کے بجائے پانچ صُوبوں میں بانٹ دیا یعنی صنعاً[۳۶۷]، کندہ و صدف[۳۶۸]، حضرموت[۳۶۹]، جند[۳۷۰] اور زبید و عدن و زمعہ و سواحل[۳۷۱] ان کے علاوہ دوسرے صُوبے یہ تھے، نجران[۳۷۲]، مکہ[۳۷۳]، تیما[۳۷۴]، وادی القریٰ[۳۷۵]، عرینہ یا فدک[۳۷۶] وغیرہ، بحرین[۳۷۷] و قطیف بحرین[۳۷۸]، عمان اور اس کے مضافات[۳۷۹] اور طائف[۳۸۰]۔

والیوں اور گورنروں کے تقرر میں رسولؐ اللہ کا معیار وہی تھا جس کا ذکر ہم صیغہ جات کی تمہید میں کر چکے ہیں۔ یعنی اس عہدے کے لئے بھی ان لوگوں کو نااہل سمجھا جاتا تھا جو اپنی خدمات خود پیش کرنا چاہتے تھے۔ رسولؐ اللہ کے نزدیک کسی بھی وال یا

حاکم کی اہلیت کی سب سے اہم شرط یہ تھی کہ وہ اسلام سے نہ صرف یہ کہ واقف ہو بلکہ اس کا عالم ہو اور دین و دنیا کے مسائل میں استادر ک اور ایسی بالغ نظری یا بصیرت رکھتا ہو کہ وقت ضرورت آزادانہ اجتہاد کر سکے۔ حضرت معاذ بن جبل کے مشہور واقعہ کا ہم پہلے حوالہ دے چکے ہیں کہ روانگی کے وقت رسولؐ اللہ نے ان سے مذکورہ باتوں کا امتحان لیا تھا۔[۳۴۱] حکام و ولاۃ دونوں کے لئے اس شرط کو پورا کرنا دو وجوہات سے ضروری تھا، ایک تو اس لئے کہ ریاست نبویؐ ایک نظریاتی اور دستوری ریاست تھی اور اس کے کلیدی مناصب پر لازماً ایسے ہی لوگوں کو فائز کیا جا سکتا تھا جو اس نظریۂ حیات پر یقین کامل رکھتے ہوں اور دوسری وجہ یہ تھی کہ حکام و ولاۃ منتظم صوبہ سے بڑھ کر اسلام کے داعی اور مبلغ تھے۔ اس لئے ان کے فرائض ولایت میں سے ایک اہم اور مقدس فریضہ اشاعت اسلام اور تعلیم دین تھا جیسا کہ ہم صیغہ تعلیم و تربیت کے تحت بیان کر چکے ہیں۔ تاہم اس کی مزید صراحت کی غرض سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسولؐ اللہ مذکورہ فریضہ کو اس تحریری دستاویز میں بھی مندرج کر دیتے تھے جو تقرر کے وقت والیوں کو ہدایت نامہ تقرر" (INSTRUMENT OF INSTRUCTIONS) کے طور پر دی جاتی تھی۔ ہماری اس بات کی وضاحت اور والیوں کے دیگر فرائض کو سمجھنے کے لئے عمرو بن حزم کے نام رسولؐ اللہ کے گرامی نامہ کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ بروایت طبری آپ کا یہ مکتوب بہت طویل ہے اس لئے پورا نقل کرنے کے بجائے ہم اس کے اہم نکات کا خلاصہ ذیل میں دے رہے ہیں۔ طبری کے بیان کے مطابق رسولؐ اللہ نے عمرو بن حزم کو پہلے تو تقویٰ اختیار کرنے کی ہدایت کی اور پھر یہ فرمایا کہ :

(۱) لوگوں کو خوشخبری سناؤ اور انہیں اچھائیاں اختیار کرنے اور برائیاں چھوڑنے کی ہدایت کرو۔

(۲) تمام امور میں عدل و انصاف سے کام لو۔

(۳) تنذیر اور تبشیر دونوں کی تلقین کرو۔

(۴) لوگوں کے دل موہ لینے کی کوشش کرو۔

(۵) شرائع اسلام کی تعلیم و خصوصاً حج اور عمرہ کے ارکان و آداب بتاؤ۔

(۶) نعرۂ عصبیت بلند کرنا ممنوع ہے۔

(۷) وضو کے مکمل اور صحیح طریقے کی تفصیل۔

(۸) نمازوں کو وقت پر ادا کرنے کی ہدایت اور اوقات کا مفصل بیان۔

(۹) مالِ غنیمت کا خمس، عشر اور نصف عشر کا نصاب، شرح اور وصولی کی وضاحت۔

(۱۰) ادائیگیِ صدقات کا حکم۔

(۱۱) اہلِ کتاب میں سے جو لوگ اسلام قبول کر لیں ان کے حقوق و فرائض عام مسلمانوں کے برابر ہوں گے لیکن جو اسلام نہ قبول کریں ان کے حقوق اس کے مطابق ہوں گے اور انہیں جزیہ ایک دینار فی کس کے حساب سے دینا ہوگا۔[۳۴۲]

کم و بیش اسی سے ملتا جلتا مضمون اس وصیت نامہ کا بھی ہے جو یمن کو روانہ کرتے وقت حضرت معاذ بن جبل کو دیا گیا تھا۔ اس میں رسولؐ اللہ نے یہ لکھا تھا کہ :

انک ستاتی قوما من اهل الکتاب فادعهم الی ان یشهدوا ان لا اله الا الله وان محمداً رسول الله فان هم اطاعوا لک بذلک فاخبرهم ان الله قد فرض علیکم خمس صلوٰت فی کل یوم ولیلة فان هم اطاعوا لک بذلک فاخبرهم ان الله قد فرض علیکم صدقة توخذ من اغنیائهم فترد علی فقرائهم فان هم اطاعوا لک بذلک فایاک و کرائم اموالهم واتق دعوة المظلوم فانه لیس بینه و بین الله حجاب۔(۳۸۳)

(تم اہلِ کتاب کے پاس جاؤ تو پہلے ان کو کلمۂ توحید کی دعوت دینا اگر وہ اس کو مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے امراء سے لے کر ان کے فقراء پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ اگر وہ اس کو بھی تسلیم کر لیں تو ان کے بہترین مال سے احتراز کرنا اور مظلوم کی بددعا سے بچنا کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا)

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں جہاں تک والی ریاست کے فرائض کا تعلق ہے تو وہ حسب ذیل تھے:

(۱) صوبہ میں قانون کی تنفیذ اور امن و امان کے قیام کی ذمہ داری۔

(۲) صوبہ کا عام انتظام۔

(۳) اشاعتِ اسلام اور فرائض و سنت کی تعلیم۔

(۴) مقدمات و نزاعات کا فیصلہ اور

(۵) تحصیل محاصل (خراج، جزیہ، صدقات وغیرہ)۔

ان فرائض میں سے آخری دو ذمہ داریاں بعض اوقات دوعلیحدہ افسروں کے سپرد کی جاتی تھیں یعنی عامل صدقات علیحدہ مقرر ہوتا اور قاضی علیحدہ، کبھی ایک ہی شخص کو تحصیل محاصل اور قضاء دونوں پر مامور کر دیا جاتا(۳۸۴) اور کبھی ولایت، قضاء اور تحصیل صدقات کے تمام مناصب ایک ہی شخص یعنی والی کو سونپ دیے جاتے تھے جس کا اندازہ عمرو بن حزم اور معاذ بن جبل دونوں کے نام مکتوب نبوی سے لگایا جا سکتا ہے۔ اور جس کی وضاحت ہم صیغہ ہائے تعلیم و تربیت کے تحت بھی کر چکے ہیں۔

ان فرائض کی بجا آوری پر ریاست کی جانب سے والیوں کو تنخواہ اور بقدر ضرورت معاوضہ بھی ادا کیا جاتا تھا(۳۸۵) اور اس کی شرح رسول اللہ نے خود مقرر فرمادی تھی، یعنی:

من کان لنا عاملاً فلیکتسب زوجة فان لم یکن له خادم فلیکتسب خادماً وان لم یکن له مسکن فلیکتسب مسکناً ومن اتخذ غیر ذلک فهو غال(۳۸۶)

(جو شخص ہمارا عامل ہو اس کو ایک بیوی کا خرچ لینا چاہیے اگر اس کے پاس نوکر نہ ہو تو نوکر کا اگر مکان نہ ہو تو مکان کا خرچ لینا چاہیے لیکن اگر کوئی اس سے زیادہ لے گا تو وہ خائن ہوگا)

ہر صوبہ میں گورنروں کا تقرر بھی رسول اللہ خود فرماتے تھے اور اگر ان کے بارے میں کسی قسم کی شکایتیں ملتی تھیں یا ایک

جگہ کے بجائے کسی دُوسری جگہ کا تقاضا شدید ہوتا تھا تو ایک والی کا تبادلہ دوسری جگہ کر دیا جاتا تھا۔ نیز اطمینان بخش کارکردگی نہ ہونے کی بنا پر معزول بھی فرما دیا کرتے تھے۔

بہر حال صوبہ کی امارت و ولایت کے سلسلے میں مندرجہ بالا پہلو ایسے ہیں جن کی بکثرت مثالیں ماضی و حال کے انتظام حکومت میں مل سکتی ہیں اور اس قسم کی لچک کا ہونا ایک صحت مند سیاسی نظام کے لئے بہت ضروری ہے۔ ہمارا جائزہ اس بات کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ رسولؐ اللہ نے گورنروں کے تقرر اور صوبائی نظام کی ترکیب و ترتیب دونوں میں گہرے سیاسی شعور و تجربہ اور بیدار مغزی کا ثبوت پیش کیا۔

حواشی

باب اوّل ۔ بعثت نبوی کے وقت دنیا کا سیاسی نظام

[۱] Bryce, James Viscount, The Holy Roman Empire, MacMillan & Co. ltd., London, 1950, p. XXXI.

[۲] بلنچلی ۔ جے ۔ کے ۔ نظریۂ سلطنت ۔ ترجمہ قاضی تلمذ حسین (مقابلہ کتاب اصل جرمن ۔ ڈاکٹر عبد الستار صدیقی) جامعہ عثمانیہ ۔ دکن ۱۹۲۹ء (ص ۳۸۰)۔ اغسطس ۲۷ سنہ ق م میں برسر اقتدار آیا (BRYCE, P. XIX) اس کی حکومت کے ۴۲ برس بعد حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے (ابن خلدون ۔ عبد الرحمٰن المغربی ۔ کتاب العبر و دیوان المبتدا و الخبر فی ایام العرب والعجم والبربر ومن عاصرہم من ذوی السلطان الاکبر ۔ بتصحیح نصر ابو الوفا الهورینی (بولاق) مصر ۱۲۸۴ھ ج ۲ ص ۱۹۸) اسی کے دور سے "رومی امن" کا آغاز ہوتا ہے (کرین برنٹن، جان بی کرسٹوفر، رابرٹ ایل ولف ۔ تاریخ تہذیب ۔ ترجمہ غلام رسول مہر ۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۵ء حصہ اوّل ص ۱۵)

[۳] بیوری ۔ جے ۔ بی ۔ تاریخ سلطنت روما ۔ ترجمہ ہاشمی فرید آبادی ۔ جامعہ عثمانیہ ۔ دکن ۱۹۲۹ء ۔ ص ۱۶۹ ۔

[۴] کرین برنٹن وغیرہ ۔ ص ۱۴۲ ۔

[۵] Webster's Biographical Dictionary. G. & C. Marrian Co., U.S.A.

[۶] بلنچلی ۔ ص ۳۰۰ ۔ [۷] بیوری ۔ ص ۸۵۷ تا ۸۵۸ ۔

[۸] کرین برنٹن وغیرہ ۔ ص ۱۵ ۔ [۹] BRYCE, P. XX.

[۱۰] LBID., P. XXXI قسطنطنیہ کی بنیاد (۳۲۶ء تا ۳۲۸ء میں) پڑی ۔ پہلے یہ شہر بزنطیم کہلاتا تھا لیکن قسطنطین نے اسے از سرِ نو آباد کرکے اپنے نام پر قسطنطنیہ سے موسوم کیا (ابن خلدون ج ۲ ص ۲۱۰)

[۱۱] ایضاً ج ۲ ص ۲۱۰ [۱۲] اور دیکھیے: Bryce, p.XXXI

Gibbon, Edward, The Decline and Fall of the Roman Empire, The Modern Library, New York, Vol.I, p.634.

[۱۳] ڈننگ لکھتا ہے: "فلسفۂ سیاسیہ کے نقطۂ نظر سے ازمنۂ وسطیٰ کا خاص الخاص واقعہ یہ ہے کہ تمام رومی شہنشاہی بلکہ اس کی حدود کے باہر بھی مذہب عیسوی قائم ہوگیا اور مسیحی کلیسا کو ترقی ہوئی۔" (ڈننگ ۔ ولیم آرچ بالڈ ۔ نظریاتِ سیاسیہ ۔ (ازمنۂ قدیم و قرونِ وسطیٰ) ترجمہ قاضی تلمذ حسین ۔ جامعہ عثمانیہ ۔ دکن ۱۹۴۴ء ج ۱ ص ۱۳۳)

[۱۴] BRYCE, P. XXXI. [۱۵] IBID. نیز دیکھیے GIBBON, VOL.1, P. 1027.

[۱۶] BRYCE, P. XXXI. [۱۷] Ebenstein, William, Great Political Thinkers (Plato to the Present), Holt Rinehart & Winston, Inc., New York, 1969, p. 171.

[۱۸] جسٹینین کا دور شہنشاہی ۵۲۷ء میں شروع ہوتا ہے اور ۵۶۵ء میں ختم ہو جاتا ہے (WEBSTERS, P. 1684) سانٹا صوفیہ کی تعمیر اسی کے عہد میں ہوئی (کرین برنٹن وغیرہ ص ۱۵) اور رومی قوانین کی ترتیب نو (۵۲۹ء۔ ۵۳۴ء) بھی اسی کے زمانہ میں ہوئی۔ (BRYCE, P. XXXIII)

[۱۹] تھیچر، آلیور، اور شول فرڈینڈ۔ تاریخ یورپ۔ ترجمہ عبدالماجد، نواب حیدر یار جنگ، قاضی تلمذ حسین۔ جامعہ عثمانیہ۔ دکن ۱۹۳۲ء حصہ اول ص ۴۲۵۔ [۲۰] ڈننگ ص ۱۳۳۔

[۲۱] GIBBON, VOL.II, P.752.

[۲۲] بلنچلی۔ حکمران کے اختیار و اقتدار کے لیے: ص ۳۸۳ تا ۳۸۵، ۳۸۸، ۳۸۹ اور ۳۹۰۔

[۲۳] ایضاً ص ۳۸۵۔ [۲۴] ایضاً ص ۳۸۶۔

[۲۵] Briffault. Robert, The Making of Humanity, Allen & Unwin Ltd., London, 1928, p. 159.

[۲۶] بلنچلی ص ۳۸۹ [۲۷] ایضاً ص ۴۰۔

[۲۸] ایضاً ص ۴۱۔ [۲۹] ایضاً ص ۳۴۹۔

[۳۰] Lawrence C. Wanlass, Gettell's History of Political Thought, Allen & Unwin, Ltd., London, 1961, p. 94.

[۳۱] ایضاً [۳۲]۔ ڈننگ ص ۱۳۹ [۳۳] ایضاً ص ۱۴۱ [۳۴]۔ ایضاً ص ۲۸۷-۲۸۸

[۳۵] ٹیوٹن جرمن نسل وہ تھی جس نے روم کی شہنشاہی کو شکست دے کر شاہی اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں ہر جگہ ٹیوٹن حکمران تھے۔ کلیسا کا مذہبی تصور اور رومی تہذیب دونوں ان میں جمع تھیں۔ اس کے بعد جدید دور (پندرھویں صدی کے نصف آخر سے) شروع ہوتا ہے۔ بلنچلی ص ۲۶۹۔

[۳۶] تفصیل کے لیے: LAWRENCE, PP. 105, 106 [۳۷] ایضاً ص ۹۳

[۳۸] ایضاً ص ۱۰۷ [۳۹] ایضاً ص ۱۰۷ [۴۰] ڈننگ لکھتا ہے کہ:

"زمانۂ وسطیٰ غیر سیاسی زمانہ تھا" (ج ۱ ص ۱۳۳) اور سبائن رقمطراز ہے کہ:

"سیاسی اور علمی دونوں اعتبار سے مغربی یورپ جس کا مرکز بحیرۂ متوسط تھا پوری دنیا میں تگ و تاز کرنے کے بجائے محض اپنے ہی حدود میں محدود ہو گیا تھا۔" اور پھر لکھتا ہے کہ:

"چھٹی سے نویں صدی عیسوی تک یورپ کی حالت ایسی تھی کہ جہاں فلسفیانہ و مذہبی سرگرمیوں کی زیادہ گنجائش نہ تھی۔"

Sabine, George, H. A History of Political Theory, G.G. Harrap & Co., Ltd., London, 1966, p. 198, 199.

LAWRENCE, P. 107. [۴۱]

[۴۲] مشہور امریکی مستشرق ایس پی اسکاٹ نے ایک جگہ لکھا ہے، "حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مولودِ مسعود سے ایک صدی پیشتر سخت ترین افسوسناک جہالت نے دُنیائے مسیحی کے منہ کو کالا کر رکھا تھا۔" (اسکاٹ۔ ایس، پی، تاریخ اندلس۔ ترجمہ محمد خلیل الرحمٰن۔ مطبوعہ لاہور۔ ص ۶۴) آگے لکھتا ہے:

"تمام ملک تباہی کامل کی تصویر تھا۔ عوام الناس کے قوائے عقلی و دماغی اور جذبات بلند نظری کو دبائے رکھنا سلطنت کا ایک قاعدہ مستمرہ تھا (ایضاً ص ۷۰)۔ بدقسمتی تو یہ ہے کہ اس زمانے میں صرف یہی خرابیاں نہیں تھیں، علم کے خلاف ایک باقاعدہ سازش ہو رہی تھی۔ اس کا اثر ان مقامات پر زیادہ تھا کہ جہاں تعلیم کی سخت ضرورت تھی خواہ نامکمل اور ناقص ہی سہی، اگر تعلیم ہوتی تو کم از کم آثارِ قدیمہ کی قدر و قیمت کو تو سمجھتے اور ان کو باقی رکھنے کی فکر تو کرتے۔" (ایضاً ص ۷۲، اور ملاحظہ ہو ص ۱۱۱) [۴۳] ایضاً ص ۱۱۱۔

فارس میں شہنشاہیت کا دور (از کیومرث تا یزدجرد) بقول ابنِ خلدون تقریباً چار ہزار دو سو اٹھاسی سال کی مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ جیسا کہ ابنِ سعید نے کتاب "تاریخ الامم" تصنیف علی بن حمزہ اصفہانی سے نقل کیا ہے (ابن خلدون ج ۲ ص ۱۵۴)

کیومرث در اصل دُوسرے افسانوی دور کا پہلا آدمی ہے جس نے نئے شاہی خاندان (پیشداریہ) کی بنیاد رکھی۔ طہمورث، جمشید، فریدون، منوچہر وغیرہ اس کے بعد آتے ہیں۔ گرشاسپ اس دور (پیشداریہ) کا آخری حکمران تھا۔ تیسرا افسانوی دور (کیانیہ) کے ممتاز حکمران کیقباد، کیخسرو وغیرہ ہیں۔

[۴۴] طبری کا بیان ہے کہ:

"لہراسب کے زمانہ میں ملوک روم، ملوک مغرب، ملوک ہند وغیرہ شاہانہ فارس کو سالانہ خراج و وظائف ادا کرتے تھے اور لہراسب کی عظمت و جلالت اور ہیبت و تعظیم کا اظہار "ملک الملوک" (شاہوں کے شاہ) کے الفاظ سے کیا کرتے تھے۔" (طبری۔ ابو جعفر محمد ابن جریر۔ تاریخ الرسل والملوک۔ تحقیق۔ محمد ابو الفضل ابراہیم۔ دار المعارف۔ مصر۔ ۱۹۶۰ء۔ ج ۱ ص ۵۴۱)

[۴۵] سکندر کے حملے کے بعد تقریباً دو سو چھیاسٹھ سال تک اشکانی (اشغانی) ملوک الطوائف نے فارس پر حکومت کی۔ ان اشکانیوں کے زمانہ میں ہی حضرت عیسیٰؑ نے ارضِ فلسطین میں خدا کی بادشاہت کا اعلان کیا۔ انہوں

اور ملوک الطوائف کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:
الدینوری - ابو حنیفہ احمد بن داؤد - الاخبار الطوال - دار احیاء الکتب العربیہ - قاہرہ ۱۹۶۰ء ص ۴۸ تا ۶۱) نیز طبری (ج ۱ ص ۵۸۰ تا ۵۸۴) اور المسعودی - ابی الحسن علی بن الحسین بن علی - مروج الذہب و معادن الجوہر - مطبعۃ السعادۃ - مصر - ۱۹۵۸ء (ج ۱ ص ۲۳۴ و مابعد) وغیرہ۔

[۴۶] مثلاً سابور ذوالاکتاف کی عرب پر فوج کشی (ابن خلدون ج ۲ ص ۱۷۲) اور بلادِ روم پر حملہ (ایضاً ص ۱۷۳) یا اسی طرح نوشیرواں بن قباد (جس کے عہدِ حکومت میں پیغمبرِ اسلام کی ولادت ہوئی) نے رومیوں پر چڑھائی کی، حلب، قبرص، حمص، انطاکیہ اور اسکندریہ کو فتح کیا۔ ملوک قبط پر خراج قائم کیا، رومی، چینی، تبتی بادشاہوں نے بطور نذرانہ تحائف بھیجے، سراندیپ پر فوج کشی، حیرہ پر قبضہ اور یمن میں مسروق (شاہِ حبشہ) کو قتل کرا کے ابن ذی یزن کو حکمران بنایا (ایضاً ص ۱۷۷) پرویز نے بھی رومیوں سے جنگ کی (الدینوری ص ۱۰۶، ۱۰۷) - عربوں سے لڑائیاں (ایضاً ص ۱۱۱، ۱۱۲) [۴۷] ان میں سے یہ چار ادوار یا طبقات مشہور رہیں:

۱- پیشدادیہ ۲- کیانیہ ۳- اشکانیہ اور ۴- ساسانیہ۔

ان طبقات کی تفصیل بادشاہوں کے نام اور اہم واقعات کی تصریح اگرچہ اکثر مورخین نے کی ہے مثلاً طبری (ج ۱ ص ۵۴۰ و مابعد)، مسعودی (ج ۱ ص ۲۲۰ تا ۲۸۱)، ابنِ اثیر (عز الدین ابی الحسن علی - الکامل فی التاریخ دار صادر للطباعۃ والنشر - بیروت ۱۹۶۵ء ج ۱ ص ۲۰۷ تا ۵۰۱) وغیرہ لیکن اس سلسلے میں واضح ترین بیان ابنِ خلدون (ج ۲ ص ۱۵۴ تا ۱۸۲) کا ہے۔

[۴۸] اس میں سابور (شاپور) اوّل (مدّتِ حکومت ۳۱ سال - طبری ج ۲ ص ۴۴)، سابور ذوالاکتاف (۷۲ سال - طبری ج ۲ ص ۶۱)، فیروز بن یزدگرد (۲۶ سال - ایضاً ص ۸۸)، قباد بن فیروز (۴۵ سال - الدینوری ص ۵۹ تا ۶۱)، نوشیرواں (۴۲ سال یا ۴۵ سال - طبری ج ۲ ص ۱۰۳) اور ساسانیوں کے آخری حوصلہ مند حکمران خسرو پرویز بن ہرمز (۳۲ سال - ایضاً ص ۲۱۸) کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

[۴۹] ندوی - ابوالحسن علی - انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر - مکتبۂ اسلام - لکھنؤ (مقدمہ ۱۳۷۳ھ) ص ۵۰ - [۵۰] ایضاً ص ۵۰، ۵۱۔

[۵۱] سابور ذوالاکتاف جس نے ایک عرصے تک حکمرانی کی - جب تخت پر بیٹھا تو شیر خوار ہی تھا - دیکھیے: ابن خلدون (ج ۲ - ص ۱۷۲)، اسی طرح اردشیر بن شیرویہ بمشکل سات سال کا تھا کہ اسے شہنشاہ بنا لیا گیا۔
(طبری ج ۲ ص ۲۳۰)

[۵۲] کسریٰ پرویز کی دونوں لڑکیوں یعنی بوران (طبری ج ۲ ص ۲۳۱) اور آزرمیدخت (ایضاً ص ۲۳۲) کو تختِ حکومت پر جلوہ افروز کیا گیا۔

[۵۳] غلام سرور۔ ڈاکٹر۔ تاریخ ایرانِ قدیم۔ مکتبہ خورشید جہاں۔ کراچی۔ ۱۹۶۵ء ج ۱ ص ۱۴۶۔

[۵۴] ایضاً ص ۱۴۷، ۱۴۸۔ [۵۵] طبری ج ۲ ص ۲۳۰ [۵۶] مسعودی ج ۱ ص ۲۸۰

[۵۷] طبری ص ۲۳۱ [۵۸] ایضاً ص ۲۳۲ [۵۹] ایضاً ص ۲۳۲ [۶۰] ایضاً ص ۲۳۲

[۶۱] ایضاً ص ۲۳۲
ابنِ اثیر نے بھی طبری کی تائید میں آزرمیدخت کے جانشین کی حیثیت سے کسریٰ بن مہر جشنس کا ذکر کیا ہے (ج ۱ ص ۵۰۰) لیکن ابن خلدون نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا اور آزرمیدخت کے بعد فرخ زاد کا نام رکھا ہے (ج ۱ ص ۱۸۲) [۶۲] طبری ج ۲ ص ۲۳۳۔ ابن اثیر اور ابنِ خلدون دونوں نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

[۶۳] طبری ج ۲ ص ۲۳۴۔

[۶۴] یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ آخری بادشاہ یزدگرد سے پہلے ابنِ خلدون نے ایک اور حکمران حض جارہ کا بھی ذکر (ج ۲ ص ۱۸۲) کیا ہے جو ۶ ماہ بعد قتل ہوگیا لیکن دوسرے مآخذ میں عام طور پر اس کا نام نہیں ملتا۔

[۶۵] یہ طبری کا بیان ہے (ج ۲ ص ۲۳۴) ابن اثیر مدت صرف ۲ سال لکھتا ہے (ج ۱ ص ۵۰۱)۔

[۶۶] ولو یکن من بیت الملك (ابن اثیر ج ۱ ص ۴۹۹)۔

[۶۷] ابن ہشام۔ السیرۃ النبویہ (تحقیق و شرح وغیرہ مصطفیٰ السقا۔ ابراہیم الابیاری، عبدالحفیظ شبلی، مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی و اولادہ۔ مصر ۱۹۳۶ء ج ۱ ص ۶۴، ۶۵)۔ اس واقعہ کا تذکرہ کم و بیش تمام مورخین نے صراحت سے کیا ہے۔ مثلاً طبری (ج ۲ ص ۱۳۹ و ما بعد)، مسعودی (ج ۱ ص ۶۰) وغیرہ۔ اہلِ دربار (عظمائے فارس یا شاہی مجلس مشاورت) نے یہ مشورہ دیا تھا کہ "ان فی سجونك رجالاً قد حسبتم للقتل (ابنِ ہشام ج ۱ ص ۶۵)۔

[۶۸] ایضاً ج ۱ ص ۶۵، ۶۶۔ [۶۹] طبری ج ۲ ص ۲۳۰ [۷۰] ندوی۔ ابوالحسن علی۔ ص ۸۵

[۷۱] طبری ج ۲ ص ۱۰۳ (یعنی از ۵۳۱ء تا ۵۷۹ء) مدتِ حکومت کے بارے میں جزوی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً طبری نے ہی ۴۲ سال کی مدت بھی دی ہے۔ اسی طرح ابنِ اثیر نے ۴۴ یا ۴۸ سال لکھے (ج ۱ ص ۴۳۹)۔

[۷۲] طبری ج ۲ ص ۱۷۶۔ دینوری نے نہ معلوم کس طرح اس کی مدت فرمانروائی ۱۹ سال لکھ دی ہے جو صحیح نہیں ہے۔

[۷۳] طبری ج ۲ ص ۲۱۸۔

[۷۴] یہاں یہ وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ زوال و انحطاط کی تیز رفتاری اور حکمرانوں کے عزل و نصب کا جو عالم فارس میں رہا ہے اسی طرح کم و بیش روم میں بھی رہا ہے۔ بلکہ روم میں معاملہ دو طرفہ ہے۔ یعنی حکمرانوں کا انتشار و زوال علیحدہ اور بطارقہ یا مذہبی و کلیسائی قواد (پاپائے روم) کا علیحدہ مثلاً سلاطین کی فہرست دیکھیے۔ جسٹین دوم (۵۶۵ء تا ۵۷۸ء) ٹائبرس دوم (۵۷۸ء تا ۵۸۲ء)، مارس (MAURICE - ۵۸۲ تا ۶۰۲ء)، فوکس (PHOCAS - ۶۰۲ء تا ۶۱۰ء) اور عہدِ نبوی کا آخری معاصر۔ ہرقل (HERACLUIS - ۶۱۰ء تا ۶۴۱ء) دوسری طرف

پاپائے روم کا سلسلہ ملاحظہ کیجئے (جان سوم ۔ ۵۶۰ء) گریگری اعظم (۵۹۰ء) بینین (۶۰۴ء) بونیفس سوم (۶۰۴ء) بونیفس چہارم (۶۰۷ء) ڈیتسڈیڈٹ (۶۱۵ء) بونیفس پنجم (۶۱۸ء) ہونوریس اوّل (۶۲۵ء) تفصیل کے لیے: BRYCE, P. XXII, XXIII. [۷۵] طبری ۲ ص ۱۵۴۔

[۷۶] طبری نے لکھا ہے کہ ہجرتِ نبویؐ کے وقت پرویز کی حکومت کو ۳۲ سال ۵ ماہ اور ۱۵ دن ہو چکے تھے (ج ۲ ص ۲۱۸)

[۷۷] طبری ج ۲ ص ۱۹۳۔ [۷۸] ایضاً

[۷۹] ھذا اوّل یوم انتصف العرب من العجم و بی نصروا (ایضاً)

[۸۰] سلطنت فارس کا خاتمہ ۶۵۲ء میں ہوا۔

[۸۱] سلیمان ندوی ۔ سید ۔ سیرۃ النبیؐ ۔ مطبع معارف اعظم گڑھ ۔ ۱۹۵۱ء ۔ ج ۴ ص ۲۱۳۔

[۸۲] ندوی ۔ ابوالحسن علی ۔ ص ۴۸ ۔ [۸۳] ایضاً ص ۴۹۔

[۸۴] Luigi Parati, History of Mankind (Cultural & Scientific Development), Tr. G.E.F. Chiloq and Sylina Chilver, London, 1965, Vol.II, p. 160.

[۸۵] ایضاً (واضح رہے کہ راجہ بالعموم اپنے بڑے بیٹے کو نامزد کیا کرتا تھا) [۸۶] ایضاً ص ۱۶۰۔

[۸۷] ہیراچند اوجھا ۔ رائے بہادر مھوپا دھیائے گوری شنکر ۔ قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ۔ ترجمہ منشی پریم چند ۔ ہندوستانی اکیڈیمی ۔ الہ آباد ، ۱۹۳۱ء ص ۱۸۱۔ [۸۸] LUIGI PARATI, P. 164.

[۸۹] Mukerji, History of India, Calcutta, 25th (ed), p. 177.

[۹۰] Smith, V.A., History of India, Oxford, 1957, p. 335.

[۹۱] ایضاً ص ۱۶۷۔

[۹۲] MUJAMDAR, R.C. ANCIENT INDIA, BANARAS, 1952, P. 260.

[۹۳] SMITH, P. 176. [۹۴] ہیراچند اوجھا ص ۱۹۳، ۱۹۴۔

[۹۵] BANERJEA, PRAMATHANATH, PUBLIC ADMINISTRATION IN ANCIENT INDIA, MACMILLAN & CO., LTD., LONDON, 1916, P. 61.

[۹۶] شودر، وہ بدقسمت طبقہ تھا جس کو قانونی طور پر اپنے سے تین بڑی ذات والوں کی خدمت کرنی پڑتی تھی۔ ان کی حیثیت شہری اور مذہبی قانون کی رُو سے جانوروں سے پست اور کتوں سے زیادہ ذلیل تھی (ندوی ۔ ابوالحسن علی ۔ ص ۶۴) مولانا سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

"شودروں کی قوم ایک ایسی غلامی میں مبتلا تھی کہ تعلیم و تربیت، تہذیب و اخلاق اور دین و ایمان سے محروم رہنا

اس کا فرض تھا۔ وید کی آواز بھی اس کے کان میں پڑ جائے تو اس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینے کا حکم تھا۔" (سلیمان ندوی۔ ج ۳ ص ۲۳۲، ۲۳۳)

[۹۷] سلیمان ندوی ج ۴ ص ۲۳۱ (بحوالہ آر۔سی۔ دت کی ہندوستان قدیم ص ۳۴۲، ۳۴۳)

[۹۸] (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: سلیمان ندوی (ج ۴ ص ۲۳۲) اور ندوی ابوالحسن علی (ص ۵۷) وغیرہ۔

[۹۹] ایضاً ص ۵۵۔ [۱۰۰] ہیرا چند اوجھا ص ۹۔

[۱۰۱] Benton William (ed), Encyclopaedia Britannica, Encyclopaedia Britannica Inc., Chicago, 1970, Vol.V, p.574.

[۱۰۲] چینی۔ بدر الدین، مولوی۔ چین و عرب کے تعلقات اور ان کے نتائج۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی ۱۹۴۹ء ص ۴۔

[۱۰۳] ایضاً ص ۴، ۵ [۱۰۴] ایضاً ص ۹ [۱۰۵] ایضاً ص ۱۱ [۱۰۶] ایضاً ص ۱۱۔

[۱۰۷] بینٹن (برٹانیکا) ص ۵۸۰ [۱۰۸] ایضاً [۱۰۹] ایضاً [۱۱۰] ایضاً [۱۱۱] ایضاً

[۱۱۲] چینی۔ ص ۱۲ [۱۱۳] ایضاً [۱۱۴] ندوی۔ ابوالحسن علی۔ ص ۷۶ [۱۱۵] ایضاً

[۱۱۶] حبشہ کے سلسلے میں تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سلیمان ندوی، سید۔ ارض القرآن، مطبع معارف اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۵ء۔ جلد اول ص ۳۰۳۔

[۱۱۷] تفصیلات کے لیے دیکھئے، ندوی، ریاست علی، سید۔ تاریخ اندلس۔ مطبع معارف اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۰ء۔ ص ۵۳ تا ۵۶۔ [۱۱۸] ابنِ خلدون۔ ج ۲۔ ص ۲۳۶ [۱۱۹] ندوی۔ ابوالحسن علی۔ ص ۷۳

[۱۲۰] ایضاً ص ۵۶ [۱۲۱] ایضاً ص ۴۴، ۴۵

[۱۲۲] اس مسئلہ پر اگرچہ اختلافات پائے جاتے ہیں لیکن سید سلیمان ندوی نے مختلف دلائل و براہین قائم کر کے اس کو مرجح قرار دیا ہے (سلیمان ندوی۔ ارض القرآن ج ۱ ص ۱۰۷ تا ۱۱۵) [۱۲۳] ایضاً ص ۱۱۶۔

[۱۲۴] ایضاً ص ۱۲۷۔ عاد کے سلسلے میں قرآن کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: الاعراف (۶۵ تا ۷۲)۔ الفجر (۷) حٰم السجدہ (۱۵)، ہود (۵۰ تا ۶۰)۔ الشعراء (۱۲۳ تا ۱۴۰)۔ العنکبوت (۳۸)؛ الاحقاف (۲۱ تا ۲۷)، الفرقان (۳۸) وغیرہ۔ اس قوم کی اصلاح کے لیے حضرت ہود کو پیغمبر بنا کر مبعوث کیا گیا تھا مگر اپنے غرور، قوت، ظلم و جور، پرستش باطل کی بنا پر قومِ عاد نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا جس کے نتیجے میں وہ تباہ و برباد ہو گئی۔

[۱۲۵] یعنی عاد، ثمود، جرہم، طسم، جدیس وغیرہ۔ [۱۲۶] سلیمان ندوی ج ۱ ص ۱۶۳ [۱۲۷] ایضاً ص ۱۲۹

[۱۲۸] ایضاً ص ۱۳۰ [۱۲۹] ایضاً ص ۱۳۰ [۱۳۰] ایضاً ص ۱۳۱ [۱۳۱] ایضاً ص ۱۳۲

[۱۳۲] ایضاً ص ۱۷۷ [۱۳۳] ایضاً ص ۱۸۵۔ اور قرآن میں ہے (الاعراف ۷۳)۔ [۱۳۴] ایضاً ص ۱۸۶۔

[۱۳۵] ایضاً ص ۱۸۶۔ قرآن میں ثمود کے بارے میں جو تفصیلات آئی ہیں ان کے لیے دیکھئے:

الفجر (۹)، الاعراف (۳، تا ۹۷)، الشعرأ (۱۴۱ تا ۱۵۹)، المومن (۳۰، ۳۱)، النمل (۴۵ تا ۵۳)، الحاقہ (۴، ۵)، النجم (۵۱)، القمر (۲۳)، الشمس (۱۱ تا ۱۵)، ہود (۶۱ تا ۶۸، ۹۵)، التوبہ (۷۰)، ابراہیم (۹)، الاسرأ (۵۹)، الحج (۴۲)، الفرقان (۳۸)، العنکبوت (۳۸)، صٓ (۱۳)، فصلت یا حٰم السجدہ (۱۳، ۱۷)، قٓ (۱۲)، الذاریات (۴۳ تا ۴۵)، البروج (۱۸)، الحجر (۸۰ تا ۸۴) وغیرہ۔

[۱۳۶] سلیمان ندوی ج ۱ ص ۱۸۷۔ [۱۳۷] الاعراف (۷۳)، النمل (۵۴)، [۱۳۸] سلیمان ندوی ج ۱ ص ۱۹۸

[۱۳۹] جوفِ یمن میں معین نامی ایک آبادی تھی اس کے مشرق میں حضرموت اور جنوب میں سبا (موجودہ صنعأ) واقع تھا اس کا وجود دوسری صدی ہجری تک باقی تھا۔ یہ شہر کسی زمانے میں حکومت کا مستقر تھا۔ عہدِ حکومت ۱۵۰۰ تا ۶۵۰ ق م تک رہا۔ معین کی حکومت یمن سے شروع ہو کر شام و مصر اور اشوربا (اسیربا) تک قائم تھی۔ (ایضاً ص ۲۰۴ تا ۲۰۵)

[۱۴۰] معین کے بعد سبا کا زمانہ آتا ہے۔ زمانۂ عروج غالباً ۱۱۰۰ ق م ہے۔ سبا کا اصلی مرکزِ حکومت جنوب عرب میں یمن کا مشرقی حصہ تھا۔ دار الحکومت شہر مآرب تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کا دائرہ مغرب میں حضرموت تک وسیع ہوگیا تھا۔ سبا کے جانشین حمیر بنے۔ سبا اور حضرت سلیمان (۹۵۰ ق م) کی معاصرت قرآن، اسفار یہود اور انجیل سے ثابت ہے۔ یمن کے علاوہ حبشہ اور شمالی عرب میں بھی سبا کی آبادیاں تھیں۔ ۱۱۵ ق م میں اس کے مقبوضات کا شیرازہ بکھر گیا۔ حبش پر اکسومی خاندان قبضہ کر بیٹھا، شمالی عرب میں اسماعیلی عربوں نے خروج کیا، یمن میں حمیر نے ظہور کیا اور بقیہ قبائلی تمام ممالک میں تتر بتر ہو گئے۔ (ایضاً ص ۲۳۳ تا ۲۰۶ ملخصاً)

[۱۴۱] حمیر یا سبا کا طبقہ ثالثہ رابعہ (قوم تبع و اصحاب الاخدود) کا آغاز پہلی صدی ق م سے اور اختتام ۵۲۵ء یعنی ذونواس کی موت پر ہوتا ہے۔ (ایضاً ص ۲۷۷)

[۱۴۲] Margolionth, D.S., The Relations Between Arabs and Israelites Prior tc the Rise of Islam, Oxford University Press, London, 1924, p. 24.

[۱۴۳] LBID, P. 25.

[۱۴۴] آل منذر یا ملوک حیرہ کی تعداد ان کی ترتیب، مدتِ حکومت اور بعض دوسری تفصیلات میں مورخین کے یہاں کافی اختلاف پائے جاتے ہیں۔ دیکھئے: طبری (ج ۲ ص ۱۰۴ تا ۱۴۴)، مسعودی (ص ۹۰ تا ۱۰۲، ج ۱)، ابنِ اثیر (ج ۱ ص ۳۸۴ تا ۴۹۵) ابنِ خلدون (ج ۲ ص ۲۵۹ تا ۲۷۱)، جرجی زیدان۔ العرب قبل الاسلام۔ دار الهلال۔ مصر (ص ۲۲۰ تا ۲۳۹)۔

[۱۴۵] طبری (ج ۲ ص ۱۰۴)، ابنِ اثیر (ج ۱ ص ۳۹۴) اور ابنِ خلدون (ج ۲ ص ۲۶۵)۔

[۱۴۶] ابنِ خلدون (ج ۲ ص ۲۶۵) [۱۴۷] ایضاً ص ۲۷۰۔

[۱۴۸] ایاس ۹ سال تک نعمان کے بجائے حیرہ کا حاکم رہا۔ ایرانی مرزبان ہمرجان (یا نخیرجان۔ طبری ج ۲ ص ۲۱۳)

اس کے ساتھ حکومت میں شریک تھا۔ اس کے عہد ولایت کے آٹھویں سال (آلوسی نے نامعلوم کن مآخذ کی بنا پر ایاس کی کل مدتِ حکومت ۸ ماہ لکھی ہے۔ آلوسی ۔ محمود شکری ۔ بلوغ الارب فی احوال العرب ۔ مطبعۃ دارالسلام بغداد ۔ ۱۳۱۴ھ ۔ ج ۲ ص ۱۹۱) ۔ رسول اللہؐ کی ہجرت ہوئی ۔ اس کے بعد حیرہ کی ولایت زادویہ بن ماہان (طبری نے نام آرازدیہ بن ماہان ج ۲ ص ۲۱۳ لکھا ہے) کے پاس آئی وہ حیرہ کا آخری مرزبان ثابت ہوا ۔ اس نے کسریٰ کی بیٹی بوران کے عہدِ حکومت تک، ۱ سال حکومت کی (ابن خلدون ج ۲ ص ۲۶۸)

[۱۴۹] زادویہ (یا زادیہ ۶۱۴ء تا ۶۲۵ء) کے بعد المنذر بن النعمان المغرور پھر حکمران (۶۲۸ء تا ۶۳۲ء) ہوا اور یہی آخری ملوک حیرہ تھا ۔ بحرین میں قتل ہوا ۔ (جرجی زیدان ص ۲۳۶) [۱۵۰] ابن خلدون ص ۲۷۱ ج ۲

[۱۵۱] ۔ ابن خلدون ج ۲ ص ۲۶۹ [۱۵۲] ایضاً ص ۲۸۰

[۱۵۳] جرجی زیدان ص ۲۰۸ ۔ بروایت حمزہ الاصفہانی ۔ لیکن علامہ سید سلیمان ندوی نے اس روایت کی تردید (ارض القرآن ج ۲ ص ۸۰) کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ قطعاً غلط ہے ۔ کیونکہ یہ قطعی طور سے معلوم ہے کہ انباط کی حکومت رومیوں کے زیر اقتدار ۱۰۶ء تک باقی تھی نیز بطلیموس کے عہد تک یعنی دوسری صدی عیسوی تک آل غسان تہامہ میں موجود تھے ۔ اس لیے بطور نتیجہ وہ لکھتے ہیں کہ ان کا زمانہ ۲۰۰ء تقریباً سے ۶۳۶ء (جبلہ بن ایہم) تک یعنی کوئی چار سو سال کا ہے ۔ (دلائل کے لیے دیکھیے ص ۸۱، ۸۲) آلِ غسان کے بادشاہوں کی تعداد میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں ۔ مثلاً حمزہ نے تعداد ۳۲ بیان کی ہے (جبکہ اس میں عموماً بعض معاصر حکمران غسانی شہزادوں کو بھی شمار کر لیا گیا ہے) مسعودی نے تعداد ۱۹ (مروج، ج ۲ ص ۱۰۷) اور ابن قتیبہ نے ملوک الشام کے تحت صرف چند کا تذکرہ کیا ہے (ابن قتیبہ الدینوری ۔ المعارف ۔ المکتبہ الحسینیہ ۔ مصر ۱۹۳۴ء ص ۲۷۸ تا ۲۸۱) لیکن بقول سلیمان ندوی چار سو برس کی مدت کے لیے یہ تعداد کم ہے (سلیمان ندوی ج ۲ ص ۸۱) نولدیکی نے بھی تعداد ۱۰ بتائی ہے (جرجی زیدان ص ۲۰۹) ۔

[۱۵۴] جرجی زیدان (ص ۲۰۷) یہ حوران میں تھا ۔ عرب و شام کے درمیان جو حدود ہیں ان کو حوران کہتے ہیں اور ان ہی کا نام اذرعات بھی ہے ۔ یہ قدیم زمانہ میں موآب عمان اور ادوم سے متعلق تھا ۔ اور اس عہد سے پہلے یہاں انباط کی حکومت تھی ۔ تدمر، رقیم، عمان، معان وغیرہ شہر اس میں آباد تھے اور مشہور ترین شہر بصریٰ تھا (سلیمان ندوی ج ۲ ص ۸۱) [۱۵۵] ابن خلدون ج ۲ ص ۲۸۰ ۔

[۱۵۶] سلیمان ندوی (ج ۲ ص ۸۲) ۔ علامہ سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ۶۱۶ء تک رومیوں نے ایک ایک کر کے اپنا ملک واپس لے لیا ۔ حالانکہ یہ واقعہ ۶۲۳ء کا ہے جبکہ مسلمان بدر کی خوشیاں منا رہے تھے اور قرآن کی پیشگوئی کی صداقت ثابت ہو رہی تھی ۔

[۱۵۷] الروم (۱ تا ۴) ۔ ان آیات کی توضیح اور تشریح کے لیے ملاحظہ ہو : القرطبی ، الجامع الاحکام القرآن ج ۱۴

ص ۱ تا ۴ ۔ نیز آلوسی ۔ روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی ج ۲۱ ص ۱۶۔
[۱۵۸] ابن خلدون ج ۲ ص ۲۵۶ ۔ [۱۵۹] ایضاً ص ۲۸۱ [۱۶۰] ایضاً ص ۲۸۲
[۱۶۱] ایضاً ص ۲۴۹ [۱۶۲] ایضاً ص ۲۵۳
[۱۶۳] بقول جرجی زیدان کندہ کی اصل اور ان کے وطن دونوں کے بارے میں مورخین کے بیانات مختلف ہیں (ص ۲۴۲)۔ ہم نے قول راجح کو اختیار کیا ہے اور زیادہ تر ابن خلدون کے بیان کو معتبر مانا ہے۔
[۱۶۴] ابن خلدون ج ۲ ص ۲۷۳ [۱۶۵] ایضاً ص ۲۵۲ [۱۶۶] ایضاً ص ۲۷۳
[۱۶۷] ایضاً ص ۲۵۲ [۱۶۸] ایضاً ص ۲۷۰ [۱۶۹] ایضاً ص ۲۴۴
[۱۷۰] ابن حزم کا قول ہے کہ علاؔ بن الحضرمی بھی حضر موت کی اولاد سے ہیں۔ رسول اللہؐ نے انھیں بحرین (جہاں غالباً پہلے اہل بحرین کی حکومت تھی۔ المحبر ص ۷۷) کا والی مقرر کیا تھا (ابن خلدون ص ۲۴۵)۔
[۱۷۱] دیکھیے: جرجی زیدان ص ۱۳۰ تا ۱۳۵۔ [۱۷۲] سلیمان ندوی ج ۱ ص ۲۷۷۔
[۱۷۳] ایضاً ص ۲۷۸ [۱۷۴] ایضاً ص ۲۷۹ [۱۷۵] ایضاً ص ۲۷۸
[۱۷۶] ایضاً ص ۲۸۵، ۲۸۶۔ [۱۷۷] ایضاً ص ۲۷۸ [۱۷۸] ایضاً ص ۲۷۹
[۱۷۹] ایضاً ص ۲۸۷۔ قرآن میں بھی قوم تُبّع کا دو مرتبہ ذکر کیا گیا ہے۔ دیکھئے، الدخان (۳۷)، ق (۱۴) اور دونوں جگہ ان کے زور و قوت اور جبروت و عظمت کی طرف ہی اشارہ موجود ہے۔
[۱۸۰] اس پر تقریباً تمام مورخین متفق ہیں۔ مثلاً ابن ہشام (ج ۱ ص ۲۲)۔ طبری (ج ۲ ص ۱۲۳)، مسعودی (ج ۲ ص ۶۷)، ابن اثیر (ج ۱ ص ۲۵۴ - ۴۳۱) وغیرہ۔
[۱۸۱] مارگولیتھ نے لکھا ہے کہ: "زیادہ تر روایات کی رُو سے صرف ذو نواس ہی اکیلا یہودی بادشاہ ہوا اور جب اس نے مذہب تبدیل کیا تھا تو اس نے اپنا نام یوسف (JOSEPH) رکھا جبکہ حبش مآخذ اور روایات سے اسے PHINEAS کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔" (MARGOLIOUTH, P. 65)
الدینوری نے لکھا ہے کہ اس کا نام ذو نواس اس لیے پڑا کہ اس کے ماتھے پر بالوں کی ایک لٹ لہراتی رہتی تھی۔ (ص ۶۱) [۱۸۲] ابن ہشام (ج ۱ ص ۳۷) اور طبری (ج ۲ ص ۱۲۳) وغیرہ۔
[۱۸۳] البروج (۴ تا ۶) [۱۸۴] ابن ہشام (ج ۱ ص ۳۸) [۱۸۵] ایضاً ص ۳۹
[۱۸۶] ایضاً ص ۴۳، ۴۴ [۱۸۷] الفیل (۱) [۱۸۸] ابن ہشام ج ۱ ص ۵۰
[۱۸۹] اگرچہ روایتی طور پر تاریخ ولادت ۵۶۹ء سے ۵۷۱ء تک بیان کی جاتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر حمید اللہ کی جدید تحقیقات کی روشنی میں آپ کی ولادت ۱۲ ربیع الاول ۵۳ ق ھ مطابق ۹ ستمبر ۵۶۹ء بروز پیر ہوئی۔ تفصیلات اور مباحث کے لیے دیکھیے:



مسجدِ نبویؐ کا اندرونی منظر اور گنبدِ روضۂ رسولؐ

Hamidullah, M., THE NASI, The Hijrah Calendar and the need of preparing a new concordance for the Hijrah and Gregorian Eras, Journal of the Pakistan Historical Society, Karachi, January 1968, Vol.XVI, p. 1 to 18.

[۱۹۰] ابن ہشام ج ۱ ص ۶۳ - نیز طبری ج ۲ ص ۱۳۳ -

[۱۹۱] ابن ہشام ج ۱ ص ۶۴، ۶۵ [۱۹۲] ایضاً ص ۶۶ تا ۷۰ [۱۹۳] ایضاً ص ۷۱

[۱۹۴] MARGOLIOUTH, P. 65. [۱۹۵] ابن ہشام ص ۷۱ [۱۹۶] ایضاً ص ۷۲

[۱۹۷] "ایک قلعہ ہوتا تھا۔ قلعہ کے آس پاس گاؤں کی صورت میں مختلف چھوٹی چھوٹی آبادیاں ہوتی تھیں۔ ان ہی کے مجموعہ کو "محفد" کہتے تھے۔ قلعہ داران کا حاکم ہوتا تھا۔ اس کا لقب اس کے قلعہ کے انتساب و اضافت سے رکھا جاتا تھا۔ مثلاً ذوغمدان، ذوثعلبان وغیرہ۔ ذو یمن زبان میں کلمۂ اضافت ہے اور اس کے معنی آقا کے ہوتے ہیں۔ ذو کی جمع اذواء (قلعہ داران) ہے۔ دُوسرے مرحلے میں یہ قلعے یا محافد مل کر ایک "مخلاف" کے تابع ہوتے تھے جس کو صوبہ کا ہم معنی سمجھنا چاہیے۔ حاکمِ مخلاف کا لقب "قیل" تھا۔ اس کی جمع اقیال ہے۔ یہ تمام اقیال ایک بادشاہ کے ماتحت ہوتے تھے۔ (سلیمان ندوی ج ۱ ص ۲۴۶ ملخصاً)

[۱۹۸] ملک یا بادشاہ کے علاوہ بعض دوسرے سیاسی عہدوں اور اداروں کا علم تاریخ عرب کے مطالعہ سے بخوبی ہو جاتا ہے مثلاً

(۱) رداف یا ردف (وہ شخص جو بادشاہ کے دائیں جانب بیٹھتا۔ جب بادشاہ کسی مہم پر جاتا تو ردف اس کی جگہ بیٹھتا اور بادشاہ کی واپسی تک اس کا جانشین ہوتا تھا اور جب بادشاہ کی فوج آجاتی تو ردف مالِ غنیمت کا چوتھائی حصہ لیتا تھا) دیکھیے: آلوسی ج ۲ ص ۱۹۹۔

(۲) قواد (حمیر کے اقیال اور رومیوں کے یہاں بطریق کا جو درجہ تھا وہی عربوں کے یہاں قواد کا تھا)۔ ایضاً ص ۱۹۰۔

(۳) عریف (قبیلے اور محلہ کا منتظم ہوتا تھا وہ تمام امور کا انتظام کرتا۔ اہم لوگوں کے حالات اسی سے دریافت کیے جاتے تھے) ایضاً ص ۱۹۹ - ۲۰۰۔

یہاں یہ وضاحت بھی نامناسب نہ ہوگی کہ اگرچہ وزارت کا عہدہ باقاعدہ طور پر عربوں کے یہاں رائج نہ تھا مگر عملاً کچھ لوگ وزیر کی حیثیت سے ہر ملک کے یہاں ہوتے تھے نیز اہلِ عرب "وزیر" کا واضح تصور رکھتے تھے مثلاً ملوک یمن میں سے ابوکرب تبع الاوسط کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا تھا چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ اشعار بھی مورخین نے نقل کیے ہیں (ایضاً ص ۱۰۵) اور یہ بعثت نبوی سے تقریباً ۷۰۰ سال قبل کا واقعہ ہے (ایضاً)

[۱۹۹] جرجی زیدان ص ۱۵۷ [۲۰۰] ایضاً ص ۱۵۷

[۲۰۱] ایضاً ص ۱۵۷ [۲۰۲] ایضاً ص ۱۵۸ [۲۰۳] ایضاً ص ۱۷۸ [۲۰۴] ایضاً ص ۱۸۱

[۲۰۵] حمیداللہ عہد نبویؐ میں نظامِ حکمرانی۔ مکتبہ ابراہیمیہ۔ دکن۔ طبع دوم۔ ج ۱ ص ۲۳۳۔

[۲۰۶] علامہ سلیمان ندوی نے اس کی نوعیت کے بارے میں لکھا ہے کہ "قصی نے مکہ میں جو چھوٹی سی ریاست قائم کی تھی اس کی حیثیت ایک شہری جمہوریت کی تھی۔ یونان کے شہر ایتھنز اور اسپارٹا کے طرزِ حکومت کا ایک دھندلا سا خاکہ قریش کی سرزمین میں نظر آتا ہے۔" (ارض القرآن ج ۲ ص ۱۰۴)

[۲۰۷]
Muir, Sir William, Life of Mahomet, London, 1861, Vol.I,p.cci

علامہ سلیمان ندوی نے مختلف دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ قصی کا زمانہ پانچویں صدی عیسوی کا عہد اوسط ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ارض القرآن (ج ۲ ص ۱۰۳، ۱۰۴)

[۲۰۸] ابن سعد۔ الطبقات الکبریٰ۔ دار صادر للطباعۃ والنشر۔ بیروت ۱۹۶۰ء۔ ج ۱ ص ۷۰۔

[۲۰۹] ان کی صحیح تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ تقریباً تمام مورخین نے پانچ کے بارے میں تو بالکل اتفاق کیا ہے کہ یہ ادارے اس کے زمانے میں موجود تھے یعنی حجابہ، سقایہ، رفادہ، ندوہ اور لواء (ابنِ ہشام ج ۱ ص ۱۳۱، ۱۳۲) جبکہ الازرقی نے ان میں "قیادہ" کا اضافہ کیا ہے (الازرقی۔ ابو الولید محمد بن عبد اللہ بن احمد۔ اخبار مکۃ وما جاء فیہا من الآثار۔ المطبعۃ الماجدیہ۔ مکہ۔ ۱۳۵۲ھ ج ۱ ص ۶۲) ابنِ سعد نے "حکومۃ" کو بھی شامل کیا ہے (ابنِ سعد ج ۱ ص ۷۰، ۷۱) اور ابن عبد ربہ نے مزید عمارہ، عقاب، سدانہ، مشورہ، اشناق، قبہ، اعنہ، سفارہ، ایسار اور اموال المحجرہ کے عہدے بتائے ہیں (ابن عبد ربہ۔ شہاب الدین احمد۔ العقد الفرید۔ مطبعۃ العامرہ۔ مصر۔ ۱۲۹۳ھ ج ۲ ص ۴۶) یہ پتا نہیں چلتا کہ فی الحقیقت ان میں سے کتنے عہدے خود قصی کے زمانہ میں قائم تھے۔ اور کتنے عہدوں کا اضافہ بعد میں ہوا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے مندرجہ بالا مناصب پر مزید چار (یعنی افاضہ، اجازہ، نسئی اور حلوان النفر) کا اضافہ تحریر کیا ہے مگر کسی سند کا ذکر نہیں کیا ہے (عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی ص ۲۳)۔ صرف افاضہ کی تفصیل ابن ہشام نے "ما کانت علیہ عدوان من افاضۃ المزدلفۃ" کے تحت دی ہے (ج ۱، ص ۱۲۷، ۱۲۸)۔ [۲۱۰] یہ فہرست ڈاکٹر حمید اللہ کے یہاں بھی (ص ۴۲) موجود ہے۔

[۲۱۱] ابنِ ہشام ج ۱ ص ۱۳۲۔ نیز دیکھیے: الازرقی (ج ۱ ص ۶۱)۔

[۲۱۲] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: ابنِ ہشام (ج ۱، ص ۱۳۱، ۱۳۲) ابنِ سعد (ج ۱ ص ۷۰، ۷۱) الازرقی (ج ۲ ص ۶۰، ۶۱)۔ نیز دیکھیے: آلوسی (ج ۱ ص ۲۵۰ تا ۲۶۶) وغیرہ۔

[۲۱۳] حمید اللہ (عہدِ نبویؐ میں نظام حکمرانی) ص ۴۲۔ [۲۱۴] ایضاً ص ۴۳۔

[۲۱۵] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابن عبد ربہ (ج ۲ ص ۴۵) اور آلوسی (ج ۱ ص ۲۶۶، ۲۶۷)

[۲۱۶] مثلاً ایک شرط کبر سنی تھی۔ مگر ابو جہل نوعمر تھا۔ عطا و بخشش کی صفت ضروری تھی مگر ابو سفیان اور عامر بن طفیل بخیل تھے۔ کلیب بن وائل اور حذیفہ بن بدر ظالم ہونے کے باوجود بالترتیب ربیعہ اور غطفان کے سردار تھے۔ عقلمندی بھی

ایک لازمۂ سیادت تھی مگر عُیینہ بن حسن احمق ہونے کے باوجود سردار تھا افرادِ قبیلہ کی کثرت تعداد بھی ایک صفت تھی مگر سبل بن معبد سردار تھا حالانکہ بصرہ میں اس کے قبیلے کے دو آدمی بھی نہ تھے اور عتبہ بن ربیعہ تنگدست ہونے کے باوجود سردار تھا۔ (ملاحظہ ہو: آلوسی ص ۲۰۲) [۲۱۷] ایضاً ص ۲۰۰، ۲۰۱ [۲۱۸] ایضاً ص ۲۰۱ -

[۲۱۹] MARGOLIOUTH, P. 26. [۲۲۰] LBID.

[۲۲۱] حمیداللہ (عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی) ص ۲۷ [۲۲۲] ایضاً ص ۳۹، ۴۰ -

[۲۲۳] اس سلسلے میں ہمیں متقدمین کے یہاں تفصیلات نہیں مل سکیں۔ لہٰذا ہم زیادہ تر آلوسی کے مرہونِ منت ہیں۔

[۲۲۴] حمیداللہ (عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی) ص ۴۱، ۴۲ [۲۲۵] آلوسی ج ۲ ص ۱۹۹، ۲۰۰ -

[۲۲۶] ایضاً ص ۲۰۰ [۲۲۷] ایضاً ج ۴ ص ۱۹ [۲۲۸] ایضاً ص ۱۴۹ تا ۱۰۲ (بمعہ فہرست خطباءُ)

[۲۲۹] ایضاً ص ۱۹۶ - لسابوں کی فہرست کے لیے: ص ۱۹۶ تا ۲۰۵ - [۲۳۰] ایضاً ج ۱ ص ۳۳۸ -

[۲۳۱] تفصیلات کے لیے: ایضاً ص ۳۳۸ تا ۳۶۱ [۲۳۲] ایضاً ص ۳۷۲ تا ۳۷۸ -

[۲۳۳] اسواق العرب پر تفصیلی بحث متقدمین میں سے ابنِ حبیب بغدادی نے اپنی کتاب المحبّر (ص ۲۶۳ تا ۲۶۸) میں اور جدید مصنفین میں سے سید سلیمان ندوی (ارض ۔ ج ۲ ص ۱۲۱ تا ۱۲۸) اور ڈاکٹر حمیداللہ نے (عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی ص ۲۳۶ تا ۲۴۵) کی ہے۔

[۲۳۴] سلیمان ندوی (ارض القرآن) ج ۲ ص ۱۲۳، ۱۲۴ [۲۳۵] ایضاً

[۲۳۶] مثلاً قریش ۔ ابتداً میں قریش کے تمام خاندان مکہ سے باہر رہتے تھے مگر بعد ازاں ان کے دو فرقے ہو گئے۔ قریش البطاح اور قریش الظواہر (مسعودی ج ۲ ص ۵۹ ، ابنِ کثیر ج ۲ ص ۲۰۷) قریش البطاح تو قصی بن کلاب کی اولاد تھے اور قریش الظواہر ان کے علاوہ دیگر قبیلے تھے ۔ قریش الظواہر وہ قبیلے تھے جو مکہ سے ایک مرحلہ یعنی ایک دن کی مسافت سے کم فاصلے کے اندر آباد تھے ۔ اور " ضواحی " اس سے زیادہ فاصلے پر رہتے تھے ۔ قریش اور کنانہ کے علاوہ مکہ کے قبائل مضر (اشجع ، عبس ، فزارہ ، مرہ ، سلیم ، سعد بن بکر ، عامر بن صعصعہ ، ثقیف ، تیم ، رباب ، ضبّہ ، بنو اسد ، ہذیل اور قارہ) تھے ۔ تمام بادیہ نشین تھے جو چارہ اور پانی کی تلاش میں صحرا نوردی کرتے تھے ۔ (دیکھئے : ابن خلدون ج ۲ ص ۳۳۴)

[۲۳۷] لیبان ۔ گستاؤ ۔ ڈاکٹر ۔ تمدنِ عرب ۔ ترجمہ سید علی بلگرامی ۔ مقبول اکیڈمی لاہور ۔ ۱۹۳۶ء ۔ ص ۴۰ ۔

[۲۳۸] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:
حِتّی (HITTI) ۔ عرب اور اسلام ۔ ترجمہ مبارز الدین و محمد معین خان ۔ ندوۃ المصنفین ۔ دہلی ۔ ۱۹۵۹ء ۔ ص ۱۷ ۔

[۲۳۹] احمد امین ۔ فجر الاسلام ۔ مکتبہ النہضہ المصریۃ ۔ قاہرہ ۔ ۱۹۶۴ء ۔ ص ۹ تا ۱۱ ۔

حواشی

باب دوم ـــ تاسیسِ ریاست

(۱) ریاست کی فکری بنیادیں

[۱] عربی زبان میں "دین" کا لفظ مندرجہ ذیل معنوں میں استعمال ہوتا ہے :
(الف) غلبہ و اقتدار، حکمرانی و فرمانروائی، دُوسرے کو اطاعت پر مجبور کرنا، اس کو اپنا غلام اور تابع امر بنانا۔
(ب) اطاعت، بندگی، خدمت، کسی کے لئے مسخر ہو جانا، کسی کے تحت امر ہونا۔
(ج) شریعت، قانون، طریقہ، کیش و ملت رسوم و عادات۔
(د) جزاً عمل، بدلہ، مکافات، فیصلہ، محاسبہ۔
ان معانی کے علاوہ قرآن لفظِ دین کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے اور "اس سے ایک ایسا نظامِ زندگی مراد لیتا ہے جس میں انسان کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت و فرمانبرداری قبول کر کے اس کے حدود و ضوابط اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے۔ اس کی فرمانبرداری پر عزّت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے"۔ حوالہ اور تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو : مودودی، ابوالاعلیٰ۔ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی۔ لاہور۔ سنہ ۱۹۵۴ء۔ ص ۱۲۵ تا ۱۴۸۔

[۲] قرآن کی رُو سے صرف اسلام ہی حقیقی دین ہے اور اللہ کے یہاں اس کے سوا کوئی اور دین مقبول نہیں۔ دیکھئے : آل عمران (۱۹ ، ۸۵)، المائدہ (۳)۔

[۳] مودودی : مذہب کا اسلامی تصور۔ جماعت اسلامی۔ کراچی سنہ ۱۹۶۵ء ص ۴۔ [۴] الحدید (۲۵)۔

[۵] الصف (۹) یہی مضمون دو اور مقامات پر بھی بیان کیا گیا ہے : التوبہ (۳۳)، الفتح (۲۸)

[۶] ابنِ ہشام۔ ج ۱ ص ۳۱۶ [۷] ابنِ سعد - ج ۱۔ ص ۲۰۲ [۸] ابنِ ہشام ج ۱ ص ۲۱۴۔

[۹] Wellhausen, J. The Arab Kingdom and its Fall, tr. Margaret Graham Weir, Khayats, Beruit, 1963, Chap-1 (Introduction) p.10

[۱۰] سلیمان ندوی، سید: سیرۃ النبیؐ۔ مطبع معارف اعظم گڈھ۔ طبع سوم۔ ۱۹۵۱ء۔ ج ۴، ص ۴۰۵۔
[۱۱] مودودی، سید ابوالاعلیٰ۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان۔ لاہور۔ طبع اول ۱۹۵۵ء، ص ۱۰۱۔ [۱۲] ایضاً ص ۱۰۲، ۱۰۳ [۱۳] ایضاً ص ۱۴۱
[۱۴] العنکبوت (۶۱، ۶۳)، لقمان (۲۵)، الزمر (۳۸)۔ الزخرف (۹)، مزید: المائدہ (۷۳)، النحل (۵۱)، المومنون (۹۱، ۱۱۷)، الحجر (۹۶)، الانعام (۱۹)، الانبیاء (۲۲)۔
[۱۵] مودودی۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔ ص ۱۴۲
[۱۶] تفصیل کے لئے: ایضاً ص ۱۴۵ تا ۱۵۸ [۱۷] ایضاً ص ۱۶۳
[۱۸] الانعام (۸، ۵۰)، ھود (۱۲، ۳۱)، الفرقان (۷)
[۱۹] آل عمران (۸۰)، الاسراء (۲۰)، السبا (۴۰)، الصافات (۱۵۰)، النجم (۲۷)
[۲۰] الانبیاءؑ (۲۷) [۲۱] الرعد (۱۳) [۲۲] المریم (۶) [۲۳] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مودودی۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔ ص ۱۶۶ - ۱۶۷
[۲۴] راغب اصفہانی: المفردات فی غریب القرآن۔ مصطفی البابی۔ مصر ۱۹۶۱ء، ص ۴۸۱۔
[۲۵] البقرہ (۱۱۹)، الفاطر (۲۴) [۲۶] الاحزاب (۴۰)
[۲۷] النساءؑ (۷۹)، الانبیاءؑ (۱۰۷)، السبا (۲۸) [۲۸] المائدہ (۳)
[۲۹] المائدہ (۷۲)، الاعراف (۵۹، ۶۵، ۷۳، ۸۵)، ہود (۵۰، ۶۱، ۸۴)، النحل (۳۶)، المومنون (۲۳، ۳۲)، النمل (۴۵)، العنکبوت (۱۶، ۳۶)، نوح (۳)، الرعد (۳۶)، الزمر (۱۱)
[۳۰] النساءؑ (۷۹)، الانبیاءؑ (۱۰۷)، السبا (۲۸) [۳۱] الکہف (۱۱۰) [۳۲] الانعام (۱۲۵)
[۳۳] النساءؑ (۶۴، ۶۵، ۸۰)، الشعراءؑ (۱۳۱) [۳۴] النحل (۴۴) [۳۵] آل عمران (۱۶۴)
[۳۶] آل عمران (۳۱)، الاحزاب (۲۱) [۳۷] الاعراف (۱۵۷)، الحشر (۷) [۳۸] النساءؑ (۱۰۵)
[۳۹] لغت میں لفظ وحی متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اشارہ کرنا، ارسال یعنی پیغام بھیجنا یا بتانا، چپکے سے کسی سے کچھ کہہ دینا اور فطرتاً کسی حکم پر مامور و مقرر کر دینا وغیرہ (ابن درید۔ جمہرۃ اللغہ۔ مطبع معارف العثمانیہ۔ دکن ۱۳۴۵ھ، ج ۱، ص ۱۷۱، ۱۷۲) لیکن شریعت اسلامی کی اصطلاح میں جو کلام یا اشارۂ الٰہی نبیوں اور رسولوں کی طرف بھیجا جاتا ہے اسے وحی کہتے ہیں۔ اسے ہم دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ "وحی خاص اس ذریعہ غیبی کا نام ہے جس کے ذریعہ غور و فکر کسب و نظر اور تجربہ و استدلال کے بغیر خاص اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے فضل و لطف خاص سے کسی نبی کو کوئی علم حاصل ہوتا ہے۔" (سعید احمد اکبر آبادی۔ وحی الٰہی۔ ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۵۲ء، ص ۲۵)

[۴۰] مودودی ۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص ۱۷۴ [۴۱] الانبیأ (۱۰۷)
[۴۲] الفرقان (۷)، [۴۳] الاعراف (۱۸۴)، یونس (۲)، الحجر (۶) [۴۴] الاسرأ (۹۴)
[۴۵] یوسف (۱۰۹) مزید حوالے کے لئے: النحل (۴۳)، الانبیأ (۷) [۴۶] الاسرأ (۹۵)
[۴۷] الزخرف (۳۱) [۴۸] الانعام (۱۲۴)
[۴۹] مودودی ۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی ۔ ص ۲۰۴، ۲۰۵
[۵۰] البقرہ (۴، ۲۸۵) . آل عمران (۳، ۴، ۸۴)، الحدید (۲۵) [۵۱] الاعراف (۱۵۷)
[۵۲] الشعرأ (۱۹۲)، الحاقہ (۴۳)، الواقعہ (۸۰)، السجدہ (۲)
[۵۳] القیامہ (۱۷ تا ۱۹)، الاعلیٰ (۶)، الحجر (۹) [۵۴] ایضاً [۵۵] البقرہ (۱۸۵)
[۵۶] الفرقان (۱)، المدثر (۵۵)، عبس (۹۰) [۵۷] الاعراف (۳) [۵۸] المائدہ (۴۸)
[۵۹] البقرہ (۲)، السبا (۶)، الحاقہ (۵۱)، الاعراف (۵۲)، الفرقان (۶)، الکہف (۱)، الاسرأ (۹)
[۶۰] حٰم السجدہ (۴۲) [۶۱] البقرہ (۲، ۱۷۶)، آل عمران (۳)، المائدہ (۴۸)
[۶۲] النحل (۱۰۱ تا ۱۰۲) [۶۳] النجم (۳، ۴)، یونس (۱۵)
[۶۴] البقرہ (۴)، الانعام (۹۲)، الاعراف (۱۴۷)، النحل (۲۲)، الاسراء (۱۰)، المومنون (۷۴)۔
[۶۵] مودودی ۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی ۔ ص ۲۴۴ [۶۶] الانعام (۱۹۲)

۲ ۔ تشکیلِ معاشرہ

[۶۷] رسول اللہؐ کا صاف ارشاد یہ ہے کہ: لیس لاحد علی احد فضل الا بدین و تقویٰ۔
(کسی کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں مگر ہاں دین اور تقویٰ کے سبب)
ملاحظہ ہو: الخطیب العمری التبریزی ۔ مشکوٰۃ المصابیح ۔ اصح المطابع، کراچی ۱۳۶۸ھ ۔ باب المفاخرہ والعصبیۃ ۔ ص ۴۱۸ ۔
[۶۸] آپؐ کا ارشاد ہے: لیس منّا من دعا الی عصبیۃ ۔ (جو عصبیت کی طرف بلائے وہ ہم میں سے نہیں ہے)
دیکھئے: ابوداؤد السجستانی ۔ سنن ۔ نور محمد ۔ اصح المطابع، کراچی، ۱۳۶۹ھ، کتاب الادب، باب فی العصبیۃ، ج ۲، ص ۶۹۸، مزید دیکھئے: الخطیب العمری، ص ۴۱۸
[۶۹] الانبیأ (۱۰۷)، السبا (۲۸)، الفرقان (۱) [۷۰] الحجرات (۱۰)
[۷۱] القصص (۷۷) [۷۲] الحجر (۸۸)
[۷۳] قرآن کے یہ الفاظ اس نقشۂ حالات پر مہرِ صداقت ثبت کرتے ہیں کہ ظہر الفساد فی البرّ و البحر بما کسبت

ایدی الناس۔ (الروم۔ آیت ۴۱) [۷۴] یہ سرگزشت بہت طویل ہے۔ ملاحظہ ہو: ابن ہشام۔ ج ۱
ص ۲۲۸ تا ۲۳۶ [۷۵] ایضاً ص ۲۳۱، ۲۳۲ [۷۶] ایضاً ص ۲۳۸

[۷۷] ایضاً ص ۲۳۸ [۷۸] ایضاً ص ۲۳۹، ۲۴۰ [۷۹] ایضاً ص ۲۴۰

[۸۰] ایضاً ص ۲۴۶، ۲۴۷ [۸۱] ایضاً ص ۲۴۷

[۸۲] حنفاءؔ کا یہ طبقہ عرب کی مذہبی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ لغوی اعتبار سے حنیف کا لفظ "حنف" سے بنا ہے جس کے معنی مُڑنے کے ہیں۔ لیکن جاہلیت میں اصطلاحی طور پر اس سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ حنیف وہ شخص ہے جو دینِ ابراہیمی کی بعض رسموں مثلاً ختنہ اور حجِ بیت اللہ کو ادا کرتا ہے (ابن منظور الافریقی۔ لسان العرب۔ مطبعۃ الامیریہ۔ بولاق۔ ۱۳۰۳ھ، ج ۱۰، ص ۴۰۴)۔ حنیف اور حنفاءؔ کے سلسلے میں مفصل بحث، تحقیق، تنقید اور تبصرہ کے لئے ملاحظہ ہو: سلیمان ندوی سید۔ ارض القرآن۔ معارف پریس۔ دار المصنفین۔ اعظم گڈھ۔ طبع چہارم، ۱۹۵۶ء، ج ۲، ص ۲۰۹ تا ۲۱۶)

[۸۳] ایک متفق علیہ حدیث میں رسول اللہؐ نے اپنی بعثت کو بارش سے تشبیہ دی ہے۔ دیکھئے: محمد فواد عبد الباقی۔ اللؤلؤ والمرجان فیما اتفق علیہ الشیخان۔ عیسی البابی الحلبی۔ دار احیاء الکتب العربیہ۔ قاہرہ ۱۹۴۹ء، ج ۲، ص ۱۲۰ (بحوالہ بخاری۔ کتاب العلم)

[۸۴] قرآن نے سورۂ نور میں اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے کہ صحیح فطرت کی مثال صاف و شفاف روغن کی ہے، جو ہر طرح کی آمیزش اور ملاوٹ سے پاک ہے۔ اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ بغیر اس کے کہ اس کو آگ چھوئے بھڑک اُٹھنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ پس جُوں ہی وحی و الہام کی چنگاری اس سے مس ہوتی ہے فوراً بھڑک اُٹھتا ہے (آیت ۳۵)۔

[۸۵] الانعام (۲۰)، النحل (۸۳)

[۸۶] اہلِ کتاب چونکہ "کتابِ مقدس" رکھتے تھے اس لئے انھیں بعثتِ رسولؐ کے بارے میں روایات کا پوری طرح علم تھا اور وہ کفار و مشرکین سے اسی نبیؐ موعود کے بل بوتے پر اظہارِ مشیخت بھی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ سورہ البقرہ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے (آیت ۱۴۶ اور ۸۹)۔ [۸۷] ملاحظہ ہو: الصف (۶)

[۸۸] ابنِ ہشام، ج ۲، ص ۶۶

[۸۹] ابنِ ہشام نے بیان کیا ہے کہ بنی عمرو بن عوف کا ایک شخص سوید بن صامت تھا۔ اس کی قوم کے لوگ شرف و بزرگی اور بہادری کی وجہ سے اس کو "کامل" کہتے تھے (ج ۲، ص ۶۷)۔ مکہ میں حج یا عمرہ کے ارادہ سے آیا۔ حضورؐ اس کی خبر سُن کر اس کے پاس گئے اور اس کو اسلام کی دعوت دی۔ سوید نے کہا شاید جیسی چیز میرے پاس ہے ایسی ہی کوئی چیز تمہارے پاس بھی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا تمہارے پاس کیا چیز ہے؟ اس نے کہا لقمان کا نصیحت نامہ! آپ نے فرمایا اس کو میرے سامنے پیش کرو۔ سوید نے وہ حضورؐ کو دکھایا۔ حضورؐ نے فرمایا ہاں یہ بھی اچھی چیز ہے

مگر جو چیز میرے پاس ہے وہ اس سے بدرجہا بہتر و افضل ہے۔ وہ قرآن ہے جس کو اللہ نے مجھ پر نازل کیا ہے وہ ہدایت اور نور ہے۔ پھر حضورؐ نے سوید کو قرآن پڑھ کر سنایا اور اسلام کی دعوت دی اس نے قبول کیا اور پھر وہ مدینہ میں اپنی قوم کے پاس گیا اور زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ خزرج نے اس کو قتل کر دیا۔ (ابنِ ہشام، ج ۲، ص ۶۸، ۶۹)

[۹۰] لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاحشًا ولا متفحشًا وکان یقول: انّ من خیارکم احسنکم اخلاقًا۔ (محمد فواد، عبدالباقی، ج ۳، ص ۱۲۵، بحوالہ بخاری کتاب المناقب)

[۹۱] حربِ فجار کا واقعہ پیش آیا تو اس وقت آپ کی عمر چودہ یا پندرہ سال کی تھی۔ ایک روایت کے اعتبار سے بیس برس کی تھی۔ اس جنگ کا نام فجار اس لئے ہوا کہ دونوں فریقوں (قریش، بنی کنانہ اور بنی قیس عیلان) نے اشہر حرم میں جنگ کی تھی (ابنِ ہشام، ج ۱، ص ۱۹۵ تا ۱۹۸۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: ابنِ سعد، ص ۱۲۶ تا ۱۲۸)۔ حربِ فجار زمانہ جاہلیت کی جنگوں میں سب سے زیادہ مشہور اور عظیم الشان سمجھی جاتی ہے۔ حروب فجار کی کل تعداد چار ہے۔ متذکرہ بالا حربِ فجار چوتھی اور آخری ہے۔ اس سے پہلے ایک بنی کنانہ اور ہوازن کے درمیان، دوسری قریش اور ہوازن کے درمیان، اور تیسری پھر کنانہ اور ہوازن کے درمیان ہوئی تھی۔ (ابنِ ہشام ص ۱۹۵، حاشیہ)

[۹۲] حربِ فجار کے بعد حلف الفضول کا واقعہ پیش آیا۔ رسول اللہؐ کی عمر اس وقت بیس سال تھی۔ اس معاہدہ کی طرف سب سے پہلے بنی ہاشم مائل ہوئے۔ زبیر بن عبدالمطلب نے دعوت دی، سب لوگ (بنی ہاشم، بنی زہرہ، بنی تیم) عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے۔ زبیر نے سب کے کھانے کا انتظام کیا، سب نے اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر ان الفاظ میں عہد کیا کہ "جب تک دریا میں صوف کے بھگونے کی شان باقی ہے ہم مظلوم کا ساتھ دیں گے۔" رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ میں اس حلف میں شریک تھا اور اگر مجھ کو اب بھی اس میں بلایا جائے تو قبول کروں گا۔ (ابنِ سعد، ج ۱، ص ۱۲۸، ۱۲۹)

[۹۳] ابنِ سعد، ج ۱، ص ۱۴۶ [۹۴] ایضاً، ج ۱، ص ۱۹۵

[۹۵] رسول اللہؐ کے کردار کی اس عظمت پر قرآن نے بھی شہادت دی ہے۔ ملاحظہ ہو: القلم (۴)

[۹۶] یونس (۱۶) [۹۷] ابنِ سعد، ج ۱، ص ۲۰۰

[۹۸] الخطیب العمری، ص ۵۲۱ (باب المبعث و بدء الوحی)

[۹۹] مودودی۔ سید ابوالاعلیٰ۔ تفہیم القرآن۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند۔ دہلی، ج ۱، ص ۵۳۵

[۱۰۰] الانعام (۳۳)

[۱۰۱] مثلاً حضرت ابوبکرؓ اور پھر ان کی وجہ سے دوسرے ایمان لائے۔ (ابنِ ہشام، ج ۱، ص ۲۶۷)

[۱۰۲] شاہ ولی اللہ۔ الشیخ احمد۔ حجۃ اللہ البالغہ۔ ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ۔ مصر ۱۳۵۲ھ، ج ۱، ص ۱۲۴۔

[۱۰۳] ایضاً ص ۱۲۴۔ ۱۲۵ [۱۰۴] ایضاً ص ۱۲۶ [۱۰۵] ایضاً ص ۱۲۷

[۱۰۶] ایضاً ص ۱۲۷، ۱۲۸ [۱۰۷] العنکبوت (۴۶) [۱۰۸] آل عمران (۶۴)

[۱۰۹] اصلاحی، امین احسن۔ دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی۔ لاہور۔ ۱۹۵۸ء، ص ۱۴۷، ۱۴۸۔ [۱۱۰] الاعراف ۱۰۱

[۱۱۱] یہود کا بڑا حصہ جو توراۃ و انجیل کی تعلیمات کو چھوڑ کر شہواتِ نفس اور رغباتِ دنیا کا شکار ہو چکا تھا، محروم ہدایت رہا۔ صرف ایک مختصر سی جماعت ان میں اہلِ حق کی رہ گئی تھی جو رسولِ آخر کی آمد کے منتظر تھے۔ جونہی اس کی صدا ان کے کانوں میں پڑی حق قبول کر لیا۔ قرآن نے جہاں یہود کی عام بدبختی کا ذکر کیا ہے وہاں اس چھوٹی جماعت کی حق پسندی کی تعریف بھی کی ہے۔ دیکھئے: المائدہ (۶۶)

[۱۱۲] ان میں سے بھی وہ لوگ جن میں صحیح تعلیم کی روشنی موجود تھی انہوں نے پورے جوش کے ساتھ اس دین کا استقبال کیا۔ المائدہ (۸۳) [۱۱۳] سورۂ اعراف میں آتا ہے:

"جن لوگوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی ان کی مثال کتنی بُری ہے۔ انہوں نے نقصان کیا تو اپنا ہی کیا۔ جس کو خدا ہدایت دے وہی راہ یاب ہے اور جس کو گمراہ کرے تو ایسے ہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لیے پیدا کئے ہیں۔ ان کے دل ہیں لیکن سمجھتے نہیں ان کی آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں یہ لوگ بالکل چار پایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر۔ یہی وُہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ (آیت ۱۷۷ تا ۱۷۹)

[۱۱۴] بعض مدنی سُورتوں میں بھی یہ الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً:

البقرہ (۲۱، ۱۶۸)، الحج (۱، ۱۵، ۴۹، ۷۳)، النساء (۱، ۱۷۰، ۱۷۴) اور الحجرات (۱۳) میں سورۂ حج کے بارے میں اختلاف ہے کہ مکی سورہ ہے یا مدنی، ایک گروہ مکی قرار دیتا ہے جبکہ حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کا دُوسرا گروہ اسے مدنی کہتا ہے۔ اسی طرح یا قوم! کا خطاب البقرہ (۵۴)، المائدہ (۲۰، ۲۱) اور الصف (۵) میں بھی موجود ہے۔ [۱۱۵] الانفطار (۶)، الانشقاق (۶)

[۱۱۶] الاعراف (۱۵۸)، یونس (۲۳، ۵۷، ۱۰۴، ۱۰۸)، النحل (۱۶)، لقمان (۳۳)، الفاطر (۳، ۵، ۱۵)

[۱۱۷] الانعام (۷۸، ۱۳۵)، الاعراف (۵۹، ۶۱، ۶۵، ۶۷، ۷۳، ۷۹، ۸۵، ۹۳) یونس (۷۱، ۸۴)، الھود (۲۸، ۲۹، ۳۰، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۶۱، ۶۳، ۶۴، ۶۸، ۸۴، ۸۵، ۸۸، ۸۹، ۹۲، ۹۳)، طٰہٰ (۸۶، ۹۰)، المومنون (۲۳)، النحل (۴۶)، العنکبوت (۳۶)، یٰسین (۲۰)،

الزمر (۳۹)، المومن (۲۹، ۳۰، ۳۲، ۳۸، ۳۹، ۴۱)، الزخرف (۵۱)، النوح (۲) - یاَیّھا الذین اٰمنوا اگرچہ مدنی سورتوں کا نشانِ امتیاز ہے مثلاً البقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ، الانفال، التوبہ، الحج، النور، الاحزاب، المحمد، الحجرات، الحدید، المجادلہ، الحشر، الصف، المنافقون، التغابن اور التحریم وغیرہ میں اسے استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن مکہ میں بھی انہی الفاظ سے اہلِ ایمان کو خطاب کیا گیا ہے۔ (دیکھئے، العنکبوت)

[۱۱۸] اصلاحی۔ ص ۹۔ [۱۱۹] یہی خصوصیات مکی سورتوں میں پائی جاتی ہیں۔

[۱۲۰] اخلاص کی شدت کا اندازہ ایک طرف تو خود قرآن مجید کے متعدد بیانات سے ہوتا ہے۔ مثلاً دیکھئے، الکہف (۶)، التوبہ (۱۲۸) اور دوسری طرف رسول اللہ خود یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

انما مثلی و مثل الناس کمثل رجل استوقد نارا فلما اضاءت ما حوله جعل الفراش وھذہ الدواب التی تقع فی النار یقعن فیھا فجعل ینزعھن و یغلبنه فیقتحمن فیھا فانا آخذ بحجزکم عن النار وھم یقتحمون فیھا۔ (محمد فواد عبدالباقی، ج ۳، ص ۱۲۱، ۱۲۲ بحوالہ بخاری کتاب الرقاق)

[۱۲۱] یٰسین (۶۹)، [۱۲۲] الحاقہ (۴۲)، الطور (۲۹)

[۱۲۳] الاحقاف (۸)، المومنون (۳۸)، الانبیاءٓ (۵) وغیرہ

[۱۲۴] تاریخی لحاظ سے یہ امر دلچسپ ہے کہ ابنِ ہشام کی روایت کے مطابق ابوسفیان بن ہشام اور اخنس بن شریق جیسے معززینِ قریش تک کو قرآن سننے کا شوق اس حد تک پیدا ہو گیا کہ وہ آپ کے مکان کے باہر کسی جگہ چھپ کر بیٹھ گئے اور متواتر تین دن تک آکر سنتے رہے اور محظوظ ہوتے رہے۔ کلام کی شیرینی غالباً اثر کرنے لگی تو آپس میں عہد کیا کہ اب ہم ہرگز نہ آئیں گے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ ظاہر کی کہ ان کے آنے سے بعض لوگ جو ان میں سے جاہل اور بے عقل ہیں نہ معلوم کیا سمجھنے لگیں۔ (ابنِ ہشام، ج ۱، ص ۲۳۷)

[۱۲۵] یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ قریش نے عتبہ بن ربیعہ کو گفتگو کے لئے حضورؐ کے پاس بھیجا۔ عتبہ گفتگو کرنے کے بعد جب قریش کے پاس واپس پہنچا تو اس نے کہا کہ:

"میں نے تو ایسی بات سُنی ہے کہ قسم کھا کر کہتا ہوں ایسی بات کبھی نہیں سُنی۔ نہ تو وہ شعر ہے نہ جادو ہے نہ کہاوت ہے۔ اے قریش! میری بات مانو تو اس شخص (محمدؐ) کو چھوڑ دو اور اس کے مزاحم نہ ہو۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ یہ جو بات میں نے اس شخص سے سنی ہے یہ تمام عالم میں پھیلے گی۔ پس اگر عرب ان کے مخالف ہو گئے تب تم کو ان کی مخالفت کی زحمت نہ اٹھانی پڑے گی۔ عرب ان سے سمجھ لیں گے اور اگر یہ عرب پر غالب ہوئے تو ان کا ملک تمہارا ملک ہو گا اور ان کی عزت تمہاری عزت ہو گی، تم کو ان سے برسرِ فساد نہ رہنا چاہیئے۔ اس تدبیر سے تم بہت اچھے رہو گے۔ قریش کہنے لگے، اے ابوالولید! قسم ہے خدا کی تم پر بھی اس نے جادو کر دیا ہے۔" (ایضاً، ص ۳۱۴)

[۱۲۶] اصلاحی، ص ۶۰، ۶۱ [۱۲۷] ایضاً ص ۶۱، ۶۲

[۱۲۸] الشعراء (۲۱۴)

[۱۲۹] بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب وانذر عشیرتك الاقربین کی آیت نازل ہوئی تو آپ دعوت و تبلیغ پر مستعد ہو گئے اور فرمایا کہ:

یا معشر قریش" او کلمة نحوها" اشتروا انفسکم لا اغنی عنکم من اللہ شیئا یا بنی عبد مناف! لا اغنی عنکم من اللہ شیئا یا عباس بن عبد المطلب! لا اغنی عنك من اللہ شیئا یا صفیه عمة رسول اللہ! لا اغنی عنك من اللہ شیئا یا فاطمه بنت محمد سلینی ما شئت من مالی لا اغنی عنك من اللہ شیئا۔ (محمد فواد عبدالباقی، ج ۱، ص ۵، بحوالہ کتاب الوصایا)

[۱۳۰] ابن سعد نے لکھا ہے کہ جب آیت وانذر عشیرتك الاقربین نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفا پر چڑھے اور قریش کو اس طرح پکارا:

"یا معشر قریش...... فقالوا: مالك یا محمد؟ قال: ارأیتکم لو اخبرتکم ان خیلاً بسفح هذا الجبل أکنتم تصدقونی؟ قالوا: نعم انت عندنا غیر متهم وما جربنا علیك کذبًا قط، قال: فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید یا بنی عبد المطلب یا بنی عبد مناف یا بنی زهره، حتی عدد الافخاذ من قریش، ان اللہ امرنی أن انذر عشیرتی الاقربین وانی لا أملك لکم من الدنیا منفعه ولا من الآخره نصیباً الا ان تقولوا لا الٰه الا اللہ

(ابن سعد، ج ۱، ص ۲۰۰)

طبری کی ایک روایت کے مطابق رسولؐ اللہ نے کھانے کی دعوتوں میں بھی اپنی دعوت کو پیش کیا۔

(طبری، ج ۲، ص ۳۲۰، ۳۲۱)

[۱۳۱] حضورؐ نے یہ دعا کی تھی کہ "اے اللہ! ابوحکم بن ہشام (یعنی ابوجہل) یا عمر بن خطاب کے ساتھ اسلام کی تائید فرما" (ابن ہشام، ج ۱، ص ۳۷۰) [۱۳۲] اصلاحی، ص ۲۱۸ [۱۳۳] ایضاً ص ۲۱۹

[۱۳۴] ان کی جن بے شمار معاشرتی اور اخلاقی خرابیوں کا پردہ چاک کیا گیا ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ خاص یہ ہیں: کذب، بخل، ناشکرا پن، لالچ اور مال کی ہوس، شقی القلبی، تکاثر، تفاخر، تکذیب و طغیان، روزمرہ ضروریات کی اشیا دوسروں کو دینے سے انکار، یتیموں کی ناقدری، ہزل، حق سے اعراض، تکبر و گمراہی، کفر، ظلم، فسق، ادبار، حسد، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا، اسراف (الیل، العادیات، التکاثر، الهمزه، المعارج، الماعون، الطارق، القیامه، النوح، النازعات، المدثر، التطفیف، القلم، التکویر اور الذاریات)، اعتدا، شک و تذبذب، مناع للخیر، استہزاء رسول، عدوان، لہو و لعب، شرارت،

غفلت، شرک، جھوٹ، قتلِ ناحق، زنا، فواحش وسیئات، حُبِّ دنیا، طغیٰ، کفر (الغاشیہ، النبا، ق، الاحقاف، حٰمٓ السجدہ، الطور، ص، النجم، الکہف، المومنون، الانبیاء، یٰسین، الشعراء، الرعد، الفرقان، الشوریٰ، السباء، المومن، الزمر، الکافرون)، بے جا اکڑ، انتہا پسندی، فتنہ و فساد (لقمان، القصص، یوسف، ابراہیم)، منافقت، پیٹھ پیچھے بُرائی، جدائی پیدا کرنا، مسلسل انکار، تبذیر، قتلِ اولاد، یتیم کا مال ہڑپ کر جانا، تہمت لگانا، عصیان، بغاوت، الزام تراشی، ایمان بالباطل (الروم، الاعراف، العنکبوت، الفاطر، حٰمٓ سجدہ، الجن، الجاثیہ، الزخرف، النحل، الاسراء، ہود، یونس، النحل، الانعام) [۱۳۵] ابنِ ہشام، ج ۱، ص ۲۸۸ [۱۳۶] ایضاً، ص ۲۸۹

[۱۳۷] ایضاً، ص ۳۱۳ [۱۳۸] ایضاً، ص ۳۱۵ [۱۳۹] ایضاً، ج ۲، ص ۲۸۰

[۱۴۰] یہاں اس غلط فہمی کو دُور کر دینا چاہیے کہ مکی دور کے ابتدائی چند سالوں میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا وہ محض نوجوان، غریب اور غلام تھے۔ اگر ایک نظر صرف اس فہرست پر ڈال لی جائے جو قبولِ اسلام کے سلسلہ میں ابنِ ہشام نے دی ہے اور جن لوگوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ سابقون الاولون میں سے اکثر لوگ عرب کے مختلف شعوب و قبائل کے معزز و محترم ارکان اور باضابطہ و آزاد شہری تھے۔

[۱۴۱] اصل عبارت کے لئے ملاحظہ ہو: ابن خلدون، عبدالرحمٰن۔ مقدمہ۔ المکتبہ التجاریہ قاہرہ، الفصل السابع والعشرون، ص ۱۵۱۔ [۱۴۲] الروم (۳۰) اس آیت کے ذیل میں مفسرین نے بہت کچھ لکھا ہے اور بخاری و مسلم کی اس مشہور حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے جس میں رسول اللہ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ:

ہر مولود فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

مزید تفصیل اور متن کے لئے ملاحظہ ہو: ابن الجوزی۔ ابی الفرج عبدالرحمٰن، زاد المسیر فی علم التفسیر۔ المکتب الاسلامی للطباعۃ والنشر، ج ۶، ص ۳۰۰ تا ۳۰۲۔

نیز دیکھیے: ابن کثیر الدمشقی۔ تفسیر القرآن العظیم۔ دار الاندلس للطباعۃ والنشر۔ بیروت ۱۹۶۶ء، ص ۳۵۹، ۳۶۰۔ [۱۴۳] ابنِ ہشام، ج ۱، ص ۳۵۹، ۳۶۰

[۱۴۴] حوالے اور متن کے لئے ملاحظہ ہو، محمد فواد عبدالباقی، ج ۳، ص ۱۱ تا ۱۳ بحوالہ بخاری کتاب الادب اور کتاب الاشربہ [۱۴۵] ابن ہشام، ج ۱، ص ۳۶۰

[۱۴۶] ابوجہل کو جب کسی کے مسلمان ہونے کی خبر ملتی تو فوراً اس کو جا کر دھمکاتا اور کہتا کہ تُو نے اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا ہم تجھ کو ذلیل کر دیں گے اور اگر وُہ سوداگر ہوتا تو اس کی تجارت برباد کر دینے کا خوف دلاتا اور اگر غریب ہوتا تو مارتا، ستاتا اور ایذا پہنچاتا (ایضاً، ج ۱، ص ۳۴۲)۔

[۱۴۷] تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: ایضاً ص ۳۷۵، ۳۷۶ [۱۴۸] ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ابوسفیان بن حرب بن امیہ (بنی عبد شمس)، طعیمہ بن عدی، جبیر بن مطعم اور حارث بن عامر بن نوفل (بنی نوفل)، نضر بن حارث بن کلدہ (بنی عبدالدار)، ابوالبختری بن ہشام، زمعہ بن الاسود اور حکیم بن حزام (بنی اسد)، ابوجہل عمر بن ہشام (بنی مخزوم)، نبیہ اور منبہ بن الحجاج (بنی سہم) اور امیہ بن خلف (بنی جمح میں سے) ان کے علاوہ اور لوگ بھی جن میں سے اکثر قریش اور بعض غیر قریش تھے۔ (ایضاً ج ۲، ص ۱۲۵) [۱۴۹] ایضاً ص ۱۲۶ [۱۵۰] ایضاً ص ۱۶

[۱۵۱] ایک روایت یہ بھی ہے کہ قدرتِ خداوندی سے اس تحریری معاہدہ کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ (ایضاً)

[۱۵۲] ملاحظہ ہو: البلد (۱۷، ۱۸)، التطفیف (۲۹)، حٰم السجدہ (۲۶)، العنکبوت (۳، ۴، ۷، ۹، ۱۱، ۱۲)

[۱۵۳] ابن حبیب بغدادی۔ محمد۔ کتاب المحبّر۔ دائرۃ المعارف۔ حیدر آباد دکن ۱۹۴۲ء، ص ۷۰، ۷۱

[۱۵۴] ابن سیدالناس۔ عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر۔ مکتبہ القدس۔ قاہرہ، ۱۳۵۶ھ، ج ۱، ص ۱۹۹۔

[۱۵۵] زرقانی۔ الزرقانی علی المواہب اللدنیہ۔ مطبعۃ ازہریہ۔ مصر۔ ۱۳۲۵ھ، ج ۱، ص ۳۷۳۔

[۱۵۶] ایضاً [۱۵۷] البقرہ (۱۳۸)۔

۳ تنظیمِ معاشرہ

[۱۵۸] ہجرتِ نبویؐ سے قبل مدینہ کا نام یثرب تھا۔ اس شہر کو یثرب نامی عمالقی نے بسایا تھا اور اسی کے نام سے بعد کو موسوم ہوا (الفیومی، احمد بن محمد بن علی المقری۔ المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر للرافعی۔ مطبعہ مصطفی البابی۔ مصر۔ ج ۱، ص ۸۹) اس کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ تفصیل کے لئے: یاقوت الحموی الرومی۔ شہاب الدین ابی عبداللہ معجم البلدان۔ دار صادر للطباعۃ والنشر۔ بیروت۔ ۱۹۵۷ء، ج ۵، ص ۸۴، ۸۵) شہر کی تعمیر کا زمانہ ۱۶۰۰ ق م اور ۱۲۰۰ ق م کے درمیان ہے۔ پہلے یہاں عمالیق آباد تھے۔ لیکن عہدِ اسلام میں یہاں یہود اور قبائلِ اوس و خزرج آباد تھے (سلیمان ندوی۔ ارض القرآن، ج ۱، ص ۹۹)

رسول اللہؐ نے شہر مدینہ کو یثرب کے نام سے موسوم کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس کراہت کی توجیہ مختلف انداز سے کی گئی ہے (السمہودی، علی نورالدین۔ وفاءُ الوفاء باخبار دار المصطفیٰ۔ مطبعۃ الآداب والموید۔ مصر۔ ۱۳۲۶ھ ج ۱، ص ۸) جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں اس کے لفظی اور لغوی معنے اچھے نہیں ہیں (ثرب اس چربی کو کہتے ہیں جو اوجھڑی اور انتڑیوں پر ہوتی ہے اور تثریب گناہ اور بُرائی پر دلالت کرتا ہے۔ ابن درید، ج ۱، ص ۲۰۱۔ اس کی جمع ثروب، اثرب اور اثارب آتی ہے۔ الفیروز آبادی۔

مجد الدین ۔ القاموس ۔ المحیط ۔ مطبعہ دار المامون ۔ ۱۹۳۸ء، ج ۱، ص ۴۰) قرآن میں یثرب کا نام صرف ایک جگہ (الاحزاب : ۱۳) آیا ہے۔ اور وُہ بھی منافقین کے ایک قول کے حوالے سے ۔ چنانچہ علامہ السمہودی نے یہی بات لکھی ہے کہ قرآن میں مذکورہ نام اس موقع پر آیا ہے کہ جہاں منافقین کے قول کو بطور حکایت کے بیان کیا گیا ہے اور اس میں کراہت ہے (السمہودی ج ۱ ص ۸)۔ ایک تحقیق کے مطابق یثرب رومی لفظ "اتھریبس" کی تعریب ہے (سلیمان ندوی ج ۱ ص ۹۹) یثرب کی وجہ تسمیہ اور مشتقات کی تفصیل کے لئے مزید ملاحظہ ہو :

(الشریف، احمد ابراہیم، مکہ والمدینہ فی الجاہلیہ وعہد الرسول۔ مطبوعہ دار الفکر العربی ۔ مصر ۔ ص ۲۹۱، ۲۹۲) بہرحال رسولؐ اللہ نے یثرب کا نام بدل کر طیبہ اور طابہ رکھا (ایضاً، ج ۱، ص ۱۲) مورخین اور دیگر علماؒ نے اس کے دوسرے بہت سے نام بھی لکھے ہیں۔ مثلاً یاقوت حموی نے انتیس نام گنائے ہیں (یاقوت الحموی ج ۵ ص ۸۳) جبکہ السمہودی نے ترتیب وار چورانوے نام مرتب کئے ہیں (السمہودی ج ۱ ص ۷ تا ۱۹) اس فہرست میں تہترواں نام "المدینہ" اور چہترواں "مدینۃ الرسول" لکھا ہے (ایضاً ص ۱۶) اس وقت ہم دوسرے ناموں کے بجائے مختصراً صرف مدینہ سے بحث کرنا چاہتے ہیں ۔ کیونکہ سب سے زیادہ مشہور بھی یہی ہے اور ہم نے اپنے مقالہ میں ہر جگہ یثرب یا دُوسرے اسمٔا کے مقابلہ میں "مدینہ" کو ترجیح دی ہے اور اسی کو اختیار کیا ہے۔

قرآن میں "مدینہ کو بطورِ خاص شہر یثرب کے لئے کم و بیش چار مقامات پر ذکر کیا گیا ہے (التوبہ : ۱۰۱، ۱۲۰ ۔ الاحزاب ۶۰ اور المنافقون : ۸) لغوی اعتبار سے "مدینہ" "مدن" سے بنا ہے۔ السمہودی کا بیان ہے :

من مدن بالمکان اذا أطاع (السمہودی ج ۱ ص ۱۶) پھر آگے لکھتے ہیں :

والمدینہ أبیات مجتمعہ کثیرہ تجاوز حدا لقریٰ کثرہ وعمارہ و لم تبلغ حد الامصار۔

(ایضاً ص ۱۶) اور ابن منظور الافریقی نے ایک قول نقل کیا ہے کہ :

انہ مفعلہ من دنت ای ملکت (ابن منظور الافریقی ج ۱۷ ص ۲۸۹)۔

اب قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ مدینہ کو "مدینہ" کیوں کہا جاتا ہے؟ اور اس کا رواج کب سے ہوا؟ حقیقت یہ ہے کہ ان مسائل پر باوجود تلاش کے تشفی بخش مواد نہ مل سکا۔ تعجب ہے کہ ہمارے یہاں کے مورخین اور اصحاب سیر نے اس پر قابل ذکر توجہ نہ دی۔

ہمارے مطالعہ کی رُو سے مدینہ کو "مدینہ" کہنے کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں :

(الف) مدینہ رسولؐ اللہ کا مسکن بنا اور آپ نے یہاں اقامت اختیار فرمائی (قیل لانہ صلی اللہ علیہ وسلم سکنھا ۔ السمہودی ج ۱ ص ۱۶) نیز العباس، احمد بن عبد الحمید ۔ کتاب عمدۃ الاخبار فی مدینۃ المختار ۔ مطبعۃ المدنی ۔ قاہرہ ۔ طبع ثالث ۔ ص ۶۷)

(ب) مدینہ قلعہ (الحصن) کہتے ہیں جو اس خطۂ زمین کے وسط میں بنا ہو جہاں شہر واقع ہے ۔ پھر اس سے

ہر ایسے شہر کو کہنے لگے جہاں قلعے (ابن منظور الافریقی ج ۱۷ ص ۲۸۹) بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں محفوظ و مستحکم پناہ گاہیں اور اطم (گڑھی) بنے ہوں۔ اور ہر تاریخ کا طالب علم یہ جانتا ہے کہ جس شہر کو "مدینہ" کا خاص نام دیا گیا وہاں اطم اور قلعے وغیرہ کثرت سے پائے جاتے تھے (تفصیل کے لئے السمہودی ج ۱ ص ۱۱۱ تا ۱۱۶) اس لئے اس مقام کو مدینہ سے تعبیر کرنا انتہائی موزوں ہے۔

(ج) مدینہ کو اس لئے بھی مدینہ کہتے ہیں کہ رسولؐ اللہ نے اس کو مغلوب کر کے اسے شرف و عظمت عطا کی (والمدینہ اسم مدینہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاصہ غلبت علیہا تفخیما لہا (ابن منظور الافریقی، ج ۱۷، ص ۲۸۹) اور وہاں کے باشندے پُرامن طریقے پر مطیع و منقاد بن گئے (السمہودی ج ۱، ص ۱۶)۔ نیز العباس ص ۷۶)۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ رسولؐ اللہ کا اس شہر میں غلبہ و تمکن اور سکانِ مدینہ کی اطاعت گزاری کسی جبر و قہر یا عسکری مہم جوئی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس شہر کی تسخیر کا باعث دُنیا کے دُوسرے تمام شہروں کے برخلاف تلوار نہیں بلکہ قرآن ہے۔ اور اس کی واضح دلیل حضرت عائشہؓ کی وہ روایت ہے جسے بلاذری نے نقل کیا ہے۔ یعنی: قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما یفتح من مصر او مدینۃ عنوۃ فان المدینۃ فتحت بالقرآن (بلاذری، احمد بن یحییٰ بن جابر۔ فتوح البلدان۔ مطبعۃ الموسوعات۔ مصر، سنہ ۱۹۰۱ء ص ۱۴) ہمارے نزدیک یہی توجیہ سب سے زیادہ قوی ہے۔

اب جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اسے مدینہ کے نام سے کب موسوم کیا گیا تو اس سلسلے میں عام خیال یہ ہے کہ "حضورؐ کی آمد کے بعد اس کا نام "مدینۃ النبی" ہوا اور پھر کثرتِ استعمال سے صرف مدینہ رہ گیا" (سلیمان ندوی - ارض القرآن ج ۱، ص ۹۸)۔ یہ بیان کچھ مبہم سا معلوم ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ شہر آمدِ رسولؐ کے بعد کب سے "مدینۃ النبی" کہلایا؟ بعض شواہد کے پیش نظر ہمارا قیاس یہ ہے کہ منشورِ مدینہ کے اجرا تک تو اس کا نام یثرب ہی تھا جیسا کہ خود منشورِ مدینہ کے الفاظ میں اسے استعمال کیا گیا ہے:

هذا کتاب من محمد النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین المومنین والمسلمین من قریش و یثرب۔ (ابنِ ہشام، ج ۲، ص ۱۴۷)

البتہ اس کے بعد اس کا نام مدینہ ہوا، یہاں تک کہ سورۂ احزاب میں جس کا نزول ۵ھ میں ہوا (مودودی، ابوالاعلیٰ۔ تفہیم القرآن۔ مکتبہ تعمیرِ انسانیت۔ لاہور سنہ ۱۹۶۶ء ج ۴ ص ۵۴) اور غالباً لفظ مدینہ بھی جہاں سب سے پہلے استعمال کیا گیا ہے یہ ارشاد ہوا کہ اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے اور جو مدینہ میں ہیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے ہیں اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے تمہیں کھڑا کریں گے پھر وہ اس شہر میں مشکل ہی سے تمہارے ساتھ رہ سکیں گے (الاحزاب: ۶۰) اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسی سُورہ کی بالکل ابتدا میں اہلِ یثرب کے بارے میں منافقین ہی کا ایک قول اللہ نے نقل کیا ہے جس کے بین السطور

ان کی اسلام دشمنی، ریاکاری اور اہل ایمان کے لئے ان کی بدخواہی کو صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ گویا ایک ہی سورت میں ایک ہی شہر کے لئے یثرب اور مدینہ کے دو مختلف نام، دو نقطہ ہائے نظر کی عکاسی کر رہے ہیں۔ اس سے یہ بھی خیال کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک وہ شہر "مدینۃ النبیؐ یا مدینہ" کی حیثیت سے اس وقت مشہور و متداول ہے جبکہ منافقین اسے "یثرب" ہی کہتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ منافقین کے گروہ نے تو رسولؐ اللہ کو ہی تسلیم نہ کیا تھا تو بھلا وہ اس شہر کو آپ کے نام سے منسوب کرنا کب پسند کرتے تھے۔ بہرحال ان تمام باتوں سے غزوۂ احزاب سے پہلے یثرب کا مدینہ کی حیثیت سے مشہور ہونا قرینِ صواب ہے اور بالفرض محال اگر ۵ھ سے پہلے "مدینہ" کا مشہور و متداول ہونا تسلیم نہ کیا جائے تو یہ بات طے ہے کہ ۵ھ کے بعد اس نے رواج پایا۔
لہٰذا یہ کہنا بھی علمی زیادتی ہے کہ "یہ نام بعد کی پیداوار ہے"۔

(Gibb, H.A.R., and Kramers J.H. (edd), Shorter Encyclopaedia of Islam, F.J. Brill, Leiden, 1953, p. 291)

[۱۵۹] مدینہ کا پہلا شخص جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے متاثر ہوا سوید بن الصامت تھا۔ اپنی بہادری، سرداری، عالی نسبی اور شاعری وغیرہ کی وجہ سے اہلِ مدینہ میں اسے ایک خاص مقام حاصل تھا اور لوگوں نے اسے "کامل" کا خطاب دے رکھا تھا۔ جنگِ بعاث سے کچھ عرصہ پہلے وہ مکہ آیا تو اس کی ملاقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہُوئی۔ اس زمانہ میں رسولؐ اللہ کا معمول یہ تھا کہ آپ موسمِ حج وغیرہ میں جہاں آپ کو کسی کے بارے میں یہ اطلاع ملتی کہ فلاں شخص نامور ہے اور اپنی قوم کا سربرآوردہ ہے تو آپ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اسے اللہ کی طرف بلاتے اور اپنے اصول اس کے سامنے بیان فرماتے۔ رسولؐ اللہ نے سوید کو بھی دعوتِ اسلام دی۔ سوید نے اس کے جواب میں کہا کہ ایک ایسی ہی چیز میرے پاس بھی ہے یعنی صحیفۂ لقمان۔ حضورؐ نے فرمایا:

ان ھذا الکلام، حسن، والذی معی افضل من ھذا قرآن انزلہ اللہ علی ھو ھدیً و نور۔

(بے شک یہ کلام تو اچھا ہے مگر جو چیز میرے پاس ہے وہ اس سے بہتر ہے یعنی قرآن جسے اللہ نے مجھ پر نازل کیا ہے اور جو سراپا ہدایت و نور ہے)

پھر رسولؐ اللہ نے اسے قرآن پڑھ کر سنایا اور اسلام کی دعوت دی۔ تو یہ پیغام اس کے دل میں گھر کر گیا اور وہ پکار اُٹھا کہ: "ان ھذا القول حسن"۔ (بے شک یہ کلام تو بہت خوب ہے)

پھر یہ واپس مدینہ پہنچا۔ لیکن جلد ہی خزرجیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بارے میں لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ وہ مسلمان ہونے کی حیثیت میں قتل ہُوا۔ اس کا قتل جنگِ بعاث سے پہلے کا واقعہ ہے (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۶۷ تا ۶۹)۔ دعوت اسلام سے بہرہ اندوز ہونے والا دوسرا شخص ایاس بن معاذ تھا۔ یہ اہلِ مدینہ کے اس وفد میں شامل تھا جو جنگِ بعاث سے پہلے خزرج کے خلاف قریش سے حلیفانہ معاہدہ کرنے اور امداد حاصل کرنے آیا تھا

رسولؐ اللہ نے اس وفد کی آمد کی خبر سنی تو معمول کے مطابق دعوت پیش کی، قرآن سنایا۔ ایاس نے جو اس وقت کم سن نوجوان تھا کہا کہ "اے قوم! واللہ یہ تو اس سے بہتر ہے جس کے لئے تم آئے ہو۔" اس پر وفد کے ایک رکن ابوالحیسر انس نے مٹی ایاس کے منہ پر ماری اور کہا "ہمارے درمیان سے نکل جاؤ۔" اس کے بعد یہ لوگ مدینہ چلے گئے پھر جب جنگِ بعاث چھڑ گئی اور اس کے چند روز بعد ہی ایاس کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت تکبیر اس کی زبان پر تھی (ایضاً ص ۶۹، ۷۰) سوید اور ایاس کے بعد رسولؐ اللہ کی دعوت اہلِ مدینہ کے اس چھ نفری گروہ تک پہنچی جو عقبہ کے مقام پر آپ سے ملا تھا۔ ابنِ سعد کی ایک روایت کے مطابق اسعد ابن زرارہ اہلِ مدینہ میں سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلام قبول کیا اور مکہ میں حضورؐ سے ملاقات کی۔ دیکھیے: ابنِ سعد، ج ۳، ص ۶۰۸، ۶۰۹)۔

[۱۶۰] اوس اور خزرج کے قبائل سیلِ عرم کے بعد یمن سے نکلے اور مدینہ میں چاہ صرار کے پاس آکر اُترے (ابنِ خلدون، ج ۲، ص ۲۸۷۔ مارگولیتھ نے بھی اسے تسلیم کیا ہے، MARGOLIOUTH, P. 60) ابنِ سعد نے ان دونوں کا پورا سلسلۂ نسب نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ اوس و خزرج کی ماں قیلہ بنت کاہل بن عذرہ تھی (ابن سعد، ج ۳، ص ۴۱۹) نہ معلوم دائرہ معارف اسلامیہ میں ماں کا نام قیلہ بنت الارقم کیوں لکھا ہوا ہے) ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اور دیگر۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ دانش گاہ پنجاب۔ لاہور۔ ۱۹۶۸ء، ج ۳، ص ۷۴۵) بہرحال یہ بات طے ہے کہ اپنی ماں کی وجہ سے ہی وہ بنو قیلہ یا ابنائے قیلہ کہلاتے ہیں۔ جب اوس اور خزرج مدینہ آئے تو وہاں مختلف یہودی قبائل آباد تھے مثلاً بنو ثعلبہ، بنو زرعہ، بنو قینقاع، بنو زید، بنو نضیر، بنو قریظہ (یہ دونوں کاہان کہلاتے تھے)، بنو عوف، بنو قصیص یا عصیص اور بنو بہدل وغیرہ (ابن خلدون ج ۲ ص ۲۸۷) سمہودی نے بجائے بہدل کے ہدل دیا ہے (السمہودی ج ۱ ص ۱۱۵) مدینہ میں اس وقت چونکہ غلبہ یہود کو حاصل تھا اس لئے اچھے نخلستان اور املاک ان کے ہاتھ نہ آئیں بلکہ چند جوہڑ، معمولی اور بنجر زمینیں اور کچھ مویشی بنو قیلہ کے پاس تھے ایک عرصہ تک یہ اسی حالت میں رہے یہاں تک کہ مالک بن عجلان کی کوششوں اور ابو جبلہ غسانی کی امداد سے اوس اور خزرج کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ بہت سے سردارانِ یہود قتل ہوئے۔ جس کا نتیجہ ایک تو یہ نکلا کہ ان کے درمیان عداوت کا بیج پڑ گیا اور دُوسرا یہ کہ یہود نے سہم کر ان سے امداد اور دوستی کی درخواست بھی کی۔ ایک مدت تک اوس اور خزرج کو مدینہ میں شوکت و سیادت حاصل رہی تا آنکہ ان کے ہمسایہ مغربی قبائل ان سے عہد وفا استوار کرنے لگے۔ لیکن بعد میں اوس اور خزرج کی باہمی خونریزیوں نے نہ صرف ان کی شوکت و سطوت کا خاتمہ کر دیا بلکہ ان کی ہوا اُکھڑ گئی۔ یہود نے ان سے پیمانِ صلح توڑ دیا۔ یہود کو غلبہ حاصل ہو گیا (ابنِ خلدون ج ۲ ص ۲۸۷، ۲۸۸۔ نیز السمہودی ج ۱ ص ۱۲۵ تا ۱۴۴)۔ اور اوس و خزرج خائب و خاسر ہو کر رہ گئے۔ خاص طور پر ان کی آخری جنگ نے جو بعاث کے نام سے مشہور ہے ان کو بالکل خستہ و نزار کر دیا تھا جیسا کہ ہم متن میں کئی جگہ صراحت کر چکے ہیں۔

[۱۶۱] یہود (یا بنی اسرائیل) کی تاریخ بہت پُرانی بھی ہے اور دردناک بھی۔ یہ لوگ فرعون آمن حوطف سوم (م ۱۲۷۵ ق م) کے زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رہنمائی میں مصر سے نکلے۔ (تفصیلات کے لئے

Breasted, James, A

History of Egypt (From the Earliest times to the Persian Conquest), Hodder and Stoughton, London, 1952.

اس کے بعد آزادی پائی۔ پھر دشت نوردی کرکے بالآخر فلسطین پہنچے لیکن کچھ ہی عرصہ میں خانہ جنگیوں کے شکار ہو کر ذلیل وخوار ہو گئے یہاں تک کہ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں عظیم الشان سلطنت کے مالک ہو سے لیکن بعد میں پھر خانہ جنگیوں، باہمی اختلافات اور اندرونی چپقلش میں مبتلا ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہوئے اور تتر بتر ہو گئے۔ جہاں تک جزیرہ نمائے عرب میں یہود کی تاریخ کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں کوئی مستند تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے، نہ تو انہوں نے خود کوئی ایسی تحریر یا کتاب چھوڑی جس سے ان کے ماضی پر کوئی روشنی پڑ سکے اور نہ عرب سے باہر کے مورخین نے ان کا کوئی ذکر کیا۔ اس لئے یہود عرب کی تاریخ کا بیشتر انحصار ان زبانی روایات پر ہے جو اہل عرب میں مشہور تھیں (مودودی۔ تفہیم القرآن۔ ادارہ ترجمان القرآن۔ لاہور۔ ۱۹۷۱ء۔ ج ۵، ص ۲۷۰) ان کی رُو سے یہود کی سب سے پہلی ہجرت خود حضرت موسیٰؑ کے آخر عہد میں ہوئی۔ (تفصیل کے لئے: یاقوت حموی۔ ج ۵، ص ۸۴، ۸۵۔ السمہودی ج ۱ ص ۱۱۱۔ نیز MARGOLIOUTH, P.59,60.) دوسری ہجرت یہودیوں کی اپنی روایت کے مطابق ۵۸۷ ق م میں ہوئی (مودودی۔ ج ۵، ص ۲۷۱) تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ ۷۰ء میں رومیوں نے فلسطین میں یہودیوں کا قتل عام کیا اور پھر ۱۳۲ء میں انھیں اس سرزمین سے نکال باہر کیا۔ اس دور میں بہت سے یہودی قبائل بھاگ کر حجاز میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ کیونکہ یہ علاقہ فلسطین کے جنوب میں متصل ہی واقع تھا۔ یہاں آکر انھوں نے جہاں جہاں چشمے اور سرسبز مقامات دیکھے وہاں ٹھہر گئے اور پھر رفتہ رفتہ اپنے جوڑ توڑ اور سُود خواری کے ذریعہ سے ان پر قبضہ جما لیا۔ ایلہ، مقنا، تبوک، تیماء، وادی القریٰ، فدک اور خیبر پر ان کا تسلط اسی دور میں قائم ہُوا اور بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی بہدل اور بنی قینقاع بھی اسی دور میں آکر مدینہ پر قابض ہوئے (ایضاً ج ۵، ص ۲۷۱۔ نیز MARGOLIOUTH, P.60.) اس کے تقریباً تین صدی بعد ۴۵۰ یا ۴۵۱ء میں یمن کے اس سیلاب عظیم کا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے قوم سبا کے مختلف قبیلے یمن سے نکل کر عرب کے اطراف میں پھیل جانے پر مجبور ہونے (ایضاً ج ۵ ص ۲۷۱۔ مزید تفصیل اور حوالے کے لئے: السمہودی۔ ج ۱ ص ۱۱۱ تا ۱۱۶۔ ابن خلدون ج ۲ ص ۲۸۶، ۲۸۷ اور مجیب اللہ ندوی۔ اہل کتاب صحابہ و تابعین۔ معارف پریس اعظم گڈھ۔ ۱۹۵۱ء ص ۲ تا ۶)

یہ ہم پچھلے حاشیہ میں بیان کر چکے ہیں کہ اوس اور خزرج کے قبائل پر جو ان کے بعد مدینہ میں آباد ہوگئے یہود کو غلبہ کس طرح حاصل ہوا۔

رسول اللہؐ کی آمدِ مدینہ سے قبل یہود کو عرب میں بالعموم اور حجاز میں بالخصوص جو مقام حاصل تھا اسے سمجھنے کے لئے یہود کی کچھ اہم خصوصیات اور ان کے نمایاں خدوخال کو سامنے رکھنا ہوگا۔

(۱) زبان، لباس، تہذیب، تمدن ہر لحاظ سے انھوں نے پُوری طرح عربیت کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ ان کی غالب اکثریت کے نام تک عربی ہو گئے (مودودی۔ (تفہیم) ج ۵ ص ۳۷۲) شاید اسی لئے مغربی علما اور مستشرقین کو یہ متعین کرنے میں دقت پیش آئی کہ وہ عربی قبائل ہیں یا باہر سے آئے ہیں۔ حالانکہ جدید تحقیق کے مطابق حجازی یہود، اصل میں بنی اسرائیل سے تعلق رکھتے تھے اور عربی قبائل نہیں تھے (دروزۃ۔ محمد عزۃ۔ عصر النبی۔ دار الیقظۃ العربیۃ۔ بیروت ۱۹۶۴ء ص ۱۷۷)

(۲) یہود چونکہ کتاب و شریعت کے حامل تھے اور نسلی فخر و غرور اور تعصب ان میں بہت پایا جاتا تھا اس لئے وہ اہلِ عرب کو اُمّی (GENTILES) کہتے تھے جس کے معنی صرف اَن پڑھ کے نہیں بلکہ وحشی اور جاہل کے بھی ہیں۔ (مودودی۔ ج ۵ ص ۳۷۲) ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان امیوں کو وُہ انسانی حقوق حاصل نہیں ہیں جو اسرائیلیوں کے لئے ہیں۔ اور ان کا مال ہر جائز و ناجائز طریقے سے مار کھانا اسرائیلیوں کے لئے حلال و طیب ہے۔ (ایضاً) یہود کی اس تفوق پسندی کو اس لئے اور بھی ترقی ہوتی رہی کہ عام عرب انھیں حاملانِ دین و شریعت ہونے کی وجہ سے اپنے آپ سے برتر سمجھتے تھے اور دینی معاملات میں ان سے رہنمائی کے طالب ہوتے تھے۔ چنانچہ قریش نے ہی متعدد بار اپنے وفود مدینہ کے پاس اس لئے بھیجے کہ وہ آپ کی نبوت اور آپ کی صفات کتب سابقہ کی روشنی میں ان سے دریافت کریں (مجیب اللہ ندوی۔ ص ۳۰)۔ عام عربوں کے علاوہ دینی لحاظ سے یہود کی برتری کا سکّہ اوس اور خزرج پر تو یہاں تک قائم تھا کہ جب ان کے بچے زندہ نہیں بچتے تھے تو وہ منت مانتے تھے کہ بچہ زندہ رہ جائے گا تو اسے یہودی بنائیں گے (ابوداؤد۔ سنن۔ اصح المطابع۔ کراچی۔ ۱۳۶۹ھ۔ ج ۲۔ ص ۳۶۵۔ کتاب الجہاد۔ باب فی الاسیر یکرہ علی الاسلام) چنانچہ مدینہ میں اس طرح کے بہت سے جدید الیہودیہ افراد موجود تھے (مجیب اللہ ندوی، ص ۳۰)۔

(۳) یہودیوں کی معاشی اور اقتصادی حالت بہت اچھی تھی۔ اور اس اعتبار سے بھی وہ دیگر عرب قبائل پر فوقیت رکھتے تھے۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ فلسطین و شام کے متمدن علاقوں سے آئے تھے۔ اس لئے وہ بہت سے ایسے فنون جانتے تھے جو اہلِ عرب میں رائج نہ تھے اور باہر کی دنیا سے ان کے کاروباری تعلقات بھی تھے (مودودی۔ ج ۵، ص ۳۷۳، ۳۷۴) قریشِ مکہ جن کی تجارت ضرب المثل ہے وُہ بھی بعض اوقات مثلاً شادی بیاہ کے مواقع پر خیبر کے یہودیوں سے زیورات کرائے پر لیجاتے تھے (مجیب اللہ ندوی، ص ۳۰)۔ مدینہ میں چونکہ اوس اور خزرج کے قبائل مالی لحاظ سے کمزور ہو گئے تھے اس لئے وہ عام طور پر یہود کے مقروض تھے (مجیب اللہ ندوی۔ ص ۳۰) بلکہ یہود کو وہ خراج ادا کرتے تھے (یاقوت حموی۔ ج ۵۔ ص ۸۳) اگر ایک طرف ان کے تجارتی و مالی مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ عربوں میں سے کسی سے نہ بگاڑیں تو دوسری طرف ان کے مفاد کا تقاضا یہ بھی تھا کہ عربوں کو باہم متحد نہ ہونے دیں اور

انھیں ایک دوسرے سے لڑاتے رہیں (مودودی - ج ۵ - ص ۴، ۳) -
(۴) عرب کا معاشرتی نظم قبائلی تھا اس لئے یہود کے ہر قبیلے کو بھی اپنی حفاظت کے لئے کسی نہ کسی طاقتور عرب سے حلیفانہ تعلقات بھی قائم کرنے پڑتے تھے تاکہ کوئی دوسرا زبردست قبیلہ ان پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ اس بنا پر بارہا انھیں نہ صرف ان عرب قبائل کی باہمی لڑائیوں میں حصہ لینا پڑتا تھا بلکہ بسا اوقات ایک یہودی قبیلہ اپنے حلیف عرب قبیلے کے ساتھ مل کر دوسرے یہودی قبیلہ کے خلاف جنگ آزما ہو جاتا تھا جس کے حلیفانہ تعلقات فریق مخالف سے ہوتے تھے (مودودی ج ۵ ص ۴، ۳) چنانچہ جنگِ بعاث کے موقع پر یہ تصویر واضح ہو جاتی ہے۔

بہر حال جیسا کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے کہ "عہدِ نبویؐ کے آغاز پر یہودی ہم کو عرب کے ہر حصہ میں ملتے ہیں۔ ٹھوس بستیوں میں بھی اکّے دُکّے بھی بلکہ بستیوں کا ایک زنجیر نظر آتا ہے جو ایلہ (عقبہ)، مقنا، خیبر، وادی القریٰ، تیماءَ، فدک، مدینہ (یثرب) اور طائف و جرش سے لے کر یمن اور عمان و بحرین تک عرب میں شمالاً جنوباً چلا گیا تھا (ڈاکٹر حمید اللہ - رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی - دار الاشاعت - کراچی - سنہ ۱۹۶۱ء ص ۲۱۰)۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد رسول اللہؐ اور یہود سے تعلقات پر بحث مقالہ میں کی گئی ہے، اس لئے مزید تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔

[۱۶۲] بعاث کی جنگ وہ جنگ تھی جس میں اوس اور خزرج باہم برسرِ پیکار ہوئے تھے۔ اس جنگ میں بالآخر خزرج پر اوس کو فتح حاصل ہوئی۔ اس وقت اوس کا سردار ابو اسید حضیر بن سماک الاشہلی اور خزرج کا سردار عمرو بن النعمان البیاضی تھا۔ یہ دونوں اس جنگ میں مارے گئے (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۲۰۴) اوس و خزرج کے مابین اگرچہ لڑائیاں بہت سی ہوئیں جو حربِ سمیر، حربِ کعب، حربِ حاطب، یوم السرارہ، یوم الربیع، یوم فارع، یوم البقیع، یوم معبس و مفرس وغیرہ کے ناموں سے مشہور ہیں (تفصیلات کے لئے: محمد احمد جاد، علی محمد البجاوی اور محمد ابو الفضل ابراہیم ایام العرب فی الجاہلیہ - مطبعہ عیسٰی البابی الحلبی - مصر - سنہ ۱۹۴۲ء ص ۶۲ اور ۳، تا ۴۷) - لیکن بعاث وہ آخری جنگ ہے جو مذکورہ گروہوں کے درمیان واقع ہوئی بلکہ ان کے ہمراہ ان کے اعوان و انصار نے بھی حصہ لیا۔ چنانچہ خزرج کے ساتھ ان کے حلیف اشجع اور جہینہ کے قبیلے تھے جبکہ اوس کے ساتھ مزینہ کے علاوہ قریظہ اور نضیر کے یہودی قبائل بھی تھے۔ اس جنگ کا آغاز بعثتِ نبویؐ سے قبل ہوا (ابنِ خلدون ج ۲ ص ۲۰۹) اور اختتام ہجرت سے چند سال پہلے ہوا۔

[۱۶۳] ولہازن اپنے مضمون The Tribal Life of the Epic Period میں رسول اللہؐ کی آمد سے پہلے حالات کی نقشہ کشی ان الفاظ پر ختم کرتا ہے کہ،

"Life was then indeed impossible" (زندگی فی الحقیقت ناممکن تھی)

ملاحظہ ہو:

Williams, Henry Smith (edd), The Historians History of the World, The Times, London, 1908, Vol.VIII, p. 291.

[۱۶۴] عبداللہ بن ابی سلول ایک خزرجی سردار تھا۔ بیعت عقبہ ثانیہ کے دوران موسم حج میں دیگر اہلِ مدینہ کے ساتھ مکہ گیا تھا قریش کو جب بیعت عقبہ ثانیہ کی بھنک پڑی اور وہ تحقیق حال کے لئے ابن ابی کے پاس پہنچے تو اس نے کہا تھا یہ بالکل جھوٹ ہے اگر یہ واقعہ پیش آتا تو مجھ سے ضرور مشورہ لیا جاتا (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۹۱) ابن ابی کی یہ توقع بےجا نہ تھی۔ کیونکہ اسے اہلِ مدینہ میں خاص مقام واہمیت حاصل تھی (ایضاً ج ۳ ص ۱۱۱) اور اس کی سرداری و عزت کا عالم یہ تھا کہ رسولؐ اللہ کی آمد سے پہلے اسے تاجدار بنانے کی تیاریاں پُورے زور شور سے ہو رہی تھیں اور اس کے لئے موتیوں کا ایک تاج بھی بن رہا تھا (ایضاً ج ۳ ص ۳۰۴)۔ مگر رسولؐ اللہ کے پہنچ جانے سے اس کا خواب شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکا۔ اس کا افسوس ابن ابی کو غالباً زندگی بھر رہا لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہ تھی کہ علی الاعلان رسولؐ اللہ کی مخالفت کر گزرتا اس لئے بظاہر اسلام قبول کر لیا۔ اور اس طرح منافقوں کا سردار بن گیا۔ ابن ابی نے رسولؐ اللہ کے خلاف اور اسلام کے رد میں جو سرگرمیاں روا رکھیں ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ ابن ابی کا انتقال ۹ھ میں ہوا۔ [۱۶۵] ایضاً ج ۳ ص ۳۰۴ [۱۶۶] ایضاً ج ۲ ص ۱،

[۱۶۷] البخاری۔ ج ۱۔ ص ۵۳۳ (کتاب المناقب) [۱۶۸] ابنِ ہشام۔ ج ۲۔ ص ۰،

[۱۶۹] سعید انصاری۔ سیر انصار۔ مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۳۴۳ھ۔ حصہ اول۔ ص ۰۴۔ نیز دیکھئے:

Watt, W. Montgomery, Muhammad at Mecca, Clarendon Press, London, 1953, p.144.

یہاں واٹ کی ایک توجیہہ قابلِ ذکر ہے۔ وُہ لکھتا ہے کہ "معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اہلِ مدینہ سرو جنگ سے اتنے عاجز آ چکے تھے کہ وُہ کسی بھی ایسے طریقے کو اپنانے کے لیے آمادہ تھے جو انھیں سکون و عافیت کی ضمانت مہیا کر سکے۔ اور یہ جذبہ اتنا مقبول بلکہ شدید تھا کہ عبداللہ ابن ابی جیسا شخص بھی اس کے خلاف نہ جا سکتا تھا خواہ یہ چیز اس کے ذاتی مفاد کے کتنے ہی خلاف کیوں نہ ہو" ملاحظہ ہو:

Watt, W. Montgomery, Islam and the Integration of Society, Routledge and Kegan Paul, London, 1961, p. 21.

[۱۷۰] ابنِ ہشام ج ۲ ص ۷۷ [۱۷۱] ابنِ ہشام کی روایت کے مطابق ان کے نام یہ ہیں:

(۱) ابو امامہ اسعد بن زرارہ (۲) عوف بن الحارث (۳) رافع بن مالک (۴) قطبہ بن عامر (۵) عقبہ بن عامر (۶) جابر بن عبداللہ (ج ۲ ص ۷۱، ۷۲)

ان لوگوں کی تعداد بعض نے آٹھ بیان کی ہے۔ اسعد بن زرارہ اور ابوالہیثم کا پہلے سے موجود ہونا ابن سعد نے لکھا ہے (ج ۱ ص ۲۱۸) جبکہ واقدی کا بیان ہے کہ اسعد بن زرارہ اس سے پہلے مکہ میں جا کر آنحضرتؐ پر

اسلام لا چکے تھے۔ بعض نے ابوالہیثم کی جگہ عقبہ بن عامر کا نام لیا ہے اور بعض نے جابر بن عبداللہ کے بجائے عبادہ بن الصامت کو جگہ دی ہے۔ (شبلی ج ۱ ص ۲۶۳)

[۱۷۲] ابنِ ہشام ج ۲ ص ۷۳۔

[۱۷۳] ابن سعد ج ۱ ص ۲۲۰۔ واضح رہے کہ اس بیعت کو اصطلاحاً "بیعت النساء" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۷۳)

[۱۷۴] اس بات میں مورخین کے درمیان اختلاف ہے کہ اہلِ مدینہ نے معلّم کی درخواست کب اور کس طرح کی تھی۔ ابنِ ہشام کے اس بیان سے کہ "بعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معہم مصعب" (ج ۲ ص ۷۶) سے مترشح ہوتا ہے کہ بیعت کے موقع پر ہی اُنھوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ جبکہ ابنِ سعد نے لکھا ہے کہ جب بیعتِ عقبۂ اُولیٰ کے بارہ آدمی مدینہ واپس پہنچے اور انصار کے گھر گھر اسلام پھیل گیا تو انھوں نے ایک آدمی کے ذریعہ رسول اللہ کو خط لکھا جس میں مذکورہ خواہش کا اظہار تھا (ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۲۰ اور ج ۳ ص ۱۱۸)۔ نیز دیکھئے، البلاذری۔ احمد بن یحییٰ۔ انساب الاشراف۔ تحقیق۔ الدکتور محمد حمید اللہ۔ معہد المخطوطات۔ جامعۃ الدول العربیۃ دار المعارف۔ مصر۔ ۱۹۵۹ء (ج ۱ ص ۲۳۹)

[۱۷۵] مصعب نام، ابو محمد کنیت، والد کا نام عمیر اور والدہ کا خناس بنت مالک تھا۔ پورا سلسلۂ نسب یہ ہے، مصعب بن عمیر بن ہاشم بن عبد مناف بن عبدالدار بن قصی (ابن سعد ج ۳ ص ۱۱۶) بچپن میں ان کی پرورش انتہائی نازونعم میں ہوئی، خود رسول اللہ کا یہ ارشاد تھا کہ "میں نے مکہ میں مصعب سے زیادہ کوئی حسین، خوش پوشش اور پروردہ نعمت نہیں دیکھا لیکن اسلام لانے کے بعد اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں خستہ حال ہو گئے"۔ (ایضاً ص ۱۱۶، ۱۱۷) اس وقت ایمان لائے جبکہ رسول اللہ کا قیام دار ارقم میں تھا۔ حبشہ ہجرت کی۔ پھر بیعتِ عقبہ کے بعد بطور معلّم و قاری مدینہ بھیجے گئے (جس کی تفصیل پہلے آ چکی ہے)۔ اس دوران ان کی پُر خلوص کوششوں کی وجہ سے مدینہ کے بڑے بڑے سردار مثلاً سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر وغیرہ نے اسلام قبول کیا اور بہت ہی قلیل عرصہ میں اسلام انصار کے گھر گھر پھیل گیا (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۷۹، ۸۰) حضور کی اجازت سے انھوں نے سب سے پہلے نمازِ جمعہ باجماعت (کی روایت قائم کی (ایک روائے کے مطابق جمعہ پہلی مرتبہ اسعد بن زرارہ نے قائم کیا تھا۔ ابنِ سعد ج ۳ ص ۱۱۸) بیعت عقبۂ ثانیہ کے بعد مکہ ہی میں قیام کیا، یہاں تک کہ رسول اللہ کے سفرِ ہجرت سے چند دن قبل یعنی یکم ربیع الاول ۱۳ نبوی کو عازمِ مدینہ ہوئے (ایضاً ص ۱۱۹) اور مدینہ پہنچ کر حضرت سعد بن معاذ کے مکان پر اترے (ایضاً ص ۱۱۷) ہجرتِ مدینہ کے بعد ان کی مواخات حضرت ابوایوب انصاری سے (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۵۲) یا سعد بن ابی وقاص یا ذکوان بن عبد قیس (ابن سعد ج ۳ ص ۱۲۰) سے ہوئی) غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تو سفید علم (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۶۴) یعنی مہاجرین کا بڑا جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھا (ابنِ سعد ج ۳ ص ۱۲۰)، اور یہ عجیب اتفاق تھا کہ دوسری طرف قریش کی جانب النضر بن الحارث کے بعد مشرکین کا علمبردار ان کا بھائی ابوعزیز

ن عمیر تھا جو بالآخر قید ہوا اور چار ہزار درہم کے فدیہ پر رہا ہوا (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۳۰۰)۔ غزوۂ اُحد میں بھی علم بردار مصعب بن عمیر ہی تھے۔ آخر وقت تک علم کو نیچے نہ گرنے دیا۔ اسی غزوہ میں شہادت پائی۔ شہادت کے وقت عمر چالیس سال یا کچھ زائد تھی (ابنِ سعد ج ۳ ص ۱۲۲) مزید حوالے کے لئے دیکھئے؛ ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب۔ مطبعہ دائرۃ المعارف النظامیہ۔ دکن سنہ ۱۳۳۶ھ (ج ۱ ص ۲۷۹)۔ نیز ابن حجر العسقلانی۔ الاصابہ فی تمیز الصحابہ۔ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ۔ مصر۔ سنہ ۱۹۳۹ء۔ (ج ۳ ص ۴۰۱)۔

[۱۷۶] ان گھرانوں کے نام یہ ہیں؛

بنی امیہ بن زید، خطمہ، وائل اور واقف (یہ اوس اللہ کہلاتے تھے اور اوس بن حارثہ کی اولاد تھے۔ انھیں اسلام سے روکنے میں ان کا قائد اور شاعر ابو قیس بن لاسلت صیفی پیش پیش تھا۔ اسی کی وجہ سے کم و بیش غزوۂ خندق تک یہ گھرانے اور وُہ خود بھی دولتِ اسلام سے محروم رہا۔ (ابن ہشام ج ۲ ص ۰۰)

[۱۷۷] ایضاً ج ۲ ص ۷۷۔ [۱۷۸] آل عمران (۱۰۳) [۱۷۹] الانفال (۶۳)

[۱۸۰] Muir, William, The Life of Mahomet, Smith-Elder & Co., London, 1858, Vol.II, p. 217.

[۱۸۱] طبری کی روایت ہے کہ مصعب موسمِ حج سے کچھ پہلے مکہ آئے تھے۔ اور پھر بعد میں مدینہ کے مسلمان دوسرے مشرکوں کے ساتھ ادائیگی فریضۂ حج کے لئے آئے (طبری ج ۲ ص ۳۶۰)۔ محمد حسین ہیکل نے بغیر کسی حوالے کے یہ لکھا ہے کہ حضرت مصعب بہت پہلے یعنی رجب سنہ ۱۲ نبوی میں مکہ آ گئے تھے (ہیکل، محمد حسین، حیاۃ محمد۔ مکتبہ النہضہ المصریہ۔ قاہرہ سنہ ۱۹۴۷ء۔ ص ۲۰۲)

[۱۸۲] اسلامی تاریخ کے تقریباً تمام مآخذ میں عقبہ کی اس ملاقات کے لئے "اوسط ایام التشریق" (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۸۱ مزید حوالے کے لئے؛ طبری ج ۲ ص ۳۶۰، ابن عبد البر۔ الدرر فی اختصار المغازی والسیر۔ لجنۃ احیاء التراث الاسلامی۔ مصر۔ سنہ ۱۹۶۶ء۔ مطبعۃ السعادۃ۔ مصر سنہ ۱۹۳۲ء ج ۳ ص ۱۵۸ نیز ابنِ کثیر کی کتاب، السیرۃ النبویہ۔ مطبعۃ عیسیٰ البابی حلبی۔ قاہرہ سنہ ۱۹۶۴ء ج ۲ ص ۱۹۲ وغیرہ وغیرہ) کی ایک رات کو مقرر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ تعین کچھ مبہم ہے۔ اس لئے ابنِ سعد کے بیان "ایام التشریق لیلہ النفر الاوّل (ج ۱ ص ۲۲۱) سے اس کی تصریح ہو جاتی ہے۔ اور البلاذری نے اس کی مزید تشریح یوں کر دی ہے کہ: "اللیلہ التی صبحتہا النفر الآخر باسفل العقبہ ویقال فی اللیلۃ التی صبحتہا النفر الاوّل"۔ (انساب ج ۱ ص ۲۵۴)۔ بہر حال اگر النفر الاوّل کو مانا جائے تو اس سے مراد ۱۲ ذی الحجہ ہے (MUIR. P. 233. حاشیہ)

[۱۸۳] ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ اہلِ مدینہ کی کل تعداد پچھتر تھی یعنی ۷۳ مرد اور دو عورتیں (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۹۷۔ ناموں کی تفصیل کے ساتھ) البلاذری نے (الانساب الاشراف میں) ستّر بتائی ہے بلکہ عنوان ہی یہ قائم کیا ہے کہ تسمیۃ

السبعین الذین بایعوا عند العقبۃ (ج ۱ ص ۲۴۰) البتہ ابن حزم نے ابنِ ہشام کی متابعت میں تعداد پچھتّر ہی بتائی ہے (ابنِ حزم - جوامع السیرۃ ص ۷۵) یہی بیان السہیلی (الروض الانف۔ مطبعۃ الجمالیہ - مصر ۱۹۱۴ء ج ۱ ص ۲۷۵) کا بھی ہے۔ [۱۸۴] ابنِ ہشام ج ۲ ص ۸۴۔

[۱۸۵] اس موقع پر دورانِ گفتگو حضرت عباس بن عبدالمطلب نے حاضرین کو خبردار کیا تھا کہ باتیں آہستہ اور مختصر کی جائیں اس لئے کہ جاسوس لگے ہوئے ہیں (ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۲۲) جبکہ الہیثمی کی روایت کردہ حدیث کے مطابق مقامِ عقبہ پر پہنچتے ہی رسولؐ اللہ نے یہ ہدایت فرمادی تھی کہ :

" اوجزوا فی الخطبہ فانی اخاف علیکم کفار قریش " (الہیثمی ، نورالدین علی بن ابی بکر۔ مجمع الزوائد و منبع الفوائد۔ مکتبۃ القدس - قاہرہ - ۱۳۵۳ھ - ج ۶ ص ۴۷)

[۱۸۶] عام طور پر مورخین نے ان تمام باتوں کا یکجا ذکر نہیں کیا ہے۔ ہم نے یہاں مجموعی طور پر تمام روایات کا خلاصہ دے دیا ہے۔ تفصیلات اور حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو :

ابنِ ہشام (ج ۲ ص ۸۴ ، ۸۵ ، ۹۷) ، ابنِ سعد (ج ۱ ص ۲۲۲) ، الیعقوبی (تاریخ الیعقوبی ، دارصادر ، بیروت ۱۹۶۰ء - ج ۲ ص ۳۸) ، طبری (ج ۲ ص ۳۶۲ ، ۳۶۳) ، ابنِ حزم (ص ۷۴) ، ابنِ عبدالبر (الدرر ص ۷۴) ، ابن سیدالناس (ج ۱ ص ۱۶۵) ، الذہبی (تاریخ الاسلام وطبقات المشاہیر والاعلام - مکتبۃ القدس قاہرہ ۱۳۶۷ھ ج ۱ ص ۱۸۱) ، ابنِ قیم (زادالمعاد فی ہدی خیر العباد مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی ، مصر ۱۹۵۰ء ج ۲ ص ۵۱) ، ابنِ کثیر (البدایہ ج ۳ ص ۱۵۹ ، ۱۶۰ ، ۱۶۳ ، ۱۶۴ ، السیرۃ ج ۲ ص ۱۹۵) ، ابنِ خلدون (ج ۲ ، بقیہ الجزء الثانی ص ۱۲) ، الہیثمی (ج ۶ ص ۴۷ ، ۴۸ ، ۴۹) وغیرہ۔

[۱۸۷] عباس نام ، قبیلہ خزرج سے ہیں۔ نسب نامہ یہ ہے :

عباس بن عبادہ بن نضلہ بن مالک بن عجلان بن زید بن غنم بن سالم بن عوف بن عمرو بن عوف بن الخزرج - بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تھے (جیساکہ خود ان کی مذکورہ تقریر سے ثابت ہے)۔ بیعت کے بعد مکہ ہی میں مقیم ہو گئے پھر ہجرت کرکے دیگر مہاجرین کے ہمراہ مدینہ آئے اس بنا پر وہ مہاجری انصاری ہیں (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۰۷) وہ رسولؐ اللہ کے مہمان یعنی اصحابِ صُفّہ میں داخل تھے۔ مدینہ آکر حضرت عثمان بن مظعون سے مواخاۃ ہوئی بدر میں شریک نہ تھے۔ غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے اور لڑکر شہادت پائی (سیدِ انصاری ج ۲ ص ۸۹ ، ۹۰)۔

[۱۸۸] ابنِ ہشام ج ۲ ص ۸۸ ، ۸۹۔

[۱۸۹] اسعد نام ، ابوامامہ کنیت ، خیر لقب ، قبیلہ خزرج سے تھے اور نجار کے خاندان سے وابستہ تھے۔ نسب نامہ یہ ہے :

اسعد بن زرارہ بن عدس بن عبید بن ثعلبہ بن غنم بن مالک بن النجار (ابن سعد ج ۳ ص ۱۰۸)

اپنی فطرتِ سلیمہ کی بنا پر کفر و شرک سے متنفر تھے۔ ایک روایت کے بموجب اہلِ مدینہ میں سب سے پہلے ایمان لانے والے یہی تھے (ایضاً) اور انھوں نے ہی سب سے پہلے حضورؐ سے مکہ میں ملاقات کی تھی (ایضاً ص ۶۰۹) عقبہ اولیٰ اور ثانیہ دونوں میں شریک تھے۔ اور عقبہ ثانیہ کے موقع پر جو تقریر کی وُہ آگے ہم نے نقل کی ہے۔ اسی موقع پر انھیں بنو نجار کا نقیب مقرر کیا گیا۔ نقبأ میں یہ سن و سال کے لحاظ سے اگرچہ سب سے کم تھے لیکن ابنِ سعد کے بقول "رأس النقباء" (ج ۳ ص ۶۱۱) اور البلاذری کی روایت کے مطابق رسولؐ اللہ نے انھیں "نقیب النقباء" بنایا تھا (البلاذری۔ الانساب، ج ۱ ص ۲۴۳) رسولؐ کی آمدِ مدینہ سے قبل اسعد لوگوں کے ساتھ پنج وقتہ نمازیں ادا کرتے تھے۔ اور نماز با جماعت کا اہتمام بھی کر رکھا تھا۔ جب حضرت مصعب مدینہ پہنچے تو وہ بھی ان حضرات کے ساتھ نمازیں ادا کرتے تھے اور رسولؐ اللہ کے حکم سے نمازِ جمعہ کا اہتمام کرتے تھے (ابنِ سعد ج ۳ ص ۶۰۹) یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ایک روایت کے مطابق اسعد بن زرارہ ہی پہلے شخص تھے جنھوں نے مدینہ میں جمعہ کی بنیاد ڈالی (ابن ہشام ج ۲ ص ۷۷) اس دوران حضرت مصعب کا قیام بھی اسعد کے گھر میں رہا (ایضاً ص ۷۶)۔

ہجرتِ نبویؐ کے وقت اگرچہ رسولؐ اللہ کا قیام ابو ایوب انصاری کے یہاں رہا تاہم آپ کی اونٹنی اسعد بن زرارہ کی مہمان تھی (ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۳۷) حضرت اسعد کی عمر نے مزید وفا نہ کی اور جلد ہی شوال سنہ ۱ھ میں یعنی جبکہ مسجد نبویؐ کی تعمیر ہو رہی تھی کہ آپ کا انتقال ہو گیا (ایضاً ج ۳ ص ۶۱۱) قبرستانِ بقیع میں دفن ہونے والے پہلے مسلمان ہیں (ایضاً ص ۶۱۲) اسعد چونکہ بنو نجار کے نقیب تھے اس لیے وفات کے بعد انھوں نے رسولؐ اللہ سے کسی دُوسرے کو ان کا نقیب مقرر کرنے کی درخواست کی۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا: "میں تمہارا النقیب ہوں۔" (ایضاً ص ۶۱۱)۔ معلوم ہوتا ہے کہ نقبأ کا ادارہ اس وقت بھی موثر تھا

[۱۹۰] ابنِ سید الناس ج ۱ ص ۱۶۵۔ ابنِ سعد نے اسعد بن زرارہ کی جو تقریر نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:
یا ایھا الناس ھل تدرون علی ما تبایعون محمدًا! انکم تبایعونه علیٰ ان تحاربوا العرب والعجم والجن والانس مجلبةً۔ (ابن سعد ج ۳ ص ۶۰۹) [۱۹۱] ابنِ ہشام ج ۲ ص ۸۹۔

[۱۹۲] بیعت العقبۃ الاولیٰ کو "بیعۃ النسأ" اور بیعت العقبۃ الثانیہ کو "بیعت الحرب" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ موخرالذکر کی توجیہ یہ ہے کہ اس بیعت میں اہلِ مدینہ نے جہاد، کفار سے لڑنے اور حضورؐ کی جان کی حفاظت و دفاع کرنے پر بیعت کی تھی اس بیعت کے موقع پر براؔ بن معرور نے اہلِ مدینہ کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا تھا۔ "یا رسول فنحن واللہ ابناء الحروب و اھل الحلقة" (ابن ہشام ج ۲ ص ۸۵) اور عباس بن نضلہ نے اپنے ہم وطنوں کو خبردار کیا تھا کہ "انکم تبایعونه، علی حرب الاحمر والاسود من الناس" (ایضاً ص ۸۸) اور ان ہی عباس نے رسولؐ اللہ سے جنگ کی اجازت مانگی تھی اور کہا تھا کہ:
والله الذی بعثك بالحق ان شئت لنميلين علیٰ اهل منیٰ غداً باسيافنا؟ قال فقال رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم نومر بذٰلک (ایضاً ص ۹۰)

صرف یہی نہیں کہ اہلِ مدینہ اور اہلِ ایمان ہی بیعتِ مذکورہ کو ہمہ گیر جنگ کا پیش خیمہ سمجھ رہے تھے بلکہ اس حقیقت کا احساس قریشِ مکہ میں بھی موجود تھا چنانچہ شب عقبہ کے بعد صبح کو خزرجیوں سے تفتیشِ حال کے لئے ان الفاظ کا سہارا لیا تھا کہ:

یا معشر الخزرج انہ قد بلغنا انکم قد جئتم الیٰ صاحبنا ھذا تستخرجونہ من بین اظھرنا وتبایعونہ علیٰ حربنا؟ (ایضاً ص ۹۰)

یہاں بخاری کی اس روایت سے غلط فہمی نہ ہونی چاہئے جس میں یہ مذکور ہے کہ عقبۂ ثانیہ کی شرائط میں شرک، چوری، زنا، قتلِ اولاد سے اجتناب شامل تھا (البخاری، صحیح۔ اصح المطابع۔ دہلی ۱۹۳۸ء ج ۱ ص ۵۵۰ کتاب المناقب) کیونکہ تمام مورخین اور اصحابِ سیر اس پر متفق ہیں کہ یہ عقبۂ اولیٰ کی شرائط ہیں۔

[۱۹۳] ابنِ ہشام ج ۲ ص ۸۵۔

[۱۹۴] ایضاً ج ۲ ص ۸۵) رسول اللہؐ کے اس ارشاد کے علاوہ اہلِ مدینہ نے بھی یہ کہا تھا کہ:

"نحن حرب لمن حارب وسلم لمن سالمہ" (ابنِ سعد ج ۳ ص ۶۰۹)

یہی روایت الہیثمی نے بھی نقل کی ہے (الہیثمی ج ۶ ص ۴۹)

[۱۹۵] ابنِ ہشام ج ۲ ص ۸۵۔ [۱۹۶] البلاذری (انساب) ج ۱ ص ۲۵۴۔

[۱۹۷] ابن الجوزی۔ ابی الفرج عبدالرحمٰن۔ زاد المسیر فی علم التفسیر۔ المکتب الاسلامی للطباعۃ والنشر۔ بیروت ۱۹۶۵ء ج ۲ ص ۳۱۰، ۳۱۱۔

[۱۹۸] الزمخشری۔ ابی القاسم جار اللہ محمود بن عمر۔ الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل۔ مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی۔ مصر ۱۹۴۸ء۔ ج ۱ ص ۴۵۰۔

[۱۹۹] ابنِ کثیر (تفسیر) ج ۲ ص ۵۲۴۔

[۲۰۰] البلاذری (انساب) ج ۱ ص ۲۵۴ رسول اللہؐ کے ارشاد میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ سے متعلق دونوں حوالے قرآن میں بھی موجود ہیں۔ دیکھئے: المائدہ (۱۳) اور الصف (۱۴)

[۲۰۱] بارہ نقبا کی تفصیل یہ ہے:

اوس میں سے: اسید بن حضیر، سعد بن خیثمہ اور ابو الہیثم بن التیہان یا رفاعہ بن عبد المنذر (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۸۷۔ رفاعہ کا نام ابنِ ہشام نے لکھا ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ یہ قابلِ التفات نہیں ہے کیونکہ کعب بن مالک نے جو انصار کے شاعر تھے اور اس بیعت میں شریک تھے نقبا کے نام ایک نظم میں بیان کئے ہیں لیکن اس میں رفاعہ کا نام نہیں ہے۔ ایضاً ص ۸۷، ۸۸)۔

خزرج میں سے ، اسعد بن زرارہ ، سعد بن ربیع ، عبداللہ بن رواحہ ، براء بن معرور ، عبداللہ بن عمرو ، عبادہ بن الصامت ، رافع بن مالک اور سعد بن عبادہ و منذر بن عمرو (ایضاً ص ۸۶ ، ۸۷ - ابن سعد ج ۲ ص ۶۰۲ تا ۶۲۲)

[۲۰۲] اسید نام کنیت ابوالحضیر تھی ۔ سلسلۂ نسب یہ ہے :

اسید بن حضیر بن سماک بن عتیک بن امری القیس بن زید بن عبدالاشہل ۔ باپ حضیر الکتائب جنگ بعاث میں اوس کے کمانڈر تھے ۔ اسید باپ کے بعد اپنی قوم میں سب سے معزز تھے ۔ فن کتابت سے واقف تھے حالانکہ اس زمانہ میں عرب میں اس کا رواج بہت کم تھا ۔ اعلیٰ خصوصیات کی بنا پر " الکامل " کے نام سے پکارے جاتے تھے حضرت مصعب بن عمیر کے ہاتھ پر ایمان لائے ۔ عقبۂ ثانیہ میں شریک تھے اور نقیب بنائے گئے ۔ ان کی مواخاۃ ہجرت کے بعد زید بن حارثہ سے ہوئی ۔ بدر میں شریک نہ تھے اس کے بعد دیگر تمام غزوات میں شریک رہے ۔ انتقال شعبان سنہ ۲۰ھ میں ہوا ۔ (ابن سعد ج ۳ ص ۶۰۳ تا ۶۰۵)

[۲۰۳] ابن سعد ج ۳ ص ۶۰۴ ۔

[۲۰۴] ایضاً ص ۶۰۸ ، ۶۰۹ (ان کے تفصیلی حالات حاشیہ نمبر ۱۸۹ میں آچکے ہیں) ۔ [۲۰۵] ایضاً ص ۶۱۱

[۲۰۶] البلاذری (انساب) ج ۱ ص ۲۴۳ ۔ [۲۰۷] ابن سید الناس ج ۱ ص ۱۶۵ ۔

[۲۰۸] Ilyas Ahmad, The Social Contract and the Islamic State, The Urdu Publishing House, Allahabad, 1944, p. 1-20)

[۲۰۹] ایک سیاسی تصور کے طور پر " معاہدۂ عمرانی " کی تاریخ کافی طویل ہے ۔ (ملاحظہ ہو

Watt, (Islam and the Integration of Society), p. 21.

لیکن اس تصور کے ضمن میں ہابس ، لاک اور روسو کے نظریات قابل ذکر ہیں ۔ بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ معاہدہ عمرانی کا مقصد قدرتی زمانہ جنگ اور نراجیت سے آزادی حاصل کرنا ، غیر سیاسی معاشرہ سے سیاسی معاشرہ کی طرف ارتقاء ، اس کے ذریعہ ایک سیاسی معاشرہ اور اس کے بعد بالآخر ایک ریاست کی تشکیل ، اور افراد کا اپنے اختیارات کو کسی فردِ واحد یا مجموعۂ افراد ، یا معاشرے یا ارادۂ عامہ کو برضا و رغبت سپرد کر دینا ہے ۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ فلسفۂ سیاسیات کی تاریخ کی رُو سے " معاہدۂ عمرانی " کا نظریہ محض تصوراتی شے ہے جس کی کوئی تاریخی و مادی تعبیر یا دلیل نہیں پائی جاتی ۔ چنانچہ کانٹ (KANT) کے بقول اس نظریہ کو فی الحقیقت کسی ریاست کا ماخذ تسلیم کرنے (an explanation of the actual origin of the state) سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ اسے سیاسی تصور کا ایک فلسفیانہ بیان (A PHILOSOphical explanation) مانا جائے ۔ ملاحظہ ہو :

(Ilyas Ahmad, p. 2

لیکن شہری مملکت مدینہ کے باب میں معاہدۂ عقبہ کے حوالہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر معاہدۂ عمرانی کا کوئی مفہوم اور حقیقت ہے تو وہ اپنے بہترین معنیٰ اور تمام حقیقتوں کے ساتھ یہاں موجود ہے۔

[۲۱۰] لوگ گھروں سے نکلتے اور شہر سے باہر جمع ہوکر انتظار کرتے اور جب سورج کی تمازت ناقابلِ برداشت ہوجاتی تو حسرت زدہ ہوکر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تھے (ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۲۳)۔ نیز دیکھئے: طبری (ج ۲ ص ۱۰۱) اور البخاریؒ ج ۱ ص ۵۵۵ (باب ہجرۃ النبی واصحابہ الی المدینہ) [۲۱۱] ابنِ ہشام ج ۲ ص ۹۰۔

[۲۱۲] ایضاً۔ [۲۱۳] ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۲۷۔

[۲۱۴] شرکاءِ محفل کے ناموں کی تفصیل کے لئے دیکھئے: ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۲۴ تا ۱۲۵۔ [۲۱۵] ایضاً ص ۱۲۶

[۲۱۶] الانفال (۳۰)۔ [۲۱۷] ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۲۶، ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۲۷۔

[۲۱۸] الزخرف (۷۹، ۸۰)۔ [۲۱۹] ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۲۷ نیز البخاری ج ۱ ص ۵۵۲ (باب بنیان الکعبہ)۔

[۲۲۰] حضرت ابوبکرؓ نے کئی بار رسولؐ اللہ سے ہجرت کی اجازت مانگی لیکن آپؐ نے فرمایا کہ جلدی نہ کرو شاید اللہ تمہارا کوئی اور بھی ساتھی کردے (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۲۸)۔ علاوہ ازیں سفرِ ہجرت کے لیے دو اونٹنیوں اور زادِ سفر کا انتظام قابلِ لحاظ ہے (ایضاً ص ۱۲۹)۔ نیز (ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۲۸، ۲۲۹)۔

[۲۲۱] یہاں یہ وضاحت مناسب ہے کہ رسولؐ اللہ بنیادی طور پر خود دوسروں کے لئے فکر مند رہا کرتے تھے۔ اس لئے فی الواقع یہ آپ کا کوئی ذاتی مسئلہ نہ تھا اور نہ ہی آپ اس کے لئے پریشان تھے۔ اس کی تاریخی توجیہہ کے ضمن میں یہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ جب حضورؐ مدینہ پہنچے تھے تو مدینہ کا ہر باشندہ آپؐ کی میزبانی کا حریص تھا۔ (خواہ اس کا سبب وفورِ جذبات ہو، خدمتِ رسولؐ ہو یا پاسِ عہد) لیکن کسی دوسرے کے یہاں ٹھہرنے کے بجائے آپ حضرت ابوایوب انصاری کے یہاں مقیم ہوئے (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۴۱) ممکن ہے ابوایوب انصاری کے یہاں آپؐ کا قیام وحی والہام کی متابعت میں ہو کیونکہ اثنائے راہ میں آپ نے بار بار یہ فرمایا تھا کہ: خلّوا سبیلھا فانھا ماموره (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۴۰)۔ لیکن یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ مدینہ رسولؐ اللہ کے لئے کوئی اجنبی شہر نہ تھا۔ اس کے محلّۂ بنونجار میں آپ کا ننھیال تھا اور کم سنی کے زمانہ میں والدۂ محترمہ کے ساتھ آپ کا یہاں قیام بھی رہ چکا تھا۔ یہیں پر آپ ایک انصاری لڑکی انیسہ کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ اطم پر سے چڑیا کو اڑانا آپؐ کا مشغلہ رہا تھا۔ اور یہیں ایک تالاب میں آپ نے پیراکی بھی سیکھی تھی (ابنِ سعد ج ۱ ص ۱۱۶) لہٰذا ابوایوب کے گھر اترنا قرینِ قیاس یہی ہے کہ قرابت داری کی وجہ سے تھا۔

[۲۲۲] ابنِ حبیب البغدادی۔ ص ۷۱۔ نیز ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۳۸۔

[۲۲۳] یہ امر باعثِ تعجب ہے کہ ایک طرف تو مورخین اور اصحابِ سیر لکھتے ہیں کہ مواخاۃ مہاجرین اور انصار کے درمیان ہوئی لیکن دوسری طرف رشتوں کی تفصیل میں یہ فرق سرے سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً ابنِ ہشام کا بیان ملاحظہ ہو:

وہ لکھتا ہے:

"واخی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین اصحابہ من المہاجرین والانصار"

اور پھر آگے لکھتا ہے کہ:

"تاخوا فی اللہ اخوین اخوین ثم اخذ بید علی بن ابی طالب فقال: ھٰذا اخی" (ابن ہشام ج ۲ ص ۱۵۰)

ہمارے نزدیک اس بیان میں تضاد موجود ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ اصولی طور پر مہاجرین و انصار کے درمیان انعقاد مواخاۃ ہوا تھا اس لئے ایک مہاجر کی دوسرے مہاجر سے مواخاۃ قابلِ فہم نہیں معلوم ہوتی۔ چنانچہ اس قسم کی تمام روایات پر تبصرہ اور محاکمہ یہاں ممکن نہیں (اس کے لئے راقم الحروف کا رسالہ ملاحظہ ہو۔ نثار احمد مواخاۃ صحابہ۔ جمعیت الفلاح۔ کراچی۔ ۱۹۷۱ء) البتہ یہاں ابنِ ہشام کے مندرجہ بالا بیان میں رسولؐ اللہ اور حضرت علیؓ کی جس مواخاۃ کو ذکر کیا گیا ہے اور جو بالعموم مشہور رہی ہے۔ اس کے بارے میں چند گزارشات بے محل نہ ہوں گی۔

ابن سعد نے اگرچہ اس روایت کو جس میں حضرت علیؓ کی مواخاۃ حضورؐ سے بیان کی گئی ہے، نقل کیا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ:

اخی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین علی ابن ابی طالب وسھل بن حنیف (ابنِ سعد ج ۳ ص ۲۳)

اوّل الذکر روایت کو بعض دوسرے مورخین بھی تسلیم نہیں کرتے۔ مثلاً ابن عبدالبر (الدرر) ص ۹۰۔

اور علامہ ابنِ کثیر لکھتے ہیں کہ:

اما مواخاۃ النبی وعلی فان من العماء ینکر ذٰلک ویمنع صحتہ و مستندہ فی ذٰلک ان ھذہ المواخاۃ انما شرعت لاجل ارتفاق بعضھم من بعض ویتالف قلوب بعضھم علی بعض فلا معنی لمواخاۃ النبی لاحد منھم ولا مہاجری لمہاجری (ابنِ کثیر۔ السیرۃ النبویہ۔ ج ۲۔ ص ۲۲۶)

اور بقول امام زرقانی علامہ ابن تیمیہ نے بھی اس مواخاۃ کا انکار کیا ہے اور یہاں تک دعویٰ کر دیا ہے کہ:

ان ذٰلک من الاکاذیب وانہ لم یواخ بین مہاجری و مہاجری (زرقانی۔ ج ۱۔ ص ۲۷۳)۔

اسی طرح سے بعض دُوسرے اصحابِ سیر نے مواخاۃ کے اغراض و مقاصد، نیز مصالح اور خواص کے پیشِ نظر اسے رد کر دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابنِ قیم نے بطورِ خاص اور بطرزِ مناظرہ یہ بحث اصولی طور پر کی ہے کہ اوّل تو ایک مہاجر سے دوسرے مہاجر کی مواخاۃ ہی ناقابلِ قبول ہے اور دُوسرے یہ کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین میں سے ہی کسی کو اپنا بھائی بناتے تو تمام لوگوں سے زیادہ تو اس کے مستحق حضرت ابوبکر تھے، جو حضورؐ کے محبوب ترین ساتھی اور رفیقِ ہجرت، انیسِ غار، دیگر تمام صحابہ سے افضل و اکرم ہیں اور جن کے بارے میں آپ یہ فرما چکے تھے کہ "دنیا والوں میں سے اگر میں کسی کو اپنا دوست بناتا تو ابوبکر کو بناتا مگر یہ کہ اسلامی اخوت سب سے بہتر ہے۔" ان کے اصل الفاظ کے لئے دیکھئے (ابنِ قیم۔ ج ۲۔ ص ۵۶)۔ ان روایات اور دلائل کے پیشِ نظر ہمارا خیال یہ ہے کہ مورخین

کو زیرِ بحث رشتہ مواخاۃ میں التباس ہوگیا ہے۔ اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ اور حضرت علی کے درمیان مواخاۃ یقیناً ہوئی ہے مگر مکہ میں، مدینہ میں نہیں۔ صحیح قرینِ قیاس اور مناسب حال بات یہی نظر آتی ہے کہ حضرت علی کی مواخاۃ حضورؐ سے نہیں بلکہ حضرت سہل بن حنیف سے قائم کی گئی تھی۔ اور حضرت علی کی یہ مواخاۃ اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی رشتہ مواخاۃ متعین طور پر کسی نہ کسی انصاری سے ضرور جوڑا جائے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دوسرے بہت سے مہاجرین کی طرح (اگر مواخاۃ میں شرکاء کی تعداد اور کیفیت روایتی طور پر ۴۵ یا ۵۰ تسلیم کر لی جائے) حضورؐ کی مواخاۃ بھی کسی سے نہیں ہوئی۔ دوسرے یہ کہ حضورؐ چونکہ تمام انصار سے بحیثیت مجموعی بیعتِ عقبۂ کبیرہ میں یہ کہہ چکے تھے کہ تمہارا خون میرا خون، تمہاری جان میری جان ہے۔ تم اطمینان رکھو جس سے تم لڑو گے اس سے میں لڑوں گا اور جس سے تم صلح کرو گے اس سے میں بھی صلح کروں گا۔ تمہارا ذمہ میرا ذمہ ہے اور تمہاری حرمت میری حرمت، میرا جینا اور مرنا تمہارے ساتھ ہوگا (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۸۵)۔ تو پھر ظاہر ہے کہ دوبارہ انفرادی طور پر کسی انصاری سے رشتۂ اخوت استوار کرنا محض ایک تکلف اور غیر ضروری امر ہوتا اور اگر حضور کسی ایک انصاری سے بھی مواخاۃ کر لیتے تو شاید یہ عقد دوسرے انصار کی دل شکنی کا باعث بنتا۔ علاوہ ازیں آپ کی نبوت کی انفرادیت کا تقاضا یہی تھا کہ آپ کسی ایک سے وابستہ ہونے کے بجائے سب سے وابستہ رہیں۔

[۲۲۴] ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۵۰۔

[۲۲۵] جن انصار و مہاجرین کے درمیان یہ رشتۂ خاص قائم کیا گیا ان کی کل تعداد اصحابِ سیرو تاریخ کے نزدیک نوے (۹۰) یا سو (۱۰۰) ہے (ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۳۸)۔ قطع نظر اس کے یہ تعداد مہاجرین کی اس تعداد کی ایک تہائی ہے جنھوں نے مکّے سے مدینہ ہجرت کی تھی (ایک اندازے کے مطابق اس وقت مہاجرین کی تعداد کم از کم ڈیڑھ سو تھی دیکھئے:

Ghulam Sarwar, Hafiz, Mhammad - The Holy Prophet, Sh. Mohd. Ashraf, Lahore, 1964, p. 152.

لیکن دقت یہ ہے کہ بالعموم اٹھارہ (۱۸)، انیس (۱۹) مخصوص حضرات کے ناموں (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۵۰ تا ۱۵۲) کے علاوہ دوسرے مہاجرین کے رشتہ ہائے مواخاۃ کے ذکر سے اکثر قدیم و جدید مآخذ خالی ہیں۔ بہر طور غنیمت یہ ہے کہ ابنِ سعد نے کہیں کہیں تراجم رجال کے ضمن میں مواخاۃ کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ علاوہ ازیں محمد ابن حبیب البغدادی نے بھی اپنی کتاب المحبّر میں پچپن (۵۵) آدمیوں کے نام لکھے ہیں (ص ۷۱ تا ۷۵) لیکن پھر بھی یہ تعداد کل مہاجرین سے بہت کم ہے۔ اس صورتِ حال سے تین باتیں متبادر ہوتی ہیں یعنی (الف) تمام مہاجرین کے درمیان عقد مواخاۃ قائم ہوا لیکن اتفاقاً ان کے نام اور رشتوں کی تفصیل کو محفوظ نہیں کیا گیا اس قیاس کو تقویت رسول اللہ کے اس ارشاد میں ملتی ہے کہ "خدا کی راہ میں دو دو اشخاص آپس میں بھائی بھائی بن جائیں"۔ گویا تعداد کی کوئی تحدید خود زبانِ رسالت سے نہیں کی گئی۔ غالباً اسی لئے رشتۂ اخوت میں منسلک ہونے والے حضرات کے اسماء اور ان کے رشتوں میں

فرق و اختلاف پایا جاتا ہے (تفصیلات کے لئے : نثار احمد، ص ۱۳، ۱۴)۔

(ب) مواخاۃ صرف ان ہی مہاجرین و انصار کے درمیان ہوئی تھی جو حضرت انس بن مالک کے گھر میں موجود تھے۔

(ج) اسے مواخاۃ کا پہلا مرحلہ مانا جائے تو دوسرے مرحلہ میں باقی مہاجرین کی مواخاۃ بھی انصار سے متوقع تھی لیکن پھر ممکن ہے کہ مسجد نبویؐ کی تکمیل اور منشور مدینہ کے اجراُ کے بعد ضرورت نہ سمجھی گئی ہو۔ اس لئے کہ مسجد نبویؐ نے بھی اسلامی معاشرہ کی سالمیت و اتحاد کے لئے عموماً اور اہلِ مدینہ میں مرکزیت پیدا کرنے کے سلسلے میں خصوصاً انتہائی اہم اور مؤثر کردار ادا کیا۔ اسی طرح منشورِ مدینہ کے بعد مدینہ میں رہنے والے تمام عناصر کے درمیان حقوق و فرائض کا تعین ہو گیا اور مسلمانوں کی امتیازی حیثیت بھی واضح ہو گئی (اس کی تفصیل آئندہ آئے گی) یہ بھی ممکن ہے کہ انما المؤمنون اخوۃ (تمام اہلِ ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ الحجرات ۱۰) اور المسلم اخو المسلم (الخلیب العمری ص ۲۲۴) کی اصولی ہدایات کے بعد نام بنام رشتۂ مواخاۃ استوار کرنے کی حاجت باقی نہ رہ گئی ہو۔ یہاں یہ واضح رہے کہ مہاجرین و انصار کے ان برادرانہ تعلقات کو اللہ تعالیٰ نے بھی بہ نظرِ استحسان دیکھا ہے۔ ملاحظہ ہو : الانفال (۷۲)۔ [۲۲۶] الانفال (۷۵)

[۲۲۷] مدینہ آنے کے فوراً بعد رسول اللہؐ نے چند اقدامات فرمائے، ان میں سے مسجد نبویؐ کی تعمیر، مواخاۃ کا قیام اور منشورِ مدینہ کا اجرا انتہائی اہم ہیں۔ ان تینوں میں کوئی زمانی ترتیب حتمی طور پر قائم کرنا اگرچہ مشکل ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ یہ اقدامات سنہ ۱ھ میں ہی کیے گئے البتہ اصحابِ سیر نے جس انداز سے ان کا ذکر کیا ہے اس میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً متقدمین میں سے ابنِ ہشام (ج ۲ ص ۱۴۱ تا ۱۵۴) نے پہلے مسجد نبویؐ کی تعمیر پھر منشورِ مدینہ اور پھر مواخاۃِ صحابہ سے بحث کی ہے۔ متاخرین میں سے ابنِ خلدون (تاریخ، ج ۲ ص ۱۶، ۱۷) نے ٹھیک اسی ترتیب کا اتباع کیا ہے جبکہ بعض مورخین ایسے ہیں جنھوں نے پہلے مسجد نبویؐ پھر مواخاۃ اور اس کے بعد منشورِ مدینہ کو رکھا ہے۔ مثلاً ہمارے یہاں علامہ شبلی (ج ۱ ص ۲۷۶ تا ۲۹۴) نے یہی ترتیب برقرار رکھی ہے جبکہ ابنِ سعد نے نئی ترتیب یہ قائم کی ہے کہ پہلے مواخاۃ پھر بنائے مسجد سے بحث کی ہے (ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۳۸، ۲۳۹) ہمیں مدینہ کی مخصوص صورتِ حال اور مسائل کی نوعیت کے اعتبار سے دُوسری ترتیب ہی زیادہ صحیح اور مرجح معلوم ہوتی ہے۔ یعنی پہلے مسجد نبویؐ کی تعمیر اور اس کے بعد مواخاۃ صحابہ۔

[۲۲۸] ابنِ عبدالبر نے اسے پانچویں مہینہ (یعنی رجب) کا واقعہ قرار دیا ہے (الاستیعاب ج ۱ ص ۱۸) نیز علامہ قسطلانی کا بیان بھی یہی ہے۔ اور ہمیں زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ورنہ روایات مختلف ہیں کسی میں اسے آٹھویں مہینے، ساتویں مہینے، بدر سے قبل تیرھویں مہینے کا واقعہ اور بعض میں مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت کا واقعہ بتایا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مسجد نبوی کے بننے سے پہلے کا ہے (زرقانی ج ۱ ص ۲۷۳)۔

[۲۲۹] اگرچہ مسجد کی تعمیر پہلا قدم ہے تاہم تعمیر کا کام کئی ماہ کی مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ چنانچہ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ حضرت

ابو ایوب انصاری کے مکان میں ٹھہرنے کے فوراً بعد آپ نے مسجد بنانے کا منصوبہ بنایا اور پھر زمین خرید کر تعمیر کا آغاز بھی کر دیا (ج ۲ ص ۱۴۲)۔ پھر ابن اسحاق کے حوالے سے وہ آگے لکھتا ہے کہ ربیع الاوّل میں حضورؐ مدینہ میں رونق افروز ہوئے اور (اس کے دس ماہ بعد) صفر میں آپ کی مسجد اور مکان بن کر تیار ہوا (ایضاً ص ۱۴۶) اور ظاہر ہے کہ ان تعمیرات کے مکمل ہونے کے بعد آپ دارِ ایوب سے مسجد (نبوی) میں منتقل ہوئے۔ ابن ہشام نے تعمیر کے سلسلے میں دس ماہ سے زائد کی جس مدت کا ذکر کیا ہے بعض مورخین مثلاً متاخرین میں سے ابنِ قیم (ج ۱ ص ۲۵) نے یہ مدت سات ماہ بھی لکھی ہے۔ بہرحال مسجد نبویؐ اور حجرات کی تعمیر میں اتنا عرصہ لگنا بالکل قرینِ قیاس ہے کیونکہ مسجد نبویؐ اپنی انتہائی سادہ شکل اور غیر مزیّن ہونے کے باوجود تقریباً ڈھائی ہزار مربع گز پر محیط تھی۔

[۲۲۰] ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۳۹۔ نیز زرقانی ج ۱ ص ۳۷۴ [۲۲۱] صاحبِ روض الانف علامہ سہیلی لکھتے ہیں کہ:

لیذھب عنھم وحشۃ الغربۃ و یؤنسھم من مفارقۃ لاھل والعشیرہ ویشد ازر بعضھم بعض،

(ج ۲ ص ۱۸) اور علامہ ابنِ کثیر نے لکھا ہے:

لاجل ارتفاق بعضھم من بعض ولیتالف قلوب بعضھم علی بعض (السیرۃ) ج ۲ ص ۳۲۶۔

[۲۲۲] اس کی ایک روشن مثال حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی ہے۔ جب ان کے انصاری بھائی حضرت سعد بن الربیع نے اہل و مال دونوں میں نصف حصہ کی پیش کش کی (البخاری ج ۱ ص ۵۶۱ باب بنیان الکعبہ) اور یہاں تک کہہ دیا کہ میری دو بیویاں ہیں ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر لو، میں اس کو طلاق دے دوں گا تم نکاح کر لینا" (زرقانی ج ۱ ص ۳۷۴)، تو ابنِ عوف نے گوارا نہ کیا اور جواب دیا کہ "خدا تمہارے مال و منال میں برکت دے مجھے تو تم بازار کا رستہ دکھا دو"۔ (البخاری ج ۱ ص ۵۶۱) چنانچہ پھر حضرت ابنِ عوف نے کاروبار شروع کیا اور اس میں اللہ نے اتنی برکت دی کہ مٹی سے سونا پیدا کرنے لگے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے مال کا آٹھواں حصہ چار بیویوں پر تقسیم کیا گیا تو ہر ایک کو اسّی (۸۰) ہزار درہم ملے (حاجی معین الدین، مہاجرین مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۲۸ء حصہ اول ص ۱۲۷)۔ [۲۲۳] الانفال (۷۵)۔

[۲۲۴] حمید اللہ (رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی) ص ۲۲۲۔ بحوالہ صحیح بخاری (اس کا حوالہ راقم الحروف کو تلاش کے باوجود نہ مل سکا)۔

[۲۲۵] انصار کس حد تک یہود کے مقروض تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ بنو نضیر نے جلاوطنی کے حکم پر رسولؐ اللہ کی توجہ دلائی تھی کہ ان کے قرضے مقامی باشندوں سے وصول طلب ہیں تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ضعوا و تجعلوا (السرخسی، محمد بن احمد بن ابی سہل۔ شرح السیر الکبیر۔ مطبعۃ دائرۃ المعارف النظامیہ۔ دکن۔ ۱۳۳۵ھ ج ۳ ص ۲۲۹) اس کا ترجمہ ڈاکٹر حمید اللہ نے یہ کیا ہے کہ: "رقم گھٹا کر میعاد سے قبل حساب بے باق کر لو" (رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۲۲۷)۔

[۲۳۶] انصار نے اپنے لئے (یہود کے بازاروں سے الگ) چند بازار قائم کر رکھے تھے۔ چنانچہ مدینہ کا سب سے بڑا بازار وُہ تھا جو مہروز میں لگتا تھا اور جس کے قریب بنو ساعدہ کی آبادی تھی۔ ایک بازار قبا میں، ایک بازار ام العیال نامی ایک چشمہ کے کنارے اور ایک بازار مسجد الرایہ کے قریب تھا (یہ مدینہ کا قدیم بازار تھا اور پشت پر ثنیۃ الوداع کی پہاڑیاں تھیں) ایک بازار مزاحم تھا اور یہ اوائل اسلام تک لگتا تھا۔ (سعید احمد انصاری ج ا ص ۶۶)۔

[۲۳۷] بنو قینقاع کے اخراج کے لئے دیکھئے (ابنِ سعد ج ۲ ص ۲۹) بنو نضیر اور بنو قریظہ کے لئے (ابنِ ہشام ج ۳ ص ۲۰۱، ۲۴۹ تا ۲۶۴) نیز ابنِ سعد ج ۲ ص ۵۸، ۷۵ تا ۷۷)۔

[۲۳۸] آرنلڈ۔ ڈاکٹر سر تھامس۔ دی پریچنگ آف اسلام (دعوتِ اسلام) اردو ترجمہ۔ محمد عنایت اللہ دہلوی۔ مسعود پبلشنگ ہاؤس۔ کراچی ۱۹۶۴ء۔ ص ۶۴۔

[۲۳۹] اس کی واضح مثالیں متعدد رشتوں میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً حضرت عمر اور عتبان بن مالک کی مواخاۃ، حضرت سعید بن زید اور رافع بن مالک بن عجلان کی مواخاۃ، حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور ابی ابنِ کعب کی مواخاۃ، حضرت خبّاب اور جبار بن صخر کی مواخاۃ وغیرہ (تفصیلات کے لئے: نثار احمد، ص ۲۰ تا ۲۲)۔

[۲۴۰] الصف (۴)۔ ایک حدیث میں بھی رسولؐ اللہ نے مسلمانوں کے باہمی تعلق کو پختہ دیوار سے مشابہ قرار دیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

المومن للمومن کالبنیان یشد بعضه بعضاً ثم شبك بین اصابعه (الخطیب العمری ص ۴۲۴)۔

[۲۴۱] روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عن عاصم قلت لانس ابلغك ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لاحلف فی الاسلام فقال قد حالف النبی صلی الله علیه وسلم بین قریش والانصار فی داری (زرقانی ج ا ص ۳۷۴)۔

[۲۴۲] زرقانی نے مواخاۃ کی حکمت بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ،

فاخی بین الاعلیٰ والادنیٰ لیرتفق الادنیٰ بالاعلیٰ ولیستعین الاعلیٰ بالادنیٰ وبهذا تظهر حکمه مواخاۃ (ایضاً ص ۳۷۳)۔

۴۔ آغازِ ریاست

[۲۴۳] ابو عبید القاسم بن سلام۔ کتاب الاموال۔ تصحیح و تعلیق۔ محمد حامد الفقی۔ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ۔ مصر (تصحیح ۱۳۵۳ھ) الجزء الثانی۔ ص ۲۰۲ تا ۲۰۵ (فقرہ نمبر ۵۱۶)۔ اور ابنِ ہشام کے لئے دیکھئے، (ج ۲ ص ۱۴۸ تا ۱۵۰)۔ [۲۴۴] ابو عبید کے یہاں اس کے بعد "رسولؐ اللہ" کے الفاظ کا اضافہ ہے (ص ۲۰۲)۔

[۲۴۵] اضافہ ابوعبید۔ "اھل" (ص ۲۰۲) [۲۴۶] اضافہ ابوعبید۔ "فحل معھم" (ص ۲۰۲)۔

[۲۴۷] ابوعبید: "امۃ واحدہ دون الناس" (ص ۲۰۲)۔

[۲۴۸] ابوعبید: "رباعتھم" (ص ۲۰۲)، روایت عبداللہ بن صالح: ربعاتھم (ص ۲۰۲)

[۲۴۹] اضافہ ابوعبید: "معاقلھم الاولیٰ" (ص ۲۰۲) [۲۵۰] اضافہ ابوعبید: "والمسلمین" (ص ۲۰۳)۔

[۲۵۱] ابوعبید: "رباعتھم" (ص ۲۰۳) ہر جگہ اسی طرح دہرایا ہے۔

[۲۵۲] اضافہ ابوعبید: منھم (ص ۲۰۳، ہر دفعہ میں، جہاں یہ الفاظ ہیں) یہی اضافہ موجود ہے۔

[۲۵۳] ابوعبید نے پہلے "بنوالحرث بن الخزرج علیٰ رباعتھم ..... الخ" کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد بنوساعدہ کا (ص ۲۰۳)۔

[۲۵۴] ابوعبید نے اس ترتیب کو اُلٹ کر لکھا ہے یعنی بالقسط والمعروف (ص ۲۰۳)۔

[۲۵۵] اس کے بعد ابوعبید کے الفاظ یہ ہیں: "منھم ان یعینوہ بالمعروف" (ص ۲۰۳)۔

[۲۵۶] یہ فقرہ ابوعبید کے یہاں نہیں ہے۔ [۲۵۷] اضافہ ابوعبید "أیدیھم" (ص ۲۰۳)۔

[۲۵۸] ابوعبید نے اس جملہ کو یُوں لکھا ہے: علیٰ کل من بغی وابتغی منھم دسیعۃ ظلم أو اثم أو عدوان او فسادٍ بین المؤمنین (ص ۲۰۳) [۲۵۹] ابوعبید: جمیعہ (ص ۲۰۳)۔

[۲۶۰] ابوعبید: لایقتل (ص ۲۰۳)۔

[۲۶۱] ابوعبید کے یہاں یہ فقرہ موجود نہیں۔ اس کے بعد فقرہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے کہ والمومنون ..... الخ (ص ۲۰۳)۔ [۲۶۲] ابوعبید: الیھود (ص ۲۰۳)۔

[۲۶۳] ابوعبید کے یہاں اس فقرہ کی ترکیب اور الفاظ یہ ہیں: فان لہ المعروف والاسوہ غیر مظلومین ولا متناصر علیھم (ص ۲۰۳)۔ [۲۶۴] ابوعبید: "واحد" (ص ۲۰۳)

[۲۶۵] ابوعبید: "ولا یسالم" (ص ۲۰۳) [۲۶۶] ابوعبید: "یعقب بعضھم بعضا" (ص ۲۰۳)۔

[۲۶۷] ابوعبید کے یہاں یہ فقرہ نہیں ہے۔ [۲۶۸] ابوعبید: "مالاً لقریشٍ ولا یعینھا علی مومن" (۲۰۴)۔

[۲۶۹] ابوعبید نے "عن بینۃ" کے الفاظ کو حذف کر دیا ہے۔

[۲۷۰] ابوعبید: فانہ قود الآان یرضی ولیّ المقتول بالعقل (ص ۲۰۴)۔

[۲۷۱] ابوعبید نے ولا یحل لھم الاقیام علیہ کے الفاظ نقل نہیں کئے۔

[۲۷۲] ابوعبید: فمن نصرہ (ص ۲۰۴)۔

[۲۷۳] ابوعبید: الیٰ یوم القیامۃ لایقبل مینہ (ص ۲۰۴)۔

[۲۷۴] ابوعبید کے یہاں یہ فقرہ اس طرح ہے کہ: وانکم ما اختلفتم فیہ من شئٍ فان حکمہ الی اللّٰہ تبارک و

تعالیٰ والی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم (ص ۲۰۴)۔

[۲۷۵] بوعبید: وان یہود بنی عوف و موالیھم و انفسھم امۃ من المومنین (ص ۲۰۴)۔

[۲۷۶] ابوعبید: للمومنین (ص ۲۰۴) [۲۷۷] یہ ابوعبید کے فقرہ ماقبل میں شامل ہے (ص ۲۰۴)۔

[۲۷۸] ابوعبید کے یہاں پہلے بنو جشم کا ذکر ہے اس کے بعد بنو ساعدہ کا۔

[۲۷۹] ابوعبید: وان لیھود الاوس (ص ۲۰۴) [۲۸۰] ابوعبید کے متن میں یہ ٹکڑا شامل نہیں ہے۔

[۲۸۱] ابوعبید کے بیان میں " اثم " موجود نہیں ہے۔

[۲۸۲] وان جفنہ سے یہاں (. . . . کانفسھم) تک کا حصہ ابوعبید کے یہاں منقول نہیں۔ صرف اس صحیفہ کے آخری جملوں میں بنی الشطیبہ کے بارے میں یہ ہے کہ: وان بنی الشطیبہ بطن من جفنۃ (ص ۲۰۴)۔

[۲۸۳] ابوعبید: احد منھم (ص ۲۰۴)۔

[۲۸۴] ابوعبید کے متن میں وانہ لا ینحجز سے یہاں (نفقتھم) تک کے تین فقرے موجود نہیں ہیں۔

[۲۸۵] ابوعبید: وان بینھم النصیحۃ والنصر للمظلوم (ص ۲۰۴)۔

[۲۸۶ تا ۲۸۸] ابوعبید کے یہاں یہ فقرے نہیں ہیں۔

[۲۸۹] ابوعبید: وان المدینہ جوفھا حرم لاھل ھذہ الصحیفہ (ص ۲۰۴)۔

[۲۹۰] یہ دونوں فقرے ابوعبید نے نقل نہیں کئے۔

[۲۹۱] ابوعبید: وانہ ما کان بین اھل ھذہ الصحیفہ من حدث یخاف فسادہ فان اُمرہ الی اللہ والی محمد النبی (ص ۲۰۴) [۲۹۲] یہ فقرے ابوعبید کے یہاں نہیں ہیں۔

[۲۹۳] ابوعبید: " وانھم اذا دعوا الیھود الی صلح حلیف لھم فانھم یصالحونہ، وان دعونا الی مثل ذٰلک فانہ لھم علی المومنین، الا من حارب الدین۔" (ص ۲۰۴)۔

[۲۹۴] ابوعبید: وعلیٰ کل اناس حصتھم من النفقہ (ص ۲۰۴)۔

[۲۹۵] ابوعبید: ان یہود الاوس وموالیھم وانفسھم مع البر المحسن من اھل ھذہ الصحیفۃ و ان بنی الشطیبہ بطن من جفنہ (ص ۲۰۴) [۲۹۶] ابوعبید: فلا یکسب (ص ۲۰۴)۔

[۲۹۷] ابوعبید: لا یحول الکتاب (ص ۲۰۴) [۲۹۸] " بالمدینہ " کے الفاظ ابوعبید کے یہاں محذوف ہیں۔

[۲۹۹] ابوعبید کے یہاں " ان اللہ . . . . . الخ " کا جملہ نہیں ہے اس کے بجائے بطور اضافہ یہ عبارت لکھی ہے کہ: وان اولاھم بھذہ الصحیفہ البر المحسن (ص ۲۰۵)۔

[۳۰۰] ڈاکٹر حمید اللہ نے منشورِ مدینہ کا ترجمہ " دستورِ مملکت مدینہ بعہد نبویؐ " کے عنوان سے اپنی کتاب (عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی۔ مکتبہ ابراہیمیہ۔ دکن۔ طبع دوم۔ جلد اوّل۔ ص ۱۰۲ تا ۱۱۱) میں شامل کیا ہے۔ وہ ترجمہ ہمارے پیشِ نظر ہے لیکن

اس دستاویز کی ابتدائی شقوں میں بار بار استعمال ہونے والی اصطلاح "علی رباعتھم" کی ترجمانی "اپنے محلے کے ذمہ دار" سے کرنا ہمارے نزدیک محلِ نظر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابن منظور الافریقی نے "ربع" کے تحت جو بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ:

وفی روایہ من رباع الربع المنزل و دار الاقامہ وربع القوم محلتھم .... الخ
(ابن منظور الافریقی۔ ج ۹۔ ص ۴۵۸)

اس سے ڈاکٹر صاحب کے مطلب کی گنجائش نکلتی ہے۔ لیکن در اصل اس دستاویز میں جہاں یہ اصطلاح استعمال کی گئی ہے اس سے وہی مفہوم نکلتا ہے جو ہم نے اپنے ترجمہ میں ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ زمخشری نے لکھا ہے کہ: والقوم علی رباعتھم ای علی حالھم التی کانوا علیھا (زمخشری۔ اساس البلاغہ۔ مطبعہ دار الکتب المصریہ۔ قاہرہ ۱۹۵۳ء، ص ۱۵۲)

اور سیرۃ ابن ہشام کے مرتبین (مصطفی السقا، ابراہیم الابیاری، عبدالحفیظ شبلی) نے بھی حاشیہ (ج ۲ ص ۱۴۷) میں واضح کیا ہے کہ الربعۃ۔ الحال التی جاء الاسلام وھم علیھا۔

علاوہ ازیں خود ابو عبید جس نے دستاویز زیر بحث کو محفوظ کیا ہے۔ متن نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:
قولہ "بنو فلان علی رباعتھم"۔ الرباعہ ھی المعاقل وقد یقال فلان علی رباعہ قومہ، اذا کان المتقلد لامورھم ..... الخ (ج ۲ ص ۲۰۵)

[۲۰۱] حمید اللہ (عہد نبویؐ میں نظامِ حکمرانی) ص ۸۳ علاوہ ازیں مشہور مستشرق نکلسن (R.A. NICHOLSON) نے اپنی کتاب تاریخ ادبیات عرب (A. LITERARY HISTORY OF THE ARABS) میں جہاں اس دستاویز سے بحث کی ہے اس کا عنوان ہی یہ قائم کیا ہے کہ "اسلامی ریاست کا آغاز" (BEGINNINGS OF THE MOSLEM STATE) (ص ۱۷۳) اور ہیل (JOSEPH HELL) نے نوشتۂ مذکور کی بعض دفعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"These passages read as if they were laying down the basis of en Islamic Empire". (Hell, J. The Arab Civilization, Tr.(eng.) S. Khuda Baksh, Sh. Mohd. Ashraf, Lahore, 1943, pp. 25,26).

[۲۰۲] ملاحظہ ہو: حمید اللہ (عہد نبویؐ میں نظامِ حکمرانی) ص ۷۶۔ [۲۰۳] ایضاً ص ۸۳

[۲۰۴] ایضاً ص ۸۳، ۸۴

[۲۰۵] ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے کہ "زیر بحث دستاویز ایک معاہدے کی شکل نہیں رکھتی بلکہ ایک فرض اور حکم کی صورت

میں نافذ کی جاتی ہے۔" (ص ۸۳) ولہازن بھی اسے معاہدہ کے دائرہ سے نکال کر فرمان (DEGREE) قرار دیتا ہے۔ (Nicholson, R.A., A Literary History of the Arabs, University Press, Cambridge, 1962, p. 173).

نکلسن اسے منشور (CHARTER) سے تعبیر کرتا ہے (NICHOLSON, P. 173) اور ہیل (HELL) اسے حکم نامہ (ORDINANCE) سے موسوم کرتا ہے۔ واٹ نے اسے دستورِ مدینہ (A CONSTITUTION OF MEDINA) کے تحت بیان کیا ہے جبکہ ایک جدید مغربی مؤرخ صونڈرز (SAUNDERS) اسے معاہدہ یا دستور (Treaty or Constitution) کہتا ہے۔ (ملاحظہ ہو:

Saunders, J.J.:
A History of Medieval Islam, Routledge and Kegan Paul, London, 1965, p. 26.)

[۲۰۶] ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے کہ "سلہ میں مدینہ منورہ میں ہجرت کر آنے کے پہلے ہی سال ایک نوشتہ مرتب فرمایا جس میں حکمران کے حقوق اور فرائض اور دیگر فوری ضروریات کا تفصیلی ذکر ہے (حمید اللہ۔ عہد نبوی میں نظامِ حکمرانی، ص ۷۶) اور دیکھئے: (HELL P. 26) وغیرہ۔

[۲۰۷] ہمارے قدیم و جدید سیرت نگاروں کا عام تاثر یہی ہے کہ یہ (منشورِ مدینہ) رسول اللہ اور یہودیوں کے مابین ایک معاہدہ تھا۔ مثلاً دیکھئے: ابنِ ہشام (ج ۲ ص ۱۴۷)، ابن سیدالناس (ج ۱ ص ۱۹۷)، المقریزی (امتاع الاسماع ۔ ج ۱ ص ۴۹) وغیرہ۔ اور بزبانِ اُردو: سلمان منصورپوری، قاضی محمد سلیمان۔ رحمۃ للعلمین ۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور۔ ۱۹۵۲ء۔ (ج ۱ ص ۱۲۸)، اور شبلی (ج ۱ ص ۲۷۵) وغیرہ وغیرہ۔

[۲۰۸] حوالے کے لئے دیکھئے: دستاویز کی دفعہ ۲۴، ۲۵، ۳۸، ۴۳، ۵۴ اور ۵۶۔

[۲۰۹] ازروئے دفعہ ۲۴، ۴۰، ۴۸ اور ۵۴۔

[۲۱۰] عربی زبان میں لفظ امّۃ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً حالت و کیفیت، سنّت، طریقہ، دین، وقت یا زمانہ (قرن)، جماعت یا گروہ، انسانوں کا، حیوانوں کا بلکہ دُوسرے جانداروں کا بھی، مقتدا اور پیشوا وغیرہ (ابن منظور الافریقی، ج ۱۴ ص ۲۸۸ تا ۲۹۳) منشورِ زیرِ بحث کا دائرۂ کار چونکہ خالص عمرانی ہے اس لئے مبیّنہ طور پر یہاں اُمّۃ سے مراد لازماً ایک گروہ یا جماعت ہے (دالامۃ الجماعۃ ۔ ایضاً ص ۲۹۳)۔ اور صاحب المفردات نے لکھا ہے کہ "ہر وُہ جماعت جس میں کوئی امرِ مشترک پایا جائے اسے امۃ کہا جاتا ہے خواہ یہ اشتراک مذہبی وحدت کی بنا پر ہو یا جغرافیائی اور عصری وحدت کی وجہ سے اور اس امرِ مشترک کے اختیاری یا غیر اختیاری ہونے کی قید بھی نہیں ہے (راغب اصفہانی، ص ۲۳)۔ لہٰذا یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ منشور میں امتزاج و ائتلاف اور ضم وادغام کا مدعا مشترکہ مقصد میں اتحاد و اتفاق ہے نہ کہ کسی متحدہ قومیت

کی تکوین۔ علاوہ ازیں چونکہ منشور کو مدنی معاشرہ کی سیاسی ضروریات کے پیشِ نظر مرتب کیا گیا تھا اس لئے سیاسی ضرورتوں کا حل سیاسی وحدت کے ذریعہ ہی ممکن تھا۔

[۲۱۱] ملاحظہ ہو: دفعہ (۱۶)۔ وان المؤمنین بعضھم موالی بعض دون الناس۔ (ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۴۸)

[۲۱۲] قوم، قومیت کا مفہوم، اس کے بارے میں اسلام کا تصور اور متحدہ قومیت پر تفصیلی مباحث کیلئے ملاحظہ ہو: مودودی۔ مسئلہ قومیت۔ مکتبہ جماعت اسلامی۔ دار الاسلام۔ پٹھانکوٹ۔ ستمبر ۱۹۴۴ء، (ص ۴۹ تا ۵۸)۔

[۲۱۳] قرآن کی رُو سے ایسا کرنا معاشرہ کے تمام افراد کی انفرادی ذمہ داری بھی ہے (لقمان ۱۰۷) اجتماعی اور گروہی بھی ہے (آل عمران ۱۰۴) اور بحیثیت مجموعی پوری اُمت مسلمہ کی بھی ذمہ داری یہی ہے کہ نیکیوں کو فروغ دیں اور بُرائیوں کو مٹائیں (آل عمران ۱۱۰) [۲۱۴] الحج (۴۱)

[۲۱۵] مودودی۔ الجہاد فی الاسلام۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور۔ ستمبر ۱۹۶۲ء۔ ص ۱۔

[۲۱۶] مثلاً دفعات ۳ تا ۱۲ ملاحظہ ہوں۔ [۲۱۷] از روئے دفعہ ۱۴ [۲۱۸] از روئے دفعہ ۱۵

[۲۱۹] از روئے دفعہ ۳ تا ۱۲ [۲۲۰] از روئے دفعہ ۲۳ [۲۲۱] از روئے دفعہ ۱۶، ۴۶ اور ۴۷

[۲۲۲] از روئے دفعہ ۱۸ [۲۲۳] از روئے دفعہ ۱۹ [۲۲۴] از روئے دفعہ ۲۰

[۲۲۵] از روئے دفعہ ۲۴ [۲۲۶] از روئے دفعہ ۲۵

[۲۲۷] یہاں بطور مثال ہم میکیاویلی (MACHIAVELLI) کے نظریات کو پیش کر سکتے ہیں۔ جو نہ صرف اپنی تصنیف بادشاہ کے لئے مشہور ہے بلکہ جدید تصورِ ریاست کا بانی ہے۔ اس کے نزدیک سیاست میں چالبازی، دغا اور فریب اس قسم کے دُوسرے ہتھیاروں سے کام لینا چاہیے۔ وُہ یہ بھی کہتا ہے کہ جہاں ریاست کی زندگی اور موت کا سوال ہو اور عام اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھنے سے کام نکل سکتا ہو تو میکیاویلی کے خیال میں اسے اختیار کرنا نہ صرف جائز بلکہ "یہی ایک اصول ہے جس کی پابندی فرض ہے"۔ میکیاویلی بدعہدی، بے وفائی اور دھوکہ فریب کو بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دینے کا سبب گردانتا ہے اور راست بازی وغیرہ کو تنزل و انحطاط کا۔ ملاحظہ ہو: میکیاویلی پرنس (بادشاہ) ترجمہ مقدمہ مع حواشی۔ ڈاکٹر محمود حسین۔ اردو اکیڈیمی سندھ۔ کراچی۔ ستمبر ۱۹۵۷ء (ص ۲۲، ۱۳۳)۔ مختصر یہ کہ اس نے سیاست کی بنیاد اخلاق سے قطع نظر "سیاسی مصلحت" پر رکھی جو اسلام کی ضد ہے۔ [۲۲۸] حمید اللہ (عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی) ص ۸۸۔

[۲۲۹] ایضاً ص ۸۸ [۲۳۰] ایضاً ص ۸۷، ۸۸۔

[۲۳۱] WATT (MUHAMMAD AT MADINA), P. 226.

[۲۳۲] ایضاً ص ۲۲۶ [۲۳۳] ایضاً ص ۲۲۷۔

[۲۲۴] ابنِ ہشام (ج ۲ ص ۲۶۳)، ابن سعد ج ۲ ص ۱۲۔

[۲۲۵] ابن ہشام نے لکھا ہے کہ: وکان فراغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم من بدر فی عقب شہر رمضان اوفی شوال (ج ۳ ص ۴۵) [۲۲۶] ابنِ سعد ج ۲ ص ۲۸، ۲۹۔

[۲۲۷] ایضاً ج ۲ ص ۲۹۔ [۲۲۸] ابنِ ہشام ج ۳ ص ۵۰۔

[۲۲۹] ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ: ان بنی قینقاع کانوا اول یہود نقضوا ما بینھم و بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم وحاربوا فیما بین بدر واُحد (ج ۳ ص ۵۱)۔

مزید حوالے کے لئے ملاحظہ ہو، طبری ج ۲ ص ۴۷۹)، ابن اثیر (ج ۲ ص ۱۳۷)، المقریزی (امتاع الاسماع ج ۱ ص ۱۰۴) وغیرہ۔ [۲۴۰] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو،

MUIR (THE LIFE OF MAHOMET, LONDON 1861). VOL. III, P. 31 TO 37.

[۲۴۱] البقرہ (۲۴۶)، الانعام (۲۰)۔ [۲۴۲] ابوعبید، ج ۲ ص ۲۰۶ (تحت فقرہ ۵۱۷)۔

[۲۴۳] ایضاً [۲۴۴] ایضاً ص ۲۰۷ (فقرہ ۵۱۸)

[۲۴۵] ڈاکٹر حمید اللہ نے ولہاوزن اور جملہ یورپی مصنفین کے اتباع میں ۱ سے ۲۳ دفعات میں محصور کیا ہے (عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی ص ۸۵) لیکن مکمل متن نقل کر دینے کے بعد ہم نے اپنے لئے اس پابندی کو ضروری خیال نہیں کیا۔

[۲۴۶] ڈاکٹر حمید اللہ کے نزدیک اس میں ۴۸ فقرات یا دفعات ہیں (ص ۸۶) جبکہ ہمارے حساب سے کل ۵۶ دفعات ہیں۔

[۲۴۷] Wellhausen (The Historians History of the World) Vol. VIII, p. 291.

[۲۴۸] ازروئے دفعہ ۲۰، ۲۸ [۲۴۹] ازروئے دفعہ ۴۰ [۲۵۰] دفعہ ۴۲، ۵۱

[۲۵۱] دفعہ ۳۹ [۲۵۲] دفعہ ۴۲، ۵۰ اور ۵۱ [۲۵۳] دفعہ ۴۹ [۲۵۴] دفعہ ۴۲

[۲۵۵] دفعہ ۵۳ تا ۳۰ [۲۵۶] دفعہ ۵۴

[۲۵۷] لفظ حرم کی لغوی بحث کے لئے ملاحظہ ہو (ابنِ منظور الافریقی ج ۱۵ ص ۹ تا ۱۳) اسی مصنف نے لکھا ہے کہ اہلِ عرب ایسے شہر کو حرم سے موسوم کرتے تھے جہاں قتل و قتال جائز نہ ہو (ایضاً ص ۱۰) حرم کی معنویت کو سمجھنے کے لئے حرم مکہ کے احکام کا مطالعہ مفید ہے، مثلاً جن میں یہ کہا گیا ہے کہ وہاں قتل۔ خونریزی اور درختوں کو کاٹنا وغیرہ ممنوع ہے۔ البخاری (ج ۲۔ ص ۶۱۵)۔ کتاب المغازی اور الجزیری۔ عبدالرحمٰن۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ۔ المکتبۃ التجاریہ الکبریٰ۔ مصر۔ طبع ثانی (ج ۱ ص ۶۴۸ تا ۶۵۰)؛ نیز دیکھئے: بحرالعلوم ابی العیاش عبدالعلی محمد۔ رسائل الارکان، مطبع الیوسفی۔ لکھنؤ۔ ۱۳۲۸ھ (ص ۲۷۴ تا ۲۷۶)۔ میجر جنرل

اکبرخاں نے "حدیث دفاع" میں لکھا ہے کہ آپ نے مدینہ کے حدود قائم کرکے اس کو حرم قرار دیا۔ اسے آجکل کی اصطلاح میں کُھلا شہر (OPEN CITY) کہتے ہیں اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس شہر کے اندر اور اس کے گرد و نواح میں اہلِ شہر مخالفین سے جنگ کرنا نہیں چاہتے۔ پھر آگے حرم کی مذہبی اہمیت (مثلاً تقدیس و احترام، ہر چیز کا تقدس، درختوں کی قطع و برید، جانوروں کی ایذا رسانی، شکار سے محفوظ، ہر شخص کے لئے امن وغیرہ)۔ نیز اس کی سیاسی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ "گویا حرم اپنے حدود کے اندر ایک مملکت ہوتا ہے جس کے رسوم و ضوابط اس سے مختص ہوتے ہیں" (اکبرخان، میجر جنرل۔ حدیث دفاع۔ فیروز سنز۔ لاہور۔ سنہ ۱۹۵۴ء۔ ص ۱۱۰)۔

[۳۵۸] ملاحظہ ہو دفعات ۳۶، ۳۹ تا ۴۲، ۵۰ تا ۵۲ اور ۵۵۔ [۳۵۹] دفعہ ۴۳، ۴۵، ۴۶ اور ۴۷۔

[۳۶۰] مودودی۔ (مسئلۂ قومیت) ص ۵۸، ۵۹ [۳۶۱] دفعہ ۲۷۔

[۳۶۲] دفعہ ۲۸۔ ابوعبید نے اس دفعہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: انما اراد نصرهم المومنين ومعاونتهم اياهم على عدوهم بالنفقه التى شرطها عليهم فاما الدين فليسوا منه فى شئ۔ الاتراه قد بيّن ذٰلك فقال لليهود دينهم وللمؤمنين دينهم ..... (ابوعبید۔ ج ۲ ص ۲۰۷) ایک جدید مصنف کے بقول: ان هٰذه المعاهدة أطلقت فى عبارتها فشملت اليهود جميعا فيما ارادت ان تصرفه اليهم وهو اشتراكهم فى النفقه فى الحرب ومن عدم اجازه قريش ولانصرها (وصبق۔ الدكتور مصطفىٰ كمال۔ محمد صلّى الله عليه وسلم وبنو اسرائيل۔ المجلس الاعلىٰ للشئون الاسلاميه۔ قاهره۔ سنه ۱۹۷۰ء ص ۳۷، ۳۸)۔

[۳۶۳] جیسا کہ "متحدہ قومیت" کے سلسلہ میں دلائل دیتے ہوئے مولانا محمود حسن دیوبندی نے اپنے ایک رسالہ "متحدہ قومیت اور اسلام" میں ان یهود بنی عوف امه مع المؤمنين سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیکھئے: مودودی (مسئلہ قومیت) ص ۴۹۔ [۳۶۴] دفعہ ۵۰ [۳۶۵] دفعہ ۲۲ [۳۶۶] دفعہ ۴۹

[۳۶۷] HELL. P. 25. [۳۶۸] دیکھئے دفعہ ۳ تا ۱۴، ۱۸، ۲۰، ۲۱ اور ۲۳۔

[۳۶۹] دیکھئے دفعہ ۳ تا ۱۱۔ [۳۷۰] حمید اللہ (عہد نبوی میں نظامِ حکمرانی) ص ۹۹۔

[۳۷۱] Wellhausen (The Historians History of the World), Vol. VIII p. 291.

[۳۷۲] NICHOLSON, P. 173.

[۳۷۳] آرنلڈ (دعوتِ اسلام) ص ۴۵۔

حواشی

باب سوم ——— توسیع ریاست

(۱) ابن حبیب بغدادی، ص ۱۰۷، (۲) ابو داود، ج ۲، ص ۳۲۳ (کتاب الخراج والفئ والامارہ) (۳) ایضاً (۴) ایضاً، قاضی سلیمان منصور پوری نے لکھا ہے کہ "قریشِ مکہ نے اندر ہی اندر یثرب کے یہودیوں سے سازش کرنی شروع کر دی اور جب خفیہ طور پر ان کو اپنے ساتھ ملا چکے تب اپنی کامیابی پر پورا بھروسا کر کے مسلمانوں کو کہلا بھیجا" تم مغرور نہ ہو جانا کہ تم مکہ سے صاف بچ کر نکل آئے۔ ہم یثرب ہی پہنچ کر تمہارا ستیاناس کئے دیتے ہیں" (سلمان منصور پوری۔ قاضی محمد سلیمان۔ رحمۃ للعالمین۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور۔ ۱۹۵۳ء۔ ج ۱۔ ص ۱۳۲) قریش کا یہ پیغام اگرچہ ان کی بد طینتی کے عین مطابق ہے مگر راقم الحروف کو اس کا کہیں اور حوالہ نہیں مل سکا۔ (۵) ابنِ سعد، ج ۲، ص ۹ (کرز بن جابر الفہری کی تادیب کے لئے خود رسول اللہ تشریف لے گئے۔ مدینہ میں حضرت زید بن حارثہ کو اپنا نائب بنایا۔ اور پھر کرز کی تلاش میں وادئ سفوان تک جا پہنچے جو بدر کے نواح میں ہے۔ لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔ چنانچہ آپ مدینہ واپس تشریف لے آئے (ایضاً) اس مہم کو غزوہ طلب کرز بن جابر الفہری (ایضاً) غزوۂ سفوان اور غزوۂ بدر اولیٰ (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۲۵۱) بھی کہتے ہیں۔ ابن ہشام نے ابن اسحاق کے حوالے سے اسے غزوہ ذی العشیرہ کے بعد جمادی الآخرہ کا واقعہ بتایا ہے (ایضاً) جبکہ واقدی (الواقدی۔ ابی عبداللہ محمد بن عمر۔ کتاب المغازی۔ مطبع بپٹسٹ مشن۔ کلکتہ ۱۸۵۵ء ص ۳) اور دیگر مورخین کے نزدیک بالاتفاق ماہ ربیع الاول میں پیش آیا۔ ہمارے نزدیک یہی روایت متواتر اور قوی ہے۔ (۶) بخاری میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ خود رسول اللہ راتوں کو جاگا کرتے تھے (کان النبی سہر) اور آپ کی خواہش یہ تھی کہ کوئی رات کی پہرہ داری کرے۔ اتنے میں ہتھیاروں کی جھنکار سنائی دی۔ دیکھا تو حضرت سعد بن ابی وقاص تھے جو پہرہ داری کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ نے آرام فرمایا (البخاری ج ۱ ص ۴۰۴ نیز دیکھئے ص ۴۲۹، کتاب الجہاد) (۷) واقدی اور ابن سعد کی متفقہ رائے یہ ہے کہ یہ سب سے پہلا سریہ تھا جو حضرت حمزہ کی قیادت میں سیف البحر تک بھیجا گیا (الواقدی، ص ۲۔ ابنِ سعد، ج ۲، ص ۶) یہ تیس افراد پر مشتمل تھا اور رمضان سنہ ۱ھ (یعنی ہجرت کے ساتویں مہینہ) میں روانہ کیا گیا تھا (ایضاً) ابنِ ہشام نے سب سے پہلے سریۂ عبیدہ بن الحارث کا ذکر کیا ہے اور پھر سریۂ حمزہ کے تحت دونوں روایتوں میں تطبیق کے لئے یہ کہا ہے کہ دراصل ان دونوں سرایا کو ایک ساتھ روانہ کیا گیا تھا (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۴۱، ۲۴۵) (۸) ہجرت کے آٹھویں مہینے (شوال سنہ ۱ھ) میں ساٹھ یا اسی سواروں کا دستہ عبیدہ بن حارث کی کمانڈری میں رابغ کی جانب بھیجا گیا (الواقدی ص ۲، نیز ابن سعد ج ۲ ص ۷)۔ (۹) ہجرت کے نویں مہینے (ذیقعدہ سنہ ۱ھ) میں حضرت سعد بن ابی وقاص بیس سواروں کا دستہ لے کر خرار تک گئے (ابنِ سعد ج ۲ ص ۷)۔ ابن ہشام نے بعض اہل علم کے

حوالے سے لکھا ہے اسے سریۂ حمزہ کے بعد بھیجا گیا تھا (ج ۲ ص ۲۵۱) (۱۰) سرایا کی کل تعداد کے بارے میں مورخین اور اصحاب سیر کے بیانات مختلف ہیں۔ ابن سعد کے نزدیک سرایا سینتالیس ہیں (ج ۲ ص ۶) کچھ انہیں صرف چھتیس یا اڑتیس قرار دیتے ہیں۔ بعض کے نزدیک اڑتالیس، بعض کے خیال میں چھپن اور مسعودی کے مطابق ساٹھ ہے۔ جبکہ کچھ اسے ستر اور بعض سو سے اوپر بتاتے ہیں (تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو زرقانی ج ۱ ص ۳۸۸) (۱۱) حضرت سعد بن ابی وقاص کی کنیت ابو اسحٰق تھی۔ ماں کا نام حمنہ تھا۔ سلسلہ نسب زہرہ بن کلاب تک پہنچتا تھا (ابن سعد ج ۳ ص ۱۳۷)۔ ابتدائی مسلمانوں میں سے ایک ہیں۔ نیز خود کہتے ہیں کہ جس دن میں اسلام لایا وہ دن تھا جب اللہ نے نماز فرض کی تھی۔ ایمان کے وقت عمر سترہ سال کے قریب تھی (ایضاً ج ۲ ص ۱۳۹)۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد ایک روایت کے بموجب مصعب بن عمیر سے اور دوسری روایت کے مطابق سعد بن معاذ سے ان کی مواخاۃ ہوئی تھی۔ سب سے پہلے سریۂ حمزہ بن عبد المطلب میں بھی شریک تھے اور سریۂ عبیدہ بن الحارث میں بھی نہ صرف شریک ہوئے بلکہ اللہ کی راہ میں سب سے پہلا تیر چلانے کا شرف بھی حاصل کیا (ایضاً ص ۱۳۹، ۱۴۰) اور یہ افتخار و اعزاز بھی انہی کو حاصل ہے کہ غزوۂ احد میں رسول اللہؐ نے ان سے مخاطب ہو کر یہ کہا تھا کہ "ارم سعد، فداك ابی و امّی (سعد تیر چلاؤ تم پر میرے ماں باپ فدا ہوں۔ ایضاً ص ۱۴۱)۔ حضرت سعد بدر، احد، خندق، حدیبیہ، خیبر، فتح مکہ وغیرہ تمام غزوات میں شریک رہے (ایضاً ص ۱۴۲)۔ مدینہ سے کچھ فاصلہ پر بمقام عقیق ۵۵ھ میں انتقال ہوا اور نماز جنازہ والی مدینہ مروان بن الحکم نے پڑھائی۔ اس وقت ان کی عمر ستر سے متجاوز تھی (ایضاً ص ۱۴۸، ۱۴۹) (۱۲) ابن ہشام ج ۲ ص ۱۴۱۔

(۱۳) عبد اللہ بن جحش ابن اثاب بن یعمر بن صبرہ بن مرہ بن کبیر بن غنم بن دودان ابن اسد ابن خزیمہ کنیت ابو محمد، ماں کا نام امیمہ تھا۔ دار ارقم میں رسول اللہؐ کے قیام سے پہلے ایمان لائے (ابن سعد ج ۳ ص ۸۹)۔ ابن جحش اور ان کے پورے گھرانے نے ہجرت کی تھی۔ ان کی سرکردگی میں جو سریہ بطن نخلہ کی جانب بھیجا گیا اسی میں ان کا نام "امیر المومنین" رکھا گیا (ایضاً ص ۹۰)۔ غزوۂ احد میں جام شہادت نوش کیا۔ حضرت حمزہ کے ساتھ ایک ہی قبر میں مدفون ہوئے۔ شہادت کے وقت عمر چالیس سال سے کچھ اوپر تھی۔ (ایضاً ص ۹۱) (۱۴) یہ ہدایت تحریری تھی۔ رسول اللہؐ نے چلتے وقت ابن جحش کو ایک سر بمہر لفافہ حوالے کیا تھا جس میں یہ تحریر تھا کہ جب تم میرا خط دیکھو تو مکہ اور طائف کے درمیان مقام نخلہ تک اترتے چلے جانا اور وہاں پہنچ کر قریش کی گھات میں رہنا اور ان کے بارے میں اطلاعات ہمیں بھیجتے رہنا۔ (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۲۵۲) (۱۵) غزوۂ ودّان کو غزوۂ الابواء بھی کہتے ہیں۔ ودّان کی جانب اس پیش قدمی کا سبب ابنِ ہشام کی رائے میں قریش اور بنی ضمرہ سے جنگ کا ارادہ تھا (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۴۱) ابنِ سعد کے نزدیک قافلۂ قریش کی ناکہ بندی مقصود تھی (ابن سعد ج ۲ ص ۸) لیکن قرینِ قیاس امر یہ ہے کہ بنی ضمرہ چونکہ قریش کے ہم نسب تھے اس لئے قریشِ مکہ سے ان کی ساز باز تھی۔ اس بات کے امکانات اس لئے اور بھی روشن ہو جاتے ہیں کہ اس قبیلہ کی آبادی اس شاہراہ پر واقع تھی جس سے قریش کے قافلے شام کی طرف جانے کے لئے گزرتے تھے۔ لہٰذا آتے جاتے قریش کو ان لوگوں سے ملنے اور مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کا پورا موقع میسر تھا۔ غالباً رسول اللہؐ نے اس خطرہ کو پوری طرح محسوس کیا کہ دشمن کا ایک حلیف آپ کے اتنے قریب ہے لہٰذا آپ نے ضرورت سمجھی کہ ان سے صلح

کرکے اس خطرہ کا سدِ باب کردیا جائے۔ (۱۶) ابنِ ہشام ج ۲ ص ۲۴۱۔ ابنِ سعد کی روایت کے بموجب معاہدہ میں (جو بنی ضمرہ کے سردار فحشی بن عمرو سے ہوا) یہ طے پایا کہ نہ تو رسولؐ اللہ بنی ضمرہ سے جنگ کریں گے اور نہ بنی ضمرہ آپ سے لڑیں گے، نہ آپ کے خلاف لشکر جمع کریں گے اور نہ دشمن کو مدد دیں گے (ابن سعد ج ۲ ص ۸)۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ معاہدہ مصالحت کرنے کے علاوہ رسولؐ اللہ نے ایک فرمان بھی تحریر کرکے دیا۔ ہم گزشتہ باب میں ڈاکٹر حمید اللہ کے حوالہ سے کتاب کا ترجمہ فرمان تسلیم کرچکے ہیں اس لئے ابن سعد کے ایک ہی پیراگراف میں دو قسم کے الفاظ (وادع) اور (کتب بینہ و بینھم کتابا) سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ معاہدہ الگ تھا اور فرمان یا امان نامہ الگ تھا۔ ہمارا قیاس اس بنا پر بھی قابلِ التفات ہے کہ مورخین عام طور پر "معاہدہ" کے ذیل میں جو الفاظ نقل کرتے ہیں وہ اپنے مضمون اور اندازِ بیان کے اعتبار سے فرمان ہونے کی داخلی شہادت دیتے ہیں جبکہ ابنِ سعد نے مصالحہ کی جن شرائط کا ذکر کیا ہے وہ مختلف ہیں۔ چنانچہ فرمان (یا مروجہ صلح نامہ) کا متن یہ ہے کہ: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ھذا کتاب من محمد رسول اللہ لبنی ضمرہ بانھم آمنون علیٰ اموالھم و انفسھم و ان لھم النصر علی من رامھم ان لا یحاربوا فی دین اللہ ما بل بحر صوفقہ (زرقانی ج ۱ ص ۳۹۶)۔ (۱۷) اس میں رسولؐ اللہ تقریباً دو سو مہاجرین کے ہمراہ اس تجارتی قافلہ پر مسلمانوں کی قوت کا رعب قائم کرنے کے لئے تشریف لے گئے جو امیہ بن خلف الجمحی کی سرکردگی میں جا رہا تھا۔ بواط مدینہ سے تقریباً اڑتالیس میل کے فاصلہ پر علاقہ جہینہ کا ایک پہاڑی مقام تھا اور شام کے تجارتی راستے سے متصل واقع تھا (ابن سعد ج ۲ ص ۹)۔ (۱۸) جیسا کہ ہم پہلے ضمناً اشارہ کرچکے ہیں کہ غزوہ سفوان کا سبب کرز بن جابر الفہری کی تاخت و تاراج تھی (ابن سعد ج ۲ ص ۹)۔ (۱۹) ابن سعد (ج ۲ ص ۹)۔ غزوہ ذی العشیرہ کی وجہ مورخین نے یہ بیان کی ہے کہ قریشِ مکہ نے جو تجارتی قافلہ شام کی طرف روانہ کیا تھا رسولؐ اللہ اس کو روکنا چاہتے تھے (ایضاً ص ۱۰) لیکن یہ بات اس لئے محلِ نظر ہے کہ سرما میں تجارتی قافلہ پورے ساز و سامان کے ساتھ یمن کے بجائے شام کی طرف روانہ کیا گیا تھا حالانکہ قرآن کے بیان کے مطابق سردی کے زمانہ میں قریش کا تجارتی قافلہ یمن اور موسمِ گرما میں شام کی طرف جاتا تھا (قریش ۔ ۱)۔ بہرحال اگر سبب یہی تھا تو ماننا پڑے گا کہ قریش نے یہ اقدام بہت غیر معمولی حالات میں کیا تھا۔ انھوں نے نامناسب موسم میں ایک بڑا قافلہ روانہ کیا اور جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے کہ اس میں قریش کے تمام مردوں اور عورتوں نے اپنا روپیہ لگا دیا تھا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرکے مسلمانوں کے خلاف جنگی تیاریاں کی جاسکیں۔ ان متوقع تیاریوں کے پیشِ نظر رسولؐ اللہ نے مناسب سمجھا کہ اس قافلہ کو راستہ میں ہی روک دیا جائے۔ چنانچہ آپ ذی العشیرہ پہنچے لیکن قافلہ ہاتھ نہیں آیا اس لئے کچھ دن وہاں قیام فرمایا اور بنو مدلج سے معاہدہ کرکے لوٹ آئے (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۲۴۹)

یہاں یہ وضاحت بھی مناسب ہوگی کہ مورخین نے عام طور پر جنگِ بدر کا سبب بیان کرنے میں اسی قافلۂ تجارت کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ جو تجارتی قافلہ غزوہ ذی العشیرہ کے موقع پر شام جاتے ہوئے بچ کر نکل گیا تھا وہ جب شام سے واپس آنے لگا تو اس کو روکنے کے لئے رسولؐ اللہ مع انصار و مہاجرین مدینہ سے روانہ ہوئے لیکن جب بدر کے قریب پہنچے

تو قافلہ جا چکا تھا (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۲۵۷، ۲۵۸) لیکن پھر اس لشکر سے جنگ واقع ہو گئی، جو امیرِ قافلہ ابو سفیان کی طلبی پر قافلہ کی امداد کے لئے مکہ سے آیا تھا۔ مورخین کا عام رجحان اسی طرف ہے لیکن علامہ شبلی نے متعدد دلائل کے ذریعہ اس موقف کی پُر زور تردید کی ہے (ج ۱ ص ۳۱۵ تا ۳۵۹) اور شہادتوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ غزوۂ بدر کا حقیقی سبب ابن حضرمی کا قتل تھا (ایضاً ص ۳۵۹ تا ۳۶۴)۔ شبلی کا بیان بہت مفصل اور مدلل ہے جس کا یہاں دُہرانا تحصیل حاصل ہے۔ البتہ ان کے اہم نکات کا خلاصہ یہ ہے کہ: (i) قافلۂ تجارت میں مکہ کو تمام سرمایہ اُگل دینے کی ضرورت کیا تھی؟ (ii) قافلہ ابھی شام سے روانہ نہیں ہوا تھا کہ حضرمی کے قتل کا اتفاقیہ واقعہ پیش آ گیا (iii) اس قدر عموماً مسلّم ہے کہ جب آنحضرتؐ کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ قریش بڑی تیاری کے ساتھ مکہ سے نکلے ہیں تو آپ نے صحابہ سے مخاطب ہو کر استمزاج کیا۔ مہاجرین نے جوش کے ساتھ آمادگی ظاہر کر دی۔ مگر رسولؐ اللہ انصار کی مرضی کے خواہاں تھے۔ چنانچہ ان کی طرف سے حضرت مقداد نے کہا کہ "ہم موسیٰ کی قوم کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر لڑیں، ہم آپ کے دائیں بائیں سے، سامنے سے اور پیچھے سے لڑیں گے"۔ ان کی اس تقریر سے رسولؐ اللہ کا چہرہ چمک اٹھا اور پھر آپ روانہ ہو گئے۔ رسولؐ اللہ کا انصار کی مرضی معلوم کرنے کی وجہ ظاہر ہے۔ اُنھوں نے بیعت کے وقت صرف یہ اقرار کیا تھا کہ وہ اس وقت تلوار اٹھائیں گے جب دشمن مدینہ پر حملہ آور ہو۔ آنحضرتؐ نے اسی لئے انصار کو شرکت کی دعوت دی۔ ورنہ بصورتِ دیگر اربابِ سیر کے عام بیان کے مطابق واقعہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ انصار معاہدہ اور معمولِ سابق کے خلاف شرکت کے لئے نکلے۔ نیز انصار کو مخاطب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اب انصار سے کام لینے کا وقت آ چکا تھا۔ (iv) آنحضرتؐ نے اس سے پہلے قریش کے قافلوں پر حملہ کرنے کے لئے جس قدر سرایا بھیجے ان میں بیس سے دو سو تک کی جمعیت تھی اور کبھی کسی انصاری کو شریک نہیں کیا حالانکہ اس واقعہ میں انصار کی تعداد مہاجرین سے بہت زیادہ تھی یعنی کل فوج ۳۰۵ تھی جس میں ۸۳ مہاجرین اور باقی سب انصار تھے۔ (v) اگر کاروانِ تجارت پر حملہ مقصود ہوتا تو شام کی طرف بڑھنا تھا۔ یہ خلافِ قیاس ہے کہ کاروان شام سے آ رہا ہے اور آپ کو خبر ہو چکی لیکن شام کی طرف بڑھنے کے بجائے مکہ کی طرف جاتے ہیں اور پانچ منزل مکہ کی طرف پہنچ کر خبر آتی ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا۔ (vi) مدینہ سے ایک میل چل کر نابالغ افراد کو واپس کر دیا جانا قابلِ لحاظ ہے۔ اگر صرف قافلہ کا مال لوٹنا مقصود تھا تو یہ کام نوخیز نوجوان زیادہ خوبی سے انجام دے سکتے تھے جبکہ فی الواقع جہاد مقصود تھا۔

(vii) اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ مدینہ سے جب آپ نکلے تو صرف قافلۂ تجارت پر حملہ مقصود تھا۔ دو چار منزل چل کر قریش کی فوج کا پتا چلا۔ لیکن قرآن کی سورۂ انفال میں جہاں غزوۂ بدر کا سب سے مستند بیان موجود ہے، یہ فرمایا جاتا ہے کہ: کما اخرجک ربک من بیتک بالحق وان فریقاً من المومنون لکرھون یجادلونک فی الحق بعد ما تبین کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انھا لکم وتودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم ویرید اللہ ان یحق الحق بکلماتہ ویقطع دابر الکافرین (آیت ۵ تا ۷)۔ آیت مذکورہ میں یہ تصریح مذکور ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے اس وقت دو گروہ تھے ایک کاروان تجارت اور دوسرا قریش مکہ کی فوج کی طرف جانا چاہتا تھا گویا مدینہ سے نکلنے سے پہلے ہی صورتِ حال واضح تھی اور انصار سے مشورہ ہوا تھا ورنہ اتنے آگے جا کر انصار کہاں ملتے؟

اور یہ تصریح بھی ہے کہ مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت تھی جو چاہتی تھی کہ کاروان پر حملہ کیا جائے خدا نے ان پر ناراضی ظاہر کی۔ علاوہ ازیں اگر صرف قافلۂ تجارت پر حملہ مقصود ہوتا تو یہ خوف و اضطراب اور پہلوتہی (جیسے آیت میں بیان کیا گیا ہے) کس بناء پر تھی؟ اس سے پہلے بارہا (بقول اربابِ سیر) قافلۂ قریش پر حملہ کرنے کے لئے تھوڑے تھوڑے آدمی بھیجے گئے تھے اور کبھی ان کو ضرر نہیں پہنچا۔ اس دفعہ اسی قافلہ سے اتنا ڈر کہ تین سو کی جیدہ اور منتخب فوج ہے اور پھر لوگ ڈر کے مارے سہمے جاتے ہیں۔ مزید برآں عام اربابِ سیر اور احادیث نے لوگوں کے کسمسانے کی توجیہ یہ کی ہے کہ جانتے تھے کہ جہاد یا غزوہ نہیں ہے صرف قافلہ کا مال لوٹنا ہے حالانکہ قرآن میں صاف ہے کہ یہ کسمسانا عدمِ ضرورت کی بناء پر نہیں بلکہ اس وجہ سے تھا کہ ان کو یہ نظر آتا تھا کہ موت کے مُنہ میں جا رہے ہیں۔ (viii) کفارِ قریش جو مکہ سے لڑنے کے لئے آئے ان کی نسبت قرآن میں ہے: ولا تکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطراً و رئاء الناس ویصدون عن سبیل اللّٰہ (الانفال - ۴۷) اگر صرف قافلۂ تجارت کے لئے نکلتے تو خدا کیوں کہتا کہ دکھاوے کے لئے اور خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے؟ پھر خدا کی راہ سے لوگوں کو روکنا کیا تھا؟

علامہ شبلی کے اس موقف کے برخلاف ڈاکٹر حمید اللہ نے یہ بیان کیا ہے کہ "مدینہ سے مسلمانوں کا قریش پر معاشی دباؤ ڈالنا اور بزورِ قریش قافلوں کی آمد و رفت کو اپنے زیرِ اثر علاقے میں روک دینا۔ یہی بدر کی لڑائی کا باعث ہو سکتے ہیں" (حمید اللہ۔ محمد۔ عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ۔ نشریۂ شرکت وراقت۔ دکن ۱۹۴۵ء ص ۱۷)

پھر آگے لکھتے ہیں کہ "شبلی مرحوم نے کانّما یساقون الی الموت کی آیت سے استدلال کر کے کم از کم جنگِ بدر کی حد تک اپنی رائے کو مستحکم کر لیا ہے کہ آنحضرتؐ قافلے کو روکنے کے لئے نہیں بلکہ قریشی امدادی دستے سے مقابلہ کے لئے نکلے تھے لیکن...... الخ" (ایضاً ص ۱۷)۔ ہمیں اس سے تو انکار نہیں ہے کہ قریش کے تجارتی قافلوں کو روکنے اور ان پر چھاپہ مارنے کے لئے مہمات روانہ کیں۔ ان میں سے چند کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور یہ غزوۂ ذی العشیرہ کا مقصد بھی (اگرچہ بالکل غیر معمولی حالات میں ہوا) یہی تھا۔ لیکن جہاں تک جنگِ بدر کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ہمیں علامہ شبلی کی رائے اور دلائل سے اتفاق ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جنگِ بدر بہر حال ایک سوچی سمجھی اسکیم، متعدد واقعات (جن میں تجارتی قافلوں پر مسلمانوں کے حملے بھی شامل ہیں) اور طویل منصوبہ بندی کا نتیجہ تھی۔ اور سب سے اہم کردار یا یوں کہہ لیجئے کہ اس کا فوری سبب ابنِ حضرمی کا قتل ہی تھا۔ یہی عرب کی قدیم روایات کا خلاصہ، ان کے قومی خاصہ کے مطابق اور حالات کا تقاضا تھا۔

(۲۰) ابنِ سعد (ج ۲ ص ۸، ۱۰)۔ نیز تفصیلات کے لئے دیکھئے: حمید اللہ، الدکتور محمد۔ مجموعۃ الوثائق السیاسیہ فی العھد نبوی والخلافۃ الراشدہ۔ مطبعہ لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر۔ قاہرہ۔ ۱۹۴۱ء۔ ص ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۳)۔ ابن حبیب بغدادی کے بیان کے مطابق ان قبائل کے علاوہ رسول اللہؐ نے غزوۂ سفوان میں بنی غفار اور اسلم سے بھی معاہدات استوار کئے (ابن حبیب، ص ۱۱۱) واقدی نے بغیر نام لئے بروایت مخرمہ لکھا ہے کہ قد حالف علینا اھل الطریق وادعھم (الواقدی، ص ۲۱)۔ اس سے معلوم ہوا کہ باشندگانِ میانہ راہ سے آپ نے (غالباً غیر جانبداری پر) حلف

لیا تھا اور ان سے مصالحہ کر لیا تھا۔ (۲۱) حمید اللہ، ڈاکٹر محمد۔ رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی۔ دارالاشاعت۔ کراچی۔ ۱۹۶۱ء۔ ص ۸۴) (۲۲) ڈاکٹر حمید اللہ نے بھی ۱ھ میں "مملکتِ نبویہ کی توسیع" کو نقشہ کے ذریعہ مدینہ تا ینبوع ظاہر کیا ہے (ایضاً ص ۸۳)۔ (۲۳) بروایت ابن ہشام کل لشکر ۳۱۴ صحابہ پر مشتمل تھا یعنی مہاجرین ۸۳، اوس ۶۱ اور خزرج ۱۷۰ (ابن ہشام ج ۲ ص ۳۶۴) اس لشکر میں سے آٹھ صحابہ کو رسول اللہؐ نے بعض کاموں پر متعین کر دیا تھا اس لئے وہ جدال و قتال میں شریک نہیں ہو سکے لیکن مالِ غنیمت میں ان سب کو برابر کا حصہ ملا۔ گویا اس طرح میدانِ جنگ میں موجود مسلمانوں کی کل تعداد ۳۰۶ تھی۔ ابن سعد نے ان آٹھ کو نکال کر شرکاءِ بدر کی تعداد ۳۰۵ لکھی ہے (ج ۲ ص ۱۲)۔ لشکر کی روانگی کے بارے میں ابنِ ہشام نے ۸ رمضان کی تاریخ لکھی ہے (ج ۲ ص ۲۶۳) لیکن ابن سعد کے نزدیک یہ ۱۲ رمضان تھی (ج ۲ ص ۱۲) ہمیں ابنِ ہشام کا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ (۲۴) ابنِ ہشام (ج ۲ ص ۲۷۱)۔ وادی کے ایک کنارے کے لئے عدوۃ الدنیا (جہاں رسول اللہؐ کا قیام تھا) اور دوسرے کنارے کے لئے (جہاں کفارِ قریش کا پڑاؤ تھا) عدوۃ القصویٰ کی اصطلاحات قرآن نے استعمال کی ہیں (الانفال ۴۲)۔ (۲۵) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: الواقدی ص ۴۹ تا ۱۱۹ (ضرورت سے زیادہ تفصیل موجود ہے)، نیز ابنِ ہشام ج ۲ ص ۲۶۳ تا ۳۰۰ (تمام ضروری تفصیلات کے ساتھ) لیکن سب سے اچھا، صاف ستھرا اور واضح بیان ابنِ سعد کا ہے، دیکھئے: ابنِ سعد ج ۲، ص ۱۲ تا ۱۹۔ (۲۶) رسول اللہؐ نے خود لوگوں کے سامنے یہ اظہار کر دیا تھا کہ: ھذہ مکۃ قد القت افلاذ کبدھا" (یہ مکہ ہے جس نے اپنے جگر پاروں کو سامنے ڈال دیا ہے) ملاحظہ ہو: الواقدی ص ۴۸ اور ابن ہشام ج ۲ ص ۲۶۹۔ ان جگر پاروں میں سے چند کے نام قابلِ ذکر ہیں مثلاً عقبہ بن ابی معیط، عقبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ (بنو شمس) الحارث بن عامر، طعیمہ بن عدی (بنو نوفل) زمعہ بن الحجاج اور اس کا بھائی بنیہہ (بنو سہم) امیہ بن خلف (بنو جمح) اور سب سے بڑھ کر ابوجہل (بنو مخزوم) وغیرہ۔ (۲۷) شبلی ج ۱ ص ۳۶۴۔ (۲۸) الانفال (۲۶)۔ (۲۹) آلِ عمران (۱۲۳)۔ (۳۰) الانفال (۴۱)۔ (۳۱) جنگ بدر ۱۷ رمضان ۲ھ کو ہوئی تھی (الواقدی ص ۲) اور اس سے رسول اللہؐ رمضان کے اواخر یا شوال کے آغاز میں فارغ ہوئے (ابن ہشام ج ۳ ص ۵۴) پھر غزوۂ بنو قینقاع ۱۵ شوال ۲ھ کو ہوا (واقدی ص ۲) ان کا محاصرہ پندرہ دن تک جاری رہا (ابن ہشام ج ۳ ص ۵۲) اور اس کے بعد ان کا اخراج عمل میں آیا۔ (۳۲) WATT (MUHAMMAD AT MEDINA) P.17. (۳۳) الواقدی (ص ۳) اور ابنِ سعد (ج ۲ ص ۳۱) نے اسے محرم ۳ھ کا واقعہ لکھا ہے جبکہ ابنِ ہشام نے شوال کا۔ (ج ۳ ص ۴۶)۔ (۳۴) ابن سعد ج ۲ ص ۳۴، ۳۵۔ اس غزوہ کو ابن ہشام نے غزوہ ذی امر کے نام سے (ج ۳ ص ۴۹) اور واقدی (ص ۳) اور ابن سعد (ص ۳۴) نے غزوۂ غطفان کے عنوان سے لکھا ہے۔ (۳۵) ابنِ سعد ص ۳۵، ۳۶۔ اس غزوہ کو ابن سعد نے غزوۂ بنی سلیم کا عنوان دیا ہے۔ جبکہ واقدی نے غزوۂ بحران (ص ۴) اور ابن ہشام نے اسے "غزوۃ الفرع من بحران" (ج ۳ ص ۵۰) کے نام سے لکھا ہے۔

(۳۶) بدر کے انتقام میں رسول اللہؐ کی جان لینے کی کوشش کے ضمن میں ایک مثال عمیر بن وہب کی ہے۔ جس کا بیٹا وہب

رسول اللہؐ کے اسیرانِ بدر میں شامل تھا۔ عمیر نے اپنے رنج والم کا اظہار صفوان بن امیہ سے کیا۔ بالآخر دونوں نے مقام حجر میں گفتگو کر کے باہم یہ طے کر لیا کہ صفوان عمیر کا قرض بھی ادا کرے گا اور اس کے بال بچّوں، خاندان کی تاحیات کفالت کرے گا جبکہ عمیر نے قسم کھا کر یہ اقرار کیا کہ وہ انتہائی رازداری کے ساتھ مدینہ پہنچ کر شمعِ رسالت کو گل کر دے گا۔ اس غرض سے اس نے اپنی تلوار کو خوب تیز کر کے زہر میں بجھا لیا اور مدینہ آ گیا۔ مگر شومیِ قسمت سے ایک تو سب سے پہلے اس کی مڈ بھیڑ حضرت عمرؓ سے ہو گئی اور انہوں نے اسے پکڑ کر حضور کی خدمت میں پیش کر دیا اور دوسری طرف خود رسول اللہؐ کو بذریعہ وحی اس کے منصوبہ کی اطلاع ہو گئی مختصر یہ کہ عمیر اپنے ارادہ میں ناکام ہوا بلکہ ایمان لا کر مکہ لوٹا (واقدی ص ۱۱۸ تا ۱۲۲، ملخصاً) اس واقعہ کو ابن ہشام نے بھی "اسلام عمیر بن وہب" کے تحت نقل کیا ہے (ج ۲ ص ۳۱۶ تا ۳۱۸)۔ (۳۷) اس لشکر میں تمام قریش، ان کے حلفا، احابیش بلکہ قبائل کنانہ کے لوگ اور اہل تہامہ اور عورتیں بھی شامل تھیں (ابن ہشام ج ۳ ص ۶۵، ۶۶)۔ (۳۸) غزوۂ سویق ذی الحجہ ۲ھ میں ہُوا۔ ابوسفیان نے بدر کی رسواکن شکست پر منّت مانی تھی کہ جب تک مسلمانوں سے انتقام نہ لے گا چین سے نہ بیٹھے گا۔ چنانچہ دُو ماہ کا توقف کرنے کے بعد ایک رات مدینہ پہنچا اور رات ہی کے وقت مدینہ کے حصّہ عریض نامی پر حملہ کر دیا۔ وہاں ایک انصاری کی کھیتی اور کچھ کھجور کے درخت تھے ان میں آگ لگا دی۔ اور ان انصاری اور ان کے ایک ساتھی کو سوتے میں شہید کر دیا اس کے بعد بڑی تیزی سے راہِ فرار اختیار کی۔ رسول اللہؐ کو معلوم ہوا تو آپ نے دو سو صحابہ کے ہمراہ ابوسفیان کا تعاقب کیا لیکن وُہ اپنی منّت پُورا کر کے اس طرح بھاگ چُکا تھا ستّو (سویق) کے بہت سے بورے جو بطور رسد ساتھ لایا تھا راستے میں پھینکتا گیا جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے (ایضاً ج ۳ ص ۴۷، ۴۸)۔

(۳۹) ابن سعد ج ۲ ص ۳۷ (۴۰) ابن ہشام ج ۳ ص ۶۴۔ واٹ نے اپنی کتاب (MUHAMMAD AT MEDINA, P.22) میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عبداللہ بن ابی کی اس طرح سے علیحدگی بدنیتی پر مبنی نہ تھی جیسا کہ اولین مآخذ سے معلوم ہوتا ہے بلکہ یہ قیاس پیش کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی نے علیحدگی اس لئے اختیار کی کہ وُہ مدینہ کی مرکزی آبادی کا تحفظ کر سکے۔ ہمارے نزدیک واٹ کے اس قیاس کی تائید نہ تو اوّلین ماخذ سے ہوتی ہے جیسا کہ واٹ نے خود اعتراف کیا ہے اور نہ ہی واقعات سے۔ پھر ابن ابی کے اس فعل کی نوعیت اس وقت اور واضح ہو جاتی ہے جبکہ ہم اس روز اسی گروہ منافقین کی گفتگو کو سامنے رکھتے ہیں (مثلاً انہوں نے اس موقع پر کہا تھا کہ اگر ہمیں معلوم ہوتا اور یقین ہوتا کہ جنگ ضرور ہو گی تو ہم تمہارے ساتھ بے شک چلتے اور تمہاری طرف سے لڑتے مگر ہمارے خیال میں جنگ نہیں ہو گی (ابنِ ہشام ج ۳ ص ۱۲۵) علاوہ ازیں جنگِ اُحد کے بعد پہلے جمعہ کو مسجد نبوی میں ابن ابی کو اسی بناء پر ذلیل وخوار کیا گیا کہ اس نے جنگ کے نازک موقع پر انتہائی گھناؤنے کردار کا مظاہرہ کیا تھا (ابنِ ہشام ج ۳ ص ۱۱۱)۔ منافقوں نے رسول اللہؐ اور دیگر مسلمانوں کو نقصان اٹھانے پر خوشیاں بھی منائیں (ابن سعد ج ۲ ص ۴۴)۔ (۴۱) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۹۸ (۴۲) ابن سعد ج ۲ ص ۳۶۔ (۴۳) ایضاً ص ۵۹۔ نیز دیکھئے طبری ج ۲ ص ۵۲۷۔ (۴۴) ان کے نام یہ ہیں، مرثد بن ابی مرثد غنوی، خالد بن بکیر، عاصم بن ثابت، خبیب بن عدی، زید بن دثنہ اور عبداللہ بن طارق (ابن ہشام ج ۳ ص ۱۷۸)۔

(۴۵) چار شہدا میں مرثد، خالد، عاصم اور عبداللہ بن طارق شامل ہیں (ابن ہشام ج ۳ ص ۱۷۹، ۱۸۰) جبکہ خبیب اور زید کو بنو ہذیل نے اپنے قیدیوں کے بدلے میں (جو مکہ میں قید تھے) فروخت کر دیا۔ خبیب کو تو حجیر بن ابی وہاب تمیمی (حلیف بنو نوفل) نے خریدا، تاکہ اپنے باپ کا بدلہ لے۔ اور زید بن دثنہ کو صفوان بن امیہ نے اپنے باپ امیہ بن خلف کے بدلے میں قتل کرنے کے لئے خریدا (ایضاً ص ۱۸۰، ۱۸۱) ان واقعات کو ابن سعد نے سریہ مرثد بن ابی مرثد کے تحت بیان کیا ہے (ابن سعد ج ۲ ص ۵۵، ۵۶)۔ (۴۶) ان مبلغین کو رسول اللہؐ نے بنی عامر کے ایک سردار ابو براءؓ عامر بن مالک بن جعفر کی درخواست اور اصرار پر روانہ فرمایا تھا۔ (ابن ہشام ج ۳ ص ۱۹۳، ۱۹۴) مگر ان کے ساتھ بھی غداری کی گئی اور عامر بن الطفیل کی شہ پر بنی سلیم کے قبائل عصیہ رعل اور ذکوان نے بئر معونہ کے مقام پر اچانک نرغہ کر کے ان سب کو قتل کر دیا۔ صرف ایک صحابی کعب بن زید بچ گئے تھے جو بعد میں غزوۂ خندق میں شہید ہوئے (ایضاً ص ۱۹۴)۔ ان واقعات کو ابنِ سعد نے سریۂ منذر بن عمرو کے نام سے ذکر کیا ہے (ج ۲ ص ۵۱ تا ۵۴)۔ (۴۷) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: الواقدی (ص ۳۵۴ تا ۳۵۶)، ابنِ ہشام (ج ۲ ص ۱۹۹، ۲۰۰)، ابن سعد (ج ۲ ص ۵۷، ۵۸)۔ (۴۸) ان کی سرکوبی کے لئے حضورؐ کی مہم کو غزوۂ ذات الرقاع کہا جاتا ہے (ابن ہشام ج ۳ ص ۲۱۳، ۲۱۴)۔ (۴۹) ابنِ سعد نے غزوۂ حمراء الاسد کے لئے روانگی کے وقت آپ کی یہ حالت بیان کی ہے کہ "آپ اس حالت میں روانہ ہوئے کہ چہرہ مبارک مجروح تھا اور پیشانی زخمی تھی، دندان مبارک ٹوٹا ہوا تھا اور نیچے کا ہونٹ اندر کی جانب ہو گیا تھا، داہنا شانہ ابن قمیہ کی تلوار کی ضرب سے شکست تھا اور دونوں گھٹنے چھلے ہوئے تھے (ابن سعد ج ۲، ص ۴۹)۔ (۵۰) حضرت علی کو رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ تم مشرکین کے پیچھے جا کر دیکھو کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور آئندہ کیا کرنا چاہتے ہیں اگر انہوں نے گھوڑوں کو کوتل ساتھ لیا ہو اور خود وہ اونٹوں پر سوار ہوں تو سمجھ لینا کہ اب وہ مکہ پلٹ رہے ہیں اور اگر اس کے برعکس وہ گھوڑوں پر سوار ہوں اور اونٹوں کو خالی ساتھ لے جا رہے ہوں تو سمجھنا کہ ان کا ارادہ مدینہ کا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر وہ مدینہ کا رخ کریں گے تو میں ضرور فوراً پہنچ کر ان سے لڑوں گا (طبری ج ۲ ص ۵۲۷، اس ارشاد میں بصیرت، عزم اور حوصلہ کا کتنا صاف اظہار پایا جاتا ہے۔ (۵۱) ابنِ سعد ج ۲ ص ۴۹)۔ (۵۲) ابن ہشام ج ۲ ص ۱۱۰۔ نیز ملاحظہ ہو، طبری ج ۲ ص ۵۳۵۔ (۵۳) ابن سعد ج ۲ ص ۴۹۔ (۵۴) ایضاً ج ۲ ص ۵۰۔ (۵۵) ابن ہشام ج ۳ ص ۱۹۹۔ (۵۶) ایضاً۔ (۵۷) ابنِ سعد ج ۲ ص ۵۷ (۵۸) ابن ہشام ج ۲ ص ۲۰۰۔ (۵۹) ابنِ سعد ج ۲ ص ۵۷۔ (۶۰) ایضاً (۶۱) ایضاً (۶۲) ایضاً ص ۵۸۔ (۶۳) البلاذری (فتوح) ص ۲۴۔ (۶۴) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۲۰۱۔ (۶۵) ایضاً (۶۶) ابنِ سعد ج ۲ ص ۵۹، (۶۷) ایضاً ص ۵۹، ۶۰۔ (۶۸) ایضاً ص ۶۰۔ (۶۹) طبری ج ۲ ص ۵۵۹ (واضح رہے کہ طبری نے اسے "الخبر عن غزوۃ السویق" کے تحت بیان کیا ہے)۔ (۷۰) ابن ہشام ج ۳ ص ۲۲۵۔ (۷۱) ایضاً ص ۲۲۶۔ (۷۲) واٹ نے واقدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بنو نضیر نے جنہیں مدینہ سے جلا وطن کیا گیا اور اس وقت خیبر میں تھے لیکن مدینہ میں دوبارہ آباد ہونے کی آرزو رکھتے تھے اور جنہوں نے اتحادی لشکر تیار کرنے میں بڑی جانفشانی دکھائی تھی۔ انہوں نے بنو غطفان کو خیبر کی کھجوروں کی

آدھی آمدنی کے وعدہ پر جنگ میں ساتھ دینے کے لئے آمادہ کیا۔ ملاحظہ ہو: WATT. (MUHAMMAD AT MEDINA) P. 36. ۔ (۷۳) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۲۱۴ ۔ (۷۴) ایضاً ۔ ابنِ ہشام نے اسے جمادی الاولیٰ سنہ ۴ھ کا واقعہ بتایا ہے جبکہ ابنِ سعد لکھتا ہے کہ رسولؐ اللہ غزوہ ذات الرقاع کے لئے محرّم سنہ ۵ھ میں نکلے (ابنِ سعد ج ۲ ص ۶۱)۔ (۷۵) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۲۱۴۔ (۷۶) ایضاً ۔ ابنِ سعد کا بیان واضح ہے۔ لیکن ابنِ ہشام کا یہ لکھنا ہمارے لئے ناقابلِ فہم ہے کہ: ثم رجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل ان یتصل الیہا و لم یلق کیدا (ج ۳ ص ۲۲۴)۔ یہ کہنا کہ لم یلق کیدا تو اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ وہاں تک پہنچے ہوں ورنہ یہ کہنا لاحاصل ہے۔ طبری نے بھی صاف صاف بیان کیا ہے کہ: حتی بلغ دومۃ الجندل۔ (طبری ج ۲ ص ۵۶۴)۔ (۷۸) واقدی نے قریش اور اس کے اتحادی لشکر میں شامل جماعتوں اور اس کی کیفیت کے بارے میں لکھا ہے کہ: ان قریش جمعوا الجموع واستاجروا احیا من قبائل العرب فسارت غطفان واسد وسلیم وقریش ومن دخل فیہا فاجتمع منہم نضیر جم فار واجیعا (الواقدی ص ۲۶۲) اور حی بن اخطب اور بنی قریظہ کی گفتگو کے دوران یہ اشارہ کیا ہے کہ دشمنانِ اسلام کے لشکر میں پندرہ ہزار جنگجو شامل تھے (ایضاً ص ۲۶۴)۔ ابنِ ہشام نے بیان کیا ہے کہ قریش کے ساتھ فوج دس ہزار تھی جو احابیش اور بنو کنانہ اور اہلِ تہامہ میں سے ان کے پیروؤں پر مشتمل تھی۔ ساتھ ہی قبیلہ غطفان اور اہلِ نجد میں سے ان کے متبعین بھی تھے جو ذنب نقمی میں پہنچ کر ٹھہر گئے۔ (ابنِ ہشام ج ۳ ص ۲۳۰، ۲۳۱ نیز دیکھئے ص ۲۲۶)۔ ابنِ سعد نے اتحادیوں کے لشکر میں شامل تمام جماعتوں اور ان کے جملہ شرکاء کی تفصیل بتا دی ہے (ابنِ سعد ج ۲ ص ۶۶) تعجب خیز امر یہ ہے کہ یہودیوں نے اگرچہ آگ لگانے اور اس اتحادی لشکر کی فراہمی میں انہوں نے مرکزی کردار ادا کیا تھا لیکن وُہ خود لشکر میں شریک نہ تھے ورنہ بقول ڈاکٹر حمید اللہ "مجوزہ حملے میں کچھ نہیں تو تین چار ہزار مزید سپاہیوں کا اضافہ ہو جاتا" (حمید اللہ ۔ رسولؐ اکرم کی سیاسی زندگی ۔ ص ۸۵)۔ (۷۹) ابنِ سعد ج ۲ ص ۶۶ ۔ (۸۰) الاحزاب (۱۰، ۱۱)۔ (۸۱) شہر مدینہ مشرق اور مغرب کی جانب سے حراۃ اور جنوب کی طرف مشرقی حراۃ کی ایک شاخ اور جبل عیر سے گھرا ہوا ہے۔ اس زمانے میں اکثر حصّے کھجور کے باغات اور گھنے جنگلات سے ڈھکے ہُوئے تھے جن سے ہو کر راستہ بنانا مشکل تھا اور فوج کشی کرنا تو قطعاً ناممکن تھا۔ شمال کی جانب جبلِ اُحد اور وادی قناۃ کی وجہ سے شہر محفوظ تھا صرف شمالی مغربی علاقہ کھلا ہوا تھا۔ جہاں وادیٔ قناۃ، وادیٔ بطحان اور وادی العقیق نے مل کر ایک وسیع ہموار میدان بنا لیا تھا اور اس میدان سے فوج کو بآسانی گذار کر شہر پر حملہ کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا سب سے زیادہ ضرورت اسی طرف کے استحکام کی تھی۔ چنانچہ جب یہ بات طے ہو گئی کہ خندق کھودی جاتے تو آپ نے اس کے لئے نشانات قائم کئے۔ دیار بنی عبدالاشہل اس کا مشرقی سرا قرار پایا۔ وہاں سے شروع کر کے ساڑھے تین میل پر وادی بطحان کے پار حرۃ الوبرہ پر واقع کچھ پہاڑی ٹیلوں کو مغربی حد قرار دیا گیا۔ اس طرح لمبائی ساڑھے تین میل ہُوئی (مغربی جانب حرۃ الوبرہ اور وادیِ بطحان کے بعض حصّوں میں مختلف خاندانوں نے اپنے اپنے محلّوں کے آگے خندق کھود کر اس سلسلہ کو مسجد نبویؐ کے جنوب تک وسیع کر دیا تھا) مدینہ کی آبادی اور جبل سلع کو خندق کے جنوب میں رکھا گیا تھا (تفصیلات کے لئے: ابن سعد ج ۲ ص ۶۶، ۶۷) خندق کی چوڑائی اور گہرائی کی

کیفیت بالعموم بیان نہیں کی گئی اس لئے اندازاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی چوڑائی اوسطاً دس گز (۳۰ فٹ) اور گہرائی پانچ گز (۱۵ فٹ) سے دس گز (۳۰ فٹ) تک تھی۔ نیز اس خندق کی کھدائی کو تین ہفتوں کے اندر اندر مکمل کیا گیا تھا۔ (۸۲) ابن سعد ج ۲ ص ۶۶۔ (۸۳) ابن ہشام نے لکھا ہے کہ اتحادیوں اور رسول اللہؐ کا آمنا سامنا بیس دن سے کچھ زائد تک رہا (ج ۳، ص ۲۲۳)۔ (۸۴) ابن سعد ج ۲ ص ۶۷۔ (۸۵) الواقدی ص ۲۶۴، ۲۶۵۔ نیز ابن ہشام ج ۳ ص ۲۳۱، ۲۳۲۔ (۸۶) ان میں سے حضرت سعد بن معاذ، سعد بن عبادہ، عبداللہ بن رواحہ اور خوات بن جبیر کو بھیجا گیا تھا (ابن ہشام ج ۳ ص ۲۳۲)۔ (۸۷) ایضاً ص ۲۲۳۔ (۸۸) نعیم بن مسعود کا تعلق قبیلۂ اشجع سے تھا۔ نام و نسب یہ ہے، نعیم بن مسعود بن عامر بن اُنیف بن ثعلبہ بن قنفذ بن خلاوہ بن سبیع بن بکر بن اشجع۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر قریش کی معیت میں جن قبائل نے مدینہ پر حملہ کرنے میں حصہ لیا تھا ان میں ان کا قبیلہ بھی شامل تھا۔ اور یہ خود بھی اسی لشکر کے ساتھ آئے لیکن اس وقت تک اپنی قوم کے دین پر تھے۔ اسی اثناء میں ان کے دل میں اللہ نے اسلام کی محبت پیدا کی لیکن اس کا اظہار کئے بغیر یہ خاموشی سے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے۔ چونکہ ان کے مسلمان ہونے کا علم دوسروں خصوصاً قریش یا بنی قریظہ کو نہ تھا اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے لشکرِ اسلام اور ریاستِ مدینہ کی زبردست خدمت انجام دی۔ یہ بظاہر خیر خواہ بن کر باری باری قریظہ، قریش اور غطفان کے پاس گئے اور انھیں ایک دوسرے کے خلاف بدظن کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست مدینہ کے دشمنوں میں پھوٹ پڑ گئی ورنہ ان کا اتحاد سخت نقصان پہنچاتا۔ اس غزوہ کے بعد انہوں نے ہجرت کی اور مستقل مدینہ میں سکونت اختیار کر لی (ابنِ سعد ج ۴ ص ۲۷۷ تا ۲۷۹)۔ (۸۹) ابن سعد ج ۲ ص ۶۹، ۷۰۔ (۹۰) ایضاً۔

(۹۱) الاحزاب (۲۵)۔ (۹۲) ابنِ سعد ج ۲ ص ۷۴۔ (۹۳) ایضاً ص ۷۵۔ (۹۴) محاصرہ کے سلسلے میں ابن سعد نے ایک روایت پندرہ روز کی لکھی ہے (ج ۲ ص ۷۴) ہمارے نزدیک یہی صحیح ہے۔ لیکن دوسری روایت چودہ روز کی بھی لکھی (ص ۷۶)، جبکہ ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ بنی قریظہ کا محاصرہ پچیس دن تک جاری رہا (ج ۳ ص ۲۴۶)۔ (۹۵) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۲۵۰، ۲۵۱۔ (۹۶) ایضاً ص ۲۵۱۔ (۹۷) ایضاً ص ۲۴۲ (۹۸) اگرچہ یہ غزوہ اپنے بعض واقعات کی وجہ سے نہایت اہم ہے لیکن اس کے زمانہ وقوع میں مورخین اور اصحابِ سیر نے اختلاف کیا ہے۔ ابن اسحاق ابن ہشام (ج ۳، ص ۳۰۲)، ابن حبیب بغدادی (ص ۱۱۴، ۱۱۵)، طبری (ج ۱ ص ۶۰۴)، ابن اثیر (ج ۲ ص ۱۹۲)، طبرانی (الہیثمی ج ۶ ص ۱۴۳) وغیرہ نے اسے شعبان سنہ ۶ھ کا واقعہ بتایا ہے جبکہ واقدی (ص ۴) اور ابن سعد (ج ۲ ص ۶۳) وغیرہ کی روایت شعبان ۵ھ کی ہے۔ ہم نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے اس کے مندرجہ ذیل وجوہ ہیں: (۱) اکثر مورخین اور سیرت نگاروں کے نزدیک یہ امر متفق علیہ ہے کہ قرآن کی سورۂ نور اسی غزوہ کے بعد نازل ہوئی۔ خود قرآن کے بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا نزول واقعہ افک کے سلسلے میں ہوا تھا (آیت ۱۱ تا ۲۰)۔ نیز کثیر التعداد معتبر روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ افک سے پہلے احکام حجاب نازل ہو چکے تھے اور وہ متعین طور پر سورۂ احزاب (آیت ۵۹) میں پائے جاتے ہیں اور یہ بھی طے ہے کہ سورۂ احزاب غزوۂ خندق کے بعد نازل ہوئی تھی۔ اس طرح یہ بھی تعین ہو جاتا ہے

کہ سورۂ نور کا نزول سُورۂ احزاب کے بعد ہوا یا دوسرے الفاظ میں واقعۂ افک غزوۂ خندق اور غزوۂ بنی قریظہ کے بعد پیش آیا۔ (ii) معتبر روایات یہ بھی بتاتی ہیں کہ واقعہ افک سے پیشتر حضرت زینب کا حضورؐ سے نکاح ہو چکا تھا اور وہ غزوۂ احزاب کے بعد ذی قعدہ ۵ھ کا واقعہ ہے۔ علاوہ ازیں یہ ثابت ہے کہ حضرت عائشہ پر تہمت لگانے والوں میں حمنہ بنت جحش بھی شامل تھیں۔ ان کے اس فعل میں یہ قرینہ پایا جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ ان کی بہن کی سوکن تھیں اور ظاہر ہے کہ بہن کی سوکن کے خلاف اس طرح کے جذبات کا پیدا ہو جانا بڑی حد تک فطری امر ہے اور اس نفسیاتی عمل کے لئے کچھ نہ کچھ مدت بھی درکار ہے (مودودی تفہیم القرآن مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند۔ دہلی۔ ج ۳، ص ۳۰۷)۔ (iii) بعض روایات میں واقعہ افک کے زمانہ میں حضرت سعد بن معاذ کی موجودگی کا ذکر آیا ہے (جن کا انتقال ۵ھ میں ہوا تھا) مگر یہ مشکل اس لئے رفع ہو جاتی ہے کہ اس کے برخلاف بعض روایات میں حضرت اسید بن حضیر کا ذکر موجود ہے جو دوسرے تمام واقعات و روایات سے عین مطابقت رکھتا ہے۔ (ایضاً)۔ (۹۷) ابن سعد کا بیان یہ ہے کہ منافقین کی اتنی بڑی تعداد پہلی مرتبہ اس غزوہ میں رسولؐ اللہ کے ہمراہ تھی (ج ۲ ص ۶۳)۔ منافقین کا پہلی مرتبہ اس بڑی تعداد میں شریک ہونا اور پھر ان کا طرزِ عمل بھی اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ غزوہ احزاب کے بعد کا واقعہ ہے۔ (۹۹) ابن سعد ج ۲ ص ۶۳۔ (۱۰۰) مریسیع ایک آبگیر کا نام تھا جس کا محلِ وقوع قدید سے متصل تھا (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۳۰۲)۔ (۱۰۱) آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ تمام مردوں، عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ ان ہی اسیرانِ جنگ میں سردارِ قبیلہ کی صاحبزادی جویریہ بھی تھیں جو بعد میں ام المومنین بنیں۔ قیدیوں کے علاوہ مالِ غنیمت میں دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں بھی مسلمانوں کے ہاتھ آئیں (ابنِ سعد ج ۲ ص ۶۴)۔

(۱۰۲) ایضاً ج ۲ ص ۸۹، ۹۰ (واضح رہے کہ فدک کی دوسری متعدد مہمیں بھی روانہ کی گئی تھیں)۔ (۱۰۳) حضرت عمر بن خطاب شعبان ۷ھ میں تیس آدمیوں کے ہمراہ بنو ہوازن کی تادیب کے لئے بجانب تربہ روانہ ہوئے مگر دشمن ہاتھ نہ آیا۔ چنانچہ مدینہ واپس آ گئے (ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۱۷)۔ (۱۰۴) بنی کلاب کی تادیب کے لئے حضرت ابوبکر صدیق شعبان ۷ھ میں (نجد کے نواح میں) تشریف لے گئے تھے (ایضاً ص ۱۱۷ - ۱۱۸)۔ (۱۰۵) بشیر بن سعد الانصاری کی سرکردگی میں دو مرتبہ مہمیں روانہ کی گئیں ایک تو بنی مرہ کی تادیب کے لئے تیس آدمیوں کے ہمراہ انہیں شعبان ۷ھ میں فدک بھیجا گیا (ایضاً، ص ۱۱۸، ۱۱۹) پھر دوبارہ شوال ۷ھ میں انہیں تادیبِ غطفان کے لئے تین سو آدمیوں کے ہمراہ یمن و جبار کی طرف روانہ کیا گیا لیکن جب پہنچے تو دشمن ان کی اطلاع پا کر فرار ہو چکا تھا اس لئے مڈبھیڑ نہ ہوئی صرف دو آدمی ملے جن کو قید کر کے مدینہ لے آئے اور وہ دونوں مسلمان بھی ہو گئے (ایضاً ص ۱۲۰)۔ (۱۰۶) غالب بن عبداللہؓ اللیثی تین مرتبہ مہم لے کر گئے تھے۔ ایک مرتبہ تو مہم لے کر بنو عوال اور بنی عبد ابن ثعلبہ کی تادیب کے لئے رمضان ۷ھ میں ایک سو تیس آدمیوں کے ہمراہ میفعہ (نجد) گئے اور دشمن کو بُری طرح پامال کیا (ایضاً ص ۱۱۹)۔ دوسری بار انہوں نے صفر ۸ھ میں تادیب بنو الملوح کے لئے بجانب کدید سفر اختیار کیا۔ (ایضاً ص ۱۲۴ تا ۱۲۵) اور تیسری بار صفر ۸ھ میں فدک کی جانب گئے تاکہ اس سے قبل سریۂ بشر بن سعد کے نقصان کا بدلہ لے سکیں۔ دو سو آدمیوں کے ہمراہ گئے اور فتح مند واپس آئے (ایضاً ص ۱۲۶)۔

(۱۰۷) ابن ابی العوجاء السلمی کو رسول اللہؐ نے ذی الحجہ ۷ھ میں پچاس آدمیوں کے ہمراہ بنی سلیم کی طرف بھیجا تھا (ایضاً ص ۱۲۳) (۱۰۸) سریۂ شجاع بن وہب الاسدی ربیع الاول ۸ھ میں ہوا۔ یہ بنی عامر کی گوشمالی کے لئے بھیجے گئے تھے (نواح رکبہ عقب معدن)۔ لڑائی نہیں ہوئی لیکن اونٹ بکریاں وغیرہ بہت ہاتھ آئیں (ایضاً، ص ۱۲۷)۔ (۱۰۹) جہینہ کے ایک قبیلہ کی تادیب کے لئے رسول اللہؐ نے ابوعبیدہ بن الجراح کو رجب ۸ھ میں تین سو مجاہدین کے ایک لشکر کے ساتھ (ساحلِ سمندر سے متصل) القبلیہ روانہ کیا تھا (ایضاً ص ۱۳۲)۔ (۱۱۰) خضرہ (نجد میں قبیلہ محارب کی سرزمین) کی جانب ابوقتادہ بن ربعی الانصاری کا سریہ شعبان ۸ھ میں ہوا۔ ابوقتادہ کے ہمراہ ۱۵ آدمی تھے اور مقصد یہ تھا کہ بنوغطفان کی سرکوبی کی جائے (ایضاً ص ۱۳۲، ۱۳۳)۔ (۱۱۱) مشہور مغربی عالم مارگولیتھ Margoliouth ایک جگہ رقمطراز ہے کہ:

"Wars are won in the first place by science, but in the second by discipline, in the third by enthusiasm. Military science is a recent invention; it is clear, however, that the Prophet gladly availed himself of such technical knowledge of the subject as was current in his time, and highly rewarded strategic talent".

(Margoliouth, D.S. Mohammedanism, Thornton Butterworth Ltd., London, 1928, p. 76).

(۱۱۲) النحل (۱۲۶)۔ (۱۱۳) ابنِ ہشام (ج ۳ ص ۲۹۲، ۲۹۳)، طبری (ج ۲ ص ۵۹۵) اور ابن اثیر (ج ۲، ص ۱۸۸) وغیرہ نے غزوۂ بنی لحیان کو جمادی الاولیٰ ۶ھ (یعنی غزوۂ بنی قریظہ کے تقریباً چھ ماہ بعد) کا واقعہ قرار دیا ہے لیکن واقدی (ص ۵) اور ابن سعد (ج ۲ ص ۷۸) نے اسے ربیع الاول ۶ھ میں محسوب کیا ہے۔ (۱۱۴) ابن ہشام ج ۳ ص ۱۷۸ تا ۱۸۲)۔ (۱۱۵) ایضاً ص ۲۹۲۔ (۱۱۶) ایضاً۔ ابن سعد ج ۲ ص ۷۸ تا ۸۰) وغیرہ۔ البتہ واقدی نے یہ لکھا ہے کہ "ثم خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرید بنی لحیان فلقیھم وھزمھم اللہ وقتلھم" (الواقدی ص ۳۷۴)۔ (۱۱۷) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۲۹۳۔ (۱۱۸) عسفان تک پیشقدمی کی یہ حکمت خود رسول اللہؐ نے بھی ارشاد فرمائی تھی (ایضاً ص ۲۹۲)۔ (۱۱۹) ایضاً ص ۲۹۳ تا ۲۹۴۔ غزوۂ غابہ یا ذی قرد کو ابن ہشام نے جمادی الاول ۶ھ میں بیان کیا ہے (ایضاً) لیکن ابنِ سعد نے اسے ربیع الاول ۶ھ کا واقعہ بتایا ہے (ج ۲ ص ۸۰) غابہ مدینہ منورہ کے شمال میں شام کے راستہ پر ایک جنگل تھا جہاں چراگاہیں تھیں جن میں چرنے کے لئے مدینہ کے بعض لوگ اپنے جانور چھوڑ دیتے تھے۔ رسول اللہؐ نے بھی اپنی دودھ دینے والی بیس اونٹنیاں اسی جگہ چھوڑ رکھی تھیں اور ان کی نگرانی پر ابوذر غفاری کے بیٹے مامور تھے۔ غابہ کا مدینہ سے فاصلہ بارہ میل یا ایک دن کی مسافت کے بقدر تھا (ابن سعد، ج ۲ ص ۸۰)۔ (۱۲۰) ایضاً (۱۲۱) ایضاً ص ۸۱ (۱۲۲) ایضاً (۱۲۳) ایضاً (۱۲۴) ایضاً ص ۸۸۔

(۱۲۵) ایضاً (۱۲۶) ایضاً ص ۹۰، ۹۱ - (۱۲۷) ایضاً (۱۲۸) ایضاً ص ۹۲ (۱۲۹) ایضاً (۱۳۰) ایضاً (۱۳۱) المائدہ (۳۳) - (۱۳۲) ڈاکٹر حمید اللہ نے المبسوط کے حوالے سے کہا ہے کہ قریش اور اہلِ خیبر میں معاہدہ تھا - حمید اللہ (رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی) ص ۸۵ - (۱۳۳) تفصیل کے لئے دیکھئے : ابن سعد ج ۲ ص ۹۱، ۹۲ - (۱۳۴) ایضاً ص ۹۲ (۱۳۵) ایضاً (۱۳۶) خواب یہ دیکھا کہ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ گئے اور طواف سے متمتع ہوئے ہیں (زرقانی ج ۲ ص ۱۶۹) - (۱۳۷) واقدی نے لکھا ہے ثم اذن رسول اللہ فی الحج (الواقدی ص ۳۸۲) نیز ملاحظہ ہو : ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۲۲ - (۱۳۸) شرکائے سفر کے بارے میں روایات مختلف ہیں - ابنِ ہشام نے دو روایتیں نقل کی ہیں : ایک سات سو کی اور دوسری چودہ سو کی (ج ۳ ص ۳۲۲) ابن سعد نے چودہ سو کے علاوہ سوا پندرہ سو اور سولہ سو کی تعداد کا بھی ذکر کیا ہے (ج ۲ ص ۹۵) طبری نے سات سو، تیرہ سو، چودہ سو، پندرہ سو کی روایات لکھی ہیں (ج ۲، ص ۶۲۱) ابنِ حزم کے بیان کے مطابق تیرہ سو سے پندرہ سو کے درمیان تھی (جوامع السیرۃ ص ۲۰۷) - ان تمام روایات میں سے چودہ سو کی روایت زیادہ مشہور و متداول ہے - نیز بخاری میں بھی حضرت براؓ بن عازب اور جابر بن عبداللہ وغیرہ سے یہی تعداد مروی ہے (البخاری ج ۲ ص ۵۹۸ کتاب المغازی) اور ہمارے نزدیک بھی اس کی ترجیح کی ایک مزید دلیل یہ ہے کہ غزوۂ خیبر کے موقع پر رسولؐ اللہ نے یہ اعلان فرما دیا تھا کہ ؛ لا یخرجن معنا الا راغب فی الجهاد (ابن سعد ج ۲، ص ۱۰۶) اس کے نتیجہ میں وہی لوگ اس میں شامل ہوئے جو حدیبیہ میں رسولؐ اللہ کے ہمسفر تھے اور ان کی تعداد بھی چودہ سو ہی تھی (ایضاً) - (۱۳۹) الواقدی ص ۳۸۳ - نیز البخاری ج ۲ ص ۵۹۸ ذوالحلیفہ ہی اہلِ مدینہ کی میقات ہے اور مدینہ سے اس کا فاصلہ تقریباً چھ میل ہے - (۱۴۰) مورخین و اصحاب سیر کی متفقہ روایت یہی ہے کہ رمضان و شوال میں رسولؐ اللہ کا قیام مدینہ میں رہا اور ذیقعدہ ۶ھ میں عمرہ کی نیت سے نکلے (ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۲۱) البتہ امام ابو یوسف کا بیان ذرا مختلف ہے - وہ لکھتے ہیں کہ رسولؐ اللہ حدیبیہ کے لئے رمضان میں نکلے (دیکھئے : ابو یوسف - یعقوب بن ابراہیم - کتاب الخراج - المطبعۃ السلفیہ - قاہرہ - ۱۳۵۲ھ ص ۲۰۸) - ڈاکٹر حمید اللہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ چونکہ ۱۰ھ سے پہلے تک اسلامی تقویم درست نہ ہوئی تھی اور نسی وغیرہ کا قاعدہ مروّج تھا اس لئے قمری اور کبیسہ کے دو قسم کے کیلنڈر رائج تھے چنانچہ ۶ھ میں ان دونوں کے درمیان دو ماہ کا فرق تھا - چنانچہ مثال کے طور پر قمری کا ماہ رمضان کبیسہ کے ذوالقعدہ کے مساوی تھا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو

Hamidullah, Dr. M., <u>Diplomatic Relations of Islam with Iran in the time of the Prophet</u>. (A paper read at the second session of Idara-i-Ma'arif-i-Islamia)

Proceedings of the Idara-i-Ma'arif-i-Islamia, Lahore, 1938, p. 97.

ڈاکٹر حمید اللہ کی اس تصریح کی روشنی میں امام ابو یوسف کے قول میں کوئی معارضہ باقی نہیں رہتا - ہاں ایک روایت سے

عبداللہ سے رجب کے بارے میں بھی منقول ہے۔ لیکن اس کی تردید خود حضرت عائشہ نے یہ کہہ کر فرما دی کہ ابن عمر سے بھول ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں حضرت انس بن مالک اور دوسرے صحابہ کے اقوال سے بھی حضرت عائشہ کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: البخاری (ج ۱ ص ۲۳۸، ۲۳۹) کتاب المناسک۔ (۱۴۱) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۲۳۔ (۱۴۲) ایضاً ص ۳۲۲۔ (۱۴۳) ایضاً ص ۳۲۳، ۳۲۴۔ واقدی نے لکھا ہے کہ جب اہلِ مکہ کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ نے حدیبیہ پر نزولِ اجلال فرمالیا ہے تو یہ خبر ان پر بجلی بن کر گری (فشق ذلك عليهم) دیکھئے الواقدی ص ۳۰۴۔ حدیبیہ کا مقام حدودِ حرم سے متصل واقع ہے حدیبیہ اور مکہ کے درمیان ایک منزل کی مسافت ہے۔ اس جگہ ایک کنواں تھا جس کا نام حدیبیہ تھا اور پھر بعد میں یہ علاقہ بھی حدیبیہ کہلانے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ حدودِ حرم کے اندر اور کچھ باہر واقع ہے (یاقوت الحموی۔ ج ۲ ص ۲۲۹)۔ ابن سعد نے مکہ سے حدیبیہ کا فاصلہ نو میل لکھا ہے۔ (ج ۲ ص ۹۶)۔ (۱۴۴) واقدی ص ۳۰۷۔ تفصیل کے لئے: ابن ہشام ج ۳ ص ۳۲۵ تا ۳۳۱۔ (۱۴۵) البقرہ (۱۴۴)۔ (۱۴۶) الانفال (۶)۔ (۱۴۷) الفتح (۱۲)۔ (۱۴۸) شاید اس خدشہ کو مسلمانوں نے بھی محسوس کیا تھا کہ قریش مکہ کی بد طینتی رنگ لا سکتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ جب ذی الحلیفہ پہنچے تو حضرت عمرؓ نے آپ کی توجہ اس طرف دلائی کہ آپ دشمن کے علاقہ میں بغیر اسلحہ اور دوسری جنگی تیاری کے بغیر تشریف لے جا رہے ہیں، جو مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس پر رسول اللہؐ نے کسی کو مدینہ بھیجا۔ وہ وہاں سے پورا مخزن یعنی وہاں جس قدر اسلحہ اور جانور وغیرہ تھے سب کو ساتھ لے آیا۔ لیکن مکہ کے قریب پہنچ کر وہاں لیجانے سے روک دیا۔ (طبری ج ۲ ص ۶۲۲)۔ (۱۴۹) الفتح (۱۵)۔ (۱۵۰) محمود شیت خطاب۔ الرسول القائد۔ دارالقلم ۱۹۶۴ء ص ۲۰۹۔ (۱۵۱) مورخین نے حدیبیہ میں قیام کی مدت ۱۹، ۲۰ دن بتائی ہے۔ ملاحظہ ہو، (الحلبی، ج ۳ ص ۲۰)۔ (۱۵۲) ابن سعد کی روایت کے مطابق یہ بسر بن سفیان تھا اور غدیر الاشطاط (عقب عسفان) پر ملا تھا۔ (ابن سعد ج ۲ ص ۹۵)۔ (۱۵۳) ابنِ ہشام ج ۳، ص ۳۲۲، ۳۲۳۔ (۱۵۴) ابو یوسف ص ۲۰۷۔ (۱۵۵) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۲۳۔ (۱۵۶) الواقدی ص ۳۰۵۔ (۱۵۷) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۲۳۔ (۱۵۸) ایضاً ص ۳۲۴۔ (۱۵۹) ایضاً ص ۳۲۷۔ (۱۶۰) ایضاً ص ۳۲۹۔ یہاں یہ بتانا بے جا نہ ہوگا کہ اس روز رسولؐ اللہ کی نگہبانی کا فریضہ حضرت محمد بن مسلمہ انجام دے رہے تھے اور انہوں نے ہی قریش کے دستہ کو پکڑا تھا (الحلبی ج ۳ ص ۲۱)۔ (۱۶۱) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۲۵۔ (۱۶۲) واقدی ص ۳۰۴۔ (۱۶۳) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۲۹۔ (۱۶۴) ایضاً، ص ۳۲۲، ۳۲۳۔ (۱۶۵) ایضاً ص ۳۲۵ (۱۶۶) ایضاً ص ۳۲۶۔ (۱۶۷) امام ابو یوسف نے لکھا ہے کہ عروہ بن مسعود سے گفتگو کے دوران رسولؐ اللہ نے یہ واضح کر دیا کہ "ہم لوگ جنگ کرنے نہیں آئے ہیں بلکہ عمرہ ادا کرنے اور اپنے قربانی کے جانور قربان کرنے آئے ہیں۔ کیا تم اتنا کر سکتے ہو کہ میری قوم کے پاس جاؤ کہ یہ لوگ اب بھی میرے اہلِ خاندان ہیں انھیں جنگ نے ڈرا دیا ہے ان کی بھلائی اس میں نہیں کہ جنگ ان کو جو نقصانات پہنچا چکی ہے اب اس پر مزید کوئی اضافہ کریں (اور ان سے کہنا کہ) وہ میرے اور اپنے درمیان ایک مدت (امن) طے کر لیں جس میں ان کی نسل بڑھے گی ہمیں

ان کے شر سے نجات حاصل رہے گی (ابو یوسف ص ۲۰۹)۔ (۱۶۸) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۲۹۔ (۱۶۹) ایضاً ص ۳۲۸۔ (۱۷۰) ابن ہشام کے بیان کی رو سے بایعهم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی الموت (ایضاً ص ۳۳۰) جابر کہتے ہیں بایعنا علی الموت (ایضاً)۔ (۱۷۱) بیعتِ رضوان یعنی جس میں اللہ کی رضا شامل تھی اور جس سے اللہ راضی ہوا۔ دیکھئے سورہ الفتح (آیت ۱۰، ۱۸)۔ (۱۷۲) محمد (۳۵) اسے ابو عبید نے اپنی کتاب الاموال میں بھی ذکر کیا ہے (ابو عبید، ج ۲ ص ۱۶۱ - فقرہ ۴۴۴)۔ (۱۷۳) البقرہ (۱۹۴)۔ (۱۷۴) الفتح (۲۲)۔ (۱۷۵) ابو عبید نے لکھا ہے کہ اس بیعت نے یرغمال شدہ مشرکین کو ترغیب دلائی اور انہوں نے امن و صلح کی پیش کش کی۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ: وھو الذی کف ایدیھم عنکم و ایدیکم عنھم ببطن مکۃ من بعد ان اظفرکم علیھم و کان اللّٰہ بما تعملون بصیرا (الفتح ۲۴)۔ ملاحظہ ہو: ابو عبید (ج ۲ ص ۱۵۷ فقرہ ۱۴۴)۔ اسی طرح ابن سید الناس نے اپنی کتاب عیون الاثر میں یہ لکھا ہے کہ مشرکینِ مکہ نے حضرت عثمانؓ کو یرغمال بنا لیا اور رسولؐ اللہ نے اپنے پاس مشرکین کو خطرات کے پیش نظر یرغمال بنا لیا تھا (ج ۲ ص ۱۲۲)۔ چالیس پچاس قریشیوں کا جو دستہ رسولؐ اللہ پر حملہ آور ہونے کے لئے آیا تھا پھر گرفتار ہوا تھا اس کے آدمیوں کو روک لیا اور بقیہ اس وقت تک یرغمال بنائے رکھے جب تک کہ حضرت عثمانؓ ان کے ہاں سے واپس معسکر رسولؐ میں نہ آ گئے۔ (۱۷۶) دیکھئے واقدی (ص ۳۸۶)۔ نیز ابنِ ہشام (ج ۳ ص ۳۳۰) اور سیرۃ حلبیہ میں ہے کہ: ولما علمت قریش بھذہ البیعۃ خافوا و اشار اھل الرای بالصلح (الحلبی ج ۳ ص ۲۲) واقدی نے یہ بھی لکھا ہے کہ صلح کی درخواست کے ساتھ قریش نے عروہ بن مسعود اور مکرز بن جعفر کو بھیجا تھا (الواقدی ص ۳۸۵) اور امام ابو یوسف کا بیان ہے کہ صلح کے لئے سہیل بن عمرو کے ساتھ ساتھ مکرز بن حفص کو بھی اختیارِ صلح دیا تھا (ابو یوسف ص ۲۱۰) اور طبری کی تصریح کے مطابق صلح کرنے کے لئے قریش نے سہیل بن عمرو، حویطب بن عبد العزی اور حفص کو بھیجا تھا (طبری ج ۲ ص ۶۲۹)۔ (۱۷۷) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۳۱۔ (۱۷۸) الفتح (۲۵)۔ (۱۷۹) الواقدی ص ۳۸۷۔ (۱۸۰) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۳۲۔ صلح کی مدت واقدی کے یہاں دو سال (ص ۳۸۷) اور ابو عبید کی کتاب الاموال میں چار سال (ابو عبید ج ۲ ص ۱۵۷ فقرہ ۴۴۱) مذکور ہے۔ (۱۸۱) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۳۲۔ واقدی کا جملہ یہ ہے کہ: نہ ہمارے لوگ تم کو اور نہ تمہارے لوگ ہم کو ایذا پہنچائیں (الواقدی ص ۳۸۷)۔ ابو عبید کے یہاں فقرہ اس طرح ہے: ان یأمن بعضھم بعضاً۔ اور اضافہ یہ ہے کہ علی الّا اغلال ولا اسلال (ابو عبید ج ۲ ص ۱۵۷) یہ اضافہ ابن سعد نے بھی نقل کیا ہے (ابن سعد ج ۲ ص ۹۷)۔ (۱۸۲) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۳۲۔ واقدی کے یہاں جملہ اس طرح ہے: ومن اتاہ من اھل مکۃ مسلماً ردّہ الیھم و من جاء من اھل مکۃ من اصحابہ فھولھم (ص ۳۸۷) اور ابو عبید کے الفاظ یہ ہیں: انہ من اتی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مسلماً ردّہ الیھم و من اتاھم من المسلمین لم یردّوہ الیہ (ج ۲ ص ۱۵۷ - فقرہ ۴۴۱)۔ (۱۸۳) ابن ہشام کا فقرہ یہ ہے کہ: وان بیننا عیبۃ مکفوفۃ و انہ لا اسلال ولا اغلال (ج ۳ ص ۳۳۲)۔ اس کے پہلے حصے کا ترجمہ ہم نے ڈاکٹر حمید اللہ

سے لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس شق کا پورا ترجمہ یُوں کیا ہے: "یہ کہ ہم میں باہم سینے ہر طرح بند رہیں گے (جن میں باہر سے کوئی غداری داخل نہ ہو سکے گی) اور نہ تو خفیہ کسی دوسرے کو مدد دی جائے گی نہ علانیہ خود خلاف عہد دغا کریں گے" (حمید اللہ۔ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی۔ ص ۹۱)۔ محمود شیت خطاب نے اس کا مدعا یہ سمجھا ہے کہ "یعنی ہم تم سے رکے رہیں گے اور تم ہم سے" (محمود شیت خطاب۔ ص ۲۷)۔ ہمارے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ باہم ہر طرح راز داری برتی جائے گی، نیز دل کو ایک دوسرے سے صاف رکھیں گے یعنی باہم خلوص برتا جائے گا۔ یا یہ کہ دلوں کی عداوتیں دلوں میں رہیں گی، نہ انھیں ظاہر کیا جائے گا نہ بدعہدی اور خیانت کی جائے گی۔ نیز دیکھئے: ابو یوسف ص ۲۱۰۔ (۱۸۴) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۳۲۔ اس شق کے تحت قبائلِ خزاعہ نے رسولؐ اللہ کے معاہدے اور ذمہ داری میں اور بنی بکر نے قریش کے معاہدہ اور ذمہ داری میں شریک ہونے کا اعلان کیا (ایضاً)۔ (۱۸۵) ایضاً۔ واقدی کے یہاں اس دفعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ: "وعلی اھل مکہ لمحمد بن عبد اللہ ان یخلوا لہ مکہ عاماً قابلا ثلاثۃ ایام وعلیٰ محمد لاھل مکہ ان لا یدخل احد منھم بسلاح الا سلاح یجعل فی قراب وھو السیف" (الواقدی ص ۳۸۸)۔ (۱۸۹) ابو عبید ج ۲ ص ۱۵۷ فقرہ ۴۴۴۔ اس دفعہ کو بلاذری نے بھی ابو عبید کے حوالہ سے نقل کیا ہے (البلاذری۔ فتوح۔ ص ۴۴)۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس شق کو بالعموم مورخین اور اصحابِ سیر نے ذکر نہیں کیا ہے۔ نیز ڈاکٹر حمید اللہ نے دفعات کے سلسلہ میں معاہدہ کے حوالے سے یہ صراحت کی ہے کہ ہمارے اور تمہارے حقوق و واجبات برابر ہوں گے" (حمید اللہ۔ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی۔ ص ۹۱) لیکن ہمیں اس کا حوالہ نہیں مل سکا۔ (۱۸۷) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۳۲۔ (۱۸۸) ڈاکٹر حمید اللہ نے بغیر کسی حوالے کے یہ عجیب بات لکھی ہے کہ "ان کا سب سے بااثر سردار ابو سفیان کسی نامعلوم راستے سے چھپ چھپاکر اور بچ بچاکر ان دنوں شام گیا ہوا تھا اس لئے حضرت عثمان نظر بند ہو گئے ...... الخ" (رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۸۸) حالانکہ اگر روایات صحیح ہیں تو متعدد مآخذ میں اس کی موجودگی کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً ابن ہشام نے حضرت عثمان کی سفارت کے ضمن میں بروایت ابن اسحاق صراحت سے لکھا ہے کہ "حضرت عثمان مکہ کی جانب گئے تو ابان بن سعید العاص سے ملے (مکہ میں داخل ہونے پر یا اس سے پہلے) اور رسولؐ اللہ کا پیغام پہنچایا پھر عثمان آگے چلے یہاں تک کہ ابو سفیان اور دوسرے عظمائے قریش تک جا پہنچے اور رسولؐ اللہ کا پیغام پہنچا دیا" (ج ۳ ص ۳۲۹) کم و بیش یہی بیان واقدی کا بھی ہے، بلکہ لکھا ہے کہ جب حضرت عثمان نے رسولؐ اللہ کا خط ابو سفیان کو پہنچایا تو اسے لے کر وہ دوسرے امرأ سے مشورہ کے لئے نکل کھڑا ہوا (الواقدی ص ۳۸۴) اور طبری نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اس وقت جبکہ صلح کی تیاری ہو رہی تھی فغتك بہ ابو سفیان (ابو سفیان نے رسولؐ اللہ پر اچانک یورش کر دی) ملاحظہ ہو: (ج ۲ ص ۶۲۹) اور حضرت عثمان کی سفارت کے سلسلے میں لکھا ہے کہ: فانطلق عثمان حتی اتی الی ابا سفیان وعظماء قریش (ایضاً ص ۶۳۱) اور السیرۃ الحلبیہ میں بھی ابو سفیان کی موجودگی کا ثبوت موجود ہے (الحلبی: ج ۳ ص ۱۴)۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اس وقت مکہ میں عجیب بدنظمی تھی" (رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی ص ۸۸) ہمارے خیال میں

اس وقت کی مخصوص صورتِ حال میں اسے بدنظمی کی بجائے "اختلاف رائے" کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ رسولؐ اللہ نے حدیبیہ پہنچ کر اور اعلان عمرہ کی شکل میں پروپیگنڈہ کی جو جنگ ان پر مسلّط کردی تھی۔ اس سے عہدہ برآ ہونے میں انہیں سخت دقت پیش آرہی تھی اور پھر یہی ہوا کہ انہوں نے ایک طرف سے اپنا دامن بچایا تو دُوسری طرف اُلجھ کر رہ گیا۔ (۱۸۹) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۳۱۔ (۱۹۰) حضرت عمر کے ردِ عمل کی شدت کا اندازہ ان کے لب ولہجہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ جس کا اظہار انہوں نے حضرت ابوبکر سے اور اس کے بعد رسولؐ اللہ سے کیا ابنِ اسحاق کی روایت کے مطابق حضرت عمر نے رسولؐ اللہ کو مخاطب کرکے کہا تھا: الست برسول الله ؟ قال بلیٰ ! قال اولسنا بالمسلمین ؟ قال بلیٰ ! قال اولیسوا بالمشرکین ؟ قال بلیٰ ۔ قال فعلام نعطی الدنیة فی دیننا (ابن ہشام ج ۳ ص ۳۳۱)۔ لیکن بعد میں جوشش سرد پڑنے پر انہیں اپنی گفتگو کا احساس ہوا چنانچہ زندگی بھر پچھتاتے رہے اور نماز، روزہ، صدقہ، خیرات کی صورت میں اس کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کرتے رہے (ایضاً)۔ (۱۹۱) ایضاً۔ رسولؐ اللہ کا یہ جواب اس لحاظ سے قابلِ غور ہے کہ اس میں رسولؐ اللہ نے حاکمیت باری تعالیٰ کا اظہار بھی کردیا اور اپنی حیثیت بھی واضح کردی۔ علاوہ ازیں اس ایک جملہ میں اسلام کے سیاسی نظریہ کی توضیح بھی موجود ہے یعنی یہ کہ اسلام میں سیاست بھی الٰہی ہدایات کے تابع ہے۔ (۱۹۲) سورہ الفتح کا نزول مکہ و مدینہ کے درمیان راستہ میں ہوا (ابن ہشام ج ۳ ص ۳۴۴) ابنِ سعد کے بقول یہ سورۃ مقام ضجنان (یعنی مکہ سے تقریباً ۲۵ میل دور) میں نازل ہوئی (ج ۲ ص ۹۸)۔ (۱۹۳) الفتح (۱)۔ (۱۹۴) ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۰۴ (۱۹۵) ایضاً (۱۹۶) علامہ ابن قیم کے بیان کے مطابق اس سے پہلے سریۂ نجد ہوچکا تھا جس میں یمامہ سے بنی حنیفہ کے سردار ثمامہ بن اُثال الحنفی کو گرفتار کر کے لایا گیا تھا۔ رسولؐ اللہ کے اصرار پر ثمامہ نے اسلام قبول کرلیا اس کا اسلام قبول کرنا قریشِ مکہ کے لئے تباہ کن ثابت ہوا کیونکہ یمامہ مکہ کا پیداواری علاقہ تھا۔ ثمامہ نے (جوش اسلام میں) مکہ کی طرف غلّہ بھیجنا بند کردیا۔ اس سے قریش سخت تنگ آگئے اور انہوں نے رسولؐ اللہ سے قرابت داری کا واسطہ دے کر درخواست کی کہ ثمامہ کو لکھیں کہ غلّہ ان کی طرف بھیجا جائے۔ چنانچہ آپ نے ازراہِ کرم گندم بھیجنے کی ہدایت فرمادی (زاد المعاد ج ۲) بقول ڈاکٹر حمید اللہ اسی زمانے میں حجاز میں سخت قحط پڑا تھا اور اس موقع پر آپ نے قریش مکہ کی خاموش دلدہی کے کام جاری رکھے (رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی ص ۸۶، ۸۷) پھر حدیبیہ سے پہلے تک رسولؐ اللہ کی روانہ کی ہوئی متعدد مہموں کے نتیجے میں قریش کے لئے تمام شمالی علاقوں خصوصاً شام سے تجارت کرنا بالکل ناممکن ہوگیا تھا اور اس لئے انہوں نے معاہدہ کی ایک دفعہ میں اس مشکل کے ازالہ کی کوشش کی۔ (۱۹۷) ابن سعد ج ۲ ص ۹۲، ۹۳ (سریہ عمرو بن امیۃ الضمری)۔ (۱۹۸) ایضاً ص ۹۵۔ (۱۹۹) طبری ج ۲ ص ۶۲۲ (۲۰۰) ابویُوسف ص ۲۰۸ (۲۰۱) ایضاً۔ (۲۰۲) احابیش عرب میں تیرانداز قبائل تھے۔ سیاہ رنگ ہونے کی وجہ سے ان کو حبشیوں کی طرف منسوب کیا گیا۔ یا یہ حبشی کی بنا پر کہلاتے ہیں جو مکہ کی ایک جانب ایک پہاڑ کا نام تھا (محمود شیت خطاب ص ۲۶۶) اس کے علاوہ احابیش ان مختلف افراد پر بھی بولا جاتا تھا جو مختلف قبائل سے تعلق رکھتے ہوں۔ (۲۰۳) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۲۶ (۲۰۴) ایضاً۔

(۲۰۵) دیکھیے الفتح (۲۶)(۲۰۶) ایضاً۔ (۲۰۷) پرویز۔ معراج انسانیت۔ ادارہ طلوع اسلام۔ لاہور۔ ۱۹۶۸ء۔ ص ۲۷۱۔ (۲۰۸) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۳۷، ۳۳۸۔ (۲۰۹) ایضاً ص ۳۳۲۔ (۲۱۰) ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۳۴۔ (۲۱۱) اس ضمن میں وہ جواب قابلِ ذکر ہے جو رسول اللہؐ نے حضرت عمرؓ کے استفسار پر دیا تھا۔ دیکھیے: واقدی ص ۳۰۷۔ (۲۱۲) الروم (۱)۔ (۲۱۳) حمید اللہ، رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی۔ ص ۸۷۔ (۲۱۴) مودودی۔ تفہیم القرآن۔ ج ۵۔ ص ۴۱۔ (۲۱۵) قریش کی شکست میں ایک وجہ غالباً یہی تھی کہ وہ اب تک رسول اللہؐ اور مسلمانوں کو محض "ایک گروہ" سمجھتے رہے اور اس حقیقت سے صرفِ نظر کرتے رہے کہ ان کا مقابلہ اب محض ایک گروہ سے نہیں ہے بلکہ ایک "ریاست" سے ہے (MARGOLIOUTH, P.56) غلطی کا احساس اب ہوا ہے مگر بے سُود۔ (۲۱۶) یہ بات تو خود صلح نامہ میں موجود ہے (دفعہ ۵)۔ (۲۱۷) محمود شیث خطاب، ص ۲۸۰۔ (۲۱۸) رسول اللہؐ حدیبیہ سے ذی قعدہ ۶ھ کی بالکل آخری تاریخوں میں واپس تشریف لانے اور پھر ذی الحجہ کے بعد محرمؔ میں خیبر کے لئے تشریف لے گئے (ثم اقام رسول اللہ بالمدینہ حین رجع من المدینہ ذا الحجہ وبعض المحرم) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۴۲۔ (۲۱۹) اس کی مضبوطی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہود نے وہاں متعدد قلعے تعمیر کر رکھے تھے ان قلعوں کی تعداد مورخین نے مختلف بتائی ہے لیکن ابنِ سعد نے ۹ قلعوں کے نام لکھے ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے (ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۰۶) علامہ شبلی نے خیبر کے قلعوں کی تعداد ۶ بتائی ہے اور ان کے نام سالم۔ قموص، نطاۃ، قصارہ، شق اور مرابطہ لکھے ہیں (شبلی، سیرۃ النبی ج ۱ ص ۴۸۴)۔ (۲۲۰) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۲۶، ۳۴۴۔ نیز ملاحظہ ہو: WATT (MUHAMMAD AT MEDINA). P.93, 217, 218.۔ (۲۲۱) عموماً مورخین نے غزوۂ خیبر کے لئے رسول اللہؐ کی روانگی محرم میں بتائی ہے لیکن ابنِ سعد نے اسے جمادی الاوّل ۷ھ کا واقعہ بتایا ہے (ج ۲ ص ۱۰۶)۔ ہو سکتا ہے رسول اللہؐ ربیع الثانی تک خیبر، فدک اور وادی القریٰ کے معاملات سے فارغ ہو کر جب مدینہ واپس پہنچے ہوں تو جمادی الاوّل کا مہینہ شروع ہو گیا ہو اور شاید اسی بناء پر ابنِ سعد نے اس غزوہ کو جمادی الاوّل کا واقعہ بتایا ہو۔ (۲۲۲) ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حدیبیہ کے سفر میں بھی تعداد یہی چودہ سو تھی۔ کیونکہ صلح حدیبیہ کے فوراً بعد نازل ہونے والی سورہ الفتح میں رسول اللہؐ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ خیبر کی مہم پر صرف انھیں لوگوں کو لے جائیں جو حدیبیہ میں آپ کے ساتھ تھے (الفتح ۱۵) اور رسول اللہؐ نے مدینہ سے چلتے وقت یہ اعلان کر دیا تھا کہ "ہمارے ہمراہ اس کے سوا کوئی نہ جائے جسے جہاد کا شوق ہو (ابن سعد، ج ۲، ص ۱۰۶)(۲۲۳) ابن ہشام ج ۳ ص ۳۴۳۔ (۲۲۴) ایضاً (۲۲۵) ایضاً۔ (۲۲۶) ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۱۰۔ (۲۲۷) الفتح (۱۸)۔ (۲۲۸) ایضاً (۱۹)۔ (۲۲۹) ایضاً (۲۱)۔ (۲۳۰) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۶۸۔ (۲۳۱) البلاذری (فتوح) ص ۴۱۔ (۲۳۲) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۳۲، ۳۶۔ (۲۳۳) ابن سعد ج ۲ ص ۱۳۴۔ (۲۳۴) ایضاً (۲۳۵) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۴۲۔ (۲۳۶) ایضاً۔ ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ دن بدھ کا تھا اور آپ بعد عصر روانہ ہوئے (ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۳۵)۔ (۲۳۷) الفیل (۱ تا ۵)۔ (۲۳۸) البخاری

(۲۳۹) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۸۰۔ (۲۴۰) ایضاً ص ۹۲۔ (۲۴۱) الفتح (۲۸)۔ (۲۴۲) ایضاً (۲۴۳) ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۳۵۔ (۲۴۴) اس کی پیشگوئی خود قرآن نے کر دی تھی: النصر (۱، ۲)۔ (۲۴۵) الصعیدی ص ۱۶۸۔ (۲۴۶) دیکھیے القرآن: التوبہ (۳۳)، الفتح (۲۸)، النسأ (۷۹)، الانبیاء (۱۰۷)، الاعراف (۱۰۴)، الاحزاب (۲۱)، السباء (۲۸) اور الفرقان (۱)۔ وغیرہ وغیرہ۔ (۲۴۷) بخاری میں حضرت جابر سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دی گئیں۔ یعنی:

۱۔ مجھے رُعب اور دھاک کے ذریعہ سے فتح و نصرت دی گئی۔

۲۔ میرے لئے تمام رُوئے زمین سجدہ گاہ بنائی گئی۔

۳۔ غنیمت کا مال میرے لئے حلال کیا گیا اور مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کے لئے حلال نہ تھا۔

۴۔ مجھے شفاعت کا مرتبہ عنایت ہوا۔

۵۔ مجھ سے پہلے انبیاء خاص اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور میں تمام دنیا کے لئے مبعوث ہوا۔

(البخاری ج ۱ ص ۶۲ کتاب الصلوٰۃ)۔

(۲۴۸) اظہارِ دعوت کے موقع پر دیکھیے رسولؐ اللہ کا پہلا خطبہ بمقام صفا، جس میں صاف فرما دیا کہ: واللہ الذی لا الٰہ الا ھو انی رسول اللہ الیکم خاصۃً و الی الناس عامہ (ابن اثیر ج ۲ ص ۶۱) نیز دیکھیے: زکی صفوت احمد۔ جمہرۃ خطب العرب فی عصور العربیہ الزاہرہ۔ مطبعۃ مصطفیٰ البابی۔ مصر۔ ۱۹۳۳ء۔ ج ۱، ص ۵۱۔

(۲۴۹) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۲۵۴۔ (۲۵۰) ایضاً۔ (۲۵۱) ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۵۸۔ ابنِ ہشام نے بتصریح لکھا ہے کہ حدیبیہ سے فارغ ہو کر رسولؐ اللہ نے خطوط ارسال کئے (ج ۴ ص ۲۵۴) اور یہ واضح ہے کہ حدیبیہ سے فراغت ذی الحجہ ۶ھ کے اواخر یا محرم ۷ھ کے اوائل میں ہوئی (ابن حبیب لبغدادی ص ۱۱۵) اس لئے محرم ۷ھ میں ہی ارسال مکاتیب قرینِ صحت ہے۔ البتہ بعض مورخین نے اسے ۶ھ کا واقعہ بتایا ہے۔ مثلاً طبری (ج ۲ ص ۶۴۴) اور ابنِ کثیر (البدایہ والنہایہ۔ مکتبۃ المعارف۔ بیروت ۱۹۶۶ء۔ ج ۴۔ ص ۲۶۲) لیکن اپنے بیان و تفصیل میں ۷ھ کی تصریح و ترجیح بھی قائم کر دی ہے۔ (۲۵۲) ابن سعد ج ۱ ص ۲۵۸۔ ابن سعد نے جن چھ قاصدوں کا نام لیا ہے ان میں عمرو بن امیۃ الضمری، دحیۃ الکلبی، عبداللہ بن حذافہ، حاطب بن ابی بلتعہ، شجاع بن وہب اور سلیط ابن عمرو شامل ہیں جن کو بالترتیب نجاشی، قیصر روم، کسریٰ، شاہِ مصر، ابن شمر الغسانی اور ہوذہ بن علی الحنفی کے پاس خط دے کر بھیجا گیا (ایضاً ص ۲۵۸ تا ۲۶۲)۔ ابنِ ہشام نے اس کے مقابلہ میں تفصیل کچھ زیادہ دی ہے اور مزید قاصدوں میں عمرو بن العاص، علاؑ بن الحضرمی اور مہاجر بن امیہ کا ذکر کیا ہے جن کو علی الترتیب رؤسائے عمان، حاکم بحرین اور حاکم یمن کی جانب روانہ کیا گیا۔ علاوہ ازیں ابنِ ہشام نے سلیط بن عمرو کو ثمامہ بن آثال اور ہوذہ بن علی دونوں کی جانب سفیر مانا ہے اور شجاع بن وہب کے لئے لکھا ہے کہ انھیں حارث بن ابی شمر کے ساتھ ساتھ جبلہ بن ایہم کی طرف بھی بھیجا گیا تھا (ایضاً ص ۲۵۴، ۲۵۵)۔

(۲۵۳) ایضاً (۲۵۴) طبری، ج ۲ ص ۶۴۵ - (۲۵۵) ترمذی - ابو عیسٰی - جامع الترمذی - امین کمپنی (کتب خانہ رشیدیہ) دہلی، ج ۲ ص ۹۶ (ابواب الاستیذان والادب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اس حدیث کو مسلم نے بھی معمولی سے تغیر کے ساتھ نقل کیا ہے - ملاحظہ ہو: مسلم بن الحجاج القشیری - الصحیح - اصح المطابع - دہلی ۱۳۴۹ھ - ج ۲، ص ۹۹ (کتاب الجہاد والسیر) - (۲۵۶) طبری ج ۲ ص ۶۴۸ - مسلم نے بھی ابوسفیان کا یہ قول ایک طویل حدیث میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے کہ: لقد امر امر ابن ابی کبشہ انہ لیخافہ، ملك بنی الاصفر (مسلم، ج ۲، ص ۹۹) - (۲۵۷) البخاری ج ۲ ص ۶۵۴ - نیز ابن سعد ج ۱ ص ۲۶۱ - (۲۵۸) الحلبی ج ۳ ص ۲۸۱ - (۲۵۹) طبری ج ۲ ص ۶۵۴، ۶۵۵ - (۲۶۰) ابو عبید - ج ۱ ص ۲۲ فقرہ ۵۶ - نیز الحلبی ج ۳ ص ۲۸۱ - واضح رہے کہ اس فقرہ کو اہلِ کتاب کے قبولِ اسلام کے لئے بھی سمجھا جا سکتا ہے - یعنی ایک تو اپنے اسرائیلی مذہب کے ماننے کا ثواب اور دُوسرا قبولِ اسلام کا ثواب و اجر - لیکن ہماری موجودہ بحث کے سیاق و سباق میں اسے رعایا کے تعلق سے عام معنوں میں لینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے یعنی ایک اجر ذاتی قبول دین کا اور دوسرا اجر اس کے اتباع میں قوم کے اسلام کا - (۲۶۱) دحیہ کلبی کے ذریعہ قیصر روم کو مکتوب پہنچانے کی روایت عام طور پر تمام مآخذ میں منقول ہے - (مثلاً ابن ہشام ج ۴ ص ۲۵۴، ابن سعد ج ۱ ص ۲۵۹ وغیرہ) لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ دحیہ کے ساتھ ساتھ عدی بن حاتم کو بھی روانہ کیا گیا جو اس وقت تک اگرچہ نصرانی تھے لیکن دحیہ کی معیت میں گئے تھے (زرقانی ج ۳ ص ۳۳۵) خط کے متن کے لئے ملاحظہ ہو: ابو عبید (ج ۱ ص ۲۲، ۲۳، ۲۴، فقرہ ۵۶، ۵۹) البخاری (ج ۲ ص ۶۵۴، کتاب التفسیر) مسلم (ج ۲ ص ۹۸، ۹۹ کتاب الجہاد والسیر) ترمذی (ج ۲ ص ۹۶ ابواب الاستیذان والادب) نیز طبری (ج ۲ ص ۶۴۹) وغیرہ - طبری نے متن میں دوسروں کے برخلاف یہ جملہ نقل کیا ہے کہ وان تتولی فان اثم الاکارین علیك (ایضاً) - ابن طولون نے لکھا ہے کہ جب قیصر کے سامنے رسولؐ اللہ کا مکتوب گرامی پڑھا گیا تو اس نے یہ کہا کہ هذا الکتاب لم اسمع به بعد سلیمان النبی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (ابن طولون - شمس الدین محمد بن علی بن محمد - اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین - مکتبہ القدس - دمشق ۱۳۴۸ھ ص ۱۴) یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ رسولؐ اللہ نے قیصر روم کے نام ایک دوسرا مکتوب اور سفارت تبوک سے بھی بھیجی تھی - ابو عبید (ج ۱ ص ۲۱، ۲۲ فقرہ ۵۵) - (۲۶۲) ابن سعد ج ۱ ص ۲۵۸ (سب سے پہلے ان ہی کو روانہ کیا گیا) - متن کے لئے ملاحظہ ہو: طبری ج ۲ ص ۶۵۲ - نجاشی نے اس کا جواب رسولؐ اللہ کی خدمت میں بھیجا تھا (ایضاً ص ۶۵۲، ۶۵۳) - (۲۶۳) ابن سعد ج ۱ ص ۲۶۰، ۲۶۱ - الحلبی ج ۳ ص ۲۸۱ - (۲۶۴) ابن ہشام ج ۴ ص ۲۵۴، طبری ج ۲ ص ۶۵۲ - نیز دیکھئے: حمید اللہ، الدکتور محمد - مجموعۃ الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدہ - مطبعۃ لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر - قاہرہ - ۱۹۴۱ء ص ۴۱ (مکتوب ۳۷) - (۲۶۵) ابن ہشام کے مطابق جبلہ کے لئے خط لے کر شجاع بن وہب گئے تھے (ج ۴ ص ۲۵۵) نیز حمید اللہ (الوثائق) ص ۴۲ - (۲۶۶) ابن سعد

ج ۱ ص ۲۸۱ - (۲۶۷) ایضاً ص ۲۷۶ - نیز حمید اللہ (الوثائق) ص ۳۲، ۳۳ - (۲۶۸) ان کے نام خطوط کی تفصیل و متن کے لئے ملاحظہ ہو، حمید اللہ (الوثائق ص ۲۴ تا ۹۴) - (۲۶۹) طبری ج ۲ ص ۶۵۴، ۶۵۵ - (۲۷۰) ابن ہشام ج ۴ ص ۲۵۴ - ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۶۲ - نیز حمید اللہ (الوثائق) ص ۶۵ - (۲۷۱) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۲۵۴ - ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۶۴، ۲۷۶ نیز حمید اللہ (الوثائق) ص ۵۵، ۵۶، ۵۷ اور ۶۴ - (۲۷۲) ابن حبیب بغدادی ص ۷۷، نیز حمید اللہ (الوثائق) ص ۵۹ - (۲۷۳) حمید اللہ (الوثائق) ص ۵۴ - (۲۷۴) ایضاً ص ۱۳۲ - (۲۷۵) عمان پر اس زمانے میں جلندی کے دو بیٹوں جیفر و عیاذ (یا جیفر و عبد - ابن حبیب بغدادی ص ۷۷) کی حکمرانی تھی۔ ان دونوں بھائیوں کی طرف حضرت عمرو بن العاص رسول اللہ کا مکتوب لے کر گئے (ابنِ ہشام ج ۴ ص ۲۵۴) تھوڑی سی ردّ و کد کے بعد ان دونوں بھائیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ عمرو بن العاص زکوٰۃ اور وصولی کے لئے وہیں ٹھہر گئے یہاں تک کہ جب رسول اللہ کا وصال ہوا تو یہ وہیں تھے (ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۶۳) - (۲۷۶) بحرین کا حاکم منذر بن ساوی تھا رسول اللہ نے علاء بن الحضرمی کو قاصد بنا کر بھیجا تھا (ابنِ ہشام ج ۴ ص ۲۵۴) اسے خط جعرانہ سے واپسی پر روانہ کیا گیا تھا اور یہ لکھا تھا کہ: "تم جب تک اصلاح کرتے رہو گے تمہیں تمہارے عہدے سے نہیں ہٹائیں گے" (ابن سعد ج ۱ ص ۲۶۳) یہاں چونکہ سلطنت ایران کے اثر سے مجوس و یہود بھی رہتے تھے اس لئے ان پر جزیہ عائد کیا گیا (ایضاً)۔ (۲۷۷) یمن کا صوبہ ایران کے زیرِ اثر تھا۔ وہاں کا عامل باذان تھا۔ رسول اللہ کا مکتوب جس وقت کسریٰ کو ملا تھا تو اس نے اسے پھاڑ کر باذان کو لکھا تھا کہ دو بہادر آدمیوں کو بھیجو جو اس گستاخ شخص کو گرفتار کر کے میرے سامنے حاضر کرے جس نے مجھے خط لکھنے کی جرأت کی ہے۔ باذان نے شہنشاہ کے حکم کی تعمیل میں دو اشخاص کو رسول اللہ کی گرفتاری کے لئے مدینہ بھیجا۔ یہ دونوں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ نے انہیں کسریٰ کے قتل کی خبر دی۔ وہ اس خبر کو لے کر باذان کے پاس واپس گئے تو باذان اور وہ سب مولد قبائل جو یمن میں ابناء کہلاتے تھے اسلام لے آئے۔ ملاحظہ ہو: ابنِ سعد (ج ۱ ص ۲۶۰) اور طبری (ج ۲ ص ۶۵۵) - (۲۷۸) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۲۵۴ - (۲۷۹) ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۶۲ - (۲۸۰) ایضاً - (۲۸۱) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۲۵۴ - (۲۸۲) ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۶۰ - (۲۸۳) ایضاً ج ۲ ص ۱۲۸ - طبری ج ۲ ص ۶۵۵ - (۲۸۴) طبری ج ۲ ص ۶۵۶ - (۲۸۵) ابن سعد ج ۲ ص ۱۲۸ - (۲۸۶) ایضاً (۲۸۷) ایضاً (۲۸۸) واضح رہے کہ اس سے پہلے یہ واقعہ ہو چکا تھا کہ ربیع الاول ۸ھ میں (یعنی موتہ سے بمشکل ایک ماہ قبل) رسول اللہ نے ۱۵ آدمیوں کا ایک وفد حضرت کعب بن عمیر الغفاری کی قیادت میں سرحد شام سے متصل قبائل میں دعوتِ اسلام دینے کے لئے روانہ کیا تھا۔ یہ قبائل زیادہ تر عیسائی تھے اور رومی سلطنت کے زیرِ اثر تھے ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان لوگوں نے اسلام قبول کرنے کے بجائے وفد پر تیروں سے بارش کی مجبوراً اہلِ وفد کو بھی مقابلہ کرنا پڑا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس وفد کے تمام آدمی قتل ہو گئے صرف ایک (قائدِ وفد) باقی بچے اور رسول اللہ کے پاس پہنچے اور واقعہ عرض کیا۔ ایضاً (ص ۱۲۷، ۱۲۸)۔

(۲۸۹) اس عظیم الشان فوج میں شمالی عرب کے سرحدی قبائل مثلاً بہرا، وائل، بکر، لخم، جذام وغیرہ کے لوگ بھی شامل تھے (تفصیل: ابن سعد ج ۲ ص ۱۶۹) ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے کہ یہ مذکورہ قبائل نیز کلب، تغلب، قین، بلی اور قضاعہ وغیرہ) رومی بازنطینی سلطنت کے زیرِ اثر تھے اور جن کو قیصرِ روم کی طرف سے سالانہ ۵۰۰ سیر سونا بطور وظیفہ ملتا تھا (رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی ص ۱۶۷)۔ (۲۹۰) مودودی۔ تفہیم القرآن۔ ج ۲ ص ۱۶۸، ۱۶۹۔ (۲۹۱) ابن سعد ج ۲ ص ۱۳۱۔ (۲۹۲) ایضاً ص ۱۶۵۔ (۲۹۳) ابو عامر راہب کا تعلق قبیلۂ اوس سے تھا۔ قبیلہ میں برتری اور بڑا اثر و رسوخ رکھتا تھا اس کا پورا نام ابو عامر عبد عمرو صیفی بن النعمان تھا جو بنی ضبیعہ بن زید میں سے تھا۔ یہی شخص حنظلہ الغسیل کا باپ تھا۔ ابو عامر نے زمانۂ جاہلیت ہی میں رہبانیت اختیار کرلی تھی۔ موٹے کپڑے پہنا کرتا اور راہب کہلاتا تھا (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۲۴)۔ رسول اللہؐ مدینہ پہنچے تو اس کی اہمیت و برتری ختم ہوگئی۔ اور عبد اللہ بن اُبی کی طرح اس کے دل میں بھی کینہ پیدا ہوگیا بلکہ اس معاملہ میں ابن ابی سے آگے بڑھ گیا۔ اسے کسی قیمت پر اسلام اور رسول اللہؐ کی برتری و سیادت منظور نہ تھی اس لئے اپنے دس ہم مشرب آدمیوں کو لے کر مکہ چلا گیا۔ رسول اللہؐ نے مکہ فتح فرمایا تو وہاں سے طائف بھاگا لیکن طائف کے لوگوں نے بھی اسلام قبول کرلیا تو شام میں جا بسا اور پھر اس کی زندگی کا سورج بھی وہیں غروب ہوگیا (ایضاً ص ۲۲۵)۔ (۲۹۴) ابن سعد ج ۲ ص ۱۶۶۔ (۲۹۵) ایضاً۔ (۲۹۶) مودودی (تفہیم القرآن) ج ۲ ص ۱۷۰، ۱۷۱۔ (۲۹۷) ابو عبید۔ ج ۱۔ ص ۲۱، ۲۲ فقرہ ۵۵۔ ابو عبید کہتے ہیں کہ آپ کی یہ عبارت کہ بصورتِ دیگر "تم فلاحین اور اسلام کے درمیان حائل نہ رہو" سے مراد خاص طور پر کاشتکار اور کسان طبقہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اس کی مملکت کے تمام باشندے ہیں (ایضاً) ابو عبید کے متن میں قرآن کی جس آیت کو نقل کیا گیا ہے وہ سورۂ توبہ کی ۲۹ آیت ہے۔ (۲۹۸) ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے کہ: "قیصر کا جواب جو یعقوبی نے محفوظ کیا ہے اور جس میں قیصر کے اسلام کا اعلان ہے صریحاً فرضی معلوم ہوتا ہے کیونکہ بعد کے واقعات اس کی تائید نہیں کرتے۔ علاوہ بریں قیصر کا خط بزنطینی اسلوب میں ہونا چاہئے حالانکہ یہ جواب خالص عربی بدوی انداز میں ہے" (رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی۔ ص ۱۸۰)۔ (۲۹۹) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۱۶۹۔ (۳۰۰) البلاذری (فتوح) ص ۶۶۔ (۳۰۱) ابن ہشام ج ۴ ص ۱۶۹۔ نیز دیکھئے: البلاذری (فتوح) ص ۶۶۔ (۳۰۲) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۱۷۰۔ نیز بلاذری (فتوح) ص ۶۸۔ (۳۰۳) مصالحت کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: البلاذری (فتوح) ص ۶۶، ۶۷۔ (۳۰۴) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۲۵۳۔ (۳۰۵) محمود شیت خطاب۔ ص ۴۸۹۔ (۳۰۶) التوبہ (۷۳)۔

(۳۰۷) سویلم الیہودی کا گھر جاسوم میں تھا۔ منافقین وہاں جمع ہو کر مسلمانوں کو تبوک میں جانے سے روکنے کی سازشیں کرتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے طلحہ بن عبید اللہ اور کچھ دوسرے صحابہ کو اسے جلانے اور منہدم کرنے کے لئے بھیجا تھا (ابن ہشام ج ۴ ص ۱۶۰)۔ (۳۰۸) ابنِ اسحاق کے قول کے مطابق رسول اللہؐ جب ذی اوان پہنچے جو مدینہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر تھا تو آپ نے مسجد ضرار کو ڈھانے کے لئے چند صحابہ کو روانہ فرمایا تھا (ایضاً ص ۱۷۳)۔ ان میں سے دو کے نام ابنِ ہشام نے دیئے ہیں یعنی مالک بن الدخشم اور معن بن عدی یا اس کا بھائی عاصم بن عدی (ایضاً ص ۱۷۴)۔ جن منافقین

نے اس مسجد کی بنیاد ڈالی اور بنایا ان کی تعداد تقریباً بارہ ہے (ناموں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ایضاً ص ۱۷۴)۔ منافقین اس مسجد کی آڑ میں جو کھیل کھیلنا چاہتے تھے اس کی منصوبہ بندی میں عبداللہ بن ابی اور منافقین کے دوسرے اکابرین کے علاوہ ابو عامر راہب کا دماغ بھی شامل تھا۔ جس کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ وہ پہلے مدینہ سے بھاگ کر مکہ گیا تھا جہاں مسلمانوں کے خلاف جنگوں میں کفار و مشرکین کا حامی و ناصر بنا رہا۔ اور پھر شام میں جا کر رومیوں کو ریاست نبوی پر حملہ کے لئے بھڑکاتا رہا بہر حال مسجد ضرار کا مدعا یہ تھا کہ ایک طرف تو ابو عامر کی اسلام دشمن سرگرمیوں کو مدد پہنچائی جا سکے اور دوسری طرف ایک ایسا محفوظ مقام میسر آجائے جہاں عام مسلمانوں سے بچ کر وہ جمع ہو سکیں۔ وہاں سازو سامان جمع کر سکیں اور ان سب پر مذہب کا پردہ بھی پڑا رہے۔ مختصر یہ کہ مسجد ضرار کی تعمیر جیسا کہ قرآن نے کہا ہے خالص ناپاک سازش کے تحت عمل میں آئی تھی (التوبہ ۱۰۷ تا ۱۱۰)۔ مزید برآں منافقین نے اپنے اعمال بد کی مکمل پردہ پوشی کی غرض سے یہ جسارت بھی کر ڈالی کہ رسول اللہؐ پر اس کے افتتاح کے لئے زور ڈالا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے معصومانہ انداز سے خدمتِ نبوی میں یہ عرض کیا کہ اس سے بارش میں اور سرد راتوں میں عام لوگوں خصوصاً ضعیفوں اور معذوروں کو آسانی ہو جائے گی جو مسجد نبوی اور مسجد قبا سے دُور رہتے ہیں اور جن کو ان مساجد میں وقت پر حاضری میں مشکل ہوتی ہے۔ رسول اللہؐ نے ان کی اس درخواست کو ٹال دیا اور یہ فرمایا کہ "اس وقت میں جنگ کی تیاری میں مشغول ہوں اور ایک بڑی مہم درپیش ہے اس سے واپس آکر دیکھوں گا" اس کے بعد آپ تبوک روانہ ہو گئے اور آپ کی عدم موجودگی میں یہ اپنی حرکتیں کرتے رہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ یہ مزید کوئی گل کھلاتے رسول اللہؐ نے تبوک سے واپسی میں اس کے منہدم کرنے کا حکم دے دیا۔ (۳۰۹) التوبہ (۸۴)۔ (۳۱۰) التوبہ (۷۴ تا ۱۰۱)۔

(۳۱۱) مودودی (تفہیم القرآن) ج ۲ ص ۱۷۱۔ (۳۱۲) سورۂ توبہ کے مباحث، مضامین اور اس کے مختلف اجزاء پر تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے: ایضاً (ص ۱۶۶ تا ۱۷۳)۔ (۳۱۳) بیت اللہ کی تطہیر اور اس میں موجود تمام بُتوں کو خود رسول اللہؐ نے اپنے ہاتھوں سے سرنگوں کیا۔ آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس کی ضرب ہر بت پر مارتے تھے اور جاء الحق و زهق الباطل..... الخ پڑھتے جاتے تھے (ابن ہشام ج ۴ ص ۵۹۔ ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۳۶)۔ خانۂ کعبہ کی تصویروں کو بھی مٹا دیا گیا (ابن ہشام ج ۴ ص ۵۵)۔ خانہ کعبہ کی تطہیر کے علاوہ دوسرے اہم مقامات پر جو سنگی بت نصب تھے اور اہلِ عرب جن کی پرستش کرتے تھے ان کو ڈھانے کے لئے آپ نے فتح مکہ کے ساتھ ہی صحابہ کو روانہ فرمایا جن میں سے خالد بن ولید کو تہامہ کی جانب (ایضاً ص ۷۱) اور عزّیٰ کے انہدام کے لئے بھی (ابن سعد ج ۲ ص ۱۴۵، ۱۴۶)، علی ابن ابی طالب کو بنو جزیمہ کی طرف (ابن ہشام ج ۴ ص ۷۲، ۷۴) پھر رسول اللہؐ نے سعد بن زید الاشہلی کو بجانب مناۃ رمضان ۸ھ میں ہی روانہ کیا۔ عمرو بن العاص کو سواع کی جانب بھیجا اور اسی طرح سے دوسرے بتوں مثلاً بوانہ، ذوالکفین وغیرہ کا قصہ ختم کرنے کے لئے صحابہ کو مقرر کیا (ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۳۷)۔ (۳۱۴) التوبہ (۱)۔ (۳۱۵) ایضاً (۴، ۷، ۱۰، ۱۲، ۱۳)۔ (۳۱۶) ایضاً (۵ تا ۱۶)۔ (۳۱۷) ایضاً (۱۷ تا ۲۷)۔ (۳۱۸) ایضاً (۲۸، ۲۹، ۳۳)۔ (۳۱۹) ایضاً (۳۶، ۳۷)۔ (۳۲۰) ابن سعد ج ۱ ص ۲۹۱۔ (۳۲۱) ایضاً (ص ۲۹۹)۔ (۳۲۲) ان وفود کے

نام یہ ہیں (۱) وفد مزینہ (ایضاً ج ا ص ۲۹۱) - (۲) وفد اشجع (ایضاً ص ۳۰۶) - (۳) وفد الاشعریین (ایضاً ص ۳۴۸) - (۴) وفد جذام (ایضاً ص ۳۵۴) (۵) وفد جہینہ (ایضاً ص ۳۳۳) (۶) وفد ازد (ایضاً ص ۳۳۷) - (۷) وفد ثعلبہ (ایضاً ص ۲۹۸) (۸) وفد باہلہ (ایضاً ص ۳۰۸) - (۹) وفد سلیم (ایضاً ص ۳۰۷) - (۱۰) وفد ثقیف (ایضاً ص ۳۱۲) - (۱۱) وفد صداء (ایضاً ص ۳۲۶) - (۱۲) وفد خشین (ایضاً ص ۳۲۹) (۱۳) وفد عذرہ (ایضاً ص ۳۳۱) - (۱۴) وفد سعد بن بکر (ایضاً ص ۲۹۹) (۱۵) وفد اسد (ایضاً ص ۲۹۲) - (۳۲۳) ابن سعد ج ا ص ۲۹۷ - (۳۲۴) ایضاً ج ا ص ۳۴۳ - (۳۲۵) ایضاً ص ۳۲۴ - (۳۲۶) ایضاً ص ۳۳۲ - (۳۲۷) ایضاً ص ۳۴۰ - (۳۲۸) ایضاً ص ۳۳۹ - (۳۲۹) ایضاً ص ۳۴۴ (۳۳۰) ایضاً ص ۳۴۷ - (۳۳۱) ایضاً ص ۲۹۳ - (۳۳۲) ایضاً ص ۳۰۰ - (۳۳۳) ایضاً ص ۳۰۴ - (۳۳۴) ایضاً ص ۳۲۳ - (۳۳۵) ایضاً ص ۳۵۶ - (۳۳۶) ایضاً ص ۲۹۱ تا ۳۵۹ - (۳۳۷) حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ کا خطبہ ہم نے طوالت کے خوف سے نقل نہیں کیا۔
(۳۳۸) سورہ المائدہ (۳) - (۳۳۹) التوبہ (۳۲، ۳۳) یہی مضمون الصف (۸) میں بیان کیا گیا ہے۔

حواشی

باب چہارم ——— استحکام ریاست

(۱) دورِ اوّل

(۱) اس پانچ سالہ عرصہ میں رسول اللہؐ نے بذاتِ خود جن عسکری مہمات کی قیادت فرمائی ان کی تعداد اٹھارہ ہے جبکہ غزوات کی مجموعی تعداد ۲۷ ہے۔ رسول اللہؐ کے غزوات کا سلسلہ صفر ۲ھ سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے قبل آپ صحابہ کی جن طلایہ گرد جماعتوں کو وقتاً فوقتاً روانہ فرماتے رہے ان کی تعداد کے بارے میں اگرچہ اصحابِ مغازی میں اختلاف ہے تاہم کم سے کم تعداد ۳۶ اور زیادہ سے زیادہ ۱۰۰ ہے (زرقانی ج ۱ ص ۳۸۸)۔ ان سرایا کے دوران آنحضرتؐ مدینہ میں مقیم رہ کر انتظامات فرماتے رہے، ان اعداد و شمار کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سرایا کی کم سے کم تعداد کو ماننے کی صورت میں عسکری مہمات کی کل تعداد ۶۳ اور زیادہ سے زیادہ ماننے کی صورت میں مذکورہ مہمات کی تعداد ۱۲۷ تک جا پہنچتی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اتنی کثیر التعداد فوجی مہمات کا انتظام کرنا (جبکہ دُوسرے ریاستی امور بھی توجہ کے مستحق تھے اور مسلمانوں کی قوت ہنوز مراحلِ تکمیل میں تھی) کس قدر مشکل تھا اور کتنی سیاسی و عسکری مہارت اور سیاست و تدبّر کا متقاضی تھا۔ (۲) سورہ الاسراُ کا نزول واقعہ معراج کے بعد ہوا تھا۔ ملاحظہ ہو: مودودی (تفہیم۔ ج ۲۔ ص ۵۰۶)۔ (۳) از روئے آیت (۲۳)۔ (۴) از روئے آیت (۱۱۱)۔ (۵) از روئے آیت (۲۳، ۲۴)۔ (۶) از روئے آیت (۳۲)۔ (۷) از روئے آیت (۳۱)۔ (۸) از روئے آیت (۳۳)۔ (۹) از روئے آیت (۲۶، ۲۸)۔ (۱۰) از روئے آیت (۳۴)۔ (۱۱) از روئے آیت (۳۴)۔ (۱۲) از روئے آیت (۳۶)۔ (۱۳) آیت (۳۰)۔ (۱۴) آیت (۲۶)۔ (۱۵) آیت (۲۹)۔ (۱۶) ایضاً۔ (۱۷) آیت (۳۵)۔ (۱۸) آیت (۳۷)۔ (۱۹) ابنِ ہشام ج ۲، ص ۱۴۱۔ (۲۰) ایضاً ص ۱۴۳۔ (۲۱) ایضاً، ج ۳، ص ۲۴۷۔ (۲۲) النساء (۱۰۲)۔ (۲۳) رسول اللہؐ کا فرمان ہے کہ: اذا کان ثلاثۃ فی سفر فلیؤمروا احدھم۔ دیکھئے: الخطیب العمری ص ۳۳۹، کتاب الجہاد، باب آداب السفر۔ بحوالہ ابوداؤد۔ (۲۴) ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۵۴ تا ۱۵۶۔ (۲۵) تحویلِ قبلہ کا حکم ہجرت کے ۱۶ یا ۱۷ ماہ بعد نازل ہوا۔ ابنِ سعد نے دونوں روایتیں نقل کی ہیں (ابنِ سعد، ج ۱، ص ۲۴۱ تا ۲۴۲)۔ (۲۶) البقرہ (۱۴۳)۔ (۲۷) البقرہ (۱۴۲)۔ (۲۸) اکبر خان۔ میجر جنرل، حدیثِ دفاع، فیروز سنز۔ کراچی ۱۹۵۴ء، ص ۱۱۹ (اس کا

حوالہ مصنف نے نقل نہیں کیا)۔ (۲۹) مثلاً سورۂ الحج، التغابن، البقرہ، محمد، طلاق، الانفال وغیرہ۔ (۳۰) البقرہ (۲ تا ۴، ۶۲، ۱۳۶، ۱۷۷، ۲۸۵)۔ (۳۱) التغابن (۸)، محمد (۲)، البقرہ (۲۵، ۶۲، ۸۲، ۱۰۳)، الطلاق (۲) (۳۲) التغابن (۸)۔ (۳۳) البقرہ (۴)، الطلاق (۲)۔ (۳۴) محمد (۳، ۲۱)۔ (۳۵) التغابن (۸، ۱۲)، محمد (۳۳)، الانفال (۱، ۲۴، ۴۶)۔ (۳۶) التغابن (۱۴)، محمد (۳۳)، الطلاق (۳)، الانفال (۴۹، ۶۱) (۳۷) التغابن (۱۶)، البقرہ (۱۰۳، ۱۱۷)۔ (۳۸) البقرہ (۴۵، ۱۷۷)۔ (۳۹) محمد (۷)، البقرہ (۱۷۷)، الانفال (۴۵)۔ (۴۰) الحج (۳۷)، البقرہ (۱۵۲)، الانفال (۲، ۴۵)۔ (۴۱) الحج (۳۷)، البقرہ (۱۴۳)۔ (۴۲) التغابن (۹)، البقرہ (۲۵، ۶۲، ۸۲)، الطلاق (۱۱)۔ (۴۳) البقرہ (۲، ۳، ۱۱۰)، الانفال (۳)، الحج (۴۱)۔ (۴۴) البقرہ (۱۰۴)، الانفال (۲۱)۔ (۴۵) البقرہ (۱۱۲)۔ (۴۶) البقرہ (۱۱۲، ۱۹۵)۔ (۴۷) البقرہ (۱۴۳)، الطلاق (۲)۔ (۴۸) البقرہ (۱۵۰)۔ (۴۹) البقرہ (۱۶۰)۔ (۵۰) البقرہ (۸۳، ۱۷۷، ۲۱۵)، النساء (۲، ۳۶، ۱۲۷)، الانفال (۵۶) وغیرہ (۵۱) التغابن (۱۴)۔ (۵۲) آل عمران (۱۵۹)۔ (۵۳) آل عمران (۲۰۰)۔ (۵۴) الحج (۷۸)، الصف (۱۱)، البقرہ (۲۱۸)، الانفال (۲، ۷۴)، (۵۵) البقرہ (۱۹۰، ۱۹۳، ۲۴۴)، آل عمران (۱۶۷)، الانفال (۳۹)، النساء (۸۴)۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قرآن نے جہاد اور قتال دونوں کے معاملہ میں فی سبیل اللہ کی قید لگائی ہے۔ دفاعی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ قید معنی خیز بن جاتی ہے کیونکہ جنگ میں کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ فوج کو اپنے دفاعی مقاصد یا نصب العین سے واضح طور پر علم و واقفیت حاصل ہو۔ (۵۶) محمد (۴)، الانفال (۳۹)، البقرہ (۱۹۰)، الانفال (۶۵)۔ (۵۷) محمد (۲۰)، البقرہ (۸ تا ۱۶)۔ (۵۸) محمد (۳۲)، الانفال (۱۳)۔ (۵۹) محمد (۳۵)۔ (۶۰) ایضاً (۳۸)۔ (۶۱) محمد (۳۸)، البقرہ (۲۵۴، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۵، ۲۶۷، ۲۷۲، ۲۷۴)، الانفال (۳)۔ (۶۲) محمد (۳۵)۔ (۶۳) الانفال (۲۷، ۵۸)۔ (۶۴) الانفال (۶۰)۔ (۶۵) الانفال (۴۶)۔ (۶۶) آل عمران (۱۵۲)۔ (۶۷) آل عمران (۲۰۰)۔ (۶۸) النساء (۵۹)۔ (۶۹) النساء (۶۵)۔ (۷۰) الحشر (۷)۔ (۷۱) الاحزاب (۲۱)۔ (۷۲) الاحزاب (۴۰)۔ (۷۳) ابنِ سعد کے الفاظ یہ ہیں: ثم غزوۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لطلب کرز بن جابر الفہری فی شہر ربیع الاول علی رأس ثلاثۃ عشر شہراً من مہاجرہ (ابنِ سعد، ج ۲ ص ۹)۔ (۷۴) الصعیدی۔ عبد المتعال۔ السیاسۃ الاسلامیہ فی عہد النبوۃ۔ دار الفکر العربی۔ الطبعۃ الثانیہ۔ ص ۴۵۔ (۷۵) ابنِ ہشام، ج ۲، ص ۲۶۷۔ (۷۶) مثلاً شاہ ولی اللہ نے الفوز الکبیر میں منافقین کے گروہ کی تفصیل، ان کی خصوصیات اور ان کے بارے میں قرآنی احکام کی تفصیل دی ہے۔ متن کے لئے ملاحظہ ہو: شاہ ولی اللہ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر مع فتح الخبیر۔ مترجم۔ سید محمد مہدی الحسنی و حبیب الرحمٰن صدیقی۔ قرآن محل۔ کراچی ۱۳۸۳ھ، ص ۳۷ تا ۴۰۔ (الفوز الکبیر کے عربی ترجمہ (جو ۱۲۹۵ھ سے قبل کیا گیا تھا) کے حوالہ کے لئے دیکھئے: الفوز الکبیر فی

اصول التفسیر ویلیہ الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف ۔ المکتبۃ السلفیہ ۔ لاہور ۱۹۵۱ء، ص ۱۱، ۱۲)
(۷۷) البتہ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ انھوں نے اسلام کو بطور دین کے قبول کیا تھا اور وہ مسلمانوں میں سے ہی سمجھے جاتے تھے۔ یہ بات نہ تھی کہ محض ایک سازشی گروہ بھیس بدل کر مسلمانوں میں آملا اور مسلمانوں میں سے نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو نہ تو ان کو پہچاننا مشکل تھا اور نہ ان سے سلوک اس قسم کا کیا جاتا۔ مشکل یہی تھی کہ وہ بظاہر مسلمانوں کی صفوں میں تھے اور اعمال و افعال میں بھی ان کے ساتھ شریک تھے البتہ دل جدا تھا۔ چونکہ عام آدمی ظاہر پر ہی حکم لگاتا ہے اور باطن کا حال صرف خدا کو معلوم ہے اس لئے اس گروہ کو پہچاننا آسان نہ تھا اس لئے ان کے ساتھ سلوک کرنے میں بڑے ٹھنڈے طریقے سے کام لیا گیا اور جب قانونی اعتبار سے ان کے خلاف قدم اٹھانے کا جواز پیدا ہو گیا تب ان کی گرفت کی گئی۔
(۷۸) منافقین کی مکمل فہرست تو کسی ماخذ میں نہیں ملتی۔ البتہ ابن ہشام نے کافی نام لکھے ہیں ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے (ج ۲، ص ۱۶۶ تا ۱۷۶)۔ (۷۹) ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۷۳ - (۸۰) ان کے نام یہ ہیں: سعد بن حنیف، زید بن الصلت، نعمان بن اوفی بن عمرو، عثمان بن اوفی، رافع بن حرملہ، رفاعہ بن زید بن التابوت، سلسلہ بن برہام اور کنانہ بن صوریا (ابن ہشام ج ۲ ص ۱۷۴ تا ۱۷۵)۔ (۸۱) دونوں بخل، انکارِ حق اور حسد کی بنا پر انکارِ رسالت پر سختی سے قائم تھے (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۲۰۸ تا ۲۱۴)۔ (۸۲) اس کی طرف اشارہ قرآن نے بھی کیا ہے: فلا تعجبک اموالھم و لا اولادھم (التوبہ ۵۵)۔ (۸۳) ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۷۳ (۸۴) سورہ منافقون میں ان کا نقشہ یوں کھینچا گیا کہ: واذا رایتھم تعجبک اجسامھم ان یقولوا تسمع لقولھم کانھم خشب مسندۃ (آیت ۴) ترجمہ یہ ہے کہ: "انھیں دیکھو تو ان کے جثے تمہیں بڑے شاندار نظر آئیں، بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے رہ جاؤ مگر اصل میں یہ گویا لکڑی کے کندے ہیں جو دیوار کے ساتھ چن کر رکھ دئے گئے ہیں۔" (۸۵) البقرہ (۱۱)۔ (۸۶) الماعون (۵، ۶)، النساء (۱۴۲) ان کے یہ تمام اعمال اللہ کے ہاں نامقبول ہیں (الحدید ۱۴)۔ (۸۷) محمد (۱۶، ۲۶) (۸۸) یہودیوں سے دوستی۔ المجادلہ (۱۴)، الحشر (۱۱، ۱۲، ۱۴)، الاحزاب (۱۲، ۱۳، ۱۴ تا ۲۰)۔ (۸۹) آل عمران (۱۱۸، ۱۱۹)، النساء (۱۰۸، ۱۱۴، ۱۳۸، ۱۳۹)، التوبہ (۴۷)۔ (۹۰) البقرہ (۱۳ تا ۱۶)، آل عمران (۱۵۶، ۱۶۷)، النساء (۶۲، ۷۳، ۸۱، ۸۳)، التوبہ (۷۴ تا ۵۹)، محمد (۱۶، ۲۰، ۲۲، ۲۹)۔ (۹۱) الحشر (۱۱)، المجادلہ (۱۶)، المنافقون (۱، ۲)۔ (۹۲) التوبہ (۴۷)، (۹۳) ابن ہشام ج ۲ ص ۲۳۸ (۹۴) ایضاً، ج ۲ ص ۱۷۴۔ (۹۵) ایضاً (۹۶) سورۂ محمد (۲۰، ۲۱) (۹۷) ابن ہشام ج ۳، ص ۵۲ (۹۸) ایضاً ج ۳ ص ۱۱۱۔ (۹۹) ایضاً، ج ۳، ص ۱۱۱ (۱۰۰) ایضاً ج ۳ ص ۲۰۰، ۲۰۱۔ (۱۰۱) الحشر (۱۱) (۱۰۲) ایضاً (۱۲)۔ (۱۰۳) بقول ابن ہشام یہ معتب بن قشیر نے کہا تھا (ج ۲، ص ۱۶۹)۔ (۱۰۴) الاحزاب (۱۲) - (۱۰۵) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۰۳ (۱۰۶) قرآن نے اس کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے کہ: تحسبھم جمیعاً وقلوبھم شتّٰی۔ دیکھئے: الحشر (۱۴)۔ (۱۰۷) جنگِ احد کے موقع پر تقریباً ۳۰۰ افراد مسلمانوں سے الگ ہٹ گئے تھے

اور مورخین کی فراہم کردہ فہرست کے مطابق کم از کم تعداد ۶۳ تھی (ابنِ ہشام ج ۲ ص ۱۶۶ تا ۱۷۶) (۱۰۸) تفصیل کے لئے دیکھئے: ابن ہشام ج ۲ ص ۱۶۶ تا ۱۷۴ - (۱۰۹) مودودی، ابو الاعلیٰ، تفہیم القرآن - ادارہ ترجمان القرآن - لاہور ۱۹۷۱ء، ج ۵ ص ۵۱۰ - (۱۱۰) ایضاً (۱۱۱) الحشر (۱۴) - (۱۱۲) الاحزاب (۶۰، ۶۱) - (۱۱۳) الصعیدی، ص ۱۶۴ - (۱۱۴) کیونکہ حاکمیت تو صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے - دیکھئے: یوسف (۴۰)، الاسراء (۱۱۱)، الحشر (۱)، الاحزاب (۱، ۲)، النساء (۵۹) - (۱۱۵) اس کا حکم بھی آپ کو مل چکا تھا۔ آل عمران (۱۵۹) - (۱۱۶) بنو قریظہ سے اسی طرح کا معاملہ ہوا - حضرت سعد بن معاذ نے فیصلہ دیا (ابنِ ہشام، ج ۳، ص ۲۵۰) (۱۱۷) النساء (۵۸، ۶۵، ۱۰۵، ۱۲۵)، الحدید (۲۵) - (۱۱۸) حضورؐ کے حکم سے ایک یہودی مرد اور عورت کو مسجد بنی غنم بن مالک کے پاس سنگسار کیا گیا (ابنِ ہشام، ج ۲، ص ۲۱۴) - (۱۱۹) البقرہ (۱۴۴) (۱۲۰) ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۵۴، ۱۵۵ - (۱۲۱) البقرہ (۱۸۳ تا ۱۸۷) - (۱۲۲) البقرہ (۲۱۵)، النساء (۴۳) - (۱۲۳) البقرہ (۱۷۵) - (۱۲۴) النساء (۱۱ تا ۱۳) - (۱۲۵) سورۂ الانفال کی آخری آیت: واولوا الارحام بعضھم اولیٰ ببعض فی کتاب اللہ (۷۵) نازل ہو جانے کے بعد موقوف ہوا - (۱۲۶) البقرہ (۲۲۱) - (۱۲۷) اس سلسلے میں ملاحظہ ہو قرآن کی سورہ الطلاق اور النساء - (۱۲۸) الاحزاب (۵۹) - (۱۲۹) قانونِ جنگ و صلح کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: سورۂ محمد اور سورہ الانفال - (۱۳۰) ایضاً - (۱۳۱) ایضاً - (۱۳۲) الحشر (۶ تا ۱۰) - (۱۳۳) البقرہ (۲۸۳) - (۱۳۴) البقرہ (۲۱۷)، النساء (۱۳۷) - مدینہ میں ارتداد کا اولیں حادثہ حارث بن سوید بن صامت کے ساتھ پیش آیا - وہ اگرچہ غزوۂ اُحد میں بحیثیت مسلمان شریک ہوا تھا لیکن مجذر بن زیاد البلوی کو قتل کر کے مکہ بھاگ گیا تھا - (ابنِ ہشام، ج ۲، ص ۱۶۷) - (۱۳۵) البقرہ (۱۷۹)، النساء (۹۰ تا ۹۳) - (۱۳۶) ظہار کے شرعی احکام - المجادلہ (۱ تا ۶) - دورِ جاہلیت کا نظام - طلاق و ظہار - المجادلہ (۱ تا ۴) (۱۳۷) الاحزاب (۴۰) - (۱۳۸) مثلاً دیکھئے: الاحزاب (۵۰ تا ۵۲) -

(۲) دورِ دوم

(۱۳۹) الاسراء (۳۲) (۱۴۰) النور (۲) - (۱۴۱) ایضاً (آیات ۴، ۵ تا ۱۰، ۲۲، ۲۴) - (۱۴۲) ایضاً (۳۳) (۱۴۳) ایضاً (۳۲، ۳۳) - (۱۴۴) ایضاً (۳۰، ۳۱) - (۱۴۵) ایضاً - (۱۴۶) ایضاً - (۱۴۷) ایضاً (۲۷ تا ۲۹) - (۱۴۸) ایضاً (۵۸، ۵۹، ۶۰) - (۱۴۹) واقعہ افک سے مراد حضرت عائشہؓ پر تہمت کا واقعہ ہے۔ اس واقعہ کی مختصر روئداد یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ غزوۂ بنی المصطلق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریکِ سفر تھیں۔ اس غزوہ سے واپسی پر مدینہ سے قریب ایک منزل پر اسلامی لشکر نے پڑاؤ کیا اور ابھی رات کا کچھ حصہ باقی تھا کہ کوچ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اسی اثنا میں رفع حاجت اور گلے کے گم شدہ ہار کی تلاش میں حضرت عائشہؓ تو پیچھے رہ گئیں اور لشکر آگے نکل گیا۔ صبح کے وقت ایک صحابی صفوان بن المعطل السلمی بھی اس جگہ سے گزرے جہاں حضرت عائشہؓ موجود تھیں اُنہوں نے کوئی بات نہیں کی اور حضرت عائشہؓ کے

قریب اپنا اونٹ لاکر بٹھا دیا اور خود الگ کھڑے ہو گئے۔ حضرت عائشہ اونٹ پر سوار ہو گئیں اس پر بہتان اٹھانے والوں نے بہتان اٹھا دئے اور ان میں سب سے پیش پیش عبداللہ بن ابی تھا۔ مگر حضرت عائشہ ابتداءً اس سے بے خبر تھیں کہ ان پر کیا باتیں بن رہی ہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ابنِ ہشام ج ۳ ص ۳۱۱ء اس کے بعد منافقین نے اس بے بنیاد الزام کو ایسی شہرت دی کہ خود مسلمانوں میں سے بعض اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو گئے تھے جن میں مسطح، حسّان اور حمنہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ آخر کچھ دنوں بعد اس الزام سے حضرت عائشہ کی براءت کو جب وحی الٰہی کے ذریعہ سورۂ نور (آیات ۱۱ تا ۲۰) میں نازل کر دیا گیا تو یہ قضیہ ختم ہوا۔ واقعہ افک کی پوری تفصیل خود حضرت عائشہ سے مروی ہے۔ اکثر محدثین اور مورخین نے حضرت عائشہ کی روایت کو ہی بہ تمام و کمال نقل کیا ہے۔ متنِ روایت کے لئے ملاحظہ ہو: البخاری - محمد بن اسماعیل - الصحیح، اصح المطابع - دہلی - سنہ ۱۹۳۸ء ج ۲ - ص ۶۹۶ تا ۶۹۸ - کتاب التفسیر، باب ان الذین جاؤا بالافک - (۱۵۰) یہاں ہم اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جبکہ حضرت عمر کے غلام جہجاہ بن مسعود اور سنان بن وبر کے درمیان پانی کے مسئلہ پر معمولی سا جھگڑا ہوا۔ لیکن عبداللہ بن ابی نے اسے بڑی بات بنا دیا اور عصبیت جاہلیہ کو ابھارا جس کے نتیجہ میں مہاجرین و انصار کے درمیان جنگ کی نوبت آتے آتے رہ گئی۔ ملاحظہ ہو: ابنِ ہشام، ج ۳، ص ۳۰۲ - (۱۵۱) ایضاً ج ۳، ص ۳۱۲ - نیز دیکھئے: البخاری ج ۲ ص ۶۹۷، ۶۹۹ (کتاب التفسیر) - (۱۵۲) جن لوگوں پر حد جاری کی گئی ان میں حضرت مسطح، حسّان اور حمنہ کا نام ابنِ ہشام (ج ۳، ص ۳۱۵) اور دوسرے تمام مورخین لیتے ہیں لیکن یہ بات ہمارے لئے اب تک ناقابلِ فہم ہے کہ عبداللہ بن ابی اس سے کس طرح مستثنیٰ رہا جبکہ فتنہ جوئی میں اس کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔ اور اس کا شمار بھی بہر حال مسلمانوں میں ہوتا تھا۔

(۱۵۳) المجادلہ (۱ تا ۶) - (۱۵۴) المجادلہ (۷ تا ۱۰)، المنافقون (۱ تا ۴) - نیز النور (۴۸ تا ۵۰ اور ۵۳، ۵۴) - (۱۵۵) المجادلہ (۱۴ تا آخر سورہ) - (۱۵۶) ایضاً - (۱۵۷) ایضاً (۷ تا ۱۳) - (۱۵۸) المنافقون (۸) - آیت کا شانِ نزول خود اسی کے اندر موجود ہے کہ وہ (منافقین) کہتے ہیں کہ: لئن رجعنا الی المدینة لیخرجن الاعزّ منہا الاذل - یہ دراصل عبداللہ بن ابی کا قول تھا جو غزوۂ بنی المصطلق کے موقع پر اس نے کہا تھا (ابنِ ہشام، ج ۳، ص ۳۰۳) - (۱۵۹) النور (۱۹) - (۱۶۰) الحجرات (۱۲) - (۱۶۱) النور (۵۸، ۵۹) - (۱۶۲) ایضاً (۶۱) - (۱۶۳) المجادلہ (۱۱ تا ۱۳) - (۱۶۴) ایضاً (۲۱) - (۱۶۵) ایضاً (۵) - (۱۶۶) النور (۵۵) - (۱۶۷) الفتح (۲۹) (۱۶۸) پرویز - غلام احمد: معراجِ انسانیت - ادارہ طلوعِ اسلام - لاہور - سنہ ۱۹۴۹ء - ص ۵۶۱، ۵۶۲ - (۱۶۹) ابن ہشام، ج ۳، ص ۳۴۰ - (۱۷۰) مودودی (تفہیم القرآن) ج ۵ ص ۴۳۵ - (۱۷۱) ابن ہشام، ج ۳، ص ۳۳۲ - (۱۷۲) البخاری، ج ۱، ص ۳۸۰، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد - (۱۷۳) الممتحنہ (آیات ۱۰ تا ۱۲) (۱۷۴) ایضاً (۱۰) - (۱۷۵) ایضاً (۱۲) - (۱۷۶) مودودی - تفہیم القرآن، ج ۵، ص ۴۳۷، ۴۳۸ - (۱۷۷) ایضاً، ص ۴۳۸ - واضح رہے کہ اس قانون کو فقہائے اسلام نے چار بڑے بڑے عنوانات کے تحت مرتّب کیا ہے - ان عنوانات اور ان کی ضروری تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: (ایضاً، ص ۴۳۸ تا ۴۴۲) - (۱۷۸) ابن ہشام

ج ۴ ص ۴۰)۔ (۱۷۹) بخاری میں حضرت علی کی روایت سے اس قصہ کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ابن ہشام کے بتائے ہوئے مقام کے بجائے خاخ کے باغ کا نام آتا ہے۔ دیکھئے: البخاری۔ ج ۲، ص ۲۶، کتاب التفسیر۔ باب لا تتخذ وا عدوّی۔ (۱۸۰) ابن ہشام، ج ۴ ص ۴۱۔ صحیح بخاری میں اس واقعہ کو اور زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو: البخاری، ج ۲، ص ۷۲۶، کتاب التفسیر۔ (۱۸۱) ابن ہشام، ج ۴، ص ۴۱۔ یہاں جن آیات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سورہ الممتحنہ کی ابتدائی نو (۹) آیات ہیں۔ صحیح بخاری میں بھی شانِ نزول یہی بیان کیا گیا ہے۔ دیکھئے: البخاری، ج ۲، ص ۵۶۷ کتاب المغازی اور ص ۲۶، کتاب التفسیر۔ (۱۸۲) الممتحنہ (۱)۔ (۱۸۳) البخاری۔ ج ۲، ص ۷۲۶ کتاب التفسیر۔ (۱۸۴) مودودی۔ تفہیم القرآن، ج ۵، ص ۴۲۷، ۴۲۸ (بحوالہ احکام القرآن ابن العربی، عمدۃ القاری اور فتح الباری)۔ (۱۸۵) احسان۔ بی اے۔ رسولؐ اللہ میدانِ جہاد میں۔ پاک پبلشرز لمیٹڈ، کراچی۔ ۱۹۶۸ء ص ۱۸۶۔ (۱۸۶) ابنِ ہشام، ج ۳، ص ۳۴۵۔ (۱۸۷) ابنِ سعد، ج ۲، ص ۱۱۳۔ (۱۸۸) ابنِ ہشام، ج ۳، ص ۳۴۵۔ (۱۸۹) ایضاً ص ۳۴۶۔ (۱۹۰) البخاری۔ ج ۲، ص ۶۰۶ کتاب المغازی۔ (۱۹۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مودودی، تفہیم القرآن، ج ۱ ص ۴۳۶۔ (۱۹۲) النور (۵۵)۔ (۱۹۳) المائدہ (۲، ۹۴، ۹۵، ۹۷)۔ (۱۹۴) ایضاً (۲)۔ (۱۹۵) ایضاً (۱ تا ۵، ۸۷، ۸۸، ۹۰، ۹۱، ۹۴ تا ۹۶، ۱۰۳)۔ (۱۹۶) ایضاً (۲)۔ (۱۹۷) ایضاً (۶)۔ (۱۹۸) ایضاً (۸۹)۔ (۱۹۹) ایضاً (۱۰۶ تا ۱۰۸)۔ (۲۰۰) ایضاً (۲۳، ۲۴)۔ (۲۰۱) ایضاً (۳۸)۔ (۲۰۲) ایضاً (۳۲)۔ (۲۰۳) ایضاً (۵۴)۔ (۲۰۴) ایضاً (۵)۔ (۲۰۵) ایضاً (۵۱، ۵۷)۔ (۲۰۶) ایضاً (۲، ۸، ۴۲)۔ (۲۰۷) ایضاً (۱، ۳۵، ۹۲)۔ (۲۰۸) ایضاً (۱۳، ۷۱)۔ (۲۰۹) ایضاً (۴۸، ۴۹)۔ (۲۱۰) ایضاً (۱۵، ۵۹، ۶۳ تا ۶۶، ۶۸)۔ (۲۱۱) ایضاً (۱۶، ۷۲، ۷۳، ۷۵ تا ۸۰، ۱۱۰ تا ۱۱۸)۔ (۲۱۲) ایضاً (۱۵، ۱۹، ۸۱)۔ (۲۱۳) رسولؐ اللہ نے اپنے وصال مبارک سے ذرا پہلے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: "انّی واللہ ماتمسکون علی بشیٔ، انّی لم احل الّا ما احل القرآن، ولم احرّم الّا ما حرّم القرآن" (خدا کی قسم تم میرے ذمہ کوئی چیز نہیں لگا سکتے۔ میں نے کوئی چیز حلال نہیں کی بجز اس کے جو قرآن نے حلال کی اور میں نے کوئی چیز حرام نہیں کی بجز اس کے جو قرآن نے حرام کی) دیکھئے: ابن ہشام، ج ۴، ص ۳۰۴۔ (۲۱۴) التوبہ (۱)۔ (۲۱۵) ایضاً (۵، ۱۲۳)۔ (۲۱۶) ایضاً (۱۲)۔ (۲۱۷) ایضاً (۱۷)۔ (۲۱۸) ایضاً (۴)۔ (۲۱۹) ایضاً (۲۸)۔ (۲۲۰) ایضاً (۲۹)۔ (۲۲۱) ابو عبید، ج ۱، ص ۲۲، فقرہ ۵۵۔ (۲۲۲) بقول ابن سعد رسولؐ اللہ نے ایک فرمان اہلِ نجران کے نام لکھا تھا جس کے جواب میں ان کے چودہ شرفائے نصاریٰ کا ایک وفد آپ کی خدمت میں آیا تھا (ابن سعد ج ۱، ص ۳۵۷)۔ ابنِ ہشام کے بیان کے مطابق یہ وفد ساٹھ (۶۰) سواروں پر مشتمل تھا۔ اور اس نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ ان ۶۰ میں سے ۱۴ ان کے سربرآوردہ لوگ تھے۔ پھر ان چودہ میں سے تین اشخاص ایسے تھے جو مرجع عام تھے (ابنِ ہشام ج ۲، ص ۲۲۲)۔ اس وفد کی آمد رسولؐ اللہ کے پاس ۹ھ میں ہوئی تھی (ندوی، سلیمان۔ ارض القرآن، ج ۱،

ص ۶۹)۔ اسی موقع پر سورۂ آلِ عمران کی تقریباً ۸۰ آیات نازل ہوئی تھیں (ابنِ ہشام، ج ۲، ص ۲۲۵)۔ ان کا آغاز اِنّ اللّٰہ اصطفیٰ ادم و نوحًا و اٰل ابراھیم و اٰل عمران علی العالمین سے ہوتا ہے (مودودی، تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۲۲۰)۔ (۲۲۳) مولانا مودودی نے اپنی کتاب تفہیم القرآن میں لکھا ہے کہ "اس وقت اس علاقے میں ۷۳ بستیاں شامل تھیں اور کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ بیس ہزار قابلِ جنگ مرد اس میں سے نکل سکتے تھے۔ آبادی تمام تر عیسائی تھی" (ج ۱، ص ۲۴۶) البتہ اس کا حوالہ نقل نہیں کیا ہے۔ اس بات پر قریب قریب تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ نجران کی پوری آبادی ان ہی تین سرداروں کے زیرِ حکم تھی۔ مثلاً دیکھئے: ابنِ سعد، ج ۱، ص ۳۵۰۔ (۲۲۴) ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ عاقب قوم کا سردار اور ان سب کو ایسا مشورہ اور رائے دینے والا تھا کہ بجز اس کی رائے کے وہ لوگ کسی طرف منہ پھیرتے تھے۔ اس کا نام عبدالمسیح تھا۔ سیّد ان کی دیکھ بھال کرنے والا اور ان کے سفروں اور اجتماعات کا منتظم تھا، اس کا نام الایہم تھا، جبکہ اسقف ابوحارثہ بن علقمہ تھا۔ وہ بنی بکر بن وائل کا ایک فرد، ان کا دینی پیشوا، ماہر عالم، امام اور ان کی درسگاہوں کا افسر تھا (ابنِ ہشام، ج ۲، ص ۲۲۲)۔ ابنِ ہشام نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان تینوں سرداروں میں سے ابوحارثہ نے ان سب میں بلند مقام حاصل کر لیا تھا۔ وہ مذہبی کتابوں کی تعلیم دیا کرتا تھا اور اسے اپنے علوم میں خوب مہارت حاصل ہو گئی تھی یہاں تک کہ روم کے عیسائی بادشاہوں کو دینی علوم میں اس کی مہارت کی خبر پہنچی تو انہوں نے اسے بڑا مرتبہ دے دیا اور مال و منال خدم و حشم والا بنا دیا۔ انہوں نے اس کے لئے کئی کلیسے بنا دئے تھے اور طرح طرح کے اعزازات دئے تھے (ایضاً)۔ (۲۲۵) آلِ عمران (۳۹ تا ۶۳)۔ (۲۲۶) ایضاً (۶۲، ۷۳، ۷۷، ۹۹، ۱۱۲، ۱۱۸ تا ۱۲۰)۔ (۲۲۷) ابنِ سعد، ج ۱، ص ۳۵۷۔ (۲۲۸) ایضاً (۲۲۹) ایضاً ص ۳۵۷ تا ۳۵۸ (۲۳۰) صلح نامہ کے اصل متن کے لئے ملاحظہ ہو: ابو یوسف (ص ۷۲)، ابنِ سعد (ج ۱، ص ۳۵۸) بلاذری۔ فتوح البلدان (ص ۷۰ تا ۷۲) نیز الدکتور محمد حمید اللہ الحیدر آبادی۔ مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ۔ مطبعہ لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر۔ قاہرہ، ۱۹۴۱ء (ص ۸۱)۔ (۲۳۱) ابنِ قیم، زاد المعاد، ج ۱، ص ۱۷۵۔ (۲۳۲) البقرہ (۲۷۸، ۲۷۹)، یہ آیات فتحِ مکہ کے بعد نازل ہوئی تھیں۔ ان آیات کے نزول کے بعد اسلامی حکومت کے دائرہ میں سُودی کاروبار ایک فوجداری جُرم بن گیا۔ عرب کے جو قبیلے سُود کھاتے تھے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمّال کے ذریعہ سے آگاہ فرما دیا کہ اگر وہ اب اس لین دین سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ نجران کے عیسائیوں کو جب اسلامی حکومت کے تحت اندرونی خود مختاری دی گئی تو معاہدے میں یہ تصریح کر دی گئی کہ اگر تم سُودی کاروبار کرو گے تو معاہدہ فسخ ہو جائے گا اور ہمارے تمہارے درمیان حالتِ جنگ قائم ہو جائے گی۔ (مودودی۔ تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۲۱۸)۔ نیز ابو یوسف (ص ۷۲، ۷۳)۔

(۲۳۳) شبلی نے لکھا ہے کہ ۸ھ تک زکوٰۃ فرض نہیں ہُوئی۔ فتحِ مکہ کے بعد اس کی فرضیت ہوئی تو اس کے مصارف بیان کئے گئے (شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی۔ سیرت النبی۔ مطبع اعظم گڑھ، ۱۳۷۵ھ، ج ۲، ص ۱۲۲)۔

(۲۳۴) محصلینِ زکوٰۃ و صدقات اور ان کے تقرر کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: ابن ہشام (ج ۴، ص ۲۴۶)۔

شبلی نے لکھا ہے کہ ان محصلین کا تقرر رسولؐ اللہ نے یکم محرم الحرام ۹ھ کو فرمایا (شبلی، ج ۲، ص ۳۷)۔(۲۳۵) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: شبلی، ج ۲، ص ۸۶ تا ۹۹۔(۲۳۶) سورۂ حجرات کا نزول ۹ھ میں وفد بنی تمیم کی آمد پر ہوا تھا جبکہ وفد کے لوگوں نے حجراتِ ازواج کے باہر رسولؐ اللہ کو پکارنا شروع کر دیا تھا۔ ابن ہشام نے تو عنوان ہی یہ لکھا ہے کہ :

قدوم وفد بنی تمیم و نزول سورہ الحجرات (ج ۴ ص ۲۰۶)۔(۲۳۷) الحجرات (۱، ۲، ۶، ۱۰، ۱۱ تا ۱۳)۔

(۲۳۸) یہ وفد محارب تھا جو ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ دس افراد پر مشتمل تھا۔ ملاحظہ ہو: ابنِ سعد، ج ۱، ص ۲۹۹۔ (۲۳۹) الحجرات (۱۴)۔(۲۴۰) مثلاً حارث بن سویہ کا ارتداد (ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۶۷) عبداللہ بن اخطل کا ارتداد جس کے قتل کا حکم رسولؐ اللہ نے فتح مکہ کے موقع پر دیا تھا (ایضاً، ج ۴، ص ۵۲) واضح رہے کہ شبلی نے بڑی تفصیل سے "اشتہاریان قتل" پر بحث کی ہے اور اس سلسلہ میں مذکورہ ابن اخطل کا بھی ذکر کیا ہے۔ نیز اس کے ارتداد کا واقعہ نقل کر کے ابوداؤد کے حوالہ سے حدیث پر تنقید و جرح سے کام لیا ہے۔ ملاحظہ ہو (شبلی، ج ۱، ص ۵۲۴ تا ۵۲۵)۔ ابنِ ہشام کی رُو سے مسیلمۃ الکذاب نے ارتداد بھی اختیار کیا تھا اور جھوٹی نبوت کا دعویٰ بھی (ابنِ ہشام، ج ۴، ص ۲۲۳)۔(۲۴۱) ابنِ ہشام، ج ۴، ص ۲۲۳۔(۲۴۲) ایضاً (۲۴۳) ایضاً ص ۲۴۷۔

(۲۴۴) عہدِ نبویؐ میں تحریکِ ارتداد کا بانی اسود عنسی تھا اس نے حجۃ الوداع کے بعد خروج کیا تھا اور مذحج کے اکثر افراد اس کے ساتھ ہو گئے تھے۔ بڑا شعبدہ باز تھا عجیب وغریب تماشے دکھاتا تھا۔ رسولؐ اللہ کو جب اس کی تحریک کی اطلاع ملی تو آپ نے فوج کشی کرنے کے بجائے محض چند اشخاص کی سفارتی اور سیاسی کوششوں سے کام لیا جس کی وجہ سے مرتدین کے تمام راستے بند ہو گئے۔ آپ کی وفات سے ایک دن پہلے وُہ مارا گیا۔ دیکھئے: طبری، ج ۳، ص ۱۸۵ تا ۱۸۷۔

حواشی

باب پنجم — انتظامِ ریاست

(۱) ابن الطقطقی۔ محمد بن علی بن طباطبا۔ الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ۔ المطبعۃ الرحمانیہ، مصر ۱۹۲۷ء، ص ۵۲ (الفصل الثانی) (۲) الحدید (۲۵) (۳) الحج (۴۱) (۴) اس نظریہ کو متعارف کرانے کا سہرا بودین (BODIN) کے سر ہے جس نے ۱۵۷۶ء میں اسے پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔

(Gilchrist, R.N., Principles of Political Science, Orient Longman, Calcutta, 1961, p. 93).

یہ نظریہ حاکمیت بودین نے اپنی کتاب "ON THE COMMONWEALTH" میں واضح طور پر بیان کیا۔ تاریخی اعتبار سے چونکہ اس کا نظریہ لوئیس یازدہم (Louis XI) کے دور کی غمازی کرتا ہے۔ اس لئے اس کا تصور دراصل استبدادیت پر مبنی ہے۔

(L.R. Sm. Sovereignty, Encyclopaedia Britannica, edd. William Benton, Ency. Britannica Inc., Chicago, 1955, Vol.21,p.1

بودین سے پہلے حاکمیت (Sovereignty) یا حاکمِ اعلیٰ (Sovereign) کی اصطلاح کو استعمال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اس کے لئے قوتِ بالادست (Supreme power) یا اتمام و اکمال طاقت (Fullness of power) کے الفاظ کا سہارا لیا جاتا تھا۔ (دیکھئے

(Ilyas Ahmad, Sovereignty, Islamic and Modern, The Allies Book Corporation, Karachi, 1965, p. 5)

بودین کے بعد جن لوگوں نے حاکمیت کے بارے میں خاص طور پر اپنے نظریات پیش کئے ان میں ہابس Hobbes لاک Locke، روسو Rousseau اور اسپنوزا Spinoza قابلِ ذکر ہیں جبکہ آسٹن Austin نے حاکمیت کے نظریہ کو بالکل واضح اور غیر مبہم انداز سے بیان کر کے اسے سائنسی جامہ عطا کیا اور جو کچھ پہلے سوا سو ڈیڑھ سو برس میں حاکمیت کے بارے میں سوچا گیا تھا، وہ یا تو آسٹن کے نظریہ کی تفسیر ہے یا تنقید (شیروانی، ہارون خاں، سیاسیات کے اصول۔ انجمن ترقی ہند۔ علی گڑھ۔ مدینہ پریس بجنور، ۱۹۵۲ء۔ حصہ اوّل، ص ۵۹) (۵) Jones, W.T.,

Masters of Political Thought, Harrap., London, 1960, Vol.II, p. 19.

(۶) رسول اللہؐ سے قبل دوسرے انبیاءؑ نے بھی حاکمیتِ الٰہی کے تصور کی تعلیم دی تھی جیسا کہ متعدد مقامات پر قرآن کے بعض بیانات مثلاً الاعراف (۵۹، ۶۵، ۷۳، ۸۵)، ھود (۵۰، ۶۱، ۸۴) اور المومنون (۲۳، ۳۲) کے

مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔(۷) جدید نظریات کی رُو سے مقتدرِ اعلیٰ کو مطلق العنان Absolute جامع و ہمہ گیر (Universal or all comprehensive)، ناقابلِ انتقال (Inallienable)، مستقل Permanent، ناقابلِ تقسیم (Indivisable) (دیکھئے Gilchrist, p. 10)، طبع زاد (Original) (Ilyas Ahmad, p. 3) اور بلاشرکت غیرے Exclusive or Excessive ہونا چاہیئے۔ (Garner James Wilford, Political Science and Government, The World Press Ltd., Calcutta, 1952, p. 170).

(۸) مودودی، سید ابوالاعلیٰ۔ اسلامی ریاست۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور۔ سنہ ۱۹۶۷ء، ص ۳۱۲ - ۳۱۴ (۹) حاکمیت کے لغوی معنی تعریف، اوصاف، شرائط اور دیگر تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو:

(i) William Little, H.W. Fowler, J. Coulson (edd), The Shorter Oxford English Dictionary, On Historical Principles' The Clarendon Press, London.1965, p. 1954.

(ii) Marsball, G. Sovereignty, A Dictionary of the Social Sciences (edd), Julius Gould, William L. Kolb, The Free Press of Glencoe, New York, 1964, pp. 686, 687.

(iii) Coker, Francis W. Sovereignty, Encyclopaedia of Social Sciences (edd) Seligman, Edwin R.A. Macmillan, New York, 1950, Vol. 13, pp. 268, 269.

(۱۰) شیروانی حصہ اول۔ ص ۵۳ - (۱۱) ایضاً -

(۱۲) اس کا اندازہ صحیح طور پر اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ یورپ میں نظریۂ حاکمیت کی مختصر تاریخ سامنے رہے۔ تاریخی نقطہ نظر سے یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں انتہائی کوششوں کے باوجود کسی قسم کی مرکزیت قائم نہیں ہو سکی تھی اور بجائے اکائی کے دُوئی قائم ہوگئی تھی۔ یعنی شہنشاہ اور پوپ دونوں نے اپنے اپنے دائرہ کے اندر حاکمیت کا دعویٰ کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان دونوں میں ایسی طویل کشمکش شروع ہوئی جو بالآخر سولہویں صدی عیسوی میں پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک مذہبوں کی شکل میں منتج ہوئی۔ پھر ان دونوں مذہبوں کے درمیان جو مناقشے اور لڑائیاں ہوئیں ان کے باعث تمام یورپ گویا ایک بڑا میدانِ جنگ بن گیا اور جرمنی اور فرانس دو دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ چنانچہ اسی صورتِ حال کے لحاظ سے بودین نے اپنا نظریۂ حاکمیت پیش کیا (شیروانی: حصہ اوّل - ص ۵۴) اور حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ کا مظہر شخص واحد کو قرار دیا کیونکہ بودین خود شہنشاہ فرانس (لوئیس یازدہم) کا حامی و ناصر تھا (L.B.SN.P. 100) جو جاگیرداروں اور کلیسا کے اختیارات کو چھین کر تختِ شاہی کے لئے زیادہ سے زیادہ اختیار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ مقتدرِ اعلیٰ نہ تو اپنے پیشروؤں یا جانشینوں کا پابند ہے اور نہ قانون کا پابند۔ کوئی قانون ساز ادارہ جو خود

اس کی آزادانہ مرضی کے تابع ہے۔ مقتدرِ اعلیٰ کو کسی معاملہ میں پابند نہیں بنا سکتا (MARSHALL, P.686) مختصر یہ کہ بودین کا نظریہ تمام تر استبدادیت پر مبنی تھا۔

سترھویں صدی عیسوی میں ہالبس نے استبدادیت کا جو نظریہ پیش کیا اس میں اس نے مقتدرِ اعلیٰ کے لئے بغیر کسی تحدید کے زیادہ سے زیادہ اختیارات کا مطالبہ کیا اور اپنے زمانے کی شخصی حکومت کو معاہدہ عمرانی کے ذریعہ سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نظریہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے نزدیک چونکہ خود مقتدرِ اعلیٰ اس معاہدہ کا فریق نہیں ہوتا اس لئے وہ جس طرح چاہتا ہے اختیاراتِ حکومت استعمال کرتا ہے (GILCHRIST, P.101)

اس کے برعکس جان لاک نے نظریۂ حاکمیت کے سلسلہ میں لفظ حاکمیت (SOVEREIGNTY) سے بچتے ہوئے ایک "بالادست قوت" (SUPREME POWER) کی اصطلاح استعمال کی۔ اس کے نزدیک یہ قوت فردِ واحد کے بجائے ایک مطلق ادارہ قانون سازی کے سپرد ہوگی (LBID, P.101) لاک کے نظریات نے یہ حقیقت بھی واضح کی کہ حاکمیت کو کم از کم جزوی طور پر عوام کے ذریعہ محدود کیا جا سکتا ہے (LBID. P.102)۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ کا مسئلہ تاریخ یورپ میں ہمیشہ ایک نزاعی مسئلہ رہا ہے اور افکارِ سیاسی کے باب میں مسئلہ حاکمیت پر شدید اختلافات ہر زمانے میں رہے ہیں بلکہ ماضی قریب میں اختلافات نے صورتِ حال اس حد تک پہنچا دی ہے کہ اگر ایک گروہ نظریۂ حاکمیت کا علمبردار اور ریاست کے لئے اسے ناگزیر سمجھتا ہے۔ اور جن میں سے چند کا تعارف ہم اوپر کرا چکے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ایک گروہ ان فلاسفر کا بھی ہے جو سرے سے کسی حاکمیت کے ہی قائل نہیں ہیں بلکہ انھوں نے حاکمیت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں فرانس کے مفکر دیوگی (DUGUIT) اور انگلستان کے پروفیسر لاسکی (LASKI) کو نمائندہ حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:

Droit اور Problem of Sovereignty بحوالہ Garner, pp. 200, 201

اور لنڈسے (Lindsay) Constitutional, Vol.I, pp.86,1 نے تو اس وقف پر یہ کہہ کر مہر ثبت کر دی ہے کہ "مقتدر ریاست کا نظریہ اب دم توڑ چکا ہے"

(Ibid., p. 200, "The State in Recent Political Theory", The Political Quarterly, No.1, February, 1914, p. 136).

بلکہ پروفیسر کریب (Krabbe) نے یہ سفارش کی ہے کہ چونکہ اب نظریۂ حاکمیت متمدن دنیا میں تسلیم نہیں کیا جاتا اس لئے نظریاتِ سیاسی سے اسے خارج کر دینا چاہئے (LBID.

"THE MODERN IDEA OF THE STATE" (TRANSLATED BY SBINE بحوالہ P. 20 AND SHEPARD), P.35.

ہمارے اوپر کے بیان میں اگرچہ زیادہ تفصیلات نہیں آسکی ہیں لیکن اس سے یہ اندازہ بہر حال ہو جاتا ہے کہ حاکمیت کے سلسلے میں جتنے بھی نظریات پیش کئے گئے وہ حالات و زمانہ کے تابع تھے اور مجموعی طور پر اس وقت پیش کئے گئے جبکہ

سیاسی اقتدار و اختیار رُو بہ زوال تھا اور ضرورت اس بات کی سمجھی گئی تھی کہ اس کا وقار از سرِ نو بحال کیا جائے۔ (۱۳) قانونی حکمران کے پیچھے ایک انتخابی ادارہ کی قوت ہوتی ہے جو اگرچہ قانونی طور پر اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتا لیکن بہر حال اس کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ یہی انتخابی ادارہ سیاسی مقتدرِ اعلیٰ کو جنم دیتا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: (GARNER, P. 160)۔ (۱۴) انگلستان کے فقیہہ جان آسٹن نے اپنے خطبات قانون (LECTURES ON JURISPRUDENCE) میں مقتدرِ اعلیٰ کی تعریف ایک متعین اور برتر و اعلیٰ انسان کی شخصیت میں کی ہے۔ ایک قانون دان کی حیثیت سے اس کے ذہن میں یقیناً یہ بات تھی کہ عدالت جو حکم نافذ کرتی ہے وہ صرف قانون کو دیکھتی ہے اس سے قطع نظر کہ قانون رائے عامہ کی تائید رکھتا ہے یا نہیں (تفصیل کے لئے: GARNER, PP. 179, 180) آسٹن کے نزدیک حاکمِ اعلیٰ سے برتر کوئی ایسی انسانی ہستی نہیں ہونی چاہیے جس کا حکم وُہ مانتا ہو۔ لیکن اسے کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جو واقعۃً آزاد ہو اور جو کسی دُوسری انسانی ہستی یا انسانی مجموعہ کا کسی نہ کسی طرح تابع نہ ہو یا اس سے اثر نہ لیتا ہو (تفصیل کے لئے: GILCHRIST, PP. 114-116) اس لئے انیسویں صدی کے وسط میں ڈائسی (DICEY) نے قانون اور سیاسی حاکمیت کا نیا نظریہ پیش کیا جس میں اس نے کہا کہ قانونی حاکمیت تو یقیناً اس شخص یا ریاست کو حاصل ہوگی جو قانون بنانے اور اس میں ترمیم کرنے کی اہل ہو لیکن جو اقتدار ان لوگوں کو حاصل ہو جو اس قانونی حاکمِ اعلیٰ پر اثر ڈالتے ہوں تو ایسے اقتدار کو بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے اور جسے سیاسی حاکمیت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ تفصیلات اور بحث کے لئے ملاحظہ ہو (GARNER, P. 160 حاشیہ) (۱۵) ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں عمومی حاکمیت (POPULAR SOVEREIGNTY) کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی لیکن اس کا استعمال بالکل غیر متعین ہے۔ بالعموم یہ انتخابی ادارہ (ELECTORATE) کے بجائے لوگوں کا وہ بڑا غیر منظم گروہ ہے جو اپنی رائے کے اظہار کی کوئی قانونی شکل نہ رکھتا ہو۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: LBID., PP. 164, 165) (۱۶) جب ایک قانونی حکمران اعلیٰ انقلاب یا حملہ کے نتیجہ میں ہٹ جائے تو اس صورت میں وہ شخص یا مجموعہ اشخاص جو اپنی مرضی کو نافذ کر سکے DEFACTO SOVEREIGN کہلائے گا، اور DEJURE SOVEREIGNTY کا قیام عملی قوت (PHYSICAL POWER) کے بجائے قانون کی وجہ سے وجود میں آتا ہے۔ آسٹن دونوں قسم کی حاکمیت کو ماننے سے انکار کرتا ہے (LBID. PP. 167, 168)۔

(۱۷) خارجی حاکمیت (EXTERNAL SOVEREIGNTY) کا مطلب بیرونی ریاستوں کی حاکمیت سے آزادی ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: LBID., PP. 169 و 170)۔ (۱۸) دیکھئے: المائدہ (۴۴)، نیز اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت تسلیم کرنے کی صورت میں قرآن کا لب و لہجہ یہ ہے کہ: یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ (آیت ۶۰) یعنی چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ (۱۹) آیت (۶) مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الفاطر (۱۲)، الانعام (۱۰۲) اور المومن (۶۲)۔ (۲۰) یونس (۳) (۲۱) الاعراف (۵۴)۔ (۲۲) دیکھئے

یونس (۳۱)، السجدہ (۵)۔ (۲۳) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الانعام (۵۷، ۶۲)، یوسف (۴۰، ۶۷)، المومن (۲)، قصص (۷۰)، آل عمران (۱۵۴)، الشوریٰ (۱۰)۔ (۲۴) ملاحظہ ہو: آل عمران (۱۵۴)، الاسراءُ (۱۱۱)، الفرقان (۲)، الکہف (۲۶)، النحل (۱۱۶) اور الرعد (۴۱)۔ (۲۵) النحل (۱۱۶)۔ (۲۶) الفاتحہ (۱)، الانعام (۴۵)۔ (۲۷) الناس (۱)۔ (۲۸) ایضاً (۲)۔ (۲۹) ان خصائص کے لئے ملاحظہ ہو: البقرہ (۲۰، ۱۰۹)، الانعام (۱۷)، النحل (۷۷)، الملک (۱)، الفاطر (۱)، النور (۴۵)، الطلاق (۱۲)، الکہف (۴۵)، الروم (۵۰، ۵۴)، یٰسٓ (۸۳) اور المومن (۶۸) وغیرہ وغیرہ۔ (۳۰) البقرہ (۱۶۵)، الذاریات (۵۸)۔ (۳۱) المومنون (۱۱۶)، طٰہٰ (۱۱۴)، لقمان (۳۰)، الجاثیہ (۳۷)، الحشر (۲۳)۔ (۳۲) الانعام (۱۸، ۶۱، ۱۰۲)، الحشر (۲۳)، العنکبوت (۴۲)، الروم (۲۷)، لقمان (۲۷)، یوسف (۲۱)، الشوریٰ (۳)۔ (۳۳) المائدہ (۱)، ابراہیم (۲۷)، ھود (۱۰۷)، یٰسٓ (۸۳)۔ (۳۴) یوسف (۲۱)۔ (۳۵) دیکھئے: الرعد (۴۱)۔ (۳۶) الفاطر (۴۴)، ابراہیم (۲۷)۔ (۳۷) الانبیاءُ (۲۳)، المومنون (۸۸)۔ (۳۸) السجدہ (۲۲)، الزمر (۳۷)۔ (۳۹) رحمٰن (۲۷، ۷۸)۔

(۴۰) البقرہ (۲۵۵)، آل عمران (۲)، طٰہٰ (۱۱۱)، المومن (۶۵)۔ (۴۱) الزخرف (۸۴، ۸۵)، الجاثیہ (۳۷)، القصص (۷۰، ۸۸)، الانعام (۳)۔ (۴۲) الانبیاء (۲۲)۔ (۴۳) الحشر (۲۳)، الجمعہ (۱)، التغابن (۱)۔ (۴۴) الانعام (۱۱۵)، الکہف (۲۹)۔ (۴۵) الشوریٰ (۱۰)۔ (۴۶) الطلاق (۱۱۲)، الاعلیٰ (۷)، المجادلہ (۶)، الانعام (۱۸، ۷۳)، ھود (۱۲۳)، حٰم السجدہ (۵۴)، ابراہیم (۳۸)، الفجر (۲۵)، النحل (۱۹)، طٰہٰ (۹۸، ۱۱۰)، القصص (۶۹)، العنکبوت (۶۲)، لقمان (۳۴)، المومن (۱۹)۔

(۴۷) حوالے کے لئے ملاحظہ ہو: البقرہ (۱۰۷)، آل عمران (۲۶، ۱۸۹)، المائدہ (۱۷، ۱۸، ۴۰، ۱۲۰)، الاعراف (۱۵۸)، التوبہ (۱۱۶)، النور (۴۲)، الفرقان (۲)، الفاطر (۱۳)، الزمر (۶، ۴۴)، الشوریٰ (۴۹)، الزخرف (۸۵)، الجاثیہ (۲۷)، الفتح (۱۴)، الحدید (۲، ۵)، التغابن (۱)، البروج (۹)۔

(۴۸) الکہف (۴۴)۔ (۴۹) آل عمران (۱۸۰)، الحدید (۱۰)۔ (۵۰) البقرہ (۲۳۷)، آل عمران (۲۶)۔ (۵۱) ایضاً (۵۲) ھود (۴۵)، التین (۸)، ھود (۲۳)، الاعراف (۸۷)، یوسف (۸۰)، یونس (۱۰۹)۔ (۵۳) الشوریٰ (۱۱)۔ (۵۴) خلافت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی نیابت، جانشینی اور قائم مقامی کے ہیں امام راغب اصفہانی کے الفاظ میں یہ نیابت خواہ سابق کی غیر حاضری کی وجہ سے ہو، موت، عزل، عجز سے ہو یا نائب کو محض شرف بخشنے کی صورت میں ہو (راغب - المفردات فی غریب القرآن - مصر - ۱۹۶۱ء، ص ۱۵۶) اسی سے لفظ خلیفہ بنا ہے یعنی نائب وجانشین۔ اصطلاحی طور پر خلافت محض فرمانروائی اور غلبہ و تمکن کا نام نہیں ہے بلکہ یہ حکومت کی ایک شکل ہے جس میں اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے امر شرعی کے مطابق اختیارات کو استعمال کیا جاتا ہے اور اصطلاحی طور پر خلیفہ وہ شخص ہوتا جو کسی اسلامی ریاست میں حکومت کا سربراہ اور اس کے باشندوں کے دینی و دنیاوی

معاملات کا ناظم و نگران ہوتا ہے (مزید تشریح کے لئے: مودودی ۔ اسلامی ریاست ص ۴۹، ۷۱، اور اصلاحی، امین احسن "ریاست کا اسلامی تصور"، الندوۃ العالمیہ للاسلامیات ۔ جامعہ پنجاب، لاہور سنہ ۱۳۷۹ھ، ص ۱۴ تا ۲۰) ۔ یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی مفکرینِ سیاست نے تصورِ خلافت کو امامت سے بھی موسوم کیا ہے ۔ لیکن یہ تصور شیعی تصورِ امامت سے بالکل مختلف ہے ۔ چنانچہ علامہ ابنِ تیمیہ نے اپنی ایک کتاب میں اس مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے (دیکھئے: ابنِ تیمیہ ۔ منہاج السنۃ النبویہ فی نقض کلام الشیعہ القدریہ ۔ مکتبہ دار العروبہ ۔ مطبعۃ المدنی ۔ قاہرہ ۔ سنہ ۱۹۶۲ء خصوصاً ج ۱، ص ۳۴۰)

ہماری بحث کا مدعا یہ ہے کہ رسول اللہؐ کی حیثیت مقتدرِ اعلیٰ کی نہیں بلکہ "خلیفہ کی تھی ۔ چنانچہ اس کی تائید اس امر سے بخوبی ہو جاتی ہے کہ رسول اللہؐ سے پہلے جو انبیاءؑ اور رسل حکومت و سلطنت سے سرفراز کئے گئے وہ سب خلیفۃ اللہ فی الارض تھے ۔ چنانچہ قرآن میں اللہ نے حضرت داؤدؑ کو "خلیفہ" کہہ کر ہی مخاطب کیا (ملاحظہ ہو: ص (۲۶) ۔ پھر یہ کہ ان سے جو کچھ کہا گیا اس سے ایک طرف تو حاکمیتِ الٰہی کا واضح ثبوت ملتا ہے تو دوسری طرف خلافت و نیابت کا یہ اشارہ کرنا برمحل ہوگا کہ رسولؐ اللہ "خلیفۃ اللہ" تھے، اور ان کے جانشین "خلیفہ رسول اللہ"۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے آپ کو کہا تھا (امام احمد بن حنبل ۔ المسند ۔ شرحہ و ضع فہارسہ ۔ احمد محمد شاکر ۔ دار المعارف للطباعۃ والنشر ۔ مصر سنہ ۱۹۴۹ء (ج ۱، حدیث نمبر ۵۹ و ۶۴) ۔

(۵۵) یہ قانونِ قرآن ہے جو حاکمِ حقیقی اور مقتدرِ اعلیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے: الشعراءُ (۱۹۲)، الحاقہ (۴۳)، الواقعہ (۸۰)، السجدہ (۲)، المومن (۲)، الجاثیہ (۲)، الاحقاف (۲) ہے ۔ یہ قانون مکمل ہے: المائدہ (۳)، بلند و برتر ہے، الواقعہ (۷۷) اور تحریری مجموعۂ احکام ہے: البقرہ (۲)، الطور (۲، ۳) ۔ یہ قانون غیر مبدل اور ہر قسم کی کمی بیشی یا تغیر سے محفوظ ہے: القیامتہ (۱۷ تا ۱۹)، الاعلیٰ (۶)، الحجر (۹)، الکہف (۲۷) ۔ اس میں ردّ و بدل کا حق یا اختیار کسی انسان بلکہ کسی پیغمبر کو نہیں ہے: یونس (۱۵) ۔ اس میں نہ تو نبی و رسول کی کسی خواہش کا دخل ہے: النجم (۳، ۴) اور نہ کسی شیطانی قوت کا: النمل (۲۱۰ تا ۲۱۲) ۔ یہ قانون صحت و صداقت کے معیار پر کامل اترتا ہے بلکہ یہ عین صداقت ہے: البقرہ (۲)، السبا (۶)، الحاقہ (۵۱)، الاعراف (۵۲)، الفرقان (۶)، الکہف (۱)، الاسراء (۹)، الواقعہ (۹۵) ۔ اس میں کوئی بات بے سروپا یا گمان و اندازہ پر نہیں ہے: المائدہ (۴۸)، آل عمران (۳)، البقرہ (۲، ۱۷۶) ۔ کسی قسم کا بطلان اس قانون میں موجود نہیں ہے: حٰم السجدہ (۴۲) ۔ اس قانون کی ہر دفعہ صاف و واضح اور روشن ہے: ھود (۱)، البقرہ (۹۹، ۱۸۵)، آل عمران (۸۶)، المائدہ (۱۵، ۳۲)، النور (۱، ۳۴)، یوسف (۱)، الحجر (۱)، الشعراء (۲)، النمل (۱)، یٰسٓ (۶۹)، النساء (۱۷۴)، النحل (۸۹) ۔ یہ قانون کائنات کے خالق و مالک اور حاکم و فرمانروا کی طرف سے بصورت محکم نازل ہوا ہے: آل عمران (۷)، ھود (۱۱)، اور اس کی طرف سے رہتی دنیا تک اس کی حفاظت کی ضمانت

دی گئی ہے: الحجر (۹)۔ یہی وہ اساسی قانون ہے جو خلافت وحکومت کی روح ہے اور جس سے حاکمیتِ الٰہی کے قوانینؔ ضوابط کا صاف اظہار ہوتا ہے۔ انسانیتِ عامہ کی صحیح رہنمائی: البقرہ (۱۸۵)، الزمر (۴۱)۔ انسانی زندگی کے اجتماعی نظم وضبط کا انصاف پہ قیام: الحدید (۲۵)۔ معاشرہ کی قانونی شیرازہ بندی اور اختلافات کو مٹانا: البقرہ (۲۱۳)، الشوریٰ (۱۰)۔ اس میں زندگی کے ہر اجتماعی رجحان کے لئے ایک قابلِ عمل ضابطہ موجود ہے: البقرہ (۲۱۳)، النساء (۱۰۵)، ابراہیم (۱)۔ یہ قانون پچھلے تمام سچے اور الہامی قوانین کا محافظ وجامع ہے: المائدہ (۴۸)، الانعام (۳۸) اور جو کچھ بھی اس قانون کے خلاف ہے وہ ہرگز قابلِ اتباع نہیں ہے: الاعراف (۳)۔ اس قانون کی رُو سے مقتدرِ اعلیٰ نے دراصل قانونِ اسلامی کی تمام اساسی دفعات کو طے کر دیا ہے۔ (۵۶) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الجن (۲۰)، النحل (۳۶)، الانبیاءؑ (۲۵، ۱۰۸) وغیرہ (۵۷) دیکھئے: التوبہ (۳۲)، الفتح (۲۸)، الصف (۹)، الحدید (۲۵)۔ (۵۸) کتابِ مقدس یعنی پرانا اور نیا عہد نامہ۔ پاکستان بائبل سوسائٹی۔ لاہور۔ سنہ ۱۹۵۹ء۔ نیا عہد نامہ، ص ۹ (متی ب ۶: ۱۰)۔ (۵۹) البقرہ (۱۲۷، ۱۲۹، ۱۵۱) آلِ عمران (۱۶۴)، الجمعہ (۲)۔ (۶۰) الاحزاب (۲۱)، آلِ عمران (۳۱، ۳۲)۔ (۶۱) النحل (۴۴، ۶۴)۔

(۶۲) النساء (۵۹، ۱۰۵)، الشوریٰ (۱۵)۔ (۶۳) النساء (۱۰۵)۔ (۶۴) النحل (۶۴)، النساء (۶۵)۔ سورۂ نساء کی اس آیت کے سببِ نزول میں محدثین نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ زبیر بن العوام کا کسی شخص سے جھگڑا ہو گیا۔ یہ مقدمہ رسولؐ اللہ کے سامنے پیش ہُوا تو رسولؐ اللہ نے زبیر کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس پر اس شخص نے رسولؐ اللہ سے کہا کہ انھوں نے زبیر کے حق میں اس لئے فیصلہ دے دیا ہے کہ وہ ان کا رشتہ کا بھائی ہے۔ اس موقع پہ مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ ملاحظہ ہو: الحمیدی۔ ابی بکر عبداللہ بن الزبیر۔ المسند۔ تحقیق۔ حبیب الرحمٰن الاعظمی۔ المجلس العلمی۔ کراچی سنہ ۱۹۶۳ء، ج ۲، ص ۱۴۴ (حدیث نمبر ۳۰۰)، نیز امام احمد، ج ۳، ص ۱۳، ۱۴ (حدیث نمبر ۱۴۱۹)۔ (۶۵) الاعراف (۱۵۷)، الحشر (۷)۔ (۶۶) الانعام (۱۱۴، ۱۱۶)، یونس (۱۰۹)، الاحقاف (۹)، المومن (۶۶)، الشوریٰ (۱۰)، الزخرف (۴۳)۔ (۶۷) دیکھئے آیات ۱ تا ۳، مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: البخاری ج ۲ ص ۲۹، کتاب التفسیر۔ نیز دیکھئے ص ۹۹۰ کتاب الایمان والنذور۔ (۶۸) اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ قرآن نے ازواجِ نبوی کو برے اور اچھے کاموں پر عام عورتوں کے مقابلہ میں بالترتیب دوہرے عذاب اور دوہرے اجر کی بشارت سنائی ہے۔ ملاحظہ ہو: الاحزاب (۳۰، ۳۱)۔ (۶۹) الانعام (۱۴)۔ (۷۰) النحل (۹۱، ۹۲)۔ مزید یونس (۱۰۴)۔ (۷۱) ملاحظہ ہو: المائدہ (۴۴، ۴۵، ۴۷)۔ (۷۲) الاعراف (۱۴۳)، الانعام (۱۶۳)۔ (۷۳) اس کا تاریخی ثبوت بروایت ابنِ سعد یہ ہے کہ مرضِ وفات میں رسولؐ اللہ فضل بن عباس کے سہارے مسجد نبوی میں داخل ہوئے اور اللہ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا: "تم میں سے بعض کے حقوق مجھ سے وابستہ تھے۔ میں بھی ایک بشر ہُوں اس لئے جس شخص کی آبرو کو میں نے کچھ نقصان پہنچایا ہو تو یہ میری آبرو موجود ہے اسے بدلہ لے لینا چاہیئے، جس شخص کے جسم کو میں نے کچھ تکلیف دی ہے تو یہ میرا جسم موجود ہے اسے بدلہ لے لینا چاہیئے۔ جس شخص کے مال کو میں نے کچھ نقصان پہنچایا ہو تو یہ میرا مال موجود ہے اُسے لے لینا چاہئے۔

جان لو کہ تم میں سب سے زیادہ مجھ سے محبت کرنے والا وہ شخص ہوگا کہ ان حقوق میں سے اس کا کوئی حق ہو اور وہ اسے لے لے یا مجھے بری کر دے تاکہ میں اپنے رب سے اس حالت میں ملوں کہ میں اپنے کو بری کر چکا ہوں۔ کوئی شخص ہرگز یہ نہ کہے کہ مجھے انتقام لینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت و بغض کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں میری طبیعت میں نہیں ہیں۔ جس شخص کا نفس کسی بری بات میں اس پر غالب آگیا تو اسے بھی مجھ سے مدد لینا چاہیئے کہ میں اس کے لئے دعا کروں گا" (ابن سعد ج ۲ ص ۲۵۵) ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ "آپ کے پاس ایک سائل آیا تھا آپ نے مجھے حکم دیا تھا تو میں نے اسے تین درہم دے دیئے تھے۔ فرمایا: سچ ہے اے فضل ان کو درہم دے دو۔" (ایضاً) ابن اثیر کے بیان کے مطابق ان باتوں کے علاوہ رسول اللہ نے یہ بھی کہا تھا کہ "جس کسی کی پشت پر میں نے کوڑا مارا ہو تو میری پشت حاضر ہے وہ آئے اور بدلہ لے لے۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: ابن اثیر (ج ۲ ص ۳۱۹)۔ اسی طرح ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ تقسیم فرما رہے تھے اتنے میں سامنے سے ایک شخص آکر آپ کے اوپر گر گیا۔ رسول اللہ کے دستِ مبارک میں چھڑی تھی۔ اس چھڑی سے آپ نے اسے ٹھوکا دیا۔ اتفاق سے چھڑی کا سرا اس کے منہ پر لگا اور خراش آگئی۔ آپ نے اس سے فرمایا: آؤ مجھ سے بدلہ (قصاص) لے لو۔ اس نے عرض کیا: نہیں یا رسول اللہ! میں نے معاف کر دیا ہے (ابوداؤد۔ سلیمان بن اشعث۔ سنن۔ اصح المطابع۔ کراچی ۱۳۶۹ھ، ج ۲، ص ۲۶۴ کتاب الدیات)۔ (۷۴) ابو یوسف۔ قاضی۔ یعقوب بن ابراہیم۔ کتاب الخراج۔ المطبعۃ السلفیہ و مکتبہا۔ قاہرہ ۱۳۵۲ھ، ص ۱۱۵۔ (۷۵) الممتحنہ (۱۲) (۷۶) البخاری: ج ۲، ص ۱۰۵۰۔ کتاب الاحکام۔

(۷۷) ایضاً ج ۲ ص ۱۰۵۷ کتاب الاحکام۔ (۷۸) امام ابوبکر جصاص نے آیت وشاورهم فی الامر کے تحت کہا ہے کہ ولابد من ان تکون مشاورۃ النبی ایام فیما لا نص فیه اذ غیر جائز ان یشاورهم فی المنصوصات ۔ ۔ ۔ ۔ الخ دیکھئے (جصاص۔ ابوبکر۔ احکام القرآن۔ مطبعۃ البہیۃ مصر ۱۳۴۷ھ۔ ج ۲، ص ۵۰)۔ (۷۹) النساء (۸۰)۔ (۸۰) ملاحظہ ہو النساء (۱۳، ۵۹، ۶۴، ۶۹)، النور (۵۲، ۵۴)، الاحزاب (۲۲، ۷۱)، الفتح (۱۷)، التوبہ (۷۱)، آل عمران (۳۲، ۱۳۲)، المائدہ (۹۲)، الانفال (۱، ۲۰، ۴۶)، محمد (۳۳)، المجادلہ (۱۳)، التغابن (۱۲، ۱۶)۔

(۸۱) دیکھئے: الشوریٰ (۱۰)، البقرہ (۲۱۳)، النحل (۶۴)، النساء (۵۹، ۶۰، ۶۵)۔ (۸۲) الحشر (۷)۔ (۸۳) مثلاً دیکھئے: التوبہ (۴۳)، عبس (۱ تا ۱۰)۔ (۸۴) الشوریٰ (۱۵)۔ (۸۵) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ابن ہشام ج ۳ ص ۳۲۱۔ (۸۶) تفصیل کے لئے دیکھئے: ابن ہشام ج ۴ ص ۱۴۲۔ (۸۷) ابن ہشام: ج ۲، ص ۲۷۲۔ مزید حوالے کے لئے دیکھئے: ابن عربی۔ احکام القرآن۔ دار احیاء الکتب العربیہ۔ مصر ۱۹۵۷ء۔ ج ۱، ص ۲۹۹۔ (۸۸) آل عمران (۱۵۹)۔ (۸۹) الشوریٰ (۳۸)۔ (۹۰) النحل (۲۹ تا ۳۵)۔ (۹۱) پانی پتی، محمد ثناء اللہ، قاضی، تفسیر المظہری۔ مجلس اشاعۃ العلوم۔ دکن۔ ج ۲، ص ۱۶۱۔ بحوالہ بغوی۔ (۹۲) الترمذی۔ ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ۔ جامع۔ امین کمپنی۔ دہلی۔ ۱۳۷۷ھ۔ ج ۱، ص ۲۰۴۔ ابواب فضائل الجہاد۔ (۹۳) ابن ہشام ج ۲، ص ۱۵۴ تا ۱۵۶۔ (۹۴) ایضاً، ص ۲۶۷۔ نیز دیکھئے: ابن کثیر التفسیر، ج ۲، ص ۱۴۲۔ (۹۵) طبری ج ۲ ص ۴۷۶۔ (۹۶) ابن ہشام

ج ۳، ص ۶۷، ۶۸۔ (۹۷) طبری، ج ۲، ص ۵۶۶۔ مزید شوریٰ یہ بھی ہوا کہ جب رسول اللہؐ نے مدینہ کی ⅓ کھجوروں پر اتحادیوں سے مصالحت کا ارادہ کیا تو سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ نے مخالفت کی۔ چنانچہ اس تجویز کو رسول اللہؐ نے ترک کر دیا (ابن کثیر، تفسیر، ج ۲، ص ۱۴۲)۔ (۹۸) ابن ہشام، ج ۳، ص ۳۱۲، ۳۱۳۔ (۹۹) ابو یوسف: ص ۲۰۸، نیز البخاری: ج ۲ ص ۶۰۰ (کتاب المغازی)۔ (۱۰۰) طبری ج ۳ ص ۸۶، ۸۷۔ (۱۰۱) غازی، حامد الانصاری۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ ندوۃ المصنفین۔ دہلی۔ ۱۹۴۳ء، ص ۴۲۸۔ (۱۰۲) آل عمران (۱۵۹)۔ (۱۰۳) ابن کثیر۔ تفسیر۔ ج ۲۔ ص ۱۴۳۔ (۱۰۴) جصاص، ج ۲، ص ۲۵۰۔ شوریٰ کے سلسلہ میں مزید ملاحظہ ہو: راغب الاصفہانی۔ الذریعۃ الیٰ مکارم الشریعۃ۔ المطبعۃ الحیدریہ۔ نجف۔ ۱۹۶۷ء۔ ص ۱۶۳، ۱۶۴۔ (۱۰۵) الخطیب العمری۔ ص ۳۲۰۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے لیکن الفاظ کا معمولی سا فرق ہے۔ چنانچہ بخاری کے الفاظ یہ ہیں: انا لا نولی ھذا من سالہ ولا من حرص علیہ (ج ۲ ص ۱۰۵۸ کتاب الاحکام)۔ (۱۰۶) ابو داؤد۔ ج ۲ ص ۴۰۶ کتاب الخراج والفئ والامارہ۔ (۱۰۷) البخاری۔ ج ۲ ص ۱۰۵۸ کتاب الایمان والنذور۔ (۱۰۸) ابو یوسف: ص ۹۔ نیز دیکھئے: الخطیب العمری، ص ۳۲۰۔ (۱۰۹) النساء (۵۸)۔ (۱۱۰) ابن تیمیہ۔ السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ۔ مکتبہ انصار السنۃ المحمدیہ۔ مطبعہ دار الجہاد۔ قاہرہ۔ ۱۹۶۱ء۔ ص ۱۰۔ (۱۱۱) ایضاً، ص ۱۰۔ (۱۱۲) الانفال (۲۷)۔ (۱۱۳) الحجرات (۱۳)۔ (۱۱۴) معقل بن یسار سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کا راعی (حاکم) بنایا اور وہ اس حال میں مرا کہ اس نے لوگوں کی بدخواہی کی ہے تو اللہ اس پر جنت حرام کر دے گا (الخطیب العمری، ص ۳۲) ان ہی سے دوسری روایت یہ ہے "جو شخص مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار بنایا جائے پھر نہ تو وہ ان کے لئے کوشش کرے اور نہ ان کی خیر خواہی کرے تو وہ جنت کی خوشبو تک نہ پا سکے گا (ایضاً) (۱۱۵) تفصیلات کے مطابق ان حضرات میں سب سے زیادہ شرفِ نیابت حضرت ابن ام مکتوم کو حاصل ہوا۔ رسول اللہؐ نے انہیں غزوۂ بدر عظمیٰ (ابنِ ہشام: ج ۲، ص ۲۶۳)، غزوۂ نجران (ایضاً ص ۵۰)، غزوۂ اُحد (ایضاً ج ۳، ص ۶۸)، غزوۂ خندق (ایضاً ص ۲۳۱)، غزوۂ بنی قریظہ (ایضاً ص ۲۴۵)، غزوہ بنی لحیان (ایضاً ص ۲۹۲) اور غزوہ ذی قرد (ایضاً ص ۲۹۷) کے مواقع پر مدینہ سے روانگی اور دار الحکومت سے عدم موجودگی کی صورت میں متعین فرمایا تھا۔ مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: ابنِ ہشام، ج ۲ (ص ۲۴۸، ۲۵۱ اور ۲۶۳) ج ۳ (ص ۴۶، ۴۸، ۴۹، ۵۲، ۲۲۰، ۲۲۴، ۳۰۲، ۳۲۱، ۳۴۲) ج ۴ (ص ۱۲، ۴۲، ۱۶۳، ۲۴۸) وغیرہ۔ یہاں یہ وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ رسول اللہؐ نے سب سے پہلے حضرت سعد بن عبادہ کو اپنا قائم مقام اس وقت مقرر فرمایا جبکہ آپ صفر ۲ھ میں غزوۂ ودان یا ابواء کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ ملاحظہ ہو: ابنِ سعد، طبقات، ج ۲ ص ۸۔ (۱۱۶) دیکھئے: ابن ہشام ج ۳ ص ۳۲۱ اور ج ۴ ص ۱۲ و ۲۴۸۔ (۱۱۷) اصحابِ سیر میں سے متقدمین نے اکثر مشہور و معروف کاتبانِ وحی کے ذکر پر اکتفا کیا ہے جبکہ ابن سید الناس نے اپنی کتاب عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر میں ان حضرات کی مکمل فہرست قلمبند کر دی ہے۔

طوالت کے خوف سے ہم بھی ناموں کی تفصیل حذف کرتے ہیں۔ حوالے کے لئے ملاحظہ ہو (ج ۲ ص ۳۱۵ تا ۳۱۷) مورخین کی تصریحات کے مطابق قریش میں سے سب سے پہلے حضرت عبداللہ بن ابی السرح العامری نے کتابتِ وحی کی خدمت انجام دی، جبکہ مدینہ میں سب سے پہلے حضرت ابی بن کعب کو یہ شرف حاصل ہوا (الحلبی۔ علی بن برہان الدین۔ السیرۃ الحلبیہ۔ التجاریہ۔ قاہرہ۔ ۱۹۶۲ء، ج ۳، ص ۳۶۴۔ مزید حوالے کے لئے دیکھئے: زرقانی، ج ۳ ص ۳۲۶)۔ (۱۱۸) حضرت عبداللہ بن مسعود اس خدمت پر مامور تھے۔ وُہ آپ کی مسواک، جوتوں اور لباس کی دیکھ بھال کرتے تھے اور آپ کے آگے عصا لے کر چلتے تھے۔ الحلبی۔ ج ۳ ص ۳۶۲۔ (۱۱۹) اس کے منتظم عقبہ بن عامر تھے (ایضاً ص ۳۶۳)۔ (۱۲۰) منتظم سواری اسقع بن شریک تھے (ایضاً)۔ (۱۲۱) حضرت حذیفہ بن الیمان "صاحب السر" کی حیثیت سے مشہور تھے (ابن عبدالبر۔ ج ۱۔ ص ۱۰۴) صاحب السر کی توجیہہ قدیم مآخذ میں نہیں ملتی۔ البتہ خطیب نے بیان کیا ہے کہ "الذی لم لکن یعلمہ غیرہ (الخطیب البغدادی۔ تاریخ بغداد او مدینۃ السلام۔ دارالکتاب العربی۔ بیروت۔ ج ۱۔ ص ۱۶۲) اس کی مزید صراحت کے لئے دیکھئے: کتانی (ج ۱ ص ۲۰) یہاں یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ زرقانی نے حضرت عثمان کے بارے میں وضاحت کی ہے کہ وُہ رسول اللہؐ کے "کاتب الستر" تھے۔ یعنی ان امور کے لکھنے پر مامور تھے جن کو لوگوں سے مخفی رکھنا چاہتے تھے (زرقانی ج ۳ ص ۳۱۶)۔ (۱۲۲) ابن عبدالبر، ج ۱، ص ۱۰۵۔ مزید حوالے کے لئے: ابنِ حجر العسقلانی۔ احمد بن علی بن محمد۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ۔ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ۔ مصر۔ ۱۹۳۹ء، ج ۱، ص ۳۵۹۔ (۱۲۳) الصعیدی ص ۲۳۶۔ (۱۲۴) مسعودی، ابی الحسن علی بن الحسین۔ التنبیہ والاشراف۔ مکتبۃ المثنیٰ۔ بغداد۔ ۱۹۳۸ء۔ ص ۲۴۶۔ (۱۲۵) ابن عبدالبر۔ ج ۱۔ ص ۱۰۵۔ نیز دیکھئے: النووی۔ تہذیب الاسمأ واللغات۔ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ۔ مصر (ج ۲ ص ۱۰۸)۔ اس منصب پر حنظلہ بن الربیع فائز تھے۔ بعض اوقات جب مہر موجود نہ ہوتی تو رسول اللہؐ اپنے ناخن سے ہی مہر لگا دیا کرتے تھے (کتانی۔ ج ۱۔ ص ۱۷۹)۔ (۱۲۶) طبری۔ ج ۳۔ ص ۱۷۱۔ یہ فرائض رسول اللہؐ کے ایک مولیٰ انسہ کے ذمہ تھے۔ ابنِ سعد کی تصریح کے مطابق رسول اللہؐ بعد ظہر اپنے پاس آنے کی عام اجازت دیتے تھے اور یہی سنّت ہے (ابن سعد، ج ۳، ص ۴۹)۔ (۱۲۷) مسعودی، ص ۲۴۵ و ۲۴۶۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت معاویہ اور زید بن ثابت بطورِ خاص کتابت کے لئے رکھے گئے تھے۔ جو رسول اللہؐ کے سامنے وحی اور دیگر اشیاء کو تحریر کرتے تھے اور اس کے علاوہ انھیں کوئی کام یا مشغولیت نہ تھی۔ دیکھئے: ابنِ حزم (جوامع السیرۃ) ص ۲۷۔ نیز الحلبی ج ۳ ص ۳۶۴۔ (۱۲۸) الحلبی، ج ۳، ص ۳۶۵۔ (اس کے افسر حضرت بلال تھے) (۱۲۹) ایضاً۔ (حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور ابو اسید بن الساعدی اس خدمت کو انجام دیتے تھے)۔ (۱۳۰) ابن سید الناس، ج ۲، ص ۳۱۷ (حضرت علی، زبیر، مقداد، محمد بن مسلمہ اور عاصم بن ثابت بارگاہِ رسالت کے جلّاد تھے)۔ (۱۳۱) ایضاً۔ ص ۳۱۶، ۳۱۷ (افسران یہ تھے: سعد بن معاذ، محمد بن مسلمہ، زبیر بن العوام، ابو ایوب الانصاری)۔ (۱۳۲) کتانی۔ ج ۱۔ ص ۲۹۰، ۲۹۱۔ (۱۳۳) رسول اللہؐ نے مردم شماری بھی کرائی تھی۔ دیکھئے: البخاری، ج ۱، ص ۴۳۰۔ کتاب الجہاد۔ (۱۳۴) مثلاً جب عمرو بن حزم کو یمن کا گورنر بنا کر

بھیجا گیا تو ان کو تحریری ہدایت نامہ (INSTRUMENT OF INSTRUCTIONS) بھی دیا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو: ابنِ ہشام، ج ۴ ص ۱۴۲ - نیز طبری ج ۲ ص ۱۲۸، ۱۲۹۔ (۱۳۵) بقول مسعودی ان امور کے نگران اور اس شعبہ کے سکریٹری حضرت عبداللہ بن ارقم تھے۔ مسعودی، ص ۲۴۵۔ (۱۳۶) مسعودی۔ ص ۲۴۵، ۲۴۶۔ اور دیکھئے کتانی: ج ۱، ص ۱۲۰ و ۱۲۴۔ (۱۳۷) خدمت حضرت معاویہ کے سپرد تھی۔ ملاحظہ ہو: زرقانی، ج ۳، ص ۳۲۲۔ نیز دیکھئے: کتانی ج ۱ ص ۱۲۱۔ (۱۳۸) مثلاً تبوک کے موقع پر ایک وفد آیا۔ مالک بن احمر نے اسلام قبول کیا اور ایک تحریر کی درخواست کی۔ چنانچہ چمڑے کے ایک ٹکڑے پر لکھ کر دے دی گئی۔ (کتانی: ج ۱ ص ۱۲۲)۔ (۱۳۹) کتانی: ص ۱۲۳۔ (۱۴۰) ایضاً۔ ص ۱۲۴۔ (۱۴۱) الحج (۴۱)۔ (۱۴۲) التوبہ (۱۲۳)۔ (۱۴۳) البخاری۔ ج ۲۔ ص ۱۰۶۴ اور ۱۰۶۸ وغیرہ۔ کتانی نے بھی اس واقعہ کو محاسبہ کے تحت ہی نقل کیا ہے۔ دیکھئے (ج ۱ ص ۲۳۷)۔ (۱۴۴) البخاری۔ ج ۲۔ ص ۱۰۶۳۔ کتاب الاحکام۔ (۱۴۵) الترمذی۔ ج ۱۔ ص ۱۵۹۔ (ابواب الاحکام) ابن عبدالبر، ج ۱، ص ۲۳۸۔ (تذکرہ معاذ بن جبل)۔ (۱۴۶) ہم پہلے بھی عمرو بن حزم کے سلسلہ میں رسولؐ اللہ کے تحریری فرمان کا ذکر کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو: حوالہ سابق نمبر ۱۲۴۔ (۱۴۷) اس کی تصریح تاریخ کے اہم ماخذ میں ہمیں نہیں مل سکی البتہ ڈاکٹر حمیداللہ صاحب کے ایک مضمون میں ان باتوں کی تفصیل ہے مگر حوالہ مذکور نہیں۔ ملاحظہ ہو: DR. HAMIDULLAH, THE GOVERMENT OF THE HOLY PROPHET, II THE ISLAMIC REVIEW WOKING, ENGLAND, JUNE 1942, NO.6, VOL.XXX, P.282. (۱۴۸) رسولؐ اللہ کا ارشاد ہے کہ التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشہداء (الدارمی، ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن۔ سنن۔ مطبع النظام۔ کانپور، ۱۲۹۳ھ ص ۳۳۸) مزید ملاحظہ ہو: ابن ماجہ۔ القزوینی۔ محمد بن یزید ابی عبداللہ۔ سنن المصطفیٰ (ومعہ حاشیہ السندی) المطبعۃ التازیہ۔ مصر۔ ج ۲۔ ص ۲ (ابواب التجارت)۔ (۱۴۹) احادیث میں بڑی تفصیل سے یہ تمام ہدایات مذکور ہیں۔ طوالت کے خوف سے ہم یہاں نقل کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ البتہ بطور مثال ملاحظہ ہو: البخاری، ج ۱ ص ۲۷۸ تا ۲۸۰ (کتاب البیوع) اور ص ۳۶۷ (کتاب الشہادات)۔ مسلم بن الحجاج بن مسلم القشیری۔ الصحیح۔ اصح المطابع۔ دہلی۔ ۱۳۴۹ھ، ج ۱ ص ۷۰ (کتاب الایمان) ابو داؤد، ج ۲ ص ۵۰۷ اور الخطیب العمری، ص ۱۷ وغیرہ وغیرہ۔ (۱۵۰) مسلم۔ ج ۱۔ ص ۷۰ (کتاب الایمان)۔ (۱۵۱) قرآن کے حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو: الانعام (۱۵۲)، الاعراف (۸۵)، ھود (۸۴، ۸۵)، الاسراء (۳۵)، الشعراء (۱۸۱)، الرحمٰن (۸، ۹)، المطففین (۱ تا ۳) اور حدیث کے حوالے کے لئے دیکھئے: البخاری ج ۱، ص ۲۸۵، ۲۸۶ (کتاب البیوع)۔ (۱۵۲) دیکھئے: کتانی ج ۱ ص ۲۸۴۔ (۱۵۳) چنانچہ بعد فتح سوق مکہ کے نگران سعد بن سعید بن العاص اور سوق مدینہ کے نگران و محتسب عمر بن الخطاب تھے (الحلبی ج ۳ ص ۳۶۵)۔ (۱۵۴) کتانی نے سمراء بنت نہیک الاسدیہ کے بارے میں اسی طرح کا احوال لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو: ج ۱ ص ۲۸۵۔ (۱۵۵) یہ افسر حضرت بلال تھے

(ابنِ حزم ص ۲۰)۔ اس منصب پر حضرت بلال رسول اللہؐ کے وصال مبارک تک فائز رہے (ابوداؤد، ج ۲ ص ۴۳۳، کتاب الخراج والفئے والامارہ)۔ (۱۵۶) کتانی نے لکھا ہے کہ "ان النبی اذا قدم علیہ الوفد لبس احسن ثیابہ وامر اصحابہ بذالک مزابتہ وفد علیہ وفد کندہ وعلیہ حلّۃ یمانیہ وعلی ابی بکر وعمر مثلہ (ج ۱ ص ۴۵۲)۔

(۱۵۷) مثلاً وفد طائف کو مسجد نبوی میں اتارا گیا تھا (شبلی ج ۲ ص ۶۴) نیز وفد نجران کو بھی مسجد نبوی ہی میں ٹھہرایا گیا تھا (ابنِ قیم: زاد المعاد، ج ۳، ص ۳۸)۔ (۱۵۸) وفد ثقیف کے آنے پر ایسا ہی ہوا۔ تفصیل ملاحظہ ہو: کتانی ج ۱، ص ۴۴۸۔ (۱۵۹) کتانی، ج ۱، ص ۴۵۱۔ (۱۶۰) البخاری ج ۱ ص ۴۹۴ (کتاب الجہاد) مزید حوالے کے لئے دیکھئے: ابوداؤد، ج ۲، ص ۴۲۹ (کتاب الخراج والفئے)، اور کتانی ج ۱ ص ۴۵۱۔ (۱۶۱) ابوداؤد ج ۲ ص ۴۳۳ (کتاب الخراج والفئے)۔ (۱۶۲) ایضاً ص ۴۴۳۔ (۱۶۳) بلاذری (فتوح) ص ۶۶۔ (۱۶۴) ایضاً۔ (۱۶۵) البخاری ج ۲ ص ۸۴۳ (کتاب المرضیٰ)، نیز الخطیب العمری ص ۱۳۳۔ (۱۶۶) البخاری ج ۲ ص ۸۴۴، ۸۴۶ (کتاب المرضیٰ)۔ (۱۶۷) ایضاً ص ۸۴۵ (کتاب المرضیٰ)۔ (۱۶۸) ایضاً ص ۸۴۴ (کتاب المرضیٰ) خصوصاً ملاحظہ ہو: باب عیادۃ الصبیان، باب عیادۃ الاعراب اور باب عیادۃ المشرک)۔ (۱۶۹) احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے مسلمانوں کو بھی ان باتوں کے اختیار کرنے کا بطور معمول روزمرہ حکم دیا تھا۔ مثلاً دیکھئے: البخاری (ج ۱ ص ۳۳۱، ابواب المظالم والقصاص) اور متعدد احادیث میں ان باتوں کو ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر حقوق میں شمار کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو: الخطیب العمری (ص ۱۳۳، باب عیادۃ المریض وثواب المریض)۔ (۱۷۰) ایک حدیث میں رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ الخلق عیال اللّٰہ فاحب الخلق الی اللّٰہ من احسن الی عیالہ (ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے تو مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ کو محبوب وہ ہے جو اللہ کی عیال سے اچھا سلوک کرتا ہے)۔ ملاحظہ ہو: الخطیب العمری ص ۴۲۵ (باب الشفقۃ والرحمۃ)۔

(۱۷۱) محدثین اور اصحابِ سیر نے یہ صراحت سے بیان کیا ہے کہ عہدِ رسالت میں قیس بن سعد بن عبادہ "صاحب الشرطہ" کی حیثیت رکھتے تھے۔ دیکھئے: الخطیب العمری ص ۳۲۱ (کتاب الامارہ والقضاء) نیز کتانی ج ۱ ص ۱۴۔ (۱۷۲) امام بخاری نے لکھا ہے: ولقد فزع اھل المدینہ ذات لیلہ فانطلق الناس قبل الصوت فاستقبلھم النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد سبق النّاس الی الصوت وھو یقول لم تراعوا لم تراعوا۔ وھو علی فرس لابی طلحہ عری ما علیہ سرج وفی عنقہ سیف فقال لقد وجد تہ بحراً او انہ لبحر (البخاری ج ۲ ص ۸۹۱ کتاب الادب) (۱۷۳) کتانی ج ۱ ص ۲۹۲، ۲۹۳۔ (۱۷۴) الحجرات (۱۲)۔ (۱۷۵) کتانی ج ۱ ص ۳۶۱۔ (۱۷۶) مثالوں کے لئے: ایضاً ص ۳۶۱، ۳۶۲۔ (۱۷۷) ایضاً ص ۳۶۳۔ (۱۷۸) ایضاً ص ۳۰۰۔ (۱۷۹) ایضاً ص ۲۹۵۔ (۱۸۰) ایضاً۔ (۱۸۱) ایضاً ص ۲۹۵ اور ۳۰۰۔ (۱۸۲) ایضاً ص ۲۹۵۔ (۱۸۳) ایضاً ص ۳۱۲، ۳۱۳۔ (۱۸۴) ایضاً، ص ۳۱۳۔ (۱۸۵) عبداللہ بن ارقم کا نام پہلے عبد یغوث تھا۔ فتح مکہ کے دن ایمان لائے۔ رسول اللہ کے لئے ملوک و امرا اور دوسرے لوگوں کو خطوط لکھنے پر مامور ہوئے۔ اس سلسلے میں ان کی امانت اس درجہ قابلِ اعتماد تھی کہ رسول اللہ کے حکم سے

خط کا جواب لکھ کر اس پر مُہر ثبت کر کے روانہ کر دیتے تھے اور رسول ؐ اللہ ان کے جواب کو سننے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ اسی لئے آپ نے یہ صداقت نامہ حضرت عبداللہ کو دے دیا تھا کہ" اصبت بما کتبت (تم نے جو کچھ لکھا ٹھیک تھا) رسول ؐ اللہ کے بعد حضرت ابوبکر کے دور میں بھی عبداللہ بن ارقم اسی منصب پر فائز رہے۔ پھر حضرت عمر نے اپنے دورِ خلافت میں ان کو بیت المال کا نگران بنایا۔ پھر حضرت عثمان نے بھی انھیں اسی عہدہ پر برقرار رکھا لیکن بعد میں مستعفی ہو گئے۔ حضرت عثمان نے خدمات کے صلہ میں ان کو تیس ہزار کی رقم پیش کی تو عبداللہ بن ارقم نے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ" میں نے تو اللہ کی رضا کی خاطر یہ خدمت انجام دی تھی"۔ ایک روایت کے مطابق ان کا انتقال حضرت عثمان کے دور میں ہوا (زرقانی ج ۳ ص ۳۱۹) - (۱۸۶) ابن عبدالبر - ج ۱، ص ۳۳۶ - نیز زرقانی ج ۳ ص ۳۱۹ - (۱۸۷) حضرت زید بن ثابت کا پُورا نام و نسب یہ ہے: زید بن ثابت بن الضحاک بن زید بن لوذان بن عمرو بن عبد عوف بن غنم بن مالک بن النجار الانصاری الخزرجی النجاری (زرقانی ج ۳ ص ۳۳۲) ان کی کنیت ابوسعید یا ابو عبدالرحمٰن اور لقب کاتب الوحی و المصحف تھا (نووی ج ۱ ص ۲۰۰)۔

حضرت زید نے حضرت مصعب بن عمیر کی دعوت پر اسلام قبول کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۱ برس تھی اور اسی زمانے میں رسول اللہ بھی مکہ سے مدینہ تشریف لائے تھے۔ انتہائی صغر سنی سے ہی اسلام، قرآن اور کتابت سے انتہائی شغف رکھتے تھے اور ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھتے ہُوئے ہی رسول ؐ اللہ نے ان سے لکھنے پڑھنے میں مزید مہارت پیدا کرنے کو کہا تھا۔ غالباً سب سے پہلے غزوۂ احزاب میں شرکت کی جبکہ ان کی عمر ۱۶ برس کی تھی (ابن حجر العسقلانی، ج ۱، ص ۵۴۳) پھر اس کے بعد تمام غزوات میں شریک رہے۔

اسلام کے لئے حضرت زید کی خدمات کی فہرست طویل ہے لیکن ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ (جیسا کہ ان کے لقب سے بھی ظاہر ہے) ممتاز کاتبِ وحی بلکہ کاتبانِ وحی کے سردار تھے اور حضرت ابوبکر کے دور میں قرآن کو مدون کرنے کا شرف بھی ان ہی کو حاصل ہے (السیوطی۔ جلال الدین - الاتقان فی علوم القرآن مصطفی البابی۔ مصر ۱۹۵۱ء، ج ۱، ص ۵، ۵۸) اپنے علوم و فضل کی بنا پر مسعود بن مخرمہ ان کا ذکر ان چھ اشخاص میں کرتے ہیں جن پر اصحابِ رسول کے علم کی انتہا ہے (ابنِ سعد، ج ۱، ص ۳۵۱) قرآن و حدیث میں مہارت کے ساتھ ساتھ فقہ میں بھی اجتہادی درجہ رکھتے تھے اور ان کا شمار ان حضرات میں ہوتا تھا جو رسول ؐ اللہ کے عہد مبارک میں فتوٰی دیتے تھے (ابن سعد، ج ۲، ص ۳۵۱) فقیہہ و مفتی کی حیثیت سے حضرت زید نے اپنی زندگی میں جس قدر فتاوٰی جاری کئے ان کے بارے میں ابنِ قیم کا بیان ہے کہ" اگر ان سب کو الگ جگہ جمع کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں (ابن قیم - اعلام الموقعین - مطبعۃ السعادۃ ۱۹۵۵ء ج ۱ ص ۱۲) حضرت زید بن ثابت کی دلچسپی کا اصل میدان "فرائض" کا فن تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ رسول ؐ اللہ خود فرماتے تھے کہ افرض امتی زید بن ثابت (ابن سعد، ج ۲، ص ۳۵۹) یعنی میری اُمّت کے سب سے بڑے فرائض دان زید ہیں۔ حضرت زید نے رسول ؐ اللہ کے حکم کی تعمیل میں عبرانی اور سریانی زبانیں بھی سیکھ لی تھیں اور ذہانت و فطانت کا عالم یہ تھا کہ پندرہ دن کی مدت میں ہی استعداد بہم پہنچالی تھی اور توراۃ و انجیل کی زبانوں کے عالم بن گئے تھے۔

مسعودی کے بیان کے مطابق آپ کا کام یہ تھا کہ بادشاہوں اور امراء کو رسول اللہؐ کی طرف سے جواب لکھیں۔ وقت ضرورت آپ رسول اللہؐ کی ترجمانی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ اور بقول مسعودی فارسی، رومی، قبطی اور حبشی زبانوں میں گفتگو کر سکتے تھے (مسعودی ص ۲۴۶)۔ رسول اللہؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافتوں میں حضرت زید مختلف اہم مناصب پر فائز رہے اور بالآخر مشہور روایت کے مطابق ۴۵ھ میں اور بعض روایات کے مطابق ۵۴ھ یا ۵۵ھ میں مدینہ میں وفات پائی (الاصابہ ج ۱ ص ۵۴۳)۔ (۱۸۸) ابن عبدالبر، ج ۱، ص ۳۳۶، ۳۳۷۔ نیز دیکھئے ابن حجر العسقلانی ج ۱ ص ۵۴۳۔ (۱۸۹) ابن عبدالبر، ج ۱، ص ۳۳۷۔ (۱۹۰) ابن سعد، ج ۲ ص ۳۵۸۔ (۱۹۱) ایضاً ص ۳۵۹۔ (۱۹۲) ابنِ سعد کے بیان کے مطابق یہ سفارتیں نجاشی (ج ۱ ص ۲۵۸) قیصر روم (ایضاً ص ۲۵۹) کسریٰ (ایضاً) اور متوقس (ایضاً ص ۲۶۰) وغیرہ کو روانہ کی گئی تھیں۔ (۱۹۳) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۲۵۵۔ (۱۹۴) ان سفارتوں میں سے چند سفارتیں قابلِ ذکر ہیں مثلاً سفارت بنی ثقیف (ابنِ سعد ج ۱ ص ۳۱۲) سفارت بنی تمیم (ایضاً ص ۲۹۳) سفارت عامر بن صعصعہ (ایضاً ص ۳۰۱) سفارت بنی سعد (ایضاً ص ۲۹۹) سفارت عبدالقیس (ایضاً ص ۳۱۴) سفارت بنی حنیفہ (ایضاً ص ۳۱۶) سفارت بنی طے (ایضاً ص ۳۲۱) سفارت بنی زبید (ایضاً ص ۳۲۸) سفارت بنی کندہ (ایضاً) سفارت شاہان حمیر (ایضاً ص ۳۶۵) سفارت ازد (ایضاً ص ۳۳۷) اور سفارت ہمدان (ایضاً ص ۳۴۰) وغیرہ۔ (۱۹۵) ابن سعد ج ۱ ص ۲۶۲ (بسلسلہ فردہ بن عمرو الجذامی)۔ (۱۹۶) کتانی ج ۱ ص ۱۹۰۔ (۱۹۷) ایضاً ص ۱۹۵۔ (۱۹۸) ترجمانی کے فرائض اکثر حضرت زید بن ثابت انجام دیتے اور رسول اللہؐ کی طرف سے جواب دینے والے خطیب حضرت ثابت بن قیس تھے۔ ملاحظہ ہو: البخاری ج ۲ ص ۱۰۶۸ (کتاب الاحکام)، ابنِ حزم، ص ۲۸۔ اور کتانی ج ۱ ص ۲۰۲۔ (۱۹۹) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: ڈاکٹر حمید اللہ (الوثائق السیاسیہ) ص ۱۴، ۳۶، ۸۰ تا ۸۲، ۸۵ تا ۹۶، ۱۴۲، ۱۵۹، ۱۶۹، ۱۷۰۔ (۲۰۰) ایضاً۔ (۲۰۱) الحج (۴۱)۔ (۲۰۲) دیکھئے: البقرہ (۲۹، ۱۶۸)، الاعراف (۱۰، ۳۱، ۱۵۷)، الرعد (۳)، ابراہیم (۳۲ تا ۳۴)، النحل (۱۱۶)، الاسراء (۳۰)، الحدید (۲۵) اور الملک (۱۵) وغیرہ وغیرہ۔ (۲۰۳) ملاحظہ ہو: البقرہ (۱۷۷، ۱۸۸، ۲۶۲ تا ۲۶۴، ۲۷۸، ۲۸۰ تا ۲۸۳)، النساء (۱۰، ۲۹، ۳۶ تا ۳۸)، المائدہ (۳۳، ۸۸)، الاسراء (۲۶، ۲۷)، المطففین (۱ تا ۳)، الھمزہ (۱ تا ۴) وغیرہ وغیرہ۔ (۲۰۴) البقرہ (۲۵)، الاعراف (۳۲)۔ (۲۰۵) النساء (۲، ۴، ۷، ۱۰، ۲۴، ۲۰، ۳۶ تا ۳۸، ۵، ۶)، البقرہ (۲۷۵، ۲۷۹، ۲۶۱، ۱۸۸، ۲۷۸ تا ۲۸۰، ۲۱۹، ۱۷۷، ۱۸۰، ۲۷۳، ۲۶۲ تا ۲۶۷)، المائدہ (۳۳، ۳۸، ۸۹)، الانعام (۱۴۱)، الاعراف (۳۱)، التوبہ (۳۴، ۱۰۳)، آل عمران (۹۲، ۱۶۱، ۱۸۰)، الاسراء (۲۹)، الفرقان (۶۷)، النور (۲۷، ۳۲)، یٰسٓ (۷۱)، الذاریات (۱۹) اور الدھر (۸، ۹) وغیرہ۔ (۲۰۶) النساء (۴، ۷ تا ۱۲، ۲۰، ۳۲، ۱۷۶)۔ (۲۰۷) الاعراف (۳۱، ۳۲)، الحدید (۲۵)۔ (۲۰۸) البقرہ (۱۷۷، ۲۷۳، ۲۷۵)، آل عمران (۱۸۰)، النساء (۳۶ تا ۳۸)، المائدہ (۸۹)، الانعام (۱۴۱)، التوبہ (۳۴، ۶۰، ۱۰۳)، النور (۳۳)،

التغابن (۱۶)، المجادلہ (۳، ۴)، المعارج (۲۴، ۲۵)، الدھر (۸، ۹)، التکاثر (۱ تا ۳)۔(۲۰۹) الصعیدی، ص ۲۳۶۔ یہ ذمہ داری حضرت حذیفہ بن الیمان کے سپرد تھی۔ مسعودی کی تصریح کے مطابق یہ حجاز کی آمدنی کا تخمینہ بھی لگاتے تھے (مسعودی ص ۲۴۵)۔(۲۱۰) یہ کام معیقیب بن ابی فاطمہ کرتے تھے (مسعودی ص ۲۴۵، ۲۴۶)۔(۲۱۱) زبیر بن العوام اور الجہم بن الصلت اس شعبہ کے افسران تھے (ایضاً، ص ۲۴۵)۔(۲۱۲) مثلاً بدر کے دن صاحب المغانم عبداللہ بن کعب تھے (کتانی ج ۱ ص ۳۸۰)۔(۲۱۳) ایضاً ص ۳۸۲۔(۲۱۴) ایضاً ص ۳۹۲۔(۲۱۵) ایضاً ص ۳۹۲۔(۲۱۶) ایضاً ص ۳۹۳۔(۲۱۷) یعنی اندازہ اور تخمینہ لگانے والے (ایضاً ص ۳۹۹)۔(۲۱۸) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: یوسف الدین، ج ۲ ص ۵۹۳۔(۲۱۹) ابن ہشام ج ۲ ص ۲۵۴ نیز ابن سعد ج ۲ ص ۱۱۔(۲۲۰) تفصیل کے لئے دیکھئے: الماوردی ص ۱۱۶۔(۲۲۱) سورہ الانفال (۴۱)۔(۲۲۲) ابویوسف ص ۱۸۔(۲۲۳) الماوردی ص ۱۲۴۔(۲۲۴) الانفال (۴۱)۔(۲۲۵) ابوعبید۔ ص ۳۲۴، ۳۲۵ (فقرہ نمبر ۸۳۱)۔(۲۲۶) ابویوسف ص ۲۰۔(۲۲۷) یوسف الدین ج ۲ ص ۶۱۷ (بحوالہ البخاری و مسلم)۔(۲۲۸) ابویوسف ص ۲۲، ۲۳۔(۲۲۹) ایضاً ص ۱۸۔(۲۳۰) فَے کی وسیع تعریف کے لحاظ سے "جو مال مشرکوں (غیر مسلموں) سے بغیر قتال اور چڑھائی کے حاصل ہو جیسے مال صلح، جزیہ، ان کی تجارت کا عشر اور جس کے حاصل ہونے کا سبب ان کی طرف سے ہو جیسے مال خراج (الماوردی ص ۱۱۱) فَے اور غنیمت میں بعض باتیں مشترکہ ہیں اور بعض مختلف جیسے دونوں اہلِ کفر کے مال سے وابستہ ہیں اور ان کے خمس کے مصارف یکساں ہیں جبکہ ان میں ایک اختلاف تو یہ ہے کہ مالِ فَے برضامندی لیا جاتا ہے اور مالِ غنیمت زبردستی، نیز دوسرا اختلاف یہ ہے کہ مالِ فَے کے چار خمس کا مصرف مالِ غنیمت کے چار خمس کے مصرف سے جُدا ہے (ایضاً) محدود معنوں کے لحاظ سے امام ابویوسف لکھتے ہیں کہ: "فَے ہمارے نزدیک خراج ہے زمین کا خراج" (ابویوسف ص ۲۳)۔(۲۳۱) بلاذری ص ۲۴۔(۲۳۲) ایضاً ص ۲۸۔(۲۳۳) ایضاً ص ۳۶، ۳۷ اور ۴۲۔ نیز ابوداؤد ج ۲ ص ۱۳۴ (کتاب الخراج و الفَے)۔(۲۳۴) الحشر (۶، ۷)۔(۲۳۵) بلاذری ص ۲۴ تا ۲۶۔(۲۳۶) البخاری ج ۱ ص ۴۳۶ (کتاب الجہاد) ابوداؤد ج ۲ ص ۱۳۴ (کتاب الخراج والفَے)۔(۲۳۷) الحشر (۷، ۸)۔(۲۳۸) ابن رشد القرطبی۔ محمد بن احمد۔ بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد۔ مکتبہ الکلیات۔ الازہریہ۔ سنہ ۱۹۶۶ء، ج ۱ ص ۴۱۴۔(۲۳۹) ابوعبید ص ۷۶۔(۲۴۰) شبلی ج ۲ ص ۸۳۔(۲۴۱) یوسف الدین ج ۲ ص ۶۰۲۔(۲۴۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الماوردی ص ۱۲۷ (الباب الثالث عشر)۔(۲۴۳) التوبہ (۲۹)۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ یہاں قرآن سے تو صرف اہلِ کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری ثابت ہوتی ہے لیکن رسول اللہ نے اس کے اطلاق میں وسعت پیدا کی اور آپ نے ہجر و بحرین کے مجوسیوں کا بھی جزیہ قبول فرما لیا (یوسف الدین ج ۲ ص ۶۱۷) اس کی صراحت احادیث میں ہے کہ مجوس ہجر و بحرین سے رسول اللہ نے جزیہ وصول کیا۔ دیکھئے: ناصف ج ۴ ص ۳۹۴ (کتاب الجہاد)۔(۲۴۴) ابویوسف ص ۱۲۲۔(۲۴۵) ایضاً ص ۱۲۲۔
(۲۴۶) ایضاً ص ۱۲۲۔(۲۴۷) یوسف الدین ج ۲ ص ۶۱۸۔(۲۴۸) رسول اللہ نے فرمایا: "کسی مسلمان پر

جزیہ واجب الادا نہیں"۔ ابوعبید نے یہ حدیث نقل کر کے اس کے مطلب کی وضاحت میں یہی کہا ہے (ابوعبید ص ۴۷) (فقرہ ۱۲۱) نیز دیکھئے: طبری ج ۳ ص ۱۲۹۔ (۲۴۹) ابوعبید ص ۲۷ (فقرہ ۶۶)۔ (۲۵۰) یوسف الدین ج ۲ ص ۶۱۲۔ (۲۵۱) البخاری۔ ج ۲ ص ۶۲۳ (کتاب المغازی)۔ (۲۵۲) الماوردی۔ ص ۹۹ (باب الحادی عشر)۔

(۲۵۳) یہ بیان ڈاکٹر یوسف الدین کا ہے (ج ۲ ص ۶۶۰) اور انھوں نے حوالہ طبری کا دیا ہے جبکہ راقم الحروف کو طبری میں باوجود تلاش کے یہ نہیں مل سکا کہ "زکوٰۃ سنہ ۲ ھ میں فرض ہوئی"۔ البتہ اس نے صدقۂ فطر کے بارے میں یہ ضرور لکھا ہے کہ "فیہا امر الناس باخراج زکوٰۃ الفطر" (ج ۲ ص ۴۱۸)۔ ہمارے لئے یہ ناقابلِ فہم ہے کہ اس سے زکوٰۃ کس طرح مراد لی جاسکتی ہے۔ علاوہ دوسری جگہ طبری کا بیان بالکل واضح ہے۔ طبری نے سنہ ۹ ھ کے ضمن میں لکھا ہے کہ "فرضت الصدقات وفرق فیہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمالہ علی الصدقات" (ج ۳ ص ۱۲۳) اس لحاظ سے سنہ ۹ ھ میں زکوٰۃ کی فرضیت کا بیان اور مذکورہ بالا سنہ ۲ ھ والا بیان یا تو محض تسامح ہے یا کتابت کی غلطی ہے۔ (۲۵۴) ان اشیاء کا نصاب اور شرح وغیرہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: البخاری (ج ۱ ص ۱۹۴ تا ۱۹۹ کتاب الزکوٰۃ) ابوداؤد (ج ۱ ص ۲۱۸ تا ۲۲۳، کتاب الزکوٰۃ) الخطیب العمری (ص ۱۵۵ تا ۱۵۹ کتاب الزکوٰۃ) وغیرہ۔ (۲۵۵) ابوعبید ص ۴۷۶، ۴۷۷ (فقرہ ۱۴۱۲)۔

(۲۵۶) البخاری (ج ۱ ص ۱۹۴ تا ۱۹۹ کتاب الزکوٰۃ)، الخطیب العمری (ص ۱۵۵ تا ۱۵۹ کتاب الزکوٰۃ)۔

(۲۵۷) ابوداؤد ج ۱ ص ۲۱۸ (کتاب الزکوٰۃ)۔ (۲۵۸) التوبہ (۶۰)۔ (۲۵۹) الترمذی ج ۲ ص ۳۱۔

(۲۶۰) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: (یوسف الدین ج ۲ ص ۲۶، تا ۲۷) "انگلستان میں کلیسائی نظام کے زوال کے بعد سے یہ بات مان لی گئی کہ مفلسوں کی امداد بھی حکومت کا ایک فرض ہے اور محتاجوں کی اس وقت تک خاطر خواہ مدد نہیں کی جاسکتی جب تک کہ حکومت کی نگرانی میں اس کا باقاعدہ انتظام نہ ہو۔ اسی بنا پر سنہ ۱۶۰۱ء میں قانونِ محتاجاں منظور کیا گیا (ایضاً ص ۲۹)۔ (۲۶۱) تفصیل کے لئے: الماوردی ص ۱۰۸ (الباب الحادی والعشر)۔ (۲۶۲) آنحضرتؐ کا ارشاد ہے: انا اولیٰ بالمومنین من انفسھم من ترک مالاً فلاھلہ ومن ترک دیناً اوضیاعاً فالیّ وعلیّ (ابوداؤد ج ۲، ص ۴۱۰ کتاب الخراج والفئے والامارہ)۔ یہ بھی آپ کا ارشاد ہے کہ: من ترک مالا فلورثتہ ومن ترک کلا فالینا (ایضاً) مزید حوالے کے لئے ملاحظہ ہو: الترمذی ج ۲ ص ۳۰۔ (۲۶۳) الخطیب العمری ص ۲۶۳ (باب الفرائض)۔

(۲۶۴) ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۴۸، طبری ج ۲ ص ۴۱۸۔ (۲۶۵) البخاری ج ۱ ص ۲۰۴ (کتاب الزکوٰۃ)۔

(۲۶۶) ابوداؤد ج ۲ ص ۴۰۸، ۴۰۹ (کتاب الخراج والفئے والامارہ)۔ (۲۶۷) قانون وراثت کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: النساء (۱۱ تا ۱۲) البخاری ج ۱، ص ۳۸۲ تا ۳۹۰ (کتاب الوصایا) نیز ج ۲ ص ۹۹۵ تا ۱۰۰۱ (کتاب الفرائض)۔ (۲۶۸) النووی۔ ریاض الصالحین من کلام سید المرسلین۔ مطبعہ مصطفی البابی الحلبی۔ مصر سنہ ۱۹۳۸ء ص ۲۴۷ (باب القناعۃ وذم السوال من غیر ضرورہ)۔ (۲۶۹) مثلاً یزید بن المجل الحارثی کو نمرہ اور اس کی آبپاشی کے راستے اور جنگل میں سے وادی الرحمٰن عطا کی گئی (ابنِ سعد ج ۱ ص ۲۶۸) بنی شمخ جہنی کو صفینہ کی وہ زمین عطا فرمائی جس پر ان لوگوں نے خط لگا لیا اور

زراعت کی (ایضاً ص ۲۷۱) بلال بن الحارث المزنی کو النحل اور جزعہ وغیرہ (ایضاً ص ۲۷۲) عدّاء بن خالد بن ہوذہ کو المصباعہ کے درمیان سے الزج و لوابہ یعنی لوابہ الخرار تک کے درمیان جو کچھ ہے (ایضاً ص ۲۷۳) اور راشد بن عبد السلمی کو اتنی زمین عطا کی جتنی دُور دو مرتبہ تیر اور ایک مرتبہ پتھر جا سکے (ایضاً ص ۲۷۴) مزید حوالے کے لئے دیکھئے: ابو عبید ص ۲۷۲ تا ۲۸۲ (فقرات نمبر ۶۸۴ تا ۶۹۳)، ناصف منصور علی۔ التاج الجامع لاصول فی احادیث الرسول۔ مطبعہ مصطفی البابی الحلبی مصر ۱۹۳۴ء ج ۲ ص ۲۷۱ تا ۲۷۲ (کتاب الزکوٰۃ)۔ (۲۷۰) البخاری ج ۱ ص ۳۱۴ (ابواب الحرث والمزارعۃ) نیز ابو عبید ص ۱۰۷، ابو داؤد ج ۲ ص ۳۳۷، ۳۴۴، ۳۸۴ (کتاب الخراج والفئے والامارہ)۔ (۲۷۱) ابو عبید ص ۱۹۴ تا ۱۹۶ (فقرہ ۵۰۸) نیز بلاذری ص ۶۸۔ (۲۷۲) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: مودودی۔ الجہاد فی الاسلام۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور۔ ۱۹۶۲ء۔ ص ۱۴۶ تا ۱۶۸۔ (۲۷۳) حمید اللہ (عہد نبوی میں نظام حکمرانی) ص ۲۶۵۔ (۲۷۴) ابن ہشام ج ۴ ص ۴۹۔ (۲۷۵) البخاری ج ۲ ص ۶۱۳۔ (۲۷۶) ابنِ ہشام ج ۴ ص ۴۹۔ (۲۷۷) تفصیلات کے لئے: حمید اللہ (عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی) ص ۶۷، ۶۸ اور HUSSANI, S.Q., ARAB ADMINISTRATION, MADRAS, 1949, P. 13. (۲۷۸) ملاحظہ ہو: ناصف۔ ج ۴ ص ۳۶۶ (کتاب الجہاد والغزوات) نیز دیکھئے: جرجی زیدان۔ تاریخ التمدن الاسلامی۔ دار الہلال۔ قاہرہ۔ ج ۱۔ ص ۱۹۲ تا ۱۹۸۔ (۲۷۹) ایضاً ص ۱۸۵۔ (۲۸۰) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: مودودی (الجہاد) ص ۱۶۹ تا ۱۸۰۔ (۲۸۱) التوبہ (۴۱)، الحج (۷۸)۔

(۲۸۲) امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ الجہاد والمجاھدہ کے معنی دشمن کے مقابلہ میں پوری طاقت صرف کرنے کے ہیں۔ اور جہاد تین قسم پر ہوتا ہے یعنی (۱) کفار سے (۲) شیطان سے اور (۳) نفس سے۔ اور آیت وجاھدوا فی اللہ حق جہادہ تینوں قسم کے جہاد پر مشتمل ہے۔ (ملاحظہ ہو: راغب اصفہانی ص ۱۰۱۔ (۲۸۳) البقرہ (۱۹۱ تا ۱۹۳، ۲۱۷، ۲۵۱)، الانفال (۳۹)۔ (۲۸۴) زرقانی ج ۲ ص ۲۶۹۔ جنگ و صلح کے سلسلے میں رسول اللہؐ کی مزید ہدایات کے حوالے کے لئے دیکھئے: ابنِ ہشام ج ۴ ص ۱۰۰، ابو یوسف ص ۱۹۳، الخطیب العمری ص ۱۴۳ تا ۳۴۳، ناصف ج ۴ ص ۳۷۳، ۳۷۴ (کتاب الجہاد والغزوات)۔ (۲۸۵) شبلی۔ الفاروق۔ ایم ثناء اللہ خاں۔ لاہور۔ ۱۹۶۱ء ج ۲ ص ۲۹۸۔ وان کریمر نے ایک موقع پر اگرچہ یہ بیان حضرت عمرؓ کے دَور سے متعلق دیا ہے لیکن اس کی روشنی میں خود رسول اللہؐ کے عہد میں مردم شماری کی اہمیت و نوعیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ مردم شماری کا رواج اگر قدیم ایشیائی سلطنتوں اور سلطنت روما میں بھی تھا لیکن اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ رعایا پر محصول کے بوجھ کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے اور حکومت کے پنجۂ تظلم کو زیادہ سے زیادہ سخت کیا جائے جبکہ حضرت عمر اوّل کے دور میں مردم شماری ایک بالکل دوسرے جذبے کے تحت کی گئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ تمام مسلمانوں کو ریاست کے محاصل اور آمدنی میں سے جائز حقوق عطا کئے جائیں۔ VON KREMER, THE ORIENT UNDER THE CALIPH'S TR. S. KHUDA BAKSH, UNIVERSITY OF CALCUTTA, 1920, P. 79, 80.

(۲۸۶) البخاری ج ۱ ص ۴۳۰ (کتاب الجہاد) اسی سے متصل حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فہرست جہاد رسولؐ اللہ کے دور میں ہی مرتب ہو چکی تھی جیسا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے والے شخص نے اپنی درخواست میں کہا تھا (ایضاً) یہاں حوالۂ سابق (۲۸۵) بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ (۲۸۷) کتانی ج ۱ ص ۲۲۰۔ (۲۸۸) مورخین کے بیان کے مطابق بدر کے معرکۂ کار زار میں آٹھ آدمی (عثمان بن عفّان، طلحہ بن عبیداللہ، سعید بن زید، حارث بن صمہ، خوّات بن جبیر، حارث بن حاطب، عاصم بن عدی اور ابو لبابہ بشیر بن عبدالمنذر انصاری) موجود نہ تھے۔ مگر مالِ غنیمت میں ان لوگوں کے حصّے بھی لگائے گئے۔ ملاحظہ ہو: ابنِ سعد، ج ۲ ص ۱۹ نیز مسعودی (التنبیہ) ص ۲۰۵، ۲۰۶۔ (۲۸۹) الصف (۴)۔ (۲۹۰) ناصف، ج ۱، ص ۲۰۳ (کتاب الصلوٰۃ باب فی تسویۃ الصفوف)۔ (۲۹۱) حمیداللہ۔ عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی۔ ص ۲۶۶۔

(۲۹۲) رسولؐ اللہ بدر کے لئے شہر سے نکلے تو ایک میل چل کر فوج کا جائزہ لیا جو کم عمر تھے واپس کر دئے گئے۔ ابنِ سعد (ج ۲ ص ۱۲) نیز طبری (ج ۲ ص ۴۷۷)۔ (۲۹۳) حمیداللہ (عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی) ص ۲۶۶۔ (۲۹۴) مثلاً بدر کے موقع پر رسولؐ اللہ کی دعا کہ "اللّٰھمّ انجزلی ماوعدتنی اللّٰھمّ آتِ ما وعدتنی۔ اللّٰھم ان تھلک ھذہ العصابہ من اھل الاسلام لا تعبد فی الارض (ناصف ج ۴ ص ۴۱۵ کتاب الجہاد والغزوات)۔ (۲۹۵) قرآن میں رسولؐ اللہ کو یہ حکم دیا گیا کہ، یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ (اے نبی! مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دو)۔ الانفال (۶۵)۔ (۲۹۶) غازی انصاری۔ اسلام کا نظامِ حکومت، ص ۵۰۹، ۵۱۰۔ (۲۹۷) ایضاً ص ۵۱۰۔

(۲۹۸) ابنِ ہشام ج ۲ ص ۲۷۲۔ (۲۹۹) کتانی ج ۱ ص ۳۱۷۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ عہدِ رسالت میں لوا کا رنگ سفید تھا، اور رایہ سیاہ رنگ کا اور دھاری دار (سوداً مربّعہ من نمرہ)۔ دیکھئے: ناصف ج ۴ ص ۳۶۸ (کتاب الجہاد والغزوات)۔ (۳۰۰) ایضاً ص ۳۲۲۔ (۳۰۱) ایضاً۔ (۳۰۲) مثلاً غزوۂ بدر میں شعار احد احد (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۸۷) احد میں امت امت (ایضاً ج ۳ ص ۲۷) احزاب و بنی قریظہ میں حٰمٓ لا ینصرون (ایضاً ج ۳ ص ۲۳۷) بنی المصطلق میں یا منصور امت امت (ایضاً ج ۳ ص ۳۰۶) اور فتح مکہ، حنین اور طائف میں مہاجرین کا شعار یا بنی عبدالرحمٰن، خزرج کا یا بنی عبداللہ اور اوس کا یا بنی عبیداللہ تھا (ایضاً ج ۴ ص ۱۵) نیز دیکھئے: ناصف، ج ۴ ص ۳۷۸، ۳۷۹۔ کتاب الجہاد والغزوات (باب الشعار فی الحرب)۔ (۳۰۳) یہ پتا نہیں چلتا کہ جاسوسوں کی کل تعداد کتنی تھی مگر یہ بات طے ہے کہ جاسوسی کے لئے رسولؐ اللہ نے کافی لوگوں کو مقرر کر رکھا تھا۔ اور بعض اوقات ایک ایک مہم کے لئے متعدد جاسوسوں کو روانہ کیا جاتا تھا۔ مثلاً دیکھئے: البخاری ج ۲ ص ۵۶۷، ۵۶۸ (کتاب المغازی)۔

(۳۰۴) ایضاً ص ۵۶۷ اور ۶۱۲، ۷۲۶ (کتاب التفسیر)۔ (۳۰۵) حمیداللہ (عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی)، ص ۲۶۴، ۲۶۵۔ (۳۰۶) کتانی ج ۱ ص ۳۴۸۔ (۳۰۷) ایضاً ص ۳۵۱۔ (۳۰۸) ایضاً ص ۳۶۰۔ (۳۰۹) ایضاً ص ۳۶۱ تا ۳۶۳۔ (۳۱۰) ایضاً ص ۳۸۰۔ (۳۱۱) ایضاً ص ۳۸۲۔ (۳۱۲) ایضاً ص ۳۵۱۔ (۳۱۳) ایضاً ص ۳۵۶ تا ۳۵۸۔ (۳۱۴) الانفال (۶۱)۔ (۳۱۵) الحدید (۲۵)۔ (۳۱۶) المائدہ (۴۲)۔ (۳۱۷) ایضاً

(۴۸)۔ (۳۱۸) ملاحظہ ہو: ایضاً (۴۹)، ص (۲۶)۔ (۳۱۹) النساء (۵۸)۔ (۳۲۰) الشوریٰ (۱۵)۔
(۳۲۱) البقرہ (۲۱۳)، النحل (۶۴)۔ (۳۲۲) امام مالک۔ موطا (مع شرح تنویر الحوالک از سیوطی) مطبعہ مصطفی البابی الحلبی۔ مصر۔ سنہ ۱۹۵۱ء۔ ج ۲ ص ۱۰۶، ۱۰۷ (کتاب الاقضیہ)۔ یہی روایت چند الفاظ کے تغیّر کے ساتھ امام بخاری نے بھی لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو: البخاری ج ۲ ص ۱۰۶۲ (کتاب الاحکام) نیز الترمذی ج ۱ ص ۱۶۰ (ابواب الاحکام)۔
(۳۲۳) البخاری ج ۱ ص ۳۱۱ (کتاب الوکالہ)۔ (۳۲۴) مسلم ج ۱ ص ۷۴ (کتاب الاقضیہ)۔ شہادت کے مسائل اور اثبات دعویٰ کے سلسلہ میں تفصیلی مباحث کے لئے ملاحظہ ہو: محمصانی۔ صبحی۔ فلسفۃ التشریع فی الاسلام۔ مکتبۃ الکشاف۔ بیروت۔ سنہ ۱۹۴۶ء۔ ص ۲۶۹ تا ۲۷۷۔ (۳۲۵) محمصانی ص ۲۷۲۔ (۳۲۶) ایضاً۔ (۳۲۷) ابنِ قیّم نے لکھا ہے کہ "قد حکم النبی صلی اللہ علیہ وسلم بشاھد ویمین"۔ اور اس کی دلیل میں یہ دلیل دی ہے کہ حضرت ابن عباس نے کہا کہ "قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشاھد ویمین" (بحوالہ مسلم) دیکھئے: ابنِ قیّم۔ الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ۔ مطبعۃ المدنی۔ قاہرہ۔ سنہ ۱۹۶۱ء۔ ص ۲۰۷۔ یہاں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ حضرت ابن عباس کی تصریح کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدعا علیہ سے حلف لیتے تھے اور اس کے الفاظ یہ ہوتے تھے کہ احلف باللہ الذی لا الٰہ الا ھو ما لہ عندك شئ (الخطیب العمری ص ۳۲۰، باب الاقضیۃ والشہادات)۔ (۳۲۸) اس سلسلے میں ابنِ قیّم نے بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے اور کتاب وسنّت کے آثار وشواہد اور تاریخی واقعات سے استدلال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: ابنِ قیّم (الطرق الحکمیہ) ص ۱۱، ۲۷، ۳۹، ۴۱، ۹۴، ۱۰۶، ۱۰۷، ۲۳۴ تا ۲۳۸، ۲۲۰ اور ۳۰۸ وغیرہ۔ امام مالک نے لکھا ہے کہ دورِ نبوی میں پہلا واقعہ جس میں قسامت کا طریقہ جاری کیا گیا، عبداللہ بن سہل کے خیبر میں قتل ہو جانے کے سلسلے میں برتا گیا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: امام مالک۔ ج ۲ ص ۱۹۵ تا ۱۹۷ (کتاب القسامت)۔ (۳۲۹) المائدہ (۸)، الانعام (۱۵۲)، الحجرات (۹)۔ (۳۳۰) البخاری۔ ج ۲ ص ۶۱۶ (کتاب المغازی)۔ (۳۳۱) النساء (۶۵)۔ نیز دیکھئے: الاحزاب (۳۶)۔ (۳۳۲) النساء (۱۲۸)۔ (۳۳۳) الحجرات (۹)، البقرہ (۲۲۸)۔ (۳۳۴) ملاحظہ ہو: النحل (۱۲۶)، النساء (۱۲۳)، الشوریٰ (۴۰)۔ (۳۳۵) الانعام (۱۶۴)، الفاطر (۱۸)، الاسراء (۱۵)، النجم (۳۸)۔
(۳۳۶) الترمذی ج ۱ ص ۱۵۹ (ابواب الاحکام)۔ (۳۳۷) ایضاً۔ (۳۳۸) الخطیب العمری ص ۳۲۵۔
(۳۳۹) البخاری ج ۱ ص ۱۰۹۲ (کتاب الاعتصام) نیز دیکھئے: الترمذی ج ۱ ص ۱۵۸ (ابواب الاحکام)۔
(۳۴۰) کتانی ج ۱ ص ۲۵۷، ۲۵۸۔ (۳۴۱) خلیل حامدی۔ اسلام کا نظامِ قضا۔ چراغِ راہ۔ اسلامی قانون نمبر۔ جون سنہ ۱۹۵۸ء۔ ج ۱ ص ۱۹۳ (جلد ۱۲ شمارہ ۶)۔ (۳۴۲) تفصیل کے لئے: محمد احمد جاد، علی محمد البجادی، محمد ابو الفضل ابراہیم۔ ایام العرب فی الجاہلیۃ۔ دار احیاء الکتب العربیہ۔ عیسی البابی الحلبی۔ مصر۔ سنہ ۱۹۴۲ء۔
(۳۴۳) الشوریٰ (۱۰)، النحل (۶۴)، النساء (۵۸)۔ (۳۴۴) البقرہ (۱۲۹، ۱۵۱)، آل عمران (۴۸، ۱۶۴)۔ (۳۴۵) الخطیب العمری ص ۳۶ (کتاب العلم) نیز دیکھئے: ابن ماجہ ج ۱ ص ۱۰۱ (باب فضل العلماء)۔

(۳۴۶) العلق (۱تا۵)۔(۳۴۷) حمید اللہ۔ الصحیفۃ الصحیحہ موسوم بہ صحیفۂ ہمام بن منبہ۔ دیباچہ (پیغمبرِ اسلام کی تعلیمی سیاست) ص ۱۸۔ اسلامک پبلیکیشنز سوسائٹی۔ مکتبہ نشاۃ ثانیہ۔ دکن۔ ۱۹۵۶ء۔(۳۴۸) حمید اللہ (عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی۔ ص ۲۱۲، ۲۱۳۔(۳۴۹) ایضاً ص ۲۱۳۔(۳۵۰) ایضاً۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے صحیفۂ امام ابن منبہ کے دیباچہ میں یہ بھی بیان کیا ہے "بعض مؤلف اہلِ صُفّہ کے چار سو طلبہ کا ذکر کرتے ہیں جو تعجب نہیں کہ ایک ہی دن کی حاضری ہو" (ملاحظہ ہو (ص ۱۸، حاشیہ ۲)۔ محدثین نے اصحابِ صفّہ کی تعداد ۷۰ لکھی ہے۔ الخطیب العمری ص ۴۴ (کتاب الرقاق)۔

(۳۵۱) ابنِ سعد، ج ۲ ص ۲۲۔(۳۵۲) کتانی ج ۱ ص ۵۶۔(۳۵۳) یہ مورخین کا عام بیان ہے جبکہ علامہ شبلی کی تحقیق کے مطابق مساجد کی تعداد ۳۱ ہے ان کے نام اور تفصیل کے لئے دیکھئے: شبلی ج ۲ ص ۹۲۔(۳۵۴) حمید اللہ۔ عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی۔ ص ۲۰۶۔(۳۵۵) ابنِ ہشام ج ۳ ص ۱۹۳، ۱۹۴۔(۳۵۶) ایضاً ص ۱۷۸۔

(۳۵۷) ابن عبد البر، ج ۱، ص ۲۳۸۔ نیز کتانی ج ۱ ص ۴۳۔(۳۵۸) کتانی ج ۱ ص ۴۳۔(۳۵۹) ایضاً۔(۳۶۰) ایضاً ص ۴۸۔ اس قسم کے معلمین میں عبد اللہ بن سعید اور عبادہ بن الصامت کا نام لیا جا سکتا ہے۔(۳۶۱) کتانی نے الشفاؒ ام سلیمان بن ابی حثمہ کا ذکر کیا ہے (ج ۱، ص ۴۹، ۵۰)۔(۳۶۲) عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی۔ ص ۲۲۶۔(۳۶۳) ابنِ سعد ج ۲ ص ۱۶۸، ۱۶۹۔(۳۶۴) ابنِ حزم ص ۲۳۔(۳۶۵) ایضاً۔(۳۶۶) ایضاً۔(۳۶۷) اس کے والی خالد بن سعید بن ابی العاص تھے۔ شہر بن باذان کے قتل کے بعد انہیں مقرر کیا گیا تھا (ایضاً)۔(۳۶۸) والیِ مہاجر بن ابی امیہ تھے (ایضاً) (۳۶۹) والی زیاد بن بید البیاضی تھے (ایضاً)۔(۳۷۰) والی معاذ بن جبل تھے (ایضاً)۔(۳۷۱) والی ابو موسیٰ الاشعری تھے (ایضاً)۔(۳۷۲) والی ابو سفیان صخر بن حرب بن امیہ تھے اور انہیں عمرو بن حزم کے بعد والی بنایا گیا تھا (ایضاً)۔ (۳۷۳) والی عتاب بن اسید تھے (ایضاً)۔(۳۷۴) والی یزید بن ابی سفیان تھے (ایضاً)۔(۳۷۵) والی عمرو بن سعید بن ابی العاص تھے (ایضاً ص ۲۴)۔(۳۷۶) والی حکم بن سعید بن ابی العاص تھے (ایضاً)۔(۳۷۷) والی ابان بن سعید بن ابی العاص تھے (ایضاً)۔ بلاذری نے اس بات کو ترجیحاً بیان کیا ہے کہ پہلے والی علاء بن الحضرمی تھے اور ابان بن سعید ان کے جانشین بنے (ایضاً)۔(۳۷۸) والی علاء بن الحضرمی تھے (ایضاً)۔(۳۷۹) والی عمرو بن العاص تھے (ایضاً)۔(۳۸۰) والی عثمان بن ابی العاص تھے (ایضاً)

(۳۸۱) ابن سعد ج ۲ ص ۳۴۷، ۳۴۸۔ نیز دیکھئے: الترمذی ج ۱ ص ۱۵۹ (ابواب الاحکام)۔(۳۸۲) ملاحظہ ہو: طبری ج ۳ ص ۱۲۸، ۱۲۹۔(۳۸۳) البخاری ج ۲ ص ۶۲۳ (کتاب المغازی)۔(۳۸۴) ابنِ حزم نے لکھا ہے کہ حضرت علی اخماس یمن اور قضا دونوں پر مامور کئے گئے تھے (ابنِ حزم ص ۲۴)۔(۳۸۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عتاب بن اسید کو گورنر مقرر فرمایا تو ان کی تنخواہ ایک درہم یومیہ مقرر فرمائی یعنی ماہانہ تیس درہم (کتانی ج ۱ ص ۲۶۴) نیز ابوداؤد ج ۲ ص ۴۰۷ (کتاب الخراج والفئے)۔(۳۸۶) ابوداؤد، ج ۲ ص ۴۰۹ (کتاب الخراج والفئے)۔

اختتامیہ

عہدِ نبوی میں ریاست کے نشوو ارتقاء کا تفصیلی مطالعہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا اب اختتام سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بطور خلاصہ تمام مباحث پر ایک مجموعی نظر ڈال لی جائے۔

"تاریخی حقائق اس بات کا کافی ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے سیاست و ریاست کے انداز و اسالیب میں انقلابی تبدیلیاں فرمائیں اور سخت انتشار بلکہ نزاع کے پس منظر سے سیاسی اتحاد کو ابھارا۔ یہ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ اس وقت دنیا کے تمام متمدن مہذب ممالک سیاسی طوائف الملوکی، معاشرتی بے راہ روی اور اخلاقی تنزل کا شکار تھے۔ ایسے عالم میں رسول اللہؐ نے خالص عقیدہ کی بنیاد پر ایک جدید معاشرہ کی تشکیل کی، اسے دین کے مثبت اصولوں پر ترقی دی، اخوت، مساوات اور ہمدردی و تعاون کے رشتوں سے اسے مضبوط و مستحکم کیا اور پھر اس تنظیم پر بالآخر ایک ریاست کو وجود بخشا۔

ریاست کے باب میں سب سے اہم تغیر یہ تھا کہ آپ نے شہنشاہیت اور مطلق العنانیت کے نقوش کہنہ کو محو کر کے حاکمیت باری تعالیٰ کا نقش تازہ ثبت کیا۔ حکمرانوں کو الوہیت و اوتار کی مسندوں سے اتار کر عام انسانوں کے برابر کھڑا کیا اور جبر و استبداد، ظلم و ناانصافی، استحصال، خیانت، دغا بازی، کشت و خون، فتنہ و فساد اور دھوکہ و فریب کے بجائے حریتِ فکر و عمل، تقویٰ، امانت و دیانت، شوریٰ، امن و صلح، نظم و ضبط، عدل و انصاف، مساوات، رواداری کی روایات[1] کو زندہ و تابندہ کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دین و سیاست کو متحد کیا۔ حالانکہ اس وقت دنیا میں دین و سیاست کی تفریق عام تھی۔ یہ ایک غیر معمولی کارنامہ، ایک انقلاب تھا جسے روسو (ROUSSEAU) جیسے مفکرِ سیاسیات نے بھی محسوس کیا۔ چنانچہ مسیحی دنیا کے نظامِ سیاسی پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ، مذہبی مسلک اس سے پہلے ہمیشہ اور اس وقت بھی فرمانروا (کے تسلط) سے آزاد رہنے میں کامیاب ہوا۔ مذہبی مسلک اور ریاست کے درمیان لازمی طور پر کوئی علاقہ نہ تھا۔ اس مسئلہ میں (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

---

(۱) ڈوزی لکھتا ہے، انقلابِ فرانس کے مبادیات یعنی حریت، مساوات اور اخوت کی بنیاد ان (عربوں) ہی نے ڈالی۔ اور ایک بدوی کو وہ آزادی حاصل ہے جس کی مثال روئے زمین پر نہیں۔ اس کا قول ہے کہ وہ خالقِ کائنات کے علاوہ کسی اور کو اپنا آقا نہیں مانتا۔ وہ حریت کے اس درجہ پر فائز ہے کہ اگر اس کا موازنہ ہمارے انتہائی ترقی یافتہ اصولِ آزادی سے کیا جائے تو وہ عربوں کی آزادی کے مقابلہ میں ایک قسم کا استبداد معلوم ہوگی (کرد علی۔ الاسلام و الحضارۃ العربیۃ (ترجمہ) شاہ معین الدین احمد ندوی (اسلام اور عربی تمدن) دار المصنفین۔ اعظم گڑھ۔ ص ۱۴۰۔

کا نظریہ نہایت مستحکم تھا انہوں نے اپنے سیاسی نظام کو مکمل طور پر متحد و منظم کر لیا تھا۔ چنانچہ جب تک ان کے جانشین خلفاؓ کے تحت یہ نظام جاری رہا۔ حکومت ہر لحاظ سے متحد، غیر منقسم اور اچھی رہی۔[1] یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ دین و ریاست کے درمیان اتحاد و تعلق کا یہ رشتہ خارجی یا مصنوعی نہ تھا بلکہ فطری اور حقیقی تھا کہ ریاست دین ہی کے نتیجہ میں رُو بہ عمل آئی تھی۔[2] علاوہ ازیں اس سیاسی نظام کو رسول اللہؐ نے اس سرزمین پر جاری و ساری کیا جہاں کی تاریخ میں ایک متحد سیاسی نظام یا ہمہ گیر ریاست کا قیام کبھی نہ ہوا تھا۔ اور وہ لوگ ایک پرچم تلے آ گئے[3] جنہوں نے کسی قوتِ قاہرہ کے آگے جھکنا ہی نہ سیکھا تھا، جن کی سرشت میں سرکشی، خودسری اور آزادی کے عناصر داخل تھے۔ اور ریاست کے ارتقا کی تکمیل ہوتے ہی جزیرہ نمائے عرب پر خدا کا وہ امن چھا گیا، جو دن رات لوٹ مار، قتل و غارت گری میں سرگرم رہنے والے عربوں کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا۔

علمِ سیاسیات کی رُو سے ریاست کی تعریف کچھ ہی مقرر کیوں نہ کی جائے ریاست نبوی بہر صورت ایک مکمل ریاست، ایک موثر، آزاد، خودمختار، حقیقی، سیاسی طاقت اور اپنے تمام لوازمات کے ساتھ ایک مثالی و معیاری مملکت تھی۔ اس ریاست کے وظائف و اعمال کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ وہ ایک نظریاتی و دستوری اور فلاحی و خادمِ خلق ریاست تھی۔ جہاں معاش و معاد کو یکساں اہمیت حاصل تھی اور ایک عادلانہ اجتماعی نظام سایہ فگن تھا۔ نیز ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف قرآن میں "خلافتِ ارضی" کے لئے حقوق و فرائض کا جو دائرہ مقرر کیا گیا ہے[4] ریاست نبوی میں اس سے سرِ مو تجاوز نہیں کیا گیا تو دوسری طرف ریاست کے جن مقاصد کی وحیِ الٰہی میں نشان دہی کی گئی ہے[5] ریاستِ نبویؐ نے ان کو بھی کماحقہ، پورا کیا۔[6]

علاوہ ازیں رسول اللہؐ نے جیسا مضبوط اور لچکدار نظامِ حکومت مرتب کیا تھا اس کے پیشِ نظر یہ بات بڑے اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ عہدِ نبوی میں قائم ہونے والے ادارات نے اپنے بعد کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا۔ خصوصاً مسلمانوں کی ریاست کا تاریخی ارتقا رسول اللہؐ کی قائم کردہ ریاست پر ہی ہوا تھا اور آپ نے اپنے زمانہ میں جن انتظامی ادارات کی بنا ڈالی تھی، بعد میں ان ہی کو مزید ترقی دے کر ایک متنوع اور وسیع نظام کی صورت میں ڈھال دیا گیا۔

---

(1) ROUSSEAU, JEAN JACQUES, THE SOCIAL CONTRACT OR PRINCIPLES OF POLITICAL RIGHT, TR. TOZER, HENRY, J., GEORGE ALLEN AND UNWIN LTD. LONDON, 1948, P. 22.

(۲) ایضاً (حاشیہ)۔ (۳) یہ کہنا غلط ہوگا کہ رسول اللہؐ نے اتحاد کی راہ "کشت و خون" کے ذریعہ ہموار کی۔ جیسا کہ مارک سائیکس نے لکھا ہے۔ دیکھئے: SYKES, SIR MARK, THE CALIPH'S LAST HERITAGE, MACMILLAN & CO. LTD. LONDON, 1915, P. 74.

(۴) الحج (۴۱)، ص (۲۶)، الحدید (۲۵)۔ (۵) ایضاً (۶) لہٰذا نولدیکے کا یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا کہ رسول اللہؐ کو حالات کے دباؤ نے آگے بڑھایا اور پھر خلافِ توقع وہ ایک بادشاہ اور فاتح بن گئے۔ NOLDEKE, THEODOR, SKETCHES FROM EASTERN HISTORY, TR. BLACK, JOHN SUTHARLAND, EDINBURGH, 1892, P. 61.

کتابیات

(ا) قرآن اور علوم قرآن

۱ - القرآن
۲ - آلوسی۔شہاب الدین، السید محمود ۔ روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم و السبع المثانی ۔ مصر۔ (الطباعۃ المنیریہ)
۳ - ابن الجوزی ۔ زاد المسیر فی علم التفسیر ۔ بیروت ۔ سنہ ۱۹۶۵ء ۔
۴ - ابن کثیر الدمشقی ۔ تفسیر القرآن العظیم ۔ بیروت ۔ سنہ ۱۹۶۶ء ۔
۵ - ابن عربی ۔ احکام القرآن ۔ مصر ۔ سنہ ۱۹۵۷ء ۔
۶ - پانی پتی ۔ محمد ثناء اللہ ۔ تفسیر المظہری ۔ دکن ۔ (مجلس اشاعۃ العلوم)
۷ - جصاص ۔ ابوبکر ۔ احکام القرآن ۔ مصر ۔ سنہ ۱۳۴۷ھ ۔
۸ - راغب اصفہانی ۔ المفردات فی غریب القرآن ۔ مصر ۔ سنہ ۱۹۶۱ء ۔
۹ - الزمخشری ۔ ابی القاسم جار اللہ ۔ الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل ۔ مصر ۔ سنہ ۱۹۴۸ء ۔
۱۰ - السیوطی ۔ جلال الدین ۔ الاتقان فی علوم القرآن ۔ مصر ۔ سنہ ۱۹۵۱ء ۔
۱۱ - شاہ ولی اللہ ۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر ۔ لاہور ۔ سنہ ۱۹۵۱ء ۔
۱۲ - القرطبی ۔ ابی عبداللہ محمد بن احمد الانصاری ۔ الجامع لاحکام القرآن ۔ قاہرہ ۔ سنہ ۱۹۲۵ء ۔

(ب) احادیث و تراجم

۱۳ - ابن حجر العسقلانی ۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ ۔ مصر ۔ سنہ ۱۹۳۹ء ۔
۱۴ - ابن عبدالبر ۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ۔ دکن ۔ سنہ ۱۳۳۶ھ ۔
۱۵ - ابن ماجہ ۔ القزوینی ۔ سنن المصطفیٰ ۔ مصر (مطبعۃ التازیہ) ۔
۱۶ - ابوداؤد ۔ السجستانی ۔ سنن ۔ کراچی ۔ سنہ ۱۳۶۹ھ ۔
۱۷ - احمد بن حنبل ۔ المسند ۔ مصر ۔ سنہ ۱۹۴۹ء ۔
۱۸ - البخاری ۔ صحیح ۔ دہلی ۔ سنہ ۱۹۳۸ء ۔

۱۹ - الترمذی - جامع الترمذی - دہلی - سنہ ۱۳۴۴ھ -
۲۰ - الحمیدی - ابی بکر عبداللہ - المسند - کراچی - سنہ ۱۹۶۳ء -
۲۱ - الدارمی - ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن - سنن - کانپور - سنہ ۱۲۹۳ھ -
۲۲ - امام مالک - موطا - مصر - سنہ ۱۹۵۱ء -
۲۳ - محمد فواد عبدالباقی - اللؤلؤ والمرجان فیما اتفق علیہ الشیخان - قاہرہ - سنہ ۱۹۴۹ء -
۲۴ - مسلم بن الحجاج القشیری - الصحیح - دہلی - سنہ ۱۳۴۹ھ -
۲۵ - ناصف - منصور علی - التاج الجامع لاصول فی احادیث الرسول - مصر - سنہ ۱۹۳۴ء -
۲۶ - النودی - ریاض الصالحین من کلام سید المرسلین - مصر - سنہ ۱۹۳۸ء -
۲۷ - النودی - تہذیب الاسماء واللغات - مصر (المنیریہ) -
۲۸ - الہیثمی - نورالدین علی - مجمع الزوائد ومنبع الفوائد - قاہرہ - سنہ ۱۳۵۳ھ -

(ج) فقہ اور اصولِ فقہ

۲۹ - ابن رشد القرطبی - بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد - مصر (ازہریہ) - سنہ ۱۹۶۶ء -
۳۰ - بحر العلوم ابی العیاش عبدالعلی محمد - رسائل الارکان - لکھنؤ - سنہ ۱۳۲۸ھ -
۳۱ - الجزیری - عبدالرحمٰن - کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ - مصر (طبع ثانی) -
۳۲ - السرخسی - شرح السیر الکبیر - دکن - سنہ ۱۳۳۵ھ -
۳۳ - المحمصانی - صبحی - فلسفۃ التشریع فی الاسلام - بیروت - سنہ ۱۹۴۶ء -

(د) دیگر کتب

۳۴ - الازرقی - ابوالولید - محمد بن عبداللہ - اخبار مکۃ وما جاء فیہا من الآثار مکہ سنہ ۱۳۵۲ھ
۳۵ - آلوسی - محمود شکری - بلوغ الارب فی احوال العرب - بغداد - سنہ ۱۳۱۴ھ -
۳۶ - ابنِ اثیر - عزالدین - الکامل فی التاریخ - بیروت - سنہ ۱۹۶۵ء -
۳۷ - ابنِ تیمیہ - السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ - قاہرہ - سنہ ۱۹۶۱ء -
۳۸ - ابنِ تیمیہ - منہاج السنۃ النبویہ فی نقض کلام الشیعۃ القدریۃ - قاہرہ - سنہ ۱۳۸۲ھ -
۳۹ - ابنِ حزم - جوامع السیرۃ - مصر (دارالمعارف) -
۴۰ - ابنِ حبیب بغدادی - کتاب المحبّر - دکن - سنہ ۱۹۴۲ء -

۴۱ - ابنِ خلدون - عبدالرحمٰن - مقدمہ - قاہرہ (مکتبۃ التجاریہ) -
۴۲ - ابنِ خلدون - عبدالرحمٰن - کتاب العبر و دیوان المبتدا و الخبر فی ایام العرب والعجم والبربر ومن عاصرہم من ذوی السلطان الاکبر - بولاق - سنہ ۱۲۸۴ھ -
۴۳ - ابنِ سعد - الطبقات الکبریٰ - بیروت - سنہ ۱۹۶۰ء -
۴۴ - ابنِ سید الناس - عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر - قاہرہ - سنہ ۱۳۵۶ھ -
۴۵ - ابن الطقطقی - محمد بن علی بن طباطبا - الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ - مصر - سنہ ۱۹۲۷ء -
۴۶ - ابن طولون - شمس الدین محمد بن علی - اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین - دمشق - سنہ ۱۳۴۸ھ -
۴۷ - ابن عبدالبر - الدرر فی اختصار المغازی والسیر - مصر - سنہ ۱۹۶۶ء -
۴۸ - ابن عبدربہ - شہاب الدین احمد - العقد الفرید - مصر - سنہ ۱۲۹۳ھ -
۴۹ - ابن قیم الجوزیہ - زاد المعاد فی ھدی خیر العباد - مصر - سنہ ۱۹۵۰ء -
۵۰ - ابن قیم الجوزیہ - الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیۃ - مصر - سنہ ۱۹۶۱ء -
۵۱ - ابنِ قتیبہ الدینوری - المعارف - مصر - سنہ ۱۹۳۴ء -
۵۲ - ابنِ کثیر - عماد الدین ابی الفداء اسماعیل - السیرۃ النبویہ - قاہرہ - سنہ ۱۹۶۴ء -
۵۳ - ابن کثیر - عماد الدین ابی الفداء اسماعیل - البدایۃ والنہایۃ - بیروت - سنہ ۱۹۶۶ء -
۵۴ - ابنِ ہشام - السیرۃ النبویۃ - مصر - سنہ ۱۹۳۶ء -
۵۵ - ابوالفداء - عماد الدین اسماعیل - کتاب المختصر فی اخبار البشر - مصر (الحسینیہ)
۵۶ - ابوعبید القاسم بن سلام - کتاب الاموال - مصر - سنہ ۱۳۵۳ھ -
۵۷ - ابویوسف - کتاب الخراج - قاہرہ - سنہ ۱۳۵۲ھ -
۵۸ - احمد امین - فجر الاسلام - قاہرہ - سنہ ۱۹۶۴ء -
۵۹ - بلاذری - احمد بن یحییٰ بن جابر - فتوح البلدان - مصر - سنہ ۱۹۰۱ء -
۶۰ - بلاذری - احمد بن یحییٰ بن جابر - انساب الاشراف - مصر - سنہ ۱۹۵۹ء -
۶۱ - جرجی زیدان - تاریخ التمدن الاسلامی - مصر (دار الہلال) -
۶۲ - جرجی زیدان - العرب قبل الاسلام - مصر (دار الہلال) -
۶۳ - الحلبی - علی بن برہان الدین - السیرۃ الحلبیہ - قاہرہ - سنہ ۱۹۶۲ء -
۶۴ - الخطیب البغدادی - تاریخ بغداد او مدینۃ السلام - بیروت - (دار الکتاب العربی) -
۶۵ - الدینوری - ابوحنیفہ احمد بن داؤد - الاخبار الطوال - قاہرہ - سنہ ۱۹۶۰ء -

۶۶ - دروزہ - محمد عزۃ - عصر النبی - بیروت - سنہ ۱۹۶۴ء -

۶۷ - الذہبی - تاریخ الاسلام وطبقات المشاہیر والاعلام - قاہرہ - سنہ ۱۳۶۷ھ -

۶۸ - راغب اصفہانی - الذریعۃ الیٰ مکارم الشریعۃ - نجف - سنہ ۱۹۶۷ء -

۶۹ - زرقانی محمد بن عبدالباقی - علی المواہب اللدنیہ - مصر - سنہ ۱۳۲۵ھ -

۷۰ - زکی صفوت احمد - جمہرۃ خطب العرب فی عصور العربیۃ الزاہرہ - مصر - سنہ ۱۹۳۳ء -

۷۱ - السمہودی - علی نور الدین - وفاءُ الوفاء باخبار دار المصطفیٰ - مصر - سنہ ۱۳۲۶ھ -

۷۲ - السہیلی - ابی القاسم عبدالرحمٰن - کتاب الروض الانف - مصر - سنہ ۱۹۱۴ء -

۷۳ - الشریف احمد ابراہیم - مکۃ والمدینۃ فی الجاہلیۃ وعہد الرسول - مصر (دار الفکر) -

۷۴ - الصعیدی - عبدالمتعال - السیاسۃ الاسلامیۃ فی عہد النبوۃ - قاہرہ (دار الفکر) طبع ثانی -

۷۵ - العباس احمد - بن عبدالحمید - کتاب عمدۃ الاخبار فی مدینۃ المختار - قاہرہ - (طبع ثالث)

۷۶ - طبری - ابوجعفر محمد ابن جریر - تاریخ الرسل والملوک - مصر - سنہ ۱۹۶۰ء -

۷۷ - کتانی الفاسی - التراتیب الاداریہ والعمالات والصناعات والمتاجر والحالۃ العلمیۃ التی کانت علی عہد تاسیس المدینۃ الاسلامیہ فی المدینۃ المنورۃ العلمیۃ - رباط - سنہ ۱۳۴۶ھ -

۷۸ - الماوردی - الاحکام السلطانیہ - مصر - سنہ ۱۹۰۹ء -

۷۹ - محمد احمد جاد وغیرہ - ایام العرب فی الجاہلیۃ - مصر - سنہ ۱۹۴۶ء -

۸۰ - محمود شیت خطاب - الرسول القائد - سنہ ۱۹۶۲ء (دار القلم) -

۸۱ - المقریزی - تقی الدین احمد - امتاع الاسماع بما للرسول من الانباءٓ والاموال والحفدۃ والمتاع - سنہ ۱۹۴۱ء - (مطبعۃ لجنۃ التالیف) -

۸۲ - المسعودی - ابی الحسن علی بن الحسین - مروج الذہب ومعادن الجوہر - مصر - سنہ ۱۹۵۸ء -

۸۳ - ہیکل - محمد حسین - حیاۃ محمد - قاہرہ - سنہ ۱۹۴۷ء -

۸۴ - وصفی - الدکتور مصطفیٰ کمال - محمد صلی اللہ علیہ وسلم و بنو اسرائیل - قاہرہ - سنہ ۱۹۷۰ء -

۸۵ - الواقدی - ابی عبداللہ محمد بن عمر - کتاب المغازی - کلکتہ - سنہ ۱۸۵۵ء -

۸۶ - الیعقوبی - تاریخ الیعقوبی - بیروت - سنہ ۱۹۶۰ء -

(۵) لغات اور معجم وغیرہ

۸۷ - ابن درید - جمہرۃ اللغۃ - دکن - سنہ ۱۳۴۵ھ -

۸۸ - ابن منظور الافریقی - لسان العرب - بولاق - ۱۳۰۳ھ۔
۸۹ - الزمخشری - اساس البلاغۃ - قاہرہ - ۱۹۵۳ء۔
۹۰ - الفیروز آبادی - مجد الدین - القاموس المحیط - ۱۹۳۸ء (دار المامون)۔
۹۱ - الفیومی - احمد بن محمد بن علی - المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر - مصر۔
۹۲ - یاقوت الحموی الرومی - معجم البلدان - بیروت - ۱۹۵۶ء۔

(د) کتبِ اردو

۹۳ - آرنلڈ - سر تھامس - دی پریچنگ آف اسلام (دعوتِ اسلام) - ترجمہ: عنایت اللہ دہلوی - کراچی - ۱۹۶۴ء۔
۹۴ - احسان بی اے - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میدانِ جہاد میں - کراچی - ۱۹۶۸ء۔
۹۵ - اسکاٹ - ایس پی - تاریخِ اندلس - ترجمہ: محمد خلیل الرحمٰن - مطبوعہ لاہور۔
۹۶ - اصلاحی - امین احسن - دعوتِ دین اور اس کا طریق کار - لاہور - ۱۹۵۸ء۔
۹۷ - اکبر خان - میجر جنرل - حدیثِ دفاع - لاہور - ۱۹۵۴ء۔
۹۸ - بیوری - جے - بی - تاریخ سلطنت رومہ - ترجمہ: ہاشمی فرید آبادی - دکن - ۱۹۲۹ء۔
۹۹ - بلنچلی - جے - کے - نظریۂ سلطنت - ترجمہ: قاضی تلمذ حسین - دکن - ۱۹۲۸ء۔
۱۰۰ - پرویز - معراجِ انسانیت - لاہور - ۱۹۶۸ء۔
۱۰۱ - تھیچر آلبور - تاریخ یورپ - ترجمہ: عبد الماجد وغیرہ - دکن - ۱۹۳۲ء۔
۱۰۲ - چیتی - بدر الدین - چین و عرب کے تعلقات - کراچی - ۱۹۴۹ء۔
۱۰۳ - حتّی - عرب اور اسلام - ترجمہ: مبارز الدین و معین خان - دہلی - ۱۹۵۹ء۔
۱۰۴ - حمید اللہ - قانون بین الممالک - دکن - ۱۳۶۴ھ۔
۱۰۵ - حمید اللہ - عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی - دکن (طبع دوم)۔
۱۰۶ - حمید اللہ - رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی - کراچی - ۱۹۶۱ء۔
۱۰۷ - حمید اللہ - عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ - دکن - ۱۹۴۵ء۔
۱۰۸ - ڈننگ - نظریات سیاسیہ - ترجمہ: قاضی تلمذ حسین - دکن - ۱۹۲۴ء۔
۱۰۹ - سعید انصاری - سیر انصار - اعظم گڑھ - ۱۳۴۳ھ۔
۱۱۰ - سعید احمد اکبر آبادی - وحی الٰہی - دہلی - ۱۹۵۲ء۔
۱۱۱ - سلیمان ندوی - ارض القرآن - اعظم گڑھ - ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۶ء۔

۱۱۲۔ سلیمان ندوی و شبلی نعمانی۔ سیرۃ النبیؐ۔ ج ا تا ۴۔ اعظم گڑھ۔ سنہ ۱۳۵۱ھ تا سنہ ۱۳۷۵ھ۔

۱۱۳۔ سلیمان منصورپوری۔ رحمۃ للعالمین۔ لاہور۔ سنہ ۱۹۵۳ء۔

۱۱۴۔ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ اسلام اور عربی تمدن۔ اعظم گڑھ (دار المصنفین)

۱۱۵۔ شیروانی، ہارون خان۔ سیاسیات کے اصول۔ علی گڑھ۔ سنہ ۱۹۵۳ء۔

۱۱۶۔ غازی۔ حامد الانصاری۔ اسلام کا نظام حکومت۔ دہلی۔ سنہ ۱۹۴۳ء۔

۱۱۷۔ کرین برنٹن، جان بی کرسٹوفر، رابرٹ ای ولف۔ تاریخ تہذیب۔ ترجمہ: غلام رسول مہر۔ لاہور۔ سنہ ۱۹۶۵ء۔

۱۱۸۔ لیبان۔ گستاؤ۔ تمدنِ عرب۔ ترجمہ: سید علی بلگرامی۔ لاہور۔ سنہ ۱۹۳۶ء۔

۱۱۹۔ مجیب اللہ ندوی۔ اہل کتاب صحابہ و تابعین۔ اعظم گڑھ۔ سنہ ۱۹۵۱ء۔

۱۲۰۔ مودودی۔ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔ لاہور۔ سنہ ۱۹۵۴ء۔

۱۲۱۔ مودودی۔ مذہب کا اسلامی تصور۔ کراچی۔ سنہ ۱۹۶۵ء۔

۱۲۲۔ مودودی۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔ لاہور۔ سنہ ۱۹۵۵ء۔

۱۲۳۔ مودودی۔ مسئلہ قومیت۔ پٹھانکوٹ۔ سنہ ۱۹۴۶ء۔

۱۲۴۔ مودودی۔ الجہاد فی الاسلام۔ لاہور۔ سنہ ۱۹۶۲ء۔

۱۲۵۔ مودودی۔ اسلامی ریاست۔ لاہور۔ سنہ ۱۹۶۲ء۔

۱۲۶۔ مودودی۔ تفہیم القرآن (جلد اوّل تا سوم مطبوعہ دہلی، اور جلد چہارم تا ششم مطبوعہ لاہور)۔

۱۲۷۔ میکیاویلی۔ پرنس (بادشاہ)۔ ترجمہ: ڈاکٹر محمود حسین۔ کراچی۔ سنہ ۱۹۵۷ء۔

۱۲۸۔ ندوی۔ ابوالحسن علی۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر۔ لکھنؤ۔

۱۲۹۔ یوسف الدین۔ اسلام کے معاشی نظریے۔ دکن۔ سنہ ۱۹۵۰ء۔

۱۳۰۔ الندوۃ العالمیۃ الاسلامیات۔ لاہور۔ سنہ ۱۳۷۹ھ۔

۱۳۱۔ چراغِ راہ۔ اسلامی قانون نمبر۔ جون سنہ ۱۹۵۸ء۔

۱۳۲۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ لاہور۔ سنہ ۱۹۶۸ء۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ

حکم (تو اور کسی کا) نہیں بجز اللہ کے

(الانعام ۵۷)

عہدِ نبوی میں تنظیمِ ریاست و حکومت



عہدِ نبویؐ میں

تنظیمِ ریاست و حکومت

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

باب اوّل

اسلامی ریاست کا ارتقاء

اسلامی ریاست: منہاج ومقصد

عہدِ نبوی میں اسلامی ریاست کا قیام نہ صرف مدینہ منورہ یا جزیرہ نمائے عرب میں بلکہ تمام انسانی دنیا کے لئے ایک نیا سیاسی تجربہ تھا۔ سلطنتوں اور حکومتوں کا خمیر محض مادی ضروریات کی تکمیل اور آسائشوں کی فراہمی کے لئے حیوانی اور بہیمی فطرت کی مٹی سے اٹھایا جاتا ہے۔ ان کا مقصد جہانگیری وجہانبانی ہوتا ہے، محکوموں کی اقتصادی دولت سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ غریب وبے بس رعایا کی سیاسی غلامی اور سماجی تحقیر سے حکامِ وقت کے جذباتِ حکمرانی وفرمانروائی کی تسکین مقصود ہوتی ہے۔ حکمرانوں کو نہ معاشرتی اصلاح کی فکر ہوتی ہے اور نہ سیاسی بہبود کی، نہ ان کو اقتصادی حالات کو سدھارنے کا غم ستاتا ہے نہ عوام کے اخلاق بلند کرنے کا۔ سلاطین، فرمانرواؤں اور طبقات حکمراں کو محض اپنے مادی فوائد عام طور سے عزیز ہوتے ہیں۔ مدینہ منورہ میں ۱۲ ربیع الاول ۱ھ / ۲۴ ستمبر ۶۲۲ء کو جس اسلامی ریاست کی داغ بیل پڑی تھی وہ دوسری دنیاوی سلطنتوں اور حکومتوں اور ریاستوں کی مانند ایک اور دنیاوی ریاست یا حکومت نہ تھی، بلکہ وُہ ایک ایسی مثالی ریاست اور قابلِ تقلید حکومت تھی جس کی بنیادیں خدائے قادر ومطلق کی حاکمیتِ اعلیٰ، پیغمبرِ خدا کی نیابتِ خداوندی، اُمتِ مسلمہ کی اخوت ومساوات اور احترام ومحبتِ بنی آدم کے عظیم اصولوں اور عملی نمونوں پر قائم کی گئی تھیں۔ یہی وُہ بنیادی خصوصیات ہیں جو اسلامی ریاست وحکومت کو اپنی تمام پیشرو اور جانشین دنیاوی حکومتوں اور ریاستوں سے ممتاز کرتی ہیں۔[1]

دُوسری طرف جزیرہ نمائے عرب کے قبائلی نظام میں ریاست کا کوئی تصور نہ تھا اور نہ منظم حکومت کا کوئی نظریہ وخیال۔ سیاسی تصورات دُھندلے تھے اور سیاسی نظام خام۔ بدوی عربوں (اهل البداوة) میں سیاسی نظام کی جگہ سیاسی انارکی تھی۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ آزاد وخودمختار تھا، مرکزیت واجتماعیت مفقود تھی۔ نتیجہ یہ کہ بدوی قبیلوں کی زندگی باہمی اختلافات، چپقلش، نزاع اور تصادم وتحارب کی تفسیر تھی، جو اپنی آزادی اور خودمختاری کے اظہار واقرار کے لئے دوسروں کی زندگی، مال اور آزادی سے کھیلتے رہتے تھے۔ ان کا نظریۂ حیات وسیاست معاصر ریاستوں اور اقوام کے نظریاتِ زندگی سے کچھ مختلف نہ تھا۔ مادی آسائشیں، دنیاوی راحتیں اور اقتصادی سہولتیں ان کا بھی مطمحِ نظر تھیں۔ اگرچہ ایرانی ساسانی سلطنت، رومی بازنطینی سلطنت اور ان دونوں کی ماتحت وباجگذار بادشاہتیں —— لخمی، غسانی، کندی اور حبشی وغیرہ —— ایک منظم ومرتب سیاسی ڈھانچہ رکھتی تھیں اور ان کے مقابلے میں عرب کی بدو قبائلی آبادیاں خاص کر اور شہری بستیاں

(اهل الحضارة) عام طور سے منظم نظامِ سیاست سے عاری اور تہی تھیں[۲]، تاہم دونوں کے نظریہ ہائے حیات اور سیاسی نظاموں کے اثرات یکساں تھے۔ دونوں کا بس ایک مقصد تھا، اپنی فلاح دوسروں کی قیمت پر۔

ان کے برعکس اسلامی ریاست کا مقصود صرف اپنی فلاح یا محض امتِ مسلمہ کی بہبود ہی نہ تھا۔ اس کا مطمحِ نظر پوری انسانیت، تمام کائناتِ انسانی کی فلاح و بہبود تھا۔ اس عظیم و بے مثل مقصود کے ساتھ یہ ریاست وجود میں آئی تھی۔ عملی طور پر اس کا ارتقاء ہجرتِ نبوی کے معاً بعد شروع ہوگیا اور حیاتِ نبوی کے آخری دنوں میں وہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا جب پُورے جزیرہ نمائے عرب نے مدینہ کے حاکم و رسول کی حکمرانی تسلیم کرلی تھی۔ لیکن اس اسلامی ریاست کا نظریاتی ارتقاء اس سے بہت پہلے شروع ہوا تھا۔ اس کی پہلی اینٹ تیرہ برس قبل غارِ حرا میں اُترنے والی پہلی وحی نے جبرئیل امین کے ہاتھوں قلب نبوی میں رکھی تھی اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ ایک کے بعد دوسری اینٹ رکھی جاتی رہی اور نظریاتی ارتقاء کا عمل جاری رہا تا آنکہ اس کا دھارا عملی ارتقاء کے دھارے میں مل گیا۔ اور پھر دونوں کی تکمیل ساتھ ساتھ ہوئی۔ لیکن نقطۂ کمال تک پہنچنے کے لئے ریاستِ اسلامی کو مختلف تشریعی تکوینی منزلوں، سیاسی نشیب و فراز اور معاشرتی شکست و ریخت کے تعمیری عمل سے گزرنا پڑا۔

تاریخی و نظریاتی پس منظر

عہدِ نبوی کی اسلامی ریاست کا بنیادی پتھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سماجی تحفظ کا نظام تھا جو بذاتِ خود "اُمۃ" کے تصور و نظریہ پر مبنی تھا۔ اُمتِ مُسلمہ کا کلیدی تصوّر و نظریہ بنیادی طور سے مکّی دورِ حیات میں ابھرا اور نشو و نما پذیر ہوا تھا جو ساتویں صدی عیسوی کے عربوں کے سیاسی نظریے سے یکسر مختلف تھا۔ غیر مسلم عربوں کا مرکزی خیال قبیلہ تھا جو بنیادی طور پر خون کے رشتہ[۳] کی اساس پر ایک انسانی گروہ ہوتا تھا۔ اگرچہ قبیلے حِلف، وِلاء اور جوار کے مصنوعی رشتوں[۴] کی بناء پر اپنے ارکان کی عددی قوت اور اس کے نتیجے میں عسکری طاقت بڑھاتے رہتے تھے تاہم ان کی سماجی بنیاد خون کا رشتہ ہی فراہم کرتا تھا۔ مصنوعی رشتوں کے ذریعہ نئے سیاسی و سماجی اتحاد و معاہدے تو قائم کئے جا سکتے تھے مگر وُہ انسانی محبّت، بھائی چارے، قربانی اور دُوسروں کی خاطر کچھ کرنے کا جذبہ عام طور سے نہیں پیدا کرتے تھے۔ پھر یہ مصنوعی رشتے اپنے دائرۂ کار اور افادیت کے اعتبار سے محدود ہوتے تھے۔ عموماً ان کا مقصد دشمن قبائل کے خلاف سیاسی اور عسکری اتحاد قائم کرنا ہوتا تھا۔ مصنوعی رشتوں کی بنا پر خُون کے رشتہ کی اہمیت میں ذرا بھی کمی نہ آئی تھی اور نہ ہی قبیلہ کی سیاسی اہمیت میں۔ چنانچہ عرب کے قبائلی نظام میں سماجی تحفظ کا سرچشمہ قبیلہ کی اجتماعی طاقت تھی۔ قبیلہ افراد کو جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دیتا تھا تو معاوضہ میں اپنے لئے غیر مشروط و غیر متزلزل وفاداری کا طالب تھا۔ یہی قبائلی فطرت تھی جس نے ہر اہم اور بڑے قبیلہ کو ایک آزاد و خود مختار سیاسی و معاشرتی وحدت کا درجہ عطا کردیا تھا۔ اگرچہ عربوں کو، چاہے وہ بدو ہوں یا شہری، منظم و باقاعدہ سیاسی نظاموں خاص کر اپنی سرحدوں پر واقع اس وقت کی دو عظیم ترین سلطنتوں ——— بازنطینی اور ساسانی ——— اور ان کی ماتحت متعدد دوسری بادشاہتوں اور ریاستوں کا بخوبی علم و تجربہ تھا تاہم ان کو

اپنی قبائلی زندگی اور اس کی عطا کردہ آزادی و خود مختاری اتنی عزیز تھی کہ وہ مرکزیت و تنظیم کے خیال سے لرزاں اور ریاست کے تصور سے بے بہرہ تھے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب کبھی ان کو ریاستی تنظیم کا خیال آتا تھا جو عموماً ایک یا دو قبیلوں یا شہروں اور علاقوں تک محدود ہوتا تھا تو صرف بادشاہت (ملوکیۃ)[۵] ہی کو اپنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کی وجہ شاید جزیرہ نمائے عرب میں قائم بعض قدیم و معاصر بادشاہتوں کا اور سرحدوں پر رومی اور ایرانی سلطنتوں کا اثر تھا۔

امت اسلامی کا جو تصور مکہ میں پیدا اور ترقی پذیر ہوا اس کی بنیاد خون کے رشتے پر نہیں بلکہ مذہب ——— اسلام ——— پر رکھی گئی تھی۔ یہ ایک انقلاب آفریں تصور تھا۔ اپنی ماہیت و حقیقت کے اعتبار سے ہی یہ نظریہ ان تمام سماجی تفریقوں، سیاسی و سماجی اونچ نیچ اور اقتصادی ناہمواری کی کاٹ کرتا تھا جس کی بنیاد خون کے رشتہ پر قائم سماج اور ریاست میں ہوتی ہے۔ چنانچہ رنگ، نسل، وطن، علاقے اور قوم کے تمام تفرقے مٹ گئے تھے اور اُمتِ اسلامی میں وہ تمام لوگ شامل اور اس کے رکن بن گئے جو اسلام کو مانتے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ یہ خیال کہ اُمتِ اسلامی کا یہ تصور و نظریہ واضح طور سے قرآن و حدیث اور سنتِ نبوی میں بیان نہیں ہوا ہے بلکہ ہر جگہ مضمر و محذوف ہے[۶]، صحیح نہیں ہے۔ قرآن کی متعدد آیات، بے شمار احادیثِ نبوی اور مختلف سنن رسول میں اس نظریہ کو واضح اور واشگاف انداز میں بیان کیا گیا ہے[۷]۔ پھر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدائے واحد و مطلق کا پیغمبر تسلیم کرنا ہی یہ ثابت و لازم کر دیتا ہے کہ رسول کا ایک فرضِ منصبی تو یہ ہے کہ وہ پیغامِ خداوندی کو قبول کر کے اسے انسانوں تک پہنچائے اور پھر اس کو عملی جامہ پہنا کر ان کے لئے ایک اُسوۂ عمل قائم کرے۔ ظاہر ہے کہ پیغمبرِ خدا کی مرضی اور اس کے قوانین و احکام کو انسانوں تک پہنچاتا اور پھر ان پر عمل کراتا ہے۔ اس اعتبار سے پیغمبر خدا کا نائب اور جانشین ارضی ہوتا ہے اور اصل کارساز و مقتدر خداوند تعالیٰ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے خدا خود امتِ اسلامی کا حاکمِ اعلیٰ ہوتا ہے۔ گویا کہ اسلامی معاشرہ اور اُمت کا سرچشمۂ حکمرانی اور فرمانروائی جس کو موجودہ سیاسی اصطلاح میں اقتدارِ اعلیٰ یا حاکمیت مطلقہ تامہ کہتے ہیں۔ خدا کی ذات اقدس ہوتی ہے کیونکہ وہ تمام کائنات کا خالق و مالک ہے۔ مگر اس خدائی اقتدارِ اعلیٰ کو نافذ و جاری پیغمبر کی ذات کرتی ہے اور اس کے بعد یہ ذمہ داری اس کے سیاسی خلفاء پر انفرادی طور سے اور امتِ مُسلمہ پر اجتماعی طور سے عائد ہوتی ہے۔ عہدِ جدید کے بعض عظیم مسلم مفکرین نے قرآن مجید کی وہ سیاسی تعلیمات ایک جگہ جمع کر دی ہیں جو اسلام کے تصورِ کائنات، حاکمیتِ الٰہیہ، اللہ کی قانونی حاکمیت، رسول کی حیثیت، قانون کی بالاتری، خلافتِ الٰہی اور اس کی اجتماعی اہمیت، اسلامی ریاست کی اطاعت کے حدود، اس کے مقصد، رعایا یا باشندوں اور شہریوں کے حقوق، حکمرانوں کی صفات و خصائص اور سیاسی اصولوں سے متعلق ہیں[۸]۔ ان سے اسلام کے سیاسی اصولوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور اس کے اصولِ حکمرانی مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔

مکہ میں چونکہ قریشی اشرافیہ کی بالادستی ہر میدان حیات میں قائم و دائم تھی اس لئے وہاں اسلام اُمت کے تصور کو ایک اخلاقی و نظریاتی بنیاد تو فراہم کر سکا لیکن اس کو مکمل طور سے کوئی عملی شکل نہ دے سکا۔ تاہم جب اسلام مکہ میں ایک سماجی اور سیاسی نظریہ کی شکل میں اُبھرا تو اسلامی اُمت کے ایک مخصوص و ممتاز نظریہ کا اولین اظہار مواخاۃ (بھائی چارے) کی شکل میں ہوا۔

ابنِ اسحاق اور دُوسرے ابتدائی سیرت نگاروں اور اسلامی مورخین کا بیان ہے کہ جب مکہ میں مسلمانوں کی ایک معتدبہ تعداد ہوگئی

اور ایک جماعت وجود میں آگئی تو آپ نے مسلمانوں کے درمیان مواخاۃ قائم کردیا۔ یعنی دو مکی مسلمانوں کو ایک دوسرے کا اصلی بھائی بنا دیا جاتا تھا جو عملی و نظری دونوں اعتبار سے خون کے رشتہ سے زیادہ پکا اور مستحکم رشتہ بن جاتا تھا۔ اس طرح حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی اور حضرت زبیر بن عوام اسدی بھائی بھائی بن گئے تھے تو دوسری طرف جناب رسالتمآبؐ نے حضرت علی کو اپنا اسلامی بھائی قرار دیا تھا۔[9] ظاہر ہے کہ اسی طرح دوسرے تمام مسلمانانِ مکہ ایک دوسرے کے بھائی بنے تھے۔ اس نئے رشتۂ اخوت نے ایک طرف تو اسلام یا مذہب کی افادیت، اہمیت اور فعالیت بڑھا دی اور مسلمانوں کے ذہن نشین کر دی تھی تو دوسری طرف دو مسلمانوں کے درمیان جذبۂ اخوت کو مضبوط تر کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو اپنے خاندان اور رشتہ داروں سے کٹ جانے کے غم کو ہلکا کر دیا تھا اور جینے کا ایک عزم جزم، ایک جوش و ولولہ اور ایک نیا رنگ و آہنگ ان کو عطا کر دیا تھا۔ مکی دور کا یہ رشتۂ اخوت و مواخات اُمتِ اسلامی کے قیام کا پہلا بنیادی پتھر تھا۔ مگر مکی عہد میں متعدد اور گوناگوں سماجی، سیاسی اور اقتصادی دشواریوں اور رکاوٹوں کے سبب اس پتھر پر امتِ اسلامی کی مکمل عمارت تعمیر نہیں کی جا سکی۔ تقدیرِ الٰہی نے یہ اہم ترین کام مدنی مسلمانوں کی نصرت و حمایت کے سایہ میں لینا چاہا تھا اس لئے ہجرتِ مدینہ تک ملت و امتِ اسلامی کو اپنے مکمل و منظم وجود و ارتقاء کے لئے انتظار ساغر کھینچنا تھا۔

(۱) پہلا مرحلہ: ہجرت

یثرب میں اسلام کا تعارف کافی پہلے ہو چکا تھا۔ روایت ہے کہ شہر انصار کا ایک سر برآوردہ و سرکردہ سردار سوید بن صامت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں بعثت کے صدرِ اوّل ہی میں مکہ جا کر حاضر ہوا تھا اور اسلام کی حقانیت کا قائل بھی ہو گیا تھا لیکن شرفِ اسلام سے محروم رہا اور جنگِ بعاث (۶۱۵ء) میں اظہار و اقبالِ اسلام سے قبل مارا گیا۔[10] اسی طرح اسی زمانہ کے قریب اوس کے ایک اہم سردار ایاس بن معاذ بھی اسلام سے مکہ میں متعارف ہوئے تھے اور وہ بھی اسلام کے اعلان و اجہار سے پہلے جنگِ بعاث میں مارے گئے۔[11] محض یہی دو واقعات تنہا نہیں تھے متعدد ایسے واقعات رہے ہوں گے اور اسلام سے یثرب والے ابتدا ہی میں روشناس ہو گئے ہوں گے کیونکہ ان کے مکہ والوں سے تجارتی، معاشرتی اور مذہبی تعلقات تھے اور دونوں شہروں کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ برابر لگا رہتا تھا۔ اسلام کے اس ابتدائی تعارف نے یثرب میں اس کے قبول کرنے کے لئے زمین ہموار اور ذہن تیار کر دئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سنہ ۱۱ نبوی / سنہ ۶۲۰ء میں آپ نے خزرج کے چھ صالح و سرکردہ جوانوں کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے بلا کسی پس و پیش کے اسے قبول کر لیا۔[12] بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ تھا کیونکہ مسلمان ہونے والے یثربیوں کی تعداد بہت حقیر تھی تاہم یہی سرزمین یثرب میں اسلام کا پہلا پودا تھا اور اسی نے اسلامی اُمت کا پہلا بیج بویا تھا۔ ان نومسلم خزرجیوں نے اسلام کی اشاعت کا فریضہ اپنے ذمے لے لیا اور اس تندہی اور جوش سے کام کیا کہ یثرب میں مسلمانوں کی تعداد معتدبہ ہو گئی[13] اور ان میں سے بارہ مسلمان نمائندوں نے دوسرے برس سنہ ۱۲ نبوی / سنہ ۶۲۱ء میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ جا کر ملاقات کی اور پہلی بیعت عقبہ کی۔ یہ معاہدہ یا بیعت اپنی

شرائط کے اعتبار سے سیاسی لحاظ سے زیادہ اہم نہ تھی کہ ان کے مطابق مسلمانانِ یثرب نے چند اخلاقی ضوابط کی بجاآوری کا وعدہ کیا تھا۔ اسی بنا پر اس بیعت کو ہمارے مستند مورخین عموماً بیعت النساءؑ (عورتوں کی بیعت) کے نام سے یاد کرتے ہیں کہ اسی قسم کے وعدے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان خواتین سے قبولِ اسلام کے وقت لیتے تھے۔[14] سیاسی اہمیت نہ ہو، مگر ان شرائط نے مسلم سماج کے اخلاقی اصول وضع کئے تھے اور اُمتِ اسلامیہ کو ایک پاکیزہ، قائم و دائم روایات فراہم کی تھیں جنہوں نے بعد میں اسلامی معاشرہ کی اساسی تشکیل کی تھی۔ اس بیعت کی دوسری سماجی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں یثرب کے دونوں متحارب و متصادم قبیلوں —— اوس و خزرج —— کے نمائندے شامل تھے۔ یہ حقیقت اور یثرب میں اسلام کی اشاعت اور اس کے سماجی پس منظر کے واقعات ثابت کرتے ہیں کہ اسلام کو یثرب میں روزِ اول سے ایک معاشرہ ساز سماجی اصلاحی تحریک کے طور پر قبول کیا گیا تھا کیونکہ اسلام نے مدتوں سے باہم دست بگریباں رہنے والے یثربیوں کو ایک دُوسرے کا بھائی، ہمدم اور دوست بنا دیا تھا۔ شہر کے دونوں حریف و مقابل سماجی طبقات نے اسلام کی اس شیرازہ بندی کی صلاحیت اور سماجی فعالیت کو بخوبی سمجھ لیا تھا۔[15] یہی وجہ ہے کہ یثرب میں اسلام کی اشاعت قبائلی خطوط پر نہیں ہُوئی تھی کہ ایک قبیلہ یا چند خاندانوں میں وہ محدود رہتی بلکہ وہ طبقاتی حد بندی کو پار کر کے آفاقی بنی تھی اور اس طرح اسلام نے قبائلی عصبیت کو دبا یا تھا اور ایسا نہیں ہونے دیا تھا کہ ایک قبیلہ کی دشمنی یا تعصب میں دوسرے مخالف قبیلہ نے اسے ماننے سے انکار کر دیا ہو۔ بہرحال جس طرح سے بیعت عقبۂ اولیٰ میں چھ خزرجی اور تین اوسی مسلمانوں نے دستِ مبارک رسول پر بیعت کی تھی اور ایک مشترک مقصد کے حصول کی خاطر ایک دُوسرے سے جس طرح تعاون کا اظہار کیا تھا وہ دراصل یثرب میں امتِ مسلمہ کے قیام کا پیش خیمہ تھا۔

ظاہر ہے کہ اسلام کی اشاعت پر امتِ مسلمہ کا اور اس پر اسلامی ریاست کے قیام کا انحصار تھا۔ مدینہ منورہ میں اشاعتِ اسلام کا کام یثربی —— اوسی اور خزرجی —— مسلمان جس تندہی، جوش اور ولولے سے کر رہے تھے اور اس میں جتنی ان کو کامیابی مل رہی تھی اس کے لئے کسی خارجی مدد کی ضرورت نہ تھی۔[16] تاہم مسلمانانِ شہر نو کی مذہبی و تعلیمی تربیت اور اس سے زیادہ معاشرتی تنظیم کے لئے ایک ایسے صحابیٔ رسول کی ضرورت تھی جو کہ اسلام کی صحیح نمائندگی کر سکے اور مقامی قبائلی تعصبات سے بلند تر ہو تاکہ دونوں طبقات اس پر یکساں اعتماد و یقین کر سکیں۔ اسی لئے انہوں نے بیعتِ عقبۂ اولیٰ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک معلّم کی درخواست کی تھی جو ان کو قرآن اور اسلام کی تعلیم دے سکے۔ آپ کی نگاہِ انتخاب قریش کے خاندان عبد الدار کے ایک نوجوان مسلمان حضرت مصعب بن عمیر پر پڑی جنہوں نے راہِ حق میں خاندانی وجاہت و ثروت اور دنیاوی عیش و عشرت کو تج دیا تھا۔ مدینہ پہنچ کر حضرت مصعب عبدری نے اشاعتِ اسلام کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے کی شیرازہ بندی کا بھی کام کیا۔ وہ مسلمان آبادی کے معلّم، امام اور ایک معنی میں خلیفہ و نائبِ رسول تھے۔[17]

یثربی مسلمانوں اور حضرت مصعب عبدری کی کوششیں رنگ لائیں اور یثرب میں اسلام اتنی تیزی اور ہمہ گیری سے پھیلا کہ اوس و خزرج کا کوئی خاندان، خاص مدینہ میں ایسا نہ تھا جس کے گھر میں خدا و رسول کا نام نہ گونجتا ہو۔ مورخین کا بیان ہے کہ اوس مناۃ کے صرف چار گھرانے بنو خطمہ، بنو وائل اور بنو واقف اور بنو امیہ بن زید دائرہ اسلام کے باہر رہ گئے تھے۔[18] یثرب

کی سرزمین پر اسلام کی کامیابی کا اظہار اور پیغمبر اسلام کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے ۱۲ سنہ نبوی / ۶۲۲ء میں امتِ مسلمہ کے تقریباً پچھتر[۱۹] اشخاص و افراد مکہ میں بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ یہ بیعتِ عقبہ ثانیہ کہلاتی ہے۔ اور اس کو بیعتِ حرب (جنگ کی بیعت یا معاہدہ) بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس موقعہ پر خزرج و اوس کے مسلمان نمائندوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وطن میں آ بسنے کی دعوت دی اور جب آپ نے اسے قبول کر لیا تو انھوں نے نہ صرف خدا اور اس کے رسولؐ کی غیر مشروط و غیر متزلزل وفاداری کا دم بھرا تھا بلکہ آپ کے جان و مال کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔ دراصل یہ معاہدہ دفاعی اور جارحانہ جنگ دونوں کا معاہدہ تھا۔[۲۰] یہ وہ بنیادی اور کلیدی پتھر تھا جس پر ہجرت کے بعد یثرب میں اُمتِ اسلامی کی بنیاد رکھی جانی تھی۔

یثرب میں ہجرتِ نبوی تک امتِ مسلمہ کی تشکیل و شیرازہ بندی کے لئے آپ نے بارہ اشخاص پر مشتمل سربرآوردانِ یثرب کی ایک جماعت مقرر کی۔ ان میں سے ہر ایک نقیب تھا اور ان سب پر ایک نقیب النقباء تھا۔ نو نمائندے خزرج کے مختلف قبیلوں سے اور تین اوس کے مختلف گھرانوں سے منتخب کئے گئے تھے۔ یہ نکتہ اہم ہے کہ نقیبوں کے ناموں کا انتخاب خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے نمائندگانِ یثرب نے کیا تھا۔ اس جماعتِ نقباء کی سرکردگی اور سیادت و ریاست کی فضیلت کا سہرا حضرت اسعد بن زرارہ کے سر بندھا تھا جو خاندان بنی نجار / خزرج کے ایک معزز اور با اثر سردار تھے اور جنہوں نے وطنِ مالوف میں اسلام کی اشاعت اور اُمتِ مسلمہ کی شیرازہ بندی کا کام بڑی لیاقت اور خوبی سے کیا تھا۔ اور اس طرح اپنی قائدانہ صلاحیت، معاملہ فہمی، حُسنِ تدبیر اور مقبولیت و سیادت کا ثبوت دے چکے تھے۔[۲۱]

بیعتِ عقبہ ثانیہ دراصل ہجرتِ یثرب کا دیباچہ تھی۔ اس نے مکہ کے ستم رسیدہ اور منتشر مسلمانوں کے لئے ایک جائے پناہ فراہم کر دی تھی، جہاں نہ صرف مسلمانانِ مکہ بلکہ مسلمانانِ عرب آزادی سے اپنے مذہب و عقیدہ کے مطابق زندگی بسر کر سکتے تھے بلکہ امتِ مسلمہ کی تشکیل کر سکتے تھے جو ہجرت کا اصل مقصد تھا۔ اس ضمن میں یہ نکتہ ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ محض ہجرت مقصود نہ تھی اور نہ ہی اس کی برکت میں ملنے والی آزادیٔ فکر و عقیدہ و عمل۔ اگر یہی مطلوب رہا ہوتا تو ۵ سنہ نبوی / ۶۱۵ء میں ہجرتِ حبشہ کافی ہوتی کیونکہ مسلمانانِ مکہ کو نجاشی کے حبش میں مکمل مذہبی و سماجی تحفظ حاصل تھا۔ حبشہ کو بے سرو سامان مکی مسلمانوں نے اس لئے ہجرت کی تھی کہ مکہ کے مخالفان و دشمنانِ اسلام نے نہ صرف ان کی آزادیِ فکر و عمل پر قدغن لگا دی تھی بلکہ ان پر عرصۂ حیات بھی تنگ کر دیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی تعذیب و ظلم و جبر سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے ان کو ہجرت کی اجازت دے دی تھی مگر تاریخِ اسلامی میں کسی روایت سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ کی ہجرت کے بارے میں سوچا بھی ہو۔ اذنِ خداوندی ملنے کے بعد آپ نے جب ہجرت کے بارے میں سوچنا اور مختلف مقامات کے انتخاب کے بارے میں غور کرنا شروع کیا تھا تو بھی آپ کی نگہِ فکر اور نظرِ انتخاب جزیرہ نمائے عرب کے کسی مرکزی مقام ہی پر پڑتی تھی۔[۲۲] وطن ثانی بلکہ معہدِ اسلام کے لئے مدینہ کا انتخاب سیاسی، سماجی، اقتصادی، فوجی بلکہ ہر اعتبار سے مناسب ترین تھا جسے بعد کے تاریخی واقعات نے صحیح ثابت کر دیا۔ تاریخی دھارے بھی اسی سمت میں بہہ رہے تھے اور ہجرت سے دو سال پہلے کے تاریخی واقعات اور عناصر نے مدینہ کے انتخاب پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی۔[۲۳]

بیعتِ عقبہ ثانیہ نے مسلمانانِ مکّہ کی ہجرتِ مدینہ کو ایک طرح سے ناگزیر بنا دیا تھا۔ چنانچہ اجازتِ الٰہی اور اذنِ نبوی ملتے ہی صحابہ کرام نے مدینہ کا رُخ کیا۔[۲۴] یہ صحیح خیال نہیں ہے کہ مسلمانانِ مکّہ میں سے اکثر نے چھُپ کر اور عالمِ بے سروسامانی میں ہجرت کی تھی دراصل مہاجرینِ مدینہ کے تین طبقات کئے جا سکتے ہیں: اول وہ مالدار، بااثر اور سیاسی و سماجی اعتبار سے سربر آوردہ مکی مسلمان تھے جنہوں نے علانیہ باجماعت اور اپنی تمام منقولہ جائدادوں، اثاثوں اور مال و دولت سمیت ہجرت کی تھی۔ دوسرا طبقہ ان مہاجرینِ مکّہ پر مشتمل تھا جو قریش اور دوسرے عرب قبائل کے مختلف خاندانوں کے نوجوان، سماجی و سیاسی طور سے خاصے معزز افراد تھے مگر اقتصادی اعتبار سے اپنے خاندان یا قبیلے پر منحصر تھے اس لئے بوقتِ ہجرت وُہ اپنے ساتھ زیادہ مال و دولت بھی نہ لے جا سکے تھے اور عموماً چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں عازمِ سفر ہُوئے تھے۔ ان میں سے کچھ قریشی روک ٹوک کی بنا پر یا اس سے زیادہ اپنے خاندان اور قبیلہ والوں کے خوف سے چھُپ کر ہجرت کے سفر پر نکلے تھے۔ اور تیسرا طبقہ ان نادار، بے آسرا اور سماجی و اقتصادی طور پر مجبور مسلمانوں پر مشتمل تھا جن کو مکّہ میں کسی کی پناہ و حمایت حاصل نہ تھی چنانچہ وُہ موقع پاتے ہی نکل کھڑے ہوتے تھے۔ اور ایسا عموماً خفیہ طور سے ہی ممکن تھا۔[۲۵] مکّہ میں رہ جانے والے مسلمانوں میں صرف غلام، موالی، مفلسی سے مجبور لوگ ہی نہیں رہ گئے تھے بلکہ دُوسرے طبقے کے کافی افراد ایسے تھے جو اپنے خاندان اور قبیلہ والوں کی چیرہ دستی اور جبر کی بنا پر ہجرت نہیں کر سکے تھے بلکہ ان میں سے بعضوں کو تو ہزارہا بہانوں اور مکر و فریب سے مدینہ سے واپس لا کر قید کر دیا گیا تھا۔ متعدد جاں نثارانِ رسول جیسے حضرات ابوبکر، علی، طلحہ بن عبید اللہ تیمی، عبد الرحمٰن بن عوف، زبیر بن عوام اور دُوسرے کئی عظیم و اکابر صحابہ ایسے تھے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرتِ مدینہ کی راہ دیکھ رہے تھے۔ بعض مورخین کا یہ خیال کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ مکرمہ میں اکابر صحابہ میں سے صرف اول الذکر دو بزرگ یا محض گنتی کے چند مسلمان رہ گئے تھے صحیح نہیں ہے۔[۲۶] جاں نثاروں کی کافی بڑی جماعت ہم رکابی کا شرف حاصل کرنے کی منتظر تھی یا ذاتِ نبوی کو نرغۂ اعدا میں تنہا چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہ تھی۔ جو بزرگ و نوجوان صحابہ کرام پہلے ہجرت کر گئے تھے ان پر کوئی نکیر نہ تھی کہ وہ اذنِ نبوی سے گئے تھے اور وہاں ایک عظیم تعمیری کام میں دل و جان سے لگ گئے تھے یعنی نئے مرکزِ اسلامی میں تنظیمِ معاشرہ اور تشکیلِ اُمت میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ بالآخر وُہ ساعتِ مسعود آ پہنچی کہ حکمِ الٰہی نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رخصت و اجازتِ ہجرت دی اور آپ اپنے رفیقِ غار، صدیقِ دیرینہ، جاں نثارِ قدیم حضرت ابوبکر تیمی کی معیت میں پنجشنبہ یکم ربیع الاول سنہ ۱ھ / ۲۴ اگست سنہ ۶۲۲ء کو ہجرتِ مدینہ کے سفر پر نکلے اور ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱ھ / ۴ ستمبر سنہ ۶۲۲ء کو قبا پہنچے۔[۲۷]

قبا میں حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد ہی ریاست اسلامی اور اُمتِ مُسلمہ کی تشکیل و تنظیم کا پہلا دن ہے۔ کیونکہ روایات شاہد ہیں کہ قبا میں آپ نے جو پہلا کام کیا وہ پہلی مسجد نبوی کی تعمیر تھی۔[۲۸] اگرچہ ورودِ مسعود سے قبل قبا اور مدینہ کے مسلمان نمازیں ادا کرتے تھے لیکن ان کی کوئی باقاعدہ اور مرکزی مسجد نہ تھی۔ اسلام میں مسجد کو جو مرکزی اہمیت حاصل ہے اور صدرِ اول میں جو اس کی سیاسی اور سماجی حیثیت تھی اس پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں کہ وہ معروف و مشہور حقیقت ہے۔ بہر حال مسجد قبا کی پہلی اینٹ دراصل مدنی اسلامی معاشرہ کی کلیدی اینٹ تھی۔ دو ہفتے یا چودہ راتیں قبا میں قیام کے بعد آپ مدینہ منورہ پہنچے جبکہ تاریخ ۲۶ ربیع الاول سنہ ۱ھ / ۱۸ ستمبر سنہ ۶۲۲ء تھی۔[۲۹]

(۲) دُوسرا مرحلہ : اُمت کی تشکیل

مقبول عام اور مشہور خیال ہے کہ چونکہ مہاجرینِ مکہ بالکل خالی ہاتھ، تہی دست اور بے سرو سامان آئے تھے اس لئے وہ مدینہ کے مسلمانانِ اوس و خزرج کی فیاضی، وسیع القلبی اور مہمان نوازی پر اپنی معیشت و معاش کے لئے منحصر تھے مدنی مسلمانوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کی جس محبت، حوصلہ مندی، دل سوزی اور خلوص سے مہمانی کی تھی وہ تاریخِ اسلام کا ایک روشن باب، اسلامی تعلیمات اخوت و مساوات کا بے نظیر نمونہ اور مذہبی تعلق و بھائی چارے کا عظیم ترین اُسوہ ہے جس نے وسیع قلب و فیاض و مخلص مدنیوں کو تاقیامت انصار اللہ و الرسول کے عظیم و قابلِ فخر لقب سے ممتاز و مشہور کر دیا۔ انصارِ مدینہ کی مدد اور تعاون، مہمان نوازی اور محبت، پُرخلوص تعلقِ خاطر اور دل سوزی سے کسی دیانت دار مورخ کو انکار نہیں ہو سکتا تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام مہاجرینِ مکہ بالکل ہی بے سرو سامان و تہی دست نہ تھے اور وہ محض فیاضی و سخاوتِ انصار پر منحصر نہ تھے اور نہ ہی وہ مدنی معیشت پر بوجھ بنے تھے جیسا کہ عام خیال ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے مدینہ کے معاشی استحکام میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا تھا اور مسلم معیشت کو نئی جہتیں عطا کی تھیں جن کا جائزہ کہیں اور لیا جا چکا ہے[۳۰] اور جس سے سرِ دست ہمیں بحث نہیں ہے۔ لیکن مہاجرینِ مکہ کی ناداری اور مفلسی کے مفروضے نے اس غلط تصور کو شہرت دی ہے کہ مہاجرینِ مکہ اور انصارِ مدینہ کے درمیان رشتۂ محبت و اخوّت —— مواخاۃ —— اس لئے قائم کیا گیا تھا کہ بے گھر در مسلمانوں کو اقتصادی بنیاد فراہم کی جائے۔ یہ صحیح ہے کہ انصارِ مدینہ نے مدتوں مہاجرینِ مکہ کی مہمان نوازی کی تھی اور ان کو اپنے گھروں میں رکھا اور کھلایا پلایا تھا حتٰی کہ اپنی اُفتادہ زمینیں ان کو بخش دی تھیں اور کسی حد تک ان کو اپنی جائدادوں بالخصوص باغوں اور کھیتوں میں شریک بھی کر لیا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانانِ مکہ نے اپنے مالی اور اقتصادی وسائل خود تلاش کر لئے تھے اور وہ کسی کے دستِ نگر محض نہ تھے۔[۳۱]

مواخاۃ دراصل مسلم معاشرہ —— امۃ —— کی تشکیل کا دوسرا مرحلہ تھا جس کا مقصد ایک نووارد شہر کو ایک قدیم باشندے کے ساتھ رشتۂ اخوت و محبت میں منسلک کر دینا تھا تاکہ خارجی و اندرونی، ملکی و غیر ملکی، اپنے پرائے اور فرزندانِ زمین و تازہ واردان بساط اور سب سے بڑھ کر مکی اور مدنی کا فرق مٹ جائے اور مدینہ کی مسلم آبادی ایک مذہبی وحدت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سماجی اور معاشی وحدت بھی ہو جائے۔ جس طرح اسلام اور پیغمبرِ اسلام نے مذہبی نظریۂ اخوت کے ذریعہ اوس و خزرج کی قبائلی تفریق اور قبائلی عداوت کو مٹایا اور ان کو ایک مسلم اکائی بنایا تھا بالکل اسی طرح وہ مدینہ والوں اور مکہ والوں یا انصار و مہاجرین کی سماجی تفریق مٹا کر مدینہ میں صرف ایک سماجی وحدت —— مسلم معاشرہ —— کے تصور کو فروغ بلکہ عملی شکل دینا چاہتے تھے۔

چنانچہ جب حضورِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی تعمیر قریب قریب مکمل کر لی تو روایات کے مطابق مواخاۃ کا پہلا عملی قدم اٹھایا گیا۔ ابتدائی مرحلے میں ابنِ اسحاق کے مطابق تقریباً ۴۵ مہاجرین اتنے ہی انصاریوں کے بھائی بنائے گئے[۳۲]۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مکہ مکرمہ میں آپ نے دو مکی مسلمانوں کو ایک دُوسرے کا بھائی قرار دیا تھا اور مدینہ منورہ

میں ایک مہاجر اور ایک انصاری کے درمیان یہ رشتۂ مودت قائم کیا تھا۔ شیرازہ بندی کے اس حکیمانہ معاملے اور طریق نے پہلے مکہ کے قبائلی تفرقوں کو مٹایا تھا، نفرتوں کو ختم کیا تھا اور عصبیت کو نابود کیا تھا اور اب اس کو وسعت دے کر دو شہروں کے سماجی قبائلی تعصبات کا خاتمہ کر کے دو مختلف سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تہذیبی پس منظر کے طبقوں میں ہم آہنگی پیدا کی تھی۔ یہ در اصل اس سماجی عمل شیر و شکر کا آغاز تھا جس نے روزِ اول سے اخوت اسلامی کا اعلان و دعویٰ کیا تھا اور حجۃ الوداع کے عظیم موقعہ پر عالمی اسلامی برادری اور آفاقی اخوتِ اسلامی کے عظیم نظریہ پر منتج ہوا تھا۔ اس کے نتیجے میں کالے، گورے، سرخ و سیاہ، رنگدار و سفید، عربی عجمی غرض کہ نسل، وطن و علاقہ اور رنگ وغیرہ پر مبنی تمام امتیازات کو مٹا دیا گیا تھا اور ایک ایسے آفاقی اور عالمی معاشرہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا جس میں تمام مسلمانانِ عالم بلا کسی امتیاز و تفریق کے ایک دوسرے کے بھائی اور مذہبی اور سماجی طور پر ہم پلہ، ہم سر اور مساوی تھے۔

عملی اعتبار سے مواخاۃ کا رشتہ خون کے حقیقی رشتوں سے کہیں زیادہ بڑھ گیا تھا۔ عہدِ نبوی میں مواخاۃ نے جن دو مہاجر اور انصاری مسلمانوں یا دو خاندانوں اور گھرانوں کو رشتۂ مودت و الفت میں باندھا تھا۔ وہ اتنا پائیدار اور مستحکم نکلا کہ اکثر و بیشتر صحابۂ کرام نے اپنے مذہبی یا مواخاۃ کے بھائیوں کو اپنے خون کے رشتہ داروں پر ہر لحاظ سے ترجیح دی اور تا عمر وہ اس عظیم رشتۂ اخوت کو سرمایۂ حیات سمجھتے اور نبھاتے رہے۔[۴۳] ہماری تفسیری، اخباری، سیرت اور حدیث کی روایات یہاں تک اعلان کرتی ہیں کہ ایک مذہبی بھائی کے انتقال پر اس کا ترکہ دوسرے مذہبی بھائی کو ملتا تھا اور خون کے حقیقی رشتے دار اس سے محروم رہتے تھے۔[۴۴] لیکن اس دعوے کی تصدیق یا ثبوت میں ہمیں کوئی تاریخی واقعہ نہیں ملتا جس کے مطابق متوفی کی جائداد کا وارث کوئی مسلم بھائی ہوا ہو۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورہ انفال کی آیت عذا میں مذکور الفاظ خداوندی بعضھم اولیاء بعض (وہ لوگ باہم بھائی بھائی ہیں) کی تفسیر میں مسلم بھائی کے لئے اپنے متوفی بھائی کی جائداد و ترکہ میں جس حق کا دعویٰ کیا گیا ہے وہ اس نظریہ و خیال کا منطقی نتیجہ ہے جس کے تحت مواخاۃ کے رشتہ کے قیام کا سبب مہاجرین کی اقتصادی ناداری کو بتایا گیا ہے۔ اسی بنا پر بعض مغربی مورخین کا خیال ہے کہ ترکہ و وراثت میں مشکلات ہونے کے سبب غزوۂ بدر کے معاً بعد یا کچھ مدت کے بعد رشتۂ مواخات ہی کو ختم کر دیا گیا۔[۴۵] ہمارے مسلم مورخین میں بعض اس کے قائل ہیں کہ آیات متعلقہ بہ وراثت کے نزول کے بعد صرف میراث کا حق مسلم یا دینی بھائی سے حقیقی اور خون کے رشتہ داروں کو منتقل کر دیا گیا تھا اور بقیہ سماجی اور مذہبی اخوت قائم رہی تھی۔[۴۶] مگر بعض دوسرے مسلمان علماء و مورخین نے پوری طرح مغربی فکر کا تتبع کیا ہے۔[۴۷] غالباً یہ دونوں ہی نقطۂ نظر غیر تاریخی ہیں۔ مواخاۃ کا مقصد نہ تو ایک مسلمان بھائی کی موت پر دوسرے کو جائداد دلانا تھا اور نہ دورانِ حیاتِ فریقین اقتصادی طور پر نادار بھائی کا مالدار بھائی کے مال میں حصہ لگانا تھا۔ ان دونوں نقطہ ہائے نظر کی تردید مواخاۃ کی اوّل تاریخ سے بھی ہوتی ہے اور بعد کی کچھ اور مثالوں سے۔ روایات کے مطابق مواخاۃ کی مدینہ میں پہلی مثال ہجرت نبوی کے تقریباً سات ماہ بعد ——— اواخر رمضان یا اوائل شوال سنہ ۱ھ / مارچ - اپریل سنہ ۶۲۳ء ——— میں قائم ہوئی تھی۔[۴۸] منطقی اعتبار سے نادار و مفلس مہاجرین کو اقتصادی مدد اور ترکۂ مسلم میں حق کی ضرورت مدنی دور کی ابتدا میں زیادہ تھی نہ کہ کچھ مدت کے بعد۔ اسی طرح تاریخی واقعات سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ تمام یا اکثر مہاجرین اس زمانے میں اتنے

مالدار ہوگئے تھے کہ ان کو زکوٰۃ کی دولت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کے علاوہ ہماری روایات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مواخاۃ کی ایک ہی مثال نہ تھی، بلکہ کئی مثالیں تھیں جو بدر سے پہلے شروع ہوئی تھیں اور غالباً فتح مکہ تک چلتی رہی تھیں۔[۳۹] دراصل ان کا انحصار مہاجرین کی انفرادی یا اجتماعی آمد پر تھا جو فرد یا گروہ تازہ وارد ہوتا وہ مواخاۃ کے موثر و فعال ذریعہ کے سبب مدنی مسلم سماج کا جزو بنا دیا جاتا تھا۔ چنانچہ مواخاۃ کی ایسی متعدد مثالیں مذکور ہیں جن میں ان مہاجر صحابہ کو انصار کا بھائی قرار دیا گیا ہے جو بدر کے کافی بعد بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد یا غزوۂ خیبر کے بعد مدینہ میں وارد و مقیم ہوئے تھے۔[۴۰] ان شواہد کی بنیاد پر بلا خوف کہا جا سکتا ہے کہ مواخاۃ کا عمل عہدِ نبوی کے اواخر تک جاری رہا تھا۔

اسی طرح مواخاۃ کے بارے میں پیش کردہ نظریہ کہ اس کا اساسی محرک و سبب میدانِ جنگ میں دو مسلمانوں کے درمیان فوجی ہم آہنگی اور عسکری مطابقت پیدا کرنا تھا[۴۱] تاریخی حقائق کی کسوٹی پر کھرا نہیں اُترتا۔ مواخاۃ کا پہلا مظاہرہ مکی عہدِ نبوی میں ہوا تھا جب جنگ و جدال تو درکنار اس کے بارے میں مسلمانانِ مکہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب مسلم نقطۂ نظر سے قتال و جدال کے لئے اذنِ الٰہی نہیں ملا تھا[۴۲] اور مغربی نقطۂ نظر سے مسلمان اس فوجی و عسکری صلاحیت اور تنظیم کے مالک نہ تھے کہ وشمنوں سے مسلح یا غیر مسلح ٹکر لے سکتے۔ اس کے علاوہ تاریخی واقعات اور ٹھوس حقائق بھی اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ مکی دور میں مواخاۃ کا مقصد عسکری تنظیم و ہم آہنگی رہی ہوگی۔ مدنی عہد میں مواخاۃ کی نوعیت اور حقیقت کو سمجھنے کے لئے اس کی توقیت ضروری ہے۔ اس کی پہلی مثال ہجرت کے بعد سات ماہ کے عرصے کے اندر قائم کی گئی تھی جو جنگِ بدر سے کافی پہلے تھی۔[۴۳] یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مواخاۃ ابتدائی مہموں میں فوجی تنظیم قائم کرنے کے لئے کی گئی تھی کیونکہ اول تو یہ مہمیں فوجی تھیں ہی نہیں، دوم ان میں سے اکثر میں انصار شامل نہ تھے اور اگر تھے تو مہاجر اور انصار کے سپاہیوں کی تعداد میں کافی فرق رہا ہے۔ غزوۂ بدر کے موقعہ پر یہ فرق بہت ہی واضح طور پر ابھرتا ہے کہ اس جنگ میں مہاجرین کی کل تعداد صرف ۸۲ تھی اور انصار کی ۲۳۱ یعنی دونوں میں ایک اور تین کا تفاوت تھا۔[۴۴] سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انصار کے بقیہ سپاہیوں کا میدانِ جنگ میں ساتھ دینے کے لئے کون تھا؟ پھر مواخاۃ کے متعدد جوڑوں میں سے ایک یا دوسرا فریق غزوۂ بدر میں شامل نہیں ہوا تھا۔[۴۵] اس کے علاوہ مواخاۃ کی دُوسری مثالیں صلح حدیبیہ کے بعد تک ملتی ہیں جس زمانے عسکری تنظیم و رفاقت قائم کی چنداں ضرورت نہ رہی تھی۔[۴۶] ان حقائق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مواخاۃ کا اصل مقصد کچھ اور تھا کم از کم جنگ کے دوران یا میدانِ جنگ میں مسلم سپاہیوں کے دو طبقوں میں فوجی ہم آہنگی پیدا کرنا نہیں تھا۔ وُہ اصل مقصد تھا نو مسلم عربوں کا سماجی اور معاشرتی شعور و احساس میں تبدیلی پیدا کرنا کہ وہ عرب کے متعدد اور محدود قبیلوں کے داٰئرہ میں محصور نہیں ہیں بلکہ مسلم یا اسلامی معاشرہ کی وسیع دنیا کے باشندے اور شہری ہیں جن کی حد بندی یا درجہ بندی علاقہ، زبان، نسل، رنگ یا وطن نہیں کرتے۔ بلکہ وہ ایک عالمی اور آفاقی براوری کے افراد ہیں جن کو دینِ خداوندی کا مضبوط رشتہ ایک قوم، ایک ملت اور ایک امت بناتا ہے۔ یہ محض نظریہ یا خیال یا تصوّر ہی نہ تھا بلکہ مواخاۃ نے حقیقتاً بے شمار اور مختلف قبائلی اور محدود نظر و تنگ خیال لوگوں کو جو ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہتے تھے ایک مضبوط و مستحکم اور متحدہ اُمت میں تبدیل کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ یہی وہ اسلامی جذبۂ اخوت تھا جس نے مالدار مسلمانوں میں اپنے غلام دینی بھائیوں کو خرید کر

آزاد کرانے کا جذبہ پیدا کیا تھا۔ اسی نے مسلمانوں میں تعاون اور امداد کے ایک غیر معمولی احساس اور عمل کو تحریک دی تھی۔ اسی نے ان کو ایک امت سے وابستہ ہونے کا طاقتور شعور بخشا تھا اور یہی جذبہ ان کو بحرانوں اور مصائب و آلام کے زمانے میں نہ صرف زندہ اور متحرک و فعال رکھتا تھا بلکہ ان کے ملی شعور یگانگت و وابستگی کو اور مضبوط تر دیا بیدار بناتا تھا۔ بہرحال مواخاۃ کا مقصد مختلف پس منظر اور طبقات کے مسلمانوں کو ایک منظم اور متحد اُمت میں تبدیل و تشکیل کرنا تھا اور اس میں اس کو سو فیصد کامیابی ملی تھی۔ اس مستقل اخوتِ اسلامی اور جزیرہ نمائے عرب کے مسلمانوں کے نئے تاریخی و سماجی شعور کا بہترین مظاہرہ حضرت سلمان فارسی کا وُہ جواب تھا جو اُنھوں نے اپنے نسب کے بارے میں پُوچھنے والے ایک شخص کو دیا تھا:

"انا سلمان بن اسلام"[۴۷] (میں سلمان ہُوں، اسلام کا ایک فرزند)

(۳) تیسرا مرحلہ: دستورِ نبوی

اُمتِ اسلامی اور ریاستِ اسلامی کی تشکیل کا تیسرا مرحلہ کتاب نبوی کا اجرا و نفاذ تھا جس کو ہمارے ماخذ میں صحیفہ، کتاب، عہد، میثاق وغیرہ مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے اور جس کو آج کل زیادہ تر مورخین "دستورِ مدینہ یا "اسلام کے پہلے دستور" کے نام سے یاد کرتے ہیں[۴۸]۔ اور دورِ جدید میں یہی زیادہ صحیح مفہوم عطا کرتا ہے۔ صحیفہ یا کتابِ[۴۹] نبوی یا دستور مدینہ کے اجرا و نفاذ کی تاریخ کے بارے میں جدید مورخین میں اختلاف ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کا متن نقل کرنے والے اولین سیرت نگار ابنِ اسحاق نے اس کی تاریخِ نفاذ کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔ انھوں نے اپنی سیرت رسول اللہؐ میں ہجرت کے بیان کے بعد حتیٰ کہ مواخاۃ وغیرہ کے ذکر سے پہلے ہی اس کو نقل کر دیا ہے۔ ماخذ کے سکوت نے جدید مورخین کو تاریخِ نفاذ و اجرا کے بارے میں اپنے اپنے نظریات پیش کرنے کا موقع دیا ہے۔ ولہاوزن (WELLHAUSEN) کا خیال ہے کہ وہ غزوۂ بدر سے قبل جاری کیا گیا تھا[۵۰] جبکہ ہیوبرٹ گریم (HUBERT GRIMME) اس کو بدر کے بعد کا صحیفہ مانتے ہیں[۵۱] اور دونوں اپنے اپنے نظریے کی تائید میں دلیلیں دیتے ہیں۔ مونٹگمری واٹ (MONTGOMERY WATT) کا خیال ہے کہ اصل دستورِ مدینہ تو بدر سے پہلے نافذ ہوا تھا مگر اس میں وقتاً فوقتاً ضرورت کے تحت تبدیلی کی جاتی رہی اور بعض دفعات گھٹائی اور بڑھائی جاتی رہیں اور موجودہ متن مختلف زمانوں میں نافذ ہونے والی دفعات کا مجموعہ ہے[۵۲]۔ برکات احمد نے بھی اسی نظریے سے اتفاق کیا ہے اگرچہ دونوں کی بعض دلیلیں الگ الگ ہیں تاہم اکثر پر ان دونوں کا اتفاق ہے[۵۳]۔ ان دونوں مورخین کے خیال میں یہ دستور یا صحیفہ نبوی ایک اکائی نہیں ہے بلکہ مختلف اکائیوں کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کو ایک اکائی اور متحدہ متن مانتے ہیں جو ہجرت کے بعد مرتب و نافذ کیا گیا تھا[۵۴]۔ بہرحال واٹ اور برکات احمد کے نظریہ میں خاصی جان ہے اور ان کی بعض دلیلیں بڑی وزنی ہیں تاہم ان کے تمام دلائل اور مزعومات سے اتفاق کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ بقیہ اہم مورخین میں آر، بی سرجنٹ (R.B. SERJEANT)[۵۵]، ریوبن لیوی (RUBEN LEVY)[۵۶]، موشے گل (MOSHE GIL)[۵۷] وغیرہ اس کی تاریخ ماقبل بدر کے قائل نظر آتے ہیں۔ ابنِ اسحاق اور ان کے تبعیی سیرت نگار و مورخین کے علاوہ احادیث کے مختلف

مجموعوں سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ دستورِ مدینہ کا اصل مسودہ بدر سے پہلے ترتیب و نفاذ پا چکا تھا چاہے بعد میں اس میں کمی بیشی ہوتی رہی ہو۔
تاریخِ دستورِ مدینہ سے کہیں زیادہ اہم اس کا متن ہے۔ ابنِ اسحاق کے فراہم کردہ متن کو دوسرے عربی مآخذ نے توجوں کا توں شائع کیا ہے مگر اس پر بحث کرنے والے مترجموں اور مورخوں نے اس کو الگ الگ ڈھنگ سے پیش کیا ہے جس کے سبب صحیح نتائج اخذ کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ بعض علماؑ نے اس کی مختلف دفعات کو اپنی فہم اور زاویۂ نظر کے مطابق الگ الگ حصوں یا خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ بہرحال سب سے اچھی ترتیب دفعات وینسنک (WENSINCK) نے کی ہے جس کو مونٹگمری واٹ نے معمولی ردّ و بدل کے ساتھ قبول کیا ہے اور یہی میرے خیال میں بہترین ترتیب ہے(۵۸)۔ اگرچہ واٹ کا بعض جگہ ترجمہ مبہم اور اضافے (قوسین میں) غیر ضروری بلکہ گمراہ کن ہیں۔ بہرحال متنِ دستورِ مدینہ کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے لیکن یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صحیفۂ نبوی سے قبل سیرت نگار ابنِ اسحاق کا ایک تعارفی دیباچہ ہے جو متنِ دستور کا جزو نہیں ہے۔ دیباچہ میں ابنِ اسحاق کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان ایک تحریر (کتاب) لکھی جس میں آپ نے یہودیوں سے ایک معاہدۂ صلح کیا۔ ان کو ان کے مذہب اور ان کے مقبوضات کے حقوق دئے اور ان کو ان میں بدستور قابض رہنے دیا اور ان کے کچھ فرائض اور حقوق مقرر کئے۔ وہ کتاب یہ تھی:

متنِ دستورِ نبویؐ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

یہ محمد رسول اللہ کی کتاب (معاہدہ) ہے جو قریش کے مسلمانوں اور یثرب کے مومنوں اور ان دونوں کے ان لواحقین (ومن تبعھم) کے درمیان کیا گیا ہے جو ان کے ساتھ آملیں، اتحاد کریں اور جو ان کے ساتھ مل کر جہاد کریں (جاھدوا معھم)۔

۱ - وہ [یعنی مسلمان مہاجرین و انصار کے دو طبقات اور ان کے مسلم لواحقین و متبعین] ایک امت واحدہ ہیں جو دوسرے لوگوں سے الگ و ممتاز ہے (من دون الناس)(۵۹)۔

۲ - قریشی مہاجرین اپنے پرانے دستور کے مطابق اپنے قیدیوں کا زرِ فدیہ اجتماعی طور سے ادا کریں گے اور مسلمانوں کے معاملہ میں انصاف و راستی کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔

۳ - بنو عوف اپنے سابق دستور کے مطابق اجتماعی طور سے اپنی پرانی دیت ادا کریں گے اور ہر گروہ (طائفہ) اپنے قیدیوں کا زرِ فدیہ ادا کرے گا اور اس ضمن میں مسلمانوں کے درمیان انصاف و راستی کا خیال رکھے گا۔

۴ - بنو الحارث اپنے سابق دستور کی مانند دیت ادا کریں گے (دفعہ ۳ کی مانند)

۵ - بنو ساعدہ ..... (دفعہ ۳ کی مانند)

۶ - بنو جُشم ..... (〃 〃 〃)

۷ - بنو نجار ..... (〃 〃 〃)

۸ - بنو عمرو بن عوف ..... (دفعہ ۳ کی مانند)

۹ - بنو نبیت ..... (")

۱۰ - بنو اوس ..... (")

۱۱ - مسلمان اپنے کسی مقروض کو نظر انداز نہ کریں گے بلکہ انصاف کے ساتھ اس کے زرِ فدیہ یا دیت کی ادائیگی میں اس کی مدد کریں گے۔

۱۲ - ایک مسلم کسی دوسرے مسلم کے "مولیٰ" کو اس کے آقا و سرپرست کی اجازت کے بغیر اپنے "حلیف" کے طور پر قبول نہیں کرے گا۔

۱۳ - خدا ترس مسلمان ہر اس شخص کے خلاف ہیں جو غلط کام کرے یا غیر منصفانہ یا غدارانہ، مخالفانہ یا بدعنوان کام کرنے کا ارادہ مسلمانوں کے بیچ کرے۔ ان کے ہاتھ اس شخص کے خلاف متحدہ طور سے اٹھیں گے خواہ وہ ان ہی میں سے کسی کا فرزند کیوں نہ ہو۔

۱۴ - ایک مسلم کسی دوسرے مسلم کو کسی غیر مسلم کے لئے نہ تو قتل کرے گا اور نہ ہی ایک مسلم کے خلاف کسی غیر مسلم کی مدد کرے گا۔

۱۵ - خدا کا تحفظ (ذمہ) ایک ہے: ان میں سے (مسلمانوں میں سے) کسی ادنیٰ کی بھی ضمانت (جوار) ان سب پر واجب العمل ہے۔ تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی اور دوست (موالی) ہیں دوسرے تمام لوگوں کے سوا (من دون الناس)۔

۱۶ - یہود میں سے جو بھی ہماری اتباع کرے گا اس کے لئے یکساں مدد اور تعاون (نصر، اسوۃ) ہے جب تک کہ وہ مخالفانہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرتا اور ان کے (مسلمانوں کے) خلاف دوسروں کی مدد نہیں کرتا۔

۱۷ - مسلمانوں کی امان (سلم) بھی ایک ہے: ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے الگ صلح نہیں کرے گا، جبکہ اللہ کے راستہ میں جہاد ہو رہا ہو، سوائے اس کے کہ وہ مساوات و انصاف کے ساتھ کی جائے۔

۱۸ - ہماری ہر مہم میں ہر گروہ باری باری سے کام کرے گا۔[۶۰]

۱۹ - ایک مسلم کی راہِ خدا میں شہادت کی صورت میں تمام مسلمان اس کا قصاص لیں گے۔ خدا ترس مسلمانوں کو بہترین اور صحیح ترین رہنمائی حاصل ہے۔

۲۰ - کوئی شخص مشرک قریش کے کسی شخص یا سامان کو پناہ (جوار) نہیں دے گا اور نہ اس کی حمایت میں کسی مسلم کے خلاف مداخلت کرے گا۔

۲۱ - جب کوئی کسی مسلمان کو ناحق قتل کر دے اور اس کی شہادت واضح ہو تو اس کو قصاص میں قتل کیا جائے گا سوائے اس کے کہ مقتول کے ورثہ مطمئن و راضی ہو جائیں۔ تمام مسلمان قاتل کے خلاف ہوں گے۔ اس کی مخالفت کے سوا

ان کے لئے اور کچھ بھی جائز نہ ہوگا۔

۲۲ - ہر اس مسلم کے لئے جو خدا و آخرت پر ایمان اور اس معاہدہ (صحیفہ) میں یقین رکھتا ہے یہ جائز نہ ہوگا کہ وہ کسی غلط کار و بدعنوان شخص کی مدد کرے یا اسے پناہ دے۔

۲۳ - ہر وہ شخص جس کے بارے میں تمہارا (مسلمانوں کا) اختلاف ہو اس کو خدا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کرنا ہوگا۔

۲۴ - یہود اور مسلمان (دونوں) مشترکہ طور پر جنگ کے اخراجات اس وقت تک اٹھائیں گے جب تک کہ وہ جاری رہے۔

۲۵ - بنو عوف کے یہود مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ایک اُمّت ہیں۔ یہودیوں کے لئے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین۔ یہی (ضمانت) ان کے موالی اور ان کے اپنے لئے ہے۔ مگر اس شخص کے سوا جو کوئی غلط کام کرے یا غداری کا کام کرے۔ وہ صرف اپنے لئے مصیبت پیدا کرتا ہے اور اپنے خاندان کے لئے۔

۲۶ - بنو نجار کے یہودیوں کے لئے بھی وہی (احکام و مراعات) ہیں جو یہود ان بنی عوف کے لئے۔

۲۷ - بنو الحارث کے یہود کے لئے وہی ......

۲۸ - بنو ساعدہ کے یہود کے لئے وہی ......

۲۹ - بنو جُشم کے یہود کے لئے وہی ......

۳۰ - بنو اوس کے یہود کے لئے وہی ......

۳۱ - بنو ثعلبہ کے یہود کے لئے وہی ہے جو بنو عوف کے یہود کے لئے۔ سوائے اس شخص کے جو غلط کام یا غداری کا مرتکب ہو۔ وہ صرف اپنے لئے اور اپنے خاندان کے لئے باعثِ مصیبت ہوگا۔

۳۲ - ثعلبہ کا ایک خاندان (بطن) جفنہ بھی انھیں کی مانند ہے۔

۳۳ - بنو شطیبہ کے لئے بھی وہی ہے جو بنو عوف کے یہود کے لئے۔ آبرومندانہ سلوک غداری نہ ہونے کی صورت میں ہوگا۔

۳۴ - ثعلبہ کے موالی اُنھیں کی مانند ہیں۔

۳۵ - بطانہ[۶۱] یہود بھی انھیں کی مانند ہیں۔

۳۶ - ان میں سے کوئی بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر جنگ کے لئے نہیں نکلے گا لیکن اس کو تکلیف و زخموں کا انتقام لینے پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ جو بھی بے سمجھے بوجھے اقدام کرتا ہے (فتك) وہ صرف اپنے آپ اور اپنے خاندان کو معرضِ خطر میں ڈالتا ہے۔ سوائے اس کے کہ اس پر ظلم ہوا ہو۔ خدا اس صحیفہ کا سب سے سچّا شاہد ہے۔[۶۲]

۳۷ - یہودیوں کا ذمہ ہے کہ وہ اپنے اخراجات برداشت کریں اور مسلمانوں پر اپنے اخراجات اُٹھانے کی ذمہ داری ہے ان کے درمیان باہمی مدد (نصر) کا معاہدہ ہے ہر اس شخص کے خلاف جو اس صحیفہ کے لوگوں کے خلاف جنگ کرے ان کے درمیان پُر خلوص دوستی اور قابلِ اعتماد صلح و خیر خواہی ہے اور آبرومندانہ رشتہ ہے، غداری نہیں ہے۔

ایک شخص اپنے کسی حلیف کی بنا پر غداری کا مجرم نہ ہوگا۔ ہر مظلوم کے لئے مدد و اعانت ہوگی۔

۳۸۔ یہود مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ جاری رہنے تک اخراجات مساوی طور پر برداشت کریں گے۔

۳۹۔ وادی یثرب اس صحیفہ والوں کے لئے مقدس حرم ہے۔

۴۰۔ ہر "جار" (محفوظ شخص) اسی وقت تک (محفوظ) رہے گا جب تک کہ وہ نقصان نہیں پہنچاتا اور غداری نہیں کرتا۔

۴۱۔ کسی عورت کو اس کے لوگوں کی اجازت کے بغیر پناہ نہیں دی جائے گی (لا تجارُ)۔

۴۲۔ جب بھی اس صحیفہ والوں کے درمیان کوئی حادثہ یا جھگڑا اٹھ کھڑا ہو جس سے فسادِ خلق کا خوف ہو، اس کو خدا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کرنا ضروری ہے۔ خدا ہی سب سے زیادہ اس صحیفہ کی شرائط کو نافذ و جاری کرنے والا ہے۔

۴۳۔ قریش کو اور جو ان کی مدد کریں پناہ نہیں دی جائے گی (لا تجار)۔

۴۴۔ ان کے (اہلِ صحیفہ کے) درمیان باہمی تعاون ہوگا ہر اس شخص کے خلاف جو یثرب پر حملہ کرے۔

۴۵۔ جب بھی ان کو صلح یا معاہدہ کرنے یا قبول کرنے کا حکم دیا جائے وہ اس کو کریں گے اور قبول کریں گے۔ جب وہ اسی طرح کے کسی معاہدہ یا صلح کے لئے بلائیں تو یہ مسلمانوں کے لئے بھی ضروری ہوگا سوائے اس صورت کے کہ جب کوئی مذہب کے سبب جنگ کرے کیونکہ ہر شخص کی وفاداری اس کے اپنے گروہ سے متعلق ہوتی ہے۔[۹۳]

۴۶۔ الاوس کے یہودی، ان کے حلیف اور وہ خود بھی انھیں (حقوق و مراعات) کے حقدار ہیں جو اس صحیفہ والوں کے لئے ہیں جب تک کہ ان کا طرزِ عمل اس صحیفہ کے لوگوں سے مکمل طور سے آبرو مندانہ اور اچھا ہے۔ کیونکہ غداری سے پہلے محسنِ سلوک کا درجہ ہے۔

۴۷۔ ایک مجرم صرف اپنے لئے ذمہ دار ہوگا۔ خدا ہی اس صحیفہ کو سب سے زیادہ نافذ و جاری کرنے والا ہے۔ یہ معاہدہ کسی غلط کار و ظالم اور غدار کی پشت پناہی نہیں کرے گا۔ جو بھی مدینہ میں رہے یا باہر جائے محفوظ رہے گا سوائے اس شخص کے جو غلط کام یا غداری کا ارتکاب کرے۔ خدا ہر شخص کا حامی و پناہ گاہ (جار) ہے جو اس سے ڈرتا ہے اور حسنِ سلوک کرتا ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

دستورِ مدینہ کا تجزیہ:

موجودہ متنِ دستور سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں کل ۴۷ دفعات ہیں۔ اور دستور کے تعارفی کلمات سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاہدہ اساسی اور بنیادی طور پر قریشِ مکہ اور انصارِ مدینہ کے مسلمانوں اور مومنوں کے درمیان ہوا تھا اور ان دونوں طبقات مسلمین کے لواحقین و متبعین ان کے طفیل میں شریک و سہیم معاہدہ بن گئے تھے۔ اس صحیفہ کی پہلی دفعہ میں جن لوگوں کو "اُمتِ واحدہ ممتاز از اقوامِ دیگر" کہا گیا ہے وہ بنیادی طور سے صرف مہاجرین و انصار کے دو طبقات تھے۔

انھیں کو "اُمۃ اللہ" کہا گیا ہے جس کا حاکم مطلق خدائے واحد تھا اور اس زمین پر خلیفۃ اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ چونکہ یہ نئی "اُمۃ اللہ" ایک نیا مذہب ——— اسلام ——— ماننے کے سبب وجود میں آئی تھی اور وہی اس کی اساس حقیقی بھی تھی، اس لئے صرف اور صرف مسلمان ہی اس اُمت کے ارکان تھے یا بن سکتے تھے۔ یہ بات بڑی صراحت کے ساتھ دستورِ مدینہ کی دفعات نمبر ۱، ۱۵ اور ۲۵ سے بھی معلوم ہوتی ہے۔

"امۃ" اساسی طور سے ایک مخصوص قرآنی اصطلاح ہے اور محمد فواد عبدالباقی کے مطابق وہ قرآن کریم میں کل اکیاون[۵۱] مواقع پر بیان ہوئی ہے اور اس کی جمع ——— اُمم ——— تیرہ مقامات پر۔ ان میں ۴۹ بار مکی سورتوں میں اور محض پندرہ بار مدنی سورتوں میں۔[(۶۴)] بقول مونٹگمری واٹ "یہ ان لوگوں پر مشتمل اُمت تھی جنہوں نے پیغمبرِ اسلام اور ان کے پیغام کو قبول کیا تھا"۔[(۶۵)] انھیں معانی میں اصطلاح "امۃ" کم و بیش ۳۰۲ احادیثِ نبوی میں استعمال ہوئی ہے۔[(۶۶)] تمام مغربی اور بعض مشرقی مورخین و علماء کا یہ خیال کہ غیر مسلم طبقات مدینہ ——— یہودی، عیسائی اور غیر مسلم عرب --- بھی اس "امت اللہ" کے دائرہ سے خارج نہ تھے،[(۶۷)] نہ صرف اس دستورِ مدینہ کی روح کے منافی ہے بلکہ بجائے خود مذہب اسلام پر مبنی امت کے نظریہ کی کاٹ کرتا ہے۔ جیسا کہ پہلے حوالہ گزر چکا دستور کی دفعہ اول صرف مسلم مہاجرین و انصار کو تمام دوسرے لوگوں سے الگ ایک امۃ واحدہ قرار دیتی ہے۔ یہی روح دستور کی دفعہ ۱۵ میں کارفرما ہے جو یہ اعلان کرتی ہے کہ مومنین اور مسلمین[(۶۸)] ہی ایک دوسرے کے موالی (بھائی بند اور دوست) ہیں اور ان کے ساتھ دوسرے لوگ شریک نہیں۔ اسی طرح دفعہ ۲۵ مسلمانوں کو ایک الگ اُمت اور بنو عوف کے یہود کو ایک الگ امت قرار دیتی ہے اور ان کے دینوں کو بھی الگ الگ سمجھتی اور قرار دیتی ہے۔[(۶۹)] تمام حقائق و شواہد کو مدِنظر رکھنے سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ مدینہ کی شہری ریاست کے مسلمان اور صرف مسلمان ہی اس اُمت کے ارکان تھے یا بن سکتے تھے۔ شہر کے تمام غیر مسلم طبقات کو، چاہے وہ یہود ہوں یا عیسائی، یا غیر مسلم عرب۔ زیادہ سے زیادہ حلیف کا، ورنہ ذمیوں کا مقام دیا گیا تھا اگرچہ اس حیثیت کا واضح اعلان نہیں ملتا لیکن تمام دفعاتِ دستور میں مضمر و محذوف یہی ہے۔ خاص کر ان دفعات میں جن کا تعلق یہودیوں اور مسلمانوں کے مابین یا اسلامی ریاست سے روابط سے ہے۔ مثال کے طور پر دفعہ ۱۶ یہود کو امداد و تعاون کی ضمانت اسی صورت میں دیتی ہے جبکہ وہ مسلمانوں کی اتباع کریں اور ان کے دشمنوں کی امداد و اعانت نہ کریں۔ اسی طرح دفعہ ۲۵ ان کو مذہبی آزادی کی ضمانت بھی اس شرط پر دیتی ہے اور دفعات ۲۴، ۳۷ اور ۳۸ ان پر مسلمانوں کی مدد و نصرت کو تمام معاملات میں لازمی قرار دیتی ہیں۔ امتِ اسلامی اور یہودی یا غیر مسلم طبقات کے درمیان جو بھی تعلقات یا روابط قائم ہوئے وہ محض اس بنا پر کہ وہ مدینہ میں بستے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کو اُمت اسلامی کا رکن نہیں بنایا جا سکتا تھا کیونکہ پھر اس کی مذہبی خصوصیت جو اس کی اساسی و امتیازی چیز تھی کیا رہ جاتی۔ لیکن دوسری طرف ان کو لاتعلق بھی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ مدینہ کے معاشرہ میں ان کو کسی نہ کسی طرح کھپانا اور قبول کرنا تھا۔ اور ان کی قبولیت و شمولیت کا بہترین طریقہ وہی تھا جس کو عرب حلف کے نام سے جانتے تھے اور جو در اصل اسلام سے پہلے یہودی قبائل اور اوس و خزرج کے قبائل کے درمیان قائم بھی رہا تھا۔ اس بنا پر دستورِ مدینہ یہودی طبقات پر بھی مسلمانوں کی طرح یکساں فرائض عائد کرتا ہے۔ اور یہ فرائض تھے اپنے قبائلی دستور و

روایات کے مطابق دیت (معقلہ) ادا کرنا، شہر کے تمام باسیوں کے ساتھ امن و امان کے ساتھ رہنا، غیر ملکی یا خارجی حملے یا جارحیت کی صورت میں شہری ریاست کا دفاع کرنا اور اس پر آنے اخراجات و مصارف کو برابر برابر برداشت کرنا اور سب سے بڑھ کر اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل فرمانبرداری و اطاعت کرنا۔

امۃ کا جو نظریہ ولہاؤزن نے ایجاد کیا اور واٹ اور ان کے دوسرے مغربی و مشرقی خوشہ چینوں نے قبول و شائع کیا مسلم ارکانِ اُمت اور یہودی اور دوسرے غیر مسلم باشندگانِ شہر کے حقوق کے فرق کے پس منظر میں بھی نہیں ٹھہرتا ہے۔ منطق کا تقاضا ہے کہ ایک اُمت کے تمام ارکان کو یکساں اور برابر کے حقوق حاصل ہوں۔ دستورِ مدینہ بہرحال یہ مساوی اور یکساں حقوق مسلمانوں کو عطا کرتا ہے کہ وہ امتِ واحدہ کے افراد تھے مگر یہود یا دُوسرے غیر مسلم طبقات کو برابر کے حقوق نہیں دیتا ہے۔ ولہاؤزن کو تو اس کا تھوڑا سا اعتراف بھی ہے کہ "یہودانِ شہر کو اُمت سے وہ قریبی تعلق و ربط حاصل نہ تھا جو انصار و مہاجرین کو تھا اور نہ ہی ان کو برابر کے حقوق و فرائض حاصل تھے"۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ واٹ نے اس نکتہ کی طرف ذرا بھی اشارہ نہیں کیا ہے۔ بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ دستورِ مدینہ یہودیوں اور دوسرے غیر مسلم طبقات کو مدینہ کے سماجی نظام اور اسلامی شہری ریاست میں دوسرے درجہ کا مقام دیتا ہے جو کہ حلیف کے درجہ سے یا بعد کے ذمیوں کے مقام سے بڑی حد تک مشابہ و مماثل تھا۔ اس حقیقت بدیہی پر نہ تو شرمانے کی ضرورت ہے، نہ معذرت کرنے یا معذرت خواہانہ لہجہ اپنانے کی۔ اور تاویل کرنے کی تو کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وہ تاریخی دیانت کے خلاف اور اسلامی اصولوں کی تحریف کے مرادف ہو گی۔

بہرحال دستورِ مدینہ کی کل اہم دفعات کے ایک ناقدانہ تجزیے اور مبصرانہ تحلیل سے ایک طرف تو خود دستورِ مدینہ کی نوعیت و ماہیت اجاگر ہو گی اور دُوسری طرف مدینہ منورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قسم کا سماجی معاشرہ اور سیاسی ڈھانچہ کھڑا کیا تھا اس پر بھی روشنی پڑے گی۔ ایک اہم نکتہ جو عام طور سے علمائے تاریخ و سماجیات کی نگاہ سے اوجھل رہ گیا یہ ہے کہ دستورِ مدینہ کے دُو دیباچے ہیں:

ایک سیرت نگار ابنِ اسحاق کا دیباچہ یا تعارفی نوٹ۔

اور دُوسرا قلمِ نبوی کا دیباچہ جو متنِ دستور کی ابتدائی سطروں پر مشتمل ہے۔

ان دونوں میں ایک بڑا فرق ہے: ابنِ اسحاق نے مہاجرینِ قریش اور انصارِ مدینہ کے درمیان ہونے والے معاہدہ یا صحیفۂ اولین میں یہودیوں کو بھی ایک فریق کی مانند شامل کر دیا ہے جس سے یہ تصور رہتا ہے کہ وہ دُو مسلم طبقات کے ہم پلّہ و ہمسر فریق تھے جبکہ دیباچۂ دستورِ نبوی میں صرف مہاجرین و انصار اور ان کے متبعین و لواحقین کو دو فریقوں کا درجہ یا شرکائے معاہدہ قرار دیا گیا ہے اور اس طور سے یہی دونوں مسلم طبقات اصل اہلِ صحیفہ تھے۔ ان میں یہود کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ بعد میں یہودیوں کو بھی حلیف، یا جس کو موجودہ اصطلاح میں مشاہد رکن کہتے ہیں' کا درجہ دیا گیا تھا۔ غالباً مورخین و علماء سیرت کے امتِ اسلامی کے بارے میں غلط نظریہ کا ایک یہ بھی سبب رہا ہے۔ بہرحال یہ امر واضح رہنا چاہئے کہ دستورِ مدینہ کی اوّلین دفعہ میں جن لوگوں کو ضمیر جمع غائب (وہ لوگ = ھُم) کہا گیا ہے ان سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا ذکر دیباچۂ نبوی میں ہے نہ کہ دیباچۂ ابنِ اسحاق میں۔

دفعات ۲ تا ۱۱ عربوں کی ایک سماجی روایت و دستور — زرِ فدیہ[۱] اور دیت[۲] — سے متعلق ہیں جو بدوی اور قبائلی عربوں کے سماجی تحفظ کے نظام کی عظیم ترین ضمانتیں تھیں[۳]۔ شہرِ رسول کے ہر قبیلہ/ سماجی اکائی، کو بشمول مہاجرین مکہ جن کو بھی عملی اعتبار سے ایک متحدہ قبیلہ یا ایک سماجی وحدت گردانا گیا تھا،[۴] ان دونوں سماجی روایات کی پاسداری مسلمہ قبائلی اصولوں کے مطابق کرنی تھی اور اس میں ایک اہم بات یہ تھی کہ دیت اور زرِ فدیہ کی ادائیگی کو ہر قبیلہ کی اجتماعی ذمہ داری قرار دیا گیا تھا۔[۵] ظاہر ہے کہ انفرادی ذمہ داری کی صورت میں مجرم یا خطاکار راہِ فرار اختیار کر سکتا تھا اور اس وقت کے عرب سماج میں کوئی ایسی فعال و کارگر قوت نہ تھی کہ وہ اس سے زور و زبردستی سے وصولیابی کر سکتی۔ اس کے مقابلہ میں پورا قبیلہ نہ بھاگ سکتا تھا اور نہ ہی ذمہ داری کو کسی اور طریقہ سے قانوناً نظر انداز کر سکتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سماجی تحفظ کا نظام قائم کیا تھا اس کے یہ دو اہم پتھر تھے: جان و مال کا تحفظ۔ اور ان دونوں کا تحفظ اسی صورت کیا جا سکتا تھا کہ شہری ریاست کے کسی فرد کو نہ کسی کی جان سے کھیلنے کا موقعہ دیا جائے اور نہ مال سے۔ اور اگر کوئی جان و مال کو کسی طرح کا نقصان پہنچائے تو اس کو اس کی سزا یا جرمانے کا خوف لاحق رہے۔ جان کی ضیاع کی صورت میں وہ قصاص کے قبائلی اصول کے تحت اپنی جان سے ہاتھ دھو سکتا تھا یا مقتول کے وارثین کی رضامندی کی صورت میں مال دے کر جان تو بچا سکتا تھا لیکن اپنی دولت کے خاصے بڑے حصے سے محروم ہو جاتا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی مذموم حرکت سے اپنے پورے قبیلہ کا نام اور عزت و آبرو کو کلنک لگاتا جو عربوں کے نزدیک موت سے زیادہ بُری شے تھی۔ چنانچہ جان و مال کے مزید تحفظ کی ضمانت دستور کی دفعات ۱۲ تا ۱۹ دیتی ہیں۔

دفعہ ۱۲ مدنی سماج میں حلیف و مولیٰ کے رشتوں کو بلا اجازت و مرضیٔ فریقین بدلنے کی اجازت نہیں دیتی کیونکہ بصورتِ دیگر سماج کے مختلف افراد میں تعلقات کشیدہ ہوتے اور ان کے نتیجے میں تفرقے اور انتشار کی راہیں کھل جاتیں۔ جبکہ دفعہ ۱۳ غلط کار، مجرم اور انتشار پھیلانے والے اشخاص کے مذموم اثرات سے معاشرہ کو بچانے کی تدبیر کرتی ہے۔ وہ مجرم کو جرم کرنے کا موقعہ نہیں دیتی ہے اور ارتکابِ جرم کرنے کی صورت میں اس کی پناہ کی تمام راہیں مسدود کر دیتی ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ مجرم کو پورے سماج کا دشمن سمجھا گیا ہے اور تمام مسلمانوں کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ خواہ مجرم کوئی ہو سب کے سب اس کے دشمن ہوں گے اور اسے کسی قسم کی پناہ یا اعانت نہ دیں گے۔ دفعات ۱۴، ۱۵ اور ۱۹ مسلمان طبقات کو غیر مسلم طبقات پر سماجی فوقیت عطا کرتی ہیں جو سماجی اعتبار سے کافی اہم ہے۔ قبائلی روایات کے مطابق قتل کا قصاص قتل یا خون کا بدلہ خون تھا۔ لیکن اسلامی معاشرہ میں یہ اہم اور انقلاب آفریں تبدیلی کی گئی تھی کہ کسی کافر کے قتل کے بدلے میں یا کسی کافر کے سبب کسی مسلمان کو قتل نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی کسی مسلمان کے خلاف کسی کافر کی مدد و اعانت کی جا سکتی تھی۔ اس دفعہ نے قبائلی عصبیت پر کاری ضرب لگائی تھی اور عربوں کے سماجی شعور کو قبائلی روایات کے گورکھ دھندے سے نکال کر اسلامی اخوت پر مبنی وسیع تر نگاہ عطا کی تھی۔ بقیہ دونوں دفعات مسلمانوں کے تمام طبقات کو صلح و امن اور ضمانت کے برابر حقوق کی ضمانت دیتی ہیں کہ اگر ادنیٰ ترین مسلمان نے بھی کسی کو پناہ دے دی، امن و صلح کر لی یا ضمانت کی ہامی بھر لی تو وہ تمام افرادِ اُمت پر لازم و عائد ہو گی۔ یہ اخوت و یگانگت کے مضبوط بندھن اور "مسلمان ایک جماعت" کے تصور کا مظاہرہ و اعلان تھا۔ ان تینوں

دفعات سے یہ اہم نکتہ بھی اُبھرتا ہے کہ مسلمانوں کو مدینہ کے سماجی نظام میں یک گونہ برتری حاصل تھی۔ اور اس سے اہم بات یہ ہے کہ اس سماجی برتری کو غیر مسلم طبقات نے خواہ مرضی سے یا خواہ بادلِ نخواستہ قبول و تسلیم بھی کیا تھا۔ دراصل مسلمانوں کی یہ معاشرتی حیثیت اور سماجی برتری ان تاریخی واقعات اور عناصر و رجحانات کا لازمی اور منطقی نتیجہ تھا جو ہجرت کے بعد مدینہ میں رونما ہو رہے تھے۔[۶] اور ظاہر ہے کہ مدینہ کے مسلمانوں کا پلّہ اپنی سیاسی و سماجی برتری اور تنظیم کے سبب بھاری ہوتا جارہا تھا۔ شہر کے غیر مسلم طبقات خاص کر یہودی قبائل جو اسلام سے قبل مدنی سماج اور سیاست میں سرداری یا کم از کم پاسنگ کا درجہ رکھتے تھے اب ماتحت و زیرنگیں طبقات بن کر رہ گئے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرینِ مکہ کے طفیل مسلم طبقات کی طرف سیادت و سرداری پُوری طرح سے منتقل ہوگئی تھی۔ اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے یک گونہ بہتر و برتر سماجی حقوق ایک لازمی اور منطقی امر تھے۔ یہ بات یہاں ذہن نشین رہنی چاہئے کہ مسلمانوں کی یہ سماجی برتری کسی ناانصافی یا سماجی بے دیانتی پر مبنی نہیں تھی۔ مساوات و اخوت کا اسلامی تصوّر و نظریہ اور اس کا عملی مظاہرہ افرادِ اُمت کے لئے ہو سکتا تھا اور تھا جو خدا اور رسول اور ان کے احکام و تعلیمات پر ایمان رکھتے تھے۔ جو اس سیاسی اور سماجی نظریۂ حیات نصب العین یا آئیڈیالوجی کو نہیں تسلیم کرتے تھے ان سے سماجی اخوت و مساوات نہیں برتی جا سکتی تھی۔ مگر ان سے تعلقات احترام آدمیت اور انسانیت کے ناطے اور سماجی انصاف کے اصول و بنیاد پر قائم کئے اور نبھائے جاتے تھے۔

اسی لئے جہاں تک انسانی جان و مال کے تحفظات کا تعلق ہے وہ بلا کسی تفریق و امتیاز کے شہری ریاست کے تمام باشندوں کو عطا کئے گئے تھے چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ جیسا کہ دفعات ۱۶، ۱۷، ۲۱، ۲۲، ۴۰، ۴۱ اور ۴۷ سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام افراد اور سماجی طبقے اپنے کاموں کے لئے ذمہ دار اور جوابدہ تھے اور کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ کسی مجرم یا سماج دشمن شخص یا اشخاص کو پناہ و امداد دے۔ یہ دفعات قتل و قصاص کے معاملات، مجرم کے ساتھ معاشرہ کے بحیثیت مجموعی برتاؤ، جار یا محفوظ اشخاص بالخصوص عورتوں کو جوار دینے کے مسائل و معاملات وغیرہ سے بحث کرتی ہیں جن کا لب لباب یہ ہے کہ سماج سے جرم اور مجرم اور ان کے بُرے اثرات کو ختم کیا جائے اور قبائلی عصبیت کے سبب ان کی پشت پناہی نہ کی جائے جیسا کہ ماقبل اسلام عرب کے قبائلی نظام میں دستور و طریقہ تھا۔ اب اسلامی معاشرہ اور شریعت افراد و قبائل کے کاموں کو ان کے قبائلی خطوط و بنیادوں کے بجائے ان کی اچھائی یا برائی سے تولا جاتا تھا۔ گویا کہ ایک ایسا معاشرہ وجود میں لایا جا رہا تھا جس میں سماجی انصاف سب افراد کو برابر سے مل سکے اور ان کے جان و مال کو مکمل طور سے تحفظ دیا جا سکے اور جس میں سماجی حیثیت و رتبہ کی بنیاد عمل تھا نہ کہ خاندان، قبیلہ یا پیدائشی نجابت و شرافت کا جھوٹا تصور۔

دفعات ۲۴ تا ۳۵ کا تعلق مدینہ منورہ کے مختلف یہودی قبائل سے ہے جو ان کو مذہبی آزادی اور سماجی خودمختاری عطا کرتی ہیں۔ یہ نکتہ اہم ہے کہ ان یہودیوں کو یہ مذہبی اور سماجی تحفظات غیر مشروط طور پر نہیں حاصل تھے ان کو یہ حقوق و مراعات امن و امان قائم رکھنے، وفاداری و استواری کا مظاہرہ کرنے اور سماج میں انتشار نہ پیدا کرنے اور غداری سے مکمل پرہیز

رکھنے کی شرائط پر عطا کئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ دفعات ۳۶، ۳۷، ۳۸ اور ۴۶ یہودی قبائل کے مسلمان طبقات اور مسلم ریاست سے تعلق پر بحث کرتی ہیں۔ ان کے مطابق دونوں مذہبی گروہوں کو ایک دوسرے کے ساتھ دوستی و آشتی، صلح و مفاہمت، امداد و تعاون اور خیر و نصیحت کے سایہ میں رہنا ضروری تھا۔ مزید برآں دونوں طبقات کے لئے ضروری قرار دیا گیا تھا کہ وہ اپنے قبائلی یا قومی اخراجات خود اٹھائیں گے مگر مدینہ کے دفاع کے ضمن میں جو اخراجات و مصارف ہوں گے ان میں شراکت کا اصول چلے گا۔ یہ فریضہ یا ذمہ داری اور واضح انداز میں دفعات ۱۸، ۲۴، ۳۸ اور ۴۵ سے مزید معلوم ہوتی ہے۔ کسی بیرونی جارحیت سے مدینہ کے دفاع کی ذمہ داری مساوی طور سے مدینہ کے تمام طبقات پر ڈالی گئی تھی جیسا کہ دفعات ۳۹ اور ۴۴ سے معلوم ہوتا ہے۔ دفعہ ۳۶ بصراحت بتاتی ہے کہ دستورِ مدینہ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شہر کا سب سے بڑا سردار و حکمران بنا دیا تھا اور آپ کی اس حیثیت کو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں نے بھی تسلیم کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ یہودیوں میں سے بیشتر نے آپ کی نبوت و رسالت سے انکار کر دیا تھا[۷۷] تاہم انھوں نے آپ کو شہری ریاست کے سیاسی سربراہ اور مسلمانوں کے علاوہ اپنے بھی سیاسی رہنما اور سردار کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔

چونکہ مدینہ کی نوزائیدہ اسلامی ریاست کو سب سے اہم اور خطرناک ترین خدشات و خطرات مکہ کی طاقتور اشرافیہ سے لاحق تھے اور اب تک وہی سب سے بڑے اسلام اور پیغمبر اسلام کے دشمن ثابت ہوئے تھے اس لئے دستورِ مدینہ کی بعض دفعات مثلاً ۲۰ اور ۴۳ نے یہ واضح کر دیا تھا کہ قریش کے کسی شخص یا ان کے مال یعنی کاروانوں کی حفاظت کی ذمہ داری اور ضمانت کوئی بھی فریقِ معاہدہ نہیں لے گا۔ اور نہ ہی ان کے کسی شخص کو کسی قسم کی مدد و تعاون دے گا۔ خاص کر کسی مسلمان کے خلاف کسی بھی قریشی کی مدد نہیں کی جائے گی۔ دستورِ مدینہ کی یہ دونوں شقیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور ان کی اہمیت مسلمان قریشیوں اور مدینہ کے بعض یہودی اور عربی قبیلوں اور خاندانوں اور افراد کے قریش مکہ سے سیاسی، سماجی اور تجارتی تعلقات کے پس منظر میں اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ فطری بات تھی کہ قریشی مسلمان کسی وقتی جوش و وفاداری و محبت قبیلہ میں کوئی ایسا کام کر سکتے تھے کہ جو مسلمان قوم یا معاشرہ کے مفادات کے خلاف ہوتا جیسا کہ بعض مواقع پر ہوا۔[۷۸] اسی طرح سے یہودی قبائل میں بنو نضیر کے بعض سرداروں کے تعلقات دوستانہ مکہ کے رؤسا سے تھے۔[۷۹] حتیٰ کہ اوس قبیلہ کے سردار حضرت سعد بن معاذ کے تعلقات بنو جمح کے ایک اہم سردار امیہ بن خلف سے تھے۔[۸۰] اسی قسم کے اور بہت سے تعلقات تھے۔ ان دفعات نے دراصل ان خطرات و نقصانات کا سدِ باب کیا تھا جو ان قدیم تعلقات کے سبب مسلم معاشرہ اور مسلم ریاست کو پہنچ سکتے تھے۔

مقامِ رسولِ کریمؐ

ایک اہم ترین مسئلہ یہ تھا کہ اس مدنی معاشرہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقام تھا؟ مغربی مورخین و علماءِ سیرت[۸۱] نے اس مسئلہ پر بڑی طول طویل بحثیں کی ہیں اور اپنے علم و تحقیق، تاویل و تفسیر، بیان و زبان اور دلائل و نظائر کے ترکش کے سارے تیر خرچ کر ڈالے اور ساری قوت لگا دی ہے خاص کر یہ ثابت کرنے میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائی

پانچ برسوں میں محض مہاجرین کے قبیلہ کے ایک جماعتی سردار کا مقام حاصل تھا اور آپ مدینہ کے دوسرے مسلم اور غیر مسلم سرداروں میں سے محض ایک تھے۔ آپ کو کوئی خاص یا بلند و ارفع مقام اور وسیع تر اختیارات نہیں حاصل تھے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ مہاجرین کو مدینہ کے دوسرے قبائل اور خاندانوں کا ہم پلہ قرار دیا گیا ہے اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی محض ایک سردار ہی تھے۔ اور چونکہ مہاجرین کو پہلے دستورِ مدینہ میں ذکر کیا گیا ہے اس لئے آپ کو زیادہ سے زیادہ تمام سرداروں میں صرف سبقت کا اعزاز و افتخار حاصل تھا۔ بلکہ ان مورخین کے نزدیک ابتدائی تعمیری سالوں میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہیں زیادہ با اثر اور طاقتور سردار مدینہ میں موجود تھے۔ چنانچہ آپ کے مقام کی نظریاتی کمزوری متعدد واقعات سے ثابت کی جاتی ہے۔ ان میں واقعۂ افک میں عبداللہ بن اُبی بن سلول کے ملوث ہونے کے باوجود اس کے خلاف آپ کا کوئی اقدام نہ کرنا اور بنو قریظہ کے خلاف سزا کا اعلان خود کرنے کے بجائے حضرت سعد بن معاذ سے کرانا آپ کی کمزور سیاسی حیثیت اور مدینہ میں آپ سے زیادہ طاقتور افراد و قبائلی سرداروں کی موجودگی کی دلیلیں بتایا گیا ہے۔ اور ثابت یہ کیا گیا ہے کہ مدینہ کے بیشتر قبائل اور ان کے سرداروں کی طاقت و شوکت برقرار رہی تھی اس لئے انھوں نے آپ کی قوت و حشمت اور اقتدار و اختیار کو محدود کر کے آپ کو محض ایک قبائلی سردار کا درجہ دے دیا تھا۔(۸۲)

حیرت کی بات ہے کہ مغربی مورخین نے دانستہ طور سے بڑی جرأت اور بے باکی سے دستورِ مدینہ کی ان دفعات کی اُلٹی سیدھی تاویل و تفسیر کی ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کے معاشرہ و سماج میں روزِ اوّل سے اہم ترین مقام سیادت اور اعلیٰ ترین اختیارات و اقتدار عطا کرتی ہیں۔ کم از کم تین دفعات مثلاً ۲۳، ۳۶ اور ۴۲ آپ کے مقام اور اختیارات کو واضح طور سے بیان کرتی ہیں۔ پہلی دفعہ کے مطابق صرف اور صرف رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اختلافات اور مقدمات میں فیصلہ کرنے کا حق حاصل تھا۔ اور نہ صرف یہ حق حاصل تھا بلکہ تمام فریقوں کے لئے آپ کا فیصلہ ماننا ضروری تھا۔ واٹ نے عجیب و غریب تاویل یہ کی ہے کہ اس اختیار کا تعلق مذہبی معاملات اور امور سے تھا اور اس لئے وہ محض مسلمانوں تک محدود تھا کیونکہ ان کے خیال میں اختلافات کو آپ کے حوالے کرنے کے سلسلہ میں فقرہ " خدا اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے حوالے کرنے کا " آیا ہے اور اس ضمن میں مورخ موصوف نے قرآن کریم کی بعض آیات سے استشہاد کیا ہے کہ یہ حق و اختیار محض مذہبی تھا اور صرف مسلمانوں سے متعلق۔(۸۳) مگر دستورِ مدینہ کی عبارت سے یہ نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس یا اس سے وسیع تر مفہوم قطعی طور پر یہ نکلتا ہے کہ تمام اختلافات و جھگڑے جن سے کسی قسم کا خدشہ فساد ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے لئے پیش کرنا ضروری تھا اور اس میں مذہبی یا غیر مذہبی، سماجی یا معاشی، سیاسی یا تہذیبی پالیسی کے معاملات یا معمولی جھگڑے کی کوئی قید یا شرط نہ تھی۔ قرآن کریم کی وہ تمام آیات جو مختلف فیہ اور متنازعہ امور کو فیصلہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کرنے کا حکم دیتی ہیں در اصل اسی سماجی و سیاسی اقتدار کی تشریح و تعبیر ہیں۔ بحیثیت رسولِ خدا آپ کو مدینہ والوں نے بیعت عقبہ ثانیہ میں تسلیم کیا تھا اور اسی کے ساتھ تسلیم کیا تھا آپ کی غیر مشروط فرمانبرداری کے حق کو۔ اس کے علاوہ تاریخی واقعات بھی آپ کے اس حق و اقتدار کے شروع سے قائم اور واجب التعمیل ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔

پہلے ابتدائی پانچ برسوں میں جب آپ کی کمزور سیاسی حیثیت اور محدود اختیارات ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے۔ آپ کے فیصلے ایک یہودی جوڑ عورت اور ایک یہودی زناکار کے مقدمات میں کسی اور نے نہیں خود یہودیوں نے نافذ کئے تھے[۸۴] غزوۂ بنو قینقاع اور بنو نضیر میں آپ نے بذاتِ خود اور بہ نفس نفیس اقدامات کئے اور فیصلے نافذ کئے تھے جن کی تعمیل کی گئی تھی۔ یہ دونوں فیصلے غزوہ بنو قریظہ اور بنو مصطلق سے پہلے نافذ کئے گئے تھے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہ ہوگی کہ ایک سال یا دو سال قبل تو آپ صاحبِ اختیار تھے لیکن بعد میں آپ کی پوزیشن کمزور ہوگئی تھی۔ واقعۂ افک اور غزوۂ بنو قریظہ کے ضمن میں آپ نے جو پالیسی اپنائی تھی اس کا تعلق مصلحت و حکمتِ عملی سے تھا کسی سیاسی کمزوری اور اختیارات کے محدود یا زیرِ قدغن ہونے سے نہ تھا۔ عبد اللہ بن ابی بن سلول کے ساتھ آپ کا طرزِ عمل دراصل آپ کی منافقین کے بارے میں اصل پالیسی اور حکمت سے تھا۔ آپ نے منافقین میں سے کسی ایک کے خلاف بھی کوئی سخت قدم نہیں اٹھایا تھا اور نہ ان میں سے کسی کو سزا دی تھی۔[۸۵] حتیٰ کہ غزوۂ تبوک کے زمانے میں جب آپ نے منافق سازشیوں کی مسجد ضرار کو آگ لگوائی تھی تاہم ان میں سے کسی بھی شخص کو سزا نہیں دی گئی تھی۔[۸۶] یہ وہ زمانہ تھا جب آپ کے تمام اختیارات کے اعلیٰ و ارفع ہونے کے مغربی مورخین بھی قائل ہیں۔

مونٹگمری واٹ نے اسی طرح سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فوجی پوزیشن کو ہلکا دکھانے کی کوشش کی ہے اور اس کو مبہم و غیر واضح قرار دیا ہے اور یہ دلیل دی ہے کہ "بیعۃ الحرب" کی شرائط نے صرف دفاعی اقدام کی بات کہی تھی اور اس میں بھی یہ واضح نہیں کیا تھا کہ قیادت کی زمام کس کے ہاتھ میں رہے گی۔[۸۷] بڑی حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ مورخ موصوف نے اس ضمن میں دستورِ مدینہ کی دفعہ ۳۶ کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے جو بلا کسی شک و شبہ کے جنگ کے لئے مدینہ سے باہر نکلنے کی اجازت دینے کے اختیار کو جن میں دفاعی اور جارحانہ دونوں طرح کے اقدامات شامل تھے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار بلا شرکت غیرے قرار دیتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ مورخ مذکور نے تاریخی ٹھوس اور ناقابلِ انکار تردید واقعات کو بھی اپنی عجیب و غریب تاویل کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بیعۃ الحرب میں قیادت کا مسئلہ طے نہیں کیا گیا تھا لیکن یہ بھی اتنا ہی صحیح ہے کہ جب آپ کو قائد یا امام تسلیم کیا گیا تھا اور آپ کی غیر مشروط اطاعت کا دم بھرا گیا تھا تب ہی قیادت کا اختیار آپ کو منتقل ہوگیا تھا اور باقی رہی سہی کسر دستورِ مدینہ کی اس دفعہ نے پوری کر دی۔ پھر دفاعی اور جارحانہ اقدامات دونوں دفاع کے لئے ہوتے ہیں یہ بات فوجی تاریخ و اصول کے کسی طالب علم سے پوشیدہ نہیں اس لئے دفاعی اور جارحانہ اقدامات کی تفریق کا سوال اٹھانا مضحکہ خیز ہے۔ اس کے علاوہ عہدِ مدینہ کی دہ سالہ تاریخ بلا شک و شبہ یہ ثابت کرتی ہے کہ قیادت عسکری کا منبع و سرچشمہ صرف آپ کی ذات تھی اور آپ ہی مدینہ کے اصل مستقل اور عظیم ترین قائد تھے۔ اس پر مفصل بحث تو اپنے مقام پر آئے گی یہاں یہ کہنا کافی ہوگا کہ واقدی کے شمار غزوات و سرایا کے مطابق پہلی مہم سے آخری مہم تک تقریباً ۷۴ مہموں میں یہ اختیار آپ کو حاصل رہا اور نہ صرف حاصل رہا بلکہ آپ نے اس کو پوری طرح سے استعمال فرمایا اور آپ کے ماننے والوں نے اسے مانا اور تسلیم بھی کیا بہر حال یہاں آپ کے مقامِ سیادت و قیادت و اختیار سے مکمل بحث نہیں کرنی ہے۔ دستورِ مدینہ کی بعض دفعات کی روشنی میں آپ کے مقام کو متعین کرنا مقصود تھا اور ان سے یہ واضح و صریح طور سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کو تمام معاملات میں، خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی، اقتصادی ہوں یا شہری، فوجی ہوں یا مذہبی، مکمل اور ارفع و اعلیٰ اختیارات حاصل تھے اور آپ کی یہ سیادت و قیادت اعلیٰ ہجرت کے بعد خاص کر دستورِ مدینہ کے نفاذ کے بعد سب کو تسلیم اور ماننی پڑی تھی۔ مسلمانوں کو اس لئے کہ آپ اللہ کے نبی اور رسول تھے اور اس اعتبار سے آپ کے تمام احکام کی بجا آوری سب کے لئے ضروری اور واجب التعمیل تھی۔ اور غیر مسلموں کے لئے اس بنا پر کہ انھوں نے آپ کو دستورِ مدینہ اور دوسرے مختلف انفرادی معاہدوں کے تحت مدینہ کا سردارِ اعلیٰ اور قائدِ اعظم تسلیم کیا تھا اور وہ آپ کو سیاسی رہنما مانتے تھے اور اس کی بنا پر آپ کی اطاعت و فرمانبرداری کے پابند تھے۔

دستورِ مدینہ کی مختلف دفعات کے تجزیے سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ ہجرت کے بعد مدینہ میں ایک سیاسی نظام کی داغ بیل ڈالی گئی تھی جس میں شہر کے مختلف سماجی طبقات کو ایک سیاسی وحدت میں مدغم کیا گیا تھا۔ اصولی طور پر اسی سیاسی وحدت میں دو قسم کے مذہبی اور سماجی طبقات شامل تھے، ایک مسلم جو مہاجرین و انصار پر مشتمل تھا اور دوسرا غیر مسلم جو یہودی قبائل، غیر مسلم عربوں اور اکا دکا نصرانیوں پر مشتمل تھا۔ مسلم طبقہ کے ذیلی گروہ ہی امۃ اللہ یا امت مسلمہ کے ارکان و افراد تھے کیونکہ اس کی بنیاد مذہب ——— اسلام ——— تھا، جو ایک نیا سیاسی نصب العین بن کر اُبھرا تھا۔ اس کے مطابق امۃ اللہ کا حاکم مطلق و مقتدر اعلیٰ خدائے واحد و قدوس کی ذات تھی اور اس کے نائب اور رسول کی حیثیت سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تنفیذِ مرضی و احکامِ الٰہی کا حقِ اوّلین تھا جس نے آپ کو سیاسی، سماجی، مذہبی، فوجی اختیارات کا مرکز و محور بنایا تھا۔ اور اس بنیاد پر مسلم طبقات آپ کی بلا مشروط و غیر متزلزل فرمانبرداری کے پابند تھے۔ اگرچہ غیر مسلم طبقات آپ کو رسولِ خدا اور مذہبی رہنما نہیں تسلیم کرتے تھے مگر چونکہ مدینہ کے علاقہ میں بستے تھے اور حکمراں یا سیاسی و سماجی اعتبار سے برتر مسلمان طبقات کے ساتھ رہتے تھے اس لئے وہ آپ کی بالادستی ——— سیاسی بالادستی ——— کو قبول و تسلیم کرنے پر مجبور تھے اور دوسری طرف مسلمان بھی ان کے ساتھ کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھنے پر مجبور تھے اس لئے ان کو اسلام کے سیاسی نظام میں بطور حلیف یا شریکِ مشاہد رکن کر لیا گیا تھا اور ان کے کچھ فرائض و حقوق مقرر کئے گئے تھے جو بنیادی طور پر شہر کے غالب و حکمراں مسلم طبقات کے حقوق سے فروتر تھے۔ وہ اسلامی امت کے افراد و ارکان نہیں تھے اور نہ اصولی اور عملی طور سے ہو سکتے تھے کیونکہ اللہ کی حاکمیت اعلیٰ اور رسولِ اکرم کی رسالت اور قرآن کریم کے احکامِ الٰہی پر ایمان نہیں رکھتے تھے یا دُوسرے الفاظ میں ان کا مذہب اسلام نہیں تھا اور وہ اسلام کی سیاسی آئیڈیالوجی کو نہیں مانتے تھے۔ اس طرح یہ تاریخی ارتقا ثابت کرتا ہے کہ دستورِ مدینہ نے ایک طرف تو امت مسلمہ کو وسعت و استحکام دیا تھا تو مدینہ کی اسلامی ریاست کو دُوسری طرف وجود بخشا تھا۔ اور یُوں مواخاۃ کے بعد دستورِ مدینہ کا نفاذ و اجرا اسلامی ریاست کے ارتقا کا تیسرا مرحلہ عظیم تھا۔

(۴) چوتھا مرحلہ : ابتدائی مہمیں

عہدِ نبوی کی ابتدائی مہمیں اور ان کے نتیجے میں ہونے والے قبائل عرب سے معاہدے اور صلح نامے اسلامی ریاست کے

ارتقا کا چوتھا مرحلہ تھا۔ ہمارے مستند مورخین کے بیانات کے مطابق ہجرت کے چھ ماہ کے اندر اندر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مہم ترتیب دی تھی اور اس کو شہر مدینہ کے مغرب کے ایک قبیلہ کے علاقے میں بھیجا گیا تھا۔ اور اس کے بعد ہجرت کے اٹھارہ ماہ کے اندر واقدی کے بقول جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید سات مہمیں ترتیب دی تھیں[۸۸] جن میں سے ایک کے سوا سب کی سب قرب وجوار کے علاقے میں گئی تھیں۔ ایک کم معروف مورخ کے مطابق بدر سے پہلے دو اور مہمیں بھیجی گئی تھیں اور ان کے بھی منازل مدینہ کے قریبی قبائل تھے[۸۹]۔ اس طرح سے غزوۂ بدر سے پہلے ترتیب دی جانے والی مہمیں دس ہو جاتی ہیں۔ ان مہموں کی نوعیت اور حقیقت کو عموماً بہت ہی غلط انداز میں سمجھا، سمجھایا اور پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے مغربی علمأ تاریخ نے تو غلط فہمی، غلط تفسیر اور غلط تشریح کی ایک بے نظیر مثال پیش کی ہے۔ اس میں کچھ تو بقول مولانا شبلی نعمانی ہماری روسیاہی کے لئے سیاہی ہمارے ہی اوّلین مورخین و سیرت نگاروں نے فراہم کی ہے، اور کچھ مہمات نبوی کی اقتصادی اہمیت سے ان کی غیر معمولی اور اکثر حالات میں غیر حقیقی اور مبالغہ آمیز دلچسپی کو دخل ہے۔ بعض ابتدائی مورخین مغرب نے تو اس سلسلہ میں صریح بددیانتی اور افترا پردازی سے کام لیا ہے مگر بعد کے جدید مورخین پر بددیانتی کا اتنا شبہ نہیں کیا جا سکتا جتنا کہ اپنے پیشرؤوں کے نظریات سے متاثر ہو کر اپنے طرزِ خیال اور طرزِ فکر کو ڈھالنے کا احساس ملتا ہے۔ چونکہ یہ خیال اتنا یقینی اور پختہ ہو گیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مہاجر اصحاب خالی ہاتھ اور بے سروسامان مدینہ آئے تھے[۹۰] لہٰذا ان کو معاشی ضروریات کی فراہمی کا کوئی ذریعہ درکار تھا۔ مدینہ میں انصار کی پہلے سے خراب معیشت نے ان کی کوئی مستقل مدد نہیں کی اور ان کی فیاضی و سخاوت اور سیر چشمی بس ایک حد تک کفایت کر سکتی تھی اس لئے جلد ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے تہی دست و نادار اصحاب کے لئے ایک ذریعہ آمدنی تلاش کرنا پڑا اور آپ کے سامنے عربوں کے پرانے لوٹ مار ——— رزیہ ——— کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا جس کو اخلاقی طور سے برا نہیں سمجھا جاتا تھا اور عرب قبائلی سماج میں جسے سندِ قبولیت حاصل تھی۔ چنانچہ آپ نے یہ سلسلہ شروع کیا اور اسی مقصد کے لئے دس ابتدائی مہمیں ترتیب دی گئیں جو بالآخر غزوۂ بدر پر منتج ہوئیں اور پھر اس کے نتیجے میں مکہ والوں سے باقی فوجی آویزش ہوئی۔

ہمارے سیرت کے ابتدائی مؤلفین نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقدامات کو قریشی عداوت و خطرے کے پس منظر میں سمجھا، دیکھا اور پھر ہمیں دکھایا ہے۔ چونکہ مدینہ منورہ شام سے مکہ والوں کی تجارت کی بین الاقوامی شاہراہ پر پڑتا تھا اس لئے ان مؤلفینِ سیرت نے آپ کی ان ابتدائی مہموں کو قریشی کاروانوں کی روک ٹوک اور چھیڑ چھاڑ قرار دے دیا[۹۱]۔ اس سے جدید مغربی مورخین اور ان کے خوشہ چیں مشرقی اور مسلم سیرت نگاروں اور مورخوں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور یہ نتیجہ نکالا کہ قریشی مال و دولت سے لدے کاروانوں نے مسلمانوں میں طمع، حرص و ہوس اور آسانی سے مل جانے والی دولت کی آگ بھڑکا دی اور وہ اپنی اقتصادی مجبوریوں سے تنگ آ کر لوٹ مار کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور یہ ابتدائی مہمیں انھیں کا دوسرا اور عملی روپ تھیں[۹۲]۔ دوسری طرف بعض مسلم مورخین نے تھوڑی سی یہ تاویل کی کہ ان مہموں کا مقصد دولت یا کارواں لوٹنا نہیں تھا بلکہ مکہ کی اقتصادی ناکہ بندی تھی جس کے ذریعہ مکہ کی اشرافیہ کو مدینہ کی اسلامی ریاست سے کسی قسم کی مزاحمت پیدا کرنا تھا[۹۳]۔ بہر حال ان دونوں صورتوں میں ان ابتدائی مہموں کا مقصد محرک اور مسائل و معاملات اقتصادی و معاشی تھے۔ لیکن ان ابتدائی مہموں کا ایک

تنقیدی اور تحلیلی تجزیہ ان کے مقاصد، محرکات اور مسائل کے بارے میں بالکل دوسرے نتائج نکالنے پر مجبور کرتا ہے جو در اصل صحیح اور واقعی تھے۔

اگر واقدی کی روایت تسلیم کر لی جائے تو سریہ حضرت حمزہ بن عبد المطلب اسلام کی پہلی مہم تھی جو رمضان سنہ ۱ھ / مارچ ۶۲۳ء میں بحر قلزم کے ساحل پر واقع ایک مقام العیص کی طرف بھیجی گئی تھی۔[۹۴] طبری اور ابنِ اثیر کا بیان ہے کہ اس مہم کا مقامِ مقصود قبیلۂ جُہینہ کا علاقہ تھا۔[۹۵] یہ حقیقت دلچسپ ہے کہ جہینہ والے مدینہ کے قبیلہ خزرج کے حلیف و معاہد تھے اور اس کے تحت جنگ بعاث میں جو سنہ ۶۱۵ء کے ابتدائی زمانے میں ہوئی تھی خزرج کی طرف سے شریکِ جنگ ہوئے تھے۔ دُوسرا فریق مدینہ کا اوس اور ان کا اتحادی حلیف قبیلۂ مزینہ تھا جو مدینہ کے نواح مغرب میں آباد تھا اور وہ اپنے حلیف قبیلہ کی طرف سے جنگ میں شریک ہوا تھا۔ قبائل جہینہ اور مزینہ کے اپنے اپنے حلفائے مدینہ خزرج اور اوس کے ساتھ بالترتیب قریبی اور دوستانہ تعلقات قائم اور بعد ہجرت نبوی بدستور قدیم دائم تھے۔ چنانچہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر میں معاشرۂ امت اور اسلامی ریاست کا سنگِ بنیاد رکھا تو فطری طور سے ان حلیف و قریب و دوست قبائل سے تعلقات کا مسئلہ زیرِ بحث آیا اور لازمی طور سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان قبائل سے بھی وہی حلف و معاونتِ باہمی کے رشتے استوار رکھے جائیں جس طرح مدینہ کے یہودی حلیف قبیلوں سے قائم رکھے گئے تھے کیونکہ یہ قبائل مدینہ کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی دائرہ کار میں رہتے تھے اور جغرافیائی سیاسیات کے اصول کے ماتحت ان سے تعلقات قائم رکھنا لازمی و ناگزیر تھا۔[۹۶] جدید مغربی مورخین اور علماءِ سیرت کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ مدینہ کے ارد گرد بسے ہُوئے قبائل امتِ اسلامی کے حلقہ میں سب سے پہلے داخل ہُوئے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مہاجرین و انصار کے بعد سب سے بڑے جاں نثار و وفادار تھے۔[۹۷] اس امر کی صریح و صاف تصدیق ان معاہدوں سے ہوتی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مغربی قبائل سے خصوصاً اور مشرق مدینہ کے باسی قبائل سے عموماً کئے تھے۔ اگرچہ ان تمام معاہدوں کی تاریخ اور وقت کے بارے میں مآخذ کے بیانات صاف نہیں ہیں تاہم خوش قسمتی سے بعض معاہدوں کے وقت اور حالات کا ذکر صریح طور پر ملتا ہے، جس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ یا تو یہ معاہدات حلف و باہمی تعاون انہیں ابتدائی مہموں کے زمانے اور دوران میں ہُوئے تھے یا ان کے نتیجے میں طے پائے تھے۔ حضرت حمزہ کی مہم العیص کا مقصد قبیلہ جہینہ کی دوستی و تعاون حاصل کرنا تھا نہ کہ قریشی کارواں پر چھاپہ مارنا۔ اسی ضمن میں جہینہ کے سردار مجدی بن عمرو کا کردار بہت اہم ہے۔ اتفاق سے جب مسلم جماعت ان کے علاقہ میں پہنچی تو اس کا سامنا شام سے لوٹنے والے ایک کارواں سے ہوگیا۔ قریب تھا کہ جھڑپ ہو جاتی مگر مجدی بن عمرو نے بیچ بچاؤ کیا۔ ہمارے مآخذ بصراحت کہتے ہیں کہ قبیلہ جہینہ کے مسلمانوں اور مکہ والوں دونوں سے دوستانہ تعلقات تھے اسی لئے ان کے سردار نے ثالث، حکم یا صلح کے علمبردار کا کردار ادا کیا تھا۔[۹۸]

دوسری مہم رابغ کی وادی کی طرف حضرت عبیدہ بن الحارث کی زیرِ قیادت شوال سنہ ۱ھ / اپریل ۶۲۳ء میں بھیجی گئی تھی۔ اس کا مقصد بھی اس علاقے کے بدوؤں یا بدوی قبیلوں سے دوستی کے روابط قائم کرنا تھا۔ اس مہم میں بھی اسلامی دستے کا سامنا ایک اور قریشی کارواں سے ہوا تھا مگر دونوں میں جنگ و جدال کی نوبت نہیں آئی۔[۹۹] ان دو مہموں کے علاوہ تیسری مہم

حضرت سعد بن ابی وقاص کے زیر کمان ایک ماہ بعد خرّار کے علاقے میں بھیجی گئی تھی۔ ہمارے مورخین اس مہم کی منزل کے باسیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتے اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ اس کا مقصد بھی ایک قریشی کاروان تھا مگر وہ مسلم جماعت کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی نکل گیا تھا۔ مسلمانوں کی کسی دشمن سے ملاقات نہیں ہُوئی اور وُہ بسلامت مدینہ منورہ واپس آ گئے۔(۱۰۰)

اس کے بعد پے بہ پے چار غزوات ہُوئے:

اوّل غزوۂ ابواء یا ودّان صفر ۱ھ / اگست ۶۲۳ء میں،

دوم غزوۂ بواط ربیع الاوّل ۲ھ / ستمبر ۶۲۳ء میں،

سوم غزوۂ سفوان اسی ماہ میں، اور

چہارم غزوۂ ذوالعشیرہ جمادی الاولیٰ ۲ھ / دسمبر ۶۲۳ء میں۔

ان غزوات پر تمام مورخین و سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ بدر سے پہلے صرف چار مہموں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت فرمائی تھی۔(۱۰۱) مگر محمد بن حبیب بغدادی ان کے بعد دو اور غزووں کا ہونا بتاتا ہے اور بظاہر تمام قرائن کہتے ہیں کہ اس کا اضافہ غلط نہیں ہے۔ اس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعرات ۲ شعبان ۲ھ / ۲۹ جنوری ۶۲۴ء اور پھر منگل ۱۴ شعبان ۲ھ / ۱۲ فروری ۶۲۴ء کو بالترتیب ینبع اور سفوان کا سفر کیا تھا۔ پہلی مہم کے محرک و مقصد کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہتا البتہ دوسرے سفر کا نتیجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ آپ نے پہلے غفار سے اور پھر اسلم سے دوستی و باہمی تعاون کے معاہدے کئے تھے۔(۱۰۲) پہلے چار غزوات کے بارے میں عمومی تاثر یہ ہے کہ وہ قریشی کاروانوں کی روک تھام کے لئے واقع ہوئے تھے اور یہ تاثر ہمارے ابتدائی سیرت نگاروں نے فراہم کیا ہے اگرچہ وُہ یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ ان میں سے کسی میں بھی دشمن سے سامنا نہیں ہوا تھا۔(۱۰۳) بہرحال ان کے بیانات کا تنقیدی تجزیہ کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جو محرکات و مقاصد ان مہموں کے ابتدائی مولفینِ سیرت نے مقرر کئے ہیں وُہ دراصل ان کے اپنے تاثرات کا نتیجہ ہیں نہ کہ واقعات اور حقائق کا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ان غزوات کے بارے میں انھیں مورخین و سیرت نگاروں کے بیانات سے ان کے تاثرات کی تردید ہو جاتی ہے۔

مثال کے طور پر ابنِ اسحاق پہلی دو مہمات نبوی کے بارے میں یہ قطعی نہیں بیان کرتے کہ وُہ کن لوگوں کے خلاف بھیجی گئی تھیں۔ ان کا بیان بس اس حد تک ہے کہ وُہ غزوات اپنے علاقوں کی طرف گئے جہاں ان کی ملاقات اتفاقاً قریشی کاروانوں سے ہو گئی دراصل یہ ملاقات ایک اتفاقی حادثہ تھا نہ کہ سوچا سمجھا منصوبہ۔(۱۰۴) ابنِ اسحاق کے ان بیانات کی کم و بیش یکساں پیروی ابنِ ہشام، واقدی، ابنِ سعد اور ابنِ اثیر کے یہاں ملتی ہے۔(۱۰۵) طبری واحد مورخ ہیں جو یہ حتمی بیان دیتے ہیں کہ یہ دونوں مہمات قریشی کاروانوں پہ چھاپہ مارنے کے لئے وجود پذیر ہوئی تھیں۔(۱۰۶) اگرچہ اوّل چار غزواتِ نبوی کے بارے میں ہمارے اکثر سیرت نگار اپنے بیانات کا آغاز اس ٹیپ کے بند سے کرتے ہیں کہ "آپ قریش کے ارادے سے نکلے"، مگر بعد میں غزوات کے اصل بیانات میں حیرت کی بات ہے کہ وہ قریش یا قریشی کاروانوں کا حوالہ نہیں دیتے ہیں۔(۱۰۷) غزوۂ ودّان یا ابواء کے بیان میں سارا زور قبیلہ کنانہ کے ایک خاندان بنو ضمرہ سے معاہدہ صلح و تعاون پر مرکوز رہتا ہے جو آپ نے ان کے سردار

مخشی بن عمرو ضمری کے ذریعہ کیا تھا۔[۱۰۸] ابن اسحاق اور واقدی نے اگرچہ غزوۂ بواط کے بارے میں صرف یہی کہا ہے کہ وہ قریشی کارواں پر چھاپہ مارنے کی غرض سے ہوا تھا مگر چونکہ شکار ہاتھ سے نکل گیا اس لئے آپ ناکام واپس آ گئے۔[۱۰۹] ابن سعد نے اگرچہ اکثر نکات پر اپنے استاد سے اتفاق کیا ہے تاہم وہ ایک اہم اور نیا حوالہ یہ دیتا ہے کہ بُواط کا علاقہ قبیلہ جہینہ کا تھا جہاں مسلم جماعت تقریباً ایک ماہ مقیم رہی۔[۱۱۰] اسی طرح اگرچہ غزوہ ذو العشیرہ کے بارے میں مورخینِ صدر اول کا تاثر یہی ہے کہ وہ قریشی کارواں کے لئے ہوا تھا لیکن ان کا سارا بیان سفر نبوی کی منازل اور راستوں سے متعلق ہے اور آخر میں یہ حتمی بیان ہے کہ آپ نے بنو مدلج اور ان کے حلیف بنو ضمرہ سے معاہدۂ صلح و اعانتِ باہمی کیا تھا۔[۱۱۱] باقی دو مزید غزواتِ نبوی کے بارے میں محمد بن حبیب بغدادی کے بیان میں کہیں بھی قریش یا قریشی کارواں کا ذکر نہیں بلکہ قبیلۂ غفار اور قبیلۂ اسلم سے معاہدات نبوی کا واضح بیان ملتا ہے۔[۱۱۲] جہاں تک سریہ نخلہ کا تعلق ہے وہ حضرت عبداللہ بن جحش کی زیرِ قیادت مکہ اور طائف کے درمیان واقع مقام نخلہ کو بھیجی گئی تھی اور اس کا مقصد قریشِ مکہ کے بارے میں معلومات فراہم کرنا تھا۔ اس پر بحث کہیں اور کی جا چکی ہے۔[۱۱۳] لہٰذا تفصیلات سے گریز کیا جاتا ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہو گا کہ مہم نخلہ در اصل ایک طلیعہ تھا جس کا کام صرف معلومات فراہم کرنا تھا۔ اور یہی حال ان میں سے بیشتر سرایا کا تھا جہاں تک اولین غزواتِ نبوی کا تعلق ہے وہ فوجی مہمیں ہرگز نہ تھیں بلکہ سیاسی مہمیں یا مشن تھے جن کا مقصد پڑوسی قبائل سے جو مدینہ کے زیر اثر علاقے میں آباد تھے دوستانہ اور باہمی تعاون و نصرت کے تعلقات قائم کرنا تھے۔ اور اس طرح مدینہ کی اسلامی ریاست کے زیر اثر علاقے اور باہمی تعاون و نصرت کے تعلقات قائم کرنا تھے۔ اور اس طرح مدینہ کی اسلامی ریاست کے زیر اثر علاقے یا سیاسی علقۂ اثر کو وسیع تر کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ قبائل بنو مدلج، بنو ضمرہ، غفار، اسلم، مزینہ، جہینہ اور متعدد دوسرے قبائل سے معاہدے اسی زمانے کی یادگار ہیں اور وہ بالواسطہ طور پر ان ابتدائی مہمات نبوی کی نوعیت و حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں۔[۱۱۴]

ان مہموں کے بارے میں ابتدائی مولفینِ سیرت اور جدید مسلم و مغربی مورخین کے اس نظریہ کی کہ وہ قریشی کاروانوں پر چھاپہ مارنے کے لئے منظم کی گئی تھیں متعدد دوسرے دلائل اور شواہد سے قطعی اور حتمی تردید ہوتی ہے۔ اول یہ کہ نظریاتی طور سے مسلمانوں کو اقدامِ جنگ کی اجازت نہ تھی۔[۱۱۵] اس کے علاوہ مسلم ریاست اس وقت اس فوجی صلاحیت اور سیاسی طاقت کی مالک نہ تھی کہ وہ جزیرہ نمائے عرب کے سب سے بڑی سیاسی اور فوجی طاقت سے ٹکر لے سکتی۔ چنانچہ مسلمان نہ تو قریشی کاروانوں پر سامنے سے بالمشافہ حملہ کرنے کا خطرہ مول لے سکتے تھے اور نہ ہی ان پر چھپ کر چھاپہ مار سکتے، گھات لگا کر حملہ کر سکتے یا شبخون مار سکتے تھے۔[۱۱۶] اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ قریشی کاروانوں کے ساتھ محافظین کی تعداد کافی ہوتی تھی اور عددی لحاظ سے مسلم مہموں کی طاقت بہت کم تھی جیسا کہ چاروں سرایا کی عددی طاقت سے خاص طور پر معلوم ہوتا ہے اور چھ غزواتِ نبوی میں سے محض تین میں مسلم دستوں کی عددی طاقت سو اور دو سو مسلمانوں پر مشتمل تھی جبکہ ان کے مقابلے میں قریشی کاروانوں کی عددی قوت خاص گراں کی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں سے سامنا ہوا تھا کئی گنا زیادہ تھی۔[۱۱۷]

ایک دوسرا اور کہیں زیادہ اہم معاملہ تھا مغربی شاہراہ تجارت پر بسے ہوئے قبائل عرب کے رویے اور طرزِ عمل کا۔ تمام آثار و شواہد اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام اور استحکام سے پہلے

تمام قبائل عرب جو اس علاقے میں بستے تھے قریشی تاجران مکہ سے حلف و دوستی کے تعلقات رکھتے تھے۔ یہ زمانہ جاہلیت کے قبائلی سماجی اور اقتصادی تعلقات کی دین تھے۔ عموماً تاجر قبیلے شاہراہ تجارت کے ارد گرد بسے ہوئے قبائل سے دوستی کے معاہدے کر لیتے تھے۔ یہ معاہدے باہمی تعاون کے ہوتے تھے۔ تاجر قبائل ان بدوی یا ساکن قبیلوں کو چند مراعات یا ایک خاص قسم کا ٹیکس دیتے تھے جو عموماً بدو قبائل کی مادی ضروریات مثلاً کھجور، کپڑے، ہتھیار وغیرہ پر مشتمل ہوتا تھا۔ اور اس کے بدلے میں یہ بدو قبیلے تجارتی کاروانوں کی اپنے علاقے میں حفاظت کرتے تھے بلکہ ان کو دوسرے علاقوں تک حفاظت سے پہنچانے کا اہتمام کرتے تھے قریش نے اسی قسم کے معاہدے تمام قبیلوں سے کر رکھے تھے[۱۱۸] جیسا کہ جہینہ کے سردار مجدی بن عمرو جہنی کے رویہ اور جملہ سے ہوتا ہے اور دوسرے متعدد ثبوت سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان علاقوں میں مسلم دستے آسانی سے کامیاب نہیں ہو سکتے تھے اگر وہ تجارتی قافلوں پر حملہ کرتے۔ اس صورت میں وُہ نہ صرف قریش مکہ سے جنگ کا خطرہ مول لیتے بلکہ پڑوس کے بدوی قبائل کو بھی اپنا دشمن بنا لیتے اور اس طرح نہ صرف مسلم دستوں کی بہ حفاظت واپسی مشکل ہو جاتی بلکہ خود نوزائیدہ اسلامی ریاست کی زندگی اور وجود معرض خطر میں پڑ جاتا۔

شاہراہ تجارت پر بسے ہُوئے قبائل عرب کے رویے اور طرزِ عمل سے زیادہ حیرت انگیز رویہ خود قریشی کاروانوں کا نظر آئے گا اگر مسلم مہموں کو چھاپہ مار کارروائی مان لیا جائے۔ اگر بالفرض پہلی مہم میں جہنی سردار کی کوششوں کے سبب تصادم کی نوبت نہیں آئی تھی اور مسلم دستہ صاف بچ گیا تھا تو دوسری مہم رابغ میں برتر قریشی کارواں نے فروتر مسلم دستہ کو تہس نہس کر کے اس خطرہ کا سدِ باب ہمیشہ کے لئے کیوں نہیں کر دیا؟ لیکن اگر یہ دلیل بھی تسلیم کر لی جائے کہ قریشی کارواں بلاوجہ کوئی جھگڑا مول لینا نہیں چاہتے تھے اور اپنی تجارت کی آئندہ سلامتی کی خاطر جنگ و جدال سے پہلو تہی کرنے کی حکمت عملی پر عمل پیرا تھے[۱۱۹] تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی تجارت پر مسلسل منڈلاتے ہوئے اس خطرہ کا مستقل سدِ باب کیوں نہیں کیا تھا، کیا وُہ اپنی تجارت کے بارے میں اتنے ہی لاپروا تھے؟ اور کیا تھا تو کیا اور کیوں کر کیا تھا؟ کیا انھوں نے اپنے کاروانوں میں محافظ دستہ کی فوجی طاقت میں اضافہ کیا تھا یا عرب قبائل سے مزید امداد مانگی تھی؟ بظاہر دوسری صورت تو پیش نہیں آئی تھی کیونکہ واقعات و حقائق اس کی نفی کرتے ہیں۔ رہی پہلی صورت تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بجائے محافظین کی تعداد میں اضافہ کے ان میں مسلسل کمی آتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ بدر سے ذرا پہلے جو عظیم اور مالا مال قریشی کارواں شام گیا تھا اس میں محافظین کی تعداد بہت ہی کم تھی۔[۱۲۰] یہ حقیقت اس بات کی غماز ہے کہ ہمارے جدید مغربی مورخین اور ان کے خوشہ چیں مسلم مولفینِ سیرت اور مورخین کو قریشی تجارت پر ان ابتدائی مہموں کی صورت میں جو خطرہ منڈلاتا نظر آ رہا ہے وُہ کم از کم اس وقت کے تاجرانِ مکہ کو غالباً بالکل نظر نہیں آیا یا محسوس ہوا تھا۔ ورنہ وُہ یُوں اپنے کاروانوں کے محافظین کی تعداد میں مسلسل کمی کرتے نہ رہتے اور اس طرح خود اپنی تجارت کے ہلاکت کے درپے نہ ہوتے۔ حالات و واقعات اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد قریشِ مکہ کو یقیناً اپنی تجارت اور تجارتی کاروانوں کے لئے خدشہ پیدا ہوا ہوگا اور اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی کاروانوں میں افرادی طاقت مقابلتاً کہیں زیادہ تھی لیکن جُوں جُوں

وقت گزرتا گیا ان کو مدینہ کی طرف سے لاحق خدشات، اگر کوئی تھے بھی تو وہ مٹتے گئے اور وہ رفتہ رفتہ اپنے کاروانوں کی حفاظت کے بارے میں مطمئن ہوتے گئے۔ پھر قریشِ مکہ اچھی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور فکر و عمل سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مکہ کا الامین مدینہ میں اپنی فطرت و طبیعت کے خلاف اپنی روایاتِ امانت و دیانت سے یوں گریز نہ کرے گا کہ کسبِ معاش کے لئے لوٹ مار کی راہ اختیار کرے۔ مآخذ سیرت و حدیث کی بعض روایات سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ بدر سے پہلے تک مکہ والوں کو اپنی تجارت کے لئے مدینہ والوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا، جیسا کہ حضرت سعد بن معاذ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔[۱۲۱]

ابتدائی مہموں کے ذیل میں ایک اہم نکتہ ان کی منزلوں کا بھی ہے۔ ان دسوں مہموں میں مہماتِ نبوی کی منزلیں ایک دوسرے سے قطعی مختلف اور فاصلہ کے لحاظ سے الگ الگ تھیں۔ سفوان اور نخلہ مکہ کے قرب میں اور کافی جنوب مشرق میں واقع تھے جبکہ بقیہ منازل کا مدینہ منورہ سے فاصلہ تیس اور سو میلوں کے درمیان تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام منازل مغربی شاہراہ تجارت پر واقع نہ تھیں۔ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ تمام منازل اس شاہراہ پر ہی واقع تھیں تو مورخین کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ کئی مہمات نبوی کی منزل مقصود شاہراہ تجارت سے ہٹ کر بدوی قبیلوں کے علاقے میں تھی۔[۱۲۲]

اس کے علاوہ ایک اہم ترین نکتہ جو ان مہموں کے چھاپہ مار ہونے کے الزامِ خام کی قطعی تردید کرتا ہے وہ ان مہموں میں لگنے والی مدت خاص کر مسلم دستوں کے اپنی منازلِ مقصود پر قیام سے متعلق ہے۔ مورخین ان مہمات نبوی خاص کر غزوات کے بارے میں صراحت سے بیان کرتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بدوی علاقوں میں کتنی مدت تک قیام کیا۔ مثلاً غزوۂ ودان کے دوران آپ نے منزل پر تقریباً دو ہفتے تک قیام کیا تھا جبکہ بواط اور ذو العشیرہ میں آپ کا قیام دونوں مقامات پر ایک ماہ کے لگ بھگ رہا تھا۔ اگرچہ محمد بن حبیب بغدادی اپنی بیان کردہ دو نئی مہموں کے دوران منازلِ مہمات پر قیام نبوی کی مدت کا کوئی حوالہ نہیں دیتے تاہم یہ واضح ہے کہ وہ خاصی طویل رہی ہو گی۔ یہ بات عجیب نظر آتی ہے کہ آپ نے یا آپ کے امراءِ سرایا نے ظاہری طور پر کاروانانِ قریش کے ہاتھ سے نکل جانے کے باوجود اتنی مدت تک ان علاقوں میں قیام رکھا تھا۔ یہ سوچنا غلط ہے کہ آپ یا آپ کے امراء تجارتی کاروانوں کی واپسی کے منتظر تھے یا دوسرے کاروانوں کی تاک میں تھے۔ پہلی صورت میں قریشی کارواں شام سے اتنی جلد واپس نہیں آ سکتے تھے کیونکہ آمد و رفت میں کم از کم تین ماہ یا اس کے لگ بھگ مدت لگتی تھی۔ پھر یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ جب کاروانوں کی واپسی کا وقت قیاساً قریب آیا تو آپ مدینہ لوٹ آئے۔ جہاں تک دوسرے کاروانوں پر حملہ کا سوال ہے تو ہمارے تمام مآخذ اس پر متفق ہیں کہ ایسا کوئی واقعہ نہیں پیش آیا۔[۱۲۳]

پھر ایک بڑا سوال قریشی کاروانوں کی آمد و رفت کی تیز رفتاری اور سرعت اور اسی کے ضمن میں مکی تجارت کے معیار کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر مغربی مورخین کا یہ نظریہ مان لیا جائے کہ کرز بن جابر فہری کے خلاف کئے گئے غزوۂ سفوان کے علاوہ بقیہ تمام مہموں کا مقصد چھاپہ مار کارروائی تھی تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مکی تجارت کتنی بڑی اور عظیم تھی کہ ہجرت کے بعد دس ماہ کی قلیل مدت میں تاجرانِ مکہ نے لگ بھگ نو کارواں شام کو بھیجے تھے اور وہ بھی ابو جہل، ابو سفیان، امیہ بن خلف

جیسے بڑے بڑے سردارانِ قریش کے زیرِ کمان۔ جبکہ بعد کے زمانے میں پُورے چار برسوں کی مدّت میں — بدر اور حدیبیہ کے دوران — یہی تاجرانِ مکہ صرف دو کاروان شام کو بھیج سکے تھے۔ اور دونوں ہی کارواں اسلامی ریاست کی حدود سے بچ کر نہیں نکل سکے تھے اور مسلم فوجی دستوں کے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ یہ نکتہ ہمیں اس بحث کی طرف بھی لے جاتا ہے کہ کیا مسلم اُمراء و قائدینِ مدینہ اتنے بے تدبیر، فوجی حکمتِ عملی سے عاری، سیاسی بصیرت سے محروم اور عمل کے کورے تھے کہ انھوں نے کم و بیش نو بار گھات لگائی اور سوائے ایک موقعہ کے ہر بار ناکام رہے۔ بعد کی فوجی کارروائیوں بلکہ کارناموں سے اسی غلط تاثر و نتیجہ کی نہ صرف تردید ہوتی ہے بلکہ یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ جب جب مسلمانوں نے تلوار اٹھائی وہ کاری ضرب لگائے بغیر نیام میں نہ گئی۔ انھوں نے جب یہ فیصلہ کر لیا کہ قریشی کاروانوں کو اپنے علاقے سے یا کسی بھی تجارتی شاہراہ سے خواہ وہ مشرقی ہو یا مغربی نہیں گزرنے دینا ہے تو کوئی کارواں بچ کر نہیں نکل سکا، حتیٰ کہ صلح حدیبیہ کے بعد جب مکہ کے بے بس و لاچار مسلمانوں نے عیص میں پناہ لی تھی تو انھوں نے اپنی فوجی بے سر و سامانی کے باوجود قریشی کاروانوں کو بچ کر نہیں نکلنے دیا تھا۔ یہ حقیقت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس وقت تک مسلمانوں نے چھاپہ مار کارروائی کا منصوبہ ہی نہیں بنایا تھا۔ اور نہ ہی قریشِ مکہ کو اپنی تجارت یا تجارتی قافلوں کے لئے کوئی خطرہ تھا یا ان مہماتِ نبوی سے محسوس ہوا تھا۔[۲۴]

ان ابتدائی مہموں کا اولین و آخرین مقصد در اصل مدینہ کے ارد گرد بسے ہوئے قبائل سے دوستی و باہمی تعاون کے تعلقات کو فروغ دینا اور مدینہ کی اسلامی ریاست کو ایک محفوظ و مامون علاقہ فراہم کرنا تھا۔ ان کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ مدینہ کے مغربی نواح میں بسے ہوئے تقریباً تمام بدوی قبائل جیسے خزاعہ اور ان کی ایک اہم شاخ اسلم اور کنانہ کی متعدد شاخوں جیسے ضمرہ، غفار، لیث، دیل اور مدلج، قبائل جہینہ اور مزینہ اور ازد شنوءہ کے بعض خاندانوں سے مسلم ریاست کے باہمی تعاون اور دوستی کے تعلقات قائم ہو گئے۔[۲۵] یہ دفاعی معاہدے تھے جو ان سے اس زمانے میں کئے گئے تھے۔ چونکہ ان قبائل کے انصارِ مدینہ سے دوستی کے دیرینہ تعلقات تھے اس لئے اسلامی ریاست کو ان سے تعلقات قائم کرنے میں مدد بھی ملی اور مدینہ کے مسلمانوں کی سیاسی اور فوجی طاقت میں بھی اضافہ ہوا۔ مغربی قبیلوں کے علاوہ بعض مشرقی قبائل سے بھی جن میں اسد بن خزیمہ اور سُلیم کے بعض خاندان شامل تھے اسی زمانے میں تعلقاتِ حلف استوار ہوئے تھے۔ ان مہموں کے نتیجے میں اسلامی ریاست کے حدود میں خاصی توسیع ہُوئی تھی۔ اور یہ توسیع دو طرح کی تھی:

اوّل تو مدینہ منورہ کے قریب ترین علاقے تھے جن میں جہینہ اور مزینہ کے قبیلوں کے بعض اہم خاندان آباد تھے۔ یہ قبائل/خاندان نہ صرف اسلامی ریاست کے حلیف رکن بنے تھے بلکہ اسلامی معاشرہ — امت — کے رکن بھی بن گئے تھے اس لئے مدنی ریاست کی سیاسی حدود محض شہرِ رسول تک محدود نہیں رہی تھیں بلکہ شہری ریاست کے مرکز کے ارد گرد کے علاقوں تک وسیع ہو گئی تھیں۔

دوم یہ کہ وسعت کے لحاظ سے مدینہ کی اسلامی ریاست کا حلقۂ اثر و نفوذ اس عملی دائرے سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔ اور غزوۂ بدر تک ایک طرف تو مغربی شاہراہ تجارت کی پوری ساحل پٹی جو شمال میں العیص اور ینبوع اور جنوب میں رابغ کے

درمیان تھی مدینہ[۱۲۶] کی اسلامی ریاست کے سیاسی اور مذہبی اثر میں آگئی تھی اور اس سے زیادہ مدینہ اور ان تینوں مقامات کے درمیانی علاقہ کے قبائل اور ان کے خطّوں کا معاملہ تھا ان کے علاوہ یہ بھی قوی امکان ہے کہ مدینہ کے عین مشرق اور مشرق شمال اور مشرقِ جنوب کا علاقہ بھی اسلامی ریاست کے اثرات محسوس کرنے لگا ہو۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ مدینہ شہر کے چاروں سمت میں ارد گرد کا خاصا وسیع علاقہ یا تو مدنی ریاست کا جزو بن گیا تھا یا اس کے حلقۂ اثر کا علاقہ۔ اور یہ ابتدائی مہمات کا اصل کارنامہ تھا جو انھوں نے اسلامی ریاست کے ارتقاء کے ایک اہم مرحلہ کے بطور انجام دیا تھا۔

(۵) پانچواں مرحلہ : عظیم جدّوجہد کا زمانہ

رمضان سنہ ۲ھ / مارچ سنہ ۶۲۴ء میں غزوۂ بدر[۱۲۷] مدینہ منورہ کے سیاسی حلقۂ اثر کی توسیع اور اس کے نتیجے میں نئی امت اسلامی کے وائرے کے پھیلاؤ میں ایک اہم سنگِ میل ثابت ہُوا۔ بے سروسامان، غیر منظم اور عددی اعتبار سے کہیں زیادہ فروتر اسلامی فوج کی طاقتور و مالدار مکی اشرافیہ کی کیل کانٹے سے لیس، تجربہ کار سپاہ پر مشتمل اور وقت کے بہترین قائدین کی زیرِ کمان برتر فوج پر عظیم الشان فتح نے تقریباً پُورے جزیرہ نمائے عرب کو انگشت بدنداں بلکہ شل کر دیا تھا۔[۱۲۸] ماضی قریب میں قریش مکہ نے اتنی بڑی شکست کا منہ نہیں دیکھا تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اس سے پہلے پے در پے فتوحات سے ہم کنار ہوتے رہے تھے اور اپنی ان عسکری فتوحات اور قبیلہ کنانہ وغیرہ سے اتحاد کے سبب ایک عظیم ترین فوجی طاقت بن کر اُبھرے تھے۔ ان کی اس حیثیت میں ان کے کثیر مال و دولت اور مذہبی برتری نے بھی اپنا حصّہ ادا کیا تھا۔ اپنی فطری صلاحیتوں اور قائدانہ لیاقتوں کے سبب وہ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں عرب کی سب سے بڑی سیاسی، فوجی، مذہبی اور اقتصادی وحدت تھے۔ بدر کے میدان میں ان کی یہ ذلّت آمیز شکست ان کے سیاسی و سماجی وقار، مذہبی چودھراہٹ، اقتصادی بالادستی اور فوجی برتری کا جنازہ نکال سکتی تھی۔ خود قریشِ مکّہ کو اس شکست کے دُوررس اثرات کا اندازہ تھا[۱۲۹] ورنہ شاید وُہ اپنی شامی تجارت کو بچانے کے لئے مدینہ والوں سے بھی دوسرے قبائل عرب کی مانند صلح یا دوستی کرنے کی کوشش کرتے اور بدر کے زخموں کو اپنی حکمتِ عملی کے مرہم سے بھرنے کا مداوا پسند کرتے۔ لیکن اپنے زخم خوردہ سیاسی و سماجی وقار کی بحالی اور فوجی بالادستی کے غیر متزلزل ہونے کا یقین خود ان کو اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ وُہ مدینہ کی اُبھرتی فوجی اور سیاسی طاقت کو ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے نابود نہ کر دیتے یا اس کو اس حد تک کچل نہ دیتے کہ وہ پھر سر نہ اٹھا سکتی۔

دوسری طرف بدر کی فتحِ عظیم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقار میں زبردست اضافہ کیا اور مسلمانوں کی دھاک بٹھا دی۔ مدینہ کے عرب۔ قبائل خاص کر اور دُوسرے نواحی بدو قبیلے عام طور سے مسلمانوں کی جیت سے یقیناً متاثر ہوئے تھے۔ ان کو اس حقیقت کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اسلامی ریاست ایک سیاسی اور فوجی طاقت بن چکی ہے جس سے بہ آسانی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ قریش جیسی عظیم طاقت کی شکست نے ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدے کرنے کی تحریک دی ہو گی اور اس کا بھی قوی امکان ہے کہ اس فتح مبین کے نتیجے میں بعض قبائل اور جماعتوں اور افراد نے اسلام کے بارے میں

اپنی رائے تبدیل کی ہو اور غور و فکر کے بعد اسلامی اُمت کا ایک رُکن بننے کی صدقِ دل سے کوشش کی ہو۔ بہرحال یہ یقینی بات ہے کہ اس وقت تک یا اس زمانے میں کم از کم دو مغربی قبیلے جُہینہ اور مُزینہ اسلام کے دائرہ میں تقریباً مکمل طور سے داخل ہو چکے تھے اور بعض دوسرے قبیلوں نے اسلامی ریاست کی سیاسی دوستی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ خزاعہ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے زمانہ عبد المطلب سے حلف کے تعلقات رکھتے تھے[۱۳۰] اور قریب آ گئے تھے اور ان جیسے قدیم دوست اور حلیف قبائل نے مکمل طور سے یکسو ہو کر مدنی ریاست سے اپنی سیاسی وفاداری وابستہ کر لی تھی[۱۳۱]۔ خاص طور سے اسلم اور غفار کے قبیلوں نے، کیونکہ وہ بوقت ہجرت نبوی تقریباً پورے کے پورے مسلمان ہو چکے تھے اور ان میں جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی وہ اس فتح کے بعد یقیناً پوری ہو گئی تھی۔[۱۳۲] ان جیسے اور نہ جانے کتنے قبائل ہوں گے جنھوں نے اپنا رُخ اب مکہ کے بجائے مدینہ کی طرف کر لیا تھا۔ اگرچہ اس جنگ کے بعد بظاہر ہمارے مآخذ سے جزیرہ نمائے عرب کی سیاست میں کوئی واضح انقلاب نظر نہیں آتا تاہم یہ یقینی ہے کہ بدر کی فتح نے طاقت کا توازن کم از کم پڑوسی قبائل اور علاقوں کی حد تک اسلامی ریاست کے حق میں کافی جھکا دیا تھا۔

اس حقیقت کا اندازہ اس بین الاقوامی ردِّ عمل سے بھی ہوتا ہے جو بدر کی فتح نے کم از کم ایک غیر ملک حبشہ میں پیدا کیا تھا۔ مآخذ کا بیان ہے کہ جب شاہ نجاشی کو مسلمانوں کی اس فتح کی خبر پہنچی تو اس نے حبشہ میں موجود مسلم مہاجرین کے سامنے زبردست خوشی کا اظہار کیا۔ غالباً قریشِ مکہ کو بھی اس بین الاقوامی ردِّ عمل کا جو ان کے حق میں قطعی نہیں تھا خدشہ یا علم تھا چنانچہ اُنھوں نے اسی زمانے میں حبشہ کے دربار میں دو سفارتیں اس غرض سے بھیجی تھیں کہ مسلمانوں کو وہاں سے نکلوایا جائے لیکن یہ دونوں کوششیں ناکام رہیں کچھ تو اس سبب سے کہ شاہِ حبش مسلمانوں کا حامی اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیرو تھا اور کچھ اس سیاسی حکمت عملی کی بنا پر جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریشی چالوں کے توڑ کے لئے اپنائی تھی۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریشی ارادوں کی سن گن پا کر اپنے ایک نمائندے حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو دربارِ حبش میں سفیر بنا کر بھیجا تھا تاکہ ان کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے اور ظاہر ہے کہ ان کا مشن پُوری طرح کامیاب رہا تھا۔[۱۳۳] اسلامی ریاست کو اس فتح مبین کے نتیجے میں محض کامیابیاں اور کامرانیاں ہی نہیں ملی تھیں بلکہ ان کے ساتھ ساتھ زیادہ صبر آزما مراحل اور تکلیف دہ زمانے سے گزرنا پڑا تھا۔ خطرات بڑھے تھے، مصائب میں اضافہ ہُوا تھا، یلغار و نرغہ کی سرحدوں میں توسیع ہُوئی تھی اور پہلے سے کہیں زیادہ مشکلات و آزمائشوں کا سامنا تھا۔

جہاں تک قریش کا تعلق تھا بدر کی شکست بجائے خود ان کے لئے ایک زبردست اشتعال کا سبب تھی۔ مسلمان بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ قریش کا احساسِ شکست غرور ان کو نچلا نہ بیٹھنے دے گا اور وہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک کہ وہ اس کا بدلہ نہ لے لیں۔ دُوسری طرف مسلمانوں کو ہر ممکن تدبیر اور ہر قابلِ حصول طاقت کا استعمال کرنا تھا تاکہ وہ اپنی ریاست اپنے معاشرے اور اپنے مذہب کی حفاظت کر سکیں[۱۳۴]۔ چنانچہ ۲ھ / ۶۲۴ء اور ۸ھ / ۶۳۰ء کے درمیان مکہ اور مدینہ کے درمیان جتنی آویزشیں، تصادم اور محاربات ہُوئے وہ دونوں فریقوں کے انھیں مقاصد کے پس منظر میں تھے۔ اگرچہ ۳ھ / ۶۲۵ء میں غزوۂ اُحد کا نتیجہ مسلمانوں کے خلاف قطعی طور پر رہا تھا لیکن انھوں نے اپنی اس ہزیمت پر جلد ہی قابُو پا لیا اور اس سے

بڑھ کر یہ کہ انھوں نے طاقت کا توازن جو مکیوں کے حق میں جھک سکتا تھا اپنی حکمتِ عملی سے نہ جھکنے دیا اور اقدام اپنے ہی ہاتھوں میں رکھا۔[۱۳۵] مکہ والوں کو اس خوں ریز تصادم اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی عارضی کامیابی سے قطعی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ان کا منصوبہ تو یہ تھا کہ مدینہ کی اسلامی ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے مگر وہ مدینہ میں داخل تک نہ ہو سکے۔ حضرت عمرو بن العاص سہمی جو اس معرکہ میں قریشی افواج کے ایک شہسوار دستے کے سالار تھے اور اپنی جنگی لیاقت کے لئے اس وقت بھی شہرت رکھتے تھے بعد میں بیان کیا کرتے تھے کہ جنگ کے ابتدائی مرحلے میں جب مسلمان سپاہی حاوی تھے تو انھوں نے تاک تاک کر تیروں سے تمام قریشی فوج کے گھوڑوں کو بیکار کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جلد ہی افراتفری پر قابو پا لیا گیا تھا اور اسی جنگی حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا کہ قریشی فوج نہ صرف یہ کہ مدینہ میں داخل نہیں ہو سکی تھی بلکہ پسپا ہونے پر مجبور ہو گئی تھی۔[۱۳۶] قریش کو جو کچھ فوجی اور سیاسی فائدہ عارضی طور سے ہوا تھا وہ بھی دوسری صبح ختم ہو گیا کہ جب زخمی رسول اللہؐ اور شکستہ دل مگر جواں عزم مسلمان سپاہ نے پسپا ہوتی قریشی فوج کا حمراء الاسد تک پیچھا کیا تھا۔[۱۳۷] اس جرأت مندانہ اقدام کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف مسلمان فوجیوں کے حوصلے بلند، عزم پختہ اور ہمت بالا ہو گئی تھی بلکہ مخالفوں کی صفوں میں مایوسی اور زیاں کا احساس پیدا ہوا تھا۔ اور اس سے بڑھ کر مسلمانوں کے بارے میں ان کے پڑوسی قبائل میں خاص کر اور دُور دراز کے قبائل میں عام طور سے یہ تاثر پیدا ہوا تھا کہ مسلمانوں کی فوجی طاقت اگر بڑھی نہیں تو کسی طور سے کم بھی نہیں ہوئی اور وہ اب بھی اس قابل تھے کہ طاقتور اور کسی حد تک فاتح دشمن کو پسپائی پر مجبور کر سکتے تھے۔ قریشی اتحاد کے بارے میں ان کا تاثر یقیناً یہی رہا ہو گا جو حقیقی بھی تھا اور جس کی طرف حوالہ خزاعہ کے ایک سردار کے تبصرے اور ابو سفیان سے اس کے ایک مکالمے کے دوران بھی ملتا ہے کہ مسلم طاقت میں اضافہ اور اسلامی ریاست کے حلقۂ اثر و نفوذ میں روز افزوں توسیع ہو رہی تھی[۱۳۸] مسلمانوں کی اس بالادستی اور اپنی روز افزوں دگرگوں حیثیت کا احساس خود مکیوں کو بھی تھا چنانچہ غزوۂ اُحد سے پہلے اور اس کے بعد جنگِ خندق تک کسی بھی موقعہ پر (جیسے سویق، قردہ، بدر الموعد وغیرہ میں) وہ کوئی مؤثر اقدام نہیں کر سکے تھے بلکہ ان تمام مواقع پر ان کی فوجی طاقت کے کھوکھلے پن اور سیاسی ساکھ کے انحطاط کا کچھ زیادہ اظہار ہوا تھا۔[۱۳۹]

غزوۂ اُحد کے دو سال بعد جنگِ خندق (۵ھ / ۶۲۷ء) کے موقعہ پر قریشِ مکہ نے اپنی پُوری فوجی طاقت جھونک دی تھی۔ اس بار وہ اپنی عسکری طاقت کے علاوہ اپنے اتحادیوں غطفان، سلیم و اسد وغیرہ کا احزابِ عظیم لے کر آئے تھے جو دس ہزار مسلح اور کیل کانٹے سے لیس سپاہیوں پر مشتمل تھا۔[۱۴۰] دوسری طرف مسلمانوں کی جو حالت تھی یا جو ان کی فوجی و عسکری طاقت تھی اس کا بہترین نقشہ قرآن کریم نے کھینچا ہے کہ "زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی تھی اور زبردست کپکپی (زلزال) طاری تھی اور دل حلق میں آ کر اٹک گئے تھے"۔ یہ خوف و ہیبت فطری تھی تاہم اس نے ان پر مایوسی اور بے دلی یا بزدلی نہیں طاری ہونے دی تھی بلکہ ان کے دلوں میں ایک عزمِ مصمم، ایک جذبۂ بیکراں، ایک قوتِ لامحدود اور ایک ایمانِ عظیم پیدا کر دیا تھا جو ان کو یقین دلاتا تھا کہ فتح ان کی ہو گی۔[۱۴۱] ایک ماہ کے شدید، طویل و صبر آزما محاصرے کی آزمائش کے بعد وہ امتحان میں سرخرو ہوئے تھے اور ان کی سیاسی اور فوجی حکمتِ عملی پُوری طرح کامیاب رہی تھی جبکہ ان کے حریفوں کی فوجی و سیاسی طاقت کے تابوت میں یہ ناکامی کی آخری کیل تھی۔ یہ واضح تھا کہ مکہ اپنی سیاسی برتری اور فوجی بالادستی کو نہ صرف کھو رہا تھا بلکہ ان کے پیروں کے نیچے سے زمین آہستہ آہستہ

سرک رہی تھی۔[۱۴۲] قریشِ مکہ اور مدینہ کی اسلامی ریاست کے درمیان سیاسی و فوجی توازن کے تقابلی مطالعہ کی بہترین مثال اس حدیث نبوی میں ملتی ہے جس کے مطابق مدبر و سیاستدان پیغمبرِ اعظمؐ نے فرمایا تھا کہ "قریش اپنی ساری طاقت آزما چکے اور جنگِ خندق ان کے فوجی ترکش کا آخری تیر تھا۔ اب وہ آئندہ کبھی مدینہ پر حملہ آور نہ ہو سکیں گے بلکہ اب ہم ان کے خلاف فوج کشی کریں گے۔"[۱۴۳] یہ محض ایک نبی کی پیشگوئی نہ تھی بلکہ ایک سیاسی قائد اور فوجی سالار اور ایک عظیم مدبر اور دُور بیں سیاستدان کا اس وقت کے حالات کا تجزیہ تھا جو حقیقت پر مبنی تھا اور جو بعد کے دو تین برسوں میں حرف بہ حرف سچا ثابت ہوا۔ اس مرحلے میں اسلامی ریاست اتنی طاقتور اور با اثر ہو چکی تھی کہ اس کا صحیح معنوں میں کوئی حریف و مقابل نہیں رہا تھا جیسا کہ ہم ابھی کچھ دیر بعد دیکھیں گے۔

(۶) چھٹا مرحلہ : اندرونی مخالفت

اپنی ارتقاء کے پانچویں مرحلے میں اسلامی ریاست کا اگرچہ سارا زور قریشِ مکہ اور ان کی ریشہ دوانیوں، سازشوں اور فوجی اقدامات پر مرکوز رہا تھا تاہم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی بصیرت سے دُوسرے علاقوں اور قبائل کے معاملات پوشیدہ نہیں تھے اور نہ ہی آپ اپنے گھر کے بھیدیوں اور دشمنوں کی مکارانہ چالوں اور دشمنانہ تدبیروں سے غافل تھے اگرچہ نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیرانِ بدر کے ساتھ خاص کر اور دُوسرے جھکے ہوئے دشمنوں کے ساتھ عام طور سے رحمت و رافت کا سلوک کیا تھا جس نے نہ صرف کئی قیدیوں اور قبیلہ والوں کے دل جیت لئے تھے اور ان کو آپ کا ہمنوا بنا دیا تھا بلکہ آپ کے دشمنوں کو یہ احساس بھی بخوبی دلا دیا تھا کہ رحمتِ عالم کو اپنے دشمنوں کی تباہی اور بربادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ تو صرف ان کی دشمنی اور عداوت کو ختم کر کے ان کو اسلامی ریاست کا رکن یا اسلامی اُمت کا فرد بنانا چاہتے تھے، تاہم یہ بھی حقیقت تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے معاہد قبائل اور حلیف دوستوں کی غداری اور باغیانہ حرکتوں کو برداشت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔ بعض یہودی سازشیوں اور غدار حلیفوں کا قتل دراصل ان کی ان باغیانہ حرکتوں کا سبب ہوا تھا جو وہ اسلامی ریاست کو تباہ کرنے یا اسلامی ریاست میں تفرقہ اندازی پیدا کرنے کے لئے کر رہے تھے۔ وہ اس سماجی معاشرہ اور سیاسی نظام کے درپے ہو گئے تھے جس کو قائم و دائم رکھنے کے لئے انھوں نے حلف اٹھایا تھا اور جس کے وہ خود رکن تھے۔[۱۴۵] بعض مورخین کا یہ خیال غلط ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان افراد کو اس لئے قتل کرا دیا تھا کہ آپ اپنی تنقید یا مخالفت نہیں برداشت کر سکتے تھے۔[۱۴۶] آپ اپنی ذاتی تنقید بلکہ بہتان تراشی تک کو کھلے دل سے برداشت کر لیتے تھے اور دشمنوں کے زبان و قلم سے تو آپ نے اسلام، اسلامی اُمت اور اسلامی ریاست تک پر تنقید و نکتہ چینی برداشت کی تھی۔ اس کی متعدد مثالیں ہیں جن میں سے سہیل بن عمرو عامری،[۱۴۷] ابو سفیان بن حارث ہاشمی،[۱۴۸] عکرمہ بن ابی جہل مخزومی،[۱۴۹] ابو سفیان بن حرب اموی[۱۵۰] اور نہ جانے کتنے دوسروں کی مثالیں بہت ہی واضح اور بیّن ہیں۔ لیکن اگر اسلامی ریاست کا ایک رکن یا حلیف دشمنوں سے سازباز کرے، ان کو اخلاقی یا مادی امداد دے یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی ریاست پر تنقید و نکتہ چینی کرے تو اس کی حرکت غداری کے مترادف ہوگی جو کسی بھی حال میں قابلِ برداشت نہیں ہو سکتی تھی، اور نہ ہوئی۔ چنانچہ آپ کا سخت ردِّ عمل اور طرزِ معاملہ اسلامی ریاست کے

گھر کے بھیدیوں کے ساتھ صحیح تھا اور اس نے نہ صرف ان کو ان اعمال و افعال کے سنگین نتائج کا احساس دلا دیا بلکہ ان میں سے جو لوگ ابھی تک حیص بیص اور گومگو کے عالم میں تھے ان کو اسلامی امت کے دائرۂ اثر میں داخل ہونے کی حکمت اور افادیت کا قائل کر دیا جیسا کہ بنو خطمہ کے یہودیوں کے معاملہ سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔

انھیں اسباب و علل سے اور تقریباً انھیں حالات میں آپ نے مدینہ منورہ کے تین یہودی قبیلوں ——— بنو قینقاع،(۱۵۱) بنو نضیر(۱۵۲) اور بنو قریظہ ——— اور محمد بن حبیب بغدادی کے مطابق ایک چوتھے قبیلہ ——— بنو فطیون(۱۵۳) ——— کے خلاف فوجی اقدامات کئے تھے۔ موخر الذکر کے بارے میں ہمیں تاریخ واقعہ اور اس کے اسباب و محرکات وغیرہ کے بارے میں تفصیلات کا علم نہیں ہے مگر بغدادی کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلا یہودی قبیلہ تھا جسے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے ان کی باغیانہ اور مغرورانہ حرکتوں کے سبب نکالا تھا۔ بنو فطیون غالباً بنو قریظہ کا ایک اہم حلیف و معاہد بنو ہدل کی ایک ذیلی شاخ بنو ثعلبہ کا حصہ تھا جو اپنے مشہور بدکار رئیس کے نام سے مشہور ہو گیا تھا جیسا کہ سمہودی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔(۱۵۵) بنو قینقاع کے بارے میں عام روایت یہ ہے کہ وہ مدینہ کے زرگر، مالدار مہاجن اور تاجر پیشہ یہودی تھے جن کو غزوۂ بدر کے فوراً بعد ذی قعدہ ۲ھ/ اپریل ۶۲۴ء میں معاہدہ صلح توڑنے، سازشیں کرنے اور اسلامی ریاست کے خلاف بغاوت اور مسلح جنگ کرنے کے جرم میں مدینہ سے نکالا گیا تھا اور ان کے مکانات، قلعوں (آطام) اور دکانوں اور بازار پر قبضہ کر لیا گیا تھا۔ لیکن عہد جدید کے دو مسلمان مورخوں محمد حمید اللہ اور برکات احمد کا خیال ہے کہ بنو قینقاع کے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دینے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو معاف کر دیا تھا اور مدینہ میں رہنے کی حسب دستور سابق اجازت دے دی تھی موخر الذکر نے اپنے نظریہ کے ثبوت میں خاصے وقیع، وزنی اور دل کو چھو لینے والے دلائل دیئے ہیں۔(۱۵۸) ربیع الاول ۴ھ/ اگست ۶۲۵ء میں غداری و بغاوت کے جرم میں بنو نضیر کی خیبر کو جلاوطنی پر تمام قدیم و جدید مورخین کا اتفاق ہے۔ مگر مدینہ کے ایک چوتھے یہودی قبیلہ بنو قریظہ کے بارے میں اب تک مشہور اور مقبول روایت یہی رہی ہے کہ ذی قعدہ۔ ذی الحجہ ۵ھ/ مئی ۶۲۷ء میں بغاوت، سازش، غداری، دشمنوں کے ساتھ ساز باز کے جرم میں ان کے تمام مردوں کو قتل کر دیا گیا تھا اور ان کے بچوں اور عورتوں کو مدینہ، نجد اور شام وغیرہ کے بازاروں میں غلام بنا کر بیچ دیا گیا تھا۔ لیکن دورِ جدید کے مورخوں برکات احمد اور ڈبلو۔ این۔ عرفات نے اپنی شاندار تحقیقات سے ثابت کیا ہے کہ بنو قریظہ کے قتل عام کی کہانی غلط اور تراشیدۂ دشمنانِ اسلام ہے۔ صرف چند مجرم سرداروں یا افراد کو قتل کیا گیا تھا بقیہ کو معاف کر کے مدینہ میں رہنے کی اجازت بھی دے دی گئی تھی۔

بہرحال ان تمام یہودی افراد و قبائل کے ساتھ اسلامی ریاست نے سختی کا سلوک کیا تھا کیونکہ انھوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح و تعاون کے معاہدے کر رکھے تھے مگر پھر اپنی طاقت کے زعم، اسلام دشمنی، قومی عصبیت، یہودی مزاج غدر و مکر و فریب کی بنا پر اسی ریاست اسلامی کی جڑیں کاٹنے لگے جس کی حفاظت و حمایت کی انھوں نے قسم کھائی اور حلف اٹھایا تھا۔ ۵ھ کے اواخر تک مدینہ منورہ کو ان یہودی سازشیوں سے پاک کیا جا چکا تھا اگرچہ اب بھی مدینہ منورہ میں یہودی آبادی بشمول افراد و قبائل کے خاصی بڑی تھی لیکن چونکہ انھوں نے معاہدہ صلح و تعاون کی پُر خلوص پابندی کی تھی اس لئے ان سے

کوئی تعرض نہیں کیا گیا اور ان کو مسلمانوں اور ان کی ریاست کے ایک حلیف و دوست اور بعد میں ذمی کی حیثیت سے تمام حقوق و مراعات حاصل رہے۔

مدینہ منورہ میں ایک اور اسلام دشمن یا رسالتمآب کا مخالف عنصر منافقین پر مشتمل تھا۔ مآخذ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طبقہ یہودیوں اور عربوں دونوں پر مشتمل تھا[161] جو بظاہر مسلمان اور اسلامی ریاست کے رکن تھے لیکن دل سے دشمن اور اہل میں مارِ آستین تھے۔ ان کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول تھا جو قبیلۂ خزرج کے ایک طاقتور اور با اثر خاندان کا رئیس تھا۔[162] سیاسی طور پر کچھ دوسرے خاندان بھی اس کے زیرِ اثر تھے۔ چونکہ ہجرتِ نبویؐ سے قبل بلکہ مدینہ میں اشاعتِ اسلام سے پہلے سردارِ منافق کو سیاسی بالادستی اور تفوق حاصل تھا جو اسے ہجرتِ نبویؐ کے بعد حاصل نہ رہا اس لئے اسے اور اس کے ہمنواؤں کو اسلام و رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کد پیدا ہو گئی تھی اور جوں جوں اسلام کو عروج، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کامیابی اور ریاست اسلامی کو توسیع و استحکام حاصل ہوتا جاتا تھا نوں توں منافقین کی آتشِ حسد بھڑکتی جاتی تھی اور وہ اسلام و ریاست مدینہ کی بیخ کنی کی تدبیریں کرتے جاتے تھے۔ چونکہ وہ تنہا خود کچھ نہ کر سکتے تھے اس لئے انھوں نے بعض یہودی قبیلوں[163] اور مکہ کے قریش کے علاوہ کچھ بدوی قبائل سے بھی سازباز کر رکھی تھی مگر جغرافیائی سیاسیات کے دباؤ میں وہ بظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے بدر کے بعد بنو قینقاع کو بھڑکانے میں انھیں کا ہاتھ تھا اسی طرح بنو نضیر کی سرکشی و تمرد کو بھی ان کی اسلام دشمنی نے طول دیا تھا۔[165]
اس سے پہلے غزوۂ احد میں انھوں نے اپنا دستہ عین وقت پر مسلم فوج سے الگ کر کے جاں نثاران اسلام کی ہمت شکنی کی کوشش کی تھی[167] مگر وہ ایک طرح سے مسلمانوں اور ریاست اسلامی کے حق میں امدادِ غیبی اور رحمتِ خداوندی بن گئی۔[168] غزوۂ خندق کے زمانۂ محاصرہ میں انھوں نے جو کچھ کیا اس کو قرآن کریم نے خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔[169] حیرت کی بات ہے کہ منافقین کا کسی بھی کردار کا، منفی یا مثبت، کوئی ذکر احزاب کے بارے میں نہیں ملتا ہے[170] حالانکہ اسی زمانے سے متصل انھوں نے غزوۂ مریسیع میں سفر مراجعت میں مہاجرین و انصار کے درمیان قبائلی عصبیت بھڑکانے کی کوشش کی تھی جو ناکام رہی۔[171] اسی طرح انھوں نے واقعۂ افک میں کلیدی کردار ادا کیا تھا تاکہ مسلم معاشرے کو پراگندگی کا شکار بنایا جائے مگر وہاں بھی زک اٹھائی۔[172] اگرچہ ان کی سازشوں کا سلسلہ تبوک کے غزوہ کے زمانے تک مسجدِ ضرار[173] وغیرہ کی صورت میں جاری رہا تاہم یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ ۵ھ / ۶۲۷ء میں احزاب کی شکستِ فاش سے پہلے ہی ان کے زہر کا کانٹا ٹوٹ گیا تھا۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ افک میں ان کا حصہ اور اس سے کچھ پہلے مریسیع کی مہم کے دوران ان کی فتنہ انگیزی ان کے ترکش کا آخری تیر یا ان کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ اتفاق کی بات ہے کہ منافقین اور یہودی[174] سازشیوں کی طاقت ایک ہی زمانے میں ٹوٹی۔
بہرحال مدینہ منورہ کے ان دونوں گھر کے بھیدیوں کے خاتمے کے ساتھ ہی مسلمانوں کو اپنے عقب کی حفاظت کی ضمانت فراہم ہو گئی۔ اسلامی ریاست کو اب کسی اندرونی سازش، بغاوت یا غداری کا خطرہ نہ رہا کہ وہ اس کے وجود یا استحکام کے لئے کوئی غلط یا خطرناک صورت پیدا کر سکتا۔ اس اندرونی استحکام نے ہی اسلامی ریاست کو اس قابل بنایا تھا کہ وہ اپنے بیرونی دشمنوں کے خلاف مؤثر اور مستقل اقدام کر سکے۔

(۷) ساتواں مرحلہ : قبائلِ عرب کی عداوت

اسلامی ریاست کو اپنے اندرونی دشمنوں، غدار یہودیوں اور سازشی منافقوں کے علاوہ متعدد بیرونی دشمنوں کی عداوت کا بھی مسلسل سامنا رہا۔ قریشِ مکہ کے علاوہ بعض سرکش قبائل بھی مدینہ کی ریاست کو پنپنے دینا نہیں چاہتے تھے کیونکہ ان کو اس صورت میں اپنی امن دشمن حرکات جاری رکھنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ کچھ ان کی اسلام دشمنی اور قبائلی عصبیت بھی اس کی ذمہ دار و محرک تھی اور غالباً اس سے زیادہ اسلام کی سیاسی اور سماجی و مذہبی برتری میں وہ اپنی آزادی اور خود مختاری کی موت دیکھتے تھے اس لئے وہ مسلسل مدینہ کے خلاف اقدامات کرتے یا ان کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دوربین نگاہیں مدینہ کے قرب وجوار یا دور دراز کے ان خطرات کو بخوبی اور بروقت دیکھ لیتی تھیں اور آپ ان کے موثر تدارک کی صحیح وقت پر تدبیر کر لیتے تھے۔ بدر تک اسلامی ریاست کو قبائل عرب کی ایسی کسی دشمنی کا سابقہ نہیں پڑا تھا کیونکہ غالباً ان بدوی قبائل کو ان کی سیاسی مصالح نے ابھی تک اپنے مفادات کے لئے کوئی بڑا خطرہ نہیں دکھایا تھا لیکن قریشِ مکہ کی طاقتور فوج کے خلاف مسلمانوں کی فتح نے کچھ بدوی قبائل کی آتشِ حسد و نفرت بھڑکا دی اور ان کو یہ احساس دلا دیا کہ مدینہ کی اسلامی ریاست ان کے لئے بھی کسی وقت خطرہ کا سبب بن سکتی ہے۔ چنانچہ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ بدر کی فتح عظیم نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کو بیک وقت آسان بھی بنا دیا تھا اور مشکل بھی۔ اگر اس کامیابی نے بعض قبائل عرب کو مدینہ کی سیاسی بالادستی ماننے پر مجبور کر دیا تھا تو دوسری جانب اس نے نبرد آزمائی اور تصادم کے دائرے کو وسیع تر بنا دیا تھا۔ اب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک سے زیادہ محاذوں پر بیک وقت متعدد دشمنوں سے لڑنا پڑ رہا تھا سب سے پہلے ۲ھ / ۶۲۴ء کے وسط میں آپ کو مشرقی علاقے کے ایک قبیلہ بنو سُلیم کی طرف توجہ دینا پڑی جس نے اپنی عددی طاقت کے زعم میں مدینہ کی ریاست کے خلاف سرکشی و تمرد کی راہ اپنائی تھی اور مسلمانوں کی حکومت کے خلاف درپے تھا۔ چنانچہ صفر ۲ھ / جولائی ۶۲۵ء اور ربیع الثانی ۳ھ / ستمبر ۶۲۶ء کے درمیان آپ کو اس قبیلہ کے مختلف خاندانوں کے خلاف اقدام کرنا اور ان کی ناپاک سازشوں کو کچلنا پڑا۔ پہلی دو مہموں کی قیادت آپ نے بہ نفسِ نفیس فرمائی اور ان کے علاقوں پر اچانک چھاپے مارے۔ ہمارے مآخذ کے مطابق آپ مقام کدر تک پہنچے اور وہاں آپ نے پندرہ دنوں تک قیام فرمایا اور مدینہ کو بغیر کسی لڑائی اور تصادم کے لوٹ آئے۔[(۱۶۹)] دوسری مہم کے دوران جو جمادی الاولیٰ ۳ھ / اکتوبر، نومبر ۶۲۴ء میں واقع ہوئی۔ مسلمان سپاہ بحران نامی مقام تک گئی جو فرع کے علاقے میں حجاز کی ایک مشہور کان تھی۔ اس مہم میں بھی آپ نے منزلِ مہم پر تقریباً دو ماہ تک قیام فرمایا اور بغیر کسی جنگ و جدال کے مدینہ منورہ لوٹ آئے۔[(۱۷۰)] اگرچہ ہمارے مآخذ کا بیان ہے کہ پہلی مہم میں مسلمانوں کو کچھ معمولی سی غنیمت بھی ہاتھ آئی تھی اور دوسری مہم میں کوئی مال و منال نہیں ملا تھا" تاہم یہ معاملہ خاصا اہم ہے کہ آپ نے ان دونوں مہموں کے دوران کافی طویل مدت تک قیام ان قبیلوں کے علاقوں میں کیا تھا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مدینہ کے خلاف سازشوں اور منصوبوں میں ملوث تھے۔ ہماری روایات کا یہ اصرار کہ آپ نے یہ اقدامات ان علاقوں کے قبیلوں کی شرارت اور دشمنی کی سن گن پا کر کئے تھے بالکل صحیح بھی ہو سکتا ہے

اور آپ کا بروقت اقدام کرنا حکمت عملی کی دلیل بھی تھی تاہم اس سے بڑی دلیل حکمت آپ کے ان طویل قیاموں میں پوشیدہ ہے جو آپ نے ان علاقوں میں رکھے تھے آخر اتنا طویل قیام آپ نے کیوں کیا تھا جب کہ کوئی جنگ و جدال بھی نہیں ہوئی تھی؟ اس کا جواب اگرچہ واضح انداز میں ہمارے مآخذ سے نہیں ملتا تاہم یہ نتیجہ نکالنا قطعی صحیح اور حقیقت کے مطابق ہوگا کہ آپ نے ان دونوں مہموں کے دوران متعلقہ قبائل سے دوستی اور تعاون کے معاہدے کئے ہوں گے اور ان میں اسلام کی تبلیغ کی ہوگی۔ اس نتیجہ کی مزید تائید دوسری مہم میں پیش آنے والے ایک واقعہ سے ہوتی ہے جس میں غطفان کی ایک شاخ بنو محارب کے سردار حضرت دعثور بن حارث نے بڑے ڈرامائی طریقہ سے اسلام قبول کر لیا تھا۔[۱۷۸] ہمارے سیرت نگاروں نے یہ واقعہ جس انداز میں بیان کیا ہے اس سے یہ غلط تاثر ابھرتا ہے کہ حضرت دعثور کا اسلام محض ایک انفرادی اور شخصی واقعہ تھا جس کا حالاتِ حاضرہ و واقعہ سے نہ کوئی تعلق تھا نہ اس کا کوئی اثر۔ حالانکہ یہ بالکل صحیح نہیں ہے۔ واقعات کی ترتیب اور نہج کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو بخوبی واضح ہوتا ہے کہ حضرت دعثور کا اسلام لانا دراصل پورے قبیلہ/خاندان کا مشرف بہ اسلام ہونا تھا چاہے یہ فوراً ہوا ہو یا اس میں کچھ مدت لگی ہو۔[۱۷۹] یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ سردارِ قبیلہ کا اسلام دراصل اس کے قبیلہ والوں کے لئے ایک حکم و مثال کا درجہ رکھتا تھا۔ پھر دوسری روایات سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت دعثور نے اپنے قبیلہ کو اسلام سے روشناس اور اس کا پیرو بنا دیا تھا۔ ان واقعات و دلائل کی روشنی میں یہ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دونوں مہمیں دراصل سیاسی اور مذہبی دورے تھے نہ کہ فوجی مہمیں۔ اور ان کے نتیجے میں سُلیم، غطفان اور اس کے خاندان بنو محارب میں اسلام پھیلا تھا اور کدر، ذوامر اور ارحضیہ کے علاقوں تک اسلامی ریاست کی سرحد وسیع ہوئی تھی یا حلقۂ اثر بڑھا تھا۔

صفر ۴ھ / جولائی ۶۲۵ء میں بئر معونہ کا حادثۂ فاجعہ پیش آیا جس میں تقریباً ستر مسلمان مبلغین نے اپنے خون سے کلمۂ حق سرزمینِ معونہ پر لکھ دیا تھا اور اسلامی ریاست کی لکیر بنا دی تھی۔ اس قتلِ عظیم میں کلیدی کردار قبیلۂ غطفان کے خاندان بنو مالک کے سردار عامر بن طفیل نے ادا کیا تھا اور اپنے اس گھناؤنے جرم میں عُصیّہ، رِعل اور ذکوان نامی تین خاندانِ بنی سُلیم سے مدد لی تھی۔ یہ دلچسپ حقیقت یاد رکھنے کی ہے کہ پہلے عامر بن طفیل نے اپنے خاندان بنو عامر بن صعصعہ سے مدد چاہی تھی مگر انھوں نے اپنے سردار ابو براء مالک بن عامر کے اس عہدِ ضمانت و تحفظ کو توڑنے سے انکار کر دیا تھا جس کے سایہ میں مسلمان مبلغین نے سفر کیا تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کا بڑا قیمتی جانی نقصان ہوا تھا مگر اس واقعہ سے دو اہم فائدے مسلمانوں کو حاصل ہوئے تھے: اول یہ کہ غطفان کے بعض خاندانوں مثلاً بنو عامر وغیرہ کی سیاسی حمایت ملی تھی جیسا کہ ابو براء مالک کے بعد کے رویے سے ثابت ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ اسلام نہ صرف ان حامی قبیلے یا اس کی شاخوں میں پھیلنے لگا تھا بلکہ قاتل/قاتلین کے خاندانوں میں بھی اس نے اپنی راہ بنا لی تھی۔[۱۸۰] اسلام کی یہی تاثیر تھی جس نے مسلمانوں کے دائرہ اثر و نفوذ کو مسلسل بڑھایا اور وسیع کیا تھا۔ ستر[۱۸۱] شہدائے بئر معونہ نے اپنے خون سے ان دو بڑے قبیلوں یعنی سُلیم اور غطفان کے علاقوں میں اسلامی انقلاب کی بنیاد رکھی تھی جس نے باقی دشمنانِ اسلام کی سیاسی، مذہبی اور فوجی طاقت کو مسلسل گھٹایا اور مسلمانوں کی طاقت کو برابر بڑھایا تھا۔

اس خونیں واقعہ کے دو برس بعد بنو سُلیم کے دشمن خاندانوں اور افراد کے سات سو نمائندوں نے اگرچہ اسلامی ریاست کے خلاف مکی اتحادِ احزاب عظیم میں حصہ لیا تھا[۱۸۲] تاہم ان کی طاقت مسلسل گھٹ رہی تھی اور ربیع الثانی ۶ھ/ستمبر ۶۲۷ء میں بنو سُلیم کے خلاف حضرت زید بن حارثہ کی تیسری مہم آخری ثابت ہُوئی جس نے اس قبیلہ کی دشمنی کا جنازہ نکال دیا۔[۱۸۳] اس مہم کے بعد مسلمانوں کو ان کے خلاف کوئی اور فوجی کارروائی نہیں کرنی پڑی۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ قبیلہ سُلیم کے متعدد سرداروں اور سربرآوردہ افراد کے ساتھ کافی لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا[۱۸۴] اور صلح حدیبیہ تک یا اس کے معاً بعد پورا قبیلہ اسلام لا چکا تھا اور وہ اسلامی ریاست کا رکن رکین بن چکا تھا[۱۸۵] فتح مکہ سے قبل ہی بنو سلیم اسلامی امت کا مکمل رکن بن چکے تھے[۱۸۶] اور اس طرح اسلامی ریاست کی سرحدیں قبیلہ سلیم کے علاقوں تک وسیع ہوگئی تھیں۔[۱۸۷]

اگرچہ ذوامر کی مہم[۱۸۸] نے بنو محارب کو اسلامی اُمت کا رکن بنا دیا تھا[۱۸۹] تاہم یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسی قبیلہ غطفان کی ایک اور شاخ بنو ثعلبہ نے کچھ مزید مدت تک اسلامی ریاست کی مخالفت جاری رکھی تھی۔ چنانچہ ۶۲۶ء اور ۶۲۹ء کے دوران پانچ اور مہمیں ان کے خلاف بھیجی گئی تھیں۔ ان میں سے اہم ترین مہم غزوۂ ذات الرقاع[۱۹۰] کی تھی جس کی قیادت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفس نفیس فرمائی تھی۔ یہ مہم محرم ۵ھ/جون ۶۲۶ء میں ہُوئی تھی اور اس میں مسلمان سپاہ کی تعداد مختلف روایات کے مطابق چار سو اور آٹھ سو نفوس پر مشتمل تھی۔[۱۹۱] اس مہم کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ اس کے بعد بنو ثعلبہ کی مخالفت اسلام کی آخری چنگاری بھی بجھ گئی۔ چنانچہ اس کے بعد جو چار مہمیں بھیجی گئیں وہ مہم یا لشکر سے زیادہ تبلیغی یا سیاسی جماعتیں تھیں اور اگر ان کی فوجی نوعیت بھی تھی تو بہت ہی معمولی، کیونکہ یہ مہمیں محض دس[۱۹۲]، چالیس[۱۹۳]، پندرہ[۱۹۴] اور ایک سو تیس[۱۹۵] افراد پر بالترتیب مشتمل تھیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مہمیں اس قبیلہ کے شرپسند عناصر کے خلاف بھیجی گئی ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ اتنی چھوٹی چھوٹی جماعتیں کسی بڑے قبیلے کے خلاف نہیں بھیجی جا سکتی تھیں۔ اگرچہ مآخذ کا اصرار ہے کہ ان کی نوعیت سیاسی یا فوجی تھی مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تبلیغی جماعتیں تھیں۔ بہرحال یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ۶۲۹ء کے آغاز تک کم از کم ثعلبہ کے خاندان نے اسلام اور اسلامی ریاست کی بالادستی تسلیم کر لی تھی اگرچہ غطفان کی دشمنی کچھ اور مدت تک جاری رہی تھی۔

مشرقی علاقے کے ایک اور قبیلہ اسد نے جو خزیمہ کا سب سے بڑا اور معروف قبیلہ/رکن تھا، اسی زمانے میں غزوہ اُحد کے بعد سر اُٹھایا۔ محرم ۴ھ/جون ۶۲۵ء میں طے اور بنو غطفان کے اس پڑوسی قبیلہ نے مدینہ پر اچانک حملہ کرکے مسلمانوں کی ریاست کو مٹانے کا منصوبہ بنایا[۱۹۶] مگر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ دُوربیں اس خطرہ کو پہلے ہی بھانپ چکی تھی۔ چنانچہ آپ نے خود اقدام کرکے ان کے منصوبہ کو خاک میں ملا دیا۔ مسلمان لشکر نے تیزی سے پیش قدمی کی اور ان کی آمد کی خبر سن کر دشمن بھاگ کھڑا ہوا اور بغیر کسی تصادم یا خُونریزی کے اس خطرہ کا سدِباب ہوگیا۔[۱۹۷] اس بروقت اور سخت اقدام کا اتنا اثر ہوا کہ بنو اسد/خزیمہ کے شرپسند عناصر نے کافی مدت تک سر نہیں اُٹھایا۔ دو برس کے بعد ربیع الثانی ۶ھ/اگست ستمبر ۶۲۷ء میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے الغمر[۱۹۸] نامی مقام پر جمع ہونے والے اسد کے کچھ خطرپسند و دشمن عناصر کی شرارت کے منصوبوں کو ایک دُوسری چھوٹی سی فوج بھیج کر پھلنے پھُولنے سے پہلے ہی کچل دیا۔ اس بار بھی دشمن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر راہِ فرار

اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ بہرحال اس واقعہ کے بعد اسد/خزیمہ کے کسی اسلام دشمن کارروائی میں ملوث ہونے کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ یہ اور ایسی ہی دوسری شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ اسد/خزیمہ نے اسلامی ریاست کے ساتھ کوئی سیاسی یا مذہبی یا دونوں قسم کا سمجھوتہ کر لیا تھا اور اس طرح وہ اسلامی ریاست کے دائرۂ اثر و نفوذ میں آ گئے تھے۔[199]

اسی زمانے میں قبیلۂ بنو لحیان کے سردار سفیان بن خالد ہذلی نے مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست پر حملے کا منصوبہ بنایا مگر حضرت عبداللہ بن انیس کی ایک شخصی مہم نے اس کا کام تمام کر دیا۔[200] اور اس طرح یہ منصوبہ سر چڑھنے سے پہلے ہی دم توڑ گیا۔ مآخذ میں سے بعض روایات کا بیان ہے کہ اس سیاسی قتل کے نتیجہ میں واقعہ رجیع پیش آیا جس میں سات یا آٹھ یا دس مسلم مبلغین نے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔[201] عام طور سے ہمارے مآخذ اس حادثہ پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی شدید فوجی ردّ عمل کا اظہار نہیں کرتے ہیں تاہم محمد بن حبیب بغدادی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ کدر کی مہم اسی حادثۂ فاجعہ کے ردِ عمل کے طور پر پیش آئی تھی۔[202] بہرحال کوئی بھی صورت رہی ہو یہ حقیقت ابھرتی ہے کہ اس واقعہ کے بعد بنو لحیان یا اس کے دوسرے خاندانوں نے اسلامی ریاست کے ساتھ تصادم کی راہ نہیں اختیار کی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو گا کہ ان قبیلوں نے اسلامی ریاست کے ساتھ کسی نہ کسی قسم کا سمجھوتہ کر لیا ہو گا۔ واقعہ رجیع کے اثرات اور شہداء کا خون یوں رائیگاں جانے والا نہ تھا۔ اس نے اپنا رنگ دکھایا اور اسلام نے اس قبیلہ میں اپنے قدم جما لئے تھے۔[203]

ربیع الثانی ۵ھ/ اگست، ستمبر ۶۲۶ء[204] میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے شمال میں واقع دومۃ الجندل کی طرف پیش قدمی فرمائی۔ بظاہر اس کا سبب یہ تھا کہ شمال کے بعض قبائل نے سرِ تمرد و عصیان اٹھایا تھا وہ فسادِ خلق کے مرتکب ہو رہے تھے۔ اگرچہ ابنِ اسحاق، ان کے جامع ابنِ ہشام اور ان کے خوشہ چیں طبری کے بیانات اپنے اختصار و ابہام کے سبب تشنہ ہیں تاہم واقدی کے بیانات سے کچھ تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ اس کے مطابق دومۃ الجندل میں ایک بڑا علاقائی بازار تھا جہاں جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں سے خاص کر شمال، شمال مغرب و مشرق کے علاقوں سے تاجر آتے تھے اور تجارت کا بازار گرم کرتے تھے۔ بعض شر پسند شمالی عرب کے قبیلوں نے بدوی قبائل سے ساز باز کر کے بازار دومۃ الجندل میں لوٹ مار مچا دی بلکہ آتے جاتے کاروانوں کے لئے مستقل خطرہ بن گئے۔ ان کا منصوبہ مدینہ کی اسلامی ریاست پر بھی حملہ کرنے کا تھا۔ اگرچہ ہمارے مآخذ ان دونوں معاملات کے درمیان تعلق کا برملا ذکر نہیں کرتے تاہم یہ بات واضح ہے کہ اگر کوئی سیاسی یا فوجی طاقت ان لٹیروں کو کچل سکتی اور ان کی لوٹ مار کا سدِ باب کر سکتی تھی تو وہ مدینہ کی اسلامی ریاست تھی کیونکہ اس نے روزِ اول سے یہ اپنا فرضِ منصبی قرار دے لیا تھا کہ مظلوموں کی فریاد کو پہنچے اور ان کی ظالم کے ظلم اور شر سے حفاظت کرے۔ اور حقیقتاً ہوا بھی یہی۔ اندازہ ہوتا ہے کہ بازار دومۃ الجندل کے باسیوں یا آنے جانے کاروانوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مداخلت کی درخواست کی۔ اور عین ممکن ہے کہ یہ مدینہ کی اقتصادی ناکہ بندی کی دشمن قبائل کی کوشش ہو اور مسلمانوں کی تجارت کو برباد کرنا اس کا مقصد رہا ہو۔[205] چنانچہ آپ ایک ہزار صحابہ پر مشتمل ایک لشکر لے کر روانہ ہوئے اور لٹیروں کی سرکوبی کی۔ مہم کے نتیجہ میں مسلمانوں کو کچھ مالِ غنیمت مویشیوں اور قیدیوں کی شکل میں ملا مگر اس سے زیادہ اہم اور دیرپا نتیجہ اس مہم کا سیاسی اور فوجی اثر تھا۔ آپ نے

دومۃ الجندل میں کچھ مدت قیام کیا اور مختلف علاقوں میں چھوٹے چھوٹے سرایا بھیجے۔ ان کا، ظاہر ہے، قرب و جوار کے علاقے کے قبیلوں پر خاصا اثر پڑا، اور عجب نہیں کہ ان میں کچھ نے اسلامی ریاست سے صلح و امن کے معاہدے کر لئے ہوں۔[۲۰۶] اس کی ایک شہادت طبری کے ایک بیان سے ملتی ہے کہ اس مہم کے دوران رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے ایک طاقتور ترین قبیلہ غطفان کے ایک اہم خاندان بنو فزارہ کے سردار عُیَینہ بن حصن فزاری سے جو اسی نواح میں مشرقی علاقوں میں آباد تھا ایک معاہدۂ امن کیا تھا۔[۲۰۷] اس شہادت سے گمان ہوتا ہے جو کافی حد تک یقینی بن جاتا ہے کہ دُوسرے قبیلوں نے بھی اسی قسم کا معاہدہ آپ سے کیا ہوگا۔ اور اگر نہ بھی کیا ہو تو یہ لازمی تھا کہ ان پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی اور فوجی طاقت کا خاصا رعب قائم ہُوا ہو گا۔ غالباً یہی سبب تھا کہ اس کے بعد اس علاقے میں تجارتی کاروانوں کو لوٹنے یا بازار دومۃ الجندل میں لوٹ مار کرنے کے ایسے کسی مزید واقعہ کا ذکر نہیں ملتا ہے۔

سیاسی، اقتصادی اور فوجی لحاظ سے یہ مہم کافی اہم اور نتیجہ خیز تھی مگر مونٹگمری واٹ اس مہم میں صرف چند مویشیوں اور قیدیوں پر مشتمل مالِ غنیمت کو ہی کل حاصل سمجھتے ہیں[۲۰۸] اور اپنی قابلیت اور علمیت کا سارا زور اس پر صرف کر دیتے ہیں کہ یہ مہم معمولی اور بے نتیجہ تھی حالانکہ واقعات و مآخذ کی شہادتیں دوسری ہی کہانی سناتی ہیں۔ در اصل مونٹگمری واٹ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شمالی قبائل کے سلسلے میں اپنائی گئی پالیسی کی اہمیت کو گھٹانے کی مسلسل مگر غیر علمی اور تاریخی کوشش کرتے ہیں جیسا کہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے مگر یہاں صرف چند مزید شہادتوں پر اکتفا کی جاتی ہے جو اس مہم یا شمالی پالیسی کی صحیح نوعیت کو اُجاگر کرتی ہیں۔ مآخذ کا بیان ہے کہ اس مہم میں معاہدے کی ایک شق کے مطابق رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیینہ بن حصن فزاری کو تَغْلَمَیْن اور مراز کی وادیوں میں اپنے جانور چرانے کا حق عطا فرمایا تھا۔[۲۰۹] سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ حق آپ کو کس نے دیا تھا اور آپ نے ایک معاہد و حلیف کو کیونکر اور کس بنیاد پر عطا فرمایا تھا؟ جواب اس کا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس علاقہ غیر کے قبیلوں نے معاہدوں کے ذریعہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی اور اس کے نتیجہ میں ان علاقوں پر اس کے سیاسی اقتدار و قبضہ کو تسلیم کر لیا تھا۔ اسی طرح اس علاقے کے قبائل کے علاوہ مزید شمال کے علاقے یعنی دومۃ الجندل اور شامی سرحد کے بیچ کے خطے کے قبیلوں پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ چنانچہ پورے ایک سال تک مسلمانوں کو ان شمالی قبیلوں سے کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں ہوا تھا۔ بہر حال تمام تاریخی حقائق و شواہد اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ اس غزوہ کے نتیجے میں اسلامی ریاست کا سیاسی اقتدار دومۃ الجندل تک مدینہ کے شمال میں پھیل چکا تھا اور ان علاقوں کے بدوی قبائل میں سے کچھ یقیناً اسلامی ریاست کے زیرِ اثر آ چکے تھے۔

اس شمالی مہم کے تین ماہ کے بعد شعبان ۵ھ / جنوری ۶۲۷ء کے آغاز میں اسلامی ریاست کو مدینہ سے تقریباً سو میل جنوب مغرب میں واقع خزاعہ کے ایک خاندان بنو مصطلق کی طرف سے خطرہ پیدا ہوا۔ اگرچہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پرانے حلیف خزاعہ کا ایک حصہ اور نئے حلیف بنو مدلج کے حلیف بھی تھے[۲۱۰] تاہم انھوں نے اسلامی ریاست کے ساتھ ابھی تک کسی قسم کا معاہدہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی ابھی تک کسی قسم کی سرکشی اور تمرد کا اظہار کیا تھا۔ لیکن اس موقعہ پر بنو مصطلق کا حارث بن ابی ضرار کی قیادت میں جارحانہ غلط ارادوں سے ہو رہا تھا جس کی مسلسل خبریں جاسوسوں کے ذریعہ آپ کو پہنچ رہی تھیں اور

جن کی آپ نے اپنے ایک فرستادہ کے ذریعہ پکّی تصدیق کرلی تھی۔[۲۱۱] بہرحال آپ نے اقدام کیا[۲۱۲] اور مریسیع[۲۱۳] کے چشمہ پر ایک ہلکا سا تصادم بھی ہوا جس میں کچھ لوگ دشمن کے مارے گئے، ٹمسان کے دو سو خاندان گرفتار کر لئے گئے اور کافی مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔[۲۱۴] رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ کے دوران ہی مفرور سردار قبیلہ کی صاحبزادی حضرت جویریہ سے جو مشرف بہ اسلام ہوگئی تھیں شادی کرلی۔ اس مبارک و مسعود رشتے کے نتیجے میں تقریباً آدھے قیدی[۲۱۵] بلا معاوضہ اس خوش آئند و مسرت آگیں موقعہ پر رہا کر دئے گئے

آپ کے نرم، شرافت و رحمت سے بھرپور اور حکمت و دانائی کے حامل رویے سے نہ صرف مذکور قبیلہ بلکہ بیشتر افراد اسلام قبول کر کے امت کا حصہ بن گئے[۲۱۶] اور اس طرح اُنھوں نے اسلامی ریاست کی شہریت قبول کرلی۔ یہ مہم ثابت کرتی ہے کہ کس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدار مختلف علاقوں میں رفتہ رفتہ مگر پُوری قوت و طاقت کے ساتھ پھیل رہا تھا اور کس طرح مکہ کے حلقۂ اثر کے لوگ یا دوسرے سیاسی و سماجی علاقوں کے قبائل اسلامی ریاست کے رکن بنتے یا اس کے حلقۂ اثر کے ماتحت آتے جا رہے تھے۔[۲۱۷] مختلف علاقوں میں اسلام کے سیاسی اور مذہبی اقتدار کے پھیلنے کی یہ دونوں مہمیں ——— غزوۂ دومۃ الجندل اور غزوۂ مریسیع ——— بہترین مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی خاص اہم ہے کہ اکثر مورخین کے نزدیک یہ دونوں مہمیں غزوۂ احزاب سے پہلے واقع ہوئی تھیں۔[۲۱۸] اس پس منظر میں نہ صرف ان دونوں مہموں کی سیاسی اور فوجی اہمیت میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اس اہم حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ مدینہ کی اسلامی ریاست اس وقت تک اتنی طاقت ور ہو چکی تھی کہ کسی ایک قبیلہ یا سیاسی وحدت چاہے وہ طاقتور ترین یا اہم ترین کیوں نہ ہو جیسے مکہ کی قریشی اشرافیہ یا غطفان کا عظیم ترین قبیلہ اس کو تنہا کسی طرح زک نہیں دے سکتی تھی اور یہی احساس قبائل عرب کو تھا جس نے احزاب یا اتحادِ عظیم کی دعوت دی تھی۔

قبیلہ غطفان نے اسلامی ریاست کے خلاف تنہا اور دُوسروں سے اتحاد کر کے بھی کئی کوششیں کیں۔ چنانچہ ان کے بعض خاندانوں کی انفرادی کوششوں کے علاوہ، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، غزوۂ احزاب میں ان کا متحدہ لشکر ان کے تین اہم خاندانوں ——— فزارہ، اشجع اور مُرّہ ——— پر مشتمل تھا، جو خود قبیلوں کی حیثیت و طاقت رکھتے تھے۔ اس قبیلہ نے مجموعی طور سے ایک ہزار آٹھ سو سپاہی فراہم کئے تھے۔[۲۱۹] لیکن یہ اتحادی حملہ کامیاب نہیں ہو سکا جس کے متعدد اسباب تھے۔[۲۲۰] یہاں یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ فزارہ کے سردار عیینہ بن حصن نے وہ معاہدہ بظاہر توڑ دیا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دومۃ الجندل کی مہم کے دوران کیا گیا تھا۔ بعد میں عیینہ نے مدنی ریاست کے خلاف اپنی فوجی کارروائی جاری رکھی اور مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کر کے مسلمانوں کے مویشیوں کو پکڑ لیا اور چراگاہ کے نگراں کو مار ڈالا۔[۲۲۱] اس کے نتیجے میں غزوۂ ذی قرد ہوا[۲۲۲] جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حملہ آوروں کو سزا بھی دی اور اپنے کچھ مویشی بھی واپس لے لئے مگر سردارِ قبیلہ اور بیشتر حملہ آور فرار ہوگئے۔[۲۲۳] دُوسرے سال کے آغاز میں غطفان کے ایک قبیلہ نے حضرت زید بن حارثہ کی وادی القریٰ سے مدینہ واپسی کے سفر کے دوران مسلم دستے پر حملہ کیا، چنانچہ اس کے جواب میں حضرت زید ہی کی کمان میں ایک مہم انتقام لینے کے لئے بھیجی گئی جو اپنے مقصد میں پُوری طرح کامیاب رہی۔[۲۲۴] ۶۲۸ء کے آخری ماہ میں بنو مرہ نے، جو بنو غطفان کا ایک اہم ترین خاندان تھا، حضرت بشیر بن سعد خزرجی کے زیر کمان ایک مسلم دستہ کو قتل کر ڈالا۔[۲۲۵] لیکن ان ظالموں کو اپنے ظلم کی قیمت اپنے خُون سے

اور زیادہ گراں چکانی پڑی۔[۲۲۶] اس کے تین ماہ بعد ۶۲۹ء کے دوسرے ماہ میں حضرت بشیر بن سعد نے یمن اور خباب کے نواح[۲۲۷] میں جمع ہونے والے غطفانیوں کے ایک قبیلہ کو خاطر خواہ سزا دی۔[۲۲۸] اور اسی مہم کے ساتھ غطفان کی مخالفت کی کمر ٹوٹ گئی۔ بعد میں اگرچہ ایک چھوٹی سی جماعت بنو خشم کے کچھ لٹیروں کی سرکوبی کے لئے بھیجی گئی تھی تاہم وہ اتنی چھوٹی تھی کہ اس کا پورے قبیلہ یا غطفان سے کوئی سروکار نہیں تھا۔[۲۲۹] اوپر کی تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ غطفان نے کافی دنوں تک اور جنگِ احزاب و صلح حدیبیہ کے کچھ بعد تک اپنی اسلام دشمنی اور ریاست اسلامی کی مخالفت پر مبنی پالیسی جاری رکھی تھی لیکن فتح مکہ سے پہلے ہی ان کی طاقت ٹوٹ چکی تھی اور ان کا سرِ پُر غرور جھک چکا تھا۔ بہرحال ۸ھ کے خاتمہ تک نہ صرف غطفان بلکہ مشرق مدینہ کے بیشتر قبائل اسلامی ریاست کی ماتحتی قبول کر چکے تھے یا اسلامی اُمت کے رکن بن کر ریاستِ اسلامی کے رکن بن گئے تھے۔

اکتوبر، نومبر ۶۲۷ء اور مئی، جون ۶۲۸ء (جمادی الآخرہ ۶ھ / محرم ۷ھ) کی درمیانی مدت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ خاص طور پر مدینہ کے شمال میں آباد بعض سرکش قبائل پر مرکوز رہی۔ ۶۲۷ء کے وسط یا ۶ھ کے ابتدائی مہینوں تک اسلامی ریاست نے شمال کے ایک اہم قبیلہ جذام کی کم از کم ایک شاخ کے ساتھ مفاہمت حاصل کر لی تھی اور ان کے ساتھ ایک معاہدۂ امن و دوستی کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔[۲۳۰] اسی زمانے کے قریب حضرت زید بن حارثہ کلبی کی زیرِ قیادت ایک مہم، جو عام طور سے سریہ حُسمیٰ[۲۳۱] کے نام سے مشہور ہے، جذام کے ایک سرکش اور اسلام دشمن قبیلہ کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ اس کا سبب یہ ہوا تھا کہ اس قبیلہ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سفیر حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی کے ساتھ جو اپنی سفارت کی واپسی پر اس علاقہ سے گزر رہے۔ تھے بدسلوکی کی تھی اور ان کا مال و متاع اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو تحائف وہ لا رہے تھے چھین لئے تھے۔ اس مہم نے نہ صرف ان سرکشوں کو ان کے کرتوت کی سزا دی تھی بلکہ قبیلہ کے دوسرے خاندانوں کے ساتھ خصوصاً مدینہ حامی طبقات کے ساتھ تعلقات استوار اور مضبوط کئے تھے۔[۲۳۲] چنانچہ بنو ذبیب کا طرزِ عمل اس کی ایک بڑی شہادت ہے۔

یہ امر بہت اہم ہے کہ حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی پر حملہ کی خبر جونہی اس مسلم قبیلہ کو ملی اس نے مسلم مہم کے مدینہ سے آنے سے پہلے ہی لٹیروں کے خلاف فوجی اقدام کیا تھا اور نہ صرف ان کو سزا دی تھی بلکہ حضرت دحیہ کے تمام سامان کو ان سے واپس لے کر سفیر نبوی کو بحفاظت تمام علاقہ سے گزرنے کا اہتمام کیا تھا۔ ۶۲۸ء کے آغاز تک اس علاقہ میں آباد ایک اور اہم قبیلہ بنو سعد نے اسلامی ریاست کی دوستی قبول کر لی تھی اور حضرت علی کے سریہ فدک نے اس کا آغاز کیا تھا انھوں نے معاہدوں کے ذریعہ اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی تسلیم کر لی تھی۔[۲۳۳] ان مہموں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا تھا کہ وادی القریٰ کا بیشتر علاقہ، جہاں بنو سعد آباد تھے، اسلامی ریاست کے موثر قبضہ میں آگیا تھا۔ اسی زمانے میں دومۃ الجندل کے علاقے میں آباد ایک اور اہم شمالی قبیلے بنو کلب نے اسلامی ریاست کی رکنیت قبول کی تھی کہ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کے زیرِ قیادت سات سو مسلم سپاہ پر مشتمل ایک سریہ نے ان کے ساتھ دوستی اور ازدواج کے تعلقات قائم کئے تھے۔ اس سے زیادہ اہم واقعہ یا نتیجہ یہ تھا کہ اس شادی کے نتیجہ میں نہ صرف حضرت تماضر زوجۂ صحابیِ موصوف نے بلکہ ان کے والد ماجد اصبغ بن عمرو کلبی نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔[۲۳۴] مآخذ کا بیان ہے کہ ان کے اسلام کے نتیجے میں قبیلۂ بنو کلب کی اس شاخ کے کافی بڑے حصے نے اسلام قبول کر لیا تھا اور

جو لوگ اپنے سابق دین پر قائم رہے تھے انھوں نے جزیہ ادا کرنے کا معاہدہ کیا تھا۔[۲۳۵] مونٹگمری واٹ نے اپنے متعصبانہ یا غیر علمی نظریہ کے مطابق اس مہم کے اثرات کو گھٹا کر دکھانے کی کوشش کی ہے۔[۲۳۶] ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دومۃ الجندل کا قبیلہ کلب یا تو اسلام کا باقاعدہ رکن بن گیا تھا یا اس نے ریاست اسلامی کی باجگزاری قبول کر لی تھی۔ اس مدت میں اور کتنی چھوٹی بڑی مہمیں شمال کو بھیجی گئیں جنھوں نے اپنا مقصود بخوبی حاصل کیا لیکن اس علاقے کو اسلامی ریاست کا حصہ بننے کے لئے اگلے مرحلے کا انتظار رہا۔

(۸) آٹھواں مرحلہ : اقدام کا آغاز

صلح حدیبیہ اسلام کی تاریخ اور اسلامی ریاست کے ارتقاء کا ایک اہم مرحلہ تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کو صلح حدیبیہ کا معاہدہ کرتے وقت اس کی سیاسی اور سماجی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں تھا تاہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معاہدۂ صلح کا دور رس، مسلمانوں کے حق میں مفید اور اشاعتِ اسلام میں معاون نتائج و اثرات کا بخوبی علم تھا۔ صلح حدیبیہ کے محرکات و عوامل اور ان تاریخی حالات جن میں وہ عمل پذیر ہوئی تھی کا ابھی تک جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ مونٹگمری واٹ نے اس کی اہمیت اور تاریخی حالات کا تجزیہ کیا ہے لیکن وہ بعض غیر تاریخی تعبیرات سے بھی بھرا ہوا ہے۔[۲۳۷] دوسرے مورخین نے، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، مآخذ کا روایتی انداز اپنایا ہے جس میں تجزیہ و تحلیل کا فقدان ہے۔ بعض مآخذ کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبۃ اللہ کا عمرہ کرنے کا حکمِ خداوندی خواب میں دیکھا۔ بعض دوسرے اس کو الہامِ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں۔[۲۳۸] شبلی نعمانی نے اس سفر و غزوۂ حدیبیہ کے اسباب میں مسلمانوں کے اپنے قدیم وطن سے لگاؤ، عمرہ یا حج کی خواہش، کعبہ کی محبت کو گنایا ہے۔[۲۳۹] واٹ نے بھی مختلف سیاسی اور مذہبی اسباب و محرکات بنائے غزوہ قرار دیئے ہیں۔

دراصل غزوہ حدیبیہ کے اسباب و علل اور محرکات کو غزوۂ خندق میں قریش اور ان کے اتحادی احزاب کی ناکامی سے پیدا ہونے والے تاریخی حالات میں تلاش کرنا چاہئے۔ ذکر آ چکا ہے کہ مدینہ کے خلاف احزاب کا اجتماع سب سے بڑا فوجی اور سیاسی منصوبہ تھا جو اپنے مقصد یعنی مسلمانوں کی ریاست کو تہس نہس کرنے میں قطعی طور پر ناکام رہا تھا۔ دشمنوں نے اپنی بھرپور طاقت کا استعمال کر کے دیکھ لیا تھا، مگر نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف ناکام رہے بلکہ اقدام ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ان کی ہمتیں پست ہو گئیں، عزائم بکھر گئے اور منصوبے خاک میں مل گئے۔ نہ وہ اپنی سیاسی ساکھ کو بحال کر سکے اور نہ ہی سماجی مقام کو۔ ان کی اقتصادی زندگی جس کا دارومدار بیشتر شامی تجارت پر تھا بے موت مر گئی۔ اس تمام ناکامی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکی سیاست میں اختلافات پھوٹ پڑے جن کا اظہار صلح حدیبیہ کے حالات سے ہوتا ہے۔ ان کی قیادت متحد نہیں رہی تھی اور گروہی عصبیت بڑھ گئی تھی۔ عام لوگوں کا اپنے قائدین پر سے اعتماد اُٹھ گیا تھا اور متعدد قائدین و سردارانِ مکہ کا بھرم کھل گیا تھا اور ان کی وہ سیاسی اور سماجی حیثیت نہیں رہی تھی جو پہلے کبھی تھی۔ دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس ابتلاء و آزمائش سے گزر کر اور کندن بن گئے تھے اور آپ پہلے سے زیادہ طاقت ور، با اثر اور زیادہ محبوب قائد کے طور پر اُبھرے تھے۔ غزوۂ خندق کے دوران حضرت نعیم بن مسعود اشجعی کے ذریعہ آپ نے نہ صرف احزاب کے مختلف عناصر میں پھوٹ ڈال کر ان کی طاقت

توڑ دی تھی، بلکہ عرب بدوی قبائل سے اپنے زیادہ مضبوط روابط کی بنیاد بھی ڈالی تھی۔[۲۴۰] اس کے علاوہ قبائلِ عرب کو اسلام اور اسلامی ریاست سے قریب لانے اور حامی بنانے کی یہی پالیسی تھی جس کے نتیجے میں آپ نے مختلف علاقوں میں غزوات اور سرایا کی مہمیں بھیجی تھیں یا خود لے کر گئے تھے۔ قریش اور ان کے اتحادیوں کی ناکامی نے قبائلِ عرب کو بھی بخوبی احساس دلایا تھا کہ مدینہ کی اسلامی ریاست ایک ایسی سیاسی اور فوجی طاقت بن چکی ہے جس کی مخالفت میں سراسر زیاں ہے اور جس کی دوستی اور محبت میں مکمل اور بھرپور فائدہ ہے اور اس احساس ہی کا نتیجہ تھا کہ متعدد قبائل عرب اسلام یا اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ آچکے تھے اور دوسرے بہت سے قبائل نے مخالفت کی راہ کم از کم ترک کر دی تھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روز افزوں سیاسی طاقت کے ہر لمحہ میں یہ پالیسی عیاں رہی تھی کہ آپ کو اپنے کسی دشمن کی، چاہے وہ بدوی قبائل عرب ہوں یا مغرور قریشِ مکہ یا قبائلِ شمال و جنوب کی منظم حکومتیں، تباہی مقصود نہ تھی۔ آپ ان کو اسلام کے دائرے میں لانا اور اسلامی حکومت اور امت کا رکن بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس پالیسی کا عملی اظہار ہر غزوہ اور ہر سریہ میں ہوا، جب آپ نے گرے ہوئے دشمن پر وار کرنے اور اس کا کام تمام کرنے کے بجائے اس کو گلے سے لگا لینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ قریشِ مکہ کے ساتھ بھی آپ کی یہ پالیسی شروع ہو رہی تھی اور جنگِ بدر اور اس کے قیدیوں، مختلف سرایا میں پکڑے گئے دوسرے قریشی قیدیوں اور بسا اوقات ان کے مالِ غنیمت کے معاملہ میں آپ نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ آپ ان کی تباہی اور بربادی نہیں چاہتے بلکہ ان کو اسلام کا پیرو اور امتِ مسلمہ کا رکن دیکھنا چاہتے تھے۔ قریشِ مکہ بھی آپ کی اس پالیسی سے پوری طرح واقف تھے اور اس کا بخوبی احساس رکھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کی تعداد میں برابر قریشیوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن دوسری طرف ان کو اسلامی ریاست کی روز افزوں طاقت سے یہ بھی خدشہ تھا (جو اگرچہ حقیقی نہ تھا مگر قریش کے لئے صحیح تھا) کہ مسلمان کسی وقت بھی مکہ پر مسلح حملہ کر سکتے ہیں اور مکہ کی سیادت و قیادت کو آنِ واحد میں بالکل ختم کر سکتے ہیں۔ یہ احساس بھی ممکن ہے بعض مکی تاجروں کے لئے قبولِ اسلام کا سبب بن گیا ہو۔

قریشِ مکہ کی دن بدن دگرگوں سیاسی اور فوجی طاقت اور اسلامی ریاست کی روز افزوں ترقی و استحکام کا یہی زمانہ تھا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ جا کر عمرہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے سفر پر چودہ سو[۱۴۰۰] یا سولہ سو[۱۶۰۰] مسلمانوں کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔[۲۴۱] مسلمانوں کی اس جماعت زائرین کے پاس صرف مسافروں کے ہتھیار یعنی تلواریں تھیں، ان کے احرام بندھے ہوئے تھے اور قربانی کے جانور ساتھ تھے۔ اس پورے اہتمام کا مقصد قریشِ مکہ کو خصوصاً اور قبائل عرب کو عموماً یہ تاثر دینا تھا کہ آپ کا مشن پُرامن اور مذہبی فریضہ ادا کرنا تھا۔[۲۴۲] قبائلِ عرب تو پہلے بھی شاید مکہ والوں کی حمایت میں گوناگوں اسباب سے نہ آتے اور اس اظہار مذہب سے تو وہ اتنے متاثر ہو گئے ہوں گے کہ مداخلت کا اگر کوئی خیال بھی تھا تو جاتا رہا ہوگا۔ اس کا مکہ کے مختلف سماجی اور مذہبی حلقوں پر بھی خاطر خواہ اثر ہوا ہوگا۔ اس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام پڑوسی یا متعلقہ قبائل عرب کو پوری طرح سے، اور مکہ کی آبادی کے خاصے بڑے حصے کو کسی حد تک، کم از کم ایک معاملہ میں اپنا ہمنوا بنا لیا تھا یا کم از کم ان کو خیر جانب دار بنا دیا تھا۔[۲۴۳] اس حکمت عملی کے نتیجہ میں خون خرابے یا جنگ کے امکانات کا تو سرے سے خاتمہ ہو گیا تھا۔ جس کا بہترین ثبوت ہم کو

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صلح حدیبیہ کے موقعہ پر بھیجے گئے دو سفیروں حضرات خراش بن امیہ اور عثمان بن عفان کے ساتھ مکہ والوں کے سلوک سے ہوتا ہے کہ ان کی مدافعت، محافظت اور حمایت میں خود مکہ کے لوگ آگے آئے تھے۔[۲۴۴] اس کے علاوہ مکہ میں عمومی تاثر یہی تھا کہ زائرین مکہ کو، خواہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مسلمان رفقا ہی کیوں نہ ہوں، کیونکر روکا جا سکتا ہے؟ یہ خیال بڑی حد تک صحیح ہے کہ خانہ کعبہ کا عمرہ اور مکہ مکرمہ کی مذہبی حیثیت کا اس طرح اظہار کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور قبائل عرب کے تمام مذہبی عناصر میں اپنے لئے ایک نرم گوشہ ضرور بنا لیا تھا۔ چنانچہ مکہ اور اس کے ارد گرد کے علاقوں میں مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے کا خیال جم چکا تھا۔ حضرت خالد بن ولید مخزومی کی کمان میں مکہ کے رؤساء قبائل نے جو شہسوار دستہ بھیجا تھا، اس کا مقصد مسلمانوں کو یوں بے محابا مکہ میں داخل ہونے سے روکنا تھا نہ کہ ان سے کسی قسم کی معرکہ آرائی کرنا۔[۲۴۵] رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بھی نبرد آزمائی سے گریز کرنا شروع سے رہا تھا چنانچہ اس کے تمام امکانات کو رد کرنے کی خاطر آپ نے مسلمانوں کو تنگ اور دشوار گزار پہاڑی راستوں سے حدیبیہ کی وادی میں پہنچا دیا جو مکہ کے بالکل قریب تھی اور وہیں مسلمانوں نے پڑاؤ ڈال دیا اور حالات کے رُخ کا انتظار کرنے لگے۔[۲۴۶]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بخوبی احساس تھا کہ مکہ کے مغرور سرداران کو اور مسلمانوں کو اتنی آسانی سے شہر میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ حدیبیہ میں آپ کا قیام اور متعدد دوسرے قرائن اور شواہد اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اسی سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ مذہبی اسباب و محرکات کے ساتھ اس غزوہ کے کچھ سیاسی مقاصد و محرکات بھی تھے۔ دو ہی صورتیں ممکن تھیں یا تو مسلمان مکہ میں داخل ہوں گے اور عمرہ کریں گے اور یا مسلمان داخل نہ ہوں گے اور دونوں صورتوں میں کسی قسم کے سمجھوتے کا امکان تھا، جس کا ثبوت ہم کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبیلہ خزاعہ کے سردار و نمائندے بدیل بن ورقاء سے گفتگو میں ملتا ہے۔[۲۴۷] بہر حال قیامِ حدیبیہ کے فوراً بعد ہی گفت و شنید اور نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہوا اور نقطہ آغاز بدیل بن ورقاء ہی سے شروع ہُوا جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لئے آئے تھے اور واپسی پر پیغام رسول مکہ والوں کے پاس لے گئے۔[۲۴۸] اس کے بعد مکرز بن حفص عامری کی سفارت آئی۔ وہ بھی ناکام رہی۔[۲۴۹] پھر قریش نے احابیش کے سردار حلیس بن علقمہ کو بھیجا۔ پھر عروہ بن مسعود ثقفی کی سفارت آئی۔ مگر مکمل گفتگو نہ ہو سکی۔[۲۵۰] اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خراش بن امیہ کو مکہ والوں کے پاس بھیجا، مگر ان کی سفارت کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر میں حضرت عثمان بن عفان اُموی کو حضرت عمر فاروق کے مشورہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا جنھیں مکہ والوں نے روک لیا اور اس کے سبب ان کے قتل کی افواہ مشہور ہو گئی[۲۵۱] اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خون کا قصاص لینے کی بیعت و قسم مسلمانوں سے لی۔[۲۵۲] غالباً اسی عزم مصمم کا اثر تھا کہ مکہ والوں نے صلح کرنے کا فیصلہ کر لیا[۲۵۳] اور ان کی وہ موثر سفارت خطیبِ قریش سہیل بن عامر عامری کی قیادت میں آئی جس نے صلح حدیبیہ کا معاہدہ مسلمانوں سے مل کر لکھا۔ ممکن ہے کہ درمیان میں کچھ اور سفارتیں بھی آئی گئی ہوں۔ ان متعدد سفارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش کی قیادت و سیادت میں کس قدر رخنہ پڑ گیا تھا اور سیاست میں کس قدر الجھن اور مایوسی پیدا ہو گئی تھی۔ ایک دوسرا اہم نکتہ یہ ابھرتا ہے کہ قریش مکہ کے ان سرداروں کا صلح حدیبیہ میں نہ ذکر ملتا ہے نہ ان کے اس میں حصہ لینے کا کوئی ثبوت جو اب تک کی سیاست اور

قیادت پر چھائے رہے تھے خاص کر ابوسفیان بن حرب کی غیر موجودگی بہت کھلتی ہے،[۲۵۴] اگرچہ ان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ اس موقعہ پر مکہ میں موجود نہ تھے تاہم دوسرے زعمائے قریش کو کیا ہوا تھا؟ ہم دیکھتے ہیں کہ قریشی اشرافیہ کی جانب سے پہلے ایک خزاعی حلیف نے پھر ایک غیر معروف عامری نے پھر احابیش کے بدوی سردار نے، پھر ایک ثقفی حلیف نے اور آخر میں ایک نسبتاً کم پایہ اور سیاسی طور پر کم رتبہ قریشی خاندان بنو عامر کے نمائندے نے گفت وشنید میں قیادت کی تھی۔ بنو ہاشم، بنو امیہ، بنو مخزوم، بنو سہم وغیرہ کے سردار جو ملکی سیاست کا جوہر تھے اس میں کیوں شامل نہ تھے؟ اس کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں: اوّل یہ کہ مکہ کی سیادت کی صفِ اوّل یا تو ختم ہو چکی تھی جیسا کہ حضرت عمرو بن عاص سہمی کے قبولِ اسلام کے سبب سے ظاہر ہوتا ہے[۲۵۵] یا از کار رفتہ ہو چکی تھی اور اصل قیادت دوسری صف کے سیاستدانوں کے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ اور دوم یہ کہ سیادت وقیادت میں اختلاف وانتشار تھا جیسا کہ متعدد قریشی سفارتوں کی آمد اور ان کے حالات سے ہوتا ہے۔

مکہ میں زمامِ قیادت کسی کے ہاتھ میں رہی ہو، ان سیاسی حالات نے بہرحال مکہ کے سنجیدہ طبقۂ اشراف کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ اسلامی ریاست سے کسی قسم کا معاہدۂ صلح ہو جائے، تاکہ ان کی معاش کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال پر قابو پایا جا سکے اور اس پُر خلوص جذبۂ خیر میں ان کو مکہ کے تمام تاجر طبقات کی خاموش رضا حاصل تھی۔ دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر حال میں صلح کے لئے تیار رہتے۔ چنانچہ تھوڑی سی بحث وتمحیص[۲۵۶] کے بعد وہ تاریخی معاہدہ لکھا گیا جو تاریخ میں صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہُوا۔ فریقین نے اس پر اتفاق کیا تھا کہ:

(۱) یہ معاہدۂ صلح دس برس کے لئے ہوگا۔ فریقین اس زمانہ میں جنگ نہ کریں گے۔

(۲) مسلمان اس سال عمرہ نہیں کریں گے اور نہ مکہ میں داخل ہوں گے بلکہ اگلے سال عمرہ کے لئے آئیں گے اور مکہ میں صرف تین دن قیام کریں گے۔

(۳) مکہ کے افراد یا گروہ اگر مدینہ اس دوران اپنے بزرگوں کی اجازت کے بغیر ہجرت کریں گے تو ان کو واپس مکہ بھیجنا مسلمانوں پر لازمی ہوگا لیکن اگر مدینہ کا کوئی شخص یا جماعت مکہ آ جائے تو اس کی واپسی کی شرط مکیوں کے لئے ضروری نہ ہوگی۔

(۴) فریقین میں کسی کے ساتھ دوسرے عرب قبائل حلف ودوستی کے معاہدے کرنے کے لئے آزاد ہوں گے۔[۲۵۷]

اس صلح کے دُور رس اور بڑے اہم اثرات مرتب ہُوئے اگرچہ ابتدا میں یہ معاہدہ اسلامی ریاست کے مفاد میں نظر نہیں آتا تھا اور اس کی اکثر وبیشتر دفعات کا فائدہ قریش کے حق میں جاتا معلوم ہوتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ قریشِ مکہ کے اس معاہدہ کی وجہ سے بھرم رہ گیا تھا اور ان کی عزت وساکھ بچ گئی تھی۔ ان کی شامی تجارت کا راستہ کھل گیا تھا جس کی ان کو سب سے زیادہ ضرورت تھی لیکن اس سے اسلامی ریاست کو جو گوناگوں فوائد حاصل ہوئے وہ اگرچہ فوری طور پر نہیں محسوس کئے گئے تھے تاہم ان کا پھل کچھ مدت کے بعد نکلا۔ ایک اہم فائدہ یہ ہُوا کہ قریشِ مکہ نے اسلامی ریاست کو اپنا ہم پلہ تسلیم کر لیا۔ دوسرا یہ کہ قبائل عرب کے لئے خاص کر مکہ کے حلقۂ اثر کے قبائل کے لئے راستہ کھل گیا کہ وہ مکہ اور مدینہ میں سے جس کے ساتھ چاہیں حلف کے

معاہدے کرلیں۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے مکمل ہوتے ہی خزاعہ نے اسلامی ریاست سے اور بنوبکر نے قریش سے معاہدے کر لئے۔[۲۵۸] مآخذ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے معاہدے صرف دو قبائل نے کئے تھے، لیکن اس کا امکان قوی ہے کہ کچھ اور قبائل عرب نے بھی مدینہ کی اسلامی ریاست سے صلح حدیبیہ کے بعد اس کے روز افزوں سیاسی استحکام اور فوجی طاقت کو دیکھ کر اسی قسم کے باہمی تعاون کے معاہدے کر لئے ہوں گے۔ لیکن سب سے بڑا فائدہ جو اسلامی ریاست کو ہوا وہ اسلام کی تیز رفتاری کے ساتھ تبلیغ ہے ہمارے مآخذ کا بیان ہے کہ اس صلح کے نتیجہ میں فتح مکہ تک یعنی تقریباً دو سال کی قلیل مدت میں اتنے لوگ مسلمان ہوئے تھے جتنے کہ اس سے قبل کی پوری مدت یعنی تقریباً بیس سال میں نہیں ہوئے تھے۔[۲۵۹] یہ بیان محض خوش گمانی یا مبالغہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کے تاریخی ثبوت ہیں کہ وہ قطعی طور پر صحیح ہے۔[۲۶۰] اس سے زیادہ اہم یہ فائدہ تھا کہ خود مکہ میں اشاعتِ اسلام کی رفتار تیز ہوگئی اور لوگ تیزی سے مسلمان ہونے اور مدینہ جانے لگے۔[۲۶۱] ابنِ اسحاق، ابنِ سعد اور دوسرے مؤلفینِ سیرت نے ان مسلمانوں یا قریشیوں کی فہرست دی ہے جو اس واقعہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ ان میں اور ممتاز لوگوں کے علاوہ حضرات خالد بن ولید، عمرو بن العاص، یزید بن ابی سفیان اور ان کے بھائی معاویہ وغیرہ شامل تھے۔[۲۶۲] اسلامی ریاست کو ان باصلاحیت اور قابل اصحاب کے قبول اسلام سے کافی فائدہ ہوا اور اس نے انتظام و انصرام، فتوحات وغزوات، تنظیم و تشکیلِ معاشرہ میں ان کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کیا۔[۲۶۳] اس کے علاوہ مسلمانوں کو آزادانہ آمد و رفت کے سبب اپنی تجارت کو بھی اشاعتِ اسلام کے ساتھ ساتھ فروغ دینے کا موقعہ ملا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریشِ مکہ کی مخالفت اور عداوت ختم ہونے سے راحت ملی ہی تھی کہ مدینہ کے شمال میں خیبر کے طاقتور یہودیوں نے بدوی قبائل خصوصاً غطفان کے ساتھ مل کر اسلامی ریاست پر حملہ کرنے کے منصوبے بنائے لیکن قبل اس کے کہ وہ اقدام کر سکیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے انھیں جاں نثاروں کے ساتھ جو حدیبیہ میں پیغامِ امن لے کر گئے تھے۔ خیبر کی طرف جنگ کا پرچم لہراتے ہوئے کوچ کیا اور یہودی آطام یا قلعوں کا محاصرہ کر لیا۔ ایک مختصر سی مدت میں کئی یہودی قلعے مسلمانوں کے قبضے میں آگئے۔ مقابلہ بیکار سمجھ کر یہودیوں نے صلح کی درخواست کی جو بابِ رحمت سے منظور ہوئی۔ یہودیوں نے اپنی زمینوں پر اسلامی ریاست کی ملکیت کا حق تسلیم کر لیا اور اس کے عوض اپنی تمام پیداوار کا نصف بطورِ خراج مسلمانوں کو ادا کرنا منظور کیا۔[۲۶۴] تقریباً انھیں شرائط پر خیبر کی ماتحت دوسری یہودی بستیوں ——— فدک[۲۶۵]، تیماء[۲۶۶]، وادی القری[۲۶۷] ——— نے بھی صلح کر لی۔[۲۶۸] اسلامی ریاست کے ارتقاء اور اس کی سیاسی طاقت کی افزونی کا یہ ایک انتہائی اہم مرحلہ تھا۔ خراج کی ادائیگی دراصل اسلامی ریاست سے وفاداری کا عہد اور اس کی سیاسی برتری تسلیم کرنے کا اعلان تھا۔ جزیہ کی ادائیگی کی بعض مثالیں ہم کو اسی سال کے کچھ ابتدائی حصے میں مل چکی ہیں۔ یہاں سے اسلامی ریاست کا رویہ دوسرے قبائل عرب کے ساتھ بدلتا ہے آئندہ سے اسلامی حکومت ان سے باہمی نصرت و تعاون کے معاہدے نہیں کرتی بلکہ تمام قبائل اور علاقہ جات عرب کو اسلامی ریاست کی سیاسی برتری تسلیم کرنی ضروری تھی اور اس کے اظہار و اعلان کے لئے زکوٰۃ، جزیہ، خراج جیسے محاصل ادا کرنے اور اپنے علاقوں میں مسلمان حاکموں یا مدینہ کے مقرر کردہ منتظمین و عمال کی موجودگی کو بخوشی برداشت کرنا لازمی ہو گیا تھا۔[۲۶۹]

بہرحال خیبر اور اس کی ملحقہ بستیوں کے زوال اور ان کے اسلامی ریاست کی بالادستی قبول کرنے کے بعد مسلمانوں کا قبضہ و اقتدار پوری وادی القریٰ پر محیط ہوگیا۔ چنانچہ چھ برس کی مختصر مدت میں اسلامی ریاست شمال میں کافی بڑے خطے پر قابض ہوگئی تھی اور اس کی حدود شامی سرحد کے قریب بسے ہوئے قبائل خصوصاً غسان، جذام، لخم وغیرہ کے حدود کے قریب پہنچ گئی تھیں۔ یہ صورتِ حال نہ صرف ان عرب قبائل کے لئے بلکہ ان کے سیاسی آقا رومی شہنشاہ کے لئے باعثِ تشویش تھی۔

صلحِ حدیبیہ کے معاً بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ریاست کے پڑوس میں آباد عرب حکمرانوں اور ان کے سیاسی آقاؤں کو اسلام قبول کرنے اور اس طرح اسلامی اُمت کا رکن بننے اور اسلامی ریاست کے دائرہ اقتدار میں آجانے کی دعوت دی۔ آپ نے جن لوگوں کو یہ دعوتی خطوط تحریر فرمائے تھے ان میں مملکتِ بصریٰ کے غسانی حکمراں، مصر کے بازنطینی گورنر اور ان کے سیاسی سرپرست رومی شہنشاہ ہرقل شامل تھے۔ اسی طرح مشرقی پٹی کے حکمرانوں اور ان کے سیاسی آقا شہنشاہِ ایران کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ یمن کے حکمراں جو ایرانی گورنر تھے اور دوسرے عرب خود مختار شہزادوں کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ غرض کہ اس وقت کی جتنی اہم حکومتیں خود جزیرہ نمائے عرب میں تھیں یا اس کے بالکل قریب میں تھیں ان کو ریاست اسلامی کا شہری بننے اور اس کی سیاسی بالادستی قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔[270] یہ دعوت بنیادی طور پر مذہبی تھی تاہم اس میں سیاسی مضمرات بھی تھے اور اس دعوت کو قبول کرنے کی صورت میں اسلامی ریاست کی سرپرستی اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بالادستی قبول کرنی لازمی تھی۔ بہرحال ان خطوط و فرامینِ نبوی سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ نہ اسلام صرف ایک عربی دین تھا اور نہ ریاستِ اسلامی جزیرہ نمائے عرب کی حدود میں مقید رہنے والی تھی۔ دونوں کا نقطۂ نظر عالمی تھا اور دونوں کی نظر پورے عالمِ انسانی پر تھی۔

(۹) نواں مرحلہ: فتوحاتِ عظیم

صلحِ حدیبیہ کی بعض شرائط اپنی نوعیت کے اعتبار سے زیادہ مدت تک قائم رہنے والی نہ تھیں کیونکہ وہ تاریخی دھاروں کے خلاف مسلمانوں پر ٹھونسی گئی تھیں۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غالباً پورا احساس و ادراک تھا کہ وہ تمام شقیں جن کو مسلمانوں نے پسند نہیں کیا تھا اور جن کو وہ اپنے لئے ناقابلِ برداشت اور توہین آمیز پاتے تھے جلد یا بدیر از خود ختم ہوجائیں گی۔ چنانچہ اس کا اشارہ حضرت ابوجندل کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کلماتِ تشفی میں ملتا ہے جو آپ نے ان کی غمزدہ و غمناک واپسی پر فرمائے تھے[271] اور پھر آخر کار حضرت ابوبصیر ثقفی اور دوسرے گرفتارانِ بلا کی مکی ظالموں کی قید سے رہائی اور ساحل بحر پر ینبوع کے علاقہ میں قیام کے نتیجہ میں وہ شق ختم ہوگئی تھی۔[272] لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے خاتمے کی درخواست انھیں ظالموں کی طرف سے آئی تھی جنھوں نے اس کو مسلمانوں پر زبردستی لادا تھا۔ اس زمانے میں یہی شق مسلمان مہاجر عورتوں کے بارے میں پہلے ہی حضرت ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط اموی کی دلیرانہ اور مجاہدانہ ہجرت سے ختم ہوچکی تھی۔[271] دوسری شق مسلمانوں کی ۶ھ میں حدیبیہ سے واپسی اور ۷ھ میں کامیاب عمرہ کی ادائیگی سے ختم ہوچکی تھیں۔[273] باقی دو شقوں کا ایک دوسرے سے بڑا

قریبی تعلق تھا اور بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ معاہدۂ حدیبیہ فتح مکّہ کا دیباچہ بننے والا تھا۔

مکّہ کے محاذ پر یہ صورتِ حال پیدا ہو رہی تھی اور مدینہ کے شمال میں خیبر کی مہم کے کچھ بعد حالات نے دُوسری کروٹ لی۔ صلح حدیبیہ اور فتح مکّہ کے درمیانی عرصے میں اسلامی ریاست کو مختلف علاقوں میں لگ بھگ سترہ چھوٹی بڑی مہمیں بھیجنی پڑیں۔ ان میں سے کچھ وُہ مہمیں تھیں جو اُن قبائل عرب خصوصاً مشرقی علاقوں کے عربوں کے خلاف بھیجی گئی تھیں جو آہستہ آہستہ اسلامی ریاست کی طرف اپنے مخالفانہ اور معاندانہ رویّے میں لچک پیدا کر رہے تھے اگرچہ ابھی تک انھوں نے مکمل تابعداری اور اطاعت کی راہ نہیں اپنائی تھی۔ یہودی شمالی بستیوں کے زوال کے چھ ماہ بعد ہوازن کے بعض چھوٹے چھوٹے گروہوں نے انتشار برپا کرنے کی کوشش کی۔ رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کچلنے کے لئے فوری طور پر اقدام کیا اور دو مہمیں تربہ اور نجد کے علاقے میں بھیجی گئیں جنھوں نے شرپسندوں کا خاتمہ کر دیا۔(۲۷۵)(۲۷۴) جولائی ۶۲۹ء میں ہوازن کا ایک حصہ جو سی کے علاقے میں آباد اور انتشار میں مشغول تھا راہِ راست پر لایا گیا۔(۲۷۶) یہ تمام مہمیں دراصل بہت ہی معمولی تھیں کیونکہ اصل ہوازن کا قبیلہ مکّہ کے جنوب مشرق میں مقیم و آباد تھا اور اس کا ان شرپسندوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان معمولی مہموں سے بہرحال اسلامی ریاست کی سیاسی طاقت اور اقتدار و اختیار کی وسیع حدود کا اندازہ ہوتا ہے۔

غطفان اور اس کے دو تین اہم خاندان جیسے مرّہ اور ثعلبہ بھی اس زمانے میں کافی سرگرم رہے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طاقت کو کچلنے میں ذرا دیر نہیں لگائی تھی۔ اگرچہ فدک کا سریہ بشیر بن سعد مسلمانوں کی شہادت کا سبب بنا(۲۷۷) تاہم حضرت غالب بن عبداللہ نے اس کا فوری انتقام لے لیا(۲۷۸) اور کچھ مدّت کے بعد حضرت بشیر بن سعد نے غطفان کے خلاف ایک اور کامیاب مہم کی قیادت کی۔(۲۷۹) اسی طرح سلیم کے خلاف حضرت ابن ابی العوجا سُلمی نے فوج کشی کی تھی۔(۲۸۰) بعض چھوٹی مہمیں دوسرے شرپسند عناصر کے خلاف بھیجی گئی تھیں جو اکثر و بیشتر کامیاب رہی تھیں۔(۲۸۱) مآخذ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان مہموں میں مسلم سپاہ کی تعداد کافی کم تھی اور غالباً مخالف قبیلوں کے بعض سرکش حصّے ہی اس فوج کشی کا سبب بنے تھے۔ بہرحال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست کے خلاف اُٹھنے والی ہر سازش، حرکت اور منصوبے کو فوری طور پر کچلا تھا اور اس طرح ان قبیلوں یا ان کے عناصر پر واضح کر دیا تھا کہ ان کا وجود صرف اسلامی ریاست کے ساتھ دوستی، مفاہمت اور وفاداری ہی کی صورت میں برقرار رہ سکتا ہے۔

اسی مدت میں اسلامی ریاست کو بعض شمالی قبائل اور علاقوں کی طرف توجہ دینی پڑی کیونکہ اس کے خلاف سازشیں، حملے کے لئے فوجی جماؤ اور سیاسی و فوجی مخالفت جنم لے رہی تھی۔ اس کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پرانی پالیسی کے مطابق تبلیغی جماعتیں بھی بھیجتے رہے تھے۔ چنانچہ حضرت کعب بن عمیر غفاری کی قیادت میں جو جماعت ذات اطلاح وادی القریٰ کے علاقے میں واقع ایک مقام تک گئی تھی وہ ایک مذہبی مشن تھا جس کی تکمیل مسلمانوں نے اپنے خُون کی سُرخی سے کی تھی۔(۲۸۲)

دوسری مہم اس حادثہ کے دو ماہ بعد جنوبی اردن کے شہر موتہ کے مقام کو حضرت زید بن حارثہ کے زیرکمان سفیر نبوی حضرت حارث بن عُمیر ازدی کے بصریٰ کے غسانی حکمراں شرحبیل بن عمرو کے ہاتھوں ظالمانہ قتل کا انتقام لینے کے لئے گئی تھی۔ اگرچہ اس مہم میں

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نامزد کردہ تینوں سالار شہیدِ راہ حق ہوئے اور غالباً کچھ دوسرے بھی شہید ہوئے تھے تاہم اس کا مقصد پورا ہوا تھا۔ غسانی حکمراں کو یہ احساس دلا دیا گیا تھا کہ اسلامی حکومت کے خلاف کوئی کارروائی خطرناک نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔[۲۸۳] اس کے دوسرے ماہ حضرت عمرو بن العاص سہمی بنو قضاعہ کے ایک فوجی جماؤ کے خلاف ایک مہم لے کر گئے،[۲۸۴] اور بعد میں حضرت ابو عبیدہ بن جراح ان کے لئے امداد لے کر پہنچے۔[۲۸۵] اس مہم کو بڑی کامیابی ملی خاص کر عذرہ، بلی اور بہراد کی کچھ شاخوں میں جنھوں نے نہ صرف اسلامی حکومت اور ریاست کی دوستی کا دم بھرا بلکہ کچھ لوگوں نے اسلام بھی قبول کیا۔[۲۸۶] اس طرح اسلامی حکومت کا حلقۂ اثر شمال میں اور وسیع ہو گیا۔

حالات کا یہی رُخ تھا کہ مکی قائدین کی بے تدبیری اور خراب حکمت عملی نے صورتِ حال کو ان کے لئے بد سے بدتر بنا دیا۔ قبیلہ بنو بکر اور خزاعہ میں مدت سے رقابت چلی آ رہی تھی۔ اسی دوران وہ اتنی بڑھی کہ بنو بکر نے قریش کی حمایت اور مدد سے خزاعہ پر اچانک شب خون مارا اور ان کے کئی آدمی مار ڈالے۔ صلح حدیبیہ کی شق ۲ کے مطابق خزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے چنانچہ انھوں نے اس ظلم کے خلاف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فوجی و اخلاقی مدد چاہی جو معاہدہ کے مطابق آپ پر لازمی تھی چنانچہ آپ نے ان کی حمایت کی اور قریشِ مکہ سے دیت ادا کرنے کا مطالبہ کیا اور نہ ادا کرنے کی صورت میں معاہدہ حدیبیہ کو باطل کرنے کا۔ قریشِ مکہ کے عاقبت نااندیش سرداروں نے نتائج کو سوچے سمجھے بغیر معاہدہ حدیبیہ کو توڑنے کا اعلان کر دیا۔ مگر جب سمجھدار اور دانشمند طبقہ نے اس کے خطرناک نتائج کا احساس کیا تو تجدید معاہدہ کے لئے ابو سفیان بن حرب کو مدینہ بھیجا مگر ساری کوششیں بیکار گئیں کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر فوج کشی کی تیاری کی اور ایک لشکر جرار لے کر حملہ آور ہوئے۔ مکہ میں اتنا دم خم نہ تھا کہ وہ مقابلہ کر سکتا۔ اس کے علاوہ غالباً مکہ والوں نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دینا زیادہ مفید سمجھا۔ چنانچہ رمضان ۸ھ / جنوری ۶۳۰ء میں اس مغرور و ظالم شہر نے اس دُرِ یتیم کے سامنے سر جھکا دیا تھا جس کو اس نے آٹھ سال قبل عالم بے سروسامانی میں جلا وطن کر دیا تھا مگر فاتح مکہ کا حال یہ تھا کہ شہر میں داخلہ کے وقت اس کا سر بارگاہِ خداوندی میں خم تھا اور زبان پر سب کے لئے رحمت و رافت، معافی و بخشش اور رحم و کرم کے الفاظ تھے۔ مکہ نے بالآخر اپنی سیاسی خود مختاری اور بالادستی کھو دی[۲۸۷] اور وہ اسلامی ریاست کا ایک ماتحت شہر بن کر رہ گیا جس پر مدینہ کا مقرر کردہ گورنر حکومت کرتا تھا۔[۲۸۸] مدینہ کی اسلامی ریاست کی حدود مکہ کی وادی تک وسیع ہو چکی تھیں۔

مکہ کی فتح کے لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک لشکر جرار کے ساتھ روانگی نے قریشِ مکہ کے قدیم دوست، حلیف اور پڑوسی ہوازن اور ان کے خاندان ثقیف کو اپنی طاقت جمع کرنے کا موقعہ فراہم کیا تھا۔ پھر فتح مکہ کی خبر نے ان کو اسلامی ریاست کے ساتھ نبرد آزما ہونے پر اکسایا۔ ان کو اپنی کثیر طاقت، فوجی صلاحیت اور تجربہ کار قیادت کا غرور تھا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح مکہ کے بعد ان کے خطرہ کی طرف توجہ دینی پڑی۔ جنگِ حنین میں مسلمانوں کو ابتدائی ہزیمت کے بعد ایک عظیم الشان فتح آخرکار حاصل ہوئی۔[۲۸۹] بے شمار مالِ غنیمت اور ہزارہا قیدی قبضہ میں آئے۔[۲۹۰] اس کے فوراً بعد ہوازن کے شکست خوردہ سپاہ اور قائدین نے طائف کے قلعہ میں پناہ لے لی اور اسلامی لشکر نے ان کا محاصرہ کر لیا۔

کچھ مدت کے بعد جب یہ یقین ہو گیا کہ ثقیف اسلامی ریاست کے لئے کوئی خطرہ نہیں بن سکتے تو آپ نے محاصرہ اٹھا لیا۔ جعرانہ میں قیدیوں کے ساتھ حُسنِ سلوک اور بالآخر ان کی باعزت رہائی نے ہوازن کو اسلام کا پیرو اور اسلامی ریاست کا ہمنوا بنا دیا۔ اگرچہ طائف چند ماہ مزید دائرۂ اسلام سے باہر رہا[291] تاہم اسلامی ریاست کی حدود حنین و طائف کے علاقے سے پرے وسیع ہو چکی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب متعدد چھوٹی چھوٹی مہمیں یا جماعتیں جن میں سے کئی ایک یا دو نفری تھیں قرب وجوار کے بتوں اور ان کے معبدوں کو توڑنے کے لئے گئیں تو ان جھوٹے خداؤں کی حمایت میں کوئی انگلی بھی اٹھانے والا نہ تھا۔[292] اسلام کی فتح، اسلامی ریاست کی کامیابی سے کہیں زیادہ وسیع، دیرپا اور شاندار تھی۔ فتح مکّہ اور فتح حنین اسلامی ریاست کے ارتقاء کی ایک اہم ترین بلکہ سب سے زیادہ شاندار منزل تھی۔ ان کے نتیجے میں پورا وسطی و مرکزی جزیرہ نمائے عرب اسلامی ریاست کے دائرۂ اقتدار میں آ چکا تھا۔

(۱۰) دسواں مرحلہ: اوجِ تکمیل وکمال

فتح مکّہ کے بعد تمام عرب قبائل نے، خواہ وہ بدوی ہوں یا متمدن وشہری، قرب وجوار اور وسطی عرب میں آباد ہوں یا دُور دراز کے مقامات پر، یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مدینہ کی اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی کو قبول کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ مآخذ کا بیان ہے کہ سارا عرب مکّہ اور مدینہ کے درمیان ہونے والی آویزش کو بڑی دلچسپی، توجہ اور قریب کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور منتظر تھا کہ توازن کا پلہ کس کے حق میں جھکتا ہے۔ عرب بڑے عملی اور حقیقت پسند لوگ تھے۔ جوں ہی انھوں نے مکّہ کے زوال و انحطاط کی خبر سنی ان کے ہر قبیلے نے اپنی بھلائی اور عافیت اسی میں محسوس کی کہ مدینہ کی سیاسی بالادستی اور اسلام کی مذہبی برتری قبول کر لی جائے چنانچہ اعلان وفاداری ومحبت کرنے کے لئے مدینہ میں پے بہ پے اور جوق درجوق وفود عرب آنے لگے۔ اور اتنی کثرت سے آنے کہ نواں ہجری سال وفود کا سال (عام الوفود) ہی کہا جانے لگا۔[293] عام طور پر ہمارے مورخین اور سیرت نگار یہ سمجھتے اور بیان کرتے ہیں وفود کی آمد کا سلسلہ اسی برس شروع ہوا تھا۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ وفود عرب کی آمد کا سلسلہ ۵ھ / ۶۲۶-۲۷ء میں کسی وقت شروع ہو گیا تھا۔[294] دراصل ہجرت کا نواں سال ان وفود کے مدینہ میں حاضر ہونے کا ایک غیر معمولی موقعہ تھا جب جزیرہ نمائے عرب کے ہر کونے اور گوشے سے چھوٹے بڑے، بدوی شہری، متمدن اور نیم متمدن قبائل عرب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں اظہار وفاداری کرنے پہنچے تھے۔ ابنِ سعد نے وفود عرب کی کل تعداد ۷۱ بتائی ہے اور کہا ہے کہ ان میں سے اکثر وبیشتر ۹ھ میں مدینہ آئے تھے۔[295]

اوپر ذکر گزر چکا ہے کہ فتح مکّہ اور غزوہ حنین کے بعد عرب کے وسطی علاقے اسلامی ریاست میں مدغم ہو چکے تھے۔ اب جزیرہ نما کے دُور دراز اور کناروں پر بسے قبائل اور علاقے اس میں شامل ہو گئے۔ ان قبائل نے یا تو اسلامی ریاست کے ساتھ سیاسی تعلقات قائم کئے تھے اور اس کے ذمی یا اہل الذمہ بن گئے تھے جن کے جان ومال کی حفاظت کی اسلامی ریاست ضمانت دیتی تھی اور جس کے عوض یہ قبائل نقد یا جنس یا دونوں میں جزیہ مدینہ کو ادا کرتے تھے جیسا کہ نجران کے عیسائیوں اور بحرین کے زرتشتیوں / مجوسیوں نے کیا تھا یا انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اسلامی اُمت کے مکمل رکن بن گئے تھے جس کے سبب ان کو مکمل مراعات وحقوق حاصل ہو گئے تھے۔ دونوں صورتوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم افراد، گروہوں اور قبائل کو ایک کتاب (صحیفہ، پروانہ) عطا فرماتے تھے

جس میں ان کے حقوق اور اسلامی ریاست کے تئیں ان کے فرائض و واجبات بصراحت تحریر ہوتے تھے۔[۲۹۶]

یہ حقیقت یہاں غور کرنے کے قابل ہے کہ غزوۂ احزاب کے بعد کسی حد تک اور فتح مکّہ کے بعد پوری طرح سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائلِ عرب سے جو معاہدے کئے یا ان کو جو صحیفے اور کتاب عنایت فرمائے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ماقبل فتح کے زمانے کے معاہدوں اور صحیفوں یا کتابوں سے قطعی مختلف ہیں۔ پہلے زمانے کے معاہدوں اور صحیفوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فریق ثانی کے ساتھ باہمی تعاون اور دوستی کے معاہدے کئے ہیں اور جن قبائل عرب سے کسی وجہ سے اس قسم کے دفاعی معاہدے نہیں ہو سکے ان کو غیر جانبدار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی کسی قبیلہ/شہر سے آویزش کے زمانے میں کسی فریق کا ساتھ نہ دیں۔[۲۹۷] لیکن ان معاہدوں اور صحیفوں میں جو فتح مکّہ کے بعد جاری کئے گئے اسلامی ریاست کے سیاسی اقتدارِ اعلیٰ اور بالادستی کو تسلیم کرنے اور مدینہ منوّرہ کے مقرر کردہ انتظامی افسروں اور عاملوں کی اطاعت و فرمانبرداری کو لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اب عربوں کے سامنے صرف دو متبادل رہ گئے تھے: یا تو وہ اسلام قبول کر کے اسلامی اُمّت کے رکن بن جائیں اور حکمرانوں میں شامل ہو جائیں یا اسلامی ریاست میں سماجی اور سیاسی طور پر ایک فروتر درجہ پر قانع رہیں اور اسلامی حکومت کو جزیہ ادا کریں۔ اب اسلامی حکومت کے حلیف بن کر رہنے کا زمانہ ختم ہو گیا۔[۲۹۸] مختصر یہ کہ اسلامی ریاست کی رکنیت ہر ایک کے لئے ناگزیر ہو گئی تھی۔ کوئی قبیلہ، علاقہ یا فرد مدینہ کے سیاسی دائرہ اقتدار کے پرے نہیں رہ سکتا تھا۔ عرب حالات کے رُخ کو بخوبی پہچانتے تھے اور انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ کسی نہ کسی شکل میں اسلامی ریاست کی رکنیت اختیار کئے بغیر چارہ نہیں۔ اسی لئے اتنے بیشمار وفود اتنی تیز رفتاری سے مدینہ پہنچ کر اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار کرنے لگے تھے۔

لیکن ابھی تک کچھ ایسے علاقے اور قبیلے رہ گئے تھے جو اسلامی ریاست کے حلقۂ وفاداری و اطاعت سے باہر تھے۔ یہ انتشار و مزاحمت کے چھوٹے چھوٹے دائرے یا جزیرے تھے جو زیادہ تر جزیرہ نمائے عرب کے شمال بعید میں سرحد شام و عراق کے قریب اور جنوب بعید میں یمن اور حضر موت میں اور جنوب مشرق بعید میں عمان وغیرہ میں تھے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے ہی مرکز دشمن چھوٹے چھوٹے آبادی کے جزیرے جزیرہ نمائے عرب میں جہاں تہاں بکھرے ہوئے تھے۔ اسلامی ریاست کی سب سے زیادہ اور سخت مزاحمت و مخالفت شمالی علاقوں کے قبائل نے کی تھی، خاص طور سے غسان نے کیونکہ ان کو بازنطینی سلطنت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان قبیلوں کے خلاف متعدد مہمیں بھیجنی پڑی تھیں۔ لیکن اس وقت تک شمال کے ان قبیلوں نے اسلامی ریاست کے اقتدار کو نہیں للکارا تھا۔ انھوں نے یا تو حملوں کے منصوبے بنائے تھے یا لوٹ مار کی تھی اور وہ بھی پورے قبیلوں نے نہیں کی تھی بلکہ مجرم تھوڑے سے شر پسند تھے۔ لیکن ۸ھ میں سفیر نبوی کا قتل غسانی حکمراں کے ہاتھوں دراصل ایک منظم حکومت کی اسلامی ریاست کو دھمکی اور للکار تھی۔[۲۹۹] اور اگر اسلامی ریاست کو اپنا وجود، اقتدار اور افتخار برقرار رکھنا تھا تو اس قسم کے اقدامات کا مداوا کرنا لازمی تھا۔ موتہ کی جنگ نے اگرچہ غسانی حکمراں پر اپنی ناراضگی اور ناپسندیدگی ظاہر کر دی تھی تاہم غسانی بادشاہت کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کو ابھی پست کرنا باقی تھا۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے عرب قبائل کے ساتھ مفاہمت اور دوستی بھی اس علاقہ میں کسی مزید کارروائی کے لئے ضروری تھی۔ اس سلسلے میں ضروری

زمین ہموار کرنے کا فریضہ حضرات عمرو بن العاص اور ابو عبیدہ بن جراح کی مہموں نے انجام دیا تھا۔[۳۰۰] ان کے بعد ایک سال سے زیادہ شمالی سرحد یا محاذ پر مکمل سکون رہا۔ لیکن یہ سکون غالباً کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔[۳۰۱] چنانچہ رجب ۹ھ / اکتوبر ۶۳۰ء میں اس محاذ پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے جب بلقاء میں رومی افواج اور ان کے عرب باجگذار و مددگار قبائل بالخصوص لخم، جذام، غسان اور عاملہ وغیرہ کے اجتماع کی خبریں مدینہ پہنچنے لگیں۔[۳۰۲] نبطی تاجروں[۳۰۴] نے اور غالباً دوسرے ذرائع نے بھی جن میں مسلمان جاسوس بھی شامل تھے اسلامی ریاست پر رومی حملے کا خدشہ ظاہر کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان مبہم خبروں سے یقین ہو گیا تو آپ نے سرحد ہی پر دشمن کو روکنے کی غرض سے تیس ہزار سپاہ پر مشتمل ایک لشکرِ جرار کے ساتھ پیش قدمی کی اور کوچ پر کوچ کرتے ہوئے تبوک میں خیمہ زن ہوئے۔[۳۰۵] آپ کے اس جرأت مندانہ اور بروقت اقدام سے دشمن کو مقابلے پر آنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ اسی خاموشی کے ساتھ تتر بتر ہو گئے تھے جس احتیاط و خاموشی کے ساتھ وہ جمع ہوئے تھے۔

تبوک میں ڈیڑھ دو ماہ کے قیام کے بعد جب آپ کو یقین ہو گیا کہ دشمن کا خطرہ جاتا رہا ہے تو آپ نے کچھ چھوٹے موٹے اور بعض خاصے بڑے سرایا مختلف علاقوں میں بھیجے۔ اتنے بڑے لشکر کے ساتھ تبوک میں آپ کا یوں تزک و احتشام کے ساتھ قیام قرب و جوار کے قبیلوں اور علاقوں کے حکمرانوں اور آبادیوں دونوں کو مرعوب کرنے کے لئے کافی رہا تھا۔ اور ان پر اسلامی ریاست کی سیاسی اور فوجی طاقت کا بے انتہا اثر پڑا تھا۔ چنانچہ اس کا ایک تو یہ اثر ہوا کہ شمالی علاقے کے بازنطینی حکومت کے وفادار و باجگذار حکمراں اور سرحد کے پار ان کے سیاسی آقا اچھی طرح سمجھ گئے کہ اب جزیرہ نمائے عرب کے معاملات میں مداخلت مہنگی پڑے گی۔ دوسرا فوری اثر یہ ہوا کہ شامی سرحد کے اس پار کے قبائل نے اپنی قسمت کو اسلامی ریاست کے ساتھ وابستہ کرنے میں بہتری سمجھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام قبیلوں، علاقوں اور چھوٹی موٹی ریاستوں نے جن میں بعض یہودی بستیاں اور عیسائی بادشاہتیں شامل تھیں اسلامی ریاست کے ساتھ معاہدے اور صلح نامے کر لئے تھے۔ بازنطینی سلطنت کے قدیم نمک خوار اور باجگذار یا کم از کم ان کے سیاسی ہمدرد جیسے شاہ ایلہ،[۳۰۶] مقنا،[۳۰۷] جرباء اور اذرح[۳۰۸] کے یہودی اور دومۃ الجندل[۳۰۹] کے عیسائی بادشاہ نے جزیہ دینے کا معاہدہ کیا تھا اور اس طرح اسلامی حکومت کے ذمی بن گئے تھے۔[۳۱۰] کچھ مدت کے بعد ان علاقوں میں مدینہ کے مرکزی نمائندے بھی مقرر کر دئے گئے تھے اور غزوہ تبوک کے بعد متعدد شمالی قبائل نے یا تو اسلام قبول کرنے کے لئے یا سیاسی وفاداری کے اظہار میں اپنے وفود مدینہ بھیجے تھے۔ ان میں عراق کی سرحد کے قریب آباد بنو بکر بن وائل اور بنو تغلب کے عیسائی قبیلے بھی شامل تھے جنہوں نے زکوٰۃ سے دوگنا جزیہ ادا کرنے کا معاہدہ کیا تھا۔[۳۱۱] اس طرح ۹ھ / ۶۳۰ء کے اختتام تک اسلامی اقتدار کی حدود شامی اور عراقی سرحدوں تک وسیع ہو گئی تھیں۔

شمال بعید کے علاقوں کے برعکس جنوب بعید کے علاقوں اور ان کے قبیلوں کا معاملہ قطعی مختلف تھا۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ مکہ کے جنوب بلکہ جنوب بعید میں اسلامی ریاست کے اقتدار کی ہلکی سی بھی پرچھائیں فتح مکہ تک نہیں پڑی تھی اگرچہ اسلام نے اپنے سایۂ رحمت کو روزِ اوّل سے جنوبی عرب پر پھیلا دیا تھا۔ بہر حال اسلامی اقتدار کا پہلا ذائقہ جنوبی عربوں نے اس وقت چکھا جب آغاز ۹ھ / وسط ۶۳۰ء میں پہلی مسلمان مہم وہاں پہنچی۔ لیکن یہ حقیقت ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ یہ جماعت یا مہم فوجی

سے زیادہ مذہبی تھی مگر چونکہ گوناگوں اسباب و عوامل کے سبب عددی اعتبار سے یہ خاصی بڑی جماعت تھی اور فوجی لحاظ سے کسی بھی غیر متوقع حالت یا واقعہ کا سامنا بخوبی کر سکتی تھی اس لئے اس کو یا اس کے بعد آنے والی جماعتوں کو ہم کہہ دیا جاتا ہے۔ بہر حال کل پانچ مہیں حیاتِ نبویؐ میں صفر ۹ھ / مئی، جون ۶۳۰ء اور ربیع الاول ۱۱ھ / جون ۶۳۲ء کے درمیانی عرصے میں جنوبی عرب کے مختلف علاقوں میں بھیجی گئی تھیں۔ ان میں سے پہلی دو مہیں تو خاصی چھوٹی جماعتیں تھیں جو شروع ۹ھ میں قبیلہ خثعم کے ایک خاندان کے علاقے تبالہ میں اور بنو کلاب کے خلاف بھیجی گئی تھیں[۳۱۲] ظاہر ہے وہ پورے قبیلہ کے خلاف کوئی فوجی کارروائی نہیں تھی اگرچہ تیسری مہم کافی بڑی تھی کہ اس میں تین سو مسلم شامل تھے تاہم وہ کسی جنوبی عرب قبیلہ کے خلاف نہ تھی بلکہ اس کا مقصد حبشہ کے بعض لٹیروں کی سرکوبی کرنا تھا جو سمندر پار کر کے لوٹ مار کی غرض سے جنوبی ساحلی علاقے یا جزیرہ شعبہ میں آگئے تھے۔ حضرت علقمہ بن مجزز مدلجی کی قیادت میں مسلمان فوج کا یہ پہلا سمندری فوجی کارنامہ تھا کیونکہ واقدی اور ابنِ سعد کے مطابق اُنھوں نے کشتیوں (مراکب) کے ذریعہ جدّہ کے ساحل سے غالباً کسی جزیرہ کا جو بحر قلزم میں واقع تھا سفر کیا تھا۔ بہر حال ان کی آمد پر حبشی لٹیرے بھاگ گئے تھے[۳۱۳]۔

کسی جنوبی عرب کے قبیلے یا علاقے میں پہلی اہم مسلم مہم ربیع الاول ۱۰ھ / جون جولائی ۶۳۱ء میں گئی تھی جب حضرت خالد بن ولید مخزومی چار سو مسلمانوں کو لے کر بنو الحارث بن کعب یا دوسری روایات کے مطابق نجران کے بنو عبد المدان کے علاقے میں پہنچے تھے۔ طبری کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ حضرتِ خالد کی یہ مہم فوجی ہرگز نہیں تھی بلکہ وہ ایک تبلیغی جماعت تھی جس کا اوّلین و آخرین مقصد اسلام کی اشاعت و تبلیغ کرنا تھا۔ طبری کے علاوہ دوسرے مآخذ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ قبیلہ مذکورہ و متعلقہ نے دعوتِ اسلامی قبول کی تھی اور اس میں حضرتِ خالد بن ولید مخزومی کو مکمل کامیابی حاصل ہوئی تھی[۳۱۴]۔ اس کے بعد رمضان ۱۰ھ / دسمبر ۶۳۱ء میں حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کی مہم جنوبی عرب کے ایک اہم قبیلے مذحج میں پہنچی تھی۔ وہ بھی ایک تبلیغی مشن تھا۔ معمولی سی جھڑپ کے بعد مذحج نے ہتھیار ڈال دئے تھے اور اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے قبولِ اسلام کے بعد حضرت علی نے ان کا مال اور ان کے قیدی واپس کر دئے تھے اور اس طرح ان کے باقی غیر مسلم طبقات کے بھی دل جیت لئے تھے۔ پھر وہ ان کے صدقات لے کر واپس ہوئے اور مکہ میں اس وقت پہنچے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا آخری حج ادا کر رہے تھے[۳۱۵]۔

اس طرح یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عہدِ نبوی میں جنوبی عرب کے قبائل میں سے کسی کے خلاف کوئی فوجی اقدام نہیں کیا گیا تھا۔ مآخذ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی قبائل میں سے اکثر و بیشتر بلکہ تقریباً سب نے اسلامی ریاست کے ساتھ اپنا رشتۂ وفاداری یا تو قبولِ اسلام کے ذریعہ استوار کیا تھا یا سیاسی اتحاد و معاہدہ کے ذریعہ۔ اس کی صریح شہادت بلاذری کے اس بیان میں ملتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور و عروج کی خبر اہلِ یمن تک پہنچی تو انھوں نے خدمتِ نبوی میں اپنے وفود بھیجنے میں بڑی سرعت کی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کتاب / صحیفے لکھ کر دئے اور یمنیوں نے اپنے صدقات ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ جب اُنھوں نے اسلام بھی قبول کر لیا تو جناب رسالتمآبؐ نے ان کے پاس اپنے پیغامبر اور منتظمین بھیجے تاکہ وہ ان کو اسلام کے بنیادی اصولوں اور سنّتِ نبویؐ کی تعلیم دیں اور ان کے صدقات وصول کریں۔ آپ نے ان لوگوں پر

جزیہ عائد کیا جو یہودیت، عیسائیت یا مجوسیت پر قائم رہے۔" بلاذری کے اس بیان کی تصدیق جنوب عرب سے کثیر تعداد میں آنے والے وفود سے بھی ہوتی ہے۔ ابنِ سعد کے مطابق عرب کے طول وعرض سے آنے والے اکثر وفود میں سے تقریباً ایک تہائی صرف جنوبی عرب کے قبیلوں نے بھیجے تھے۔[۳۱۷] ان تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ امر پُوری طرح سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام تلوار یا طاقت کے بجائے تبلیغ وتحریض، ایقان واذعان اور دل کا یقین تھا جس نے یمن اور اس کے اردگرد کے علاقے کو اسلامی ریاست میں مدغم کیا تھا۔ ایک طرح سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنوبی عرب کے قبیلوں نے اپنی مرضی وخوشی، ارادہ وقصد اور سوچ سمجھ سے اسلام قبول کر کے اسلامی ریاست کی رکنیت کا شرف حاصل کیا تھا۔[۳۱۶]

مذکورہ بالا طویل تاریخی بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے مآخذ کا یہ دعویٰ بالکل بجا اور حقیقی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب میدانِ عرفات میں اپنا عظیم اور تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا تو اس وقت پُورا جزیرہ نمائے عرب شمال میں شام و عراق کی سرحدوں سے یمن وحضرموت کے کناروں تک جنوب میں، اور مغرب میں بحر قلزم سے خلیج فارس وایرانی حدود تک مشرق میں، نہ صرف اسلامی ریاست کے سیاسی اقتدارِ اعلیٰ اور برتری کو تسلیم کر چکا تھا بلکہ وہ اسلامی معاشرہ کا ایک جزو بن چکا تھا وہ اسلامی معاشرہ اور وہ اسلامی ریاست جو اسلام پر یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین پر مبنی تھی۔

باب دوم

قبائلِ عرب اور اسلام

اگرچہ اسلامی ریاست کی تنظیم و تشکیل اور ارتقا کے گوناگوں اسباب و عوامل تھے جن میں سیاسی تنظیم، سماجی ہم آہنگی اور فوجی مہموں میں بظاہر سب سے زیادہ حصہ لیا تھا تاہم سچ یہ ہے کہ ان تمام رنگا رنگ کاوشوں اور کاہشوں کی ایک اور صرف ایک اساس تھی ۔ یعنی اسلام، خدائے بزرگ و برتر کا نازل کیا ہوا دین، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا آخری اور کامل مذہب ۔ یہی اسلام تھا جس نے مکہ کے بت پرستوں کے بیچ خدائے واحد کے ماننے والوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ذاتِ برتر و اعلیٰ کا فرستادہ اور رسول جاننے والوں کو ایک متحدہ و ممتاز امت کا اولیں تصور عطا کیا تھا۔ خدا کے نازل کردہ اس دین نے مکہ کے لاچار و بے بس مسلمانوں کو اپنے ہموطنوں اور عزیزوں کے ظلم و ستم سہنے کا حوصلہ عطا کیا تھا۔ پھر اسی مذہب احمدی کے لیے انھوں نے اپنے گھر بار، اپنے عزیز و قریب، اپنے اہل و عیال کو چھوڑ کر دیارِ غیر میں بسنا اور آباد ہونا گوارا کیا تھا۔ اسی کیشِ محمدی کے لیے انھوں نے ظلم و جبر، جور و ستم اور جارحیت کے خلاف تلوار اٹھائی تھی اور اپنوں اور غیروں کے مدِمقابل ڈٹ گئے تھے۔ اسی دین کے لیے انھوں نے سب سے دشمنی مول لی تھی۔ اسی عقیدہ کے لیے انھوں نے اپنی جان و مال کی قربانی دی تھی اور آخر کار اسی مذہب نے مکہ کے منتشر و غیر منظم، بے مایہ و فروتر، بے اساس و بے بنیاد مسلمانوں کو ایک وطن، ایک معاشرہ اور ایک ریاست بخشی تھی۔ یہ ریاست جو شہر مدینہ کی حدود میں محدود تھی رفتہ رفتہ وسیع ہوتی رہی تا آنکہ پورا جزیرہ نمائے عرب اس کے اقتدارِ اعلیٰ اور حاکمیت کے دائرہ میں سمٹ کر آ گیا۔ مکی اور دوسرے مسلمانوں کے خلوص و عقیدت، عزمت و صلابت، قربانی اور جفاکشی نے اپنوں، غیروں سب کو اسلام کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ کردار و بلندیٔ سیرت، حُسنِ ہدایت و تبلیغ اور اس سے بڑھ کر رحمۃ للعالمین نے ان کو گرویدہ بنایا اور اسلام کی سادگی اور سچائی، صداقت و حقانیت اور جذب و کشش نے سب کو اپنے دائرۂ صدق و صفا میں سمیٹ لیا تھا۔ اسلام ہی دراصل وہ اساسِ اول تھی جس پر پہلے اسلامی معاشرے اور پھر اسلامی ریاست کی بلند و بالا عمارت تعمیر کی گئی تھی۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست مدنی عہدِ نبوی کے دس سال کے قلیل عرصہ میں تشکیل و تنظیم پا گئی تھی مگر یہ حقیقت اولیں و آخریں نگاہوں سے عموماً اوجھل رہ جاتی ہے کہ اس دہ سالہ مدنی دور سے قبل مکہ کی تیرہ برس کی وہ عظیم مدت بھی تھی جس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اولیں پیروؤں ۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں سابقین اولین ۔ نے

اپنے خونِ جگر سے اسلام کی آبیاری کی تھی۔ وہ ابتلا و آزمائش اور امتحان کی سخت گذر گاہوں سے گزرے تھے تب یہاں تک پہونچے تھے۔ مکی دورِ حیات کے ان سخت تیرہ برسوں میں خدائے واحد کے ایک اور تنہا برگزیدہ بندے نے ایک ایک گھر ایک ایک در کو کھٹکھٹایا تھا۔ ایک ایک کر کے سب کو بلایا اور اکٹھا کیا تھا تب چند ماننے والے بنے تھے۔ ان گنتی کے ماننے والوں نے جب اپنا خونِ جگر، اپنے محبوب و محترم رسول کے خونِ جگر میں شامل کر دیا تھا تب ایک جماعت، ایک چھوٹی سی جماعت بنی تھی۔ اس چھوٹی سی جماعت کے سر سے جب جوتے خون گزر گئی، ان میں سے بعض کے سینے تلواروں اور نیزوں سے چھلنی ہو گئے، آنکھیں لوہے کی انیوں سے بے نور ہو گئیں، پشت دہکتے انگاروں سے داغ داغ ہو گئی، جسم تپتے پتھروں اور جھلستی ریت سے آبلہ آگیں بن گئے۔ پتھروں کی مار سے چوٹی کا خون پاؤں کی جوتی میں بھر بھر گیا تب مکہ کی سنگلاخ و سنگین سرزمین میں اسلام کی کونپل پھوٹی اور خدا کے دین کا پودا پھلا پھولا تھا۔ پھر جیتے جاگتے خون سے سینچے گئے اس پودے کی نشو و نما قابلِ دید تھی۔ صرف مکہ کی تپتی اور سیاسی چٹانیں صدیوں کے بعد ٹھنڈے سائے سے لطف اندوز نہیں ہوئی تھیں بلکہ اس کی شاخیں اتنی وسیع ہو گئیں کہ جزیرہ نمائے عرب کے گوشے گوشے اور چپے چپے پر ان کا سایۂ رحمت و رافت پھیل گیا اور عرب کے تمام تپیدہ باشندوں نے اس کے تلے چین و سکون کا سانس لیا تھا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام پہلے پہل مکہ کے باسیوں خاص کر قریش کے مختلف خاندانوں میں پھیلا تھا ہمارے بعض جدید مؤرخین اور سیرت نگاروں نے یہ غلط فہمی پیدا کر دی ہے کہ قریش کے بعض قبائل یا خاندانوں نے اسلام کی مخالفت سب سے زیادہ کی تھی۔ عہدِ جدید میں برصغیر پاک و ہند کے عظیم ترین سیرت نگار و مؤرخِ اسلام مولانا شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو خاندانِ بنو امیہ اپنے رقیب (بنو ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔ بدر کے سوا باقی تمام لڑائیاں ابو سفیان ہی نے برپا کیں اور وہی ان لڑائیوں میں رئیسِ لشکر رہا۔"(۱) یہ اور اسی قسم کے دوسرے بیانات تاریخ کی کسوٹی پر کھرے نہیں اترتے۔ نہ بنو امیہ اور بنو ہاشم میں اس وقت تک کوئی رقابت تھی، نہ خاندانِ بنو امیہ رسالتِ محمدی کو اپنے مفروضہ رقیب بنو ہاشم کی فتح خیال کرتا تھا اور نہ بنو امیہ نے اسلام کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی اور نہ ہی ابو سفیان بن حرب اموی نے کسی قبائلی عصبیت یا خاندانی رقابت یا ذاتی عداوت کے سبب اسلام کے خلاف جنگیں برپا کی تھیں(۲)۔ عموماً حقیقت نگاہوں سے اوجھل رہ جاتی ہے کہ اسلام کی مخالفت یا محبت دونوں ہی قبائلی خطوط پر نہیں ہوئی تھیں اور نہ ہی اس کی مخالفت اور چاہت میں قبائلی یا خاندانی تعصب کو دخل رہا۔ اسلام کی جس نے بھی مخالفت کی تھی اس نے خدا اور رسول کی دشمنی میں کی تھی اور جس نے بھی اسے قبول و منظور کیا تھا اس نے خدا اور رسول کی محبت میں کیا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ مخالفین نے اپنی انفرادی حیثیت میں گروہی یا جماعتی یا قبائلی عصبیت سے بھی کام لیا ہو بالکل اسی طرح جس طرح کہ بعض عرب قبائل نے گروہی تعصب، قبائلی عصبیت اور جاہلی حمیت کی بنا پر اسلام یا ست کی مخالفت کی تھی لیکن اسلام کی محبت اور دشمنی میں قبائلِ عرب عام طور سے اور قبائلِ قریش خاص طور سے بجائے خود

منقسم تھے۔ چونکہ اسلام کا آغاز قریش مکہ کے درمیان ہوا تھا اور وہی اسلام کے علمبرداروں (اور مخالفوں میں بھی) سرِ فہرست تھے۔[۳] رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمنواؤں میں سابقین اولین اور اسلامی ریاست کے بانیوں میں ممتاز و نمایاں ترین تھے اس لیے اسلام کی قبائلِ عرب کے درمیان اشاعت کا مطالعہ انہی سے شروع کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اور یہی تاریخی ترتیب واقعات یا تقویت کا بھی تقاضا ہے

قریشِ مکہ

اولین مسلم یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہاشمی کے بعد جن چار مکیوں نے اسلام قبول کیا ان میں حضرت خدیجہ بنت خویلد کا تعلق قریش کے خاندان بنی اسد سے، حضرت ابو بکر عبداللہ بن ابی قحافہ عثمان کا بنو تیم سے، حضرت علی ابن ابی طالب کا بنو ہاشم سے اور حضرت زید بن حارثہ کا نسلاً بنو کلب سے مگر عملاً بنو ہاشم سے تھا۔[۴] یہ وہ سابقین اولین تھے جو اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سب سے پہلے بے بہا اور گرانقدر جاہر تھے اور بلا کسی کد و کاوش کے پہلے اسلام کے پیرو اور پھر اس کے اولین داعی بنے تھے۔ ان کے سوا قریش کے تمام افراد، خاندانوں اور قبیلوں نے اسلام کی دعوت کو قبول کرنے میں لیس و پیش کیا تھا یا اس کو قبول کرنے سے سرے سے انکار کر دیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو پہلے پہل بنو عبدالمطلب بن ہاشم نے اس طرح ٹھکرا دیا تھا[۵] جس طرح کوہِ صفا پر آپ کے اعلانِ حق کو دوسرے قبائلِ قریش نے۔[۶] اگر کوئی قبائلی یا خاندانی عصبیت تھی جس نے اسلام کی مخالفت کی تھی تو وہ ان تمام قبائلِ قریشِ مکہ کی یکساں مخالفت و عداوت تھی۔ اس میں کسی کو کسی پر نہ امتیاز حاصل تھا اور نہ ہی ان کے بیچ کوئی تفریق تھی۔ گروہوں، خاندانوں اور قبیلوں نے بحیثیت مجموعی مختلف اسباب و عوامل سے دعوتِ اسلامی مسترد ضرور کر دی مگر انہی کے افراد اسلام کے سحرِ حلال کے اثر سے نہ بچ سکے اور رفتہ رفتہ اس کے حلقہ بگوش بنتے گئے۔

مکہ کے اولین مسلمانوں کے درمیان قبولِ اسلام میں سبقت کے لحاظ سے کس کو شرفِ عظمت و افتخار دیا جانا چاہیے اس مسئلے پر ہمارے قدیم و جدید دونوں مؤرخین اور اہلِ سیر کا اختلاف ہے۔ ہماری قدیم روایات میں سے بعض یہ شرف حضرت خدیجہ کو، بعض حضرت ابو بکر کو، بعض حضرت زید بن حارثہ کو اور بعض حضرت علی بن ابی طالب کو دیتی ہیں۔[۷] قدیم و جدید دونوں مورخین نے اپنے اپنے مذہبی رجحانات اور شخصی میلانات کے سبب ان میں سے بعض کو دوسرے پر ترجیح دی ہے جبکہ بعض صلح جو اور تطبیق پسند طبقوں نے بیچ کی راہ نکالی ہے کہ ان چاروں سابقینِ اولین کو اپنے اپنے طبقہ کا پہلا مسلمان تسلیم کر لیا ہے۔[۸] مستشرقین نے بھی اس پر اکثر کلام کیا ہے اور عہدِ جدید کے نامور مورخ مونٹگمری واٹ نے ان میں سے حضرت خدیجہ کو بلا شک و شبہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلا مسلم گردانا ہے اور ان کے بعد حضرت زید بن حارثہ کو۔ اگرچہ وہ حضرات علی اور ابو بکر کے اسلام کو بھی ایک لحاظ سے قدیم ترین اعلانِ حق تسلیم کرنے کو تیار ہیں تاہم وہ اول الذکر کے اسلام کو اہمیت کے ان کی صغر سنی کے سبب قائل نہیں ہیں اور موخر الذکر کے بارے میں ان کا



خیال ہے کہ بعد کے زمانے میں ان کی عظمت کا پرتو ان کے ابتدائی عہد پر پڑا ہے اور ان کی اولیت اسلام کی دعویدار روایات اسی کی مظہر ہیں۔ بہرحال وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اپنے سماجی اعتبارات اور تبلیغی اثرات کے لحاظ سے حضرت ابوبکر کا اسلام اہم ترین اور دوررس نتائج کا حامل تھا۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے اور اس کا اعتراف کرنا چاہیے۔(۹)

جہاں تک سبقتِ اسلام میں عددی ترتیب یا حساب و ریاضی کے اصولِ ترتیب کا تعلق ہے اس کا سرِدست ہمارے اس مباحثے سے تعلق نہیں ہے کہ وہ سیرت نگارِ رسول کا کام ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ تاریخی لحاظ سے حضرت ابوبکر کے اسلام کو جو اہمیت حاصل تھی وہ مذکورہ بالا بزرگوں میں سے کسی کو حاصل نہیں تھی۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر اسلام کے سب سے بڑے، سب سے زیادہ پرجوش اور عظیم ترین داعی تھے۔ ان کے سماجی اور سیاسی مرتبے، وسیع تجارتی تعلقات اور ہمہ گیر تہذیبی اور معاشرتی اثرات نے مکہ میں اسلام پھیلانے اور قریش کے نوجوانوں کو مسلمان بنانے میں سب سے بڑا کردار ادا کیا تھا۔(۱۰) اس لیے مآخذ کے اس بیان میں کہ حضرت ابوبکر کی دعوت پر حضرات عثمان بن عفان اموی، زبیر بن عوام اسدی، عبدالرحمٰن بن عوف زہری، سعد بن ابی وقاص زہری اور طلحہ بن عبیداللہ تیمی ایمان لائے تھے اور پہلے آٹھ مسلمانوں میں تھے،(۱۱) کذب و افترا کا ذرا سا بھی عنصر نہیں ہے۔ ان مسلمانوں کی سبقتِ اسلام کو محض اس لیے نہیں مسترد کیا جا سکتا یا مشتبہ سمجھا جا سکتا کہ وہ بعد کے زمانے میں امت کے عظیم ترین افراد اور شہادتِ عمر کے وقت ریاستِ اسلامی کے عظیم ترین قائدین میں تھے۔(۱۲) ممکن ہے کہ ان میں سب کو یا بعض کو ترتیبِ ریاضی کے لحاظ سے دوسرے سابقین پر سبقت کی فضیلت نہ حاصل رہی ہو جیسا کہ حضرات عثمان بن مظعون جمحی، خالد بن سعید اموی، ابوذر غفاری اور عمرو بن عبسہ ازدی وغیرہ کے دعوائے اولیت اور ترتیبِ سبقت سے معلوم ہوتا ہے لیکن محض ان متاخر الذکر بزرگوں یا ان کی جانب سے مؤرخین کے دعووں کی بنا پر مذکورہ بالا آٹھ سابقینِ اولین کی سبقتِ اسلام سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مثال کافی ہوگی حضرت ابوذر غفاری کے بارے میں مآخذ کا اتفاق ہے کہ وہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور و بعثت اور اسلام کا شہرہ سن کر اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے اور پھر اپنے بھائی کے ذریعہ اس کی تصدیق کی تھی اور جب ان کی روداد سے مطمئن نہیں ہوئے تو خود مکہ آ گئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم دارِ ارقم میں قیام فرما چکے تھے اور مکہ میں مسلمانوں پر قریش کی مخالفت کی دہشت سوار تھی۔(۱۳) مآخذ کے مطابق دارِ ارقم میں قیامِ نبوی کا آغاز ۴ھ نبوی / ۶۱۴ء سے ہوا تھا جو غالباً اسلامِ عمر کے زمانے ۶ھ نبوی / ۶۱۶ء تک جاری رہا تھا۔ اس وقت تک متعدد مکی مسلمان ہو چکے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری اسی مدت کے دوران کسی وقت اسلام لائے تھے لہٰذا ان کو وہ سبقتِ اسلام حاصل نہ تھی جیسا کہ ان کی جانب سے مؤرخین کا دعویٰ ملتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اسلام میں سبقتِ اسلام کی اہمیت ضرور ہے لیکن محض اس کی بنا پر طبقۂ اشراف (NOBILITY) میں شمولیت نہیں حاصل ہو جاتی۔ اس کی درخشاں مثال حضرت عمر بن خطاب کا اسلام ہے۔ حسابی ترتیب کے مطابق صحابی موصوف کا پچاس مسلمانوں کے بعد نمبر آتا ہے(۱۴) لیکن تاریخِ اسلام کا کوئی دیانتدار طالب علم ان کی فضیلت و اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ بہرحال، اصولِ ریاضی کی ترتیبِ حسابی کی مؤرخین کے

نزدیک یا ماخذ تاریخ اسلامی میں اہمیت ہو نہ ہو اس کی تاریخ اسلام یا مذہب اسلام میں جہاں تک مکی عہد کے مسلمانوں کی ترتیب کا تعلق ہے زیادہ اہمیت نہیں ہے کیوں کہ قرآن کریم سابقین اولین کے معاملے میں اس کی کوئی رو رعایت نہیں کرتا اور نہ ان کے درمیان کوئی خطِ تفریق کھینچتا ہے[۱۵]۔ عملی لحاظ سے دار ارقم میں قیامِ نبوی سے ماقبل اور مابعد زمانے کی بھی کوئی خاص تخصیص نہیں ہے۔ ثواب و اجرِ اخروی کی بات اور ہے لیکن اس دنیا میں اس کی تفریق نہ تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روا رکھی تھی اور نہ اسلام کے صدرِ اول میں اس کی کوئی زیادہ اہمیت گردانی گئی۔

بہرحال تمام مکی مسلمانوں کی بلا لحاظ ترتیبِ حسابی یکساں اہمیت تھی اور ان میں سے ہر ایک کو ایک سا شرفِ سبقت اور شرفِ صحبت حاصل تھا کیوں کہ قرآنِ کریم ہجرتِ مدینہ کو خطِ تفریق و امتیاز قرار دیتا ہے[۱۶]۔ ابنِ اسحاق اور ابنِ سعد نے جن مکی مسلمانوں کو قدیم الاسلام کہا اور اولین مسلموں میں شمار کیا ہے وہ بلا ریب صحیح ہے اور ان میں حسابی ترتیب تلاش کرنا بے سود ہے۔ ابنِ اسحاق نے مذکورہ بالا آٹھ نو سابقین اولین کے ذکر کے بعد مزید چھیالیس[۴۶] قدیم مسلمانوں کی فہرست دی ہے ان کا تعلق قریش کے مختلف خاندانوں سے تھا۔ ان میں قریشی بھی تھے اور ان کے قبائلِ غربہ کے متعدد حلفاء اور موالی بھی ان سابقین اولین کے ایک تحلیلی مطالعہ سے یہ بات پایۂ ثبوت و اعتبار کو پہنچتی ہے کہ اسلام کی اشاعت قبائلی یا خاندانی خطوط پر نہیں ہوئی تھی اور نہ اس میں قبائلی رقابت اور خاندانی عصبیت نے کوئی حصہ لیا تھا یا رکاوٹ ڈالی تھی۔ یہ دلچسپ کی بات ہے کہ اس مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قریش کے متعدد سربرآوردہ خاندانوں کے افراد کس طرح اسلام کے حلقہ بگوش بنے تھے۔ ذیل میں ابنِ اسحاق کی ترتیب کے مطابق[۱۷]، جو کوئی تاریخی یا حسابی ترتیب نہیں ہے۔ ان سابقینِ اولین کے قبولِ اسلام کا مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے

۱۔ بنو حارث بن فہر سے : حضرت ابو عبیدہ بن جراح

۲۔ بنو مخزوم سے : حضرات ابو سلمہ بن ابو الاسد، ارقم بن ابی ارقم، عیاش بن ابی ربیعہ اور ان کی زوجہ، محترمہ سلامہ تمیمی اور اس خاندان کے مذحجی حلیف عمار بن یاسر عنسی

۳۔ بنو جمح سے : حضرات عثمان بن مظعون، ان کے دو بھائی قدامہ اور عبد اللہ اور ایک فرزند سائب بن عثمان حاطب بن حارث اور ان کی اہلیہ فاطمہ بنتِ مجلل، حطاب بن حارث اور ان کی اہلیہ فکیہہ بن یسار اور حاطب و خطاب کے تیسرے بھائی معمر بن حارث۔

۴۔ بنو المطلب سے : حضرت عبیدہ بن حارث

۵۔ بنو عدی سے : حضرات سعید بن زید اور ان کی اہلیہ فاطمہ بنتِ خطاب، نعیم بن عبد اللہ النحام اور خاندانِ بنو عدی کے حلفاء، عامر بن ربیعہ عنزی، واقد بن عبد اللہ تمیمی اور بنو بکیر/ بنو بکر بن عبد مناۃ / کنانہ کے خالد، عامر عاقل اور ایاس۔

۶۔ بنو تیم سے : حضرات اسماء بنت ابی بکر اور ان کی بہن عائشہ، خاندانِ صدیق کے مولیٰ عامر بن فہیرہ اور ان کے

حلیف صہیب بن سنان (بنو نمر بن قاسط)

۷۔ بنو زہرہ سے: حضرات عمیر بن ابی وقاص، مطلب بن ازہر اور ان کی اہلیہ رملہ بنت عوف، اور بنو زہرہ کے حلفاء عبداللہ بن مسعود ہذلی، مسعود القاری اور موخر الذکر مولیٰ حضرت خباب بن ارت تمیمی۔

۸۔ بنو عامر بن لوی سے: حضرات سلیط بن عمرو بن عبد شمس اور ان کے برادر حاطب بن عمرو۔

۹۔ بنو سہم سے: حضرت خنیس بن حذافہ

۱۰۔ بنو امیہ سے: حضرات خالد بن سعید بن عاص اور ان کی اہلیہ امینہ بنت خلف خزاعی، ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ اور بنو امیہ کے حلفاء عبداللہ بن جحش اور ان کے بھائی ابو احمد (اسد/خزیمہ)

۱۱۔ بنو ہاشم سے: حضرات جعفر بن ابی طالب اور ان کی بیوی اسماء بنت عمیس خثعمی

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اس زمانے میں مکہ کے لوگوں کی خاصی بڑی تعداد نے جن میں مرد و عورت دونوں شامل تھے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا اور شہر خدا میں اسلام کی اتنی شہرت ہوگئی تھی کہ ہر خاص و عام کی زبان پر اس کا ذکر ہونے لگا تھا۔[۱۸] مکی مسلمانوں کی یہ تعداد اسلام کی خفیہ تبلیغ کے زمانے کی تھی جو بعثت نبوی کے پہلے تین برسوں کی مدت تھی۔ گویا ۶۱۰ء اور ۶۱۳ء کے دوران لگ بھگ سو مکی مسلمان ہو چکے تھے۔ اس کے بعد اسلام کی علانیہ تبلیغ کا زمانہ شروع ہوا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ابن اسحاق نے ان ضعفاء المسلمین (کمزور مسلمانوں) کے زمانہ قبول اسلام کا کسی زمانہ میں ذکر نہیں کیا ہے جن کے بارے میں عام شہرت یہ ہے کہ وہی اسلام کے اولین پیرو تھے بلکہ اکثر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مذہب کو پہلے ماننے والے ہمیشہ کمزور لوگ ہوتے ہیں۔[۱۹] بہر حال اگرچہ ابن اسحاق کی فہرست مسلمین قدیم میں حضرات خباب بن ارت تمیمی، عبداللہ بن مسعود ہذلی اور عمار بن یاسر مذحجی کا ذکر آگیا ہے تاہم ثانی الذکر کے بھائی عتبہ اور موخر الذکر کے والدین یاسر اور سمیہ کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح موذن رسول حضرت بلال حبشی کے زمانہ اسلام کی صراحت نہیں کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے ضعفاء مسلمین جیسے حضرات ابو فکیہہ، لبینہ، زنیرہ، نہدیہ اور ام عبیس وغیرہ کے قدیم الاسلام ہونے کا تو ذکر عموماً ماخذ میں ملتا ہے لیکن ان کے قبول اسلام کے زمانے کی تعیین نہیں ملتی۔[۲۰] تمام حقائق اور شواہد بہر حال اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا تمام کمزور مسلمانوں نے بھی اسلام کی خفیہ تبلیغ کے زمانے میں ہی اسلام قبول کیا تھا۔ عام طور سے ان کمزور مسلمانوں کے قدیم الاسلام ہونے کا ذکر قریش مکہ کے ہاتھوں مسلمانوں کی تعذیب کے بیان میں ملتا ہے[۲۱] جو ۶۱۳ء اور ۶۱۵ء کی درمیانی مدت میں اپنے عروج پر تھی۔ یہ مسلمانوں کی آزمائش و ابتلا کا سخت ترین دور تھا مگر ساتھ ہی مسلمانوں کے تپ کر کندن بننے کا بھی۔

حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی اور حضرت عمر بن خطاب عدوی کا زمانہ قبول اسلام عموماً ۶ نبوی/۶۱۶ء بتایا جاتا ہے جو خفیہ اور علانیہ تبلیغ کے زمانے کا ایک طرح سے سنگم ہے۔ حضرت حمزہ کے بارے میں عموماً وضاحت نہیں ملتی کہ وہ کتنے مسلمانوں کے بعد اسلام لائے تھے۔ البتہ یہ بیان ملتا ہے کہ انھوں نے دار ارقم میں قیام نبوی کے زمانے میں ۶ نبوی میں اسلام قبول کیا تھا۔ غالباً اس وقت تک مکی مسلمانوں کی تعداد تیس چالیس سے اوپر ہو چکی تھی۔[۲۲] ان کے قبول اسلام کے وقت

مسلمانوں کی یکجا تعداد کا صریح ذکر نہیں ملتا لیکن حضرت عمرؓ کے بارے میں روایات شاہد ہیں کہ وہ چالیس مردوں اور دس عورتوں کے بعد اسلام لاتے تھے[۲۳] اور ان کا زمانہ قبولِ اسلام غالباً دارِ ارقم میں قیامِ نبوی کا آخری دن تھا۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اولین داعیوں نے علانیہ تبلیغ شروع کر دی تھی۔ مذکورہ بالا قدیم مسلمانوں کی اگر اتنی ہی تعداد تھی جتنی کہ ابنِ اسحاق نے بتائی ہے تو حضرت عمرؓ کے اسلام کی ترتیب حسابی سے متصادم نظر آتی ہے۔ بہر حال ماخذ کا یہ بیان صحیح معلوم ہوتا ہے کہ پہلی ہجرت حبشہ کے بعد حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا تھا۔ ممکن ہے ان کا نمبر پچاسواں یا اکیاونواں نہ رہا ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے اسلام کے بعد مکی مسلمانوں کو ایک احساسِ توقیر و تحفظ ہوا تھا اور اسلام کو ان کے سبب قوت و شوکت نصیب ہوئی تھی۔ اسلام کی تاریخ اشاعت و تبلیغ میں یہ ایک اہم سنگِ میل تھا جب مسلمانانِ مکہ نے خوف و ہراس کی بجائے پہلی بار ایک مضبوط و مستحکم امت کا احساس کیا تھا۔

ماخذ کے مطابق پہلی ہجرت حبشہ ۵ نبوی/ ۶۱۵ء میں مکہ کے گیارہ مسلمان مردوں اور چار عورتوں نے پہلی بار خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا تھا اور وہ باجماعت حبشہ گئے تھے۔[۲۴] اس کے ایک سال بعد ۶ نبوی/ ۶۱۶ء میں حبشہ کو دوسری ہجرت ہوئی جس میں ۸۳ یا ۸۶ مکی مسلمانوں نے ہجرت کی تھی۔ ابنِ اسحاق کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری ہجرتِ حبشہ نہ تو پہلی ہجرت کے مکمل ایک سال بعد ہوئی تھی اور نہ ہی باجماعت بلکہ پہلی ہجرت کے بعد سے مسلسل اکا دکا کرکے مکی مسلمان جاتے رہے تا آنکہ ان کی تعداد دوبارہ ہجرت میں ۸۳ یا ۸۶ ہو گئی۔ ابنِ اسحاق نے اس ضمن میں ایک اہم نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ مذکورہ بالا تعداد مہاجرینِ مکہ کے بالغ مردوں اور عورتوں کی تھی اور ان میں چھوٹی عمر کے بچے شامل نہیں تھے جو اپنے والدین یا دوسرے بزرگوں کے ساتھ گئے تھے۔[۲۵] اس طرح سے یہ تعدادِ مہاجرین مجموعی طور سے کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ ایک موٹے سے اندازے کے مطابق دو تین سو مسلمانوں نے ۶۱۶ء تک حبشہ میں پناہ لے لی تھی۔ ماخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ مہاجرینِ حبشہ کے ترکِ وطن کے بعد بھی مکہ میں مسلمانوں کی معتد بہ تعداد موجود تھی جو گوناگوں اسباب سے ہجرت نہیں کر سکے تھے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مکہ میں وہی مسلمان باقی رہ گئے تھے جن کو اپنے خاندانوں کا یا کسی اور طرح کا قبائلی تحفظ (جوار) حاصل تھا اور ہجرتِ حبشہ پر وہ لوگ مجبور ہوئے تھے جو اس قبائلی تحفظ سے محروم ہو گئے تھے اور ان کے اپنے خاندانوں نے ان کو چھوڑ دیا تھا۔[۲۶] بہر حال ہجرتِ حبشہ ثانیہ کے بعد مکہ میں باقی رہ جانے والوں میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہلِ بیتِ اطہر کے علاوہ متعدد قریشی سربرآوردہ خاندانوں کے افراد جیسے حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ، عبداللہؓ النحام وغیرہ بھی تھے[۲۷] اور حضرات بلال، زنیرہ، نہدیہ اور ام عبیس جیسے ضعفاء مسلمین بھی۔ یہ کمزور مسلمان اپنی ذاتی مجبوریوں کے سبب ترکِ وطن بھی نہیں کر سکتے تھے۔[۲۸]

مکی دورِ حیاتِ نبوی کے نصفِ اول کے خاتمہ پر مسلمانانِ مکہ کی کتنی تعداد تھی؟ اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں ہے خصوصاً اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ ہمارے پاس اس زمانے کے مکہ کی آبادی کے اعداد و شمار نہیں ہیں تاہم ایک موٹے سے تخمینہ کی بنیاد پر ان کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر ۶۱۶ء کے اواخر میں بالغ مکی مسلمانوں

کی تعداد بشمول مہاجرین حبشہ دو سو بھی فرض کر لی جائے جو اس زمانے میں یقینی طور پر تھی اور ہر بالغ کے ماتحت ارکان خاندان یعنی بیوی، بچوں، غلام و نوکر اور دوسرے ماتحت افراد کی تعداد فی کس ۵ یا ۶ بھی مان لی جائے تو مکہ کے مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔ بالغ مسلمانانِ مکہ میں سے کچھ کو اگر تنہا بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ تعداد کسی طرح سات آٹھ سو سے کم نہیں معلوم ہوتی اس خیال کے ثبوت میں چند مثالوں کی ضرورت ہے

ہم پہلی مثال خود خاندانِ رسالت مآب سے لیتے ہیں۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بعثت تک کئی بچوں اور بچیوں کے والد ماجد بن چکے تھے۔ اگرچہ آپ کی اولادِ نرینہ زیادہ دنوں تک بقیدِ حیات نہیں رہی تاہم آپ کی دخترانِ گرامی چار تھیں جو ہجرت کے بعد تک زندہ رہیں۔[۲۹] اس طرح مکی عہد میں ۹ سنہ نبوی / ۶۱۹ء تک آپ کا مقدس گھرانہ بشمول آپ کے کم از کم چھ افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں آپ کے موالی، غلام یا گھریلو یا تجارت کے نوکر شامل نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی مآخذ میں مذکور ہیں۔ حضرت زید بن حارثہ جو آپ کے آزاد کردہ غلام اور متبنیٰ تھے آپ کے گھرانے کے ہی ایک فرد تھے۔[۳۰] حضرت زید کا اپنا گھرانہ تھا۔ ان کی اہلیہ حضرت ام ایمن تھیں[۳۱] اور ان کے کم از کم ایک فرزند حضرت اسامہ مکہ میں پیدا ہو چکے تھے اور بوقتِ ہجرت تک بھگ دس برس کے تھے[۳۲] ان کے علاوہ حضرت خدیجہ کے بعض غلاموں اور تجارت میں شامل نوکروں کا ذکر ملتا ہے ان میں حضرت میسرہ کا نام کافی نمایاں ہے۔[۳۳] بعض دوسرے غلامانِ رسول جیسے حضرات ابو رافع،[۳۴] صالح شقران،[۳۵] رافع،[۳۶] ابو کبشہ،[۳۷] انسہ وغیرہ[۳۸] کا بھی ذکر ملتا ہے جو مکی عہد میں خاندانِ رسول سے وابستہ تھے اور ہجرت کر کے مدینہ گئے تھے۔ اس طرح محض خاندانِ رسول کے مسلمانوں کی تعداد کم از کم پندرہ تھی۔

دوسری مثال حضرت ابو بکر صدیق کی ہے۔ عام طور سے ان کے خاندان کے مسلمانوں میں ان کی دو صاحبزادیوں حضرات اسماء اور عائشہ[۳۹] اور ان کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ[۴۰] کا ذکر کیا جاتا ہے۔ گویا کہ خاندانِ صدیقی میں محض چار افراد مکی مسلمان تھے حالانکہ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ مورخین سے کم از کم چار مزید ارکانِ خاندان صدیقی یعنی حضرت ابو بکر کی والدہ ماجدہ ام الخیر[۴۱] زوجہ محترمہ حضرت ام رومان[۴۲]، ایک نوجوان صاحبزادے حضرت عبداللہ[۴۳] اور موخر الذکر کی اہلیہ حضرت عاتکہ بنت زید تیمی[۴۴] کو مسلمانانِ مکہ میں شامل نہیں کیا ہے۔ ہمارے جدید عہد کے مستشرقین جو اپنی وسعتِ نظر، خوبیٔ نظر، خوبیٔ تحقیق اور ہمہ گیر نظر کے لیے شہرتِ عام رکھتے ہیں۔ ان ناموں کو یا اسی طرح اور مکی مسلمانوں کے ناموں کو اپنی فہرستوں میں نہیں شامل کر سکے ہیں۔[۴۵] بہر حال ان آٹھ ارکان کے علاوہ یہ یقینی بات ہے کہ خاندانِ صدیقی میں کچھ اور رکن بھی مسلمان تھے یا کم از کم ان کے موالی اور حلیف اور غلام اسلام قبول کر چکے تھے۔ ایک موٹے سے اندازے کے مطابق خاندانِ صدیقی کے کل مکی مسلمانوں کی تعداد دس بارہ سے کسی طور کم نہیں تھی۔

حضرت عمر فاروق کے خاندان کے مکی مسلمانوں میں صرف ان کا اور ان کے نابالغ فرزند حضرت عبداللہ بن عمر کا ذکر کیا جاتا ہے[۴۶] حالانکہ یہ حقیقت سبھی جانتے ہیں کہ ان کی ایک صاحبزادی حضرت حفصہ بھی مکی مسلمان تھیں۔[۴۷] ان دونوں فاروقی اولادوں کے علاوہ جو کافی مشہور

ہی حضرت عمر کے ایک اور صاحبزادے عبدالرحمٰن اکبر بھی تھے جو ان دونوں مذکورہ بالا کے حقیقی بھائی تھے اور ابتدائی مسلم تھے۔ ان کی والدہ ماجدہ جو حضرت عثمان بن مظعون جمحی کی بہن تھیں بھی ایک قدیم مکی مسلم تھیں۔ حضرت عمر کی کم از کم ایک بہن حضرت فاطمہ بنت خطاب اور ایک بھائی حضرت زید بن خطاب تو قدیم تر مسلم تھے۔[۴۹] ان دونوں بھائی بہنوں کے اپنے اپنے خاندان تھے۔ حضرت فاطمہ کے شوہر سعید بن زید مسلمان تھے اور ان دونوں کی کئی اولادیں مکہ میں پیدا ہو چکی تھیں۔[۵۰] حضرت زید بن خطاب کی اہلیہ اور ان کے کم از کم دو لڑکے لڑکی بھی مسلم تھے۔[۵۱] ان کے علاوہ حضرت عمر کی ایک اور بیوی بھی اسی مکی عہد میں مسلمان ہو گئی تھیں۔[۵۲] ان کے ایک غلام حضرت مہجع اولیں مسلمانوں میں شامل تھے اور بعد میں وہ بدر میں شہید ہوئے۔[۵۳] اس طرح صرف خاندانِ فاروقی سات آٹھ نفوس پر مشتمل تھا اور اس کا قوی امکان ہے کہ ان کے بعض دوسرے فرزندوں اور دختروں کے علاوہ ان کے بعض غلام اور موالی بھی مسلمان رہے ہوں۔ ان کے بعض مسلمان حلیفوں اور ان کے خاندانوں کے بارے میں بھی تفصیلات ملتی ہیں جن سے ان کے مکی عہد کے مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان تین اہم گھرانوں کے علاوہ مختصراً بعض دوسرے قریشی گھرانوں کے مسلمانوں کی تعداد کا بھی حوالہ دیا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ تفصیلات ذرا دیر بعد قریش مکہ کے مختلف بطون کے مسلمانوں کے مطالعہ کے ضمن میں دیکھیں گے۔ بنو مطلب کے حضرت عبیدہ بن حارث کا اپنا گھرانہ کم از کم بارہ افراد پر مشتمل تھا۔[۵۴] حضرت عثمان بن مظعون جمحی کا گھرانہ بھی اسی طرح دس بارہ مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ اسی طرح حارث بن قیس سہمی کے فرزندوں میں سے تقریباً دس ابتدائی مسلمان تھے۔[۵۵] ظاہر ہے کہ ان فرزندوں کی ازواج و اولاد بھی تھی اور وہ تقریباً سب مسلمان تھی۔ اس طرح ان کے مسلمانوں کی تعداد کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

قریشی خاندان کے اصل اراکین کے علاوہ ان کے خاص حلیفوں کے خاندانوں کے مطالعہ سے ہمارے خیال کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ بنو غنم بن دودان جو قریشی خاندان کے حلیف تھے سب کے سب مکی عہد میں مسلمان ہو گئے تھے۔ ابن اسحاق نے ان کے بیس مردوں اور آٹھ / نو عورتوں کے نام اپنی فہرست مہاجرینِ مدینہ میں گنائے ہیں اور ان کو مکی عہد کا قدیم مسلم قرار دیا ہے۔ ابن سعد اور ابن حزم اندلسی کی روایت سے نہ صرف اس کی تائید ہوتی ہے بلکہ یہ مزید معلوم ہوتا ہے کہ صرف ان کے بالغ مردوں اور عورتوں کی تعداد چالیس تھی۔ ان کے مردوں میں سے چند کو چھوڑ کر سب نے جنگِ بدر اور احد میں حصہ لیا تھا۔[۵۶] بہرحال قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کے بچوں اور غلاموں اور موالی کی تعداد کیا رہی ہوگی؟ ایک تخمینے کے مطابق یہ تعداد کم از کم دو سو افراد صغیر و کبیر پر مشتمل معلوم ہوتی ہے۔ مونٹگمری واٹ اور ان کے پیش رو لیون کیتانی نے ان کے صرف انیس مردوں کے نام ہی اپنی فہرستوں میں گنائے ہیں۔[۵۷] حیرت اور عبرت کا مقام ہے کہ ہمارے روشن فکر اور روشن خیال مستشرقین نے تمام مسلمان عورتوں کو اپنی فہرستوں سے خارج کر دیا ہے۔ اور اس طرح بڑی ہوشیاری، سمجھداری بلکہ عیاری سے مکی مسلمانوں کی تعداد کو کم کر کے دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح سعد بن لیث / کنانہ کے ایک قریشی حلیف خاندانِ بنو بکیر کے کل مرد و عورت مسلمانوں کی تعداد خاصی تھی جب کہ ان کے محض چار پانچ مردوں کو عام طور سے شمار کیا جاتا ہے۔[۵۸] اس سے زیادہ حیرت انگیز معاملہ بنو غنی کے ساتھ ہوا ہے جو بنو ہاشم خاص کر حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی کے حلیف تھے۔ عام طور سے ان کے باپ بیٹوں کا مکی مسلمانوں میں ذکر کیا جاتا ہے۔[۵۹] جبکہ یہ ثابت ہے کہ بنو غنی میں صرف یہی حضرات مکی مسلمانوں میں نہیں شامل تھے۔ ان کے افراد کا کوئی حتمی یا ظنی تعین کے

بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے خاندان کے مسلمانوں کی تعداد بلا ریب اس سے کہیں زیادہ تھی جتنی کہ بتائی جاتی ہے۔[۶۰]

ان متعدد حتمی مثالوں سے یہ دعویٰ دلیل کو پہنچتا ہے کہ فی بالغ مرد کم از کم چھ سات اس کے ماتحت اراکین کو بھی مکی مسلمانوں میں شمار کرنا چاہئے۔ یہ نتیجہ ایک عام اوسط کی بنا پر نکلتا ہے۔ آبادی کے اعداد و شمار کی غیر موجودگی میں یہ اوسط حقیقت اور قیاس کے قرین ہے اور ابتدائی عہد کے مسلمانوں کی کوئی فہرست بھی بناتے وقت اس کا لحاظ رکھنا لازمی ہے۔

عام تاثر یہ ہے کہ مکی عہد کے نصف آخر میں ہجرت حبشہ یا اسلام عمرؓ کے بعد مکہ میں اسلام کی اشاعت رک گئی تھی اور ۶۱۶ء اور ۶۲۲ء کے درمیان شہر خدا نہ صرف بنجر ہو گیا تھا بلکہ اس میں قبولِ اسلام کی صلاحیت ہی نہیں رہ گئی تھی۔[۶۱] ماخذ سے بھی یہی تاثر ملتا ہے اور اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ ہمارے قدیم مؤرخین و مستند سیرت نگاروں کی توجہ اس موضوع سے ہٹ گئی اور وہ دوسرے اہم موضوعات جیسے قریش مکہ کے ہاتھوں ابتدائی مسلمانوں خاص کر ضعفا المسلمین کی تعذیب، خاندان بنی ہاشم کے سماجی مقاطعے حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات کے المناک حادثوں، طائف کے غمناک و حسرت ناک سفر نبوی، قبائل عرب کے سامنے تبلیغ اسلام کی کوششوں اور پھر مدینہ منورہ کے اوس و خزرج میں اشاعت اسلام اور ہجرت مدینہ کے موضوعات میں ایسے الجھے کہ اس موضوع پر ان کی نگاہ نہیں رہی تاہم ماخذ میں گنتی کی سہی چند ایسی روایتیں ملتی ہیں جو اس زمانے میں مکہ میں اسلام کی نشر و اشاعت کی طرف واضح اشارہ کرتی ہیں۔

بلاذری کا بیان ہے کہ حضرات عمرؓ و ابو عبیدہ بن جراح اور حمزہ وغیرہ مکہ کے لوگوں میں علانیہ تبلیغ کرتے تھے جبکہ حضرات ابو بکرؓ، عثمانؓ اور سعید بن زید وغیرہ لوگوں کو خفیہ طریقے سے دعوت دیتے تھے۔[۶۲] اگرچہ بلاذری ان پر جوش مبلغوں کی سرگرمیوں کے نتائج کی طرف واضح اشارہ نہیں کرتے تاہم یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہو گا کہ ان کی کوششیں خاصی کامیاب رہی تھیں۔ جدید مؤرخین میں سے بعض کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ بنو عدی، بنو سہم، بنو امیہ اور بنو تیم وغیرہ کے موالی اور حلفاء میں سے بہت سے حضرات اسی زمانے میں اسلام لاتے تھے۔[۶۳] اس کے علاوہ متعدد قریشی خاندانوں کے بہت سے مکی مسلمانوں کے زمانۂ قبولِ اسلام کا تعلق بھی اسی مکی حیاتِ نبوی کے دورِ آخر سے تھا جیسے کہ ابنِ سعد کے مکی مسلمانوں کے سوانحی خاکوں سے علم ہوتا ہے۔[۶۴] اس ضمن میں اس روایت کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا جس کے مطابق حضرت ابو بکرؓ قریشِ مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر حبشہ ہجرت کر جانے کے لیے وطن سے نکلے تھے ہی کہ راستے سے ان کو قبیلۂ قارہ کا سردار ابن الدُّغُنہ اپنی حفاظت و امان میں مکہ واپس لایا۔ امان کی شرط کے مطابق حضرت ابو بکرؓ نے کچھ دنوں تک تو نمازوں میں قرآن کریم کی تلاوت آہستہ آہستہ کی مگر طبیعت کی روانی پر وہ قابو نہیں پا سکے اور زور زور سے تلاوت کرنے لگے۔ رقیق القلب آدمی تھے، خود روتے اور اپنے سننے والوں کو رلاتے۔ پڑوسی کافروں نے ابن الدغنہ سے حضرت ابو بکرؓ کی شکایت کی کہ ان کی تلاوت و گریہ زاری سے ان کے اہلِ خانہ پر اثر پڑتا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے امان واپس کر دی مگر زور سے تلاوت کرنے سے باز نہیں آئے۔ اس روایت میں اگرچہ صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کی مسحور کن تلاوت کلامِ ربانی کا اثر پڑوسی غیر مسلم قریشیوں کے بیوی بچوں پر پڑتا تھا تاہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کفارِ قریش کو شکایت ان کی تلاوت کے سبب ان کے اہلِ خانہ میں تبلیغِ اسلام کے سبب زیادہ تھی۔[۶۵] بہر حال یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ

مکہ میں اسلام کی اشاعت ہجرتِ مدینہ تک برابر جاری رہی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کی رفتار خاصی سست اور پہلے زمانے کے مقابلہ میں کافی کم رہی ہو۔ مکی حیاتِ نبوی کے نصفِ ثانی کے دوران مکہ میں اشاعتِ اسلام کی مثالیں ہم کو قریش کے مختلف بطون (خاندانوں) پر بحث میں ملیں گی۔

مکہ مکرمہ میں تبلیغِ اسلام کا تیسرا دور ہجرتِ نبوی اور صلح حدیبیہ کا درمیانی زمانہ یعنی ۶۲۲ء اور ۶۲۸ء کا چھ سالہ درمیانی عرصہ ہے۔ ہمارا عموماً تاثر اس زمانے کے بارے میں بھی اس سے مختلف نہیں ہے جو مکی دورِ حیات کے نصفِ آخر کے بارے میں ہے۔ یہ تاثر صریح تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ ہجرتِ نبوی کے بعد نہ مکہ مسلمانوں سے تہی ہو گیا تھا اور نہ ہی قبولِ اسلام کی صلاحیت سے عاری۔ مسلمانانِ مکہ کی غالب اکثریت ضرور ہجرت کر گئی تھی لیکن اسلام نے مکہ سے ہجرت نہیں کی تھی۔ جدید مورخین نے ایک غلط فہمی یہ بھی عام کر دی ہے کہ ہجرتِ نبوی سے کچھ پہلے مکہ سے چند مسلمانوں کے سوا اور باقی سب مدینہ چلے گئے تھے۔[۶۶] حالانکہ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج و اولاد مکہ ہی میں رہ گئی تھی۔[۶۷] اسی طرح خاندانِ صدیقی کے تمام مسلم اراکین نے ہجرتِ نبوی کے بعد مدینہ کے لیے رختِ سفر باندھا تھا[۶۸]، حضرات طلحہ و زبیر نے بھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہجرت کی تھی۔[۶۹] اس کے علاوہ متعدد اکابر صحابہ نے بعد میں مدینہ کو ہجرت کی تھی۔[۷۰] یہ تو مہاجرینِ مکہ کا معاملہ تھا۔ مکہ میں باقی ماندہ ابتدائی مسلمانوں میں حضرت نعیم بن عبداللہ النحام تیمی کا پورا گھرانہ تھا جو تقریباً چالیس افراد پر مشتمل تھا اور انھوں نے کافی مدت کے بعد مدینہ کے لیے رختِ سفر باندھا تھا۔[۷۱] ان کے علاوہ مکہ میں اور بھی متعدد اور سربرآوردہ قریشی خاندانوں کے مسلمان ہجرت کے بعد مقیم رہے تھے اور ان کو اپنے خاندان والوں کا تحفظ حاصل تھا۔[۷۲] بہرحال کمزور مسلمانوں کی ثابت قدمی، تعذیب و ایذا پر صبر اور قید و حبس کے اندھیروں میں بھی عزیمت و صلابت نے اگر ایک طرف مکہ میں اسلام کی شمع روشن رکھی تھی تو دوسری طرف مذہبِ خداوندی کی اپنی تاثیر تھی۔ اس کی یہ تاثیر اور دلوں میں گھر کر جانے والی صلاحیت تو ایک تھی مگر اس کو قبول کرنے والوں کے طبائع مختلف تھے۔ قرآنِ کریم کے الفاظ و تشبیہ میں بارش کا پانی تو ایک اور اس کی قوتِ نشو و نما یکساں ہوتی ہے مگر اس کو قبول کرنے والی مٹی کی طبیعت مختلف ہوتی ہے۔ نرم مٹی پانی فوراً جذب کر لیتی ہے۔ سخت مٹی قبول و جذب میں نسبتاً دیر لگاتی ہے اور چٹانیں اور پتھر اسے قبول کرنے سے یکسر انکار کر دیتے ہیں لیکن ان میں سے بھی بعض ایسے ہوتے ہیں جو اگر پانی روک لیں تو آہستہ آہستہ نم ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی اس کے مستقل اثر سے پھٹ بھی جاتے ہیں۔ اسلام کی بھی تاثیر یہی تھی جس نے مکہ کے سخت اور پتھر دلوں میں بھی دراڑیں پیدا کر دی تھیں۔ اس دور میں ایک اور عنصر بھی مکیوں کے قبولِ اسلام کا سبب بنا ہو گا اور وہ تھا قریشِ مکہ اور مسلمانانِ مدینہ کا مسلح تصادم اور مسلسل آویزش، مکہ کے بہت سے سمجھدار لوگوں نے اسلام و کفر کی اس آویزش میں بھی اسلام کی صداقت دیکھی تھی۔ ان میں سے جن لوگوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمتِ عام کا تجربہ کیا تھا وہ بلاتکلف اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے تھے۔ وہب بن عمیر بن امیہ بن خلف جمحی[۷۳] اور ولید بن ولید بن مغیرہ مخزومی[۷۴] کا قبولِ اسلام اس زمانہ کی دو درخشاں مثالیں ہیں۔

صلح حدیبیہ قریش مکہ کے مکمل قبولِ اسلام کا دیباچہ تھی۔ ابن اسحاق وغیرہ قدیم ماخذ نے اس کو تبلیغ اسلام کا اہم ترین زمانہ قرار دیا ہے جب لوگ جوق در جوق اور شوق و ذوق اسلام کی طرف از خود پروانہ وار آتے رہے تھے۔[۷۵] ماخذ کے اس بیان کو عام جزیرہ نمائے عرب کے قبائل کے پس منظر میں تو دیکھنا ہی چاہئیے مگر خاص طور سے اسے قریش کے پس منظر میں بھی دیکھنا ضروری ہے کہ ان کا اصل زور بطونِ قریش کے قبولِ اسلام پر ہے۔ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان دو برس ۶۲۸ء تا ۶۳۰ء کا مختصر وقفہ مکہ میں اشاعت اسلام کا چوتھا اور اہم مرحلہ تھا جب وہاں کا ہر سوچنے سمجھنے والا اور حق کو ماننے والا طبقہ اور فرد اسلام کے دائرے میں داخل ہو چکا تھا۔ ہمارے ماخذ عموماً بعض انتہائی اہم حضرات کے قبولِ اسلام کا ذکر اس زمانے میں کرتے ہیں۔ ابن سعد نے حضرات خالد بن ولید مخزومی، عمرو بن عاص سہمی اور عثمان بن طلحہ عبدری کے ایک ساتھ قبولِ اسلام کا ذکر کیا ہے۔[۷۶] مگر دوسرے ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات یزید و معاویہ فرزندان ابی سفیان بن حرب اموی اور نہ جانے کتنے دوسرے قریشی زعماء اور قائدین نے اسی زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔[۷۷] انفرادی اور اجتماعی قبولِ اسلام کی مثالیں ہم کو مختلف بطونِ قریش میں اشاعت اسلام کی بحث میں ملیں گی۔

فتح مکہ (۶۳۰ء جنوری)، مکہ میں اسلام کی قبولیت کا نقطۂ عروج و کمال تھا۔ اسلامی ریاست کی دنیاوی جاہ و حشمت کے سائے میں مکہ کے قریشی اسلام کے دائرہ میں داخل ہو چکے تھے اور جو کچھ کسر رہ گئی تھی وہ رحمتِ نبوی، رافتِ احمدی اور عفوِ محمدی نے اپنے بے پایاں و بیکراں اظہارِ عنایت سے پوری کر دی تھی۔ مکہ۔ وہی مغرور و ظالم و ستمگر مکہ جس نے اللہ کا نام لینے کے جرم میں اللہ کے رسول اور مسلمانوں پر جینا حرام کر دیا تھا اور بالآخر ان کو جلاوطن کر کے چھوڑا تھا۔ اسی اللہ کا ماننے والا اور اس کے رسول کا چاہنے والا بن چکا تھا۔ اور قریش کے وہی زعماء اور قائدین جو اسلام کا چراغ بجھانے کی ہر ممکن کوشش کر چکے اور ناکام رہ چکے تھے اب اسی دین کی خاطر خدا کے گھر کو بتوں سے پاک کر رہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ عرب کے چپے چپے پر قائم کفر کے مرکزوں اور خدا ناترسی اور ناشناسی کے اداروں کو اپنے ہی ہاتھوں خاک میں ملا رہے تھے۔ وہ سالارانِ قریش جنہوں نے بدر، احد، خندق اور دوسری متعدد جنگوں اور آویزشوں میں اسلام سے ٹکر لی تھی اب وہی اس کی حفاظت و اشاعت کے لیے کبھی حنین و طائف کے معرکوں میں سرگرم کارزار تھے اور کبھی تبوک اور دومہ کے صحراؤں میں اسلام کے علمبردار تھے۔ قریش کے وہی سردار و شیوخ جو اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں اب تک رکاوٹیں پیدا کرتے رہے تھے اب خود اس کے مبلغ اور داعی بن چکے تھے اور سب کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے۔[۷۸]

مکہ میں اشاعتِ اسلام کے اس عمومی جائزے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قریش کے مختلف خاندانوں (بطون) کے قبول اسلام کا الگ الگ تجزیہ کیا جائے۔ اس سے ایک طرف تو یہ حقیقت عیاں ہوگی کہ مکہ میں اسلام کی اشاعت قبائلی خطوط پر نہیں ہوئی تھی اور اس میں قبائلی / خاندانی رقابت و عصبیت کو دخل نہیں تھا اور دوسری طرف قریش کے ہر بطن (خاندان) کا اسلام اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رویہ و سلوک بھی اجاگر ہوگا۔ یہ ایک بین سماجی حقیقت ہے کہ افراد کا اپنے اپنے خاندانوں میں خاص کردار اپنے علاقے کے سماج میں عام طور سے ایک مقام اور

اثر ہوتا ہے اور سربرآوردہ اور اہم افراد ہی عموماً کسی سماجی اور تہذیبی تحریک کی داغ بیل ڈالتے ہیں اور اس کو پروان چڑھاتے ہیں۔ اس لیے بھی یہ تجزیہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس تجزیے سے مکہ میں اسلام کی اشاعت کی تاریخی توقیت بھی متعین کرنے میں مدد ملے گی اور ان سب سے بڑھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی کارنامے کا خاص کر اور مدنی عہد میں مکہ پر اپنے اثرات کا عام طور سے صحیح جائزہ لینے اور اس کی اصل قدر و قیمت متعین کرنے کا تاریخی فریضہ بھی پورا کیا جا سکے گا۔

اس جائزے سے پہلے بعض اہم نکات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ اول یہ کہ کہنے کو قریش ایک قبیلہ تھا اور اس کے متعدد خاندان تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ بطون یا خاندان بجائے خود قبیلے بن چکے تھے اور ان خاندانوں کی اپنی ذیلی شاخیں اور گھرانے تھے چنانچہ اس جائزے میں ان بطون کی مختلف شاخوں اور گھرانوں کو مدنظر رکھ کر بحث کی گئی ہے تاکہ قبائلی اور خاندانی عصبیت یا حمایتِ اسلام کا بھی لگے ہاتھوں تجزیہ ہو تا رہے، دوم یہ کہ اس جائزے میں مختلف بطونِ قریش کی ترتیب عہدِ نبوی کے مکی دور میں ان کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی و تہذیبی اہمیت کے مطابق کی گئی ہے۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعثتِ نبوی کے زمانے میں اور اس کے بعد فتح مکہ تک قریش کا سب سے بڑا اور ہر لحاظ سے اہم ترین بطن " بنو عبد مناف " کا تھا[۹] جو چار اہم بطون / خاندانوں ۔ بنو امیہ / بنو عبد شمس، بنو ہاشم بنو مطلب اور بنو نوفل ۔ پر مشتمل تھا۔ اگرچہ ان چاروں " برادر " خاندانوں میں اپنے اندرونی اختلافات تھے لیکن یہ اختلافات ان کے اتحادات سے کہیں کم تھے۔ وہ تمام اجتماعی معاملات میں اور قریشِ مکہ کے دوسرے بطون یا قبائلِ عرب سے تعلقات کے ضمن میں بطور ایک سماجی اکائی کے کام کرتے تھے۔ بنو عبد مناف میں ہر لحاظ سے بنو عبد شمس کو اہمیت اور فوقیت حاصل تھی اور ان میں بھی خاص کر ان کے ذیلی گھرانے بنو امیہ کو۔ اسی بنا پر بنو امیہ سے دراصل تمام بنو عبد شمس مراد لیے جاتے تھے۔ بنو ہاشم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک خاص کر ۵۷۸ء میں عبد المطلب بن ہاشم کی وفات کے بعد سماجی، اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے پسماندہ ہو گئے تھے جبکہ باقی اور دو خاندان یا تو اپنا سماجی مقام کھو رہے تھے یا کھو چکے تھے اور زیادہ اہم نہیں رہ گئے تھے لیکن آغازِ بحث ہم بنو ہاشم ہی سے کر رہے ہیں کہ یہی رسول کریم محمد بن عبد اللہ ہاشمی صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان تھا اور بنو ہاشم کو آپ کی نسبتِ ولادت سے جو شرف حاصل تھا وہ اوروں کو حاصل نہیں تھا۔

(۱) بنو عبد مناف

(الف) بنو ہاشم

بلاریب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف خاندان بنی ہاشم کے بلکہ سارے جزیرہ نمائے عرب کے اولین

مسلم تھے۔ آپ کے بعد یہ سعادت آپ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ بنت خویلد کے حصہ میں آئی تھی جو اگرچہ قبیلہ و خاندان کے لحاظ سے بنو اسد کی فرد تھیں تاہم شادی کے بعد عملی طور سے بنو ہاشم کی رکن بن چکی تھیں۔ عربوں کی قبائلی روایات کے مطابق عموماً اور اصولاً بیویاں اپنے خاوندوں کے خاندان کی رکن سمجھی جاتی تھیں۔ اسی طرح موالی اور حلیف بھی اپنے سرپرستوں یا آقاؤں کے خاندان ہی کے افراد شمار ہوتے تھے چنانچہ حضرت زید بن حارثہ کلبی کے علاوہ حضرات ابو رافع، صالح شقران، ابو کبشہ اور انسہ اور غالباً کچھ اور موالی بھی بنو ہاشم اور اہل بیت رسول کے مکی مسلمان تھے۔ حضرت زید تو تیسرے یا چوتھے مسلم تھے جبکہ باقی حضرات کے بارے میں حتمی بیان نہیں ملتا تاہم یہ بات یقینی ہے کہ وہ سابقین اولین میں شمار ہوتے تھے۔ اہل بیت کرام میں آپ کی چار بنات اطہر، حضرت زینب، حضرت رقیہ، حضرت ام کلثوم حضرت فاطمہ بھی ابتدائی مکی دور کی مسلم تھیں۔ آپ کی کوئی اولاد نرینہ مکہ میں زیادہ دنوں زندہ نہیں رہی ورنہ ان کا بھی شمار کی مسلمانوں میں ہوتا۔ خاندان رسول کے موالی میں حضرت زید بن حارثہ کلبی کی زوجہ محترمہ حضرت ام ایمن بھی قدیم ترین اسلام لانے والوں میں تھیں۔ ان دونوں کے فرزند حضرت اسامہ بن زید کلبی پیدائشی مسلم تھے۔ امکان یہ ہے کہ خاندان رسول میں ان کے علاوہ بھی کچھ اور حضرات و خواتین مکی مسلم تھے۔ بہرحال موجودہ معلومات کے مطابق کم از کم پندرہ مسلمان خاندان رسالت مآب کے ایسے تھے جو مکی دور حیات کے آغاز ہی میں اسلام سے بہرہ ور ہو چکے تھے۔[۸۰]

خاندان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یعنی اہل بیت کرام کے علاوہ بنو ہاشم میں آپ کے چچاؤں کے گھرانے تھے ان میں ابو طالب بن عبد المطلب ہاشمی کا گھرانہ سب سے نمایاں تھا اور مدتوں تک وہ اپنے بانی خاندان کی نسبت سے طالبی خاندان و طالبیین کہلاتا رہا۔[۸۱] سربراہ خاندان کے اسلام کے بارے میں روایات کے باوجود قدیم و جدید مورخین کا اتفاق ہے کہ وہ شرف اسلام سے محروم رہے تھے۔ اگرچہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی و نجی محبت میں پورے قریش مکہ سے لوہا منوا لیا تھا۔[۸۲] جس شرف سے محروم رہے اس سے ان کے خاندان کے دو افراد اولاً بہرہ یاب ہوئے۔ یہ حضرات علی بن ابی طالب[۸۳] اور جعفر بن ابی طالب تھے۔[۸۴] موخر الذکر کی زوجہ محترمہ حضرت اسماء بنت عمیس خثعمی بھی قدیم مکی مسلمان[۸۵] تھیں۔ انھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کی تھی۔ جب کہ حضرت علی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ مکہ میں مقیم رہے تھے۔[۸۵] دوسرے فرزندان ابی طالب میں فرزند اکبر طالب کی موت کفر ہی میں ہوئی تھی جبکہ تیسرے فرزند عقیل بن ابی طالب نے صلح حدیبیہ کے بعد کسی وقت یا فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کر لیا تھا۔[۸۶] یہ دلچسپ بات ہے کہ ابی طالب کی زوجۂ مقدسہ حضرت فاطمہ بنت اسد بن ہاشم نے مکہ ہی میں کسی وقت غالباً ابو طالب کی وفات کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا اور بعد میں مدینہ کو ہجرت بھی کی تھی۔[۸۷] ان کے فرزند عقیل کی اہلیہ فاطمہ بنت عتبہ بن ربیعہ اموی / عبد شمسی نے بھی غالباً اپنے شوہر کے ساتھ اسلام کا شرف حاصل کیا تھا۔[۸۸] ابو طالب کی بعض دختروں کے قبول اسلام کے بارے میں بھی روایات ملتی ہیں۔[۸۹] ان میں سے ام ہانی نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا تھا۔[۹۰]

ابو لہب بن عبد المطلب ہاشمی نے اسلام کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی اور اس نے اسلام کبھی قبول نہیں کیا

اس دشمنِ اسلام اور رسول کے دو فرزندوں حضرات عتبہ اور عتیبہ نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کرلیا تھا اور غالباً ان کی تمام اولاد و اخلاف نے بھی[۹۱]

بنو ہاشم کا تیسرا گھرانہ عباسی تھا جس کے سربراہ حضرت عباس بن عبدالمطلب نے غالباً فتح مکہ سے کچھ قبل یا صلح حدیبیہ کے کچھ بعد اسلام قبول کیا تھا۔ اگرچہ بعض روایات ان کو مکی عہد کا قدیم مسلم ثابت کرتی ہیں لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ وہ غزوۂ بدر تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔[۹۲] ان کے صحیح زمانۂ قبول کا ہم کو حتمی علم نہیں ہے کیونکہ ماخذ اس سلسلے میں کسی متعین تاریخ کا ذکر نہیں کرتے ہیں حضرت عباس کے فرزندانِ گرامی مکی عہد میں کمسن تھے اور غالباً وہ بھی اسلام کے دائرے میں اپنے والد نامدار کے ساتھ داخل ہوئے تھے ان میں حضرات فضل، قثم، عبداللہ، عبیداللہ اور معبد وغیرہ شامل تھے۔ اسی طرح حضرت عباس ہاشمی کی دختروں میں ام حبیب حضرت آمنہ اور حضرت صفیہ بھی غالباً بعد کے زمانے کی مسلمان تھیں۔[۹۳] یہ ہاشمی گھرانہ مکی دورِ حیات میں اسلام سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ اور ان کا زمانۂ قبولِ اسلام بدر اور فتحِ مکہ کے درمیان متعین کیا جا سکتا ہے جبکہ زیادہ تر حقائق آخری زمانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

لیکن بنو ہاشم کا چوتھا گھرانہ ابتدائی عہد کا مسلم تھا۔ یہ تھا حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی کا خاندان، حضرت حمزہ نے دارِ ارقم میں قیام نبوی کے زمانے میں سنہ نبوی میں اسلام قبول کیا تھا۔[۹۴] ان کے خاندان کے دوسرے افراد کے اسلام کے بارے میں ہمارے ماخذ خاموش ہیں۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ حضرت حمزہ کی اہلیہ غالباً اسلام نہیں لائی تھیں یا لائی تھیں اور ہجرت سے قبل وفات پاچکی تھیں کیوں کہ ان کی ایک صاحبزادی حضرت امامہ بنتِ حمزہ فتح مکہ کے دن بھی کافی کم عمر تھیں اور غالباً ہجرت سے کچھ قبل مکہ ہی میں پیدا ہوئیں اور وہیں رہ گئی تھیں۔ وہ غزوۂ عمرۃ القضاء (۶۲۹ء) میں حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمی کی تولیت میں دی گئی تھیں کیونکہ ان کی ماں سلمیٰ بنتِ عمیس خثعمی حضرت جعفر کی اہلیہ حضرت اسمار کی حقیقی بہن اور حضرت امامہ کی خالہ تھیں۔[۹۵] حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کی کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ البتہ ان کے موالی بنو غنی ابتدائی مکی مسلم تھے۔ عموماً ان میں سے صرف دو باپ بیٹوں ابو مرثد اور مرثد غنوی کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن ابن اثیر نے ابو مرثد غنوی کے دو مزید قدیم الاسلام فرزندوں حضرات انس اور انیس کا بھی ذکر کیا ہے۔[۹۶] یہ یقینی ہے کہ ان کے علاوہ بھی اس خاندان کے کچھ اور افراد بھی ابتدائی مسلمینِ مکہ میں شامل تھے۔

بنو حارث بن عبدالمطلب ہاشمی کا گھرانا بنو ہاشم کا پانچواں اہم گھرانا تھا۔ اس کے سربراہ کی وفات غالباً بعثتِ نبوی سے قبل ہی ہو چکی تھی۔[۹۷] ابنِ سعد کا بیان ہے کہ ان کے ایک فرزند نوفل بن حارث نے بدر کے بعد اسلام قبول کرلیا تھا مگر مدینہ کو ہجرت غزوۂ خندق کے بعد حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمی کے ساتھ کی تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندانِ بنی ہاشم کے ان دونوں چچا بھتیجے کے درمیان مواخاۃ قائم کردی تھی۔[۹۸] لیکن یہ بیان بھی دوسرے تاریخی بیانات سے متصادم ہے اور صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ وہ ابتدائی مسلم رہے ہوں لیکن زیادہ امکان اس کا ہے کہ انھوں نے صلح حدیبیہ کے بعد یا فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ ان کے باقی تین بھائیوں ربیعہ، عبداللہ اور ابو سفیان فرزندانِ حارث بن عبدالمطلب کے بارے میں ماخذ صراحت کرتے ہیں کہ انھوں نے فتح مکہ کے دن حلقہ بگوشِ اسلام ہونا پسند کیا تھا۔[۹۹] حضرت ابو سفیان حارثی ہاشمی کے بارے میں روایات کا اتفاق ہے کہ وہ اپنے وقت کے اچھے شاعر تھے مگر اسلام کے دشمن۔ وہ بیس برس تک اسلام اور اس

کے پیغمبرِ عظیم کی ہجو کرتے رہے تھے لیکن فتح مکہ میں ایسے پکے جاں نثارِ رسول بنے کہ غزوہ حنین کے اولیں دہلہ شکست میں جب اوروں کے پیر اکھڑ گئے تھے تو وہ ناقہ رسول کی مہار تھامے دلیرانہ جمے رہے تھے۔ اس خاندان کے تین اور افراد حضرات جعفر بن ابی سفیان بن حارث، حارث بن نوفل بن حارث اور عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا تھا۔[۱۰۰] اس خاندان کی تمام کتخدا اور ناکتخدا صاحبزادیوں نے غالباً اپنے بزرگوں کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا۔ ان میں سے بعض پیدائشی مسلمان بھی تھیں۔[۱۰۱] اولین مکی مسلمانوں میں حضرت ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب کی زوجہ محترمہ حضرت جمانہ جو ابوطالب کی دختر اور حضرت علی کی بہن تھیں اپنے شوہر سے قبل اسلام لاکر شامل ہو چکی تھیں اور ہجرت کرکے مدینہ آ گئی تھیں۔ انہوں نے خیبر کی غنیمت کے خمس سے طعمہ نبوی پایا تھا۔[۱۰۲]

بنوہاشم کے بعض اور چھوٹے چھوٹے گھرانے تھے جو عبدالمطلب کے سوا ہاشم کے دوسرے بیٹوں کی نسل میں چلے تھے لیکن یہ گھرانے یا تو بعثتِ نبوی تک نابود ہو چکے تھے یا اتنے غیر اہم کہ ان کی خاندانی حیثیت جاتی رہی تھی اور ان کے صرف افراد رہ گئے تھے۔[۱۰۳]

بنوہاشم کی متعدد خواتین نے مکہ مکرمہ میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی پھوپھیاں تھیں جن میں حضرت صفیہ بنتِ عبدالمطلب، حضرت امیمہ بنت عبدالمطلب نمایاں تھیں۔[۱۰۴] باقی خواتین میں سے کافی نے ہجرت کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ جبکہ ام ہانی بنت ابی طالب جیسی خواتین بنی ہاشم نے فتح مکہ کے دن اسلام کے دائرے میں داخل ہونا پسند کیا تھا۔ خواتین کے سلسلے میں ذکر آ چکا ہے کہ ان میں سے کتخدا کو اصولاً ان کے خاوندوں کے خاندانوں میں شمار کیا جانا چاہیے جیسا کہ ہم بعض اوروں کے ضمن میں آگے چل کر دیکھیں گے۔

طبری کی روایت ہے کہ جب قرآن کریم کی آیت وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (اور آپ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو دعوتِ حق دیں)، نازل ہوئی تو حکمِ الٰہی کی تعمیل میں آپ نے بنوعبدالمطلب کی ضیافت کا اہتمام کیا اور ان کو اسلام کی دعوت دی۔ اس مجلس میں بنوعبدالمطلب کے چالیس[۴۰] یا پینتالیس[۴۵] آزاد اور خود مختار، عاقل و بالغ، تجربہ کار و سن رسیدہ مرد اکٹھے ہوتے تھے۔[۱۰۵] اس روایت سے خاندان بنی عبدالمطلب کی عددی طاقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے مفروضہ کے مطابق صرف اسی خاندان کے کل افراد کی تعداد ۲۴۰ اور ۲۸۰ یا ۲۷۰ اور ۳۱۵ کے درمیان رہی ہوگی ایک موٹے سے اندازے کے مطابق بنوہاشم کی کل عددی قوت اس زمانے میں بشمول ان کے حلفاء اور موالی کے ۴۰۰ کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اگرچہ اس دعوتِ اولین میں صرف ایک کم عمر بچے نے جو کہ میزبان تھا اور مہمانوں یا مدعوئین میں سے نہ تھا اسلام قبول کرنے کا جرأتمندانہ اعلان کیا تھا۔[۱۰۶] مگر باقی نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا بہرحال رفتہ رفتہ ایک ایک، دو دو کرکے یا چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں ہاشمی قبولِ اسلام کرتے چلے گئے اور فتحِ مکہ کے بعد سب ہی اسلامی ریاست کے رکن اور اسلام کے پیرو تھے۔

اس تجزیے سے یہ حقیقت واشگاف طور پر عیاں ہوتی ہے کہ خاندان کی محبت میں کسی ہاشمی نے اسلام قبول نہیں

کیا تھا۔ ایک ہاشمی فرد کی حیثیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابو طالب اور ان کے خاندان والوں کی حمایت وحفاظت دراصل عربوں کے قبائلی نظام تحفظ کا اظہار تھا نہ کہ اسلام کی حمایت و دفاع۔ بنو ہاشم نے اسلام کی شدید ترین مخالفت بھی کی تھی اور حمایت بھی۔

(ب) بنو عبد شمس / بنو امیہ

دنیاوی جاہ وحشمت کے اعتبار سے بنو عبد مناف کا سب سے زیادہ طاقت ور، مالدار اور با اثر اور عددی لحاظ سے اہم و اکبر قبیلہ، خاندان یا بطن بنو عبد شمس کا تھا۔ اس کی ایک اہم ترین شاخ بنو امیہ اتنی اہمیت اختیار کر گئی تھی کہ بنو عبد شمس عملاً بنو امیہ ہی سمجھے جانے لگے تھے۔[۱۰۷] عام خیال یہ ہے کہ بنو امیہ / بنو عبد شمس کو یہ سماجی، سیاسی اور اقتصادی بلند مقام ہاشم اور ان کے فرزند عبد المطلب کی وفات کے بعد حاصل ہوا تھا اور مکہ کی زمام سیادت کلی طور پر بنو امیہ کے ہاتھ ابو طالب ہاشمی کی وفات (۶۱۹ء) کے بعد آ گئی تھی۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ بنو امیہ اور بنو ہاشم ایک دوسرے کے رقیب و حریف تھے۔[۱۰۸] یہ دونوں خیال خام اور ان پر تعمیر کردہ نتائج کی دنیا محض مفروضہ باطل ہے۔ اس موضوع پر مفصل بحث کہیں اور کی جا چکی ہے۔[۱۰۹] مختصراً یہ کہ دینا یہاں کافی ہو گا کہ عبد شمس کو ہاشم کی مانند اپنے باپ عبد مناف کی زندگی میں ہی برابری کا مقام حاصل تھا اور باپ کے انتقال کے بعد اگر ہاشم کو سقایہ اور رفادہ کے عہدے ملے تھے تو عبد شمس کو قیادہ کا عظیم منصب ملا تھا اور اس طرح دونوں فرزندانِ عبد مناف مکی اشرافیہ کے برابر کے رکن اور مکی سماج میں یکساں عزت و توقیر کے حقدار بن گئے تھے۔ ہاشم کی نو عمری میں وفات اور ان کے بیشتر بچوں کے بچپن میں انتقال وغیرہ کے سبب ان کی نسل صرف بنو عبد المطلب میں جاری رہی۔ بقیہ فرزندوں کی نسل جلد ہی منقطع ہو گئی جب کہ عبد شمس کے متعدد فرزندوں سے ان کی نسل خوب خوب چلی اور اس کے نتیجے میں بعثتِ نبوی تک بنو عبد شمس کے اپنے متعدد بطون وجود میں آ چکے تھے۔ کثرتِ تعداد نے جو قبیلوں کی اس زمانے میں امتیازی خصوصیت تھی بنو عبد شمس کو سیاسی اور سماجی عظمت و توقیر بخشی۔ اس کے علاوہ ان کی اقتصادی صلاحیتوں نے ان کو مکی اقتصادیات میں نمایاں ترین گروہ بنا دیا۔ ان اسباب سے بنو عبد شمس کو مکی سماج میں یہ سیادت و قیادت عہدِ قدیم سے حاصل تھی اور عہدِ نبوی میں برابر حاصل رہی۔ اس قیادت کو قائم رکھنے میں بنو عبد شمس کی اپنی صلاحیتوں اور لیاقتوں کے علاوہ کل خاندان بنو عبد مناف کی تائید و تصدیق اور اتحاد کی دولت حاصل تھی۔ گویا کہ بنو عبد شمس کی عظمت و ریاست بنو ہاشم کی عظمت و ریاست تھی۔ یہ دونوں بلکہ چاروں خاندان ایک دوسرے کے دوست، حلیف اور بھائی تھے نہ کہ رقیب، حریف اور مدِ مقابل۔[۱۱۰]

بعثتِ نبوی تک بنو عبد شمس کے متعدد خاندان، بطون یا گھرانے بجائے خود ایک سماجی اکائی بن چکے تھے۔ ان میں سب سے بڑا اور اہم ترین گھرانا بنو امیہ اکبر بن عبد شمس کا تھا جو بجائے خود متعدد گھرانوں پر مشتمل تھا۔ اس کی اہم شاخیں حسبِ ذیل تھیں۔

(۱) بنو ابی العاص بن امیہ اکبر۔ جس کی مزید دو ذیلی شاخیں تھیں (ا) بنو عفان (حضرت عثمان کا خاندان)، (ب) بنو

حکم (حضرت مروان بن حکم کا خاندان)

(۲) بنو حرب بن امیہ الاکبر: اس کی تین اہم ترین شاخیں تھیں (الف) بنو ابو سفیان بن حرب (ب) بنو عتبہ بن ابی سفیان اور (ج) بنو عنبسہ بن ابی سفیان۔ ان کے علاوہ بھی بعض گھرانے اس میں شامل تھے۔

(۳) بنو ابی العیص — حضرت عتاب بن اسید کا گھرانہ۔

(۴) بنو ابی عمرو بن امیہ اکبر — دشمن رسول عقبہ بن ابی معیط وغیرہ کا خاندان۔

(۵) بنو عاص بن امیہ اکبر — ابو احیحہ سعید بن عاص کا گھرانا۔

ان کے علاوہ بنو امیہ اصغر کا گھرانا تھا جو پہلے کے مقابلہ میں یقیناً کافی چھوٹا تھا لیکن وہ اپنی جگہ خاصا بڑا گھرانا تھا ان دو اہم "اموی" خاندانوں کے بعد عبد شمس کے متعدد بیٹوں کے خاندان تھے جیسے بنو حبیب بن عبد شمس، بنو عبد امیہ بن عبد شمس، بنو نوفل بن عبد شمس، بنو ربیعہ بن عبد شمس اور بنو عبد العزیٰ بن عبد شمس۔ اول الذکر کے تین گھرانے ہو چکے تھے۔ بنو سمرہ بن حبیب، بنو ربیعہ بن حبیب، اور بنو کریز بن حبیب، بنو ربیعہ بن عبد شمس کے دو افراد عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ مکی اشرافیہ کے بعثت نبوی کے اہم ترین ستون تھے جبکہ موخر الذکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے داماد حضرت ابو العاص بن ربیع کا گھرانا تھا (۱۱۱)

خاندان بنو عبد شمس کی اس صبر آزما تفصیل کے بعد یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے بارے میں ان کا رویّہ بنو ہاشم یا کسی دوسرے خاندانِ مکہ اور بطنِ قریش کے رویّہ سے مختلف نہ تھا۔ ان میں سے بعض نے اسلام کی بھرپور مخالفت کی تھی تو ان کے ہی افراد نے بھرپور حمایت بھی کی تھی۔ مکی عہد میں ان میں سے بعض خاندان اسلام سے بہرہ یاب نہیں ہو سکے تھے جس طرح سے بنو ہاشم کے بعض گھرانے محروم رہے تھے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بنو ہاشم کے بعض گھرانوں کی مانند بعض اموی/عبد شمسی گھرانوں نے بھی سبقت اسلام کی دولت پائی تھی۔ ان گھرانوں میں امیہ اکبر کے خاندان بنو ابی العاص اور بنو عاص تھے جب کہ عبد شمس کے دوسرے فرزندوں کے خاندانوں میں یہ سعادت بنو ربیعہ بن عبد شمس کے حصہ میں آئی تھی۔

خاندانِ بنی عاص بن امیہ اکبر میں ابو احیحہ سعید بن عاص کا گھرانا اپنی دولت و ثروت، شرافت و نجابت اور سیادت و ریاست کے لیے مکہ بھر میں ممتاز ترین سمجھا جاتا تھا اور اس کے سربراہ خاندان کو انتہائی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔[۱۱۲] اسی "خاندانِ سعیدی" کے ایک فرد حضرت خالد بن سعید اموی غالباً اولیں اموی مسلم تھے اور روایات کے مطابق ان کا سلسلہ صحابہ سابقین اولین میں تیسرا یا چوتھا نمبر تھا۔[۱۱۳] یہ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور بعض جدید مؤرخین اسی کے حق میں ہیں۔ بہر حال یہ حتمی و یقینی امر ہے کہ وہ ایسے دس مکی مسلمانوں میں شامل تھے۔ ان میں سے ایک بھائی عمرو بن سعید نے غالباً ان کے اثر سے مکی عہد کے نصف اول کے آغاز ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔[۱۱۴] یہ دونوں بھائی اپنے والد اور دوسرے بھائیوں اور خاندان والوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے تھے اور ابنِ اسحاق کے بقول اپنی دونوں بیویاں

بالترتیب امینہ بنت خلف خزاعی اور فاطمہ بنت صفوان مدلجی کنانی کے ہمراہ حبشہ ہجرت کر گئے تھے۔ حضرت خالد بن سعید کی کم از کم دو اولادیں حضرت سعید اور حضرت ام حبشہ میں پیدا ہوئی تھیں۔[115] غالب حضرت عمرو بن سعید کی اولادیں بھی مکہ، حبشہ یا مدینہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ سربراہ خاندان ابو احیحہ سعید بن عاص کا بدر کے بعد کسی وقت بحالت کفر انتقال ہوا تھا جب کہ ان کے دو فرزندوں ابان بن سعید اور حکم و عبداللہ بن سعید نے صلح حدیبیہ کے بعد یا فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ حسنِ اتفاق سے یہ چاروں بھائی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے اس لیے انھوں نے اسلامی ریاست کے چار مختلف ولایتوں پر بطورِ والی (گورنر) حکمرانی عہدِ نبوی ہی میں کی تھی۔ اگرچہ ہمارے متداول ماخذ اس خاندان کے متعدد دوسرے اراکین خاص کر ان کی عورتوں کے قبولِ اسلام کا ذکر نہیں کرتے تاہم انساب و سوانح کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندانِ سعیدی میں اور بھی متعدد ابتدائی مکی عہد کے اور بعد کے زمانے کے تھے۔ ان میں ابو احیحہ سعید کے ایک فرزند سعید غزوۂ طائف میں شہید ہوئے تھے۔[116] اس خاندان کی دختروں میں ایک فاختہ بنتِ سعید تھیں جو بعد میں رسولِ اکرم کے بڑے داماد حضرت ابو العاص بن ربیع کی بیوی بنیں اور انہی سے ان کی نسل چلی۔[117]

خاندانِ بنی ابی العاص کے قدیم ترین مسلمان حضرت عثمان بن عفان اموی تھے جو دار ارقم میں قیامِ نبوی سے قبل اسلام لائے تھے اور بقولِ ابن اسحاق پہلے آٹھ مسلمانوں میں سے تھے۔ وہ اپنے حقیقی چچا حکم بن ابی العاص اموی کے ہاتھوں ستائے گئے تھے اور تنگ آ کر اپنی اہلیہ حضرت رقیہ بنتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۵ نبوی میں ہجرتِ حبشہ کے لیے وطن سے نکل گئے مگر پھر کچھ مدت کے بعد مکہ والوں کے قبولِ اسلام کی خبر سن کر واپس مکہ آ گئے تھے جہاں ہجرتِ مدینہ تک وہ دونوں مقیم رہے۔[118] حضرت عثمان کے دوسرے بھائی بہنوں کے قبولِ اسلام کے بارے میں ماخذ خاموش نظر آتے ہیں۔[119] البتہ ان کی والدہ ماجدہ حضرت اروی بنت کریز ابتدائی مکی مسلم تھیں۔[120] اور ان کی ایک اموی اہلیہ حضرت رملہ بنتِ شیبہ بن ربیعہ ابتدائی مکی مسلمان، مہاجرہ مدینہ تھیں۔[121] ان کے چچا حکم بن ابی العاص کے خاندان نے فتح مکہ میں اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت حکم کے علاوہ ان کے فرزند حضرت مروان بن حکم صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ عموماً اس خاندان کے انہی دو کے قبولِ اسلام کا ذکر ملتا ہے۔[122] لیکن یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں خاندانوں میں مزید مرد اور عورت افراد تھے جو فتح مکہ کے زمانے میں داخلِ اسلام ہوتے تھے۔[123] البتہ ان کے ایک مولیٰ حضرت صبیح ابتدائی مکی مسلمان تھے جن کا تعلق حضرت خالد بن سعید اموی کے خاندان سے تھا۔[124]

بنو ربیعہ بن عبد شمس کی قسمت میں سبقتِ اسلام کا شرف لانے والے حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ تھے۔ وہ تیسرے اہم اموی مکی مسلمان تھے جو نہ صرف آغازِ اسلام میں مسلمان ہوئے تھے بلکہ مکہ میں اپنوں ہی کے ہاتھوں ستائے جانے کے سبب اپنی زوجہ محترمہ حضرت سہلہ بنتِ سہیل عامری کے ساتھ حبشہ ہجرت کر گئے تھے مگر کچھ دنوں بعد مکہ واپس آ گئے تھے اور پھر مدینہ ہجرت کی تھی وہ بدری صحابی تھے۔[125] ان کے خاندان میں ان کی ایک عم زاد بہن کے علاوہ اور کسی کے فتح مکہ سے قبل قبولِ اسلام کا ذکر نہیں ملتا البتہ ان کے ایک مولیٰ حضرت سالم تھے جو بالکل آغاز میں مسلمان ہوتے تھے اور قدیم مہاجر تھے اور بدری تھے۔[126] غالباً موخر الذکر کا اپنا خاندان بھی تھا جو آغاز ہی میں مسلمان ہو گیا تھا۔

ماخذ کا اصرار ہے کہ بنو حرب بن امیہ کا کسی فرد نے مکی عہد میں اسلام قبول نہیں کیا تھا تاہم ان کو اعتراف ہے کہ اس

خاندانِ سفیانی کی ایک خاتون حضرت ام حبیبہ جو ابو سفیان بن حرب کی دختر تھیں ابتدائی مسلمان تھیں اور اپنے شوہر عبیداللہ بن جحش / بنو غنم بن دودان کے ساتھ حبشہ کو سنہ ۶ نبوی میں ہجرت کر گئی تھیں۔ حبشہ میں جب ان کے شوہر عیسائی ہو گئے تو وہ اسلام پر ثابت قدم رہیں اور بالآخر غالباً اسی ثبات قدمی کے سبب وہ سنہ ۶ھ / ۶۲۹ء میں ام المومنین بن کر مدینہ واپس آئیں۔[۱۲۷] عام عقیدہ یہ ہے کہ اس خاندان کے مردوں نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا تھا مگر یہ صحیح نہیں ہے بعض قوی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابو سفیان بن حرب کے دو فرزندان حضرات یزید اور معاویہ صلح حدیبیہ کے بعد غالباً عمرۃ القضیہ کے موقع پر مسلمان ہو گئے تھے[۱۲۸] اور ان کے ساتھ غالباً ان کے اہلِ خانہ بھی حضرت ابو سفیان بن حرب اپنی زوجہ حضرت ہند بنت عتبہ بن ربیعہ اور دوسرے فرزندان عتبہ اور عنبسہ وغیرہ کے ساتھ فتح مکہ کے زمانے میں اسلام لاتے تھے۔[۱۲۹]

یہ حیرت کی بات ہے کہ ابو سفیان بن حرب اور ان کے خاندان کے تمام ارکان مکی عہد میں دائرۂ اسلام سے خارج رہے مگر ان کے بنو غنم بن دودان کے تمام حلیف جن کی تعداد چالیس بالغوں پر مشتمل تھی ابتدا کار ہی میں مسلمان ہو گئے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ ان کے قبولِ اسلام کا زمانہ مکی حیاتِ نبوی کا دورِ آخر ہے۔ بہر حال کوئی زمانہ رہا ہو وہ سابقین اولین میں تھے اور ان میں بعض مہاجرینِ حبشہ میں بھی شریک تھے اور بقیہ مہاجرینِ مدینہ اور بدری صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ابنِ اسحاق[۱۳۰] اور ابنِ سعد[۱۳۱] نے ان کے تینتیس مردوں کے نام گنوائے ہیں جو یہ ہیں۔

(۱) عبداللہ بن جحش (۲)، ان کے بھائی ابو احمد (۳) عبداللہ کے فرزند محمد (۴)، عکاشہ بن محصن (۵)، شجاع بن وہب (۶)، ان کے بھائی عقبہ (۷)، اربد بن حمیرہ (۸)، منقذ بن نباتہ (۹) سعید بن رقیش (۱۰)، یزید بن رقیش (۱۱) عبدالرحمن بن رقیش (۱۲) محرز بن نضلہ (۱۳)، قیس بن جابر (۱۴) عمرو بن محصن (۱۵)، مالک بن عمرو (۱۶)، صفوان بن عمرو (۱۷)، ثقف بن عمرو (۱۸)، ربیعہ بن اکثم (۱۹) زبیر بن عبید (۲۰)، تمام بن عبیدہ (۲۱) سخبرہ بن عبیدہ (۲۲)، ابو سنان بن محصن (۲۳)، سنان بن ابی سنان۔

ابنِ اسحاق نے ان کی خواتین کے صرف آٹھ نام گنائے ہیں جو یہ ہیں: (۱) زینب بنتِ جحش (۲)، ان کی بہن ام حبیب (۳)، جذامہ بنتِ جندل (۴)، ام قیس بنتِ محصن (۵)، ام حبیب بنتِ ثمامہ (۶) آمنہ بنتِ رقیش (۷)، سخبرہ بنتِ تمیم اور (۸) حمنہ بنتِ جحش۔[۱۳۲] اس طرح بنو حرب بن امیہ کے حلفاء بنی غنم بن دودان کے کل ابتدائی مسلمانوں کی تعداد ۴۱ ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ بجائے خود اہم تعداد ہے تاہم ماخذ کے مطابق اس میں مزید نو بالغوں کے نام شامل ہونے چاہئیں۔ ان کے بچوں میں سے کسی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحش وغیرہ کی والدہ ماجدہ حضرت امیمہ بنتِ عبدالمطلب ہاشمی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ابتدائی مکی عہد کی مسلم پھوپھی تھیں۔[۱۳۳] اندازہ یہ ہے کہ حلفاء بنی حرب بن امیہ کے ابتدائی مسلمانوں کی تعداد ڈھائی تین سو کے درمیان تھی۔ اسی طرح بنو امیہ کے ایک اور حلیف حضرت معیقیب بن ابی فاطمہ دوسی تھے جو بعض روایات کے مطابق مکہ کے قدیم مسلم تھے اور ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے اور بعض دوسری روایات کے مطابق وہ مکہ سے واپس اپنے قبیلہ دوس چلے گئے تھے۔ اور وہاں تبلیغ اسلام کرتے رہے تھے[۱۳۴]

خاندان بنی ابی عمرو بن امیہ اکبر کے مکی سردار عقبہ بن ابی معیط اموی نے نہ صرف اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا بلکہ وہ ابولہب ہاشمی اور ابوجہل مخزومی کی مانند اسلام اور پیغمبر اسلام کا تیسرا سب سے بڑا دشمن تھا۔ وہ اپنے جنگی جرائم کے سبب غزوۂ بدر میں قتل کر دیا گیا تھا۔[۱۳۵] اسی دشمن اسلام کی جرأتمند اور دلیر دختر حضرت ام کلثوم بنت عقبہ اموی نے بعد ہجرت کسی وقت اسلام قبول کر لیا تھا اور صلح حدیبیہ کے معاہدے کے فوراً بعد دلیرانہ ہجرت کر کے مدینہ پہنچی تھیں۔ عقبہ اموی کے تین صاحبزادوں حضرت ولید، خالد اور عمارہ نے عام روایات کے مطابق فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا تھا لیکن اس امکان سے یکسر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اپنی بہن کی متابعت میں کچھ پہلے اسلام قبول کر لیا ہو۔[۱۳۶] یہ اس خاندان کے اہم ترین افراد کے قبولِ اسلام کا ذکر تھا۔ امکان قوی ہے کہ اور دوسروں نے بھی اسلام قبول کیا ہو۔[۱۳۷] بہرحال یہ تاریخی حقیقت ہے کہ عقبہ اموی کا گھرانا ہجرت کر کے مدینہ جا بسا تھا۔

بنو عبد العزیٰ بن عبد شمس کے ایک اہم رکن حضرت ابو العاص بن ربیع تھے۔ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد اور دخترِ رسول حضرت زینب کے شوہر ہونے کے علاوہ حضرت خدیجہ کی بہن کے فرزند بھی تھے۔ روایات کے مطابق انھوں نے سنہ ۶ھ/۶۲۸ء میں صلح حدیبیہ سے قبل اسلام قبول کر کے مدینہ کو ہجرت کی تھی۔ ان کی ایک صاحبزادی حضرت امامہ بنتِ ابی العاص اموی بھی عہد کی پیدائشی مسلمان تھیں۔[۱۳۸] ان کے سوا باقی گھرانا فتح مکہ کے زمانے میں اسلام لایا تھا۔

بنو ابی العیص میں حضرت عتاب بن اسید اموی ممتاز مسلمان تھے جو فتح مکہ کے دن اپنے خاندان والوں کے ساتھ اسلام لائے تھے۔ وہ قبولِ اسلام کے چند دنوں کے بعد ہی اسلامی ریاست کی طرف سے مکہ کے گورنر مقرر ہوئے تھے۔ اگرچہ وہ نوجوان اور متاخر مسلمان تھے۔[۱۳۹] زبیری نے ان کے ایک بھائی خالد بن اسید کا ذکر کیا ہے جن کا کافی بڑا گھرانا تھا۔[۱۴۰]

بنو عبد شمس اور بنو امیہ کے باقی گھرانے اور افراد[۱۴۱] زیادہ تر فتح مکہ کے زمانے میں اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ امکان ہے کہ ان میں سے کچھ حضرات و خواتین کچھ پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے ہوں لیکن اس کا ثبوت تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ پھر بھی ان میں سے حضرات ابو کبیسہ حارث بن کریز، عامر بن کریز، عبد اللہ بن عامر اور عبد الرحمٰن بن سمرہ وغیرہ عظیم صحابہ کا ذکر مل ہی جاتا ہے۔

اگر خاندانِ بنی ہاشم اور خاندانِ بنی امیہ کے قبولِ اسلام کا ایک تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس میں بڑی حیرت انگیز مماثلت نظر آئے گی اور واضح ہو گا کہ "خاندانِ بنو عبد مناف" کے ان دو برادر گھرانوں اور ان کے افراد نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے ساتھ یکساں رویہ اپنایا تھا۔ اگر چند ہاشمیوں نے سبقتِ اسلام اور حمایتِ رسول کا شرف حاصل کیا تھا تو بعینہٖ یہی شرف چند امویوں نے بھی حاصل کیا تھا۔ اگر کچھ ہاشمیوں نے مکہ میں راہِ خدا میں تکلیفیں اٹھائی تھیں اور حبشہ ہجرت کی تھی تو امویوں نے بھی یہی قربانیاں دی تھیں۔ اگر ابو سفیان بن حرب اموی اور عقبہ بن ابی معیط اموی نے اسلام کی مخالفت کی تھی تو عنادِ اسلام و مخالفتِ رسول میں ابولہب ہاشمی اور ابو سفیان بن حارث ہاشمی کسی سے پیچھے نہیں

رہے تھے۔ دونوں خاندانوں کے کچھ افراد نے مکہ میں سبقتِ اسلام کا شرف حاصل کیا پھر ہجرتِ مدینہ کے بعد ان کے افراد اسلام قبول کرتے رہے تا آنکہ فتح مکہ کے دن وہ سب کے سب اسلام کے علمبردار بن گئے۔ اگرچہ ہمارے پاس آبادی کے اعداد و شمار نہیں ہیں تاہم ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وفاتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پچاس سال بعد صرف مدینہ میں امویوں کی تعداد ایک ہزار سے متجاوز تھی۔[۱۴۲] اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فتح مکہ کے دن خاندانِ بنو عبد شمس / بنو امیہ کے کل افراد کی تعداد ایک ہزار دو ہزار افراد کے درمیان یقیناً تھی۔

(ج) بنو المطلب

بنو عبد مناف میں ہاشم اور عبد شمس کے بعد قریشی سرداروں میں جن کو ممتاز مقام حاصل تھا۔ ان میں مطلب بھی تھے اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاشم کی موت کے بعد بنو ہاشم اور بنو مطلب کی مشترکہ قیادت موخر الذکر کے سربراہ خاندان کے ہاتھ میں رہی تھی کیونکہ ہاشم کے تمام فرزند بہت خورد سال تھے[۱۴۳] ——— اسی طرح مطلب کی وفات کے بعد ان کے خاندان میں کوئی ایسی شخصیت نہیں ابھری جو خاندانی قیادت کی ذمہ داری سنبھال سکتی چنانچہ اس بار عبد المطلب ہاشمی نے اپنے خاندان کے علاوہ اپنے عزیز و مشفق چچا کے خاندان کی کفالت و قیادت کی ذمہ داری انجام دی۔[۱۴۴] یہی تاریخی عوامل تھے جنہوں نے ان دونوں خاندانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر بلکہ ایک دوسرے کا حلیف، دوست اور برادر بنا دیا تھا اور بنو عبد مناف میں بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب دوسروں کی بنسبت زیادہ باہمی الفت و یگانگت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ بنو مطلب اقتصادی لحاظ سے بنو ہاشم اور بنو عبد مناف کے دوسرے گھرانوں کے دست نگر بھی تھے۔[۱۴۵] عددی قوت کے لحاظ سے بنو مطلب کا گھرانا بنو ہاشم سے بھی کافی چھوٹا تھا۔[۱۴۶] اور اس کے فروتر سماجی مقام کا ایک سبب یہ بھی تھا۔

بہرحال مکی سماج و اقتصادیات میں بنو مطلب کو امتیاز و تفوق حاصل رہا ہو یا نہ رہا ہو لیکن قبولِ اسلام میں ان کو شرفِ اولیت اور عظمتِ سبقت ضرور حاصل تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک پورا گھرانا بنو حارث بن مطلب آغازِ عہدِ مکہ ہی میں مسلمان ہو گیا تھا چنانچہ اس کے تین اہم ارکان حضرات عبیدہ بن حارث بن مطلب اور ان کے دو بھائیوں طفیل اور حصین کا شمار قدیم ترین مکی مسلمانوں میں ہوتا ہے۔[۱۴۷] حضرت عبیدہ ان معدودے چند قدیم مسلمانوں میں سے ایک تھے جن کی عمر قبولِ اسلام کے وقت پچاس سے متجاوز تھی۔[۱۴۸] مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دس اولادیں تھیں جن میں سے چھ بیٹے تھے اور وہ سب کے سب مسلمان تھے۔[۱۴۹] ہمارے بعض مورخین کا خیال ہے کہ ان کی تمام اولادیں کم عمر اور نابالغ تھیں مگر یہ صحیح نہیں ہے۔[۱۵۰] پچاس سال کی پختہ عمر کے عرب کی اولادیں خاص کر پہلی اولادیں جوان اور بالغ ہوتی تھیں۔ ان کے دونوں بھائیوں کی اولادیں بھی تھیں اور وہ سب بھی مسلمان تھیں۔ مآخذ سے اگرچہ اس کی مکمل تصریح نہیں ملتی ہے۔[۱۵۱] یہ تینوں بھائی مہاجرین مدینہ میں اولیت رکھتے تھے اور بدری صحابہ ہونے کا شرف بھی۔ قیاس کہتا ہے کہ ان کا پورا خاندان ابتدائی مکی مسلم تھا اور ان کے سب مرد، عورتیں اور بچے ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے تھے۔[۱۵۲]

اس خاندان کا ایک ذیلی گھرانا عباد بن مطلب کا تھا۔ اس کے اولین مسلم حضرت مسطح بن اثاثہ بن عباد تھے جو زمانۂ مکی میں اسلام لائے تھے۔ وہ ایک طرف تو حضرت عبیدہ بن حارث مطلبی کے بھتیجے تھے تو دوسری جانب حضرت ابو بکر صدیق تیمی کے خالہ زاد بھائی بھی۔ ان کی معاشی حالت خاصی خراب تھی چنانچہ ان کی کفالت کا بار ان کے خالہ زاد بھائی حضرت ابو بکر صدیق نے اٹھا رکھا تھا اور وہ مدنی عہد میں بھی ان کی کفالت کرتے رہے تھے۔[153] ان کی والدہ ماجدہ حضرت اُمِ مسطح بھی ابتدائی مکی عہد کی مسلم تھیں، اور اپنے فرزند کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آ بسی تھیں۔[154] خیال یہ ہے کہ حضرت مسطح نے حضرت ابو بکر کے زیرِ اثر اسلام قبول کیا تھا۔[155] ممکن ہے کہ ان پر ان کے چچا کے خاندان کا بھی اثر پڑا ہو۔ ان کے گھرانے کے بارے میں مزید تفصیلات نہیں ملتی ہیں۔

بنو مطلب میں بنو مخرمہ بن مطلب کا گھرانا بھی شروع ہی سے اسلام سے متعارف ہوا تھا۔ ان کے دو فرزند قیس بن مخرمہ اور صلت بن مخرمہ کے علاوہ موخر الذکر کے فرزند جہیم بن صلت اور دو پوتے حکیم بن جہیم اور عمرو بن جہیم ابتدائی مسلم تھے اور مدینہ ہجرت کر کے جا بسے تھے جہاں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خیبر کی پیداوار کے خمس سے طعمہ (رزق / روزینہ) عطا فرمایا تھا۔[156]

ایک اور گھرانا ہاشم بن مطلب کا تھا۔ اس کے مکی عہد کے مسلمانوں میں عبد یزید، رکانہ اور عجیر کے نام ملتے ہیں۔ امکان یہ ہے کہ انھوں نے مکی دور کے نصف آخر میں اسلام قبول کیا تھا۔[157]

علقمہ بن مطلب کے گھرانے کے تین بزرگوں ابو نبقہ عبد اللہ، ندیم اور جنادہ کا شمار صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کا زمانۂ قبولِ اسلام کیا تھا۔[158] ممکن ہے کہ وہ مکی دور کے مسلم ہوں اور اس کا بھی امکان ہے کہ انھوں نے بعد میں اسلام قبول کیا ہو۔

امکان ہی نہیں بلکہ تقریباً یقینی ہے کہ بنو مطلب میں اور بھی متعدد مکی اور مدنی عہد کے مسلمان تھے جن کا ذکر مآخذ میں آنے سے رہ گیا ہے۔ لیکن ان کی تعداد کیا تھی یہ کہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے البتہ اندازہ یہ ہے کہ کل تعداد ڈیڑھ سو افراد پر مشتمل رہی ہوگی۔

(د) بنو نوفل

ہمارے مآخذ عموماً بنو ہاشم اور بنو مطلب کو ایک طبقہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور بنو عبد شمس / بنو امیہ اور بنو نوفل کو دوسرا طبقہ۔[159] اور عموماً ان دونوں طبقوں کو زمانۂ جاہلیت سے ایک دوسرے کا حریف اور مدِ مقابل بنا کر بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ چند اسباب و عوامل کے سبب بنو ہاشم اور بنو مطلب ایک دوسرے کے قریب تر تھے انہی کے سبب بنو امیہ اور بنو نوفل کے درمیان زیادہ ہم آہنگی تھی لیکن ان دونوں مفروضہ یا مبینہ طبقوں کے درمیان کوئی سیاسی یا سماجی رقابت یا عداوت نہیں تھی۔ ان خاندانوں کے درمیان منافرت و مسابقت کے جو بعض واقعات ملتے ہیں وہ عموماً بعد کے گھڑے ہوئے

معلوم ہوتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ان کو عم زادوں کی چشمک کہا جا سکتا ہے، حریفوں یا دشمنوں کی رقابت نہیں۔[۱۹۰] اس باہمی چپقلش و چشمک کے باوجود مکہ کے دوسرے قریشی خاندانوں یا دوسرے قبائلِ عرب کے مقابلہ میں یہ چاروں خاندان ایک متحدہ لطنِ قریش ــ بنو عبد مناف ــ کی مانند تھے اور وہ بطور ایک سماجی اور سیاسی اکائی کے کام کرتے تھے۔

لیکن اسلام کے مقابلہ میں ہر قبیلہ اور خاندان نے قبائلی روش سے ہٹ کر الگ وطیرہ اپنایا تھا چنانچہ اس پر ذرا بھی حیرت نہیں ہونی چاہیئے کہ بنو عبد مناف کے اس گھرانے نے اپنے تینوں برادر خاندانوں کی اسلام کے سلسلہ میں ذرا بھی پیروی نہیں کی تھی۔[۱۹۱] ابنِ اسحاق اور ابنِ سعد نے اس گھرانے کے کسی ابتدائی مکی عہد کے مسلم کا ذکر نہیں کیا ہے[۱۹۲] اور اگر کوئی الیا رکن بنی نوفل ہے تو ان کے ایک حلیف حضرت عتبہ بن غزدان مازنی اور ان کے مولیٰ حضرت خباب یہ دونوں ابتدائی مسلمانوں میں شامل ہونے کے علاوہ مہاجرِ حبشہ بھی تھے۔ اور بدری صحابہ بھی۔[۱۹۳] بعض روایات ان کے مولیٰ کو دونوں طبقات میں شمار نہیں کرتیں۔

یہ صحیح ہے کہ بعثتِ نبوی کے زمانے میں بنو نوفل کو وہ مقام مکی سماج میں حاصل نہیں تھا جو بڑے بطونِ قریش کو تھا اس کا سب سے بڑا سبب ان کی عددی طاقت کی کمزوری تھی۔ سماجی اور اقتصادی کمزوری اور صلاحیتوں کا فقدان دوسرے اسباب تھے تاہم وہ بالکل ہی فروتر اور بے مایہ نہ تھا کیوں کہ اسی زمانے کے لگ بھگ یہ خاندان مکی اشرافیہ کے ایک اہم منصب رفادہ کا حقدار بنا تھا اور غالباً یہ بنو ہاشم سے عہدہ اسے ملا تھا۔[۱۹۴] یہ بھی قابلِ ذکر حقیقت ہے کہ سفرِ طائف کے بعد جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھرانے بنو ہاشم کی حمایت و حفاظت سے محروم ہو گئے تھے تو یہی بنو نوفل اور ان کے سردار معطم بن عدی بن نوفل تھے جنہوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جوار (پناہ) دی تھی اور غالباً ہجرتِ مدینہ تک آپ اسی جوار کے سائے میں مکہ میں رہے تھے۔ اس حسنِ سلوک اور احسان کو آپ نے ہمیشہ یاد رکھا تھا۔[۱۹۵]

بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو نوفل کا گھرانا فتحِ مکہ کے زمانے میں اسلام لایا تھا۔ ممکن ہے کہ ان کے کچھ افراد صلح حدیبیہ یا اس کے معاً بعد کے زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئے ہوں لیکن مآخذ میں ان کے بارے میں سکوت پایا جاتا ہے۔ اس خاندان کے نمائندہ صحابی حضرت جبیر بن مطعم بن عدی تھے اور غالباً وہ فتحِ مکہ یا اس کے آس پاس کے زمانے میں اسلام لاتے تھے۔[۱۹۶] بہرحال انساب کی کتابوں کے مطابق نوفل بن عبد مناف کے پانچ فرزند تھے عدی، عمرو، ابو عمرو، عبد عمرو اور عامر تھے اور ان میں سے ہر ایک کی متعدد اولادیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ فتح مکہ میں اس خاندان کے تمام باقی افراد نے اسلام قبول کر لیا تھا۔[۱۹۷]

(۲) بنو مخزوم

اگر بنو عبد مناف کا کوئی مدِمقابل، حریف اور برابری کا دعویٰ رکھنے والا گروہ تھا تو وہ تھا خاندانِ بنی مخزوم عام طور سے ہمارے مآخذ بھی اور جدید مورخین بھی بنو مخزوم کو بنو ہاشم کا حریف اور مدِمقابل اور بنو امیہ کا حلیف و

دوست بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔[۱۶۸] بنو مخزوم دراصل بنو عبد مناف کے حریف تھے[۱۶۹] لیکن اسلام کے معاملہ میں ان کی رقابت و عصبیت قبائلی سے زیادہ انفرادی اور مذہبی تھی۔ ابو جہل مخزومی اسلام کے بدترین دشمنوں میں سرِفہرست تھا تاہم اس کی عداوت کلیتاً قبائلی حمیت کے سبب نہ تھی۔ اس میں اس کے ذاتی عناد کو بھی کافی دخل تھا۔[۱۷۰] عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ابو جہل مخزومی بعثتِ نبوی کے زمانے سے غزوۂ بدر تک سردارانِ قریش میں عظیم و بلند ترین مقام کا مالک تھا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔[۱۷۱] وہ شیوخ و ساداتِ قریش کی دوسری صف کے قائدین میں شمار ہوتا تھا۔[۱۷۲] یہ بات بھی اہم ہے کہ اس کو مکی اشرافیہ میں سے کوئی منصب حاصل نہیں تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ بڑی صلاحیتوں کا مالک تھا اور اسی لیے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے یا حضرت عمر کے قبولِ اسلام کے لیے دعا مانگی تھی تاکہ اس کی ہمت و دلیری، دبنگ فطرت، معاملہ فہمی اور قیادت کی لیاقت سے فائدہ اٹھایا جا سکے مگر دعائے رسول حضرت عمر کے حق میں قبول ہو گئی اور وہ سعادت سے محروم اور شقاوت و بدبختی کا پیکر بن کر رہ گیا۔[۱۷۳]

ابو جہل عمرو بن ہشام مخزومی کی دشمنیٔ اسلام اور مخالفتِ رسول کے پس منظر میں دیکھیے تو یہ حقیقت کتنی حیرت ناک و عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اسلام نے اسی کے گھر میں سب سے پہلے قدم جمائے تھے۔ بنو مخزوم کے ابتدائی مکی مسلمانوں میں حضرات ابو سلمہ بن عبد الاسد، ان کی اہلیہ محترمہ حضرت اُم سلمہ اور ان کے فرزند سلمہ،[۱۷۴] عیاش بن ابی ربیعہ اور ارقم بن ابی ارقم[۱۷۵] ابو جہل کے قریبی عزیز تھے۔[۱۷۶] حضرت عیاش تو اس دشمنِ اسلام کے ماں جائے بھائی تھے جب کہ حضرت ابو سلمہ اور ارقم اس کے دادا مغیرہ کے بھائیوں کی اولاد ہونے کے ناطے اس کے عم زاد بھائی تھے۔ طرفہ ستم یہ کہ ابو جہل کے حقیقی بھائی حضرت سلمہ بن ہشام بھی ان رشتہ داروں کے ساتھ ہی یا ان کے معاً بعد مگر ہجرتِ حبشہ سے قبل مسلمان ہو گئے تھے۔ ابو جہل کے ظلم و ستم سے جن مخزومیوں نے تنگ آ کر حبشہ کو ہجرت کی تھی ان میں حضرت سلمہ بھی شامل تھے۔ ایک سال بعد حبشہ سے واپسی پر وہ ابو جہل کی قیدِ بلا میں گرفتار ہو گئے اور اس ظالمِ مکہ اور فرعونِ امت کی غزوۂ بدر میں عبرت ناک موت کے بعد بھی وہ خندق کے زمانے تک محبوس و مقید رہے تھے۔[۱۷۷] اسی طرح ابو جہل حضرت عیاش کو بھی مکر و فریب سے کام لے کر ہجرتِ مدینہ کے بعد قبا سے بلا کر لایا تھا اور قید کر دیا تھا۔ حضرت ابو سلمہ کو اپنے خاندان سمیت حبشہ ہجرت کرنا پڑی تھی۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ارقم بن ارقم مخزومی کا معاملہ نہ صرف مختلف تھا بلکہ وہ ابو جہل کے ہم پلہ بلکہ بعض لحاظ سے بہتر مقابل تھے۔ عام طور سے مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ارقم مخزومی قبولِ اسلام کے وقت بہت کم عمر تھے[۱۷۸] لیکن یہ بیان ناقابلِ فہم بن جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنا گھر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف قیامِ نبوی کے لیے پیش کیا تھا بلکہ اس کو اسلامی دعوت و تبلیغ کا اولین مرکز بھی بنایا تھا۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ بنو مخزوم کے ایک فرد نے ابو جہل مخزومی اور اس کے حامی اراکینِ خاندان کی اس طرح کھلم کھلا مخالفت کی تھی اور ان کے اقتدار کو للکارا تھا۔ مآخذ کی کسی روایت سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ حضرت ارقم کے اس طرح اسلام قبول کرنے اور اس کی حمایت و

نصرت کرنے کے سلسلہ میں ابوجہل نے ان کے خلاف انگلی بھی اٹھانے کی جرأت کی ہو۔ اس صورت میں یہ نتیجہ نکالنا بعید از حقیقت نہ ہوگا کہ حضرت ارقم بذاتِ خود اتنے طاقتور تھے کہ نوعمری کے باوجود ابوجہل جیسے بااثر شخص کی مخالفت مول لے کر زندہ و توانا رہ سکیں یا ان کو بنو مخزوم کے کسی اہم اور طاقت ور طبقہ کی حمایت و پشت پناہی حاصل تھی جس کی بنا پر ابوجہل ان کے یا ان کے مکان میں جوار لینے والے انسان کامل اور پیغمبر اسلام کے خلاف کچھ کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔

ابوجہل مخزومی کی عداوتِ اسلام جتنی بڑھتی جاتی تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خاندان اور حلفاء اور موالی میں اسلام اتنی ہی تیز رفتاری سے پھیلتا جا رہا تھا۔ کم از کم چھ حلفاء بنی مخزوم کے ابتدائی مکی عہد میں قبولِ اسلام کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں ایک خاندان تو حضرت عمار بن یاسر عنسی مذحجی کا تھا جو ان کے والد یاسر اور والدہ سمیہ پر مشتمل تھا۔ مآخذ عموماً حضرت عمار کے دوسرے بھائی بہنوں کا ذکر اس ضمن میں نہیں کرتے ہیں لیکن دوسرے مقامات پر ان کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کم از کم ایک بھائی بھی ابتدائی مسلمان تھے۔[179] حضرت معتب بن عوف خزاعی بھی بنو مخزوم کے حلیف اور ابتدائی مسلمان تھے اور ان کے علاوہ دو اور حلیف بھی اسی دورِ اول کے مسلم تھے۔[180] تقریباً یہ یقینی ہے کہ بنو مخزوم کے مزید حلفاء اور موالی نے مکی دور میں اسلام قبول کیا تھا۔

خود خاندانِ بنو مخزوم کے متعدد گھرانوں میں اسلام اسی تیز رفتاری یا مستعدی کے ساتھ پھیل رہا تھا۔ چنانچہ مکی دورِ اول کے مسلمانوں میں ہم کو مختلف گھرانوں کے افراد کے نام ملتے ہیں ان میں حضرات شماس (عثمان) بن عثمان بن شرید،[181] ہبار بن سفیان بن عبدالاسد[182] اور ان کے برادرِ حقیقی عبداللہ[183] اور ہشام بن ابی حذیفہ بن مغیرہ[184] کے علاوہ عمر بن سفیان اور عبیداللہ بن سفیان اور ان دونوں کے متعدد بھائیوں اور رشتہ داروں اور عزیزوں کے اسمائے گرامی ملتے ہیں۔ مذکورہ بالا مسلمان نہ صرف قدیم الاسلام تھے بلکہ ہجرتِ حبشہ کی سعادت بھی رکھتے تھے جب کہ ان میں سے بعض نے بعد کے زمانے میں کارنامے انجام دیئے تھے اور غزوہ موتہ یا جنگِ یرموک میں شہید ہوتے تھے۔ ہجرتِ حبشہ ظاہر ہے مسلمانوں کی سماجی اور اجتماعی کمزوری اور قریش کے ظالموں کے ظلم و ستم کے سامنے عدمِ دفاع کے سبب ہوئی تھی مگر ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ جب مہاجرینِ حبشہ میں کچھ حضرات ایک سال بعد مکہ واپس آ گئے تو بنو مخزوم کے بعض افراد کو ان کے ننہالی رشتہ داروں نے اپنی جوار میں لے لیا۔ چنانچہ یہ کتنی حیرت انگیز حقیقت ہے کہ حضرت ابو سلمہ بن عبدالاسد مخزومی کی حفاظت و حمایت کسی اور نے نہیں بلکہ دشمنِ اسلام ابولہب ہاشمی نے کی تھی کیوں کہ صحابی موصوف اس کی بہن کے فرزند تھے[185] جب کہ اسی ظالم نے اپنے حقیقی بھتیجے محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک طوفانِ بلا کھڑا کر دیا تھا۔ اسی طرح مآخذ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شماس بن عثمان مخزومی کو بنو عبد شمس کے ایک اہم ترین سردار اور مکہ کے عظیم ترین قائد عتبہ بن ربیعہ کی حمایت و نصرت و محبت حاصل تھی کیوں کہ وہ بھی اس کے چہیتے بھانجے تھے۔[186] بہر حال بنو مخزوم کے متعدد خاندانوں / گھرانوں میں اور بھی کئی مسلمان تھے جن کا ذکر صراحتاً سیرتِ نبوی کے مآخذ میں نہیں ملتا لیکن دوسرے مآخذ میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ اندازہ ہے کہ مکی عہد کے دونوں ادوار میں بنو مخزوم کے مسلمانوں کی کافی معتد بہ تعداد تھی جو بعد میں مدینہ ہجرت کر گئی۔[187]

ہجرت نبوی کے بعد بھی بنو مخزوم میں اسلام کی اشاعت جاری رہی۔ ان کے ایک مولیٰ حضرت حکم بن کیسان نے سریہ نخلہ میں اپنی گرفتاری کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا اور مدینہ ہی میں بس گئے تھے۔[۱۸۸] قبولِ و تاثیرِ اسلام کی ایک درخشاں مثال حضرت ولید بن ولید مخزومی کی ہے۔ وہ حضرت خالد بن ولید مخزومی کے حقیقی بھائی تھے۔ غزوۂ بدر میں کفر کی جانب سے مسلمانوں سے لڑے مگر گرفتار ہو کر مدینہ آ گئے جہاں سے کچھ مدت کے بعد ان کے بھائی فدیہ دے کر انھیں چھڑا لے گئے۔ راستے سے بھائیوں کو چکمہ دے کر مدینہ پہونچے اور اسلام قبول کر لیا۔ ان کے بھائیوں نے مکر و فریب سے ان کو مکہ لے جا کر محبوس و مقید کر دیا۔[۱۸۹] خیال یہ ہے کہ بدر اور صلح حدیبیہ کے درمیانی عرصہ میں بھی بنو مخزوم میں اسلام کی اشاعت جاری رہی تھی۔

صلح حدیبیہ کے بعد جب اسلام نے مکہ کے گھر گھر میں ڈیرہ ڈالا تو بنو مخزوم بھی اس کے فیضانِ عام سے نہ بچ سکے۔ اس عہد میں حضرت خالد بن ولید مخزومی کا قبولِ اسلام تاریخ اسلام کا ایک اہم واقعہ ہے۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اسلام قبول کرنے کی تحریک ان کے مسلم و مہاجر بھائی حضرت ولید بن ولید کی جانب سے ہوئی تھی جو اس وقت مدینہ پہنچ چکے تھے۔ اور انھوں نے حضرت خالد تک رحمتِ نبوی کی خوشخبری پہنچائی تھی۔[۱۹۰] قرائن کہتے ہیں کہ اسی زمانے میں متعدد مخزومیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔

فتح مکہ اسلام کے ہمہ گیر فیضانِ عام کا دیباچہ تھا چنانچہ اس عظیم دن یا اس کے مابعد تمام دوسرے قریشی خاندانوں کی مانند بنو مخزوم نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ ان میں ابو جہل کے فرزندِ دلبند حضرت عکرمہ بن ابی جہل بھی شامل تھے جو اپنی مخزومی مسلم اہلیہ حضرت ام حکیم بنت حارث کی تحریک و تبلیغ پر ایمان لائے تھے۔[۱۹۱] ان کے علاوہ ابو جہل کی والدہ ماجدہ حضرت اسماء بنت مخربہ دارمی بھی اسی موقع پر اسلام لائی تھیں۔[۱۹۲] حضرات حارث بن ہشام[۱۹۳] اور سعید بن یربوع[۱۹۴] دو اہم مخزومی سردار تھے جن کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خمس ہوازن میں سے اپنے گراں قدر عطیات سے نوازا تھا۔ ابو جہل کے خاندان کے ایک اور فرد حضرت جویریہ کے قبولِ اسلام کا بھی ذکر ملتا ہے۔[۱۹۵] ام المومنین حضرت ام سلمہ کے دو بھائی حضرات عبداللہ بن ابی امیہ مخزومی اور ان کے مشہور بھائی مہاجر بھی فتح مکہ کے مسلمانوں میں شامل تھے۔[۱۹۶] ان کے علاوہ حضرات عبداللہ بن ابی ربیعہ مخزومی،[۱۹۷] ولید بن عبد شمس بن مغیرہ مخزومی،[۱۹۸] ابو عمرو بن حفص مخزومی،[۱۹۹] عمرو بن عثمان مخزومی اور ان کے دو فرزند حریث[۲۰۰] اور عمرو اور ایک پوتے سعید بن حریث،[۲۰۱] عبداللہ بن ابی سائب مخزومی اور ان کے بھائی عبدالرحمٰن[۲۰۲] و اہیب بن خالد مخزومی اور سہل بن وہب مخزومی فتح مکہ کے مسلمانوں میں نمایاں ترین تھے۔[۲۰۳]

بہر حال کچھ ایسے بھی بد قسمت تھے جو اسلام کی رحمتِ عام سے محروم اس موقع پر بھی رہے۔ ان میں حضرت ام ہانی بنتِ ابی طالب ہاشمی کا مخزومی شوہر، ہبیرہ بن ابی وہب تھا جو مکہ سے فرار ہوا اور بحالتِ کفر نجران میں مر گیا۔ مگر یہ بات اس کے لیے کتنی اذیت ناک تھی کہ اس کی اپنی بیوی اور اولاد میں عمر، ہانی، یوسف اور جعدہ ـ اسی اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے تھے۔[۲۰۴] اسی گھرانے کے بلکہ ہبیرہ کے حقیقی بھائی حضرت سہل بن ابی وہب بن حزن، مخزومی اور ان کے پانچ فرزند ـ حکیم بن حزن، مسیب، عبدالرحمٰن، سائب اور ابو سعید ـ بھی فتح مکہ کے مسلمانوں میں شامل تھے۔[۲۰۵] عدی

لحاظ سے بنو مخزوم بنو امیہ/بنو عبد شمس کے قریب قریب ہم پلہ تھے لہٰذا ان کے کل مسلمانوں کی تعداد دو تین ہزار سے کسی طرح سے کم نہیں تھی (۲۰۶)

(۳) بنو عدی

مکی سماج میں بنو عدی کے خاندان کو عزت و افتخار بھی حاصل تھا اور مکی اشرافیہ میں سفارہ منافرہ کا اہم منصب بھی چھٹی صدی میں اس منصب عظیم پر فائز ہونے والوں میں نفیل بن عدی اور خطاب بن نفیل تھے اور بعثت نبوی کے قریب خطاب کے فرزند حضرت عمر فاروق تھے۔ (۲۰۷) اسی خانوادہ کو مکی سماج میں جو مقام حاصل تھا وہ بنو مخزوم کے ہم پلہ تھا چنانچہ بعثتِ نبوی کے وقت بنو عدی کے عمر بن خطاب اور بنو مخزوم کے ابو جہل کو تقریباً ان کی اپنی صلاحیتوں کے سبب برابر کا مقام حاصل تھا اگرچہ بنو عدی اتنے عددی اعتبار سے طاقتور نہیں تھے جتنے کہ بنو مخزوم لیکن ان کی سماجی منزلت، مذہبی وقار، تہذیبی افتخار اور اقتصادی ثروت کے سبب ان کا مقام بنو مخزوم کے ساتھ یا کچھ بعد میں آتا ہے۔ اس کا ایک ثبوت ان کے حلفاء اور موالی کی کثرتِ تعداد سے ہوتا ہے۔ بعثتِ نبوی سے قبل نفیل کے ایک فرزند زید نے بت پرستی اور مکہ کے قدیم جاہلی مذہب کو ترک کر کے اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے احناف کا افتخار بھی حاصل کر لیا تھا۔ (۲۰۸)

غالباً یہی مذہبیت تھی یا تلاشِ حق کی لگن جس نے زید بن نفیل کے فرزند حضرت سعید عدوی کو اسلام قبول کر لینے پر آمادہ کر لیا تھا۔ وہ قدیم ترین مکی مسلمان تھے۔ وہ حضرت عمر بن خطاب کے چچا زاد بھائی اور بہنوئی بھی تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ حضرت فاطمہ بنت خطاب نے بھی مکی دورِ اول کے آغاز میں ہی اپنے شوہر کے ساتھ اسلام قبول کر لیا تھا۔ (۲۰۹) حضرت سعید بن زید عدوی کی ایک بہن حضرت عاتکہ بنت زید بھی قدیم مکی مسلمان تھیں اور حضرت ابوبکر تیمی کے مسلمان صاحبزادے حضرت عبداللہ تیمی کو بیاہی تھیں۔ ان دونوں میاں بیوی نے ایک ساتھ ہجرت مدینہ کی سعادت حاصل کی تھی۔ (۲۱۰) حضرت سعید بن زید کے دوسرے اہلِ خاندان خاص کر ان کے بھائیوں اور فرزندوں کے بارے میں ہمارے ماخذ زیادہ روشنی نہیں ڈالتے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احنافِ قدیم کا یہ خاندان پورا مسلمان ہو گیا تھا۔

بنو عدی کے ایک گھرانے کے ایک اولین مسلم حضرت نعیم بن عبداللہ تھے جو اپنے پیشۂ آہن گری کے سبب النحام کے لقب سے معروف ہیں۔ ہمارے بعض مورخینِ جدید نے ان کو ان کے پیشے کے سبب ایک کمتر مسلمان سمجھ لیا ہے اور ان کے کئی برس تک مدینہ ہجرت نہ کرنے کے سبب ان کے اسلام کو ضعیف محمول کیا ہے۔ یہ دونوں خیال غلط ہیں وہ پکے مسلمان ہی خاصے مالدار بلکہ بنو عدی کے مالدار ترین افراد میں سے ایک اور اپنے قبیلے اور قریش مکہ کے با اثر سرداروں میں سے تھے۔ (۲۱۱) اس کا ثبوت اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال اور لواحقین کے علاوہ بنو عدی کے یتیموں، بیواؤں، بے کسوں کی کفالت کرتے تھے اور اپنی اسی فیاضی، سخاوت اور دریا دلی کے لیے اتنے مقبول و با اثر تھے کہ ان کو خود ان کے خاندان والوں نے ہجرت نہیں کرنے دی تھی اور مکہ میں ان کے اسلام پر عامل ہونے کے

باوجود ان کو بعد عزت و احترام رکھا تھا اور قریش مکہ کے ظالموں کو بھی جرأت نہ ہوئی تھی کہ کوئی ان کی طرف انگلی بھی اٹھا سکتا۔ ابن سعد کے مطابق وہ گیارھویں مسلمان تھے اور صلح حدیبیہ کے زمانے میں جب انھوں نے مدینہ ہجرت کی تھی تو ان کے ساتھ ان کے خاندان (اہل) کے چھوٹے بڑے چالیس افراد تھے۔ قیاس یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مکی عہد کے اواخر اور مدنی عہد کے آغاز میں مسلمان ہوئے تھے اور کافی لوگ قدیم مکی عہد کے مسلمان بھی تھے۔ اسی سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ہجرت نبوی کے بعد بھی صلح حدیبیہ تک بنو عدی کے اس خاندان میں کم از کم اسلام کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ حضرت نعیم بن عبداللہ النحام کے خاندان میں ان کے ایک فرزند حضرت ابراہیم، ان کی زوجہ محترمہ حضرت زینب بنت حنظلہ اور موخر الذکر کی ایک پھوپھی حضرت جربا بنت مسامہ اور ایک دختر امت بنت نعیم وغیرہ کا مکی عہد کے مسلمانوں میں شمار کیا گیا ہے۔[۲۱۲]

بنو عدی کی ایک قدیم عہد مکہ کی مسلمان تھیں حضرت شفا بنت عبداللہ بن عبد شمس اور دوسرے تھے ان کے صاحبزادے حضرت سلیمان بن ابی خیثمہ عدوی، ابو خیثمہ کا مکی عہد میں انتقال ہو گیا تھا اور ان کے فرزند و زوجہ نے ہجرت نبوی سے کچھ قبل مدینہ ہجرت کی تھی۔[۲۱۳]

مکی عہد قدیم کے ابتدائی مسلمانوں میں اس خاندان بنو عدی کے مختلف گھرانوں کے متعدد افراد شامل تھے جن میں حضرات معمر بن عبداللہ[۲۱۴]، عدی بن نضلہ اور ان کے فرزند نعمان بن عدی[۲۱۵]، عروہ بن ابی اثاثہ[۲۱۶]، مسعود بن سوید[۲۱۷]، عبداللہ بن سراقہ اور ان کے بھائی عمرو[۲۱۸] اور حضرت خارجہ بن حذافہ[۲۱۹] کے علاوہ متعدد مرد اور خواتین جیسے حضرت ارنب بنت عفیف[۲۲۰] وغیرہ نمایاں ترین تھے۔

اگرچہ حضرت عمر بن خطاب عدوی مکی دور تبلیغ و اشاعت اسلام کے نصف ثانی کے آغاز یعنی سنہ ۶ نبوی ۶۱۶ء کے لگ بھگ اسلام لائے تھے لیکن ان کے خاندان کے دوسرے افراد ان سے قبل مسلمان ہو چکے تھے۔ ان کی بہن حضرت فاطمہ بنت خطاب کے علاوہ ان کے حقیقی بھائی حضرت زید بن خطاب جن سے حضرت عمر کو بے انتہا محبت تھی کافی پہلے غالباً اپنی بہن کے ساتھ اسلام کے حلقہ بگوش ہو چکے تھے۔[۲۲۱] بہر حال حضرت عمر کا قبول اسلام در اصل مکہ میں تاریخ اسلام میں مسلمانوں کی قوت و شوکت و حشمت کی تابناک ترین مثال ہے اور کاروانِ اسلام کی ایک اہم ترین منزل۔ مسلمانوں کو پہلی بار اسلام کا با جماعت علانیہ اظہار کرنے کا موقع ملا تھا۔[۲۲۲] دعائے رسول سے حضرت عمر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن اسی ضمن میں یہ بھی بیان کر دیا جائے کہ حضرت عمر کے اسلام کی خبر جیسے ہی مکہ میں پھیلی تو بنو سہم کے ایک عظیم ترین سردار اور شیوخ مکہ میں سے اہم ترین فرد عاص بن وائل سہمی نے ان کے بنا طلب کیے ان کو اپنی جوار میں لینے کا اعلان کر دیا تھا۔[۲۲۳] اس کے علاوہ ماخذ میں ایک بھی روایت ایسی نہیں ملتی جس سے یہ معلوم ہو کہ قریش مکہ کے سخت ترین دشمنوں میں سے بھی کسی نے ان کے منہ آنے کی جسارت کی ہو۔ بہر حال حضرت عمر کے ساتھ ان کا پورا گھرانا مسلمان ہو گیا تھا[۲۲۴] بلکہ بعض افراد تو پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے۔ ان میں حضرت عمر کے فرزند اکبر حضرت عبداللہ[۲۲۵] اور دختر حضرت حفصہ[۲۲۶]

اور ان دونوں کی والدہ ماجدہ جو بنو جمح کے ایک عظیم و قدیم مسلم حضرت عثمان بن مظعون کی حقیقی بہن تھیں اور جن کا نام حضرت زینب بنت مظعون تھا، شامل تھے۔ حضرت عمر کے دوسرے فرزندانِ گرامی حضرات عبدالرحمٰن اکبر، زید، عاصم عبیداللہ وغیرہ بھی صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔[۲۲۷] اسی طرح حضرت زید بن خطاب کی اہلیہ اور فرزند بھی قدیم مکی مسلمان تھے[۲۲۸] ممکن ہے کہ ان دونوں گھرانوں کے اور بھی افراد قدیم مسلمانوں میں شامل رہے ہوں۔

ماخذ سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمر کو قبولِ اسلام پر آمادہ کرنے والے عوامل و اسباب میں ان کے بہنوئی اور بہن کا خاصا اثر تھا۔ یہ قیاس بھی صحیح ہے کہ ان کے برادرِ نسبتی حضرت عثمان بن مظعون جمحی کا اثر پڑا ہو۔ کچھ ان کو مائل کرنے میں ان کے چچا زید بن نفیل کی "حنفیت" کا بھی دخل رہا ہو گا۔ کسی حد تک ان کے خلفاء کے اسلام اور ضعفاء مسلمین خاص کر وہ کمزور مسلمان جن کو حضرت عمر بحالت کفر سخت ترین ایذائیں دیتے تھے کی صلابت اور ثابت قدمی نے بھی ان کو مائل بہ اسلام کیا ہو گا لیکن آخری وار یا ضرب کاری خود کلام ربانی نے لگائی تھی جس نے ان کے جسم و جاں کے ریشے ریشے کو ہلا دیا تھا۔[۲۲۹] مونٹگمری واٹ کا یہ قیاس بے جا اور گمراہ کن ہی نہیں بلکہ تاریخی حقیقت کے خلاف ہے کہ اقتصادی بدحالی اور معاشی زوال نے ان کے اسلام قبول کرنے میں کوئی حصہ لیا تھا۔[۲۳۰] ابن اسحاق کی واضح روایت ہے کہ ہجرت مدینہ کے وقت حضرت عمر قریشِ مکہ کے مالدار ترین شخص تھے۔[۲۳۱] روایت میں مبالغہ بھی سمجھ لیا جائے جس کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے تو بھی وہ قریش کے اس وقت کے متمول ترین افراد میں ضرور تھے۔

بنو عدی خاص کر حضرت عمر کے خاندان کے موالی اور حلفاء بھی قدیم دور کے مسلمان تھے۔ ان میں حضرت عمر کے ایک غلام حضرت مہجع بھی شامل تھے۔[۲۳۲] حلفاء میں بنو بکیر/کنانہ کا گھرانا تھا جس کے چار افراد حضرات عامر، خالد، عاقل اور ایاس، فرزندانِ بکیر کے نام عموماً گنائے جاتے ہیں۔[۲۳۳] لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے علاوہ دوسرے متعدد مرد اور عورتیں اور بچے بھی ابتدائی مسلمانوں میں شامل تھے۔ بنو بکیر کے علاوہ دوسرے حلفاء بنی عدی میں قدیم مسلمان تھے۔ حضرات واقد بن عبداللہ تمیمی، خولی بن ابی خولی، ان کے بھائی مالک، عامر بن ربیعہ عنزی اور ان کی اہلیہ گرامی حضرت لیلیٰ بنت ابی حثمہ۔[۲۳۴]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنی عدی کے بعض گھرانے خصوصاً حضرت عمر کا پورا گھرانا اسلام لا چکا تھا اور مدینہ ہجرت کر کے جا چکا تھا۔ امکان ہے کہ ان کے بعض افراد نے ہجرتِ نبوی کے بعد اسلام قبول کر کے مکہ چھوڑا ہو۔ یہی سبب ہے کہ صلح حدیبیہ سے پہلے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو اپنا سفیر بنا کر قریش مکہ سے گفتگو کرنے کے لیے شہر بھیجنا چاہا تھا تو انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی تھی کہ ان کے گھرانے کا کوئی فرد مکہ میں نہیں بچا ہے جو ان کی حفاظت و حمایت میں قریش سے ٹکر لے سکے۔[۲۳۵]

بہرحال مکہ میں بنو عدی کے بعض گھرانے اب بھی بحالتِ کفر موجود تھے لیکن یہ دلچسپ و اہم حقیقت ہے کہ وہ اسلام کے زیادہ مخالف نہ تھے چنانچہ غزوۂ بدر سے قبل ابوجہل کی دھمکی کے باوجود شام سے لوٹنے والے قریشی کاروان کے محفوظ ہو جانے کی خبر سن کر جنگ میں حصہ لیے بغیر مکہ لوٹ گئے تھے۔[۲۳۶] ظاہر ہے کہ وہ ابوجہل مخزومی اور اس کے حامیوں

کی طاقت سے مرعوب نہ تھے۔ بہر حال بنو عدی کے باقی ماندہ افراد جو بیشتر بنو عویج بن عدی کے گھرانے سے متعلق تھے فتح مکہ میں مسلمان ہو گئے تھے ان میں حضرات ابو جہم بن حذیفہ، ان کے بھائی ابو حشمہ، مطیع (عاصی) بن اسود اور ان کے فرزند عبداللہ بن مطیع وغیرہ شامل تھے (۲۳۷)

(۴) بنو تیم

بنو تیم کا خاندان عددی لحاظ سے کافی چھوٹا ہونے کے باوجود مکی اشرافیہ کا رکن تھا (۲۳۸) اور اس کے بعض صاحب صلاحیت و امتیاز افراد کی موجودگی اور اقتصادی دولت کی فراوانی کے سبب اس کو سماج میں عزت و منزلت حاصل تھی بعثت نبوی سے کچھ پہلے ان کے خاندان کے ایک سربرآوردہ سردار عبداللہ بن جدعان تیمی نے خاندان تیم کو کافی افتخار بخشا تھا اور ۶۰۵ء کے لگ بھگ حلف الفضول کا اہم معاہدہ انہی کے گھر میں عمل میں لایا گیا تھا۔ (۲۳۹) اس کے بعد حضرت ابوبکر عبداللہ بن ابی قحافہ عثمان تیمی اس خاندان کے اہم ترین فرد تھے۔ وہ دولت مند تاجر، ماہر نسب قریش و عرب، معاملہ فہم سردار و سلجھے ہوئے آدمی تھے۔ (۲۴۰) ظاہر ہے کہ بنو تیم کو وہ مقام حاصل نہیں تھا جو بنو امیہ، بنو مخزوم یا بنو عدی کو حاصل تھا اور اس کا سب سے بڑا سبب ان کی عددی کمزوری تھی۔

بہر حال مکی سماج میں بنو تیم کو مقام امتیاز حاصل رہا ہو یا نہ رہا ہو سبقت اسلام کے شرف میں قریش مکہ کا کوئی بطن اور خاندان ان کے مساوی نہیں تھا۔ ان کے فرد حضرت ابوبکر صدیق نے نہ صرف سب سے پہلے قبول اسلام کا اظہار کیا تھا بلکہ بلا کسی ریب و تردد، جھجک اور لیس و پیش کے اسلام قبول کیا تھا اور اسی لیے وہ صدیق کے مرتبۂ عظیم پر فائز ہوئے۔ (۲۴۱) ہمارے ماخذ ابتدائی مسلمانوں میں خاندان صدیقی کے دو افراد حضرات اسماء بنت ابی بکر اور ان کی بہن عائشہ کو شمار کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ بچپن کی مسلمان تھیں کیوں کہ ان کی پیدائش بعثت نبوی کے بعد ہوئی تھی۔ اس خاندان گرامی کے متعدد افراد ابتدائی مسلمانوں میں شامل تھے۔ ان میں حضرت ابوبکر کی اہلیہ حضرت ام رومان، ان کے ایک جوان دیبا ہے فرزند عبداللہ اور بہو عاتکہ بنت زید عدوی، حضرت ابوبکر کی ایک اور تخذا بہن ام کلثوم جو حضرت طلحہ بن عبیداللہ تیمی کی زوجہ تھیں اور ان سب سے بڑھ کر حضرت ابوبکر کی والدہ ماجدہ حضرت ام الخیر بھی شمار کی جاتی ہیں۔ (۲۴۱) یہ دلچسپ اور قابل غور نکتہ ہے کہ ام الخیر نے اپنے شوہر ابو قحافہ کے کفر پر قائم رہنے کے باوجود اسلام قبول کر لیا تھا اور غالباً ان کی خدمت بھی کرتی رہی تھیں۔ روایات میں حضرت ابوبکر کی ایک کم عمر بہن کا ذکر ملتا ہے جو بوڑھے ابو قحافہ کی دلجوئی کے لیے مکہ ہی میں رہ گئی تھیں۔ (۲۴۳) خاندان صدیقی کے ایک اور حلیف حضرت صہیب بن سنان نمری قاسطی اور ایک مولی حضرت عامر بن فہیرہ بھی قدیم الاسلام تھے۔ (۲۴۴)

بنو تیم کے ایک اور گھرانے کے ابتدائی اور قدیم مسلمان حضرت طلحہ بن عبیداللہ تیمی تھے جو حضرت ابوبکر صدیق کے بہنوئی تھے اور انہی کی دعوت پر اسلام لائے تھے۔ ابن اسحاق نے ان کو پہلے آٹھ مسلمانوں میں شمار کیا ہے۔ وہ ایک

مالدار تاجر ہونے کے علاوہ خاصے وقیع گھرانے کے فرد تھے اور ان کا خاندان متعدد افراد پر مشتمل تھا اور وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے تھے جن میں ان کی والدہ ماجدہ بھی شامل تھیں[۲۴۵]

بنو تیم کا ایک اور گھرانا اسی ابتدائی مکی عہد میں مسلمان ہوا تھا۔ اس کے نمایاں افراد حضرت حارث بن خالد تیمی اور ان کی اہلیہ حضرت ریطہ بنت حارثہ کے علاوہ حضرت عمرو بن عثمان بھی تھے۔ یہ سب کے سب مہاجرین حبشہ میں شامل تھے حبشہ میں حضرت حارث تیمی کے ایک فرزند موسیٰ اور تین صاحبزادیاں عائشہ، زینب اور فاطمہ پیدا ہوئی تھیں۔ یہ سب حضرات و خواتین کچھ مدت کے بعد مکہ واپس لوٹ آئے تھے اور پھر وہاں سے مدینہ ہجرت کی تھی۔[۲۴۶]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہجرتِ نبوی کے بعد مکہ میں جو بنو تیم کے غیر مسلم لوگ مقیم تھے ان میں رفتہ رفتہ اسلام پھیل رہا تھا اور فتح مکہ تک یہ سلسلہ کسی نہ کسی طرح سے جاری رہا تھا۔ اس کی ایک واضح مثال حضرت ابوبکر صدیق کے فرزند اکبر حضرت عبدالرحمٰن کے قبولِ اسلام کا واقعہ ہے۔ غزوۂ بدر تک وہ کافر رہے تھے اور اسی حیثیت میں مکی فوج میں شامل ہو کر مسلمانوں اور خاص کر اپنے باپ کے مقابل آئے تھے لیکن انھوں نے صلح حدیبیہ کے بعد کسی وقت اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے اہل و عیال بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ اور وہ سب مدینہ ہجرت کر کے آ بسے تھے[۲۴۷]

بنو تیم کے باقی ماندہ افراد فتح مکہ کے دن اسلام لائے تھے۔ ان میں حضرت ابوبکر صدیق کے والد بزرگوار حضرت ابو قحافہ بھی شامل تھے۔[۲۴۸] ان کے علاوہ متعدد دوسرے تیمی افراد بھی اسی دن اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ ہمارے مآخذ نے بنو تیم کے حارث بن حارثہ کے فرزند عبداللہ اور پوتے منکدر کو فتح مکہ کے صحابہ میں شمار کیا ہے جبکہ حضرت امیمہ بنت عبد تیمی کو اس دن کی مبایعات (بیعت کرنے والی عورتوں) میں گردانا جاتا ہے۔[۲۴۹]

(۵) بنو سہم

قریشی اشرافیہ میں بنو سہم طاقتور ترین لطون/خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کی دو اہم ترین وجہیں تھیں: اول یہ کہ وہ عددی اعتبار سے کافی بڑا تھا[۲۵۰] اور دوم یہ کہ اس میں صاحب صلاحیت و لیاقت افراد کی تعداد زیادہ تھی۔ چھٹی صدی عیسوی کے اختتام پر اور بعثتِ نبوی کے زمانے میں اس خاندان کے بعض شیوخ جیسے عاص بن وائل سہمی اور حارث بن قیس سہمی، مُنبہ اور نُبیہ فرزندانِ حجاج سہمی وغیرہ اہم ترین رؤسائے قریش میں شمار ہوتے تھے۔[۲۵۱] دوسرے درجہ کے قائدین اور زعماء کی فہرست میں اس خاندان کے عمرو بن عاص سہمی اور ان کے بھائی ہشام سہمی وغیرہ کا نام بھی شامل تھا۔ اسلام کے معاملے میں دوسرے بطونِ قریش کی مانند بنو سہم کا بھی رویہ تھا۔ اس کے بعض سرداروں نے جن میں مذکورہ بالا حارث، مُنبہ اور نُبیہ شامل تھے اسلام کی سخت مخالفت کی تھی جبکہ بعض دوسروں کا شمار ہمارے سیرت نگاروں نے دشمنانِ اسلام کی بجائے مستہزئین (مذاق اڑانے والوں)، یا کم درجہ کے مخالفوں میں کیا ہے۔ عاص بن وائل سہمی کا تعلق دوسرے طبقے سے تھا[۲۵۲]

بہر حال اسلام کے ناوک نے بنو سہم کے بعض افراد و گھرانوں کو بھی نہیں چھوڑا تھا چنانچہ متعدد گھرانے بالکل آغاز میں

انتہائی نامکمل ہے۔ ان سے کئی گنا زیادہ وہ حضرات صحابہ و صحابیات ہوں گی جو گمنام رہ گئیں یا جن کا ذکر نہیں آسکا۔

(۶) بنو زہرہ

مکہ کے سیاسی اور اقتصادی نظام میں بنو زہرہ کا بطن خاندان بنو سہم کا ہم پلہ تھا۔[۲۶۴] اگرچہ زمانہ بعثت کے قریب اس میں کوئی بڑا قائد یا شیخ نہیں رہا تھا۔ کم از کم ہمارے مآخذ اس خاندان کے کسی بڑے دشمنِ اسلام کا ذکر نہیں کرتے۔ بعض مورخین نے اس سے یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ وہ مکی سیاست میں اتنا اہم نہیں رہ گیا تھا حالانکہ اس کا اصل سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی جانب اس کا رویہ معتدل تھا اور وہ سوچ سمجھ پر مبنی تھا چنانچہ بنو زہرہ اور بنو عدی نے دوسروں کی طرح اندھا دھند اسلام دشمن رویہ نہیں اپنایا تھا اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ بنو زہرہ بھی میدانِ جنگ سے بلا جنگ و جدال کئے مکر پلٹ گئے تھے۔[۲۶۵] ایک سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بنو زہرہ نسبتاً بنو عبد مناف سے زیادہ قریب تھے۔ ان کے تجارتی اور ازدواجی تعلقات دوسروں کے مقابلہ میں بنو ہاشم اور بنو امیہ سے زیادہ تھے۔[۲۶۶] مونٹگمری واٹ کا یہ خیال ہے کہ وہ محض بنو امیہ سے زیادہ قریب تھے آدھا سچ ہے بنو زہرہ کے بعض لوگوں کے تجارتی تعلقات بنو تیم سے بھی تھے۔

بہرحال کی سیاست اور سماج و اقتصاد میں بنو زہرہ کی جو بھی حیثیت رہی ہو۔ اسلام میں ان کے بعض گھرانوں اور افراد کو سبقت کا شرف ضرور حاصل تھا۔ ذکر آچکا ہے کہ بنو زہرہ کے دو گھرانوں بنو عوف بن عبد عوف اور بنو اہیب کے دو اہم افراد حضرات عبد الرحمٰن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص حضرت ابوبکر تیمی کے حلقۂ احباب میں شامل تھے اور انہی کے ایما و تبلیغ پر بالکل آغازِ عہدِ اسلامی میں مسلمان ہو چکے تھے۔ ابن اسحاق کے مطابق وہ پہلے آٹھ مسلمانوں میں سے تھے۔ البتہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے پورے گھرانے ابتدا ہی میں مسلمان ہو گئے تھے چنانچہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کی دونوں بیویاں جو عتبہ بن ربیعہ اور اس کے بھائی شیبہ کی بیٹیاں تھیں مسلمان ہو چکی تھیں۔[۲۶۷] ان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ مکی دورِ حیات میں ناکتخدا تھے اور تجارت میں ان کی عالمگیر شہرت کی چھاپ ابھی نہیں لگی تھی بلکہ وہ بے نوا اور بے کس شخص تھے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ ہجرت کے وقت ان کی عمر ۳۴ سال ہو چکی تھی۔ وہ صرف شادی شدہ بلکہ کم از کم دو بیویوں کے شوہر اور غالباً کئی بچوں کے والد ماجد بھی تھے۔ بنتِ شیبہ سے ان کے دو اولادیں ایک فرزند محمد اور ایک دختر ام القاسم تھیں جن کا شمار صحابہ میں ہوتا ہے۔[۲۶۸] ان کے علاوہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کی دو بہنوں حضرت عاتکہ اور حضرت شفاء کے بارے میں بھی صراحت ملتی ہے کہ وہ مکی مسلمان تھیں۔ یہ بات اہم ہے کہ ان کی بہن عاتکہ کے شوہر مخرمہ بن نوفل زہری نے مکی عہد میں اسلام قبول نہیں کیا تھا چنانچہ صحابیہ موصوفہ نے اپنے شوہر کو چھوڑ دیا تھا اور اپنے فرزند حضرت مسعود بن مخرمہ کے ساتھ جو مکی مسلمان تھے مدینہ ہجرت کی تھی۔ ان کی دوسری بہن نے بھی مکہ کو چھوڑ مدینہ جا کر گھر بسا لیا تھا۔[۲۶۹] اس سے زیادہ دلچسپ روایت یہ ہے کہ حضرت عبد الرحمٰن کی بوڑھی والدہ نے بھی شروع ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا اور ہجرت کی تھی۔[۲۷۰]

حضرت عبد الرحمٰن بن عوف زہری کے چچا کا خاندان بنو ازہر بھی غالباً پورا مسلمان ہو گیا تھا۔ مکی عہدِ قدیم کے

اسلام سے روشناس ہو گئے تھے۔ عہدِ قدیم کے مکی مسلمانوں میں بنو قیس بن عدی کے تین افراد حضرات خنیس بن حذافہ بن قیس بن عدی اور ان کے دو بھائی عبداللہؓ اور قیس ہجرتِ حبشہ سے پہلے مسلمان ہو گئے تھے۔ حضرت خنیس کی زوجہ محترمہ حضرت حفصہ بنت عمر خطاب عدوی بھی مسلمان ہو گئی تھیں۔ قیاس ہے کہ ان کے دونوں بھائیوں کے اہل و عیال بھی اسلام سے مشرف ہو چکے تھے (۲۵۳)۔ بہرحال ان تینوں سہمیوں نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہجرتِ حبشہ کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔ بنو سہم کے غالباً اہم ترین گھرانے بنو عاص بن وائل کے ایک فرزند حضرت ہشام بن عاص بھی ابتدائی مکی مسلم تھے اور کاروانِ حبشہ کے ایک رکنِ رکین (۲۵۴)

ابنِ اسحاق نے دوسری ہجرتِ حبشہ کے مہاجروں میں تیرہ سہمی حضرات اور ان کے ایک زبیدی حلیف حضرت محمیہ بن جزء زبیدی کا نام گنوایا ہے۔ مذکورہ بالا سہمی مہاجرینِ حبشہ کے علاوہ باقی حضرات تھے عبداللہ بن حارث، ابو قیس بن حارث حارث بن حارث، معمر بن حارث، بشر بن حارث اور موخر الذکر کے ایک ماں جائے بھائی جن کا نام تھا سعید بن عمرو تمیمی، سعید بن حارث، سائب اور عمیر بن رئاب اور عمیر بن رئاب بن حذافہ بن مخشم (۲۵۵)۔ ابن سعد کے یہاں بعض نئے ناموں کا اضافہ ہے اور وہ ہیں حجاج بن حارث تمیم یا نمیر بن حارث اور معبد بن حارث۔ ابنِ سعد نے موخر الذکر کو صرف ابتدائی عہد کا قدیم مسلم قرار دیا ہے اور بقیہ تفصیلات نہیں دی ہیں (۲۵۶)۔ خیال ہے کہ وہ بھی مہاجرینِ حبشہ میں شامل رہے ہوں گے اور نہ بھی رہے ہوں تو یہ تو مسلم امر ہے کہ وہ قدیم مکی مسلم ضرور تھے۔ یہ نکتہ دلچسپ، حیرت انگیز اور اہم ہے کہ بنو سہم کے شدید ترین دشمنِ اسلام حارث بن قیس سہمی کے آٹھ نو حقیقی اور سوتیلے بیٹوں نے مکی دور کے نصفِ اول ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس سے یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ حارث سہمی کی عداوتِ اسلام ذاتی وجوہ سے تھی۔ کسی نصب العین یا قبائلی عصبیت کے سبب نہ تھی۔ مونٹگمری واٹ نے اپنی فہرست مسلمینِ مکہ میں ان حارثی فرزندانِ اسلام میں سے صرف چھ کے نام گنائے ہیں (۲۵۷)۔ اس سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ہمارے محقق و حق جو مستشرقین کس طرح مکی مسلمانوں کی تعداد کو کم کر کے پیش کرتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ تبلیغ و اشاعتِ اسلام کو کمیوں کر دھندلا بنا کر دکھاتے ہیں۔ مزید برآں ہمارے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ مکی عہد میں ہی گھرانے کے گھرانے اسلام قبول کر چکے تھے اور اسلام صرف افراد ہی تک محدود نہیں تھا۔

ہجرتِ نبوی کے بعد بھی مکہ کے بنو سہم میں اسلام کی اشاعت جاری رہی تھی اگرچہ اس کی رفتار سست تھی اور مآخذ میں اس کے بارے میں تفصیلات بھی کم ملتی ہیں۔ بہرحال صلح حدیبیہ کے بعد اس خاندان کے غالباً اہم ترین فرد حضرت عمرو بن عاص سہمی کے قبولِ اسلام کے واقعہ سے ہمارے خیال کو کسی قدر تقویت ملتی ہے (۲۵۸)۔ مزید تائید ابنِ سعد کی روایت سے ہوتی ہے جس کے مطابق حضرت عمرو بن عاص سہمی کے صاحبزادہ گرامی حضرت عبداللہؓ بن عمرو نے اپنے والد سے قبل اسلام قبول کر لیا تھا (۲۵۹)۔ عین ممکن ہے کہ ان کے قبولِ اسلام کا تعلق زمانۂ قبل حدیبیہ سے ہو۔

فتح مکہ میں تمام دوسرے بطونِ قریش کی مانند بنو سہم کے باقی ماندہ افراد بھی اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے تھے۔ ان میں نمایاں ترین حضرات تھے حضرت قیس بن عدی (۲۶۰)، حضرت عبداللہؓ بن زبعری جو اپنے وقت کے مشہور و بلند پایہ شاعر بھی تھے، حضرت ابو وداعہ، حارث بن صبرہ اور کم از کم ان کے تین جواں سال فرزند حضرات مطلب، ابو سفیان اور سائب (۲۶۲)۔ خواتین میں عام طور سے حضرت ریطہ بنتِ منبہ بن حجاج کا نام لیا جاتا ہے (۲۶۳)۔ ظاہر ہے کہ سہمی مسلمانوں کی یہ فہرست

مسلمانوں میں اس گھرانے کے تین ارکان حضرات مطلب بن ازہر، طلیب بن ازہر اور عبدالرحمٰن بن ازہر کا نام ملتا ہے۔ ان کے ساتھ خواتین میں حضرت مطلب زہری کی زوجہ محترمہ حضرت رملہ بنت ابی عوف سہمی کا نام لیا جاتا ہے۔[۲۷۲] یہ سب حضرات و خواتین ہجرت حبشہ سے پہلے کے مسلمان تھے۔ ان کے علاوہ بھی قیاس کہتا ہے کہ مزید مسلمان اس گھرانے میں عہدِ قدیم کے تھے۔ اگرچہ متداول مآخذ قبولِ اسلام کے زمانے کے بارے میں صراحت نہیں کرتے مگر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کے ایک ہم نام بھتیجے کا بھی صحابہ کرام میں شمار کیا گیا ہے اور وہ بھی یقیناً ابتدائی عہد کے مسلمان تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص (مالک) زہری کا تعلق بنو وہیب سے تھا اور ان کا پورا گھرانا لگتا ہے کہ شروع ہی میں مسلمان ہو گیا تھا۔ اس خاندان میں حضرت سعد کے سوا ان کے دو بھائیوں عامر زہری اور عمیر زہری کے مکہ میں قبولِ اسلام کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے ایک اور بھائی عتبہ زہری اسلام سے قبل مدینہ جا بسے تھے جہاں وہ آغازِ اسلام ہی میں مسلمان ہو گئے تھے اگرچہ ہمارے مآخذ حضرت سعد اور ان کے بھائیوں کے اہل و عیال کے بارے میں کچھ نہیں کہتے مگر یہ یقینی ہے کہ کم از کم حضرت سعد اور ان کے ایک بھائی عامر شادی شدہ اور صاحب اولاد تھے اور ان کے دوسرے بھائی عتبہ بھی صاحب اولاد تھے اور ان کی تمام اولادیں نابالغ ہونے کے سبب مسلم تھیں۔ ان کے ایک بھائی عمیر کی عمر ہجرت کے وقت بارہ تیرہ یا چودہ سال کی تھی۔[۲۷۳] قیاس یہ ہے کہ حضرات سعد و عامر وغیرہ کے گھرانے کی خواتین بھی مسلمان تھیں اور ان میں سر فہرست ان کی والدہ ماجدہ تھیں

بنو زہرہ کے ایک اور گھرانے بنو شہاب کے دو رکن حضرات عبداللہ بن شہاب زہری اور ان کے چھوٹے بھائی عبداللہ اصغر مکی عہدِ قدیم کے مسلمان تھے۔ ان میں سے اول الذکر نے ہجرت حبشہ سے قبل مکہ میں انتقال کیا تھا جبکہ موخر الذکر نے حبشہ ہجرت کی تھی اور واپس آ کر ایک سال کے عرصہ سے زیادہ گذرا تھا کہ انھوں نے بھی وفات پائی تھی۔[۲۷۴] اگرچہ مآخذ کا اتفاق ہے کہ بنو زہرہ نے اجتماعی طور سے غزوۂ بدر میں شرکت نہیں کی تھی مگر ابن سعد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے رکن اور دونوں مسلمان صحابہ کے بڑے بھائی عبداللہ اکبر بن شہاب زہری نے مکی فوج کی جانب سے شرکت کی تھی اور جنگ میں مارے گئے تھے۔[۲۷۵] ممکن ہے کہ بنو زہرہ کے اس رکن نے اپنے قبیلہ کو چھوڑ کر اپنی انفرادی حیثیت سے شرکت کی ہو بالکل اسی طرح جس طرح طالب بن ابی طالب ہاشمی نے بنو ہاشم کا ساتھ اس معاملہ میں نہیں دیا تھا اور راستے سے مکہ پلٹ گئے تھے جبکہ ان کے ایک بھائی عقیل اور چچا عباس وغیرہ نے غزوۂ بدر میں بنو ہاشم کی نمائندگی کی تھی۔

بنو زہرہ کے مختلف گھرانوں کے ساتھ ساتھ ان کے متعدد حلفاء اور موالی نے بھی مکی عہدِ اسلام کے دورِ اول کے آغاز میں اسلام قبول کیا تھا۔ ان میں بنو ہذیل کا ایک خاندان تھا جس کے دو مردوں اور ایک خاتون نے کم از کم اسلام قبول کیا تھا وہ تھے حضرت عبداللہ بن مسعود ہذلی اور ان کے بھائی عتبہ اور ان کی والدہ ماجدہ۔[۲۷۶] غالباً ان کے والد ماجد کا اس وقت تک انتقال ہو چکا تھا۔ اگرچہ مآخذ ان دونوں ہذلی مسلمانوں کے اہل و عیال کا ذکر نہیں کرتے لیکن یہ حتمی ہے کہ ان کے گھرانے کے اور افراد جن میں مرد عورتیں اور بچے شامل تھے اسلام لا چکے تھے کیوں کہ ہجرت کے وقت ان

دونوں بھائیوں کی عمریں ۳۵ - ۳۷ سال کے درمیان تھیں۔ ان کے حلفاء میں ایک مختصر سا کندی گھرانا حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی کا تھا۔ وہ اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت حسنہ نہ صرف قدیم مسلمان تھے بلکہ مہاجرِ حبشہ و مدینہ بھی تھے ان کے اہل و عیال بھی مسلمان ہو چکے تھے۔[۲۷۷] اسی طرح ایک اور حلیف حضرت مقداد بن عمرو بہرانی تھے جو اسود بن عبدیغوث زہری کے حلیف ہی نہیں متبنیٰ بھی تھے۔ ان کا چھوٹا سا کنبہ مکی عہد کا مسلم تھا۔[۲۷۸] ایک خزاعی حلیف حضرت ذوالشمالین بن عمرو خزاعی ابتدائی مکی مسلم اور بدری صحابی تھے۔[۲۷۹] اس خاندان کے ایک موالی حضرت خباب بن ارت تمیمی قدیم ترین مکی مسلمانوں میں شامل تھے جنہوں نے اسلام کی خاطر بے نظیر قربانیاں دی تھیں۔ ایک اور حلیف حضرت مسعود القاری بھی ابتدائی مسلمان تھے[۲۸۰] غالباً مدنی عہد میں اسلام مکہ کے بنو زہرہ میں پھیلتا رہا تھا مگر ہمارے پاس اس کے ثبوت کم ہیں۔ فتح مکہ میں البتہ وہ سب مسلمان ہو گئے تھے۔ اس دور کے ممتاز مسلمانوں میں حضرات مخرمہ بن نوفل، اسید بن حارث، عبداللہ بن ارقم اور عبدالرحمٰن بن ارقم کے علاوہ ان کے ایک حلیف حضرت علا بن جاریہ شامل تھے۔[۲۸۱] یہ بات بلا ریب کہی جا سکتی ہے کہ کیا قدیم اور کیا بعد کے زہری مسلمانوں کی تعداد ہماری فہرست سے کہیں زیادہ تھی۔

(۷) بنو اسد

چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں قریش مکہ کا خاندان بنو اسد اگرچہ مکی اشرافیہ کا رکن تھا اور اقتصادی دولت اور تجارتی مہارت کے لیے خاصا ممتاز تھا تاہم عددی اعتبار سے چھوٹا ہونے کے سبب دوسرے درجہ کے قریشی خاندانوں میں گنا جاتا تھا۔[۲۸۲] بعثتِ نبوی کے قریب کے زمانے میں اس کے متعدد افراد جیسے زمعہ بن اسود، ابوالبختری، نوفل بن خویلد کے علاوہ حضرت خدیجہ بنتِ خویلد اور ان کے بھتیجے حکیم بن حزام ممتاز و متمول تاجرانِ مکہ میں سمجھے جاتے تھے۔ اگر بنو اسد کے ازدواجی تعلقات بنو مخزوم، بنو عبد شمس اور بنو ہاشم سے تھے تو تجارتی تعلقات بنو تیم وغیرہ سے بھی تھے۔[۲۸۳]

بنو خویلد کے حضرت زبیر بن عوام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہ بنتِ عبدالمطلب کے فرزند تھے۔ ابن اسحاق نے حضرت زبیر کو پہلے آٹھ مسلمانوں میں شمار کیا ہے۔ وہ حضرت ابوبکر کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ اور انہی کی تحریک پر اسلام لائے تھے۔[۲۸۴] حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب بھی قدیم مکی مسلم تھیں اور غالباً وہ اپنے فرزند کے ساتھ یا ان کے قبول اسلام کے معاً بعد مشرف بہ اسلام ہوئی تھیں۔ اسی زمانے میں ان کے ایک اور فرزند حضرت سائب بن عوام نے اسلام قبول کیا تھا[۲۸۶] جبکہ ان کے فرزند اکبر عبدالرحمٰن بن عوام نے فتح مکہ میں یہ شرف حاصل کیا تھا۔[۲۸۷] بنو خویلد کے دوسرے ابتدائی مسلمانوں میں حضرت خدیجہ بنت خویلد[۲۸۸] اور ان کے ایک بھتیجے حضرت خالد بن حزام تھے۔[۲۸۹] حضرت خدیجہ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پہلی مسلم تھیں۔ ان کی ایک بہن ہالہ بھی مکی عہد کی مسلم تھیں۔[۲۹۰] وہ رسول کریم کے بڑے داماد کی والدہ ماجدہ تھیں۔ اسی طرح اسود بن نوفل بن خویلد بھی قدیم مکی مسلمان تھے۔[۲۹۱] بنو حارث میں حضرت عمرو بن امیہ اسدی[۲۹۲] اور بنو اسود میں حضرت یزید بن زمعہ اسدی ابتدائی مسلم تھے۔[۲۹۳] یہ نکتہ یا حقیقت کافی اہم ہے

دونوں بھائیوں کی عمریں ۳۵ - ۳۷ سال کے درمیان تھیں۔ ان کے حلفاء میں ایک مختصر سا کندی گھرانا حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی کا تھا۔ وہ اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت حسنہ نہ صرف قدیم مسلمان تھے بلکہ مہاجرِ حبشہ و مدینہ بھی تھے ان کے اہل و عیال بھی مسلمان ہو چکے تھے۔[۲۷۷] اسی طرح ایک اور حلیف حضرت مقداد بن عمرو بہرانی تھے جو اسود بن عبدیغوث زہری کے حلیف ہی نہیں متبنیٰ بھی تھے۔ ان کا چھوٹا سا کنبہ مکی عہد کا مسلم تھا۔[۲۷۸] ایک خزاعی حلیف حضرت ذوالشمالین بن عمرو خزاعی ابتدائی مکی مسلم اور بدری صحابی تھے۔[۲۷۹] اس خاندان کے ایک موالی حضرت خباب بن ارت تمیمی قدیم ترین مکی مسلمانوں میں شامل تھے جنہوں نے اسلام کی خاطر بے نظیر قربانیاں دی تھیں۔ ایک اور حلیف حضرت مسعود القاری بھی ابتدائی مسلمان تھے[۲۸۰] غالباً مدنی عہد میں اسلام مکہ کے بنو زہرہ میں پھیل رہا تھا مگر ہمارے پاس اس کے ثبوت کم ہیں۔ فتح مکہ میں البتہ وہ سب مسلمان ہو گئے تھے۔ اس دور کے ممتاز مسلمانوں میں حضرات مخرمہ بن نوفل، اسید بن حارث، عبداللہ بن ارقم اور عبدالرحمٰن بن ارقم کے علاوہ ان کے ایک حلیف حضرت علاء بن جاریہ شامل تھے۔[۲۸۱] یہ بات بلا ریب کہی جا سکتی ہے کہ کیا قدیم اور کیا بعد کے زہری مسلمانوں کی تعداد ہماری فہرست سے کہیں زیادہ تھی۔

(۷) بنو اسد

چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں قریشِ مکہ کا خاندان بنو اسد اگرچہ مکی اشرافیہ کا رکن تھا اور اقتصادی دولت اور تجارتی مہارت کے لیے خاصا ممتاز تھا تاہم عددی اعتبار سے چھوٹا ہونے کے سبب دوسرے درجہ کے قریشی خاندانوں میں گنا جاتا تھا۔[۲۸۲] بعثتِ نبوی کے قریب کے زمانے میں اس کے متعدد افراد جیسے زمعہ بن اسود، ابوالبختری، نوفل بن خویلد کے علاوہ حضرت خدیجہ بنتِ خویلد اور ان کے بھتیجے حکیم بن حزام ممتاز و متمول تاجرانِ مکہ میں سمجھے جاتے تھے۔ اگر بنو اسد کے ازدواجی تعلقات بنو مخزوم، بنو عبد شمس اور بنو ہاشم سے تھے تو تجارتی تعلقات بنو تیم وغیرہ سے بھی تھے۔[۲۸۳]

بنو خویلد کے حضرت زبیر بن عوام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہ بنتِ عبدالمطلب کے فرزند تھے۔ ابن اسحاق نے حضرت زبیر کو پہلے آٹھ مسلمانوں میں شمار کیا ہے۔ وہ حضرت ابوبکر کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ اور انہی کی تحریک پر اسلام لائے تھے۔[۲۸۴] حضرت صفیہ بنتِ عبدالمطلب بھی قدیم مکی مسلم تھیں اور غالباً وہ اپنے فرزند کے ساتھ یا ان کے قبولِ اسلام کے معاً بعد مشرف بہ اسلام ہوئی تھیں۔ اسی زمانے میں ان کے ایک اور فرزند حضرت صائب بن عوام نے اسلام قبول کیا تھا جبکہ ان کے فرزندِ اکبر عبدالرحمٰن بن عوام نے فتح مکہ میں یہ شرف حاصل کیا تھا۔[۲۸۶] بنو خویلد کے دوسرے ابتدائی مسلمانوں میں حضرت خدیجہ بنتِ خویلد[۲۸۸] اور ان کے ایک بھتیجے حضرت خالد بن حزام تھے۔[۲۸۹] حضرت خدیجہ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پہلی مسلم تھیں۔ ان کی ایک بہن ہالہ بھی مکی عہد کی مسلم تھیں[۲۹۰] ۔ وہ رسولِ کریم کے بڑے داماد کی والدہ ماجدہ تھیں۔ اسی طرح اسود بن نوفل بن خویلد بھی قدیم مکی مسلمان تھے۔[۲۹۱] بنو حارث میں حضرت عمرو بن امیہ اسدی[۲۹۲] اور بنو اسود میں حضرت یزید بن زمعہ اسدی ابتدائی مسلم تھے۔[۲۹۳] یہ نکتہ یا حقیقت کافی اہم ہے

کہ یہ تمام ابتدائی مسلمان سرداران اسد کے اولاد و احفاد تھے اور کسی طرح سے ان کو بنو اسد کے ذیلی یا غیر اہم خاندانوں کے افراد نہیں سمجھا جا سکتا۔ بنو اسد[۲۹۴] کے بعض حلیف اور موالی بھی ابتدائی مسلم تھے جن میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ لخمی اور ان کے مولیٰ حضرت سعد ممتاز افراد تھے۔ یہ دونوں بزرگ بدری صحابی تھے[۲۹۵]۔

ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو اسد میں ہجرت نبوی کے بعد بھی اسلام کی اشاعت جاری رہی۔ اس کی ایک مثال حضرت ہبار بن اسود بن مطلب / اسد کے قبول اسلام کا واقعہ ہے۔ وہ غزوۂ بدر کے بعد اسلام لائے تھے اور ہجرت کر کے مدینے چلے گئے تھے۔ امکان ہے کہ ان کے اہلیے اور مسلمان رہے ہوں گے[۲۹۶]۔

بہر حال فتح مکہ میں یہ پورا گھرانا اسلام کے دائرے میں داخل ہو چکا تھا۔ فتح مکہ کے ممتاز مسلمانوں میں حضرت حکیم بن حزام اور غالباً ان کے فرزند ہشام بن حکیم تھے[۲۹۷]۔ یہ یقینی ہے کہ خانوادۂ اسد کے متعدد دوسرے حضرات و خواتین بھی اس روز اسلام لاتے تھے[۲۹۸]۔

(۸) بنو جمح

بنو جمح کی اشرافیہ کے رکن ہونے کے علاوہ مکی سماج میں خاصے طاقتور تھے لیکن ان کا بھی شمار دوسرے درجے کے خاندانوں میں ہوتا تھا[۲۹۹]۔ ان کا سماجی و اقتصادی مقام بنو سہم یا بنو اسد کے مانند تھا۔ مکی دور نبوی میں اسلام کے سخت ترین دشمنوں میں بنو وہب کے دو رکن امیہ بن خلف اور اس کا بھائی ابی بن خلف پیش پیش تھے۔ وہ قریشی سرداروں میں غالباً اسی عداوت اسلام و دشمنی رسولؐ کے سبب گنے جاتے تھے[۳۰۰]۔ در اصل خاندان بنو وہب کی دو شاخیں اسلام و کفر کی آویزش کی دو نمایاں مثالیں تھیں۔ ایک بنو خلف بن وہب کا گھرانا تھا جس کے مذکورہ بالا سردار نمائندے تھے اور دوسرا بنو حبیب بن وہب کا گھرانا تھا جس کے ممتاز ترین نمائندے حضرت عثمان بن مظعون بن حبیب بن وہب تھے۔

حضرت عثمان بن مظعون جمحی قدیم ترین مکی مسلمانوں میں تھے۔ ان کو ابن اسحاق نے پہلے چھیالیس یا پچپن مسلمانوں کی فہرست میں شامل کیا ہے[۳۰۱]۔ تقریباً یہ یقینی ہے کہ ان کا پورا گھرانا مسلمان ہو گیا تھا کیونکہ فہرست میں ان کے کم از کم تین بھائیوں حضرات سائب، قدامہ اور عبد اللہؓ کے علاوہ ان کے ایک فرزند حضرت سائب بن عثمان کو بھی شمار کیا گیا ہے[۳۰۲]۔ ان کی جمحی اہلیہ بھی مسلمان تھیں[۳۰۳]۔ ان کی ایک بہن کے قبول اسلام کے بارے میں ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ ماخذ نے اگرچہ اس موقع پر ان کے اور بھائی بہنوں، فرزندوں اور دختروں اور دوسرے اعزہ جیسے والدہ وغیرہ کا ذکر نہیں کیا ہے تاہم یہ یقینی ہے کہ ان کا پورا گھرانا مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا کیونکہ روایات میں ہے کہ جب بنو مظعون نے اپنی تمام عورتوں، مردوں اور بچوں کے ساتھ مدینہ ہجرت کی تو وہ اپنی تمام جائیداد منقولہ و اسباب و دولت اپنے ساتھ مدینہ لے گئے تھے۔ اور مکہ میں اپنے گھروں کو تالا لگا گئے تھے[۳۰۴]۔

بنو جمح کا ایک اور ابتدائی مکی مسلم گھرانا بنو معمر بن حبیب بن جمح کا تھا۔ اس کے کئی افراد کے ناموں کا ذکر ملتا

ہے۔ ان میں حضرات معمر بن حارث، ان کے دو بھائی حطاب بن حارث اور حاطب بن حارث، حاطب کی اہلیہ مکرمہ حضرت فاطمہ بنت مجلل اور ان دونوں میاں بیوی کے دو فرزندانِ گرامی حضرات محمد اور حارث، حضرت حطاب بن حارث کی زوجہ محترمہ حضرت فکیہہ بنت لیسار شامل تھے۔ ممکن ہے کہ کچھ اور افراد بھی مسلمان ہوتے ہوں۔ یہ گھرانا پورا مسلمان ہو گیا تھا۔[۳۰۵] ان کے علاوہ ان کے چچا بنو معمر بن حبیب کے خاندان میں حضرت سفیان بن معمر، ان کی اہلیہ محترمہ حسنہؓ اور دونوں کے دو فرزند حضرات جابر اور جنادہؓ حضرت سفیان کے ایک حقیقی بھائی حضرت جمیل بن معمر اور ان کے ایک ماں جائے بھائی حضرت شرحبیل بن عبداللہ غوثی نمایاں ترین مسلمان تھے۔[۳۰۶] یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بنو جمح کا گھرانا بھی پورا اسلام لے آیا تھا۔ اگرچہ اس کی خواتین اور بچوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

بنو وہب کے ایک ذیلی گھرانے بنو احبان بن وہب کے ایک اہم فرد حضرت نبیہہ بن عثمان بن ربیعہ تھے جنہوں نے ہجرت حبشہ سے پہلے نہ صرف اسلام قبول کیا تھا بلکہ اللہ کی راہ میں وطن بھی چھوڑ دیا تھا۔[۳۰۷] قیاس ہے کہ اس خاندان کے مزید ارکان نے مکی دورِ اول ہی میں یا دورِ ثانی میں اسلام قبول کیا تھا۔

ہجرت نبوی کے بعد بھی اسلام کی اشاعت کا سلسلہ بنو جمح کے مختلف گھرانوں میں جاری رہا تھا۔ اس کی دلچسپ مثال عمیر بن وہب جمحی کے صاحبزادے حضرت وہب کی ہے۔ موصوف اسلام کے نہ صرف دشمن تھے بلکہ غزوہ بدر میں کی لشکر کی شکست پر اتنے برافروختہ ہوئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے مدینہ چل پڑے مگر وہاں پہنچ کر جمالِ روئے انورِ نبوی اور رحمتِ عامِ نبوی سے اس قدر متاثر اور مبہوت ہوئے کہ اسلام لائے بغیر نہ بنی۔ گھر بار چھوڑ چھاڑ کر وہ مدینہ ہی میں جوارِ نبوی میں بس گئے[۳۰۸]۔ یہ اور ایسی ہی دوسری مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ ہجرت کے بعد بھی مکہ کی سنگلاخ و سنگین زمین میں قبولِ اسلام کی نمو باقی تھی۔ اس کی تائید مزید حضرت سعید بن عامر بن حذیم جمحی کے قبولِ اسلام کے واقعہ سے ہوتی ہے جو صلح حدیبیہ کے فوری بعد اسلام لائے تھے، مدینہ ہجرت کر کے پہنچے اور خیبر کے غزوہ میں شریک جہاد ہوئے[۳۰۹] امکان یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہونے والے بنو جمح میں حضرت سعید بن عامر تنہا شخص نہیں تھے۔

فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کرنے والوں میں بنو جمح کے ممتاز افراد میں حضرات صفوان بن امیہ[۳۱۰]، عمیر بن وہب اول الذکر کے دو فرزند عبدالرحمٰن اکبر اور عبداللہ منکبر اور ان دونوں کی مائیں بالترتیب حضرت ام حبیب بنت ابی سفیان اور حضرت برزہ بنت مسعود بن عمر[۳۱۱] امیہ بن خلف کے فرزندِ گرامی حضرت احیحہ اور پوتے حضرت اسید بن احیحہ کے علاوہ حضرت ابو محذورہ اوس بن معیر بن لوذان جمحی بھی شامل تھے۔[۳۱۲] موخر الذکر صحابی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت خوش گلو موذن کعبہ تھے اور انہی کے خاندان میں یہ شرف ہمیشہ باقی رہا۔[۳۱۳] بلا ریب بنو جمح کے کل مسلمانوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ تھی جن کے اسمائے گرامی مآخذ میں مذکور ہیں یا پردۂ گمنامی میں پوشیدہ[۳۱۴]

۹۔ بنو عبدالدار

عبدالدار شہر مکہ کے بانی اوّل قصی کے فرزند اکبر اور عبد مناف کے برادر اکبر تھے۔ ہمارے عام مآخذ میں عموماً یہ بیان ملتا ہے کہ قصی نے اپنی زندگی میں اپنے پانچوں مناصب فرزند اکبر کو دے دیئے تھے۔ اور بقیہ فرزندوں کو محروم کر دیا تھا قصی کے بعد ہی بنائے مخاصمت بنی اور عبد مناف اور عبدالدار کے فرزندوں کے درمیان تصادم کی نوبت آگئی لیکن معاملہ صلح و معاہدہ سے سلجھ گیا اور دونوں خاندانوں میں تقسیم مناصب ہو گئی اور اس کے بعد بنو عبدالدار کی سماجی اور اقتصادی حیثیت وہ نہیں رہی جو تھی۔ یہ بیان یک طرفہ اور غلط ہے۔ ازرقی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قصی نے اپنے چھ مناصب برابر برابر اپنے دونوں فرزندوں عبدالدار اور عبد مناف میں تقسیم کر دیئے تھے۔ جو ان کے گھرانوں میں بالترتیب چلتے رہے[۳۱۵] بنو عبدالدار کی سماجی اور مذہبی برتری سے کوئی مؤرخ انکار نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اب بھی کعبہ کے متولی اور کلید بردار تھے۔ جو مذہبی لحاظ سے سب سے بڑا عہدہ تھا[۳۱۶] البتہ ان کی عددی طاقت کے کم ہو جانے اور اقتصادی ثروت نہ ہونے کے سبب وہ بنو عبد مناف کے ہم پلہ نہیں رہے تھے۔ اور قریشی بطون کی دوسری صف میں آگئے تھے۔

بنو عبدالدار کے نسبتاً ایک متمول گھرانے کے دو افراد حضرت مصعب بن عمیر بن ہاشم[۳۱۷] اور ان کے بھائی حضرت ابوالروم بن عمیر ابتدائی مکی مسلمانوں میں شامل تھے[۳۱۸]۔ اسلام کی خاطر انہوں نے نہ صرف عیش و عشرت کی زندگی چھوڑی بلکہ قریش کے خاص کر اپنی کافرہ ماں کے ظلم و ستم بھی سہے اور اسی سبب ہی وطن سے ہجرت کر کے حبشہ بھی گئے۔ اس کار وان مہاجرین حبشہ میں بنو عبدالدار کے تین مختلف گھرانوں کے متعدد افراد شامل تھے۔ ابن اسحاق نے حضرت سُوَیبط بن سعد، حضرت جہم بن قیس اور ان کی زوجہ محترمہ حضرت ام حرملہ بنت عبدالاسد خزاعی اور ان دونوں میاں بیوی کے دو فرزندوں حضرات عمرو اور خزیمہ کے علاوہ حضرت فراس بن نضر بن حارث کو بھی گنایا ہے[۳۱۹]۔ مؤخر الذکر صحابی خاندان عبدری کے ایک اہم سردار کے فرزند جلیل تھے۔ ابن سعد نے اس میں بنو عبدالدار کے ایک مولیٰ حضرت ابو فکیہہ ازدی کا اضافہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ قدیم الاسلام مکی بھی تھے اور مہاجر حبشہ بھی[۳۲۰]۔ ابن اسحاق کے مطابق حضرت مصعب بن عمیر اور حضرت سویبط مہاجرین حبشہ کے مکہ لوٹ آنے والے گروہ میں شامل تھے اور بعد میں ان دونوں نے ہجرت نبوی سے ایک سال قبل مدینہ کو ہجرت کی تھی[۳۲۱]۔ یہ دونوں عبدری صحابی بدری ہونے کی فضیلت بھی رکھتے تھے[۳۲۲] اسی خاندان کی ایک خاتون حضرت برہ بنت عامر نہ صرف ابتدائی مسلمان تھیں بلکہ مہاجرات مدینہ میں بھی شامل تھیں[۳۲۳]۔ ایسی خواتین نہ جانے اور کتنی ہوں گی ہجرت نبوی کے بعد مکہ کے باقی ماندہ عبدریوں میں اسلام کی اشاعت کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ کیونکہ مآخذ عموماً اس موضوع پر صراحت کے ساتھ کچھ نہیں کہتے ہیں۔ البتہ یہ قیاس کرنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ سست روی سے سہی اسلام کی تاثیر و کارکردگی کا سلسلہ جاری ہی رہا ہو گا۔ البتہ یہ یقینی ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد بنو عبدالدار کے عاقل و فہیم اشخاص اسلام میں داخل ہونے لگے تھے۔ اس کی سب سے درخشاں مثال بنو عبدالدار کے ممتاز ترین سردار اور کلید بردار و متولی

کعبۃ اللہ الحرام حضرت عثمان بن طلحہ عبدری کے قبول اسلام کا واقعہ ہے۔ ابن سعد نے قریش مکہ کے جن تین عظیم شخصیتوں کے اسلام قبول کرنے کا اس زمانے میں ذکر کیا ہے۔ حضرت عثمان عبدری ان میں سے ایک تھے[۳۲۴]۔ اگرچہ ابن سعد اور دوسرے سیرت نگاروں نے اس موقعہ پر یہ صراحت نہیں کی ہے کہ ان کے خاندان نے اسلام قبول کیا تھا یا نہیں تاہم دوسرے ذرائع بلکہ انہی مآخذ کے دوسرے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خاندان والے نہ صرف ان کے ساتھ مسلمان ہوئے تھے۔ بلکہ وہ ہجرت کر کے مدینہ بھی چلے گئے تھے۔ مزید امکان یہ بھی ہے کہ ان کے علاوہ بھی دوسرے عبدریوں نے اسی زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ خاص کر حضرت عثمان عبدری کے برادروں اور رشتہ داروں نے

بہرحال فتح مکہ کے دن یا اس کے بعد کے متصل زمانے میں بنو عبدالدار کے دوسرے تمام افراد اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے تھے۔ ان میں حضرت نضیر بن حارث عبدری بھی شامل تھے جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے غنائم کے خمس سے خاص عطیہ نبوی اور سرداروں کا حصہ عطا فرمایا تھا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت عثمان بن طلحہ کے ایک فرزند حضرت شیبہ بن عثمان نے فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا[۳۲۵]۔ ظاہر ہے کہ متعدد اور بھی عبدری اس دن مسلمان ہوئے تھے عبدالدار کے ایک بھائی عبد قصی کی نسل کچھ زیادہ نہیں چلی تھی۔ لہٰذا وہ کبھی ایک گھرانا نہیں بن سکا۔ اس کے بہت کم افراد میں سے حضرت طلیب بن عمیر مکی عہد کے قدیم مسلمان تھے[۳۲۶]۔ ان کے علاوہ دوسروں کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ زبیری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نسل ہی منقطع ہو گئی تھی۔ پھر بھی کچھ مرد عورتیں اور بچے یقینی طور سے عہد نبوی کے مسلم تھے۔

۱۰۔ بنو عامر بن لوی

بنو عامر بن لوی کو مکی اشرافیہ میں کوئی خاص مقام حاصل نہیں تھا، حالانکہ وہ عددی لحاظ سے قریش کے بڑے بطون میں سے ایک تھا۔ اس کا غالباً سبب یہ تھا کہ وہ قریش البطائح کے مقابلے میں قریش الظواہر کے زیادہ قریب تھے[۳۲۷]۔ بعثت نبوی کے بعد اس کے بعض سرداروں خاص کر سہیل بن عمرو کی طاقت میں اضافہ ہوا تھا۔ اور صلح حدیبیہ کے زمانے میں وہ مکہ کے اہم ترین رؤساء و اشراف میں شمار ہوتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے قریش کے نمائندے کی حیثیت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح حدیبیہ کا معاہدہ طے کیا تھا۔ اور متن معاہدہ کے مطابق تو فریق ثانی وہی تھے[۳۲۸]

بہرحال اسلام نے قریش البطائح اور قریش الظواہر تو درکنار اسود و احمر اور نسل و رنگ و وطن و علاقہ و زبان وغیرہ کسی انسانی یا قدرتی حد بندی کی پروا نہیں کی۔ چنانچہ مکی دور تبلیغ کے نصف اول کے آغاز ہی میں اس نے ابن اسحاق اور ابن سعد کے بقول اس قریشی خاندان کے بعض گھر انوں میں قدم جما لئے تھے۔ اس کے ایک گھرانے بنو عبد شمس کے دو افراد حضرات سلیط بن عمرو بن عبد شمس اور ان کے بھائی سکران قدیم ترین مسلمان تھے۔ ان دونوں کی زوجات محترمات بالترتیب حضرت فاطمہ بنت علقمہ اور حضرت سودہ بنت زمعہ بھی مسلمان ہو گئی تھیں۔ مآخذ کے بیان کے مطابق ان دونوں

بھائیوں کے گھرانوں نے حبشہ کو ہجرت کی تھی۔ جہاں حضرت سکران کا انتقال ہوگیا تھا اور باقی عامری مہاجرین ایک سال بعد مکہ پلٹ آئے تھے[۲۲۹]۔ حضرت سکران ہی کی بیوہ حضرت سودہ تھیں۔ جن سے حضرت خدیجہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کرلی تھی[۲۳۰]۔ اگرچہ مآخذ صراحت نہیں کرتے۔ مگر انساب و سیر کی دوسری کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے متعلقین خاص کر بچے بھی مسلمان تھے یا ہو گئے تھے۔ بنو عامر کے ایک اور گھرانے کے اہم ترین مکی مسلم تھے۔ حضرت ابن ام مکتوم جن کے اصل نام میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ علماء مدینہ کے نزدیک ان کا نام عبداللہ بن قیس جبکہ علماء عراق و شام عمرو بن قیس بتاتے ہیں۔[۲۳۱]

ابن اسحاق نے[۲۳۲] اپنی فہرست مہاجرین حبشہ میں بنو عامر کے مختلف گھرانوں کے آٹھ حضرات و خواتین کے اسمائے گرامی بیان کئے ہیں۔ ان میں مذکورہ بالا بزرگوں کے علاوہ (حضرت ابن ام مکتوم کو چھوڑ کر) حضرات ابو سبرہ بن ابی رہم[۲۳۳] اور ان کی زوجہ محترمہ حضرت ام کلثوم بنت سہیل بن عمرو[۲۳۴]، عبداللہ بن مخرمہ[۲۳۵]، عبداللہ بن سہیل بن عمرو[۲۳۶]، مالک بن زمعہ بن قیس[۲۳۷] اور ان کی اہلیہ عمرہ بنت سعدی بن وقدان[۲۳۸] اور حاطب بن عمرو بن عبد شمس[۲۳۹] اور ان کے ایک یمنی حلیف سعد بن خولی کو شمار کیا ہے[۲۴۰]۔ بدری صحابہ کی فہرست میں ابن اسحاق نے ایک نئے عامری نام عمیر بن عوف جو دراصل ان کے مولیٰ تھے کا اضافہ کیا ہے اور ان کو مکہ کا قدیم مسلم قرار دیا ہے[۲۴۱]

تاریخی عوامل کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اسلام نے سہیل بن عمرو عامری جو اسلام و رسول اسلام کے سخت مخالفوں میں تھے کے گھر میں یوں قدم جمالیے کہ ان کے اہل خاندان میں سے ہر فرد رفتہ رفتہ ان کا ساتھ چھوڑتا اور اسلام کا پیرو بنتا گیا۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ ان کے ایک فرزند عبداللہ اور ایک صاحبزادی ام کلثوم نہ صرف اسلام لا چکے تھے۔ بلکہ مہاجرین حبشہ میں بھی شامل تھے۔ اسی طرح ان کے دونوں بھائیوں سلیط اور سکران اور دونوں بھاوجیں فاطمہ اور سودہ بھی ابتدائی مسلمان تھے ان کی دوسری کتخدا تمام بیٹیاں بھی مسلمان ہو چکی تھیں۔ ان میں ایک حضرت سہیلہ تھیں جو حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ اموی کی زوجہ محترمہ تھیں۔ اپنے اقتدار و وقار کی خلاف ورزی نے غالباً ان کی مخالفت اسلام میں شدت پیدا کردی تھی اور انہوں نے اپنے مسلم فرزندوں پر پابندیاں عائد کردی تھیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن سہیل کی حبشہ سے واپسی پر ان کو اور اسی زمانے میں یا اس سے کچھ پہلے یا بعد میں ان کے ایک اور بھائی حضرت ابو جندل کو مکہ میں محبوس و مقید رکھا تھا[۲۴۲]۔ حضرت عبداللہ خوش نصیب تھے کہ بدر کے موقع پر مکی فوج میں شریک ہو کر مدینہ پہنچے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن رحمت میں پناہ گزیں ہوتے مگر ان کے بھائی ابو جندل کو صلح حدیبیہ کے کچھ بعد تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ ان کے علاوہ اس خاندان کے اور بھی قدیم و متاخر مسلمان تھے[۲۴۳]

بنو عامر کے دو اور ابتدائی مسلمان حضرت وہب بن سعد بن ابی سرح اور ان کے بھائی عبداللہ تھے۔ اگرچہ مؤخر الذکر کے بارے میں روایات شاہد ہیں، کہ وہ مدینہ سے بھاگ کر مرتد ہو گئے تھے۔ تاہم فتح مکہ میں وہ پھر اسلام لے آئے تھے اور مخلص مسلمان بن گئے تھے[۲۴۴]۔ فتح مکہ ہی میں حضرت سہیل بن عمرو عامری بھی مسلمان ہوئے تھے، اور ایسے

پکے اور راسخ العقیدہ کر رہ کے زمانے میں جب اوروں کے قدم ڈگمگانے لگے تھے وہ نہ صرف چٹان کی طرح ثابت قدم رہے تھے۔ بلکہ انہوں نے دوسروں کے قدم بھی جما دیئے تھے[۳۴۵]۔ دوسرے مسلمین فتح مکہ میں حضرت حویطب بن عبد العزیٰ[۳۴۶] اور ہشام بن عمرو[۳۴۷] اور حضرت سہیل کے ایک فرزند عتبہ کے علاوہ عبد بن زمعہ اور ان کے بھائی عبد الرحمٰن[۳۴۸] بھی شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے علاوہ متعدد بلکہ کثیر عامری مسلمان صحابہ ایسے تھے جو اس تذکرہ میں نہیں آسکے ہیں[۳۴۹]

۱۱۔ بنو حارث بن فہر

بنو عامر بن لوی کی مانند یہ خاندان بھی قریش الظواہر میں شمار ہوتا تھا اور کبھی کبھی قریش البطاح میں بھی مگر مکی اشرافیہ میں اس کو کوئی مقام حاصل نہیں تھا[۳۵۰] اور غالباً بعثت نبوی کے زمانے کے قریب یا اس کے بعد عہد اسلامی میں اس "مکہ کے بیرونی خاندانِ قریش" میں کوئی ایسی عظیم اور طاقتور شخصیت نہیں پیدا ہو سکی جو اسے مکی سماج و سیاست میں کوئی نمایاں مقام دلا سکتی جیسے کہ حضرت سہیل بن عمرو عامری نے اپنی صلاحیتوں کے سبب خاندان بنو عامر بن لوی کو دلایا تھا۔

بہر حال اس طبقاتی اونچ نیچ اور مکی سماج میں اس کے فروتر مقام سے قطع نظر اسلام نے بالکل شروع سے اس خاندان میں بھی اپنا اثر جما لیا تھا۔ ابن اسحاق نے قدیم ترین آٹھ مسلمانوں کی فہرست کے بعد جو چھیالیس مسلمانانِ مکہ کی فہرست دی ہے۔ اس میں حضرت ابو عبیدہ بن جراح فہری کو سر فہرست رکھا ہے[۳۵۱] درحقیقت بنو حارث بن فہر میں حضرت ابو عبیدہ کا کوئی کلیدی مقام رہا ہو یا نہ رہا ہو مگر امت اسلامی میں وہ اپنی گوناگوں صلاحیتوں اور قربانیوں کے سبب نمایاں ترین افراد میں شمار کئے جاتے تھے اور عہد نبوی میں ہی وہ حضرات ابوبکر و عمر و عثمان کے پایہ و درجہ کے سمجھے جاتے تھے۔ وہ نہ صرف اسلام کے قدیم ترین ماننے والوں میں تھے۔ بلکہ اس کے کامیاب ترین و پرجوش ترین مبلغوں میں بھی تھے اور ان کے ہاتھ پر متعدد خواتین و حضرات نے اسلام قبول کیا تھا[۳۵۲] ماخذ ان کے اپنے خاندان کے افراد کے قبول اسلام کے بارے میں خاموش ہیں۔ لیکن یہ تقریباً یقینی ہے کہ ان میں سے اکثر عہد مکی قدیم میں ہی مسلمان ہو چکے تھے[۳۵۳]

بنو حارث بن فہر کے ایک اور گھرانے کے ایک اور قدیم مسلم تھے۔ حضرت سہل بن بیضا فہری۔ وہ حضرت ابوبکر کے قدیم و قریبی دوست تھے اور ممکن ہے کہ ان کی دعوت پر اسلام لائے ہوں[۳۵۴]۔ ابن اسحاق نے مہاجرین حبشہ کی فہرست میں جن اور فہری مسلمانوں کے نام گنائے ہیں۔ ان میں مذکورہ بالا دونوں صحابہ کے علاوہ حضرات عمرو بن ابی سرح بن ربیعہ عیاض بن زہیر، عمرو بن حارث، عثمان بن عبد غنم، سعد بن عبد قیس اور حارث بن عبد قیس کے اسمائے گرامی بیان کئے ہیں[۳۵۵] بدری صحابہ کی فہرست میں اس خاندان کے پانچ افراد کا نام شامل کیا ہے۔ جن میں صفوان بن بیضاء کا نام نیا ہے[۳۵۶]۔ ان کے علاوہ دوسرے ابتدائی مسلمانوں میں حضرت حاطب بن عمرو بن ابی سرح اور حضرت عامر بن عبد غنم کو بھی شمار کرنا چاہیئے[۳۵۷] ہجرت نبوی کے بعد قریش الظواہر میں اسلام کی اشاعت کی رفتار کے بارے میں ہمارے ماخذ عام طور سے خاموش رہتے ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ دوسرے بطونِ قریش کی مانند ان میں بھی اسلام پھیلنے کا سلسلہ جاری رہا ہو گا اور فتح مکہ میں وہ بھی

اسلامی امت کے جزو بن چکے تھے[۳۶۸] ابن اثیر کے اس بیان سے کہ حضرت کرز بن جابر فہری نے بدر کے بعد کسی وقت اسلام قبول کیا تھا۔ اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے[۳۶۹]

قریش الظواہر

یہ حیرت کی بات ہے کہ ہمارے قدیم مؤلفین سیرت و مؤرخین اسلام عام طور سے اپنی ساری توجہ قریش البطاح کے مختلف بطون اور خاندانوں میں اشاعت و نشر اسلام پر مرکوز رکھتے ہیں اور اس سے زیادہ حیرت ناک و ناقابل فہم رویہ ہمارے جدید مسلم و مستشرق مؤرخین و سیرت نگاروں کا ہے جو تحقیق و تفتیش کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود قدیم ماخذ کے تتبع میں انہیں خطوط پر چلتے ہیں جن پر ان کے پیشرو چل چکے تھے۔ بہر حال قدیم و جدید دونوں مصنفین نے پوری طرح سے قریش الظواہر اور ان کے گھرانوں میں تبلیغ و اشاعت اسلام کی بحث سے صرف نظر کیا ہے۔ لیون کیتانی اور مونٹگمری واٹ وغیرہ جنہوں نے بڑی کدو کاوش سے مکی مسلمانوں کی فہرستیں تیار کی ہیں۔ قریش الظواہر کے مکی و مدنی مسلمانوں کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے اور ان کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔[۳۷۰] حالانکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ، دور کے باسی اور مکی سیاست و سماج میں غیر اہم عناصر سہی، قریش الظواہر بھی بہر حال مکہ کے باشندے تھے اور یہ بھی مسلمہ واقعہ ہے کہ وہ بھی مختلف زمانوں اور ادوار میں اسلام میں داخل ہوتے رہے۔ اسلام کی دعوت صرف قریش کے "اندرون مکہ" کے باشندوں کے لئے ہی نہیں تھی بلکہ اس کے مخاطب و مستحق اور علمبردار اس کے بیرونی باشندے بھی تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی دعوتِ حق دی تھی اور انہوں نے اسے قبول بھی کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے ماخذ میں ان کے بارے میں معلومات بہت ناقص ہیں پھر بھی ان میں اسلام کی قبولیت و اشاعت کی رفتار و نہج پر مختصر سا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

قریش الظواہر میں عام طور سے فہر کی وہ اولاد اور ان کی نسلیں شمار کی جاتی ہیں۔ جو فہر کے پوتے کعب بن غالب کے علاوہ تھیں۔ اس لحاظ سے بنو عامر بن لوی اور بنو حارث بن فہر بھی قریش الظواہر کے خاندان تھے۔ لیکن ان کو بعض اوقات قریش البطاح کا رکن سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس لئے ان پر بحث انہی کے دوسرے اراکین / بطون کے ساتھ کی جاتی ہے بہر حال ذیل میں قریش الظواہر کے مختلف بطون میں قبول و نشر اسلام کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ان کے چھ مزید گھرانے تھے۔ چار بنو عامر بن لوئی کے ذیلی گھرانے .... سامہ بن لوی، خزیمہ بن لوی، سعد بن لوی، اور حارث بن لوی، جبکہ ایک گھرانہ بنو تیم بن غالب کا تھا اور ایک ہی محارب بن فہر کا۔ ان کا مطالعہ انساب کی کتابوں پر بنیادی طور سے مبنی ہے[۳۷۱]

بنو سامہ بن لوی کی اولادوں میں حارث بن سامہ کے فرزند لوی، عبیدہ، سعد، ربیعہ، عبد البیت، ساعدہ اور حارث رسول کریم کے معاصر تھے۔ اور غالباً وہ کسی وقت اسلام ضرور لاتے تھے۔ اسی طرح بنو ربیعہ بن حارث اور لوی بن حارث وغیرہ کے فرزندوں کے بارے میں گمان ہے کہ وہ عہد نبوی میں کسی دور کے مسلمان تھے۔

بنو خزیمہ بن لوی کو عائذۃ قریش بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں بنو حارث بن مالک بن عبید بن خزیمہ سے متعدد لوگ عہد نبوی کے معاصر مسلمان تھے۔ جبکہ بنو حرب بن خزیمہ کے متعدد افراد مسلمان ہو کر حضرت ابوبکر و عمر کے زمانے میں شام کے علاقے میں جا بسے تھے۔

بنو سعد بن لوی میں عبد اللہ بن غانم کی اولاد یں یقینی طور پر عہد نبوی کی مسلمان تھیں۔ ان میں سے ابو الدھماء حضرت عمر کے عہد میں مدینہ آئے تھے اور حضرت عثمان بن عفان نے ان کے لئے شہادت دی تھی۔

بنو الحارث بن لوی میں حصین بن عقیدہ کی اولاد و اخلاف کے اسلام لانے کا گمان ہوتا ہے۔ اگرچہ تفصیلات نہ ہونے کے سبب یقینی طور سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

بنو تیم بن غالب جن کو بنو ادرم بھی کہا جاتا ہے کے بارے میں ہمارے سیرت کے مآخذ بھی روایت کرتے اور شہادت دیتے ہیں کہ اس کے ایک گھرانے بنو کثیر بن تیم الادرم کے ایک فرد عبد اللہ بن خطل نے اسلام قبول کر کے مدینہ ہجرت کی تھی، مگر پھر وہ مرتد ہونے کے علاوہ ایک مسلمان کو قتل کر کے مکہ فرار ہو گیا۔ جہاں فتح مکہ کے دن وہ اپنے جرائم کی پاداش میں قتل کیا گیا تھا۔ امکان ہے بلکہ یقینی ہے کہ اس گھرانے میں مخلص مسلمان بھی تھے اور خاصے تھے۔

بنو محارب بن فہر میں مآخذ نے کئی صحابہ کرام کا نام گنایا ہے۔ ان میں حضرت عمرو بن ابی عامر مکی عہد کے قدیم مسلم تھے۔ جبکہ حضرت ضحاک بن قیس فہری عہد نبوی کے اواخر کے صحابی اور مسلمان تھے۔ ان کے علاوہ حضرت حبیب بن مسلمہ فہری کو بھی صحابہ میں شمار کیا گیا ہے، اگرچہ واقدی کا خیال ہے کہ ان کو شرف صحبت نبوی حاصل نہیں تھا۔ اسی طرح حضرت ضرار بن خطاب محاربی فہری بھی عہد نبوی کے اواخر کے مسلمان تھے۔ ایک اور مسلم محاربی تھے۔ حضرت رباح بن عمرو جو سفر کے اچھے گیت لکھتے تھے، لیکن بنو محارب کے سب سے نامور صحابی تھے۔ حضرت کرز بن جابر محاربی فہری جو بدر کے بعد کسی وقت اسلام لائے تھے اور فتح مکہ میں چند مسلمان شہداء میں سے ایک تھے۔ ظاہر ہے کہ ان صحابہ کرام کے دوسرے خاندان والوں میں سے سب نہ سہی مگر کچھ یقیناً ابتدائی مسلمان تھے۔ ورنہ یہ تو قیاس کی کسوٹی پر یقینی ہے۔ کہ ان تمام خاندانوں کے تمام افراد فتح مکہ کے زمانے میں اسلام لا چکے تھے ۳۶۲

انصار مدینہ

ریاست اسلامی کے ارتقاء کے ضمن میں ہم انصار مدینہ کے دونوں قبیلوں اوس و خزرج کے اسلام سے تعارف و تعلقات کا جائزہ لے چکے ہیں۔ دراصل ان کے قبول اسلام کے چار عہد یا زمانے تھے۔ پہلا زمانہ ۱۱ نبوی کا برس تھا جب خزرج کے چھ اشخاص مکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر مسلمان ہو گئے اور جب وہ اپنے وطن یثرب واپس لوٹے تو اسلام کے مبلغ و علمبردار بن کر لوٹے اور اپنے اپنے قبیلوں، خاندانوں اور پڑوسیوں میں اسلام پھیلاتے رہے ان کی دعوت و تبلیغ پر خاصی تعداد میں لوگ مسلمان ہو گئے۔ جن میں سے بارہ مسلمان۔ نو خزرج کے مختلف خاندانوں سے اور

تین اوس کے گھرانوں سے دوسرے برس یعنی ۶۲۱ء میں حج کے موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور پہلی بیعت عقبہ کی۔ ۶۲۱ء اور ۶۲۲ء کا درمیانی عرصہ دوسرا عہد تبلیغ اسلام ہے جو مدینہ میں شروع ہوا۔ اس زمانے میں مدینہ میں اسلام کی اشاعت میں تیز رفتاری آئی اور کافی لوگ مسلمان ہوتے۔ اس کا ایک سبب حضرت مصعب بن عمیر عبدری کا بطور مبلغ و معلم و امام بن کر مدینہ پہنچنا تھا۔ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے اور "خلیفہ" کی حیثیت سے تبلیغ و دعوت میں زبردست کوششیں کیں۔ ان کے دست راست اور تبلیغ اسلام کو مدینہ میں منظم کرنے والے حضرت اسعد بن زرارہ نجاری تھے۔ ان دونوں کی کوششوں، حکمت عملی، اور خلوص و جد و جہد سے قبیلہ اوس کے دو بڑے سردار حضرات سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر اسلام لے آئے اور اس کے نتیجہ میں پورا قبیلہ اوس مسلمان ہو گیا۔ یہ دوسرا مرحلہ ۶۲۲ء میں بیعت عقبہ ثانیہ پر ختم ہوا۔ جب مدینہ کے مسلمانوں کے پچھتر نمائندے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ آ کر ملے اور آپ کو مدینہ آنے کی دعوت دی۔ ۶۲۲ء میں بیعت عقبہ ثانیہ اور ہجرت نبوی کے کچھ بعد تک کا زمانہ مدینہ میں تبلیغ اسلام کا تیسرا مرحلہ تھا۔ جب پورا مدینہ مسلمان ہو گیا تھا۔ سوائے اوس مناۃ کے تین چھوٹے چھوٹے گھرانوں بنو وائل، بنو واقف اور بنو خطمہ کے علاوہ ایک اور گھرانے بنو امیہ بن زید کے۔ یثرب کی غالب اکثریت بلکہ پچانوے فیصد آبادی کل تین ساڑھے تین برس میں مسلمان ہو گئی تھی۔ لیکن یہ پانچ فیصد عرب آبادی نے اپنے قبول اسلام میں لگ بھگ پانچ برس لگا دیئے اور وہ غزوہ خندق کے بعد اسلام لاتے۔ ان کے قبول اسلام میں تاخیر کا سبب یہ تھا کہ ان کے سردار حضرت ابو قیس صیفی بن الاسلت نے اسلام نہیں قبول کیا تھا۔ اور ان کی پیروی میں ان کی قوم بھی قبول اسلام سے رکی رہی تھی۔ اس واقعہ سے مزید ثابت ہوتا ہے کہ سرداروں اور شیوخ قبائل کا اثر ان کے قبیلہ والوں پر کس قدر زیادہ دور رس اور ہمہ گیر ہوتا تھا۔ سرداروں کا قبول اسلام دراصل قبیلوں کا قبولِ اسلام ہوتا تھا۔ مکہ اور مدینہ میں اسلام کی تبلیغ و دعوت کے تقابلی مطالعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں قبول و اشاعتِ اسلام میں سب سے بڑی رکاوٹ سرداران قریش کی سرد مہری، مخالفت اور عداوت تھی۔ جبکہ مدینہ کے تمام اہم اوسی اور خزرجی سرداروں نے اسلام قبول کر کے اپنے قبیلوں کے مسلمان ہونے کی راہ ہموار کر دی تھی۔

مدینہ منورہ میں اشاعتِ اسلام کا سہرا جن حضرات کے سر بندھا ہے۔ ان میں سر فہرست خزرج کے چھ سابقین اولین ہیں جنہوں نے مکہ میں سب سے پہلے قبول اسلام کیا تھا۔ پھر بیعت عقبہ اولیٰ کے بارہ ارکان کے نام آتے ہیں۔ لیکن اس عظیم کام میں سب سے اہم اور گرانقدر کردار حضرت مصعب بن عمیر عبدری اور ان کے دست راست حضرت ابو امامہ اسعد بن زرارہ نے ادا کیا تھا۔ ان کے بعد باقی کام بارہ نقیبوں نے حضرت مصعب کے ساتھ مل کر انجام دیا تھا۔ لیکن اس موقعہ پر اوس و خزرج کے سرداروں کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ ان کے قبیلوں نے دراصل انہی کی تحریک و تقلید پر اسلام قبول کیا تھا۔

انصار مدینہ میں اشاعت اسلام کی بحث میں ان کے اہم خاندانوں اور گھرانوں کا ایک مختصر سا جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جس سے ان کی تعداد کا اندازہ کیا جا سکے گا۔ اوس و خزرج کے اہم خاندان اور قبیلے یہ تھے ۳۶۳؎

۱۔ اوس بن حارثہ بن ثعلبہ بن عمرو مزیقیاء

اوس کا قبیلہ اس کے ایک فرزند مالک کی نسل میں دراصل چلا تھا اور اس کے پانچ اہم خاندان تھے۔ یہ پانچ خاندان اور ان کے ذیلی گھرانے حسب ذیل تھے۔

(ل) بنو عوف بن مالک : (۱) بنو عمرو بن عوف : بنو ضُبَیعہ، بنو امیہ، بنو عبید، بنو جحجبا، بنو ثعلبہ، بنو معاویہ بنو لوذان، بنو علش، بنو حبیب (بنو عمرو بن عوف قباء میں آباد تھے)

(ب) بنو عمرو بن مالک : (یہ النبیت کہلاتے تھے) : بنو عبد الاشہل، بنو زعوراء بن حشم، بنو حارثہ بن حارث بنو مجدعہ بن حارثہ بن حارث، بنو ظفر (بن خزرج بن عمرو بن مالک)

(ج) بنو مُرّہ بن مالک : (یہ جعادرہ کہلاتے تھے) : بنو وائل، بنو امیہ، بنو عطیہ (اوس مناۃ کے گھرانے بشمول بنو واقف)

(د) بنو جشم بن مالک : بنو خطمہ

(س) بنو امرؤ القیس بن مالک : بنو سلیم، بنو واقف، بنو غنم

(۲) خزرج بن حارثہ بن ثعلبہ بن عمرو مزیقیاء

(ا) بنو النجّار : بنو جدیلہ، بنو معاویہ، بنو غنم بن مالک، بنو حزم بن زید بن لوذان، بنو مبذول، بنو دینار بنو مازن، بنو عدی (بنو مغالہ)

(ب) بنو عوف : بنو عمرو بن عوف، بنو سالم، الحبلیٰ، بنو عنز (قواقلہ)

(ج) بنو غنم :

(د) بنو جشم : بنو زریق بن عبد حارثہ، بنو زریق بن عامر، بیاضہ، بنو تزید (سارده : بنو سلمہ)

(س) بنو حارث : بنو جشم، بنو زید، بنو عوف، بنو خزرج، بنو مالک بن ثعلبہ، بنو عوف بن حارث بنو عبارہ، بنو ابجر

(ط) بنو کعب : بنو ساعدہ

انصار کے ان دونوں قبیلوں اور ان کے اہم خاندانوں کی تفصیل سے ایک موٹا سا اندازہ ان کی کل آبادی کا ہوتا ہے ہمارے پاس ان کی آبادی کے کل اعداد و شمار نہیں ہیں لیکن اندازہ ہے کہ فتح مکہ کے دس ہزار کے لشکر میں ان کی سپاہیوں کی تعداد چار اور پانچ ہزار کے درمیان تھی[۲۱۴]۔ اس پر قیاس کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انصار کی کل آبادی ہجرت نبوی کے وقت بیس پچیس ہزار کے لگ بھگ تھی جو وفات نبوی کے وقت تقریباً تیس پینتیس ہزار ہو گئی تھی۔ اتنی بڑی آبادی

کی غالب اکثریت کا تین ساڑھے تین برس میں مسلمان ہوجانا یقیناً ایک عظیم کارنامہ تھا۔

اسلام اور بدوی قبائل

مکہ کے قریش اور مدینہ کے اوس و خزرج اسلام کے پہلے دو مرکز اور تبلیغ دینِ خداوندی کے اولین دو محور تھے۔ ہجرتِ نبوی سے قبل اسلام کی اشاعت محض قریش کے مختلف بطون اور ان کے گھرانوں یا مکہ کی چار دیواری میں محدود نہیں رہی تھی۔ بالکل اسی طرح ہجرتِ مدینہ کے بعد اسلام صرف انصار کے مختلف قبیلوں اور ان کے خاندانوں کے بیچ محصور نہیں رہا تھا۔ بلکہ مکہ اور مدینہ اپنے اپنے ادوار میں اسلام اور اسلامی تحریک کے وہ دو بنیادی مرکز تھے۔ جہاں سے اسلام کے نور کی شعاعیں جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں بلکہ گوشے گوشے اور چپے چپے کو روشن کر گئی تھیں۔ مکی عہد کے ساتویں برس کے آغاز میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعوری و ارادی طور سے اسلام کو جزیرہ نمائے عرب کے پڑوسی ممالک شام، عراق، فلسطین، مصر اور ایران و حبشہ میں روشناس کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور اس کے اچھے نتائج بھی برآمد ہوئے تھے[265] جبکہ مکی عہد کے پانچویں برس میں غیر شعوری طور پر ہی اسلام کا تعارف بحرِ قلزم کے پار حبشہ کی عیسائی سلطنت میں ہو چکا تھا، اور مسلم روایات کے مطابق وہاں کا معاصر بادشاہ مسلمان ہو گیا تھا[266]، اگرچہ اس کے طبقہ امراء اور رعایا نے اسلام کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔ پھر بھی اس امکان سے قطعی اور حتمی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حبشی رعایا میں سے گنتی کے چند افراد ہی نے ضرور اسلام قبول کر لیا تھا۔ ٹھوس تاریخی حقائق قرآن کریم کے اس دعوائے ربانی کی تائید کرتے ہیں کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا جو روزِ اول بلکہ روزِ ازل سے "تمام لوگوں (کافۃ۔ للناس) کے لئے اتارا گیا تھا"[267] اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس آفاقی نصب العین اور عالمی فریضے کا اس دن سے بخوبی احساس و شعور تھا[268] جس دن آپ کو خلقِ خدا کے سامنے دعوتِ اسلامی کو واشگاف و علانیہ پیش کرنے کا حکم الٰہی ملا تھا[269] ہمارے جدید محققین اور مستشرقین کا یہ نظریہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم محض ایک عرب پیغمبر تھے اور آپ کا لایا ہوا دین محض آپ کی اپنی قوم یا زیادہ سے زیادہ عربوں کے لئے تھا[270] غلط اور گمراہ کن ہی نہیں بلکہ تاریخی حقائق کے بالکل خلاف ہے۔ وہ دراصل ان کے مذہبی اور قومی تعصب کا زائیدہ و پروردہ اور حق کو جان لینے کے باوجود اس کو نہ ماننے کے جہلِ مرکب کا نتیجہ ہے۔

جہاں تک مکی عہد میں جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے متعارف ہونے کا تعلق ہے۔ یہ ٹھوس تاریخی واقعہ ہے کہ تمام بدوی قبائل پیغمبرِ اسلام کے ظہور اور اسلام کے بنیادی اصولوں سے واقف ہو چکے تھے۔ ماخذ سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف مکہ میں تبلیغ کرتے پھرتے تھے بلکہ اردگرد کے علاقوں میں لگنے والے بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں بھی آپ اپنے پیغامِ صداقت اور دعوتِ حق کو لیکر پہنچ جاتے تھے۔ چنانچہ عکاظ، ذوالمجاز، ذوالمجنہ وغیرہ بازاروں میں آپ کے خطبات عالیہ کے حوالے سیرت کے ماخذ میں ملتے ہیں۔ خود مکہ میں چونکہ سال بھر کعبہ کا عمرہ کرنے والے عرب قبائل کا تانتا لگا رہتا تھا اور حج کے مواقعِ خاص پر جزیرہ نما کے گوشے گوشے اور قبیلے قبیلے کے لوگ آتے رہتے تھے۔ اس لئے پورا

عرب آپ کے کام سے واقف ہو چکا تھا۔ مؤرخین نے جن بدوی قبائل سے آپ کی مکہ میں ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں بنو عامر بن صعصعہ، بنو محارب، بنو فزارہ، (غطفان)، غسان، بنو مُرّہ (غطفان)، بنو حنیفہ، بنو سلیم، بنو عبس بنو نضر، بنو کندہ، بنو کلب، بنو حارث بن کعب، (نجران)، بنو عذرہ، اور حضر موت و یمن کے متعدد قبیلے شامل تھے۔[۲۱]
ہمارے تمام مآخذ عموماً یہ بیان کرتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے آپ کے پیغام کو قبول نہیں کیا تھا۔ مگر یہ تعمیم صحیح نہیں معلوم ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان قبیلوں نے اجتماعی طور سے دعوتِ حق مسترد کر دی تھی مگر اس امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض افراد نے اس کو نجی طور سے قبول بھی کر لیا ہو۔ بہر حال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کسی نے قبول نہیں کیا تھا تو بھی یہ تو ماننا ہی پڑے گا۔ کہ قبائل عرب سے آپ کی ان ملاقاتوں نے نہ صرف اسلام کو ان سے اور ان کے ذریعہ ان کے علاقے کے لوگوں سے متعارف کرا دیا تھا۔ بلکہ ان میں اسلام کے بارے میں جستجو پیدا کر دی تھی اور اسلام کی قبولیت و اشاعت کی راہیں ہموار کر دی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ یمن کے دور دراز کے علاقے میں بسنے اشعر قبیلے سے حضرت ابوموسیٰ اشعری، مغربی علاقے کے ابوذر غفاری، ازد کے طفیل بن عمرو دوسی، بحرین کی مشرقی سرحد سے عبد القیس کے اشج اور ازدشنوءہ کے ضماد بن ثعلبہ اور نہ جانے کتنے اور آپ کے بارے میں سن کر پیغام حق کے مشتاق بنے تھے۔ دل کی لگی، حق کی تلاش اور روح کی پیاس ان کو مشتاقانہ و پروانہ وار مکہ لائی تھی۔ اور پھر ان تشنہ کامان عرب نے اپنی پیاس کو ثر و سلسبیل محمدی کے آب خنک سے بجھائی تھی۔

مدنی دور میں قبائل عرب کی تلاش حق اور جستجوئے صدق میں عشق کی گرمی بھی در آئی تھی۔ اسلامی ریاست اور امتِ الٰہی کے قیام اور ارتقا نے ان کے لئے تازیانہ شوق کا کام کیا تھا۔ مکہ کی طاقت ور ترین اشرافیہ کے خلاف مسلمانوں کی کشمکش اور کامیابی نے ان کے اشتیاق کو اور ہوا دی تھی۔ اور دور دراز کے مقامات سے ان کے افراد و گروہ مدینہ آتے تھے اور شاد کام واپس جاتے تھے۔ ان میں مدینہ کے نواح مغرب کے قبائل خزاعہ، مزینہ، جہینہ، اسلم و غفار ضمرہ، لیث، مدلج، کنانہ اور ازد شنوءہ بھی تھے اور حرمین کے مشرق کے باسی قبیلے جیسے خزیمہ، طے، ہذیل، محارب غطفان، سلیم، ہوازن، اور باہلہ وغیرہ بھی تھے۔ شمالی قبائل سعد ہذیم، جذام، قضاعہ، بلی، بہراء، لخم، کلب اور غسان کے افراد بھی کلام ربانی کے اتنے ہی آرزو مند تھے۔ جتنے کہ جنوبی قبائل خثعم، مذحج، بجیلہ، ہمدان، حارث بن کعب، نہد، مراد، کندہ، حمیر، حضر موت اور عک و اشعر کے لوگ تھے۔ اسی طرح جزیرہ نمائے عرب میں جا بجا منتشر و آباد قبائل عرب جیسے بہرہ، ازد عمان، عبد القیس، بنو حنیفہ، تمیم، وائل اور تغلب بھی حق و صداقت کے جویا اور پابند تھے۔

اس دہ سالہ عہد تبلیغ میں ایک نئے عنصر کا اضافہ بھی ہوا تھا اور وہ تھا تبلیغی جماعتوں اور مہموں کو منظم کر کے مختلف علاقوں اور قبیلوں میں بھیجنا۔ مکی عہد نبوی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ممکن نہ تھا کہ اس طرح کی تبلیغی تنظیم کر سکتے۔ مگر مدینہ میں وہ نہ صرف ممکن ہو گئی تھی بلکہ ناگزیر بھی بن گئی تھی۔ چنانچہ آپ کی بیشتر مہمیں جن کو غلطی

کی غالب اکثریت کا تین ساڑھے تین برس میں مسلمان ہو جانا یقیناً ایک عظیم کارنامہ تھا۔

اسلام اور بدوی قبائل

مکہ کے قریش اور مدینہ کے اوس و خزرج اسلام کے پہلے دو مرکز اور تبلیغ دین خداوندی کے اولین دو محور تھے۔ ہجرت نبوی سے قبل اسلام کی اشاعت محض قریش کے مختلف بطون اور ان کے گھرانوں یا مکہ کی چار دیواری میں محدود نہیں رہی تھی۔ بالکل اسی طرح ہجرت مدینہ کے بعد اسلام صرف انصار کے مختلف قبیلوں اور ان کے خاندانوں کے بیچ محصور نہیں رہا تھا۔ بلکہ مکہ اور مدینہ اپنے اپنے ادوار میں اسلام اور اسلامی تحریک کے وہ دو بنیادی مرکز تھے۔ جہاں سے اسلام کے نور کی شعاعیں جزیرۂ نمائے عرب کے مختلف علاقوں بلکہ گوشے گوشے اور چپے چپے کو روشن کر گئی تھیں یہ مکی عہد کے ساتویں برس کے آغاز میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعوری و ارادی طور سے اسلام کو جزیرہ نمائے عرب کے پڑوسی ممالک شام، عراق، فلسطین، مصر اور ایران و حبشہ میں روشناس کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور اس کے اچھے نتائج بھی برآمد ہوئے تھے[۲۶۵] جبکہ مکی عہد کے پانچویں برس میں غیر شعوری طور پر ہی اسلام کا تعارف بحر قلزم کے پار حبشہ کی عیسائی سلطنت میں ہو چکا تھا، اور مسلم روایات کے مطابق وہاں کا معاصر بادشاہ مسلمان ہو گیا تھا[۲۶۶]، اگرچہ اس کے طبقہ امراء اور رعایا نے اسلام کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔ پھر بھی اس امکان سے قطعی اور حتمی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حبشی رعایا میں سے گنتی کے چند افراد ہی نے ضرور اسلام قبول کر لیا تھا۔ ٹھوس تاریخی حقائق قرآن کریم کے اس دعوائے ربانی کی تائید کرتے ہیں کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا جو روز اول بلکہ روزِ ازل سے "تمام لوگوں (کافة ۔ للناس) کے لئے اتارا گیا تھا"[۲۶۷]۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس آفاقی نصب العین اور عالمی فریضے کا اس دن سے بخوبی احساس و شعور تھا[۲۶۸] جس دن آپ کو خلق خدا کے سامنے دعوت اسلامی کو واشگاف و علانیہ پیش کرنے کا حکم الٰہی ملا تھا[۲۶۹]۔ ہمارے جدید محققین اور مستشرقین کا یہ نظریہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم محض ایک عرب پیغمبر تھے اور آپ کا لایا ہوا دین محض آپ کی اپنی قوم یا زیادہ سے زیادہ عربوں کے لئے تھا[۲۷۰] غلط اور گمراہ کن ہی نہیں بلکہ تاریخی حقائق کے بالکل خلاف ہے۔ وہ دراصل ان کے مذہبی اور قومی تعصب کا زائیدہ و پروردہ اور حق کو جان لینے کے باوجود اس کو نہ ماننے کے جہل مرکب کا نتیجہ ہے۔

جہاں تک مکی عہد میں جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے متعارف ہونے کا تعلق ہے۔ یہ ٹھوس تاریخی واقعہ ہے کہ تمام بدوی قبائل پیغمبر اسلام کے ظہور اور اسلام کے بنیادی اصولوں سے واقف ہو چکے تھے۔ مآخذ سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف مکہ میں تبلیغ کرتے پھرتے تھے بلکہ ارد گرد کے علاقوں میں لگنے والے بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں بھی آپ اپنے پیغام صداقت اور دعوت حق کو لیکر پہنچ جاتے تھے۔ چنانچہ عکاظ، ذوالمجاز، ذوالمجنہ وغیرہ بازاروں میں آپ کے خطبات عالیہ کے حوالے سیرت کے مآخذ میں ملتے ہیں۔ خود مکہ میں چونکہ سال بھر کعبہ کا عمرہ کرنے والے عرب قبائل کا تانتا لگا رہتا تھا اور حج کے مواقع خاص پر جزیرہ نما کے گوشے گوشے اور قبیلے قبیلے کے لوگ آتے رہتے تھے۔ اس لئے پورا

عرب آپ کے کام سے واقف ہو چکا تھا۔ مورخین نے جن بدوی قبائل سے آپ کی مکہ میں ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں بنو عامر بن صعصعہ، بنو محارب، بنو فزارہ، (غطفان)، غسّان، بنو مُرّہ (غطفان)، بنو حنیفہ، بنو سلیم، بنو عبس بنو نضر، بنو کندہ، بنو کلب، بنو حارث بن کعب، (نجران)، بنو عذرہ، اور حضرموت و یمن کے متعدد قبیلے شامل تھے ۲۷۱ ہمارے تمام مآخذ عموماً یہ بیان کرتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے آپ کے پیغام کو قبول نہیں کیا تھا۔ مگر یہ تعمیم صحیح نہیں معلوم ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان قبیلوں نے اجتماعی طور سے دعوتِ حق مسترد کر دی تھی مگر اس امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض افراد نے اس کو نجی طور سے قبول بھی کر لیا ہو۔ بہر حال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کسی نے قبول نہیں کیا تھا تو بھی یہ تو ماننا ہی پڑے گا۔ کہ قبائل عرب سے آپ کی ان ملاقاتوں نے نہ صرف اسلام کو ان سے اور ان کے ذریعہ ان کے علاقے کے لوگوں سے متعارف کرا دیا تھا۔ بلکہ ان میں اسلام کے بارے میں جستجو پیدا کر دی تھی اور اسلام کی قبولیت و اشاعت کی راہیں ہموار کر دی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ یمن کے دور دراز کے علاقے میں بسے اشعر قبیلے سے حضرت ابو موسیٰ اشعری، مغربی علاقے کے ابوذر غفاری، ازد کے طفیل بن عمرو دوسی، بحرین کی مشرقی سرحد سے عبد القیس کے اشج اور ازد شنوءہ کے ضماد بن ثعلبہ اور نہ جانے کتنے اور آپ کے بارے میں سن کر پیغامِ حق کے مشتاق بنے تھے۔ دل کی لگی، حق کی تلاش اور روح کی پیاس ان کو مشتاقانہ و پروانہ وار مکہ لائی تھی۔ اور پھر ان تشنہ کامانِ عرب نے اپنی پیاس کوثر و سلسبیل محمدی کے آبِ خنک سے بجھائی تھی۔

مدنی دور میں قبائل عرب کی تلاشِ حق اور جستجوئے صدق میں عشق کی گرمی بھی در آئی تھی۔ اسلامی ریاست اور امتِ الٰہی کے قیام اور ارتقا نے ان کے لئے تازیانہ شوق کا کام کیا تھا۔ مکہ کی طاقت ور ترین اشرافیہ کے خلاف مسلمانوں کی کشمکش اور کامیابی نے ان کے اشتیاق کو اور ہوا دی تھی۔ اور دور دراز کے مقامات سے ان کے افراد و گروہ مدینہ آتے تھے اور شاد کام واپس جاتے تھے۔ ان میں مدینہ کے نواح مغرب کے قبائل خزاعہ، مزینہ، جہینہ، اسلم و غفار ضمرہ، لیث، مدلج، کنانہ اور ازد شنوءہ بھی تھے اور حرمین کے مشرق کے باسی قبیلے جیسے خزیمہ، طے، ہذیل، محارب غطفان، سلیم، ہوازن، اور باہلہ وغیرہ بھی تھے۔ شمالی قبائل سعد ہذیم، جذام، قضاعہ، بلی، بہراء، لخم، کلب اور غسان کے افراد بھی کلام ربانی کے اتنے ہی آرزو مند تھے۔ جتنے کہ جنوبی قبائل خثعم، مذحج، بجیلہ، ہمدان، حارث بن کعب، نہد، مراد، کندہ، حمیر، حضرموت اور عک و اشعر کے لوگ تھے۔ اسی طرح جزیرہ نمائے عرب میں جا بجا منتشر و آباد قبائل عرب جیسے مہرہ، ازد عمان، عبد القیس، بنو حنیفہ، تمیم، وائل اور تغلب بھی حق و صداقت کے جویا اور پابند تھے۔

اس دہ سالہ عہدِ تبلیغ میں ایک نئے عنصر کا اضافہ بھی ہوا تھا اور وہ تھا تبلیغی جماعتوں اور مہموں کو منظم کر کے مختلف علاقوں اور قبیلوں میں بھیجنا۔ مکی عہدِ نبوی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ممکن نہ تھا کہ اس طرح کی تبلیغی تنظیم کر سکتے۔ مگر مدینہ میں وہ نہ صرف ممکن ہو گئی تھی بلکہ ناگزیر بھی بن گئی تھی۔ چنانچہ آپ کی بیشتر مہمیں جن کو غلطی

سے "فوجی" سمجھ لیا گیا ہے۔ مذہبی اور تبلیغی کوششیں تھیں۔ یہ مہمیں کبھی آپ خود لیکر گئے اور کبھی اپنے صحابہ کرام کی ماتحتی و سرکردگی میں بھیجیں۔ ان مہموں میں غزوات بئر معونہ اور رجیع اور نہ جانے کتنی اور تھیں۔ جن میں مسلم مبلغوں نے اپنے خون کی سرخی سے اسلامی تحریک کی داغ بیل ڈالی تھی۔ زبان و قلم اور تلوار سے تبلیغ اتنی موثر نہیں ہوتی ہے۔ جتنی کہ بہتے ہوئے خون کی لالی سے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپ اور آپ کے جان نثاروں نے خالص عسکری مہموں کے دوران بلکہ تلواروں کی چھاؤں میں اور تختہ دار کی بلندی سے بھی پیغام حق سنانے اور لوگوں کو دعوت دین دینے میں گریز نہیں کیا۔ انہیں قربانیوں، کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ تئیس برس کی مدت میں پورا جزیرہ نمائے عرب اسلام کے پرچم تلے آگیا تھا۔

لیکن یہ کارنامہ یہ معجزہ اور یہ کار عظیم کیونکر اور کیسے وجود میں آیا وہ تاریخ اسلام کا ایک انتہائی تابناک باب ہے۔ اور اس کو سمجھنے کے لئے قبائل عرب میں اشاعت اسلام کی تاریخ، نہج اور انداز کا ویسے ہی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ جیسے کہ ہم نے قریش مکہ کے سلسلے میں لیا ہے۔ قبائل عرب کی اس تجزیئے میں جو ترتیب رکھی گئی ہے۔ وہ تاریخی نوعیت کے تقاضوں کے مطابق رکھی گئی ہے اور اس میں ہم نے مونٹگمری واٹ کی تقسیم قبائل کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس کے دو سبب ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ آسان جغرافیائی ترتیب ہے اور دوم یہ کہ مستشرق موصوف کی تاریخی غلط بیانیوں کا بھی پردہ چاک کیا جا سکتا ہے اور صحیح صورتحال اجاگر کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ پہلے ہم نے مدینہ منورہ کے مغرب اور نواح مغرب میں آباد بدوی قبائل عرب سے بحث کی ہے۔ پھر حرمین شریفین کے مشرق میں آباد قبائل عرب میں اسلام کی اشاعت کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے بعد بالترتیب شمالی سمت اور جنوبی عرب میں بسے ہوئے قبائل کے اسلام کے ساتھ تعلقات کی نوعیت اجاگر کی ہے۔ اور آخر میں جزیرہ نما کے مختلف علاقوں میں بکھرے قبیلوں میں اسلام کی تبلیغ کی رفتار و نہج پر نظر ڈالی ہے۔

(۱) مغربی قبائل عرب

مہاجرین مکہ یا قریش کے ابتدائی مسلمانوں اور انصار مدینہ کے بعد اسلامی امت اور اسلامی ریاست کے قیام، ارتقاء اور تکمیل میں جن قبائل عرب نے سب سے زیادہ حصہ لیا تھا۔ وہ مدینہ منورہ کے مغرب میں آباد قبیلے تھے اسلام اور مرکز اسلام مدینہ سے ان کے خصوصی تعلقات کے قیام میں جغرافیائی سیاست کے عوامل سب سے زیادہ کارفرما تھے۔ چونکہ وہ زیادہ تر مدینہ منورہ کے نواح میں آباد تھے۔ اس لئے عمرانیات کے اصول و اسباب کے سبب ان کو مدینہ سے کسی نہ کسی قسم کے تعلقات و روابط استوار کرنے ناگزیر تھے۔ اس میں بعض بدوی قبائل جیسے جہینہ اور مزینہ وغیرہ کے اوس و خزرج سے زمانہ جاہلیت سے قائم تعلقات نے کافی مدد کی تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اوس و خزرج کے مختلف گھرانوں اور افراد سے ان کے حلیفانہ تعلقات اور دوستانہ روابط کیونکر کام آئے تھے۔ اور مختلف و متضاد گروہوں کے حلیفوں کے بجائے وہ کیسے پوری امت اسلامی اور ریاست اسلامی کے حلیف اور دوست بن گئے تھے۔ ان ناگزیر اسباب سے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ بدوی قبائل عرب میں اسلام کی نشر و اشاعت کے تجزیئے کو مغربی قبائل سے شروع کیا جائے۔

ذکر آچکا ہے کہ ہر علاقے میں مختلف و متعدد قبائل تھے جو نسل و نسب یا خون کے رشتوں پر استوار ہوئے تھے۔ ان میں چھوٹے بڑے اور متوسط درجہ کے قبیلے تھے۔ عموماً ایک چھوٹا قبیلہ پانچ سو سے ایک ہزار افراد پر مشتمل ہوتا تھا۔ جبکہ متوسط قبیلہ اس کا دوگنا ہوتا تھا۔ بڑے قبیلے دو تین ہزار اور پانچ چھ ہزار افراد پر مشتمل ہوتے تھے اور لبا اوقات بعض قبائل اس سے بھی بڑھ جاتے تھے۔ جیسے کہ قریش، غطفان، اور ہوازن و غسان وغیرہ تھے[342] چونکہ ہر قبیلہ چارہ پانی اور کھانے کی کمی اور شاداب جگہ کی قلت کے سبب ایک جگہ نہیں ٹھہر سکتا یا مقیم رہ سکتا تھا۔ اس لئے وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ جاتا تھا۔ جو بطن / حی (خاندان: CLAN) کہلاتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ بطن اتنے بڑے ہو جاتے تھے وہ بجائے خود قبیلے بن جاتے تھے اور اجتماعی اکائی کے طور پر کام نہ کر سکنے کے سبب وہ پھر تقسیم ہونا شروع ہو جاتے تھے اور شکست و ریخت کا یہ عمل اور اسی پر مبنی تعمیر و تشکیل کا رد عمل جاری ہی رہتا تھا۔ انہی اسباب سے عرب میں بیشمار قبیلے، بطون اور گھرانے نظر آتے ہیں۔ ہم سارے اہم ترین قبائل اور ان کی خاص شاخوں سے اس تجزیے میں بحث کریں گے بہرحال مغربی قبائل اور ان کی ذیلی شاخیں حسب ذیل تھیں:

(ا) کنانہ : بکر بن عبد مناۃ (۱) بنو ضمرہ (۲) بنو غفار (۳) بنو لیث (۴) بنو دئل (۵) بنو مدلج (۶) بنو خذیمہ

(ب) خزاعہ : (۱) بنو اسلم، (۲) بنو کعب بن عمرو (۳) بنو المصطلق

(ج) جہینہ :

(د) مزینہ :

(س) ازد شنوءہ : بنو سعد بن بکر، بنو دوس۔

(۱) بنو ضمرہ

مغربی قبائل میں بنو ضمرہ غالباً سب سے پہلے تھے۔ جنہوں نے اسلامی ریاست سے دوستانہ تعلقات کی بنیاد ڈالی تھی اور پھر اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے تھے[343] ہمارے مآخذ اس کنانی شاخ کے کئی ابتدائی مدنی عہد کے مسلمانوں کے ناموں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت جعال بن سراقہ ضمری تھے۔ جو اپنے علاقے سے ہجرت کر کے مدینہ آ بسے تھے اور غزوہ احد میں شریک تھے[344] حضرت عمرو بن امیہ ضمری[345] اور ان کے والد گرامی حضرت امیہ بن خالد ضمری[346] بھی ابتدائی مسلمانوں میں شامل تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ ان کے خاندان کے اور لوگ بھی شروع ہی میں یا کچھ مدت بعد مسلمان ہو کر اسلامی امت کے رکن بن چکے تھے۔ ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد، ابن اثیر، ابن عبدالبر، اور ابن حزم اندلسی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد ضمری اسلام کے دائرے میں اول عہد میں داخل ہو چکے تھے[347] خیال یہ ہے کہ ۳ھ / ۶۲۵ء کے وسط تک یہ قبیلہ اکثر و بیشتر اسلامی ریاست کی حکمرانی قبول کر کے اس کا کارکن بن چکا تھا۔ ابن اثیر نے گنے چند ضمری صحابہ کے نام گنائے ہیں اور ان میں حضرت یزید بن سلمہ ضمری کے نام کا اضافہ کیا ہے۔ مگر ان کے زمانہ قبول اسلام کا ذکر نہیں

کیا ہے [۲۷۸] یہ حیرت کی بات ہے کہ تمام مؤلفین سیر صحابہ نے بنو ضمرہ کے دس سے زیادہ مسلمانوں کے نام نہیں گنائے ہیں۔ مگر اس سے یہ نہیں نتیجہ اخذ کر لینا چاہیئے کہ وہ عہد نبوی میں مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے۔ مآخذ کے عمومی بیانات اس پر شاہد ہیں کہ ان میں اسلام پوری طرح سے پھیل چکا تھا۔ اس کے علاوہ بعض تاریخی ثبوت بھی ان کے قبول اسلام کے گواہ ہیں۔ اوّل یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف کسی قسم کی کوئی مہم نہیں بھیجی۔ دوم یہ کہ اسلامی مہموں اور اسلامی ریاست کے نظم و نسق میں وہ برابر کے شریک تھے۔ اس کے علاوہ مآخذ میں جا بجا بکھرے بیانات سے بھی ان کے قبول اسلام کی تصدیق ہوتی ہے [۲۷۹]

(۲) بنو مدلج

بدر سے قبل وہ اسلامی ریاست کے حلیف بن چکے تھے اور ان کے بعض افراد اسلام بھی قبول کر چکے تھے۔ غزوہ بدر اور خندق کے درمیان ان میں اسلام نے اپنے قدم مضبوطی سے جما لئے تھے۔ مؤلفین سیر صحابہ نے بنو ضمرہ کے مانند بنو مدلج کے بھی بہت کم صحابہ کرام کے نام گنائے ہیں۔ بہر حال جو گنتی کے چند نام ملتے ہیں ان میں حضرت علقمہ بن مجزز مدلجی بہت نمایاں صحابی تھے وہ اسلامی حکومت و ریاست کے ایک نمایاں مدبر و سالار تھے۔ ان کا خاندان ابتدا ہی میں مسلمان ہو گیا تھا [۲۸۰] ان کے علاوہ بنو مدلج کے دوسرے متعدد حضرات نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنی خدمات سے ریاست اسلامی کو فائدہ پہونچایا تھا۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ شہ / سنہ ۱۳ھ میں بنو جذیمہ کے ایک گروہ کے خلاف حضرت خالد بن ولید مخزومی جو لشکر لے کر گئے تھے اس میں بنو مدلج کا ایک خاصا بڑا دستہ شریک تھا۔ [۲۸۱]

(۳) بنو غفار

بنو غفار دراصل بنو ضمرہ کے ذیلی شاخ یا خاندان تھے۔ تاریخی توقیت کے مطابق بنو غفار اسلام سے غالباً قبائل عرب میں سب سے پہلے متعارف ہوئے تھے۔ اگر اولیت کا شرف ان کو حاصل نہ تھا تو کم از کم سبقت اسلام کے اعتبار سے وہ چند قبائل عرب میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔ وہ مکہ اور مدینہ کے درمیان مغربی بین الاقوامی شاہراہ تجارت کے آس پاس کے علاقوں میں بستے تھے۔ ان میں اسلام کا تعارف مکی عہد تبلیغ کے خفیہ دور میں ہوا تھا اور اس کا سہرا ان کے سب سے عظیم مسلمان حضرت ابوذر غفاری [۲۸۲] اور ان کے بھائی انیس غفاری [۲۸۳] کے سر بندھتا ہے۔ یہ دونوں بھائی تلاش حق میں مکہ میں آئے تھے اور انہوں نے اس وقت اسلام قبول کیا تھا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دار ارقم میں قیام پذیر تھے حضرت ابوذر غفاری نے مکہ کے سرداروں کے مجمع عظیم میں اپنے قبول اسلام کا جس طرح اعلان و اظہار کیا تھا۔ وہ ان کی جرأت و ہمت اور صلابت ایمانی کی دلیل ہے [۲۸۴] بنو غفار کا یہ پورا خاندان ابتدا ہی میں مسلمان ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہم کو ان کے فرزند اور بہو کے قبول اسلام کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے [۲۸۵] بنو غفار کے اسلام لانے کا سہرا اور اصل حضرت ابوذر غفاری ہی کے سر بندھتا ہے جنہوں نے بے مثال جوش و ولولے اور ہمت و جرأت سے اپنے قبیلے میں اسلام پھیلایا تھا۔ یہی نہیں انہوں نے اپنے پڑوسی قبیلہ اسلم کے کم از کم آدھے حصہ کو

مسلمان کر لیا تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ ہجرت نبوی کے زمانے میں پورا قبیلہ بنی غفار مسلمان ہو چکا تھا[۲۸۶] گویا کہ اس قبیلے کے اسلام کا زمانہ ۶۱۴ء سے ۶۲۲ء تک کا کل سات برس کا عرصہ تھا۔

بنو غفار کے اوّلین اور اہم ترین مسلمانوں میں حضرت ابوذر کے بعد حضرت ابورہم غفاری کا نام آتا ہے۔ وہ اسلامی حکومت و ریاست کے نظم و نسق کے اہم شخص تھے[۲۸۷] ابن سعد اور ابن اثیر نے متعدد غفاری صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے۔ ان میں حضرت ابوسریحہ حذیفہ بن اسید غفاری تھے جو صلح حدیبیہ میں شریک تھے۔ ان کے علاوہ حضرات ابوبصرہ غفاری، ابوخنیس غفاری ابومالک غفاری، ابن مسعود غفاری، رافع بن عمرو غفاری، حکم بن عمرو غفاری، وغیرہ کے نام نامی صحابہ کرام کی فہرست میں ملتے ہیں[۲۸۸] ابن سعد کے بیان کے تائید میں ابن اسحاق وغیرہ کے بیانات بھی ملتے ہیں جو ان کے اجتماعی قبول اسلام کی طرف نشاندہی کرتے ہیں۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ غزوہ خیبر میں بنو غفار کے کافی مرد و عورت افراد شامل جہاد تھے[۲۸۹] انہوں نے فتح مکہ کے لیے چار سو غفاری مجاہدین پر مشتمل ایک دستہ بھی اسلامی لشکر کے لئے فراہم کیا تھا[۲۹۰] اسی طرح غزوہ تبوک کے عظیم لشکر میں ان کے دستہ کی عددی طاقت خاصی تھی[۲۹۱] اس کے علاوہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعد ہجرت نبوی جو معاہدہ کیا تھا۔ اس سے بھی ان کے مکمل طور پر مسلمان ہونے کی تائید ہوتی ہے[۲۹۲]۔ بنو غفار کے متعدد حضرات نے اسلامی ریاست کے نظم میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ اوپر حضرت ابورہم غفاری کا ذکر آ چکا ہے۔ ان کے علاوہ حضرات سباع بن عرفطہ غفاری اور کعب بن عمیر غفاری نے عہد نبوی کے نظام حکومت میں خاصے بلند عہدوں پر کام کیا تھا[۲۹۳]۔ چنانچہ مونٹگمری واٹ کا یہ نتیجہ کہ بنو غفار کو اسلامی ریاست و حکومت و امت میں کوئی بلند مقام حاصل نہیں تھا۔ اور یہ کہ وہ ایک غیر اہم قبیلہ تھا بالکل صحیح نہیں ہے۔ یہ نتیجہ موصوف نے صرف اس بنیاد پر اخذ کیا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری کے صاحبزادے اور رہو مدینہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چراگاہ کی دیکھ بھال کرتے تھے[۲۹۴] حالانکہ وہ محض چرواہے نہیں تھے۔ جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے۔

(۴)، بنو دئل اور بنو حارث بن عبد مناۃ

اگرچہ ہمارے مآخذ کنانہ کی بعض دوسری شاخوں جیسے بنو دئل اور بنو حارث بن عبد مناۃ کے قبول اسلام کے موضوع پر کچھ زیادہ روشنی نہیں ڈالتے۔ تاہم بعض ایسے قرائن اور شواہد ان میں مل جاتے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ وہ اسلام کے دائرے سے یکسر باہر نہیں تھے۔ مثال کے طور پر ابن سعد کا بیان ہے کہ بنو بکر بن عبد مناۃ کے ایک شخص الجبیب کے دو فرزندان گرامی حضرات عبداللہ اور عبدالرحمٰن اس کنانی شاخ کے ابتدائی مسلمان تھے۔ جنہوں نے غزوۂ احد میں حصہ لیا تھا اور جام شہادت نوش کیا تھا[۲۹۵] اسی ضمن میں بنو بکر بن عبد مناۃ کے ایک اور گھرانے کا ذکر کرنا چاہیئے۔ جس نے نہ صرف اسلام قبول کیا تھا۔ بلکہ اپنا علاقہ چھوڑ کر مکہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ بنو بکیر کا خاندان تھا۔ جس کا ذکر آ چکا ہے کہ ان کے کم از کم چار افراد نے مکی عہد کے آغاز میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ لیکن ابن سعد کے بیان سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خاندان

کیا ہے۔[۲۷۸] یہ حیرت کی بات ہے کہ تمام مؤلفین سیر صحابہ نے بنو ضمرہ کے دس سے زیادہ مسلمانوں کے نام نہیں گنائے ہیں۔ مگر اس سے یہ نہیں نتیجہ اخذ کر لینا چاہیئے کہ وہ عہد نبوی میں مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے۔ مآخذ کے عمومی بیانات اس پر شاہد ہیں کہ ان میں اسلام پوری طرح سے پھیل چکا تھا۔ اس کے علاوہ بعض تاریخی ثبوت بھی ان کے قبول اسلام کے گواہ ہیں۔ اوّل یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف کسی قسم کی کوئی مہم نہیں بھیجی۔ دوم یہ کہ اسلامی مہموں اور اسلامی ریاست کے نظم و نسق میں وہ برابر کے شریک تھے۔ اس کے علاوہ مآخذ میں جا بجا بکھرے بیانات سے بھی ان کے قبول اسلام کی تصدیق ہوتی ہے۔[۲۷۹]

(۲) بنو مدلج

بدر سے قبل وہ اسلامی ریاست کے حلیف بن چکے تھے اور ان کے بعض افراد اسلام بھی قبول کر چکے تھے۔ غزوہ بدر اور خندق کے درمیان ان میں اسلام نے اپنے قدم مضبوطی سے جما لئے تھے۔ مؤلفین سیر صحابہ نے بنو ضمرہ کے مانند بنو مدلج کے بھی بہت کم صحابہ کرام کے نام گنائے ہیں۔ بہرحال جو گنتی کے چند نام ملتے ہیں ان میں حضرت علقمہ بن مجزز مدلجی بہت نمایاں صحابی تھے وہ اسلامی حکومت و ریاست کے ایک نمایاں مدبر و سالار تھے۔ ان کا خاندان ابتدا ہی میں مسلمان ہو گیا تھا۔[۲۸۰] ان کے علاوہ بنو مدلج کے دوسرے متعدد حضرات نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنی خدمات سے ریاست اسلامی کو فائدہ پہونچایا تھا۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸ھ / ۶۳۰ء میں بنو جذیمہ کے ایک گروہ کے خلاف حضرت خالد بن ولید مخزومی جو لشکر لے کر گئے تھے اس میں بنو مدلج کا ایک خاصا بڑا دستہ شریک تھا۔[۲۸۱]

(۳) بنو غفار

بنو غفار دراصل بنو ضمرہ کے ذیلی شاخ یا خاندان تھے۔ تاریخی توقیت کے مطابق بنو غفار اسلام سے غالباً قبائل عرب میں سب سے پہلے متعارف ہوئے تھے۔ اگر اولیت کا شرف ان کو حاصل نہ تھا تو کم از کم سبقت اسلام کے اعتبار سے وہ چند قبائل عرب میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔ وہ مکہ اور مدینہ کے درمیان مغربی بین الاقوامی شاہراہ تجارت کے آس پاس کے علاقوں میں بستے تھے۔ ان میں اسلام کا تعارف مکی عہد تبلیغ کے خفیہ دور میں ہوا تھا اور اس کا سہرا ان کے سب سے عظیم مسلمان حضرت ابوذر غفاری[۲۸۲] اور ان کے بھائی انیس غفاری[۲۸۳] کے سر بندھتا ہے۔ یہ دونوں بھائی تلاش حق میں مکہ میں آئے تھے اور انہوں نے اس وقت اسلام قبول کیا تھا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دار ارقم میں قیام پذیر تھے حضرت ابوذر غفاری نے مکہ کے سرداروں کے مجمع عظیم میں اپنے قبول اسلام کا جس طرح اعلان و اظہار کیا تھا۔ وہ ان کی جرأت و ہمت اور صلابت ایمانی کی دلیل ہے۔[۲۸۴] بنو غفار کا یہ پورا خاندان ابتدا ہی میں مسلمان ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہم کو ان کے فرزند اور بہو کے قبول اسلام کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے۔[۲۸۵] بنو غفار کے اسلام لانے کا سہرا دراصل حضرت ابوذر غفاری ہی کے سر بندھتا ہے جنہوں نے بے مثال جوش و ولولے اور ہمت و جرأت سے اپنے قبیلے میں اسلام پھیلایا تھا۔ یہی نہیں انہوں نے اپنے پڑوسی قبیلہ اسلم کے کم از کم آدھے حصہ کو

مسلمان کر لیا تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ ہجرت نبوی کے زمانے میں پورا قبیلہ بنی غفار مسلمان ہو چکا تھا[۳۸۶] گویا کہ اس قبیلے کے اسلام کا زمانہ ۶۱۳ء سے ۶۲۲ء تک کا کل سات برس کا عرصہ تھا۔

بنو غفار کے اولین اور اہم ترین مسلمانوں میں حضرت ابوذر کے بعد حضرت ابو رہم غفاری کا نام آتا ہے۔ وہ اسلامی حکومت و ریاست کے نظم و نسق کے اہم شخص تھے[۳۸۷] ابن سعد اور ابن اثیر نے متعدد غفاری صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے۔ ان میں حضرت ابو سریحہ حذیفہ بن اسید غفاری تھے جو صلح حدیبیہ میں شریک تھے۔ ان کے علاوہ حضرات ابو بصرہ غفاری، ابو خنیس غفاری ابو مالک غفاری، ابن مسعود غفاری، رافع بن عمرو غفاری، حکم بن عمرو غفاری، وغیرہ کے نام نامی صحابہ کرام کی فہرست میں ملتے ہیں[۳۸۸] ابن سعد کے بیان کے تائید میں ابن اسحاق وغیرہ کے بیانات بھی ملتے ہیں جو ان کے اجتماعی قبول اسلام کی طرف نشاندہی کرتے ہیں۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ غزوہ خیبر میں بنو غفار کے کافی مرد و عورت افراد شامل جہاد تھے[۳۸۹] انہوں نے فتح مکہ کے لیے چار سو غفاری مجاہدین پر مشتمل ایک دستہ بھی اسلامی لشکر کے لئے فراہم کیا تھا[۳۹۰] اسی طرح غزوہ تبوک کے عظیم لشکر میں ان کے دستہ کی عددی طاقت خاصی تھی[۳۹۱] اس کے علاوہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعد ہجرت نبوی جو معاہدہ کیا تھا۔ اس سے بھی ان کے مکمل طور پر مسلمان ہونے کی تائید ہوتی ہے[۳۹۲]۔ بنو غفار کے متعدد حضرات نے اسلامی ریاست کے نظم میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ اوپر حضرت ابو رہم غفاری کا ذکر آ چکا ہے۔ ان کے علاوہ حضرات سباع بن عرفطہ غفاری اور کعب بن عمیر غفاری نے عہد نبوی کے نظام حکومت میں خاصے بلند عہدوں پر کام کیا تھا[۳۹۳] چنانچہ مونٹگمری واٹ کا یہ نتیجہ کہ بنو غفار کو اسلامی ریاست و حکومت و امت میں کوئی بلند مقام حاصل نہیں تھا۔ اور یہ کہ وہ ایک غیر اہم قبیلہ تھا بالکل صحیح نہیں ہے۔ یہ نتیجہ موصوف نے صرف اس بنیاد پر اخذ کیا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری کے صاحبزادے اور بہو مدینہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چراگاہ کی دیکھ بھال کرتے تھے[۳۹۴] حالانکہ وہ محض چرواہے نہیں تھے۔ جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے۔

(۲) بنو دئل اور بنو حارث بن عبد مناۃ

اگرچہ ہمارے مآخذ کنانہ کی بعض دوسری شاخوں جیسے بنو دئل اور بنو حارث بن عبد مناۃ کے قبول اسلام کے موضوع پر کچھ زیادہ روشنی نہیں ڈالتے۔ تاہم بعض ایسے قرائن اور شواہد ان میں مل جاتے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ وہ اسلام کے دائرے سے یکسر باہر نہیں تھے۔ مثال کے طور پر ابن سعد کا بیان ہے کہ بنو بکر بن عبد مناۃ کے ایک شخص الجبیب کے دو فرزندان گرامی حضرات عبداللہ اور عبدالرحمٰن اس کنانی شاخ کے ابتدائی مسلمان تھے۔ جنہوں نے غزوۂ احد میں حصہ لیا تھا اور جام شہادت نوش کیا تھا[۳۹۵] اسی ضمن میں بنو بکر بن عبد مناۃ کے ایک اور گھرانے کا ذکر کرنا چاہیے۔ جس نے نہ صرف اسلام قبول کیا تھا۔ بلکہ اپنا علاقہ چھوڑ کر مکہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ بنو بکیر کا خاندان تھا جس کا ذکر آ چکا ہے کہ ان کے کم از کم چار افراد نے مکی عہد کے آغاز میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ لیکن ابن سعد کے بیان سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خاندان

یں صرف یہی چار افراد نہیں تھے جو مسلمان ہوئے تھے۔ بلکہ ان کے تمام افراد معہ ان کے بچوں اور عورتوں کے اسلام کے حلقہ بگوش بنے تھے [۳۹۶] ابن ہشام اور ابن اثیر نے بنو دئل کے ایک ابتدائی مسلم حضرت عویف بن الاضبط کا ذکر کیا ہے جو غالباً صلح حدیبیہ سے کافی پہلے مسلمان ہو چکے تھے [۳۹۷] اسی طرح بنو دئل کے دو مزید مسلمانوں حضرات ساریہ بن زنیم اور ان کے بھائی انیس بن زنیم کا ذکر ابن حزم نے کیا ہے۔ یہ دونوں بھی ابتدائی مسلمانوں میں شامل تھے [۳۹۸] قیاس یہ ہے کہ ان کے خاندان کے اور افراد نے بھی اسلام ضرور قبول کیا تھا۔ بعض بنو دئل کے مسلمانوں کے اسلامی لشکروں اور مہموں میں شرکت کا ذکر واقدی کے یہاں ملتا ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق حضرت جعن دئلی نے حسمیٰ کی مہم (۶ھ / ۶۲۸ء) میں حصہ لیا تھا۔ واقدی نے ان کے علاوہ بھی بعض اور مسلمانان بنی دئل کا ذکر کیا ہے [۳۹۹]

(۵) بنو جذیمہ

کنانہ کی ایک شاخ بنو جذیمہ تھی۔ جو بجائے خود خاصا بڑا قبیلہ بن گیا تھا اور مدینہ سے کچھ فاصلے پر آباد تھا۔ وہ ۸ھ کے وسط اور ۸ھ / ۶۳۰ء کے آغاز تک پورے مسلمان ہو چکے تھے۔ جیسے کہ حضرات خالد بن ولید مخزومی اور علی بن ابی طالب ہاشمی کی ان دو مہموں سے معلوم ہوتا ہے جو ان کے علاقوں میں گئی تھیں۔ ماخذ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کو ان کے علاقہ میں ایک لشکر دے کر بھیجا۔ حضرت خالد نے غلطی سے پہنچتے ہی ان پر حملہ کر دیا اور ان کے بعض لوگ مارے گئے اور ان کا مال لوٹ لیا گیا۔ اس میں دراصل حضرت خالد کی غلطی نہیں تھی۔ مسلمان فوج کو بنو جذیمہ کے قبول اسلام کی خبر نہ تھی۔ بہر حال اسی دوران حضرت خالد کے پیچھے پیچھے بنو جذیمہ کے نمائندے مدینہ پہنچے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد کی کہ وہ مسلمان ہیں اور اس کے باوجود ان کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا۔ آپ نے حضرت علی کو مال دے کر بھیجا تاکہ ان کے قبیلے میں پہنچ کر ان کے مقتولوں کا خون بہا ادا کر دیں۔ ماخذ کا بیان ہے کہ حضرت علی نے ان کے کتوں تک کا خون بہا ادا کیا جو مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ بہر حال فتح مکہ تک یہ قبیلہ اسلام کے دائرے میں داخل ہو چکا تھا [۴۰۰] لیکن ہم کو اس قبیلہ کے ممتاز مسلمانوں کے نام نہیں معلوم ہو سکے ہیں۔ اور نہ ہی اس میں اسلام کی اشاعت کی رفتار اور انداز کا علم ہوتا ہے۔

(۶) بنو لیث

کنانہ کے خاندان بکر بن عبد مناۃ کا ایک بڑا گھرانا تھا۔ بنو لیث۔ ہمارے ماخذ اس گھرانے کے متعدد مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان میں حضرت غالب بن عبد اللہ لیثی ممتاز ترین صحابہ کرام میں تھے۔ انہوں نے اسلامی ریاست اور امت کیلئے شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ وہ کم از کم دو تین مہموں میں سالار / امیر سریہ رہے تھے [۴۰۱] دوسرے بزرگ حضرت نمیلہ بن عبد اللہ لیثی تھے۔ جن کے بارے میں ابن اسحاق کا خیال ہے کہ وہ ایک یا دو مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت

سے مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے سربراہ بھی رہے تھے۔ اگرچہ واقدی اور دوسرے مؤرخین ابن اسحاق کی اس روایت سے اتفاق نہیں کرتے ہیں[۴۰۲] ابن حزم نے بنولیث کے مختلف گھرانوں کے کم از کم چودہ ممتاز صحابہ کرام کے اسمائے گرامی کو بیان کیا ہے۔ یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ بنولیث کے ابتدائی مسلمانوں میں سے بیشتر اپنے علاقوں میں سکونت پذیر رہے تھے اور صرف چند حضرات نے ہجرت کر کے مدینہ میں سکونت اختیار کی تھی[۴۰۳]۔ یہ بات اس پس منظر میں اور اہم ہو جاتی ہے کہ بنولیث کے قبیلے بنوبکر بن عبد مناۃ نے فتح مکہ تک بحیثیت قبیلہ اسلام کی کافی سخت مخالفت کی تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے قریش مکہ سے قریشی حلیفانہ تعلقات تھے۔ جیسے کہ صلح حدیبیہ کے معاہدہ کی آخری شق سے واضح ہوتا ہے۔

بہر حال ان کا پورا قبیلہ ..... بنوبکر بن عبد مناۃ ...... ۹ھ کے آغاز اور ۶۳۰ء کے وسط میں اسلام کا حلقہ بگوش بن چکا تھا۔ اس کی تصدیق ان کے وفد کی آمد سے ہوتی ہے۔ جو غزوہ تبوک سے کچھ قبل حضرت واثلہ بن الاسقع لیثی کی زیر قیادت مدینہ منورہ آیا تھا۔ صحابی موصوف کے بارے میں مآخذ صراحت کرتے ہیں کہ انہوں نے غزوہ تبوک میں بھی شرکت کی تھی مگر اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ بنولیث کا خاصا بڑا دستہ اور خاص کر ان کے وفد کے تمام ارکان غزوہ میں مجاہدین کی حیثیت سے شریک ہوتے تھے[۴۰۴]۔

بہر حال ان تمام شواہد اور حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا بعید از حقیقت نہ ہوگا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے وقت تک پورا قبیلہ کنانہ معہ اپنی تمام شاخوں اور ذیلی گھرانوں کے اسلام کے دائرے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس ضمن میں یہ حقیقت کافی دلچسپ اور اہم معلوم ہوتی ہے کہ روہ کے پرآشوب زمانے میں کنانہ کے محض ایک معمولی حصہ نے جو بنولیث، بنودئل اور مدلج کے کچھ افراد اور طبقات پر مشتمل تھا۔ مدینہ منورہ کے خلاف بغاوت و سرکشی میں حصہ لیا تھا[۴۰۵]۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کنانہ کے ان خاندانوں نے ارتداد نہیں اختیار کیا تھا بلکہ وہ صرف زکوٰۃ کی ادائیگی سے استثنا چاہتے تھے۔ اور بقیہ دوسرے اسلامی شعائر۔ جیسے نماز وغیرہ کو قائم رکھنے کا وعدہ کیا تھا[۴۰۶] اس جگہ یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ اس وقت کی امت اسلامی کی غالب اکثریت نے مانعین زکوٰۃ کو غیر مسلم یا مرتد نہیں سمجھا تھا۔ یہ صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عظیم اور دوربین شخصیت تھی۔ جس نے ایک اور صرف ایک شعار اسلامی کو ترک کرنے کے منصوبے کی حوصلہ شکنی کر کے اسلام کے بنیادی اصولوں کی بنیاد استوار رکھی تھی[۴۰۷]۔

(ب) بنو خزاعہ

خزاعہ ایک اور بڑا بدوی قبیلہ تھا جو حرمین کے مغرب میں آباد تھا۔ اس کے تین بڑے خاندان تھے جو بجائے خود قبیلے بن گئے تھے۔ ان میں اسلم غفار کے پڑوسی اور دوست تھے۔ جبکہ بنوکعب بن عمرو ان سے ذرا فاصلے پر آباد تھے۔ اور بنو مصطلق کے بیشتر گھرانے چشمہ مریسیع کے ارد گرد کے علاقے میں بسے ہوئے تھے۔ یہ دلچسپ امر ہے کہ بنو خزاعہ کے بہت اچھے تعلقات قریش مکہ سے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کچھ گھرانے مکہ اور اس کے نواح میں بھی آباد تھے[۴۰۸]

(۱) بنو اسلم

بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ خزاعہ عام طور سے اور بنو اسلم خاص طور سے اسلام سے مکی عہد تبلیغ کے آغاز ہی میں غالباً ۶۱۵ء میں روشناس و متعارف ہو گئے تھے۔ حضرت ابو ذر غفاری کے قبول و تبلیغ اسلام کا ذکر آچکا ہے کہ انہوں نے اپنے قبیلہ بنو غفار کے علاوہ بنو اسلم کو بھی نہ صرف اسلام سے روشناس کرایا تھا بلکہ ان کا نصف قبیلہ ہجرت مدینہ سے قبل اسلام لا چکا تھا اور بقیہ نصف ہجرت نبوی کے معاً بعد اسلام کے دائرے میں داخل ہوا تھا[۲۰۹]۔ اس کی تصدیق ابن سعد کی ایک روایت سے ہوتی ہے جو بصراحت کہتی ہے کہ دونوں قبیلوں نے ہجرت نبوی کے فوراً بعد مدینہ حاضر ہو کر اسلام قبول کرنے کا اعلان و اقرار کیا تھا[۲۱۰]۔ ۶۲۲ء کے آخری ربع تک بنو اسلم کا اسلام ایک تاریخی حقیقت بن چکا تھا[۲۱۱]۔ ابن سعد نے اسلم کے ابتدائی مسلمانوں میں سے تقریباً ۲۶ صحابہ کرام کے اسمائے گرامی اپنی طبقات میں بیان کئے ہیں[۲۱۲]۔ اسد الغابہ کے مطابق بنو اسلم کے کئی مسلمان غزوہ احد میں شریک تھے اور انہوں نے بڑی جاں نثاری اور قربانی کے کارنامے انجام دیئے تھے[۲۱۳]۔ ان کے علاوہ ابن سعد، طبری، اور اسد الغابہ بنو اسلم کے بہت سے ایسے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے مختلف مہموں کے دوران امت اسلامی کے لئے گرانقدر خدمات انجام دی تھیں[۲۱۴]۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت سے اسلمی صحابہ کرام نے عہد نبوی کی اسلامی ریاست کی تعمیر و ترقی میں بھی خاصا بڑا حصہ لیا تھا اور اس کے نظم و نسق میں بھی شامل رہے تھے[۲۱۵]۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد جو معاہدے انفرادی اور اجتماعی طور سے بنو اسلم سے کئے تھے۔ ان میں سے کم از کم تین معاہدوں سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ سب کے سب اسلام لا چکے تھے ان کی صلابت ایمانی اور غالباً مدینہ سے قربت کے سبب ان کے لئے ہجرت ضروری نہیں سمجھی گئی تھی۔ اور ان کو اپنے گھروں اور علاقوں ہی میں مہاجرین کی عظمت و حیثیت حاصل تھی[۲۱۶]۔ مونٹگمری واٹ نے اسلمی مسلمانوں کی اس مہاجرت کا مفہوم نہ جاننے پر کیونکر نکالا ہے۔ کہ مہاجروں کو امتِ اسلامی یا ریاست اسلامی میں کسی قسم کے مراعات یا امتیازات حاصل تھے۔ ان کا دوسرا نظریہ کہ یہ معاہدے بعد کے کسی زمانے کے ہیں[۲۱۷]۔ قطعی طور پر غلط ہے اول اس وجہ سے کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت منسوخ ہو گئی تھی۔ یا اس کی اہمیت نہیں رہ گئی تھی، دوم یہ کہ بنو اسلم کے ان معاہدوں میں فریقین کے درمیان باہمی تعاون اور امداد کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ ابتدائی عہد کے معاہدات نبوی کی خصوصیت ہیں جیسا کہ ہم نے اسلامی ریاست کے ارتقاء کے باب میں دیکھا ہے۔ بہر حال فتح مکہ کی مہم میں بنو اسلم کے چار سو مجاہدین شامل تھے[۲۱۸]۔ اس سے ان کے کل مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۲) بنو کعب بن عمرو

بنو اسلم کے علاوہ خزاعہ کے بعض دوسرے گھرانوں میں بھی اسلام مکی عہد میں پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ ان میں وہ لوگ خاص طور سے ذکر کے قابل ہیں۔ جو مکہ ہی میں قیام پذیر تھے۔ ابن سعد نے ایسے خزاعی صحابہ کرام کی فہرست اپنی طبقات میں دی

ہے۔ ابن اسحاق نے کم از کم ایسے دو خزاعی مسلمانوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت ایہمہ تھے جو بنو مخزوم کے حلیف تھے، جبکہ حضرت ذوالشمالین مہاجر مدینہ اور بدری صحابی تھے۔ مکی خزاعیوں کے ایک اور نمائندے حضرت نافع بن بدیل بن ورقاء خزاعی تھے۔ جو قدیم مسلم، مہاجر مدینہ اور شہید بئر معونہ تھے اسی طرح حضرت معتب بن عوف خزاعی کا ذکر فہرست مہاجرین حبشہ اور مجاہدین بدر کے ذیل میں آتا ہے۔ بلاذری نے قبیلہ خزاعہ کی ایک خاتون حضرت حمینہ بنت خلف کا جو حضرت خالد بن سعید اموی کی اہلیہ محترمہ تھیں۔ ذکر مہاجرین حبشہ میں کیا ہے ایسی متعدد خزاعی مسلمان خواتین کا ذکر ماخذ میں ملتا ہے۔۴۱۹

بنو اسلم کے علاوہ خزاعہ کے بعض دوسرے گھرانوں کے افراد نے اسلامی ریاست کے مختلف انتظامی شعبوں میں خدمات انجام دی تھیں۔۴۲۰ ابن سعد کا بیان ہے کہ فتح مکہ سے کچھ قبل خزاعہ کے خاندان بنو کعب بن عمرو سے صدقات وصول کرنے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مصدق (ٹیکس افسر، محصل) بھیجا تھا۔ جو ان کے صدقات وصول کر کے لایا تھا۔۴۲۱ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بیجا نہ ہوگا۔ کہ بنو کعب بن عمرو سب کے سب یا اکثر مسلمان ہو چکے تھے محرم ۹ھ اپریل مئی ۶۳۰ء میں بنو اسلم اور غفار سے صدقات وصول کرنے کے لئے ایک مشترکہ مصدق مقرر کیا گیا تھا۔۴۲۲ اس خزاعی گھرانے کے مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے فتح مکہ کے لئے اسلامی لشکر میں پانچسو مجاہدین کا دستہ فراہم کیا تھا۔۴۲۳

(۳) بنو مصطلق

اسلم اور بنو کعب بن عمرو کے برعکس بنو مصطلق نے اسلامی امت میں شمولیت ۵ھ کے وسط اور ۶۲۷ء کے آغاز میں یعنی مدنی عہد نبوی کے نصف اول کے آخر میں کی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ غزوہ مریسیع یا غزوہ بنی مصطلق میں خزاعہ کی اس شاخ نے اسلامی ریاست کی مخالفت و عداوت کس طرح ترک کی تھی۔ ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ مریسیع کے علاقے میں آباد اس قبیلے کے دو سو خاندانوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قید کر لیا تھا۔ مگر آپ کے نرم رویے، حسن سلوک اور قبیلہ سے ازدواجی تعلقات کے سبب یہ سب لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور آزاد کر دیئے گئے تھے۔ اجتماعی تبدیلی مذہب کی یہ ایک شاندار مثال تھی۔ غالباً یہی کل آبادی بنو مصطلق کی تھی۔ ہمارے مفروضہ اصول کے مطابق ان کی کل آبادی کا تخمینہ بارہ اور چودہ سو افراد کے درمیان رہا ہوگا۔ ان کے بعض افراد نے ممکن ہے فوراً اسلام قبول نہ کیا ہو جیسے کہ سردار قبیلہ حضرت حارث بن ابی ضرار خزاعی کے بارے میں ماخذ صراحت کرتے ہیں۔ کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد فرار ہو گئے تھے اور کچھ دنوں بعد غالباً اپنی بیٹی حضرت جویریہ کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی اور اپنے پورے قبیلے کے اسلام کی خبر سن کر مدینہ پہنچے تھے اور اسلام قبول کیا تھا۔ بنو مصطلق کے مکمل طور سے اسلام کا حلقہ بگوش ہونے کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے قبولِ اسلام کے معاً بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ولید بن عقبہ اموی کو ان کا مصدق یا عاملِ صدقات بنا کر بھیجا تھا۔۴۲۴ ہمارے ماخذ اور جدید مؤرخین دونوں نے اس مسئلہ پر شدید الجھنیں پیدا کر دی ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ عامل صدقات کی یہ تقرری

فتح مکہ کے بعد پیش آئی تھی جبکہ انہیں ماخذ کا بیان ہے کہ بنو مصطلق کے قبول اسلام کے دو سال بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر مصدق مقرر کیا تھا۔ اسی طرح حضرت ولید بن عقبہ اموی کے بارے میں ماخذ نے اور ان سے زیادہ ہمارے جدید مورخین نے بڑی غلط فہمیاں عام کر دی ہیں جن پر کہیں اور بحث کی جا چکی ہے[۴۲۵]۔ بہرحال حضرت ولید بن عقبہ اموی کے بعد بنو مصطلق کی خود اپنی پسند پر حضرت عباد بن بشر انصاری کو عامل بنا کر بھیجا گیا تھا جو ان سے صدقات وصول کر کے مدینہ لاتے تھے۔[۴۲۶]

اس پوری بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بنو خزاعہ کے مختلف گھرانوں اور افراد کے بیچ اسلام پھیلنے کا آغاز مکی عہد تبلیغ کے خفیہ دور سے ہوا تھا اور اس کا ایک حصہ - بنو اسلم - ہجرت تک یعنی ۶۱۵ء اور ۶۲۲ء کے درمیان پورا اسلام لا چکا تھا جبکہ کعب بن عمرو نے مزید پانچ سال اپنے مکمل قبول اسلام میں لئے تھے۔ بہرحال یہ پورا قبیلہ غزوہ خندق کے زمانے میں اسلام کے دائرے میں آ چکا تھا۔ بنو مصطلق کا قبول اسلام فوری تھا۔ اور اس نے زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کی مدت لی تھی۔ یہ وہ خزاعی گھرانے تھے جو مدینہ کے مرکز ثقل کے دائرے میں بستے تھے۔

لیکن ابھی خزاعہ کے کچھ گھرانے ایسے بھی تھے جو مکہ کے سیاسی اثر و اقتدار کے دائرے میں آتے تھے اور مکہ کے قرب و جوار کے علاقے میں بستے تھے۔ ان میں سے بعض افراد نے مکی دور میں کسی وقت یا مدنی دور کے ابتدائی حصے میں اسلام قبول کیا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ لیکن ان کے گھرانے اور خاندان اجتماعی طور سے ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے گو کہ وہ اسلامی ریاست کے وفادار اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے۔ واقدی، ابن سعد اور دوسرے متعدد ماخذ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ بدر سے فتح مکہ تک وہ مکی خزاعی ہی تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریشی منصوبوں اور ارادوں سے باخبر کرتے رہتے تھے[۴۲۷]۔ اور صلح حدیبیہ سے ذرا قبل ان کے ایک اہم ترین سردار بدیل بن ورقاء خزاعی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں مسلمانوں کے داخلے کی اجازت نہ دینے کے قریشی فیصلہ اور ضد سے آگاہ کیا تھا[۴۲۸]۔ اور انہیں کے زیر قیادت خزاعہ نے صلح حدیبیہ کی ایک شق کے مطابق مسلمانوں یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے حلف کے معاہدے کا اعلان تجدید کر دیا تھا[۴۲۹]۔ اسلامی ریاست اور اسلام سے اتنے بڑے قریبی تعلقات نے بالآخر ان کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا ہی دیا اور واقدی کا انتہائی واضح بیان ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد بنو خزاعہ کا آخری آدمی تک مسلمان ہو چکا تھا[۴۳۰]۔ فتح مکہ کی مہم میں ان کی کثیر تعداد کے شریک ہونے سے ان کے مکمل قبول اسلام کی ناقابل تردید تصدیق ہوتی ہے۔ اسی طرح غزوہ تبوک میں ان کی خاصی بڑی تعداد شریک جہاد تھی[۴۳۱]۔

ا ج ۱ جہینہ

جہینہ زمانہ جاہلیت سے مدینہ منورہ کے قبیلہ خزرج سے حلف اور دوستی کے تعلقات رکھتا تھا! در بعثت نبوی کے قریب واقع ہونے والی جنگ بعاث میں اس نے خزرج کا ساتھ ان کے مدنی حریف اور مدمقابل قبیلہ اوس اور ان کے یہودی اتحادیوں کے خلاف دیا تھا۔ ماخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے قیام کے بعد بھی جہینہ کے لوگوں نے مدینہ

والوں سے اپنے پرانے روابط قائم رکھے تھے۔ ذکر آچکا ہے کہ اب ان تعلقات کی نوعیت مختلف تھی۔ کیونکہ اب وہ صرف بنو خزرج کے ہی حلیف اور دوست نہیں رہے تھے۔ بلکہ اوس اور مہاجرین مکہ کے بھی تھے۔ گویا کہ وہ اب اسلامی ریاست کے حلیف اور رکن تھے۔ مآخذ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہینہ کے قبیلے میں انفرادی اور باجماعت قبول اسلام کے سلسلہ کا آغاز مدنی عہد کی ابتدا ہی میں ہو چکا تھا۔ کم از کم جہینہ کے ابتدائی مسلمانوں میں سے نو حضرات کا ذکر ان کے ناموں کے ساتھ ملتا ہے۔[۴۴۲] ابن اسحاق اور ابن سعد نے جہینہ کے پانچ بدری صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی تھے۔ حضرات عدی بن ابی الزعباء، ودیعہ بن عمرو، زیاد بن کعب، عمرو بن عمرو، اور بسبس بن عمرو۔ اگر واقدی کی روایت تسلیم کر لی جائے تو ایک اور بدری صحابی تھے حضرت کعب بن جماز[۴۴۳] ابن سعد نے ان صحابہ کرام میں جنہوں نے فتح مکہ سے قبل اسلام قبول کر لیا تھا۔ کم و بیش جہینہ کے بیس مسلمانوں کے نام گنائے ہیں[۴۴۴]۔ اس کے علاوہ ابن سعد کا یہ بھی بیان ہے کہ جہینہ والوں نے اتنی کثرت سے مدینہ ہجرت کی تھی کہ شہر رسول میں ان کا ایک پورا محلہ آباد ہو گیا تھا جہاں انہوں نے اپنی ایک الگ مسجد بھی بنا رکھی تھی[۴۴۵] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہینہ میں اسلام باجماعت قبول کیا گیا تھا اور ہجرت کے مابعد قبول اسلام اور مدینہ ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا لیکن جہینہ کے تمام لوگوں یا مسلمانوں نے مدینہ ہجرت نہیں کی تھی اور غالباً ان کے بیشتر لوگ اپنے علاقوں میں مغربی ساحل کے قریب شاہراہ تجارت کے ارد گرد مقیم رہے تھے اور تعلیم و تربیت، جہاد و غزوات اور ملاقات رسول کیلئے مدینہ آتے رہتے تھے۔ چنانچہ جہینہ کا وفد بھی کسی وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں مدینہ حاضر ہوا تھا۔[۴۴۶]

بہر حال یہ مؤرخین کے نزدیک حتمی ہے کہ ہجرت کے دو تین برسوں میں پورا قبیلہ جہینہ مسلمان ہو گیا تھا۔ اور ان کے بہت سے لوگوں نے بدر، احد اور خندق وغیرہ کی جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ فتح مکہ کے موقعہ پر اسلامی لشکر میں جہینی مجاہدین کی تعداد آٹھ سو تھی جن میں سے پچاس شہسوار تھے[۴۴۷]۔ واقدی نے غزوہ تبوک کے موقعہ پر ان کے خاصے بڑے دستے کی شرکت کا حوالہ دیا ہے[۴۴۸] ان حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ بلا کسی خوف تردید کے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ فتح مکہ سے کافی پہلے جہینہ کا پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا تھا۔ اس کے ثبوت میں مزید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ریاست سے ان کا کوئی اختلاف نہیں ہوا تھا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف کوئی مہم کبھی نہیں بھیجی تھی۔ بہر حال جہینہ کے لوگ اسلامی امت اور اسلامی ریاست کے رکن اس کے قیام کے ابتدائی زمانے میں بن چکے تھے۔

(د) مزینہ

مزینہ بھی قبیلہ جہینہ کی مانند مدینہ کے قبیلوں سے قدیم اور قریب کے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ اگر جہینہ کے لوگ خزرج کے حلیف تھے تو مزینہ کا قبیلہ اوس کی دوستی اور حلف کا دم بھرتا تھا۔ اور ان کے حلیف کی حیثیت سے جنگ بعاث میں اپنے پڑوسی بدوی قبیلہ کے خلاف میدان جنگ میں اترا تھا۔ جہینہ اور مزینہ دونوں کے مدینہ والوں سے حلف اور دوستی کے تعلقات کے علاوہ ازدواجی تعلقات بھی تھے۔ زمانہ جاہلیت کے ان تعلقات نے قبیلۂ مزینہ

کو اسلام سے روشناس اور اسلامی ریاست کے قریب کیا تھا۔ مآخذ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مزینہ کے لوگوں میں بھی اسلام شروع ہی سے پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور ان کے افراد اور گروہوں میں ہجرت کے بعد سے ہی اسلام قبول کرنے کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ مزینہ کے قدیم مسلمانوں میں کم از کم پانچ حضرات کے نام مختلف مآخذ میں ملتے ہیں[439] ابن سعد نے دو مزید مزنی قدیم مسلمانوں کا ذکر کیا ہے۔ جنہوں نے غزوہ احد میں جہاد میں شرکت کی تھی۔ اور جام شہادت نوش کیا تھا[440] ابن درید ازدی نے مزینہ کے حضرات نعمان بن مقرن، عبداللہ بن مغفل، معقل بن یسار، قرہ بن ایاس، بلال بن حارث اور کعب بن زہیر کو قدیم مسلمان بتایا ہے[441] ابن اثیر کا بیان ہے کہ حضرت نعمان بن مقرن مزنی نے اپنے لوگوں کو مسلمان بنایا تھا۔ جبکہ ابن سعد کے مطابق حضرت عمرو بن مرہ مزنی نے اپنی قوم کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا تھا[442] ابن سعد کا مزید بیان ہے کہ ۵ھ / ۶۲۷ء میں مدینہ آنے والا پہلا وفد عرب قبیلہ مزینہ کا تھا جو چار سو مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ قبیلہ مزینہ ہجرت کے بعد کے زمانے میں یعنی مدنی عہد کے نصف اول میں مسلمان ہو چکا تھا[443]۔ اس کے علاوہ اسلامی لشکروں میں ان کے دستوں کی عددی طاقت بھی ان کے اجتماعی طور سے قبول اسلام کی ناقابل تردید شہادت دیتی ہے۔ چنانچہ فتح مکہ کے دس ہزار کے عظیم لشکر میں صرف قبیلہ مزینہ کا حصہ دسواں تھا یعنی ان کے ایک ہزار تین مجاہدین جن میں سے سو شہسوار بھی تھے شریک جہاد تھے[444] ابن اسحاق کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ حنین میں قبیلہ مزینہ کے دو غیر معروف خاندان بنو اوس اور بنو عثمان کے مجاہدین اسلامی لشکر کے مقدمہ میں دوسرے مجاہدین کے ساتھ شامل تھے[445] غزوہ تبوک میں اس قبیلہ کا اور بڑا دستہ اسلامی لشکر میں شامل تھا[446] بہر حال مآخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ قبیلہ مزینہ دوسرے مغربی قبائل کی مانند اسلامی امت کا رکن مدنی عہد کے آغاز میں بن چکا تھا۔

(س) ازد شنوءہ

حرمین شریفین کے مغربی علاقے میں آباد بدوی قبائل میں ازد شنوءہ ایک اہم قبیلہ تھا جو اسلامی تحریک سے اس کے آغاز کار ہی میں روشناس ہو گیا تھا۔ غالباً ۱۳ق ھ / ۶۱۳ء اور ۶۱۵ء کے درمیان کوئی زمانہ تھا۔ جب اس قبیلہ کے ایک اہم رکن اور اپنی قوم بنو سعد بن بکر کے سردار حضرت ضماد بن ثعلبہ نے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوانی کے زمانے کے دوست اور تجارت کے شریک رہے تھے، عمرہ کے لئے مکہ پہنچے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی اور آپ کا پیغام سناہی تھا کہ مسلمان ہو گئے[447] ارشاد نبوی کے مطابق وہ اپنے لوگوں میں واپس گئے اور وہاں اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ صحیح مسلم کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ضماد بن ثعلبہ نے بڑی لگن اور جوش سے لوگوں میں تبلیغ کی اور خاصے کامیاب بھی ہوئے[448] چنانچہ ۵ھ / ۶۲۶ء میں وہ ابن سعد کے بقول اپنے قبیلہ کے مسلمانوں کی جانب سے ایک وفد لیکر مدینہ پہنچے تھے[449] ابن سعد ہی کے بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ۱۰ھ / ۶۳۲ء کے اواخر تک ازد شنوءہ کی غالب اکثریت اسلامی امت اور اسلام کے دائرے میں شامل ہو چکی تھی[450]

۱۱۱ دوس

ازد شنوءہ کا ایک اہم خاندان دوس تھا جس کا مشہور ترین مسلمان صحابی حضرت ابوہریرہ دوسی ہیں۔ اس ازدی خاندان کا اسلام سے تعارف مکی عہد کی خفیہ تبلیغ کے زمانے میں ہوا تھا۔ جب اس کے تین افراد مسلمان ہوئے تھے۔ ان ابتدائی مسلمانوں میں ایک حضرت معیقب بن ابی فاطمہ دوسی تھے جو قریش مکہ کے خاندان بنو امیہ کے حلیف تھے اور مہاجرین حبشہ میں شمار ہوتے تھے مگر ایک روایت ہم ایسی بھی دیکھ چکے ہیں جس کے مطابق حضرت معیقب دوسی اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے علاقے کو لوٹ گئے تھے۔ اور وہاں اسلام کی تبلیغ کرتے رہے تھے۔ وہاں سے وہ سنہ ۷ھ/۶۲۸ء میں اپنے مسلمانوں کے ساتھ مدینہ پہنچے تھے[۲۵۱]۔ باقی دو ابتدائی مسلمان تھے۔ حضرت طفیل بن عمرو اور ان کے فرزند حضرت عمرو بن طفیل دوسی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے وطن واپس آکر ایک نو مسلم کے جوش و خروش اور ولولے کے ساتھ اسلام کی تبلیغ اپنی قوم میں کی اور سنہ ۸ھ/۶۲۹ء تک ان کا پورا قبیلہ دوس اسلام قبول کر چکا تھا[۲۵۲]۔ مختلف روایات کے مطابق حضرت طفیل بن عمرو دوسی اپنے قبیلہ کے شاعر تھے۔ اور عربوں کے سماج میں شعراء کی نہ صرف عزت ہوتی تھی۔ بلکہ ان کا کافی سماجی اور تہذیبی اثر بھی ہوتا تھا قبیلہ دوس کے قبول اسلام کا سہرا اور اصل انہیں کے سر ہے[۲۵۳]۔ بہرحال خیبر سے قبل دوس کے اسی افراد۔ دوس پر مشتمل ایک وفد نے نہ صرف خدمت نبوی میں حاضری دی تھی۔ بلکہ غزوہ خیبر میں شریک جہاد بھی رہا تھا[۲۵۴]۔

ابن سعد نے ان صحابہ کرام میں جنہوں نے فتح مکہ سے قبل اسلام قبول کر لیا تھا۔ دوس کے تین مسلمانوں کے نام بھی گنائے ہیں۔ یہ تھے حضرات ابوہریرہ دوسی، ابوالرومی دوسی۔ اور سعد بن ابی ذباب۔ مؤخر الذکر صحابی نے اسلامی ریاست و حکومت کی شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ اور وہ اس کے نظم و نسق میں بھی شریک رہے تھے[۲۵۵]۔ ابن سعد اور ابن اثیر کا بیان ہے کہ حضرت سعد بن ابی ذباب کو قبیلہ دوس سے صدقات وصول کرنے کا افسر مقرر کیا گیا تھا[۲۵۶]۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دوس کی اکثریت بلکہ غالب اکثریت اسلام لا چکی تھی بہرحال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہجرت کے ساتویں برس قبیلہ دوس اسلامی امت و ریاست کا ایک اہم رکن بن چکا تھا۔

ابن سعد نے ان کے علاوہ تین مزید ابتدائی مسلمانوں کا ذکر کیا ہے۔ جن کا تعلق ازد سے تھا۔ ان میں ایک حضرت عبداللہ بن بحینہ تھے۔ جو ہجرت نبوی سے قبل مکی عہد کے مسلمان تھے[۲۵۷]۔ ان کے بھائی حضرت جبیر بن مالک بھی مکی عہد کے ایک قدیم مسلم تھے[۲۵۸]۔ تیسرے ازدی مسلمان تھے حضرت حارث بن عمیر جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر گرامی تھے اور جو آپ کا پیغام امن و اسلام لیکر شاہ بصریٰ کے پاس گئے تھے۔ ان کو واپسی کے سفر کے دوران شرجبیل بن عمرو غسانی نے شہید کر دیا تھا[۲۵۹]۔ تمام واقعات و حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ازد شنوءہ میں اسلام مکی عہد کے آغاز سے پھیلنا شروع ہوا۔ اور اس کے مختلف خاندانوں اور گھرانوں میں افراد اور گروہ رفتہ رفتہ مسلمان ہوئے۔ تقریباً بیس برس کی انتھک کوششوں کے بعد یہ پورا قبیلہ اسلامی حکومت کا ماتحت، اسلامی ریاست کا شہری اور اسلامی امت کا رکن بن سکا تھا۔

مغربی قبائل میں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے اس جائزے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ کے بعد حرمین شریفین کے مغربی علاقوں میں آباد بدوی قبائل تیسرے اہم ترین عنصر تھے جنہوں نے اسلامی امت اور اسلامی ریاست کے قیام اور ارتقاء میں گرانقدر ترین خدمات انجام دی تھیں۔ مونٹگمری واٹ کا یہ تجزیہ صحیح ہے کہ بنیادی طور سے یہی تینوں اسلامی عناصر اسلامی امت اور اسلامی ریاست کی ریڑھ کی ہڈی تھے۔[۴۹] اسلام میں ان کا ناقابلِ شکست ایمان اور غیر متزلزل عقیدہ، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر کامل بھروسہ اور آپ کی ذات والا صفات سے بے اندازہ محبت و عقیدت اور اسلامی امت کے تحفظ، بقا اور ترقی کے لئے عظیم قربانیاں اور اسلامی ریاست کے لئے ان کی شاندار خدمات ہی ان کے وہ اوصاف حمیدہ اور صفات ستودہ تھے جنہوں نے ان کو اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب میں ایک نمایاں و درخشندہ مقام عطا کیا ہے۔

(۲) مشرقی قبائل عرب

تاریخی توقیت کے اعتبار سے اسلامی امت کے تین اہم علاقائی عناصر ... مہاجرین مکہ، انصار مدینہ اور مغربی قبائل عرب ... کے بعد اسلامی ریاست اور اسلامی تحریک کے تعلقات حرمین شریفین کے مشرقی علاقوں میں واقع اور آباد مشرقی قبائل عرب سے اوروں کے بہ نسبت زیادہ قریبی، قدیم اور مضبوط تھے۔ اگرچہ بعض طاقت ور قبائل عرب مشرقی نے اسلامی ریاست کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی۔ لیکن اس سیاسی مخالفت کے باوجود وہ اپنے بعض گھرانوں میں اسلام کی نشر و اشاعت کے مصنوعی اور انسانی و قدرتی حدبندیوں کو توڑ کر سب کو سیراب و فیضیاب کرنے والے فیضانِ اسلام کو نہیں روک سکے تھے۔

مشرقی علاقوں میں خاص کر نجد و حجاز اور یمامہ کے مرکزی خطوں میں متعدد قبیلے آباد تھے اور غالباً اپنی عددی طاقت کے اعتبار سے وہ دوسرے علاقوں کے قبائل سے زیادہ بڑے اور طاقت ور تھے۔ ان میں بعض قبیلوں کی متعدد شاخیں اور بطون بجائے خود قبیلے بن گئے تھے اور اس طرح مشرقی قبائل کی تعداد بھی نسبتاً زیادہ تھی۔ اس علاقہ میں کثرت آبادی کا سبب زیادہ تر جغرافیائی تھا۔ کیونکہ مدینہ و مکہ کے مشرق میں بحرین و عراق کی سرحدوں تک سینکڑوں بلکہ ہزاروں مربع میل کا علاقہ پھیلا ہوا تھا۔ جہاں قبائیلیوں ... آباد و خانہ بدوش ... دونوں کی اقتصادی ضروریات کی فراہمی کے اسباب موجود تھے مشرقی علاقے میں اہم ترین قبیلے اور ان کے بنیادی خاندان حسب ذیل تھے :

(ا) بنو خزیمہ بن مدرکہ : (۱) اسد بن خزیمہ (۲) بنو غنم بن دودان / اسد بن خزیمہ (۳) بنو ثعلبہ بن دودان / اسد بن خزیمہ (۴) بنو ہون بن خزیمہ (۵) بنو عضل (۶) اور بنو قارہ

(ب) بنو سلیم : (۱) بنو عصیہ (۲) بنو رعل (۳) بنو ذکوان (۴) بنو فالج (۵) بنو شیبان

(ج) بنو غطفان : (۱) اشجع (۲) فزارہ (۳) مرّہ (۴) عبس و ذبیان (۵) ثعلبہ (۶) انمار

(د) بنو محارب بن خصفہ

(س) بنو ہوازن : (۱) بنو عامر بن صعصعہ (۲) بنو ہلال (۳) بنو ربیعہ (۴) بنو البکاء (۵) بنو کلاب (۶) بنو القرطاء (۷) بنو عریبہ

(ط) بنو جشم (۹) بنو نصر (۱۰) بنو سعد بن بکر (۱۱) بنو ثمالہ
(ظ) ثقیف : (۱) بنو مالک (۲) الاحلاف (۳) بنو غنی
(ع) باہلہ۔

(ف) بنو ہذیل : (۱) بنو معاویہ بن ہذیل (۲) بنو طابخہ (۳) بنو لحیان
(ک) بنو طے : (۱) بنو معاویہ (۲) بنو جوین (۳) بنو معن (۴) بنو اجا (۵) بنو نبہان[۴۶۱]

مشرقی قبائل عرب کی اسلامی ریاست کی مخالفت و عداوت ۶۲۲ء میں ہجرت نبوی کے کچھ بعد شروع ہوئی تھی۔ جب اسلام ایک سیاسی طاقت اور مرکزیت کے عناصر لیکر ابھرا تھا۔ اور کم از کم وسطی عرب میں فتح کے زمانے یعنی ۶۳۰ء کے ابتدائی دنوں تک جاری رہی تھی۔ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام چھوٹے بڑے غزوات و سرایا کا تجزیہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ تقریباً ۹۰ مہموں میں سے ۲۸ مہموں کی منزل مقصود مدینہ کے مشرقی علاقوں اور قبیلوں میں تھی[۴۶۲] گویا کہ ایک تہائی مہمیں ان کے خلاف بھیجی گئی تھیں۔ لیکن غالباً یہ قدرت کا قانون ہے کہ بند جتنا مضبوط و مستحکم ہوتا ہے سیلاب اور دریا کی موجیں اتنی ہی تند و تیز ہوتی ہیں۔ تاریخ مذاہب عالم کی یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مخالفت و عداوت کی ساری انسانی حد بندیاں اور دیواریں مذہب کے جوش و خروش کے سیلاب کے آگے ٹوٹ گئیں۔ خدا کا آخری دین۔۔ اسلام ۔۔۔ جس کی تکمیل مقدر ہو چکی تھی۔ کیونکر ان مصنوعی دیواروں اور رکاوٹوں سے روکا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مشرقی قبائل کی مخالفت و عداوت کے باوجود وہ ان کے افراد اور جماعتوں کو اپنا حلقہ بگوش بناتا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شیفتہ و شیدا بناتا رہا۔ جیسے کہ ہم ابھی مشرقی قبائل کے تفصیلی جائزے میں دیکھیں گے۔

(۱) بنو اسد بن خزیمہ

مآخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ اسد/خزیمہ کے اسلام سے قریبی اور گہرے روابط ابتدائے کار سے ہی قائم ہوگئے تھے[۴۶۳]۔ اس قبیلہ میں متعدد قدیم مسلمان تھے اور غالباً اسلام سے اس ابتدائی تعارف کا ایک سبب وہ قدیم سماجی، اقتصادی اور ازدواجی تعلقات تھے۔ جو قریش کے مختلف بطون سے قائم تھے۔ ابن اسحاق ان کے بیس مردوں اور آٹھ عورتوں کے نام ابتدائی مکی مسلمانوں کی فہرست میں شامل کرتے ہیں اور ان میں سے متعدد کو مہاجرین حبشہ میں بھی شمار کرتے ہیں[۴۶۴] اوپر ذکر آچکا ہے کہ ان کی تعداد چالیس مردوں اور عورتوں کے علاوہ کافی بڑی تعداد میں بچوں پر بھی مشتمل تھی، جن کا ذکر مآخذ نہیں کرتے ہیں بہر حال بنو غنم بن دودان کا یہ اسدی خاندان مکہ میں ابتدائے اسلام میں ہی میں مسلمان ہوگیا تھا۔ عام خیال یہ ہے کہ مکہ کے باسی ان اسدیوں کے قبول اسلام کا اثر ان کے اصل قبیلے پر (جو قبیلہ غطفان کے شمال اور مشرق میں آباد تھا اور قبیلہ طے کا پڑوسی تھا) نہیں پڑا تھا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ مکہ میں بس جانے والے ان اسدیوں نے اپنے مادر قبیلہ سے تعلقات پوری طرح سے ختم نہیں کئے تھے۔

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ مآخذ عام طور سے اسد بن خزیمہ کے اصل قبیلے کے قبول اسلام پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتے ہیں خاص کر مکہ کی فتح کے قبل کے زمانے میں۔ لیکن شواہد و قرائن بتاتے ہیں کہ ان میں اسلام کی تخم ریزی فتح مکہ سے کافی پہلے ہو چکی تھی کیونکہ ابن اسحاق کے بیان کے مطابق غزوہ حنین میں اسد حلیس اور ذبیان کے مجاہدین کے ساتھ ان کی کافی بڑی تعداد لو اسلامی لشکر میں موجود تھی۔ اور اس موقعہ پر انہوں نے زبردست فوجی کارنامے انجام دیئے تھے ۴۶۵۔ چند ماہ بعد ۹ھ کے ابتدائی دنوں اور ۶۳۰ء کے وسط میں اسد بن خزیمہ کا ایک وفد خدمت نبوی میں پہنچا جو دس خاندانوں (رھط) پر مشتمل تھا۔ ان لوگوں نے اپنے مسلمان ہونے کے علاوہ اپنے قبیلہ کے اسلام لانے کا اظہار بھی کیا تھا ۴۶۶۔ طبری نے اپنی تفسیر میں سورہ حجرات کی آیت نمبر ۱۷ میں روایت بیان کی ہے کہ بعض یا کل ارکان وفد نے فخریہ یہ بات کہی تھی کہ وہ اپنے آپ اسلام لائے تھے اور کسی نے انہیں اس پر آمادہ نہیں کیا تھا۔ ۴۶۷ ان کے مسلمان ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ غالباً اس کے فوراً بعد ان کے قبیلہ میں ایک عامل صدقات بھیجا گیا تھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ مرکزی عامل صدقات ان کے پڑوسی قبیلہ بنو طے کے صدقات وصول کرنے کے لئے بھی مشترکہ طور پر بھیجا گیا تھا ۴۶۸۔

مستشرقین نے طلیحہ بن خویلد اسدی کی مثال کو پیش کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بنو اسد عہد نبوی میں اسلام کے دائرے میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے۔ جبکہ مآخذ کا اصرار ہے کہ وہ حیات نبوی میں نہ صرف مسلمان ہو چکے تھے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں اپنی وفاداری بھی ثابت کر چکے تھے۔ بہر حال ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ طلیحہ بن خویلد اسدی کی اصل طاقت اور قوت کا سرچشمہ اس کا اپنا خاندان یا قبیلہ نہیں تھا۔ بلکہ بنو طے اسد اور غطفان خاص کر موخر الذکر کے خاندان بنو فزارہ کا قبائلی اتحاد تھا۔ جس نے وفات نبوی کے بعد طلیحہ کی بغاوت اور ارتداد بلکہ جھوٹے دعوائے نبوت میں امداد کی تھی ۴۶۹۔ اگرچہ سردست ہمارے موضوع سے طلیحہ کے ارتداد اور بنو اسد کی سرکشی کا تعلق نہیں ہے۔ تاہم یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بنو اسد یا طلیحہ کا ارتداد بھی بالواسطہ سہی ان کے "قبول اسلام" کا ثبوت تھا۔ اس کے علاوہ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عدی بن حاتم طائی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم صحابی، پکے مسلمان اور بنو طے کے سب سے بڑے سردار تھے نہ صرف اپنے قبیلہ کو طلیحہ کے دام تزویر سے نکال لانے میں کامیاب رہے تھے بلکہ بنو اسد اور غطفان کے مختلف خاندانوں کو روہ جنگ سے پہلے مرکز اسلام کا مطیع بنانے میں بھی کامیاب رہے تھے یہ دلچسپ بات ہے کہ طلیحہ کے سب سے عظیم اتحادی حضرت عیینہ بن حصن فزاری نے طلیحہ کے فرار ہونے کے بعد دوبارہ اسلام قبول کرتے وقت کہا تھا۔ کہ "ہم اس مذہب خداوندی میں پھر سے داخل ہو رہے ہیں۔ جس سے ہم نکل گئے تھے" اس ضمن میں یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ طلیحہ اسدی کی اصل طاقت فزارہ کی عصبیت سے بھرپور حمایت تھی کیونکہ وہ اس کے قدیم حلیف تھے۔ لیکن جوں ہی حضرت عیینہ فزاری پر طلیحہ کے کذب وافترا کی قلعی کھلی۔ انہوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا ۴۷۰ اور اسی اعتراف حق کے سبب حضرت ابوبکر صدیق اور ان کے سپہ سالار حضرت خالد بن ولید مخزومی نے ان کو معاف بھی کر دیا تھا۔ بہر حال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حیات نبوی میں ہی بنو اسد بن خزیمہ کے اکثر لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور ان میں سے بہت سول

نے طلیحہ کا ساتھ اس کی لبغاوت میں نہیں دیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو قبیلہ اسد کو اسلام کی طرف اتنی آسانی سے دوبارہ واپسی نہیں ہو سکتی تھی۔

ابن حزم اندلسی کے مطابق بنو اسد عام طور سے اور بنو اسد کی ایک ذیلی شاخ بنو غنم بن دودان خاص طور سے مادر قبیلے خزیمہ کی اصل شاخ تھی[۱۸۱]! ان کے علاوہ بنو ثعلبہ بن دودان بھی ایک اہم شاخ تھی۔ اور اس میں بھی متعدد مسلمانوں کے نام ملتے ہیں۔ جیسے حضرات عبید بن ثعلبہ، مالک بن حضرمی ابن عامر، ضرار بن الازور اور والصبہ بن معبد وغیرہ[۱۸۲]! بنو اسد کے علاوہ بہرحال خزیمہ کی دو اہم شاخیں اور بھی تھیں۔ بنو عضل اور بنو قارہ جن کا تعلق بنو ہون بن خزیمہ سے تھا۔ یعنی جو بنو اسد کا عم زاد خاندان تھا۔ اور اس میں بھی اسلام نے اپنے ماننے والے بنا لئے تھے۔ بنو قارہ کے ایک عظیم ترین صحابی حضرت مسعود بن ربیع تھے۔ جو بدری صحابی ہونے کا شرف رکھتے تھے اور انہوں نے مکہ میں اسلام قبول کیا تھا۔ اور وہاں سے ہجرت کی تھی[۱۸۳]۔ ان کے علاوہ اسد الغابہ کے مطابق ایک اور قاری صحابی تھے۔ حضرت مسعود بن عمرو، جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ حنین کے بعد ہوازن سے حاصل شدہ اموال غنیمت کو جعرانہ کے مقام پر اکٹھا کرنے کے لئے بھیجا تھا[۱۸۴]۔ مجموعۃ الوثائق میں منقول ایک نامۂ نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو ہون بن خزیمہ کے دو خاندانوں بنو قارہ اور بنو حکم کے لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ کنانہ اور مزینہ کے کچھ لوگ بھی اسلام لائے تھے[۱۸۵]؟ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خزیمہ کے ان خاندانوں نے مدنی عہد کے دور اول میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کی تائید مزید عضل اور قارہ کے اس وفد سے بھی ہوتی ہے جو ۳ھ میں خدمت نبوی میں یہ درخواست لیکر آیا تھا کہ ان کے قبیلے کے مسلمانوں کو اسلام کی تعلیم دینے کے لئے کچھ معلمین کو مدینہ سے بھیج دیا جائے۔ درخواست قبول کر لی گئی مگر مسلم جماعت قراء و معلمین کو واقعہ رجیع میں بنو لحیان نے عضل و قارہ کے مشرک و دشمن عناصر کی مدد سے قتل کر دیا تھا[۱۸۶]؟ مآخذ اور ہمارے جدید مؤرخین عموماً بنو عضل و قارہ کی درخواست کو مسلمانوں سے انتقام لینے کا بہانہ بتاتے ہیں۔ لیکن بہرحال یہ امکان پھر بھی رہ جاتا ہے کہ ان قبیلوں میں یقیناً کچھ نہ کچھ مسلمان رہے ہوں گے۔ خزیمہ کی دوسری شاخوں میں توسیع و اشاعت اسلام کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ لیکن قرائن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ فتح مکہ تک خزیمہ کے تمام خاندان اور شاخیں اسلام کے سایہ میں آ گئی تھیں۔

(ب) بنو سُلیم

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے مشرقی علاقے میں آباد بنو سلیم کا قبیلہ بڑا اہم اور طاقتور قبیلہ تھا۔ اسلام سے اس کا تعارف مکی عہد میں ہوا تھا۔ جب اس کے بعض افراد نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بنو سلیم کے ابتدائی مسلمانوں میں ایک تھے حضرت عمرو بن عبسہ جنہوں نے ابن سعد کی ایک روایت کے مطابق حضرات ابوبکر و بلال کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ اور چوتھے یا پانچویں مسلمان تھے[۱۸۷]! قبول اسلام کے بعد وہ حکم نبوی کے مطابق اپنے علاقے میں واپس چلے گئے تھے اور صفر اور ہرۃ کے مقامات پر متبادل طریقے سے سکونت پذیر رہے۔ یہ بنو سلیم کا روایتی علاقہ تھا۔ جہاں وہ مدتوں سے آباد تھے اور بالآخر حضرت

عمروؓ نے ہجرت نبوی کے بعد مدینہ میں سکونت اختیار کر لی[۴۷۸] ابن حزم کے بیان میں یہ اضافہ ہے۔ جس کی تائید دوسرے ماٰخذ سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عمرو بن عبسہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی دوست تھے اور ان کے تعلقات ایام جاہلیت سے قائم تھے[۴۷۹] ماٰخذ سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے قبولِ اسلام اور ہجرت مدینہ کے درمیانی عرصے میں کیا کیا تھا؟ لیکن غالباً یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا۔ خاص کر حضرات ابوذر غفاری، طفیل بن عمرو دوسی وغیرہ کی مثالوں کے بعد کہ انہوں نے بھی اپنے علاقے میں اسلام کی اشاعت کی کوشش کی ہوگی۔ اس میں ان کو کتنی کامیابی ملی۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ دوسرے ابتدائی مسلمان حضرت عتبہ بن غزوان مازنی تھے اور ان کے ایک مولیٰ حضرت خباب سے بھی ان کی اقتدار کی تھی مگر یہ دونوں صحابی مکی تھے۔ کیونکہ وہ مکہ ہی میں سکونت پذیر رہے اور بنو نوفل رقریش کے حلیف بھی تھے۔ ان دونوں صحابیوں نے مہاجرت حبشہ و مدینہ کی سعادت کے علاوہ بدری ہونے کی فضیلت بھی پائی تھی[۴۸۰]

بنو سلیم کے ایک اور ابتدائی مسلم تھے حضرت عروہ بن الصلت جو غزوہ احد میں یا بئر معونہ کے المیہ میں (بہ اختلاف روایت) شہید ہوئے تھے۔ بہرحال صورت حال جو کچھ بھی رہی ہو ابن اسحاق کے مطابق وہ بہترین مسلمانوں میں سے ایک تھے۔ اگر بئر معونہ میں ان کی شہادت کی روایت قبول کر لی جائے تو یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے بنو سلیم کے ایک ساتھی ہم قبیلہ کی امان یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دی تھی کہ "وہ اسلام لانے کے بعد کسی کافر کی امان (پناہ) نہیں قبول کر سکتے اور ان کو بس خدا کی امان کافی ہے" اور ہنستے مسکراتے راہ خدا میں جان دے دی تھی[۴۸۱] اس سے اہم اور عبرتناک یہ واقعہ ہے کہ بئر معونہ کے المیہ نے بنو سلیم کے مختلف گھرانوں میں کم از کم افراد کی حد تک اسلام کی نشر و اشاعت کی راہ ہموار کر دی۔ حضرت جبار بن سلمیٰ کا بیان ہے کہ "میں نے جب حضرت عامر بن فہیرہ کو قتل کیا اور میرا نیزہ ان کے سینے کے پار ہو گیا تو وہ گر سے اور ان کی زبان پر بےساختہ کلمہ آیا۔ رب کعبہ کی قسم! میں تو کامیاب ہو گیا۔" میں حیران ہوا کہ ایک شخص جس کی زندگی اس المناک طریقے سے ختم ہوئی وہ کیونکر کامیاب ہوا؟ یہ خلش میرے دل میں پیدا ہوئی اور میں نے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور بالآخر مسلمان ہو گیا[۴۸۲] حضرات عروہ بن صلت اور عامر بن فہیرہ کے خون شہادت ہی نے اسلام کے پودے کی اس طرح آبیاری نہیں کی تھی اور نہ جانے کتنے شہیدوں کا لہو رنگ لایا ہوگا۔ اور وہ نہ جانے کتنے دلوں میں اسلام کا بیج بو گیا ہوگا۔ غالباً اسی زمانے سے حضرت صفوان بن معطل کا قبول اسلام بھی تعلق رکھتا ہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عظیم صحابی تھے جن کا تعلق بنو سلیم کے گھرانے بنو ذکوان سے تھا۔ تقریباً تمام ماٰخذ کا اتفاق ہے کہ وہ غزوہ بنی المصطلق میں شریک اور ساقہ لشکر اسلامی کے افسر تھے[۴۸۳]

اگرچہ غزوہ احزاب میں مکی اتحاد قبائل میں بنو سلیم کا ایک خاصا بڑا دستہ جو سات سو جنگجوؤں پر مشتمل تھا مسلمانوں کے خلاف لڑنے آیا تھا[۴۸۴] لیکن اس غزوہ کے دوران ہی ان کو اسلام کی مخالفت و عداوت کی بے مائگی اور بے فائدہ ہونے کا احساس ہو گیا تھا۔ چنانچہ اسی سبب سے وہ آہستہ آہستہ اسلامی امت بننے لگے تھے۔ بلکہ اجتماعی طور سے اسلام کے قریب آ رہے تھے[۴۸۵] اس کی تصدیق ابن سعد کے اس بیان سے ہوتی ہے۔ جس کے مطابق بنو سلیم کے کافی لوگوں نے صلح حدیبیہ

اور فتح مکہ کے درمیانی عرصے میں اسلام قبول کیا تھا۔ اور ان میں سے بارہ اہم حضرات کے نام بھی گنائے ہیں جو یہ ہیں۔ حضرات: (۱) الحجاج بن علاط سلمی (۲) عباس بن مرداس (۳) ان کے صاحبزادے جہیمہ بن عباس (۴) یزید بن اخنس (۵) ضحاک بن سفیان بن حارث (۶) عُتبہ بن فرقد (۷) نخاف بن عمیرہ بن حارثہ (۸) ابن ابی العوجاء (۹) العوروین خالد بن حذیفہ (۱۰) ہوذہ بن حارث (۱۱) عرباض بن ساریہ اور (۱۲) ابو حصین[486] ان کے علاوہ متعدد سلمی صحابہ کے اسمائے گرامی سیرت و تاریخ کی مختلف کتابوں میں ملتے ہیں[487] اور اگر سب کا استقصا کیا جائے تو بنو سلیم کے صحابہ کرام کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہوگی۔

اس کے علاوہ اس حقیقت سے کہ بنو سلیم نے غزوہ خندق کے بعد اسلامی ریاست کے خلاف کسی مخالفانہ سرگرمی میں حصہ نہیں لیا تھا اور نہ ہی اسلامی حکومت نے ان کے خلاف کوئی فوج کشی یا فوجی کارروائی کی تھی۔ ان کے قبول اسلام یا کم از کم ترک عداوت اسلام کے خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ حضرت عباس بن مرداس سلمی کی شاعری سے جو سیرت ابن اسحاق میں محفوظ ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنو سلیم کے بیشتر لوگ فتح مکہ سے قبل اسلام لا چکے تھے[488]۔ مآخذ عام طور سے اور ابن سعد خاص طور سے صراحت کرتے ہیں کہ بنو سلیم کے سرداروں اور سربرآوردہ حضرات جیسے عباس بن مرداس، جبار بن حکم، حجاج بن علاط اور عرباض بن ساریہ وغیرہ نے بنو سلیم میں اسلام کی نشر و اشاعت میں کلیدی کردار ادا کیا تھا اور ان کو اسلامی اُمت کا رکن بنا دیا تھا۔[489] بہرحال یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ فتح مکہ سے قبل بنو سلیم اسلام کے مکمل طور سے حلقہ بگوش بن چکے تھے

بنو سلیم کے قبول اسلام کی ایک ناقابل تردید شہادت ان کے دستوں کی اسلامی لشکر میں مختلف غزوات کے مواقع پر شمولیت ہے۔ اس سے ان کی عددی طاقت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مآخذ کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے لیے اسلامی لشکر میں بنو سلیم کے دستہ میں ایک ہزار مسلح و کیل کانٹے سے لیس مجاہدین شامل تھے[490]۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ بنو سلیم کا دستہ بدوی مسلم قبائل کے فراہم کردہ سب سے بڑے دستوں میں سے ایک تھا اور فوجی لحاظ سے طاقتور ترین تھا۔ بنو سلیم کے اس دستے نے جنگ حنین اور محاصرہ طائف میں بھی حصہ لیا تھا۔ یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ ان تمام مواقع پر بنو سلیم کا دستہ اسلامی لشکر کے مقدمہ کا ایک حصہ تھا جو بعض دوسرے دستوں کے ساتھ حضرت خالد بن ولید مخزومی کے کمان میں رکھا گیا تھا[491]۔ بنو سلیم کے حسن اسلام کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ بنو سعد بن بکر کی دردمندانہ درخواستوں پر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے قیدیوں کی رہائی کے احکامات صادر کئے تھے۔ تو اپنے شیخ قبیلہ کے ذہنی تحفظات اور گرانیٔ خاطر کے باوجود بنو سلیم کے تمام لوگوں نے اپنے اپنے حصے کے قیدی فوراً رہا کر دیئے تھے۔[492] حضرت خالد بن ولید مخزومی کی کمان میں جو فوج اس کے بعد بنو جذیمہ کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ اس میں مہاجرین اور انصار کے علاوہ بنو سلیم ہی کے مجاہدین کافی بڑی تعداد میں شامل تھے[493]۔ اسی طرح انہوں نے غزوہ تبوک کے موقعہ پر اسلامی لشکر کے لئے ایک خاصا بڑا اور طاقتور دستہ فراہم کیا تھا[494]۔ چنانچہ یہ واضح ہوتا ہے کہ غزوہ خیبر کے بعد بنو سلیم کے مخلص اور ثابت قدم مسلمان اسلامی ریاست کی مختلف حیثیتوں میں شاندار خدمات انجام دے رہے تھے اور اسلام کے سچے وفادار اور مخلص ماننے والے

بن گئے تھے۔

ابن سعد کا مزید بیان ہے کہ فتح مکہ کے سال ہی بنو سلیم کا ایک وفد عظیم جو نو سو یا ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ اپنے ایک خاص سردار حضرت قیس بن نفیسہ کی تحریک پر مدینہ میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا تھا۔ اور اس نے اپنی وفاداری اور صلابت ایمانی کا بیمثال مظاہرہ کیا تھا[۴۹۵]۔ اس عبارت کے دوران بنو سلیم کے متعدد حضرات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قطائع (قطیعہ: زمین کا ٹکڑا) عطا فرمائے تھے۔ طبقات، اسد الغابہ اور مجموعۃ الوثائق کے متعدد بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم بنو سلیم کے بارہ حضرات کو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف مقامات پر قطائع ملے تھے[۴۹۶] سنہ ۹ھ کے آغاز اور سنہ ۱۰ھ کے پہلے ربع میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو سلیم سے صدقات وصول کرنے کیلئے ایک مرکزی عامل صدقات مقرر کیا تھا اور یہ بنو سلیم کے شرف کی بات ہے کہ پورے قبیلہ نے بلا کسی رد و کد کے اپنے واجب الادا صدقات فوراً ادا کر دیئے تھے[۴۹۷]۔ یہاں یہ بھی ذکر کر دیا جائے کہ عامل صدقات کے پورے گھرانے اور خاندان نے ردہ کے زمانے میں بھی اپنے صدقات پوری دیانت داری سے ادا کئے تھے[۴۹۸]۔ بنو سلیم کے صرف ایک طبقہ نے ردہ میں حصہ لیا تھا اور بیشتر لوگ اسلام اور مرکز اسلام کے وفادار رہے تھے۔ بہر حال یہ ناقابل انکار و تردید حقیقت ہے کہ عہد نبوی میں بنو سلیم کا پورا قبیلہ نہ صرف مسلمان ہو گیا تھا بلکہ مخلص مسلمان تھا۔ جو لبعد کے پر آشوب زمانے میں بھی زیادہ تر ثابت قدم رہا تھا[۴۹۹]

(ج) بنو غطفان

بنو غطفان غالباً قریش مکہ کے بعد سب سے زیادہ طاقت ور اور عددی اعتبار سے بڑا بدوی قبیلہ تھا۔ نسب کے لحاظ سے وہ بنو سلیم کے بہت قریب تھا بلکہ کہنا چاہیئے کہ دونوں ایک دوسرے کے عزیز اور رشتہ دار تھے کیونکہ دونوں مضر کے ایک عظیم خاندان یا قبیلے قیس عیلان کی شاخیں تھیں[۵۰۰]۔ سماجی، سیاسی اور نسبی اعتبارات سے قریش مکہ اور قیس عیلان وسطی عرب کے دو سب سے بڑے قبائلی گروہ تھے جو بوجوہ معلوم ایک دوسرے کے حریف اور مقابل تھے۔ اگرچہ اقتصادی اور تجارتی اسباب کے سبب قیس عیلان کے بعض گھرانوں کے ساتھ قریش مکہ کے دوستانہ تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے جن میں ازدواجی روابط بھی شامل تھے۔ بہر حال غطفان بعثت نبوی کے زمانے تک بجائے خود قبائل کا ایک مجموعہ بن گیا تھا جس کے اپنے گھرانے اور ان کے ذیلی خاندان تھے اور جو اپنی اپنی جگہ قبیلے بن چکے تھے۔ ان میں سے سب سے زیادہ طاقت ور اور عددی کثرت والے تین اہم ترین بطون تھے: بنو اشجع، بنو فزارہ اور بنو مرہ ان کے علاوہ عبس اور ذبیان کے دو اہم گھرانے تھے جو ولادت نبوی یا اس سے بھی قبل کے زمانے میں بہت اہم تھے۔ لیکن بعثت نبوی کے زمانے میں وہ اپنی سابقہ حیثیت اور مقام کھو چکے تھے اور اتنے اہم نہیں رہ گئے تھے۔ دو اور اہم شاخیں تھیں جو بنو محارب اور بنو ثعلبہ کہلاتی تھیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور ذیلی شاخیں بھی تھیں جن میں سے بنو انمار اور بنو عبد العزیٰ خاصی اہم تھیں۔ یہ تمام اہم اور ذیلی خاندان اور بطون ایک دوسرے سے قریبی و اتحادی تعلقات رکھتے تھے اور ان کا سیاسی اور

فوجی اتحاد ہی ان کے طاقت ور ہونے اور قبائلی نظام عرب میں ممتاز ہونے کا سب سے بڑا سبب تھا۔ ان کے نسبی شجرہ پر ایک نظر ان کے قریبی تعلقات کی نوعیت کو واضح کر دے گی۔[۵۰۰]

جہاں تک اسلام اور اسلامی ریاست سے بنو غطفان کے تعلقات کا معاملہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے مدتوں تک اجتماعی طور سے دونوں کی مخالفت کی تھی۔ لیکن اسلام نے ان کے بعض افراد کو اپنا حلقہ بگوش آغازِ عہدِ اسلامی ہی میں بنا لیا تھا۔ ذیل میں بنو غطفان کے مختلف قبیلوں اور بطون کے افراد کے انفرادی اور ان کے اجتماعی رویّے کا جائزہ لیں گے۔ جس سے بنو غطفان میں اسلام کی اشاعت کا نہج اور رفتار اور طریقہ تاثیر و تسخیر معلوم ہو گا۔

(۱) بنو اشجع

جس طرح قریش مکہ کے بعض خاندانوں نے اسلام کی مخالفت کی تھی۔ یا اس کی دعوت سے اجتماعی طور سے گریز کیا تھا مگر اس کے تقریباً سب ہی گھرانوں کے افراد اسلام قبول کرتے رہے تھے۔ بالکل اسی طرح بنو غطفان بھی مدتوں تک اسلام کا مخالف رہا لیکن اس کے مختلف گھرانوں میں اسلام روشناس ہوتا رہا۔ ان میں سب سے پہلے اور غالباً دوسروں کی بہ نسبت ذرا ابتدائی زمانے میں ان کا گھرانا بنو اشجع اسلام سے متعارف ہوا تھا اور اس کے بعض افراد و ارکان نے اسلام مکی عہد ہی میں قبول کر لیا تھا۔ ابن سعد اور ابن حزم کی روایات کے مطابق حضرت جاریہ بن جمیل ان کے قدیم ترین مسلمانوں میں شامل تھے وہ بدری صحابی بھی تھے[۵۰۱] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو غطفان کے مختلف گھرانوں میں اسلام کی باقاعدہ اشاعت جنگ احزاب کے بعد شروع ہوئی تھی اور صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے دوران وہ تقریباً سب مسلمان ہو چکے تھے۔ ابن سعد نے فتح مکہ سے قبل مسلمان ہونے والے صحابہ کرام کی فہرست میں کم از کم دس بنو اشجع کے مسلمانوں کو شمار کیا ہے[۵۰۲] ان میں سے نصف دوسرے مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۵ھ / ۶۲۶ء سے پہلے کے مسلمان تھے اور بعض اہم حضرات تو جنگ خندق ۵ھ / ۶۲۷ء سے قبل اسلام لا چکے تھے۔ ان میں سب سے اہم حضرت نعیم بن مسعود اشجعی تھے۔ جو احزاب سے کچھ پہلے اسلام لا چکے تھے۔ اور ان کے اسلام کو ان کے قبیلہ والے اور اتحادی نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے جس مہارت، ہوشیاری اور سیاسی حکمت عملی سے احزاب کے اتحاد کو توڑا تھا وہ ان کے حسن و صلابتِ اسلام کا بھی ایک بہترین نمونہ تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہی بنو قریظہ کو عملی طور سے جنگِ احزاب کے دوران اتحادیوں سے ملنے سے روک دیا تھا۔[۵۰۳] ان کے خاندان بنو اشجع کے دوسرے اہم اور سربرآوردہ مسلمان تھے: حضرات عبداللہ بن نعیم جو غزوہ خیبر میں شریک جہاد تھے[۵۰۴] عوف بن مالک، غزوہ خیبر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دلیل (راہ بر)[۵۰۵] حسیل بن خارجہ، جو خیبر کے بعد غالباً اسلام لائے تھے[۵۰۶] اور معقل بن سنان جنہوں نے متعدد مواقع پر اسلامی ریاست کی خدمات انجام دی تھیں۔[۵۰۷]

ان اہم اور با اثر حضرات کے قبول اسلام کا لازمی طور سے ان کے قبیلے کے دوسرے افراد پر بھی اثر پڑا تھا لیکن سب سے زیادہ توسیع اسلام میں حصہ لیا تھا حضرت مسعود بن رُخیلہ اشجعی کے قبول اسلام نے۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ انہوں

نے جنگ احزاب کے فوراً یا کچھ مدت کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا[۵۰۹] ان کے قبول اسلام کی تاثیر کا اندازہ اس پس منظر میں ہوتا ہے کہ انہوں نے جنگ احزاب کے دوران اپنے قبیلہ اشجع کے دستے کی قیادت میدان جنگ میں کی تھی اور وہی قبیلہ کے سب سے بڑے اور مسلمہ سردار تھے۔ چونکہ وہ اپنے قبیلے کے سب سے زیادہ با اثر آدمی تھے۔ اس لئے ان کے قبول اسلام کا اثر ان کے قبیلہ والوں پر عام طور سے اور ان کے اپنے اہل خاندان پر خاص طور سے پڑنا لازمی تھا۔

افراد و شیوخِ قبائل کا انفرادی اسلام ہی توسیع و اشاعت اسلام کا واحد سبب نہیں تھا۔ اس سے کہیں زیادہ اہم سبب یا عنصر تھا ان نومسلموں کا پورے جوش و ولولے کے ساتھ اپنے قبیلوں میں اسلام کی تبلیغ کرنا۔ چنانچہ ابن اسحاق کے بیان سے بصراحت معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت نعیم بن مسعود اشجعی نے اپنے قبیلہ کے قبول اسلام میں کافی اہم کردار ادا کیا تھا[۵۱۰]۔ کسی حد تک بنو اشجع کے قبول اسلام کی تصدیق ابن سعد کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ بنو اشجع کا وفد سو افراد پر مشتمل تھا، لیکن دوسری روایت سے جو زیادہ قرین قیاس ہے معلوم ہوتا ہے کہ وفد کے ارکان کی تعداد سات سو تھی[۵۱۱]۔ یہ دلچسپ اور اہم تاریخی حقیقت ہے کہ بنو اشجع کے اس وفد نے جنگ احزاب میں اتحادیوں کی ناکام پسپائی کے فوراً بعد بارگاہ نبوی میں حاضری دی تھی[۵۱۲]۔ بہر حال فتح مکہ تک یہ پورا قبیلہ اسلامی امت کا ایک مخلص و تابعدار رکن بن چکا تھا۔ کیونکہ فتح مکہ کے اسلامی لشکر کے لئے بنو اشجع نے تین سو مسلح مجاہدین فراہم کئے تھے[۵۱۳]۔ اسی طرح انہوں نے غزوہ تبوک کے لئے بھی خاصا بڑا دستہ فراہم کیا تھا۔ اس ضمن میں یہ حقیقت قابل ذکر ہے کہ ان دونوں مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت نعیم بن مسعود کو بنو اشجع کے مجاہدین کو اکٹھا کرنے کے لئے بھیجا تھا[۵۱۴]۔ ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غالباً حضرت نعیم بن مسعود اشجعی یا تو بنو اشجع کے سردار بن گئے تھے اور حضرت مسعود بن رُخیلہ انتقال فرما چکے تھے۔ یا میدان سیاست سے ہٹ گئے تھے یا وہ اس وقت تک اشجع کے سب سے زیادہ اہم اور با اثر شخص بن چکے تھے۔

(۲) بنو فزارہ

بنو غطفان کے دوسرے اہم خاندان خاص طور سے فزارہ اور بہ مجموعی لحاظ سے اسلام کے دائرے سے کافی عرصے تک باہر رہے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ خیبر کے بعد تو یقیناً اور غزوہ احزاب کے بعد غالباً ان کی اسلام اور اسلامی ریاست سے مخالفت کم ہونے لگی تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں دونوں طرف سے ہم کسی جارحانہ اقدام کے بارے میں نہیں سنتے۔ یہ حتمی امر ہے کہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی عرصے میں وہ تقریباً سب کے سب مسلمان ہو گئے تھے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کا ایک خاصا بڑا فوجی دستہ اسلامی لشکر کا حصہ تھا۔ جس نے مکہ فتح کیا تھا[۵۱۵]۔ واقدی کے یہاں متعدد حوالے ملتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو فزارہ عام طور سے اور ان کے سردار خاص طور سے ان سیاسی و فوجی تبدیلیوں سے خوش نہیں تھے، جو غزوہ احزاب کے بعد پیش آ رہی تھیں۔ اور آہستہ آہستہ ان میں اسلامی ریاست سے کوئی سمجھوتہ یا مفاہمت کرنے کا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو فزارہ اور ان کے سردار عیینہ بن حصن فزاری کو اسلام کا ہمنوا بنانے

میں ان کے حلیف و عزیز بنو مرہ کے سردار حضرت حارث بن عوف مری نے اہم کردار ادا کیا تھا[516] صلح حدیبیہ یا غزوۂ القضیہ کے زمانے (شوال ۶ھ / ۲۹-۶۲۸ء) تک وہ عجیب کشمکش اور حیص بیص کے عالم میں تھے۔ لیکن مکہ کی گرتی ہوئی ساکھ اور اسلامی ریاست کی روز افزوں طاقت نے ایک طرف تو ان کو اسلامی ریاست کا وفادار بنا دیا اور دوسری طرف اسلام کا پیرو بھی فتح مکہ سے پہلے وہ اسلامی امت کے باقاعدہ رکن بن چکے تھے اور ان میں سے اکثر مخلص مسلمان تھے۔ یہی سبب تھا کہ فتح مکہ کے موقعہ پر اسلامی لشکر میں دوسرے مشرقی قبائل کے دستوں کے علاوہ بنو فزارہ کے لوگ بھی موجود تھے اور انہوں نے فتح مکہ، غزوات حنین و طائف میں شاندار فوجی خدمات انجام دی تھیں۔ اسی طرح ابن اسحاق کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو عبس کا ایک اہم دستہ اس موقعہ پر موجود تھا اور یہی فزارہ اور مرہ کا دستہ تھا۔ یہ اسلامی لشکر کے میمنہ دائیں بازو / RIGHT - WING میں شامل تھا اور ان کے علاوہ بنو عبس اور قبیلہ بنو اسد / خزیمہ کے دستے بھی تھے[517] بنو فزارہ کے قبول اسلام کا یہ ایک ناقابل تردید ثبوت ہے بلا ریب بنو فزارہ کی سب سے اہم مسلم شخصیت حضرت عیینہ بن حصن فزاری کی تھی۔ جنہوں نے غالباً فتح مکہ سے کچھ قبل اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ دوسرے بدوی قبائل جیسے بنو سلیم، تمیم اور ہوازن وغیرہ کے سرداروں کے ساتھ ان نو مسلموں میں شامل تھے جن کو عام طور سے المؤلفۃ قلوبہم (وہ لوگ جن کی تالیف و تسکین قلب کی گئی تھی) کہا جاتا ہے۔ اور جن کے اطمینان قلب و تسکین انا اور اعزاز و اکرام کے اظہار کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے خمس میں عطایائے خاص عنایت فرمائے تھے، حضرت عیینہ بن فزاری کو ایک سردار کا حصہ ملا تھا جو سو اونٹوں پر مشتمل تھا۔ یہ عطیۂ نبوی تھا[518] اس کے فوراً بعد ہی ہم ان کو اسلامی ریاست کی جانب سے بنو تمیم کے ایک سرکش خاندان کے خلاف فوجی کارروائی کے قائد کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ یہ واقعہ محرم ۹ھ / اپریل ۶۳۰ء کا ہے[519] اس سے اہم یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس زمانے میں وہ بنو تمیم کے لئے بطور مرکزی عامل صدقات مقرر کئے گئے[520] غالباً یہ عارضی انتظام تھا۔ کیونکہ اس کے بعد ہی ان کو اپنے قبیلہ بنو فزارہ کا محصل یا عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا، جیسا کہ بلاذری کا بیان ہے[521] ان حقائق سے بنو فزارہ یا ان کے سردار کے قبول اسلام کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا ہے، مزید تائید ان کے وفد کے مدینہ میں ۹ھ کے آخری زمانے اور ۱۰ھ / ۶۳۱ء کے آغاز میں آنے سے ہوتی ہے۔ ان کا یہ وفد غزوہ تبوک کے بعد حاضر بارگاہ نبوی ہوا تھا ابن حزم نے بنو فزارہ کے متعدد صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے جن میں سے اہم ترین تھے۔ حضرات کثیر بن زیاد اور سمرہ بن جندب جن کا تعلق فزارہ کے ایک گھرانے بنو شمخ سے تھا[522]

ان حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہے کہ بنو فزارہ اور ان کے سردار بلا شک و شبہ حیات نبوی میں اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے تھے۔ وہ سب یا ان میں سے اکثر یا بعض عہد نبوی کے بعد مرتد ہو گئے تھے اور طلیحہ اسدی کے جال میں پھنس گئے تھے۔ الگ بات ہے اور ان کا ارتداد بھی ان کے پہلے قبول اسلام کا ثبوت ہے۔ بہر حال جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ وہ حضرت خالد بن ولید مخزومی کے ہاتھوں ۱۱ھ / ۶۳۲ء میں طلیحہ اسدی کی شکست کے بعد پھر مسلمان ہو گئے تھے طبری کے بیان کے مطابق انہوں نے کہا تھا "ہم اس دین میں پھر داخل ہو رہے ہیں جس سے نکل گئے تھے۔ ہم خدا اور اس کے رسول"

کے سامنے سر اطاعت خم کرتے ہیں اور اپنے اموال اور اپنی جانوں کے بارے میں احکام الٰہی کی تعمیل کرتے ہیں"[۵۱۴]

(۳) بنو مرہ

بنو غطفان کے تیسرے سب سے اہم بطن بنو مرہ کا بنو فزارہ سے قریبی تعلق تھا وہ دونوں نہ صرف ایک دوسرے کے عم زاد خاندان تھے بلکہ ایک دوسرے کے حلیف بھی تھے[۵۱۵] ذکر آچکا ہے کہ ان دونوں خاندانوں میں غزوہ احزاب کے بعد گذشتہ حالات یا دوسرے الفاظ میں اسلامی ریاست اور اسلام کے بارے میں اپنے تعلقات اور حکمت عملی کے لئے تغیر یا بے اطمینانی پیدا ہوگئی تھی۔ اتحاد احزاب کے ناکام ہونے کے بعد بنو مرہ کے سردار حارث بن عوف نے اسلامی ریاست سے مفاہمت کرنے اور دوستی کے تعلقات استوار کرنے کا برملا اظہار بنو فزارہ کے سردار سے کیا تھا۔ اور ان کو بھی یہی مشورہ دیا تھا[۵۲۶] بنو فزارہ کے حیص بیص اور لیس و پیش کے سبب بنو مرہ بھی اسلام اور اسلامی ریاست کے قریب نہیں آسکے کیونکہ وہ بنو فزارہ سے اپنے قدیم برادرانہ اور حلیفانہ تعلقات کے بندھنوں سے مجبور تھے۔ پھر غزوہ خیبر کے موقعہ پر بھی بنو مرہ کے سردار نے انہی جذبات کا اظہار کیا تھا۔"[۵۱۷] اس ضمن میں یہ نکتہ خاصا اہم اور قابل ذکر معلوم ہوتا ہے۔ کہ خیبر کے یہودیوں نے بنو غطفان کو اپنی پیداوار کا نصف حصہ دیکر اسلامی ریاست کے خلاف اور ایک اتحاد بنانا چاہا تھا۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دور بین پالیسی اور عظیم حکمت عملی کے سبب یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ قوی امکان ہے کہ بنو مرہ اور ان کے ہم خیال اتحادیوں نے بھی اسلامی ریاست کے خلاف کسی نئے اتحاد یا گٹھ جوڑ میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا اور بنو غطفان کا یہ باہمی سیاسی اختلاف بھی خیبر کے یہودیوں کے منصوبے کی ناکامی کا ایک اہم عنصر یا عامل رہا تھا۔ بہر حال عمرۃ القضیہ کے زمانے تک بنو مرہ اور ان کے سردار قبولِ اسلام کی دہلیز پر کھڑے تھے اور اسی زمانے یا اس کے معاً بعد وہ باب رحمت سے قلعہ اسلامی میں داخل ہو گئے[۵۲۸] غالباً اسد الغابہ کی اس روایت کا اسی زمانہ سے تعلق ہے۔ جس کے مطابق بنو قیس کے ایک صحابی حضرت ساریہ بن اوفی کو جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو مرہ کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے بھیجا تھا۔ اور انہوں نے تھوڑی سے مزاحمت کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا[۵۲۹]۔ اس سے پہلے مختلف غزوات نبوی میں بنو مرہ کے دستوں کی موجودگی کا ذکر آچکا ہے جو ان کے قبول اسلام کے علاوہ اسلامی ریاست کے نظم و نسق میں ان کی فعال اور باقاعدہ شرکت کا بھی ثبوت ہے[۵۲۰]

بلاذری کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارث بن عوف کو اپنے قبیلہ بنو مرہ کے صدقات وصول کرنے اور مدینہ کے بیت المال میں پہنچانے کا افسر مقرر کیا تھا[۵۲۱] اور یہ انتظام غالباً ۹ھ کے آغاز یا ۶۳۰ء کے وسط میں کیا گیا تھا، جب بہت سے کزی اور مقامی عاملین و محصلین صدقات تمام چھوٹے بڑے مسلمان قبیلوں کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ اپنے حلیف اور برادر بنو فزارہ کی مانند بنو مرہ نے بھی اس برس کے آخری زمانے میں یا ۶۳۱ء کے اوائل میں بارگاہِ نبوی میں نذرانہ عقیدت و وفاداری پیش کرنے کے لئے اپنا بھی وفد مدینہ بھیجا تھا جو تیرہ اشخاص پر مشتمل تھا[۵۳۲] بنو مرہ کے عہد نبوی میں قبولِ اسلام اور ریاستِ اسلامی سے وفاداری کا ایک مزید ثبوت یہ بھی ہے کہ وفات نبوی کے بعد ردہ کے زمانے

میں پورے قبیلہ بنو مرہ نے یا اس کے کسی ایک حصہ نے بھی اسلام ترک نہیں کیا تھا۔ انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا اور اس کے لئے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق سے جنگ بھی مول لی تھی [۵۲۳] مگر انہوں نے نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد طلیحہ اسدی یا اس کے سب سے بڑے حلیف بنو فزارہ کا ساتھ دیا تھا۔ جس طرح انہوں نے قبیلہ طے کے خلاف بنو اسد اور بنو فزارہ کے جاہلی اتحاد میں شمولیت سے انکار کر دیا تھا۔ [۵۲۴]

(۴) بنو عبس

بنو عبس بنو ذبیان کے برعکس غطفان کا وہ گھرانا تھا۔ جو اسلامی عہد کے قریب سیاسی پس منظر میں چلا گیا تھا۔ لیکن وہ عرب دنیا کے معاملات میں اتنے غیر اہم نہیں ہو گئے تھے۔ جتنا کہ وہ اپنی گذشتہ تاریخ سے معلوم ہوتے ہیں اور نہ ہی یہ خیال صحیح ہے کہ عہد نبوی کے واقعات میں ان کا حصہ معمولی تھا۔ [۵۳۵] وہ اس زمانے میں بھی ایک خاصے اہم قبائلی گروہ کی حیثیت رکھتے تھے اور اسلام کی نشر و اشاعت کی تاریخ میں ان کا حصہ کافی نمایاں نظر آتا ہے۔ ابن حزم نے بنو عبس کے جن متعدد صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے ان میں سے حضرات قُرّہ بن حصین، شریح بن اوفیٰ اور ابی بن عمارہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم و ممتاز صحابہ میں سے تھے۔ اور انہوں نے اسلام اور اسلامی ریاست کے لئے اہم خدمات انجام دی تھیں [۵۳۶]

یہ نکتہ خاصا اہم ہے کہ اسلامی ریاست سے ان کا کوئی تصادم عہد نبوی میں نہیں ہوا تھا۔ اور نہ ہی اسلامی ریاست نے ان کے خلاف کسی قسم کی تادیبی یا فوجی کارروائی کی تھی جبکہ وفات نبوی کے فوراً بعد ان کے مرکز اسلام اور خلیفہ اول سے زکوٰۃ کی ادائیگی پر اختلاف و تصادم ہوا تھا۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں کم از کم ان کو اسلامی ریاست سے کوئی اختلاف یا نزاع نہیں تھا اور غالباً وہ اسلام کے حلقہ بگوش صلح حدیبیہ کے بعد بن گئے تھے۔ اس کی تصدیق اسلامی لشکر میں ان کے دستے کی موجودگی سے ہوتی ہے جو فتح مکہ، حنین اور طائف کے غزوات میں برسرکار رہا تھا [۵۳۷] اس کے علاوہ ابن سعد کا بیان ہے کہ ان کا ایک وفد جو ان کے نو خاندانوں (رھط) پر مشتمل تھا۔ کسی وقت مدینہ میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا تھا۔ تاکہ اپنے اور اپنے قبیلہ کے قبولِ اسلام کا اظہار اور اسلامی ریاست سے وفاداری کا اقرار کرے۔ ابن سعد نے ان کے وفد کے آنے کی تاریخ نہیں بیان کی ہے۔ مگر طبری نے واقدی کی ایک روایت کی بنیاد پر اس کی آمد کی تعیین سنہ ۱۰ھ / ۳۱-۶۳۲ء میں کی ہے۔ [۵۳۸]

ان کے قبولِ اسلام اور ریاستِ اسلامی کی شہریت کا مزید ثبوت بلاذری کے اس بیان سے ملتا ہے۔ جس کے مطابق حضرت نُعَیم بن مسعود اشجعی بنو غطفان کے تین اہم گھرانوں ..... اشجع، انمار بن بغیض اور بنو عبس بن بغیض ..... کے لئے مرکزی عامل صدقات مقرر کئے گئے تھے [۵۳۹] بظاہر مآخذ کے کسی بیان سے نہیں معلوم ہوتا کہ بنو عبس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کیا ہو بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے تمام صدقات خوشدلی اور بر وقت مدینہ کو ادا کئے تھے۔ لیکن وفاتِ نبوی کے بعد ان کے ایک گروہ نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے

کہ انہوں نے دوسرے تمام شعائر اسلام کو ادا کرتے رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ بات اہم ہے کہ خود مدینہ کے صحابہ کرام کی غالب اکثریت نے محض زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کو ارتداد نہیں سمجھا تھا۔ اور اسی وجہ سے ہمارے تمام مآخذ نے ایسے لوگوں کو مانعین زکوٰۃ (زکوٰۃ روکنے والے) طبقہ میں رکھا ہے۔ بہر حال طبری کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں پورے بنو عبس مسلمان ہو گئے تھے ۵۴۰ بعد میں انہوں نے اسلامی حکومت کے خلاف کسی ایک معاملہ پر بغاوت کی تھی وہ دوسری بات تھی۔

(۵) بنو ثعلبہ

مادر قبیلہ غطفان کے دو ذیلی گھرانے بنو ثعلبہ اور انمار تھے، اور وہ دونوں اسلامی ریاست کے کم از کم سنہ ۸ھ / ۶۲۹ء تک مخالف رہے تھے۔ چنانچہ سنہ ۳ھ / ۶۲۴ء سے ان کے خلاف کئی چھوٹی بڑی مہمیں مدینہ منورہ سے بھیجی گئی تھیں اس کے باوجود اسلام نے ان گھرانوں میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لئے تھے اور طرفہ ستم یہ کہ ان فوجی مہموں کے دوران ہی ان کے بعض اہم افراد اور سردار اسلام کی حقانیت کے قائل اور اسلامی ریاست کے وفادار بنے تھے۔ بنو ثعلبہ کے خلاف بھیجی گئی پہلی مہم ہی کے دوران ان کا ایک شخص مسلمان ہو گیا تھا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حضرت بلال حبشی کے دامن تربیت میں دیدیا تھا کہ وہ ان سے دین میں صلابت و ثابت قدمی کا درس لیں! ۵۴۱ یہاں یہ بات قابل ذکر معلوم ہوتی ہے کہ بنو ثعلبہ، انمار اور بنو محارب ایک ہی علاقے میں بستے تھے اور اس طرح خون کے رشتوں کے علاوہ ان میں دوستی اور سیاسی ہم آہنگی کے روابط بھی تھے۔ وہ دوسرے قبائل یا جماعتوں کے مقابلے میں عموماً بطور ایک اکائی اور وحدت کے طرز عمل اپناتے تھے۔ اسلام اور اسلامی ریاست کے معاملے میں بھی ان کا یہی وطیرہ تھا۔ چنانچہ ان تینوں قبیلوں نے ساتھ ساتھ اسلام کی مخالفت کی اور اس کے سبب کئی مہمیں جیسے غزوہ ذو امر (ربیع الاول سنہ ۳ھ / ستمبر سنہ ۶۲۴ء) ذات الرقاع (محرم سنہ ۵ھ / جون سنہ ۶۲۶ء) ذو القصہ (ربیع الثانی سنہ ۶ھ / اگست ستمبر سنہ ۶۲۷ء) الطرف (جمادی الآخرہ سنہ ۶ھ / اکتوبر، نومبر سنہ ۶۲۷ء) اور میفعہ (رمضان سنہ ۷ھ / جنوری سنہ ۶۲۹ء) بھیجی گئی تھیں ۵۴۲۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے بعد ان کے خلاف کوئی مہم نہیں بھیجی گئی اور وہ غالباً اسلام سے مخاصمت کی راہ پر لگ گئے تھے۔ بہر حال سنہ ۸ھ / ۶۳۰ء میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جعرانہ سے واپسی پر بنو ثعلبہ نے چار آدمیوں پر مشتمل اپنا وفد بھیجا اور اسلامی ریاست سے اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ جس پر وہ آخر تک قائم رہے ۵۴۳۔ چونکہ محارب انہی مذکورہ بالا مہموں میں سے کسی میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ اس لئے یہ امکان قوی ہے کہ ان کے اسلام کا اثر ان کے پڑوسیوں خصوصاً بنو ثعلبہ پر پڑا تھا۔ اس کے علاوہ ہم ان کے قبیلہ پر عامل صدقات کے مقرر کئے جانے کی شہادت پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔ چنانچہ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ بنو ثعلبہ ہی نہیں بلکہ پورا قبیلہ غطفان عہد نبوی میں اسلام لا چکا تھا۔

(د) بنو محارب بن خصفہ

بنو محارب بن خصفہ قیس عیلان کا ایک طاقتور اور اہم قبیلہ تھا اور وہ اپنے دو ہمنام مگر سیاسی لحاظ سے گمنام ولے مایہ

قبیلوں سے بالکل الگ اور ممتاز تھا[۵۴۴] واقدی اور ابن سعد کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو محارب بن خصفہ میں اسلام کی نشر و اشاعت کافی ابتدائی زمانے میں شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس کے مطابق سنہ ۳ ھ / ۶۲۴ء کی ایک مہم کے دوران اس قبیلہ کے عظیم ترین سردار حضرت دعثور بن حارث بڑے ڈرامائی طریقے سے مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ اپنے قبول اسلام کے بعد انہوں نے اپنے قبیلہ میں دین خداوندی اور کیش احمدی کی نشر و اشاعت بڑی کامیابی سے کی تھی اور مختصر سی مدت میں ان کے قبیلہ والوں نے ان کی مثال کی تقلید کی تھی اور مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے[۵۴۵] بہرحال سنہ ۱۰ھ / ۶۳۲ء میں بنو محارب کا دس آدمیوں پر مشتمل ایک وفد مکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا تھا۔ جہاں آپ اپنے آخری حج کے لئے تشریف لے گئے تھے[۵۴۶] یہ نکتہ اہم ہے کہ بنو محارب نہ صرف عہد نبوی میں بلکہ اس کے بعد بھی اسلام پر عامل رہے تھے۔ جبکہ ان کے بعض خون کے عزیز قبیلے ارتداد کا شکار ہو گئے تھے۔ بنو محارب کے ردہ میں شریک ہونے کی کوئی شہادت نہیں ملتی ہے۔ ابن سعد اور ابن اثیر نے متعدد محاربی صحابہ کے نام اپنی اپنی تالیفات میں دیئے ہیں۔ ان کے سوانحی خاکوں سے بھی ان کے قبول و حسن اسلام کی تائید مزید ہوتی ہے۔

(س) ہوازن

قریش مکہ اور بنو غطفان کے بعد شاید ہوازن ہی سب سے بڑا قبیلہ تھا اور غالباً جزیرہ نمائے عرب میں سیادت و قیادت کا دعویدار بھی۔ نسبی لحاظ سے وہ بھی قیس عیلان کی شاخ تھا، لیکن ایسی شاخ جو بجائے خود ایک تناور درخت بن گئی تھی اور جس کی اپنی متعدد شاخیں تھیں۔ وہ اوروں کے بہ نسبت بنو سلیم سے زیادہ قریب تھے۔ کیونکہ دونوں ہی بنو منصور بن عکرمہ بن خصفہ بن قیس عیلان کی نسل میں سے تھے[۵۴۷] بعثت نبوی تک ان کی شاخیں قبیلے بن چکی تھیں۔ اور ان شاخوں کی بھی مزید شاخیں پھوٹی تھیں۔ اسی لئے وہ اپنی عددی طاقت پر نازاں تھے۔ غزوہ حنین کے موقع پر ان کے جنگجوؤں کی طاقت دس ہزار نفوس پر مشتمل تھی جو میدان جنگ میں اترے تھے۔ جبکہ ان کے متعدد گھرانے اور خاندان جنگ سے الگ اپنے علاقوں میں محدود رہے تھے[۵۴۸]۔ عامر بن صعصعہ ہوازن کا ایک اہم ترین گھرانا تھا۔ جس کی متعدد شاخیں تھیں۔ جیسے بنو ہلال، بنو کلاب، بنو ربیعہ، بنو بکاّر اور قرطاء اور عرینہ وغیرہ بھی انہی کے ساتھ وابستہ تھے۔ ہوازن کے دوسرے اہم خاندان تھے بنو نصر بنو جشم، بنو سعد بن بکر، بنو ثمالہ جبکہ ثقیف بجائے خود ایک ممتاز اور علیحدہ قبیلہ بن گئے تھے، جو دوسروں سے نسبتاً فاصلے پر قلعوں میں رہتے تھے[۵۴۹] اپنی عددی طاقت پر ان کا ناز کچھ بیجا نہیں تھا۔ اس کے سبب وہ جزیرہ نمائے عرب کے طاقتور ترین قبیلوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور اسی طاقت کے زعم میں انہوں نے اسلامی ریاست سے ٹکر مول لی تھی خاص طور پر اس وقت جبکہ دوسرے تمام جبابرہ عرب مثلاً قریش اور غطفان کا کس بل نکل گیا تھا۔ ان کی عسکری اور تنظیمی طاقت کا ایک ایک سرچشمہ ان کی عظیم قائدانہ صلاحیتیں تھیں اور ان کے سرداروں نے ان کے اعتماد اور ایقان میں مزید اضافہ کیا تھا۔ ان کے قائدین اور زعماء تجربہ کار منتظم، ماہرین عسکری امور اور عمدہ قائد تھے[۵۵۰] ان میں درید بن الصمۃ سب سے بڑا اور تجربہ کار سردار تھا

جو ابن اسحاق اور واقدی کے بقول ایک سو ساٹھ سال کی عمر عظیم کو پہنچ جانے کے باوجود اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتوں سے اسی طرح بہرہ ور تھا، اگرچہ اس کے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے[۵۱]۔ لیکن بعثت نبوی بلکہ ہجرت نبوی کے بعد سب سے زیادہ فعال اور بااثر سردار نسبتاً ایک جوان شخص تھا جو قبیلہ بنو نصر کا سردار تھا[۵۲]۔ چونکہ عوف بن مالک نصری نے ہوازن کے مختلف بطون اور خاندانوں میں سماجی اور فوجی ہم آہنگی اور اتحاد پیدا کر دیا تھا جس کا بے مثال مظاہرہ میدان حنین میں ہوا تھا اس لئے اس کو قبیلہ والوں کی ہر دلعزیزی کے علاوہ ہوازن کے قومی ہیرو کا مقام مل گیا تھا[۵۳] اور اسی غیر متزلزل قبائلی وفاداری کا نتیجہ تھا کہ غزوہ احزاب کے بعد جس میں متعدد قبیلوں کا اتحاد شامل تھا، سب سے بڑے لشکر کا سامنا اسلامی ریاست کے لشکر کو کرنا پڑا تھا۔ بہر حال ثقیف کے دو بڑے خاندان تھے: الاحلاف اور بنو مالک۔ اوّل الذکر بھی چھوٹے چھوٹے گروہوں کا مجموعہ تھا جبکہ یہی حال بنو مالک کا بھی تھا۔ احلاف ثقیف کے سردار تھے، حضرت قریب بن اسود، اور بنو مالک کے سردار تھے۔ سُبَیع بن حارث اور ان کے بھائی احمد۔ یہ دونوں بلکہ تینوں سردار بعثت نبوی کے بعد کے زمانے میں ابھرے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر تھے۔

اسلام اور ہوازن کے تعلقات کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ جنگ حنین تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس قبیلہ کے درمیان کوئی تعلق نہیں قائم ہو سکا تھا[۵۴]۔ جہاں تک سیاسی تعلقات اور فوجی ودفاعی معاہدوں کا تعلق ہے یہ خیال صحیح بھی ہو سکتا ہے لیکن اسلام سے ان کے تعلقات کے بارے میں یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ مکی عہد کے آخری ربع میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے قبیلہ ثقیف کو اسلام کی دعوت دی تھی اور انہوں نے اسے بھی مسترد کر دیا تھا لیکن بعد کے زمانے میں یہ صورت حال برقرار نہیں رہی تھی۔ انفرادی طور سے متعدد گھرانوں کے کافی افراد نے اسلام قبول کر لیا تھا اور وہ اسلامی ریاست کے نظم ونسق میں شریک بھی تھے۔ ذیل کے انفرادی قبائلی تجزیے سے یہ بات زیادہ واضح اور مدلل ہو گی۔

(۱) بنو عامر بن صَعصَعَہ

ہوازن کا یہ معتبر قبیلہ اسلام سے کافی پہلے متعارف ہوا تھا۔ اس کے ذیلی گھرانوں کے متعدد افراد ابتدائی مسلمانوں میں شامل تھے، خاص کر وہ حضرات وخواتین جن کا تعلق کسی نہ کسی لحاظ سے مکہ سے تھا۔ مثال کے طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو زوجات محترمات حضرت زینب بنت خزیمہ اور حضرت میمونہ بنت حارث ابتدائی مسلمان تھیں اور ان کا نسبی تعلق بنو عامر بن صَعصَعَہ کے خاندان بنو ہلال سے تھا[۵۵]۔ ان کے علاوہ دو اور خواتین بھی کافی پہلے زمانے کی مسلمان تھیں۔ ان کے اسمائے گرامی ہیں: حضرت لُبابہ صغریٰ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بن عبد المطلب کی اہلیہ محترمہ اور ان کے فرزند حضرت عبد اللہ بن عباس کی والدہ ماجدہ تھیں اور حضرت لُبابہ کبریٰ جو حضرت خالد بن ولید مخزومی کی والدہ تھیں یہ دونوں فتح مکہ کے پہلے زمانے کی مسلمان تھیں[۵۶]۔

ان خواتین کے علاوہ بنو ہلال / عامر بن صعصعہ کے خاندان کے تین مسلمان حضرات قبیصہ بن مخیرق، نزّال بن ساریہ اور حمید بن ثور الارقط کا ذکر ابن حزم نے کیا ہے[۵۵۷] بنو عامر کے ایک گمنام اور غیر معروف قبیلہ / خاندان بنو سواءہ کے دو مسلمانوں حضرات ابو جحیفہ اور جابر بن سمرہ کا ذکر ملتا ہے[۵۵۸] اوّل الذکر اگرچہ گمنام ہیں۔ لیکن مؤخر الذکر مشہور صحابی ہونے کے علاوہ احادیث نبوی کے مشہور راوی ہیں۔ اسی طرح ایک اور غیر معروف اور چھوٹے گھرانے بنو نمیر کے دو مسلمانوں حضرات قیس بن عاصم اور قرہ بن دعمیص کا ذکر ملتا ہے۔ اوّل الذکر اپنے گھرانے کے وفد کے ساتھ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے تھے۔ جبکہ مؤخر الذکر غیر معروف صحابی ہیں۔ بنو البکاء کے گھرانے میں کم از کم چار خاصے اہم مسلمانوں کے نام ملتے ہیں حضرت معاویہ بن ثور اور ان کے فرزند بشر جو اپنے وفد کے ساتھ مدینہ حاضر ہوئے تھے، مُجیع بن عبداللہ جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک کتاب (نامہ مبارک) پایا تھا اور ماعز بن بجالہ۔ اتنے ہی مسلمانوں کا ذکر ایک اور ذیلی گھرانے بنو الضجیاء سے بھی ملتا ہے۔ اس کے سوانحی خاکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب بعد کے زمانے کے مسلمان نہیں تھے[۵۵۹]

بنو کلاب کے کم از کم سات ابتدائی مسلمانوں کا ذکر ماخذ میں مل چکا ہے۔ ان کا تعلق اس خاندان کے مختلف ذیلی گھرانوں سے تھا۔ ان میں سے تین کا تعلق بنو کلاب بن ربیعہ سے تھا۔ جن میں سے حضرت ضحاک بن سفیان کلابی عظیم ترین اور مشہور ترین صحابہ میں شمار ہوتے ہیں اور بلا ریب عامر بن صعصعہ کے رجال عظیم میں سے ایک تھے[۵۶۰]۔ ان کے بارے میں ماخذ کا اتفاق ہے کہ انہوں نے اپنے قبول اسلام کے بعد اپنے گھرانے اور قبیلے میں اسلام کی اشاعت کی کوششیں کی تھیں اور مختصر سی مدت میں پورے قبیلہ کو مسلمان بنا لیا تھا[۵۶۱] ۹ھ / ۶۳۰ء میں جب مختلف قبائل عرب کے لئے عاملین صدقات مقرر کئے گئے تھے تو حضرت ضحاک بن سفیان کو ان کے قبیلے بنو کلاب کا افسر صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ اور انہوں نے ایک روایت کے مطابق جو کافی اہم ہے۔ فتح مکہ سے قبل ہی صدقات جمع کر کے مدینہ کو ادا کئے تھے[۵۶۲] انہوں نے اسلامی لشکروں میں سے بعض کی قیادت بھی کی تھی[۵۶۳] بنو کلاب کی مزید ذیلی شاخوں میں سے تین اور مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے حضرت عمرو بن بجیر کا تعلق بنو رئاش بن کلاب سے تھا۔ جبکہ سولی اور رفاعہ بن عبداللہ کا بنو انضباب بن کلاب سے ہے[۵۶۴]

بنو ہلال اور بنو کلاب کی مختلف شاخوں کی طرح سے بنو ربیعہ کی بھی شاخیں در شاخیں تھیں اور ہر شاخ میں کچھ نہ کچھ مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے۔ بنو کعب بن ربیعہ کے گھرانے میں دو مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے حضرات مُطرّف بن عبداللہ اور ان کے والد ماجد عبداللہ بن الشخیر اور بنو جعدہ بن کعب بن ربیعہ کے ایک مسلم کا ذکر کیا گیا ہے۔ بنو قشیر بن کعب بن ربیعہ کے گھرانے کے دو اہم مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت قرہ بن ہُبیرہ خاصے اہم شخص معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے قبیلہ کے عامل صدقات مقرر ہوئے تھے۔ ربیعہ کے آخری اہم گھرانے بنو عقیل بن کعب میں کم از کم تین مسلمانوں کے نام بصراحت مذکور ہیں[۵۶۵] مذکورہ بالا نسبتاً کافی مفصل بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو عامر بن ربیعہ کا قبیلہ بحیثیت مجموعی اسلام کا حلقہ بگوش بن چکا تھا اس خیال کی مزید تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے متعدد گھرانے اسلامی ریاست کو صدقات و محاصل ادا کرتے تھے[۵۶۶] لہٰذا یہ کہنا کسی طرح سے صحیح نہیں ہو گا کہ بنو عامر بن صعصعہ آخری عہد نبوی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور جو

ہوئے بھی تھے۔ ان کی تعداد بہت مختصر تھی۔[۵۹۰] یہ تبصرہ روشن حقیقت اور تاریخی حقائق سے دیدہ و دانستہ صرف نظر کرنے کے مترادف ہے۔

بنو عامر بن صعصعہ کے مکمل قبول اسلام کا مزید ثبوت اس کے مختلف خاندانوں / گھرانوں کے مدینہ منورہ آنیوالے وفود سے بھی ہوتا ہے۔ ابن سعد نے بنو عامر اور اس کے ذیلی گھرانوں کے کم و بیش آٹھ وفدوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں چھ وفود بنو کلاب اور اس کے گھرانوں بنو رئاش بن کلاب، بنو عقیل بن کعب، بنو جعدہ بن کعب، بنو قشیر بن کعب اور بنو البکاء سے آئے تھے اور انہوں نے سنہ ۹ھ / ۶۳۱ء کے برس مختلف زمانوں میں حاضری دی تھی۔[۵۹۱] اگرچہ ابن سعد نے بنو عامر بن صعصعہ اور اس کے گھرانے بنو ہلال کے وفود کی آمد کی تاریخ کا ذکر نہیں کیا ہے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سنہ ۱۰ھ / ۶۳۱-۳۲ء میں کسی وقت بارگاہ نبوی میں حاضری دی تھی۔ کیونکہ طبری نے اوّل الذکر کے وفد کی آمد کو سنہ ۱۰ھ کے برس کے واقعات میں شمار کیا ہے۔[۵۹۲] طبری ہی کے ایک اور بیان سے واضح ہوتا ہے کہ بنو عامر بن صعصعہ کا تقریباً پورا قبیلہ عہد نبوی میں مسلمان ہو گیا تھا۔[۵۹۳] ممکن ہے کہ چند مستثنیات ہوں لیکن یہ امکان خاصا معدوم ہے۔ اس بحث کے آخر میں ہوازن کے ایک اور خاندان عُرَینہ کے ایک اہم مسلمان صحابی حضرت عبد اللہ بن عوسجہ عرنی کا ذکر کر دیا جائے جو فتح مکہ کے قریب اسلام لا چکے تھے اور جن کو سنہ ۹ھ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو حارثہ بن عمرو بن قرط میں تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا تھا۔ اس خاندان کے ایک اور مسلمان حضرت رباح المستمتی کے سوا اور اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جان سکے ہیں۔[۵۹۴]

ہوازن کی دوسری اہم اور غیر اہم شاخوں میں بھی متعدد مسلمان ایسے تھے جو غزوہ حنین میں نبرد آزمائی سے قبل اسلام لا چکے تھے۔[۵۹۵] واقدی نے حضرت شجاع بن وہب کے سریہ سی (ربیع الاوّل سنہ ۸ھ / جولائی ۶۲۹ء) کے اپنے بیان میں ہوازن کے مسلمانوں کے ایک وفد کا حوالہ دیا ہے جو غالباً سب کے سب مسلمان تھے۔[۵۹۶] اس حوالہ کی اہمیت اس پس منظر میں بڑھ جاتی ہے یہ غالباً اسلامی ریاست سے ان کی وفاداری کا ایک اہم اظہار تھا۔ ہوازن کے ایک ابتدائی مسلمان حضرت اوس بن حدثان تھے جنہوں نے صلح حدیبیہ سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔[۵۹۷] اسی طرح ہوازن کے ایک ذیلی گھرانے بنو ثمالہ کے ایک فرد حضرت عمرو ثمالی ابتدائی دور کے مسلم تھے۔[۵۹۸] یہ حقیقت ہے کہ بطور ایک قبیلہ ہوازن اسلام کے دائرے سے کافی مدت تک باہر رہے تھے اور صرف غزوہ حنین کے بعد ہی اجتماعی طور سے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ غزوہ حنین کے موقعہ پر جو ہوازن کا اتحاد عظیم مسلمانوں کے خلاف قائم ہوا تھا۔ اس میں متعدد خاندان شامل نہیں ہوئے تھے۔ اور وہ اسلامی ریاست سے تصادم مول لینے کے حق میں نہیں تھے صرف چار بڑے خاندان مکمل طور سے شامل تھے اور یہ تھے بنو نصر، بنو جشم، بنو سعد بن بکر اور بنو ثقیف اور کچھ لوگ اور گروہ بنو ہلال / عامر بن صعصعہ کے بھی شامل ہو گئے تھے۔[۵۹۹] اس اتحاد عظیم میں شامل نہ ہونے والوں میں کعب اور کلاب کے اہم گھرانے تھے اور جنکی غیر موجودگی کو ہوازن کے دور بیں اور تجربہ کار قائدین نے میدان جنگ میں محسوس کیا تھا۔[۶۰۰] بہر حال شکست کے بعد یہ پورا عظیم گروہ اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا تھا۔ مآخذ کا صریح بیان ہے کہ قبیلہ بنو سعد بن بکر (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی ماں حلیمہ سعدیہ کا گھرانا)

قبول اسلام میں پیش پیش تھا۔ ان کا ایک وفد جو قبیلہ کے تمام مسلمانوں پر مشتمل تھا[518] ہوازن کے چھ ہزار قیدیوں کی رہائی کیلئے گفتگو کرنے کی غرض سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں جعرانہ میں حاضر ہوا تھا۔ ان کی دردمند درخواستوں نے تمام قیدیوں کی رہائی حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ رحمتِ نبوی کے اس عظیم الشان مظاہرے کا فطری تقاضا اور اثر تھا کہ بنو سعد بن بکر اسلام کے دائرے کے باہر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس کے مابعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے قومی ہیرو اور سردار اعظم حضرت مالک بن عوف نصری کو اسلامی دعوت کے ساتھ بڑی فیاضانہ اور معقول شرطیں پیش کی تھیں۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ حضرت مالک بن عوف نہ صرف خود مسلمان ہوئے بلکہ ان کے زیر اثر تمام قبیلے خاص کر ثمالہ، سلمہ اور فہم بھی اسی آن اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے اور وہ ان قبیلوں کے مسلمانوں کے سردار مقرر کر دیئے گئے[519] کچھ مدت کے بعد ہوازن کا پورا قبیلہ اسلامی امت کا رکن رکین بن چکا تھا۔

سنہ ۹ھ کے اواخر اور سنہ ۱۰ھ کے وسط تک ہوازن کے مختلف خاندانوں کے مکمل قبول اسلام کی کچھ دوسری شہادتوں سے بھی تائید ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے بہترین مثال بنو سعد بن بکر کے ایک نفری وفد کی ہے۔ ابن اسحاق کے مطابق حضرت ضمام بن ثعلبہ بارگاہ نبوی میں مدینہ حاضر ہوئے اور اسلام کے بارے میں چند سوالات پوچھے۔ آپ کے جوابات سے اتنے مطمئن ہوئے کہ فوراً اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ اپنے لوگوں میں واپس پہنچے اور اس زور و شور سے تبلیغ کی کہ "رات ختم ہونے سے قبل قبیلہ میں کوئی ایسا مرد یا عورت نہ تھی جو مسلمان نہ ہو گئی ہو"[520] بنو عامر بن صعصعہ کے مختلف وفود کے علاوہ ابن سعد نے ثمالہ اور حدان کے ایک مشترکہ وفد کا بھی ذکر کیا ہے جس نے فتح مکہ کے بعد بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر اسلام سے وفاداری کا اقرار و اظہار کیا تھا[521] یہ نکتہ قابل ذکر اور قابل غور ہے کہ اس وفد کی شہادت کی بنا پر ہوازن کے ایک طبقہ کے غزوہ حنین سے قبل قبول اسلام کا ثبوت ملتا ہے۔

ہوازن کے مکمل طور پر قبول اسلام کا ایک اور پکا ثبوت ہے ان کا مدینہ منورہ کی مرکزی حکومت کو پابندی اور خلوص کے ساتھ صدقات و محاصل ادا کرنا۔ ذکر آ چکا ہے کہ بنو عامر بن صعصعہ کے مختلف خاندانوں کے لئے عاملین صدقات مقرر کئے گئے تھے۔ اس طرح ہوازن سے بھی صدقات کی وصولیابی کے لئے متعدد افسروں کو بھیجا گیا تھا۔ بلاذری کے بقول حضرت مالک بن عوف نصری کو عجز ہوازن یعنی ترقیمہ قبیلہ ...... بنو جشم، بنو نصر، اور بنو سعد بن بکر ...... کا افسر محاصل مقرر کیا گیا تھا[522] جبکہ دوسرے مآخذ کا بیان ہے کہ حضرت عکرمہ بن ابی جہل مخزومی کو پورے ہوازن کا مرکزی عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا یہ تقرری سنہ ۹ھ کے آغاز اور سنہ ۱۰ھ کے وسط میں ہوئی تھی[523] بلاذری اور ابن اثیر کا یہ بیان خاصا اہم ہے۔ وہ ہوازن کے مجموعی طور سے اسلام کے دائرے میں داخلہ کو پوری طرح سے ثابت کرتا ہے۔

(ط) ثقیف

ہوازن کے عظیم گھرانے کا آخری رکن ثقیف تھا جو اپنی سماجی اور سیاسی برتری کے سبب قدر کی نگاہ سے پورے

عرب میں دیکھا جاتا تھا اور قریش مکہ سے ان کے بہت قریبی سماجی، ازدواجی اور اقتصادی تعلقات تھے۔ اسلام سے تعارف تو اس قبیلہ کا مکی عہد ہی میں ہو گیا مگر قبول اسلام کا سلسلہ ان کے بطور اجتماعی اکائی کے انکار کے باوجود شروع ہو گیا تھا اور انفرادی طور سے اس کے افراد نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ ابن حزم کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹ھ نبوی میں ثقیف کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیرحمانہ برتاؤ کے باوجود آپ ان سے قطعی مایوس نہیں ہوئے تھے اور اس کے کچھ دنوں بعد ہی آپ نے حضرت معتب بن مالک ثقفی کو ان میں تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا تھا۔ حضرت معتب نے ارشاد نبوی کے تعمیل اور تبلیغ اسلام کی راہ میں اپنی جان قربان کر دی اور اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں شہید ہوئے ۵۸۴ خون شہید کی سرخی رنگ لائی اور ثقیف کے ایک فرد حضرت ابو ملیح نے قبیلہ کے قبول اسلام سے کافی پہلے اسلام قبول کر لیا ۵۸۵ ممکن ہے کہ ان کی شہادت سے متاثر ہو کر اور لوگوں نے بھی اسلام قبول کر لیا ہو۔ مگر تاریخی مآخذ ان کے نام محفوظ رکھنے سے قاصر رہے ہیں۔ ثقیف کے ایک اور ابتدائی مسلمان حضرت معتب شہید کے اپنے بھتیجے حضرت مغیرہ بن شعبہ تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجل اصحاب میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے صلح حدیبیہ سے قبل کسی وقت اسلام قبول کر لیا تھا غالباً جنگ احزاب کے فوراً بعد ۵۸۶ قارب بن الاسود جو حضرت عروہ بن مسعود کے ایک بھتیجے تھے ایک اور ابتدائی مسلمان تھے جنہوں نے حضرت ابو ملیح کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا۔ لیکن ثقیف کے سب سے پہلے مسلمان غالباً حضرت عامر بن غیلان اور ان کے والد ماجد تھے اور دونوں مدینہ منورہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ یہ بھی اہم بات ہے کہ یہ دونوں مسلمان باپ بیٹے ثقیف کے ابتدائی مسلمان اور مبلغ حضرت معتب شہید کے فرزند ارجمند اور پوتے تھے۔ بعد کے زمانے کے دوسرے مسلمانوں میں حضرات عروہ بن مسعود، عمرو بن امیہ، ان کے عم زاد حکم بن عمرو، ابو عبید بن مسعود اور ان کے بھائی سعد اور آخری حضرت ابو محجن ثقفی تھے جو اپنے وقت کے ایک صف اول کے ثقفی شاعر تھے ۵۸۷ ابن سعد اور طبری کے بیانات کے مطابق غالباً رمضان ۹ھ / دسمبر ۶۳۰ء میں ثقیف کے ایک وفد نے جو دس اشخاص سے کچھ زیادہ پر مشتمل تھا۔ مدینہ پہنچ کر اسلام قبول کر لیا تھا ۵۸۸ اس کے فوراً بعد پورا قبیلہ ثقیف مسلمان ہو گیا تھا ۵۸۹

ان کے اسلام قبول کرنے کی مزید شہادت ثقیف کے لئے مختلف افسران وعمال صدقات کی تقرری سے فراہم ہوتی ہے۔ بلاذری کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثالف بن عثمان بن معتب ثقفی کو طائف اور الاحلاف کے صدقات وصول کرنے کے لئے متعین فرمایا تھا۔ ان تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں ثقیف مکمل طور سے اسلامی امت کے رکن، ریاست اسلامی کے شہری اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار بن چکے تھے۔ یہ بھی قابل ذکر و فخر بات ہے کہ ہوازن اور ثقیف دونوں وفات نبوی کے بعد ردہ کے پرآشوب زمانے میں بھی اسلام کے وفادار رہے تھے اور کسی نے بھی مرکز کے خلاف قبائل عرب کی بغاوت میں حصہ نہیں لیا تھا ۵۹۰

قیس عیلان کے اہم خاندانوں / بطون میں اشاعت ونشر اسلام پر کافی مفصل بحث کے خاتمے پر ایک دو لفظ ان کے ایک خاندان بنو غنی کے بارے میں بھی کہنا ضروری معلوم ہوتے رہے۔ اگرچہ ان کے قبول اسلام کے سلسلے میں بحث قریشی قبائل کے

ضمن میں آچکی ہے۔ تاہم یہاں بھی اس کا ایک حوالہ ضروری ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو مرثد کنازؓ غنوی اور ان کے تین، چار فرزندوں حضرات مرثد، انس و انیس وغیرہ جو حضرت حمزہ بن عبد المطلب ہاشمی کے حلیف اور دوست تھے۔ مکی عہد کے ابتدائی دور کے مسلمان تھے۔ امکان قوی یہی ہے کہ اس گھرانے کے اور بھی مسلمان تھے جن کا ذکر ہمارے مآخذ میں نہیں آسکا ہے خاص کر ان کے دوسرے مردوں، عورتوں اور بچوں کے نام نہیں مذکور ہوئے ہیں۔ لبعد میں حضرت مرداس بن خویلد ایک وفد میں بارگاہ نبوی میں مدینہ پہنچے تھے[591] یہ ناقابل یقین نہیں ہے کہ دوسروں نے بھی اسی زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔

اس پوری بحث سے بلا شک و شبہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہوازن کے مختلف قبیلے، خاندان اور گھرانے سب کے سب عہد نبوی میں مخلص، ثابت قدم اور کھرے مسلمان بن چکے تھے۔ اتنے ثابت قدم کہ ارتداد کے سیلاب میں جب اوروں کے پیر اکھڑ گئے تھے تو وہ اسلام کا پرچم بلند کئے ہوئے تھے۔

(ع) باہلہ

بنو باہلہ کا بھی تعلق مضر کے عظیم خاندان قیس عیلان سے تھا اور وہ بنو غنی سے زیادہ قریبی تعلقات رکھتے تھے[592]۔ اس کے مسلمانوں میں اہل سیر اور نسب نے جن لوگوں کو گنایا ہے ان میں حضرات اصمع اور ان کے والد ماجد مزہرؓ[593]، ابو امامہ بن الصّداع بن عجلان اور حرماس بن زیاد شامل ہیں[594] یہ سب غالباً بعد کے زمانے کے مسلمان تھے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ بنو باہلہ کے دو گروہ حضرت مُطَرِّف بن کاہن باہلی اور نَہشَل بن مالک باہلی کی قیادت میں فتح مکہ کے بعد کسی وقت اپنے وفود میں آئے تھے تاکہ اپنے اسلام کا اظہار و اعلان اور ریاستِ اسلامی سے اپنی وفاداری کا اقرار کریں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نامۂ مبارک بتاتا ہے کہ بنو باہلہ عہد نبوی میں مسلمان ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے قبائلی عامل صدقات کے ذریعہ جس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے مقرر فرمایا تھا۔ مرکزی حکومت کو اپنے تمام صدقات ادا کئے تھے[595]

(ف) بنو ہُذیل

بنو ہذیل بھی مکہ مکرمہ کے مشرق میں آباد بدوی قبائل میں سے ایک تھے[596] وہ قریش کے پڑوسی ہونے کے سبب ان کے ساتھ گہرے سماجی اور سیاسی تعلقات رکھتے تھے اور انہی اسباب کی بنا پر وہ اسلام سے مکی عہد قدیم ہی میں متعارف ہو گئے تھے۔ بنو ہذیل کے سب سے قدیم اور عظیم اور مشہور صحابی حضرت عبد اللہ بن مسعود ہذلی تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دار ارقم میں قیام سے قبل ۱۲ھ/۱۴-۶۱۳ء میں کسی وقت مسلمان ہوئے تھے[597] یہ یقینی امر اور تاریخی حقیقت ہے کہ ان کا پورا گھرانا مسلمان ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان کے دو بھائیوں حضرت عتبہ و عُمَیس، والدہ ماجدہ ام عبد اور ان کے ایک بھتیجے عمرو بن عمیس کو ابن حزم نے ابتدائی مکی مسلمانوں میں شمار کیا ہے۔ غالباً ان کے دو اور بھتیجے حضرات عبد اللہ اور عون، فرزندان عتبہ بھی ابتدائی زمانے کے مسلمان تھے۔ ان سب کا تعلق ہذیل کے خاندان بنو معاویہ سے تھا[598] یہ حیرت کی بات ہے،

کہ اہل سیر نے خود حضرت عبداللہ بن مسعود کے اہل و عیال کے قبول اسلام کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے حالانکہ تقریباً یہ یقینی ہے کہ ان کی آل و اولاد بھی ابتدائی دور کی مسلمان تھی۔ یہ حقیقت بھی یہاں بیان کرنا ضروری معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کا گھرانا مکہ میں قریش کے ایک خاندان کے حلیف کی حیثیت سے مقیم تھا اور بظاہر ان کا اپنے اصل قبیلہ سے تعلق قائم و استوار نہیں تھا۔ اس لیے ان کے قبول اسلام کا زیادہ اثر ان کے قبیلہ والوں پر شاید نہیں پڑا تھا۔

بہرحال مکہ اور قریش مکہ سے قربت کے سبب ان کے اسلام سے متعارف ہونے کے امکانات تھے اور قیاس کہتا ہے کہ مکی عہد میں بھی کچھ مسلمان بنو ہذیل کے اصل قبیلے اور ان کے بطون میں ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ بنو ہذیل کے ایک ذیلی گھرانے بنو طابخہ کے ایک ابتدائی مسلمان حضرت اسامہ بن عُمَیر کے ذکر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے[599] مزید واقدی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو ملیح ہذلی کے والد ماجد صلح حدیبیہ کے موقعہ پر موجود اور شریک جہاد تھے[600] ان تمام ابتدائی شہادتوں کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ بنو ہذیل کے ایک بڑے طبقے نے خاص کر خالد بن سفیان ہذلی کے زیر اثر گروہ نے اسلامی ریاست کی مخالفت جاری رکھی تھی۔ اور وہ فتح مکہ کے بعد اسلامی امت کے دائرے میں شامل ہوئے تھے[601]، کیونکہ ہم ان کو طائف کے محاصرہ کے دوران اسلامی لشکر میں موجود پاتے ہیں۔ امکان اور غالب امکان یہ ہے کہ وہ فتح مکہ سے قبل مسلمان ہو گئے تھے۔ اور غزوات فتح مکہ، حنین اور طائف میں ہم رکاب نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم تھے[602]

(ک) بنو طے

نسبی اعتبار سے بنو طے کا تعلق بنو کہلان بن سبا سے تھا[603] اور وہ اسد / خزیمہ کے پڑوس میں اجاء اور صعنا کے پہاڑوں کے نواحی علاقوں میں آباد تھے، جو مدینہ سے خاصی بڑی مسافت پر واقع تھے[604] واقدی کے ایک جملہ سے معلوم ہوتا ہے۔ بنو طے کے تمام بطون اور خاندان ایک دوسرے کے قریب قریب آباد تھے[605] لیکن اس مسافت اور دوری کے باوجود بنو طے نے حرمین شریفین کے لوگوں سے سماجی، سیاسی اور اقتصادی روابط استوار کر رکھے تھے۔ اور ان کے کچھ لوگ مکہ مدینہ میں آباد بھی ہو گئے تھے۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو طے کے دو شخصوں نے جو قریشی قبیلہ بنو مخزوم کے حلیف تھے مکی فوج میں شریک ہو کر مسلمانوں کے خلاف غزوہ بدر میں شریک ہونا بھی پسند کیا تھا[606] جبکہ حضرت سوید بن مخشی طائی نے جو مکی طائیوں میں مسلمان اور بنو عبد شمس / بنو امیہ کے حلیف تھے، مسلمانوں کی جانب سے شرکت کر کے بدری صحابی ہونے کا فیض و انعام پایا تھا[607]

بنو طے کے لوگوں نے قریش مکہ اور انصار مدینہ سے ازدواجی تعلقات بھی استوار کر رکھے تھے۔ حضرت طُلَیب بن عُمَیر بنو عبد بن قصی / قریش کی اہلیہ ایک طائی عورت تھی جو غالباً حضرت ولید بن زُہَیر طائی کی صاحبزادی تھیں۔ مؤخر الذکر طائی صحابی نے محرم ۴ھ / جون ۶۲۵ء میں قطن کے سریہ میں حضرت ابو سلمہ مخزومی امیر سریہ کی رہنمائی کے فرائض انجام دیئے تھے[608] اسی طرح کعب بن اشرف، مشہور یہودی شاعر، کا باپ قبیلہ طے کا تھا[609] جبکہ حضرت عبداللہ بن ربیع کی اہلیہ طائی تھیں، اور

ایک ابتدائی مسلمان بھی۔[۶۱۰]

ان اور ان جیسی دوسری متعدد مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو طے کے مختلف افراد کا اسلام سے تعارف مکی عہد قدیم سے ہو چکا تھا۔ اصل قبیلہ کے ایک ابتدائی مسلمان تھے۔ حضرت رافع بن ابی رافع طائی جنہوں نے بعد میں حضرت عمرو بن عاص کے زیر کمان سریہ ذات السلاسل میں حصہ لیا تھا[۶۱۱] یہ بات اہم ہے کہ سنہ ۹ھ/۶۳۰ء میں حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کی قیادت میں بنو طے کے قومی بت کو توڑنے کے لئے جو مہم الفلس گئی تھی۔ وہ ان کے خلاف واحد فوجی کارروائی تھی[۶۱۲] اس کے بعد ہی ان میں اسلام سرعت سے پھیلنے لگا تھا۔ اور ان کے کچھ مدت بعد ان کے قومی سردار حضرت عدی بن حاتم طائی کے قبول اسلام نے پورے قبیلے طے کو اسلامی امت کا مخلص و سرگرم و پائیدار رکن بنا دیا تھا[۶۱۳] ان میں سے معدودے چند لوگ اپنے پرانے مذہب عیسائیت پر بھی قائم رہے تھے۔ اور ان کو جزیہ کی ادائیگی کے بعد اسلامی ریاست کی جانب سے جان و مال کے مکمل تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی۔ ابن حزم نے بنو طے کے ہر گھرانے کے سربرآوردہ مسلمانوں کے نام بیان کئے ہیں[۶۱۴] سنہ ۱۰ھ/۶۳۱ء-۶۳۲ء میں کسی وقت قبیلہ طے کا ایک وفد مدینہ پہنچا تھا جس میں پندرہ افراد شامل تھے۔ اس وفد کے سردار و قائد حضرت زید بن مہلہل تھے جو اپنے باقی غیر مسلم طائیوں کو اسلام کے دائرے میں لانے کے سبب زید الخیر کے نام سے زیادہ معروف ہیں[۶۱۵] ان کے علاوہ مجموعۃ الوثائق میں محفوظ متعدد نامہ ہائے نبوی سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ بنو معاویہ، بنو جوین، بنو معن، بنو اجاء کے علاوہ متعدد دوسرے گھرانے بھی سنہ ۱۰ھ کے خاتمے سے قبل مسلمان ہو کر اسلامی امت کا جزو بن چکے تھے[۶۱۶]

بنو طے کے مکمل قبول اسلام کا ایک اور یقینی ثبوت ہے ان کے مختلف گھرانوں اور خاندانوں کے لئے صدقات کے افسروں کی تقرری۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عدی بن حاتم طائی کو پورے قبیلہ طے کا افسر اعلیٰ اور مصدق اعلیٰ مقرر فرمایا تھا اور وہی تمام قبیلوں اور گھرانوں سے صدقات وصول کر کے مدینہ پہونچاتے تھے[۶۱۷] یہ حضرت عدی بن حاتم طائی کی سوجھ بوجھ، لیاقت اور معاملہ فہمی اور صلابت ایمانی تھی جس نے بنو طے کے بعض مذبذب و شک و شبہ میں مبتلا طبقوں کو ردہ میں شریک ہونے سے نہ صرف روک دیا تھا۔ بلکہ حضرت خالد بن ولید مخزومی کی ماتحت اسلامی فوج کی زبردست فوجی خدمت کی تھی[۶۱۸] چنانچہ ان شواہد کی روشنی میں یہ یقینی طور سے کہا جا سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں قبیلہ طے پورا مسلمان ہو چکا تھا اور اس کے بعض غیر مسلم افراد بھی ریاست اسلامی کے کلی طور پر وفادار تھے اور یہی نہیں بلکہ وہ ردّہ کے پرآشوب و پرفتن زمانے میں بھی وفادار رہے تھے۔[۶۱۹]

مذکورہ بالا بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حرمین شریفین کے مشرق میں واقع و آباد قبائل عرب میں اسلام کی اشاعت، مکمل، ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھی۔ کوئی دیانت دار مؤرخ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسلام کی تاثیر صرف اوپری سطح تک محدود رہی تھی اور دلوں کی گہرائیوں میں اس کا اثر نہیں قائم ہوا تھا۔ مآخذ کا صاف و صریح بیان ہے اور جس کی تائید و شواہد و حقائق سے ہوتی ہے کہ ان مشرقی قبائل نے پورے خلوص، ایمانداری، اور صلابت کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا، اور

پھر اسلامی ریاست کے لیے شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ ان کے پختہ ایمان اور پکے عمل کا ایک اہم ثبوت ارتداد کے زمانے میں اسلام پر مضبوطی سے ان کا قائم رہنا ہے۔ یہ بڑی اہم تاریخی حقیقت ہے کہ بعض مشرقی قبائل جو نسبتاً بعد کے زمانے میں اسلام لائے تھے، ردہ کے زمانے میں ان بعض قبائل کے مقابلے میں زیادہ پختہ ایمان والے ثابت ہوئے تھے جو نسبتاً کچھ پہلے اسلام لا چکے تھے۔ مشرقی قبائل میں اشاعتِ اسلام کی تاریخی توقیت بڑی مختصر ہے۔ مکی عہد میں ان کے بعض افراد نے اسلام قبول کیا تھا۔ اور مدنی عہد میں جب مسلمانوں کے تعلقات ان سے قائم ہوئے تو ان کے گھرانے اور بطون مسلمان ہونے لگے۔ ان کے قبولِ اسلام میں ان کے اپنے دلوں کی خواہش کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی تبلیغی کوششیں بھی کارفرما رہی تھیں۔ بہر حال مہاجرین و انصار اور مغربی قبائل کے بعد مشرقی قبائل ہی چوتھے اہم عنصر تھے جنہوں نے اسلامی ریاست کے ارتقاء، تنظیم اور ترقی میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا۔

(۴) شمالی قبائل

شمالی قبائلِ عرب یا مدینہ منورہ کے شمال میں خاص کر وادی القریٰ اور شامی سرحد کے درمیان واقع علاقوں کے قبائل سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلقات اور ان کے بارے میں اسلام کی پالیسی اور اسلامی ریاست کا رویہ بعینہ وہی تھا جو مغربی قبائل یا مشرقی قبائل سے تھا۔ یا جو پالیسی آپ نے قریشی قبائل کے سلسلے میں اپنائی تھی۔ مآخذ سے بیشمار ثبوت اس بات کے ملتے ہیں کہ آپ کی حکمت عملی کی واحد بنیاد اسلام کی اشاعت تھی اور تمام قبائل کو مسلمان بنانا تھا اور اگر قبائلِ عرب میں سے کوئی گروہ، جماعت یا فرد اسلام قبول کرنا نہیں پسند کرتا تھا تو اس کو اسلامی ریاست کی بالادستی سیاسی بالادستی..... قبول کرنا اور اس کا ذمی بن کر رہنا ضروری تھا، اور اس اعتراف بالادستی میں مدینہ کو جزیہ ادا کرنا تھا۔ اس کے معاوضے میں اسلامی ریاست ان کو اللہ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذمہ (ذمہ داری، محافظت، ضمانت) عطا کرتی تھی اور ان کے تمام اندرونی سماجی اور مذہبی معاملات میں ان کو خود مختاری اور آزادی فراہم کرتی تھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پالیسی تمام قبائل عرب سے آپ کے تعلقات، معاہدات اور مہموں سے واضح ہوتی ہے شمالی قبائل میں اسلام کی نشر و اشاعت کی تاریخ، منہج اور رفتار سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شمالی قبائل کے بارے میں پالیسی بھی معلوم ہوتی ہے اور شمالی قبائل کا اسلام اور اسلامی ریاست کے ساتھ رویہ اور سلوک بھی۔ ذیل میں شمالی قبائل کا بھی اسی طرح الگ الگ تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جس طرح کہ دوسرے علاقوں کے قبیلوں کے بارے میں پیش کیا گیا ہے

یہ اب کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ شمالی قبائل بھی متعدد اور مختلف تھے جو خاصے بڑے وسیع علاقے میں آباد تھے اور ان کے بطون اور خاندانوں کے علاوہ ان کی بھی مزید ذیلی شاخیں تھیں۔ البتہ شمالی قبائل خاص کر شامی سرحدوں پر آباد قبیلوں کے بارے میں یہ جان لینا مفید ہو گا کہ وہ رومی سلطنت یا بازنطینی حکومت کے زیر اثر تھے

اوران کے بعض قبائل توان کے سیاسی وفادار ومحکوم اور باجگذار بھی تھے۔ غسان وغیرہ کی حکومتیں ان کی ماتحت (Vassal) حکومتیں تھیں۔ اگرچہ وہ نسلی اور نسبی اعتبار سے عرب تھے۔ مگر تمدن وتہذیب کے لحاظ سے بازنطینی رنگ میں رنگ گئے تھے۔ ان کا سیاسی نقطۂ نظر رومی سلطنت کی پالیسیوں کا آئینہ دار تھا۔ اگرچہ وہ اپنے رومی آقاؤں سے بعض معاملات میں رنجیدہ وناراض بھی تھے۔ مدتوں تک رومی سلطنت سے وابستہ رہنے کے سبب ان کے بعض قبائل پورے کے پورے عیسائی بن گئے تھے اور بعض دوسروں میں بھی عیسائیت نے خاصے مضبوط اثرات قائم کر لئے تھے۔ کچھ عرب قبیلے اور گروہ اپنے پرانے آبائی مذہب پر بھی قائم تھے۔ تیسرا اہم مذہبی عنصر یہودی قبیلوں کا تھا جو عددی اعتبار سے کافی چھوٹے اور سیاسی لحاظ سے غیر اہم تھے۔ سیاسی لحاظ سے ایک اور اہم عنصر یہ تھا کہ شمالی قبائل عموماً متحد ومنظم حکومتوں کے باشندے تھے۔ ان میں بصریٰ کی غسانی سلطنت اور دومۃ الجندل اور ایلہ کی بالترتیب کندی اور یہودی حکومتیں خاصی منظم تھیں۔ اول الذکر سیاسی اعتبار سے ایک قوت تھی اور اس کو رومی سلطنت خاص کر شام کی صوبائی حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ شمالی قبائل میں اسلام کی تاریخ اشاعت کے مطالعہ میں ان امور کا مدنظر رکھنا ناگزیر ہے۔

شمالی قبائل میں سے اہم ترین قبائلی وحدتیں اوران کے ذیلی بطون یہ تھے۔

(ا) **بنوقضاعہ :** (۱) بہراء (۲) بلی (۳) سعد ہذیم اور موخر الذکر کی شاخیں جیسے عذرہ، ضنّہ، حارث قین، خشین اور کلب، سلامان (جہینہ اور مہرہ بھی انہی کی دوسری اہم شاخیں تھیں جو بالترتیب مدینہ کے مغرب اور جنوب میں جاکر آباد ہوگئی تھیں) وغیرہ

(ب) **بنوجذام :** (۱) بنوضبیب

(ج) **بنولخم :** (۱) بنوحدس (۲) بنووار

(د) **بنوغسان** (۱) بنوثعلبہ ۶۲۰

اسلامی ریاست کے ارتقاء کے باب میں ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی اور فوجی حکمت کا جائزہ لے چکے ہیں اور اس سے ہمیں معلوم ہوچکا ہے کہ ان قبائل شمال سے اسلامی ریاست کے سیاسی تعلقات کس قسم کے تھے۔ کب سے شروع ہوئے اور کیونکر وہ اسلامی ریاست کے رکن بنے؟ اب ہم اسلام کی ان میں اشاعت کا جائزہ لے رہے ہیں۔

(ا) بنوقضاعہ

قضاعہ اصل میں ایک قبیلہ کے بجائے متعدد قبائل کے مجموعہ کا نام تھا۔ اس میں ابن حزم کے بقول جو قبیلے شامل تھے وہ یہ ہیں: بلی، بہراء، سعد ہذیم اور موخر الذکر کی متعدد ذیلی شاخیں جیسے عذرہ، ضنّہ، حارث، قین، خشین اور سلامان ان کے علاوہ کلب جو خاصا اہم اور طاقتور قبیلہ تھا۔ نسبی لحاظ سے سعد ہذیم ہی کا ایک بطن تھا۔ مدینہ کے مغرب اور جنوب مشرق میں دو قبیلے بالترتیب جہینہ اور مہرہ آباد تھے۔ ان کا بھی تعلق سعد ہذیم سے تھا۔ ان کے علاوہ بھی متعدد چھوٹے چھوٹے

گھرانے تھے جو نسبتاً غیر معروف ہیں۔[۶۲۱] بہرحال قضاعہ اتنا بڑا قبیلہ ہو گیا تھا کہ وہ اقتصادی و سیاسی ضروریات کے سبب ایک مقام پر سما نہیں سکتا تھا اور نہ ہی بطور ایک سماجی اور سیاسی وحدت کے کام کر سکتا تھا اس لیے وہ مختلف بطون اور ان کی متعدد شاخوں میں منقسم ہو گیا تھا اور ان کے بڑے بطون بجائے خود قبیلے بن گئے تھے۔ ان میں بعض دوسرے علاقوں میں ضرور منتقل ہو گئے تھے، تاہم اصل قبیلہ اپنے روایاتی علاقے میں آباد و متمکن رہا تھا۔ ان قبیلوں میں اشاعت اسلام کی تاریخ کے ضمن میں یہ کہنا شروع ہی میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شمالی قبائل خاص کر وہ جو مغربی بین الاقوامی شاہراہ تجارت کے قریب آباد تھے اسلام سے بہت ہی ابتدائی زمانے میں متعارف ہو گئے تھے، کیونکہ شام آنے جانے والے تجارتی کارواں اور مکہ کے معبد خانۂ کعبہ کو آنے والے حجاج بھی اس زمانہ میں خبروں کی اشاعت کا کام کرتے رہتے تھے۔[۶۲۲]

۱۱۔ بنو بلی

قضاعہ کے اس عظیم بطن کا بہت ہی قریبی سماجی اور ازدواجی تعلق قریش مکہ اور انصار مدینہ سے قدیم زمانے سے قائم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قریش مکہ کے زیادہ تر تعلقات ازدواجی نوعیت کے تھے جبکہ انصار مدینہ ... اوس و خزرج نے حلف اور دوستی کے تعلقات زیادہ استوار کئے تھے، چنانچہ ماخذ سے اس کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ کئی صحابہ کرام میں سے متعدد حضرات کی مائیں اور بیویاں بنو بلی سے تھیں، جبکہ انصار کے بلوی حلیف اسلام اور اسلامی ریاست کے حلیف بن گئے تھے[۶۲۳] ایک مطالعے سے مدینہ کے دونوں انصاری قبیلوں کے کم از کم اٹھارہ بلوی حلفاء کے نام معلوم ہوتے ہیں۔[۶۲۴] ظاہر ہے کہ یہ بلوی حلیف انصاری قبیلوں کے متعدد و مختلف گھرانوں سے متعلق تھے۔

چنانچہ یہ فطری امر تھا کہ انصاری افراد کے ساتھ ساتھ ان کے بعض بلکہ اکثر حلیف بھی ان کے ساتھ اسلام کے حلقہ بگوش بنے۔ ان میں سے بعض حلیف یقیناً اپنے علاقوں کو چھوڑ کر مدینہ آ بسے تھے۔ مگر ان کی اکثریت اپنے روایتی علاقوں میں آباد و مقیم رہی جو اکثر و بیشتر مدینہ آتی رہتی تھی، جیسا کہ ماخذ سے معلوم ہوتا ہے۔ ذی قعدہ ۴ھ/اپریل ۶۲۶ء میں بدر الموعد کے موقعہ پر حضرت نعیم بن مسعود اشجعی نے قریشی سالار افواج ابو سفیان بن حرب اموی کو اطلاع دی تھی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف بدوی قبائل .... جہینہ اور بلی .... وغیرہ کے سپاہی آپ کی دعوت پر مدینہ پہنچ چکے ہیں اور وہ آپ کے ہمرکاب بدر کی جانب کوچ کرنے والے ہیں۔ اس اطلاع پر قریشی لشکر بڑی سرعت سے پسپا ہو گیا تھا۔[۶۲۵] اس واقعہ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اسلام نے بنو بلی میں اپنے ماننے والوں کی خاصی بڑی آبادی بنا لی تھی۔ مذکورہ بالا بلوی مسلمانوں کے علاوہ ابن حزم نے اس قبیلہ کے بعض اور مسلمانوں کے نام گنائے ہیں۔ ان میں حضرات کعب بن عُجرہ، عبداللہ بن اسلم، سہل بن رافع، ان کے عم زاد طلحہ بن براء، عبداللہ بن زیاد، عبدہ بن مُعتّب اور ان کے فرزند شریک اور عبدالرحمن بن عدیس شامل ہیں۔[۶۲۶] ظاہر ہے کہ ان مسلمانوں کے لواحقین اور متبعین بھی اسلام لائے تھے۔ اس طرح یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں ہوگا کہ بنو بلی کا معتدبہ حصہ ۶ھ/۶۲۸ء[۶۲۷] تک یا اس کے اواخر تک اسلام لا چکا تھا۔

اگرچہ بعد کے زمانے میں بلی کے قبیلہ کے بارے میں ماخذ کا یہ تبصرہ بھی ہم پاتے ہیں کہ وہ اسلامی ریاست کے دشمنوں کی صفوں میں شامل تھا تاہم یہ یقینی ہے کہ پورے قبیلے نے نہیں بلکہ اس کے ایک حصے نے اسلامی ریاست کی مخالفت کی تھی۔ ایک دلچسپ حقیقت غزوہ موتہ کے ضمن میں سامنے آتی ہے۔ اگرچہ مخالف فوج کی کمان بلی کے ایک شخص مالک کے ہاتھوں میں تھی۔ مگر قبیلہ کے مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کا ماخذ ذکر نہیں کرتے ہیں۔[۱۲۷] اس کے علاوہ ماخذ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غزوہ موتہ کے صرف ایک ماہ بعد غزوہ ذات السلاسل میں مسلمانوں کو قبیلہ بلی وغیرہ سے فوجی اور سیاسی امداد کی توقع تھی جو بہرحال پوری ہوئی تھی۔[۱۲۸] اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بلی کا کم از کم ایک طبقہ مسلمانوں کے ساتھ اور اسلامی ریاست کا حامی تھا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ اسلامی ریاست کو شمالی علاقوں کے متعدد قبائل کے خلاف فوجی کارروائی کرنی پڑی تھی۔ مگر قبیلہ بلی کے خلاف ایک بھی مہم مدینہ سے نہیں بھیجی گئی تھی۔ واقدی کا بیان ہے کہ غزوہ تبوک کے دوران بلی کی ایک نیک دل اور غالباً مسلمان خاتون نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پانی فراہم کیا تھا۔[۱۲۹] بہرحال یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بلی کا ایک حصہ شمالی عرب کے اس قبائلی اتحاد میں بھی شریک تھا۔ جس نے غزوہ تبوک کے لئے محرک فراہم کیا تھا۔[۱۳۰]

سیاسی تعلقات کی نوعیت یہ تھی اور اسلام کی اشاعت کا انداز جداگانہ تھا۔ وہ رفتہ رفتہ بنو بلی میں بھی پھیل رہا تھا اور ان کی صفوں میں خدا اور رسول کے ماننے والے بنا رہا تھا۔ ابن سعد نے بلی کے کم از کم چار مسلمانوں کو اپنی اس فہرست میں شامل کیا ہے۔ جو فتح مکہ سے قبل اسلام لا چکے تھے۔ ان کے اسمائے گرامی تھے۔ حضرت (۱) رویفع بن ثابت جو کبھی کبھی آکر جناب میں مقیم ہوتے تھے۔ انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور پھر صحبت نبوی سے محروم ہونا پسند نہیں کیا۔ وہ حدیث کے مشہور راوی بھی تھے (۲) حضرت ابو الشموس جو اکثر و بیشتر جحق نامی مقام پر سکونت رکھتے تھے (۳) حضرت ابوامامہ بن ثعلبہ جو حضرت ابوبردہ بن نیار مشہور صحابی رسول کے عم زاد تھے۔ (۴) حضرت عبداللہ بن حیفی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ حدیبیہ میں شریک رہے تھے[۱۳۱] ظاہر ہے کہ ان کے علاوہ اور نہ جانے کتنے مسلمان اس عہد کے تھے۔ جن کے نام ماخذ میں آنے سے رہ گئے اس خیال کی تصدیق حضرت ابو بردہ بن نیار کے ضمنی ذکر سے بھی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ غزوہ تبوک کے کوئی تین ماہ پہلے بلی کا ایک وفد حضرت ابو الضباب کی قیادت میں مدینہ پہنچا تھا جس میں قبیلہ کے تقریباً تمام سربرآوردہ مسلمان شامل تھے[۱۳۲] یہ تمام شواہد غزوہ تبوک سے قبل بلی کے خاصے بڑے حصے کے قبول اسلام کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ان کے قبولِ اسلام کی ایک اور حتمی شہادت اسلامی ریاست کو ان کی صدقات کی ادائیگی ہے۔ ماخذ کے مطابق ۹ھ؍ ۶۳۰ء میں مدینہ سے جو عاملین صدقات بھیجے گئے تھے۔ ان میں بلی کے لئے بھی افسر صدقات شامل تھے بلاذری کے مطابق خود قبیلہ بلی کے نمائندے حضرت الاعجم بن سفیان کو ان کا افسر صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ صحابی موصوف نہ صرف اپنے قبیلہ والوں سے بلکہ دوسری روایات کے مطابق عذرہ اور سلامان اور بنو کلب کے قبیلوں سے بھی صدقات وصول کر کے مدینہ پہنچاتے تھے[۱۳۳] ماخذ میں ایک نامہ نبوی کا متن محفوظ ہے۔ جس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی

کے ایک خاندان بنی جعیل کو نہ صرف بعض محاصل کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا تھا۔ بلکہ ان کو بنو نصر، بنو سعد بن بکر، بنو ثمالہ اور ہذیل کے سعایہ (محاصل) سے بھی ایک حصہ کا مستحق قرار دیا تھا[۴۳۴] اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ بنو جعیل کے اس مختصر سے گھرانے کے افراد نے ان مذکورہ بالا ہوازنی قبائل سے صدقات کی وصولیابی میں مدد کی تھی۔ اس معاہدہ یا نامہ نبوی پر بنو جعیل کے نمائندوں کی حیثیت سے چار مسلمانوں نے بطور گواہ دستخط کئے تھے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم یہ حقیقت ہے کہ مذکورہ بالا قبیلہ / خاندان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندان عبد مناف / قریش کے ایک گھرانے (رھط) کا مرتبہ عطا فرمایا تھا[۴۳۵] غالباً اس کے دو سبب تھے اول یہ کہ انہوں نے ریاست اسلامی کی بے انتہا خلوص سے مدد کی تھی۔ اور دوم یہ کہ وہ خاندان نبوی / بنو عبد مناف کے قریبی حلیف اور دوست بھی تھے جس طرح کہ خزاعہ تھے۔ بہر حال کچھ بھی صورت حال رہی ہو۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پہ اٹل ہے کہ اسلام نے عہد نبوی میں بنو بلی کے مختلف خاندانوں پر اپنی انمٹ چھاپ چھوڑی تھی۔ جو ان کے مکمل قبول اسلام کا سبب اور محرک بنی تھی۔

(۲) بنو بہراء

بنو بہراء بھی بلی کی مانند قریش مکہ اور انصارِ مدینہ سے قریبی سماجی اور ازدواجی روابط رکھتے تھے[۴۳۶] اگرچہ حضرت مقداد بن عمرو بہرانی قریش کے قبیلہ بنو زہرہ کے حلیف تھے۔ تو حضرت عتبہ بن ربیعہ انصار کے قبیلہ بنو نجار کے خاندان بنو لوذان سے اسی قسم کے تعلقات رکھتے تھے[۴۳۷] ظاہر ہے کہ دونوں اپنے اپنے زمانے کے ابتدائی مسلمان تھے۔ وہ دونوں بدری صحابی تھے۔ انتہائی اہم اور مستحکم قرائن ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف وہ دونوں ابتدائی مسلمان تھے بلکہ ان کے قبول اسلام کا اثر ان کے قبیلہ والوں پر بھی پڑا تھا[۴۳۸] ان کے اثرات کے علاوہ اسلام نے اپنی سادگی اور تعلیمات سے بھی بہراء کے متعدد لوگوں کو ۷ھ / ۸ھ ۶۲۸-۲۹ء تک حلقہ بگوش بنا لیا تھا۔ اس برس حسمیٰ کو جانے والی مہم کے امیر حضرت زید بن حارثہ کے بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافی پہلے مسلمان ہو گئے تھے[۴۳۹] اس کی مزید تصدیق ان کے وفد سے ہوتی ہے جو تیرہ سربرآوردہ اشخاص پر مشتمل تھا اور ۹ھ کے آغاز میں مدینہ پہنچا تھا۔ تمام اراکین وفد نے نہ صرف اپنے اسلام کا اعتراف و اظہار کیا تھا۔ بلکہ اپنے قبیلہ والوں کی بھی نمائندگی کی تھی[۴۴۰] اگرچہ بہراء کے قبول اسلام کی مکمل تفصیلات حاصل نہیں ہیں تاہم غزوہ تبوک میں مخالف اتحاد میں ان کی عدم موجودگی سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ پورے کے پورے اسلامی امت میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ان کے خلاف کوئی خاص فوجی کارروائی نہیں کی گئی تھی

۳۔ سعد ہذیم

قضاعہ کے عظیم قبیلے کا یہ اہم ترین بطن / خاندان خود کئی قبیلوں کا مجموعہ بن چکا تھا جن میں عذرہ اور سلامان کے بڑے خاندانوں کے علاوہ دو چھوٹے گھرانے بنو ضنہ اور بنو حارث بھی شامل تھے۔[۴۴۱] مؤخر الذکر دونوں بنو عذرہ کے حلیف اور دوست تھے۔ سعد ہذیم کے ان خاندانوں پر الگ الگ بحث دلچسپ بھی ہوگی اور مناسب بھی۔

بنو عذرہ ابن حزم کے بقول یہ بطن بجائے خود کئی بطون کا مجموعہ تھا[642] بنو الحارث اس کے حلیف تھے اور وہ بھی اس کے ساتھ اس طرح زیر بحث آتے ہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال عذرہ بھی بلی اور بہراء کی مانند خاندانی سماجی اور ازدواجی تعلقات مکہ اور مدینہ والوں سے رکھتے تھے[643] متعدد مکی اور مدنی حضرات کے حلف اور دوستی کے تعلقات زمانہ قدیم سے بنو عذرہ کے لوگوں سے تھے[644]

ان قدیم تعلقات کے پیش نظر یہ قیاس بالکل بجا معلوم ہوتا ہے کہ بنو عذرہ بھی اسلام اور اسلامی ریاست سے ابتدائی زمانے میں ہی متعارف ہو گئے تھے۔ ابن سعد نے عذرہ کے تین مسلمانوں..... حضرات خالد بن عرفطہ، حمزہ/حمرہ بن نعمان اور ابو خزامہ ...... کو فتح مکہ سے قبل اسلام قبول کرنے والے صحابہ کی فہرست میں شامل کیا ہے[645] لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے، کہ عذری مسلمانوں نے اتنی تاخیر سے اور بعد کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت خالد بن عرفطہ مکی باشندے اور قریش کے خاندان بنو زہرہ کے حلیف تھے۔ اس لئے ان کا اسلام فتح مکہ سے کافی پہلے کا واقعہ ہے۔ دوسرے مآخذ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ابن سعد کی فہرست مسلمانانِ عذرہ میں ابن حزم نے چار مزید مسلمانوں کا نام شامل کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضرات ثعلبہ بن ہوذ، زمیل بن عمرو، ثعلبہ بن سعیر اور مؤخر الذکر کے صاحبزادے عبداللہ بھی صحابہ کرام میں شامل تھے[646] لیکن عذرہ کے سب سے نمایاں اور ممتاز صحابی حضرت قضاعی بن عمرو تھے۔ جنہوں نے مختلف قبائل عرب سے صدقات کی وصولیابی کی خدمت اسلامی ریاست کے لئے انجام دی تھی۔ اور قبیلہ نبہطے اور بنو اسد کے علاقوں پر مرکزی منتظم بھی تھے[647] بنو عذرہ کے دوسرے اہم ترین مسلمان حضرت قطبہ بن قتادہ تھے۔ جنہوں نے موتہ کے غزوہ میں مسلمان فوج کے میمنہ (دائیں بازو) کی کمان کی تھی۔[648]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی ریاست سے بنو عذرہ کے تعلقات کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ اسلامی افواج کی رہبری کے لئے جن دلیل (راہبروں) کی خدمات حاصل کی گئی تھیں ان میں سے متعدد حضرات کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔ ایک مسلمان صحابی حضرت مذکور تھے۔ جو شہ عشرت[?] ۶۲۶ء میں غزوہ دومۃ الجندل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے راہبر تھے۔ انہوں نے بطور طلیعہ بھی اسلامی فوج کے لئے خدمات انجام دی تھیں[649] اسی طرح دو مزید عذری مسلمانوں کا ذکر واقدی نے کیا ہے، جنہوں نے سریہ حسمیٰ اور غزوہ تبوک میں شرکت بھی کی تھی اور راہبری کی سعادت بھی حاصل کی تھی[650] دوسری مہم کے دوران واقدی نے ایک عذری بدو کے قبول اسلام کا بھی حوالہ دیا ہے۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے تھے[651] ان تمام شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت نبوی کے بعد ہی سے بنو عذرہ کے متعدد لوگ اسلام کی طرف راغب ہونے لگے تھے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو عذرہ اور سعد ہذیم سے جو معاہدے کئے تھے۔ ان سے بھی ان کے قبول اسلام کی صراحت ہوتی ہے۔ حضرت زمیل بن عمرو عذری کے نام ایک نامۂ رسالت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابی موصوف کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو عذرہ کے غیر مسلم طبقات کے لئے مبلغ خاص بنا کر بھیجا تھا۔ اس سے مزید یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنو عذرہ کا ایک معتد بہ حصہ پہلے ہی مسلمان ہو چکا تھا[652] دوسرا نامہ نبوی جو جذام اور سعد ہذیم کے قبیلوں کے نام مشترکہ طور سے بھیجا گیا تھا۔ ان کے قبول اسلام کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے۔ کیونکہ وہ ان کو صدقات سے متعلق فرائض کی تعلیم دیتا ہے۔

اور ان کو صدقہ اور خمس کی وہ قاصدان نبوی حضرت اُبی بن کعب اور عنبسہ یا ان دونوں کے نمائندوں کو ادائیگی کا حکم دیتا ہے۔[653] یہ امر کہ بنو عذرہ اور سعد ہذیم یا قضاعہ کے دوسرے خاندانوں / بطون نے حقیقتاً اپنے صدقات مدینہ کو ادا کر دیئے تھے، متعدد شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے حضرت الاعجم بن سفیان بلوی عذرہ، سلامان، بلی اور کلب کے مرکزی عامل صدقات تھے جنہوں نے اپنے قبیلوں سے صدقات وصول کر کے بارگاہ نبوی میں پہنچائے تھے۔[654] اس کے علاوہ بنو عذرہ کے ایک سردار حضرت حمزہ کے بارے میں ابن سعد وغیرہ کا بیان ہے کہ وہ حجاز سے پہلے مسلمان تھے۔ جو اپنی قوم کے صدقات لیکر مدینہ منورہ پہنچے تھے۔[655] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شاید انہی خدمات جلیلہ کے عوض وادی القریٰ میں ایک عظیم قطعیہ عطا فرمایا تھا۔ جہاں اپنی زندگی بھر سکونت پذیر رہے تھے۔ مزید براں واقدی کا ایک تبصرہ صاف بتاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبوک سے واپسی کے بعد سعد ہذیم اکثر و بیشتر مسلمان ہو گئے تھے۔[656] مزید تصدیق ان وفود کی آمد سے ہوتی ہے جو بنو عذرہ، سلامان، سعد ہذیم اور دوسرے قضاعی خاندانوں اور گھرانوں سے بارگاہ نبوی میں پہنچے تھے۔ سعد ہذیم کا وفد متعدد افراد (نفر) پر مشتمل تھا جبکہ بنو عذرہ کے وفد میں بارہ حضرات شامل تھے اور یہ دونوں وفود سنہ ۹ھ کے آغاز میں مدینہ پہنچے تھے ان تینوں میں سلامان کا وفد سب سے آخری تھا۔ جو شوال سنہ ۱۰ھ / جنوری ۶۳۲ء میں مدینہ آیا تھا اور جس میں سات حضرات شامل تھے۔ اس وفد کے سربراہ حضرت حبیب سلامانی تھے۔[657] بہر حال ان شواہد کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سعد ہذیم کے بیشتر لوگ سنہ ۹ھ کے اواخر تک قطعی طور سے اسلامی امت میں داخل ہو چکے تھے۔

اگرچہ قضاعہ کے چھوٹے ذیلی گھرانوں کے بارے میں معلومات کم ملتی ہیں۔ تاہم اتنے قرائن ضرور ملتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اہم اور بڑے بطون کی مانند وہ بھی اسلام کے حلقہ میں داخل ہو چکے تھے۔ واقدی کا بیان ہے کہ قضاعہ کے دوسرے بطون کے علاوہ ایک چھوٹے خاندان بلقین سے بھی مسلم فوج کو ذات السلاسل کے دوران مدد کی توقع تھی اور حقیقتاً وہ ملی بھی تھی۔[658] بہر حال اس قبیلہ کے کسی ابتدائی مسلم کا ذکر عام طور سے نہیں ملتا ہے۔ لیکن ان کے بعد کے زمانے کے کئی مسلمانوں کا تذکرہ مسلمان افواج کے ذیل میں ملتا ہے۔[659] بنو جرم میں کم از کم تین مسلمانوں کا ذکر ابن حزم نے کیا ہے۔ ان میں سے حضرت ہوذہ بن عمرو اور حضرت اسمع بن ربان عاقل و بالغ مرد تھے۔ لیکن حضرت عمرو بن سلمہ سات سالہ نابالغ بچے تھے۔ لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ اپنی کم عمری کے باوجود قرآن مجید کے سب سے بڑے حافظ و عالم تھے۔ اس لئے اپنے قبیلہ کے مسلمانوں کی امامت وہی فرماتے تھے۔[660] اس واقعہ کے ایک ٹکڑے سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ مردوں اور عورتوں کی خاصی بڑی تعداد اس خاندان کی مسلمان ہو چکی تھی۔ ایک اور چھوٹے گھرانے بنو البرک بن وبرہ کے صرف ایک مسلم کا ذکر مل سکا ہے۔ جو انصار کے حلیف تھے اور مدینہ میں سکونت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے سرپرست قبیلہ کے لوگوں کے ساتھ بیعت عقبہ ثانیہ میں شرکت کی تھی۔ اور اس لحاظ سے وہ مکی عہد کے ابتدائی مسلم تھے۔[661] جبکہ بنو خشین کے دو مسلم صحابیوں حضرات ابو ثعلبہ خشنی اور عمرو بن مخزوم خشنی کا ذکر ملتا ہے لیکن ان کے زمانہ قبولِ اسلام کے بارے میں کچھ نہیں مذکور ہوا ہے۔[662] بہر حال ابن سعد کا بیان ہے کہ اس چھوٹے سے قبیلہ / خاندان کا سات آدمیوں پر مشتمل ایک وفد حضرت ابو ثعلبہ خشنی کی قیادت

میں غزوہ خیبر سے کچھ پہلے یا اس کے فوراً بعد بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا تھا[۶۶۳] اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم یہ سات حضرات صلح حدیبیہ کے بعد کسی وقت مسلمان ہو چکے تھے۔ بنو جرم کا دو نفری وفد فتح مکہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تھا۔[۶۶۴]

اس کے علاوہ اسد الغابہ کا واضح بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری برس تک قضاعہ کا پورا قبیلہ حضرت جرثوم بن ثعلبہ جیسے دعاۃ و مبلغین نبوی کی انتھک کوششوں کے نتیجے میں، اسلامی امت کا جزو بن چکا تھا[۶۶۵]

بنو کلب

قضاعہ کا آخری بڑا خاندان کلب تھا جو بجائے خود قبیلہ بن چکا تھا۔ اس کے بعض افراد اسلام کے مکی عہد قدیم میں خدا کے پیغام سے متعارف ہو چکے تھے۔ اس کے سب سے بڑے صحابی مسلم حضرت زید بن حارثہ تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار مولیٰ اور ابتدائی تین چار مسلمانوں میں سے تھے[۶۶۶] ان کے قبول اسلام کے سلسلے میں یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے قبیلہ کے نمائندے نہیں تھے کیونکہ وہ اپنے وطن، علاقہ اور قبیلہ سے دور مکہ کے باسی بن چکے تھے۔ یہ صحیح ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے والد محترم کی مکہ کی ناکام زیارت یا دوسرے زائرین اور تاجروں کی مکہ آمد نے بنو کلب کو اسلام سے آغاز عہد اسلامی ہی میں روشناس کر دیا تھا۔[۶۶۷] بہرحال مقامی کلبی مسلمانوں میں حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی کا نام کافی ممتاز اور اہم نظر آتا ہے اور ابن سعد کے ایک فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکی عہد میں کسی وقت اسلام لا چکے تھے۔ ابن سعد کا ان کو ان صحابہ کرام میں شامل کرنا جو عہد قدیم میں اسلام لا چکے تھے۔ (اسلموا قدیماً) اور پھر یہ اصرار کرنا کہ وہ مسلمان تو ہو چکے تھے، مگر بدر میں شریک نہیں ہو سکے۔ ان کے قدیم مسلم ہونے کا کافی ثبوت ہے۔ واقدی کے ایک بیان سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔[۶۶۸] بنو کلب کے ایک اور ابتدائی مسلمان حضرت نُمیلہ کلبی تھے، جن کا اوّل ذکر عام طور سے ماخذ ان مجاہدین کی فہرست میں کرتے ہیں، جن کو خیبر کی پیداوار سے عطیہ نبوی ملا تھا[۶۶۹] دوسرے مسلمانوں میں جو غالباً بعد کے زمانے سے تھے، حضرت عثمان بن عفان کی اہلیہ حضرت نائلہ بنت فرافصہ اور ان کے مذکورہ بھائی حضرت ضب تھے۔ ان کے علاوہ قطن بن صغیر بھی بعد کے زمانے کے مسلمان تھے[۶۷۰] بہرحال بنو کلب میں انفرادی قبول اسلام کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، لیکن یہ قیاس کرنے کی خاصی بنیاد موجود ہے کہ اس قبیلہ کے خاصے لوگ اسلامی امت کے رکن عہد نبوی ہی میں بن چکے تھے۔

بنو کلب کے اسلامی امت میں ادغام و شمولیت کا ایک یقینی ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے سریہ دومۃ الجندل (شعبان ۶ھ / دسمبر ۶۲۷ء) کے دوران اسلام قبول کر لیا تھا اور ان کے سردار حضرت اصبغ بن عمرو کلبی کا اکثر قبیلہ اسلامی امت کا رکن بن گیا تھا، جبکہ باقی ماندہ نے جزیہ کی ادائیگی کا وعدہ کر کے ذمی مقام کو قبول و پسند کیا تھا[۶۷۱] اس کے علاوہ ۹ھ / ۶۳۰ء میں بنو کلب کے مسلمانوں نے مرکزی عامل صدقات کو جو عذرہ، بلی، سلامان اور کلب کے لئے مشترکہ طور پر مقرر کیا گیا تھا اپنے اپنے واجب الادا محاصل بھی ادا کئے تھے[۶۷۲] اس

سے پہلے فتح مکہ کے بعد کسی وقت ان کا چار نفری وفد بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں مدینہ حاضر ہوا تھا[۶۷۳] بلاذری نے بنو کلب سے صدقات کی وصولیابی کے لئے ایک دوسری دلچسپ روایت بھی بیان کی ہے۔ اس کے مطابق بنو کلب کا کوئی مناسب شخص کلب سے صدقات کی وصول کے لئے نہیں مل سکا تھا۔ اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کو غالباً ان کے بنو کلب سے ازدواجی تعلقات کے پیش نظر ان کا افسر صدقات مقرر کر دیا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن نے یہ فرض بنو کلب کے اس حصہ کے لئے انجام دیا تھا جو دومۃ الجندل کے پاس آباد تھا[۶۷۴]

آخر میں ان متعدد نامہائے نبوی پر بھی نظر ڈال لی جائے جو مختلف طبقات کلب جیسے باشندگان دومہ اور جناب، عمائر کلب اور ان کے سفار معاونین اور عام مسلمان پیروؤں کے نام ہیں۔ ان تمام خطوط گرامی میں مکتوب الیہم کو مسلمانوں کی طرح بیان کیا گیا ہے اور ان سے اوقات مقررہ پر نمازیں پڑھنے اور اس کے تمام حقوق کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے اس سے پہلے اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ بنو کلب کی غالب اکثریت نے اپنا پرانا مذہب عیسائیت ترک کر دیا تھا اور مخلص و پکے مسلمان بن گئے تھے[۶۷۵] بنو کلب کے ضمن میں اس کا احتمال ہے کہ کچھ افراد یا چھوٹے موٹے گروہ اسلام کے دائرے سے عہد نبوی میں باہر رہ گئے ہوں اور بعد میں کسی وقت مسلمان ہوئے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ بنو کلب کا معاملہ اس کے قطعی برعکس معلوم ہوتا ہے جو واٹ نے بڑے جوش و خروش سے ثابت کرنا چاہا ہے[۶۷۶]

(ب)۔ بنو جذام

ماخذ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جذام کا کم از کم ایک طبقہ ذوالمردہ اور حسمی کے ارد گرد آباد تھا[۶۷۷]۔ یہ دونوں علاقے ابن سعد کے مطابق وادی القریٰ سے پار تھے[۶۷۸] بقیہ حصہ یا حصے شامی سرحدوں کے قریب آباد تھے اور وہ بنو جذام قضاعہ اور اس کے متعدد بطون خاص کر سعد ہذیم اور عذرہ کے پڑوسی تھے۔ ابن حزم مزید صراحت کرتے ہیں کہ وہ حجاز کے بالائی علاقے ایلہ کے نواح میں رہتے تھے۔ نسبی لحاظ سے ان کا تعلق جنوبی عرب کے ایک قدیم قبیلے بنو اُدد بن زید سے تھا لیکن وہ زمانہ جاہلیت میں کسی وقت شمال میں جنوب سے آکر بس گئے تھے۔ جیسے کہ قضاعہ بھی جنوبی عرب کے باشندے تھے اور نقل مکانی کر کے شمالی علاقے میں سکونت پذیر ہوئے تھے[۶۷۹]

بنو جذام میں غالباً اسلام کا داخلہ مدنی عہد کے دوسرے حصہ میں ہوا تھا۔ جبکہ ان کا ایک ذیلی گھرانا بنو ضبیب سنہ ۶ھ کے وسط اور سنہ ۷ھ کے اواخر میں اسلام لایا۔ یہ بنو ضبیب ہی تھے۔ جنہوں نے سرکشی اور باغی ھُنید بن عارض اور اس کے فرزند کو سفیر رسول حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی کے سامان کو جن میں قیصر کے دیئے ہوئے تحائف بھی تھے واپس کرنے پر مجبور کیا تھا۔ واقدی کے مطابق اس باغی اور لٹیرے کو سزا دینے والی جماعت میں کم از کم دس آدمی شامل تھے اور ان کے سردار حضرت نعمان بن ابی جعال تھے جو قبیلہ کے ایک عظیم جنگجو اور ماہر تیر انداز تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو ضبیب کی کارروائی کی اطلاع نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ آپ نے حضرت زید بن حارثہ کلبی کی قیادت میں ایک تادیبی جماعت بھیجدی۔

جس نے غلطی سے ان مسلمانوں طبقوں پر حملہ کر کے ان کو خاصا جانی اور مالی نقصان پہنچایا۔ جو اسلام کے وفادار تھے چنانچہ تلافی مداوا میں ستم رسیدہ مسلمان طبقات کا ایک وفد حضرت زید سے ملا جس میں متعدد حضرات جیسے حبان بن مولہ اور ان کے فرزند، ابو زید بن عمرو، ابو الشمع بن عمرو، سوید بن زید اور ان کے بھائی برزہ، اور ثعلبہ بن عدی شامل تھے۔ تحقیق سے ان کا دعویٰ ثابت ہو گیا اور ان کا مداوا کیا گیا [680]

مجموعۃ الوثائق میں شامل ایک نامہ نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ جذام کا ایک حصہ جو حضرت رفاعہ بن زید کی ماتحتی میں تھا صلح حدیبیہ سے بھی کافی پہلے مسلمان ہو گیا تھا [681] ماخذ کا بیان ہے کہ قبیلہ کے ان مسلمانوں نے حضرت دحیہ کا سامان واپس دلانے اور لٹیروں کو پکڑنے کی اپنی سی کوشش کی تھی مگر وہ نکل بھاگے تھے۔ بہر حال دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو ضبیب نے ان سے پورا پورا بدلہ لے لیا تھا۔ اس سے بہر صورت یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو ضبیب کے علاوہ جذام کا ایک اور طبقہ مسلمان ہو چکا تھا۔ مزید تصدیق اس ایک نفری وفد سے بھی ہوتی ہے۔ جو غزوہ خیبر سے کچھ پہلے مدینہ پہنچا تھا [682] ذکر آچکا ہے کہ سنہ ۹ھ میں سعد ہذیم اور جذام کے لئے ایک مشترکہ عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نامہ نبوی کے مطابق جذام سے صدقہ کے علاوہ خمس کا بھی مطالبہ کیا گیا تھا [683] اس کے علاوہ ایک گرامی نامہ جذام کے ایک غیر معروف گھرانے بنو جعال بن ربیعہ کے نام بھی ہے جس کے مطابق ان کو اپنے علاقہ میں بعض مراعات و حقوق سے نوازا گیا تھا [684] دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جذام کے ایک حصے نے رومی سلطنت سے غزوہ تبوک کے موقعہ پر ساز باز کی تھی [685] ظاہر ہے کہ یہ حصہ یا قبیلہ مسلم طبقات سے الگ تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ غزوہ تبوک تک یہ قبیلہ بعض اور شمالی قبائل کی مانند اپنی وفاداریوں کے لحاظ سے منقسم تھا۔ کچھ طبقے مسلمان ہو چکے تھے اور اسلامی ریاست کے وفادار تھے جبکہ اس کے بعض طبقات کی قدیم وفاداری ابھی تک رومی آقاؤں سے استوار و قائم تھی۔ لیکن اس غزوہ کے بعد ان اسلام دشمن طبقات میں بھی اسلام پھیل گیا تھا۔ جیسا کہ مالک بن احمر عوفی کی مثال سے ثابت ہوتا ہے [686]

(ج) ، بنو لخم

بنو لخم نہ صرف خون کے رشتوں کے سبب جذام کے ساتھ قریبی تعلقات رکھتے تھے۔ بلکہ پڑوسی ہونے کے ناطے بھی ان کے دوست تھے [687] اصل قبیلہ شامی سرحدوں کے قریب آباد تھا۔ مگر اس کی کچھ شاخیں مصر اور العریش کے درمیان واقعہ علاقہ میں بھی سکونت پذیر تھیں [688] ان کے قریبی تعلقات قضاعہ سے بھی تھے۔ دوسرے شمالی قبائل کے مانند لخم کے حلف و دوستی کے تعلقات قریش مکہ سے بھی تھے۔ اور غالباً سب سے پہلے لخمی مسلمان حضرت حاطب بن ابی بلتعہ تھے جو قریشی خاندان بنو اسد کے حلیف اور مکی باشندے تھے۔ ان کو بدری صحابی ہونے کی فضیلت بھی حاصل تھی [689] لیکن اصل قبیلے میں انفرادی اور اجتماعی قبول اسلام کی مثالیں غزوہ تبوک تک نہیں ملتی ہیں۔ اسی غزوہ کے دوران حضرت تمیم داری کی قیادت میں ان کے دس آدمیوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تبوک ہی میں ملاقات کی اور اسلام قبول کر کے آپ کے ساتھ مدینہ آکر غالباً آباد ہو گئے

آپ نے ان کو خیبر کی پیداوار سے سو وسق سالانہ کا عطیہ خاص عطا فرمایا تھا۔[۶۹۰] اسلام سے بنو جذام کے مزید تعلقات و روابط کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ ان کے قبیلے کے لئے کسی عامل صدقات کی تقرری کا بھی مآخذ میں حوالہ نہیں ملتا ہے بہر حال بنو لخم کے ایک ذیلی خاندان بنو حدس کے نام ایک گرامی نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایک طبقہ کم از کم مسلمان ہو چکا تھا جو غالباً تبوک کے بعد کا خط ہے۔[۶۹۱] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو لخم اجتماعی طور سے عہد نبوی میں مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ وہ مدینہ سے خاصی لمبی مسافت پر آباد تھے۔ اور علاوہ وہ ایک شامی قبیلہ تھے جس کو جزیرہ نمائے عرب کے معاملات و امور سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اسلام سے ان کے دور رہنے کا دوسرا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ رومی سلطنت سے بیکے وفادار تھے جیسا کہ غزوہ تبوک کے زمانے میں ان کے رویے سے واضح ہوتا ہے۔

(۵) بنو غسان

شمال کا آخری اور غالباً سب سے اہم اور طاقت ور قبیلہ غسان تھا جو اسلام کا اور اسلامی ریاست کا سب سے شدید مخالف اور دشمن تھا۔[۶۹۲] اس کی اسلام دشمنی کا مظاہرہ متعدد مواقع پر ہو چکا تھا۔ لیکن اس دشمنی اور عداوت کے باوجود اسلام کا اثر بعض صالح طبیعتوں پر پڑا تھا اور ان کے بعض افراد و طبقات اسلام کے ہمنوا بن گئے تھے، چاہے وہ بجائے خود سیاسی و سماجی لحاظ سے غیر اہم ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو گرامی ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت نبوی پر غسانیوں کے ایک حکمران حضرت جبلہ بن ایہم نے اسلام قبول کر لیا تھا[۶۹۳] اسی طرح غسان کا ایک گھرانا بنو ثعلبہ بھی اسلام کے دائرے میں داخل ہو گیا تھا۔ دوسرے مکتوب نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حبیش بن عامر کو ان کے قبیلہ (قوم) والوں کا سردار مقرر کیا گیا تھا اور بظاہر انہوں نے زکوٰۃ، خمس، صفی رسولؐ اور نمازوں کو قائم کرنے سے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کو نافذ بھی کیا تھا۔[۶۹۴] مونٹگمری واٹ اور ان کے ہم خیال و ہم فکر مستشرقین کا خیال ہے کہ ان خطوط میں بہت سا مواد مسترد کئے جانے کے قابل ہے۔ لیکن انہوں نے مآخذ کی ان صریح شہادتوں کو رد کرنے کے لئے کوئی خاص دلیل نہیں دی ہے اور جو دلیل دی بھی ہے وہ بے جان ہے اور اس کی بنا پر ان شہادتوں کو مسترد کرنے کا جواز نہیں پیدا ہوتا۔[۶۹۵] حضرت جبلہ بن ایہم کے قبول اسلام کا پس منظر ہی بتاتا ہے، کہ مکتوب ناموں کی اطلاعات قابل اعتماد ہیں۔ ان کی کسی حد تک توثیق غسان کے ایک وفد کی آمد سے ہوتی ہے جو رمضان سنہ ۱۰ھ / دسمبر ۶۳۱ء میں کسی وقت مدینہ پہنچا تھا اور اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام حق کی توثیق و تصدیق کی تھی۔[۶۹۶]

غسان کے قبول اسلام کے بارے میں ایک دلچسپ اور اہم شہادت ابن اسحاق کے ایک حوالے میں ملتی ہے جو عام طور سے مؤرخین کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہے۔ اس کے مطابق غزوہ حنین میں غسان کا ایک دستہ بنو سلیم کے ساتھ لشکر اسلامی کے ساتھ مقدمہ میں موجود و شریک جہاد رہا تھا، جیسا کہ حضرت عباس بن مرداس سلمی کی شاعری کے دو تین ابیات سے معلوم ہوتا ہے۔[۶۹۷] بہر حال یہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور اس کی تردید کے کافی اسباب بھی نہیں ہیں کہ غسان کا ایک حصہ اسلام کا حلقہ بگوش ہو چکا تھا غسان

کے قبول اسلام یا اسلام اور اسلامی ریاست سے تعلقات کے بارے میں مواد کافی ناقص ہے اور اس کا سبب وہی ہے جو لخم کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ غسان نہ صرف مدینہ منورہ سے کافی دور آباد تھا، بلکہ اس کو عملی لحاظ سے جزیرہ نمائے عرب کا قبیلہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ حقیقت بھی تھی کہ وہ شامی سرحدوں کے دونوں طرف آباد تھا۔ اور عملاً بازنطینی سلطنت کے ایشیائی صوبے شام اور جزیرہ نمائے عرب کے درمیان ایک فاصل ریاست (BUFFER STATE) قائم کئے ہوئے تھا۔ اس لئے اگر وہ عہد نبوی میں اسلام کے دائرہ اثر و اقتدار سے آزاد تھا، تو کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔

مدینہ منورہ کے شمال میں اسلام کی اشاعت و ترویج کی بحث کے خاتمہ پر یہ تبصرہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ شمالی قبائل کے ضمن میں اسلام کی تبلیغ اتنی وسیع، ہمہ گیر اور کامیاب نہیں تھی جتنی کہ مغربی اور مشرقی قبائل یا جنوبی قبائل کے ضمن میں رہی تھی۔ جوں جوں شمال کی جانب بڑھتے گئے اس کی رفتار ہلکی اور اس کو قبول کرنے کی صلاحیت کمزور ہوتی نظر آتی ہے۔ دین خداوندی کے شمالی علاقے میں اتنی سست روی سے سفر کرنے اور بہت زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکنے کے اسباب نہایت واضح ہیں اس کا پہلا اہم ترین سبب وقت کی کمی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ اور مدینہ کے شمال میں خاص کر اور مشرق و مغرب و جنوب میں عام طور سے تبلیغی کارروائی شعوری طور سے باقاعدہ ہجرت مدینہ کے بعد شروع کی تھی۔ فتح مکہ تک آپ کی توجہ پوری طرح سے مدینہ کے اردگرد بسے قبائل اور قریش مکہ کے معاملات پر مرکوز رہی تھی۔ اس زمانے میں آپ نے اگرچہ شمالی طرف جب بھی موقعہ ملا توجہ دی۔ لیکن وقت کی کمی کے سبب اتنی نہیں عنایت فرما سکے جتنی کہ آپ نے مرکزی علاقہ عرب کے قبائل پر دی تھی۔ فتح مکہ اور وفات نبوی کے درمیان کا ڈھائی سالہ عرصہ اتنے بڑے خطے میں اسلام کی تبلیغ کے لئے ناکافی تھا دوسرے یہ کہ مدینہ سے خاصی طویل مسافت بھی اسلام کی ترقی و تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ تھی۔ تیسرے یہ کہ آپ کی نظر میں اگرچہ اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا تاہم میدان کار جزیرہ نمائے عرب تک محدود تھا اور غیر ممالک میں آپ نے جو سفارتی مہمیں اور تبلیغی جماعتیں روانہ کی تھیں وہ تعداد میں کم تھیں اور ان کا اثر محدود تھا۔ چوتھا بڑا سبب یہ تھا کہ غسان اور دوسرے عرب قبائل بازنطینی حکومت کے ماتحت، وفادار اور باجگذار تھے اور ان کی غیر ملکی آقاؤں سے وفاداری اسلام سے وفاداری کی راہ میں حائل تھی۔ کیونکہ اسلام کی وفاداری کا لازمی نتیجہ تھا اسلامی ریاست اقتدار اعلیٰ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حاکمیت و نیابت خداوندی کو تسلیم کرنا، جو ان کے لئے بروقت ممکن نہ تھا۔ اور آخری اہم سبب یہ تھا کہ پوری دنیائے انسانیت کے لئے آپ رسول و ہادی ضرور بنا کر بھیجے گئے تھے۔ مگر یہ آپ کا فرائض منصبی نہیں قرار دیا گیا تھا کہ آپ "پوری دنیا یا کائنات" کو مسلمان بنالیں[۱۹۸] آپ کا کام پیغام الٰہی کو لوگوں تک پہنچانا تھا۔ جو آپ نے بلا کم و کاست پوری ایمانداری و صداقت اور ممکنہ کوشش و جہد کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ آپ کا دوسرا کام اس ضمن میں مسلمانوں اور مبلغوں کی ایسی جماعت تیار کر دینا تھا جو "اپنے پیچھے والوں کو یا بعد میں آنے والی نسلوں کو ڈرا سکیں"[۱۹۹]، ان میں تبلیغ کر سکیں اور ان تک پیغام الٰہی پہنچا سکیں۔ اور یہ آپ نے بخوبی بلکہ بہ احسن طریق انجام دیا تھا۔ آپ نے صحابہ کرام کی ایسی جماعت اور مبلغین اسلام کی ایک ایسی امت پیدا کر دی تھی جو اپنے قول و فعل اور کردار سے اسلام کے پیغام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلانے کا سبب اور وسیلہ بن گئی۔

ہمارے تمام مستشرقین اور خصوصاً مونٹگمری واٹ شمالی قبائل میں اشاعت اسلام کے بارے میں تعصب سے کام لیتے ہیں اور غیر علمی رویہ اپناتے ہیں۔ ان کے تعصب کا بنیادی سبب وہ چیز ہے جس کو قرآن کریم نے "حمیۃ جاہلیۃ" کہا ہے۔ یہ جاہلی حمیت اس لئے ہے کہ شمالی قبائل میں اکثر و بیشتر عیسائی تھے اور ان کو شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ گوارا نہیں ہوتا ہے۔ کہ عیسائیوں یا عیسائی طبقات کے مسلمان ہونے کی واقعیت کو تسلیم کرلیں۔ ان کو اس میں اپنے مذہب کی توہین اپنی قومی ذلت اور ذاتی سبکی محسوس ہوتی ہے چنانچہ وہ ماخذ کی صریح شہادتوں کو بلا وجہ مسترد کر دیتے ہیں اور تاویلات کا سہارا لیتے ہیں اور اپنی تحقیق و علمیت کی تمام کاوشوں کو اس نکتہ پر مرکوز کر دیتے ہیں کہ تاریخی واقعات۔ و حقائق میں الجھن اور شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں۔ اس فرض عظیم کی خاطر مونٹگمری واٹ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شمالی پالیسی کو مبہم غیر واضح اور پر اسرار بلکہ راز سربستہ تک قرار دیا ہے۔ حالانکہ وہ خود بھی جانتے ہیں اور جیسا کہ مذکورہ بالا بحث سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپ کی پالیسی میں کوئی ابہام اور پراسراریت نہیں تھی۔ وہ انتہائی روشن، واضح اور معلوم پالیسی تھی۔ یعنی خدا کے پیغام کو دوسروں کی طرح شمالی قبائل کو بھی پہونچانا اور ان کو اسلامی ریاست کے سایۂ عاطفت میں لانا۔ ہمارے یہ مستشرقین علمی و تحقیقی انداز کی بھول بھلیوں میں قارئین کو گم کر کے ایک اور ستم یہ کرتے ہیں کہ ان کے ذہنوں پر اسلام کی تاثیر کی کمزوری اور دین خداوندی کی اثر و نفوذ کی عدم صلاحیت کو شعوری طور سے مرتسم کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کا جب تک بت پرستوں سے مقابلہ رہا وہ تیزی سے پھیلتا رہا۔ لیکن جب اس کا واسطہ عیسائیوں یا یہودیوں سے پڑا تو اس کی تاثیر نہ صرف ماند پڑ گئی بلکہ ختم ہو گئی کیونکہ اسلام کے اصول اصلی یا پر اثر نہ تھے۔ یہ صحیح ہے کہ جن اقوام اور قبائل میں اپنے مذہب سے جذباتی لگاؤ یا مذہبی عصبیت ہوتی ہے ان پر دوسرے مذہب کا اثر مشکل سے اور دیر میں پڑتا ہے لیکن اس میں اسلام کی تاثیر کی کمی سبب نہیں ہوتی بلکہ انکی عصبیت اور جذباتی لگاؤ قبول اسلام کو روک دیتا ہے کیونکہ وہ اسلام کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ بہرحال جہاں تک شمالی قبائل کا تعلق ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ان کی غالب اکثریت خلافت راشدہ میں خاص کر عہد صدیقی ہی میں اسلام قبول کر چکی تھی اور اسلامی ریاست اور اسلامی امت کا جزو بن چکی تھی۔ اتنی مختصر سی مدت میں ان میں اسلام کی توسیع و اشاعت محض اسی بنا پر ہو سکی تھی۔ کہ زمین پہلے سے ہموار تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ذہن و قلب کو سننے، سمجھنے اور ماننے کے لئے تیار کر دیا تھا اور ان کے فکر و نظر اور عقیدے کے تبدیل کرنے کا فریضہ اس "امت خیر" نے انجام دیا جو لوگوں کے لئے ہی پیدا کی گئی ہیں۔ اور جو ان کو بھلائی کی تعلیم دیتے ہیں۔ برائی سے روکتے ہیں اور اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔""

(۴) جنوبی قبائل

مکہ اور عدن کے درمیان آباد جنوبی قبائل میں اسلام کا تعارف اور داخلہ اسلامی ریاست کی فوجی طاقت اور ہتھیار دل کے داخلے سے کافی مدت پہلے ہو چکا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جنوبی عرب میں ریاست اسلامی کے فوجی اثرات کا اتنا اثر

ہی نہیں ہوا تھا، جتنا دوسرے قبائل کے سلسلے میں ہوا تھا۔ بہرحال مسلم افواج یا مہمیں اس علاقہ میں فتح مکہ سے پہلے نہیں پہنچ سکی تھیں اور نہ ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منظم کی ہوئی تبلیغی و اشاعتی جماعتیں۔ کیونکہ مدینہ منورہ اور جنوبی عرب کے درمیان خاص طور سے اور جزیرہ نمائے عرب کے مشرقی علاقوں اور ساحلی خطوں میں عام طور سے قریش مکہ کی طاقتور اور ناقابل تسخیر اشرافیہ کی دیوار حائل تھی۔ یہاں تک وہ ۸ھ/۶۳۰ء کے ابتدائی دنوں میں منہدم ہو گئی۔ مکی عہد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی اجتماعی منظم سماجی یا سیاسی قوت نہ تھی جس کے بل بوتے پر تبلیغی وفود اور مذہبی کارواں بھیجے جاتے۔ لیکن اسلام کی ہمہ گیر تاثیر و تسخیر کے غیر معلوم و غیر محسوس اندرونی دھاروں نے ان مصنوعی دیواروں اور التوائل کی عائد کی ہوئی حد بندیوں کی ذرا پروا نہیں کی اور اس نے اپنی اشاعت و تبلیغ کے انوکھے اور شاندار ذرائع حاصل کر لیے۔ جنوب کے بعض تشنگان معرفت الٰہی، حقیقت کے جویا اور زائرین حرم کعبہ مختلف مقاصد سے مکہ آئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام و کام سے آشنا ہوئے اور ان میں سے متعدد نہ صرف اسلام کے علمبردار بن گئے بلکہ جب وہ اپنے علاقوں کو لوٹے تو اسلام کے مبلغ و داعی بن کر لوٹے۔ جنوب کے قبائل میں اسلام کے تعارف، تبلیغ اور ترویج کے کام میں حضرات ابو موسیٰ اشعری، طفیل بن عمرو دوسی، ضماد بن ثعلبہ ازدی اور متعدد دوسرے حضرات نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے ابن سعد کے بقول مکہ کے عہد قدیم میں اسلام قبول کر لیا تھا اور واپس اپنے وطن لوٹ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے وطن میں اس تندہی اور جانفشانی سے تبلیغ اسلام کی تھی کہ جب ۷ھ میں غزوہ خیبر سے کچھ پہلے وہ اشعریوں کا وفد لیکر پہنچے تو ان کے ساتھیوں کی تعداد پچاس سے متجاوز تھی، اور نہ جانے کتنے مسلمان وہ اپنے علاقے میں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔[۱]

مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ کی موجودگی سے اس کو تمام جزیرہ نمائے عرب میں ایک مذہبی اور سماجی مرکزیت حاصل تھی۔ اور اسی کے سبب وہ اقتصادی مرکز اور تجارتی منڈی بھی بن گیا تھا۔ اس میں اس جغرافیائی سبب نے بھی خاصا اہم کردار ادا کیا تھا کہ وہ مغربی ساحل کی بین الاقوامی شاہراہ پر جو یمن سے شام کو جاتی تھی واقع تھا۔ ان اسباب سے زائرین اور تاجرین کا سال بھر تانتا لگا رہتا تھا۔ چنانچہ مکہ میں پیش آنے والے واقعات اور امور مختصر سی مدت میں پورے جزیرہ نمائے عرب میں متعارف ہو جاتے تھے۔ اسلام تو مکہ میں ایک انوکھا اور دلچسپ ترین واقعہ اور تجربہ تھا۔ جس کے ماننے والے آگ کے انگاروں پر چلنا اور تپتی ریگ پر جلنا اور جسم و جان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا پسند کر لیتے تھے۔ مگر اس نئے مذہب کو چھوڑنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مسلمانان مکہ کی آزمائش و ابتلاء کے واقعات کے علاوہ اسلام کی سیدھی سادی اور سچی تعلیمات نے بھی مکہ کے زائروں کو متاثر کیا تھا چاہے انہوں نے اسلام نہ بھی قبول کیا ہو۔ یہ غیر مسلم زائرین جب اپنے علاقوں کو واپس ہوتے تھے تو وہ بھی غیر شعوری طور پر اسلام کا بالواسطہ اور غیر جانبدار علمبردار بن کر جاتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنے ہم وطنوں اور ہم قبیلہ والوں سے جا کر سناتے تھے۔ تاریخی روایات شاہد ہیں کہ انہوں نے نہ جانے کتنے ذہنوں کو جگایا اور بیدار کیا تھا، کتنے دماغوں میں ہلچل و اضطراب پیدا کیا تھا اور کتنی روحوں میں حق کی تلاش اور جستجو کی آرزو مضطر کائی تھی۔ اس کے علاوہ دوسرے علاقوں کے مانند جنوبی عرب کے قبائل کے افراد اور گروہوں کے مکہ والوں سے مستقل سیاسی اور سماجی اور اقتصادی تعلقات بھی قائم

تھے اور انہوں نے بھی اسلام کے تعارف اور روشناسی کا کام انجام دیا تھا۔ مگر سب سے بڑا عنصر اپنی تاثیر اور تسخیر قلوب کے لحاظ سے ان نومسلموں کا تھا جو جنوبی عرب کے مختلف خطوں میں چند انفرادی مبلغین اسلام کی کوششوں کے نتیجہ میں اسلام لا چکے تھے۔ یہ نومسلم بجائے خود اسلام کے سب سے بڑے اور مؤثر داعی تھے جنہوں نے اپنے رشتہ داروں، خاندان وقبیلہ والوں اور پڑوسیوں کو متاثر کیا تھا اور بہت سوں کو ہمنوا وہمخیال بھی بنا لیا تھا۔ اس پورے عمل ونفوذ کا نقطہ عروج وہ تھا جب فتح مکہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوبی عرب کے قبائل میں ترویج اسلام کی شعوری اور منظم کوششیں کیں۔ گویا کہ زمین ہموار ہو چکی تھی۔ بیج بوئے جا چکے تھے۔ پانی دیا جا چکا تھا اور فصل تیار تھی صرف فصل کو کاٹ کر گھر لانے کی دیر تھی۔

اب تک یہ واقعہ اور حقیقت اتنی عیاں ہو چکی ہے۔ کہ زیادہ دہرانے کی ضرورت نہیں کہ جنوبی عرب میں مختلف قبیلے اور ان قبیلوں کے مختلف بطون اور ان بطون کی متعدد ذیلی شاخیں تھیں۔ بہر کیف اہم جنوبی قبائل اور ان کے بطون اور شاخیں حسب ذیل تھیں:

(ا) اشعر:

(ب) بجیلہ: (۱) بنو احمس بن غوث۔ (۲) باشندگان کلاع وظلیم

(ج) خثعم: (۱) بنو معاویہ (۲) بنو رشد

(د) ہمدان: (۱) بنو الحارث (۲) بنو شاکر (۳) بنو ارحب، (۴) بنو ربیعہ بن مالک (۵۔ ۶) باشندگان زرین ومعافر (۷) باشندگان مرآن

(س) حمیر: (۱) اہل یزن (۲) اہل زود (۳) اہل مرآن

ط مذحج: (۱) بنو عنس (۲) بنو مراد (۳) بنو سعد العشیرہ، بنو جعفی، بنو عائذ، مرآن، حریم، کلاب وغیرہ (۴) بنو زبید (۵) بنو اود (۶) بنو رہاء (۷) بنو صداء (۸) بنو نخع (۹) بنو الحارث بن کعب (بنو عبد المدان بنو ضباب بنو فقن، بنو عبد لیغوث اور بنو زیاد وغیرہ) (۱۰) بنو خولان

(ع) نہد: (۱) بنو قرۃ

(ف) ازدیمن: (۱) ازد جرش (۲) نجران (۳) بنو غامد (۴) بنو بارق (۵) بنو غافق۔

(ک) کندہ: (۱) بنو معاویہ (۲) بنو وہب (۳) بنو رعیش (۴) بنو اشرس (۵) بنو سکون (بنو غوث) (۶) بنو سکاسک (۷) بنو تجیب

(ل) حضرموت یا حضارمہ: (۱) اقیال حضرموت (۲) بنو سدلیف

(م) الابناء: ایرانی نژاد باشندگان یمن [۱]

مونٹگمری واٹ کا خیال ہے کہ "فتح مکہ تک اہل جنوب اور مسلمانوں میں کوئی بھی رابطہ وتعلق نہیں تھا"[۲] اگر یہ کہا جاتا کہ اہل یمن وحضرموت وغیرہ کا تعلق اسلامی ریاست سے نہیں تھا تو بات صحیح ہوتی لیکن اسلام اور مسلمانوں سے ان کا

تعلق دیرینہ و دیرپا تھا۔ بلکہ خود "مسلمان" ان کے بیچ موجود تھے۔ جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں اور آئندہ بھی مزید اس کا مطالعہ کریں گے۔ جنوبی عرب میں اسلام کی ترویج و اشاعت کے مباحث سے پہلے یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اس کے کسی قبیلے نے اسلام کی مسلح یا فوجی مخالفت نہیں کی تھی اور اسلامی ریاست کے خلاف نہ تلوار اٹھائی تھی۔ اور نہ ہی سیاسی اور فوجی سازشوں میں حصہ لیا تھا۔ غالباً یہ صاف ذہنی بھی ان کے تیز اور جلد قبولِ اسلام کا سبب بن گئی تھی۔ یہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ قبائلی عصبیت اور رقابت نے اسلام کے قبول و انکار میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ چنانچہ جنوبی و شمالی قبائل کے درمیان موجود قبائلی رقابت بلکہ عداوت اگرچہ پرانی تھی لیکن اس نے اسلام کی ترقی و تبلیغ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی تھی۔ کیونکہ اسلام نہ جنوبی تھا نہ شمالی مشرقی تھا نہ مغربی وہ تو ایک آفاقی مذہب تھا۔ اور آج بھی اس کی وہی خصوصیت باقی ہے۔ حسب معمول جنوبی عرب کے قبائل میں ترویج اسلام کا مطالعہ توقیتی تقاضوں یا تاریخی ترتیب واقعات کے مطابق بنو اشعر سے کیا جا رہا ہے کہ وہی جنوبی عرب میں اسلام کے اولین پیرو اور علمبردار تھے۔

۱ اشعر

حضرت ابو موسیٰ اشعری کے علاوہ ابن سعد نے اشعر کے چھ اور ابتدائی مسلمانوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی تھے: حضرات ابو بردہ، ابو رہم (دونوں حضرت ابو موسیٰ اشعری کے بھائی تھے)، ابو عامر اور ان کے صاحبزادے عامر، ابو مالک اور حارث اشعری[4]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے قبیلوں کی طرح اشعر کے لوگ بھی گروہوں میں اسلام لائے تھے۔ دوسرے اشعری صحابہ کرام کے سوانحی خاکوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے گھرانے اور مختلف افراد ایک ساتھ اسلام لائے تھے۔ بہر حال اسلام اشعر میں سنہ ۶۱۵ء اور ۶۱۹ء کے درمیان روشناس ہوا تھا، اور سنہ ۷ھ/۶۲۸ء تک قبیلہ کا ایک معتدبہ اور بڑا طبقہ اسلام لے آیا تھا۔ جن میں سے پچاس سے زیادہ لوگ مدینہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کے ساتھ پہنچے تھے! اور انہوں نے متعدد مہموں میں شرکت بھی کی تھی[5]۔ یہ یقینی ہے کہ ان مہاجر اشعریوں کے علاوہ کافی بڑی تعداد میں مسلمان اپنے قبیلہ اور علاقے میں قیام پذیر رہے تھے۔ خاص طور سے ان پچاس مسلمانوں کے اہل خانہ و عزیز رہ گئے مفروضہ کے مطابق ان کی تعداد تین ساڑھے تین سو کے درمیان کہیں رہی ہوگی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے۔ کہ بنو اشعر کے مزید قبول اسلام کی نہ تو مثالیں ملتی ہیں! ورنہ ہی کوئی اور حوالہ۔ اس کے علاوہ ماخذ سے یہی تاثر ملتا ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری اور ان کے رفقاء کی کوششوں نے پورے قبیلہ کو حلقہ بگوشِ اسلام بنا دیا تھا[6]۔ بہر صورت سنہ ۱۰ھ/ ۶۳۱ء میں جب اشعر کے عاملین صدقات اور مرکزی منتظمین ان کے پاس پہنچے تھے[7]۔ اس سے پہلے ہی پورا قبیلہ اسلامی امت کا رکن بن چکا تھا، اور مدینہ کی اسلامی ریاست سے ان کے مذہبی روابط اور تعلقات میں استحکام نے ان میں وہ ایمانی صلابت اور ثابت قدمی پیدا کر دی تھی کہ ردہ کے پرآشوب و پرفتن زمانے میں نہ صرف وہ اسلام پر عامل و قائم رہے تھے۔ بلکہ دوسروں کے ایمان و سلامتی کے محافظ بن گئے تھے۔ بخاری کی ایک روایت کے مطابق اشعریوں کے ایمان کی مضبوطی اور عقیدہ کی پختگی کی

خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت دی تھی[۸] اور صادق و امین کی شہادت سے بڑھ کر اور کس کی گواہی ہو سکتی ہے!

(ب) بجیلہ

بجیلہ کا قریبی تعلق ایک دوسرے جنوبی قبیلے خثعم سے تھا اور وہ غالباً انہی کے پڑوس میں آباد بھی تھے۔ یہ ایک خاصا بڑا قبیلہ تھا جو بعثت نبوی کے زمانے میں اندرونی اختلافات اور باہمی نزاعات میں مبتلا تھا اور مختلف متحارب و متصادم گروہوں میں منقسم تھا تاآنکہ اس کو ان کے سب سے بڑے سردار حضرت جریر بن عبداللہ بجلی نے متحد و منظم کیا[۹]، اس کے متعدد خاندان بنو احمس بن غوث کے بارے میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ غالباً کچھ پہلے مسلمان ہوا تھا۔ جیسا کہ ابن حزم کا دعویٰ ہے کہا جاتا ہے کہ اس قبیلہ / خاندان کے ایک سو پچاس اشخاص حضرت جریر بن عبداللہ بجلی کے ساتھ ایک دن میں مسلمان ہوئے تھے بعد میں وہ اپنے وفد کے ساتھ مدینہ پہنچے تھے اور بارگاہ نبوی میں اپنے مسلمان ہونے کی انہوں نے پھر تصدیق کی تھی[۱۱]۔ مدینہ میں اپنی آمد کے فوراً بعد ان نومسلموں نے جہاد میں شرکت کی تھی۔ جب کہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بجیلہ کے بتکدے کو توڑنے کے لئے بھیجا تھا، جو ذوالخلصہ نامی مقام پر واقع تھا[۱۲]۔ ابن حزم نے اس کے تین اہم مسلمانوں کے نام بھی بیان کئے ہیں جو یہ تھے: حضرات طارق بن شہاب، ابو حازم القیقبہ اور ان کے صاحبزادے قیس، ان کے علاوہ انہوں نے حضرت جریر بن عبداللہ بجلی کے ایک عزیز مسلم حضرت عبداللہ بن ابی عوف کا بھی صحابہ میں شمار کیا ہے[۱۳]۔

کچھ مدت کے بعد رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جریر بن عبداللہ بجلی کو جنوبی عرب کی دو چھوٹی ریاستوں یا مملکتوں کلاع اور ظلیم کے شہزادوں / حاکموں اور ان کی رعایا میں تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا تھا، جہاں ان کو صد فی صد اور فوری کامیابی ملی تھی[۱۴]۔ لیکن بجیلہ کے قبولِ اسلام کا سب سے بڑا ثبوت ان کا دوسرا وفد تھا جو اس کے بعد حضرت قیس بن عذرہ احمسی کی قیادت میں مدینہ پہنچا تھا۔ اس میں دو سو پچاس مسلمان شریک تھے[۱۵]۔ اس حتمی شہادت سے بجیلہ کے پورے قبیلے کے مسلمان ہونے کے بارے میں کسی قسم کا شبہ یا الجھن باقی نہیں رہ جاتی۔ اس کے علاوہ مزید ثبوت یہ ہے کہ مجموعی طور سے بنو بجیلہ ردہ کے زمانے میں اسلامی ریاست کے وفادار اور اسلام پر قائم رہے تھے اس پر آشوب زمانے میں حضرات جریر بن عبداللہ بجلی اور قیس بن عذرہ احمسی وغیرہ نے اسلام کی زبردست اور شاندار خدمات انجام دی تھیں اور طوفانِ حوادث اور سیلاب بلا کے بیچ اسلام کا علم بلند رکھا تھا۔

(ج) خثعم

خثعم اور بجیلہ کے درمیان خون کی رشتہ داری کے بہت مضبوط تعلقات تھے اور خیال یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے پڑوسی بھی تھے۔ لیکن اس کا ایک حصہ قحط و قلتِ آب کی بنا پر اپنے علاقہ کو چھوڑ کر نجد میں تربہ کے مقام پر جا بسا تھا۔ جیسا کہ واقدی کا بیان ہے[۱۶]، وہ شاید تبالہ کے علاقے میں بھی بس گئے تھے۔ جو طائف کے نواح میں تھا۔ بہر حال اصل قبیلہ جنوب ہی

میں سکونت پذیر رہا تھا۔ اسلام سے اس کے ابتدائی تعلقات کے بارے میں ہمیں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ غالباً فتح مکہ کے بعد ان میں اسلام کی تبلیغ شروع ہوئی تھی۔ اور سنہ ۱۰ھ / ۶۳۱ء تک ان میں معتدبہ مسلم آبادی ہو گئی تھی ابن سعد کے بیان کے مطابق ان کا ایک وفد جو متعدد اشخاص پر مشتمل تھا۔ سنہ ۱۰ھ کے آغاز اور ۶۳۱ء کے وسط میں آیا تھا۔ جنہوں نے اسلام کے قبول کرنے کا اظہار کیا تھا"[۱۷] اس قبیلہ کے انفرادی اور گروہوں میں قبولِ اسلام کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں تاہم متعدد خثعمیوں کے مکہ میں مسلمان ہونے کے واقعات ضرور مذکور ہیں۔ خیال یہ ہے کہ یہ قبیلہ بھی جلد ہی مسلمان ہو گیا تھا کیونکہ اس کے ردہ وارتداد میں شمولیت و شرکت کے بارے میں بھی مآخذ خاموش ہیں اور یہ اس کے مسلمان ہونیکا ایک بالواسطہ ثبوت ہے

(د) ہمدان

ہمدان بھی ماہرین انساب کے مطابق بجیلہ اور خثعم کے خون کے رشتہ دار اور عزیز تھے۔ لیکن ان دونوں سے ان کے تعلقات کشیدہ اور ناشگفتہ تھے[۱۸] اس کے ایک ابتدائی مسلم حضرت قیس بن مالک بن سعد تھے۔ جنہوں نے ہجرت سے کافی پہلے مکی عہد میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ روایات کی تواتر کے ساتھ شہادت ہے کہ وہ اپنے قبول اسلام کے بعد واپس اپنے علاقے میں چلے گئے تھے! ور انہوں نے ہمدان کے لوگوں میں ایک نومسلم کے جوش و ولولے اور لگن سے تبلیغ کی تھی اور بالآخر اس کے کئی گھرانوں کو مسلمان بنا لیا تھا۔[۱۹] ابن حزم کے مطابق اس کے ایک اور مسلم صحابی حضرت عمام بن زید تھے جن کا تعلق اس کے ایک گھرانے بنو الخارف سے تھا۔[۲۰] ہمدان کا قبیلہ سنہ ۱۰ھ / ۶۳۱ء کے لگ بھگ پورا مسلمان ہو گیا تھا۔ کیونکہ کم از کم اس کی تین شاخوں کے بارے میں یہ روایت ہے کہ ان میں مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی: بنو الخارف تو تقریباً پورے مسلمان ہو چکے تھے اور حضرت مالک بن نمط کو ان کا مقامی سردار و منتظم مقرر کیا گیا تھا۔ دوسرا گھرانا بنو شاکر کا تھا جس کی ریاست و قیادت حضرت عامر بن شہر کو عطا کی گئی تھی۔ اور تیسری شاخ تھی۔ بنو ارحب کی جس میں کافی مسلمان تھے اور جس کے سردار حضرت قیس بن مالک تھے[۲۱]

ابن حزم نے ہمدان کے ایک غیر معروف گھرانے بنو ربیعہ بن مالک کے ایک مسلم کا نام شکل بن حمید بتایا ہے اور بنو ارحب کے ایک اور مسلم کا قیس بن نمط جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کتاب (نامۂ مبارک) عطا فرمایا تھا۔[۲۲] مجموعۃ الوثائق نے ہمدان کے کم از کم پندرہ گھرانوں میں کافی مسلم آبادی کا ذکر کیا ہے[۲۳] رُعین، معافر اور ہمدان کے اقیال (حکمرانوں) کے نام عام طور سے اور رُعین کے حکمران کے نام خاص طور سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط ارسال فرمائے تھے۔ ان سے ان قبیلوں میں بڑے پیمانے پر قبولِ اسلام کا ثبوت ملتا ہے[۲۴] غالباً سرداروں اور اقیال نے اسلام قبول کرنے میں پہل کی تھی۔ اور ان کی رعایا نے ان کی تقلید کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو مزید خطوط جو مرآن کے سردار حضرت عمیر اور مسلمانانِ ہمدان کے نام ہیں ثابت کرتے ہیں کہ غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد ۹ھ کے اواخر میں ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا[۲۵] طبری کا واضح بیان ہے کہ سنہ ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں حضرت علی کی مہم کے نتیجہ میں ہمدان کے باقی ماندہ لوگوں

نے ایک ہی دن میں اسلام قبول کر لیا تھا۔[۴۶]

(س) حمیر

حمیر کا قبول اسلام ہمدان کے لوگوں کے قبولِ اسلام کا ایک طرح سے تتمہ و تکملہ تھا۔ مآخذ کا بیان ہے کہ حمیر کے بادشاہوں (ملوک اور اقیال) حضرت حارث بن عبد کلال، حضرت نعیم بن عبد کلال اور حضرت زرعہ ذو یزن نے متعدد دوسرے اقیال کے علاوہ حضرت مالک بن مُرارہ رہاوی کو اپنا سفیر بنا کر خدمت نبوی میں بھیجا۔ موصوف ایک وفد کے ساتھ رمضان ۹ھ دسمبر ۶۳۰ء میں مدینہ منورہ پہنچے اور بارگاہ نبوی میں نہ صرف اقیال اور حکمرانوں بلکہ حمیر کے تمام لوگوں کے قبول اسلام کا اقرار و اعلان کیا[۴۷]۔ واقدی کے بیان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ متعدد اقیال حمیر نے اپنے اپنے سفیر دربار رسالت میں خود بھیجے تھے اور اپنے لوگوں کے قبولِ اسلام کا دعویٰ پیش کیا تھا۔ ان کی درخواست پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن سعید اموی کو ان کے علاقے کا مرکزی منتظم، مبلغ اور معلم بنا کر بھیجا تھا جنہوں نے صنعاء میں رہ کر ان کی تعلیم و تربیت کی تھی[۴۸]۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کم از کم دو اور قاصد اور سفیر و حاکم بھیجے تھے۔ یہ تھے حضرات عیاش بن ربیعہ اور اقرع بن عبد اللہ حمیری[۴۹]۔ مؤخر الذکر صحابی غالباً قبیلہ حمیر کے ایک ابتدائی مسلمان تھے اور قیاس یہ ہے کہ وہ خود اقیال کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دونوں کو زُرعہ اور مرّان کے سرداروں اور حمیر کے عوام کے پاس دو مکتوبوں کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطوط و فرامین میں ان کے غیر مشروط اور پر خلوص اسلام کی تعریف و توصیف فرمائی تھی اور ان کو اسلام کے بنیادی اصول کی تعلیم بھی دی تھی[۵۰]۔ یہ حقیقت بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ ہمدان اور حمیر کے لوگ اور ان کے حکمران اپنی مرضی اور آزادی سے اسلام کے حلقہ بگوش بنے تھے اور ان کو مسلمان بنانے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے فرستادہ مبلغین کو کوئی خاص کوشش نہیں کرنی پڑی تھی۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جنوبی عرب میں خود وہاں کے مبلغین اور مسلمان اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے زمین ہموار کر کے ان کو اسلام کی حقانیت و صداقت کا معترف بنا چکے تھے اور ذرا سی کوشش نے ان کو امت اسلامی کا مخلص اور ثابت قدم رکن بنا دیا تھا۔ اس بنا پر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ حمیر اور ہمدان کے تمام لوگ ردہ کے زمانے میں اسلام پر ثابت قدم اور اسلامی ریاست کے وفادار رہے تھے۔

(ط) مذحج

مذحج جنوبی عرب کا غالباً سب سے بڑا قبیلہ تھا وہ ایک قبیلہ کے بجائے متعدد قبیلوں کا مجموعہ تھا کیونکہ اس کے متعدد و مختلف بطون بجائے خود قبیلے بن گئے تھے۔ ان میں عنس، مراد، سَعد العشیرہ، جُعفی، زُبید اور اَوْد وغیرہ شامل تھے پھر سعد العشیرہ کے خاصے اہم بطون رگھرانے تھے[۵۱]۔ ان میں سے کچھ گھرانوں کا اسلام سے تعارف مکی عہد قدیم میں ہی ہو گیا

تھا۔ جبکہ بعض دوسرے فتح مکہ تک منتظر رہے تھے۔ مذحج کے مکہ والوں سے خاصے قریبی تعلقات تھے اور ان کے بہت سے افراد مکہ میں بس گئے تھے۔ ان "مہاجرین" نے اکثر و بیشتر اسلام قبول کرلیا تھا اور وہ بھی آغازِ عہد اسلامی میں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ممتاز صحابہ کرام جیسے حضرات یاسرؓ، ان کی اہلیہ سمیہؓ، ان کے تین فرزند عمارؓ، حریثؓ اور عبداللہؓ، اس قبیلہ کے گھرانے بنو عنس کے قدیم ترین مسلمان تھے[۲۲]۔ لیکن چونکہ ان لوگوں نے اپنا قبیلہ اور علاقہ چھوڑ کر مکہ میں گھر بنالیا تھا۔ لہٰذا ان کے اسلام کا ان کے اصل قبیلہ پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ اسی طرح زبید کے ایک گھرانے کے افراد جن کا تعلق حضرت محمیہ بن جزء زبیدی کے خاندان سے تھا۔ مکی عہد قدیم میں مسلمان ہوگئے تھے[۲۳]، وہ بھی مکہ کے باسی اور قریش کے خاندان بنو جمح کے حلیف تھے۔ جبکہ حضرت عمار بن یاسر عنسی کا گھرانا بنو مخزوم کا حلیف تھا۔

اگر مکہ کے باسی مذحجی باشندوں کے قبول اسلام کا اثر مذحج کے اصل قبیلہ پر نہیں پڑا تھا۔ تو ان کے اپنے نمائندے مکہ سے اسلام کی سوغات لیکر گئے تھے۔ ذکر آچکا ہے کہ قبائل عرب کے زائرین مکہ میں خانہ کعبہ کی زیارت اور طواف کے لیے سال بھر آتے رہتے تھے۔ ایسی ہی کسی زیارت کے دوران سعد العشیرہ کے ایک شخص مسلمان ہوگئے اور جب مکہ سے وطن لوٹے تو وہ اسلام کے علمبردار و مبلغ تھے۔ ان کی انتھک اور مسلسل کوششوں سے سعد العشیرہ میں اسلام کے قدم جم گئے[۲۴]۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود مذحج اور اس کے اہم بطون کافی طویل مدت تک بطور قبیلہ اسلام کے دائرے کے باہر ہی رہے۔ بہر حال وہ سنہ ۱۰ھ میں حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی اور حضرت خالد بن ولید مخزومی جیسے مبلغین اسلام کی دعوت و تبلیغ کے بعد مسلمان ہوئے تھے[۲۵]۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذحج کے قبیلوں اور خاندانوں کے قبول اسلام کا جائزہ الگ الگ خاندانوں کے اعتبار سے لیا جائے۔

(۱) بنو عنس

عنس کے کچھ افراد اگرچہ آغاز کار ہی میں اسلام سے مشرف ہو چکے تھے۔ لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ اصل قبیلہ اسلامی امت کا رکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری برس میں بنا تھا۔ بنو عنس کے انفرادی اور اجتماعی قبولِ اسلام کی مثالیں کمیاب ہیں۔ لیکن یہ امر کہ ان کا ایک وفد حضرت ربیعہ کی قیادت میں بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا تھا اور اپنے اسلام کا اقرار کیا تھا۔ ان کے قبول اسلام کی طرف اشارہ کرتا ہے[۲۶]۔ کچھ مدت کے بعد ایک مرکزی منتظم اور عامل صدقات صنعا بھیجا گیا تھا۔ جہاں بنو عنس آباد تھے[۲۷]۔ یہ ان کے اسلام کا ایک اور ثبوت ہے۔ لیکن بعض جدید مؤرخین عہد نبوی میں عنس اور مذحج کے قبول اسلام کے سرے سے منکر ہیں اور ان کی واحد دلیل یہ ہے کہ اسود عنسی نے حیاتِ نبوی میں ہی نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور مدینہ کی اسلامی ریاست کے خلاف مذحج ہی کے ایک طبقہ کے تعاون اور مدد سے بغاوت کردی تھی[۲۸]۔ لیکن ان کا یہ نظریہ واقعات و حقائق کی روشنی میں ثابت نہیں ہوتا ہے۔ ان مستشرقین اور جدید مؤرخین کو بھی اعتراف ہے کہ اسود عنسی اور اس کی بغاوت کا خاتمہ حیات نبوی ہی میں خود اسی کے لوگوں نے یمن کے ایرانی

باشندوں کی مدد سے کر دیا تھا اور اسلامی ریاست کی حکمرانی پھر سے قائم کر دی تھی۔ اسود عنسی کا خاتمہ کرنیوالے اور مدینہ منورہ کی حکومت کو پھر سے قائم کرنے والے ظاہر ہے کہ مسلمان تھے۔ اس سلسلے میں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ خود اسلامی ریاست و حکومت نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے کوئی فوج نہیں بھیجی تھی۔ مآخذ سے واضح ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد وفادار مسلمانوں کے طبقات اور ان کے سرداروں کو خطوط لکھے تھے اور انکو اسود عنسی کا خاتمہ کرنے اور اس کی مرکز مخالفت تحریک کو کچلنے کا حکم دیا تھا۔ اور انہوں نے اس کی بجان و دل تعمیل کی تھی۔ لہٰذا ابلا ریب یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذحج اور عنس میں خاصا طاقتور طبقہ مسلمانوں پر مشتمل تھا جو عارضی طور سے اسود عنسی کی بغاوت اور اقتدار سے معطل ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کے حامیوں نے یمن کے مسلمان گورنر حضرت شہر بن باذان کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن جونہی مسلم طبقات اس عارضی صدمے سے سنبھلے اور ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط و فرامین نے بھی سنبھلنے میں خاصی مدد دی تھی، انہوں نے بیک آن و حملہ اسود عنسی اور اس خطرہ کا خاتمہ کر کے اسلام کی حکمرانی کو پھر سے حیاتِ تازہ عطا کر دی[149]۔

(۲) بنو مراد

مراد کے لوگ بھی مذحج کے دوسرے خاندانوں کی مانند کافی بعد کے زمانے میں غالباً حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کی مذکورہ بالا مہم یمن کے بعد ہی اسلام کے ماننے والے بنے تھے۔ طبری کا یہ بیان خاصا اہم ہے کہ ہمدان کے قبول اسلام کے بعد یمن کے باقی خاندانوں اور قبیلوں نے اسلام قبول کرنے میں خاصی تیزی دکھائی تھی[150] طبری ہی کا دوسرا بیان ہے کہ مراد کے ایک طاقتور ترین سردار حضرت فروہ بن مُسیک مرادی نے سنہ ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں بارگاہ نبوی میں حاضری دی تھی اور انہوں نے نہ صرف اپنے اسلام کا اعلان و اقرار کیا تھا۔ بلکہ اپنے قبیلہ کی جانب سے بھی ذمہ داری قبول کی تھی یا اس کے قبول اسلام کی یقین دہانی کرائی تھی[151] لیکن ہمارے بعض مشکل پسند جدید مستشرقین کا خیال ہے کہ حضرت فروہ بن مسیک مرادی کا قبول اسلام اپنے ابتدائی زمانے میں محض ایک سیاسی مفاہمت تھی اور مدینہ کی اسلامی ریاست سے صرف ایک سیاسی اتحاد کیونکہ ان کے اپنے حلیف کندی بادشاہوں نے مراد اور ہمدان کے درمیان باہمی خانہ جنگی میں ان کے قبیلہ کی مدد نہیں کی تھی اس لئے وہ ہمدان اور اپنے دوسرے حریفوں کے خلاف اسلامی ریاست کی امداد و اعانت اور سیاسی اتحاد کے ذریعہ اپنی طاقت کو مستحکم کرنا چاہتے تھے[152]۔ اگر یہی سیاسی صورتحال تھی اور ان کا قبول اسلام محض ایک سیاسی اتحاد تھا تو ان کے حریف و رقیب قبیلہ کو تو مخالف گروہ یا اتحاد میں ہونا چاہیئے تھا یا کم از کم وہ خود اپنے دشمن کے سیاسی اتحادیوں سے اتحاد نہ کرتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے حریف ہمدان بھی ریاست اسلامی کے حلیف، اتحادی اور وفادار بن چکے تھے۔ پھر فروہ بن مُسیک مُرادی کو اس اتحاد سیاسی سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا؟ مستشرقین کی دلیلوں اور دعوؤں کا اندرونی تضاد ان کے خیال خام کی تردید کے علاوہ ثابت کرتا ہے کہ دونوں متحارب گروہوں کو پابند

امن کی تلاش تھی جوان کو بالآخر اسلام کے سایۂ عاطفت میں ملا اور وہ دونوں ہی اسلام کے حامی و ہمنوا اور ریاست اسلامی کے وفادار و اتحادی بن گئے۔ اس سے نہ صرف حضرت فروہ بن مسیک کے حسن اسلام کی توثیق ہوتی ہے۔ بلکہ ان کے قبیلے کے قبول و اخلاص اسلام کی بھی۔ دوسرے شواہد کے علاوہ [43] اس حقیقت سے بھی مراد کے حسن و قبول اسلام کی تائید ہوتی ہے کہ ردّہ کے زمانے میں حضرت فروہ اور ان کے قبیلہ والے نہ صرف اسلام پر ثابت قدم رہے تھے بلکہ انہوں نے اسود عنسی کی تحریک بغاوت کو کچلنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا [44]۔ انہی مآخذ کا یہ بھی بیان ہے کہ حضرت فروہ بن مسیک مرادی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قبیلہ مراد کے علاوہ زبید اور پورے مذحج کا مقامی منتظم اور عامل صدقات مقرر کر دیا تھا اور وہ پوری دیانت داری خلوص اور لگن کے ساتھ صدقات مدینہ بھیجتے رہے تھے اور ان پیچھے اور پکے مسلمان امراء میں سے تھے جنہوں نے ردّہ کے پرہول زمانے میں بھی اپنے فرائض سے غفلت نہیں برتی تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ اپنے ان عہدوں پر خلافت فاروقی کے اواخر تک فائز رہے تھے [45]۔

(۳) سعد العشیرہ

ذکر آچکا ہے کہ سعد العشیرہ اسلام سے مکی عہد قدیم ہی میں متعارف ہو چکے تھے۔ ابن حزم نے ان میں متعدد صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق ان کے متعدد بطون اور گھرانوں سے تھا۔ حضرت مالک بن مشوف بنو عائذ کے سردار (رئیس) تھے۔ ان کے علاوہ حضرت عبید بن حزن وغیرہ کئی مسلمانوں کا ذکر اس گھرانے میں ملتا ہے [46]۔

جعفی

سعد العشیرہ کا نسبتاً ایک بڑا گھرانا تھا۔ جن میں اسلام ان کے اصل قبیلہ کے ساتھ ہی آیا تھا۔ ابن حزم نے اس خاندان کے متعدد مسلمانوں کا ذکر کیا ہے جو اپنے علاقہ کے ممتاز و سربرآوردہ حضرات تھے۔ ان میں سے متعدد نسبتاً ابتدائی دور کے مسلمان تھے۔ ان میں حضرت قیس بن سلمہ بن شراحیل جو جعفی وفد کے ایک رکن تھے اور مدینہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کر چکے تھے۔ ابو سبرہ بن زید اور ان کے دو فرزند گرامی سبرہ اور عبدالرحمٰن ممتاز مقام کے حامل تھے [47]۔ یہ ان جعفی مسلمانوں کے علاوہ تھے جو مدینہ ہجرت کر کے جا چکے تھے اور جنہوں نے غزوہ بدر میں شرکت کی سعادت حاصل کی تھی۔ یہ دراصل قریش مکہ کے حلفاء میں سے تھے۔ ان میں حضرت ابو خولی کے تین فرزند گرامی خولی، ہلال اور عبداللہ بدری صحابی تھے۔ ابن سعد نے اگرچہ بدری صحابہ کی فہرست میں صرف حضرت خولی کو شمار کیا ہے۔ تاہم اس کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابو خولی کا پورا گھرانا جو متعدد افراد پر مشتمل تھا ابتداء عہد نبوی ہی میں اسلام لا چکا تھا [48]۔ بہرحال اصل قبیلہ میں فتح مکہ کے بعد ۹ھ / ۶۳۰ء میں یا اس کے بھی کچھ بعد حضرت قیس بن سلمہ جعفی کو مران، حریم اور کلاب کے قبیلوں اور ان کے موالی (حلیفوں) سے صدقات، وصول کرنے کا افسر مقرر کیا گیا تھا [49]۔ ظاہر ہے کہ یہ سب لوگ اسلام لا چکے تھے۔

زبید

زبید کا قبول اسلام مذحج کے دوسرے خاندانوں یا مادر قبیلہ کی مانند حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کی مہم یمن کا نتیجہ تھا۔ جیسا کہ واقدی کا خیال ہے۔ اس کے مطابق زبید کا ایک خاصا بڑا حصہ مسلمان ہو گیا تھا اور انہوں نے اپنے ذمہ واجب الادا صدقات ادا کر دیئے تھے۔ اس سے زیادہ واقدی کا یہ جملہ دلچسپ ہے کہ تقریباً تمام کے تمام زبیدی حضرت علی سے قرآن کریم اور دین کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے تھے۔[۵۰] اپنے قبول اسلام کے بعد انہوں نے ایک وفد جو دس آدمیوں پر مشتمل تھا۔ عمرو بن معدی کرب کی قیادت میں بارگاہ رسالت میں مدینہ بھیجا تھا۔ اس وفد نے اپنے مسلمان ہونے کا اقرار و اعلان کیا تھا اور اسلامی ریاست سے مکمل وفاداری کا حلف اٹھایا تھا۔[۵۱]

زبید کا ایک طبقہ جو قیس بن مکشوح کی قیادت میں تھا۔ بہرحال کافی مدت تک اسلام کے دائرے سے خارج رہا۔[۵۲] یہ بات قابل ذکر ہے کہ عمرو بن معدی کرب کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عہدہ نہیں عطا فرمایا تھا۔ حالانکہ وہ اپنے قبیلہ کے ایک سردار تھے۔ ذکر آچکا ہے کہ زبید کے لیے بھی مراد کے ایک شخص کو عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ عمرو بن معدی کرب وطن لوٹ آئے تھے اور وفات نبوی کے بعد نہ صرف مرتد ہو گئے تھے۔ بلکہ انہوں نے ردہ تحریک میں خاصا مؤثر اور فعال کردار بھی ادا کیا تھا۔[۵۳] ان کے ارتداد کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ پورا قبیلہ اسلام سے پھر گیا تھا۔ جیسا کہ مستشرقین نے نتیجہ نکالا ہے یہ صحیح ہے کہ ان کے زیر اثر لوگوں نے ارتداد میں حصہ لیا تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے قبیلہ کے زیادہ لوگوں نے ان کی مخالفت کی تھی اور مدینہ کے نمائندے اور منتظم و عامل صدقات، حضرت فروہ بن مسیک مرادی کی مدد کی تھی۔ یہ قابل ذکر بات ہے کہ انہوں نے لیئے ہی بھی بند تک سے خلاف اسلامی ریاست کی امداد و اعانت کی تھی اور یہ ان کے خلوص اسلام کی ایک عظیم و روشن دلیل تھی اور اس سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ حضرت عمرو بن معدی کرب پھر اسلام لے آئے تھے۔

رُہاء

رہاء مذحج کا ایک اور اہم قبیلہ تھا اور وہ بھی حیات نبوی کے آخری برس میں اسلام کا حلقہ بگوش بنا تھا۔ انہوں نے اسلام اور اسلامی ریاست سے وفاداری کے اظہار کے لیے پندرہ آدمیوں (نفر) پر مشتمل ایک وفد بارگاہ نبوی میں بھیجا تھا[۵۴]۔ ماخذ کے ایک تبصرہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رہاء کے لوگ اشعر کے پڑوسی تھے۔ اور ان کے اسلام کے زیر اثر کچھ رہاوی افراد بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ چنانچہ خیبر میں رہاوی صحابیوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعریوں کے ساتھ خیبر کی پیداوار سے حصہ عنایت فرمایا تھا۔[۵۵] عام خیال ہے کہ یہ حصہ ان کو ۷ھ میں مدینہ آنے پر دیا گیا تھا۔ لیکن اشعریوں کے ساتھ ان کو شامل کرنے سے یہ خیال زیادہ قرین معلوم ہوتا ہے کہ وہ تینوں ابتدائی مسلم تھے۔ جو حضرت ابو موسیٰ اشعری کی تبلیغ و دعوت پر اسلام لائے تھے اور پھر انہی کے ساتھ مدینہ ہجرت کر گئے تھے۔ بہرحال اس قبیلہ / خاندان کے سب سے نمایاں صحابی بلا شک و شبہ

حضرت مالک بن مرارہ رُہاوی تھے۔ جن کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ ابن حزم نے دو اور رہاوی مسلمانوں حضرات عمرو بن سُبیع اور یزید بن شجرہ کے نام بھی صحابہ کرام میں شمار کئے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر اپنے قبیلہ کے وفد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لئے مدینہ گئے تھے۔ جبکہ مؤخر الذکر صحابی کا ذکر حضرت معاویہ کے حامی صحابہ میں کیا گیا ہے۔ جو صفین کی جنگ میں شریک تھے۔[۵۶]

صُداء

مذحج کا ایک بڑا قبیلہ / بطن صُخم صداء تھا۔ اور ابن سعد کے مطابق اس نے بھی اسلام اپنے مادر قبیلہ کے ساتھ قبول کیا تھا، اگرچہ اس کے کسی مسلمان کا نام مؤرخ موصوف نے نہیں بیان کیا ہے۔ بہر حال اسد الغابہ سے کم از کم ایک صحابی حضرت حِبّان بن بُحّ کا ذکر ملتا ہے جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مقامی قبیلہ کا عامل صدقات مقرر کیا تھا۔ لیکن انہوں نے اس کار منصبی کا اپنے کو اہل نہیں سمجھا تھا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معذرت کر لی تھی۔[۵۷]

نَخَع

نخع بھی مذحج کا ایک کافی بڑا بطن / خاندان تھا۔ وہ اسلام کا حلقہ بگوش اپنے مادر قبیلہ کے ساتھ ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں بنا تھا یہ اہم بات ہے کہ ماخذ اس کے وفد کی آمد مدینہ کی بالکل متعین تاریخ بیان کرتے ہیں۔ ان کے مطابق نخعی وفد غالباً سب سے آخری تھا۔ جو مدینہ میں ۱۵ محرم ۱۱ھ / ۱۰ اپریل ۶۳۲ء میں پہنچا تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت ارطاۃ بن شراحیل اس کے قائد تھے۔ مگر طبری کا خیال ہے کہ حضرت زُرارہ بن عمرو اس کے سربراہ تھے[۵۸]۔ یہ امکان ہے کہ نخع نے دو وفود بارگاہ نبوت میں بھیجے ہوں جیسا کہ بعد کے ایک ماخذ سے محسوس ہوتا ہے۔[۵۹] یہ بات ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ نخع کے وفد کے ارکان کی تعداد دو سو نفوس سے زیادہ تھی اور یہ ان کے قبول اسلام بلکہ مکمل قبول اسلام کا ایک بڑا ثبوت ہے۔ اگرچہ نخعی مسلمانوں کے زیادہ نام ماخذ میں مذکور ہیں۔ تاہم ان کے متعدد مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے ان میں سے حضرات جُمیش بن یزید، ارقم بن کعب، زرارہ بن قیس اور قیس بن عمرو کافی ممتاز لوگ تھے[۶۰]، مگر مونٹگمری واٹ کو اصرار ہے کہ وہ سب عیسائی تھے۔

بنو الحارث بن کعب

بنو الحارث بن کعب بھی مذحج کے ایک بطن کی حیثیت رکھتے تھے! اور خاصے بڑے قبیلے کے لوگ تھے اور ایک آزاد قبیلہ بن گئے تھے۔ ان کا ایک ذیلی خاندان بنو عبد المدان تھا جو بجائے خود قبیلہ تھا۔ جنوبی عرب میں ان دونوں مذحجی گھرانوں کو ممتاز مقام حاصل تھا۔[۶۱] یہ بات اہم اور دلچسپ بھی ہے کہ بنو مذحج میں بنو الحارث بن کعب عام طور سے اور بنو عبد المدان

خاص طور سے پہلے قبائل یا بطون تھے جنہوں نے اسلام میں سبقت کی تھی۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ ان دونوں خاندانوں نے حضرت خالد بن ولید مخزومی کی دعوت و تبلیغ پر اسلام قبول کیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کو حضرت علی بن ابی طالب کی فتح یمن سے کوئی چھ ماہ پہلے بھیجا تھا جو عموماً نجران کی مہم کہلاتی ہے یہ کوئی فوجی مہم نہیں تھی بلکہ مذہبی جماعت تھی جو تبلیغ اسلام کی خاطر بھیجی گئی تھی۔ روایات کا اتفاق ہے کہ پورا قبیلہ بنو الحارث معہ بنو عبد المدان کے حضرت خالد کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ ہدایات نبوی کے مطابق حضرت خالد نے کافی طویل عرصے تک ان کے بیچ قیام کیا تھا اور ان کو دین کی تعلیم دی تھی اور ان کی پاکیزہ تربیت بھی کی تھی۔ پھر مدینہ سے آنے والی نئی ہدایات کے مطابق حضرت خالد بن ولید مخزومی نے ان کے سربرآوردہ لوگوں پر مشتمل ایک وفد بارگاہ نبوی میں بھیجا تھا۔ جہاں انہوں نے اپنے اسلام کا پھر سے اقرار کیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید مخزومی کی پرخلوص، انتھک اور کامیاب کوششوں کی تعریف و تحسین فرمائی تھی[۶۲]۔ ہمارے مسلم مؤرخین اس روایت کو عموماً نظر انداز کر دیتے ہیں اور حضرت خالد بن ولید پر ناکامی کا الزام محض اس لئے تھوپ دیتے ہیں کہ وہ یمن میں اشاعت اسلام کا سارا شرف حضرت علی بن ابی طالب کو دینا چاہتے ہیں[۶۳]۔ بہر حال کچھ مدت بعد وفد کے ایک ممتاز رکن حضرت قیس بن حصین کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ کا مقامی منتظم اور سردار مقرر کیا تھا[۶۴]۔ یہ بطن یا خاندان خاصا بڑا تھا کیونکہ اس کے متعدد ذیلی گھرانوں جیسے بنو الضباب، بنو قنان، بنو عبد یغوث، اور بنو زیاد وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ بہر حال یہ سب گھرانے بھی عہد نبوی ہی میں مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے[۶۵]۔

خولان

خولان کا اگرچہ مذحج سے نسبی تعلق نہیں تھا۔ لیکن وہ دوسرے سماجی اور معاشی اسباب سے مذحج ہی سے وابستہ تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ خولان کا اصلی قبیلہ اور اس کی تمام ذیلی شاخیں ۱۰ھ سے پہلے نصف / ۶۳۱ء کے نصف ثانی میں اسلامی امت کی رکن بن گئی تھیں۔ اس سال شعبان میں ان کے دس سربرآوردہ و ممتاز افراد پر مشتمل ایک وفد بارگاہ نبوی میں پہنچا تھا۔ جس نے اپنے اسلام کے اظہار و اقرار کے علاوہ اپنے قبیلہ کی جانب سے بھی دعویٰ کیا تھا[۶۶]۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ مآخذ اس قبیلہ میں اسلام کی تبلیغ و تدریج کی رفتار، نہج اور انداز وغیرہ سے متعلق تفصیلات کو نہیں بیان کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے زمانے میں ان کے ایمان و عقیدے کی مضبوطی۔ اسلام سے غیر متزلزل وفاداری اور اسلامی حکومت و ریاست کی بیش بہا خدمات کے لئے ان کی بے انتہا تعریف و توصیف کرتے ہیں[۶۷]۔ بہر حال اس سے بالواسطہ اور مضمر انداز میں سہی یہ تو معلوم و ثابت ہو جاتا ہے کہ خولان کے تمام خاندان اور گھرانے عہد نبوی ہی میں اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے تھے۔ ان کے قبول اسلام کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعدد افراد کو خاص کر حضرت معدی کرب بن ابرہہ اور حضرت ابی مکوک بن عبد رضا کو قطائع (اراضی) کے عطیات عطا فرمائے تھے[۶۸]۔

— — — — — — — — — — —

(ع) نہد

نسبی اعتبار سے بنو نہد کا تعلق قبیلہ قضاعہ سے تھا۔ جو زمانہ جاہلیت میں کسی وقت شمالی عرب میں ہجرت کر گئے تھے اور مدینہ منورہ کے شمال میں جا بسے تھے۔ لیکن بنو نہد کا خاندان جنوبی عرب کے اپنے روایتی علاقے میں مقیم رہا تھا وہ یمن میں نجران کے نواح میں آباد تھے اور اسی طرح بنو الحارث بن کعب کے پڑوسی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ نہد خود ایک قبیلہ بن گیا تھا جس کے اپنے متعدد بطون / خاندان تھے[۶۹]۔ نہد کے اصل قبیلے یا اس کے ذیلی خاندانوں کے قبول اسلام کے بارے میں ہمیں براہ راست معلومات نہیں ملتی ہیں۔ مگر جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کے نام بعض خطوط و فرامین سے ان کے قبول اسلام خاص کر ان کے ایک خاندان بنو قُرہؓ کے حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کا علم ہوتا ہے۔ ان خطوط میں نہد کے لوگوں کے لیے وہ تمام فرائض و واجبات بیان کئے گئے ہیں جو مسلمانوں پر ہی عائد ہوتے ہیں۔ مثلاً نماز یں قائم کرنا، صدقات بشمول زکواۃ ادا کرنا وغیرہ لیکن جو جملہ یا حکم نبوی ان کے مسلمان ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے وہ یہ کہ مشرکوں سے وہ کلی طور پر اجتناب کریں اور ان سے کسی قسم کا اختلاط نہ رکھیں۔ اس کے علاوہ مضمراً ہم ان کے بعض مسلمانوں کے نام سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ ان کے قبولِ اسلام کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بعض افراد کو ان کے اپنے علاقے میں بعض قطائع عطا فرمائے تھے[۷۰]۔

(ف) ازد

دراصل ازد ایک بہت بڑے اور عددی لحاظ سے طاقتور قبیلہ کا نام تھا۔ جس کی متعدد شاخیں متعدد مقامات پر مختلف زمانوں میں آباد ہوتی رہی تھیں[۷۱]۔ چنانچہ وہ اپنے علاقوں کی نسبت سے پکاری جاتی تھیں۔ جیسے ازد یمن، ازد جُرش، ازد عمان ازد شنوءہ وغیرہ، ان کی دو تین اہم شاخیں جنوبی عرب میں آباد تھیں۔ ان میں سے ازد جُرش نجران کے عیسائیوں کے قریبی پڑوسی تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مؤخر الذکر بھی نسبی لحاظ سے ازد ہی کی ایک شاخ تھے۔ ان کے علاوہ ازد یمن کی دوسری اہم شاخیں اور خاندان تھے۔ بنو غامد، بنو بارق اور بنو غافق وغیرہ

ہمارے مآخذ کا بیان ہے کہ سنہ ۱۰ھ / سنہ ۶۳۱ء تک ازد یمن کا اصل قبیلہ مع اپنی ذیلی شاخوں اور بطون کے اسلام کا حلقہ بگوش ہو گیا تھا[۷۲]۔ ان کے سب سے پہلے مسلمان غالباً حضرت صُرد بن عبداللہ ازدی تھے۔ جنہوں نے اپنے قبیلے کو مسلمان بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اس کے کچھ مدت بعد وہ اپنے قبیلہ کے اسلام اور اسلامی ریاست سے وفاداری اور شرائط استواری کا اظہار کرنے کے لئے مدینہ منورہ کو ایک وفد لیکر گئے تھے جس میں دس مسلم حضرات شامل تھے۔ انہوں نے صرف اپنے اسلام کا اعلان و اقرار نہیں کیا تھا بلکہ اپنے پورے خاندان کے اسلام کا اعلان و اقرار بھی کیا تھا۔ اسلام کے لئے ان کی شاندار خدمات کے عوض ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ کا سردار مقرر کر دیا تھا۔ اس اعترافِ خدمات اور اظہار پسندیدگی رسولؐ نے ان میں

اسلام کی پرجوش تبلیغ کرنے کا ایک نیا ولولہ جوش اور جذبہ پیدا کر دیا تھا اور انہوں نے ازدِ جُرش کو مسلمان بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ چنانچہ انہوں نے نہ صرف لقیہ ازد جرش کو بلکہ خثعم کے بھی ایک حصہ کو اسلامی امت کا مخلص رکن بنا دیا تھا۔ کچھ مدت بعد ازد جرش کا ایک اور وفد بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا۔ جس نے ان دونوں قبیلوں کے مکمل قبول اسلام کی تصدیق کی تھی۔ لبعض اراکین وفد کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قطائع اور اراضی انہی کے علاقوں میں عطا فرمائی تھی۔ مذکورہ بالا تینوں خاندان / بنو غامد، بنو بارق اور بنو غافق ...... نے اسلام قبول کر لیا تھا اور مدینہ منورہ کو اپنے وفود بھیجنے میں بڑی تیزی دکھائی تھی۔ ان کے اور لبعض دوسرے ازدیوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو گرامی نامے عطا کئے تھے۔ ان کے متون سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سب مسلمان ہو گئے تھے۔ ازد اور خاص کر اس کے خاندان بنو بارق کے لبعض سربرآوردہ لوگ مثلاً حضرات ضماد جُنادہ، ابو ذُبیان اور عمرو بن عبداللہ وغیرہ ؁ ان کے نام خطوط نبوی سے ان کے قبول اسلام کے بارے میں کوئی شک شبہہ نہیں رہ جاتا ہے۔

ازدِ یمن کے قبول اسلام پر بحث کے ضمن میں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس کے صرف کافر و مشرک طبقات ہی نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ بلکہ نجران کے عیسائیوں اور یمن کے یہودیوں نے بھی یہ شرف حاصل کیا تھا، خواہ ان کی تعداد کتنی ہی مختصر کیوں نہ رہی ہو۔ واقدی کا دعویٰ ہے کہ یہود یمن کے عظیم عالم حضرت کعب الاحبار حضرت علی بن ابی طالب کی دوسری مہم کے دوران مسلمان ہو گئے تھے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ حضرت کعب نے پھر دعوت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی تھی۔ اور اپنے متعدد ہم مذہبوں کو مسلمان بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے؁ یہ بھی اہم نکتہ ہے کہ جزیرہ نمائے عرب سے جب یہود جلا وطن کئے گئے تھے۔ تو ان میں یہود یمن کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ جبکہ نصاریٰ نجران کا واضح حوالہ موجود ہے۔

(ک) کندہ

ازد کی طرح کندہ کی بھی متعدد شاخیں جزیرہ نمائے عرب کے مختلف مقامات پر آباد تھیں۔ ان میں شمالی عرب کی شاخیں بھی تھیں اور جنوبی عرب کی بھی۔ ہم نے اپنے ایک مباحثے میں دومۃ الجندل کی کندی مملکت کے اسلامی ریاست سے مذہبی اور سیاسی تعلقات کا جائزہ پہلے ہی لے لیا ہے۔ بہرحال اصل قبیلہ معہ اپنی اہم شاخوں اور خاندانوں (بطون) کے جنوب ہی میں آباد تھا جن میں بنو معاویہ، بنو وہب، بنو رئیش، بنو اشرس، بنو سکون اور اسکا سک بڑے اور طاقتور خاندان تھے اور وہ یمن اور حضر موت کے متعدد مقامات پر آباد تھے؁

جنوبی عرب کے دوسرے مقامات اور قبیلوں کی طرح قبیلہ کندہ میں بھی اسلام کی نشر و اشاعت کا آغاز فتح مکہ کے بعد ہی شروع ہو سکا، اگرچہ اس کے پہلے زمانے میں لبعض انفرادی قبول اسلام کی مثالوں کے امکان کو قطعی طور سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے قبول اسلام کا اوّل قرینہ ان کے خاندان بنو سکون کے گھرانے بنو تجیب کے متعدد افراد پر مشتمل ایک وفد کے مدینہ میں آنے سے ملتا ہے۔ جو ۹ھ کے اول دنوں میں یا ۶۳۰ء کے وسط میں آیا تھا۔ ایک قابل ذکر اور اہم بات ان کے سلسلے

میں یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف زبانی طور سے اپنے قبول اسلام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاداری کا اظہار کیا تھا بلکہ عملاً مظاہرہ یہ کیا تھا کہ اپنی قوم پر واجب صدقات کی رقم اور جانور ساتھ لے کر مدینہ پہنچے تھے[۷۸]۔ کچھ مدت کے بعد اصل قبیلہ کا وفد جس میں ساٹھ سترا ارکان تھے۔ اپنے عظیم ترین اور باوقار ترین سربراہ و سردار حضرت اشعث بن قیس کندی کی قیادت میں حاضر ہوا تھا[۷۹]۔ ان کے قبول اسلام اور وفاداری کا یقین ہو جانے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قبیلے بنو کندہ اور صدلیف کے لیے ایک مرکزی سردار و منتظم اور عامل صدقات مقرر فرمایا تھا۔ مؤخر الذکر قبیلے نے بھی اس زمانے میں اسلام قبول کیا تھا اور اپنا وفد مدینہ بھیجا تھا۔ محمد بن حبیب بغدادی کے مطابق ان پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مہاجر بن امیہ کو عامل و امیر مقرر کیا تھا۔ اور موصوف نے ان کے صدقات وصول کر کے مدینہ پہنچائے بھی تھے[۸۰]۔

ابن حزم نے کندہ کے گھرانے بنو معاویہ کے چھ صحابہ کا ذکر کیا ہے: حضرات اشعث بن قیس، ان کے بھائی سیف بن قیس جو اس وفد کی زیارت کے دوران اپنے قبیلہ کے مؤذن بھی مقرر کئے گئے تھے۔ ابراہیم بن قیس، شرحبیل بن سمط، حجر بن عدی اور شریح بن مرہ۔ بنو وہب کے صحابہ کرام میں جو بنو معاویہ کی ایک ذیلی شاخ تھی اور حضر موت میں آباد تھی۔ کم از کم دو حضرات یزید اور ان کے والد اسود بن سلمہ کا ذکر ملتا ہے۔ بنو معاویہ ہی کے ایک اور گھرانے بنو شیطان میں، جن کا نام بعد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو عبد اللہ رکھ دیا تھا۔ کم از کم تین صحابیوں کا ذکر ملتا ہے وہ تھے: حضرات سائب بن یزید، کثیر بن صلت، امرالقیس بن عابس۔ موخر الذکر صحابی کی بے انتہا تعریف و توصیف ان کے ان شاندار کاموں کے لیے کی گئی ہے جو انہوں نے ردہ کے زمانے میں اسلام کے لیے انجام دیے تھے۔ خاندان بنو تجیب کے صرف ایک صحابی حضرت معاویہ بن حدیج کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بنو تجیب ردہ کے زمانے میں زیادہ تر وفادار مسلمان رہے تھے[۸۱]۔

اگرچہ سکاسک اور سکون کے بعض خاندانوں نے شمال میں نقل وطن کر کے بستیاں بسالی تھیں۔ تاہم ان کے تمام اہم خاندان اور گھرانے جنوب میں مقیم و آباد رہے تھے اور وہ بھی غالباً فتح مکہ کے بعد کسی وقت مسلمان ہوئے تھے۔ سنہ ۹ھ / سنہ ۶۳۱ء میں ان کے ایک خاندان بنو غوث کے ایک مسلم حضرت عکاشہ بن ثور کا ذکر ملتا ہے کہ وہ ان پر متعالی منتظم اور عامل صدقات مقرر کئے گئے تھے[۸۲]۔

(ل) حضر موت / حضارمہ

ماہرین انساب کے مطابق حضر موت یقطان کے ایک بیٹے اور قحطان کے ایک بھائی کا نام تھا۔ بنو حضر موت یمن کے جنوب مشرق میں جزیرہ نمائے عرب کے بالکل آخری گوشے میں بستے تھے۔ جو بعد میں انہی کے نام سے منسوب ہو گیا[۸۳]۔ اس قبیلہ / علاقہ کے سب سے پہلے مسلمان حضرت علاء بن حضرمی تھے[۸۴]۔ دوسرے شریح حضرمی تھے[۸۵]۔ لیکن وہ اپنے علاقہ کو چھوڑ کر مکہ یا مدینہ میں آباد ہو گئے تھے۔ اس لیے بنیادی طور پر ان کا اسلام ان کے قبیلہ کا نہیں تھا۔ اور

نہ ہی ان کے اسلام کا اثر ان کے قبیلے پر پڑا تھا۔ بہرحال اصل قبیلہ میں اسلام کی اشاعت بعد کے زمانے میں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلامی امت کے رکن قبیلہ کندہ کے ساتھ بنے تھے کیونکہ وہ ان کے پڑوسی تھے۔ ابن حزم کے مطابق حضرت وائل بن حجرؓ اور حضرت ربیعہ بن عیدان حضرموت کے سربرآوردہ ترین لوگوں میں سے تھے جو اسلام سے مشرف ہوئے تھے[86] تین مزید صحابہ۔ حضرات ربیعہ بن ذی المرحب، ربیعہ بن لَہشعہ اور مسعود بن وائل ..... کے نام بھی اسی زمانے کے مسلمانوں میں گنائے جاتے ہیں[87]۔ بہرحال حضرت وائل بن حجر حضرموت کے اقیال (حکمرانوں / شہزادوں) میں سے ایک تھے جن کے قبول اسلام کا اثر ان کے لوگوں پر پڑا تھا اور وہ اپنے مسلمان قبیلہ والوں کا ایک وفد بھی لیکر سنہ ۹ھ/۶۳۱ء میں بارگاہِ رسالتمآب میں گئے تھے۔ ابن سعد کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرموت کے لوگوں کا قبول و اقرار اسلام دراصل ان کے حکمرانوں کے قبول اسلام کا نتیجہ تھا۔ بنو صدیف جو حضرموت کے لوگوں ہی کا ایک حصّہ تھے۔ اسی زمانے میں ہی مسلمان ہوئے تھے۔ جیسا کہ ان کے وفد کی آمد سے ظاہر ہوتا ہے[88]۔

(۴) اَلاَبناء

الابناء کے لفظی معنی فرزندوں / بیٹوں کے آتے ہیں اور یہ لفظ اس ایرانی قوم کے لئے استعمال ہوتا تھا جو یمن میں مدتوں سے آباد تھے اور ایک طرح سے "دھرتی کے لال" تھے۔ حالانکہ وہ عرب قبائلی نظام کا کسی طور حصہ نہ تھے۔ لیکن ان پر بحث کئے بغیر جنوبی عرب میں اسلام کی ترویج و اشاعت کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ بہرحال وہ عہد نبوی کے معاصر (لوگ) تھے اور انہوں نے اسلامی ریاست اور اسلام کے لئے شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ یہ ایرانی طبقات یمن میں اس وقت سے آباد اور بسنا شروع ہوئے تھے جب جنوبی عرب کا یہ سرسبز و شاداب علاقہ ایران کی ساسانی سلطنت کا ایک ماتحت صوبہ بنا تھا۔ جس پر شہنشاہِ ایران ..... کسریٰ ..... اپنا گورنر مقرر کرتا تھا اور ظاہر ہے کہ اس دیار غیر میں اس کی مدد کے لئے ایک ایرانی فوج اور ایرانی عمال و افسروں کی ایک پوری جماعت بھیجی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ بہت سے ایرانی اس علاقے میں اس طرح رچ بس گئے کہ وہ یہیں کے باشندے اور فرزند سمجھے جانے لگے۔ عہد نبوی میں یمن کے ایرانی گورنر کا نام حضرت باذان یا باذام تھا اور وہ سنہ ۶۲۸ء میں شہنشاہ خسرو پرویز کے قتل کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر اسلام لے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے فرزند رشید حضرت شہر بن باذان کے علاوہ یقینی طور پر کچھ اور ایرانی بھی اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے تھے۔ اور کچھ مدت کے بعد تمام ایرانی طبقات اسلام کے مخلص پیرو اور اسلامی ریاست کے وفادار سپاہی بن چکے تھے[89]۔ مونٹگمری واٹ نے حضرت باذان یا ایرانی طبقات کے قبول اسلام اور اسلامی ریاست سے وفاداری کو صرف ایک سیاسی اتحاد قرار دیا ہے اور ان کے خلوص اسلام سے انکار کیا ہے[90]۔ لیکن مستشرق موصوف کا نظریہ و خیال غیر تاریخی اور غیر علمی ہے۔ انہوں نے مآخذ کی کثیر شہادتوں کو مسترد کر کے اپنے نظریہ کی بنیاد محض ظن و قیاس بلکہ کسی حد تک علمی و مذہبی تعصب پر رکھی ہے۔ حالانکہ ان کی تمام دلیلوں کی تردید واقعات سے ہوتی ہے۔

بہرحال قبول اسلام کے نتیجہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت باذان کو ان کے عہدہ پر برقرار رکھا اور پورا یمن ان کے زیر حکومت رہا۔ دو برس بعد ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند حضرت شہر کو ان کا جانشین مقرر کیا گیا تاآنکہ مدنی گورنر وہاں پہنچیں۔ سنہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یمن میں اسود عنسی کے ہاتھوں حضرت شہر کی شہادت کی خبر ملی جبکہ اس دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادہ یمن کے مختلف علاقوں کے گورنر پہنچ کر اپنا اپنا کام سنبھال چکے تھے۔ لیکن اسود عنسی کی بغاوت اور ردہ نے یمن میں سیاسی ابتری پیدا کر دی۔ بہرحال یہ ایرانی طبقات کے خلوص اسلام اور وفاداری و محبت رسول تھی۔ کہ وہ ردّہ کے زمانے میں اسلام پر قائم اور اسلامی ریاست کے وفادار رہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں الابناء سے عام طور پر اور ان کے سب سے بڑے سردار و قائد حضرت فیروز دیلمی سے خاص طور سے اسود عنسی کی بغاوت کچلنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اور ان ایرانی ابناء کے شرف کی بات ہے کہ انہوں نے ہی بغاوت کو فرو کر کے پھر سے یمن میں اسلام کی فرمانروائی بحال کی تھی۔ یہ ان کے قبول اسلام کی دلیل ہونے کے علاوہ ان کی ایمانی صلابت، رسول کریم سے محبت و عقیدت اور اسلامی ریاست سے وفاداری کی سب سے روشن تابناک اور درخشندہ مثال ہے۔ جس کی مزید تصدیق و توثیق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد خطوط و فرامین سے ہوتی ہے۔[۹۱]

جنوبی عرب میں خواہ وہ عرب قبیلے اور خاندان ہوں یا ایرانی ابناء اور ان کے غیر عرب طبقات ہوں۔ اسلام کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں ایک انتہائی اہم اور دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کے دوسرے خطوں اور ان کے قبائل کے مقابلے میں جنوبی عرب میں اسلام کی تبلیغ کی رفتار تیز تھی۔ اور اس نے بہ آسانی اور کم مدت میں ایک بڑے خطے کے لوگوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا تھا۔ اس کے اسباب و عوامل معلوم و معروف ہیں۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کے دوسرے خطوں اور قبیلوں نے اسلام اور اسلامی ریاست کی کافی مخالفت کی تھی اور اسلامی ریاست کو ان کے خلاف مسلسل فوجی کارروائی بھی کرنی پڑی تھی۔ مگر جنوبی عرب کے قبائل عرب و عجم کے بارے میں فوجی یا سیاسی آویزش کا عنصر نہیں ملتا ہے۔ جنوبی عرب کے سلسلے میں جہاں تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پالیسی کا تعلق ہے وہ ماخذ سے اور اوپر کی طویل بحث سے واضح ہے کہ تمام لوگوں کو اسلام کا پیرو بناتے اور اسلامی ریاست کا شہری بنانے کی پالیسی تھی اور وہ کسی لحاظ و اعتبار سے دوسرے خطوں، قبیلوں، علاقوں کے سلسلے میں اپنائی گئی پالیسی سے مختلف نہیں تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد خطوط و فرامین سے جو ماخذ میں محفوظ ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان کے سامنے دو متبادل رکھے تھے۔ یا تو وہ اسلام قبول کر کے اسلامی امت کے ارکان اور اسلامی ریاست کے مکمل شہری بن جائیں یا اپنے مذاہب پر قائم رہیں۔ تو جزیہ ادا کر کے اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی تسلیم کریں اور ذمی بن جائیں۔ تیسرا کوئی متبادل نہیں تھا۔ ابتدائی عہد نبوی میں جب اسلامی ریاست اتنی طاقتور اور مضبوط نہیں تھی، یہ تیسرا متبادل بھی تھا کہ وہ صرف اسلامی ریاست کے سیاسی حلیف بن جاتے تھے اور دونوں میں ایک دوسرے کے لئے باہمی تعاون و امداد کا معاہدہ طے پا جاتا تھا۔ لیکن غزوہ احزاب کے بعد یہ تیسرا متبادل ختم کر دیا گیا تھا اور صرف پہلے دو متبادل بچ رہے تھے۔ اسلامی

تاریخ کے مآخذ میں سے ایک بھی شہادت اور مثال اس تیسرے متبادل کی مدنی عہد کے نصف آخر سے نہیں پیش کی جا سکتی جبکہ باقی دونوں متبادل کی متعدد بلکہ کثیر شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ نصاریٰ، نجران، جنوبی و شمالی عرب کے یہود دومۃ اور ایلہ کی عیسائی مملکتوں، مقنا، اذرح اور جرباء کی یہودی بستیوں اور بحرین و عمان اور ہجر وغیرہ کے مجوسی طبقات وغیرہ سے جتنے بھی معاہدات نبوی ہوئے ان سب میں صرف پہلے دو متبادل .... اسلام یا جزیہ .... کا ذکر ملتا ہے۔

ہمارے جدید مؤرخین اور مستشرقین خاص کر مونٹگمری واٹ نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ تیسرا متبادل..... باہمی تعاون و امداد کا معاہدہ بغیر کسی مذہبی سمجھوتے کے .... عہد نبوی میں آخر تک موجود رہا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بقول متعدد غیر مسلم طبقات سے کسی مذہبی سمجھوتے کے بغیر باہمی سیاسی اور فوجی تعاون کے سمجھوتے کئے تھے ان میں بیشتر غیر مسلم طبقات خاص کر عیسائی یہودی اور ایرانی طبقات کے قبول اسلام کو وہ محض "سیاسی اتحاد" قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس سیاسی اتحاد کے لئے وہ کوئی تاریخی ثبوت نہیں پیش کر سکتے۔ کیونکہ تمام معاصر شہادتوں اور اسلامی تاریخ کی روایتوں کا ان کے برعکس اتفاق ہے۔ وہ محض قیاسات کی بنیاد پر تاریخی شواہد اور مآخذ کی روایتوں کو بڑی دلیری سے مسترد کر دیتے ہیں اور اپنی اس علمی بددیانتی اور تاریخی تحریف کو علمی کاوش اور تحقیق کا نام دیتے ہیں۔

(۵) قبائل پراگندہ عرب

اس عنوان کے تحت ان قبائل کے اسلام کے تعلقات پر بحث کی جائے گی جن کو ہم کسی سمت کے ساتھ مخصوص نہیں کر سکتے اور جو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف مقامات پر منتشر و آباد تھے۔ ایک لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ قبائل تھے، جو جزیرہ نما کے مشرقی خطے بلکہ پٹی پر خلیج فارس سے لیکر عراقی حدود تک بکھرے ہوئے تھے۔ نسبی اعتبار سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ مہرہ اور ازد عمان کو چھوڑ کر باقی تمام قبائل کا تعلق ربیعہ کے عظیم و مادر قبیلہ سے تھا[۹۲] جبکہ الذکر دونوں کا علاقائی اور نسبی تعلق جنوبی عرب کے بعض قبیلوں سے تھا۔ ان منتشر و پراگندہ قبیلوں میں حسب ذیل اہم ترین تھے:

(ا) ربیعہ : عبد القیس (۱) بنو عامر بن الاعشر

(ب) بنو حنیفہ : (۱) بنو مرہ (۲) بنو عبد اللہ (۳) بنو ذہل (۴) بنو ثعلبہ ..... بنو الدول کے گھرانے (۵) بنو عدی

(ج) ازد عمان : بنو معولہ بن عبد شمس

(د) مہرہ :

(س) تمیم : (۱) بنو اُسید بن عمرو (۲) بنو العنبر (۳) بنو مرہ (۴) بنو یربوع (۵) بنو نہشل (۶) بنو مجاشع (۷) بنو عبد اللہ بن دارم (۸) بنو جہم (۹) بنو مالک (۱۰) بنو زید مناۃ (۱۱) بنو منقار (۱۲) بنو عوف وغیرہ

(ط) وائل بن ربیعہ : (۱) بنو عنبر (۲) بنو بکر (۳) بنو تغلب (۴) بنو شیبان

ان منتشر و پراگندہ قبائل کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ مختلف علاقوں اور خطوں میں منتشر ہونے کے سبب ان کی کوئی

ایک سیاسی شناخت نہیں تھی اور نہ ہی وہ سب ایک سیاسی دائرہ اثر میں محدود تھے۔ ازد عمان اور مہرہ اگر جنوبی عرب کے قبائل سے متاثر ہوتے تھے، تو عبد القیس اور مجوس بحرین ایرانی دائرہ اثر و نفوذ میں آتے تھے۔ بنو حنیفہ کے کچھ طبقات عیسائی تھے تو باقی عرب دینِ قدیم پر عامل، جبکہ وائل بن ربیعہ کے متعدد خاندانوں میں مذہبی اور سیاسی اختلافات تھے۔ بہر حال ہم اسلام سے ان قبائل کے تعلقات کا آغاز بحرین کے عبد القیس سے کر رہے ہیں کہ یہی ان قبائل منتشر و پراگندہ میں سب سے پہلے اسلام کے علمبردار بنے تھے۔

(الف) عبد القیس

عبد القیس کا قبیلہ علاقائی اعتبار سے بحرین کا باشندہ تھا۔ اور اس کے کچھ لوگ عمان وغیرہ میں بھی آباد تھے۔ جبکہ نسب کے اعتبار سے وہ ربیعہ کے خاندانِ عظیم سے تھا۔ ذکر آچکا ہے کہ مکہ مکرمہ کی مرکزی سیاسی، سماجی اور مذہبی حیثیت کے سبب تمام قبائل وہاں کے معاملات سے اپنے زائرین، تاجرین اور کاروالوں کے ذریعہ واقف ہوتے رہتے تھے اور یہ قبائل پراگندہ بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ چنانچہ وہ سب اور خاص کر عبد القیس کا قبیلہ اسلام سے مکی عہد ہی میں متعارف و روشناس ہو گیا تھا۔ ابن سعد کی روایت ہے۔ جس کی تصدیق ابن قتیبہ سے بھی ہوتی ہے کہ عبد القیس کے ایک خاندان بنو عامر بن اعصر کے ایک سردار حضرت الاشج کو جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور و دعوت کی اطلاع ملی تو انہوں نے دریافتِ حال کے لئے اپنے بھانجے دہن کے لڑکے، عمرو بن عبد القیس کو مکہ بھیجا۔ چنانچہ وہ ہجرت کے سال یعنی ۶۲۲ء میں مکہ پہنچے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور کلامِ الٰہی سنتے ہی خود مسلمان ہو گئے۔ کچھ مدت تک قیام کیا اور زبان رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی پہلی سورہ اقراء سیکھی اور واپس بحرین پہنچے جبکہ ان کے راہ بر و دلیل اریقط بن عامر بن حارث مکہ ہی میں رہ گئے۔ الاشج نے بھانجے سے اسلام سے آگاہی حاصل کی اور مسلمان ہو گئے۔ اگرچہ اپنے قبولِ اسلام کو انہوں نے خفیہ رکھا تھا لیکن چپکے چپکے اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ اور کچھ مدت کے بعد روایات کے بموجب وہ سترہ یا بارہ عبد القیسی مسلمانوں کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنے اسلام کا اظہار و اقرار کیا۔ یہ بحرین اور خاص کر علاقہ عبد القیس میں اسلام کا پہلا بیج تھا۔ جو ہجرت نبوی سے قبل لگ چکا تھا اور برگ و بار لانے لگا تھا۔ بحرین واپس آکر ان عبدی نو مسلموں نے اسلام کی تبلیغ اپنے طور سے جاری رکھی اور رفتہ رفتہ ان کی تعداد بڑھتی رہی یہاں تک کہ اتنی ہو گئی کہ جواثی کے مقام پر انہوں نے ایک مسجد جمعہ بنالی اور ہجرت نبوی کے معاً بعد انہوں نے بھی جمعہ کی نماز اپنے یہاں قائم کی۔ سرزمین عرب پر مسجد نبوی کے بعد یہ دوسری مسجد تھی جہاں پہلا جمعہ اس علاقے کے مسلمانوں نے باجماعت ادا کیا تھا[۱۹۴]۔ بہر حال یہ پورا قبیلہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی عرصے میں مسلمان ہو گیا تھا اور ان کے محض چند افراد خارجِ اسلام رہے۔

بحرین میں قبیلہ عبد القیس ایک ایرانی مجوسی طبقے کے ساتھ آباد تھا۔ اور ایران کا پڑوسی بھی تھا۔ بحرین ایران کی ساسانی سلطنت کا ماتحت و باجگذار صوبہ یا مملکت تھی، جہاں خسروئے ایران کی طرف سے ایک حکمران مقرر ہوتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کا معاصر حکمران منذر بن ساویٰ تھا جو نسلاً عرب تھا۔ اور قبیلہ عبدالقیس کا فرد تھا۔ ۸ھ / ۶۲۸ء میں جب آپ نے مختلف پڑوسی اور عرب حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دی تو حضرت منذر بن ساویٰ کو بھی دی۔ غالباً وہ قبیلہ عبدالقیس کے مسلمان طبقات سے متعارف بھی تھے اور متاثر بھی۔ بہرحال وہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے دوران کسی وقت مشرف باسلام ہو گئے ۹۴۔ عام خیال یہ ہے کہ وہ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حضرت علاء بن حضرمی وہاں پہنچے تھے۔ حالانکہ یہ ان کے قبول اسلام کا زمانہ یا واقعہ نہیں تھا بلکہ بحرین کے صوبے کے اسلامی مملکت و ریاست میں ادغام و ماتحت بننے کا معاملہ تھا۔ بہرحال حضرت منذر بن ساویٰ عبدی نے اپنی مملکت میں اسلام کی ترویج و اشاعت کی اور تمام عرب طبقات مسلمان ہو گئے۔ ممکن ہے کہ بعض مجوسی افراد و طبقات بھی مشرف بہ اسلام ہوئے ہوں لیکن ان کا کوئی حتمی ذکر نہیں ملتا ہے فتح مکہ کے بعد حضرت علاء بن حضرمی بطور مرکزی منتظم اور عامل صدقات بحرین پہنچے اور وہاں حضرت منذر بن ساویٰ عبدی کے وصول کردہ صدقات اور جزیہ کی رقم لیکر مدینہ واپس آ گئے۔ بغدادی کے بقول یہ "مال" پہلا تھا۔ جو کسی صوبے سے مرکز پہنچا تھا۔ اور اس کی مقدار ستر ہزار درہم تھی ۹۵۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ بحرین میں اس کے بعد یا اسی سال دو مسلم افسروں کو مدینہ سے بھیجا گیا تھا۔ ایک صدقات اور عشور وغیرہ کے افسر تھے۔ ان محاصل کو حضرت منذر بن ساویٰ عبدی نے مسلمانان بحرین سے وصول کیا تھا اور دوسرے افسر صرف جزیہ کے لئے تھے۔ جو غیر مسلم مجوسی طبقات سے وصول کیا گیا تھا ۹۶۔ ان محاصل کے بارے میں مزید تفصیلات ہم اگلے ابواب میں دیکھیں گے۔ بہرحال ان شواہد و حقائق سے یہ بلاریب ثابت ہوتا ہے کہ بحرین کے بیشتر لوگ جن میں قبیلہ عبدالقیس کے افراد و طبقات کے علاوہ دوسرے عرب اور ایرانی طبقات بھی شامل تھے۔ ۸ھ کے اواخر ۶۳۱ء کے اوائل تک اسلام لا چکے تھے اور اسلامی ریاست کے شہری بن چکے تھے ۹۷۔

قبیلہ عبدالقیس کے قبول اسلام کے بارے میں مزید شہادت ان کے اس وفد سے بھی ہوتی ہے جو حضرت جارود بن معلّٰی کی قیادت میں فتح مکہ کے فوراً بعد بارگاہ نبوی میں پہنچا تھا ۹۸۔ تمام اراکین وفد نے اپنے اسلام کا اقرار و اعلان کیا تھا اور ان میں سے کم از کم تین حضرات: شبیب بن قُرّہ، صحار بن عباس، اور مُشَمرج بن خالد سعدی ..... کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اراضی کے عطیات (قطائع) بھی عنایت فرمائے تھے ۹۹۔ مآخذ کا دعویٰ ہے کہ حضرت جارود بن معلی عبدی نے اپنی قوم/خاندان کو مسلمان کر لیا تھا اور وہ اپنے پورے قبیلے سمیت ردّہ کے زمانے میں اسلام پر قائم رہے تھے۔ حضرت منذر بن ساویٰ عبدی اور حضرت اشج عبدی کے طبقات و خاندان بھی اسلام اور اسلامی حکومت کے وفادار رہے تھے۔ بہرحال کچھ طبقات عبدالقیس نے ارتداد کی راہ اختیار کی تھی۔ جن کی سرکوبی خلافت صدیقی کے سالاروں نے کی تھی ۱۰۰۔

بحرین میں قبیلہ عبدالقیس اور بعض دوسرے طبقات عرب اور مجوسی یا ایرانی آبادی کے علاوہ جو حضرت منذر بن ساویٰ کی مملکت میں آباد تھے۔ کچھ دوسرے عناصر بھی اس علاقہ میں اسلام لے آئے تھے۔ ان میں ہجر کے مجوس اور تمیم کے عرب طبقات شامل تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو خطوط و فرامین ..... ایک ہجر کے حکمران (صاحب) اسیخت بن عبداللہ کا نام تھا اور دوسرا بحرین و عمان کے عوام کے نام ..... ثابت کرتے ہیں کہ دونوں طبقات بھی اسلام میں داخل ہو چکے تھے کیونکہ ان

دونوں خطوط نے ان طبقات کے لئے وہ احکام و فرائض بتائے تھے۔ جن کا مطالبہ صرف مسلمانوں سے کیا جاسکتا ہے[80] رِدہ وارتداد کے سیلاب کی تاریخ اور جس آسانی اور سہولت سے بحرین میں اسے کچلا گیا تھا۔ اور اس میں جو کردار حضرات منذر بن ساوی عبدی، جارود بن معلیٰ اور ان کے ہمنواؤں نے انجام دیا تھا ثابت کرتے ہیں کہ ایرانی سلطنت کی اس ماتحت و باجگذار مملکت میں اسلام نے اپنے قدم مضبوطی سے جمالئے تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ بحرین میں مسلم عناصر اور آبادی کی وموجودگی بلکہ اس سے بڑھ کر ان کی سیاسی، مذہبی اور فوجی بالادستی کا اعتراف مونٹگمری واٹ جیسے مستشرقین نے بھی کرلیا ہے[81] حالانکہ یہ ان کی عادت کے خلاف ہے۔

(ب) بنو حنیفہ

بنو حنیفہ کا قبیلہ عددی لحاظ سے بڑا اور فوجی اعتبار سے طاقتور تھا اور وہ یمامہ کے زرخیز وشاداب خطے میں بنیادی طور سے آباد تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعض خاندان یمامہ کے باہر خاص کر عراقی سمت میں بھی آباد تھے ابن ہشام کی ایک روایت سے جس کی تصدیق بخاری کی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنو حنیفہ کا ایک طبقہ یا خاندان کم از کم اسلام کے پیغام سے فتح مکہ سے بہت پہلے متاثر ہوا تھا۔ غالباً صلح حدیبیہ کے فوراً بعد اسلام بنو حنیفہ کے قبیلہ میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اور اس کا آغاز بنو حنیفہ کے ایک ممتاز سردار حضرت ثمامہ بن اثال حنفی کے قبول اسلام سے ہوا تھا۔ حضرت ثمامہ حنفی کے قبول اسلام کا واقعہ بڑا ڈرامائی اور دلچسپ ہے۔ نجد کی ایک مہم کے دوران، جس کی کوئی تاریخ مآخذ میں نہیں ملتی ہے، وہ مسلمانوں کے ایک شہسوار دستے کے ہاتھوں اس وقت گرفتار ہوئے تھے۔ جب وہ عمرہ کے لئے مکہ جارہے تھے۔ ان کو مدینہ لایا گیا۔ جہاں تین دن تک وہ قید رہے۔ اور اس کے بعد انکو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بلا کسی شرط و وعدہ کے رہا کر دیا گیا۔ رحمتِ نبوی کے اس بے مثال مظاہرے سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ فوراً انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد وہ پھر اپنے سفر پر روانہ ہوگئے۔ مکہ پہنچے، عمرہ کیا اور واپس اپنے علاقہ کو روانہ ہوگئے۔ مگر مکہ میں ان پر قریش مکہ کے دشمنانِ اسلام نے وہ طنز و تعریض کی بارش کی کہ انہوں نے مکہ والوں کو یمامہ سے ملنے والی گیہوں کی فراہمی کو روک دینے کی دھمکی دی اور وہ محض دھمکی ہی نہیں رہی بلکہ وطن پہنچتے ہی انہوں نے اسکو عملی جامہ بھی پہنادیا اور مکہ والے بھوکوں مرنے لگے۔ حضرت ثمامہ سے جب اہل مکہ کی تمام عرض و معروض بیکار و بے فائدہ رہی تو بالآخر انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کرنے کی درخواست کی جو بالآخر بابِ رحمت نبوی سے قبول و منظور ہوئی اور ان کی گیہوں کی فراہمی پھر سے جاری ہوگئی[82] بہرحال جن حالات میں حضرت ثمامہ حنفی نے اسلام قبول کیا اور جس طرح انہوں نے مکہ والوں کا غلہ روک لیا۔ اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ محرم ۷ھ/مئی، جون ۶۲۸ء یا زیادہ سے زیادہ شعبان ۷ھ/دسمبر ۶۲۸ء میں مسلمان ہوئے ہوں گے[83] اگرچہ یمامہ یا بنو حنیفہ کے قبول اسلام کے بارے میں براہ راست کوئی شہادت نہیں ملتی ہے۔ یہ یقینی ہے کہ انہوں نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرلیا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوا

ہوتا تو مکہ کے گیہوں کی فراہمی کو روکنا آسان اور قابل عمل نہیں ہوتا۔

بہر حال مآخذ یہ ضرور بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو حنیفہ کے عوام اور سرداروں کے پاس بھی اپنے سفیر اور مبلغ بھیجے تھے اور ان کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ ابن سعد کی ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر یا اس کے کچھ بعد حضرت ثمامہ بن اثال حنفی اور بنو حنیفہ کے ایک اور بااثر سردار ہوذہ بن علی کو خطوط بھیجے تھے۔ اور ان کو اسلام کی دعوت دی تھی[۴۰۵] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خطوط حضرت ثمامہ کے قبول اسلام سے پہلے لکھے گئے تھے۔ لیکن دوسرے متعدد مآخذ جیسے بلاذری، طبری، ابن خلدون اور محمد بن حبیب بغدادی حضرت ثمامہ حنفی کا نام بنو حنیفہ کے ان سرداروں میں نہیں شامل کرتے جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے فوراً بعد خطوط لکھے تھے ان مآخذ کا اس پر اصرار ہے کہ یہ خطوط ان علاقوں کے عام آدمیوں کے نام دعوت عام تھی[۴۰۶]۔ بہر حال بنو حنیفہ اور یمامہ کے لوگوں نے آپ کی دعوت کو ذرا تاخیر سے قبول کیا اور سنہ ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں بقول ابن جریر طبری اپنا وفد بارگاہ نبوی میں بھیجا جو دس پندرہ آدمیوں پر مشتمل تھا اور ان سب لوگوں نے غالباً ایک کے سوا اسلام قبول کرنے کا اعلان و اقرار کیا تھا[۴۰۷] دوسرے مآخذ نے حنفی وفد کی آمد کی تاریخ نہیں بیان کی ہے جبکہ بلاذری کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وفد غالباً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارت اور دعوت کے جواب میں فوراً آیا تھا۔

یہ بات خاصی دلچسپ اور اہم ہے کہ بنو حنیفہ کے اس وفد میں مشہور جھوٹے نبی مسیلمہ کذاب کی بھی شمولیت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ بہر حال اس کی وفد میں شمولیت اور اسلام قبول کرنے کا معاملہ دونوں ہی پردہ خفا میں ہیں[۴۰۹]۔ اسی طرح مآخذ بنو حنیفہ کے دوسرے سردار ہوذہ بن علی کے قبول اسلام کا بھی واضح ذکر نہیں کرتے ہیں۔ وہ حنیفہ کے ایک اہم خاندان بنو مرۃ کا سردار تھا[۴۱۰] لیکن اس کے خاندان ہی کے ایک صحابی حضرت طلق بن علی کے قبول اسلام کا ذکر واضح الفاظ میں ملتا ہے[۴۱۱] اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کے خاندان یا بنو حنیفہ کے قبیلہ میں انفرادی یا اجتماعی قبول اسلام کے امکان کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک مسیلمہ کذاب کا تعلق ہے اس کا خاندان بنو عدی بن حنیفہ بہت معمولی اور غیر اہم تھا۔ اور بقول ابن حزم نہ اس میں دولت تھی نہ ریاست و حکومت اور نہ ہی عددی طاقت[۴۱۲] بنو حنیفہ کا سب سے بااثر اور طاقتور قبیلہ بنو الدول بن حنیفہ تھا۔ جو چار بڑے خاندانوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ اور وہ تھے : بنو مرۃ، بنو عبد اللہ، بنو ذہل اور بنو ثعلبہ، موخر الذکر قبیلہ / خاندان سے حضرت ثمامہ بن اثال کا تعلق تھا جو یمامہ میں اسلامی ریاست کے سب سے بڑے حامی اور وفادار تھے[۴۱۳] تمام واقعات اور حقائق کو مدنظر رکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ثمامہ کا خاندان اکثر و بیشتر مسلمان ہو گیا تھا۔ اور دوسرے خاندانوں میں کچھ افراد و طبقات مسلمان تھے۔ لیکن اکثر بنو حنیفہ کے لوگ عہد نبوی میں اسلام کے دائرے سے باہر رہے تھے۔ اور انہوں نے ہی مسیلمہ کذاب کا ساتھ ارتداد کے زمانے میں دیا تھا۔ جبکہ دوسری طرف حضرت ثمامہ اور دوسرے حنفی مسلمانوں نے اسلامی ریاست کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور اسلام کے لئے شاندار خدمات انجام دی تھیں[۴۱۴]

(ج) ازدِعمان

ازدیمن کی ایک شاخ عمان میں جا بسی تھی جو ازدِعمان کہلائی۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مدینہ میں دونوں انصاری قبیلوں اوس وخزرج کا نسبی تعلق ازدِعمان سے تھا۔ عمانی شاخ کی بھی مختلف ذیلی شاخیں تھیں اور عہد نبوی میں اس کے ایک اہم خاندان بنو معولہ بن عبد شمس کی عمان پر حکمرانی تھی [۸۱۵] اس کے ایک سردار جلندیٰ کے دو بیٹے جیفر اور عبّاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر حکمران تھے، جو ملک کے دو علاقوں پر الگ الگ اور آزادی سے حکمرانی کرتے تھے۔ بلاذری اور ابن حزم کا بیان ہے کہ اگرچہ عمان کی غالب اکثریت . . . کا تعلق ازد سے تھا۔ تاہم وہاں مختلف عرب اور غیرعرب عناصر بھی موجود تھے جو اس پورے علاقے میں پھیلی مختلف وادیوں میں رہتے تھے۔

اسلام سے ان کے روابط کے آغاز کا ذکر فتح مکہ کے بعد ۸ھ / ۶۳۰ء میں عام طور سے ملتا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دو سفیر و نمائندے حضرات ابو زید انصاری اور عمرو بن عاص سہمی کو عمان کے حکمرانوں کے پاس بھیجا۔ اور ان کو قبول اسلام کی دعوت دی [۸۱۶] یہ قابل ذکر بات ہے کہ دونوں حکمران فوراً مسلمان ہو گئے۔ اور ان کی تقلید و تبلیغ سے عربوں اور غیرعربوں کے خاصے بڑے طبقات بھی اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے [۸۱۸] اگرچہ ردہ کی تاریخ کا مطالعہ سردست ہمارے پیش نظر نہیں ہے تاہم اس ضمن میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ عمان میں ارتداد کی وبا جب عام طور سے پھیلی تو بھی وہاں وفادار و مخلص مسلمانوں کی خاصی بڑی آبادی موجود تھی جو اسلام کی بحالی کے لئے کوشاں تھی۔ وہ نہ صرف اپنے دین و مذہب پر ثابت قدم و برقرار رہی بلکہ اس نے مرتدوں کے خلاف خود بھی جنگ کی۔ اور پھر اسلامی لشکر کے پہنچنے پر اس کی بھرپور مدد کی۔ یہ نکتہ بھی خاصا اہم اور قابل ذکر ہے کہ عمان کے دونوں حکمران حضرت جیفر اور حضرت عباد ثابت قدم و مخلص مسلمان اور مدینہ کے وفادار رہے تھے اور انہوں نے ہی دراصل عمان میں اسلام کا پرچم بلند کئے رکھا تھا [۸۱۹]

(د) مَہرہ

مہرہ کا اصل قبیلہ یمن کے علاقہ شحر میں آباد تھا۔ اور اس کی کچھ شاخیں علاقہ الغبر کے متصل و متقابل ساحلی علاقوں میں آباد تھیں اگرچہ نسبی لحاظ سے ان کا تعلق قبیلہ قضاعہ سے تھا۔ [۸۲۰] ان کی ایک شاخ عمان کے علاقے میں بھی آباد تھی [۸۲۱] ابن سعد کے مطابق مہرہ کا ایک وفد حضرت مہری بن الابیض کی قیادت میں فتح مکہ کے بعد کسی وقت مدینہ پہنچا تھا اور اس نے اپنے قبیلہ کے خاصے بڑے حصے کے قبول اسلام کا اعلان واقرار کیا تھا [۸۲۲] وفات نبوی کے بعد بیشتر قبیلہ والے مرتد ہو گئے تھے۔ تاہم حضرت عکرمہ بن ابی جہل مخزومی کی قیادت میں جوں ہی اسلامی لشکر ان کے علاقے میں پہنچا۔ قبیلہ کے تمام مسلمانوں نے اپنے اسلام کی تصدیق کی تھی۔ اور بغیر کسی جنگ وجدال کے صدقات ادا کر دیتے تھے [۸۲۳] ہمارے ماخذ میں مہرہ کے انفرادی و اجتماعی قبول اسلام کی مثالیں مفقود ہیں۔

(س) تمیم

تمیم عددی اعتبار سے جزیرہ نمائے عرب کے بڑے قبائل میں شمار ہوتا تھا۔ اور قبائل پراگندہ میں شائد سب سے طاقتور اور عظیم بھی[۸۲۴] اس کے متعدد بطون بلکہ ان کی ذیلی شاخیں بجائے خود قبیلہ بن گئی تھیں اور خاصی طاقت ور اور آزاد تھیں۔ ان کے متعدد بطون اور ذیلی گھرانے یمامہ، بحرین اور عمان کے درمیان واقع علاقوں میں ایک خاصے بڑے اور وسیع رقبہ پر بسے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ جزیرہ نما کی مشرقی پٹی پر بھی وہ آباد تھے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بحرین کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاصر سلطنت وملوکیت میں حکمران طبقہ کا تعلق تمیم ہی کی ایک شاخ سے تھا۔ جبکہ عراق کی ایرانی سلطنت کی باجگذار سلطنت حیرہ کا تعلق بنو تمیم سے بہت قریبی تھا۔ دوسری طرف بنو تمیم کے بعض گھرانوں اور افراد نے مکہ و مدینہ کے لوگوں سے حلف وازدواج کے ذریعہ قریبی سماجی اور سیاسی تعلقات قائم رکھے تھے[۸۲۵]

مکہ اور قریش سے اپنے ان گوناگوں تعلقات کے سبب اسلام بنو تمیم میں کافی شروع میں متعارف ہوگیا تھا اور اس کے بعض افراد نسبتاً ابتدائی دور میں اسلام سے مشرف ہوئے تھے۔ ان میں قریش مکہ کے تمیمی حلیف نمایاں مقام کے حامل تھے جو مکہ میں بس گئے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ معزز و محترم صحابی حضرات خباب بن ارت تمیمی[۸۲۶] اور واقد بن عبداللہ تمیمی تھے[۸۲۷] جو بدری صحابہ ہونے کی فضیلت رکھتے تھے ایک اور ابتدائی مکی تمیمی مسلم حضرت سعید بن عمرو تمیمی تھے جو قریش کے خاندان بنو جمح کے حلیف تھے اور مہاجر حبشہ بھی[۸۲۸] ان کے علاوہ ایک پورا تمیمی گھرانا تھا جو اسلام سے پہلے اپنے علاقہ سے ہجرت کر کے مکہ اور پھر مدینہ جا بسا تھا۔ اور اس نے مکہ ہی میں اسلام قبول کیا تھا۔ یہ بنو اُسَیّد بن عمرو کا گھرانا تھا جس کے نمایاں فرد ابو ہالہ ہند بن زرارہ تھے جو حضرت خدیجہ کے پہلے شوہر اور ان کے بطن سے پیدا ہونے والے دو فرزندوں حضرات ھند اور حارث کے والد ماجد تھے۔ اس خاندان کے تین اور اہم ابتدائی مسلمانوں کا ذکر بھی ملتا ہے وہ تھے: حضرات صفوان بن صفوان اور ان کے بھتیجے صفوان بن مالک اور حنظلہ بن ربیع۔ اوّل الذکر دونوں صحابیوں کے بارے میں مآخذ کا اصرار ہے کہ وہ بہترین مہاجرین میں شمار ہوتے تھے جبکہ مؤخر الذکر کو کاتبین رسول میں شرکت و شمولیت کی سعادت حاصل تھی[۸۲۹]

اصل قبیلہ تمیم اور اس کی شاخوں میں بہر کیف اسلام کا تعارف فتح مکہ سے پہلے شروع ہوگیا تھا اور بعض انفرادی قبولِ اسلام کی مثالیں ملتی ہیں تاہم یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی تبلیغ واشاعت فتح مکہ کے بعد ہی ہوئی شروع ہوئی تھی۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اقرع بن حابس تمیمی کی قیادت میں تمیم کے دس اشخاص نے فتح مکہ سے ذرا پہلے اسلام قبول کر لیا تھا اور انہوں نے فتح مکہ کے علاوہ[۸۳۰] غزوات حنین وطائف میں بھی حصہ لیا تھا[۸۳۱] ان مواقع پر ان کی خدمات کے اعتراف میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اقرع بن حابس تمیمی کو بھی ایک سردار کا حصہ یعنی سو اونٹ حنین کے مال غنیمت کے خمس میں سے عطا فرمائے تھے[۸۳۲] ابن اسحاق کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمیم کے خاندان بنو اسید کے کچھ لوگ بھی ان غزوات میں شریک

جہاد تھے[۸۳۳] ۹ھ کے اواخر یعنی ۶۳۱ء کے وسط تک اسلام نے بنو تمیم کے مختلف گھرانوں اور خاندانوں میں کافی مضبوطی سے اپنے قدم جما لئے تھے۔ اس کی ایک تصدیق ان کے قبائلی وفد کی آمد سے ہوتی ہے جو اس برس بارگاہِ نبوی میں پہنچا اور جس میں اسی یا نوے مسلمان ارکان شامل تھے[۸۳۴] ابن اسحاق کے بیان سے بصراحت اور دوسرے مآخذ سے معنًا معلوم ہوتا ہے کہ وفد کے تمام اراکین مسلمان تھے[۸۳۵] اگرچہ واقدی اور ابن سعد نے ان کے مسلمان ہونے کی وضاحت نہیں کی ہے۔[۸۳۶] تاہم وہ ان کے پورے بیانات میں ہر جگہ مضمر ہے خاص کر ان اشعار میں جو وفد کے ایک رکن نے اسی موقعہ پر برجستہ کہے تھے۔ طبری نے بھی ابن ہشام و ابن اسحاق کے بیان کی تصدیق کی ہے[۸۳۷] اس طرح تمیم کے قبولِ اسلام کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں رہ جاتا۔ مزید برآں تمام مآخذ کا متفقہ بیان ہے کہ تمیم کے مختلف گھرانوں اور خاندانوں کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی عاملینِ صدقات بھی مقرر فرمائے تھے۔ جن میں حضرات قیس بن عاصم، مالک بن نویرہ اور زبرقان بن بدر بہت نمایاں مقام کے حامل تھے۔[۸۳۸]

تمیم کے تمام خاندانوں اور گھرانوں میں مسلمان طبقات اور کثیر افراد کی موجودگی بھی ان کے قبولِ اسلام کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ابن حزم نے متعدد گھرانوں کے صحابہ کرام کے نام گنائے ہیں۔ اپنی ایک روایت میں انہوں نے تمیم کے مختلف گھرانوں کے ۱۴ صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے۔ نو بنو العنبر بن عمرو سے، چھ بنو اسید سے، اور تین تین بنو مرّہ، بنو یربوع اور بنو نہشل سے، اور دو دو بنو مجاشع اور بنو عبد اللہ بن دارم سے، اور ایک ایک بنو جہم، بنو مالک، بنو کعب، بنو زید مناۃ، بنو منقار، بنو عوف، بنو قُریع، بنو ربیعہ، بنو مالک بن حنظلہ اور بنو جریر بن دارم سے[۸۳۹] یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان سے کئی گنا زیادہ وہ صحابہ کرام تھے۔ جن کے اسمائے گرامی تاریخ کے تنگ ظرف میں سما نہیں سکے۔ اور ان سے کہیں زیادہ وہ مسلمان تھے۔ جن کی ملاقات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہو سکی اور شرفِ صحبتِ نبوی سے محروم رہنے کے سبب وہ تاریخ کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گئے۔ بہرحال ان ٹھوس ثبوتوں اور مآخذ کی شہادتوں کے بعد یہ کہنا عقلمندی نہیں ہو سکتی کہ "بنو تمیم میں چند ہی لوگ مسلمان ہوئے تھے۔"[۸۴۰] یہ تاریخ کو مسخ کرنے اور بین وظاہر واقعات کو نظرانداز کرنے کی انتہائی غیر علمی، غیر تاریخی اور غیر دیانت دارانہ حرکت ہے۔ واقعات وشواہد بنو تمیم کے قبولِ اسلام کے ناقابلِ تردید ثبوت و شہادتیں فراہم کرتے ہیں۔ وفاتِ نبوی کے بعد ردہ کے زمانے میں جو کچھ پیش آیا۔ وہ مختلف معاملہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس پرفتن و پر آشوب زمانے میں بھی تمیم کے متعدد طبقات اسلام پر مضبوطی اور خلوص کے ساتھ قائم رہے تھے۔ ان میں حضرت زبرقان بن بدر تمیمی نمایاں حضرات میں سے ایک تھے۔ جنہوں نے اسلام کی اس زمانے میں شاندار خدمات انجام دی تھیں اور اپنے بہت سے قبیلہ والوں کا رشتہ اللہ اور اس کے رسول سے جوڑے رکھا تھا اور یہی نہیں انہوں نے مسلم طبقات سے صدقات وصول کر کے اس کی خطیر رقم بھی مدینہ اسی زمانہ میں پہنچائی تھی۔[۸۴۱]

(ط) وائل

جزیرہ نمائے عرب کے افرادی طاقت اور فوجی قوت کے لحاظ سے سب سے بڑے قبیلوں میں وائل کا بھی شمار ہوتا تھا

جس کے متعدد بطون تھے جو بجائے خود قبیلے بن گئے تھے۔ ان میں سے اہم ترین بطون تھے: بنوبکر، بنوعنزہ، بنوثعلب اور بنوشیبان۔ پھر ان کی اپنی ذیلی شاخیں تھیں۔ اس قبیلے کے لوگ یمن میں واقع جند کے علاقے سے عراقی سرحدوں کے قریب حیرہ تک پھیلے ہوئے تھے اور بہت بڑے علاقے میں آباد تھے۔ ان کا اصل اور مرکزی علاقہ بحرین اور حیرہ کے درمیان واقع تھا، جہاں ان کا سب سے بڑا قبیلہ آباد تھا۔ ان کے سیاسی اور سماجی تعلقات حیرہ کی مملکت سے بھی تھے اور دوسری طرف شمال کی غسانی مملکت سے بھی[942] مذہبی لحاظ سے یہ اکثر و بیشتر عیسائی تھے۔

(۱) بنوعنزہ بن وائل

یمن کے قریب الجند میں یہ گھرانا آباد تھا اور ان کے بعض افراد مکہ ہجرت کر کے جا بسے تھے اور وہاں قریش کے بعض خاندانوں کے حلیف بن گئے تھے۔ اس بطن کے ابتدائی مسلمانوں میں یہی مہاجر عنزی تھے جو قریش مکہ کے ساتھ اسلام لائے تھے ان کے ایک نمائندے تھے حضرت عامر بن ربیعہ عنزی جو حضرت عمر بن خطاب کے حلیف تھے۔ بہرحال اصل قبیلہ کے بارے میں خیال ہے کہ ان کے کچھ لوگ فتح مکہ اور وفات نبوی کے درمیانی عرصے میں اسلام لائے تھے اور قبیلہ نے اسلامی ریاست کے ساتھ کوئی مفاہمت ضرور کر لی تھی کیونکہ الجند نہ صرف اسلامی ریاست میں شامل ہو گیا تھا بلکہ جنوبی عرب میں اس کا صدر مقام تھا جہاں اس پورے علاقے کے گورنر حضرت معاذ بن جبل رہتے تھے[943]

اصل قبیلہ میں انفرادی یا اجتماعی قبول اسلام کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اسلام کے دائرے سے یکسر باہر نہیں تھے۔ مثال کے طور پر واقدی کا بیان ہے کہ بنو عجل جو بنوبکر بن وائل کی ایک شاخ تھی کا ایک شخص فرات بن حیان عجلی مسلمان ہو گئے تھے اور انہوں نے اسلامی ریاست کے لئے اچھی خدمات انجام دی تھیں[944] اس کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک گرامی نامہ ماخذ میں بنوبکر بن وائل کے نام ملتا ہے جس میں آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ آپ کے ایک اور گرامی نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص حضرت عدی بن شرحبیل جن کا تعلق بنوعامر بن ذہل سے تھا۔ بظاہر مسلمان ہو گئے تھے[945] بعد میں بنوبکر بن وائل نے اپنا ایک وفد بھی بارگاہ نبوی میں بھیجا تھا۔ جس میں قبیلہ کے سربرآوردہ افراد اور سردار شامل تھے اس وفد نے وفات نبوی سے کچھ پہلے مدینہ کا دورہ کیا تھا۔ غالباً وہ مسلمان ہو گئے تھے اور اپنے قبیلہ میں اسلام کے داعی بن کر پہنچے تھے جہاں انہوں نے اسلام کی تبلیغ کی تھی[946] بنوبکر بن وائل کے ایک ذیلی مگر اہم خاندان بنوتغلب کے وفد کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ ابن سعد کا واضح بیان ہے جس پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ بنوتغلب کے وفد میں مسلمان اور عیسائی دونوں طبقات کے سولہ نمائندے تھے جو اپنے اپنے طبقات کی نمائندگی کرنے مدینہ پہنچے تھے[947] بحرین میں ردہ کی تاریخ کے طبری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بنوبکر بن وائل اور تمیم کے تمام بڑے خاندانوں میں اسلام عہد نبوی میں پھیل چکا تھا اور ان قبیلوں کے مسلمان سخت آزمائشوں کے باوجود اسلام پر ثابت قدم رہے تھے[948] یہ قبائل یا طبقات تھے۔ حضرات عُتیبہ بن نحاس، عامر بن عبدالاسود، مِسمَع، مثنّیٰ بن حارثہ شیبانی اور حَنفَہ تمیمی کے جنہوں نے ردہ کے

زمانے میں شاندار کارنامے انجام دیئے تھے۔ یہ متعدد قبیلوں کے سردار تھے۔ جن میں حضرت مثنیٰ بن حارثہ شیبانی عہد صدیقی میں شہرت کے بام پر پہنچے۔ ان کے علاوہ ابن حزم نے بنو شیبان کے کئی مسلمانوں کے نام بھی گنائے ہیں[۸۴] اور بلا جھجک یہ کہا جا سکتا ہے کہ صرف یہی لوگ مسلمان نہیں تھے۔ بلکہ ان سے کہیں زیادہ کے نام تاریخ محفوظ نہیں رکھ سکی۔

ان حقائق وشواہد کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو بکر بن وائل اور بنو تغلب وغیرہ کے معتد بہ لوگ اور طبقات عہد نبوی میں اسلام لا چکے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ بیشتر طبقات اپنے قدیم مذہب پر قائم رہے تھے۔ مگر بعد کے زمانے میں وہ بھی رفتہ رفتہ اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ مگر یہ دعویٰ کرنا کہ عہد نبوی میں وائل کے قبیلہ کے کسی اہم طبقہ یا گروہ نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ صحیح نہیں ہے[۸۵]

عرب میں جا بجا منتشر و پراگندہ قبائل کے اسلام کے ساتھ تعلقات کے مذکورہ بالا جائزے میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک قبیلہ اور اس کی اہم شاخ میں اسلام متعارف ہو چکا تھا۔ اور ان کے معتد بہ طبقات اسلامی ریاست کے وفادار بن چکے تھے۔ خاص کر عبد القیس، ازد عمان اور تمیم کے قبیلوں میں اسلام مضبوطی سے جم گیا تھا اور ان کے بیشتر خاندان مسلمان تھے۔ جبکہ دوسرے قبائل جیسے بنو حنیفہ، بہرہ اور وائل وغیرہ کے بیشتر طبقات غیر مسلم تھے۔ لیکن ان میں بھی کچھ طبقات اور گروہ مسلمان ہو چکے تھے اور جو طبقات مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے بہرحال اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی قبول کی تھی۔ چنانچہ اس کی تصدیق بنو تغلب کے عیسائی طبقات کے اس معاہدے سے ہوتی ہے جو انہوں نے اسلامی ریاست کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے مطابق انہوں نے مدینہ کو جزیہ دینا منظور کیا تھا جو ان کی اپنی شرائط و پسند کے مطابق مسلمانوں کی زکوٰۃ کا دو گنا تھا۔ یعنی ۵ فیصد۔ اس طرح وہ اسلامی ریاست کے ذمی بن گئے تھے۔ بہرحال جزیرہ نمائے عرب میں وفات نبوی کے وقت کوئی ایسا طبقہ یا قبیلہ نہیں تھا جس نے اسلامی ریاست کی مذہبی یا سیاسی بالادستی قبول نہ کر لی ہو اور اس کا رکن نہ بن گیا ہو۔

خلاصہ بحث

تاریخ اسلام کا یہ عظیم الشان واقعہ ہے کہ ۶۱۰ء میں مکہ کے ایک فرد واحد نے خدا کا فرستادہ و پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا اور سب لوگوں کو خدا کے دین کی طرف بلایا۔ اشراف و اکابر قریش کے لئے یہ نئی آواز تھی مگر اس میں ایک عجیب سی کشش تھی اور اس کے کلام میں ایک مسحور کن صنعت وہ کلام انسانی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اور نہ اس کا سنانے والا جھوٹا، کیونکہ وہ چالیس برس سے اس کو صادق اور امین مانتے اور سمجھتے چلے آئے تھے شیوخ و اکابر قریش بڑے ذہین و فطین، تجربہ کار و دوربین عقیل و فہیم تھے وہ کسی بات کو بلا سوچے سمجھے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ مگر نوجوانان قریش جو زیادہ پختہ ذہنی تحفظات نہیں رکھتے تھے۔ اور کسی بھی قابل فہم بات کو قبول کرنے کا زیادہ فطری رجحان رکھتے تھے اس دعوت کی طرف جھکے، غور سے سنا اور جیسے ہی اسے سمجھا وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا اور ان کی رسالت پر ایمان لے آئے۔ مکی عہد میں تبلیغ اسلام کے دو دور تھے: ایک ہجرت حبشہ کے زمانے (۶۱۰ء تا ۶۱۶ء) تک، اور دوسرا ہجرت حبشہ سے لیکر ہجرت مدینہ تک

(۶۱۶ء سے ۶۲۲ء تک) ان دونوں ادوار میں اسلام کی تبلیغ برابر جاری رہی۔ خیال عام یہ ہے کہ دور اول میں اسلام تیزی سے پھیلا۔ مگر دور دوم میں اس کی اشاعت رک گئی۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ مکہ کے دونوں ادوار میں برابر اسلام کی اشاعت جاری رہی تھی۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ دوسرے دور میں اس کی رفتار قریش کے اکابر کی مخالفت اور مسلمانوں کی تعذیب کے سبب کچھ سست ضرور ہو گئی تھی۔

اکابر و شیوخ قریش کی مخالفت کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ مکہ کے موجودہ نظام زندگی میں کسی تبدیلی کو خواہ وہ بہتری کے لئے کیوں نہ ہو بدعت تصور کرتے تھے اور اس لئے مردود و مسترد کئے جانے کے قابل۔ کسی حد تک ان کے اپنے بتوں اور خداؤں کی محبت بھی اس کے لئے ذمہ دار تھی۔ پھر اسلام کی تعلیمات کو ماننے کا واضح مطلب تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بالادستی اور حاکمیت کو قبول کرنا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے قدیم اقتدار اور عالمگیر اثر کو یوں ہاتھ سے دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ قبائلی رقابت کا عنصر ایک حد تک تو کارفرما نظر آتا ہے مگر قریشی قبیلوں / خاندانوں / گھرانوں نے اسلام کی مخالفت بحیثیت مجموعی نہیں کی تھی۔ قریشی قبائل اور خاندانوں کے اسلام کی جانب رویے سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں سے تقریباً ہر خاندان اور گھرانے کے افراد مسلمان ہو گئے تھے۔ بلکہ بعض حالات میں اکثر گھرانے کے گھرانے اسلام لے آئے تھے۔ دراصل عرب قبائلی نظام کا خاصہ یہ تھا کہ سربراہ خاندان / شیخ قبیلہ کا اثر عموماً اس کے خاندان / قبیلہ والوں پر پڑتا تھا اور بقول حضرت عمرو بن عاص بھی ارکان قبیلہ و خاندان اپنے سربراہ کی اندھا دھند تقلید کرتے تھے۔ لیکن یہ اسلام کا عظیم کارنامہ تھا جس نے نوجوانان قریش کو اکابر قریش کی اندھی تقلید سے آزاد کر کے خود کچھ فیصلے کرنے پر ابھارا تھا۔ ان کو اسلام کی سادگی، سچائی اور گیرائی نے اپنا پیرو بنا لیا تھا۔ اسی بنا پر ایک مصری عالم عبدالمتعال صعیدی نے اسلام کی اولین تحریک کو نوجوانوں کی تحریک قرار دیا ہے۔

مشہور مستشرق مونٹگمری واٹ کا خیال ہے کہ مکہ کے اولین مسلمانوں کو تین طبقات میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ اوّل طبقہ ان نوجوانان قریش پر مشتمل تھا جو بہترین خاندانوں کے لال تھے۔ یہ ان مکی خاندانوں کے افراد تھے جو مکہ کی سیاست و سماج میں سب سے زیادہ بااثر با اقتدار اور بارسوخ تھے اور عموماً یہ ان کے فرزند یا قریبی عزیز و رشتہ دار تھے۔ دوسرا طبقہ ان نوجوانوں پر مشتمل تھا جو قریش کے اہم ترین اور سربرآوردہ ترین خاندانوں سے نہیں تھے اور تیسرا طبقہ ان مسلمانوں پر مشتمل تھا جو مکہ کے قبائلی نظام میں اپنی ذاتی بنیادیں نہیں رکھتے تھے اور دوسرے قریشی قبیلوں یا خاندانوں پر منحصر تھے۔ ان میں دراصل موالی اور حلفاء شامل تھے۔ یہ تقسیم کسی حد تک صحیح ہے۔ مونٹگمری واٹ نے مسلمانان مکہ میں صرف مردوں کو شامل کیا ہے۔ ان میں عورتوں اور بچوں کو بھی شامل کرنا چاہیئے۔ ان کی شمولیت سے مکی عہد میں مسلمان ہونے والے قریشیوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ جتنی کہ مستشرقین کی فہرستوں میں دکھائی گئی ہے۔ یا جتنی عام طور سے سمجھی جاتی ہے اس کے علاوہ مستشرقین کی فہرستوں میں مکی مسلمانوں کی کثیر تعداد کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ مونٹگمری واٹ کی فہرست مسلمین مکہ میں کل سو نام ملتے ہیں جبکہ ان کی تعداد کئی گنا زیادہ تھی۔ اگر ہمارا یہ مفروضہ کہ فی بالغ مسلم چھ یا سات اراکین کو شمار کرنا چاہیئے۔ صحیح ہے تو مکی عہد میں بالغ د

نابالغ مرد و عورت اور بچوں سمیت کل مسلم آبادی خاص قریشی خاندانوں کی ڈیڑھ دو ہزار سے کسی طرح کم نہیں رہی ہو گی۔ اس کی تائید ماخذ کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ فتح مکہ کے لشکر اسلامی میں مہاجر مجاہدین کی تعداد سات سو تھی گویا کہ اس وقت تک مدینہ میں کل قریشی مہاجرین کی تعداد چار یا پانچ ہزار کے درمیان تھی

مکی عہد میں تبلیغ اسلام کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام صرف مکہ کی حدود یا قبائل قریش تک محدود نہیں رہا تھا۔ وہ نہ صرف جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں میں روشناس ہوا تھا بلکہ جنوب، مغرب اور مشرق کے بعض علاقوں میں پھیل بھی گیا تھا۔ جنوب میں اشعر، رہا وغیرہ قبیلوں نے مکی عہد میں اسلام قبول کیا تھا۔ مغرب میں غفار، اسلم، ازد شنوءہ اور دوس کے قبیلوں میں مسلمانوں کی تعداد معتدبہ ہو گئی تھی۔ بلکہ اوّل الذکر دونوں قبیلے تو تقریباً پورے ہجرت تک اسلام کے پیرو بن چکے تھے۔ اسی طرح مشرق میں قبیلہ عبد القیس وغیرہ میں اسلام پھیل گیا تھا۔ پھر سنہ ۶۲۰ء تا ۶۲۲ء میں مدینہ کی تقریباً پچاس فیصد آبادی مسلمان ہو چکی تھی۔ جو تقریباً بیس پچیس ہزار اشخاص پر مشتمل تھی۔ مدنی مسلمانوں کو چھوڑ کر مکی مسلمانوں اور دوسرے قبائل میں منتشر مسلمانوں کی تعداد ہجرت نبوی کے وقت کسی طور سے پانچ چھ ہزار سے کم نہ تھی۔ تاریخی تناظر میں دیکھنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تیرہ برس کے عرصے میں ایک پیغمبر خدا نے اپنے ماننے والوں کی اتنی بڑی تعداد بنا لی تھی۔ بلا ریب وہ ایک عظیم کارنامہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے اس کار عظیم میں آپ کے جاں نثاروں کا لہو۔ قربانیاں اور کوششیں بھی شامل تھیں۔ ان میں جن مبلغین کا نام سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ وہ ہیں حضرات ابوذر غفاری۔ ابوموسیٰ اشعری، طفیل بن عمرو دوسی، ضماد بن ثعلبہ ازدی اور اشج عبدی وغیرہ۔ اسی کے ساتھ ساتھ قریشی مسلمانوں میں حضرات ابوبکر، عمر، عثمان، ابوعبیدہ، زبیر، سعید بن زید، طلحہ وغیرہ کے ناموں کو بھی شمار کرنا چاہیئے۔ ان اور ان کے بہت سے گمنام اور غیر معروف و غیر مذکور صحابہ ہی نے اسلام کی مکی عہد میں نشر و اشاعت کا فریضہ انجام دیا تھا۔

مدنی عہد میں بھی تبلیغ اسلام کے دو دور تھے: اوّل ہجرت نبوی سے غزوہ خندق تک (۶۲۲ء تا ۶۲۵ء) اور دوسرا غزوہ خندق کے بعد سے وفاتِ نبوی تک (۶۲۶ء تا ۶۳۲ء)۔ اور ان دونوں ادوار میں اسلام اور اسلامی ریاست کے رویئے میں فرق تھا۔ دور اول میں اسلامی ریاست نے بعض قبائل عرب سے حلف اور دوستی کے معاہدے کئے تھے ان کو اسلامی امت کا رکن بنائے بغیر۔ لیکن دور دوم میں ایسے دفاعی اور دوستانہ معاہدے ختم ہو گئے تھے۔ اب اسلامی ریاست تمام قبائل عرب سے دو مطالبے کرتی تھی: یا تو اسلام قبول کریں اور امتِ اسلامی کے مکمل رکن بن جائیں یا اسلامی ریاست کی بالادستی قبول کریں اور جزیہ ادا کریں۔ لیکن اسلام کا وہی ایک رویہ تھا۔ سب کو اپنے پرچم تلے جمع کرنا۔

مدنی عہد کے دورِ اوّل میں سیاسی اور فوجی مصروفیتوں اور مہموں کے سبب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ توجہ تبلیغ اسلام پر صرف کرنے کی فرصت نہ ملی۔ تاہم جب بھی آپ کو موقعہ ملا آپ نے تبلیغی جماعتیں اور انفرادی مبلغین بھیجے اور بنفس نفیس تو آپ نے غالباً کسی موقعہ کو اپنے پیغام کی دعوت دینے کے لئے لحاظ سے ہاتھ سے جانے نہ دیا چنانچہ مہموں اور جنگوں کے دوران آپ نے قبولِ اسلام کے لئے لوگوں کو دعوت دی اور بہت سی مہموں میں لوگ اسلام کے حلقہ بگوش بنے

بھی۔ جہاں تک تبلیغی جماعتوں کا تعلق ہے۔ غزوات بئر معونہ اور رجیع ان کی شاندار مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے بعض مہمیں خاص مذہبی اعتبار سے ترتیب دی تھیں۔ آپ کی بعض ابتدائی مہمیں اسی نوعیت کی تھیں۔

اس دورِ حیات کے دوسرے عرصے یا نصف میں آپ کی تبلیغی سرگرمیوں میں بہت اضافہ ہوا اور آپ نے متعدد سفارتیں، تبلیغی جماعتیں اور مبلغین کے دستے بھیجے۔ اور صرف عرب کے باشندوں اور حکمرانوں کو دعوت نہیں دی۔ بلکہ قرب و جوار کے حکمرانوں اور سلاطین کو بھی اسلام کی طرف بلایا۔ غیر ملکی حکمرانوں کی حد تک تو دعوتِ اسلامی زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ تاہم جہاں تک جزیرہ نمائے عرب کا تعلق ہے۔ آپ کی دعوت پوری طرح سے قبول و منظور کی گئی اور اس کے گوشے گوشے میں اسلام پھیل گیا۔

مدنی دور میں قبائل عرب کا اسلام کی جانب رویے کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کے مغرب میں آباد قبائل سب سے پہلے اسلام کی جانب متوجہ ہوئے۔ پہلے انہوں نے اسلامی ریاست سے دفاعی اور دوستانہ معاہدے کئے اور پھر اسلام کے پیرو بنتے گئے۔ تا آنکہ ان میں سے کوئی بھی اسلام کے دائرے سے باہر نہیں رہا۔ مغربی قبائل میں کچھ تو ہجرتِ نبوی کے مابعد اور زیادہ تر بدر اور غزوہ خندق کے دوران اسلام کے ماننے والے بن چکے تھے۔ مشرقی قبائل نے اسلامی ریاست کی مخالفت زیادہ دنوں تک جاری رکھی اور اس کے سبب اسلام کے ساتھ بھی ان کا رویہ معاندانہ ہی رہا۔ لیکن انفرادی طور سے ان میں اسلام پھیلتا رہا اور ان کے افراد اور بعض بعض حالات میں ان کے گھرانے اور طبقات اسلام قبول کرتے رہے۔ ان قبیلوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے میں اسلامی ریاست کی مادی شوکت و حشمت نے بھی خاصا اہم کردار ادا کیا تھا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کی اشاعت ان کے درمیان تیز تر ہو گئی اور فتح مکہ تک وہ اکثر و بیشتر اسلام کے دامنِ عاطفت میں آ چکے تھے اور باقی ماندہ فتح مکہ کے بعد اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے۔ شمالی قبائل میں جو مدینہ اور وادی القریٰ کے درمیان آباد تھے وہ اسلام کی طرف زیادہ اور سرعت کے ساتھ مائل ہوئے لیکن جوں جوں مدینہ سے مسافت بڑھتی گئی اسلام کی قبولیت کی رفتار سست ہوتی گئی اور شامی سرحد کے آس پاس بسے قبائل میں سے اکثر مسلمان عہدِ نبوی میں نہیں ہوئے تھے۔ اس کے برخلاف جنوب میں اسلام کی تبلیغ بڑی ہمہ گیر اور تیز رفتار تھی۔ اگرچہ اسلام وہاں مکی عہد میں روشناس ہو چکا تھا۔ اور بعض قبیلے مسلمان ہو چکے تھے تاہم اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام فتح مکہ کے بعد شروع ہوا اور دو ڈھائی برس کے عرصے میں پورا جنوبی عرب کلمہ پڑھ چکا تھا۔ مگر منتشر و پراگندہ قبائل میں اسلام کی اشاعت اتنی ہمہ گیر اور تیز نہیں تھی۔ ان میں سے زیادہ تر قبیلے اسلام اور کفر میں منقسم تھے۔ البتہ ان کے بعض بڑے قبیلے پورے مسلمان ہو چکے تھے۔ اسلام کے دائرے سے اکثر و بیشتر وہی باہر تھے۔ جو بالکل سرحدی علاقوں میں آباد تھے۔ بہر حال جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا آخری حج ادا کیا تو آپ کے جلو میں کم و بیش ایک لاکھ بیس ہزار مسلمان تھے اور نہ جانے کتنے اپنے گھروں میں رہ گئے تھے۔ اور اللہ کا نام لے رہے تھے۔ ایک اندازہ کے مطابق اس وقت تک مسلمانوں کی کل آبادی پانچ دس لاکھ کے لگ بھگ تھی اور کئی لاکھ مربع کلومیٹر علاقہ اسلامی ریاست کے قبضے میں تھا بلا ریب یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ربع صدی سے بھی کم مدت میں عظیم ترین و بے مثل کارنامہ تھا۔ اور اسلام کی روحانی تاثیر اور تسخیرِ قلوب کا بے نظیر ثبوت۔

باب سوم

فوجی تنظیم عہدِ رسالت میں

مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے قیام کا لازمی تقاضا تھا کہ اس کی ایک فوجی تنظیم بھی ہو۔ ہجرت کے بعد یثرب میں آباد مسلم امت نہ صرف ہر لحاظ سے کمزور اور فرد مایہ تھی بلکہ وہ دشمنوں سے گھری ہوئی بھی تھی گویا کہ امت مسلمہ ایک جزیرہ امن وامان میں آباد تھی اور اس کو مخالفت وعداوت کی طاقتیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین مکہ کو سب سے زیادہ خطرہ مکہ کی طاقت ور اشرافیہ سے محسوس ہوتا تھا اور یہ خوف بلا وجہ نہیں تھا۔ مدینہ میں اسلامی ریاست کے وجود کو اشراف و فراعینِ قریش اپنی اقتصادی شہ رگ پر چھری تصور کرتے تھے۔ کیونکہ وہ شام جانے والی بین الاقوامی شاہراہ تجارت کے ناکہ پر واقع تھی وہ بخوبی جانتے تھے کہ اگر اس نوزائیدہ اسلامی ریاست اور غیر منظم اسلامی اُمّت کو پنپنے اور منظم ہونے کا موقع دیا گیا تو وہ ایک دن ان کے اقتدار و بالادستی کو چراغ دکھائے گی۔ مدینہ کی ریاست کی ترقی دراصل مکی اشرافیہ کی موت تھی۔ سیاسی، سماجی، مذہبی اور اقتصادی غرض کہ ہر طرح کی موت۔ مسلمانوں کو قریشی جذبات وخیالات کا بخوبی احساس وادراک تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نرغۂ اعداء سے یوں بچ نکلنا دراصل جلتی پر تیل کے مترادف تھا۔ لہٰذا قریش مکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے ہو جائیں گے اور اسلامی ریاست کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے اور حقیقتاً یہی ہوا بھی تھا۔ ہجرت نبوی کے معاً بعد سے انہوں نے بھرپور کوششیں کی تھیں کہ اسلامی ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجادیں۔

اس عظیم ترین بیرونی خطرہ کے علاوہ مدینہ کی جنت میں بھی کچھ سانپ موجود تھے اور اسلامی ریاست کو اپنے گھر کے بھیدیوں کے خطرات، سازشوں اور کینہ توزیوں کا سامنا تھا۔ مدینہ کے یہودی قبیلے جن کی تعداد بیس سے اوپر تھی، اسلام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین مخالف تھے۔ اور وہ کسی قیمت پر اسلامی ریاست کو موجود اور ترقی کرتے دیکھنا پسند نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی مخالفت کے مذہبی اور سیاسی نیز اقتصادی اسباب تھے۔ وہ اپنی مذہبی اور اقتصادی بقاء اسلامی ریاست کی بربادی ہی میں دیکھتے تھے اس لئے وہ اس مقصد کے لئے ہر طرح کی ساز باز کر سکتے تھے اور ہر دشمن اسلام کے ساتھ اتحاد و معاہدہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے بھی حقیقتاً یہی کیا اور اسلامی ریاست کے سب سے بڑے دشمن۔ قریش۔ سے ساتھ ساز باز بھی کی اور فوجی وسیاسی اتحاد کی کوشش بھی۔

اندرونی مخالفین اور اعداء کا ایک عنصر ان نام نہاد مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ جو بظاہر مسلمان تھے لیکن باطن میں سخت ترین دشمنِ اسلام۔ ان چھپے ہوئے منافقین کی عداوت کہیں زیادہ خطرناک تھی وہ نہ صرف دشمنوں کو اندر کے حالات سے باخبر کرتے تھے بلکہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرتے تھے اور اس طرح امت اسلامی کے تار و پود کو اندر ہی اندر بکھیر دینا چاہتے تھے۔

ایک چوتھا مخالف عنصر بدوی قبائل عرب کا تھا۔ جو مدینہ کے گرد و نواح میں آباد تھا وہ اپنی بدوی روایات کے پیش نظر

بھی۔ جہاں تک تبلیغی جماعتوں کا تعلق ہے۔ غزوات بئر معونہ اور رجیع ان کی شاندار مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے بعض مہمیں خاص مذہبی اعتبار سے ترتیب دی تھیں۔ آپ کی بعض ابتدائی مہمیں اسی نوعیت کی تھیں۔

اس دورِ حیات کے دوسرے عرصے بالنصف میں آپ کی تبلیغی سرگرمیوں میں بہت اضافہ ہوا اور آپ نے متعدد سفارتیں، تبلیغی جماعتیں اور مبلغین کے دستے بھیجے۔ اور صرف عرب کے باشندوں اور حکمرانوں کو دعوت نہیں دی۔ بلکہ قرب و جوار کے حکمرانوں اور سلاطین کو بھی اسلام کی طرف بلایا۔ غیر ملکی حکمرانوں کی حد تک تو دعوت اسلامی زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ تاہم جہاں تک جزیرہ نمائے عرب کا تعلق ہے۔ آپ کی دعوت پوری طرح سے قبول و منظور کی گئی اور اس کے گوشے گوشے میں اسلام پھیل گیا۔

مدنی دور میں قبائل عرب کا اسلام کی جانب رویے کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کے مغرب میں آباد قبائل سب سے پہلے اسلام کی جانب متوجہ ہوئے۔ پہلے انہوں نے اسلامی ریاست سے دفاعی اور دوستانہ معاہدے کئے اور پھر اسلام کے پیرو بنتے گئے۔ تاآنکہ ان میں سے کوئی بھی اسلام کے دائرے سے باہر نہیں رہا۔ مغربی قبائل میں کچھ تو ہجرت نبوی کے معاً بعد اور زیادہ تر بدر اور غزوہ خندق کے دوران اسلام کے ماننے والے بن چکے تھے۔ مشرقی قبائل نے اسلامی ریاست کی مخالفت زیادہ وقتوں تک جاری رکھی اور اس کے سبب اسلام کے ساتھ بھی ان کا رویہ معاندانہ ہی رہا۔ لیکن انفرادی طور سے ان میں اسلام پھیلتا رہا اور ان کے افراد اور بعض بعض حالات میں ان کے گھرانے اور طبقات اسلام قبول کرتے رہے۔ ان قبیلوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے میں اسلامی ریاست کی مادی شوکت و حشمت نے بھی خاصا اہم کردار ادا کیا تھا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کی اشاعت ان کے درمیان تیز تر ہو گئی اور فتح مکہ تک وہ اکثر و بیشتر اسلام کے دامن عاطفت میں آ چکے تھے اور باقی ماندہ فتح مکہ کے بعد اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے۔ شمالی قبائل میں جو مدینہ اور وادی القریٰ کے درمیان آباد تھے وہ اسلام کی طرف زیادہ اور سرعت کے ساتھ مائل ہوئے لیکن جوں جوں مدینہ سے مسافت بڑھتی گئی اسلام کی قبولیت کی رفتار سست ہوتی گئی اور شامی سرحد کے آس پاس بسے قبائل میں سے اکثر مسلمان عہد نبوی میں نہیں ہوئے تھے۔ اس کے برخلاف جنوب میں اسلام کی تبلیغ بڑی ہمہ گیر اور تیز رفتار تھی۔ اگرچہ اسلام وہاں مکی عہد میں روشناس ہو چکا تھا۔ اور بعض قبیلے مسلمان ہو چکے تھے تاہم اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام فتح مکہ کے بعد شروع ہوا اور دو ڈھائی برس کے عرصے میں پورا جنوبی عرب کلمہ پڑھ چکا تھا۔ مگر منتشر و پراگندہ قبائل میں اسلام کی اشاعت اتنی ہمہ گیر اور تیز نہیں تھی۔ ان میں سے زیادہ تر قبیلے اسلام اور کفر میں منقسم تھے۔ البتہ ان کے بعض بڑے قبیلے پورے مسلمان ہو چکے تھے۔ اسلام کے دائرے سے اکثر و بیشتر وہی باہر تھے۔ جو بالکل سرحدی علاقوں میں آباد تھے۔ بہر حال جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا آخری حج ادا کیا تو آپ کے جلو میں کم و بیش ایک لاکھ ۴۰ ہزار مسلمان تھے اور نہ جانے کتنے اپنے گھروں میں رہ گئے تھے۔ اور اللہ کا نام لے رہے تھے۔ ایک اندازہ کے مطابق اس وقت تک مسلمانوں کی کل آبادی پانچ دس لاکھ کے لگ بھگ تھی اور کئی لاکھ مربع کلومیٹر علاقہ اسلامی ریاست کے قبضے میں تھا بلا ریب یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ربع صدی سے بھی کم مدت میں عظیم ترین و بے مثل کارنامہ تھا۔ اور اسلام کی روحانی تاثیر اور تسخیر قلوب کا بے نظیر ثبوت۔

باب سوم

فوجی تنظیم عہدِ رسالت میں

مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے قیام کا لازمی تقاضا تھا کہ اس کی ایک فوجی تنظیم بھی ہو۔ ہجرت کے بعد یثرب میں آباد مسلم امت نہ صرف ہر لحاظ سے کمزور اور فرومایہ تھی بلکہ وہ دشمنوں سے گھری ہوئی بھی تھی گویا کہ امتِ مسلمہ ایک جزیرہ امن وامان میں آباد تھی اور اس کو مخالفت و عداوت کی طاقتیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین مکہ کو سب سے زیادہ خطرہ مکہ کی طاقت ور اشرافیہ سے محسوس ہوتا تھا اور یہ خوف بلا وجہ نہیں تھا۔ مدینہ میں اسلامی ریاست کے وجود کو اشراف و فرایینِ قریش اپنی اقتصادی شہ رگ پر چھری تصور کرتے تھے۔ کیونکہ وہ شام جانے والی بین الاقوامی شاہراہ تجارت کے ناکہ پر واقع تھی وہ بخوبی جانتے تھے کہ اگر اس نوزائیدہ اسلامی ریاست اور غیر منظم اسلامی اُمّت کو پنپنے اور منظم ہونے کا موقع دیا گیا تو وہ ایک دن ان کے اقتدار بالادستی کو چراغ دکھائے گی۔ مدینہ کی ریاست کی ترقی دراصل مکی اشرافیہ کی موت تھی۔ سیاسی، سماجی، مذہبی اور اقتصادی غرض کہ ہر طرح کی موت۔ مسلمانوں کو قریشی جذبات وخیالات کا بخوبی احساس وادراک تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نرغۂ اعداء سے یوں بچ نکلنا دراصل جلتی پر تیل کے مترادف تھا۔ لہٰذا قریش مکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے ہو جائیں گے اور اسلامی ریاست کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے اور حقیقتاً یہی ہوا بھی تھا۔ ہجرت نبوی کے معاً بعد سے انہوں نے بھرپور کوششیں کی تھیں کہ اسلامی ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔

اس عظیم ترین بیرونی خطرہ کے علاوہ مدینہ کی جنت میں بھی کچھ سانپ موجود تھے اور اسلامی ریاست کو اپنے گھر کے بھیدیوں کے خطرات، سازشوں اور کینہ توزیوں کا سامنا تھا۔ مدینہ کے یہودی قبیلے جن کی تعداد بیس سے اوپر تھی، اسلام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین مخالف تھے۔ اور وہ کسی قیمت پر اسلامی ریاست کو موجود اور ترقی کرتے دیکھنا پسند نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی مخالفت کے مذہبی اور سیاسی نیز اقتصادی اسباب تھے۔ وہ اپنی مذہبی اور اقتصادی بقاء اسلامی ریاست کی بربادی ہی میں دیکھتے تھے اس لئے وہ اس مقصد کے لئے ہر طرح کی ساز باز کر سکتے تھے اور ہر دشمن اسلام کے ساتھ اتحاد و معاہدہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے بھی حقیقتاً یہی کیا اور اسلامی ریاست کے سب سے بڑے دشمن۔ قریش ۔ کے ساتھ ساز باز بھی کی اور فوجی و سیاسی اتحاد کی کوشش بھی۔

اندرونی مخالفین اور اعداء کا ایک عنصر ان نام نہاد مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ جو بظاہر مسلمان تھے لیکن باطن سخت ترین دشمنِ اسلام۔ ان چھپے ہوئے منافقین کی عداوت کہیں زیادہ خطرناک تھی وہ نہ صرف دشمنوں کو اندر کے حالات سے باخبر کرتے تھے، بلکہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرتے تھے اور اس طرح امتِ اسلامی کے تار و پود کو اندر ہی اندر بکھیر دینا چاہتے تھے۔

ایک چوتھا مخالف عنصر بدوی قبائل عرب کا تھا۔ جو مدینہ کے گرد و نواح میں آباد تھا وہ اپنی بدوی روایات کے پیش نظر

اسلامی ریاست کا ممکن دشمن بن سکتا تھا کیونکہ اسلامی ریاست کا مطلب تھا مرکزیت اور اجتماعیت کا مدنی سیاسیات میں پیدا ہونا، اور یہ مرکزیت ان بدو قبائل کو پسند نہیں آسکتی تھی۔ اس کے علاوہ ان میں سے بعض کے حلیفانہ تعلقات قریش مکہ سے تھے۔ اور وہ ان کی حمایت میں اسلامی ریاست کے مخالف بن سکتے تھے۔ پھر اسلامی ریاست جن مقاصد اور نصب العین کے لئے وجود میں آئی تھی ان کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ اگر یہ بدوی قبائل دوست نہ بنتے تو ان کا دشمن بننا لازمی تھا۔

ان متعدد خطرات اور مختلف دشمنوں کے پیش نظر اسلامی ریاست کے لئے یہ ناگزیر تھا کہ وہ اپنی فوج بنائے اور ایک عسکری تنظیم اپنائے۔ کیونکہ اس کے بغیر اس کا وجود مستقل معرض خطر میں تھا۔ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دور بین نگاہ اور حقیقت شناس نظر تھی جس نے ابتدائے کار ہی سے اس کار عظیم کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا۔ چونکہ آپ ایک عملی انسان تھے اس لئے آپ نے اسلامی ریاست کے قیام کے معاً بعد اس کی طرف بھرپور توجہ دی اور ایک فوجی و عسکری تنظیم کی کوششیں شروع کر دیں۔ فوجی صلاحیتوں، قائدانہ لیاقتوں، عسکری ہم آہنگی، اخلاقی اور روحانی بلندی، جسمانی خوبیوں اور کسی حد تک مادی وسائل کی کمی نہیں تھی۔ صرف تنظیم اور ترتیب کی ضرورت تھی اور ان مادی اور روحانی صلاحیتوں کو ایک مستعد و منظم و مرتب فوج میں ڈھالنے کی ضرورت تھی۔

عہد نبوی کی ابتدائی مہمیں دراصل اس عسکری تنظیم کی سنگ بنیاد تھیں۔ بنیادی طور سے وہ فوجی مہمیں نہیں تھیں لیکن ساتویں صدی کے نصف اول کے عرب میں مذہبی و اقتصادی / تجارتی کارواں بھی تلواروں کی چھاؤں ہی میں سفر کر سکتے تھے وہ دفاعی اور سیاسی جماعتیں ہونے کے باوجود تیر و تفنگ، تلوار و تبر اور نیزوں کی مدد ہی سے اپنا راستہ بنا سکتی تھیں۔ چنانچہ ان مہموں نے نہ صرف عسکری نظام نبوی کی داغ بیل ڈالی۔ بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو فوجی تربیت و تنظیم و ترتیب بھی عطا کی۔ خطرات سے مردانہ وار نپٹنا، دلیرانہ دشمنوں کا سامنا کرنا، اجنبی علاقوں اور لوگوں سے ربط و واقفیت حاصل کرنا اور ان سے بڑھ کر ایک منظم عسکری گروہ کی مانند کام کرنا سکھا۔ یہی وہ تربیت و تنظیم تھی جس نے رفتہ رفتہ مسلمانوں کو ایک فوج میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا اور جب اچانک بدر کے میدان میں ان کا سامنا اپنے سے تگنا بڑے لشکر سے ہوا تو نہ صرف یہ کہ انہوں نے ان کا بھرپور مقابلہ کیا بلکہ اسی تنظیم کی بدولت اس کو شکست فاش دی۔ پھر یہی عسکری تنظیم تھی جس نے احد، خندق، خیبر اور نہ جانے اور کتنی مہموں میں ان کو دشمنوں کے مقابلے میں سرخرو کیا تھا۔ اسی فوجی قوت کے سامنے عرب کے سب سے بڑے اور سب سے طاقتور شہر مکہ نے گھٹنے ٹیک دیئے تھے اسی سے ہوازن اور غطفان کے طاقتور قبائل نے مات کھائی تھی اسی کے عظیم الشان مظاہرے کے نتیجے میں وقت کی سب سے بڑی طاقت — رومی سلطنت — اور اس کے باجگذاروں اور حامیوں کو تبوک کے میدان میں مد مقابل ہونے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اسی عسکری طاقت نے جزیرہ نمائے عرب کے کونے کونے اور گوشے گوشے میں اسلامی ریاست کے مادی اقتدار کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ مادی لحاظ سے یہی قوت تھی جس نے تمام قبائل عرب کو اسلامی ریاست کی بالادستی ماننے پر مجبور کر دیا تھا۔ عہد نبوی میں عربوں کی مکمل تسخیر کے بعد اسی فوجی طاقت نے خلافت راشدہ میں عالمگیر فتوحات کا باب کھولا تھا اور اس کو ایک عالمگیر سلطنت میں بدل دیا تھا۔

تاریخی حقائق اور اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ مدینہ کی اسلامی ریاست کی عسکری تنظیم کو ترقی کرنے میں کافی وقت لگا تھا اور وہ

متعدد مرحلوں سے گذری تھی۔ اس کے علاوہ مدنی حیاتِ طیبہ کے دہ سالہ دور میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد و مختلف فوجی افسروں اور کارکنوں کی تقرری وقت اور ضرورت کے تقاضوں کے مطابق کی تھی اور اس طرح رفتہ رفتہ ایک فوجی سلسلۂ افسران و عسکری عمال وجود میں آیا تھا۔ ان فوجی افسروں میں جو لوگ شامل تھے وہ یہ تھے (۱) امراءِ سرایا (آزاد مہموں کے قائدین لشکر) (۲) فوج نبوی میں آپ کے ماتحت افسران (جیسے امراءِ میمنہ، میسرہ، مقدمہ اور ساقہ) یا امراءِ مشاۃ (پیدل فوج) امراءِ رُماۃ (تیر اندازوں کے افسر) (۳) علمبرداران افواج (صاحب الالویہ والرایات (۴) اطلاعی گشتی دستے اور ان کے افسر طَلِیعہ، طلائع۔ (۵) جاسوس (عیون) (۶) راہ بر (دلیل) اموال غنیمت اور قیدیوں کے نگران افسر (صاحب الغنائم والاسریٰ) ہتھیاروں اور جنگی گھوڑوں کے افسر (صاحب السلاح والفرس) اور محافظ دستوں کے افسر (اصحاب الحرس) وغیرہ۔ فوجی تنظیم نبوی کے تاریخی ارتقاء کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کا تاریخی توقیت کے مطابق مطالعہ کریں۔ اس لئے آغاز کلام امراءِ سرایا سے ہوتا ہے کہ یہی فوجی تنظیم کے بانی و مبانی تھے یا اس کا نقطۂ آغاز۔

۱۔ امراءِ سرایا (فوجی مہموں کے قائدین)

اسلامی ریاست کی عسکری تنظیم میں اعلیٰ اختیارات کس کے ہاتھ میں تھے؟ تاریخ اسلام کا تھوڑا سا بھی مطالعہ جس کسی کا ہو گا وہ بلا کسی پس و پیش کے یہ جواب دے گا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سارے اختیارات حاصل تھے۔ منطق کا بھی یہی تقاضا ہے کہ جس شخصیت کی بالادستی تسلیم کی جا رہی ہے اس کو یہ اختیارات تفویض کیے جائیں۔ مگر مونٹگمری واٹ کی تحقیق یہ ہے۔ کہ بیعت عقبہ ثانیہ میں فوجی قیادت کا مسئلہ طے نہیں کیا گیا تھا اور آپ کے فوجی اختیارات کی نوعیت اجاگر نہیں تھی۔ یہ واضح امر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدنی ریاست میں جو بھی اختیار و اقتدار حاصل تھا اس کا سرچشمہ آپ کی رسالت تھی یعنی خدا ئے قادر مطلق کے نبی و رسول کی حیثیت سے اس کے احکام و اوامر کو آپ اس اسلامی ریاست میں نافذ کرنے کے مجاز تھے اور ظاہر ہے کہ آپ سے بڑھ کر اور کون خدائی مرضی اور احکام کو سمجھ اور نافذ کر سکتا تھا لیکن قریش مکہ کی مانند اگر مستشرق موصوف بھی آپ کی رسالت اور اس کے عطا کردہ سرچشمہ اقتدار و اختیار کو نہیں تسلیم کرتے تو تاریخ کی ٹھوس واقعاتی شہادت تو تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ ماٰخذ کا بیان ہے کہ ہجرت کے چھ ماہ بعد آپ نے پہلی مہم ترتیب دی اور قیادت کا پرچم اپنے ایک صحابی کو عطا کیا۔ پھر اسی ماہ دوسری مہم کی قیادت دوسرے صحابی کو دی اور یہ سلسلہ جاری رہا کبھی خود آپ اپنی قیادت میں مہمیں لیکر گئے اور کبھی اپنے اصحاب کو قیادت کا فریضہ سونپا۔ یہاں تک کہ متعدد جنگوں میں فوجی کمان میدان جنگ میں بنفس نفیس آپ نے فرمائی۔ آپ کو یہ اختیار کس نے دیا تھا اور اس کو امت مسلمہ نے کیونکر قبول و تسلیم کیا تھا؟ لہٰذا نظریاتی اور واقعاتی دونوں طرح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی عسکری تنظیم میں سب سے اعلیٰ و ارفع اختیارات آپ کی ذات کو حاصل تھے[1]! اس کے علاوہ مزید شہادت دستور مدینہ کی دفعہ نمبر ۳۶ سے فراہم ہوتی ہے جس کے مطابق جنگ میں شریک ہونے یا نکلنے کی اجازت اختیار نبوی کے دائرہ میں تھی[2] گویا کہ آپ اسلامی افواج کے سالار اعظم اور قائد اعظم تھے اور آپ کو نہ صرف بنفس نفیس افواج کی قیادت کا حق و اختیار حاصل تھا بلکہ اپنی

جگہ یا اپنے ماتحت افسرانِ فوج کی تقرری کا اختیار بھی حاصل تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ کم از کم عہدِ نبوی میں سربراہ مملکت و ریاست ہی افواج اسلامی کا سربراہ اعظم ہوتا تھا اور وہی یکہ و تنہا مستقل فوجی افسر او رقائد۔ بقیہ امراء سرایا یا قائدین افواج کی تقرری اور حیثیت دونوں عارضی ہوتے تھے۔ جیسا کہ ہم ابھی امراء سرایا کی بحث میں دیکھیں گے۔

اسلامی تاریخ میں سریہ اس مہم کو کہتے ہیں کہ جس کی قیادت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کسی صحابی کو سونپی ہو اور غزوہ اس مہم کو جس میں آپ بنفس نفیس سالار فوج کی حیثیت سے موجود ہوں۔ چنانچہ حالات کے مطابق آپ نے متعدد مہموں کی سربراہی اور قیادت اپنے مختلف اصحاب کو عطا فرمائی۔ واقدی کے بقول پہلی مہم ہجرت کے چھ ماہ بعد رمضان سنہ ۱ھ / مارچ سنہ ۶۲۳ء میں ترتیب دی گئی۔ اور پہلا قائد حضرت حمزہ بن عبد المطلب کو مقرر کیا گیا اور آخری مہم حیاتِ نبوی کے آخری ایام میں ربیع الاول سنہ ۱۱ھ / جون سنہ ۶۳۲ء میں ترتیب کی گئی، اور حضرت اسامہ بن زید کلبی کو قائد بنایا گیا[۳]۔ درمیانی عرصے میں اس منصب جلیل پر ۲۷ اور تقرریاں کی گئی تھیں۔ جبکہ قائدین کی تعداد کل ۴۷ تھی تقرریوں اور قائدین کے تناسب میں واضح فرق سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ بعض امراء سرایا کو ایک سے زیادہ مرتبہ یہ شرف ملا تھا۔ ان خوش نصیب و معتمد قائدین میں نمایاں حضرات تھے۔ جناب محمد بن مسلمہ اوسی، علی بن ابی طالب ہاشمی، غالب بن عبد اللہ لیثی اور خالد بن ولید مخزومی۔ اوّل الذکر دونوں حضرات نے تین تین مہموں کی قیادت کی تھی۔ جبکہ مؤخر الذکر دو صحابیوں نے چار چار مہموں کی[۴] لیکن عہدِ نبوی کے امراء سرایا یا قائدین نبوی میں سب سے اہم اور نمایاں شخصیت نہ کسی قریشی کی تھی نہ کسی انصاری کی اور نہ ہی قریش و عرب کے کسی طبقۂ اشراف کے کسی فرد کی۔ بلکہ یہ شرف حاصل ہوا تھا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مولیٰ (آزاد کردہ غلام) حضرت زید بن حارثہ کلبی کو۔ انہوں نے بہ اختلافِ روایت دشہادت تیرہ یا گیارہ مہموں کی قیادت کی تھی۔ ان کی پہلی تقرری جمادی الآخر سنہ ۳ھ / نومبر سنہ ۶۲۴ء میں ہوئی تھی اور آخری تقرری جمادی الاولیٰ سنہ ۸ھ / ستمبر سنہ ۶۲۹ء میں۔ مآخذ کا تقریباً متفقہ بیان ہے کہ اگر کسی مہم میں زید بن حارثہ کلبی موجود و شریک ہوتے تو لازمی طور سے وہ اس کے قائد مقرر کیے جاتے تھے[۶]۔

ان عظیم ترین صف اول کے قائدین افواج کے علاوہ بعض ایسے امراء سرایا تھے۔ جنہوں نے یہ سعادت دوبارہ حاصل کی تھی ان کی تعداد چھ تھی[۷]۔ گویا کہ کل امراء سرایا کی تعداد ۴۹ تھی اور تقرریوں کی تعداد ۷۴[۸]۔ اتنی زیادہ تقرریوں اور امراء سرایا کی کثرت تعداد سے یہ بات از خود واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں تک عہدہ اور منصب کا تعلق تھا وہ تو مستقل تھا مگر عہدہ دار اور منصب دار مستقل طور سے مقرر نہیں کیے جاتے تھے اور اس کا سبب ظاہر تھا کہ سوائے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی ان کی موجودگی میں مستقل سالار لشکر نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس صورت میں آپ کے اعلیٰ اختیارات محدود ہو جاتے۔ چنانچہ صورتحال یہ تھی کہ ضرورت اور حالات کے تحت امراء سرایا مقرر کیے جاتے تھے اور مہم کے انجام پاتے ہی ان کی تقرری اور ان کا عہدہ ختم ہو جاتا تھا اور پھر دوسرے مواقع پر دوسرے یا انہی میں سے کسی کا تقرر کیا جاتا تھا۔ امیر سریہ کی تقرری کی یہ عارضیت دراصل دو سبب سے تھی: اوّل یہ کہ اسلامی ریاست کی کوئی مستقل اور باقاعدہ فوج نہیں تھی۔ ضرورت کے وقت مسلم آبادی میں سے بالغ مرد ایک فوج بنا لیتے تھے اور ضرورت ختم ہوتے ہی یہ فوج توڑ دی جاتی تھی۔ لہٰذا اس کے ساتھ ہی سالار فوج کا عہدہ اور تقرری بھی ختم ہو جاتی تھی۔ دوم یہ کہ مستقل سالار فوج رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور جب آپ چاہتے تھے عارضی طور سے اپنا اختیار اپنے کسی صحابی کو منتقل کر دیتے تھے جو تھوڑی سی مدت کے لیے امیر سریہ بن جاتا تھا۔

امراء سرایا کے بارے میں ایک اہم حقیقت یہ ہے کہ ان کی تقرریاں مختلف قبائل اور بطون میں اچھی طرح سے منقسم تھیں اور تقریباً ہر قبیلہ کو جو اس وقت تک اسلامی ریاست کا ہمنوا بن چکا تھا اور قائدانہ صلاحیتیں رکھتا تھا۔ قیادتِ افواج اسلامی کا موقعہ دیا گیا تھا ذیل میں اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے ایک شجرہ دیا جا رہا ہے۔ جس سے تمام امراء سرایا کی قبیلہ وار تقسیم کا علم ہو سکے گا۔

نمبر شمار	قبیلہ / خاندان	تقرریوں کی تعداد	عہدوں کی تعداد
(ا)	قریش	۲۵	۱۸
۱	بنوہاشم	۵	۳
۲	بنوامیہ	۴	۴
۳	بنوسہم	۳	۰
۴	بنومخزوم	۵	۲
۵	بنوفہر	۳	۲
۶	بنوزہرہ	۲	۲
۷	بنومطلب	۱	۱
۸	بنوتیم	۱	۱
۹	بنوعدی	۱	۱
(ب)	خزرج	۱۱	۸
(ج)	اوس	۶	۳
(د)	کلب	۱۰	۲
(س)	بلی	۱	۱
(ص)	سلیم	۱	۱
(ط)	غطفان	۱	۱
(ع)	ہوازن	۲	۲
(ف)	قیس عیلان	۲	۲
(ق)	اسد/خزیمہ	۳	۳
(ک)	کنانہ	۷	۴
ل	ازد	۲	۲

(م)	بجیلہ	۱	۱
(ن)	غیر معروف	۱	۱
	کل میزان	۷۴	۴۹

جیسا کہ شجرہ سے واضح ہوتا ہے کہ بیشتر تقرریاں اس حلقۂ افسران میں قبیلۂ قریش کو ملی تھیں اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کیونکہ قریش نہ صرف پورے عرب میں عددی لحاظ سے سب سے بڑا قبیلہ اور گروہ تھے بلکہ وہ فوجی صلاحیتوں اور لیاقتوں کے لئے بھی پورے عرب میں ممتاز تھے۔ قریش کے ضمن جو نکتہ قابل ذکر ہے وہ یہ کہ امرائے سرایائے نبوی میں بنو امیہ کی تعداد کافی اہم تھی[9] جہاں تک ان کے افسروں کی تعداد کا تعلق ہے وہ تمام قبائل عرب میں سب سے زیادہ تھے۔ اگرچہ ان کی تقرریوں کی تعداد کم تھی۔ بہر حال ان کی اتنی بڑی تعداد میں شمولیت سے ایک طرف ان کی قائدانہ لیاقتوں اور عسکری صلاحیتوں کا ثبوت ملتا ہے جن کے لئے وہ زمانہ جاہلیت سے شہرت اور نمایاں مقام رکھتے تھے تو دوسری طرف عہد نبوی میں بنو ہاشم اور بنو امیہ کی رقابت کی بالواسطہ تردید بھی ہوتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں بنو امیہ جاں نثاری میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ فتح مکہ تک قریشی اشرافیہ میں قیادہ (فوجی سالاری) کا منصب بنو امیہ ہی کو حاصل تھا اور بعثت نبوی کے زمانے میں ابوسفیان بن حرب اس کے آخری منصبدار تھے[10]

عسکری تنظیم کے اس شعبہ میں دوسرے نمایاں قریشی خاندان یہ تھے۔ بنو سہم، بنو مخزوم، بنو فہر اور بنو زہرہ وغیرہ جو قریشی اشراف مکہ کے ستون تھے[11] اگرچہ بنو مخزوم مکی اشرافیہ میں خاصا بڑا فوجی منصب (قبہ) رکھتے تھے اور اپنی عسکری صلاحیتوں کیلئے ممتاز تھے[12] مگر اسلامی تنظیم میں ان کو دوسرے قریشی سالاروں سے کچھ زیادہ حیثیت حاصل نہیں تھی۔ البتہ یہ امر بدیہی ہے کہ ان کے نمائندے حضرت خالد بن ولید مخزومی نہ صرف عہد نبوی میں بلکہ عہد ماقبل اسلام میں بھی اپنی عسکری قیادت کے لئے ممتاز و نمایاں ترین فرد رہے تھے۔ خلافت راشدہ میں انہوں نے جیسے جوہر دکھائے ان کے سبب آج ان کا شمار دنیا کے عظیم ترین سالاروں اور جنرلوں میں ہوتا ہے۔ عہد نبوی میں بھی ان کی فوجی صلاحیت کے جوہر خوب کھلے تھے۔ اور انہوں نے اپنی تمام جنگوں اور مہموں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے[13] بقیہ دوسرے قریشی سالار ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کن میں فوجی لیاقت اور صلاحیت زیادہ تھی۔ باقی تین امرائے قریش کو اس شعبہ میں نمائندگی بہت کم درجہ کی ملی تھی اور انہوں نے عہد نبوی میں اپنی عسکری صلاحیتوں کی کوئی خاص چھاپ نہیں چھوڑی تھی۔ اگرچہ ان کے نمائندے حضرت ابوبکر تیمی[14]، حضرت عمر بن خطاب عدوی[15] اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح فہری[16] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت اسلامی کے سب سے زیادہ محترم و معظم ارکان تھے۔ ان تینوں حضرات کی عسکری سوجھ بوجھ اور قائدانہ لیاقتوں کا اظہار عہد نبوی کے بعد ردّہ کی جنگوں اور عراق و شام و مصر کی فتوحات کے معرکوں کے دوران ہوا تھا۔

دوسرے قبائل عرب میں مدینہ کے دونوں قبیلوں اوس اور خزرج کو مجموعی طور پر قریشی امراء کے بعد نمائندگی حاصل تھی ان دونوں کے گیارہ نمائندوں نے سترہ تقرریاں حاصل کی تھیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ خزرج کو اوس پر یک گونہ فضیلت حاصل تھی۔ غالباً اس کا

سبب ان کی عددی طاقت تھی جس کے نتیجہ میں ان میں عسکری صلاحیتیں نسبتاً زیادہ تھیں[18]۔ اس کا ثبوت کسی حد تک ماقبل اسلام کی ان جنگوں کے شواہد سے ملتا ہے جو ان دونوں نے آپس میں لڑی تھیں۔ اور جن میں عموماً خزرج کو برتری حاصل رہی تھی۔ جہاں تک قبیلہ کلب کا تعلق ہے تو حضرت زید بن حارثہ کلبی کے بارے میں مزید یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ عہد نبوی کے سب سے بڑے قائد اور امیر سریہ تھے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ سب سے زیادہ مہموں کی قیادت کی تھی بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بڑے لشکروں کی کمان بھی ان کو سونپی گئی تھی اس طرح ان کے فرزند دل بند حضرت اسامہ بن زید کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ کے آخری دنوں میں سب سے بڑے سریے کی کمان عطا فرمائی تھی۔ ان دونوں کی اس منصبِ عظیم پر تقرری کی اہمیت اس کے تاریخی تناظر میں دیکھنے سے زیادہ واضح ہوتی ہے۔ حضرت زید بن حارثہ مولی تھے اور ان کے فرزند مولیٰ زادہ اور ظاہر ہے کہ اشراف قریش و انصار کے مقابلے میں وہ سماجی اعتبار سے فروتر تھے۔ اس کے علاوہ حضرت اسامہ تو اٹھارہ برس کے نوجوان تھے اور ان کی ماتحتی میں تمام بڑے بڑے شیوخ و اکابر قریش دے دیئے گئے تھے[19]۔ ان دو تقرریوں سے دو اہم نکتے روشنی میں آتے ہیں۔ اول یہ کہ اسلام اور اسلامی ریاست اپنے عہدوں پر تقرری کے لئے صلاحیت اور لیاقت دیکھتی تھی اور اسی کو اصل قرار دیتی تھی۔ چنانچہ ان دونوں بزرگوں نے اپنے کارناموں اور کامیابیوں سے ثابت کر دیا کہ وہ جس عہدے پر مقرر کئے گئے تھے۔ اس کے وہ بخوبی اہل تھے۔ دوم یہ کہ اسلامی ریاست سماجی امتیازات اور معاشرتی اونچ نیچ کے فرق کو عہدے اور تقرری کے ذیل میں قائم رکھنے کے حق میں نہیں تھی۔ کیونکہ اس کی بنیاد اسلام پر تھی جو ان امتیازات کو روا نہیں رکھتا۔ دراصل ایک مولیٰ اور مولیٰ زادہ کا تقرر کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے اکابر کو خاص کر اور اشرافِ عرب کو عام طور سے یہ سمجھا دینا چاہتے تھے کہ اسلامی ریاست میں عہدہ حاصل کرنے کی بنیاد صلاحیت اور صرف صلاحیت ہے۔ سماجی و قبائلی عزت اور سیادت کے جھوٹے دعوے نہیں۔

بقیہ قبائل عرب میں اسد اور کنانہ کو دوسرے قبیلوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ تقرریاں حاصل ہوئی تھیں اور اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے زیادہ افراد اسلام کے حلقہ بگوش ہو چکے تھے۔ یہاں اس نکتہ پر توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ اسد سے تعلق رکھنے والے تمام امیرانِ سرایا دراصل قریش کے قبیلہ بنو امیہ کے حلیف تھے اور چونکہ حلفا اپنے سرپرست خاندان کے افراد شمار ہوتے تھے اس لئے ایک طرح سے یہ بنو امیہ کی تقرریاں تھیں۔ اس سے اس وقت کے سماج میں بنو امیہ کے مقام و حیثیت کی تعین کرنے میں مدد ملتی ہیں اور ثابت ہوتا ہے کہ وہ خِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ زمانۂ جاہلیت میں تمہارے جو لوگ بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں، کی حدیث نبوی کے مطابق مکی اشرافیہ اور اسلامی ریاست دونوں میں ایک نمایاں اور محترم مقام کے حامل تھے۔ اور ان کو مکمل اعتماد نبوی حاصل تھا۔ یہ دراصل ان کے خلوص اسلام اور پکے عقیدے کی دربار رسالت سے سند کے مترادف تھا جس پر عموماً ہمارے جدید مؤرخین شک و شبہ کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ وہ قطعی بے بنیاد ہیں اور اس لئے بالکل غیر معتبر

اس ذیل میں ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امراء سرایا کے شعبہ میں اپنے چار قریبی اعزہ کو بھی مقرر فرمایا تھا۔ ان میں حضرت حمزہ بن عبد المطلب آپ کے حقیقی چچا تھے[20]، حضرت علیؓ[21] اور حضرت جعفر بن ابی طالبؓ[22] آپ کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے جبکہ حضرت ابو سلمٰی بن عبد الاسد مخزومی[23] آپ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ان کے علاوہ چھ اور امراء بھی تھے جن

سے آپ کے ازدواجی یا حلف کے تعلقات تھے۔ ان میں حضرات ابوبکر و عمر و ابوسفیان بن حرب آپ کے خسر تھے[24] تو حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت حفصہ کے سابق شوہر کے بھائی تھے[25] جبکہ حضرات زید بن حارثہ اور ان کے فرزند اسامہ آپ کے حلیف تھے۔ اسوۂ نبوی کی ان مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رشتہ داری یا قرابت کا تعلق کسی طور سے عہدوں اور تقرریوں کے لیے مانع نہیں ہے بشرطیکہ وہ صلاحیت و لیاقت کی بنیاد پر کیا گیا ہو اور محض اقربا پروری اور اعزہ نوازی کے لیے نہ کیا گیا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تمام تقرریاں صلاحیت اور تقاضائے وقت و مہم کی بنیاد پر کی تھیں وہ نہ تو قبائلی اور خاندانی یا اقربا پروری کے اعتبار سے کی گئی تھیں اور نہ ہی کسی اور کا حق مارکے۔ بنیادی طور سے یہ عوامل و عناصر نہ تو آپ کو عہدے دینے اور تقرری کرنے پر آمادہ کرتے تھے اور نہ ہی آپ کو ان سے روک سکتے تھے۔ اور بلا ریب حکومت و ریاست کے معاملات میں اور خاص کر ایسے سماج میں جہاں سماجی امتیازات بہت ہوں یہی بہترین پالیسی ہے کہ تمام عہدے صلاحیت و لیاقت کی بنیاد پر دیئے جائیں اور کسی کو محض اس ڈر سے محروم نہ کر دیا جائے کہ اقربا پروری کا الزام آئے گا۔ کیونکہ تقویٰ، دیانت، ایمانداری اور انصاف کا یہی تقاضا ہے

امراء سرایا کے مطالعہ میں ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان کی تقرریوں کا تاریخی توقیت کے مطابق مطالعہ کیا جائے۔ اس سے بعض بہت اہم اور دلچسپ نکات ابھرتے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پہلی تین تقرریاں توقیتی لحاظ سے قریش کے تین خاندانوں ہاشم، مطلب اور زہرہ کو بالترتیب ملی تھیں[26]۔ یہ تینوں تقرریاں بالترتیب مارچ، اپریل اور مئی ۶۲۳ء میں کی گئی تھیں یعنی ہجرت کے چھٹے، ساتویں اور آٹھویں مہینے میں۔ پہلے ہاشمی حضرت حمزہ کے لگ بھگ چار سال بعد ایک اور ہاشمی حضرت علی بن ابی طالب نے اسلامی افواج کی کمان دسمبر ۶۲۷ء یا جنوری ۶۲۸ء (شعبان ۶ھ) میں کی تھی[27]۔ جبکہ موصوف کو دوبارہ مزید یہ سعادت، ربیع الثانی ۹ھ / جولائی۔ اگست ۶۳۰ء اور دسمبر ۶۳۱ء / رمضان ۱۰ھ میں ملی تھی[28]۔ تیسرے ہاشمی حضرت جعفر بن ابی طالب نے موتہ کی مہم میں یہ ذمہ داری سنبھالی تھی۔ جبکہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین امراء سریہ میں ایک نامزد کیا تھا[29]

اگرچہ کسی اموی کی پہلی تقرری کافی تاخیر سے یعنی ۸ھ / ۶۲۹ء میں ہوئی تھی جبکہ حضرت ابان بن سعید نے عسکری قیادت کا فریضہ انجام دیا تھا[30]، تاہم امویوں کے ایک حلیف حضرت عبداللہ بن جحش کو یہ سعادت اسلامی ریاست کے قیام کے آغاز ہی میں رجب ۲ھ / جنوری ۶۲۴ء میں سریہ نخلہ میں ملی تھی[31]، دو اور اموی حلیف حضرت عکاشہ بن محصن اور شجاع بن وہب نے بالترتیب ۶ھ / ۶۲۷ء اور ۸ھ / ۶۲۹ء میں یہ فریضہ انجام دیا تھا[32]۔ بہرحال اموی خانوادے کے ایک اور فرزند حضرت خالد بن سعید کو، جو اتفاق سے پہلے اموی کمانڈر کے حقیقی بھائی تھے، ۹ھ / ۶۳۰ء میں اسلامی فوج کی کمان کرنے کا موقعہ ملا[33]۔ اسی برس ایک اور اموی حضرت ہشام بن عاص کی بھی اس خدمت پر تقرری ہوئی[34]۔ عہد نبوی کے چوتھے اور آخری کمانڈر حضرت ابوسفیان بن حرب تھے جنہوں نے مشترکہ طور سے یہ خدمت انجام دی تھی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ۸ھ / ۶۳۰ء میں اپنے قبول اسلام اور زوال مکہ کے فوراً بعد انہوں نے یہ فریضہ انجام دیا تھا[35]

بقیہ قریشی کمانداروں میں حضرت خالد بن ولید مخزومی اور حضرت عمرو بن عاص سہمی نمایاں مقام رکھتے ہیں نہ صرف عہد نبوی میں اپنی جنگی اور فوجی صلاحیتوں اور کارناموں کے لئے بلکہ خلافت راشدہ کے زمانے میں بھی[36]۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے عہد نبوی

میں اپنی اکلوتی مہم کی قیادت ذی قعدہ ۱ھ / مئی ۶۲۳ء میں کی تھی[37]۔ جبکہ حضرت عمرو بن عاص سہمی کو پہلی کمان جمادی الاولیٰ ۸ھ / اکتوبر ۶۲۹ء میں ملی تھی۔ ان کی دوسری تقرری اسی ماہ میں ہوئی تھی جس میں مکہ فتح ہوا تھا[38]۔ حضرت خالد بن ولید مخزومی کے سلسلے میں اب تک جو کچھ کہا جا چکا ہے۔ اب اسے دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور عظیم صحابی حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو پہلی اور آخری کمان عہد نبوی میں ۶ھ / ۶۲۷ء میں ملی تھی[39]۔ یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ عظیم ترین قریشی صحابہ کرام کو عسکری تنظیم کے اس شعبہ میں بہت کم نمائندگی ملی تھی اور جن کو قیادت کی سعادت ملی بھی تھی۔ انہیں کافی تاخیر سے ملی تھی اس کے علاوہ دوسروں کے مقابلے میں ان کی مہمیں کافی چھوٹی اور غیر اہم تھیں۔

اوس کو خزرج کے مقابلے میں فوجی قیادت کا موقعہ کچھ پہلے ملا تھا یعنی رمضان ۲ھ / مارچ ۶۲۴ء میں جبکہ خزرج کو اس کے ایک ماہ بعد یہ سعادت ملی تھی[40]۔ اس سال اوس کو عسکری قیادت کا موقعہ بار بار ملا مگر خزرج کے کسی فرد کو یہ منصب ایک سال بعد محرم ۴ھ / جون ۶۲۵ء میں ملا۔ دوسرے برس ان کو تیسری بار یہ منصب ملا[41]۔ دوسری طرف اوس کے ایک نمائندے حضرت محمد بن مسلمہ نے اپنے قبیلے کے لئے یہ اعزاز تین برس کی مدت گذرنے کے بعد حاصل کیا۔ صحابی موصوف کی اس عہدہ عظیم پر دوسری تقرری اس کے دوسرے برس اور آخری بار کسی اوسی کو تقرری کی سعادت مزید تین برس بعد ۸ھ / ۶۳۰ء میں ملی[42]۔ جبکہ خزرج کو مسلسل ۵ھ / ۶۲۶ء سے ۸ھ / ۶۳۰ء تک اسلامی افواج کی کمان کرنے کا موقعہ ملتا رہا۔ سوائے ۶ھ / ۶۲۷ء کے[43]۔ حیات نبوی کے آخری دو برسوں میں نہ کسی اوسی کو اور نہ ہی کسی خزرجی کو فوجی قیادت کا موقعہ ملا[44]۔ غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ ان برسوں میں مہموں کی تعداد کافی کم تھی اور دوسرے قبیلے کے مسلمانوں کی تعداد زیادہ۔ بہر حال انصار کے ان دونوں قبیلوں کی مشترکہ تقرریاں جو چھ برس تک مسلسل ہوتی رہیں اس بات کی شاہد ہیں کہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل اعتماد حاصل تھا اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قریش کے شانہ بشانہ وہ بھی اسلامی ریاست کی تعمیر و ترقی میں برابر کے شریک اور حکومت اسلامی میں برابر کے سہیم تھے۔

عسکری تنظیم کے اس شعبہ سالاران میں آخری اہم عرب قبیلہ کنانہ تھا جس کے نمائندے حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو پہلی تقرری ۶ھ / ۶۲۷ء میں ملی[45]۔ اس قبیلے کے دوسرے سالار حضرت غالب بن عبداللہ لیثی تھے۔ جن کی چار مہموں میں قیادت کا ذکر پہلے آچکا ہے[46]۔ کنانہ کی آخری کمان ربیع الثانی ۹ھ / جولائی اگست ۶۳۰ء میں رہی تھی۔ دوسرے قبائل اور بطون عرب کو سالاران افواج نبوی کے شعبہ میں بہت کم نمائندگی مل سکی تھی۔ اس کے متعدد اسباب تھے۔ جن میں اہم ترین مہموں کی تعداد کا محدود ہونا، قبائل عرب کا مدینہ سے دور آباد ہونا۔ امت مسلمہ میں ان کی مختصر و محدود نمائندگی وغیرہ تھے[47]۔ بہر حال اس ضمن میں یہ قابل ذکر بات ہے کہ مذکورہ بالا قبیلوں کے علاوہ دوسرے قبائل عرب جیسے ازد، بجیلہ، غطفان اور ہوازن وغیرہ کو سالاران سرایا کے اس شعبہ میں تقرری حیات نبوی کے آخری دو برسوں میں ملی تھی جبکہ قیس عیلان اور بنو سلیم کو بالترتیب یہ سعادت ۳ھ / ۶۲۵ء اور ۸ھ / ۶۲۹ء میں ملی تھی[48]۔ اس عسکری شعبہ میں قبائل عرب کی نمائندگی مندرجہ ذیل شجرے سے واضح ہو گی جو مسلم مہموں کی سالانہ تعداد اور مختلف قبائل کی متناسب نمائندگی کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

سنہ عیسوی	۶۲۳	۶۲۴	۶۲۵	۶۲۶	۶۲۷	۶۲۸	۶۲۹	۶۳۰	۶۳۱	۶۳۲
مہموں کی تعداد	۳	۶	۴	۲	۱۲	۹	۱۳	۱۸	۶	۱
(۱) قریش										
(الف) بنوہاشم	۱	-	-	-	۱	-	۱	۱	۱	-
(ب) بنوامیہ	-	-	-	-	-	۱	-	۳	-	-
(ج) بنوسہم	-	-	-	-	-	-	۱	۱	۱	-
(د) بنومخزوم	-	-	۱	-	-	-	-	۳	۱	-
(س) بنوفہر	-	-	-	-	۱	۱	۱	-	-	-
(ص) بنوزہرہ	۱	-	-	-	۱	-	-	-	-	-
(ط) بنومطلب	۱	-	-	-	-	-	-	-	-	-
(ع) بنوتیم	-	-	-	-	-	۱	-	-	-	-
(ف) بنوعدی	-	-	-	-	-	۱	-	-	-	-
میزان قریش	۳	-	۱	-	۳	۴	۳	۸	۳	-
(۲) خزرج	-	۱	۲	۱	-	۲	۴	۱	-	-
(۳) اوس	-	۲	-	-	۲	-	-	۱	-	-
(۴) کلب	-	۱	-	-	۵	۲	۱	-	-	۱
(۵) سلیم	-	-	-	-	-	-	۱	-	-	-
(۶) بلی	-	-	-	-	-	-	-	-	۱	-
(۷) غطفان	-	-	-	-	-	-	-	۱	-	-
(۸) ہوازن	-	-	-	-	-	-	-	۲	-	-
(۹) قیس عیلان	-	-	۱	-	۱	-	-	-	-	-
(۱۰) اسد	-	۱	-	-	۱	-	۱	۱	-	-
(۱۱) کنانہ	-	-	-	۱	-	۱	۳	۲	-	-
(۱۲) ازد	-	-	-	-	-	-	-	۲	-	-
(۱۳) بجیلہ	-	-	-	-	-	-	-	-	۱	-
(۱۴) غیر معروف	-	-	-	-	-	-	-	-	۱	-
میزان کل	۳	۶	۴	۲	۱۲	۹	۱۳	۱۸	۶	۱

اس شجرہ سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں تک امیران سرایا میں قریش کی تقرری اور نمائندگی کا تعلق ہے پورے مدنی دور میں غیر شعوری طور پر ہی ایک خاص قسم کا توازن برقرار رہا تھا سوائے ۸ھ / ۶۳۰ء کے جب ان کے امیروں کی تعداد میں ایک نمایاں اضافہ نظر آتا ہے اس کا غالباً ایک سبب یہ تھا کہ فتح مکہ کے سال مہموں کی تعداد سب سے زیادہ تھی اور دوسرا یہ کہ صلح حدیبیہ کے بعد قابل و لائق قریشی سالاروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ دوسرا سبب بقیہ عرب قبائل کے حق میں بھی صحیح تھا[۴۹]۔ قریشی سالاروں میں حضرات خالد بن ولید مخزومی اور عمرو بن عاص سہمی اپنی عسکری قیادت اور فوجی صلاحیتوں کے لئے مشہور تھے[۵۰]۔ یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنے کے لائق ہے کہ اس برس آٹھ سالاروں کی تقرری ہوئی تھی جن میں سے پانچ وہ سالار تھے۔ جو فتح مکہ سے کچھ قبل یا اسکے دوران مشرف بہ اسلام ہوئے تھے[۵۱]۔ اس تاریخی شہادات سے بعض حلقوں اور طبقوں کے اس مزعومہ اور خیال کی تردید ہوتی ہے۔ کہ صحابہ کرام کے طبقہ سابقین اولین کو محض اپنی سبقت اسلام کے سبب ریاستی، عسکری، یا حکومتی مناصب حاصل کرنے کا زیادہ حق تھا[۵۲]، یہ صحیح ہے کہ اسلام کے قبول کرنے میں پہل ایک انتہائی تحسین آمیز اور ثواب آگیں اقدام تھا تاہم حکومت و ریاست کے عہدے اور مناصب میں ترجیح کا وہ قطعی ذریعہ یا عنصر نہیں تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پورے "دہ سالہ مدنی دور میں" اس کی رعایت حکومتی مناصب کے بارے میں چاہے وہ فوجی ہوں یا غیر فوجی کبھی نہیں کی تھی۔ اس عہد مبارک کا اولین و آخرین سبب محرک یا اساس صرف صلاحیت اور موقعہ کی مناسبت تھی۔ جیسا کہ ہم مسلسل اپنے تجزیوں میں دیکھتے رہیں گے۔

بہر حال تمام سالاران سرایا کے ضمن میں ان کی مذہبی مقام وحیثیت کا تجزیہ ذیل کی مختصر سی لوح یا جدول میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سالاران افواج نبوی میں سے بیشتر کا زمانہ قبول اسلام یا تو مکی عہد کا آخری دور ہے یا مدنی دور ہے۔ بہر حال جدول یہ ہے

زمانہ قبول اسلام : مکی عہد	الف	ب	ج	د			
	۱۳	۵	-	۱۵			
مدنی عہد	س	ص	ط	ع	ف	ق	ل
	۴	-	۳	۴	۱	۴	۱
غیر متعین	م						
	۴						

یہ ممکن ہے کہ بعض حالات میں سبقت اسلام تقرری کا ایک محرک رہا ہو، لیکن عموماً اس کی بنیاد پر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ سابقین اولین کو ریاستی مناصب میں ترجیح حاصل ہونی چاہیے یا عہد اسلامی میں واقعتاً وہ کسی وقت موجود رہی تھی۔ اگر ایسا رہا ہوتا تو عہدی نبوی میں یا بعد میں خلافت راشدہ کے عہد زریں میں متاخر مسلمان شائد ہی کوئی منصب یا عہدہ حاصل کر سکتے۔ جبکہ صورت حال یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتظام حکومت میں شریک زیادہ تر صحابہ کرام کا تعلق، سابقین اولین سے نہیں تھا۔

عہد نبوی کے سالاروں کی قبائلی تقسیم کے بعد عرب کے مختلف خطوں کی نمائندگی کا اس شعبہ میں مطالعہ دلچسپی کا حامل ہوگا۔

جو ذیل کی جدول سے واضح ہوتا ہے۔

علاقہ	قبیلہ/خاندان		تقرری	فیصد	منصب دار	فیصد
مرکزی عرب	۱۔ قریش	]	۴۲	۵۶٫۷۵	۲۹	٫۴۳
	۲۔ خزرج					
	۳۔ اوس					
شمالی عرب	۱۔ کلب	]	۱۱	۱۴٫۸۹	۳	٫۲۵
	۲۔ بلی					
مشرقی عرب	۱۔ سلیم	]	۱۰	۱۳٫۵۱	۹	۱۶٫۴۷
	۲۔ غطفان					
	۳۔ ہوازن					
	۴۔ اسد					
	۵۔ قیس عیلان					
مغربی عرب	۱۔ کنانہ	]	۹	۱۲٫۱۵	۶	۱۲٫۵
	۲۔ ازدشنوءہ					
جنوبی عرب	۱۔ بجیلہ	]	۱	۱٫۳	۱	۲٫۰۹
غیر معروف			۱	۱٫۳	۱	۲٫۰۹
میزان			۷۴		۴۹	

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس شعبہ میں مرکزی عرب کو سب سے زیادہ نمائندگی ملی تھی جو بوجوہ معلوم بالکل فطری بات تھی شمالی قبائل کی کمترین نمائندگی ان کے نمائندوں اور افراد کی کمی کے سبب تھی جیسا کہ بلاذری کے ایک تبصرہ سے معلوم ہوتا ہے[۵۳]۔ جو بات شمالی قبیلوں پر صادق آتی ہے۔ وہی جنوبی عرب کے قبائل کے لئے صحیح ہے[۵۴]۔ جبکہ دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی قبیلوں کی نمائندگی کم و بیش یکساں ہے۔ اس کا ظاہری سبب ان علاقوں کے قبیلوں میں زیادہ تو سیع اسلام اور مدینہ سے قربت تھی اس وجہ سے ان کے نمائندوں اور افراد کو ریاستِ اسلامی کی خدمت کرنے کا زیادہ موقعہ ملا تھا۔

اسی طرح ایک اہم نکتہ اس ضمن میں یہ ہے کہ اس شعبہ تنظیم عسکری میں کل کتنے عرب قبائل کو نمائندگی ملی تھی۔ شمال کے طویر آٹھ اہم ترین شمالی قبائل میں سے صرف دو کو نمائندگی ملی تھی جبکہ مشرقی عرب کے سات بڑے قبیلوں میں سے چار قبیلوں کو اور پانچ اہم مغربی قبیلوں میں سے دو کو اور دس جنوبی قبیلوں میں سے محض ایک کو سالاری و قیادت کا شرف ملا تھا اور قبائل پراگندہ میں سے کسی کو کوئی بھی نمائندگی نہیں ملی تھی[۵۵]۔

سالاران سرایا پر بحث کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان کی کمان میں جانے والی چھوٹی اور بڑی مہموں کی عددی طاقت کتنی تھی؟ اگرچہ تمام سالاروں کی مہموں کی قوت کا مفصل ذکر کتاب کے آخر میں درج ضمیمے میں دیا گیا ہے۔ تاہم یہاں اس نقطۂ نظر سے ان کا تجزیہ دلچسپی کا سبب ہوگا۔ اس سے یہ بھی بیک نظر معلوم ہوگا کہ بڑی مہموں کی سالاری کا شرف صحابہ کرام میں سے کن کو ملا تھا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل جدول اسی مقصد کو اجاگر کرنے کے لیے دی جا رہی ہے۔

نمبر شمار	مہم کی عددی طاقت	مہموں کی تعداد	منصبدار/سالار کا قبیلہ اور اس کی مہمیں
الف	۱۰۰ سپاہیوں سے کم	۳۴	(۱) ۸ - قریش کے سالاروں کے زیر کمان
			(۲) ۲ - اسد " " " "
			(۳) ۵ - اوس " " " "
			(۴) ۹ - خزرج " " " "
			(۵) ۲ - قیس عیلان " " " "
			(۶) ۳ - کنانہ " " " "
			(۷) ۱ - کلب " " " "
			(۸) ۱ - سلیم " " " "
			(۹) ۱ - بجیلہ " " " "
			(۱۰) ۱ - ہوازن " " " "
			(۱۱) ۱ - غطفان " " " "
(ب)	۱۰۰–۲۰۰ سپاہیوں کے درمیان	۷	(۱) ۲ - زیر کمان حضرت زید بن حارثہ کلبی
			(۲) ۲ - " " " علی بن ابی طالب ہاشمی
			(۳) ۲ - " " " غالب بن عبداللہ لیثی
			(۴) ۱ - " " " ہشام بن عاص اموی
(ج)	۲۰۰–۳۰۰ کے درمیان	۵	(۱) ۱ - " " بشیر بن سعد خزرجی
			۱ - " " ابوعبیدہ بن جراح فہری۔ قریشی
			۱ - " " خالد بن سعید اموی
			(۴) ۱ - " " علی بن ابی طالب ہاشمی۔
			(۵) ۱ - " " علقمہ بن مجزز کنانی
د	۳۰۰–۴۰۰ کے درمیان	۲	دونوں یکجا " " خالد بن ولید مخزومی

(س)	۴۰۰-۵۰۰ کے درمیان	۳	(۱)	۱ - ″ ″ زید بن حارثہ کلبی
			(۲)	۱ - ″ ″ خالد بن ولید مخزومی
			(۳)	۱ - ″ ″ عمرو بن عاص سہمی
(ص)	۷۰۰ سپاہ پر مشتمل	۱	(۱)	۱ - ″ ″ عبدالرحمٰن بن عوف زہری قریشی
(ط)	۳۰۰۰ ″ ″ ″	۲	(۱)	۱ - ″ ″ زید بن حارثہ کلبی (شریک سالار تھے جعفر بن ابی طالب ہاشمی اور عبداللہ بن رواحہ خزرجی
			(۲)	۱ - ″ ″ اسامہ بن زید کلبی۔

مذکورہ بالا جدول سے یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ عددی لحاظ سے سب سے بڑی مہمیں یا فوجیں کسی قریشی یا انصاری عرب شریف کی کمان میں نہیں گئی تھیں بلکہ ایک مولیٰ اور اس کے نوخیز فرزند کی کمان میں بھیجی گئی تھیں۔ ان کی کامیابیوں نے نہ صرف ان کی اپنی تقرریوں کی توثیق کر دی تھی بلکہ اسلامی افواج کے سالار اعظم کی اس پالیسی کی بھی تصدیق کر دی تھی کہ عہدے اور مناصب صلاحیت و لیاقت کی بنیاد پر دیئے جانے چاہییں نہ کہ قبائلی، خاندانی یا کسی دوسری سماجی اساس کے سبب۔ حضرت زید بن حارثہ کلبی کی سالاری اور فوجی قیادت نے ان کی تمام مہموں میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اگرچہ یہی بات ہم غزوۂ موتہ کے بارے میں اتنے وثوق سے نہیں کہہ سکتے۔ حالانکہ اس مہم میں ان کی شہادت یا مسلم فوج کی پسپائی قیادت کے فقدان یا کسی خامی کے سبب نہ تھی بلکہ اس کے کچھ اور اسباب تھے۔

عہد نبوی کی دوسری اہم مہموں کے سالاروں میں نمایاں تھے حضرات عبدالرحمٰن بن عوف زہری، عمرو بن عاص سہمی اور خالد بن ولید مخزومی۔ ان کا شمار مہموں کی عددی طاقت کے اعتبار سے حضرات زید اور اسامہ کے بعد آتا ہے۔ ایک لحاظ سے وہ سالاروں کے دوسرے طبقہ میں تھے اور تیسرے طبقہ میں جو شامل تھے۔ ان میں حضرات عَلْقَمہ بن مُجَزِّز مُدلجی کنانی، علی بن ابی طالب ہاشمی، خالد بن سعید اموی، ابو عبیدہ بن جرّاح فہری اور بشیر بن سعد خزرجی نمایاں مقام کے حامل تھے۔ یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ عہد نبوی کے عظیم ترین سالار اپنے وقت کے اکثر و بیشتر عظیم ترین صحابہ میں شامل نہیں تھے اور نہ ہی ان کو بعد کی نسلوں نے اس حیثیت سے یاد رکھا۔ عسکری تنظیم کے اس شعبہ سے متعلق ایک مطالعاتی پہلو یہ ہے کہ مہموں کی منازل کیا تھیں؟ اس مطالعہ سے ہم کو نہ صرف جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں کی فوجی اہمیت کا حال علم ہو گا بلکہ اس مخالفت کی شدت اور کیفیت و کمیت کا بھی پتہ چلے گا۔ جو انہوں نے اسلامی ریاست کے خلاف کی تھی۔ ذیل کی جدول میں سو یا سو سے اوپر سپاہ پر مشتمل مہموں کا تجزیہ پیش ہے۔

نمبر شمار	قبیلہ / علاقہ	اسلامی مہم کی عددی طاقت
۱	قریش (کا ایک چھوٹا سا حصہ)	۱۰۰ اور ۷۰ (دو مہمیں)
۲	بنو سعد	۱۰۰
۳	بنو طے	۱۰۰

نمبر شمار	قبیلہ/علاقہ	اسلامی مہم کی عددی طاقت
۴	بنو ثعلبہ	۱۳۰
۵	بنو اسد	۱۵۰
۶	ملیم	۲۰۰
۷	عرینہ	۳۰۰
۸	غطفان (کا ایک حصہ)	۲۰۰ اور ۳۰۰ (دو مہمیں)
۹	جہینہ وغیرہ (راہزنوں کا گروہ)	۳۰۰
۱۰	حبشہ (کی ایک ہزن فوج)	۳۰۰
۱۱	مذحج	۳۰۰
۱۲	خذیمہ	۳۵۰
۱۳	کندہ/دومۃ الجندل کی عیسائی مملکت	۴۲۰
۱۴	نجران	۴۰۰
۱۵	جذام	۵۰۰
۱۶	بلی اور قضاعہ وغیرہ	۵۰۰
۱۷	کلب (دومۃ الجندل کا علاقہ)	۷۰۰
۱۸	غسان اور انکے حلفاء اور رومی سرپرست	۳۰۰۰ اور ۳۰۰۰ (دو مہمیں)

اکیس بڑی مہموں میں سے پانچ مہمیں شمال کے طاقتور قبائل جیسے کلب، جذام، کندہ اور غسان وغیرہ کے خلاف بھیجی گئی تھیں جبکہ دو سب سے بڑی مہمیں شمال کے قبائل کے اتحاد اور اس سے زیادہ رومی سلطنت کی باجگذار حکومتوں کے خلاف روانہ کی گئی تھیں۔ اسی طرح چار بڑی مہمیں جنوبی عرب کے منظم قبائل کے خلاف ترتیب دی گئی تھیں۔ ان دونوں دور دراز کے مقامات پر بڑی مہموں کی روانگی سے معلوم ہوتا ہے کہ فوجی لحاظ سے یہ دونوں علاقے اہم تھے۔ اس کے علاوہ طویل مسافت کا بھی ایک عنصر ان میں موجود تھا کیونکہ یہ خیال بھی ذہن میں رہا ہوگا کہ فوج اتنی بڑی ہونی چاہیئے کہ ہر قسم کی صورتحال سے بخوبی عہدہ برا ہو سکے۔ اس کے علاوہ یہ دونوں علاقے منظم و مرتب قبیلوں بلکہ منظم حکومتوں کے علاقے تھے، جہاں ان کی اپنی عسکری روایات خاصی مضبوط تھیں اور مزید برآں وہ وقت کی دو بڑی سلطنتوں۔ رومی سلطنت۔ اور ایرانی سلطنت۔ کے علاوہ ایک چھوٹی طاقت حبشہ کی مملکت کے زیر اثر علاقے تھے۔ صرف ایک بڑی مہم مدینہ کے مغرب میں رہزنوں کے ایک منظم گروہ کی سرگرمیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی البتہ مشرق میں آباد قبائل کے خلاف سات بڑی مہمیں بھیجی گئی تھیں۔ اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی سمت سے اسلامی ریاست کو خطرات زیادہ لاحق تھے۔ سرایا کے مطالعہ میں اتنی بحث کافی ہے۔

غزواتِ نبویؐ

عسکری تنظیم کے ضمن میں غزوات نبوی پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے کہ وہ بھی اسی کا ایک بلکہ اہم تر حصہ ہیں۔ ذیل میں توقیتی اعتبار سے تمام غزوات نبوی کے بارے میں معہ ان کی منازل کے تفصیلات دی جا رہی ہیں۔

نمبر شمار	مہم / غزوہ کی عددی طاقت	نام / منازل غزوات / قبیلے
۱ -	۶۰ سپاہ	الواء / ودان
۲ -	۲۰۰ ″	بواط
۳ -	۲۰۰ ″	سفوان
۴ -	۲۰۰ - ۱۵۰	ذوالعشیرہ
۵ -	۳۱۴	بدر عظیم / قریش
۶ -	(۳۱۴ ؟)	بنو قینقاع
۷ -	۴۰۰ - ۲۰۰	سویق / قریش
۸ -	۲۰۰	الکدر / سلیم و غطفان
۹ -	۴۵۰	ذوامر / ثعلبہ، محارب / غطفان
۱۰ -	۳۰۰	بحران / سلیم
۱۱ -	۷۰۰	احد / قریش
۱۲ -	۹۰۰ - ۶۲۳	حمراء الاسد / قریش
۱۳ -	۱۰۰۰	بنو نضیر / یہود
۱۴ -	۱۵۰۰	بدر الموعد / قریش
۱۵ -	۸۰۰ - ۴۰۰	ذات الرقاع / انمار، ثعلبہ، غطفان
۱۶ -	۱۰۰۰	دومۃ الجندل
۱۷ -	—	مریسیع / بنو المصطلق
۱۸ -	۳۰۰۰	خندق / احزاب عرب
۱۹ -	۳۰۰۰	بنو قریظہ / یہود
۲۰ -	۲۰۰	عسفان
۲۱ -	۷۰۰ - ۵۰۰	ذوقرد / غطفان

۲۲-	۱،۶۰۰	حدیبیہ/قریش
۲۳-	۱،۶۰۰	خیبر/یہود
۲۴-	۲۰۰۰	عمرۃ القضاء/مکہ/قریش
۲۵-	۱۰،۰۰۰	مکہ/فتح/قریش
۲۶-	۱۲،۰۰۰	حنین/ہوازن
۲۷-	۱۲،۰۰۰	طائف/ثقیف اور ہوازن
۲۸-	۳۰،۰۰۰	تبوک/غسان اور انکے اتحادی عرب اور رومی

مندرجہ بالا جدول سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کی سب سے بڑی فوجی مہم شمالی قبائل کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ غزوات نبوی میں نسبتاً تمام بڑی مہموں کا رخ یا تو اسلامی ریاست کے عظیم ترین دشمن قریش کے خلاف تھا یا مشرق میں آباد طاقت ور بدوی قبائل ہوازن، غطفان اور ثقیف کے خلاف۔ یہودیوں کے خلاف بھیجی گئی چار مہمیں بھی نسبتاً عددی لحاظ سے بڑی تھیں کہ ان میں شریک مجاہدین کی تعداد خاصی تھی۔ بہر حال اسلامی ریاست کی سب سے زیادہ مخالفت اور سب سے زیادہ مزاحمت کرنیوالے چار طبقات تھے: شمالی قبائل، قریش مکہ، یہود مدینہ و خیبر اور مشرقی قبائل۔ لہٰذا یہ فطری تھا کہ ان کے خلاف کم از کم اتنی بڑی مہم بھیجی جائے جو یا تو ان کی بخوبی سرکوبی کر سکے یا ان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دے۔

آخر میں سرایا کے امراء کا اسلامی عسکری تنظیم میں مقام اور ان کے اختیارات پر گفتگو مناسب معلوم ہوتی ہے۔ مآخذ کا اتفاق ہے کہ جب بھی مہمیں روانہ کی جاتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے امیروں کو عام ہدایات اور احکامات دیتے تھے[۵۷] اس کے علاوہ ان کو مکمل آزادی اور اختیار حاصل ہوتا تھا۔ وہ کون سا راستہ اپنائیں، کیا طرز جنگ اختیار کریں، میدان جنگ کہاں بنائیں؟ خیمہ زن کہاں ہوں، کیا حربی تدابیر اختیار کریں، شکست خوردہ کے ساتھ نرمی اور معافی کا سلوک کیونکر کریں۔ اور اموال غنیمت اور قیدیوں کے لئے کیا انتظامات کریں۔ وغیرہ وغیرہ یہ تمام اور ان سے متعلقہ امور کو ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ بہر حال سالاران فوج حالات و مواقع کے تقاضوں کے مطابق تدابیر اختیار کرتے تھے اور بہت کچھ ان کی صوابدید اور صلاحیت پر چھوڑا جاتا تھا اور یہی قرون وسطیٰ میں بہترین فوجی پالیسی تھی۔ کہ جب مواصلات اور رسل و رسائل کے ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے۔ ان حالات میں نہ تو کوئی یکا طریق کار یا طریق جنگ پہلے سے متعین کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی اس کی پیش بندی کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ مآخذ سے سالاروں کے آزادانہ اقدامات کی جو انہوں نے حالات کے تقاضوں کے مطابق کئے متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً نخلہ کی مہم میں جو کچھ ہوا وہ امیر سریہ اور ان کے رفقاء کا فیصلہ تھا۔ اگرچہ بظاہر وہ ہدایات نبوی کی خلاف ورزی تھی[۵۸]۔ موتہ کی مہم میں حضرت خالد بن ولید مخزومی کا اعلیٰ کمان سنبھالنا اور پسپائی کا فیصلہ کرنا، ان کا نجی فیصلہ تھا جس کی زبان رسالت نے تحسین و توصیف فرمائی[۵۸]۔ اسی طرح بنی جذیمہ کے خلاف مہم کے دوران ان کے آزادانہ فیصلے پر دربار رسالت سے سرزنش بھی ہوئی۔ اس کے علاوہ متعدد دوسری مثالیں ہیں جو مہموں کے بیان میں مآخذ میں محفوظ ہیں[۵۹]۔

عام نتائج

ہجرت کے چھ ماہ کے بعد اسلامی ریاست کی پہلی مہم کا ایک آزاد سالار مقرر کیا گیا۔ جس نے مدینہ کے نواح میں اس کی کمان کی۔ اس دن سے وفات نبوی تک برابر آزاد مہموں کے سالار مقرر کئے جاتے رہے ان کی کل تعداد ۶۹ تھی۔ جبکہ امیر سریہ کے عہدہ پر تقرریوں کی تعداد ۳۴ تھی یعنی کہ بعض سالاروں کو ایک سے زیادہ مرتبہ یہ سعادت حاصل ہوئی تھی۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عسکری تنظیم کے اس شعبہ میں تقرریاں مستقل نہیں تھیں جبکہ عہدہ مستقل تھا۔ سالار یا امیر سریہ کی تقرری اس لئے عارضی ہوتی تھی کہ خود فوج یا مہم عارضی ہوتی تھی۔ جیسے ہی مہم کا کام ختم ہوتا تھا۔ فوج توڑ دی جاتی تھی اور لازمی طور سے سالار کا عہدہ بھی ختم ہو جاتا تھا۔ دوسرے موقعہ پر مہم موقعہ و محل کی مناسبت سے امیر سریہ کا انتخاب ہوتا تھا۔ اِن اور اِن جیسی اور مثالوں سے مغربی مورخین نے یہ لازمی اور حتمی نتیجہ نکال لیا ہے۔ کہ عہد نبوی میں نہ عہدے مستقل تھے اور نہ عہدیدار وہ سب کے سب محض عارضی کارکن ہوتے تھے۔ حالانکہ یہ تصور غلط ہے جیسا کہ ہم مسلسل اپنے تجزیوں اور مطالعوں میں دیکھیں گے۔ بہرحال مغربی خام کاری کا سبب اس حقیقت سے صرف نظر کر لینا ہے کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی افواج کے مستقل سالار اعظم تھے اور تمام عسکری اختیارات و اقتدار ان کو حاصل تھے۔ چنانچہ جب کبھی آپ بنفس نفیس تشریف لیجانا ضروری نہیں تصور فرماتے تھے تو آپ اپنی جگہ کسی صحابی کو اپنا جانشین بنا دیتے تھے اور ظاہر کہ اصل و مستقل سالار کی موجودگی میں یہ جانشینی لازمی اور ناگزیر طور سے عارضی ہوتی تھی۔

سالاران سرایا کی تقرریوں میں اسوقت کی امت مسلمہ کے تمام طبقات اور قبائل کو ان کی صلاحیت اور افراد کی تعداد کے مطابق نمائندگی دی گئی تھی۔ زیادہ تر تقرریاں قریشی مہاجرین اور انصار مدینہ کو ملی تھیں اور وہ ہر لحاظ سے بجا تھیں۔ کیونکہ یہی دو طبقات اسلامی ریاست کی اصل تھے۔ اس طرح سے مغربی اور مشرقی قبائل کو بھی برابری سے نمائندگی ملی تھی کیونکہ وہ تیسرے اہم ترین طبقۂ امت تھے۔ جبکہ شمالی اور جنوبی قبائل کے افراد کی کمی کے سبب ان کی نمائندگی کم تھی۔ بہرحال حیات نبوی کے آخری دو برسوں میں ان دونوں آخری طبقات کی نمائندگی میں نمایاں اضافہ ہوا تھا۔

تقرری کی اصل بنیاد صلاحیت و لیاقت اور موقعہ و محل کی مناسبت تھی۔ بقیہ دوسرے اسباب جیسے خاندانی یا قبائلی علاقائی یا مذہبی محرکات و عوامل کا کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ تنقید یا تحسین، اسلام سے پہلے کی مخالفت یا محبت، علاقائی اور قرابتی دوستی یا محبت یا رشتہ داری کی بنیادوں پر نہ تو عہدے دیئے جاتے تھے نہ ان سے محروم کیا جاتا تھا۔ اگرچہ قبول اسلام میں سبقت ایک تحسین و آفرین آمیز بات تھی تاہم عسکری تنظیم کے کسی عہدے کے لئے تنہا وہی ذریعہ نہیں تھی اور نہ ہی وہ حکومت کے کسی اور منصب کے لئے اساس بن سکتی تھی۔

زیادہ تر بڑی مہمیں ان صحابہ کرام یا سالاران امت مسلمہ کے سپرد کی گئی تھیں جو عہد نبوی میں اپنی عسکری اور فوجی صلاحیتوں کے لئے ممتاز و معروف تھے۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ عہد نبوی کے سب سے اہم سالار یا امیر سریہ نہ کوئی قریشی تھا نہ کوئی انصاری بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مولیٰ حضرت زید بن حارثہ کلبی تھے۔ جنہوں نے اپنے مفروضہ فروتر سماجی مقام کے باوجود رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ مہموں کی کمان کی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ان کی مہمیں عددی طاقت کے اعتبار سے بھی غزوات کے بعد سب سے بڑی تھیں۔ دوسرے عظیم ترین سالاروں میں حضرات اسامہ بن زید کلبی، عبدالرحمٰن بن عوف زہری، خالد بن ولید مخزومی عمرو بن عاص سہمی، علی بن ابی طالب ہاشمی اور علقمہ بن مجزز مدلجی کنانی بالترتیب شمار کئے جانے چاہییں۔ امیران سرایا ہدایات نبوی کے بموجب اپنے عسکری فرائض انجام دیتے تھے۔ لیکن فوجی تدبیروں کے معاملہ میں وہ آزاد و خود مختار ہوتے تھے اور وقت و موقعہ و محل کی مناسبت سے اپنی صوابدید کے مطابق کام کرتے تھے۔ امرا دسرایا اور ان کے سپاہیوں کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی، بلکہ اموالِ غنیمت میں سے حصہ ملتا تھا۔ یہ حصہ امیر کا بھی ایک عام مجاہد کے برابر ہوتا تھا۔ البتہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اموال غنیمت میں سے خمس اور صفی لینے کا حق تھا۔ صفی تو وہ چیز تھی جسے آپ پسند فرما لیتے تھے اور خمس پورے مال کا پانچواں حصہ ہوتا تھا۔ یہ خمس آپ کا ذاتی اور نجی حصہ یا ملکیت نہیں ہوتی تھی بلکہ پوری امتِ مسلمہ کی فلاح و بہبود کے لئے آپ کو اسکے خرچ کرنے کا اختیار رہتا تھا۔ صفی آپ کی نجی ملکیت ہوتی تھی مگر عموماً آپ وہ شے کسی کو بخش دیتے تھے۔ بھلا رحمت للعالمین کو اپنی ہی فلاح کی فکر دوسروں کو چھوڑ کر کیسے ہو سکتی تھی۔

اِسلامی فوج کی ساخت اور طریق جنگ

"تاریخ اسلام کے فلسفی مورخ ابن خلدون کا بیان ہے کہ جاہلی عربوں میں جنگ کا عام اور معروف طریقہ اَلْکَرُّ وَالْفَرُّ" یعنی حملہ اور پسپائی) تھا۔ لیکن اسلام سے کچھ پہلے انہوں نے "تَعْبِیَہ" طریق جنگ اپنایا تھا جو عجم میں استعمال ہوتا تھا تعبیہ کے لغوی معنی صف آرائی اور اقدام کے ہیں۔ اس تبدیلی کے دو سبب تھے: اوّل یہ کہ عجم کے طریقوں کو انہیں کے جیسے طریقوں سے توڑا جا سکے۔ اور دوم یہ کہ باقاعدہ اور جم کر لڑی جانیوالی جنگ (اِسْتِمَاتَۃ) کے لئے زیادہ موزوں تھا" یہ طریق جنگ یا فوجی ساخت دراصل خمیس"[۶۱] کہلاتی تھی۔ جس کے معنی ہوتے ہیں پانچ حصوں والی۔ اس ساخت کے مطابق اسلامی فوج کو پانچ بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

۱ ۔ قلب (فوج کا وہ مرکزی حصہ جو درمیان میں ہوتا تھا اور جس میں سالار اعظم موجود ہوتا تھا۔)

۲ ۔ میمنہ (فوج کا دایاں بازو جس کو Right Wing کہتے ہیں یہ قلب کے دائیں ہاتھ پر ہوتا تھا)

۳ ۔ میسرہ (فوج کا بایاں بازو جس کو Left wing کہا جاتا ہے اور جو قلب کے بائیں جانب ہوتا تھا)

۴ ۔ مقدمہ (فوج کا دستہ اوّل دستہ جو اصل فوج یعنی مذکورہ بالا تینوں حصوں سے کچھ آگے ہوتا ہے)

۵ ۔ ساقہ[۶۲] (فوج کا وہ عقبی دستہ جو اصل فوج کے کچھ پیچھے رہتا ہے تاکہ عقب پر نظر رکھی جا سکے۔

ابن خلدون تعبیہ طریق جنگ کو مُزَحَّف طریقہ بھی کہتا ہے۔ یہ دراصل صف طریق جنگ کا دوسرا نام ہے جس میں فوج صفوں کی شکل میں میدان جنگ میں آراستہ کی جاتی ہے۔ کیونکہ فلسفی مورخ کے نزدیک یہ طریقہ دشمنوں کے لئے زیادہ پریشان کن اور خوفناک تھا اور یہ نظام جنگ اسلام کے آنے سے پہلے عرب میں معروف و مستعمل ہو چکا تھا[۶۳]۔ آیئے اب ہم اسلام کی

فوجی تنظیم کے اس شعبہ سے متعلق مواد کا تجزیہ کریں اور مختلف مراحل سے اس کے گذرنے کا مطالعہ کریں۔

ایک غلط فہمی یہ عام ہو گئی ہے کہ اسلامی عسکری تنظیم میں فوج کو پانچ حصوں میں تقسیم کرنے کا عمل بعد کے زمانے میں شروع ہوا تھا جب وہ زیادہ منظم اور مستقل ہو گئی تھی اور عہد نبوی میں قبائلی نظام یعنی الکر والفر کا طریقہ جاری و مستعمل تھا۔ جس میں یہ نظام ممکن ہی نہیں تھا۔ مگر ماخذ سے واضح ہوتا ہے کہ خمیس نظام عہد جاہلیت میں بھی موجود تھا، اور اسلامی عہد کے عہد نبوی سے تو متعدد بلکہ کثیر مثالیں اس کی ملتی ہیں اور ان کی بنیاد پر اس کے ارتقاء کی تاریخ اور اس کے مختلف ارتقائی منازل کی ترتیب و تعیین کی جاسکتی ہے۔ زیادہ تر اس کی مثالیں ہم کو غزوات نبوی کے ضمن میں ملتی ہیں اور مختلف مہمات نبوی میں بازوؤں کے افسروں کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان بازوؤں کی موجودگی اور ضرورت عددی اعتبار سے ایک بڑی فوج ہی میں ممکن اور موجود ہو سکتی تھی۔ اور چونکہ سرایا چھوٹی فوجوں بلکہ دستوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ اس لئے عموماً ان میں یہ دستے یا بازو غیر ضروری ہوتے تھے۔ البتہ بڑی سرایا میں ان کے حوالے ملتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اپنے اگلے تجزیے میں دیکھیں گے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام وارتقاء کے اولین مرحلہ میں اس فوجی بناوٹ کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی گئی تھی بلکہ کسی مخصوص فوجی تنظیم کی طرف ہی دھیان نہیں دیا گیا تھا۔ کیونکہ نہ تو کوئی مستقل فوج تھی اور نہ ہی اس کی فوری ضرورت محسوس کی گئی تھی۔ ساری بالغ مرد آبادی فوج تھی[۴۴]۔ جسے بوقت ضرورت اکٹھا کیا جا سکتا تھا۔ مزید یہ کہ چونکہ مسلمانوں کو ابھی تک کسی باقاعدہ جنگ و جدال کا تجربہ نہیں ہوا تھا اس لئے انہوں نے اس قسم کی کسی تنظیم کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی[۴۵]۔

بہر حال جلد ہی مسلمانوں کو میدان بدر میں قریشی اشرافیہ کی مسلح اور منظم فوج سے پالا پڑا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلم فوج کو متداول و معروف طریقہ کے مطابق میدان جنگ میں آراستہ کیا گیا۔ ماخذ میں بکثرت حوالے اس کے ملتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذاتی نگرانی میں مسلم فوج کی صف بندی کرائی تھی۔ اگرچہ اس غزوہ کے ضمن میں خمیس کی اصطلاح کا واضح حوالہ نہیں ملتا ہے تاہم اس کا ذکر مضمر طور سے ملتا ہے جو پورے بیان جنگ بدر میں موجود اور جاری و ساری ہے[۴۶] واقدی نے فوج نبوی کے دو بازوؤں میمنہ اور میسرہ کا واضح طور سے ذکر متعدد جگہوں پر کیا ہے۔ یہ بھی معلوم و معروف حقیقت ہے کہ بطور سالار اعظم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قلب میں موجود تھے اور جنگ کے دوران مسلسل ہدایات جاری فرماتے رہے تھے اس سلسلہ میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ آپ میدان جنگ سے ہٹ کر ایک جھونپڑی (عریش) میں صرف دعا و سجدہ میں مصروف رہے تھے وہ ایک نازک اور اہم لمحہ تھا جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے امداد الہی کی دعا فرمائی تھی ورنہ بقیہ وقت آپ شریک جنگ اور فوج کے درمیان موجود رہے تھے۔ عریش کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کوئی خانقاہ یا مسجد نہ تھی بلکہ ایک ایسی اونچی چٹان پر ایک فوجی چوکی تھی جہاں سے سالار اعظم پورے میدان جنگ کا معائنہ فرما سکیں[۴۷]۔ بہر حال ایک روایت کے مطابق میمنہ کے سالار حضرت ابوبکر صدیق تھے اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میسرہ بھی کسی افسر کے ماتحت نگرانی میں دیا گیا ہوگا[۴۸]۔ لیکن ماخذ میں ایک روایت یہ بھی ملتی ہے کہ اس غزوہ میں نہ تو مسلم فوج میں دونوں بازوؤں کے افسر مقرر ہوئے تھے اور نہ مکی فوج میں[۴۹]۔ بہر حال اس سے افسران میمنہ اور میسرہ کی تقرری کی تردید تو ہوتی ہے مگر ان دونوں بازوؤں کی غیر موجودگی کی تائید نہیں ہوتی عین ممکن ہے کہ دونوں طرف افسروں کی تقرری نہ ہوئی ہو۔ لیکن ماخذ کی یہ زیادہ قوی روایت پہلی بینہ طور پر ضعیف روایت سے زیادہ قوی

نہیں معلوم ہوتی ہے۔ یہ تسلیم کرلیا جائے کہ نوزائیدہ مسلم فوج اپنی ناتجربہ کاری اور قلت وقت کے سبب اپنے بازوؤں کو ترقی نہیں دے سکی تھی اور خمیس طریقے کو نہیں اپنا سکی تھی تو مکی فوج کو کیا ہوا تھا؟ وہ تو تجربہ کار بھی تھی اور وقت کی کمی بھی اس کے پاس نہیں تھی۔ پھر جنگ فجار میں وہ خمیس نظام اپنا سکتی تھی۔ تو اس کے تیس پینتیس برس بعد بدر کے میدان میں اس کو اپنانے میں کیا چیز مانع تھی؟ اس کے علاوہ اسلامی فوج تین قبائلی دستوں میں بھی منقسم تھی: ایک مہاجرین کا دستہ تھا اور باقی دو دستے مدینہ کے انصاری قبیلوں کے تھے یہ عرب کے قبائلی عسکری نظام کے عین مطابق تھے۔

جنگ احد کے بارے میں ہم کچھ زیادہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی فوج خمیس کے اصولوں پر مبنی تھی کیونکہ مآخذ کا اصرار ہے کہ مکی فوج اس نظام پر مرتب کی گئی تھی اس لئے "اسلامی فوج کے لئے ضروری ہوگیا تھا کہ ان کی چالوں کی کاٹ کرنے کے لئے وہی نظام اپنائے۔ واقدی کا بیان ہے کہ مکی سالاروں نے خالد بن ولید مخزومی کو اپنی فوج کے میمنہ پر اور عکرمہ بن ابی جہل مخزومی کو اپنے میسرہ پر سالار مقرر کیا تھا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فوج میں بھی یہ دونوں بازو بنائے تھے"[1] اور ظاہر ہے یہ دونوں بازو اپنے متعلقہ سالاروں کی کمان میں تھے۔ اس کی تصدیق اسد الغابہ کی ایک روایت سے اگرچہ جزوی طور سے ہی ہوتی ہے اس کے مطابق حضرت منذر بن عمرو اس غزوہ میں اسلامی فوج کے میسرہ کے سالار تھے"[2]۔ بہرحال اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا لازمی ہو جاتا ہے کہ دائیں بازو کا بھی کوئی سالار ضرور تھا جس کا نام مآخذ محفوظ نہیں رکھ سکے۔ مزید تصدیق طبری کے اس بیان سے ہوتی ہے۔ جس کے مطابق حضرت حمزہ بن عبد المطلب کو اس موقعہ پر مقدمہ کا سالار مقرر کیا گیا تھا"[3]۔ اگرچہ بقیہ بازوؤں یا ان کے سالاروں کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ تاہم یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ خمیس نظام اسلامی فوج کا بنیادی طور سے جزو بن چکا تھا اس کے علاوہ غزوہ مریسیع کے ضمن میں ہم ساقہ کا ذکر بھی پاتے ہیں"[4] جبکہ بنو قریظہ کے غزوہ میں ایک بار پھر مقدمہ کا ذکر ملتا ہے۔ مؤخر الذکر کے سالار حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی تھے"[5]۔

سیرت نبوی میں توقیتی اعتبار سے پہلی بار خمیس کی اصطلاح کا واضح ذکر واقدی کے یہاں خیبر کی مہم کے بیان میں ملتا ہے"[6] اس کے بعد اسلامی فوج کا جب بھی ذکر آتا ہے۔ خمیس کا حوالہ وضاحت کے ساتھ یا مضمر طور سے ضرور ملتا ہے۔ چنانچہ غزوات عمرۃ القضیہ، موتہ، فتح مکہ، حنین، اوطاس، طائف اور تبوک کے ضمن میں اس کے حوالے ملتے ہیں، عمرۃ القضیہ میں مقدمہ کے سالار حضرت محمد بن مسلمہ اوسی تھے۔ اور ان کے ماتحت سپاہی   تھے   سب کے سب شہسوار (الخیل) تھے جبکہ ہتھیاروں اور اسلحہ جات کا افسر حضرت بشیر بن سعد خزرجی کو مقرر کیا گیا تھا"[7]۔ چھ ماہ بعد حضرت قطبہ بن قتادہ کو غزوہ موتہ کی اسلامی فوج میں میمنہ کا سالار مقرر کیا گیا تھا"[8]۔ خمیس نظام کی سب سے اچھی مثال اور ثبوت حضرت خالد بن ولید مخزومی کی اس حربی تدبیر میں ملتا ہے جو انہوں نے اس غزوہ میں اپنائی تھی اس عظیم سالار نے تین نامزد سالاران نبوی کی شہادت کے بعد اپنی فوج کی ترتیب و بناوٹ میں مکمل تبدیلی یوں پیدا کی تھی کہ میمنہ کو میسرہ کی جگہ متعین کیا تھا"[9]۔ بازوؤں کی اس نئی ترتیب سے دشمن دھوکہ کھا گیا کہ مسلمانوں کی تازہ کمک آگئی ہے اور اس سبب سے اس نے جنگ سے گریز کیا اور اس طرح مسلمانوں کو باعزت پسپا ہونے کا موقعہ مل گیا۔ فتح مکہ کے غزوہ میں ہم کو یہ یقینی علم ہوتا ہے کہ حضرت خالد بن ولید مخزومی نے مقدمہ کی کمان کی تھی۔ جو نقوش نمبر ۱ (۲۰۰)

دو ہزار شہسواروں پر مشتمل تھا۔ جبکہ باقی دونوں بازو اپنے اپنے سالاروں کی کمان میں تھے اور اصل قیادت فوج کی خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔ آپ کے بارے میں مزید شہادت یہ ملتی ہے کہ تمام کتائب (دستوں / بازوؤں) پر آپ کا اختیار تھا اور ان کو ہدایات دے رہے تھے۔ یہ دستے مختلف قبیلوں نے مہیا کئے تھے اور ان کے اپنے اپنے سالار تھے۔ حنین وطائف کی مشترکہ مہم کے ضمن میں بھی خمیس کا ذکر ملتا ہے اور خیل (شہسوار دستہ) کا ذکر اس کے عظیم المرتبت سالار حضرت خالد بن ولید کے نام کے ساتھ کیا جاتا ہے[۸۱]۔ ان کثیر روایتوں اور شہادتوں کی روشنی میں یہ فرض کیا جانا جائز ہوتا ہے کہ غزوہ تبوک میں بھی اسلامی فوج اسی نظام پر مبنی تھی[۸۲]۔ بہر حال ان تاریخی واقعات اور شواہد کی بنیاد پر یہ نتیجہ بخوبی نکالا جا سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعبیہ خمیس نظام کا تجربہ اپنی پہلی عظیم مہم سے کرنا شروع کر دیا تھا اور رفتہ رفتہ یہ نظام مکمل اور پختہ ہو گیا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ کچھ مدت کے بعد ہی اسلامی فوج ایک طاقت بن کر ابھری۔ ایک ایسی طاقت جس نے نہ صرف عرب قبائل کی مزاحمت کو توڑا بلکہ عربوں کی سب سے بڑی فوجی قوت قریش مکہ کا سرنگوں کیا اور عہد نبوی کے مابعد اسلامی فوج نے نہ صرف وقت کی دو عظیم ترین طاقتوں سے لوہا لیا بلکہ ان میں سے ایک کو مختصر سی مدت میں نیست و نابود کر دیا اور دوسری کو اپاہج بنا دیا۔

عہد نبوی کے عظیم ترین بازوؤں کے سالاروں میں حضرات منذر بن عمرو[۸۳]، اوس بن خولی خزرجی[۸۴]، علی ابن ابی طالب ہاشمی[۸۵]، حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی[۸۶]، زبیر بن عوام اسدی[۸۷]، ابوعبیدہ بن جراح فہری[۸۸] اور خالد بن ولید مخزومی[۸۹] کے علاوہ قطبہ بن قتادہ سعدی[۹۰]، ورد بن خالد سلمی[۹۱] اور ابو عامر اشعری[۹۲] کے اسمائے گرامی نمایاں نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے مختلف غزوات و سرایا میں شاندار خدمات انجام دی تھیں۔

الحرس (محافظ فوج)

جنگ کے زمانے میں جب اسلامی فوج دشمنوں سے مقابلے کرنے یا ان کی مزاحمت کو کچلنے کے لئے باہر گئی ہوتی تھی تو ریاست کے پایۂ تخت کو بلا کسی محافظ فوج کے نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس صورت میں شہری آبادی اردگرد کے دشمن یا مخالف قبائل کے حملہ کا شکار ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ شہر کے مسلمان اپنے آپ کو محفوظ تصور نہیں کر سکتے تھے۔ خاص کر اس صورت میں کہ جب اندرونی دشمن جیسے منافقین اور یہود اپنی سازشوں سے باز نہیں آ رہے تھے[۹۳]۔ ان حالات میں صدر مقام کی حفاظت اور دفاع کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی تھی بہر حال یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دور بینی اور فوجی سوجھ بوجھ تھی کہ آپ نے شہر کے دفاع کے مکمل انتظامات کئے تھے۔ چنانچہ جب کبھی آپ کسی مہم یا سفر پر شہر سے باہر تشریف لیجاتے تو شہر کی حفاظت کے لئے ایک فوج چھوڑ جاتے تھے۔ جو دشمن کے منصوبوں کو خاک میں ملا سکتی تھی یا ان کو شرارت سے باز رکھ سکتی تھی۔ یہ انتظامات صرف اپنی غیر حاضری میں ہی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنی موجودگی میں بھی جب حالات غیر معمولی ہوتے تھے۔ ان کی طرف پوری توجہ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ اپنا ایک جانشین (خلیفہ، نائب) بھی چھوڑ کر جاتے تھے۔ جو مسلمانوں اور اسلامی ریاست کے مفادات کی دیکھ بھال آپ کی غیر حاضری میں کرتا تھا۔ ان خلفاء یا نوّاب سے ہم اگلے باب میں بحث کریں گے کیونکہ ان کے فرائض منصبی کسی قدر مختلف تھے۔

تقریباً تمام اہم غزوات کے بیان میں ہم کو ایک محافظ فوج (الحرس) کا ذکر ملتا ہے۔ غزوہ احد کے دوران قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ اوسی کو حرس کا سالار مقرر کیا گیا تھا[۹۴]۔ خندق کی جنگ کے پُر آشوب و خطرناک موقعہ پر دو سالاران حرس حضرت

زید بن حارثہ کلبی اور حضرت سلمیٰ بن اسلم اوسی کو باری باری سے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی اور وہ بالترتیب ۵۰۰ اور ۲۰۰ شہسوار دل پر مشتمل دستوں کے ساتھ شہر کا گشت لگاتے رہتے تھے۔ کیونکہ خدشہ یہ تھا کہ یہود بنی قریظہ کہیں عقب سے حملہ نہ کردیں[95] اسی طرح ربیع الثانی ۶ھ / اگست ۶۲۷ء میں جب آپ غطفان کے خلاف ایک مہم میں مشغول تھے۔ حضرت سعد بن عبادہ خزرجی کو تین سو سپاہ پر مشتمل ایک محافظ فوج کا، جو پوری طرح انہی کے قبیلہ والوں کی تھی، سالار مقرر کیا گیا تھا[96]۔ اگرچہ شہر مدینہ کی محافظ فوج کے لیے اس سے زیادہ اطلاعات نہیں ملتی ہیں۔ تاہم اتنی شہادتیں اس بات کے لیے کافی ہیں کہ شہر کے دفاع اور حفاظت کا پورا انتظام کیا جاتا تھا۔ عموماً ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محافظ فوج کے سپاہی مدینہ کے انصاری قبیلوں اوس و خزرج ہی سے لئے جاتے تھے۔ جیسا کہ آخری مہم میں خزرجی سپاہیوں کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے اس کے علاوہ مزید شہادتیں اس ضمن میں الحرس کی ایک اور قسم کے بارے میں بھی ملیں گی۔

الحرس یا محافظ فوج کی ایک اور قسم تھی جس کو ہم چوکسی کی فوج یا دستہ بھی کہتے ہیں۔ یہ مہموں کے دوران رات میں اسلامی معسکر یا کیمپ کی حفاظت کرتی تھی یا دشمن کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتی تھی تاکہ شب خون سے بچا جا سکے[97]۔ بدر کے غزوہ کے دوران اس قسم کا کوئی انتظام کیا گیا تھا یا نہیں ہم نہیں جانتے۔ امکان غالب یہی ہے کہ کچھ نہ کچھ انتظام ضرور کیا گیا ہوگا۔ بہر حال غزوہ احد کے بارے میں ہم یقینی طور سے جانتے ہیں کہ اس قسم کی محافظ یا چوکسی کی فوج اور اس کا سالار مقرر کیا گیا تھا[98]۔ مختلف غزوات و سرایا کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ شب بیدار محافظوں پر مشتمل دستے اپنے سالاروں کے ماتحت مقرر کئے جاتے تھے اور یہ ایک معمول تھا چنانچہ حضرات محمد بن مسلمہ اوسی عباد بن بشر اوسی، اوس بن خولی خزرجی اور عمر بن خطاب عدوی قریشی ایسے شب بیدار محافظوں کے نمایاں سالار رہتے تھے[99]۔ لیکن اعداد و شمار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ اوس اس فرض منصبی کو ادا کرنے میں پیش پیش تھا۔ دوسرا اہم نکتہ اس ذیل میں یہ بھی ہے کہ اکثر حالات میں یہ شب بیدار محافظ صرف شخص واحد ہوتا تھا۔ بہر حال ۳ھ / ۶۲۵ء سے ۸ھ / ۶۳۰ء تک کے عرصے میں اوس کے دو افراد نے یہ فرض چھ مواقع پر انجام دیا تھا[100]۔ ماخذ کا بیان بھی ہے اور واقعات سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ اول الذکر دو محافظ یعنی حضرات محمد بن مسلمہ اور عباد بن بشر نے اس اہم اور ذمہ دارانہ کام میں مہارت حاصل کر رکھی تھی اور وہ اس کے لئے معروف و مشہور تھے[101] عمرۃ القضیہ کے موقع پر تین حضرات محمد بن مسلمہ، عباد بن بشر اور اوس بن خولی نے باری باری سے پہرہ دیا تھا۔[102]

شب بیدار محافظوں کے علاوہ الحرس میں کیمپ محافظ بھی تھے۔ یہ محافظ اسلامی کیمپ کا گشت لگاتے رہتے تھے اور اپنے ساتھی مجاہدین کی حفاظت کرتے تھے۔ کبھی ایک پورا دستہ اس کام کو انجام دیتا تھا اور کبھی ایک یا دو آدمی کافی سمجھے جاتے تھے[103]۔ ظاہر ہے کہ محافظین کی تعداد حالات اور مواقع کے تقاضوں کے مطابق ہوتی تھی۔ خطرہ کم ہوتا تھا یا مہم چھوٹی ہوتی تھی تو ایک دو آدمی کافی ہو جاتے تھے یا اچانک ضرورت پیش آجانے پر بھی ایک آدمی کفایت کر جاتا تھا۔ مثال کے طور پر جنگ خندق کے دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اچانک گشت کرتے ہوتے ایک ایسی جگہ پر پڑی جہاں سے خندق پار کی جاسکتی تھی۔ آپ نے بذات خود اس کی نگرانی فرمائی۔ تاآنکہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے آپ کی جگہ سنبھال لی[104]۔ اسی غزوہ میں مکمل محافظ دستہ حضرت عباد بن بشر انصاری کی قیادت میں برابر گشت لگا رہا تھا۔ بہر حال ان تمام شواہد سے واضح ہوتا ہے کہ الحرس یا محافظ فوج کا ایک باقاعدہ نظم تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مہموں کے دوران اس کے انتظامات کرتے تھے۔ یہ عہد نبوی کی عسکری تنظیم کا ایک شعبہ تھا۔ اگرچہ مختصر سا تھا۔

معسکر سالار

خیمہ گاہ (معسکر) کا سالار عموماً اسلامی فوج کا سالار اعلیٰ ہوا کرتا تھا اور جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تھے تو آپ افواج کے ساتھ ساتھ کیمپ کمانڈر بھی ہوتے تھے۔ بہرحال دو واضح مثالیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی غیر حاضری میں اپنا جانشین سالار معسکر بنایا تھا۔ واقدی کا بیان ہے کہ آپ نے غزوات بنو نضیر اور خیبر کے دوران حضرات علی بن ابی طالب ہاشمیؓ[105] اور عثمان بن عفان امویؓ[106] کو اپنا جانشین سالار لشکر بنایا تھا۔ آپ کی عارضی غیر حاضری میں یہ دونوں حضرات سالار افواج بھی مقرر کیے گئے تھے (استخلاف) خیبر کی مہم کے سلسلہ میں اس عہدہ کی کچھ تفصیلات ملتی ہیں جن کے مطابق آپ کسی ضرورت سے رجیع کے مقام سے ہٹ گئے۔ جہاں اسلامی لشکر خیمہ زن تھا۔ چنانچہ آپ نے اپنی غیر حاضری میں حضرت عثمان بن عفان اموی کو کیمپ اور لشکر دونوں کا سالار مقرر کیا تھا۔ حضرت عثمان اموی کی اس عہدہ پر تقرری خاصی اہم بات ہے کیونکہ ان کی شہرت عموماً فوجی امور کے لئے نہیں ہے۔

عرض

عہد نبوی کی عسکری تنظیم کا ایک اہم پہلو فوجی معائنہ (عرض) تھا۔ عام طور سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ اہم کام اپنے کسی صحابی کے سپرد کر دیتے تھے جو اس فن میں ماہر ہوتا تھا۔ معمول یہ تھا کہ اسلامی فوج کے سپاہیوں کا معائنہ اس کے اکٹھا ہونے کے بعد ہوتا تھا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اسلامی فوج کوئی مستقل فوج نہیں تھی۔ جس کا معائنہ وقتاً فوقتاً ہوتا رہے۔ کبھی کبھی یہ معائنہ فوج کے کوچ سے پہلے یا اسکے دوران یا جنگ شروع ہونے سے کچھ پہلے کیا جاتا تھا۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ معائنہ کا طریقہ پہلی اہم مہم سے شروع ہو گیا تھا[107]۔ واقدی کے مطابق جب اسلامی فوج بدر جانے کے لئے بئر ابی عنبہ نامی مقام تک پہنچی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی حضرت قیس بن ابی صعصعہ کو مجاہدین کے معائنہ کا حکم دیا۔ چنانچہ تعمیل حکم میں انہوں نے سپاہیوں کا شمار لگایا (عَدَّهُمْ) اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انکی تفصیلات سے آگاہ کیا[108]۔ ابن سعد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ معائنہ اس وقت ہوا تھا جب اسلامی فوج شہر سے ایک میل دور جا چکی تھی اور معائنہ میں جن مجاہدین کو کم عمر پایا گیا تھا ان کو واپس کر دیا گیا تھا[109]۔ اسی طرح غزوہ احد کے موقعہ پر بھی اسلامی فوج کا معائنہ کیا گیا تھا اور اس بار معائنہ شیخین کے مقام پر ہوا تھا۔ واقدی کے مطابق اس بار گیارہ مجاہدین کو ان کی کم عمری کے باعث مسترد کر دیا گیا تھا۔ جب کہ ان میں سے دو حضرات رافع بن خدیج اور سَمُرَہ بن جُندَب کو ان کی جسمانی طاقت اور فن جنگ میں مہارت کے سبب کم عمری کے باوجود اجازت دیدی گئی تھی[110]۔ عرض یا معائنہ کی دوسری مثال غزوہ خندق کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ غزوہ احد میں مسترد کئے جانے والے متعدد مجاہدین جیسے حضرات عبداللہ بن عمرؓ، زید بن ثابت اور براء بن عازب وغیرہ کو فوجی عمر تک پہنچ جانے کے سبب اس بار اجازت جہاد دے دی گئی تھی[111]۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ فوجی عمر یا فوجی خدمت کی کم از کم عمر پندرہ سال تھی۔ عام حالات میں اس سے کم عمر کے لڑکوں کو فوج میں شرکت کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

اگرچہ غزوہ خیبر کے بیانات میں ابتدائی ماخذ معائنہ (عرض) کا کوئی حوالہ نہیں دیتے ہیں۔ تاہم یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس اہم غزوہ میں بھی

عرض (معائنہ) کیا گیا تھا۔ مآخذ کا یہ متفقہ بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت خزرجی کو اموال غنیمت میں مجاہدین کے حصے متعین کرنے کی غرض سے مجاہد شماری کا طریقہ سونپا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس بیان میں عرض بھی مضمر ہے۔ بہر حال اس ضمن میں ایک اہم ترین نکتہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ غزوہ خیبر کے بعد حضرت زید بن ثابت کو عرض کا مستقل افسر مقرر کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ انہوں نے اپنی کم عمری کے باوجود یہ کام عہد نبوی میں بقیہ تمام مہموں کے زمانے میں انجام دیا تھا اور ان میں فتح مکہ، حنین، طائف اور تبوک جیسی بڑی مہمیں شامل تھیں۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کم از کم عرض (معاینہ کے افسر) کا عہدہ اور منصب مستقل طور سے ایک عہدہ دار کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اور حضرت زید بن ثابت اس کے مستقل افسر تھے [113]

اسلامی فوج کے ڈویژن

اسلامی فوج نے اپنے پیشرو جاہلی نظام فوج سے بہت سی چیزیں مستعار لی تھیں اور ان میں فوجی ڈویژن یا دستے شامل تھے۔ چنانچہ عرب فوج میں چاہے وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی پانچ اہم ڈویژن ہوتے تھے پیادہ فوج (اَلْمُشَاۃ) شہسوار فوج (اَلْخَیْل) تیر اندازوں کا دستہ (اَلرُّمَاۃ) مسلح و کیل کانٹے سے لیس دستہ (اَھْلُ السِّلَاح) اور سامان رسد کا نگران دستہ (اَصْحَابُ الزَّحْمَۃ) اونٹ (بَعِیْر) سواری اور نقل و حمل کے ذرائع تھے اور غالباً ان پر مشتمل کوئی دستہ نہیں ہوتا تھا۔ ان تمام دستوں کے حوالے مختلف مہمات نبوی کے بیانات میں ملتے ہیں۔ بدر کی مہم کے ذیل میں حضرت قیس بن ابی صَعْصَعَہ خزرجی کو واقدی [114] اور ابن سعد [115] پیادہ فوج (مُشَاۃ) کا سالار بتاتے ہیں جبکہ ابن اسحاق [116] اور طبری [117] نے ان کو ساقہ (فوج کے پچھلے حصہ) کا افسر بتایا ہے۔ ممکن ہے کہ ساقہ پیادہ فوج ہونے کے سبب یہ تضاد پیدا ہوا ہو اور چاروں مآخذ کی مراد اس سے ساقہ کے پیدل مجاہدین سے ہو۔ بہر حال یہ تو معلوم ہوتا ہی ہے کہ پوری فوج بدر میں ایک دو کے سوا پیادوں پر مشتمل تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سالار اعلیٰ تھے [119] اور ساقہ بہر حال اصل فوج سے کچھ پیچھے ہوتا تھا اس لئے اس کا ایک علیحدہ افسر ہونا ضروری تھا۔ خیبر کی مہم میں حضرت اوس بن خولی اہل السلاح کے افسر تھے [120] جبکہ حضرت علی کی مہم فلس میں حضرت عبداللہ بن عتیق خزرجی مشاۃ اور رَدّہ کے افسر تھے [121] بہر حال ان مثالوں سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ پیادہ فوج عہد نبوی کی عسکری تنظیم کا ایک لازمی حصہ تھا۔ جہاں تک شہسوار فوج کا تعلق ہے تو مختلف غزوات کے بیانات میں اس کے حوالے ملتے ہیں، چونکہ اسلامی فوجی نظام میں اس کا ارتقاء ایک اہم عنصر تھا اس پر الگ سے بحث کرنا مناسب معلوم ہے۔

شہسوار فوج (الخیل) کا ارتقاء

اسلامی فوج میں شہسوار فوج ابتدائی مہموں تک نظر نہیں آتی۔ غزوہ بدر میں مسلمانوں کے تین سو چودہ سپاہیوں میں سے کل دو کے پاس گھوڑے تھے جبکہ ان کے مکی متقابلوں اور حریفوں کے پاس ایک سو شہسوار تھے [123] بدر کے مال غنیمت میں مسلمانوں کو دس گھوڑے ملے تھے [124] جس سے ان کی شہسوار فوج کی غالباً بنیاد پڑی تھی۔ اس کے چھ ماہ بعد ذو امر کے غزوہ میں مسلم فوج میں سے متعدد مجاہد شہسوار تھے۔ لیکن ان کی حتمی تعداد نہیں معلوم ہوتی ہے [125] غزوہ احد میں مسلم فوج کے پاس کم از کم پچاس گھوڑے تھے جبکہ سہ ہزاری

مکی فوج کے پاس دو سو گھوڑے، تین ہزار اونٹ اور سات سو زرہ بکتر تھے[۱۲۶] اس کے علاوہ ان کے پاس ایک سو تیر اندازوں پر مشتمل دستہ تھا۔ جبکہ مسلمانوں کا بھی دستہ کل پچاس تیر اندازوں پر مشتمل تھا اور حضرت عبداللہ بن جبیر خزرجی کی قیادت میں تھا۔[۱۲۷] مریسیع کی مہم کے ذیل میں مسلم شہسواروں کی تعداد محض تیس رہ گئی تھی[۱۲۸] لیکن خندق کی مہم کے دوران مسلم شہسواروں کی تعداد پانچ سو معلوم ہوتی ہے کیونکہ دو شہسوار دستوں کا ذکر ملتا ہے جو بالترتیب تین سو اور دو سو پر مشتمل تھے اور حضرات زید بن حارثہ اور سلمی بن اسلم اوسی کی کمان میں تھے[۱۲۹] اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ واقدی کے بیان میں اس غزوہ کے دوران فریقین کے عسکری اعداد و شمار کا تقابلی مطالعہ ملتا ہے جس سے دونوں کی حربی طاقت کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے چنانچہ مذکورہ بیان اور دوسرے ماخذ کے بیانات کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنگ خندق دراصل شہسواروں اور تیر اندازوں کی لڑائی تھی اس کے علاوہ وہ فن حرب کی بعض باریک و پیچیدہ تدابیر کی بھی جنگ تھی۔

اس کے بعد تمام دوسرے غزوات نبوی میں ہم کو شہسوار دستوں کی مسلسل موجودگی کے حوالے ملتے ہیں۔ چنانچہ مہمات عسفان[۱۳۰]، غابہ[۱۳۱]، حدیبیہ[۱۳۲]، خیبر[۱۳۳]، اور عمرۃ القضاء[۱۳۴] جو ۶ھ / ۶۲۷ء تا ۸ھ / ۶۲۹ء کے دو برس کی مدت میں بھیجی گئی تھیں شہسواروں (الخیل) کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان تمام مہموں میں ان کی تعداد کافی کم معلوم ہوتی ہے اس کا ایک ہی سبب ہے اور وہ یہ کہ فوجی نقطۂ نظر سے یہ تمام مہمیں بہت معمولی تھیں۔ بہر حال فتح مکہ کے دوران اسلامی فوج میں شہسواروں کی تعداد ڈھائی ہزار کے قریب تھی[۱۳۵]۔ ایک سال سے کچھ زیادہ مدت کے بعد غزوہ تبوک میں شہسوار (الخیل) دس ہزار کی عظیم تعداد کو جا پہنچے تھے۔ جبکہ پیادہ سپاہ کی تعداد بیس ہزار تھی[۱۳۶]۔ اس تجزیہ سے اسلامی عسکری تنظیم بالخصوص اس کے اس شعبے کے ارتقاء کا اندازہ ہوتا ہے کہ آٹھ برس کی مدت میں اسلامی فوج کی کل عددی طاقت تین سو سے کچھ زیادہ سپاہ سے بڑھ کر تیس ہزار ہو گئی اور گھوڑوں کی تعداد دو سے بڑھ کر دس ہزار ہو گئی تھی اور یہ عہد نبوی کی عسکری تنظیم کا ایک شاندار کارنامہ تھا۔

یہاں دو اہم سوال پیدا ہوتے ہیں: اول یہ کہ شہسوار فوج کو ترقی دینے کا کیا محرک یا محرکات تھے؟ اور دوم یہ کہ اسکے لئے کیا ذرائع اختیار کئے گئے تھے؟ جہاں تک محرکات و عوامل کا تعلق ہے تو وہ ظاہر تھے، اول یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں کی طاقت کا بھرپور مقابلہ کرنا چاہتے تھے اور چونکہ ان کی افواج میں شہسوار ہوتے تھے اس لئے آپ نے بھی اس کی ترقی پر توجہ دی۔ دوم یہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ تجربہ بھی ہوتا گیا کہ گھوڑ سوار فوج میں حملہ اور اقدام کی زیادہ اور کارگر صلاحیت ہوتی ہے۔ سوم یہ کہ ان کی وجہ سے مسافت کا مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے اور قلیل عرصے میں صدر مقام سے مقام جنگ یا جائے فتنہ تک پہنچا جا سکتا ہے ان اسباب سے نہ صرف آپ نے بنفس نفیس شہسوار فوج کی ترقی پر توجہ دی بلکہ مسلمانوں کو بھی گھوڑے حاصل کرنے کی پوری ترغیب دی اس میں ترغیب الٰہی بھی شامل تھی[۱۳۷] اور اس کا یقیناً خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ مسلم فوج میں شہسوار دستوں کی ترقی بلکہ زود و تیز رفتار ترقی کا ایک اہم سبب شہسواروں کا دوگنا حصہ بھی تھا جو ان کو پیادوں کے مقابلے میں اموال غنیمت میں سے ملتا تھا۔ بلکہ بعض روایات میں تو شہسواروں کا تین گنا حصہ بتایا گیا ہے۔ لیکن واقدی کے مطابق اول الذکر تناسب پہلی مہم سے آخری مہم تک عہد نبوی میں برابر قائم و جاری رہا تھا[۱۳۸]۔ ظاہر ہے کہ اس محرک نے مسلمان مجاہدین کو گھوڑے زیادہ سے زیادہ

حاصل کرنے کی عملی ترغیب دی تھی اس کے علاوہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضمن میں ایک بڑی اسلامی ریاست کی جانب سے اپنائی تھی اور وہ یہ تھی کہ اموالِ غنیمت کے خمس کے ایک حصہ کو اور اکثر حالات میں اضافی آمدنی کو گھوڑوں اور اسلحوں کی خرید پر خرچ فرماتے تھے۔ متعدد مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس مقصد کے لیے آپ نے عرب دنیا کے بازاروں سے گھوڑے خریدنے کے لئے اپنے افسر مقرر کئے تھے۔[۱۳۹] اس پالیسی کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور مختصر سی مدت میں اسلامی ریاست کے پاس اتنی بڑی شہسوار فوج ہو گئی کہ پورے عرب میں اس کا کوئی مقابل و حریف نہ تھا۔

عہدِ نبوی کی فوج میں ڈویژن عموماً قبائلی بنیادوں پر مرتب ہوتے تھے اور یہ ان حالات کے اعتبار سے ناگزیر تھا۔ کیونکہ پورا نظامِ حیات قبائلی تھا۔ یہ قبائلی فوجی کردار چھوٹی مہموں میں زیادہ واضح نہیں معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کی سپاہ کی تعداد ہی بہت مختصر ہوتی تھی۔ لیکن بڑی مہموں میں وہ پوری طرح سے نمایاں نظر آتا ہے۔ چونکہ اسلامی فوج مستقل اور دوامی نہیں تھی اور وقتِ ضرورت قبیلوں سے کہا جاتا تھا اور وہ اپنے قبائلی دستوں کے ساتھ جمع ہو جاتے تھے اور یہی قبائلی دستے اسلامی فوج بناتے تھے عام طور سے کم اہم مواقع پر اسلامی فوج کے تین دستے ہوتے تھے۔ ایک مہاجرین کا اور باقی دو دستے مدینہ کے دو انصاری قبیلوں اوس اور خزرج کے ہوتے تھے لیکن مخصوص حالات اور مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قبائلِ عرب کو بھی اپنے دستوں کے ساتھ طلب فرماتے تھے جیسا کہ فتحِ مکہ اور تبوک کے غزوہ کے دوران بہت واضح طور سے نظر آتا ہے۔ عام طور سے قبائلی روایات کے مطابق یہ قبائلی دستے اپنے سرداروں کی کمان میں ہوتے تھے۔[۱۴۰] لیکن جب وہ اسلامی فوج میں منقلب ہو جاتے تھے تو ان کے قبائلی سردار ریاستِ اسلامی کے سالارِ اعلیٰ کے ماتحت ہو جاتے تھے۔ بہرحال یہ قبائلی کردار اول مہم سے آخری مہم تک پورے عہدِ نبوی میں نظر آتا ہے۔ مثلاً جنگِ بدر میں انصار اور مہاجرین کے بالترتیب دو اور ایک یعنی کل تین دستے تھے۔ خندق سے پہلے تقریباً تمام مہماتِ نبوی میں یہی صورتِ حال برقرار رہی تھی۔ اس کے بعد کی مہموں میں خاص کر غزوہ فتحِ مکہ اور غزوہ تبوک کے مواقع پر کئی مسلم قبائلِ عرب جیسے سلیم، اشجع، فزارہ، غفار، اسلم، مزینہ، جہینہ، خزاعہ، اسد اور متعدد اور دل کے دستوں کا حوالہ ملتا ہے۔ یہ قبائلی کردار ان کے سرداروں کی تسکینِ خاطر اور اعزاز و اکرام کے لئے بھی برقرار رکھنا ضروری تھا کیونکہ وہی قبائل سپاہیوں کو قابو میں رکھ سکتے تھے۔ لیکن بہرحال آہستہ آہستہ اسلامی فوجی نظام میں مرکزیت پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی جس کا بھرپور مظاہرہ خلافتِ راشدہ میں عموماً اور خلافتِ حضرتِ معاویہ میں خصوصاً ہوا۔

صوبائی فوجی تنظیم

عہدِ نبوی میں معمول یہ تھا کہ صوبوں جن کو ولایات کہا جاتا تھا میں فوجی تنظیم من جملہ فرائض والی یا گورنر ہوتی تھی۔ لیکن بعض مخصوص حالات میں بعض ولایات میں فوجی انتظامات گورنر یا والی کے دائرہ اختیار سے نکال کر یا اسی کے اندر ایک خاص افسر فوج (جند) کے حوالے کر دیئے جاتے تھے۔ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن میں وہاں کے مخصوص حالات کے سبب کیا تھا۔ اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن ربیع مخزومی کو یمن کی مرکزی اسلامی افواج (الجند) کا افسر مقرر کیا گیا تھا۔ یہ تقرری غالباً ۹ھ / ۶۳۰ء اور ۱۱ھ / ۶۳۲ء کے درمیان کسی وقت ہوئی تھی جب حضرت معاذ بن جبل خزرجی وہاں کے گورنر جنرل تھے۔ ماخذ کا مزید بیان ہے کہ حضرت عبداللہ

مخزومی اس عہدے پر مدتوں سرفراز رہے تھے[۱۳] خلافت فاروقی میں ایک مرکزی دیوان الجند (فوجی محکمہ) قائم ہوا تھا۔ جس کے ماتحت صوبائی محکمے یا شعبے ہوتے تھے اور ان کے الگ الگ افسر مقرر کئے جاتے تھے۔

آخر میں ایک دو لفظ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مقام و منصب کے بارے میں کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو انکو غزوہ تبوک کے دوران حاصل تھے۔ واقدی کا بیان ہے کہ جب اسلامی فوج کے مختلف دستے کیمپ یا خیمہ گاہ میں اکٹھا ہو گئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو لشکر پر اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ (استخلف) اور وہاں وہ امام لشکر کی حیثیت سے مجاہدین کی نمازوں کی امامت بھی فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ سالار اعظم نے ان کو اپنا سب سے بڑا پرچم (لواء الاعظم) بھی فوج کے کوچ سے ذرا قبل عطا فرمایا تھا[۱۴] کیا اس بیان سے یہ مقصد ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو لشکر کے بڑے ہونے کے سبب اپنا نائب سالار اعظم مقرر فرمایا تھا؟ تمام قرائن اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔

افسران افواجِ اسلامی کی قبائلی نمائندگی

عہد نبوی کی فوجی تنظیم کے بیان میں عام طور سے اور افسران افواج رسالت کے بیان میں خاص طور سے ہم پہلے ہی متعدد افسروں کی قبائلی شناخت کو دیکھ چکے ہیں۔ یہاں ان افسروں کی قبائلی شناخت پر جو غزوات نبوی میں بازوؤں، ڈویژنوں، حرس وغیرہ کے افسر ہوتے تھے کچھ روشنی ڈالنے کے لئے ذیل میں ایک جدول دی جا رہی ہے۔ جو ان افسروں کی سالانہ تقرری بھی ظاہر کرتی ہے۔

نمبر شمار	سن	٦٢٤	٦٢٥	٦٢٦	٦٢٧	٦٢٨	٦٢٩	٦٣٠	-٣٢	٦٣١
١	قریش	-	-	-	-	-	-	-	-	-
(الف)	بنوہاشم	-	٢	-	١	-	-		-	-
(ب)	بنواسد	-	١	-	-	-	-	٢	٥	-
(ج)	بنوامیہ		-	-	-	١	-	-	-	-
(د)	بنوتیم	١-	-	-	-	-	-	-	-	١
(س)	بنوعدی	-	-	-	-	١	-	١	-	-
(ح)	بنوفہر	-	-	-	-	-	-	١	-	-
(ط)	بنومخزوم	-	-	-	-	-	-	٣	-	١
	میزان	١	٣	-	١	٢	-	٧	-	٢
(٢)	خزرج	١	١	-	١	١	٢	٢		-
(٣)	اوس	-	٤	-	٦	-	٢	١		-

(۴)	کلب	-	-	-	۱	-	-	-	-
(۵)	سلیم	-	-	-	۱	-	-	۲	-
(۶)	سعدہذیم	-	-	-	-	-	۱	-	-
(۷)	اشجع	-	-	-	-	-	-	۱	-
	میزان	۲	۸	-	۱۰	۳	۵	۱۳	۲

جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ قریش نے بطور ایک قبیلہ سب سے زیادہ تقرریاں یا عہدے حاصل کئے تھے تاہم اوس وخزرج نے مل کر اس سے کہیں زیادہ عہدے حاصل کئے تھے۔ صرف اوس کا تناسب نمائندگی مکی مہاجرین کے تناسب کے قریب تھا قریشی سالاروں یا امیروں میں تقریباً سب کے سب مشہور و معروف جنگجو اور ماہر فن حرب اشخاص تھے اور ان میں سے بعض نے ایک سے زیادہ مرتبہ عہدے حاصل کئے تھے۔ مثال کے طور پر حضرات زبیر بن عوام اسدی، خالد بن ولید مخزومی اور عمر بن خطاب عدیؓ نے اس شعبہ میں دوبارہ سرفرازی حاصل کی تھی۔ مآخذ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد حضرت خالد بن ولید مخزومی اسلامی فوج میں مقدمہ کے افسر مستقل طور سے ہو گئے تھے اور بعد میں عمرۃ القضاء، فتح مکہ، حنین، طائف اور تبوک وغیرہ تمام غزوات نبوی میں وہ اس کے افسر رہے تھے۔ اس لحاظ سے نہ صرف ان کا عہدہ مستقل تھا بلکہ وہ خود بھی مستقل فوجی سالار تھے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ حضرت خالد بن ولید مخزومی اسلام سے قبل مکی اشرافیہ کی فوج میں مقدمہ اور خیل ہی کے مستقل افسر تھے اور اسی حیثیت سے انہوں نے احد اور خندق میں کارنامے انجام دیئے تھے۔

انصاری افسروں میں حضرت محمد بن مسلمہ اوسی، عباد بن بشر اوسی، اسید بن حضیر اوسی، اور عبداللہ بن جبیر اوسی بہت نمایاں افسر تھے جبکہ حضرات زید بن ثابت، عبداللہ بن عتیک، اوس بن خولی اور سعد بن عبادہ خزرج کے اہم ترین افسر تھے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شب بیدار افسروں (الحرس) کا عہدہ تقریباً انہیں دونوں انصاری قبیلوں کی جاگیر بن گیا تھا۔ اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابت افسر عرض (معائنہ لشکر) مستقل طور سے بن گئے تھے۔ اس کے علاوہ تقسیم اموال غنائم کے بھی وہ مستقل افسر تھے باقی عرب قبائل میں سلیم کے علاوہ بقیہ دوسروں کی نمائندگی نام بھر کی ہے۔ اگرچہ یہ حتمی امر ہے کہ اس قسم کے تمام افسروں کا ذکر ہمارے مآخذ نے محفوظ نہیں رکھا ہے ظاہر ہے کہ تمام غزوات نبوی میں اس قسم کے فوجی انتظامات کئے گئے تھے اور ان کے متعدد افسر بھی تھے۔ لیکن ان کا ذکر محفوظ نہیں رہا ورنہ اس شعبہ کے تمام افسروں کا شمار موجودہ اعداد سے کہیں زیادہ ہوتا۔

جہاں تک ان افسروں کی علاقائی نمائندگی کا تعلق ہے تو مرکزی عرب کے قبیلوں کا تقریباً مکمل قبضہ ان مناصب پر رہا تھا۔ دوسرے علاقوں کو کوئی خاص نمائندگی حاصل نہیں تھی بلکہ بعض علاقوں کی نمائندگی نام بھر کی تھی۔ اس کا اولین سبب تو یہی تھا کہ اسلامی فوج کوئی مستقل فوجی ادارہ نہیں تھی اور کچھ سبب یہ بھی تھا کہ بہت کم مہمیں بڑی تھیں جن میں مستقل دستوں اور ان کے افسروں کی ضرورت پڑتی اور یہ بھی ایک سبب تھا کہ باقاعدہ جم کر لڑی جانے والی مہموں کی تعداد بہت کم تھی۔

ذیل کی جدول سے معاملہ بالکل واضح ہو جائے گا۔

علاقہ	نمبر شمار	قبیلہ	تقرریاں	سالار
مرکزی عرب	۱۔	قریش	۱۶	۱۰
	۲۔	خزرج	۸	۶
	۳۔	اوس	۱۳	۸
شمالی عرب	۱۔	کلب	۱	۱
	۲۔	سعد ہذیم	۱	۱
مشرقی عرب	۱۔	سلیم	۳	۳
جنوبی عرب	۱۔	اشعر	۱	۱
میزان		۷ قبیلے	۴۳	۳۰

اگر ہم ان افسروں کے زمانہ قبولِ اسلام کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان کی اکثریت بعد کے مکی اور مدنی زمانے کی مسلمان تھی اس سلسلہ میں یہ نکتہ زیادہ واضح ہوتا ہے کہ جونہی کوئی قابل قدر شخص اور موزوں افسر مسلمان ہوتا تھا اسے بلا کسی پس و پیش کے عہدہ دیدیا جاتا تھا۔ یہ حضرت خالد بن ولید مخزومی، حضرت وردبن خالد سلمیؓ اور حضرت عبد اللہ بن ربیعہ مخزومی کے معاملے میں بالکل واضح نظر آتا ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لائے تھے۔ مگر فوراً اپنے ان اعلیٰ مناصب پر فائز کردیئے گئے تھے۔

علمبردار (اصحاب الالویۃ والرایات)[۱۴۳]

عرب کی فوجی روایات میں مہم کے دوران یا میدان جنگ میں پرچم یا علم کا محافظ ہونا بڑی عزت کی بات تھی[۱۴۴] اور عام طور سے کسی ایک قبیلہ کے ایک خاص خاندان کو یہ اعزاز حاصل ہوتا تھا ایک مشہور مستشرق ریون لیوی (RUBEN LEVY) کا بیان صحیح ہے کہ "مسلم فن جنگ میں پرچم کی ایک ادرا ہمیت تھی"، ہر قبیلہ کا اپنا پرچم ہوتا تھا جو جنگ کے میدان میں اس کا نقطہ اجتماع اور نشان وقار ہوتا تھا۔ کیونکہ اسی کے قریب سالار موجود ہوتا تھا[۱۴۵] اس کے علاوہ پرچم قبائلی یا قومی آن و عزت کا نشان بھی ہے۔ مکی اشرافیہ میں علمبرداری کا اعزاز قریش کے خاندان بنو عبد الدار کو زمانہ قدیم یعنی قصی بانی شہر مکہ کے زمانے سے موروثی طور سے حاصل تھا اور زمانہ جاہلیت یا عہد نبوی میں جتنی بھی قریش نے جنگیں لڑی تھیں۔ ان سب میں اسی کو قومی پرچم اٹھانے کا افتخار ملا تھا[۱۴۶] اسلامی ریاست نے بھی اسی عرب روایت قدیم کو اپنایا تھا اور پہلی مہم میں یہ اعزاز سالار سریہ حضرت حمزہ بن عبد المطلب ہاشمی کو ملا تھا[۱۴۷] چنانچہ عربی میں لواء باندھنا (عقد لواءً لہ) کا مفہوم ہی مہم بھیجنا ہو گیا تھا۔ بہر حال سرایا میں یہ اعزاز ہمیشہ سالاران سرایا کو حاصل رہا تھا۔ لیکن غزوات نبوی میں اس کا ایک مخصوص افسر ہوتا تھا۔ جب کبھی اسلامی افواج میں مختلف قبائلی دستے ہوتے تھے تو ان میں سے ہر ایک کا ایک یا کئی پرچم ہوتے تھے اور لستے ہی اس کے افسر۔ ظاہر ہے کہ اس بنا پر عسکری تنظیم کے اس شعبہ میں بھی قبائلی کردار باقی رہا تھا۔ بہر حال ان قبائلی پرچموں کے علاوہ اسلامی ریاست کی نمائندگی کرنے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ایک مخصوص علم (رایۃ یا لواء) ہوتا تھا جسے آپ اپنے کسی عظیم صحابی کے

سپرد کرتے تھے[۴۶]۔ جیسے کہ بدر اور احد کی جنگوں میں آپ نے یہ خدمت عظیم حضرت مصعب بن عمیر عبدری کے سپرد کی تھی اور اس میں ان کے قبیلہ رخاندان کی رعائت بھی منظور تھی۔ بہر حال ذیل میں ایک جدول دی جارہی ہے جس سے تمام مذکور علمبرداران نبوی کے بارے میں تفصیلات معلوم ہو جائیں گی۔

نمبر شمار	سنہ	۶۲۳	۶۲۴	۶۲۵	۶۲۶	۶۲۷	۶۲۸	۶۲۹	۶۳۰	۶۳۱	۶۳۲	تقرریاں	علمبردار
(۱)-	مہاجرین												
(الف)	قریش	۵	۳	۴	۱	۲	۴	-	۶	۲	-	۲۷	۸
(ب)	قیس عیلان	۱	-	-	-	-	-	-	-	-	-	۱	۱
(ج)	قضاعہ	۱	-	-	-	۱	-	-	-	-	-	۲	۱
(د)	کلب	-	-	-	-	۱	-	-	-	-	-	۱	۱
(۲)	خزرج	-	۱	۱	-	۲	۴	-	۱۱	۷	-	۲۶	۱۵
(۳)	اوس	-	۱	۱	-	-	-	-	۷	۱	-	۱۰	۸
(۴)	سلیم	-	-	-	-	-	-	-	۳	-	-	۳	۳
(۵)	غطفان	-	-	-	-	-	-	-	۱	-	-	۱	۱
(۶)	مزینہ	-	-	-	-	-	-	-	۴	-	-	۴	۴
(۷)	جہینہ	-	-	-	-	-	-	-	۴	-	-	۴	۴
(۸)	خزاعہ	-	-	-	-	-	-	-	۳	-	-	۳	۳
۹	اسلم	-	-	-	-	-	-	-	۲	۱	۱	۴	۳
	میزان سالانہ	۷	۵	۶	۱	۶	۸	-	۴۱	۱۱	۱	۸۶	۵۲

یہاں اس اعتراف کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ فہرست بہت ہی نامکمل ہے۔ کیونکہ متعدد اہم غزوات نبوی جیسے تبوک وغیرہ کے علمبرداروں کے نام نہیں معلوم ہو سکے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ اس شعبہ کے فوجی افسروں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہو گی لیکن بہر حال موجودہ فہرست سے بھی اس کے افسروں کا کچھ اندازہ ہوتا ہی ہے۔ چنانچہ قریش اور انصار نے سب سے زیادہ عہدے حاصل کئے تھے۔ اس کے دو سبب تھے: اول یہ کہ وہ دس سالہ مدنی دور میں برابر تمام مہمات میں شریک رہے تھے اور دوم یہ کہ ان کی تعداد خاص کر انصار کی تعداد مجاہدین دوسروں کے مقابلے میں زیادہ رہی تھی۔ اگرچہ قریش کی تقرریاں سب سے زیادہ نظر آتی ہیں لیکن ان کے علمبرداروں کی تعداد اس تناسب سے نہیں ہے۔ اس اعتبار سے وہ خزرج کے کافی پیچھے ہیں۔ کیونکہ مؤخر الذکر کے افسروں کی تعداد ان کی تقریباً دو گنا ہے۔ اسی طرح انصار کے دوسرے طبقہ کی تقرریاں کم ہیں۔ لیکن ان کے افسروں کی تعداد قریش کے برابر ہے۔ اس سے بالواسطہ طور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فوج بنیادی طور سے ان تین مسلم طبقات پر مشتمل ہوتی تھی جہاں تک دوسرے قبائل عرب

کا تعلق ہے انہوں نے جہاد میں شرکت اور اس کے نتیجہ میں علمبرداری کے عہدے صرف ان مہموں میں حاصل کیے۔ جو بعد میں ہوئیں۔ اور ان کا واضح بیان فتح مکہ کے ضمن میں ملتا ہے۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ علموں یا پرچموں کی تعداد کسی قبیلہ/خاندان کو اس کے سپاہیوں کی تعداد کے تناسب سے دی ہوتی تھی۔ اس کا اظہار ایک جدول کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے جو ذیل میں ہے۔

نمبر شمار	قبیلہ/خاندان	سپاہ کی تعداد	علمبرداروں کی تعداد
(۱)	خزرج		
	بنو ساعدہ		
	بنو سلمٰی		
	بنو نجار		
	بنو حارث		
	بنو نجار		
(۲)	اوس		
	بنو واقف		
	بنو عبد اللہ اشہل		
	بنو معاویہ		
	بنو ظفر		
	بنو خطمہ		
(۳)	خزرج		
	بنو ساعدہ		
	بنو ظفر		
	بنو حارثہ		
میزان	۱۳ خاندان	۴۰۰۸ سپاہ / ۵۰۰ گھوڑے	۱۲
(۴)	قریش	۷۰۰ سپاہ / ۵۰۰ گھوڑے	۳
(۵)	مزینہ	۱۰۰۰ " / ۱۰۰ "	۳
(۶)	جہینہ	۸۰۰ " / ۵۰ "	۴
(۷)	اسلم	۴۰۰ " / ۳۰۰ "	۲

(۸) خزاعہ رکعب ۵۰۰ سپاہ / گھوڑے ۳

(۹) اشجع

چونکہ سپاہیوں کی تعداد اور علمبرداروں کی تعداد کا تناسب واضح طور سے مذکور نہیں ملتا ہے۔ اس لئے اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دو سو اور تین سو سپاہ پر ایک علم مل جاتا تھا۔ جیسا کہ اوپر کی جدول سے معلوم ہوتا ہے۔

عسکری تنظیم کے اس شعبہ میں نمایاں ترین افسروں میں شامل تھے حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی، جن کو کم از کم دس مواقع پر یہ سعادتؓ افتخار حاصل ہوا۔ حمزہ بن عبد المطلب ہاشمی، سعد بن ابی وقاص زہری، زبیر بن عوام اسدی، معصب بن عمیر عبدری، ابوبکر تیمی اور عمر بن خطاب عدوی یہ قریشی علمبردار تھے۔ خزرج میں حضرات سعد بن عبادہ، حباب بن منذر، زید بن ثابت، عمارہ بن حزم نمایاں تھے۔ جبکہ سعد بن معاذ اور اُسَید بن حُضَیر اوس کے عظیم نمائندے تھے۔ بدوی قبائل میں اسلم کے حضرت بُرَیدہ بن حُصَیب بہت اہم شخص تھے۔ بقیہ دوسرے عرب قبائل کے علمبردار دراصل ان کے قبیلوں کے سردار اور سربرآوردہ اشخاص تھے اور اسی حیثیت سے ان کو یہ اعزاز عطا ہوتا تھا۔ جہاں تک علاقائی نمائندگی کا سوال ہے تو زیادہ تر عہدے مرکزی عرب کے قبیلوں کو ملے تھے۔ ان کے بعد مغربی قبیلوں کا نمبر تھا جبکہ بقیہ کو کوئی خاص نمائندگی حاصل نہیں تھی صورتحال ذیل کی جدول سے واضح ہو جائے گی۔

علاقہ	قبیلہ	تعزریاں	علمبردار
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۲۷	۸
	۲۔ خزرج	۲۶	۱۵
	۳۔ اوس	۱۰	۸
شمالی عرب	۱۔ کلب	۱	۱
	۲۔ قضاعہ	۲	۱
مشرقی عرب	۱۔ سلیم	۳	۳
	۲۔ غطفان	۱	۱
	۳۔ قیس عیلان	۱	۱
مغربی عرب	۱۔ مزینہ	۴	۴
	۲۔ جہینہ	۴	۴
	۳۔ اسلم	۴	۳
	۴۔ خزاعہ	۳	۳
جنوبی عرب	-	-	-
میزان	-	۸۶	۵۲

طلیعہ (گشتی دستے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عسکری تنظیم میں طلیعہ (گشتی دستے) کے شعبہ کو ضروری اہمیت دی گئی تھی کیونکہ وہ فوج کے لئے بعض اہم کام انجام دیتا تھا۔ اس بحث میں ہم نے بعض ایسے کارکنوں کو بھی شامل کر لیا ہے جو اگرچہ اصطلاحاً طلیعہ نہیں کہے گئے ہیں مگر ان کا کام طلیعہ جیسا تھا اور وہ بھی فوجی نظام کا ایک اٹوٹ حصہ تھے۔ طلیعہ کا کام دشمنوں کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنا ان کے سپاہیوں کو پکڑ لانا، خیمہ گاہ کے لئے مناسب جگہ تلاش کرنا، پانی اور چارہ وغیرہ کی جگہوں کا پتہ لگانا وغیرہ تھا۔ چونکہ طلیعہ اور جاسوس (عیون) کے کام میں بہت نازک سا فرق ہے۔ غالباً اسی سبب سے ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے طلیعہ کے کام کو بھی فوجی جاسوسی کے شعبہ کا ایک حصہ سمجھ لیا ہے[۱۴۹]۔ بہر حال جاسوسوں اور طلائع (طلیعہ کی جمع) کے کام اور نوعیت میں خاصا فرق تھا۔ طلیعہ عموماً ایک چھوٹی سی جماعت ہوتی تھی جو دو تین نفر سے لیکر بیس نفر تک پر مشتمل ہو سکتی تھی جبکہ جاسوس عموماً ایک یا دو کر کے بھیجے جاتے تھے۔ طلیعہ علانیہ کام کرتی تھی جبکہ جاسوسوں کا کام خفیہ تھا۔ پھر طلیعہ فوج کا ایک حصہ ہوتی تھی جو ضرورت کے مطابق آگے یا ادھر ادھر بھیجی جاتی تھی جبکہ جاسوسوں کا فوج کا حصہ ہونا ضروری نہیں تھا۔

بہر حال طلیعہ کی پہلی مثال ہم کو جنگ بدر کے ضمن میں ملتی ہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار نفر حضرت زبیر بن عوام، علی بن ابی طالب، بسبس بن عمرو اور سعد بن ابی وقاص پر مشتمل ایک جماعت جنگ بدر سے ذرا پہلے دشمنوں کے بارے میں پتہ لگانے کے لئے بھیجی تھی[۱۵۰]۔ اگرچہ ماخذ اس جماعت کے لئے لفظ طلیعہ کا استعمال نہیں کرتے۔ تاہم وہ اپنے کام کی نوعیت کے سبب طلیعہ ہی معلوم ہوتی ہے[۱۵۱]۔ طبری کا بیان ہے کہ آپ نے ایک جماعت (عُصبَہ) حضرت زبیر بن عوام کے ساتھ یا کمان میں بھیجی تھی[۱۵۲]۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایک طلیعہ ایک افسر کی ماتحتی میں روانہ کی گئی تھی۔ بہر حال یہ جماعت بدر کے کنوؤں تک پہونچی جہاں اس نے مکی فوج کے پانی پلانے والے بہشتیوں (سَقَّاء)[۱۵۳] کو پکڑنے میں کامیابی حاصل کی جن سے پہلی بار یہ راز کھلا کہ مکی فوج بدر کے نواح میں پہنچ چکی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ مسلم طلیعہ اور دوسرے مسلم فوجی بھی اس جماعت سقاء کو ابو سفیان بن حرب اموی کی قیادت میں شام سے لوٹنے والے کارواں سے متعلق سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ بیچارے بار بار اعتراف کر چکے تھے کہ ان کا تعلق مکی فوج سے ہے۔ بہر حال جب یہ معاملہ صاف ہو گیا تو اس خبر نے مسلم فوج کو بدر پہنچ کر جنگی اعتبار سے اہم ترین مقامات پر قبضہ کرنے میں مدد دی تھی اور دشمن کو اپنی پسند کے میدان جنگ میں خیمہ زن ہونے اور لڑنے پر مجبور کیا تھا[۱۵۴]۔

اسد الغابہ کا بیان ہے کہ قبیلہ اسلم کے دو شخص حضرات مالک بن خلف اور ان کے بھائی لنعمان بن خلف اس طلیعہ کے رکن تھے جس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ احد سے کچھ قبل اطلاعات فراہم کرنے کے لئے بھیجا تھا اور وہ دونوں اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے شہید ہو گئے تھے[۱۵۵]۔ اس کے بعد حمراء الاسد کی مہم میں اسلم ہی کے تین آدمیوں پر مشتمل ایک طلیعہ مکی فوج کے منصوبوں کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس مہم میں بھی طلیعہ کے جاں نثاروں نے شہادت پائی تھی[۱۵۶]۔ ربیع الاول ۴ھ / جولائی ۶۲۵ء میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو لحیان کے خلاف ایک مہم کی قیادت کی تھی تو آپ نے حضرت ابو بکر کو ایک

جماعت کے ساتھ بھیجا تھا تاکہ وہ الغمر نامی مقام تک جاکر دشمن کے ارادوں کا پتہ لگائیں [۱۵۷]۔ واقدی اور ابن سعد کے مطابق حدیبیہ کی مہم کے دوران مسلم طلیعہ بیس شہسواروں پر مشتمل تھا اور حضرت عباد بن بشر اوسی کے زیر کمان بھیجا گیا تھا [۱۵۸]۔ انہیں حضرت عباد بن بشر کے زیر کمان خیبر کی مہم کے دوران بھی ایک مسلم طلیعہ روانہ کیا گیا تھا جو شہسواروں پر مشتمل تھا۔ انہوں نے یہود خیبر کے ایک جاسوس کو جو قبیلہ اشجع سے تعلق رکھتا تھا پکڑ لیا تھا اور اس نے نہ صرف تمام ضروری معلومات مسلمانوں کو بتا دی تھیں۔ بلکہ خود بھی مسلمان ہو گیا تھا [۱۵۹]۔ اس مہم کے دوران حضرت محمد بن مسلمہ اوسی کے سپرد یہ فریضہ کیا گیا تھا کہ وہ مسلم فوج کے خیمہ زن ہونے کے لئے کوئی عمدہ جگہ تلاش کریں جو انہوں نے کر لی تھی۔ مشہور واقعہ ہے کہ فتح مکہ کے لئے روانہ ہونے سے ذرا پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات علی بن ابی طالب اور زبیر بن عوام کو ایک عورت سے ایک خط وصول کرنے کے لئے بھیجا جسے ایک نیک اور متقی مسلم حضرت حاطب بن ابی بلتعہ لخمی نے اپنی سادہ لوحی میں مکہ والوں کے نام لکھا تھا اور مکہ پر مسلمانوں کے حملہ کی خبر کر دی تھی [۱۶۱]۔ تبوک کے غزوہ کے دوران حضرت اسید بن حضیر اوسی کو ایک چشمہ آب کا پتہ لگانے کی خدمت سپرد کی گئی تھی [۱۶۲]۔ اس طرح یہ واضح ہوتا ہے کہ طلیعہ گوناگوں قسم کے کام انجام دیتا تھا جو نہ صرف مسلم فوج کے لئے ضروری تھے بلکہ ان کے سبب اکثر و بیشتر مسلم فوج کو دشمنوں کے مقابلے میں زیادہ فوجی فوائد حاصل ہوتے تھے اور اس طرح طلیعہ مسلم کامیابیوں کی ایک کلید بن جاتا تھا۔

دوسری قسم کا فوجی کارکنوں میں وہ منادی اور خبر نگار شامل ہوتے تھے جو مسلم فتح کی خبر مدینہ پہنچاتے تھے۔ یا دور دراز کی مہموں کے زمانے میں مسلم آبادی کو تسکین خاطر فراہم کرنے کے لئے ان کی خیر و عافیت کی خبریں لیکر آتے تھے۔ محمد بن حبیب بغدادی نے ایسے خوشخبری دینے والوں کو البشراء الرسول کی سرخی کے تحت بیان کیا ہے اور اپنی کتاب کا ایک باب ان کے لئے مخصوص کیا ہے [۱۶۳]۔ مثال کے طور پر غزوہ بدر کی فتح کی خبر مدینہ والوں کو پہونچانے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ اور عبداللہ بن رواحہ کو بھیجا تھا [۱۶۴]۔ اسی طرح جعال بن سراقہ ضمری کو ذات الرقاع کی مہم کے دوران اپنی اور مسلم فوج کی خیر و عافیت سے مطلع کرنے کے لئے مدینہ روانہ کیا تھا [۱۶۵]۔ ایک اور البشیر یا خوشخبری دینے والے حضرت سلمہ بن اسلم اشہلی تھے، جنہوں نے صلح حدیبیہ کے کامیاب معاہدے کی خبر مدینہ والوں کو پہنچائی تھی [۱۶۶]۔ جبکہ حضرت نہیک بن اوس خزرجی نے فتح حنین کی خوشخبری اہل مدینہ کو سنائی تھی [۱۶۷]۔

کچھ مختلف النوع کاموں کو جو فوجی مہمات کے دوران لازمی طور سے انجام دینے ہوتے ہیں کرنے کے لئے مختلف و متفرق لوگوں / کارکنوں کو متقرر کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر حضرات ابو لیلیٰ خزرجی اور عبداللہ بن سلام کو ایک غزوہ کے دوران کھجور کی ایک خاص قسم کے درختوں کو جن کو قرآن کریم میں لینہ کہا گیا ہے۔ کاٹنے کا حکم دیا گیا تھا تاکہ محصور دشمن کو ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کیا جائے۔ اسی قسم کے بہت سے کاموں کے لئے مختلف لوگوں کو متقرر کیا جاتا تھا۔

آخر میں یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب ہوگا کہ طلیعہ کو مہموں کے دوران دشمنوں کی خبر لینے کے لئے روانہ کیا جاتا تھا اور ان کی کامیاب کارگذاری سے مسلم فوج کو بے انتہا قیمتی فوائد حاصل ہوتے تھے جو بالآخر کامیابی کی راہ کھولتے تھے اس شعبہ عسکری کے افسروں اور کارکنوں میں جن کا نام ماخذ میں ملتا ہے۔ متعدد قبیلوں اور علاقوں کے لوگ شامل تھے جن کو ذیل کی جدول میں اجاگر کیا گیا ہے

علاقہ	قبیلہ	تقرریاں	افسر
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۵	۳
	۲۔ خزرج	۴	۴
	۳۔ اوس	۶	۴
	۴۔ قینقاع	۱	۱
شمالی عرب	۱۔ کلب	۱	۱
مغربی عرب	۱۔ جہینہ	۱	۱
	۲۔ اسلم	۵	۵
	۳۔ ضمرہ رکنانہ	۱	۱
جنوبی عرب	۱۔ ازد	۱	۱
قبائل پراگندہ	۱۔ تمیم	۱	۱
میزان	۱۰ قبیلے	۲۶	۲۲

مذکورہ بالا جدول کے مطابق زیادہ تر تقرریاں مرکزی عرب کے قبیلوں کو ملی تھیں اور ان کا مجموعی تناسب ۶۵ فیصد تھا۔ لیکن واضح رہے کہ یہ طلیعہ کے تمام افسروں کی جدول نہیں ہے۔ متعدد بلکہ بہت سے ایسے ہوں گے جن کا ذکر نہیں آسکا۔ بہر حال اس شعبہ کے اہم ترین اشخاص میں حضرات زبیر بن عوام اسدی، علی ابن ابی طالب ہاشمی، عباد بن بشر اوسی، اسید بن حضیر اوسی اور عبداللہ بن سلام قینقاعی تھے۔ ۱۰۱۔ جہاں تک ان کے زمانہ قبول اسلام کا تعلق ہے تو ان میں سے چند ابتدائی مسلمان تھے۔ بقیہ بعد کے زمانے کے۔

جاسوس (عیون)

موجودہ زمانے میں بھی قرون وسطیٰ کی مانند جنگی چالوں کی کامیابی جاسوسوں کی خبر گیری پر کافی منحصر ہوتی تھی چنانچہ آج کل بھی ہر ملک میں فوجی جاسوسی کا شعبہ الگ اور منظم و فعال ہوتا ہے۔ اسی طرح عہد اوسطیٰ میں بھی جاسوسوں کا کام بہت ضروری سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ ان ہی کے ذریعہ دشمنوں کی عددی طاقت، ہتھیاروں کی تعداد، جنگی منصوبوں، راستوں کے انتخاب وغیرہ بہت سے اہم معاملات کی خبر حاصل کی جاسکتی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فوجی تنظیم کے اس شعبہ کی بھی باقاعدہ ترتیب و تنظیم کی تھی اور اپنے دہ سالہ دور میں جاسوسوں سے بڑے اہم کام لئے تھے۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی تمام مہموں کے دوران ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا تھا[۱]۔ فوجی جاسوسی کی پہلی دستاویزی مثال کا تعلق غزوہ بدر سے ہے کہ جب آپ نے حضرات طلحہ بن عبید اللہ تیمی اور سعید بن زید عدوی کو بدر کی جنگ سے کچھ پہلے شام سے لوٹنے والے قریشی کارواں کی خبر حاصل کرنے کے لئے بھیجا تھا[۲]۔ اس مہم کے دوران جب قریشی کارواں

کے نکل جانے کے بعد مسلمانوں کا سابقہ قریشی فوج سے پڑا تھا تو آپ نے بدر پہنچ کر دو اور جاسوسوں حضرات بسبس بن عمرو اور عدی بن ابی الزغباء کو بدر کے کنوؤں کی طرف خبریں حاصل کرنے کے لئے بھیجا تھا جب مسلم طلیعہ کے ذریعہ قریشی سقوں کے پکڑے جانے سے قریشی فوج کی بدر کے نواح میں موجودگی یقینی ہو گئی تھی تو آپ نے دو ابتدائی مسلمانوں حضرات عمار بن یاسر اور عبداللہ بن مسعود کو قریشی سقوں کی خبر کی تصدیق کرنے کی غرض سے روانہ کیا تھا"[174] غزوہ احد کے دوران دو خزرجی حقیقی بھائی حضرات انس اور مونس فرزندان فضالہ خزرجی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جاسوس بنا کر بھیجا تھا کہ وہ دشمن کی خبریں لائیں چنانچہ وہ دونوں وادی عقیق تک سفر کر کے پہنچے اور جونہی ان کو موقعہ ملا وہ قریشی سپاہیوں میں اس طرح مل گئے کہ ان کو کوئی پہچان بھی نہ سکا۔ قریشی فوج کے ساتھ انہوں نے الولاء کے مقام تک سفر کیا اور پھر موقع پاتے ہی نکل کر سیدھے بارگاہ نبوی میں ضروری اطلاعات کے ساتھ پہنچے اور آپ کو آگاہ کیا اس وقت تک قریشی لشکر احد نہیں پہنچا تھا"[175] اس کے وہاں خیمہ زن ہونے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک عظیم ماہر امور حرب اور عالم فنون جنگ صحابی حضرت حباب بن منذر خزرجی کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ وہ دشمن کی طاقت اور ارادوں کا پتہ لگائیں۔ ان کو یہ بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ تخلیہ میں اپنی اطلاعات عرض کریں اور مسلمانوں کے سامنے نہ بیان کرنا شروع کر دیں جس سے ان کے حوصلے پست ہو جائیں۔ بہر حال انہوں نے ارشاد نبوی کے مطابق مکمل اور بالکل صحیح اطلاعات فراہم کی تھیں[176] جنگ کے بعد جب دشمن پسپا ہو کر حمراء الاسد کی طرف روانہ ہونے والا تھا تو حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کو ان کے اگلے منصوبوں کے بارے میں پتہ لگانے کا حکم دیا گیا تھا۔ جس کی انہوں نے پر جوش تعمیل کی تھی[177]

اُسد الغابہ کا بیان ہے کہ واقع رجیع کے بعد حضرت امیہ بن خویلد ضمری کو قریش کے منصوبوں کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنے کی غرض سے جاسوس بنا کر بھیجا گیا تھا"[178] اس مقصد سے ان کے بعد ان کے فرزند حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو بھیجا گیا تھا۔[179] جب مدینہ منورہ میں بنو مصطلق کے مریسیع کے مقام پر جمع ہونے کی خبر پہنچی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی کو تحقیق حال کیلئے بھیجا۔ انہوں نے جائے فتنہ وفساد پر پہنچ کر خبروں کی تصدیق کی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحیح صورتحال سے باخبر کر دیا[180] جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو غزوہ بنی مصطلق میں فتح حاصل ہوئی۔ لیکن سب سے زیادہ دلچسپ واقعہ مسلم جاسوسوں کے اس کارنامے سے متعلق ہے جو انہوں نے خندق کے غزوہ کے زمانے میں انجام دیا تھا۔ اس زمانہ میں جبکہ محاصرہ کافی طول پکڑ چکا تھا اور مسلمانوں کو احزاب کے صحیح ارادوں کی خبر نہ تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خوات بن جبیر کو ان کے منصوبوں کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنے کو کہا اور انہوں نے اپنا فریضہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔[181] اس سے کچھ پہلے حضرت زبیر بن عوام نے بنی قریظہ کے احزاب میں شامل ہونے کی خبر کی تصدیق کر دی تھی[182] محاصرہ کے آخری دنوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ بن یمان کو قریشی خیمہ گاہ میں خبریں فراہم کرنے کی غرض سے بھیجا۔ وہ قریشی فوج میں مل گئے اور ایک جماعت کے ساتھ جا بیٹھے جو الاؤ کے گرد بیٹھی تھی کسی نے ان کو نہیں پہچانا۔ ابھی وہ بیٹھے ہی تھے کہ قریش کے سالار اعلیٰ ابو سفیان بن حرب اموی آ گئے اور انہوں نے اپنے سپاہیوں کو دشمن کے جاسوسوں سے خبردار رہنے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ ہر شخص اپنے ساتھی کے بارے میں واقفیت حاصل کرے یہ بڑا خطرناک موقعہ تھا لیکن مسلم جاسوس بھی ہوشیار بہت تھا۔ قبل اس کے کہ کوئی ان سے سوال پوچھتا انہوں نے خود ہی اپنے داہنے اور بائیں بیٹھے ہوئے

ساتھیوں کے نام و پتے پوچھنا شروع کر دیے اس طرح ان کے شبہات کا ازالہ کر دیا۔ آخر وہ دشمن کے پسپائی کے ارادے اور منصوبے سے آگاہ ہو گئے اور انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے باخبر کر دیا۔[۱۸۳] اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقعہ پر حضرت بُسر بن سفیان خزاعی مکہ سے خبر لائے تھے کہ قریش مسلمانوں کے شہر میں داخلہ کی سخت مزاحمت کریں گے۔[۱۸۴] غزوہ حنین کے دوران حضرت عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی نے جاسوسی کا کام انجام دیا تھا اور دشمن کے بارے میں ساری ضروری اطلاعات اکٹھا کی تھیں۔[۱۸۵]

مذکورہ بالا جاسوسوں کے علاوہ متعدد ایسے جاسوس تھے جن کی خدمات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مہموں کے دوران حاصل کی تھیں۔ مگر ان کے نام مآخذ میں محفوظ نہیں رہ سکے۔ بہر حال انہوں نے مسلم افواج کی کامیابی میں خاصا اہم حصہ لیا تھا اور شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ چونکہ جاسوسی کا کام بڑا اہم اور خطرناک تھا اس لیے عموماً کم معروف یا غیر معروف لوگوں کے ذریعہ لیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ دشمن کی فوجوں میں جا گھستے تھے تو کوئی ان کو پہچان نہیں سکتا تھا۔ جیسا کہ حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی اور ان سے بھی بڑھ کر حضرت حذیفہ بن یمان کے واقعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ ذیل میں ان مسلم جاسوسوں کی ایک جدول دی جا رہی ہے جن کے نام مآخذ میں مذکور ہوئے ہیں۔ اس جدول میں ان کی سالانہ تقرری اور علاقائی تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔

علاقہ	قبیلہ	تقرریاں باعتبار سنہ	۶۲۴	۶۲۵	۶۲۶	۶۲۷	۶۲۸	۶۳۰	جاسوس
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۲	-	۱	-	۱	-	-	۲
	۲۔ خزرج	۳	-	۲	-	-	-	-	۳
مشرقی عرب	۱۔ ہذیل	۱	۱	-	-	-	-	-	۱
	۲۔ قیس عیلان	۱		-	-	-	-	۱	۱
	۳۔ غطفان	۱	-	-	-	۱	-	-	۱
مغربی عرب	۱۔ جہینہ	۲	۲	-	-	-	-	-	۲
	۲۔ ضمرہ	۳	-	-	۲	-	-	۱	۲
	۳۔ خزاعہ	۱	-	-	-	-	۱	-	۱
	۴۔ اسلم	۲	-	-	-	۱	-	۱	۲
جنوبی عرب	۱۔ مذحج	۱	۱	-	-	-	-	-	۱
میزان	۱۰ قبیلے	۱۷	۴	۴	۲	۳	۱	۳	۱۶

جیسا کہ جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ تقرریاں اس شعبہ میں مغربی قبیلوں نے حاصل کی تھیں۔ اسکی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ مخالفین میں کم معروف تھے یا بالکل اجنبی تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ ان تمام مہموں کے متعلقہ علاقوں سے بخوبی واقف تھے اور ظاہر ہے کہ جاسوسی کے لیے یہ دونوں چیزیں بڑی اہم اور سود مند تھیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ممتاز ترین جاسوسوں

میں حضرات عمرو بن امیہ ضمری، بسبس بن عمرو جہنی، بریدہ بن خصیب اسلمی اور حذیفہ بن یمان مذحجی بہت اہم تھے۔ ان سب نے عظیم ترین خدمات اور شاندار ترین کارنامے انجام دیکر مسلم مہموں کی کامیابی کی راہیں کھولیں۔ جہاں تک ان کے قبول اسلام کے زمانے کا تعلق ہے تو مذکورہ سولہ جاسوسوں میں سے پانچ ابتدائی مسلمان تھے جبکہ پانچ اور آخری مکی عہد کے یا ابتدائی مدنی دور کے مسلمان تھے اور بقیہ چھ حضرات نے صلح حدیبیہ سے قبل اسلام قبول کیا تھا۔ گویا کہ ان کی اکثریت کو ہم سابقین اولین میں نہیں شمار کر سکتے۔

راہبر (دلیل)

جزیرہ نمائے عرب میں بالعموم اور اس کے صحراؤں میں بالخصوص جہاں کوئی راستہ یا پگڈنڈی تک نہیں ہوتی کارواں والوں مسافروں اور فوجوں کے گم ہو جانے کا انتہائی شدید خطرہ رہتا ہے اور وہ اپنی اس گمشدگی کے دوران قعر ہلاکت میں بھی گر سکتی تھیں اس لیے تمام کارواں والوں، مسافروں اور فوجوں کے لیئے ضروری تھا کہ وہ ماہر راہبروں (دلیل خریت) کی رہنمائی حاصل کریں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ قرون وسطیٰ میں کوئی بھی شخص راہبر کے بغیر سفر کرنے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ کارواں والوں اور مسافروں کو تو صرف حفاظت و سلامتی کی فکر ہوتی ہے مگر فوجوں کے لیے وقت کا مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ اگر وہ بروقت جائے واردات پر نہ پہنچیں تو شدید نقصانات کا احتمال رہتا ہے۔ اس کے علاوہ کافی حد تک ان کی تیز رفتاری کی ضمانت بھی راہبر ہی فراہم کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ مختصر راستوں سے واقف ہوتا ہے۔ واقدی کا بیان ہے کہ تمام عرب لوگوں کے لئے راہبروں کی خدمات ازبس ناگزیر تھیں۔ کیونکہ وہ پیشہ ور ہونے کیساتھ ساتھ راستوں (سنن) اور مختصر راستوں (تنکیب) سے واقف ہوتے تھے۔ فوجوں کے لئے یہ اور بھی ناگزیر تھے۔ کیونکہ اس طرح وہ دشمنوں کے سر پر جا پہنچتے تھے اور ان کو خبر بھی نہ ہوتی تھی[186] عام طور پر ان راہبروں (دلیلوں) کا تعلق بدوی عرب قبائل سے ہوتا تھا اور اجرت پر کوئی بھی فریق ان کی خدمات حاصل کر سکتا تھا[187]

سیرت نبوی کے ضمن میں چاہے اس کا تعلق سماجی، مذہبی اور معاشرتی زندگی ہو یا سیاسی اقتصادی اور فوجی پہلوؤں سے ہو ہم کو قدم قدم پر راہبروں کے حوالے ملتے ہیں وہ نہ صرف حاجیوں کے کارواں والوں اور زائرین کے قافلوں کی راہنمائی کرتے تھے بلکہ مسافروں کو راہ دکھاتے تھے اور لوگوں کو ان کی منزلوں پر پہنچاتے تھے وہ سیاسی جماعتوں اور فوجی اور تجارتی کارواں والوں کی بھی راہنمائی کرتے تھے۔ اس لئے یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ تمام مہمات نبوی کے دوران راہبروں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں چاہے ان کا بر ملا ذکر ملے یا نہ ملے۔ بہر حال یہ مشہور واقعہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہجرت کا مشہور سفر عبداللہ بن اریقط دئلی کی رہنمائی میں[188] عرج کے مقام تک طے کیا تھا اور وہاں سے مدینہ تک حضرت سعد العرجی کی راہ نمائی میں[189]

جہاں تک مہمات نبوی کا تعلق ہے یہ مسلمہ امر ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی راہبر ضرور ہوتا تھا اگرچہ بدر تک ابتدائی مہموں میں ان کا واضح ذکر نہیں ملتا ہے۔ بہر حال احد کی مہم کے دوران ایک راہبر کا واضح حوالہ ملتا ہے۔ واقدی کی زیادہ مستند روایت کے مطابق اس موقعہ پر حضرت ابوحثمہ حارثی نے راہبری کے فرائض انجام دیئے تھے[190] حمراء الاسد کی مہم میں جو دراصل احد کا تکملہ اور تتمہ تھی حضرت ثابت بن ضحاک خزرجی نے جو غالباً حضرت زید بن ثابت خزرجی کے والد تھے[191] مسلم فوج کی راہنمائی کی تھی۔

واقدی کا بیان ہے کہ حضرت ابو سلمیٰ بن عبد الاسد مخزومی کے سریہ قطن کے دوران ولید بن زہیر نامی ایک طائی شخص کو بطور راہبر منتخب کیا گیا تھا[192]۔ اسی مہم کی واپسی کے سفر کے دوران ایک دوسرا راہبر اجرت پر رکھا گیا تھا۔ جس نے مسلمانوں سے ان کے مال غنیمت کا خمس بطور اجرت مانگا تھا جو اسے دیا گیا تھا کیونکہ وہ مزید اموال غنیمت حاصل کرنے کا سبب بنا تھا[193]۔ غزوہ دومۃ الجندل میں بنو عذرہ کے ایک مشہور راہبر حضرت مذکور نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر کمان فوج کی راہنمائی کی تھی۔ انہوں نے ایک طلیعہ کا کام بھی کیا تھا اور مسلمانوں کے لیے ایک موزوں مقام خیمہ گاہ کے لئے تلاش کیا تھا[194]۔ اسی سال غزوہ مریسیع کے لیے حضرت مسعود بن ہنیدہ اسلمی نامی ایک مشہور راہبر نے مسلمانوں کو ان کی منزل تک پہنچایا تھا[195]۔ اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت ابو حدرد اسلمی نے ۶ھ میں غطفان کے خلاف ایک غزوہ میں یہی خدمت انجام دی تھی[196]۔ پھر اسی برس واقدی کے بیان کے مطابق بنو عذرہ کے ایک گمنام راہبر نے حضرت زید بن حارثہ کی سریہ حسمیٰ کی راہنمائی کی تھی[197]۔ حدیبیہ کی طرف سفر نبوی میں اسلم کے ایک راہبر حضرت عمرو بن عبد نہم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے راہبر ہونے کی سعادت حاصل کی تھی[198]۔

یہ امر دلچسپ بھی ہے اور قابل ذکر بھی کہ خیبر کے مقامی یہودیوں کے تین افراد نے الگ الگ مواقع پر مسلمانوں کی راہ بری کا فرض رضا کارانہ طور سے انجام دیا تھا۔ اسی مہم کے ذیل میں طبری اور ابن اثیر نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق حضرت حُسَیل بن نُوَیرَہ / خارجہ جو قبیلہ غطفان کے خاندان اشجع سے تھے اور خیبر کے نواح میں رہتے تھے۔ اتفاقاً مدینہ کے بازار میں خرید و فروخت کی خاطر آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی مہم کی تیاری کر چکے تھے۔ بازار ہی میں آپ سے انکی ملاقات ہو گئی اور آپ نے ان کو بطور صلہ کھجور کی پیشکش کی اگر وہ رہبری کا کام انجام دے سکیں۔ انہوں نے پیشکش قبول کر لی۔ اپنا وعدہ ایفا اور فریضہ انجام دیا اور دلچسپ بات یہ کہ مہم انجام دینے کے بعد وہ بھی مسلمان ہو گئے[199]۔ اسد الغابہ کے مطابق اس مہم میں ایک اور رہبر جنکو اجرت پر حاصل کیا گیا تھا۔ حضرت عبد اللہ بن نعیم اشجعی تھے[200]۔

غزوہ خیبر کے سات ماہ بعد جناب نامی مقام کی طرف جانے والی حضرت بشیر بن سعد خزرجی کی مہم کے دوران انہیں حضرت حُسیل نے پھر رہنمائی کے فرائض انجام دیئے تھے[201]۔ اسد الغابہ کی ایک روایت سے ایک انتہائی اہم واقعہ کی اطلاع ملتی ہے اس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت غالب بن عبد اللہ لیثی سے فتح مکہ سے ذرا پہلے مکہ کے مختصر راستے کی نشاندہی کرنے کی درخواست کی اور پھر مہم کے دوران انہیں نے مسلم فوج کی رہنمائی کی تھی[202]۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری عظیم مہم غزوہ تبوک میں حضرت علقمہ بن فغواء خزاعی کو اپنا راہبر بنایا تھا اور آپ کی مقرر کردہ آخری مہم یعنی سریہ اسامہ بن زید کے دوران ایک عذری راہبر نے رہنمائی کی خدمات انجام دی تھیں[203]۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولین مہم سے آخری مہم تک برابر راہبری کی خدمات حاصل کی جاتی رہی تھیں۔ ان متعدد راہبروں میں سے چودہ کے نام بصراحت مذکور ہیں اور یہ یقینی ہے کہ مختلف سرایا اور غزوات میں اس سے کہیں زیادہ راہبروں نے کام کیا ہو گا۔ اگرچہ ان کے نام محفوظ و مذکور نہیں رہ سکے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جہاں تک راہبروں کا تعلق ہے۔ مغربی، شمالی، مشرقی اور مرکزی عرب کے قبیلوں نے اسی ترتیب کے ساتھ خدمات انجام دی تھیں۔ ان کو ذیل کی جدول میں اور واضح کر دیا گیا ہے۔

علاقہ	قبیلہ	تقرریاں	راہبر
مغربی عرب	۱۔ اسلم	۴	۴
	۲۔ کنانہ	۱	۱
	۳۔ خزاعہ	۱	۱
شمالی عرب	۱۔ عذرہ	۱	۱
	۲۔ یہود خیبر	۳	۳
مشرقی عرب	۱۔ غطفان	۳	۲
مرکزی عرب	۱۔ خزرج	۱	۱
	۲۔ اوس	۱	۱
میزان	۸۔ قبیلے	۱۵	۱۴

جہاں تک ان راہبروں کی سبقتِ اسلام یا زمانۂ قبول اسلام کا تعلق ہے تو چودہ مذکورہ اور نامزد اشخاص میں سے چار ابتدائی مدنی یا آخری مکی عہد کے مسلم تھے، پانچ دوسرے صلح حدیبیہ کے زمانے سے پہلے کے اور چار ۶۲۸ء اور ۶۳۰ء کے درمیانی عرصہ کے اور باقی ایک حیاتِ نبوی کے آخری دو برسوں میں کسی وقت مسلمان ہوئے تھے[۲۰۶] لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ بات غیر مسلم راہبروں کی خدمات حاصل کرنے کی ہے جنہوں نے پوری وفاداری اور ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دیئے تھے۔

اموال غنیمت اور قیدیوں کے نگران افسر (اصحاب المغانم)

میدان جنگ میں فتح کے نتیجہ میں مسلمانوں کو اموال غنیمت کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی قیدی بھی ہاتھ لگتے تھے۔ ان قیدیوں کو عموماً زر فدیہ لیکر آزاد کر دیا جاتا تھا۔ کچھ اسلام لانے کے سبب آزاد ہو جاتے تھے اور کچھ کو رحمت نبوی معاف کر دیتی تھی۔ بہر حال قیدی اور اموال دونوں ہی المغانم کی وسیع اصطلاح میں آتے تھے۔ مآخذ کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے تمام غزوات و سرایا میں جن میں اموال اور قیدی ہاتھ لگیں۔ ان کے لئے مخصوص افسر مقرر کرتے تھے۔ بہر حال ہم ایسے افسروں کی تقرریوں کی متعدد مثالوں کو پہلی جنگ سے لیکر آخری جنگ کے زمانے تک دیکھتے ہیں۔

فطری طور پر اموال غنیمت اور قیدیوں کے افسروں کی تقرری کی پہلی مثال کا تعلق غزوہ بدر سے ہے۔ واقدی کے بیان کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن کعب خزرجی کو تمام مغانم کا افسر مقرر کیا تھا۔ مگر ایک اور روایت کے مطابق اس افسر کا نام حضرت خبّاب بن ارت تمیمی تھا۔ لیکن پہلی روایت بوجوہ معلوم زیادہ صحیح ہے۔ اس غزوہ میں قیدیوں کی افسری خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مولیٰ (غلام) حضرت صالح شقران کے سپرد کی گئی تھی[۲۰۸]! ان کو غلام ہونے کے

سبب سے اموالِ غنیمت میں سے حصہ نہیں ملا تھا مگر ان کو انعام و اکرام سے نوازا گیا تھا[۲۰۹] جبکہ اول الذکر افسر کو آزاد و مسلم ہونے کے سبب پورا حصۂ غنیمت ملا تھا۔ اسد الغابہ کے بیان کے مطابق بدر کے بعد ہونے والے غزوات و سرایا میں سے متعدد میں حضرت عبداللہ بن کعب خزرجی خمس (ریاست اسلامی یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مال غنیمت میں ۱/۵ حصہ) کے افسر مقرر کئے گئے تھے۔[۲۱۰] حضرت صالح شقران کی دوبارہ تقرری کا ذکر غزوہ مریسیع کے ضمن میں ملتا ہے جبکہ انہیں تمام حاصل شدہ مال غنیمت کا افسر مقرر کیا گیا تھا۔ یہ نکتہ قابل ذکر بھی ہے اور دلچسپ بھی کہ اس غزوہ میں تین مزید افسروں کی تقرری کی گئی تھی۔ ان میں سے حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی کو جنگی قیدیوں کا افسر مقرر کیا گیا تھا[۲۱۱] تو حضرت محمیہ بن جزء زبیدی کو مسلم مجاہدین کے حصوں کا[۲۱۲] جبکہ حضرت مسعود بن ہُنیدہ اسلمی کو خمس ریاست اسلامی کا[۲۱۳]

مگر کبھی کبھی ایک ہی شخص کو اموال غنیمت اور قیدیوں کا افسر مقرر کر دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ حضرت محمد بن مسلمہ اوسی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ان کو غزوہ بنی قینقاع میں دونوں کا افسر مقرر کیا گیا تھا۔[۲۱۴] اسی غزوہ میں دو اور افسروں کو دو مختلف النوع کاموں کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ حضرت منذر بن قدامہ کو تمام گرفتار شدہ قیدیوں کو ہتھکڑیاں لگانے کا کام سونپا گیا تھا[۲۱۵] جبکہ حضرت عبادہ بن صامت خزرجی کے مدینہ کی شہری حدود سے بنو قینقاع کو جلاوطن کرنے کے انتظامات کی نگرانی سپرد کی گئی تھی[۲۱۶] حضرت محمد بن مسلمہ نے اسی قسم کا کام بنو نضیر کے غزوہ میں انجام دیا تھا۔ جبکہ دشمن نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے تھے[۲۱۷] اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور غلام حضرت ابو رافع کو اس موقعہ پر اموال غنیمت پر افسر مقرر کیا گیا تھا[۲۱۸] یہود مدینہ کے خلاف آخری غزوہ میں کئی افسروں کی تقرری کے حوالے ماخذ میں ملتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن سلام قیدیوں کے اعلیٰ افسر تھے[۲۱۹] تو حضرت محمیہ بن جزء زبیدی خمس کے[۲۲۰] حضرت محمد بن مسلمہ کے سپرد قیدیوں کو ہتھکڑیاں لگانا تھا[۲۲۱] تو حضرات زبیر بن عوام اسدی اور علی بن ابی طالب ہاشمی کو (مشہور روایت کے مطابق) بنو قریظہ کے قتل کے مجرم قیدیوں کے قتل کے انتظامات کا نگران مقرر کیا گیا تھا[۲۲۲] اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت مسلم بن بہرہ جو ایک گمنام صحابی ہیں، ان قیدیوں کے افسر مقرر کئے گئے تھے جن کے بارے میں حکم حضرت سعد بن معاذ اوسی نے قتل کا فیصلہ کیا تھا[۲۲۳] ان کے علاوہ دو مزید افسروں کے نام ملتے ہیں۔ یہ تھے حضرات سعد بن عبادہ[۲۲۴] اور سعد بن زید[۲۲۵] جن کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا۔ کہ یہودی بچوں اور عورتوں کو جو قیدی بنا لئے گئے تھے۔ شام اور نجد کے بازاروں میں بالترتیب بیچ دیں۔ یہودانِ خیبر کے خلاف کامیاب مہم کے بعد کم از کم تین افسروں کی تقرری کے حوالے ملتے رہیں، واقدی اور ان کے شاگرد و کاتب ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت فروہ بن عمرو بیاضی خزرجی کو صاحب المغانم (اموال غنیمت کا افسر) بنایا گیا تھا۔[۲۲۶] جبکہ ابن اثیر کا دعویٰ ہے کہ حضرت مرداس بن مروان خزرجی کو بھی اس ضمن میں کچھ ذمہ داری سونپی گئی تھی[۲۲۷] قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غالباً موخر الذکر کو خمس یا مسلمانوں کے حصوں کی دیکھ بھال سپرد کی گئی ہوگی۔ اسد الغابہ کے مطابق تیسرے افسر ابو جُہیمہ انصاری تھے۔ جن کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ تمام مویشی اور جانور جو اموال غنیمت میں دشمنوں سے حاصل ہوئے ہیں کچھ لوگوں کی مدد سے انکو مدینہ لیکر پہنچیں[۲۲۸]

اگرچہ فتح مکہ کے ضمن میں واقدی نے نہ کسی مال غنیمت کے حصول کا ذکر کیا ہے اور نہ اس کے کسی افسر کی تقرری کا۔ تاہم ابن اثیر کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تاریخ ساز دن حضرت خُزاعی بن عَبد نہم کو مال غنیمت کا افسر مقرر کیا تھا[۲۲۹] ممکن ہے

کہ یہ تقرری اس مالِ غنیمت کے سلسلے میں ہوئی ہو جو مکہ کے ان مزاحمین سے حاصل ہوا تھا۔ جو حضرت خالد بن ولید مخزومی کے دستے کے بالمقابل آئے تھے۔ طبری اور ابن خلدون دونوں کا اتفاق ہے کہ حضرت مسعود بن عمرو غفاری کو فتح حنین میں حاصل شدہ اموالِ غنیمت اور قیدیوں کو جعرانہ میں اکٹھا کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔[۲۳۰] مگر اسد الغابہ کا بیان ہے کہ اس کے افسر حضرت مسعود بن عمرو القاری تھے[۲۳۱]۔ بہرحال یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جب جعرانہ میں تمام اموالِ غنیمت کو اکٹھا کر لیا گیا تو اس کے افسرِ اعلیٰ ایک نومسلم حضرت بُدَیل بن ورقاء خزاعی کو مقرر کیا گیا[۲۳۲]۔ یہاں رحمتِ نبوی اور رافتِ محمدی کے ایک واقعہ کا ذکر بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جیسے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ہوازن کے قیدیوں کے پھٹے پرانے کپڑوں پر پڑی، آپ کی رحمت جوش میں آئی اور آپ نے حضرت بُسر بن سفیان خزاعی کو ان کے لیے نئے کپڑے خریدنے کا حکم دیا جس کی فوری تعمیل کی گئی[۲۳۳]۔ حضرت زید بن ثابت خزرجی جو عہدِ نبوی میں فرائض (اموالِ غنیمت کے حصول) کے مستقل افسر بن چکے تھے کے سپرد ان قیدیوں کو گننے اور ان کی ایک فہرست تیار کرنے کا حکم دیا گیا[۲۳۴]۔ یہاں اس واقعہ کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دیا تو حضرت عمر بن خطاب عدوی، حضرت زید بن ثابت خزرجی اور حضرت ابورُہم غفاری کو مقرر کیا کہ وہ بالترتیب قریش، انصار اور قبائلِ عرب کے سپاہیوں کو اپنے حصے کے قیدی آزاد کرنے پر آمادہ کریں[۲۳۵]۔

صرف غزوات ہی میں ان افسروں کی تقرری نہیں کی جاتی تھی بلکہ بعض مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے انتظامات سرایا کے لئے بھی کئے جاتے تھے چنانچہ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت علی کی مہم اَلفُلس کے دوران ایک صحابی حضرت ابوقتادہ خزرجی کو اموالِ غنیمت اور قیدیوں کا افسر مقرر کیا گیا تھا[۲۳۶]۔ اگرچہ یہ سرایا کے سلسلے میں خبرِ واحد ہی ہے لیکن اس سے شہادت ملتی ہے کہ سرایا میں بھی اس قسم کے افسروں کی تقرری کا معمول تھا۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ بعض سرایا میں کافی مالِ غنیمت اور بعض قیدی بھی مسلمانوں کو ملے تھے۔ جیسا کہ آگے چل کر ہم اس کو تفصیل سے دیکھیں گے اور ظاہر ہے کہ ان کے سلسلہ میں نگرانوں کا تقرر بھی ہوا ہو گا یہ ممکن ہے کہ اس قسم کے انتظامات یا تقرریاں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر سریہ اور ہر مہم کے لئے بنفسِ نفیس نہ فرمائی ہوں۔ بلکہ ان کو امیرِ سریہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہو مگر یہ تصور کرنا کہ سرایا میں اموالِ غنیمت اور قیدیوں کے لئے افسر مقرر کئے ہی نہیں گئے تھے حقیقت کے منافی ہو گا۔

ذیل میں ایک جدول دی جا رہی ہے۔ جس میں اس شعبہ کے تمام مذکور افسروں کا قبائلی اور علاقائی تعلق ظاہر کیا گیا ہے۔

علاقہ	قبیلہ / خاندان سنہ	۶۲۴	۶۲۵	۶۲۷	۶۲۸	۶۳۰	تقرریاں	افسر
مرکزی عرب	۱۔ قریش	-	-	۲	-	۱	۳	۳
	۲۔ خزرج	۲	-	۱	۲	۳	۸	۸
	۳۔ اوس	۲	۱	۲	-	-	۵	۳
	۴۔ انصار (غیر متعین)	-	-	۱	۱	-	۲	۲
	۵۔ قینقاع	-	-	۱	-	-	۱	۱

مشرقی عرب	۱۔ قارہ	-	-	-	-	۱	۱	۱
مغربی عرب	۱۔ اسلم	-	-	۲	-	-	۲	۱
	۲۔ مزینہ	-	-	-	-	۱	۱	۱
	۳۔ غفار	-	-	-	-	۲	۲	۲
	۴۔ خزاعہ	-	-	-	-	۲	۲	۲
جنوبی عرب	۱۔ زبید	-	-	۲	-	-	۲	۱
غیر عرب مسلم	۱۔ حبشی	۱	-	۱	-	-	۲	۲
غیر معروف	۱۔ مولی رسول کریمؐ	-	۱	-	-	-	۱	۱
میزان		۵	۲	۱۲	۳	۱۰	۳۲	۲۸

جیسا کہ جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیادہ تر تقرریاں مرکزی عرب کے قبیلوں کو حاصل ہوئی تھیں اور ان میں بھی خزرج کا سب سے زیادہ حصہ تھا اور ان کے بعد اوس کا جبکہ قریش کی نمائندگی بہت کم تھی۔ دوسرے نمبر پر مغربی عرب کے قبیلے تھے اگرچہ ان میں انفرادی طور پر کوئی بھی بہت اہم نہیں تھا۔ حالانکہ ان کو اجتماعی طور سے سات تقرریاں حاصل تھیں۔ بہر حال یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حقیقتاً جتنے افسر مقرر کیے گئے تھے۔ ان میں سے صرف چند کا ذکر ہے۔ ورنہ اگر تمام غزوات اور سرایا کے تمام افسروں کا ذکر ملتا تو فہرست اس سے کہیں بڑی ہوتی اور ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے قبیلوں اور علاقوں کا تناسب بھی ہوتا۔ بہر حال اس شعبہ میں اہم اور نمایاں ترین افسروں میں حضرات محمد بن مسلمہ اوسی، عبداللہ بن کعب خزرجی زید بن ثابت خزرجی۔ بریدہ بن حصیب اسلمی مسعود بن ہنیدہ اسلمی۔ محمیہ بن جزء زبیدی اور شقران (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حبشی غلام) تھے۔ ان میں سے کم از کم دو یعنی حضرات عبداللہ بن کعب خزرجی اور محمیہ بن جزء زبیدی بالترتیب اموال غنیمت اور خمس رسول کے مستقل افسر معلوم ہوتے ہیں۔ کہ انہوں نے یہ ذمہ داری کئی سرایا اور غزوات میں انجام دی تھی جہاں تک ان افسروں کے زمانۂ اسلام کا تعلق ہے تو ۲۸ میں سے صرف پانچ کو سابقین اولین کے طبقہ میں شمار کیا جا سکتا ہے جبکہ نو دوسرے آخری مکی عہد کے مسلم تھے اور گیارہ مدنی عہد میں اسلام لائے تھے اور بقیہ حیاتِ نبویؐ کے آخری دو برسوں میں[۲۳۷]

اسلحہ اور گھوڑوں کے افسر (اَصْحَابُ السِّلَاحِ وَالْفَرَسِ)

اگرچہ اسلحہ اور گھوڑوں کے افسروں کے بارے میں ہماری معلومات بہت ناقص ہیں تاہم یہ حتمی ہے کہ عسکری تنظیم کے اس شعبہ میں بھی کئی تقرریاں ہوئی تھیں[۲۳۸] کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہتھیاروں اور گھوڑوں کے حصول کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ جیسا کہ ہم کو معلوم ہے کہ ابتدا میں اسلامی ریاست کے پاس بہت کم ہتھیار تھے اور اس سے کم گھوڑے تھے۔ مؤخر الذکر کے ارتقاء کے بارے میں

ہم دیکھ چکے ہیں اور اوّل الذکر کے ذخیرہ یابی کے بارے میں ہم ابھی کچھ دیر میں مطالعہ کریں گے لیکن وقت کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور ان سے شدید تر تقاضوں نے اسلامی ریاست کو اسلحہ اور گھوڑوں کی فراہمی کے لیے تمام امکانی کوششیں کرنے پر مجبور کر دیا تھا اس لئے قیاس اور منطق دونوں کا تقاضا ہے کہ یہ باور کر لیا جائے کہ ان کے افسر بھی مقرر کئے گئے تھے اور یہ قیاس بلا سند شہادت بھی نہیں ہے اسد الغابہ کا بیان ہے کہ بدر سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین گھوڑے حاصل کئے تھے اور ان کو حضرت سعد بن اسعد بن زرارہ خزرجی کی دیکھ بھال کو دیدیا تھا[۲۳۹] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک یا اس کے کچھ مدت بعد تک ہتھیار اور گھوڑے مسلم مجاہدین کی ذاتی ملکیت ہوا کرتے تھے اور اسلامی ریاست کی اپنی فوجی تنظیم کے نہیں ہوتے تھے لیکن جوں جوں جنگی تقاضے بڑھے اور اس کے ساتھ اسلامی نظام عسکری میں تنظیم و تربیت پیدا ہوئی۔ اسلامی ریاست نے اس کے حصول اور ملکیت کے انتظامات کئے۔ غزوہ حنین کے ضمن میں ذکر ملتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ازہر زہری کو گھوڑوں کا افسر مقرر کیا گیا تھا۔[۲۴۰] ممکن ہے کہ اس قسم کے انتظامات اور دوسرے غزوات میں بھی کیے گئے ہوں۔ اس سلسلہ میں اسلامی ریاست کی روز افزوں ہتھیاروں کی طاقت کا ایک مفصل مطالعہ دلچسپی کا سبب ہوگا۔

اسلامی ریاست کا روز افزوں ذخیرہ حربی

عہد نبوی کی تمام فتوحات اور بیشتر مہموں میں مسلمانوں کو اموال غنیمت میں متعدد چیزوں کے علاوہ تھوڑے بہت ہتھیار بھی ہاتھ لگتے تھے۔ ان کے حصول کی دو صورتیں تھیں۔ اوّل سلب کی صورت میں یعنی جنگ سے پہلے دوران مبارزت یا جنگ کے دوران عام مغلوبہ حملہ میں فاتح مسلم سپاہی اپنے مقتول دشمن کی ذاتی چیزوں کا جن میں ہتھیار بھی شامل ہوتے تھے۔ حق دار ہوتا تھا۔[۲۴۱] دوسری صورت دشمن کی پسپائی یا شکست کی صورت میں جو کچھ مسلمان فاتح کو اجتماعی طور سے حاصل ہو۔ پہلی مہم سریہ نخلہ میں جس میں مسلمانوں کو کچھ مال غنیمت میں ملا تھا غالباً ہتھیار شامل نہیں تھے۔[۲۴۲] البتہ جنگ بدر میں اونٹوں، گھوڑوں، چمڑے کی کھالوں کپڑے کے تھانوں اور روزمرہ کی ضروریات زندگی کے علاوہ کچھ ہتھیار (سلاح)[۲۴۳] بھی ہاتھ لگے تھے جن میں تلواریں (سُیُوف)[۲۴۴] زرہ بکتر (دُرُوع) کپڑے یا چمڑے کے خود (مِغْفَرْ، مَغَافِر) لوہے کے خود (بَیْضَہ : بِیْض)[۲۴۵] نیزے (رُمْح : رِمَاح) اور چھوٹے تیر یا حربی آلے (عَنَزَہ : عَنَز) وغیرہ شامل تھے۔[۲۴۶] اس کے علاوہ مسلمانوں کو اس غزوہ میں دس گھوڑے مال غنیمت کے طور پر ہاتھ لگے تھے۔[۲۴۷] ماخذ میں یہ ذکر نہیں ملتا کہ ان ہتھیاروں کی تعداد کتنی تھی اور نہ ہی یہ ذکر ملتا ہے کہ آیا وہ مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے یا ریاست کے خمس میں ان کو مخصوص و محفوظ رکھا گیا تھا۔ بہرحال کوئی بھی صورتحال رہی ہو، یہ امر مسلم ہے کہ مسلم مجاہدین کے سلاح خانہ میں خاصا اضافہ ہوا تھا اور اس سے ان کی حملہ کرنے کی طاقت بڑھی تھی۔ قریشی اشرافیہ سے دوسرے تصادم میں مسلمان ہر قسم کے اسلحہ سے لیس نظر آتے ہیں اور کم از کم سو مجاہدین زرہ بکتر پوش (دَارِع) تھے۔[۲۴۸] اس کے علاوہ ان کے پاس کم از کم پچاس سوار بھی تھے اس غزوہ میں عارضی فتح کے مختصر زمانے میں مسلمانوں کو کچھ غنیمت بھی ملی تھی۔ لیکن وہ طویل افراتفری کے عالم میں کھو گئی تھی۔

بہرحال یہود مدینہ اور خیبر وغیرہ سے مسلمانوں کو تصادم اور غزوات میں کافی ہتھیار مال غنیمت میں ملے تھے اور اس سے

ان کے ذخیرۂ حربی میں خاطر خواہ یا قابل قدر اضافہ ہوا تھا۔ بنو قینقاع کے پہلے تصادم میں یہودی سپاہ کی تعداد سات سو تھی جن میں سے چار سو زرہ بکتر پوش تھے اور باقی تین سو اس کے بغیر (حاسر) تھے۔[250] پندرہ دنوں کے محاصرہ کے بعد جب انہوں نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالے تو ان کے غالباً تمام چار سو زرہ بکتر مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے تھے، کیونکہ معاہدہ کے مطابق یہودیوں کو تمام ہتھیار مسلمانوں کے حوالے کرنے تھے[251] اس کے علاوہ مسلمانوں نے ان کے قلعوں یا گڑھیوں (آطام) میں کافی تعداد میں ہتھیار اور زرگری کے اوزار پائے تھے۔ کیونکہ وہ اس فن کے ماہر کاریگر تھے[252] مونٹگمری واٹ کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ان کی دوکانوں میں مسلمانوں کو اسلحہ سازی کے اوزار بھی ملے تھے۔ کیونکہ وہ ماہر اسلحہ ساز بھی تھے[253] مدینہ کے دوسرے یہودی قبیلہ بنو نضیر کے خلاف مہم میں مسلمانوں کو بہت کم حَلْقَۃ یعنی ہتھیار ملے تھے۔ وہ پچاس زرہ بکتروں، اتنے ہی آہنی خودوں اور تین سو چالیس تلواروں پر مشتمل تھے۔ ماخذ کا الزام یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ بنو نضیر مدینہ سے جلاوطنی کے سفر کے وقت بہت سے ہتھیار معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے اپنے کجاووں میں چھپا کر لے گئے تھے اور اس طرح ان کی کافی بڑی تعداد سے مسلمانوں کو محروم کر دیا تھا[254] مشہور عام روایت کے مطابق مدینہ کے آخری یہودی قبیلہ یعنی بنو قریظہ کے خلاف مہم میں مسلمانوں کو ہتھیاروں کی کافی بڑی کھیپ ہاتھ لگی تھی وہ پندرہ سو تلواروں، تین سو زرہ بکتروں، دو ہزار نیزوں اور پندرہ سو لوہے اور چمڑے کی ڈھالوں (تُرُس و حَجَفَۃ) پر مشتمل تھی۔[255] اس کے علاوہ بنو قریظہ کے قتل عام کی کہانی اگر صحیح ہے تو تقریباً ایک ہزار یہودی عورتیں اور بچے بطور غلام ہاتھ لگے تھے جنکو بازار میں بیچ دیا گیا تھا اور ان کی قیمت سے مزید ہتھیار اور گھوڑے (السِلَاح وَالْخُیُول) خریدے گئے تھے۔[256]

ہتھیاروں اور دوسرے آلاتِ حرب پر مشتمل سب سے بڑی تعداد غزوہ خیبر کے نتیجہ میں مسلمانوں کے قبضہ میں آئی تھی، واقدی کا بیان ہے کہ قلعہ نطاۃ کے زوال کے بعد مسلم ذخیرۂ حربی[257] میں ایک قابل مرمت منجنیق اور دو دبابوں دَبَّابَۃ[258] کے علاوہ کافی بڑی تعداد میں زرہ بکتروں، آہنی خودوں اور تلواروں کا اضافہ ہوا تھا۔ منجنیق کو فوراً مرمت کر کے لئے قابل استعمال بنا لیا گیا تھا چنانچہ یہ مقبوضہ ہتھیار خصوصاً منجنیق اور دبابے اگلے قلعوں کو فتح کرنے میں بہت کام آئے تھے۔ انہی کی بدولت قلعہ شق، قلعۂ نزار، قلعۂ قَمُوص[259] اور قلعہ صعب بن معاذ فتح ہوئے تھے، صرف قلعہ قموص میں اسلامی فوج کو ایک سو زرہ بکتر، چار سو تلواریں ایک ہزار نیزے اور پانچ سو عربی کمانیں معہ اپنے ترکشوں (جِعَابٍ) کے حاصل ہوئی تھیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے خیبر کے قلعوں میں اور کتنے ہتھیار ملے ہوں گے۔ بہر حال بطور آخری تجزیہ یہ بات اب زیادہ قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ کہ دوسرے اسباب و سامان جیسے کپڑوں، مویشیوں، چمڑوں، کھانے پینے کے برتنوں اور دوسرے ضروری روزمرہ کے سامان کے ساتھ کافی بڑی تعداد میں اسلحہ بھی خیبر کے مال غنیمت میں شامل تھا۔ جیسا کہ واقدی کا بیان بھی ہے۔[260]

لیکن کیا یہ ہتھیار اور اسلحے مسلم فوج کی روز افزوں ضرورت کے لئے کافی تھے؟ اس سوال کا جواب مفصل طور سے کہیں اور دیا جا چکا ہے۔ مگر یہاں اتنا کہنا کافی ہو گا کہ یہود مدینہ اور یہود خیبر سے حاصل شدہ ہتھیار اتنے زیادہ تھے کہ وہ مسلم فوج کی مکمل ضروریات، تو در کنار اس کے ایک تہائی یا چوتھائی کو بھی کافی نہ تھے۔ بلکہ وہ مسلم فوجیں جنہوں نے ان یہودی قبیلوں کے خلاف اقدامات کئے تھے ان کی ضرورت کے لئے بھی کافی نہیں تھے۔ اس کی تصدیق ان تمام ہتھیاروں کی مجموعی تعداد سے ہوتی ہے جو مسلمانوں

نے یہودی قبیلوں سے حاصل کئے تھے۔ ان کا میزان یہ تھا: ۸۵۰ زرہ بکتر، ۵۰ آہنی خود، ۲۲۴۰ تلواریں، ۳۰۰۰ نیزے، ۱۵۰۰ ڈھالیں اور ۵۰۰ عربی کمانیں معہ اپنے ترکشوں کے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک منجنیق، دو دبابے اور ہتھیاروں کی وہ غیر متعینہ تعداد بھی شامل کر دی جائے۔ جو دوسرے قلعوں سے ملے تھے۔ تب بھی آلات حرب اور ہتھیاروں کا اس سے کافی کم تناسب نکلتا ہے جو مسلم افواج کو چاہیئے تھا۔ بہرحال اس سب کے باوجود یہ تسلیم کرنا، ہر دیانت دار مورخ کا فرض ہے کہ یہودی قبیلوں سے حاصل شدہ ہتھیاروں اور آلات حرب کی تعداد نے مسلم سلاح خانے کی قوت میں کافی اضافہ کیا تھا اور مسلم سپاہیوں کو لیس ہونے میں کافی مدد کی تھی[۲۶۳]۔

یہاں ایک ستم ظریفی کے واقعہ کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ غزوہ احزاب کے زمانے میں مسلمانوں نے کافی بڑی مقدار میں زمین رخندق کھودنے اور مٹی ہٹانے کے اوزار اور برتن بنو قریظہ کے یہودیوں سے مستعار لئے تھے۔ ان میں آہنی پھاوڑے (مَسَاحِی)، چمڑے کے تھیلے (کَرَازِیْن)، اور کھجور کی پتیوں کی بنی ہوئی بڑی بڑی تھیلیاں اور چھابیاں جنمیں پانچ صاع وزن آجاتا تھا (مَکَاتِیْل) شامل تھیں[۲۶۴]۔ مؤخر الذکر دو چیزیں مٹی ہٹانے کے لئے استعمال کی گئی تھیں۔ خندق کی مٹی سلع کے پہاڑ کے دامن میں جمع کر دی جاتی تھی اور واپسی میں انہیں چھابیوں اور تھیلوں وغیرہ میں پتھر بھر کر لائے گئے تھے۔ جن کو ترتیب کے ساتھ اس طرح پشتہ بنا کر رکھا گیا تھا کہ وہ کھجوروں کے پہاڑ معلوم ہوتے تھے۔ واقدی کے بقول یہ پتھر بعد میں جنگ کے دوران بطور ہتھیار استعمال ہوتے تھے اور روایات کے بموجب مسلمانوں کے سب سے زیادہ کارگر اور مؤثر ہتھیار تھے جن کی مار سے کوئی بچ کر نہیں نکلتا تھا[۲۶۵]۔ بہرحال یہودیوں سے تصادم میں مسلمانوں کو کافی ہتھیار اور اوزار وغیرہ ہاتھ لگے تھے جن سے ان کی جارحانہ قوت میں اضافہ ہوا تھا۔

عہد نبوی کی دوسری مہموں میں مسلم فوج کافی کیل کانٹے سے لیس اور ضروری ساز و سامان سے مسلح نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ۷ھ/۶۲۹ء میں عمرۃ القضاء کی مہم کے دوران دو ہزار مسلم مجاہدین پوری طرح سے مسلح اور زرہ بکتر میں غرق تھے اور ہر قسم کے کیل کانٹے سے لیس تھے۔ صلح حدیبیہ کی شرائط کے تحت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام اسلحے اور ہتھیار حرم مکہ کے باہر چھوڑ دیئے تھے[۲۶۶] اور حضرت بشیر بن سعد انصاری کو ان کا نگران افسر مقرر کیا تھا[۲۶۷]۔ بعد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم سلاح خانہ کی حفاظت کے لئے دو سو سپاہیوں پر مشتمل ایک دستہ حضرت اوس بن خولی کے زیر کمان تعینات کیا تھا[۲۶۸]۔ ایک سال بعد جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے ارادے سے کوچ فرمایا تو دس ہزار مسلم فوج پوری طرح سے لیس تھی اگرچہ پوری مسلم فوج کے ہتھیاروں کا صریحی ذکر ماخذ میں نہیں ملتا ہے۔ تاہم مضمرا مقصود یہی ہے۔ اس کے علاوہ واقدی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو سلیم کا آٹھ سو یا ایک ہزار سپاہیوں پر مشتمل دستہ لوہے میں غرق تھا۔ کیونکہ "ان کے زرہ بکتر چمک رہے تھے اور ان کے نیزوں کی چھوٹ پڑ رہی تھی"[۲۶۹]۔ اسی طرح واقدی نے بنو سلیم اور بنو فزارہ کا مسلح ہونے کا حوالہ اس مفاخرت میں دیا ہے جو ان دونوں قبیلوں نے اس موقعہ پر کی تھی[۲۷۰]۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر کمان اصل فوج "لوہے میں اتنی غرق تھی کہ ان کے آخری آدمی تک کی آنکھوں کی صرف پتلیاں (حَدَق) نظر آتی تھیں"[۲۷۱]۔ ایک روایت کے مطابق صرف آپ کے دستے میں جو انصار اور مہاجرین پر مشتمل تھا۔ ایک ہزار سپاہی زرہ بکتروں سے مسلح تھے۔ مکہ کے عظیم ترین قریشی سردار ابوسفیان بن حرب اموی نے اسلامی فوج کی شان و شوکت دیکھ کر

برجستہ کہا تھا۔ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں جو دس ہزار لوہے (اسلحہ) میں غرق سپاہیوں کے ساتھ آرہے ہیں[۲۷۴]

غزوہ حنین کے آغاز سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سپاہ کے لئے مکہ کے ایک دولتمند تاجر صفوان بن امیہ حجی سے ایک ہزار زرہ بکتر مستعار لئے تھے[۲۷۵]۔ اسد الغابہ کا بیان ہے کہ مشہور صحابی رسول حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے ہم نام بھتیجے حضرت عبدالرحمٰن بن ازہر کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوہ میں گھوڑوں کا افسر مقرر کیا تھا۔[۲۷۶]

طائف کے محاصرہ کے دوران اسلامی فوج کی تعداد میں نہ صرف چار سپاہیوں کا اضافہ ہوا تھا۔ جو حضرت طفیل بن عمرو ازدی اپنے قبیلہ سے لائے تھے بلکہ ایک دبابہ اور ایک منجنیق کا بھی اضافہ ہوا تھا[۲۷۷]۔ اس اختلاف کے باوجود کہ دبابہ اور منجنیق کون لایا تھا[۲۷۸] واقدی کا یہ بیان بڑا دلچسپ ہے کہ اس زمانے میں دبابہ عام طور سے گائے کی کھالوں سے بنائے جاتے تھے[۲۷۹]۔ اس کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض اور احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں اور دفاع کے لئے قدرتی چیزوں سے فائدہ اٹھایا تھا۔ روایات کے مطابق آپ نے اپنے خیمہ کے اردگرد حسک نامی کانٹے دار جھاڑیوں کو پھیلا دیا تھا کہ دشمن اچانک شب خون نہ مار سکے[۲۸۰]۔ منجنیق اور دبابہ کو آپ نے محاصرہ ختم کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہا تھا۔ مگر بعض اصحاب کے مشورہ پر اس کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اگرچہ غزوہ تبوک کے ضمن میں اسلامی فوج کے ہتھیاروں کا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے۔ تاہم یہ یقین کرنے کی وجوہ ہیں کہ پوری فوج ہر طرح کے کیل کانٹے سے لیس تھی کیونکہ یہ عہد نبوی کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور فوج تھی۔ اس غزوہ کے دوران حضرت خالد بن ولید مخزومی کی قیادت میں ایک اسلامی مہم نے دومۃ الجندل کے عیسائی بادشاہ سے تلواروں، نیزوں اور زرہ بکتروں پر مشتمل کم از کم آٹھ سو ہتھیار حاصل کئے تھے[۲۸۱]

مذکورہ بالا مفصل بحث سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست اپنے سلاح خانے کے ذخیرہ کو ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی اور اس کے لئے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتی تھی۔ لیکن اس بحث سے یہ غلط فہمی نہ پیدا ہونی چاہیئے کہ اسلامی ریاست تمام تر ذخیرہ حربی صرف اموال غنیمت کے ذریعہ حاصل ہوا تھا۔[۲۸۲] یقیناً وہ بھی ایک اہم ذریعہ تھا اور اس کے سبب اسلامی ریاست کے سلاح خانے میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔ لیکن صرف وہی تنہا ذریعہ نہ تھا۔ اس کے حصول کے متعدد ذرائع تھے۔ کیونکہ اسلامی فوج کے تمام ہتھیاروں کا اگر اموال غنیمت میں ملنے والے ہتھیاروں سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اس کی چوتھائی ضرورت کو بھی کافی نہیں تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی مآخذ سے نہیں معلوم ہوتا کہ دس ہزار گھوڑے صرف جنگوں اور مہموں میں حاصل شدہ مال غنیمت کے نتیجہ میں حاصل ہوئے تھے۔ بلاریب گھوڑوں اور ہتھیاروں کی زیادہ تر تعداد خرید و فروخت کے ذریعہ حاصل کی گئی تھی۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ خمس کا ایک حصہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہتھیاروں اور گھوڑوں کی خرید پر صرف فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے آلات حرب بھی بعض صلح پسند قسم کے ذرائع سے حاصل کئے گئے تھے۔ ان میں مسلم امت کے چندوں اور عطیوں کا نمایاں حصہ تھا۔ مسلمانوں میں سے متمول افراد نے ہر اہم موقعہ پر دامے درمے اور قدمے عطیات دیئے تھے اور اسلامی فوج کو مسلح کرنے میں بھرپور مدد کی تھی۔ اس کی تفصیل تو آگے آئے گی۔ یہاں یہ کہنا کافی ہوگا کہ تنہا حضرت عثمان بن عفان نے غزوۂ تبوک کے ایک تہائی لشکر کو اپنی جیب خاص سے مسلح کیا تھا۔[۲۸۳]

بہرحال مذکورہ بالا تجزیے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سات آٹھ سال کے قلیل عرصے میں اسلامی فوج ایک ٹوٹی پھوٹی، ہتھیاروں سے تہی اور شہسواروں سے خالی اور غیر تربیت یافتہ وغیر منظم فوج سے ترقی کر کے ایک منظم و مرتب، ہتھیاروں اور اسلحوں سے لیس شہسواروں پر مشتمل اور عظیم جنگی مشین میں ڈھل گئی تھی۔ وہ اپنے وقت کی نہ صرف جزیرہ نمائے عرب میں ایک عظیم ترین فوج بن گئی تھی، بلکہ غالباً پڑوسی ملکوں اور ریاستوں میں بھی کوئی ایسی جنگی قوت نہ تھی جو اس کی طاقت کا مقابلہ کر سکتی۔ اس عظیم فوج نے نہ صرف اس سیاسی نظام کی بنیاد رکھی، جس نے غیر منظم، وحشی اور نظم و نسق کے دشمن عربوں کو مدینہ کی مرکزی اسلامی حکومت کا فرمانبردار شہری بنا دیا بلکہ وقت کے ساتھ ایک ایسی جنگی مشین میں ڈھل گئی، جس نے کچھ مدت کے بعد عالمگیر فتوحات کے جھنڈے گاڑے۔

محافظ جسم فوج یا دستے

عسکری تنظیم کے آخر میں محافظ جسم دستوں (Body Guards) کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک اہم ترین کام یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا انتہائی نازک فریضہ انجام دیتے تھے۔ چنانچہ اس شعبہ میں ان تمام حضرات کو شامل کیا گیا ہے جنہوں نے مہموں یا جنگوں کے دوران یا زمانہ جنگ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کی حفاظت کی تھی۔ آپ کی جسمانی حفاظت محض اس لئے ضروری نہیں تھی کہ آپ خدا کے رسول اور مسلمانوں کے محبوب سردار تھے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ آپ کی ذات اقدس ہی پر اس وقت اسلامی ریاست منحصر تھی۔ اگر خدانخواستہ آپ کی ذات کو ابتدائی زمانے میں کوئی گزند پہنچ جاتا تو وہ پوری عمارت زمین پر دھڑام سے آگرتی جس کو اپنی جاں فشانیوں اور قربانیوں سے آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے تعمیر کیا تھا۔ زمانہ جنگ میں آپ کی ذات کیلئے خطرات کئی گنا بڑھ جاتے تھے، کیونکہ عرب روایات میں قبیلوں کے سرداروں کو اچانک قتل کرا دینے کی اجازت تھی۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کا حوصلہ پست ہو جاتا اور یقینی تھا کہ وہ سارا کام ملیامیٹ ہو جاتا جس کے لئے اتنے پاپڑ بیلے گئے تھے۔ بہرحال اس ذیل میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ آپ کی حفاظت کے انتظامات مسلمانوں نے از خود کئے تھے اور ان کے لئے آپ نے احکامات یا ہدایات نہیں دی تھیں تاہم ان انتظامات کو آپ کی پسندیدگی ضرور حاصل تھی جس کو حدیث کی اصطلاح میں تقریر (تصدیق) کہتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیعت عقبہ ثانیہ میں انصار کے دونوں قبیلوں اوس اور خزرج نے جو آپ کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا اسے انہوں نے تا زندگی بحسن و خوبی نبھایا۔ لہٰذا یہ حیرت انگیز بات نہیں معلوم ہونی چاہیے کہ آپ کی ذات کی حفاظت میں پیش پیش یہی دونوں قبیلے تھے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم اور نمایاں ترین حضرات دونوں قبیلوں کے سردار حضرت سعد بن معاذ اوسی اور حضرت سعد بن عبادہ خزرجی تھے۔ بدر کی مہم کے دوران جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عریش میں تشریف فرما اور سجدہ میں مشغول تھے تو آپ کی محافظت حضرت سعد بن معاذ اوسی نے کی تھی[۲۸۴] غزوہ احد کے بعد جب دشمن حمراء الاسد کی جانب پسپا ہو گیا تو مسلمان مدینہ لوٹ آئے تھے مگر دونوں مدنی سرداروں نے اپنے محبوب اور زخمی رسول کی حفاظت کی طرف سے غفلت نہیں برتی تھی اور رات بھر وہ دونوں اپنی خستہ حالی کے باوجود اپنے ایک اور ساتھی حضرت اسید بن حضیر کے ساتھ آپ کے مکان کا پہرہ دیتے رہے تھے۔ کیونکہ خطرہ تھا کہ کہیں آپ پر شب خون نہ مارا جائے[۲۸۵] حمراء الاسد کی مہم کے دوران جب آپ وہاں خیمہ زن ہوئے تو اوس و خزرج کے ممتاز

سربرآوردہ اشخاص باری باری آپ کی حفاظت کے لئے پہرہ دیتے رہے تھے۔ ان میں سے چار حضرات سعد بن معاذ، عباد بن لبشر، عبید بن اوس اور قتادہ بن لغمان کا تعلق اوس سے تھا تو باقی تمین حضرات سعد بن عبادہ، حباب بن منذر اور اوس بن خولی کا تعلق خزرج سے تھا[۲۴۶] بعد کی اور مہموں جیسے ذات الرقاع، حدیبیہ، وادی القرا اور متعدد دوسرے غزوات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظ جاں نثاروں کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے۔

اس طبقہ جاں نثاراں میں سب سے عظیم شخصیت بلاریب حضرت عباد بن لبشر اوسی کی تھی۔ وہ اپنے محبوب رسول کی حفاظت کے لئے ہمیشہ تیار اور پیش پیش رہتے تھے۔ ان کا بار بار ذکر مآخذ میں اس سلسلہ میں ملتا ہے[۲۴۷] بقیہ دوسرے ممتاز حضرات کا ذکر پہلے ہی آچکا ہے لہٰذا ان کے ناموں کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہاں یہ بات کہہ دینے کی ضرورت ہے کہ دوسرے لوگوں نے بھی اپنے محبوب و مکرم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں کوئی دقیقہ نہیں فروگذاشت کیا تھا۔ انہوں نے بھی اسی محبت، خلوص اور جاں نثاری کے ساتھ آپ کی حفاظت کی تھی۔ ان کے اسمائے گرامی عموماً مآخذ نے محفوظ نہیں رکھے۔ پھر بھی بعض نام مل ہی جاتے ہیں مثلاً حضرت عمار بن یاسر مذحجی اور حضرت بلال بن رباح حبشی نے آپ کی متعدد مواقع پر محافظت کا خوشگوار فرض انجام دیا تھا[۲۴۸]

بہرحال جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ زیادہ تر محافظین کا تعلق اوس و خزرج کے قبیلوں سے تھا۔ جو نام مذکور ہوئے ہیں۔ ان میں آٹھ اوس کے ہیں اور چار خزرج کے اور ان اوسی اور خزرجی جاں نثاروں نے یہ سعادت مجموعی طور سے پندرہ مواقع پر حاصل کی تھی۔ جہاں تک اس طبقہ کے جاں نثاروں کے زمانۂ اسلام کا تعلق ہے تو یہ ظاہر ہے کہ وہ زیادہ تر ابتدائی مسلمان تھے۔ یا تو وہ ابتدائی مکی عہد کے مسلم تھے یا ابتدائی مدنی عہد کے۔ ذیل میں ایک مختصر سی جدول دی جا رہی ہے۔ تاکہ ان سے متعلق اعداد و شمار واضح ہو سکیں

علاقہ	قبیلہ	تقرریاں	افسر محافظ
مرکزی عرب	۱۔ اوس	۱۰	۶
	۲۔ خزرج	۵	۴
جنوبی عرب	۱۔ مذحج	۱	۱
غیر عرب مسلم	۱۔ حبشی	۱	۱
میزان	۴ طبقات	۱۷	۱۲

خلاصۂ بحث

تاریخی نقطہ نظر سے مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کا قیام وارتقا ایک عظیم تہذیبی سنگ میل تھا خاص کر اسلامی تاریخ میں۔ اس کے قیام، توسیع اور ارتقا میں خالص انسانی کوششیں اور جدوجہد کی کارفرمائی رہی تھی۔ یہاں مذہبی نقطہ نظر سے اہم عناصر جیسے

نصرت و توفیق الٰہی سے براہِ راست ہمیں بحث نہیں ہے۔ تاہم اس ضمن میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ نصرت غیبی اور توفیق الٰہی انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو اس کے راستے میں کوشش و جہد کرتے ہیں۔ قرآنی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ نصرت الٰہی جد و جہد کے ساتھ مشروط ہے اور خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی کہ جس کو خود اپنی حالت کے بدلنے کا احساس و خیال نہ رہا ہو۔ تاریخی تناظر میں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ مٹھی بھر انسانوں نے تیرہ برس تک مسلسل جد و جہد کی تھی۔ بے نظیر قربانیاں دی تھیں۔ بے مثال تگ و دو کی تھی۔ تب جا کر اس ریاست کی اوّل بنیاد فراہم ہوئی تھی اور یہ اولین بنیاد تھی اسلامی امت کی پھر مدینہ منورہ کے دس سالہ دور میں اسی امت اسلامی نے جد و جہد اور کوشش کی ایک نئی جہت نئی سمت تلاش کی تھی۔ اس دور میں مسلمانوں کی جد و جہد گوناگوں عناصر سے مرتب ہوئی تھی اور ان میں ایک اہم ترین عنصر فوجی تھا۔

بحث گذر چکی ہے کہ جغرافیائی سیاسیات اور سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات نے مدینہ منورہ کے مسلمانوں کو اپنی ایک فوجی تنظیم قائم کرنے پر مجبور کیا تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر ان کی زندگی محال اور اسلامی ریاست کا قیام ناممکن تھا۔ یہ اسلامی فوجی تنظیم ایک دن میں یا اچانک ایکدم سے وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ حالات و واقعات کے تقاضوں کے تحت رفتہ رفتہ وجود میں آتی اور ارتقاپذیر ہوتی رہی تھی۔ مختلف مرحلوں اور منزلوں سے گذرتی ہوئی وہ عہد نبوی کے آخری برسوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔

مدینہ میں مسلمانوں کی ریاست کے قیام کے بعد ارد گرد کے قبائل سے تعلقات قائم کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاسی مشن ترتیب دیئے۔ حالات اور حفاظت خود اختیاری کے تحت ان پرامن جماعتوں کی حیثیت فوجی بھی ہو گئی۔ یہ ابتدائی مہمیں تھیں۔ جن میں غزوات و سرایا دونوں شامل تھے۔ بنیادی طور سے ان کی حیثیت عسکری نہیں تھی لیکن مخالف عرب قبائل سے بالعموم اور قریشی اشرافیہ سے بالخصوص مسلح تصادم نے غزوات و سرایا کو صرف فوجی و عسکری نوعیت عطا کر دی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ایک خالص اسلامی عسکری تنظیم رفتہ رفتہ وجود میں آگئی اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس کے مختلف شعبے اور ان میں کام کرنے والے کارکن بھی وجود میں آئے۔

پیغمبر خدا ہونے کے ناطے محمد بن عبد اللہ ہاشمی صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی امت کے سربراہ تھے اور اس حیثیت سے عسکری تنظیم کے صدر بھی۔ آپ کے تمام اختیارات کا سرچشمہ آپ کی رسالت تھی۔ چنانچہ جنگ و صلح کا کلی اختیار صرف آپ کو حاصل تھا اُمتِ مسلمہ آپ کو مشورہ دینے کی مجاز تھی بلکہ اس سے مشورہ کرنا آپ کے لئے ضروری بھی تھا۔ مگر آخری فیصلہ صرف آپ کے ہاتھ میں تھا چنانچہ اس حیثیت سے اسلامی فوج کے واحد مستقل کمانڈر اور جنرل صرف آپ تھے اور تمام امت اسلامیہ کی بالغ مرد آبادی اسلامی فوج تھی جس پر آپ کے احکام کی تعمیل بہرصورت واجب و فرض تھی۔ اپنے انہیں اختیارات کے تحت آپ متعدد افسروں اور کارکنوں (امراء و عمال) کو مقرر فرماتے تھے۔ عسکری تنظیم میں اہم ترین عمال میں سرایا کے امراء ہوتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی کسی مہم کی قیادت کسی سبب سے بنفس نفیس کرنا نہیں پسند کرتے تھے تو اپنی جگہ اپنے کسی صحابی کو اس مہم کا قائد مقرر کر دیتے تھے۔ یہ قائد عارضی ہوتا تھا جس طرح کہ وہ مہم عارضی ہوتی تھی۔ وہ صرف اسی مہم کا قائد مقرر کیا جاتا تھا اور جونہی مہم پوری ہوتی تھی۔ قائد کی تقرری بھی یا عہدہ بھی ختم ہو جاتا تھا۔ اس طرح پورے مدنی دور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کل ۴۸ مہمیں بھیجی تھیں اور اتنی ہی تقرریاں کی

تھیں۔ مگر قائدین نبوی کی کل تعداد صرف ۴۹ رہی تھی۔ کیونکہ ان میں سے بعض نے ایک سے زیادہ مہموں کی قیادت کی تھی۔ ان میں دو صحابہ نے تین تین اور دو اور صحابہ نے چار چار مہموں کی قیادت کی تھی۔ حضرت زید بن حارثہ کلبی مولائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آقا و مولا کے بعد سب سے زیادہ یعنی بہ اختلاف روایت تیرہ یا گیارہ مہموں کی کمان کی تھی اور ہر ایک میں سرخرو رہے تھے۔ تقرری کا معیار صلاحیت و لیاقت تھی جس کے لیے حالات و زمانہ کی رعایت بھی کی جاتی تھی عموماً امراء سرایا کی تقرریوں میں تمام مسلم طبقات اور ان کے علاقوں کو مدنظر رکھا گیا تھا۔ لیکن فطری طور سے مرکزی عرب کے قبائل۔ قریش اور انصار۔ کو زیادہ مناصب اور عہدے ملے تھے کہ وہی اسلامی امت کی ریڑھ کی ہڈی تھے۔ جہاں تک ان قائدین نبوی کی مہموں کی عددی طاقت کا تعلق ہے تو وہ مختلف عناصر کی بنیاد پر طے ہوتی تھی۔ ان میں دشمن و مخالف قبیلہ کی طاقت، خطرہ کی نوعیت اور مدینہ سے جائے فتنہ و فساد کی مسافت اہم ترین عناصر تھے۔ متعدد قریشی، انصاری اور بدوی عرب مسلمانوں نے ۱۲ بڑی مہموں کی قیادت کی تھی تاہم عددی لحاظ سے سب سے طاقتور مہموں کی قیادت کی سعادت حضرت زید بن حارثہ اور ان کے فرزند اسامہ یعنی ایک مولیٰ اور مولیٰ زادہ کے نصیب میں آئی تھی۔ یہ اس بات کا مزید ثبوت تھا کہ صلاحیت اور صرف صلاحیت قائد کے منصب پر تقرری کا معیار و کسوٹی تھی، خاندانی شرافت اور نجابت نہیں تھی۔ مہموں کی روانگی سے قبل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم امراء سرایا کو عام فوجی اور اخلاقی ہدایات دیتے تھے مگر اپنی مہموں کے سلسلے میں امراء سرایا کو مکمل آزادی اور خود مختاری حاصل ہوتی تھی۔ امراء کو یا ان کے سپاہ کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ وہ مال غنیمت میں برابر کے حصہ دار ہوتے تھے۔ امراء سرایا کی یہ تقرریاں ہجرت نبوی کے چھ ماہ بعد شروع ہوئی تھیں اور حیات نبوی کے آخری لمحہ تک برابر جاری تھیں۔

تمام بڑی اہم مہموں کی قیادت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس کی تھی۔ اصطلاح میں ان کو غزوات کہتے ہیں اور روایات کے مطابق ان کی کل تعداد ۲۸ تھی۔ ایک غزوہ کی عددی طاقت ۱۰ تھی اور ایک اور کی ایک سو پچاس اور دو سو کے درمیان، پانچ غزوات میں مسلم سپاہ کی تعداد دو سو تھی جبکہ اتنے ہی غزوات میں تین سو سے چار ساڑھے چار سو تک، چار اور غزوات میں چھ سات سو مسلم سپاہ تھی اور ایک ڈیڑھ ہزار سپاہ پر مشتمل پانچ غزوات تھے۔ باقی غزوات میں مسلم سپاہ کی تعداد تین ہزار سے لیکر تیس ہزار تک تھی غزوات میں کثرت سپاہ کے سبب اور دوسرے فوجی اسباب سے بھی ان کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ عرب فوجی روایات کے مطابق ایک مسلم فوج کے پانچ حصے۔ مقدمہ، میمنہ، قلب، میسرہ اور ساقہ۔ ہوتے تھے۔ اس لیے وہ خمیس کہلاتی تھی۔ اپنے نظام و تنظیم کے سبب اسے تعبیہ بھی کہتے تھے۔ مسلم فوج کے ہر بازو یا حصہ کا ایک سالار بھی ہوتا تھا اور وہ سالار اعظم یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماتحت ہوتا تھا۔ طریق جنگ صف آرائی کے نظام پر مبنی تھا۔ جو عربوں نے اسلام سے کچھ قبل عجم سے مستعار لیا تھا اور عموماً غزوات نبوی اور بالخصوص جم کر لڑی جانے والی جنگوں میں عربوں کا پرانا طریق جنگ الکرّ والفرّ (حملہ کرنا اور پلٹ جانا) ترک کر دیا گیا تھا۔ جم کر لڑنے کو اصطلاحاً زحف بھی کہا جاتا تھا۔ یہ طریق جنگ اور خمیس نظام دونوں لازم و ملزوم تھے اور دونوں ہی شروع سے موجود تھے۔ چنانچہ بدر سے اس کی مثالیں ملنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ یہ نظام خمیس مکمل و منظم ہو گیا تھا اور بعد کی جنگوں اور غزوات میں مکمل طور سے موجود رہا تھا۔ غزوات کے نتیجہ میں اسلامی ریاست کے حدود اور رقبہ میں

کافی اضافہ ہوا تھا اور وہ ایک شہری ریاست سے ترقی کر کے ملک گیر ریاست بن گئی تھی۔

اسلامی عسکری تنظیم میں محافظ فوج (الحرس) ایک اہم شعبہ تھا۔ یہ محافظ فوج مختلف طرح کی ہوتی تھی۔ ایک قسم وہ تھی، جو جنگی زمانے میں یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ سے غیر حاضری کے زمانے میں شہری ریاست کے صدر مقام کی حفاظت کے لئے تعینات کی جاتی تھی چنانچہ بدر، احد، حمراء الاسد، خندق وغیرہ متعدد مواقع پر اس محافظ فوج کے حوالے مآخذ میں ملتے ہیں اسکے علاوہ محافظ فوج کی ایک قسم وہ ہوتی تھی جو دوران مہم مسلم فرودگاہ کی حفاظت کرتی تھی۔ ہم اس کو شب بیدار محافظ فوج بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ عموماً اس کی ضرورت رات کی تاریکی میں پڑتی تھی۔ یہ محافظ فوج کبھی ایک پورا دستہ ہوتی تھی اور کبھی چند افراد پر مشتمل ہوتی تھی۔ خطرہ نہ ہونے کی صورت میں ایک دو محافظ کافی سمجھے جاتے تھے۔ عموماً مہم کا سالار مسلم فرودگاہ کا سالار بھی ہوتا تھا لیکن کبھی کبھی سالار اعظم اپنا جانشین بھی مقرر کر دیتے تھے۔ تبوک کے غزوہ کے دوران حضرت ابوبکر صدیق نائب سالار اعظم نظر آتے ہیں۔

عرض یا لشکر کا معائنہ اسلامی فوجی تنظیم کا ایک اہم پہلو تھا مستقل فوج نہ ہونے کے سبب عرض وقتاً فوقتاً نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے عموماً وہ مجاہدین کے اکٹھا ہونے کے بعد یا کوچ کے دوران یا جنگ شروع ہونے سے پہلے کیا جاتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس خدمت کے لئے کسی صحابی کو مامور فرما دیتے تھے جو افسر عرض ہوتا تھا۔ متعدد افسروں کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید بن ثابت خزرجی جنگ خندق کے بعد سے مستقل افسر عرض مقرر کر دیئے گئے تھے کیونکہ وہ ریاضی و حساب کے ماہر صحابی تھے۔

جہاں تک اسلامی فوج کے دستوں (ڈویژن) کا تعلق ہے وہ بنیادی طور سے پانچ ہوتے تھے۔ پیادہ دستے (المشاۃ) شہسوار دستے (الخیل) تیراندازوں پر مشتمل دستہ (الرماۃ) ہتھیاروں سے مسلح دستہ (اھل السلاح) اور سامان رسد و اسباب کا نگران دستہ (اھل الوشۃ) بعد میں منجنیق اور دبابہ کو چلانے والا بھی دستہ خیبر کی مہم سے بڑھ گیا تھا۔ نقل و حمل کے لئے عربوں میں واحد ذریعہ اونٹ تھے۔ ابتداء میں اسلامی فوج صرف پیدل سپاہ پر مشتمل ہوتی تھی اور اس میں شہسوار بالکل نہیں تھے۔ احد کی جنگ سے شہسواروں کی تعداد میں اضافہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے، جو خندق اور فتح مکہ کی مہم میں کافی تناسب رکھتا تھا۔ خندق میں تین ہزار سپاہ میں سے پانچ سو یعنی ⅙ حصہ اور فتح مکہ میں دس ہزار سپاہ میں سے ڈھائی ہزار یعنی ¼ حصہ شہسوار تھا جو غزوہ تبوک میں بڑھ کر ⅓ یعنی تیس ہزار سپاہ میں سے دس ہزار شہسوار ہو گیا تھا۔ شہسوار فوج کے اس روز افزوں ارتقا میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی حکمت کا اصل حصہ تھا اور آپ نے ہر ممکن طریقہ سے شہسواروں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسلامی دستوں کی ایک نمایاں خصوصیت اس دور میں یہ تھی کہ وہ قبائلی خطوط پر مرتب و منظم ہوتے تھے۔ یعنی متعدد مسلم قبائل اپنے دستے جمع کرتے تھے جن سے اسلامی فوج بنتی تھی۔ ہر قبائلی دستہ اپنے قبائلی سردار کی ماتحتی میں ہوتا تھا۔ لیکن یہ تمام سردار اسلامی فوج کے سالار اعظم کے احکامات کے پابند ہوتے تھے۔ ابتداء میں اور چھوٹی مہموں میں صرف تین دستے ہوتے تھے۔ ایک مہاجرین کا اور باقی دو انصار کے دو قبیلوں اوس و خزرج کے۔ لیکن پھر بعد میں اور بڑی مہموں میں عرب قبائل کے دستے بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس قسم کی مہمیں عام طور سے خندق، حدیبیہ، خیبر، فتح مکہ اور تبوک تھیں۔ قبائلی کردار کے باوجود اسلامی عسکری تنظیم میں مرکزیت اور اجتماعیت پیدا ہونے لگی تھی کیونکہ سالار اعظم کا حکم سب کے لئے واجب التعمیل تھا۔ فتح مکہ کے بعد صوبائی فوجی تنظیم بھی ابھرنے لگی تھی۔ کیونکہ وقت ضرورت مرکز سے فوجوں کے

آنے میں تاخیر ہونے کے سبب صورت حال بگڑ سکتی تھی۔ چنانچہ یمن وغیرہ دور دراز کے صوبوں میں صوبائی فوج جو مرکزی مسلمانوں کے علاوہ بیشتر علاقائی مجاہدین پر مشتمل ہوتی تھی بنائی گئی تھی اور اس صوبائی فوج کا افسر اعلیٰ عموماً گورنر / والی ہوتا تھا۔ مگر بعض حالات میں ایک خاص فوجی افسر اعلیٰ بھی مقرر کیا جاتا تھا۔ جو گورنر کا ماتحت ہوتا تھا۔

اسلامی عسکری تنظیم نے جاہلیت کے عربوں سے علم / پرچم اور علمبرداروں کی روائت بھی ترکہ میں پائی تھی۔ فوجی پرچم عزت و آبرو کا نشان ہوتا تھا اور مہموں کے دوران اس کا علمبردار ہونا افتخار کا معاملہ تھا۔ عرب روایت کے مطابق پرچم بردار ہونا کسی ایک قبیلہ کا حق ہوتا تھا۔ لیکن اسلام نے اسے کسی طبقہ کا جاگیری حق نہیں بننے دیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مسلم قبائلی دستوں کو پرچم عطا فرماتے تھے اور ایک پرچم اسلامی ریاست کی نمائندگی کے لیے ہوتا تھا۔ جو عموماً کسی عظیم صحابی کو عطا کیا جاتا تھا۔ عام پرچم کو لواء اور خاص پرچم کو رایہ کہتے تھے۔ لیکن لباا وقات یہ فرق زیادہ ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ سرایا میں عموماً ایک ہی پرچم ہوتا تھا۔ لیکن غزوات میں کم از کم تین یا اس سے زیادہ ہوتے تھے۔ ان پرچموں کے علمبردار افسر ہوتے تھے۔ جو پہلی مہم سے آخری مہم تک برابر مقرر ہوتے رہے تھے ان کا عہدہ عارضی ہوتا تھا اور بعض علمبرداروں کو یہ سعادت بار بار ملی تھی۔ حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کو کم از کم دس مہموں میں علمبرداری کا افتخار ملا تھا۔ اندازہ یہ ہے کہ دو تین سو پر مشتمل دستہ کو ایک علم عطا کیا جاتا تھا۔

ان افسروں کے علاوہ متعدد کارکن بھی اسلامی فوجی تنظیم کا ناگزیر حصہ تھے۔ ان میں طلیعہ (گشتی دستے) کے سپاہی اور افسر ہوتے تھے۔ طلیعہ عموماً ایک جماعت ہوتی تھی جو دو تین افراد سے لیکر بیس سپاہیوں تک مشتمل ہوتی تھی اور ان کا ایک سالار ہوتا تھا طلیعہ فوج کا ایک حصہ ہوتا تھا جو ضروری اطلاعات فراہم کرنے کی غرض سے بھیجا جاتا تھا۔ وہ دن میں کھلم کھلا کام کرتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ جاسوسوں (عیون) سے مختلف ہوتے تھے۔ جاسوس عموماً ایک یا دو کر کے بھیجے جاتے تھے اور وہ خفیہ طور سے کام کرتے تھے۔ دونوں کا کام اطلاعات فراہم کرنا اور دشمن کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہوتا تھا۔ تمام مسلم مہموں میں چاہے وہ سرایا ہوں یا غزوات طلیعہ اور جاسوسوں نے کام کیا تھا اور بڑی حد تک ان کی وجہ سے اسلامی افواج کو کامیابی ملی تھی۔ اس طرح تمام مسلم مہموں میں لازمی طور سے راہبر (دلیل) کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں کہ ان کے سبب نہ صرف منزل مقصود پر پہنچنا یقینی ہو جاتا تھا۔ بلکہ گمشدگی کا خطرہ جاتا رہتا تھا اور مختصر سے وقت میں مختصر سے راستے کے ذریعہ اچانک دشمن کے سر پر پہنچا جا سکتا تھا۔ راہبروں کا تعلق عام طور سے بدوی قبائل سے ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ جغرافیائی حالات سے واقف ہوتے تھے اور ان کی خدمات فریقین میں سے کوئی بھی معاوضہ پر حاصل کر سکتا تھا۔

اسی طرح اسلامی عسکری تنظیم میں افسروں کی ایک قسم وہ ہوتی تھی جو اموال غنیمت اور قیدیوں کے لیے مقرر کئے جاتے تھے کبھی کبھی ان دونوں کے لئے ایک ہی افسر کافی سمجھا جاتا تھا۔ اور کبھی الگ الگ اموال غنیمت اور قیدیوں کے افسر مقرر ہوتے تھے۔ بعض اوقات غنیمت میں خمس کے لئے علیحدہ اور مسلمانوں کے حصوں کے لئے الگ افسر مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ ان کی نگرانی کے افسر ہوتے تھے۔ تقسیم اموال غنیمت کے افسر الگ ہوتے تھے۔ خیبر کی مہم کے زمانے سے حضرت زید بن ثابت خزرجی تقسیم اموال غنیمت کے مستقل افسر ہو گئے تھے۔ اس قسم کے افسروں کا تقرر غزوات اور سرایا دونوں کے لئے ہوتا تھا۔ کبھی سرایا کے لیے یہ تقرری خود رسول مقبول

صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اور کبھی کبھی اس کو امیر سریہ کی صوابدید پر چھوڑ دیتے تھے۔ اسی طرح اسلحوں اور گھوڑوں کے لئے بھی الگ الگ افسر مقرر کئے جاتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی اموال غنیمت کا افسر صاحب المغانم ہی ان دونوں کا افسر بھی ہوتا تھا۔ مسلم سلاح خانے یا ذخیرہ حربی کی ترقی کے ایک مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداء میں مسلمان فوج کے پاس ہتھیار خاصے کم تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان میں اضافہ ہوتا رہا۔ ان میں کچھ تو اضافہ مال غنیمت میں حاصل شدہ ہتھیاروں کے سبب ہوا تھا لیکن زیادہ تر وہ مسلمانوں کی خرید اور عطیہ کا مرہون منت تھا۔ مسلم عسکری تنظیم کا آخری کارکن محافظ جسم دستہ اور اس کے سپاہی ہوتے تھے جو اپنے سالار اعظم یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی حفاظت کرتے تھے۔ خاص کر مہموں کے دوران یا زمانہ جنگ میں اس شعبہ میں امتیاز مدینہ کے انصار قبیلوں خاص کر اوس کو حاصل تھا جنہوں نے بیعت عقبہ ثانیہ میں کئے گئے وعدہ کو پوری طرح سے وفا کیا تھا کہ یہی شرط محبت تھی

اسلامی عسکری تنظیم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے مختلف قبیلوں اور علاقوں کے عربوں میں ایک فوجی و عسکری اتحاد پیدا کر دیا تھا اور ان کے اندرونی قبائلی اور علاقائی اختلافات کو بھلا کر ان کو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ایک متحد و منظم فوج میں ڈھال دیا تھا۔ جن کا واحد نصب العین اپنی اسلامی ریاست کا دفاع اور ارتقاء تھا۔ مادی لحاظ سے یہی اسلامی عسکری تنظیم تھی جس نے مدینہ کی شہری ریاست کے اندرونی دشمنوں خاص کر مدینہ کے یہودی قبائل کی سرکوبی و بیخ کنی کی تھی اور اس کے نتیجہ میں ریاست کی حدود و رقبہ میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔ پھر اسی فوجی تنظیم نے اردگرد کے قبائل کی طاقت کو توڑا تھا۔ اور ان کو اسلامی ریاست یا اسلامی امت کا رکن بنایا تھا۔ شمال میں یہودی قبیلوں اور عیسائی مملکتوں اور آزاد جنگجو قبیلوں کو اس قدر مرعوب و دہشت زدہ کیا تھا کہ انہوں نے عراق و شام میں متمکن ایرانی اور رومی آقاؤں سے منہ پھیر کر اسلامی ریاست کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کرلی تھی۔ مگران سب سے بڑھ کر اسی فوجی طاقت نے عرب کی سب سے بڑی فوجی قوت اور منظم اشرافیہ۔ قریش مکہ۔ کا کس بل نکال دیا تھا اور بالآخر اس کو اسلامی ریاست کا ایک ماتحت و محکوم حصہ بنا دیا تھا۔ فتح مکہ کے بعد پورا جنوبی اور مشرقی عرب اسلام اور اسلامی پرچم کے تلے آگیا تھا لہٰذا یہ بلاخوف و خطر کہا جا سکتا ہے۔ کہ اگر اسلام نے دلوں کو فتح کر کے اسلامی ریاست و امت کی داغ بیل ڈالی تھی۔ تو اسلام کی عسکری تنظیم نے انسانی جسموں کو فتح کر کے ان کی گردنوں میں اطاعت کے حلقے ڈالے تھے اور اسی کی بدولت شمال میں حدود شام سے جنوب میں عدن تک اور مغرب میں بحر احمر سے مشرق میں خلیج فارس وحدود ایران و عراق تک پورا کفرستان عرب لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی روح پرور صداؤں سے گونجنے لگا تھا۔

———

اسلامی ریاست کا شہری نظم و نسق

ایک دہائی کی مدت سے کم عرصے میں مدینہ منورہ کی شہری ریاست ترقی کر کے مسلمانوں کی قومی ریاست بن گئی تھی اگرچہ وہ عربوں کے قبائلی نظام پر استوار ہوئی تھی لیکن جلد ہی وہ ایک مرکزی سلطنت اور حکومت کی شکل میں ارتقاء پذیر ہوئی یہ عربوں کے لیے ایک بالکل نیا سیاسی تجربہ تھا اس سے پہلے پورا جزیرہ نمائے عرب کبھی بھی کسی ایک مرکزی اقتدار کے تابع اور محکوم و مطیع نہیں رہا تھا۔ اگرچہ عربوں کی فطری مرکزیت مخالف فطرت ان کو ہمیشہ کسی غیر کے اقتدار بلکہ مرکزی حکومت کے تصور کے خلاف بھی اکساتی اور بغاوت پر آمادہ کرتی رہتی تھی۔ لیکن نئے دین ——— یعنی اسلام ——— نے ایک سیاسی آئیڈیالوجی کے بطور ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرکزی طاقت و اقتدار کے سامنے اپنے سر خم کرنے کی ضرورت کا قائل بنا دیا تھا۔ دراصل اسلام کی مذہبی اجتماعیت کے تصور نے مسلم قوم ہونے یا اسلامی قومیت کے تصور کو جنم دیا تھا۔ ایک دین سے وابستگی اور اس کے نتیجہ میں برادرانہ اخوت نے علاقہ، قبیلہ، وطن، رنگ، نسل اور زبان وغیرہ کے امتیازات کو مٹا دیا تھا اور پورے جزیرہ نمائے عرب کے مسلمان ایک دوسرے کو اپنا اسلامی بھائی سمجھتے تھے اور اسی احساس و ادراک اخوت نے ان کو ایک قوم بنا دیا تھا۔ عربوں یا دوسری تہذیبوں کے معاشرتی اصولوں اور بنیادوں ——— نسل، وطن، رنگ ——— کی جگہ اسلام نے اپنی معاشرت کی بنیاد مذہب پر رکھی تھی اور خون کے رشتہ کی جگہ مذہبی تعلق نے لے لی تھی۔ اس انقلاب آفریں معاشرتی تصور نے ہی مدینہ کی اسلامی ریاست کو ایک قومی ریاست میں تبدیل کر دیا تھا جس سے تمام مسلمانوں کو جذباتی وابستگی اور روحانی محبت تھی۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے دین و دنیا کے فرق کو مٹا کر اسلام اور اسلامی ریاست کو ایک دوسرے کا مترادف بنا دیا تھا۔ اسلامی ریاست کی خدمت، دراصل اسلام کی خدمت تھی کیونکہ دین و ریاست دونوں توام تھے، اور ان دونوں کے سربراہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

اسلامی سیاسی تصور کے مطابق اسلامی ریاست کا حاکم حقیقی اور مقتدر اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ ہیں اور انہی کے احکام و مرضی کے مطابق اسلامی ریاست کو چلایا جاتا تھا۔ یہ احکام و مرضی کچھ تو اس کی نازل کردہ کتاب میں موجود تھی اور کچھ کا مہبط و ماویٰ و امین قلب محمدیؐ تھا جس سے وہ جب عمل میں منتقل ہوتی تو سنت محمدیؐ میں ڈھل جاتی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر مرضیٔ الٰہی اور احکام خداوندی کو اور کون جاننے اور سمجھنے اور تعبیر کرنے والا تھا۔ لہٰذا فطری بات تھی کہ اس کائنات رنگ و بو میں آپ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور اس حیثیت سے مملکت اسلامی کے جانشین حاکم خداوندی تھے۔ خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے آپ کو تمام مذہبی اور سیاسی اختیارات حاصل تھے۔ سیاسی اختیارات میں قانون سازی، انتظامیہ، عدلیہ اور فوجی اختیارات شامل تھے۔ بشریت کے سبب اور ایک ریاستی نظم و نسق اور انتظامیہ بنانے کی غرض سے بھی آپ اپنے بہت سے اختیارات کو ثانوی طور سے اپنے بہت سے صحابہؓ کو

منتقل کر دیتے تھے اور ان کو مختلف عہدوں اور منصبوں پر مقرر کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ کارکن، عارضی ہوں یا مستقل، آپ کی مرضی اور پسندیدگی کی ہی صورت میں اپنے مناصب پر برقرار رہ سکتے تھے اور اس اعتبار سے وہ آپ کے ماتحت و محکوم تھے۔

آپ کے شہری نظم و نسق میں مرکزی، صوبائی یا علاقائی اور مقامی تنظیمی و انتظامیہ کے کارکن شامل تھے۔ ذیل کے صفحات میں ہم عہد نبوی کے شہری نظم و نسق کے تاریخی ارتقاء سے بحث کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے یہ نکتہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ عہد نبوی میں بلکہ قرون وسطیٰ کی تمام سیاسی تنظیموں میں شہری، فوجی، عدلیہ وغیرہ کے شعبوں کی تقسیم نہیں تھی۔ یہ تقسیم ہم اپنی آسانی کے لئے کرتے ہیں۔ تاکہ حکومت کے مختلف شعبوں کے تاریخی ارتقاء اور ان کی کارکردگی کو سمجھا اور اجاگر کیا جا سکے۔ ہر لحاظ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مرکزی حکومت کے شہری نظم و نسق سے بحث کی جائے۔

مرکزی شہری نظم و نسق

اگرچہ تمام سیاسی اختیارات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک میں مرکوز تھے۔ تاہم آپ اپنی مدد، بہتر نظم و نسق اور انتظامیہ کے ارتقاء کے لئے اپنے متعدد صحابہ کو حکومت کے کاروبار میں شریک کرتے تھے۔ اس سلسلے میں جن منتظمین اور کارکنوں، عمال اور افسروں کے حوالے ماخذ میں ملتے ہیں۔ ان میں خلفاء و نائبین نبوی، مشیروں، سکریٹریوں (کاتبین) سفیروں (رسل) مخصوص کاموں کے افسروں، شاعروں (شُعَرَاء) خطیبوں (خُطَبَاء) کے علاوہ متعدد کم درجہ کے کارکنوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے وقار و افتخار کے لحاظ سے سب سے ممتاز منصب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء کا تھا۔ لہٰذا اسی سے بحث کا آغاز کیا جاتا ہے۔

۱۔ مدینہ منورہ میں خلفاء (نائبین) رسول

جب کبھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی ضرورت سے مدینہ منورہ کے باہر تشریف لیجاتے تھے تو اپنا ایک جانشین شہر میں چھوڑ جاتے تھے۔ اگرچہ عام تصور یہ ہے کہ یہ جانشین رسول نماز کی امامت کے لئے مقرر کیا جاتا تھا۔ کیونکہ عموماً ماخذ اس کے لئے فقرہ علی الصَّلٰوۃ (نماز پر کے لئے) استعمال کرتے ہیں۔ اس سے یہ غلط فہمی رائج ہو گئی کہ آپ کی غیر موجودگی میں نائب و خلیفہ رسول صرف امام نماز ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ تصور صحیح نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ماخذ میں ان کو آپ رسول کے فرائض و اختیارات کی صراحت کہیں نہیں ملتی ہے۔ مگر ماخذ اس جانشینی کے جو لفظ استعمال کرتے ہیں وہ بڑا معنی خیز ہے۔ عام طور سے جانشین کے لفظ خلیفہ اور جانشینی کے لئے اِستَخلَفَ (جانشین بنایا) یا اس کا مضارع یَستَخلِفُ (جانشین بناتے ہیں) استعمال کیا جاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں اصطلاحات ہیں جن کے مخصوص اور وسیع معنیٰ ہیں۔ تاریخی شواہد سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ جانشین رسول محض نماز کے لئے آپ کا نائب نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ آپ کا بحیثیت سربراہ مملکت کے جانشین و خلیفہ ہوتا تھا اور وہ آپ کی غیر موجودگی میں مدینہ میں موجود و مقیم امت مسلمہ کی فلاح و بہبود اور ریاست اسلامی کے مفادات کا نگران ہوتا تھا وہ اصطلاحی معنی میں خلیفۃ الرسول یعنی آپ کا سیاسی جانشین ہوتا تھا۔ نماز پر تقرری یا نیابت کی اصطلاح بڑے وسیع معنیٰ اور مفہوم کی حامل تھی اور عہد خلافت

راشدہ بالخصوص عہد فاروقی میں گورنروں (ولاۃ : والی) کی تقرری کے لیے بھی یہی فقرہ استعمال ہوتا رہا تھا۔ جو دراصل عہد نبوی کی میراث تھی[۱]۔ کیونکہ نماز دین کا اہم ترین ستون اور نماز کی امامت امت مسلمہ کی امامت کے مترادف و ہم معنی تھی۔ اس شعبۂ انتظامیہ کے تاریخی ارتقاء سے نائبین رسول کے مقام و مرتبے، اختیارات و فرائض اور کارکردگی کا بخوبی علم ہوگا۔

پہلے دو غزوات وَدّان اور بُواط میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالترتیب خزرج اور اوس کے قبائلی سرداروں حضرات سعد بن عبادہ[۳] اور سعد بن معاذ[۴] کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ دو مقامی سربرآوردہ مسلمانوں اور قبائلی سرداروں کی یکے بعد دیگرے تقرری آپ کی سیاسی دوراندیشی اور انتظامی حکمت عملی کی دلیل تھی۔ اس طرح آپ نے شعوری یا غیر شعوری طور سے نہ صرف مدینہ کے دو اہم ترین اور طاقت ور ترین مسلم طبقات کو ریاستی و حکومتی معاملات میں شریک و سہیم ہونے کا احساس دلایا تھا۔ بلکہ ان کی وفاداری اور محبت بھی حاصل کر لی تھی۔ اس منصب جلیل پر تیسری تقرری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مولا و محبوب صحابی حضرت زید بن حارثہ کلبی کی ہوئی تھی[۵]۔ حضرت زید کی تقرری کو وسیع تر تاریخی تناظر اور پیچیدہ تر سماجی پس منظر میں دیکھنا چاہیئے وہ ایک طرف تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روز افزوں سیاسی طاقت کی دلیل تھی تو دوسری طرف اسلامی امت میں موالی (غیر عرب مسلمانوں) کی سماجی قدر و منزلت بلکہ اسلامی مساوات کی ایک روشن مثال تھی۔ جیسا کہ گذشتہ باب میں حضرت زید اور ان کے فرزند جلیل کے تقرر کے بارے میں تفصیل کے ساتھ کہا جا چکا ہے۔ یہ تقرری یہ بھی ثابت کرتی تھی کہ حکومتی عہدے اور ریاستی مناصب کے لئے صلاحیت و لیاقت ہی واحد بنیاد تھی، خاندانی قبائلی یا علاقائی اسباب و عناصر نہیں[۶]۔ بہر حال پہلے قریشی صحابی جنہیں یہ اعزاز حاصل ہوا تھا حضرت ابو سلمہ بن عبد الاسد مخزومی تھے۔ جنہوں نے اسی برس غزوہ ذات العشیرہ کے دوران غیبت نبوی میں آپ کی جانشینی کا شرف حاصل کیا تھا[۷]۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مکہ کے قریش کے درمیان مسلح تصادم کے دوران جانشینانِ رسول کی تعداد اور طریق تقرری کے بارے میں مآخذ میں اختلاف نظر آتا ہے۔ ابن اسحاق اور ان کے جامع ابن ہشام کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن ام مکتوم کو اس عہدہ پر سرفراز فرمایا تھا لیکن بعد میں کچھ مصالح کے پیش نظر آپ نے ان کی جگہ حضرت ابو لبابہ بشیر بن عبد المنذر خزرجی کی تقرری فرمادی تھی اور ان کو آپ نے بدر کی طرف اپنے کوچ کے دوران روحاء نامی مقام سے واپس بھیجا تھا کہ وہ حضرت ابن ام مکتوم کی جگہ لیں[۸]۔ جبکہ بعض دوسرے مآخذ کا خیال ہے کہ حضرت ابو لبابہ نے جس نائب رسول کی جگہ سنبھالی تھی وہ حضرت ابن ام مکتوم نہیں تھے بلکہ حضرت عاصم بن عدی اوسی تھے۔ لیکن ان تمام مآخذ کا اتفاق ہے کہ غزوہ بدر کے دوران دوسرے نائب رسول حضرت حارث بن حاطب تھے۔ جن کو شہر کے بالائی حصے (العالیہ) کے لوگوں کی دیکھ بھال کا فریضہ سپرد کیا گیا تھا[۹]۔ دوسری طرف ابن سعد کی روایت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر کم از کم تین حضرات کو شہر کے تین مختلف حصوں کی ذمہ داری سونپی گئی تھی: حضرت ابو لبابہ کو خاص شہر مدینہ کی، حضرت عاصم بن عدی عجلانی کو شہر کے بالائی علاقے (العالیہ) کی، اور حضرت حارث بن حاطب (بنو عمرو بن عوف) کو اپنے قبیلہ کے علاقے کی "کیونکہ ان کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ خبریں سننے کو ملی تھیں"! بہر حال اس کے بعد حضرت ابو لبابہ کو اس عہدۂ عظیم پر ۶۲۴ء کے وسط (۲ھ کے اواخر) میں "غزوات بنو قینقاع اور سویق" کے دوران دو مزید تقرریوں کی سعادت ملی تھی اور اس طرح ان کو مجموعی طور سے یہ سعادت تین بار حاصل ہوئی تھی۔

امراء وعمال نبوی کے اس شعبہ میں سب سے نمایاں شخصیت بلاریب حضرت ابن ام مکتوم کی تھی۔ صحابی موصوف کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ نابینا تھے مگر اس خلقی کمزوری کے باوجود انہوں نے بارہ یا تیرہ[12] مواقع پر خلافت رسول کی سعادت حاصل کی تھی۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ حضرت ابن ام مکتوم کی پہلی تقرری بدر کے غزوہ کے دوران ہوئی تھی اگرچہ وہ عارضی رہی تھی اور ان کو دوسرے جانشین رسول کے حق میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ بہر حال چار ماہ بعد غزوہ الکدر کے موقع پر ان کی دوسری تقرری عمل میں آئی تھی ربیع الاول ۳ھ / ستمبر ۶۲۴ء میں ایک غزوہ کے سوا جب حضرت عثمان بن عفان اموی کو یہ سعادت ملی تھی[13] حضرت ابن ام مکتوم کی جمادی الاولیٰ ۳ھ / اکتوبر ۶۲۴ء تا شوال ۳ھ / مارچ ۶۲۵ء تک تین متواتر مواقع پر اس عہدہ جلیل پر تقرری ہوتی رہی تھی جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوات بحران، احد اور حمراء الاسد کے زمانے میں شہر سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ پھر ایک مختصر سے عرصے کے بعد ان کی چھٹی تقرری غزوہ بنو نضیر کے زمانے میں ہوئی تھی۔ اس کے دوسرے برس کے دوران چار دوسرے صحابہ کرام حضرات عبداللہ بن رواحہ خزرجی[14]، عثمان بن عفان اموی[15]، سباع بن عرفطہ غفاری[16] اور زید بن حارثہ کلبی کی بالترتیب اتنے ہی غزوات کے دوران تقرریاں ہوئی تھیں۔ ان کے بعد حضرت ام مکتوم کی تقرریوں کا ایک سلسلہ دراز تھا جو ذی قعدہ ۴ھ / اپریل ۶۲۶ء سے محرم ۷ھ / مئی ۶۲۸ء تک وسیع تھا اور جس کے دوران انہوں نے پانچ غزوات۔ خندق۔ بنو قریظہ، لحیان، غابہ اور حدیبیہ کے زمانے میں متواتر نیابت رسول کی تھی۔ صحابی موصوف کی آخری تقرری رمضان ۸ھ / جنوری ۶۳۰ء میں فتح مکہ کے زمانے میں ہوئی تھی[18]۔ ماخذ کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے تیرہ مواقع پر یہ سعادت حاصل کی تھی۔ مگر تاریخی شواہد صرف بارہ کے لئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ماخذ کا دعویٰ کلی طور پر صحیح رہا ہو اور ایک موقع کی شہادت فراہم نہ کی جا سکی ہو۔ بہر حال اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ بڑی اہم تھی کہ ان کو اتنے کثیر مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتماد حاصل رہا تھا۔ یہ نکتہ اس حقیقت کے پس منظر میں اور بھی معنی خیز ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف جسمانی طور سے معذور تھے بلکہ قریش کے ایک غیر اہم خاندان بنو عامر بن لوئی سے متعلق تھے جو سیادت و قیادت کے لحاظ سے دوسرے درجہ کے خاندان بلکہ قریش البطاح کے باہر تصور کیا جاتا تھا۔ یہ بھی بہر حال ایک حقیقت ہے کہ اپنی تمام تر جسمانی اور خاندانی کم مائیگی کے باوجود وہ امت اسلامی کے اہم ترین افراد میں تھے۔ کیونکہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا غیر متزلزل اعتماد حاصل تھا اور اس سے بڑھ کر ان کی عظمت کا شاہد خود قرآن کریم بھی ہے۔

مرکزی انتظامیہ کے اس شعبہ میں دوسرے اہم اور نمایاں افسروں میں حضرت سباع بن عرفطہ غفاری کا ذکر خصوصی کرنا چاہیے وہ بعض جدید مورخین کے مطابق اگرچہ ایک نسبتاً چھوٹے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ تاہم ان کو خلیفہ رسول کے منصب عظیم پر تقرری کی تین بار سعادت ملی تھی۔ ان کی پہلی تقرری ربیع الاول۔ الثانی ۵ھ / اگست ستمبر ۶۲۶ء میں ہوئی تھی اور باقی دو صفر ۷ھ / جون ۶۲۸ء اور ذی الحجہ ۱۰ھ / مارچ ۶۳۲ء میں بالترتیب ہوئی تھیں[19] بنو غفار کے ایک اور فرد حضرت ابو رہم کلثوم بن حصین غفاری کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جن کو ذی قعدہ ۷ھ / مارچ ۶۲۹ء میں غزوہ عمرۃ القضیہ کے دوران یہ عہدہ عظیم ملا تھا[20]۔ اس عہدہ پر ایک اموی یعنی حضرت عثمان بن عفان کی دو بار تقرری کی خاص اہمیت ہے[21] بالخصوص اس حقیقت کے پس منظر میں کہ کسی ہاشمی کو یہ عہدہ پورے دور نبوی میں نہیں ملا تھا۔ غزوہ تبوک کے دوران حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کو صرف خاندان رسالت میں آپ کی جانشینی کا شرف ملا تھا[22]

جبکہ ریاست اسلامی کی سربراہی ایک اوسی صحابی حضرت محمد بن مسلمہ کے نصیب میں آئی تھی۔ یہ بھی اہم نکتہ ہے کہ بعض اہم ترین قریشی صحابہ کرام جیسے حضرات ابوبکر، عبدالرحمٰن بن عوف اور طلحہ، زبیر وغیرہ کو بھی اس شعبہ میں کوئی نمائندگی نہیں ملی تھی۔ نواب رسول کی علاقائی اور قبائلی نیز سال بسال تقرری کو بہتر طور سے سمجھنے کے لیے ذیل کی جدول کافی ہو گی۔

علاقہ	قبیلہ / خاندان	۶۲۳	۶۲۴	۶۲۵	۶۲۶	۶۲۷	۶۲۸	۶۲۹	۶۳۰	۶۳۱	۶۳۲	تقرریاں	خلفاء
مرکزی عرب ۱۔	قریشی	۱	۵	۴	۱	۴	۱	-	۱	-	-	۱۷	۳
(الف)	بنو امیہ	-	۱	-	۱	-	-	--	-	-	-	۲	۱
(ب)	عامر بن لوی	-	۴	۳	-	۲	۱	-	۱	-	-	۱۳	۱
(ج)	مخزوم	۱	-	۱	-	-	-	-	-	-	-	۲	۱
۲۔	خزرج	۱	-	-	۱	-	-	-	-	-	-	۲	۲
۳۔	اوس	۱	۵	-	-	-	-	-	۱	-	-	۷	۵
شمالی عرب ۱۔	کلب	۱	-	-	-	۱	-	-	-	-	-	۲	۱
مغربی عرب ۱۔	غفار	-	-	-	۱	-	۱	۱	-	-	۱	۴	۲
میزان	۵ قبیلے	۴	۱۰	۴	۳	۵	۲	۱	۲	-	۱	۳۲	۱۳

مذکورہ بالا جدول سے تمام حقائق از خود واضح ہو جاتے ہیں نیز گذشتہ باب میں اس موضوع پر خاصا کلام کیا جا چکا ہے لہٰذا اسے دہرانے کی مزید ضرورت نہیں رہتی۔ اس کی روشنی میں مذکورہ بالا جدول کی تشریح و تعبیر کی جا سکتی ہے۔ البتہ جہاں تک اس شعبۂ افسران کے زمانۂ قبول اسلام کا تعلق ہے تو تیرہ صحابہ کرام میں اکثر و بیشتر مکی دور کے سابقین اولین تھے اور باقی مدنی دور کے ابتدائی مسلمان۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان میں ایک دو کے سوا بقیہ سے کہیں زیادہ قدیم مسلم تھے۔ مگر ان کو ریاستی مناصب نہیں ملے تھے۔

۲۔ مشیرانِ نبوی (المشیرون)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام قسم کے "معاملہ میں مسلمانوں سے مشورہ کرنے" کا حکم دیا ہے[۲۴] مفسرین عظام نے معاملہ الامر کی تشریح میں مختلف قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن حکم خداوندی کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام ایسے امور میں جو امت مسلمہ کے اجتماعی مفادات سے متعلق ہوں، مسلمانوں سے مشورہ لینا ضروری قرار دیا گیا تھا۔ یہ امور سیاسی، سماجی، اقتصادی اور فوجی اور مذہبی تک ہو سکتے تھے۔ جہاں تک مذہبی معاملات کا تعلق ہے تو وحی الٰہی انکو وقتاً فوقتاً

طے کرتی رہتی تھی۔ مگر ایسا بھی ہوا ہے کہ بہت سے مذہبی معاملات خاص دین کے معاملات کے اسلامی امت میں نفاذ کا معاملہ مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے بھی طے پایا ہے۔ بہر حال مشورہ لینا اور صلاح کرنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ضروری ضرور تھا تاہم آخری فیصلہ آپ کے ہاتھ ہی میں ہوتا تھا۔ اور جب آپ عزم مصمم کر لیتے تھے تو پھر اسے امت مسلمہ کا اجتماعی فیصلہ بھی تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ اسی سے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اسلامی سیاسیات میں امیر المومنین یا سربراہ مملکت کو وسیع اختیار حاصل ہوتے ہیں اور وہ صرف مشورہ کا پابند ہوتا ہے۔ مگر اسے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار حاصل ہوتا ہے اور آخری فیصلہ کا وہ مجاز کل ہوتا ہے۔ بہر حال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، جیسا کہ مآخذ ثابت کرتے ہیں۔ تمام اہم اجتماعی امور پر قرآنی ہدایت کے مطابق مسلم صحابہ کرام سے مشورہ کرتے تھے جن میں ریاستی و حکومتی امور بھی شامل تھے۔ یوں تو عام مسلمانوں سے مشورہ کرنے کا حکم تھا۔ جس کے سبب ادنیٰ سے ادنیٰ مسلم مشورہ دینے کا مجاز تھا مگر بوجوہ معلوم ریاستی معاملات میں مشورہ ہر کس و ناکس کی بات نہ تھی۔ اس لئے ان تمام اہم امور پر جن میں سوجھ بوجھ، فہم و فراست اور معاملات کے ادراک کی ضرورت ہوتی تھی صرف عظیم ترین صحابہ کرام سے مشورہ کرتے تھے۔

عہد نبوی میں مسلم امت کے اکابر سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ و صلاح کرنے کی بیشتر مثالوں کا تعلق فوجی امور سے ہے اور اس طرح واقدی کے اس عام تبصرے کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ جنگ (حرب) کے معاملات میں آپ صحابہ کرام سے اکثر و بیشتر صلاح و مشورہ کرتے تھے۔[۲۵] جہاں تک شہادت مل سکی ہے کسی جنگی معاملہ پر مشورہ کا پہلا ثبوت غزوہ بدر سے تعلق رکھتا ہے۔ ابن اسحاق، واقدی، بخاری اور طبری وغیرہ متعدد مورخین اور سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ جوں ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکی خروج کی بدر کی جانب پیشقدمی کی خبر ملی۔ آپ نے اس اہم مسئلہ کو اپنے مشیروں کے حلقہ کے سامنے غور و خوض اور مشورہ کے لئے رکھا۔ مہاجرین میں سے حضرات ابو بکر، عمر اور مقداد بن عمرو خزاعی نے آپ کے منصوبہ کی بھرپور حمایت کی۔ جبکہ انصار میں سے حضرات سعد بن معاذ اوسی، سعد بن عبادہ خزرجی اور حباب بن منذر خزرجی نے انصار کی طرف سے آپ کو مکمل تعاون و حمایت کا یقین دلایا۔[۲۶] یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسی متحدہ رائے اور شوریٰ نے جنگ بدر میں قتال کا حتمی فیصلہ کیا تھا۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے بدر میں مسلم خیمہ گاہ کے لئے جگہ کا انتخاب اور کنوؤں کے اندھا کئے جانے کا فیصلہ بھی آپ نے مشہور ماہر امور حرب حضرت حباب بن منذر کے مشورہ پر کیا تھا۔[۲۷] مشہور واقعہ ہے کہ جنگ کے خاتمے پر جنگی قیدیوں کے ساتھ رویہ و سلوک پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا تھا اور حضرت ابو بکر صدیق کی صلاح کہ ان کو زر فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے کو قبول کر لیا تھا۔ جبکہ حضرت عمر فاروق کے قتل کرنے کے مشورہ کو آپ نے مسترد کر دیا تھا کہ یہی رحمت عالم کے لئے مناسب بھی تھا اس میں دوسرے فوائد مضمر تھے۔[۲۸]

اسی طرح غزوہ احد کے موقعہ پر آپ کا مسلمانوں سے مشورہ کرنا مشہور واقعہ ہے۔ آپ کی پختہ رائے تھی کہ دشمن کی کثرت تعداد و بہتر جنگی لیاقت کے پیش نظر شہر میں محصور ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ اتفاق دیکھئے کہ اس رائے سے مشہور منافق سردار عبد اللہ بن ابی بن سلول کو بھی اتفاق تھا اور بعض دوسرے اہم اور مخلص مسلمان صحابہ کو بھی۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے مسلم امت کے اہل رائے سے مشورہ کیا۔ ان میں سے ایک خاصے بڑے طبقہ کی رائے تھی کہ شہر سے باہر نکل کر کھلے میدان میں جنگ کرنا زیادہ سود مند ہو گا۔ اس پرجوش و دلیر طبقہ میں ناتجربہ کار نوجوانوں کے علاوہ متعدد تجربہ کار اور صاحبان فہم و فراست بھی شامل تھے واقدی

کے مطابق حضرات حمزہ بن المطلب ہاشمیؓ، سعد بن عبادہ خزرجیؓ، نعمان بن مالکؓ، مالک بن سنانؓ، ایاس بن اوسؓ، خیثمہ بن حارثؓ اور انس بن قتادہؓ جیسے سربرآوردہ لوگ پیش پیش تھے۷۹ بالآخر اس طبقہ کی رائے کو ان کی پرجوش وکالت کے سبب آپ نے قبول بھی کر لیا اور کھلے میدان میں جنگ کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ مگر جب آپ زرہ بکتروں سے لیس ہو کر میدان جنگ کے لیے گھر سے نکلے تو اس طبقہ کے بعض لوگوں کو ندامت ہوئی کہ انہوں نے آپ کو اپنی رائے کے خلاف اقدام کرنے کے لیے تقریباً مجبور کر دیا ہے اور انہوں نے فیصلہ پر نظر ثانی کی درخواست کی۔ جسے آپ نے عزیمت رسول اور صلابت نبوی کے خلاف قرار دیکر فیصلہ کو بدلنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ آپ کے اس عزم بالجزم سے فوری طور پر مسلم فوج کی تعداد میں منافقین کے تقریباً ڈھائی سو سپاہ کی پسپائی سے کافی کمی واقع ہوئی تھی تاہم اس کے دو فائدے بھی ہوئے تھے: اول یہ کہ مسلم صفوں سے گھر کے بھیدیوں کا اور ان کے ساتھ ان کے مکر و فریب کا خاتمہ ہو گیا تھا اور میدان جنگ میں مسلم فوج میں فوجی ہم آہنگی کے سبب پورا اتحاد و نظم تھا۔ جس کے سبب شکست کے لمحات میں بھی مسلمانوں میں پژمردگی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ بلکہ اسی کی بدولت انہوں نے کم از کم دشمن کی جیت کو پسپائی میں بدل دیا تھا۔ دوم یہ کہ تقریباً ایک چوتھائی مسلم فوج کی اس طرح پسپائی کے اصل راز کو دشمن فوج اور اس کے قائدین نے نہیں سمجھا تھا اور وہ اس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہر کے دفاع کی ایک حربی تدبیر سمجھے تھے اور اسی وجہ سے انہوں نے مدینہ پر اپنی فتح کے باوجود حملہ نہیں کیا تھا۔ اس طرح رحمت خداوندی انسانی ابتلاء و آزمائش کا بھیس بدل کر آئی تھی۔

اسلامی ریاست کے بعض خطرناک دشمنوں کا قتل بھی باہمی صلاح و مشورے کے بعد ہی کیا گیا تھا۔ ایسے قتل و حملہ کی اجازت عرب کے سماجی نظام میں فوجی روایات دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی اس ضمن میں یاد رکھنے کی ہے کہ اسلامی ریاست نے اپنے حلیفوں اور معاہدوں ہی کا اس طرح قتل کرایا تھا۔ کیونکہ دراصل یہ اسلامی ریاست کے غداروں اور باغیوں کا قتل تھا۔ بہر حال سردست ہم کو اس مسئلہ سے بحث نہیں ہے بلکہ اس کے پہلو سے بحث ہے۔ چنانچہ مآخذ کے مطابق مشہور یہودی شاعر کعب بن اشرف جس نے جنگ احد برپا کرانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا، کا قتل کئی دنوں تک انصار کے سربرآوردہ اشخاص اور سرداروں کے گرماگرم مباحثے اور صلاح و مشورہ کے بعد ہوا تھا۔۸۰ اگرچہ اس قسم کے دوسرے واقعات کے بارے میں صلاح و مشورہ کا واضح ذکر نہیں ملتا ہے۔ تاہم قرائن ایسے ہیں کہ دوسرے سیاسی قتل بھی صلاح و مشورے کے بغیر نہیں کیے گئے تھے

جنگ احزاب کے موقعہ پر کثیر تعداد میں دشمن فوج کا مقابلہ کرنے کے ضمن میں شہر کے شمالی حصہ میں ایک عظیم خندق کھودنے کا مشورہ مشہور صحابی حضرت سلیمان فارسی نے دیا تھا اور جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کر لیا تھا۸۱ یہ واقعہ اتنا مشہور ہے کہ اس کی تفصیلات کو دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم اسی غزوہ کے دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے مشیروں سے صلاح و مشورہ کرنے کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ جب محاصرہ زیادہ طول کھینچ گیا اور مسلمانوں کو اس کے سبب شدید زحمتوں کا سامنا ہوا تو آپ نے احزاب کے ایک اہم رکن قبیلہ غطفان کو متحدہ محاذ سے واپسی کے لیے سال بھر تک مدینہ کی پیداوار کا ایک تہائی حصہ دینے کی پیشکش کی اور اس سلسلے میں گفت و شنید شروع ہوئی۔ لیکن آخری فیصلہ سے قبل آپ نے مدینہ کے سرداروں حضرات سعد بن معاذ اوسی، سعد بن عبادہ خزرجی اور اسید بن حضیر اوسی سے مشورہ کیا جنہوں نے ایسے کسی

ذلت آمیز معاہدہ کو قبول کرنے کی شدید مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ جاہلیت کے زمانے میں بھی کوئی دشمن مدینہ سے خراج وصول نہیں کر سکا تو اب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں وہ ایسے کسی معاہدے کو قبول کرنے کے بجائے لڑ کر مرجانا پسند کریں گے۔ آپ نے ان کی صلابت ایمانی اور عزم بالجزم دیکھ کر گفت وشنید منقطع کر دی[۳۲]۔ یہاں اس امر کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بنو غطفان سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح کی گفتگو صرف ایک حربی تدبیر معلوم ہوتی ہے، جس کا مقصد متحدہ محاذ کے اراکین میں پھوٹ ڈالنا تھا۔ وہ مقصد پوری طرح سے حاصل ہوا تھا۔ کیونکہ مآخذ کے مطابق بنو غطفان پہلے لوگ تھے جو میدان جنگ سے پسپا ہوئے تھے۔

تقریباً تمام مآخذ کا اس پر اتفاق ہے کہ صلح حدیبیہ کے زمانے میں اشراف مکہ سے صلح کی اور مکہ میں عمرہ کے لئے مسلمانوں کے داخلہ کی بات چیت کرنے کے لئے حضرت عثمان بن عفان کی بحیثیت مسلم سفیر اور نمائندے کے تقرری حضرت عمر بن خطاب کے مشورے پر ہوئی تھی[۳۳]۔ اس طرح غزوہ خیبر کے دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے باغوں میں کھجوروں کے بعض درختوں کو کاٹنے کی حضرت حباب بن منذر کی تجویز قبول کر لی تھی۔ لیکن بعد میں حضرت ابوبکر صدیق کے مشورے پر اس کی ممانعت کے احکام صادر فرمائے تھے۔ انہیں[۳۴] دونوں مشوروں اور حکمت عملی کے مظاہروں کی احادیث اور صحت کی طرف قرآن کریم کی ایک آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے[۳۵]۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگی امور میں حضرت حباب بن منذر خزرجی کی رائے ہمیشہ دربار رسالت میں منظور و قبول ہوتی تھی۔ چنانچہ متعدد غزوات جیسے بدر، خندق، خیبر، طائف وغیرہ میں ان کی آراء کو خاص کر مسلم فرودگاہ کے لئے جگہ کے انتخاب کے ضمن میں دوسروں پر ہمیشہ ترجیح ملتی تھی[۳۶]۔ اسی طرح غزوہ خیبر کے موقعہ پر بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود خیبر کے اتحادی عرب قبیلہ غطفان کو ان کی اتحاد سے واپسی یا غیر جانب داری کے لئے وہی شرائط پیش کی تھیں جو اس سے قبل ان کے اتحادی یہودیوں نے طے کی تھیں لیکن بعد میں آپ نے حضرت سعد بن عبادہ جیسے مسلم مشیروں کی رائے پر اپنی پیشکش واپس لے لی تھی[۳۷]۔

شوال ۷ھ/فروری ۶۲۹ء میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے شمال میں جناب کے مقام کی طرف ایک مہم بھیجنے کا قصد کیا۔ مگر آپ اس کی قیادت کے مسئلہ کو طے نہیں کر سکے۔ چنانچہ آپ نے مآخذ کے مطابق حضرات ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کو مشورے کے لئے بلایا۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ دونوں مشیران نبوی نے حضرت بشیر بن سعد خزرجی کو قائد مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ جسے آپ نے فوراً اور بخوشی قبول فرما لیا[۳۸]۔ اگرچہ امراء سرایا یا عمال نبوی کی تقرری کے سلسلے میں تقریباً یہ خبر واحد اور اکلوتی شہادت ہے، تاہم اس سے اس خیال و نظریہ کو تقویت ملتی ہے، کہ حکومت کے دوسرے عہدیداروں خاص کر بڑے افسروں کی تقرری صلاح و مشورے کے بعد ہی ہوتی تھی۔

طریق جنگ اور حربی تدابیر کے اختیار کرنے کے سلسلہ میں بھی مشورہ کے بعض واقعات ملتے ہیں۔ چنانچہ مآخذ کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ حنین کے دوران طریق جنگ کے بارے میں حضرت عمر فاروق سے مشورہ کیا تھا اور غالباً ان کے مشورے کو قبول کیا تھا[۳۹]۔ اسی طرح طائف کے محاصرہ کے دوران آپ نے محصورین کے خلاف حضرت سلمان فارسی کی منجنیق استعمال

کر نیکی رائے کو نہ صرف قبول کر لیا تھا۔ بلکہ ان کو ایک منجنیق بنانے کا حکم بھی دے دیا تھا۔ لیکن بعد میں آپ نے غالباً کسی اور صحابی کے مشورے پر یا اپنی رائے سے منجنیق استعمال نہیں کی تھی [۴۰]۔ اسی طرح بالآخر آپ نے شہر کا محاصرہ حضرت نوفل بن معاویہ دیلی جو عرب قبائل کے عادات و اطوار کے ماہر تھے کے مشورے پر اٹھا لیا تھا [۴۱]۔ اس ضمن کا آخری واقعہ یہ ہے کہ غزوہ تبوک کے زمانے میں جب تبوک میں مسلمانوں کا قیام کافی طویل ہو چکا اور دشمن نظر نہ آیا تو آپ نے آئندہ اقدام کے بارے میں حضرت عمر فاروق سے مشورہ کیا جنہوں نے مدینہ واپسی کا مشورہ دیا اور دوسرے دن ہی مسلم فوج اپنی واپسی کے سفر پر مدینہ کی جانب گامزن تھی [۴۲]۔

حربی امور و معاملات کے علاوہ دوسرے مذہبی، سماجی اور سیاسی معاملات پر بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مسلمانوں سے مشورہ کرنے کی مثالیں ملتی ہیں، چند مثالیں کافی ہوں گی۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ اذان ایک مذہبی شعار ہے اور نماز باجماعت کا ایک لازمی جز۔ مدینہ میں مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو نماز کے لئے مسجد میں کیسے اکٹھا کیا جائے مختلف تجاویز کے بعد آخر کار ایک صحابی کے مشورے پر اذان کی تجویز قبول کر لی گئی تھی [۴۳]۔ اسی طرح مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی جگہ کا انتخاب صلاح و مشورہ کے بعد ہی کیا گیا تھا [۴۴] اور اس کے بعد مواخاۃ کا نظام بھی مسلمانوں کی پسندیدگی اور مرضی سے قائم کیا گیا تھا۔ خاص طور سے دو مسلمانوں کے باہمی رشتۂ اخوت و محبت میں ان کے مزاج و طبیعت کی ہم آہنگی کے علاوہ ان کی رائے کو بھی مد نظر رکھا گیا تھا [۴۵]۔ مدینہ کے یہودی قبیلوں سے مال غنیمت میں حاصل شدہ اراضی کی غریب مہاجرین اور بعض غریب انصار میں بھی تقسیم انصار کے سربرآوردہ لوگوں کے صلاح و مشورے اور مرضی کے بعد ہی عمل میں آئی تھی [۴۶]۔ اسی طرح جب بحرین اسلامی ریاست کا حصہ بن گیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں انصار کے لوگوں کو کچھ اراضی اور قطائع دینے چاہے تو انصار نے بے مثال جذبۂ اخوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس وقت تک قطائع لینے سے انکار کیا۔ جب تک اتنے ہی ان کے مہاجر بھائیوں کو نہ دیئے جائیں [۴۷]۔

غزوہ بدر میں گرفتار ہونے والے قریشی قیدیوں کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلوک کا ذکر آچکا ہے۔ اسی قبیل کے بعض اور واقعات کا ذکر یہاں کیا جا سکتا ہے۔ اس کا قوی امکان ہے کہ بدر کے قیدیوں کے رہا ہونے کے لئے زر فدیہ کی مختلف شرحیں اور غریب مگر پڑھے لکھے قیدیوں کے لئے مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی زر فدیہ کی جگہ شرط رہائی غالباً صلاح و مشورے کے بعد ہی طے کی گئی تھیں [۴۸]۔ اس سے زیادہ دلچسپ اور اہم واقعہ یہ ہے کہ اسی موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر نیک اختر حضرت زینب نے اپنے کافر و قیدی شوہر ابو العاص بن ربیع کی رہائی کے لئے مکہ سے بطور زر فدیہ اپنا گلوبند بھیجا تھا۔ جو ان کی مرحومہ والدہ حضرت خدیجہ نے ان کی شادی کے موقعہ پر بطور تحفہ دیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی محبوب و مرحوم بیوی کی آخری یادگار کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے اور اس کو واپس کرنا چاہتے تھے مگر مسلمانوں کی مرضی کے بغیر آپ نے ایسا نہیں کیا تھا [۴۹]۔ اسی طرح جب کچھ سال بعد ابو العاص بن ربیع ایک مسلم مہم کے دوران قریشی سامان تجارت سمیت

پکڑے گئے۔ نیز ان کا سازوسامان اور سامان تجارت مسلمانوں کے صلاح و مشورے کے بعد ہی واپس کیا گیا تھا۔ اور جس کا یہ خوشگوار نتیجہ نکلا تھا کہ حضرت ابوالعاص بن ربیع اموی امت مسلمہ کے ایک فرد فرید بن گئے تھے[۵۰] واقعہ افک کے دوران جو غزوہ مریسیع کے دوران پیش آیا تھا اور جس نے پچاس دن تک مسلم مدنی سماج کو زیر و زبر رکھا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قریبی صحابہ کرام سے متعدد مواقع پر صلاح و مشورہ کیا تھا۔ اگرچہ آپ نے اپنے مشیروں میں سے کسی کا مشورہ قبول نہیں کیا تھا۔ اور فیصلہ کو خداوند قدوس پر چھوڑ دیا تھا اور شان کریمی کے صدقے جائیے کہ اس نے معصوم ملزمہ کے حق میں اپنے کلام پاک میں برأت کی آیات اتاری تھیں۔ جو تاقیام قیامت بلکہ تا ابد اس عظیم شخصیت کی پاکیزگی اور تقدس کی ربانی شہادت بن گئیں۔

عہد نبوی کے مختلف برسوں میں بعض سماجی معاملات سے متعلق قوانین نافذ کئے گئے تھے۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر کا نفاذ وحی الٰہی کے نزول کے بعد ہوا تھا۔ تاہم ان میں متعدد کا مشورہ صحابہ کرام نے اس سے پہلے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا اس سلسلہ میں حضرت عمر بن خطاب کا نام نامی و اسم گرامی مآخذ میں نمایاں طور سے نظر آتا ہے۔ حدیث نبوی ہے کہ "حق عمر کی زبان سے بولتا ہے۔ اور ان کی رائے وحی و کتاب سے متفق ہوتی تھی"۔ مثال کے طور پر عورتوں کے پردے اور عوام یا بازار میں ان کے طرز عمل کے سلسلہ میں جو احکام نافذ کئے گئے۔ ان کا مشورہ حضرت عمر نے ہی دیا تھا[۵۳]۔ اس ضمن میں صلح حدیبیہ کے موقع پر ام المؤمنین حضرت ام سلمیٰ کا ذکر کیا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ صلح حدیبیہ کی تکمیل کے بعد مسلمانوں پر پژمردگی اور احساس شکست طاری تھا اور اتنا شدید کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے احرام کھولنے اور قربانی کرنے کو کہا تو مارے غم کے کوئی نہیں اٹھا۔ آپ نے حضرت ام سلمیٰ سے ان کی سرد مہری کی شکایت کی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ خود قربانی کریں اور مسلمان آپ کی مثال کی تقلید کریں گے اور ان کی رائے کس قدر صحیح ثابت ہوئی[۵۴]۔ خیبر کی مہم میں چند عورتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بلا اجازت ومرضی شریک ہوگئی تھیں۔ دوران سفر جب آپکو ان کی موجودگی کا علم ہوا تو آپ نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ مگر بالآخر ان کی دردمندانہ درخواستوں پر ان کو شرکت کی اجازت دیدی[۵۵]۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام کے بعض مخالفین بالخصوص حضرت ابوسفیان بن حرب، حضرت عکرمہ بن ابی جہل وغیرہ کو امان عطا کرنا اور پھر ابوسفیان کے گھر کو دارالامان قرار دینا دراصل بعض مسلمانوں کے مشورے ہی پر رو بہ عمل آیا تھا[۵۶]۔ ۹ھ/ ۶۳۱ء میں ایلاء (ازواج مطہرات سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عارضی جدائی) کے واقعہ کے دوران حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کیا تھا۔[۵۷]

اگرچہ معاہدات امن و صلح اور سیاسی اتحادوں کے سلسلہ میں شوریٰ کی واضح مثالیں نہیں ملتی ہیں۔ تاہم یہ فرض کرنا جائز ہوگا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مشیروں کو ضرور اپنے اعتماد میں لیا ہوگا۔ جیسا کہ حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کی صلح حدیبیہ کے لئے بطور فرستادہ و نمائندہ رسول تقرری سے ظاہر ہوتا ہے[۵۸]۔ اس کی مزید تصدیق خندق اور خیبر کے غزوات کے دوران بنو غطفان کے معاملہ میں انصار کے سرداروں سے مشورہ کی دو مثالوں سے ہوتی ہے۔

ان واقعات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا جائز ہوگا کہ دوسرے معاملات میں شوریٰ سے کام لیا جاتا تھا۔ اور خاص کر ریاستی و حکومتی امور میں بلا صلاح و مشورہ کے کوئی فیصلہ نہیں کیا جاتا تھا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ آخری فیصلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار و اقتدار خصوصی تھا جس پر کوئی قدغن نہیں لگا سکتا تھا۔

مشیران نبوی میں جن صحابہ کرام کے اسمائے گرامی نمایاں نظر آتے ہیں ان میں حضرات ابوبکر و عمر سرفہرست تھے۔ ان کے علاوہ حضرات عثمان، علی، حباب بن منذر، سعد بن معاذ، سعد بن عبادہ، طلحہ، زبیر وغیرہ متعدد دوسرے صحابہ کرام بھی شامل تھے ۹۰ شوریٰ کا رکن بننے کے لیے کسی رسمی طریقہ کار کی ضرورت نہ تھی، البتہ صلاحیت و لیاقت ناگزیر تھی اور وہی کسی شخص کو اہل الرای کے طبقہ میں شامل کرتی تھی اور اسی کی بنیاد پر وہ شوریٰ کا رکن بنتا تھا، اگرچہ رکن شوریٰ کسی تنخواہ کا حقدار نہیں ہوتا تھا مگر اس کو اسلامی امت میں کافی قدر و منزلت حاصل ہوتی تھی۔

۲۔ سکریٹری (کاتبین)

کاتب کے لغوی معنی لکھنے والے، نویسندہ اور ناقل کے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ لفظ اصطلاح بنتا گیا۔ اور حکومتی تنظیم میں سکریٹری کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ یہ لفظ بطور اصطلاح اسلامی عہد سے قبل عرب میں مستعمل تھا۔ کیونکہ لکھنے کا رواج بہت کم تھا حتیٰ کہ مکہ میں جو عرب کا ہر لحاظ سے عظیم ترین شہر تھا۔ چند ہی لوگ لکھنے کا فن جانتے تھے۔ جو لوگ لکھنا (کتابت) جانتے تھے۔ ان کو سماج میں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی اور احتراماً ان کے نام کے ساتھ الکاتب (لکھنے والا) لگایا جاتا تھا [۹۱]۔ اسلام کی آمد کے بعد کتابت کے فن کو خاص طور سے اور دوسرے علوم و فنون کو عام طور سے ترقی ملی۔ کیونکہ حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی دور حیات ہی میں وحی الٰہی اور سیاسی دستاویزات کی کتابت کے لئے متعدد کاتبوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ایک روایت کے مطابق مکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم ترین کاتبوں میں حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی شامل تھے جو ابتدائی مسلمان ہونے کے علاوہ اس فن کے ماہر تھے [۹۲] مجموعۃ الوثائق میں منقول ایک دستاویز نبوی سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ جس کے مطابق انہوں نے دارمین الخم کے کچھ لوگوں کے لئے جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ میں ملاقات کی تھی۔ ایک خط امان لکھ کر دیا تھا [۹۳] مکی عہد میں اور جن صحابہ کرام نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لکھا تھا۔ ان میں حضرات عبداللہ بن سعد بن ابی سرح عامری، ابوبکر تیمی، عمر بن خطاب عدوی، عثمان بن عفان اموی اور علی بن ابی طالب ہاشمی کے علاوہ متعدد دوسرے بھی غالباً شامل تھے۔

مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد کاتبوں کے کام کی نوعیت مذہبی ہونے کے ساتھ سیاسی رنگ بھی اختیار کر گئی تھی۔ چودھویں صدی کا ایک متاخر مصنف القلقشندی اپنے زمانے کے ریاستی شعبہ دیوان الانشاء (شعبہ مراسلات و رسل و رسائل) کے نقطہ آغاز سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ پہلا دیوان تھا جو اسلام میں پہلی بار اس وقت متعارف ہوا تھا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بنیاد ڈالی تھی [۹۴]۔ اگرچہ اس زمانے میں وہ اس نام سے نہیں جانا جا

تھا۔ بہر حال یہ ناقابل انکار و تردید تاریخی حقیقت ہے کہ اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے فوجی افسروں، امراء سرایا، سالاروں، گورنروں اور صوبائی و مقامی منتظموں، قبائلی سرداروں، ملک و بیرون ملک کے حکمرانوں اور مسلم عوام کے نام خطوط و فرامین لکھنے پڑتے تھے۔ ان کے علاوہ آپ نے متعدد عیسائی و یہودی قبیلوں سے صلح و باہمی تعاون کے معاہدے کئے تھے۔ بعد کے زمانے میں غیر مسلم طبقات کے نام فرامین صادر کئے تھے متعدد افراد اور گروہوں کو خط امان و آزادی عطا فرمائے تھے اور بہت سے لوگوں کو قطائع عطا کئے تھے تو ان کے پروانہ ہائے تیقن و حل بھی لکھوائے تھے۔ ان تمام اور ان جیسے دوسرے متعدد مقاصد کے لئے کاتبوں کے ایک پورے شعبہ کی ضرورت تھی اور رفتہ رفتہ یہی شعبہ پہلے دیوان رسالت اور پھر دیوان الانشاء کہلایا تھا۔

ان کاتبوں کی تعداد جنہوں نے عہد نبوی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لکھنے کی سعادت حاصل کی تھی مختلف مصنفین کے نزدیک مختلف ہے۔ ابن اسحاق اور ان کے جامع ابن ہشام نے اپنی سیرت میں ان میں سے محض چند کے نام گنائے ہیں [65] جبکہ واقدی نے متعدد کاتبوں کا ذکر کیا ہے [66]۔ ابتدائی مصنفین میں ابن سعد نے صرف سولہ کاتبین رسول کا حوالہ دیا ہے [67]، جبکہ بلاذری اور طبری نے صرف دس نام گنائے ہیں [68]۔ بہر حال یہ متاخر مصنفین اور سیرت نگاروں کی کاوشیں تھیں۔ جنہوں نے تمام کاتبین رسول کا استقصا کرنے کی کوشش کی اور اپنے بس بھر ان کی تعداد بتائی۔ ابن عساکر نے اپنی تصانیف تاریخ دمشق اور بہجۃ المحافل میں بالترتیب ۲۳ اور ۲۵ کاتبین نبوی کا ذکر کیا ہے [69]۔ ان میں سے بیشتر کا ذکر ابن سعد کی طبقات میں ملتا ہے [70]۔ اتنی ہی تعداد کا ذکر ابن عبد البر نے اپنی کتاب الاستیعاب میں کیا ہے [71]۔ قرطبی کی تفسیر قرآن میں ۲۶ کاتبوں کا ذکر ملتا ہے، جبکہ شیر المسی کی فہرست میں پورے چالیس کاتبوں کا حوالہ ملتا ہے۔ حافظ زین الدین عراقی کی منظوم سیرۃ میں اس سے زیادہ ۴۲ کاتبوں کے نام ملتے ہیں، جبکہ سب سے زیادہ نام گنانے کا شرف برہان حلبی کی کتاب حواشی الشفاء کو حاصل ہے، جس کے مطابق ان کی کل تعداد ۴۳ تھی [72]۔ بہر حال اس تمام تر تحقیق و تفتیش کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہی آخری فہرست یا مکمل حقیقی تعداد تھی۔ کیونکہ اس کا امکان بہر حال موجود ہے کہ متعدد دوسرے صحابہ نے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لکھا ہو۔ اور ان کے ناموں کو مآخذ میں سے کسی نے محفوظ نہ رکھا ہو۔

بہر حال سر دست ہماری گفتگو کا موضوع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبوں کی تقرری اور انکی کارکردگی ہے۔ یہ نکتہ شروع میں ذکر کرنے کے قابل ہے کہ اس زمرہ کارکنان ریاست اسلامی میں مستقل کاتبوں سے لے کر نیم مستقل اور عارضی یا جز وقتی کارکنوں تک کا ذکر ملتا ہے۔ ذیل میں ہم ان کاتبوں کی کارکردگی کا مطالعہ کریں گے۔

اسلام کی اہم ترین کتاب قرآن پاک ہے۔ جس کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے۔ روایات کے مطابق اس کی کتابت اہم ترین اہمیت کی حامل تھی اور چونکہ وہ ایک انتہائی ذمہ داری کا کام تھا۔ جس میں محض فنی کتابت کی مہارت کے علاوہ خلوص و ایمان اور ایمانداری بھی ضروری تھی۔ اس لئے اس کی کتابت کی ذمہ داری صرف چند مخلص و دیندار صحابہ کرام کے سپرد کی جاتی تھی مکی عہد میں اس کی سعادت حضرات شرحبیل بن حسنہ کندی، ابوبکر تیمی، عمر عدوی، عثمان اموی اور علی ہاشمی کے علاوہ ایک روایت کے مطابق

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح عامری کو بھی ملی تھی[۳]، لیکن مآخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ وحی الٰہی زیادہ تر اس زمانے میں حضرات عثمان اموی اور علی ہاشمی لکھا کرتے تھے۔ جبکہ مدینہ منورہ میں یہ سعادت بیشتر حضرات ابی بن کعب خزرجی اور زید بن ثابت خزرجی کے نصیب میں آئی تھی۔ بعد میں یہ سعادت حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی کے نصیب کا مستقل و لازمی حصہ بن گئی تھی[۴] بلا ریب مؤخر الذکر تینوں صحابہ کرام وحی الٰہی کے مستقل کاتب تھے۔ ان میں سے روایات کے مطابق حضرت ابی بن کعب کاتب اکبر تھے کہ ان کی موجودگی میں کسی اور کو یہ سعادت نہیں ملتی تھی[۵]، روایت ہے کہ ان کی غیر حاضری میں حضرت زید بن ثابت کتابت وحی الٰہی کیا کرتے تھے[۶]۔ متعدد مستند مصنفین و محدثین جیسے ابن عبد البر، بخاری، نودی، اور عراقی وغیرہ کا اتفاق ہے کہ ہجرت کے بعد حضرت زید بن ثابت مستقل خدمت نبوی میں حاضر رہتے تھے۔ اس لئے ان کو خطوط و فرامین نبوی اور وحی الٰہی لکھنے کی جس قدر سعادت ملی کسی اور کے نصیب میں نہیں آئی۔ لیکن فتح مکہ (یا عمرۃ القضاء) کے بعد حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی نے کچھ اس عزیمت و محبت، پابندی و دلجمعی اور استقلال کے ساتھ صحبت نبوی اختیار کی کہ کوئی ان کا اس معاملہ میں ثانی نہیں رہا۔ چنانچہ روایات کے مطابق انہوں نے بقیہ عہد نبوی میں مسلسل کلام الٰہی کی کتابت کی سعادت حاصل کی تھی[۷]

اس شعبہ ریاست اسلامی کے مطالعہ میں ایک دلچسپ پہلو ان دستاویزات و معاہدات نبوی کا تجزیہ بھی ہے جو مجموعۃ الوثائق میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے جمع کر دیئے ہیں۔ اس کے تجزیئے سے بعض بہت اہم اور دلچسپ نکات سامنے آتے ہیں۔ اس میں منقول کل دستاویزات کی تعداد ۲۴۶ ہے۔ جن کا تعلق عہد نبوی سے ہے۔ ان میں سے متعدد خطوط مختلف عرب حکمرانوں، قبائلی سرداروں اور غیر ملکی بادشاہوں یا مسلم گورنروں اور افسروں کے ہیں۔ جو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں بھیجے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسی بھی دستاویزیں ہیں جن کا متن ندارد ہے۔ لہٰذا ان کی حیثیت محض حوالوں کی سی ہے۔ جن سے کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا۔ سوا اس کے کہ آپ نے یہ خطوط و معاہدات لکھوائے تھے۔ بہر حال کم از کم ۴۷ دستاویزیں ایسی ہیں جو اپنے کاتبوں کے نام بھی رکھتی ہیں[۸]، ان کا تجزیہ ذیل میں پیش ہے۔

نمبر شمار	کاتب کا اسم گرامی	تعداد دستاویزات مکتوبہ
۱	حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی	۱۲
۲	حضرت ابی بن کعب خزرجی	۱۱
۳	حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی	۱۱
۴	حضرت خالد بن سعید اموی	۹
۵	حضرت مغیرہ بن شعبہ ثقفی	۷
۶	حضرت علاء بن عقبہ	۴
۷	حضرت ارقم بن ارقم مخزومی	۴
۸	حضرت ثابت بن قیس بن شماس خزرجی	۴
۹	حضرت عثمان بن عفان اموی	۲
۱۰	حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی	۲

۱۱	حضرت جہیم بن صلت	۲
۱۲	حضرت علاء بن حضرمی	۲
۱۳	حضرت عبداللہ بن زید	۱
۱۴	حضرت عبداللہ بن ابی بکر تیمی	۱
۱۵	حضرت محمد بن مسلمہ اوسی	۱
۱۶	حضرت زبیر بن عوام اسدی	۱

اس واقعاتی تجزیے سے مذکورہ بالا مصنفین کے بیانات کی کسی حد تک تصدیق ہوتی ہے[۳۹] اس فہرست سے سب سے اہم استثنا حضرت زید بن ثابت خزرجی کا ہے جن کا نام کسی ایک بھی دستاویز میں نہیں ملا۔ حالانکہ مآخذ کا دعویٰ ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل کاتبوں میں سے ایک تھے۔ اس کی یہی توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ صحابی موصوف زیادہ تر وحی الٰہی، فرائض صدقات وترکہ کے متعلق امور) اور سہمان (مال غنیمت کے حصص) کی کتابت کیا کرتے تھے[۴۰] جبکہ مذکورہ بالا تجزیے میں جن دستاویزات کا ذکر کیا گیا ہے ان کا تعلق سیاسی و انتظامی قسم کے معاملات و امور سے تھا۔

دوسری قسم کی دستاویزات میں صلح کے معاہدوں اور پروانہ ہائے امان و تحفظ کو اہم مقام حاصل تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی زیادہ تر صلح و باہمی تعاون کے معاہدوں کی کتابت کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ بعض ابتدائی مصنفین کا دعویٰ بھی ہے[۴۱] دلچسپ بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا معاہدات و دستاویزات نبوی کا تجزیہ بھی اس کی پوری طرح سے تصدیق کرتا ہے۔ مثال کے طور پر قریش کے ساتھ معاہدہ (صلح حدیبیہ)[۴۲] کے علاوہ انہوں نے مقنا، (بنو زیاد) بن الحارث بن کعب کے لوگوں[۴۳]، ہمدان کے ایک سردار عمیر[۴۴]، احمر بن معاویہ تمیمی[۴۵] اور نعیم بن مسعود اشجعی[۴۶] وغیرہ سے جو معاہدے مذکور ہیں۔ وہ سب حضرت علی ہاشمی نے ہی تحریر کیے تھے[۴۷]۔ مذکورہ بالا تمام سولہ کاتبوں کو اس شعبہ میں بھی شمار کرنا چاہیئے۔ کیونکہ انہوں نے ایک یا دو خط اس زمرہ میں بھی لکھے تھے۔ اس فہرست میں حضرت ابوبکر صدیق کے مولیٰ حضرت عامر بن فہیرہ کا ذکر نہیں آیا ہے۔ جنہوں نے سفر ہجرت نبوی کے دوران سراقہ بن مالک مدلجی کو پروانہ امان لکھ کر عطا کیا تھا[۴۸]

کتانی کا دعویٰ ہے کہ حضرات عبداللہ بن ارقم اور زید بن ثابت وہ خطوط و فرامین نبوی لکھا کرتے تھے۔ جو غیر ملکی حکمرانوں، اسلامی ریاست کے مختلف گورنروں اور اسلامی لشکروں کے سالاروں کا نام ہوتے تھے[۴۹] یہ بات دلچسپ ہے کہ غیر ملکی حکمرانوں کے نام لکھے گئے خطوط نبوی ہیں جن کے متن دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی کے کاتب کا نام نہیں مذکور ہوا ہے۔ دوسری جانب مدائنی کے اس دعوے کی کہ حضرت معاویہ اموی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور عرب قبائل کے درمیان معاہدے لکھا کرتے تھے[۵۰] تصدیق متعدد حقائق سے ہوتی ہے۔ تہد کے ایک خاندان بنو قرہ، نجران کے عیسائی طبقات، ربیعہ بن ذی المرحب اور حضرموت کے قیل (حکمراں)، حضرت وائل بن حجر کے نام تحریر کردہ تمام فرامین حضرت معاویہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں[۵۱] ممکن ہی نہیں یقینی ہے کہ بہت سے ایسے خطوط و دستاویزات ہوں گی جو ان کے قلم کی رہین منت رہی ہوں گی

مجموعۃ الوثائق میں منقول متعدد قطائع کے فرامین مختلف کاتبوں جیسے حضرات علی، معاویہ، خالد بن سعید، الارقم، علاء بن عقبہ، یزید بن ابی سفیان، مغیرہ بن شعبہ، جہیم بن صلت، قیس بن ثابت اور ابی بن کعب وغیرہ کے تحریر کردہ تھے[91]۔ مآخذ کا یہ بھی بیان ہے کہ دو صحابی حضرات حصین بن نمیر اور مغیرہ بن شعبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بعض خاص معاملات اور خفیہ امور کے بارے میں لکھا کرتے تھے۔ جبکہ حضرات زبیر بن عوام اور جہیم بن صلت صدقات و محاصل سے متعلق امور کی تحریر و کتابت کے ذمہ دار تھے۔ حضرت حذیفہ بن یمان اراضی کی پیداوار کے معاملات تحریر کرتے تھے۔ جبکہ حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی بادشاہوں اور حکمرانوں کے نام خطوط نبوی تحریر کیا کرتے تھے[92]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف کاتبوں کو مختلف کام انکی صلاحیتوں اور فنی مہارتوں کے سبب عطا کئے گئے تھے۔

اس بحث میں عہد نبوی کے طریق کتابت اور طرز تحریر کا مطالعہ بھی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ جب کبھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تحریر لکھوانے کی ضرورت پیش آتی تھی تو آپ کاتب کو طلب فرماتے تھے۔ کاتب لکھنے کے تمام ساز و سامان جیسے قلم، روشنائی، کاغذ یا چمڑے یا چھال کی تختیوں یا اوراق کے ساتھ حاضر ہوتا تھا اور خدمت نبوی میں دو زانو بیٹھ کر آپ سے املا لیتا تھا[93]۔ نامہ مبارک کی ابتدا بسم اللہ[94] سے ہوتی تھی جو بالکل اوپر لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد لکھنے والے یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی اسم گرامی لکھا جاتا تھا اور اس کے بعد مکتوب الیہ کا نام[95]۔ ان دونوں ناموں کے ساتھ مناسب خطابات یا القابات ہوتے تھے۔ مختصر سے تمہیدی یا دعائیہ کلمات کے بعد اَمَّا بعد کا سکہ بند فقرہ آتا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اب اصل متن شروع ہو رہا ہے۔ اصل متن کے بعد عام طور سے خط کا خاتمہ والسلام کے فقرہ سے ختم ہوتا تھا۔ اور اس کے بعد کبھی کبھی کاتب خط کا نام بھی ضبط تحریر میں آجاتا تھا۔ معاہدے کی زبان تھوڑی سی مختلف ہوتی تھی اور اس کے آخر میں اکثر و بیشتر گواہوں کے نام بھی مذکور ہوتے تھے[96]۔ خط کے آخر میں مہر رسالت لگائی جاتی تھی۔ یہ مہر دراصل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتم (انگوٹھی) تھی جو چاندی کی تھی اور جسے روایات کے مطابق آپ نے پہلی بار صلح حدیبیہ کے بعد اس وقت بعض صحابہ کرام کے مشورے پر بنوایا تھا۔ جب آپ نے غیر ملکی پڑوسی حکمرانوں کو خطوط بھیجنے کا ارادہ کیا تھا[97]۔ اس مہر میں کلمہ طیبہ کا آخری جملہ (محمد رسول اللہ) محمد اللہ کے رسول ہیں، کندہ تھا اور الفاظ کی ترتیب یہ تھی کہ آپ کا نام سب سے نیچے اور اللہ کا نام سب سے اوپر کندہ تھا اور درمیان میں لفظ رسول (محمد رسول اللہ[98])

مآخذ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر مبارک کا ایک محافظ بھی تھا۔ بخاری کی تاریخ میں ایک روایت ہے[99] جس کی تائید اسد الغابہ سے بھی ہوتی ہے[100]۔ کہ حضرت معیقب بن ابی فاطمہ دوسی، جو خاندان سعیدی، بنو امیہ کے ایک حلیف اور قدیم مکی مسلم تھے، صاحب خاتم الرسول تھے اور جب کبھی آپ انگوٹھی کو اپنی انگلی میں پہننا پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپ اس کو ان کی حفاظت میں دے دیتے تھے اور وقت ضرورت طلب کر کے استعمال فرماتے تھے۔ العقد الفرید کے مصنف نے اس سلسلہ میں دو روایتیں بیان کی ہیں۔ ایک مذکورہ بالا روایت کی مکمل تصدیق کرتی ہے۔ مگر دوسری خاتم رسول کے محافظ صحابی کا نام حضرت حنظلہ بن ربیع اسدی بتاتی ہے[101]۔ اگرچہ امکان کم ہے تاہم اس سے قطعی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سعادت کو حاصل

کرنے والے دونوں ہی صحابی رہے ہوں اور پہلے ایک کو یہ سعادت حاصل رہی ہو اور بعد میں دوسرے کے حصہ میں آئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی زمانے میں باری باری سے دونوں کو یہ خدمت سونپی جاتی رہی ہو۔

اس بحث کے خاتمہ پر ذیل میں تمام کاتبوں کی ایک جدول دی جا رہی ہے، جس میں ان کے قبائلی تعلق، علاقہ اور ہر قبیلہ کے مجموعی کاتبوں کی تعداد ظاہر کی گئی ہے۔

علاقہ	قبیلہ / خاندان	کاتبوں کی تعداد
مرکزی عرب	۱- قریش	۲۲
	(الف) ہاشم	۱
	(ب) امیہ	۷
	(ج) مطلب	۱
	(د) مخزوم	۳
	(س) زہرہ	۲
	(ص) تیم	۳
	(ط) عدی	۱
	(ع) سہم	۱
	(ف) عامر بن لوی	۲
	(ق) ادرم	۱
	۲- خزرج	۲
	۳- اوس	۲
	۴- انصاری (بلا تعیین)	۱
مشرقی عرب	۱- ثقیف	۱
مغربی عرب	۱- اسلم	۱
	۲- دوس	۱
شمالی عرب	۱- عذرہ	۱
جنوبی عرب	۱- کندہ	۱
	۲- عیسائی نومسلم	۱
	۳- حضر موت	۱

قبائل پراگندہ	۱۔ تمیم	۱
غیر معروف	—	۵
میزان	۱۳ر قبیلے	۴۴

حضرت بلال حبشی کا مقام

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیکریٹریوں پر بحث کے اختتام پر حضرت بلال حبشی کے مقام و مرتبے پر گفتگو ضروری معلوم ہوتی ہے۔ غالباً وہ کبھی اسلامی ریاست کے شعبہ کاتبین میں شامل نہیں رہے لیکن جہاں تک لفظ سیکرٹری کا تعلق ہے۔ وہ صحیح معنوں میں اس کے حقدار تھے وہ سفر و حضر، دکھ و سکھ، امن و جنگ کسی بھی عالم میں صحبت نبوی سے دور نہیں رہتے تھے۔ تعلق خاطر ان کو کہیں اور چین نہیں لینے دیتا تھا۔ اور خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ مآخذ کا بیان ہے کہ وہ آپ کے بیشتر ذاتی اور سرکاری کاموں اور ضروریات (حوائج) کی تکمیل کرتے تھے۔ چند مثالیں اس بیان کی تصدیق کے لئے کافی ہوں گی۔

جہاں تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی اور نجی ضروریات کا تعلق ہے تو حضرت بلال حبشی آپ کے تمام گھریلو کاموں جیسے بازار سے روزمرہ کا سودا سلف خریدنا، قرضوں کی فراہمی اور ادائیگی کے انتظامات کرنا، آپ کے مہمانوں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا۔ اور اس جیسے متعدد کاموں کی دیکھ بھال کرتے تھے[۹۲] وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نمازوں کے اوقات اور جماعت کی تیاری کی اطلاع بھی کرتے تھے۔ جیسا کہ واقدی اور بلاذری کا بیان ہے[۹۴]۔ بلاذری کے ایک بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بلال حبشی آپ کے وضو کے پانی کے انتظام کے بھی نگران تھے! اور نمازوں میں آپ آگے سترہ کے لئے نیزہ رکھا کرتے تھے[۹۵] اور خاص خاص مواقع پر وہ نیزہ لیکر آپ کے آگے آگے چلا کرتے تھے۔

اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت بلال حبشی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خازن (خزانچی) بھی تھے[۹۶]! اور وہ اپنے کپڑے دیا جیب (میں چاندی رکھا کرتے تھے[۹۷]! یہ خام چاندی بھی ہوتی تھی جو وزن کے اعتبار سے سکوں کی جگہ استعمال ہوتی تھی یا ڈھلے ہوئے سکے بھی ہوتے تھے۔ اس بیان کی تصدیق ابن اسحاق جیسے متعدد ابتدائی مآخذ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ غزوہ ذات الرقاع کے دوران جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے ایک اونٹ ایک اوقیہ چاندی (چالیس درہم) میں خریدا تھا تو اس کی ادائیگی حضرت بلال ہی نے ہدایت نبوی کے بموجب کچھ اضافہ و انعام کے ساتھ کی تھی[۹۸]" اس کے علاوہ نعل اور خریدار اول کی رقم بھی حضرت بلال نے ادا کی تھی۔ جس کے حوالے مآخذ میں جابجا ملتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت سربراہ مملکت جن لوگوں کو انعامات سے نوازتے تھے۔ ان کی ادائیگی حضرت بلال ہی کے ہاتھوں سے ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر جعرانہ میں اموال غنیمت کی تقسیم کے وقت جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سرداران قریش و عرب قبائل کو انعامات سے مشرف کیا تھا۔ تو حضرت معاویہ اور یزید فرزندان ابوسفیان اموی کو فی کس چالیس اوقیہ چاندی

حضرت بلال حبشی ہی نے اپنے دست مبارک سے عطا کی تھی[109] امکان ہے کہ اس موقعہ پر دوسرے سرداروں کو جو چاندی کی رقم ملی تھی وہ ان ہی کے توسط سے ملی تھی۔ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسلامی مساوات کے مظاہرہ کی پالیسی بھی کار فرما تھی کہ ایک حبشی مولیٰ کے ہاتھوں اشراف قریش و عرب کو انعامات دلوائے تھے۔ واقدی کا بیان ہے کہ حضرت بلال ہمیشہ اپنے ساتھ چاندی رکھا کرتے تھے اور جب اور جہاں کہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو عطایا دینا چاہتے تھے وہ حضرت بلال کو اشارہ کرتے تھے اور اس کی وہ فوری تعمیل کرتے تھے[110] اسی طرح متعدد حوالے ان انعامات کے بھی ملتے ہیں جو بحکم نبوی حضرت بلال حبشی نے عرب وفود کے بعض ارکان کو عطا فرمائے تھے۔ ان میں بنو تمیم کے وفد کا ذکر صریحاً ملتا ہے[111] غالباً وہ خراج اور صدقات کی شکل میں آنے والی سرکاری رقوم کے مصارف کے بھی نگران تھے۔ جیسا کہ فدک اور بحرین کے صدقات وخراج کے بارے میں معلوم ہوتا ہے[112]

ماخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت بلال حبشی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل منادی (اعلان کرنے والے) تھے۔ غزوات حمراء الاسد اور بنو قریظہ کے زمانے حضرت بلال حبشی ہی نے مسلم مجاہدین کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم سے باخبر کیا تھا کہ وہ دشمنوں سے آخری وقت تک جنگ کریں[113] غزوہ خیبر میں انہوں نے ہی اپنے اعلان کے ذریعہ محصور دشمنوں کے باغات میں کھجور کے درختوں کے کاٹنے کی ممانعت کر دی تھی اور اس طرح پہلے حکم نبوی کو منسوخ کیا تھا[114] غزوہ حنین میں بھی انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک حکم کو مسلم مجاہدین تک پہنچایا تھا[115] ان وقتی اعلانات کے علاوہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل منادی تھے کہ مسلمانوں کو مسجد نبوی میں حکم واذن نبوی پر جمع کیا کرتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی مسلمانوں سے کوئی عام یا خاص خطاب کرنا چاہتے تھے تو کبھی حضرت بلال مسجد نبوی سے اذان دیتے تھے اور کبھی مدینہ کی گلیوں میں الصلوٰۃ جامعۃ (نماز جمع کرنے والی ہے) کی صدائیں دیتے گذرتے اور مسلمانان شہر کو دعوت نبوی پہنچاتے تھے[116]

ان کے علاوہ حضرت بلال حبشی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد دوسرے متفرق کام بھی انجام دیتے تھے مثال کے طور پر غزوہ ذوامر میں ایک نومسلم کی مذہبی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری نبھائی تھی[117] وہ مہمانان رسولؐ کی مستقل طور سے ضیافت کے انتظامات کے نگران تھے۔ چنانچہ متعدد وفود کی ضیافت انہوں نے ہی کی تھی۔ اس سلسلے میں تمیم اور ثقیف کے ارکان وفود کی ضیافت کے صریح حوالے ملتے ہیں[118] خیبر کی مہم کے دوران حضرت بلال نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نئی بیوی حضرت صفیہ کو خیمہ نبوی میں پہنچانے کا نازک کام انجام دیا تھا[119] سریہ دومۃ الجندل کی روانگی سے قبل حضرت بلال ہی نے امیر سریہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کو علم (لواء) عطاء فرمایا تھا[120] فتح مکہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو حضرت طلحہ بن عثمان عبدری متولی کعبہ سے بیت اللہ کے دروازے کی چابی لانے کو کہا تھا۔ جس کی انہوں نے تعمیل کی تھی[121] اور یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خانہ کعبہ میں داخل ہونے والے دو صحابہ میں متولی کعبہ کے علاوہ حضرت بلال حبشی ہی تھے یہ تمام اور ان جیسے دوسرے متعدد امور اور واقعات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ حضرت بلال حبشی کو نہ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی ضروریات کی نگرانی حاصل تھی بلکہ وہ ریاست اسلامی میں حکومتی شعبہ میں سلسلہ افسر اعلیٰ بھی تھے اور کافی اہم اور محبوب مقام رکھتے تھے۔

۴ سفیرانِ نبوی (رُسل)

سفارہ کا ادارہ یا عہدہ اسلام سے قبل جزیرہ نمائے عرب میں یا کم از کم مکہ میں معروف تھا۔ کیونکہ قریشی اشرافیہ میں وہ موجود تھا[۱۲۲]۔ روائتی لحاظ سے خاندان بنو عدی مدت مدید سے اس کا منصب دار تھا۔ اور اسی کے اراکین اس اہم عہدے پر فائز ہوتے چلے آئے تھے۔ بعثت نبوی کے زمانے میں حضرت عمر بن خطاب عدوی اس کے منصب دار تھے۔ جنہوں نے غالباً اپنے باپ خطاب سے یہ عہدہ پایا تھا۔ ان کے دادا نفیل کے بارے میں صراحت کے ساتھ ذکر ملتا ہے۔ کہ وہ اس منصب کے منصبدار ہونے کے علاوہ قریشی رؤسا و شیوخ میں شمار ہوتے تھے۔ بہرحال حضرت عمر اسلام سے قبل کے سیاسی نظام قریش میں اس کے آخری عہدیدار تھے اور اس حیثیت سے وہ عرب قبائل اور قریش کے درمیان تعلقات کے ضمن میں قریش کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس سے زیادہ ہم اس عہدے کی کارکردگی کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتے کیونکہ تفصیلات معدوم ہیں[۱۲۳]۔

بہرکیف ماخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست نے جاہلی عربوں کے ادارۂ سفارہ کو ترکہ میں پایا تھا اور پھر اپنی ضروریات اور عصری تقاضوں کے تحت اس میں نئی جہتوں کا اضافہ کیا تھا اور اس کو ایک مخصوص شکل میں ترقی و وسعت دی تھی۔ قدیم جاہلی عہدہ سفارہ اسلامی ریاست کے انتظامیہ میں رسالۃ اور سفیر رسول کہلانے لگا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور امتیاز یہ پیدا ہوا تھا کہ جاہلی نظام میں سفیر مستقل منصبدار ہوتا تھا۔ جو تا زندگی اپنے عہدے پر فائز رہتا تھا۔ اور اس کے بعد وہ عہدہ اسی کے خاندان کے افراد کو ملتا تھا۔ اس طرح سے یہ منصب موروثی بھی تھا، مگر اسلامی سیاسی نظام میں موروثی عہدوں کی اصولاً گنجائش نہیں تھی اور نہ ہی تا زندگی منصبداری کے حق کی ضمانت، کیونکہ عہدے دار کے لئے اہلیت ولیاقت کے سوا حسن عمل اور بہتر کارکردگی اور خوشنودی سربراہ مملکت بھی لازمی تھی۔ جو حالات کے تحت بدل سکتی تھی۔ بہرحال اسلامی ریاست میں رسالہ کا عہدہ تو مستقل تھا۔ مگر رسول کے عہدے دار عارضی ہوتے تھے اور ان کو وقت و ضرورت کے مطابق مقرر و مبتدل کیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی ریاست میں متعدد بلکہ بہت سے لوگ اس عہدۂ جلیل پر سرفراز ہوتے۔

ایک اچھے سفیر یا رسول کے لئے ضروری اوصاف اور خوبیوں کا ذکر صراحت کے ساتھ مآخذ میں کہیں نہیں ملتا۔ تاہم ان سے ان کو مستنبط کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ کتانی نے اس موضوع پر پوری ایک فصل باندھی ہے اور اس کے مطابق ایک عمدہ سفیر کے لئے کم از کم چار اوصاف لازمی و ناگزیر تھے۔ اعلیٰ فراست و ذہانت، عمدہ زبان و طرز ادا، جاذب نظر شخصیت اور علاقہ تقرری دادائیگی فرائض کی زبان پر قدرت۔ یہ وہ اوصاف تھے، جو ایک اچھا سفیر بناتے تھے[۱۲۴]۔ اس کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم موقعہ محل کی مناسبت سے مخصوص و موزوں شخص کا انتخاب کرتے تھے اور اس کی روانگی سے قبل حسب معمول اس کو ہدایات دیتے تھے کہ نرم اور اچھی گفتگو کریں، رحمت و نرم دلی کا مظاہرہ کریں، سختی اور سخت روی سے پرہیز کریں، آسانی پیدا کریں اور اختلاف و تصادم سے گریز کریں، خوشخبری سنائیں۔ نفرت و عداوت سے اجتناب کریں۔ اور رحمت و اتفاق کا رویہ اپنائیں[۱۲۵]۔

عہد نبوی میں مقرر ہونے والے تمام سفیروں (رسل) کو کتانی نے مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے اور ہر ایک طبقہ سے الگ فصل میں گفتگو کی ہے۔ اس کے مطابق کچھ سفیر تبلیغ اسلام کے لئے بھیجے گئے تھے تو کچھ دوسرے صلح کے معاہدے کرنے کے لئے۔ کچھ نے دوسروں کو امان دی تھی تو کچھ اور نے بادشاہوں سے مسلم طبقات کی واپسی کی درخواست اور اپنے علاقہ یا ملک میں مقیم ایک مسلمان عورت سے امام کی شادی کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ بعض سفیروں نے امام کی جانب سے دوسروں کو تحائف پہنچائے تھے اور بعض دوسروں نے کافروں کو ان کے کفر کے برے نتائج سے آگاہ کیا تھا[۱۲۶]۔ ظاہر ہے کہ یہ تقسیم و تعیین کا رنہ تو مکمل و ہمہ گیر ہے اور نہ ہی ضروری ہے۔ ذیل میں عہد نبوی کے انتظامیہ کے اس شعبہ کی تاریخی ارتقاء سے بحث کی جا رہی ہے۔

جہاں تک واقعات شہادت دیتے ہیں۔ اسلامی ریاست میں کسی سفیر کی پہلی تقرری عسکری یا نیم عسکری مہموں کے دوران ہوئی تھی۔ اگرچہ ان کارکنوں یا افسروں کے لئے لبا اوقات ماٰخذ رسول کی اصطلاح نہیں استعمال کرتے ہیں مگر ان کے کاموں کی نوعیت ان کو اسی شعبۂ افسران میں شامل کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پہلے بھی بعض سفیروں کا تقرر ہوا ہو۔ مگر ماٰخذ میں پہلی مثال یا شہادت کا تعلق سنہ ۴ ھ/ ۶۲۵ء سے ہے جب بنو نضیر کے غزوہ کے دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت محمد بن مسلمہ اوسی کو سفیر بنا کر بنو نضیر کے یہودیوں کے پاس اس غرض سے بھیجا تھا کہ وہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کے معاملہ میں آخری فیصلے سے آگاہ کر دیں[۱۲۷]۔ دو برس بعد جب مدینہ احزاب کے محاصرہ میں گھر چکا تھا تو تین مسلم سفیروں کی تقرری ہوئی تھی۔ ان کے نام تھے حضرات سعد بن معاذ اوسی، سعد بن عبادہ خزرجی اور عبداللہ بن رواحہ خزرجی[۱۲۸]۔ ان کو بنو قریظہ کے پاس بھیجا گیا تھا تاکہ ان کو ان کا عہد و معاہدہ یاد دلائیں جو انہوں نے اسلامی ریاست کے دفاع کے لئے کیا تھا اور ان کو احزاب میں شامل ہونے سے روکیں[۱۲۹]۔ صلح حدیبیہ کے دوران کم از کم تین مسلم سفارتیں یکے بعد دیگرے مکہ بھیجی گئی تھیں۔ مسلم جماعت زائرین کے حدیبیہ میں قیام کے معاً بعد حضرت خراش بن امیہ خزاعی کو مکہ کے اشراف و روٗساء کے پاس بھیجا گیا تھا تاکہ وہ حرم مکہ میں مسلمانوں کے داخلے اور عمرہ کرنے کی اجازت حاصل کریں۔ لیکن ان کی یہ سفارت ناکام رہی[۱۳۰]۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد حضرت عثمان بن عفان اموی کو حضرت عمر کے مشورہ پر اسی غرض سے بھیجا گیا تھا[۱۳۱]۔ بہر حال اس پوری مدت میں قریش کی جانب سے بھی متعدد سفیر آئے تھے اور آخر کار ان کی آخری سفارت قریش کے شاعر و خطیب سہیل بن عمرو اور حویطب کی سرکردگی میں آئی تھی جس نے معاہدہ حدیبیہ لکھا تھا۔ مسلم جماعت کی نمائندگی اس موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی نے کی تھی اور انہوں نے ہی صلح کے معاہدہ کی تحریر بھی لکھی تھی۔ صلح حدیبیہ دراصل انہی تمام گفت و شنید کا نتیجہ تھی[۱۳۲]۔

عام طور پر خیال یہ ہے کہ اسلامی ریاست نے پہلی بار محرم سنہ ۷ ھ/ جون ۶۲۸ء میں سفیروں کی تقرری کی تھی اور متعدد سفیروں کو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف حصوں کے علاوہ بعض پڑوسی ملکوں کے حکمرانوں کے پاس بھی بھیجا تھا۔ ابن ہشام کی[۱۳۳] روایت ہے کہ حسب ذیل سفیروں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دینے کیلئے مختلف ملکوں میں روانہ کیا تھا:

۱: حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی کو	رومی شہنشاہ ہرقل کے پاس
۲: حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی کو	خسرو ایران پرویز کے پاس
۳: حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو	نجاشی حبش اصحمہ کے پاس

۴ : حضرت حاطب بن ابی بلتعہ لخمی کو	مقوقس مصر کے پاس
۵ : حضرت شجاع بن وہب اسدی کو	ملک غسان شام کے پاس

ابن سعد[۱۳۵] نے مذکورہ بالا سفیروں میں ایک چھٹے سفیر کا اضافہ کیا ہے کہ اسی دن حضرت سلیط بن عمر عامری کو شاہان یمامہ کے پاس بھیجا گیا تھا۔ نامہ نبوی کے متون[۱۳۶] کے علاوہ ماخذ[۱۳۷] سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ ان سفیران حرم کو تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا گیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں سیاسی طور سے ان سفارتوں کا مقصد یہ تھا کہ پڑوسی شاہان وقت کو اسلامی دعوت کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاست کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت اور صلح کے لئے آمادہ کیا جائے تاکہ ایک طرف تو اسلام کی عالمگیر تبلیغ کا دروازہ کھلے تو دوسری طرف تصادم و جارحیت کے امکانات یا خطرات میں کمی پیدا ہو۔ سوائے ایک سفارت کے یہ تمام سفارتیں اپنی مہول میں کافی کامیاب رہیں۔ اور انہوں نے اپنے اپنے علاقہ کے حکمرانوں میں خیر سگالی اور دوستی کے جذبات پروان چڑھانے میں کافی مؤثر کردار ادا کیا۔ ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ رومی شہنشاہ نے نبوت محمدی کی نہ صرف تصدیق کی بلکہ اپنے عوام کو اسلام کے لئے آمادہ بھی کیا۔ اگرچہ وہ سیاست دربار و امراء سے ڈر گیا تاہم اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تحائف بھیجے۔ اسی طرح مقوقس مصر اور نجاشی حبش نے نذرانے بھیجے تھے اور سفیران نبوی کا خیر مقدم کیا تھا۔ اور اسلامی ریاست سے دوستی کا دم بھرا تھا۔ ان کے علاوہ دوسرے علاقوں کے سفراء بھی شاداں و فرحاں لوٹے تھے۔ صرف کسریٰ ایران خسرو پرویز نے نخوت بادشاہت و غرور طاقت میں دعوت نبوی کو علانیہ ٹھکرا دیا اور یہی نہیں بلکہ نامہ نبوی کو نہ صرف پھاڑ کر پھینک دیا تھا بلکہ اس نے گورنر یمن کے ذریعہ اسلامی ریاست کے خلاف کسی فوجی اقدام کا منصوبہ بھی بنایا تھا لیکن قدرت کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ وہ خود ہی اپنے لخت جگر کے ہاتھوں مارا گیا اور اس طرح اپنے انجام کو پہنچا[۱۳۸]

ان سفارتوں کے علاوہ متعدد دوسری سفارتوں کے حوالے ماخذ میں ملتے ہیں۔ ان کے مطابق حضرت علاء بن حضرمی حضرت عمرو بن عاص سہمی اور حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کو بالترتیب بحرین، عمان اور حمیر (یمن) کے بادشاہوں کے پاس بھیجا گیا تھا[۱۳۹] ابن سعد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اوّل الذکر دونوں سفیروں کو ۸ھ / ۶۳۰ء میں کسی وقت غالباً فتح مکہ کے فوراً بعد بھیجا گیا تھا۔ جبکہ مؤخر الذکر کو کچھ تاخیر سے روانہ کیا گیا تھا۔[۱۴۰]

یہ غلط فہمی عام ہو گئی ہے کہ صرف یہی سفارتیں عہد نبوی میں بھیجی گئی تھیں۔ حالانکہ ماخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ متعدد اور سفارتیں ملکی حکمرانوں کے درباروں اور علاقوں میں روانہ کی گئی تھیں۔ ۹ھ / ۶۳۰-۳۱ء میں کم از کم سات سفیروں کو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف حکمرانوں اور قبیلوں کے پاس بھیجا گیا تھا۔ ذیل میں ان سفراء نبوی کے اسمائے گرامی اور ان کے علاقوں کے نام دیئے جا رہے ہیں

سفراء نبوی کے نام	علاقے یا قبیلے / حکمران
۱- حضرت نمیر بن خرشہ ثقفی	طائف کے قبیلوں کے پاس
۲- حضرت ظبیان بن مرثد سدوسی	قبیلہ بکر بن وائل "

۳۔	حضرت حارث بن عمیر ازدی	شاہ بصریٰ حارث بن عمیر غسانی کے پاس
۴۔	حضرت عیاش بن ابی ربیعہ مخزومی	حمیر کے پاس
۵۔	حضرت وحیہ بن خلیفہ کلبی	اسقف نجران ضغاطر الاسقف کے پاس
۶۔	حضرت علقمہ بن فغواء خزاعی	حضرت ابوسفیان بن حرب اموی کے پاس
۷۔	حضرت عمرو بن فغواء خزاعی	

ابن سعد[۱۴۱] نے ان میں پہلے پانچ سفراء کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ باقی دو کا ذکر ابن اثیر نے کیا ہے[۱۴۲]۔ پہلی پانچ سفارتیں کلی طور سیاسی تھیں یا مذہبی یا دونوں مقاصد پیش نظر تھے جبکہ آخری دو سفیروں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ رقم دے کر بھیجا تھا تاکہ غریب قریشیوں میں اس کو تقسیم کر دیا جائے۔ اسی طرح حضرت عمرو بن امیہ ضمری کے بارے میں بھی ذکر ملتا ہے کہ ان کو بھی کسی وقت اسی مقصد سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوسفیان اموی کے پاس بھیجا تھا[۱۴۳]۔

حیات نبوی کے آخری برس یعنی ۱۱-۱۰ھ / ۳۲-۶۳۱ء میں کسی ایک سال میں سب سے زیادہ سفارتوں کا مشاہدہ کیا جن کی کل تعداد سولہ تھی۔ ان سب کا ذکر اسد الغابہ کے مختلف تراجم میں ملتا ہے۔ مگر ان میں سے بعض کی تصدیق دوسرے مآخذ سے بھی ہو جاتی ہے۔ ابن سعد نے ان میں سے دو کا ذکر کیا ہے[۱۴۴]۔ یہ تھیں حضرات عمرو بن امیہ ضمری اور جریر بن عبداللہ بجلی کی سفارتیں جو بالترتیب قبیلہ بنو حنیفہ کے جھوٹے نبی مسیلمہ کذاب اور کلاع اور ظلیم کے حکمرانوں کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ طبری نے ان میں سے آٹھ کا ذکر کیا ہے[۱۴۵]۔ ان کا بیان ہے کہ جریر بن عبداللہ کی روانگی کے بعد سات سفراء کو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں میں بھیجا گیا تھا جو حسب ذیل تھے۔

۱۔	حضرت وبر بن یحنّس خزاعی کو	ابناء یمن اور ان کے سرداروں کے پاس
۲۔	حضرت فرات بن حیّان عجلی کو	بنو حنیفہ کے ایک مسلم سردار حضرت ثمامہ بن اُثال کے پاس
۳۔	حضرت اقرع بن عبداللہ حمیری	ذُو زُود اور ذو مُرّان کے حکمرانوں کے پاس
۴۔	حضرت صلصل بن شرحبیل کو	قبیلہ بنی عامر کے پاس
۵۔	حضرت ضرار بن الازور اسدی کو	قبیلہ بنو اسد کے خاندان بنو صیدا اور قبیلہ بنو دیل کے پاس
۶۔	حضرت زیاد بن حنظلہ تمیمی کو	بنو تمیم کے پاس
۷۔	حضرت نعیم بن مسعود اشجعی کو	بنو غطفان یا بنو اشجع کے پاس

بقیہ سفیروں کے اسمائے گرامی اور ان کے علاقوں کے ناموں کے لیے جن کا ذکر صرف اسد الغابہ میں ملتا ہے۔ کتاب کے آخر میں متعلقہ ضمیمہ دیکھنا مفید ہوگا[۱۴۶]۔ جہاں تک ان سفارتوں کا تعلق ہے تو یہ واضح ہے کہ ان کا سیاسی اور مذہبی دونوں مقصد تھے۔ غیر مسلم حکمرانوں اور قبیلوں کے پاس جو سفارتیں گئی تھیں ان کا مطلوب تھا۔ ان کا اسلام اور اسلام قبول کرتے ہی سیاسی مقصد حاصل ہو جاتا کہ وہ از خود اسلامی ریاست کے مطیع و فرمانبردار بن جاتے۔ مسلم سرداروں کے پاس یا تو اس غرض

سے سفیر بھیجے گئے تھے کہ ان سے ان کے اپنے قبیلہ یا پڑوس کے قبیلہ میں تبلیغ اسلام کا کام لیا جائے۔ یا ان کے قبیلہ کے باغیوں کی سرکوبی کے لئے ان کے مسلم طبقات کی حمایت اور مدد حاصل کی جائے جیسا کہ ابناء یمن اور حضرت ثمامہ حنفی کے نام سفارتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض سفارتیں انتظامی مقاصد کے لئے بھیجی گئی تھیں اور قبیلوں یا حکمرانوں سے صدقات و جزیہ کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ عموماً یہ تمام سفارتیں کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھیں۔ سوائے مسیلمہ کذاب اور شاہ بصریٰ کے نام کی سفارت کے۔ اوّل الذکر کے بارے میں ہم ابھی مزید دیکھیں گے۔ جبکہ شاہ بصریٰ حارث بن عمیر غسانی نے سفیر نبوی حضرت حارث بن عمیر ازدی کو قتل کر دیا تھا جس کے نتیجے میں اسلامی ریاست کو فوج کشی کرنی پڑی تھی جس کا مطالعہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔

یہاں مسیلمہ کذاب کے پاس مختلف نبوی سفارتوں کی روانگی کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہوگا۔ اس سے ایک طرف تو ان مدعیانِ نبوت کے اصل عزائم پر روشنی پڑے گی تو دوسری طرف ان سرکشوں کے بارے میں اسلامی ریاست کی پالیسی واضح ہو گی۔ مزید یہ کہ قبائل عرب کے بارے میں اسلامی ریاست کے رویہ پر بھی روشنی پڑے گی۔ اس ضمن میں پہلی سفارت حضرت عمرو بن امیہ ضمری کی معلوم ہوتی ہے۔ جو غالباً سنہ ۹ھ / سنہ ۶۳۱ء میں بھیجی گئی تھی۔ اس نامہ مبارک سے جو سفیر موصوف لیکر مدعی نبوت کے پاس گئے تھے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جوابی سفارت تھی۔ اس سے پہلے مسیلمہ کذاب نے خدمت نبوی میں ایک عریضہ بھیجا تھا جس میں اس نے یہ تجویز رکھی تھی کہ وہ تعاون کے لئے تیار ہے۔ بشرطیکہ جزیرہ نمائے عرب کو دو آزاد و خود مختار مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ جس میں سے ایک اس کے زیر اقتدار ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اس کی تجویز کو مسترد کر دیا تھا۔ بلکہ اس کو مخالفانہ و معاندانہ رویہ سے باز رہنے کی بھی تلقین کی تھی[147]۔ بظاہر یہ سفارت پوری طرح ناکام رہی تھی۔ کیونکہ وہ مسیلمہ کو اس کے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکی تھی۔ چنانچہ بلاذری[148] کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد دو مزید سفارتیں حضرات حبیب بن زید خزرجی اور عبداللہ بن وہب اسلمی کی سرکردگی میں بھیجی گئی تھیں۔ بظاہر ان کا بھی مقصد یہی تھا کہ مسیلمہ کذاب کو مخالفت کی راہ اپنانے سے روکا جائے[149]۔ لیکن اس کا انجام برا نکلا کہ مسیلمہ کذاب نے حضرت حبیب بن زید کو اتنا ستایا کہ ان کو مار ڈالا مگر کسی نہ کسی طرح سے حضرت عبداللہ اسلمی بچ کر نکل آئے اور سارا قصہ خدمت نبوی میں جا کہہ سنایا[150]۔ طبری کے بیان سے ایسا[151] معلوم ہوتا ہے کہ اس المناک حادثہ کے بعد ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فرات بن حیان عجلی کی سفارت بنو حنیفہ کے سردار حضرت ثمامہ بن اثال کے پاس بھیجی تھی جس میں ان سے مسیلمہ کذاب کے شر کا انسداد کرنے کی ہدایت تھی[152]۔ اگرچہ یہ آخری سفارت مسیلمہ کذاب کے فتنہ کو مکمل طور سے ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تاہم بنو حنیفہ کے بڑے خاصے طبقہ کو اس کے جال سے آزاد کرنے اور اسلامی ریاست کا ہمنوا بنانے میں یقیناً کامیاب ہوئی تھی۔ اس ضمن میں ابناء یمن کے نام حضرت وبر بن یحنس کی سفارت آتی ہے۔ جس نے یمن کے ایرانی اشراف و حکمرانوں سے وہاں کے مدعی نبوت و قائد بغاوت اسود عنسی کے فتنہ و فساد کا خاتمہ کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ سفارت مکمل کامیاب رہی تھی۔ کیونکہ ابناء یمن نے ایک متحدہ محاذ بنا کر اسود عنسی کا خاتمہ کر دیا تھا۔[153]

کتانی[154] نے فتح مکہ کے بعد اس کے مغرورین کو تحفظ و ضمانت عطا کرنے والے سفراء نبوی کے ذیل میں دو سفیروں کا

ذکر کیا ہے جن کے نام تھے، حضرات عمیر بن وہب جمحی اور ام حکیم بنت ہشام مخزومی۔ ان دونوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بالترتیب صفوان بن امیہ جمحی اور عکرمہ بن ابی جہل مخزومی کو تحفظ کی ضمانت دی تھی اور بالآخر ان کو دربار رسالت میں لاکر انہیں ایمان کی دولت سے سرفراز کرنے کا سبب بنے تھے۔ سفراء نبوی کی جو فہرست حافظ زین الدین عراقی نے تیار کی ہے اس میں ان دونوں سفیروں کا ذکر نہیں ہے[۱۵]۔ اس فہرست میں کل سترہ سفراء نبوی کے نام شامل ہیں۔ ان مذکورہ بالا تمام سفیروں کے علاوہ مآخذ سے متعدد اور سفیران نبوی کے حوالے ملتے ہیں۔ مگر ان کے نام نہیں مذکور ہوئے ہیں۔ جیسے فروہ بن عمرو جذامی بنو عمرو / حمیر، عدس / لخم کے مسلمانوں، خالد بن ضماد ازدی، عمرو بن حزم، تمیم اوس، یزید بن طفیل اور بنو زیاد بن الحارث کے پاس متعدد سفیر بھیجے گئے تھے۔ امکان ہے کہ ان کے علاوہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد سفیر عرب اور بیرون عرب بھیجے ہوں جن کے نام اور کام محفوظ نہیں رہ سکے بہرحال تمام سفیران نبوی جن کے نام مآخذ میں مذکور ہوتے ہیں کی کل تعداد میری تحقیق کے مطابق ۳۸ ہے۔ جبکہ اس شعبہ میں کل تقرریوں کی تعداد ۴۲ ہے۔ ذیل کی جدول میں ان کا قبائل اور علاقائی تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

علاقہ	قبیلہ / خاندان	تقرریاں	سفراء
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۷	۷
	(الف) بنو ہاشم	۱	۱
	(ب) بنو امیہ	۱	۱
	(ج) بنو سہم	۲	۲
	(د) بنو عامر بن لوی	۱	۱
	(س) بنو مخزوم	۲	۲
	۲۔ خزرج	۳	۲
	۳۔ اوس	۲	۲
شمالی عرب	۱۔ کلب	۳	۲
	۲۔ لخم	۱	۱
مشرقی عرب	۱۔ غطفان	۱	۱
	۲۔ ہوازن	۳	۳
	۳ خزیمہ	۲	۲
مغربی عرب	۱ خزاعہ	۷	۷

	۴۔ کنانہ	۳	۱
	۳۔ ازدشنوءہ	۱	۱
جنوبی عرب	۱۔ بجیلہ	۲	۲
	۲۔ حضرموت	۱	۱
	۳۔ حمیر	۱	۱
	۴۔ سدوس	۲	۲
قبائل پراگندہ	۱۔ تمیم	۱	۱
غیر معروف		۲	۲
میزان	۱۶ قبیلے	۴۲	۳۸

۵۔ مخصوص افسرانِ نبوی (کمشنر)

مرکز میں جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ تمام انتظامی امور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس انجام دیتے تھے لیکن بعض معاملات میں آپ اپنے اختیارات اپنے صحابہ کو منتقل کر دیتے تھے اور ان کے سپرد بعض معاملات کا نفاذ بھی کر دیتے تھے۔ مذکورہ بالا افسران حکومت کے علاوہ آپ نے بعض ایسے افسروں کو بھی مقرر کیا تھا جن کو ہم کسی خاص خانے میں نہیں رکھ سکتے۔ اور نہ ہی مآخذ ان کے لیے کسی مخصوص اصطلاح کا ذکر کرتے ہیں کہ افسرانِ نبوی کا ایک نیا طبقہ بنا دیا جاتا۔ اس کے باوجود بھی یہ طبقہ افسران حکومت نبوی بالکل جدا تھا۔ اور اس کا تعین ہم نے ان کے کاموں کی نوعیت کے لحاظ سے کیا ہے۔ بعض مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کرام کو مخصوص قسم کے کام سونپے تھے۔ یہ کام بھی عارضی تھے اور ان کے افسر اور عہدے بھی عارضی۔ اس لیے ہم ان کو افسران بکار خاص یا کمشنر بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان خصوصی افسروں اور عاملوں کے کاموں کی نوعیت جداگانہ تھی۔ ان میں سے بعض کو اہم ترین کام اور فرائض سونپے گئے تھے۔ جبکہ بعض دوسروں کے کام معمولی نوعیت کے تھے۔ مشہور واقعہ ہے اگرچہ اب جدید مؤرخین نے اس کی صحت پر شک کا اظہار کیا ہے کہ حضرت سعد بن معاذ اوسی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کے یہودیوں کی غداری کے سلسلہ میں فیصلہ کا مجاز یا حکم مقرر کیا تھا اور پھر ان کے فیصلے کو نافذ بھی کیا تھا۔[۱۵۷]

ایک خصوصی افسر نبوی حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی تھے جن کو تین مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا تھا ان میں سے دو بار وہ بنو جذیمہ کے قبیلہ کے مسلمانوں کا خون بہا اور دیت ادا کرنے گئے تھے۔ جن کو مسلمان سپاہیوں اور سالاروں نے غلطی سے قتل کر دیا تھا یہ تقرری شوال ۸ھ / فروری ۶۳۰ء میں ہوئی تھی۔ اس سے ایک ماہ قبل حضرت علی کو فتح مکہ کے دوران اسی مقصد سے ہی مقرر کیا گیا تھا جس میں کچھ مسلمانوں نے جوش میں غلطی کی تھی۔[۱۵۸] اس سے قبل حضرت علی کی اس شعبہ خاص میں تقرری جذام کے قیدیوں اور مال غنیمت کی واپسی کے لئے ہوئی تھی۔ جن کو مسلمان فوج نے غلطی سے پکڑ لیا تھا[۱۵۹] دوسرے

دو معاملات میں ہم کو اسلامی ریاست، کی سازشوں کے بارے میں پالیسی اور طرزِ عمل کا علم ہوتا ہے۔ دونوں واقعات کا تعلق اس زمانے سے ہے جبکہ اسلامی ریاست اپنے اوج و کمال پر تھی۔ یہ غزوہ تبوک کے ذرا قبل اور ذرا بعد کے زمانے کا واقعہ ہے کہ حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی کو مدینہ میں منافقوں اور سازشیوں کے اس گھر کو منہدم کرنے کا حکم ملا تھا۔ جہاں وہ بیٹھ کر اسلامی ریاست کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ انہوں نے حکم نبوی کی پوری طرح سے تعمیل کی تھی[160]۔ اسی طرح غزوہ تبوک کے بعد بحکم نبوی حضرات مالک بن الدخشم اور معن بن عدی اوسی کو منافقوں کے اس مرکز سازش و جائے فتنہ و فساد کو گرانے کا حکم دیا گیا تھا[161]۔ جس کو انہوں نے مسجد کا نام دے رکھا تھا۔ مگر جسے قرآن کریم نے مسجد ضرار (تکلیف و لبغاوت کی مسجد) کا نام دیا ہے[162]۔ مآخذ نے ان مراکز فتنہ و فساد کے انہدام کا ذکر تو کیا ہے۔ لیکن ان کے مجرموں کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔ اس لئے کچھ حتمی طور پر کہنا مشکل ہے۔ غالباً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بغاوت اور فتنہ جوئی کا سدِّ باب کرنا کافی سمجھا تھا اور ان کو عذاب آخرت کے لئے چھوڑ دیا تھا۔

ان سیاسی نوعیت کے مخصوص کاموں کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اخلاقی جرائم کی سزاؤں کے نفاذ کے لئے بھی چند افسروں کو مقرر کیا تھا۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ حضرت انیس بن ضحاک اسلمی کو ان کے قبیلہ کی ایک زانی عورت کو رجم (سنگسار) کرنے کے لئے مامور کیا تھا اور انہوں نے اس کی تعمیل کی تھی[163]۔ یہاں حضرت عمر بن خطاب عدوی کی تقرری کا بھی ذکر کرنا چاہیئے جن کو اسد الغابہ کے مطابق ایک عیسائی کی آدھی دولت ضبط کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ جس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا[164]۔ مآخذ کا آخری جملہ ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ قبول اسلام سے انکار اسلامی قانون میں تعزیری جرم نہیں ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ عیسائی محاصل کی عدم ادائیگی کا مجرم تھا یا اس نے کسی اور تعزیری جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ ایک روایت میں ہم کو دو حقیقی بھائیوں کے درمیان جائیداد کے معاملہ پر اختلاف کا علم ہوتا ہے۔ جس کو طے کرنے کے لئے حضرت حنظلہ بن یمان کو مامور کیا گیا تھا اور انہوں نے بطریق احسن اسے سلجھا دیا تھا[165]۔ کتانی نے حضرات علاء بن عقبہ اور ارقم کو اسی قسم کے مخصوص افسروں کے طبقہ میں شمار کیا ہے[166]۔ اگرچہ ان کے طبقہ کی یہ نشاندہی نہیں کی ہے اصابہ کے مطابق حضرت ابوامامہ باہلی کو خون کھانے کی تحریم کا اعلان کرنے کے لئے مختلف علاقوں میں بھیجا گیا تھا[167]۔ تحریم ماکولات کے ذیل میں بعض افسروں کی تقرری کے امکانات ہیں۔ اسی طرح حضرت علی کی ۹ھ میں سورہ توبہ کی چند آیات جن کا تعلق مکہ میں کافروں کے قیام و داخلہ سے تھا کے اعلان کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ جس کی انہوں نے تعمیل کی تھی[168]۔ بہرحال امکان ہی نہیں یقین ہے کہ مذکورہ بالا افسروں کے علاوہ بہت سے اور بھی افسر تھے جو بکار خاص مقرر کئے گئے تھے ذیل میں ایک جدول دی جا رہی ہے جو مذکورہ بالا افسروں پر مبنی ہے اس سے ان کے علاقائی اور قبائلی تعلق کا علم ہوتا ہے۔

علاقہ	قبیلہ / خاندان	سنہ تقرری ۶۲۸	۶۳۰	۶۳۱	۶۳۲ - ۶۲۲	میزان
مرکزی عرب	۱- قریش	۱	۲	۲	۲	۷

	(الف) بنو ہاشم	۱	۲	۲	-	
	(ب) بنو عدی	-	-	-	۱	
	(ج) بنو تیم	-	-	۱	-	
	(د) بنو مخزوم	-	-	-	۱	
	۲ - اوس	۱	-	۲	-	۴
مغربی عرب	۱- اسلم	-	-	-	۱	۱
	۲- باہلہ	-	-	-	۱	۱
مشرقی عرب	۱- غطفان	-	-	-	۱	۱
غیر معروف	-	-	-	-	۱	۱
میزان	۵ قبیلے	۲	۲	۴	۶	۱۴

۶ - شعراء و خطباءؑ (شاعر اور خطیب)

آج کے زمانے میں شعراء اور خطباء کو سرکاری یا ریاستی افسروں میں شمار کرنا مضحکہ خیز سمجھا جائے گا مگر قرون وسطیٰ میں ان کی ایک سرکاری اہمیت ہوتی تھی اور عرب میں تو ان کو ایک بے مثال اور عدیم النظیر حیثیت اور مقام حاصل تھا ایک جدید مورخ و مستشرق نے "شعراء کو اپنی قوم کے قلب و ضمیر کا محافظ" بجا طور سے کہا ہے چونکہ عرب اہل زبان تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ اس لئے ان کو اپنے شاعروں اور خطیبوں پر بہت ناز تھا۔ دوسری طرف شاعر و خطیب نہ صرف اپنے قبیلہ اور لوگوں کی آواز تھے اور ان کے جذبات و خیالات کی وہ ترجمانی کرتے تھے بلکہ وہ آراء و خیالات کو بناتے بگاڑتے بھی تھے۔ وہ جذبات برانگیختہ کرتے، اپنی قوم یا قبیلہ کو اکساتے اور ان کی ذہنی نشوونما کرتے تھے، عرب شاعری میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ انہیں شاعروں اور خطیبوں نے جذبات میں ہیجان برپا کر کے جنگ تک بھڑکائی۔ اس کے علاوہ خیالات، نظریات اور آراء کے رسل و رسائل کا بھی ایک اہم ذریعہ تھے۔ بہر حال عرب سماج میں ان کا اہم مقام تھا اور اس سے کوئی عرب حکومت صرف نظر نہیں کر سکتی تھی۔

اگرچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شاعرانہ مبالغہ آرائی اور فاحش نگاری اور فحش سخنی کو کبھی پسند نہیں کیا بلکہ ان کی سختی سے مخالفت کی لیکن اس کے باوجود آپ نے شاعری کے خوبصورت و دلآویز پہلوؤں کو ہمیشہ بنظر تحسین دیکھا اور بہتر شاعری کی ہمیشہ تعریف فرمائی اور اس کو پسند کیا آپ اس کے غیر معمولی سماجی اثرات سے واقف تھے۔ لہٰذا اسکو آپ نے اسلامی امت اور اسلامی ریاست کے مفاد میں بہتر سے بہتر طریقے پر استعمال بھی کیا۔ اگر اسلام اور اسی کے رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ جسمانی تہذیب کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو عام طور سے اور

آپ کو خاص طور سے اپنی پوری عوامی زندگی کے دوران سخت ترین عقلی و ذہنی تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اسلام اور اسلامی اصولوں کا اسی شاعری و خطابت کے ذریعہ مذاق اڑایا گیا تھا، مسلمانوں خاص کر مسلمان عورتوں کی عزت و آبرو سے کھیلا گیا تھا، ان کے نسب و حسب پر کیچڑ اچھالی گئی تھی۔ مختلف مسلم طبقات کے درمیان نسلی اور علاقائی منافرت اور دشمنی پھیلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان کے ذاتی مصائب پر پھبتیاں کسی گئی تھیں۔ اسلامی ریاست کے خلاف اس کے دشمنوں کو آمادۂ پیکار کیا گیا تھا اور وہ ساری کوششیں کی گئی تھیں جن سے مسلمانوں کی سبکی ہو، آپ کی مخالفت ہو اور اسلامی ریاست کی بیخ کنی ہو۔ اینٹ کا جواب اینٹ سے دینے کے لئے ضروری تھا کہ اسلامی ریاست بھی شاعری اور خطابت کو اپنے دفاع اور مسلمانوں کی عزت و وقار کے تحفظ کی خاطر استعمال کرے۔ چنانچہ مآخذ کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین اہم شاعروں کی خدمات حاصل کی تھیں، جو آپ کا اور اسلامی ریاست کا دفاع کرتے تھے۔ ان میں سے حضرت حسان بن ثابت خزرجی عظیم ترین شاعر دربار رسالت تھے، جو عرب کی اسلامی شاعری میں ایک خاص ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت حسان عربوں کے حسب نسب (انساب) پر تنقید کیا کرتے تھے، جبکہ حضرت کعب بن مالک ان کو جنگ کے مہلک اثرات و نتائج سے آگاہ کرتے رہتے تھے، اور تیسرے شاعر حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجی ان کو ان کے کفر پر عار دلاتے رہتے تھے[160] ابن اثیر نے اس بیان میں ان شعرائے نبوی کی اہم ترین خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ورنہ صحیح بات تو یہ ہے کہ یہ تینوں شاعر ناموس رسول کے محافظ اور اسلامی ریاست کے ترجمان تھے جو ہر موضوع اور سخن کے ماہر تھے۔ آئیے ابن اسحاق کی سیرت نبوی اور دوسرے مآخذ کے اوراق الٹیں اور دیکھیں کہ اسلامی ریاست کو جاہلی شعراء اور خطباء سے کس قسم کی تنقید کا سامنا تھا اور اس کے جواب میں مسلمانوں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا طریقے اختیار کئے اور ان کے ان تینوں شعراء نے کس طرح سے اپنے رسول اور اپنے اسلامی بھائیوں کا دفاع کیا۔ اس سے ہم کو ان کے عرب سماج میں تاثیر اور تسخیر کی قوت کا اندازہ بھی ہو سکے گا۔

پہلے ہم حضرت حسان بن ثابت خزرجی کی کاوشوں کا مطالعہ کریں گے۔ انہوں نے ہجرت سے پہلے جن موضوعات کو اپنی شاعری کی اساس بنایا تھا۔ ان میں بنو ہاشم کے قریشی اشرافیہ کے ہاتھوں سماجی مقاطعہ[161] اور اس کی منسوخی اور ہجرت نبوی پر ان کی تنقید[162] وغیرہ کا جواب شامل تھا۔ ابن اسحاق کی سیرت رسول اللہ ان کی شاعری کے نمونوں سے بھری ہوئی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ اسلام و رسول دشمنی میں یہودی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ اور انصار کے اوس و خزرج کی صفوں میں منافقین کی صورت میں ان کے ہمدردوں اور خیر خواہوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ حضرت حسان بن ثابت نے ایک موقعہ پر بنو کعب کے ایک شخص ضحاک بن ثابت کو منافقت اور یہوودیوں سے اسلام کے خلاف سازباز کے لئے سخت تنقید کا نشانہ بنایا تھا[163]۔ جنگ بدر میں قریشی فوج کی شکست پر ان کی زبردست تنقید نے اہل مکہ کے سر شرم سے جھکا دیئے تھے[164]۔ مشہور یہودی شاعر کعب بن اشرف کے خلاف جو مکہ والوں کو بدر کا انتقام لینے پر اکسانے کی خاطر مکہ گیا ہوا تھا۔ حضرت حسان بن ثابت کی شاعرانہ تنقید اور اس کے مکی میزبانوں پر چوٹ اتنی گہری تھی کہ کعب بن اشغف کو مکہ سے بھاگنا پڑا تھا[165]۔ مگر یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اپنے فرار سے قبل وہ مکہ میں بدر کے انتقام کے لئے آگ بھڑکا چکا تھا اور اس نے ایک طرح احد کی جنگ کے برانگیختہ کرنے میں کلیدی کردار ادا

کیا تھا۔ حضرت حسان بن ثابت نے جنگ احد کے دوران بعض سرداران قریش کے غیر انسانی رویہ اور غیر معیاری سلوک کیخلاف شدید تنقید کی تھی[۲۸] واقعہ رجیع کے ذمہ دار بنو ہذیل کے خلاف حضرت حسان کی تنقید اتنی شدید اور گہری تھی کہ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اس قبیلہ نے اپنے قاتل کے خلاف اقدام کر کے اس کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ اور اس طرح مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے ظلم کی تلافی کرنی چاہی تھی[۲۹] اسی طرح بئر معونہ کے واقعہ کے بعد حضرت حسان بن ثابت نے ابو البراء اور ان کے خاندان والوں کو اپنے عہد کا تحفظ نہ کر سکنے پر اتنی عار دلائی تھی۔ کہ انہوں نے واقعہ کے ذمہ دار عامر بن طفیل کو جان سے مار ڈالنے کی کوشش کی تھی[۳۰] مختصر طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت حسان کی شاعری کے نمونے ابن اسحاق کی سیرت میں تقریباً ہر موضوع پر مل جاتے ہیں اور ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور اسلامی ریاست کے دفاع میں ان کی کس قدر زبردست افادیت تھی[۳۱] یہی بات حضرات کعب بن مالک اور عبد اللہ بن رواحہ باقی دو شاعران دربار رسالت کے بارے میں بھی صحیح ہے[۳۲]

مذکورہ بالا شعراء کے علاوہ عہد نبوی میں بہت سے شاعر تھے۔ جن میں سے بعض عرب شاعری اور ادب کی آبرو ہیں ان میں سے بھی بعض نے اپنے نجی مقام اور حیثیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محافظت لسانی کی تھی اور ریاست اسلامی کی ہر طرح سے خدمت کی تھی۔ مشہور سیرت نگار رسول ابن سید الناس (م ۷۳۴ھ / ۱۳۳۳-۳۴ء) نے اپنی تصنیف "منح المدح" میں عہد نبوی کے دو سو شعراء کو شمار کیا ہے۔ ان میں اہم ترین تھے: حضرات کعب بن زہیر، لبید، خنساء، علی بن ابی طالب عامر بن اکوع اور عباس بن مرداس سلمی وغیرہ۔[۳۳]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سرکاری خطیبوں میں صرف ایک حضرت ثابت بن قیس بن شماس خزرجی کا ذکر ملتا ہے جو انصار کے قومی خطیب تھے۔ ان کی خدمات کا ذکر بنو تمیم کے اس وفد کی آمد اور اس کے شاعروں اور خطیبوں کی مفاخرت کے ضمن میں ملتا ہے جس میں حضرت زبرقان بن بدر وغیرہ شامل تھے۔ اس موقعہ پر انہوں نے تمیمی مفاخر پسندوں سے اپنی برتری منوائی تھی[۳۴] ان کے علاوہ متعدد صحابہ کرام وقت کے شعلہ نوا خطیب تھے۔ ان میں حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق علی بن ابی طالب، جعفر بن ابی طالب، سہیل بن عمرو، عامری وغیرہ بہت ممتاز مقام کے مالک تھے۔ ان کے جواہر پارے آج بھی دلوں کو گرماتے ہیں۔ لیکن یہ کتنی خوشگوار حیرت کی بات ہے کہ اس زمانے کے سب سے بڑے اور پرشکوہ خطیب خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ جن کے کلمات طیبات عربی ادب کی آبرو اور عربی خطابت کی شان ہیں اور جن کا اولیت کے لحاظ سے مرتبہ صرف کلام اللہ کے بعد ہے۔

۱۔ متفرق ماتحت اور چھوٹے کارکن

ماخذ ایک ایسے دلچسپ طبقہ کارکنان کا حوالہ دیتے ہیں جو عہد نبوی میں چھوٹے موٹے کام انجام دیتا تھا اور جن کو مختلف ناموں آذن (اجازت دینے والا)، بَوّاب (چوکیدار، دروازہ کا نگران)، حاجب (دروازہ پر پوچھ گچھ، روک ٹوک کرنے والا)

سے پکارا جاتا تھا۔ مختلف ناموں کے سبب بعض متاخر مصنفین کو یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ یہ تینوں مختلف افسر تھے اور اسی لحاظ سے ان پر بحث کی ہے۔ حالانکہ ان تینوں کارکنوں کے فرائض کی نوعیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کارکن صرف ایک تھا جس کے لئے مختلف اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ وہ دراصل مترادفات ہیں اور ان کا مفہوم یہ تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لئے اجازت کی ضرورت ہوتی تھی جو یہ کارکن ملاقاتی کے لئے فراہم کرتے تھے۔ لیکن یہاں یہ بات واضح کر دی جائے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، کیا بحیثیت رسول خدا اور کیا بحیثیت سربراہ ریاست و حکومت، ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بلکہ ہر شہری کی پہنچ کے اندر تھے اور ہر شخص آپ سے ہر وقت ملاقات بلا کسی روک ٹوک کے کر سکتا تھا۔ جیسا کہ بخاری کی ایک روایت سے واضح ہوتا ہے[183] تاہم بعض اوقات سیاسی تقاضے اور وقتی ضرورت اس بات کا مطالبہ کرتی تھی کہ خدمت نبوی میں آنے والوں پر پابندی لگائی جائے۔ یہ اہم مواقع ہوتے تھے جب اس قسم کی روک ٹوک کے لئے کسی چوکیدار یا بواب کی ضرورت پڑتی تھی۔ ایسے مواقع پر بلا اجازت نبوی بڑے سے بڑے صحابہ کو بھی داخلہ کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ جیسا کہ ہم اپنے اس بیان میں دیکھیں گے۔

ایسے کسی کارکن کی پہلی تقرری کی شہادت ہم کو سنہ ۲ھ / ۶۲۴ء میں غزوہ بنو قینقاع کے بیان کے ضمن میں ملتی ہے واقدی کا بیان ہے کہ جب یہود بنی قینقاع کے اخراج مدینہ کا فیصلۂ نبوی لوگوں کو معلوم ہوا تو منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول نے، جو ان کا قدیم حلیف تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موضوع پر بات کرنی چاہی مگر اسے در نبوی پر حضرت عویم بن ساعدۃ نے جو اس دن بوّاب کے فرائض انجام دے رہے تھے روک دیا اور بلا اجازت داخل نہیں ہونے دیا۔ عبداللہ بن ابی نے حضرت عویم کو دھکا دیکر زبردستی داخل ہونے کی کوشش کی۔ مگر دربار نبوی کے محافظ نے اس کے چہرے پر اس زور کا ہاتھ مارا کہ وہ لہولہان ہوگیا بعد میں جب رئیس المنافقین نے حضرت عویم کی شکایت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تو آپ نے اس کو مورد الزام ٹھہرایا کیونکہ اس نے کارکن نبوی کی حکم عدولی کی تھی اور غلط طور سے خدمت نبوی میں داخل ہونا چاہا تھا[184]۔ یہ واقعہ کچھ تفصیل سے اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ اس عامل نبوی کے کام کی نوعیت کے ساتھ ساتھ اس کے مقام و مرتبہ کی حیثیت بھی اجاگر ہو جائے۔

دوسری متعین شہادت کا تعلق واقعہ ایلاء[185] سے ہے جو سنہ ۹ھ میں پیش آیا تھا اور جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عارضی طور سے اپنی ازواج مطہرات سے جدائی اختیار کر لی تھی اور مشربہ ام ابراہیم یا مشربہ عائشہ میں رہائش اختیار کر لی تھی[186] اسی اثناء میں یہ افواہ بازاروں میں گشت کرنے لگی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ازواج مطہرات کو طلاق دیدی ہے ہر شخص مضطرب اور بے چین تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ بن خطاب اصل واقعہ معلوم کرنے کے لئے آپ کے دولت کدے پہنچے مگر آپ کے دروازے پر متعین چوکیدار (آذن)، حضرت رباح حبشی نے دوسری بار اجازت مانگنے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ پہلی بار اجازت طلبی پر آپ نے سکوت اختیار فرمایا تھا۔ بہر حال بعد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو اجازت عطا کر دی تھی اور حضرت رباح حبشی نے ان کو داخل ہونے دیا تھا[187]۔

بلاذری اور طبری کا بیان ہے کہ حضرت رباح حبشی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل دربان (آذن) تھے[188]۔ یہی دونوں

مورخین رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور مولیٰ حضرت انسہ کو بھی دربانوں میں شمار کرتے ہیں[۱۸۹] جبکہ محمد بن حبیب بغدادی نے ان کو حاجیوں میں شمار کیا ہے۔ حالانکہ ان کے لئے لفظ آذن ہی استعمال کیا ہے۔ بخاری اور مسلم کی ایک روایت حضرت ابوموسیٰ اشعری کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک موقعہ پر دربان بتاتی ہے۔ جب انہوں نے حضرات ابوبکر و عمر و عثمان کے لئے خدمت نبوی میں داخلہ کی اجازت حاصل کی تھی اور دوسروں کو آنے سے روک دیا تھا۔[۱۹۰] اسی طرح قضاعی اپنی کتاب انباء الانبیاء اور ابن العربی اپنی تصنیف "الاحکام" میں کہتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک بھی یہ خدمت انجام دیا کرتے تھے۔[۱۹۱]

اسد الغابہ کی ایک روایت کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن زمعہ اسدی اپنے اسلام کے بعد زندگی بھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دربانی کرتے رہے اور اس طرح سے دربار نبوی میں آنے والوں کی آمد کو منظم کرتے رہے[۱۹۲]۔ اس روایت سے ایک مستقل دربان کی موجودگی کا علم ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مستقل تقرری اگرچہ رضاکارانہ تھی۔ تاہم اس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت حاصل تھی۔ مگر اس دربان کی تقرری کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ شرف ملاقات حاصل کرنے میں کسی قسم کی قدغن لگ گئی تھی۔ تمام مسلمان کسی روک ٹوک کے اب بھی آپؐ سے مل سکتے تھے۔ یہ صرف ان مواقع کے لئے مخصوص تھی کہ جب حکومت و ریاست کے اہم معاملات پر غور و خوض کر رہے ہوتے تھے یا اپنے مشیروں سے گفتگو اور صلاح و مشورے میں مشغول ہوتے تھے۔ کیونکہ فتح مکہ کے بعد ریاستی اور حکومتی امور خاصے پیچیدہ اور اہم ہو گئے تھے۔ جن کو بھرپور توجہ کی ضرورت تھی۔ قسطلانی اور ان کے شارح زرقانی کے مطابق دربان نبوی کا عہدہ خالصتاً اعزازی تھا اور اس کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔[۱۹۳]

آخر میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عہد نبوی میں سرکاری دربان کا عہدہ اموی اور عباسی عہد کے عہدے حاجب یا بواب سے قطعی مختلف تھا۔[۱۹۴] بعد کے زمانے میں خلیفہ اور عوام کے درمیان ایک مستقل حد فاصل قائم کرنا مقصود تھا جبکہ عہد نبوی میں مخصوص مواقع پر غیر ضروری آمد پر قدغن لگانا تھا۔

(ب) صوبائی انتظامیہ / شہری نظم و نسق

اسلامی فتوحات کے بعد خاص کر فتح مکہ کے بعد اسلامی ریاست کا رقبہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور مختلف خطے مدینہ کی ریاست و حکومت کی ماتحتی میں آ گئے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے علاقے تھے جن کی اپنی منظم حکومتیں تھیں اور باقاعدہ نظام حکومت تھا۔ جیسے یمن، بحرین، حضرموت، عمان، ایلہ، کندہ وغیرہ کے علاقے۔ بقیہ علاقوں میں قبائلی سیاسی نظام قائم و جاری تھا۔ مدینہ کی نبوی حکومت سے ان تمام مفتوحہ و مقبوضہ و محروسہ علاقوں کو کسی نہ کسی قسم کا تعلق قائم کرنا تھا۔ ذکر آ چکا ہے کہ ابتدائی زمانے میں اسلامی ریاست نے پڑوسی قبائل اور علاقوں سے باہمی تعاون اور دوستی و حلف کے تعلقات استوار کئے تھے۔[۱۹۵] چنانچہ آغاز ۶۲۳ء / اواسط ۵ھ سے اواخر ۶ھ / ۶۲۸ء تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے نواح میں آباد مختلف قبائل سے دوستی کے معاہدے کر لئے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ علاقے اسلامی ریاست کے سیاسی اثر و نفوذ میں آتے گئے اور بالآخر اس میں ضم ہو گئے۔ اسی طرح یہود مدینہ کے مفتوحہ علاقے بھی اسلامی ریاست کے حصے بن گئے۔ چونکہ یہ مرکز اسلامی سے



قافلۂ حج، منیٰ سے عرفات کی جانب

قریب تھے۔ لہٰذا ان کے انتظام و انصرام کا کوئی مسئلہ نہیں تھا وہ ازخود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرکزی انتظامیہ کے ماتحت آ گئے۔ مگر جب مرکز سے دور کچھ علاقے فتح ہوئے یا انہوں نے اپنی مرضی سے اسلامی ریاست کا حصہ بننا پسند کیا، تو ان کے انتظام و انصرام کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اسی دوران ریاست اسلامی کی قبائل عرب کے بارے میں پالیسی میں تبدیلی ہوئی اور اب باہمی تعاون اور حلف کے معاہدوں کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔ کیونکہ وہ ایک طرح سے سیاسی افتراق و انتظامی انتشار کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ جبکہ اسلام کا مقصود مذہبی اتحاد کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی اتحاد بھی تھا۔ اسی پالیسی کے تحت مختلف علاقوں یا ولایتوں کے لیے مرکزی منتظم، والی یا گورنر مقرر کئے گئے تاکہ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں کو مرکزی حکومت سے وابستہ کیا جائے۔

۱۔ والی / ولاۃ گورنر

عام خیال ہے کہ عہد نبوی میں اسلامی ریاست کو صوبوں یا انتظامی اکائیوں میں تقسیم کیا نہیں گیا تھا۔ مگر یہ خیال غلط ہے۔ مآخذ سے عام طور سے اور طبری کے بیان[۱۹۲] سے خاص طور سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسلامی ریاست کو مختلف اور باقاعدہ ولایات میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اور یمن بلکہ جنوبی عرب کے بارے میں تو یہ حتمی طور پر بیان ملتا ہے۔ کہ وہ مختلف ولایات میں نہ صرف تقسیم کیا گیا تھا بلکہ ان کی باقاعدہ سرحدیں یا حدود (حیتز) تھے۔ ممکن ہے کہ باقاعدہ جغرافیائی تقسیم اتنی پختہ اور حتمی نہ ہو۔ جیسے کہ موجودہ زمانے میں ہوتی ہے، تاہم یہ یقینی ہے کہ ہر والی کو اپنے علاقہ اور ولایت کے حدود کا بخوبی علم تھا۔ بہرحال اندازہ یہ ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں اسلامی ریاست ۷ ۲ ولایتوں میں تقسیم کی گئی تھی۔ اور ان میں سے ہر ایک پر ایک والی مقرر کیا گیا تھا۔ جو اپنے علاقہ کے نظم و نسق میں خود مختار ہوتا تھا۔

غالباً وادی القری[۱۹۷] پہلا علاقہ تھا جو کسی والی کی ماتحتی میں دیا گیا تھا۔ یہ والی العبض تاریخی قرائن کے مطابق ۵ھ/۶۲۷ء میں کسی وقت مقرر کیا تھا اور ان کا نام حضرت عمرو بن سعید اموی تھا جو بنو امیہ کے سعیدی خاندان کے ایک معزز فرد ہونے کے علاوہ قدیم مسلم تھے[۱۹۸]۔ ان کا مرکز حکومت یا صدر مقام وادی ہی میں تھا۔ ایک روائت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ایک خاصے وسیع اور بڑے خطے کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اور اس عہدہ عظیم پر وفات نبوی کے وقت تک فائز رہے تھے[۱۹۹]۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ خاصے طویل عرصے لیعنی ساڑھے تین چار سال تک گورنر رہے تھے۔ یہ عہد نبوی کی حکومت میں مرکزیت اور طبقہ افسران و عمال کے استقلال کی واضح علامت اور بین شہادت تھی۔ حضرت عمرو اموی کے بھائی حضرت عبداللہ و حکم ابن سعید اموی کو محمد بن حبیب بغدادی[۲۰۰] کے بقول "قری عربیہ[۲۰۱]" کا والی غالباً اسی زمانے میں مقرر کیا گیا تھا[۲۰۲]۔ ایک اور گورنر جن کی تقرری اسی زمانے میں ہوئی تھی۔ حضرت یزید بن ابی سفیان اموی تھے۔ جن کو تیماء کی ولایت سونپی گئی تھی[۲۰۳]۔ یہاں اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تین گورنروں کا تعلق بنو امیہ کے دو اہم ترین خاندانوں سے تھا۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ بنو امیہ لیاقت و صلاحیت کے اعتبار سے ممتاز و فائق تھے۔ اسی زمانے میں غالباً چوتھے گورنر کی اسی علاقے میں تقرری

ہوئی تھی جن کا نام سواد بن غزیہ تھا اور جو بنو بخار / خزرج کے ایک اہم فرد تھے۔ ان کو خیبر کے علاقے کی گورنری تفویض ہوئی تھی[۲۰۴]
یہ محض اتفاق تھا یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوچی سمجھی پالیسی تھی کہ اسلامی ریاست کی مرکزی حکومت کے دائرے کو سب سے پہلے مرکز اسلام کے شمال میں وسعت دی گئی تھی اور بعض اہم شمالی علاقوں کو مرکزی حکومت کے ماتحت اور اقتدار کے تحت لایا گیا تھا[۲۰۵]؟ تمام تاریخی شواہد دوسرے متبادل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ شمالی علاقے سیاسی اور فوجی لحاظ سے بہت اہم تھے۔ جزیرہ نمائے عرب کی شمالی سرحدوں پر وقت کی دو عظیم طاقتوں کی باجگذار اور ماتحت حکومتیں / سلطنتیں موجود تھیں اور ان کے پرے ان کے سیاسی و فوجی آقا اپنی پوری طاقت کے ساتھ موجود تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت ان خطرات کی طرف سے آنکھیں نہیں موند سکتی تھی۔ جو ان طاقت ور حکومتوں کی موجودگی سے اس کو لاحق تھے چنانچہ آپ نے شمالی علاقے میں اپنی طاقت کو شروع سے مستحکم اور پائیدار کرنا شروع کیا تھا۔ اور اپنی سیاسی بالادستی کو ہر طرح سے قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ شمال کے غیر مسلم قبائل سے خراج اور جزیہ کی وصولیابی جو اسلامی تاریخ میں اس کی پہلی مثالیں تھیں۔ اسی سیاسی بالادستی کی ایک علامت اور ان شمالی علاقوں کی محکومیت اور زیردستی کی شہادت تھی۔ اور ان علاقوں پر مرکزی والیوں کی تقرری مرکز کے مکمل اقتدار و انتظام کی ایک مزید علامت۔ صحیح تاریخی اور واقعاتی تناظر میں دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ سے قبل اس اہم ترین شمالی علاقے میں چار والیوں کی مستقل تقرری دراصل سیاسی اور انتظامی مرکزیت کی تمہید تھی۔ جس کے نتیجہ میں پورا عرب ایک مرکز کے تحت مجتمع ہونے والا تھا[۲۰۶]۔

فتح مکہ کے بعد کا متصل زمانہ جزیرہ نمائے عرب کے تمام علاقوں اور خطوں کے ایک انتظامی مرکز سے وابستہ ہونے کا زمانہ تھا۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی ریاست اور حکومت کی مرکزیت و اجتماعیت اب پورے عرب پر محیط ہو گئی تھی۔ مدینہ میں مقیم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سیاسی اور انتظامی اقتدار و اختیار عرب کے ہر قبیلہ، خطہ بلکہ ہر فرد کے لئے ماننا ناگزیر تھا اور اس بالادستی کو تسلیم کرنے کی علامت محض بعض صدقات اور محاصل کی ادائیگی ہی نہیں تھی بلکہ ہر قبیلہ اور خطہ کے درمیان والیٔ رسول کی موجودگی و حکمرانی بھی تھی۔ یہاں تک عرب کا سب سے اہم اور طاقت ور شہر مکہ بھی، اسلامی ریاست کا ایک ماتحت علاقہ / ولایت بن گیا تھا جو سیاسی اور انتظامی اعتبار سے مدینہ کا ماتحت و محکوم تھا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت ہبیرہ بن شبل ثقفی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ حنین کے لئے روانہ ہونے سے قبل مکہ کا گورنر / والی مقرر کیا تھا[۲۰۷]، مگر جلد ہی کو ان کو تبدیل کر دیا گیا اور ان کی جگہ مکہ ہی کے ایک باشندے اور قریشی خانوادے بنو امیہ کے ایک نمایاں فرد حضرت عتاب بن اسید اموی کو جو صرف ۱۸ سال کے نوجوان تھے اور فتح مکہ کے بعد ہی اسلام لائے تھے مکہ اور اس کے ماتحت علاقوں کا گورنر / والی مقرر کر دیا گیا تھا[۲۰۸]۔ نوجوانی کی ناتجربہ کاری اور تاخیر سے اسلام قبول کرنے کی مفضولیت کے ساتھ ساتھ حضرت عتاب بن اسید کی تقرری کی اہمیت اس حقیقت کے پس منظر میں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کو اس منصب جلیل کے لئے کثیر تعداد میں موجود اشراف مکہ اور اکابر قریش پر ترجیح دی گئی تھی[۲۰۹]۔ یہ حقیقت ان کی انتظامی صلاحیت و حسن تدبیر کی شہادت فراہم کرتی ہے۔ بہر حال معلوم یہ ہوتا ہے کہ ان کی تقرری شوال ۸ھ / فروری ۶۳۰ء میں کسی وقت عمل میں آئی تھی۔ اور وہ پورے عہد نبوی میں اپنے اس عہدہ پر برقرار رہے تھے۔ بلکہ خلافت صدیقی میں بھی اس عہدہ کو انہوں نے سرفراز کیا تھا[۲۱۰]۔ گویا کہ وہ کل ملا کر پانچ چھ برس اس منصب پر فائز رہے تھے: تقریباً تین برس عہد نبوی میں اور اتنی ہی مدت تک خلافت صدیقی میں۔ کیا یہ عہد نبوی کے انتظامیہ میں مرکزیت اور استقلال

کے پیدا ہونے کی ایک واقعاتی شہادت نہیں ہے؟ حضرت عتاب بن اسید ہی کے معاملہ میں ہم کو مزید شہادت اس امر کی ملتی ہے کہ گورنروں / والیوں کو ان کی خدمات کے لئے باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔ مآخذ کے مطابق حضرت عتاب کو چالیس اوقیہ چاندی ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ اور غالباً وہ ان کو ان کی تقرری کے آخری دن تک ملتی رہی تھی[۲۱۱]

دوسرے برس طائف از خود مدینہ کی سیاسی بالادستی اور انتظامی اقتدار کی چھتری تلے آگیا اور اس کو بھی نتیجتاً ایک گورنر والی کی ماتحتی میں دے دیا گیا۔ طائف کے گورنر حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی اٹھارہ برس کے نوجوان تھے اور مآخذ کے مطابق وہ اس وفد کے اراکین میں سے ایک تھے۔ جس نے مدینہ پہنچ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دی تھی اور طائف کے قبول اسلام و تسلیم اقتدار مدینہ کا اعتراف و معاہدہ کیا تھا۔ حضرت عثمان ثقفی حضرت عتاب اموی گورنر مکہ سے بھی زیادہ مدت تک اپنے عہدے پر برقرار رہے تھے۔ مآخذ کے مطابق وہ حضرت عمر فاروق کی خلافت کے ابتدائی زمانے تک وہاں کے گورنر رہے تھے[۲۱۲] ابن اسحاق کا ایک تبصرہ ان کی اس عہدہ عظیم پر تقرری کے سبب و اساس کو ظاہر کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن ابی العاص کو ان پر ان کی نوعمری کے باوجود اس لئے مقرر کیا تھا کہ وہ اسلام اور قرآن سیکھنے کے معاملے میں سب سے زیادہ پرجوش تھے[۲۱۳] اس تبصرہ سے ان کی مذہبی معلومات کا علم ہوتا ہے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہی ان کی تقرری کی اصل یا واحد بنیاد تھی۔ یہ ان کی تقرری کی مزید بنیاد یا استحقاق تھا۔ ورنہ اصل سبب انتظامی اور تنظیمی لیاقت تھی۔ اس کی ایک شہادت تو ان کی وفد ثقیف میں شمولیت تھی اور دوسری شہادت اتنی مدت تک اس اہم عہدہ پر ان کا فائز رہنا تھا۔ اس کے علاوہ اسلام اور قرآن میں تفقہ کا مطلب محض مذہبی معلومات نہیں تھیں بلکہ اسلامی قوانین سے واقفیت بھی تھی۔

ایک اور گورنر حضرت حذیفہ بن یمان ازدی تھے۔ جن کو طائف کے قریب واقع دبا نامی ولایت سونپی گئی تھی اور انہوں نے حیاتِ نبوی کے اواخر تک اس کے انتظام و انصرام کو سنبھالا تھا[۲۱۴] اسی زمانے میں ایک اور گورنر کی تقرری جدہ کے لیے ہوئی تھی۔ اسد الغابہ کے مطابق حضرت حارث بن نوفل ہاشمی کو غالباً ۹ھ کے آغاز اور ۶۳۰ء کے وسط میں اس منصب پر مقرر کیا گیا تھا[۲۱۵] ان کی تقرری کے سلسلہ میں دو تین نکات کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے اول یہ کہ وہ واحد ہاشمی تھے جن کو یہ منصب عظیم عطا کیا گیا تھا۔ دوم یہ کہ وہ مدتوں تک اسلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دشمن رہے تھے۔ سوم یہ کہ انہوں نے کافی تاخیر سے اسلام قبول کیا تھا۔ اور چہارم یہ کہ وہ حیات نبوی کے آخر تک اس عہدہ پر برقرار رہے تھے اور خلافت راشدہ میں بھی اس عہدہ پر اسلامی ریاست کی خدمت کی تھی[۲۱۶]

فتح مکہ کے بعد اسلامی ریاست کی قبائلی عرب کے بارے میں پالیسی بدلی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ جنوب، مشرق اور جنوب مشرق میں اسلام اور اسلامی ریاست کے اقتدار کے داخلہ کا دروازہ بھی کھل گیا تھا چنانچہ وہ تمام علاقے جو طاقت کے ذریعہ فتح کئے گئے ہوں (عَنوۃً) یا صلح کے ذریعہ (صُلحاً) اسلامی اقتدار کی ماتحتی میں آئے ہوں یکے بعد دیگرے گورنروں اور والیوں کی ماتحتی میں دیدیئے گئے تھے۔ ان علاقوں میں ایک طرح سے دہرا انتظام حکومت قائم کیا گیا تھا۔ جن مملکتوں اور خطوں کے حکمرانوں اور بادشاہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کو ان کے مقام پر برقرار رکھا گیا تھا مگر

اب ان کی حیثیت آزاد و خود مختار حکمرانوں کی بجائے ماتحت گورنروں کی تھی جن کو مدینہ کی مرکزی حکومت کا اقتدار تسلیم اور اس کی ہدایات و احکام کی تعمیل کرنا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ان علاقوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادہ نمائندوں کو بھی نگرانی یا مرکزی حکومت کے مفادات کے تحفظ کی خاطر تعینات کیا گیا تھا اور جن کی اطاعت دراصل مرکزی حکومت یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری سمجھی جاتی تھی۔

اس پورے خطے میں سب سے پہلے مشرقی خطوں کے علاقوں میں گورنر یا والی مقرر کئے گئے تھے اور ان کی یہ تقرری فتح مکہ کے مابعد ہوئی تھی۔ حضرت عمرو بن عاص سہمی کو مملکت عمان پر مرکزی منتظم کی حیثیت سے مقرر کیا گیا تھا۔ جہاں کے مقامی حکمران حضرات عبد و جیفر فرزندان جلندی نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اسلامی ریاست کے وفادار بن گئے تھے۔[۲۱۸] اسی طرح بحرین کے بادشاہ حضرت منذر بن ساوی نے اسلام قبول کر کے اپنی مملکت کو اسلامی ریاست میں ضم کر دیا تھا اور ان کے علاقے کے لئے حضرت علاء بن حضرمی کو مرکزی منتظم بنایا گیا تھا لیکن محمد بن حبیب بغدادی کا خیال ہے کہ مملکت بحرین کیلئے دو گورنروں یا مرکزی منتظموں کی تقرری ہوئی تھی: حضرت علاء بن حضرمی کو قطیف کا علاقہ تفویض کیا گیا جبکہ حضرت ابان بن سعید اموی کو جو بنو امیہ کے خاندان سعیدی کے ایک ممتاز فرد اور متاخر مسلم تھے۔ الخط کے علاقے پر مقرر کیا گیا تھا۔[۲۱۹] بلاذری نے اس سلسلے میں بالکل دوسری بات کہی ہے وہ اس روایت کو بیان ضرور کرتے ہیں۔ مگر اس کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اصل معاملہ یہ تھا کہ حضرت علاء بن حضرمی کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت ابان بن سعید اموی کو بحرین کا گورنر یا منتظم مقرر کیا گیا تھا[۲۱۹] حضرت علاء بن حضرمی کی تقرری اور معزولی کے بارے میں خاصا اختلاف و تناقض ہے جو کسی حتمی فیصلے اور قطعی رائے پر پہنچنے میں حارج ہے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ مملکت بحرین کے دو مختلف حصوں کیلئے دو مختلف مرکزی منتظم مقرر کئے گئے تھے۔ کیوں کہ تمام اختلاف و تناقض کے باوجود حضرت علاء بن حضرمی کی مسلسل و متواتر موجودگی اس علاقے میں ملتی ہے۔

مدینہ منورہ کے شمال قریب کی چار دانگوں کے علاوہ شمال بعید میں وادی القریٰ اور شمالی حدود شام کے درمیان خاصا بڑا خطہ تھا جہاں متعدد عرب، عیسائی اور یہودی بستیاں، قبیلے اور مملکتیں تھیں۔ ان کے حکمران سردارن (اشراف) کہلاتے تھے۔ فتح مکہ اور غزوہ تبوک کے زمانے میں ان سرداروں نے اسلامی ریاست کے صلح کے معاہدوں یا عہدات نبوی کے نتیجہ میں تسلیم کر لیا تھا۔ ان میں کندہ کی مملکت دومۃ الجندل بھی شامل تھی جس کا حکمران ملک (بادشاہ) کہلاتا تھا۔ اور جس نے اسلامی ریاست کو جزیہ ادا کرنا منظور کیا تھا۔ ان تمام طاقت کے علاقوں یا خطوں میں مرکزی منتظمین یا گورنر مقرر کئے گئے تھے اگرچہ ان منتظمین کے نام واضح طور سے مآخذ میں نہیں ملتے ہیں تاہم ان علاقوں سے کئے گئے معاہدات نبوی میں خاص کر صلحناموں میں ان کے حوالے بکثرت ملتے ہیں۔ ان مرکزی منتظمین میں عاملین صدقات و جزیہ ٹیکس و محاصل کے افسروں کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے۔[۲۲۰]

بہرحال مملکت ایلہ کے ضمن میں اسلامی مرکزی منتظمین کے نام بھی بصراحت ملتے ہیں۔ جس سے اس علاقہ کی انتظامی مشنری کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ابن سعد وغیرہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایلہ کے مختلف علاقوں پر کم از کم

پانچ مرکزی منتظمین مقرر کیے گئے تھے۔ ان کے نام تھے: حضرات شرجیل بن حسنہ کندی[۲۲۱]، اُبَیّ بن کعب خزرجی[۲۲۲]، حرملہ[۲۲۳] حریث بن زید طائی[۲۲۴] اور جہم بن صلت[۲۲۵]۔ غالباً ان سب کی تقرری ۹ھ کے آغاز یا اواخر میں ہوئی تھی۔ ایلہ اور دوسرے علاقوں کے سرداروں کے نام ایک فرمانِ نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ آپ کے فرستادوں (رسل) کی مکمل اطاعت کریں[۲۲۶]۔ اگرچہ دوسرے علاقوں جیسے جرباء، مقنا، اذرح، دومہ وغیرہ کے لیے مرکزی منتظمین یا عاملین صدقات کا صریح ذکر نہیں ملتا ہے تاہم یہ یقینی ہے کہ ان علاقوں کے لیے بھی کچھ منتظمین ضرور مقرر کیے گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شرجیل بن حسنہ کندی کو اس پورے شمالی خطے کا گورنر جنرل یا منتظمِ اعلیٰ مقرر کیا گیا تھا اور ان کا صدر مقام ایلہ کو بنایا گیا تھا۔ بقیہ مرکزی منتظمین ان کے ماتحت اور تابع تھے۔ غالباً یہ انتظام مدینہ سے طویل مسافت کے سبب کیا گیا تھا تاکہ اس دور دراز کے علاقہ میں انتظامی وحدت اور سیاسی مرکزیت پیدا کی جا سکے۔

یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ سب سے زیادہ تعداد میں مرکزی منتظمین اور گورنر جنوبی عرب کے مختلف خطوں میں بھیجے گئے تھے اس کے بہت سے ظاہری اور نمایاں اسباب تھے۔ اوّل یہ کہ جغرافیائی لحاظ سے یہ بہت بڑا رقبہ تھا۔ جس پر ایک فرد کا حکومتی اداروں کی نگرانی کرنا ناممکن تھا۔ دوم یہ کہ سیاسی لحاظ سے یہ پورا علاقہ متعدد متمدن اور منظم حکومتوں کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ سوم یہ کہ تہذیب و تمدن کے بلند معیار کے سبب یہاں کا سیاسی نظام خاصا پیچیدہ تھا اور چہارم یہ کہ مدینہ سے طویل مسافت کے سبب ہر علاقہ پر زیادہ قریبی نگرانی کی ضرورت تھی اور پنجم یہ کہ پورا علاقہ اسلام سے کافی دیر میں روشناس ہوا تھا اس لئے اس علاقے میں ابھی تبلیغ اسلام اور اس سے زیادہ تعلیم اسلام کی زیادہ ضرورت تھی۔

اس علاقہ میں پہلا خطہ جو اسلامی ریاست کی انتظامی ماتحتی میں آیا وہ نجران تھا۔ جہاں کے عیسائی طبقات نے نہ صرف از خود مدینہ پہنچ کر جزیہ ادا کرنے پر صلح کر لی تھی[۲۲۷] بلکہ ایک عامل اور منتظم کو اپنے علاقہ میں مقرر کرنے کی بھی درخواست کی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خواہش پر حضرت ابو عبیدہ بن جراح فہری کو ان کے وفد کے ساتھ ۹ھ میں ان کے علاقہ کا منتظم و عامل بنا کر بھیجا تھا[۲۲۸]۔ ماخذ کے مختلف بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابی موصوف کو نجران کا محض عامل یا مذہبی مبلغ و منتظم بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا۔ بلکہ ان کو مکمل انتظامی اختیارات بھی حاصل تھے۔ روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ جائیں اور ان کے اختلافی معاملات میں ایمانداری سے فیصلے کیا کریں[۲۲۹]۔ ابن اسحاق ان کی تقرری کو ایک "عہدہ" قرار دیتے ہیں جبکہ ابن خلدون اس عہدہ دار کو "والی" بتاتے ہیں[۲۳۰]۔ اس کے علاوہ ابن سعد کا یہ بیان بڑا اہم اور دلچسپ ہے کہ حضرت ابو عبیدہ بن جراح فہری کی ایک اپنی مہر تھی جس کو وہ کاغذات پر لگایا کرتے تھے۔ اس مہر پر نقش تھا یہ کہ الخُمُسُ لِلّٰہِ "خمس یعنی ۱/۵ اللہ کے لئے ہے۔" یہ گویا ان کی ولایت کی ایک قطعی دلیل تھی۔

۹ھ / ۶۳۱ء میں جب حضرت خالد بن ولید مخزومی نے نجران کے علاقے میں بنو الحارث بن کعب کے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کر کے ابتدائی کام کر لیا تھا تو ذی قعدہ ۱۰ھ / فروری ۶۳۲ء میں خزرج کے خاندان بنو نجار کے ایک نوجوان صحابی حضرت عمرو بن حزم کو اس علاقہ کا گورنر مقرر کیا گیا[۲۳۲]۔ اس بات کے پختہ قرائن ہیں کہ انہوں نے حضرت ابو عبیدہ بن جراح فہری کی جگہ لی تھی، جو

سبکدوش ہوکر واپس مدینہ چلے گئے تھے۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ ماہ بعد جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرتناک کا واقعہ پیش آیا تھا تو حضرت ابوعبیدہ مدینہ میں موجود تھے۔ جبکہ حضرت عمرو بن حزم نجران میں اپنے فرائض منصبی انجام دے رہے تھے

مآخذ میں دراصل نجران اور جرش کی ولایات پر تقرریوں کے بارے میں متنازع فیہ اور مختلف روایات ہیں جو ان علاقوں کے انتظامی تبدیلیوں یا تقرریوں ہی کے بارے میں کسی صحیح یا قطعی نتیجہ پر پہنچنے میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ لیکن اس اختلاف و تصادم کے باوجود جو صورت حال ابھرتی معلوم ہوتی ہے، وہ نجران کے سلسلہ میں اوپر پیش کی گئی۔ جہاں تک جرش کا تعلق ہے تو فتوح البلدان کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابوسفیان بن حرب اموی کو نجران کی ولایت میں حضرت عمرو بن حزم کی جانشینی میں مقرر کیا گیا تھا۔[233] مگر یہ روایت واضح طور سے غلط ہے کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ نجران کے دو والی عہد نبوی میں یکے بعد دیگرے حضرت ابوعبیدہ فہری اور حضرت عمرو بن حزم رہے تھے۔ اور موخر الذکر نے وفات نبوی تک اپنے فرائض وہاں انجام دیئے تھے۔ ایک اور روایت سے وضاحت ہوتی ہے کہ خود بلاذری کا پختہ خیال یہ تھا کہ حضرت ابوسفیان اموی کی تقرری جرش کے علاقے پر ہوئی تھی[234] عہد نبوی کے اواخر یا خلافت صدیقی کے اوائل میں جب حضرت ابوسفیان اموی نے سبکدوشی حاصل کی تو ان کی جگہ پر بنو امیہ کے ایک حلیف حضرت سعید بن قُشَیب ازدی کو جرش کی ولائت سونپی گئی تھی۔[235] مؤخر الذکر صحابی کے بارے میں ہماری معلومات کافی ناقص ہیں۔ لیکن یہ روایت صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ توقیتی ترتیب کے عین مطابق ہے۔

یمن کے ایرانی گورنر حضرت باذان یا باذام کے قبول اسلام اور اس کے نتیجے میں ان کی اور ان کے ہموطن الابناء کی سیاسی وفاداری سنے جزیرہ نمائے عرب کی جغرافیائی سیاسیات میں ایک تاریخ ساز سنگ میل قائم کیا تھا۔ ہمارے مآخذ عموماً ان کے قبول اسلام کے زمانے کے مسئلہ پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتے ہیں[236] لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سنہ ۹ھ/سنہ ۶۳۰ء میں کسی وقت غالباً اس کے آغاز میں اسلام قبول کر لیا تھا کیونکہ ایرانی روایات کے مطابق شہنشاہ ایران خسرو پرویز ۶۲۸ء میں اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا اور اس کے بعد ایرانی سلطنت ابتری اور افراتفری کا شکار ہو گئی تھی۔ صوبائی گورنر یا تو خود مختار ہو گئے تھے یا انہوں نے اپنی سیاسی وفاداریوں کا رخ بدل دیا تھا۔ حضرت باذان کو اسلامی ریاست کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور طاقت کا بخوبی احساس و ادراک تھا چنانچہ انہوں نے اپنی قسمت مدینہ سے وابستہ کر لی اور اس میں وہ پوری طرح سے مخلص تھے[237] بہر حال اس خوش آئند اور تاریخی موڑ کے سبب یمن کا صوبہ جو وقت کی تمام بڑی طاقتوں کے سیاسی کھیل کا اکھاڑہ بن کر رہ گیا تھا اسلامی ریاست کا ایک اٹوٹ حصہ بن گیا۔ جب تک حضرت باذان زندہ رہے وہ بلا شرکت غیرے اس کے گورنر رہے[238]۔ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند حضرت شہر بن باذان نے عارضی طور سے اقتدار سنبھال لیا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے حالات مدینہ لکھ بھیجے آپ نے ان کی وفاداری اور خلوص کی توصیف و تحسین کی اور متبادل انتظامات ہونے تک ان سے کام کرتے رہنے کو کہا[239] اس کے بعد ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے جنوبی عرب یعنی یمن، عدن اور حضر موت کے پورے علاقے کے لئے مرکزی منتظم روانہ کئے[240] جن کے سربراہ، منتظم اعلیٰ اور گورنر جنرل حضرت معاذ بن جبل خزرجی تھے۔

حضرت معاذ بن جبل کے مقام اور مرتبے کو جدید مؤرخوں نے عام طور سے غلط سمجھا ہے[241]۔ جنوبی عرب کے انتظامیہ میں انکو

ایک مذہبی مبلغ و معلم یا زیادہ سے زیادہ عامل صدقات کا درجہ دیا جاتا ہے۔ دراصل ان کے بارے میں متعدد روایات مآخذ میں ملتی ہیں جن میں سے ہر ایک میں ان کے کسی ایک پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے اور مؤرخین نے ان کو الگ الگ سمجھ کر ان کے بارے میں رائے قائم کی ہے حالانکہ اگر تمام روایات کو جمع کر کے تجزیہ و تحلیل کی جاتی تو ان کے صحیح مقام کا عرفان کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ بہرحال تمام روایات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کی حیثیت منتظم اعلیٰ اور گورنر جنرل کی تھی اور ان کے اختیارات و اقتدار اس علاقہ کے تمام والیوں، عاملین صدقات اور مقامی منتظمین پر قائم و حاوی تھا۔ ابن اسحاق نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نامۂ مبارک کا متن نقل کیا ہے۔ جس میں آپ نے حضرت زرعہ ذی یزن (علاقہ یزن کے حکمران) کو ہدایت کی تھی کہ وہ فرستادگان رسول کی نہ صرف اطاعت و فرمانبرداری کریں بلکہ اپنے علاقے کے تمام صدقات اور جزیہ کی رقوم کو جمع کر کے ان کے حوالے کریں۔

اس نامۂ گرامی کا اس ضمن میں سب سے اہم فقرہ یہ تھا کہ ان فرستادگان (رسل) کے سردار و قائد حضرت معاذ بن جبل ہیں[242]۔ بلاذری کی روایت ہے کہ ان کو الجند پر گورنر (والی) مقرر کیا گیا تھا۔ اور ان کو یمن میں قضا (تمام مقدمات کے فیصلے کا اختیار) اور تمام صدقات وصول کرنے کا مجاز قرار دیا گیا تھا[243]۔ بلاذری نے اپنی دوسری تصنیف میں حضرت معاذ بن جبل کے اختیارات و فرائض کی تفصیل و تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ یمن کے تمام لوگوں کو اسلامی اصولوں، قوانین اور قرآن کریم کی تعلیم دینے کے علاوہ عدل و انصاف کرنے اور تمام صدقات وصول کرنے کا حکم دیا گیا تھا[244]۔ اسی طرح دوسرے مآخذ جیسے ابن ہشام[245]، ابن سعد[246]، بخاری[247] اور ابن اثیر[248] اور ابن خلدون[249] کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ ان کو تمام والیان جنوبی عرب پر ایک امتیازی تفوق و برتری حاصل تھی اور وہ پورے علاقے کے منتظم اعلیٰ تھے۔ طبری کی ایک روایت سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے جو حضرت معاذ کو معلم قرار دیتی ہے[250]۔ معلم کے ایک عام معنی استاد کے ہیں لیکن لغوی اعتبار سے یہاں اس کے دوسرے معنی آقا اور مالک کے مراد ہیں[251]۔ اس روایت کے مطابق حضرت معاذ کا صدر مقام الجند تھا۔ مگر وہ مستقل طور سے یمن اور حضر موت کے ہر عامل یا گورنر کے علاقے (عمالۃ) میں دورہ کرتے رہتے تھے۔ اور ان کے کاموں کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ جنوبی عرب میں ردۃ تحریک کے خاتمے کے بعد جب تمام ولاۃ یمن و حضر موت ایک جگہ جمع ہوئے تو انہوں نے صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد حضرت معاذ بن جبل ہی کو اپنا سربراہ تسلیم کیا تھا[252]۔ اس سے بڑھ کر ان کے مقام و مرتبے کی اور کیا شہادت ہو سکتی ہے۔

حضرت معاذ بن جبل کے جنوبی عرب کے انتظامیہ میں مقام و مرتبہ کی مانند ان کی تاریخ تقرری بھی کافی مختلف فیہ ہے۔ ابن سعد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ربیع الثانی ۹ھ (جولائی۔ اگست ۶۳۰ء) میں جنوبی عرب کیلئے روانہ ہوتے تھے[253] جبکہ دوسرے مآخذ سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کی تقرری کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کے بعد کا واقعہ سمجھتے ہیں[254]۔ لیکن متعدد وجوہ سے ابن سعد کی تاریخ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اسود عنسی کی بغاوت کے بارے میں طبری کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ۱۰ھ کے وسط یا اوائل میں پیش آئی تھی جب اس نے حضرت شہر بن باذان کو قتل کر کے صنعاء کی حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس سلسلہ میں دو اہم نکات پر توجہ رکھنا ضروری ہے۔ اول یہ کہ تمام مآخذ حضرت شہر کو صنعاء کا گورنر قرار دیتے ہیں۔ صحابی موصوف کی یہ تقرری مدینہ سے مرکزی منتظمین کے آنے کے بعد ہوئی تھی جبکہ وہ ان کی آمد

سے قبل پورے یمن کے عارضی گورنر تھے۔ دوم یہ کہ مآخذ کا واضح بیان ہے کہ اسود عنسی کی بغاوت کے زمانے میں تمام مرکزی منتظمین اپنے اپنے علاقوں میں پہنچ کر اپنے فرائض منصبی سنبھال چکے تھے[255] اور پھر جب اس بغاوت کے نتیجہ میں افراتفری اور سیاسی انارکی پھیلی تو وہ سب نجران کے علاقے میں جمع ہو گئے تھے اور بالآخر بغاوت کے استیصال کے بعد حضرت معاذ بن جبل کی امارت اعلیٰ پر اتفاق کیا تھا۔ اور اپنے اپنے علاقوں کے لئے پھر روانہ ہو گئے تھے۔ ان شہادتوں سے یہ حتمی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل اور ان کے ماتحت گورنروں / والیوں اور طبقہ افسران کی تقرری ۹ھ کے آغاز میں یا وسط میں ہوئی تھی اور وہ اسی برس کے اواخر سے پہلے یمن پہنچ کر اپنے فرائض انجام دے رہے تھے[256]

حضرت معاذ بن جبل خزرجی کے ماتحت گورنروں کی کل تعداد دس معلوم ہوتی ہے۔ جن کو طبری کے مطابق[257] مخصوص علاقوں میں جن کی حدود معلوم و متعین تھیں اور جن کے صدر مقامات کی بھی نشاندہی کر دی گئی تھی تعینات کیا گیا تھا ان گورنروں اور ان کے علاقوں کی تفصیل ذیل میں دی جا رہی ہے۔

۱۔ حضرت شہر بن باذان	صنعاء اور اس کے ماتحت علاقے۔
۲۔ حضرت عامر بن شہر ہمدانی[258]	علاقہ ہمدان
۳۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری	مارب کا علاقہ یا رمع، زبید، عدن اور سواحل کے علاقے[259]
۴۔ حضرت خالد بن سعید اموی	نجران رمع اور زبید کے درمیانی علاقے[260]
۵۔ حضرت طاہر بن ابی ہالہ	عک و اشعر کے علاقے۔ [261]
۶۔ حضرت یعلیٰ ابن امیہ	الجند کا علاقہ [262]
۷۔ حضرت عمرو بن حزم خزرجی	نجران
۸۔ حضرت زیاد بن لبید	حضرموت [263]
۹۔ حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومی	بنو معاویہ / کندہ کا علاقہ [264]
۱۰۔ حضرت عکاشہ بن ثور غوثی	سکاسک اور سکون کے علاقے [265]

ان ماتحت گورنروں میں سے حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کے بارے میں روایت ہے کہ وہ اپنی تقرری کے بعد بیمار ہو گئے تھے۔ اس لئے ان کی روانگی میں تاخیر ہوئی تھی اور ان کی غیر حاضری میں ان کے فرائض کی انجام دہی حضرت زیاد بن لبید خزرجی کرتے تھے۔ ان کو غالباً اس لئے ان کے فرائض سونپے گئے تھے کہ ان کا علاقہ غیر حاضر گورنر کے علاقے سے متصل تھا۔ بہر حال ان میں سے تین مؤخر الذکر گورنر حضرموت کے مختلف علاقوں یا ولایات کے حکمران تھے۔ جبکہ بقیہ سات یمن کے مختلف علاقوں پر مقرر کئے گئے تھے[266]

ان تمام ماتحت گورنروں کے علاوہ جو اپنے اپنے علاقہ کے خود مختار و آزاد حکمران تھے، متعدد مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل کے ساتھ متعدد افسر اور مددگار کارکن بھی بھیجے گئے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی عرب کے انتظامیہ

میں ایک طبقہ افسران یا سکریٹریٹ بھی قائم کی گئی تھی جو مختلف انتظامی امور کے نفاذ کا کام دیکھتی تھی۔ اس کی سب سے بڑی شہادت حضرت زرعہ والی یمن کے نام مذکورہ بالا نامہ نبوی سے ہوتی ہے۔ جس کے مطابق حضرت معاذ بن جبل کے ساتھ متعدد افسر و کارکن (عمال) بھیجے گئے تھے ابن اسحاق طبری اور دوسرے مآخذ سے ان میں سے صرف چار افسروں کے نام معلوم ہو سکے ہیں یہ تھے: حضرات عبداللہ بن زید، مالک بن عبادہ عقبہ بن نمر، اور مالک بن مرہ۔ ان کے علاوہ بھی متعدد تھے جن کو مذکورہ بالا چاروں اصحاب کے ساتھی کہہ کر بیان کیا گیا ہے[۲۶۷] مزید تصدیق اسد الغابہ کی ایک روایت سے ہوتی ہے۔ جس کے مطابق حضرت عبید بن صخر بن لوذان الانصاری بھی حضرت معاذ بن جبل خزرجی کے "اصحاب" میں سے ایک تھے۔[۲۶۸] ان شہادتوں کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ یمن و حضرموت کے تمام گورنروں کی ماتحتی میں مرکزی کارکنوں کا ایک طبقہ بھی کام کرتا تھا جو ان کے کاموں میں ان کی مدد کرتا اور صوبائی انتظام و انصرام کو چلانے میں تعاون دیتا تھا۔ اس ضمن میں اسد الغابہ کی ایک اور روایت کا حوالہ پھر دینا مناسب ہوگا۔ جس کے مطابق حضرت عبداللہ بن ابی ربیعہ مخزومی کو یمن اور اس کے ماتحت علاقوں کی صوبائی فوج کا امیر مقرر کیا گیا تھا[۲۶۹]۔ اس سے یہ تصدیق ہوتی ہے کہ گورنروں / والیوں کے لئے کچھ فوجی افسر بھی مقرر کئے گئے تھے۔ اس بات کے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی کہ اس وسیع خطہ سے صدقات کی وصولی کے لئے بھی بہت سے افسر مقرر کئے گئے تھے۔ مؤخر الذکر کے بارے میں ہم آگے اب بہ تفصیل سے پڑھیں گے۔

مرکزی منتظمین اور والیوں کے سلسلے میں ایک اہم نکتہ ان کے مدتِ عہدہ کا تھا۔ مختلف گورنروں / والیوں کے سلسلہ میں ان کی مدتِ ملازمت و عہدہ کا ذکر بھی آچکا ہے۔ یہاں اس سلسلے میں چند اہم نکات پر توجہ دلانا مقصود ہے اوّل یہ کہ تمام گورنر مستقل عہدے دار تھے۔ جو کافی مدت کے لئے مقرر کئے جاتے تھے۔ دوسرے مرکزی افسروں کی مانند وہ عارضی افسر نہیں ہوتے تھے دوم یہ کہ بیشتر گورنر پوری حیاتِ نبوی کے دوران اپنے عہدوں پر برقرار و سرفراز رہے تھے! اور صرف چند ہی کو ان کے عہدوں سے معزول یا تبدیل کیا گیا تھا۔ سوم یہ کہ ان میں سے بعض گورنر تو خلافت صدیقی کے پورے زمانے میں بھی برقرار رہے تھے۔ مکہ، نجران، بحرین اور جرش کے چار گورنروں کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے مختصر مدت کے لئے عہدہ سنبھالا تھا اور ان کی جگہ دوسروں نے سنبھالی تھی۔ دو گورنروں حضرات باذان اور ان کے فرزند شہر نے اپنے عہدوں کے زمانے ہی میں وفات پائی تھی جبکہ باقی پچیس گورنروں نے اسلامی ریاست کی حیاتِ نبوی کے اواخر تک خدمت کی تھی۔

ذیل میں ان تمام ولاۃ نبوی کے قبائل اور علاقائی تعلق کو ظاہر کرنے کے ایک جدول دی جا رہی ہے اس جدول سے ان کی سال بسال تقرری کا بھی علم ہوتا ہے۔ جس سے صوبائی انتظامیہ کے ارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

علاقہ	قبیلہ / خاندان	سنہ تقرری ۷/۶۲۸	۶۲۰ /	۹/۶۳۱-۶۱۸	۹/۶۳۱	تعداد ولاۃ
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۳	۲	۵	۲	۱۲
	(الف) ہاشم	-	-	۱	-	۱

	(ب) امیہ	۳	۱	۲	۱	۷
	(ج) مخزوم	-	-	-	۱	۱
	(د) فہر	-	-	۱	-	۱
	(س) مطلب	-	-	۱	-	۱
	(ص) سہم	-	۱	-	-	۱
	۲۔ خزرج	۱	-	۲	۳	۶
مشرقی عرب	(۱) ثقیف	-	۱	۱	-	۲
	(۲) طے	-	-	۱	-	۱
شمالی عرب	۱۔ ازد	-	-	۱	۱	۲
	۲۔ اشعر	-	-	-	۱	۱
	۳۔ غوث بن مر	-	-	۱	۱	۲
	۴۔ حضرموت	-	۱	-	-	۱
	۵۔ ہمدان	-	-	-	۱	۱
	۶۔ الابناء ایرانی	-	-	۱	۱	۲
قبائل پراگندہ	۱۔ تمیم	-	-	-	۲	۲
میزان	۱۱ قبیلے	۴	۴	۱۲	۱۲	۳۲

اس جدول سے بعض دلچسپ نکات سامنے آتے ہیں۔ والیوں یا مرکزی منتظمین کی کل تعداد عہد نبوی میں ۳۲ تھی جن میں سے حصۂ غالب یعنی ۱۲ والیوں کو قریش کے مختلف خاندانوں سے بالکل فطری طور پر منتخب کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ بنو امیہ کے سات افراد کو یہ منصب جلیل حاصل ہوا تھا جو ایک لحاظ سے کارنامہ تھا۔ ان میں سے چار گورنروں کا تعلق بنو امیہ کے ایک خاندان بنو سعید بن العاص سے تھا اور وہ سب کے سب حقیقی بھائی تھے۔ اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے تین بھائی بیک وقت گورنروں کے عہدے پر سرفراز تھے، چوتھے کے بارے میں اختلاف ہے اور امکان ہے کہ وہ بھی اپنے بقیہ تین ممتاز و سربرآوردہ بھائیوں کے ساتھ ساتھ اس عظیم عہدے پر فائز رہے ہوں۔ یہ چاروں بھائی تھے۔ عبداللہ بن سعید، عمرو بن سعید، ابان بن سعید، اور خالد بن سعید جنہوں نے بالترتیب قری عربیہ، وادی القریٰ، بحرین اور صنعا کے اہم ترین ولایات سنبھال رکھی تھیں۔ دو اور اموی گورنروں حضرات ابوسفیان بن حرب اور ان کے فرزند یزید کا تعلق بھی مکہ کے ایک اہم و ممتاز ترین خاندان سے تھا جو اپنی انتظامی، فوجی اور سیاسی لیاقت کے علاوہ

اپنی اقتصادی دولت کے لئے بھی مشہور و معروف تھا اور آخری اموی گورنر حضرت عتاب بن اسید تھے۔ جنہوں نے سب سے پر وقار و پر افتخار عہدہ ولایت مکہ کو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ سوائے ابوسفیان بن حرب اموی کے جنکو اپنے عہدے سے معزول کر دیا گیا تھا یا جنہوں نے از خود سبکدوشی حاصل کر لی تھی باقی تمام اموی گورنر کافی دنوں تک اپنے عہدوں میں سرفراز رہے تھے۔ ان میں سے عبداللہ بن سعید کا جلد ہی انتقال ہو گیا تھا جبکہ پانچ اموی گورنر حیات نبوی کے اواخر تک اپنے اپنے علاقوں کے گورنر رہے تھے۔ بلاذری نے اپنی متعدد روایات میں سے ایک میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ وفات نبوی کے وقت صرف چار اموی گورنر اپنے عہدوں پر برقرار تھے لیکن مورخ موصوف نے حضرت یزید بن ابی سفیان اموی گورنر تیما کا نام اس فہرست میں نہیں گنایا ہے ورنہ تعداد پانچ ہوتی۔ بہرحال اتنی بھی تعداد میں عہد نبوی کے انتظامیہ میں اموی گورنروں کی شمولیت کی اہمیت اس پس منظر میں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ حضرت ابوسفیان بن حرب اور سعید بن العاص نے مدتوں تک اسلام اور اسلامی ریاست کی مخالفت کی تھی۔ سعید کا تو کفر ہی پر جنگ بدر کے بعد انتقال ہو گیا تھا جبکہ حضرت ابوسفیان نے فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ ان کے فرزند یزید بھی کافی متاخر مسلمان تھے کہ انہوں نے عمرۃ القضیہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ صرف خاندان سعیدی کے دو گورنر حضرات خالد و عمرو ابتدائی مسلم تھے اور باقی دو سعیدی افراد نیز حضرت عتاب گورنر مکہ بھی فتح مکہ کے آس پاس کے زمانے کے مسلمان تھے۔ بہرحال اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ امویوں نے اسلام اور اسلامی ریاست کی بحیثیت قبیلہ یا خاندان کے مخالفت کی تھی۔ اس موضوع پر باب دوم میں مکمل و مدلل بحث کی جا چکی ہے جسے اب یہاں دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس سلسلہ میں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ عہد نبوی کی ۲۷ ولایات میں سے ۷ پر کسی نہ کسی وقت اموی گورنر فائز رہے تھے اور ۵ ولایات پر تو بیک وقت انہوں نے حکمرانی کی تھی یہاں اس نکتہ کیطرف بھی اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دو گورنروں حضرات علاء بن حضرمی گورنر بحرین اور سعید بن قشیب ازدی گورنر جرش کا تعلق بھی بنو امیہ کے خاندان سے تھا۔ کہ وہ دونوں ان کے حلیف تھے۔ اس لحاظ سے عہد نبوی کے اس شعبۂ عمال و امراء میں امویوں کی کل تعداد ۹ ہو جاتی ہے۔ جو گورنروں کی کل تعداد کی ایک چوتھائی سے بھی کچھ زیادہ یا ایک تہائی سے کچھ کم ہے۔ باقی قریشی گورنروں میں سے ایک ایک بنو ہاشم، بنو فہر، بنو مطلب، بنو سہم اور بنو مخزوم میں سے تھا اور آخری خاندان سے ہی میں اسلامی فوج کے صوبائی کمانڈار کا بھی تعلق تھا۔

امت اسلامی کا دوسرا اہم سماجی طبقہ خزرج کا تھا جن کے چھ ارکان نے ریاست اسلامی کی متعدد اہم ولایات پر گورنری کی تھی۔ ان میں سب سے نمایاں اور اہم مقام کے مالک حضرت معاذ بن جبل خزرجی تھے۔ جنہوں نے وسیع و عریض جنوبی عرب کے خطے کی تمام ولایات کے گورنر جنرل کی حیثیت سے تاریخ اسلامی میں اپنی انمٹ چھاپ چھوڑی ہے باقی خزرجی گورنروں نے خیبر، ایلہ، نجران اور حضرموت کے علاقوں کی ولایات پر حکمرانی کی تھی۔ اس طبقہ عمال نبوی میں مدینہ کے ایک اور اہم ترین قبیلہ اوس کی عدم شمولیت خاصی اہم اور حیرت انگیز ہے۔

دوسرے قبائل عرب میں ثقیف، غوث بن مراد اور تمیم ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے۔ کیونکہ ان کے دو دو نمائندے اس

طبقہ افسرانِ نبویؐ میں شامل تھے۔ اس سلسلہ میں یہ دلچسپ بات قابلِ ذکر ہے کہ دونوں تمیمی گورنروں نے اپنے علاقوں کو چھوڑ کر مکہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور قریش کے خاندانوں میں کسی نہ کسی کے حلیف بن گئے تھے۔ اس لحاظ سے ان کی تقرریاں دراصل قریش کی تقرریاں شمار ہونی چاہئیں۔

وُلاۃِ نبویؐ کے بارے میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ ان میں سے غالب اکثریت کا تقرر ان کے اپنے علاقے یا آبائی وطن میں نہیں ہوا تھا۔ صرف مکہ اور طائف کے گورنر اور کسی حد تک ہمدان کے گورنر اپنے اپنے علاقہ کے لوگ تھے ورنہ بیشتر گورنروں کا تعلق ان علاقوں یا قبائل سے نہیں تھا جن پر ان کو حکمرانی کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ یہ عہدِ نبویؐ کے انتظامیہ یا حکومت کی مرکزیت کی ایک اہم علامت تھی کیونکہ عرب قبائل اپنے مزاج کے سبب جس کو قبائلی روایات نے بنایا تھا کسی "غیر" کی حکومت و حکمرانی کو کبھی برداشت نہیں کرتے تھے اور مجبوراً کبھی ایسا ہو جاتا تھا تو اس کی حکومت کے خلاف ہر موقع کی تاک میں رہتے تھے۔ بہر حال ان میں مدینہ کی مرکزی حکومت کی اطاعت کا جذبہ دراصل اسلام کی ایک دین تھی۔

جہاں تک ان گورنروں کے زمانہ قبولِ اسلام کا تعلق ہے تو ۴۲ اشخاص میں سے صرف پانچ کو سابقین اولین کے زمرہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ آٹھ دوسروں نے ہجرت سے ذرا قبل یا کچھ بعد اسلام قبول کیا تھا۔ بقیہ نے جواب بھی اکثریت میں ہیں کافی تاخیر سے اسلام قبول کیا تھا۔ ان میں سے سات نے صلح حدیبیہ سے کچھ پہلے یا اس کے بعد جبکہ باقی نے فتح مکہ کے زمانے میں امتِ اسلام میں داخل ہونا پسند کیا تھا۔

والیوں / گورنروں کے اختیارات

اس بحث کے آخر میں چند الفاظ والیوں کے اختیارات کے ضمن میں کہنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ پہلے مختصر طور سے سہی مگر ذکر آ چکا ہے کہ گورنر / والی اپنی ولایت کے نظم و نسق میں بالکل آزاد خود مختار ہوتے تھے اور اس لحاظ سے ان کو کافی بلکہ غیر محدود اختیارات حاصل تھے۔ وہ نہ صرف شہری نظم و نسق کے ذمہ دار ہوتے تھے بلکہ وہ اپنے علاقہ کے فوجی سالار، قاضی اور عامل صدقات بھی ہوتے تھے۔ ان کو سیاسی و عصری تقاضوں کے مطابق قوانین وضع کرنے اور نافذ کرنے کے بھی اختیارات ہوتے تھے۔ ان پر صرف کتاب و سنت کی پابندی تھی یا وقتاً فوقتاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جو ہدایات و احکام بھیجتے رہتے تھے۔ ان کی تعمیل لازمی تھی اور یہ آخری پابندی دراصل سنت میں ہی شامل ہے۔ اس سلسلہ میں ابن سعد اور ترمذی کی روایت کردہ حدیث اکثر نقل کی جاتی ہے جس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل خزرجی سے ان کی یمن کو بطور گورنر جنرل روانگی سے قبل پوچھا تھا کہ وہ کس بنیاد پر فیصلے کیا کریں گے۔ حضرت معاذ نے پہلے کتاب کی روشنی میں اور اس میں اگر ہدایت نہ ملے تو سنت کی روشنی میں فیصلہ کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ پھر سوال نبوی یہ کہ اگر دونوں میں کوئی ہدایت نہ ملے تو وہ کیا کریں گے۔ اس پر انہوں نے اپنی رائے پر فیصلہ کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعریف و تحسین فرمائی تھی[۱۱۲]۔ اس حدیث سے یہ نکتہ مزید واضح ہوتا ہے کہ کتاب و سنت کی حد بندی کے اندر اندر

تمام گورنر بلکہ افسران و عمالِ نبوی اپنے اپنے علاقوں میں انتظام و انصرام چلانے میں پوری طرح آزاد تھے۔ ایک طرح سے صوبائی نظم و نسق مرکزی انتظامیہ کی بالکل نقل تھی۔

بہر حال یہ معمولِ نبوی تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اپنے تمام افسروں، عاملوں اور گورنروں کو ان کی روانگی سے قبل ہدایات دیتے تھے۔ جیسا کہ حضرات معاذ بن جبل اور عمرو بن حزم وغیرہ گورنروں کے معاملہ سے معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے حضرت معاذ بن جبل کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے علاقہ کے لوگوں کو، جو اتفاق سے "اہل کتاب" تھے۔ اسلام کی دعوت دیں نمازوں کا حکم کریں، اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی ہدایت دیں۔ آپ نے ان کو یہ بھی ہدایت دی تھی کہ وہ ان کی دولت کی بہترین چیزوں کو صدقات میں لینے سے احتراز کریں۔ اور مظلوم و بیکس کی بد دعا سے بچیں"[۲۶۲] ایک اور روایت کے مطابق آپ نے ان کو لوگوں کے لئے دشواری کی جگہ آسانی پیدا کرنے کی ہدایت کی۔ اختلاف بڑھانے کی جگہ تعاون کو بڑھاوا دیں اور نفرت کی جگہ محبت پیدا کریں"[۲۶۳] آپ نے ان کو لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور نرم رویہ اپنانے کی بھی ہدایت کی تھی"[۲۶۴]

اگرچہ ایک جدید مؤرخ نے شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے"[۲۶۵] تاہم اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ حضرت عمرو بن حزم کو جو ہدایات نبوی دی گئی تھیں وہ مفصل بھی ہیں اور جامع بھی آپ نے ان کو ہدایت دی تھی کہ وہ ہر حال میں خدا کا خوف و تقویٰ اختیار کریں، سچائی و صداقت کا معاملہ کریں۔ لوگوں کو خوشخبری سنائیں۔ ان کو قرآن کریم کی تعلیم دیں، غلط کام کرنے سے روکیں ان کے اختیارات، حقوق اور فرائض سے آگاہ کریں، لوگوں کے صحیح طرز عمل اختیار کرنے کی صورت میں ان کے ساتھ نرمی اختیار کریں۔ اور غلط کام کرنے کی صورت میں ان کو سزا دیں۔ انہیں جنت کی بشارت دیں اور اس کو حاصل کرنے کا طریقہ بتائیں اور جہنم سے ڈرائیں۔ لوگوں کے ساتھ دوستی قائم کریں۔ تاکہ ان کو آسانی سے دین کی تعلیم دے سکیں اور ان کو حج کے مراسم کی تعلیم دیں۔ ان کو ایک کپڑے میں جس کے دونوں سرے ان کے شانوں پر نہ پڑے ہوں نماز ادا کرنے سے منع کریں۔ اسی طرح ان کو ایسا لباس پہن کر بیٹھنے سے روکیں۔ جس سے ان کا جسم کھل جائے۔ اگر ان کے بال لمبے اور شانہ پر پڑتے ہوں تو ان کو چوٹی گوندھنے سے روکیں، لڑائی جھگڑے کی صورت میں ان کو قبیلے اور خاندان کی دہائی دینے سے روکیں بلکہ خدا سے استمداد کی ہدایت کریں اور جو لوگ خدا کی طرف رجوع نہ کریں بلکہ اپنے قبائل اور خاندانوں ہی کی دہائی دیتے رہیں۔ ان کو تلواروں سے ٹھیک کریں حتیٰ کہ وہ خدا کی طرف رجوع ہو جائیں۔ لوگوں کو وضو اور پاکی کا حکم دیں، وقت پر نمازوں کا حکم دیں ان کو جب بلایا جائے وہ مسجدوں میں جمع ہو جایا کریں۔ اور جانے سے پہلے وہ پاکی اختیار کریں۔ ان کو حکم دیں کہ وہ مالِ غنیمت سے خدا کا خمس نکالیں اور اپنے اموال سے وہ صدقات ادا کریں جو تمام مسلمانوں کے لئے ان کی اراضی پر واجب ہوتے ہیں۔ یعنی چشمہ اور بارش کے پانی سے سیراب ہونے والی اراضی کی پیداوار میں عشر اور ڈولوں یا بالٹیوں سے سینچی جانے والی اراضی کی پیداوار میں سے نصف العشر۔ اور ان کے ہر دس اونٹوں پر دو بھیڑ یا بکری اور ہر بیس اونٹوں پر چار بھیڑ یا بکری لیں جبکہ ہر چالیس گائے پر ایک گائے اور ہر تیس گائے پر ایک بیل یا بچھڑا لیں اور ہر چالیس بکریوں یا بھیڑوں پر ایک بکری یا بھیڑ وصول کریں۔ ایک یہودی یا عیسائی اگر خلوص کے ساتھ اپنے آپ اسلام قبول کر لے اور دین اسلام کی مخلصانہ پیروی کرے

تو اسے ایک مسلمان کے سارے حقوق اور فرائض حاصل ہوں گے ۔ اگر ان میں سے کوئی اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہے تو اسکو زبردستی اس سے ہٹایا نہیں جائے گا، ہر بالغ مرد، عورت، آزاد اور غلام (غیر مسلم) کو ایک دینار طلائی یا اس کی قیمت کا کپڑا (جزیہ میں) دینا ہوگا۔ جو کوئی اس کی پابندی و تعمیل کرے گا۔ اس کو خدا اور اس کے رسول کا ذمہ حاصل ہوگا ۔ اور جو کوئی اس کی مخالفت کرے گا وہ خدا، اس کے رسول اور تمام مسلمانوں کا دشمن تصور ہوگا [۲۷۶]

یہ ہدایات نبوی ظاہر ہے کہ مختلف النوع ہیں ۔ ان میں انتظامی احکام کے علاوہ مذہبی اور سماجی ہدایات بھی شامل ہیں۔ سیاسی نقطہ نظر سے قبائلی عصبیت کے رجحانات کو ختم کرنے کی ہدایات اور ان لوگوں کے خلاف جو قبائلی عصبیتوں کو بھڑکائیں اور اس طرح معاشرے میں ابتری پھیلائیں۔ تلوار اٹھانے کی اجازت بہت اہمیت کی حامل ہے ۔ اس سے ایک طرف تو قبائلی عصبیت کو ختم کرنے میں مدد ملتی اور دوسری طرف اسلامی بلکہ عرب معاشرے میں مرکزیت و اجتماعیت کی سعادت پیدا ہوتی ۔ جہاں تک مالی معاملات و امور کے بارے میں ہدایات نبوی کا تعلق ہے تو ہم ان پر بحث اگلے باب میں کریں گے ۔ بہرحال مجموعی طور سے یہ ائمہ نبوی ولایات کے گورنروں کے نبوی انتظامیہ میں مقام و مرتبہ کے علاوہ ان کے اختیارات و فرائض کی واضح نشاندہی کرتا ہے ۔ اصولی طور سے تمام گورنر مرکزی حکومت کے پابند بھی تھے اور اس کے سامنے جوابدہ بھی ۔ لیکن اپنے اندرونی نظم و نسق کے معاملہ میں وہ قطعی آزاد اور خود مختار تھے ۔ ان کا کافی وسیع سیاسی، انتظامی، فوجی اور مالی اختیارات حاصل تھے ۔ کتانی نے ان کے اختیارات کی وضاحت کے لئے ایک مشہور مصنف کا قول نقل کیا ہے ۔ کہ ولاۃ / والی وہ عمال تھے ۔ جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علاقوں (البلاد) الضاف (القضاء) صدقات و محاصل (الصدقات) اور حج کا امیر مقرر کیا تھا [۲۷۷]۔ اس کی تصدیق مزید بلاذری کے بیان سے ہوتی ہے ۔ جس کے مطابق کہ امیر وہ شخص ہوتا تھا جو کسی علاقہ کا حکمران ہوتا اور وہاں سے صدقات وصول کرتا تھا ارزاقی کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸ھ / ۶۳۰ء میں حضرت عتاب بن اسید اموی نے حج اپنی امارت میں انجام دیا تھا کیونکہ وہ علاقہ کے گورنر امیر البلد تھے ۔ حالانکہ اس روایت کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو اس فریضہ کی ادائیگی کا صریحی حکم نہیں دیا تھا [۲۷۸]۔ بہرحال تمام تاریخی شواہد اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے صوبوں / ولایتوں کی حکومت کا نظام مرکزی انتظامیہ کے مثل ہوتا تھا اور اسی کی مانند ان کے مختلف مالی، انتظامی اور فوجی شعبے ہوتے تھے جن میں متعدد افسر اور عمال کام کرتے تھے ۔ یہ عربوں کے لئے ایک نیا سیاسی تجربہ تھا جس میں اختیار و اقتدار کا سرچشمہ مرکز میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات تھی اور بقیہ تمام مرکزی اور صوبائی عمال و افسر آپ کے ماتحت اور آپ کے سامنے جوابدہ تھے ۔

۲ ۔ مقامی منتظمین

دوسرے معلوم اسباب و وجوہ کے علاوہ عرب کا قبائلی نظام بھی اس امر کا ذمہ دار تھا کہ مرکزی منتظمین، والی اور گورنر اور صوبائی افسر نہ تو مقامی معاملات و مسائل کو پوری طرح سمجھتے تھے ، اور نہ ہی ان کو سلجھانے کی صلاحیت رکھتے تھے ۔ اس کے

علاوہ وہ مقامی لوگوں کی تسکین اور اطمینان کے مطابق بھی کام نہیں کر سکتے تھے۔ ہر زمانے میں اور ہر علاقے میں ایسے لوگوں کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے جو مقامی مسائل کو سمجھ اور حل کر سکیں اور ساتھ ہی اپنے لوگوں میں خود اعتمادی اور اعتماد بھی پیدا کر سکیں چنانچہ ان اسباب و وجوہ سے مقامی منتظمین کی تقرری ناگزیر ہو گئی تھی۔ عام طور سے یہ مقامی منتظمین اپنے اپنے علاقوں کے قبائلی سردار ہوتے تھے۔ لیکن بعض علاقوں میں جہاں شیوخ قبائل نے اسلام نہیں قبول کیا۔ اور ان کی معتد بہ تعداد نے اس شرف کو حاصل کر لیا ہو تو اس علاقے کے مسلمانوں کا ایک مقامی سردار مقرر کر دیا جاتا تھا۔ اور اس تقرری میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کلی اختیار حاصل ہوتا تھا۔ لیکن اس اختیار کے باوجود آپ ہمیشہ اس "قوم" یا "قبیلہ" کے لوگوں کے خواہشات و جذبات کا احترام کرتے تھے، اور انہیں کے پسندیدہ اور سربرآوردہ شخص کو سردار مقرر فرماتے تھے۔ بعض مسلم قبیلوں کے شیوخ و سادات کی تقرری اور تبدیلی بھی آپ کے حکم و مرضی سے ہوئی تھی۔ اور یہ آپ کی عظیم سیاسی طاقت اور اقتدار مطلق و حاوی کی ایک علامت تھی۔ یہ نکتہ ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ یہ تمام مقامی منتظمین بلا استثنا عاملین صدقات بھی ہوتے تھے۔ لہٰذا عاملین صدقات اور مقامی منتظمین دونوں ایک دوسرے کے مترادف تھے۔ مگر اس بحث میں ہم نے تکرار سے بچنے کی خاطر عاملین صدقات کو شامل نہیں کیا ہے اور صرف انہی سرداروں اور شیوخ (رؤس = راسس) کو شامل کیا ہے جن کو ماخذ میں صرف اس حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بات یہاں واضح کر دی ضروری ہے کہ مذکورہ بالا بحث میں تمام مقامی منتظمین یا قبائلی سرداروں کو شامل نہیں کیا جا سکا اور ہماری فہرست بہت ہی ناقص اور نامکمل ہے کیونکہ ان سب کا نام بنام ذکر نہیں ملتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مقامی منتظمین یا قبائلی سرداروں کی حقیقی اور اصل تعداد ان کے قبائل کی تعداد کے تناسب سے تھی۔ بلکہ ایک طرح ان سے کئی گنا زیادہ تھی کیونکہ ہر قبیلہ کی متعدد اہم شاخیں (بطون) ہوتے تھے اور ان بطون کی بھی ذیلی شاخیں ہوتی تھیں۔ جیسا کہ ہم باب دوم میں دیکھ چکے ہیں۔ اور ان تمام مادر قبیلوں، اہم بطون اور ان کی ذیلی شاخوں کے سردار الگ الگ ہوتے تھے۔ اگرچہ ایک متاخر مصنف کا قبائل عرب پر تبصرہ کہ "ان کی تعداد اتنی تھی جتنی کہ آسمان پر ستارے"، مبالغہ آمیز ہے کہ لیکن وہ درحقیقت صورت حال کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ منٹگمری واٹ کا یہ خیال کہ بعثت نبوی کی جگہ قبائل کی جگہ بطون ہر لحاظ سے عرب سماج میں اہمیت اختیار کر چکے تھے صحیح ہے اور اس کے ساتھ اس میں یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ قبائلی سرداروں کی جگہ اب بطون کے سرداروں نے لے لی تھی۔ اور ان کا اختیار اور اقتدار زیادہ موثر اور فعال تھا۔

مقامی منتظمین، اور قبائلی سرداروں کے بارے میں کافی حوالے اور معلومات پہلے دو ابواب میں آ چکی ہیں۔ لہٰذا ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بحث میں صرف چند اہم نکات اٹھائے جائیں گے تاکہ اس تاریخی عمل کو سمجھا جا سکے جس کے نتیجہ میں اسلامی حکومت جزیرہ نمائے عرب کے اندرونی، سرحدی اور دور دراز کے علاقوں میں قائم و مستحکم ہو سکی تھی۔ خیال یہ ہے کہ ۹ھ / ۶۳۰-۳۱ء جس کو عام طور سے ماخذ میں عام الوفود (وفود کا سال) کہا جاتا ہے اندرون عرب اور دور دراز کے مقامات میں اسلامی حکومت بلکہ اسلام کے نفوذ کا نقطہ آغاز تھا۔ جب کہ تقریباً تمام قبائلی عرب نے اپنے

اپنے وفود نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں مدینہ بھیجے تھے۔ لیکن صحیح تاریخی تناظر میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہجرت کا نواں سال دراصل اس تاریخی عمل کا نقطۂ عروج تھا جو مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد شروع ہوا تھا۔ بلکہ اسلام کی حد تک تو اس کا نقطۂ آغاز مزید تیرہ سال قبل مکہ میں ہوا تھا۔ جیسا کہ ہم اشعر، عبد القیس، غفار، اسلم، جہینہ، مزینہ، مدلج، ضمرہ اور متعدد دوسرے قبائل کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں۔ قبائل عرب کے وفود کی آمد مدینہ پر ابن سعد کی بحث سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ ۹ھ / ۶۳۰ء سے کہیں پہلے عربوں کے وفود بارگاہ نبوی میں آنے شروع ہو گئے تھے۔ بہر حال انہیں زیارتوں کے دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عربوں کے مختلف قبیلوں کے نمائندوں سے ملاقات کا موقعہ ملتا تھا اور آپ حالات کے مطابق ان کے سرداروں کو برقرار رکھتے تھے۔ یا از سر نو مقرر فرماتے تھے۔ چونکہ بیشتر وفود عرب ۹ھ ہی میں مدینہ آئے تھے۔ اس لئے قبائلی سرداروں یا مقامی منتظمین کی یہ تقرری زیادہ تر اسی برس ہوئی تھی جس برس انہوں نے اسلامی ریاست کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کیا تھا۔

اکثر حالات میں فطری طور سے کسی رکن وفد کو اس قبیلہ یا خاندان (بطن) کے مسلمانوں کا سردار اور مقامی منتظم مقرر کر دیا جاتا تھا۔ اگر اس وفد میں سردار قبیلہ خود موجود ہوتا تھا تو عام طور سے اس کو بحال رکھا جاتا تھا۔ از سر نو تقرری کی صورت میں دو اہم نکات سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ اس کی تقرری قبیلہ والوں کی بجائے خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں عمل میں آتی تھی اور دوم یہ کہ منتخب سردار لازمی طور سے وفد کے سب سے زیادہ معمر یا تجربہ کار اشخاص میں سے نہیں ہوتا تھا۔ جیسا کہ حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی کے معاملہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ عام طور سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقامی منتظم کا انتخاب دو بنیادوں پر کیا جاتا تھا۔ ایک یہ کہ وہ مقامی انتظام و انصرام کی صلاحیت سے متصف ہو اور دوسرے یہ کہ اس کو اسلام کی کافی معلومات اور دین کا تفقہ ہو۔ دوسری بنیاد یا سبب بعض حالات میں دوسرے اسباب پر فوقیت رکھتا تھا۔ کیونکہ مقامی منتظم یا سردار قبیلہ سے تبلیغ اسلام کا کام بھی لینا ہوتا تھا۔ جو سردار زیادہ آسانی اور موثر طور سے انجام دے سکتا تھا۔

جہاں تک اسلام کے سیاسی اور انتظامی نظام میں مقامی منتظم یا مقامی سردار کے مرتبے کا تعلق ہے تو وہ خاصا دلچسپ اور ایک طرح سے بالکل نیا تھا۔ قدیم جاہلی نظام میں مقامی سردار، مقامی مسائل کا ذمہ دار ہوتا تھا اور غالباً وہ قبائل سردار کے سامنے جوابدہ اور ماتحت بھی ہوتا تھا۔ اب اسکی نوعیت ذرا مختلف نظر آتی ہے۔ وہ قبائلی سردار کی بالادستی کے تحت ہونے کے ساتھ ساتھ مدینہ کی مرکزی حکومت کے سامنے بھی جوابدہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ صوبائی اور مرکزی منتظمین اور مقامی مسلمانوں یا اسلامی ریاست کے شہریوں کے درمیان ایک رابطہ اور کڑی کا کام بھی کرتا تھا۔ بسا اوقات اس کو اختیار اور اجازت حاصل ہوتی تھی کہ وہ براہ راست مدینہ کی مرکزی حکومت سے رابطہ و تعلق قائم کرے ورنہ عموماً اور اصولاً اس کو اپنے علاقے کے مرکزی منتظمین کی اطاعت کرنی ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی علاقوں کے مقامی منتظمین کا تعلق براہ راست مدینہ سے بھی ہو سکتا تھا۔ جبکہ سرحدی مقامات یا دور دراز کے علاقوں کے منتظمین اور سرداروں کو لازمی طور سے اپنے اپنے علاقوں کے گورنروں / یا والیوں کی اطاعت کرنی پڑتی تھی آیئے اس ضمن میں چند مثالیں دیکھیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سرحدی مقامات پر چند مملکتیں اور حکومتیں قائم تھیں جن کے حکمران ماضی میں وقت کی بڑی سلطنتوں میں سے کسی نہ کسی کے باجگذار رہ چکے تھے، مشرقی علاقے میں ایسی دو مملکتیں بحرین اور عمان کی تھیں۔ جن پر بالترتیب حضرات منذر بن ساویٰ اور جیفر و عبد حکومت کرتے تھے۔ ان حکمرانوں نے جب اسلامی ریاست کی سیاسی و انتظامی بالادستی قبول کی تو انہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں مرکزی منتظمین یا نمائندگان رسول کے قیام و سکونت کی بھی شرط قبول کی تھی۔ چنانچہ بحرین میں حضرت علاء بن حضرمی اور ان کے ساتھ یا ان کے بعد حضرت ابان بن سعید اموی مدینہ کے نمائندے کی حیثیت سے مقیم تھے جبکہ اسی حیثیت سے حضرت عمرو بن عاص سہمی عمان میں قیام پذیر رہے تھے۔ اپنے علاقوں کے اندرونی نظم و نسق میں خود مختار ہوتے کے باوجود وہ ان مرکزی نمائندوں کی نگرانی اور ہدایت کے پابند تھے۔ اور ان کی اطاعت ان پر لازمی تھی[280] اور ایسے معاملات میں جن کا تعلق مرکزی حکومت کے مفادات سے ہو یہ مقامی حکمران پوری طرح سے ان نمائندگان رسول کے تابع و محکوم تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرات منذر بن ساویٰ اور فرزندان جلندی کے نام فرامین سے اسکی مکمل شہادت ملتی ہے۔ اسی طرح ایران کے کسریٰ کے ایک اور باجگذار مقامی حکمران حضرت سیبخت کو ایک نامہ گرامی میں عمال نبوی کی فرمانبرداری کی ہدایت کی گئی تھی[281] بحرین کے طاقتور قبیلہ عبد القیس کے سردار کو بھی حضرت علاء بن حضرمی کی اطاعت کی ہدایت کی گئی تھی[282] نجران میں انتظامی معاملات کے ضمن میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ امین امت، حضرت ابو عبیدہ بن جراح فہری کی سیاسی بالادستی کو نجران کے سرداروں نے قبول کیا تھا۔ اور ان کے فیصلوں کو علاقہ کے حاکم اعلیٰ کی مانند تسلیم کیا تھا[283] اسی طرح حضرت زرعہ والی یزن کے نام نامہ مبارک جس کا ذکر کئی بار آچکا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مرکزی منتظمین کی بالادستی کے تحت تھے[284] مختصر طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد خطوط و فرامین موجود ہیں۔ جن میں مقامی حکمرانوں، بادشاہوں، قبائلی سرداروں سے فرستادگان مدینہ اور عمال نبوی کے احکام و ہدایات کی تابعداری کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جس کو انہوں نے بخوبی قبول و منظور کیا تھا۔ اس ضمن میں ہمدان[285]، حضرموت[286]، مہرہ[287]، جذام اور قضاعہ[288]، باہلہ[289]، دومۃ الجندل[290]، بنو اسد[291] اور متعدد دوسروں کے نام فرامین نبوی کے متون سے اس امر کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔

جزیرہ نمائے عرب میں اور شمالی عرب میں بھی بہت سے مقامی سردار اور منتظم تھے۔ جن میں سے کچھ کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے۔ ان کے بارے میں دستیاب تمام مکمل معلومات تو اس کتاب کے آخر میں متعلقہ ضمیمہ میں ملیں گی یہاں اس بارے میں چند اہم نکات کی طرف توجہ دلانا کافی ہوگا۔ مرکزی اور شمالی دونوں علاقوں کے سرداروں اور مقامی منتظمین کی تقرری یا بحالی اسلامی حکومت ہی نے کی تھی۔ ان میں ایک اہم قبائلی سردار حضرت امرؤ القیس تھے جو ابن الاصبغ کے نام سے مشہور تھے اور وہ قبیلہ بنو کلب کی دومۃ الجندل کے علاقے کی شاخ کے سردار تھے۔ وہ قضاعہ کے متعدد سرداروں کے ساتھ اسلامی ریاست کے ہمیشہ فرمانبردار رہے تھے۔ حتیٰ کہ ردہ کے زمانے میں بھی وہ وفاداری کی صراط مستقیم سے نہیں ہٹے تھے[292] اسد الغابہ نے اس علاقے کے دو اور سرداروں کا بھی ذکر کیا ہے جو بنو ذہل اور بنو غوبن وائل کے تھے[293]۔ مشرقی خطوں کے

قبائلی سرداروں میں جو دو اہم سرداروں حضرت مالک بن عوف نصری اور حضرت عدی بن حاتم طائیؓ کا بہت نمایاں ذکر ملتا ہے ان میں سے اوّل الذکر کو ہوازن کے خاندانوں ثمالہ، سلمہ اور فہم وغیرہ[۲۹۴] پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا تھا جبکہ موخر الذکر کو ان کے قبیلہ کے عہدہ پر برقرار رکھا تھا۔[۲۹۵] جنوبی عرب کے قبائل میں سے تقریباً ایک درجن مقامی سرداروں کے ناموں کا ذکر ملتا ہے جن کا تعلق خولان، ازد جرش، بنو حارث/ہمدان، مراد، زبید، مذحج، کلاب، حریم، بنو ارحب/ہمدان صداء، کندہ اور متعدد دوسروں سے تھا۔[۲۹۶] اسی طرح حضرات جارود بن معلیٰ اور زبرقان بن بدر بالترتیب قبائل پراگندہ عرب میں سے قبیلہ عبد القیس اور بنو اوس/تمیم کے بہت اہم سردار تھے۔[۲۹۷] اس قسم کی بہت سی دوسری معلومات ہمارے مقامی عاملین صدقات کے مباحثہ میں بھی آئیں گی۔ جس سے ان کے بارے میں ہمیں اور بھی معلوم ہو گا۔ آخر میں ایک جدول دی جارہی ہے۔ جس میں تمام نامزد مقامی منتظمین کی سال بسال تقرری کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہرحال یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ فہرست مکمل تو کیا تکمیل کے قریب بھی نہیں پہنچی ہے۔ اصل منتظمین کی فہرست اس سے کم از کم دس گنا بڑی ہوتی۔ لیکن ماخذ سے ان سب کے نام نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ بہرحال اس جدول سے مذکورہ بالا نکات کو سمجھنے میں مزید مدد ملے گی۔ اور عہد نبوی کے انتظامیہ میں ان کے مقام و مرتبے کی تعیین میں سہولت ہوگی۔

علاقہ	قبیلہ/خاندان	سنین تقرری ۶۲۷	۶۳۰	۶۳۱	۶۳۱-۲	غیر مورخہ	مقامی منتظمین
شمالی عرب	۱۔ کلب	–	–	–	–	۲	۲
	۲۔ بنو عنزہ بن وائل		–	–	–	۱	۱
	۳۔ مرآن/جذام	۱	–	–	–	–	۱
مغربی عرب	۱۔ اوس	۱	–	–	–	–	۱
مشرقی عرب	۱۔ ہوازن	–	۱	–	–	–	۱
	۲۔ بنو عامر	–	–	۱	–	–	۱
	۳۔ دئل/اسد	–	–	–	–	۱	۱
	۴۔ طے اور اسد	–	–	۱	–	–	۱
جنوبی عرب	۱۔ ازد جرش	–	–	۱	–	–	۱
	۲۔ ہمدان	–	–	۱	۱	۱	۳
	۳۔ مراد	–	–	–	۱	–	۱
	۴۔ جرش	–	–	–	–	۱	۱
	۵۔ مذحج	–	–	–	۱	–	۱

	۶۔ جعفی	-	-	-	۱	-	۱
	۷۔ رہاء	-	-	-	۱	-	۱
	۸۔ حضرموت	-	-	-	۱	-	۱
	۹۔ صداء	-	-	-	۱	-	۱
	۱۰۔ کندہ	-	-	-	۱	-	۱
قبائل پراگندہ	۱۔ تمیم	-	-	۱	-	-	۱
	۲۔ عبدالقیس	-	۱	-	-	-	۱
غیر معروف	-	-	-	۲	-	-	۲
میزان	۲۰ قبیلے	۲	۲	۷	۸	۹	۲۵

۳۔ نقیب

نقیب (یعنی قبیلہ یا خاندان کا سردار، نمائندہ قوم) بہت قدیم ادارہ ہے جس کے آثار و شواہد یہودی اور عیسائی روایات میں پائے جاتے ہیں۔ مصر سے اخراج کے بعد جزیرہ نمائے سینائی میں یہود کے بارہ قبائل میں بطور مختلف قوموں کے تقسیم ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم کہتا ہے کہ پھر خدا نے ان میں سے بارہ نقیب (سردار) بنائے"[۲۹۹] اس نقیب کے ادارہ کی مکمل تصدیق اور مزید تشریح انجیل مقدس کی آیات میں ملتی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیتی ہیں کہ وہ تمام بنو اسرائیل کی جماعتوں اور طبقوں کو شمار کریں اور تمہارے ساتھ ہر قبیلہ کا ایک شخص ہو، ہر وہ شخص جو اپنے آباؤ اجداد کے گھرانے کا سربراہ ہو"[۳۰۰] ان نقیبوں کی تقرری کا مقصد یہ تھا کہ وہ خدا کی طرف سے ودیعت کئے گئے الہامی فرائض کی ادائیگی میں حضرت موسیٰ کی مدد کریں اور اس بات پر بھی نظر رکھیں کہ ان کے اپنے متعلقہ قبیلے صراط مستقیم سے نہ بھٹک جائیں۔ یا خداوند قدوس سے کئے گئے اپنے معاہدہ کو نہ توڑ ڈالیں۔ یہودی سواد اعظم میں ان کے مقام و مرتبہ کی مزید تشریح انجیل کی آیت نمبر ۱۶ کرتی ہے۔ کہ یہ "نقیب" سواد اعظم کے سربرآوردہ لوگ اپنے آباد کے قبائل کے بادشاہ و شہزادے اور مملکت اسرائیل کے ہزاروں اشخاص کے سربراہ و سردار تھے"[۳۰۱] مولانا اشرف علی تھانوی[۳۰۲] اور رچرڈ بیل (KECHARD BELL) نے متعلقہ آیت قرآنی میں لفظ نقیب کے معنی سردار LEADER کے دیئے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ ان سربرآوردہ (ELDERS) کا انتخاب اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے (فرائض منصبی کے) بوجھ کو ہلکا کریں"[۳۰۳]

یہودی روایت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی قبول و شائع کیا اور اس کی اتباع میں بھی انہوں نے بارہ نقیب (شاگرد

حواری، سردار (APOSTLES Disciples) مقرر کئے[۲۰۴] تاکہ کلام مقدس کی وہ بنو اسرائیل میں تبلیغ و اشاعت کر سکیں انجیل کے عہد نامہ جدید، باب دہم کی آیات نمبر ۷ - ۵ کا بیان ہے کہ ان بارہ (نقیبوں) کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے روانہ کیا اور ان کو حکم دیا کہ وہ دشمنوں GENTILES کے راستے پر نہ جائیں اور نہ ہی سمرتوں (SAMARITANS) کے کسی شہر میں داخل ہوں۔ بلکہ بنو اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کے پاس جائیں اور جب تم پہنچو تو یہ کہہ کر نصیحت و تبلیغ کرو کہ جنت کی بادشاہت قریب ہے۔۔۔[۲۰۵]

نقیب کی اس یہودی اور نصرانی روایت کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۲۲ء میں بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر اسلامی تہذیب و دین میں جذب کر لیا اور اس کے اتباع میں آپ نے مدینہ کے دو قبیلوں اوس و خزرج سے بارہ نقیب منتخب کئے۔ جن میں سے تین اول الذکر کے تھے اور نو موخر الذکر کے۔ ابن اسحاق[۲۰۶] ابن سعد[۲۰۷]، بلاذری[۲۰۸]، بغدادی[۲۰۹] اور طبری[۲۱۰] کے علاوہ متعدد دوسرے ماخذ میں مذکورہ متعدد روایات یہودیوں اور عیسائیوں کی روایت نقیب کے مستعار ہونے کی وافر شہادت دیتی ہیں۔ جیسا کہ ہم ابھی اپنے مباحثہ میں دیکھیں گے۔

اسلام میں نقیب کا تصور اور ادارہ تقریباً انہی خطوط پر قائم ہوا تھا جن پر یہودی مذہبی نظام میں ماضی میں قائم تھا۔ عیسائی تصور نقیب نسبتاً کچھ مختلف معلوم ہوتا ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ ان تینوں الہامی مذاہب میں کم و بیش یکساں ہے۔ بلاذری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث نقل کرتے ہوئے کہتا ہے۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنو اسرائیل سے بارہ نقیب منتخب کئے تھے۔ اسی طرح سے میں بھی بارہ نقیب منتخب کروں گا۔۔۔۔[۲۱۱] اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ میں اکٹھا ہونے والے مدنی زائر مسلمین سے کہا تھا کہ "میرے پاس اپنے بارہ سرداروں کو لاؤ جو اپنے اپنے لوگوں یا قوم کے کفیل اور ذمہ دار ہو سکیں۔" یہ بات بہت اہم ہے کہ اس ارشاد نبوی کے بعد انصاری مسلمانوں اور قبیلہ والوں نے خود اپنے سرداروں کو منتخب کیا تھا اور "نو خزرج سے اور تین اوس سے" منتخب کر کے آپ کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور آپ نے ان کی بحیثیت نقیب تقرری کی توثیق کر دی تھی[۲۱۲] یعنی مدینہ کے سرداروں کا انتخاب آپ نے بنفس نفیس نہیں فرمایا تھا۔ جیسا کہ عام خیال ہے۔ پھر آپ نے "سرداروں سے فرمایا تھا: "تم اپنے اپنے لوگوں (قوم) کے اسی طرح ذمہ دار (کفیل) ہو جس طرح عیسیٰ ابن مریم کے حواری (شاگرد) ان کے سامنے جوابدہ تھے۔ جبکہ میں اپنی قوم کے لئے ذمہ دار ہوں۔"[۲۱۴] بلاذری اور ابن سعد کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نجار/ خزرج کے ایک معزز فرد حضرت ابو امامہ اسعد بن زرارہ کو ان سب کا نقیب اعظم (نقیب النقباء) اور سردار (رأس) مقرر کیا تھا۔ بلاذری کا مزید بیان ہے کہ اس انتخاب و تصدیق انتخاب کے بعد تمام نقیبوں نے یکے بعد دیگرے کھڑے ہو کر بعد حمد و ثنائے رب جلیل اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کئے گئے معاہدہ وعہد کے ایفا کا حلف اٹھایا تھا[۲۱۶]۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نقیب کا مقام و مرتبہ مدینہ کی شہری ریاست کے سربرآوردہ ترین اشخاص اور مقامی منتظمین کے مقام و مرتبہ کے بہت مشابہ تھا جو اوس و خزرج کے مختلف خاندانوں کے لوگوں کے طرز عمل اور معاملات کے کفیل اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جوابدہ تھے۔

بلاریب یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ نقیب کے عہدہ وادارہ میں مذہبی روح کار فرما تھی اور بنیادی طور پر وہ مذہبی اور صرف اس کے نتیجے میں سیاسی اور معاشرتی ادارہ بنا تھا۔ جیسا کہ تینوں الہامی مذاہب کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی تسلیم کیا جانا چاہیئے کہ نقیب کا تصور اور عہدہ پوری طرح سے قبائلی بنیادوں پر مبنی نہیں تھا یا قبائلی کردار نہیں رکھتا تھا اگرچہ نقیبوں کا انتخاب و تعلق، بلاریب انصار کے مختلف خاندانوں اور قبیلوں سے تھا۔ بظاہر یہ بات متضاد نظر آتی ہے مگر دراصل ایسا ہے نہیں۔ چنانچہ اس کی وضاحت ایک دوسری دلیل سے بھی کی جا سکتی ہے۔ جو زیادہ جاندار اور واضح ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ بنیادی طور سے نقیبوں کی تعداد بارہ تھی اور جہاں تک ہماری معلومات ہیں وہ ہمیشہ اور ہر سہ مذاہب میں بارہ ہی رہی نہ کبھی گھٹی اور نہ کبھی بڑھی جبکہ اوس و خزرج کے خاندانوں کی تعداد بارہ نہیں تھی۔ خاص کر اول الذکر کے تین نقیب اس کے محض تین خاندانوں سے تھے اور بقیہ خاندانوں میں ایک بھی نقیب نہیں تھا۔ اسی طرح خزرج کے معاملے میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے بعض خاندانوں کو بالکل نمائندگی نہیں ملی تھی۔ پھر بعض طاقتور قبائل کے خاندانوں میں دو دو نقیب تھے۔ جبکہ دوسرے اہم خاندانوں میں صرف ایک ایک نقیب تھا۔ کتاب کے آخر میں نقیبوں کی فہرست میں ان کے قبائلی اور خاندانی تعلق کو واضح کیا گیا ہے[۲۱۷] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوس کے نقیبوں کا تعلق ان کے تین خاندانوں بنو عبد الاشہل، بنو غنم، اور بنو عمرو بن عوف سے تھا۔ جبکہ خزرجی نقیبوں میں ایک ایک کا بنو النجار، بنو قواقلہ، بنو مزرق سے اور دو دو کا بنو الحارث، بنو ساعدہ اور بنو سلمہ سے تھا۔ اگر یہ قبائلی بنیادوں پر انتخاب ہوا ہوتا تو عقبہ میں موجود دوسرے خاندانوں کو بھی نمائندگی ملی ہوتی اور کسی بھی انصاری خاندان کو اس سعادت سے محروم نہ ہونا پڑا ہوتا۔ بیعت عقبۂ ثانیہ میں موجود و شریک حضرات و خواتین کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو بیاضہ میں ایک بھی نقیب نہیں تھا اور اسی طرح بنو النجار اور غنم کو جو کافی بڑے خاندان بلکہ قبیلہ بن گئے تھے۔ اور ان کی متعدد شاخیں تھیں متناسب نمائندگی نہیں ملی تھی[۲۱۸]

اس بحث سے بعض جدید مؤرخین کے اس نظریہ کی تردید ہوتی ہے کہ نمائندوں (REPRESENTATIVES) یعنی نقیبوں کی خاندانوں میں تقسیم عقبہ میں موجود اس خاندان کے ارکان کی تعداد اور صلاحیت پر مبنی تھی[۲۱۹] اگر ایسا ہوتا تو بنو النجار کا خاندان جو عددی اور صلاحیت کے اعتبار سے سب سے بڑا تھا اور جس کی اس موقع انتخاب پر کافی نمائندگی بھی تھی۔ ایک سے زیادہ نقیبوں کی سعادت کا حقدار بنتا۔ حقیقت یہ تھی کہ نقیبوں کا انتخاب منتخب افراد کی ذاتی صلاحیتوں، لیاقتوں اور اوصاف کے علاوہ مدینہ کے سماج و سیاست میں ان کے مقام و مرتبے پر مبنی تھا اور بلاریب اس وقت کے نظام میں یہی لوگ سب سے زیادہ اہم تھے

اسی طرح نقیبوں کی کارکردگی اور افادیت کے بارے میں بعض مؤرخین نے شبہات و شکوک کا اظہار کیا ہے اور یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ عہد نبوی میں ان عہدہ داروں نے کوئی کام نہیں کیا اور یہ ادارہ نقیب بے سود تھا[۲۲۰] لیکن ماخذ میں جو بھی تھوڑی بہت معلومات اس کے بارے میں ملتی ہیں۔ وہ اس نظریہ و خیال کی تردید کرتی ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ نقیبوں کا یہ ادارہ تا اواخر عہد نبوی کام کر رہا تھا اور اس کے نمائندے اپنے فرائض برابر انجام دیتے رہے تھے۔ تقریباً تمام ماخذ کا اتفاق ہے کہ نقیب النقباء حضرت اسعد بن زرارہ کے شوال ۱ھ / مارچ ۶۲۳ء میں انتقال کے بعد بنو النجار کے لوگوں نے،

جن کے وہ خاندانی نقیب بھی تھے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ ان کے لئے کسی نئے نقیب کی تقرری فرمادیں۔ آپ نے بجائے کسی نئے نقیب کو مقرر کرنے کے خود یہ ذمہ داری سنبھال لی تھی[۲۲۱]۔ اس سے کم از کم مدینے کے ابتدائی عہد نبوی میں نقیبوں کے ادارے کا کام کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہاں اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسعد بن زرارہ کی جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فریضہ سنبھالنا محض اس سبب سے نہ تھا کہ آپ اپنی پردادی کے ذریعہ بنو النجار کے رشتہ دار اور عزیز تھے بلکہ اس بنا پر بھی تھا کہ آپ اب تمام مسلمانوں کے سردار کی حیثیت سے نقیب النقباء بھی بن گئے تھے۔

بہرحال اس کے علاوہ دوسرے واقعات اور حقائق بھی اس ادارہ کی کارکردگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں ایک اور نقیب حضرت براء بن معرور جن کا تعلق بنو سلمہ کے گھرانے سے تھا صفر سنہ ۱ھ اگست سنہ ۶۲۲ء میں انتقال کر گئے[۲۲۲] یعنی انکا انتقال ہجرت نبوی سے ایک ماہ قبل ہو گیا تھا۔ بہرحال آپ کی آمد مدینہ کے بعد ہی کسی وقت حضرت براء کی جگہ ان کے فرزند حضرت بشر کو ان کے خاندان کا نقیب مقرر کیا گیا جیسا کہ اسد الغابہ کا خیال ہے[۲۲۳]۔ افسوس یہ کہ اس تقرری کے زمانے کی تصریح و تعیین نہیں کی گئی ہے۔ مذکورہ بالا ماخذ تین مزید انصاریوں کا ذکر کرتا ہے جن کو عہد نبوی میں نقیب مقرر کیا گیا تھا۔ یہ تھے حضرات عمرو بن جموح جو خزرج کے خاندان بنو سلمہ کے نقیب تھے[۲۲۴]۔ رافع بن خدیج جو اوس کے خاندان عمرو بن مالک کے نقیب مقرر ہوئے تھے[۲۲۵] اور مسیب بن عمرو جن کے خاندان اور میدان کار کا ذکر نہیں ملتا[۲۲۶] ان تینوں کے معاملے میں بھی زمانۂ تقرری کی تصریح نہیں ملتی مگر حضرت رافع بن خدیج کے معاملے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تقرری کم از کم غزوہ احد کے بعد ہوئی ہو گی کیونکہ وہ اس وقت تک نہ صرف نابالغ تھے بلکہ اس عہدہ کے لائق نہ تھے۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ یہ نقیب کس طرح کام کرتے تھے اور کیا کام کرتے تھے ہم نہیں جانتے البتہ بعد میں اموی اور عباسی ادوار میں عباسی اور علوی نقیبوں[۲۲۷] کے کارناموں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنظیم جماعت کا کام کرتے تھے اور ان کا مقصود و مطلوب اپنے حامیوں اور ہمنواؤں کی صفوں میں اتحاد، سماجی، فوجی اور سیاسی ہم آہنگی اور اجتماعیت پیدا کرنا ہوتا تھا۔ ان کے کام کرنے کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ ہر نقیب اپنے اپنے علاقہ میں ایک تنظیمی مرکز قائم کرتا تھا۔ اور اپنے حامیوں خاص کر داعیوں (دعاۃ) کو جن کی کل تعداد ستر تھی مبلغین و معلمین و منتظمین کی حیثیت سے مختلف علاقوں میں بھیجتا تھا اور ان کے ذریعہ سے دعوت پھیلایا کرتا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس نہج پر اموی دور میں عباسی دعاۃ اور نقیبوں نے عباسی انقلاب کے لئے کامیاب کوششیں کی تھیں[۲۲۸]۔ جبکہ عباسی دور میں اسی طرح علوی نقیبوں اور داعیوں نے کام کیا تھا مگر وہ اپنی تنظیمی خامیوں کے سبب کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئے تھے۔ چونکہ یہ عباسی اور علوی نقیب ان کے سرداروں کے دعوؤں کے مطابق اسوۂ نبوی پر منظم و مرتب کئے گئے تھے۔ اس لئے یہ خیال ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں بھی اولین اسلامی نقیبوں نے اس طرح اپنے مراکز قائم کر کے اپنے نمائندوں / داعیوں اور مددگاروں کے ذریعہ اسلامی جماعت کی شیرازہ بندی کی تھی۔ اور مقامی نظم و نسق میں ہاتھ بٹا کر اسلامی ریاست کی بیش بہا خدمت انجام دی تھی۔ دونوں میں فرق یہ تھا کہ نبوی نقیب حکومت و ریاست کے وفادار اور حامی تھے تو عباسی اور علوی نقیب حکومت وقت کے مخالف اور باغی تھے۔

۴- قضاۃ (قاضی)

یہ غلط فہمی عام ہوگئی ہے اور کم از کم جدید مؤرخین اور مستشرقین کی حد تک راسخ بھی ہوگئی ہے کہ قضا (عدل و انصاف) کا ادارہ عہد نبوی میں ارتقاء پذیر نہیں ہو سکا تھا۔ اس غلطی اور غلط فہمی کے شائع ہونے کا اصل سبب مستشرقین اور جدید مؤرخین کی وہ طاقتور تحریریں ہیں جو انہوں نے اس موضوع پر سپرد قلم کی ہیں اور جو عموماً جدید نظام عدلیہ کی روشنی میں اسلام کے کلاسیکی زمانے کے نظام عدل و انصاف کا مطالعہ کرتے ہیں۔ بہر حال ماخذ پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اس نظام کے فعال و موجود ہونے کے وافر ثبوت اس عہد مبارک میں ملتے ہیں اور متاخر مسلمان مصنفین نے تو اس موضوع پر بڑا وسیع اور قیمتی ذخیرہ چھوڑا ہے[۲۲۹]۔ بہر حال قرآن کریم کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عدل و انصاف کا نہ صرف سرچشمہ قرار دیا گیا ہے بلکہ آپ کے فیصلوں کو واجب التعمیل اور حکم ناطق ہونے کے علاوہ مسلمانوں کو ان کو بلا کسی جھجک اور دل کی کھٹک کے قبول کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سیاسی طور پر بھی یہ انصاف کا تقاضا ہے کہ اسلامی ریاست کی عدلیہ کے سربراہ ہونے کا منصب آپ ہی کو عطا کیا جاتا۔

ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ عدل و انصاف کے سب سے بڑے قاضی یا حاکم کی حیثیت سے یا بطور عدالت عالیہ و مطلقہ کے آپ نے مدنی دور میں متعدد مقدمات کا فیصلہ فرمایا تھا۔ جن میں سے بعض کا حوالہ مذکورہ بالا ابواب میں آچکا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک یہودی، زانی، ایک یہودی چور اور ایک مسلم زانی مرد اور چور عورت کے مقدمات میں آپ کے فیصلے بڑے اہم تھے۔ آپ کے نظم و نسق کے اس پہلو کی حیثیت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ متعدد مسلم مصنفین نے آپ کے مقدمات اور فیصلوں پر بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہیں اور چن چن کر ان کو جمع کر دیا ہے[۲۳۰]۔ کتانی نے ان کو مختلف فصول اور ذیلی فصول میں تقسیم کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک پر خاصی مفصل بحث کی ہے[۲۳۱]۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرکزی اور صوبائی قاضیوں پر بھی ایک علیحدہ فصل میں بحث کی ہے[۲۳۲]۔ کثیر قضاۃ نبوی میں سے آٹھ حضرات کا نام بنام ذکر ملتا ہے۔ یہ تھے حضرات عمر، علی، معاذ بن جبل، عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ابو موسیٰ اشعری، عقبہ اور معقل بن یسار[۲۳۳]۔

یہاں یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ عہد نبوی کے تمام قاضی چاہے وہ مرکز اسلام مدینہ میں مقرر ہوئے ہوں یا صوبوں اور ولایتوں میں ان کی حیثیت مقامی افسران قضاء و انصاف کی تھی۔ یعنی ان کے اختیار اور اقتدار کی وسعت و احاطہ دوسرے قاضیوں پر نہیں تھی اور صوبائی یا مقامی قاضی ان کے ماتحت نہیں تھے۔ یہ اختیار تنہا ذات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ جو قاضی القضاۃ یا پوری اسلامی مملکت کے قاضی تھے۔ جن کا اختیار نہ صرف دوسرے قضاۃ پر حاوی و جاری تھا بلکہ وہ ان کے فیصلوں کو کالعدم قرار دے سکتے تھے۔ بہر حال کچھ مدینہ کے مرکز میں قاضی مقرر کئے گئے تھے اور کچھ کو ولایات میں۔ موخر الذکر میں قضاء کے فرائض عموماً گورنر یا والی انجام دیتا تھا۔ جیسا کہ حضرات معاذ بن جبل، ابو موسیٰ اشعری اور ابو عبیدہ بن جراح فہری وغیرہ کے بارے میں صراحتاً معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں والیوں کے فرائض و اختیارات پر گذشتہ بحث کی طرف حوالہ دیا جاتا ہے اور ان کو اب دہرانے کی ضرورت نہیں کہ تکرار اور تحصیل حاصل ہوگی۔ گورنر اور والیوں کے علاوہ یہ اختیار کسی حد تک امراء

سالاران مہم اور عاملین صدقات کو بھی مخصوص حالات میں حاصل ہوتا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مآخذ، امیر، قاضی، جابی محصل، اور عامل دکارکن، وغیرہ اصطلاحات کا استعمال مترادفات کے طور پر کرتے ہیں[۳۳۴]۔ بہر حال معلوم یہ ہوتا ہے کہ تمام مرکزی، صوبائی اور مقامی منتظموں کو قضا (فیصلہ کرنے) اور عدل و انصاف کے اختیارات حاصل تھے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ عہد نبوی میں تقسیم فرائض کا جدید سیاسی نظریہ موجود نہیں تھا جس کے مطابق عدلیہ، مقننہ اور عاملہ کو تین ناقابل اشتراک اور شدید شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اس زمانے میں عدل و انصاف کا فریضہ اور کام دراصل عام نظم و نسق کا حصہ تھا۔ اور کوئی افسر و عامل نبوی اسکی انجام دہی کا مجاز تھا بہر حال عہد نبوی میں قضا کے اس مستقل بند و بست کے علاوہ مآخذ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مواقع پر اپنی موجودگی ہی میں بعض اصحاب سے مقدمات فیصل کرائے تھے۔ ترمذی، احمد بن حنبل اور حاکم کی بعض روایات سے معلوم ہے کہ تین مختلف مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متقادم (متخاصم فریقین (خصمان)) کے درمیان جو خدمت نبوی میں اپنے مقدمات لیکر آئے تھے۔ حضرات عمر بن خطاب، معقل بن یسار اور عقبہ سے فیصلے کرائے تھے۔ اور انکے فیصلوں کو پسند بھی کیا تھا[۳۳۵]۔ ظاہر ہے کہ اس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی ریاست کے ان افسروں کو اپنی موجودگی میں تربیت دیں اور وقت کے روز افزوں مسائل کے حل کے لئے ایک عدلیہ کا نظام بھی مرتب کریں جو آپ کی موجودگی کا محتاج نہ ہو۔ اس نبوی نقطہ نظر کا بہترین اظہار آپ کے حضرت معاذ بن جبل کے درمیان اس گفتگو سے ہوتا ہے جو موخر الذکر کے بطور گورنر جنرل یمن جانے سے پہلے ہوئی تھی۔ اسی طرح یہ بھی نتیجہ نکالنا جائز ہے کہ عہد نبوی میں مختلف اصحاب قضاء اور عدل و انصاف کا کام مستقل طور سے آزادانہ کیا کرتے تھے اور اختلاف کی صورت میں یا فریقین میں سے کسی کی بے اطمینانی کی صورت میں مقدمات آپ کی عدالت میں بھی لائے جاتے ہوں گے۔ جہاں آپ ان کی توثیق یا تردید کرتے تھے۔ اس کی مزید تصدیق متاخر مصنفین کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ آپ نے صرف اکادکا اصحاب سے ہی مقدمات فیصل نہیں کرائے تھے بلکہ مستقل طور سے ایک پورے گروہ (جماعت) کو اس کے لئے مقرر کر دیا تھا[۳۳۶]۔ صبح الاعشیٰ کے مطابق عہد نبوی میں اور بعد کے زمانے میں بھی قاضی کا کام یہ تھا کہ وہ شریعت کے تمام امور کے سلسلہ میں فریقین کے اختلافات اور جھگڑوں کو طے کیا کرے[۳۳۷]۔ اس میں دیوانی اور فوجداری دونوں کے مقدمات شامل تھے۔ بہر حال جب بھی قاضی مناسب سمجھتے تھے تو وہ بعض پیچیدہ مقدمات اور معاملات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے لے لیتے تھے۔ کیونکہ دراصل آپ ہی اسلامی ریاست کی عدالت اعلیٰ تھے۔

۵۔ بازار کا انتظام اور اس کے افسر

چودھویں صدی عیسوی کے ایک عظیم ہندوستانی مورخ ضیاء الدین برنی کے مطابق بازاروں کا نظم و نسق ہمیشہ قرون وسطیٰ کی حکومتوں کے لئے دردسر رہا ہے۔ کیونکہ تاجر، سوداگر اور دوسرے بازار کے لوگ انتہائی شاطر، فریبندہ صفت اور عیار و مکار رہے ہیں۔ ان پر قابو پانا ایک امر محال رہا ہے[۳۳۸]۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام نے جو سماج کے تمام طبقات

کے عمل و کردار کی پاکیزگی کا علمبردار ہے۔ تاجروں اور بازار کے لوگوں کے عمل و کردار کی بھی صحیح تعبیر و تشکیل کرنا چاہتا تھا چنانچہ قرآن کریم اور احادیث نبوی میں اس قسم کی بہت سی ہدایات اور احکام ملتے ہیں۔ انتظامی طور سے یہ اسلامی ریاست کے سربراہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ شرعی حدود کے اندر بازاروں کے نظم و نسق کے لئے اقدامات کرے کیونکہ محض اخلاقی و روحانی تعلیمات کسی نظام کی بقا اور اثر کے لئے کافی نہیں ہوا کرتیں۔ چنانچہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس بازاروں کا چکر لگاتے اور دورہ کرتے تھے اور تاجروں اور خریداروں دونوں کے اعمال و اخلاق کی درستگی کے لئے برابر احکام و ہدایات جاری کیا کرتے تھے۔ ترمذی کی روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ کا گذر ایک بازار سے ہوا اور آپ نے وہاں ایک شخص کے پاس گیہوں کا ڈھیر دیکھا جو وہ فروخت کے لئے لایا تھا۔ آپ نے اس ڈھیر میں اپنا ہاتھ ڈال دیا تو دیکھا کہ وہ اندر سے نم ہے۔ آپ نے تاجر کو سرزنش کی اور دھوکہ دینے سے منع کیا[339]۔ اسی طرح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ غلہ و اناج کی ایک جگہ خرید و فروخت کو بھی آپ نے ممنوع قرار دیا تھا[340]۔ آپ نے اناج کے تاجروں کو جو مجازفہ[341] طریق تجارت سے خرید و فروخت کرتے تھے۔ دہری تجارت کرنے کی ممانعت کی تھی تا آنکہ وہ اپنے علاقہ یا قیام گاہوں (رحال) تک نہ پہنچ جائیں[342]۔ اناج کی خرید و فروخت صرف بازاروں میں یا ان مقامات پر جائز قرار دی گئی تھی جہاں وہ عام طور سے ہوا کرتی تھی[343]۔ اس قسم کی تمام ہدایات کا مقصود یہ تھا کہ اناج کے تاجروں کی باقاعدہ نگرانی کی جا سکے اور ان کے پر فریب طریقوں کا انسداد کیا جا سکے۔

اس مقصد کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بازار کے مختلف افسروں کی تقرری بھی کی تھی۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے فوراً بعد آپ نے بنو امیہ کے خاندان سعیدی کے ایک فرد حضرت سعید بن سعید بن العاص کو مکہ کے بازار کا افسر (السوق) مقرر کیا تھا[344]۔ مکہ کی اقتصادی دولت اور اس کی تجارت پر کل انحصار کی حقیقت کے پس منظر میں یہ تقرری بہت اہم تھی۔ اسی طرح حضرت عمر بن خطاب کو آپ نے مدینہ کے بازار کا افسر مقرر کیا تھا[345]۔ اور یہ ظاہر و بین حقیقت ہے کہ مدینہ کا بازار خاصی بڑی تجارتی اہمیت کا حامل تھا۔ اس لئے یہ تقرری بھی خاصی اہم تھی۔ مگر اس تقرری کا زمانہ نہیں معلوم ہو سکا۔ اندازہ یہ ہے کہ یہ تقرری شروع ہی میں عمل میں آ گئی تھی کیونکہ مدینہ کے یہودی تاجروں کے علاوہ جو اپنے پر فریب اقتصادی اور تجارتی معاملات کے لئے مشہور ہیں۔ کچھ انصاری اور تمام تر مہاجرین بھی تجارت میں لگ گئے تھے[346]۔ اس کے علاوہ قرب و جوار کے تاجران عرب اور شام جیسے دور دراز علاقوں کے نبطی تاجر بھی وہاں آتے تھے[347]۔ گویا کہ وہ ایک بین الاقوامی تجارتی منڈی تھی اور ایسے اہم تجارتی مرکز کے نظم و انتظام کے لئے حضرت عمر فاروق جیسے عظیم و دور بین منتظم ہی کی ضرورت تھی۔ اسی سلسلے میں یہ نکتہ بھی ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ یہ دونوں افسران و عمال بازار نبوی مستقل افسر تھے۔ اگرچہ حضرت سعید بن سعید اموی جلد ہی ایک مہم میں شہید ہو گئے تھے بگران کی جگہ قیاس کے مطابق کسی اور افسر کا تقرر ضرور عمل میں آیا ہو گا۔ بہرحال قرائن کہتے ہیں کہ تمام بڑے بازاروں اور تجارتی مراکز کے لئے اس قسم کے افسر مقرر کئے جاتے تھے۔ اگرچہ ان کے بارے میں تاریخی شواہد کم ملتے ہیں اور جہاں اس قسم کے مخصوص افسر نہیں تھے۔ وہاں بازاروں کی نگرانی اور ان کا نظم و نسق، مرکزی منتظمین، گورنروں اور مقامی منتظموں کے فرائض و اختیارات میں شامل تھا کہ یہ بھی عام نظم و نسق کے شعبے کے دائرہ کار میں آتا تھا۔

خلاصہ بحث

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریاستِ اسلامی کے سربراہ کی حیثیت سے جس قسم کے نظام حکومت کی بنیاد ہجرت کے بعد ڈالی تھی وہ رفتہ رفتہ دس سال کی مدت میں ترقی کے مختلف مراحل سے گذرتا ہوا نقطۂ کمال کو پہنچا تھا۔ عربوں میں ایک تو قبائلی سیاسی نظام تھا جس میں ہر قبیلہ آزاد و خود مختار ہوتا تھا اور جس کا نظام حکومت اگر کوئی تھا تو وہ باہمی تعاون یا اشرافیہ کے اصولوں پر چلایا جاتا تھا۔ اس قدیم قبائلی نظام میں شراکت کا اصول کارفرما تھا، کہ ایک قبیلہ کے تمام خاندانوں کے سارے سربرآوردہ اور شیوخ کی ایک مجلس بنتی تھی جو مکی اشرافیہ میں ملاء کہلاتی تھی اور یہی تمام قریشی معاملات کی دیکھ بھال کرتی تھی اس نظام میں مرکزیت نہیں تھی۔ لیکن دوسرا نظام جو عربوں میں معروف اور جزیرہ نمائے عرب کے سرحدی علاقوں میں رائج تھا۔ بادشاہت (ملوکیت) کا تھا اور وہ کلی طور سے مرکزیت کا حامل تھا۔ مگر جہاں دوسری خرابیاں تھیں۔ عربوں کو جب یہی خیال آیا تو انہوں نے مرکزیت کی خاطر اسی نظام بادشاہی کو اختیار کرنا چاہا۔ جیسا کہ علامہ وقت سید سلیمان ندوی نے واضح کیا ہے۔ کہ یہ غلط فہمی عام ہوگئی کہ عربوں کے نزدیک بادشاہت یا ملوکیت ناپسندیدہ طرز حکومت تھی۔ دراصل عربوں کو جو چیز اس نظام کی ناگوار تھی وہ اس کی حد سے بڑھی ہوئی مرکزیت تھی جس میں ان کی آزادروی کی گنجائش نہیں تھی۔ بہرحال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں نظاموں سے مختلف اسلامی نظام حکومت قائم کیا تھا۔ جس میں افراد اور شخصی آزادی کی فطری رعائت بھی رکھی گئی تھی اور اجتماعیت اور مرکزیت کے اصولوں کو بھی پوری طرح سے بروئے کار لایا گیا تھا۔ اس نظام نبوی میں انفرادی آزادی اور خود مختاری اجتماعیت اور مرکزیت کی دشمن اور متصادم نہیں بلکہ اس کی ممد و معاون اور تصدیق کرنے والی تھی۔

عصری ضرورتوں اور نئے حالات کے تقاضوں کے تحت حکومت اور انتظامیہ کے شعبے بھی وجود میں آتے گئے اور آپ نے ان میں مختلف سیاسی و انتظامی تجربات کئے اور ان کو رفتہ رفتہ ارتقائی شکل دیتے گئے چنانچہ تاریخی توقیت کےمطابق سب سے پہلے نائبین رسول یا خلفاء رسول کا طبقہ انتظامیہ وجود میں آیا۔ ہجرت کے پہلے سال ہی آپ کو مدینہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش آئی اور اس غیر حاضری میں آپ نے مدینہ کی نوزائیدہ ریاست کے معاملات کی دیکھ بھال اور اسلامی امت کے مفادات کی نگرانی کی خاطر شہر میں اپنا ایک خلیفہ رنائب چھوڑا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد معمول ہوگیا کہ آپ جب کبھی باہر تشریف لیجاتے اپنے پیچھے ایک جانشین چھوڑ جاتے جو عموماً نماز کا امام یا امیر کہلاتا تھا مگر وہ آپ کا سیاسی و انتظامی جانشین ہوتا تھا اور آپ کی غیر حاضری میں سربراہ مملکت کا قائم مقام بھی اس طرح پورے عہد نبوی میں کل ۳۲ تقرریاں اس شعبہ افسران میں ہوئی تھیں مگر نواب رسول کی کل تعداد صرف ۱۳ تھی۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے متعدد کی تقرری ایک سے زیادہ مرتبہ ہوئی تھی، اور سب سے اہم شخصیت حضرت ابن ام مکتوم عامری کی تھی جو اس منصب جلیل پر تیرہ بار فائز ہوئے تھے۔ اسی سے یہ نکتہ بھی آشکارا ہوتا ہے کہ نائبین رسول کا عہدہ تو مستقل تھا اور مستقبل میں منارۂ نور بننے والا تھا۔ مگر عہد نبوی میں اس کے عہدیدار عارضی ہوتے تھے۔ کیونکہ مستقل سربراہ مملکت موجود و باحیات تھے۔ دوسرے شعبوں میں تقرری کی بنیادوں کی طرح اس شعبہ میں بھی وہ صرف

لیاقت اور موزونیت بھی مگر یہ عہدہ اعزازی تھا کہ عہدیدار کو کوئی تنخواہ یا مالی منفعت نہیں حاصل ہوتی تھی۔

اسلام کے سیاسی نظام میں سربراہ ریاست کے لئے مشورہ کرنا، امت کے افراد سے رائے لینا اور مباحثہ کرنا تو ضروری ہے، لیکن کم از کم عملاً مشیروں کا مشورہ مان لینا عہد اسلامی کے زریں عہد میں کبھی کبھی لازمی اور ناگزیر نہیں رہا۔ بہرحال اس حکم الٰہی کے بموجب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے تمام اجتماعی معاملات چاہے وہ سیاسی ہوں، انتظامی ہوں، سماجی یا اقتصادی اور حتیٰ کہ مذہبی ہوں۔ آپ مسلمانوں کے اہل رائے سے مشورہ ضرور کرتے تھے اور اکثر و بیشتر ان پر عمل بھی کرتے تھے۔ لیکن یہ آپ کا اختیار تھا کہ انہیں تسلیم کریں یا مسترد کریں۔ اس عہد میں مجلس شوریٰ کی کوئی خاص شکل نہیں تھی اور نہ ہی مشیران حکومت کے لئے کسی قسم کی شرائط متعین تھیں۔ اصولاً ہر مسلم مشورہ دے سکتا تھا لیکن آپ عملاً مسلمانوں کے مرکز کے سربرآوردہ اور اہل رائے کے ایک مخصوص طبقے سے ہی رائے لیتے تھے۔ کبھی کبھی آپ پوری امتِ اسلامی کے مرکزی نمائندوں کو بھی جمع کر لیتے تھے۔ جنگی معاملات میں آپ کے مشورہ لینے کے بہت کثیر حوالے ملتے ہیں اور اس ضمن میں سب سے بڑے مشیر نبوی حباب بن منذر خزرجی تھے۔ اگرچہ دوسرے شعبہ ہائے حیات میں مشورہ لینے کی اتنی شہادتیں نہیں ملتیں تاہم یہ نتیجہ نکالنے کے لئے کافی ہیں کہ آپ کی حکومت شوریٰ کے نظام پر قائم تھی کہ یہی صفت جماعت مومنین تھی۔ آپ کے دوسرے مستقل مشیروں میں حضرات ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کا درجہ سب سے بلند تھا اور تمام مشیران نبوی فی سبیل اللہ یہ کام انجام دیتے تھے۔

حکومت کا کام جوں جوں پھیلتا گیا اور اسلام کی جوں جوں تکمیل ہوتی گئی توں توں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مددگاروں اور سیکرٹریوں کی ضرورت اور دستاویزات وغیرہ لکھوانے کی حاجت بڑھتی گئی۔ جاہلی عربوں میں لکھنا پڑھنا اگرچہ وصف محمود تھا تاہم عملاً اس کے جاننے والے لوگ کم تھے خاص کر بدوی اور نیم متمدن علاقوں میں۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک عظیم صفت آپ کا امی ہونا تھا۔ لیکن آپ نے "کتابت" کی فن کی بڑی حوصلہ افزائی کی کہ یہی اسلام کا تقاضا بھی تھا۔ مسلمانوں کے لئے مذہبی اور سیاسی دونوں لحاظ سے قرآن کریم کی حفاظت سب سے بڑا کام تھا۔ جو کتابت کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مکی عہد سے آپ نے قرآن کی نازل شدہ آیات کا اہتمام و انتظام کیا تھا۔ اس ابتدائی دور میں اس کے کاتبین میں حضرات شرحبیل بن حسنہ کندی، عثمان بن عفان اموی اور علی بن ابی طالب ہاشمی سرفہرست تھے۔ مدنی دور میں یہ سعادت مستقل طور سے حضرات ابی بن کعب خزرجی، زید بن ثابت خزرجی اور معاویہ بن ابی سفیان اموی کو حاصل ہو گئی تھی۔ قرآن کریم کے علاوہ سیاسی دستاویزات جیسے قبیلوں سے معاہدے، افراد و قبائل کو خط ضمانت اور پروانۂ قطائع آراضی، گورنروں اور عاملوں یا عوام الناس کے نام فرامین و سرکاری خطوط اور غیر ملکی یا ملکی حکمرانوں کے نام خطوط وغیرہ بھی لکھوائے جاتے تھے اور ان کی کتابت کے کبھی کبھی الگ اور مخصوص افسران کتابت ہوتے تھے۔ اسی طرح انتظامی معاملات جیسے اموال غنیمت میں مسلمانوں اور ریاست کے حصص، صدقات و عشور و جزیہ وغیرہ کی رقوم اور پیداوار اراضی کے اعداد و شمار رکھنے کی غرض سے مستقل افسران کتابت یا کاتبین مقرر کئے گئے تھے۔ یہ اسلامی ریاست کا دراصل دیوان رسالت تھا جو عہد نبوی میں شروع ہو کر بعد میں خلافت راشدہ اور اموی و عباسی عہد میں ارتقاپذیر ہوا تھا۔ عہد نبوی میں کاتبین مستقل، نیم مستقل اور عارضی اور جز وقتی ہوتے تھے جو اپنے اپنے فرائض اللہ کے لئے انجام دیتے تھے۔ نامہائے گرامی کا طرز تحریر سادہ، مبالغہ و غلو سے

پاک اور مختصر ہوتا تھا۔ عموماً نامہ مبارک کا آغاز اللہ کے نام سے ہوتا تھا اور کاتب اور مکتوب الیہ کے ناموں کے بعد دعائیہ کلمات ہوتے تھے، جن کے بعد اصل متن ہوتا تھا۔ نامہ کا خاتمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر مبارک پر ہوتا تھا۔ جو اصل میں آپ کی انگوٹھی تھی اور اس پر محمد رسول اللہ کندہ تھا۔ مآخذ کے مطابق جب بھی آپ اسے استعمال نہیں فرماتے تھے تو ایک افسر خاتم کے سپرد کر دیتے تھے جو اس کی حفاظت کرتا اور بوقت ضرورت خدمت اقدس میں پیش کر دیتا تھا۔ اب تک کل کاتبوں کی تعداد ۴۲ مل سکی ہے، اور امکان ہے کہ کچھ اور بھی تھے جن کے نام محفوظ نہیں رہ سکے۔

لیکن اصل سیکرٹری کا مقام حضرت بلال حبشی کو حاصل تھا جو اس عہدہ کے صحیح معنوں میں مصداق تھے وہ آپ کے گھریلو اور نجی کے کاموں (حوائج) کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ متعدد سرکاری کام انجام دیتے تھے۔ ان میں سرکاری مہمانوں کی میزبانی، سرکاری رقوم کی ارشاد نبوی کے مطابق تقسیم جن میں عطایا اور انعامات بھی شامل تھے۔ وغیرہ شمار کئے جاتے ہیں۔ غرض کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے منتظم، خازن، منادی، میزبان، محافظ اور نہ جانے کیا کیا تھے۔

اسلامی ریاست کی توسیع کے ساتھ ساتھ غیر مسلم طبقات، قبائل، اقوام اور حکمرانوں سے تعلقات و روابط کی بھی ضرورت پڑی تھی اور ان سے مختلف مواقع پر گفت و شنید کی حاجت ہوتی تھی اس کام کے لئے مکہ کے جاہلی عرب نظام میں سفارہ کا عہدہ تھا، جس کے آخری عہدیدار حضرت عمر فاروق تھے۔ عہد نبوی میں یہ عہدہ رسالۃ اور اس کے منصبدار رسول = رسل کہلائے اور وہ جاہلی سفیروں کے مقابلے میں عارضی ہوتے تھے۔ جبکہ ان کا عہدہ مستقل تھا۔ عام خیال ہے کہ عہد نبوی میں پہلی بار سفراء کا تقرر سنہ ۶ھ/۶۲۸ء میں صلح حدیبیہ کے مابعد ہوا تھا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ سات ملکی اور غیر ملکی حکمرانوں کو دعوت اسلام دینے کے لئے اپنے سفیروں کو بھیجا تھا لیکن یہ اس شعبہ کے ارتقاء کا ایک اہم موڑ تھا۔ "رسالۃ کا عہدہ" اور "رسول" کا تقرر پہلی بار غالباً غزوہ بنو قینقاع کے زمانے میں سنہ ۲ھ/۶۲۴ء میں ہوا تھا اور حیرت و دلچسپی کی بات ہے کہ اولین سفراء نبوی کا تقرر فوجی اور نیم فوجی مہموں کے دوران فریق مخالف سے گفتگو کے لئے کیا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ سفیروں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور بعد کے زمانے میں متعدد قبائل کے شیوخ اور غیر ملکی حکمرانوں سے گفت و شنید کے لئے بہت سے سفیر بھیجے گئے۔ عہد نبوی کے اس انتظامی شعبہ میں کل ۳۸ سفیروں کے نام ملتے ہیں جن کو ۴۲ بار تقرریاں ملی تھیں یعنی بعض کو ایک سے زیادہ مرتبہ یہ سعادت ملی تھی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کو کسی قسم کی تنخواہ ملتی تھی یا نہیں تاہم یہ حتمی ہے کہ تمام سفیروں کے سفر کے اخراجات کی کفالت کی ذمہ داری اسلامی ریاست کی تھی۔

عہد نبوی کے انتظامیہ میں ایک شعبہ افسران بکار خاص کا ہوتا تھا۔ جو مختلف قسم کے کام ارشاد نبوی کے بموجب انجام دیتے تھے۔ یہ کام اہم بھی ہوتے تھے اور معمولی نوعیت کے بھی۔ بنو قریظہ کے معاملہ میں حضرت سعد بن معاذ اوسی کی تحکیم، تین مواقع پر حضرت علی ہاشمی کا دیت ادا کرنا، منافقوں کے ایک گھر اور مسجد ضرار کو منہدم کرنا، سزاؤں اور حدود کو نافذ کرنا، اسلامی قوانین کے نفاذ کا اعلان کرنا وغیرہ کو ان افسروں کا کام شمار کیا گیا۔ یہ طبقہ ہم نے اپنی آسانی کے لئے بنا لیا ہے۔ ورنہ حقیقتاً ایسا کوئی طبقہ اس زمانے میں موجود نہیں تھا۔ کیونکہ مآخذ اس کے لئے کسی خاص اصطلاح کا ذکر نہیں کرتے۔ یہ افسر و عمال بھی عارضی ہوتے

تھے۔ کیونکہ ان کا کام بھی عارضی ہوتا تھا۔ ایسے افسروں کی کل تعداد بھی ۱۴ تک مل سکی ہے اور ظاہر ہے کہ اور بھی بہت سے ہونگے

عربوں میں شاعری، زباندانی اور زبان آوری کے سمجھی جاتی تھی کہ وہ ان کے جذبات کی ترجمان تھی اور وہ اس کو جذبات و خیالات کے رسل و رسائل اور ابلاغ کے ایک مؤثر ذریعہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ شعراء اور خطباء کو سماج میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور بقول ایک جدید مؤرخ "وہ قوم کے قلب و ضمیر کے محافظ تھے" اسلامی ریاست نے بھی شعراء اور خطباء کی خدمات سے فائدہ اٹھایا تھا اور ان کو سیاسی و سماجی مقاصد کے لئے استعمال کیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تین شاعر حضرات حسان بن ثابت، کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ مدینہ کے قبیلے خزرج کے افراد اور اسلامی ریاست کے ترجمان تھے۔ وہ دشمنوں کے عقلی اور ذہنی حملوں کا جواب دیتے اور مسلمانوں، اسلام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس کا دفاع کرتے تھے۔ ابن اسحاق کی سیرۃ اور دوسرے مآخذ ان کی شاعری کے نمونوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے شعراء وقت انفرادی حیثیت میں اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ عہد نبوی میں یوں تو متعدد خطیب تھے۔ لیکن "سرکاری حیثیت میں" صرف حضرت ثابت بن قیس شماس خزرجی نظر آتے ہیں۔ وقت کے سب سے بڑے خطیب خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے جن کے کلمات طیبات عربی ادب میں نثر کی آبرو ہیں۔

بخاری کی روایت صحیح ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت کدہ و بارگاہ نبوی پر کوئی مستقل دربان تعینات نہیں تھا مگر مآخذ سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض خاص مواقع پر جب تخلیہ چاہتے تھے یا صلاح و مشورہ کر رہے ہوتے تھے تو کسی صحابی کو دربانی کی یہ سعادت سونپ دیتے تھے۔ یہ عارضی اور مخصوص مواقع کے لئے انتظام ہوتا تھا۔ ورنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رسول خدا اور سربراہ ریاست و حکومت دونوں حیثیتوں میں ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بلکہ ارذل ترین شہری کی پہنچ میں تھے اور ہر شخص آپ سے ہر مناسب وقت پر مل سکتا تھا۔

فتوحات اور معاہدات صلح کے نتیجہ میں جب مرکز اسلام سے خاصی دور واقع علاقے اسلامی ریاست کی سیاسی بالا دستی کے پرچم تلے آگئے تو ان کو مرکزی انتظامیہ سے وابستہ کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا کہ اس کے بغیر مرکزیت نہیں پیدا ہو سکتی تھی جو اسلامی سیاسی نظام کی ایک نمایاں خصوصیت تھی چنانچہ جوں جوں علاقے جنگ کے ذریعہ (عنوۃً) یا صلح کے ذریعہ (صلحاً) اسلامی ریاست کا حصہ بنتے گئے توں توں ان کے لئے مرکزی منتظم / گورنر / والی مقرر ہوتے گئے۔ یہ انتظامی علاقے ولایات کہلاتے تھے اور طبری کے بقول ان کے جغرافیائی حدود تھے۔ عہد نبوی کے اواخر تک ایسی ۲۷ ولایات تھیں۔ ان کے والی مستقل عہدیدار تھے۔ جن کی تقرری خوشنودی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوران قائم رہتی تھی۔ اور عملاً ان کی غالب اکثریت اپنی تقرری کے زمانے سے وفات نبوی کے زمانے تک اپنے عہدوں پر قائم و برقرار رہی تھیں۔ صرف تین والیوں کو معزول کیا گیا تھا۔ جبکہ دو اور کا اپنے عہدے کے دوران ہی انتقال ہو گیا تھا۔ اس طرح کل ولاۃ نبوی کی تعداد ۳۲ تھی۔ والیوں کو ان کی خدمات کے لئے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن اس کی حتمی مقدار نہیں معلوم ہو سکی البتہ والی مکہ کے ضمن میں وہ سولہ سو درہم معلوم ہوتی ہے اور وہ بھی مختلف فیہ ہے۔ والیوں کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ جن میں سیاسی، انتظامی، فوجی، مالی اور عدل و انصاف وغیرہ کے اختیارات شامل

تھے۔ ان کے ماتحت مختلف افسروں کا ایک عملہ ہوتا تھا۔ جو ایک طرح سے صوبائی یا علاقائی مجسٹریٹ کا کام کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمالی علاقوں اور جنوبی عرب کو دو بڑے انتظامی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جن پر ایک ایک منتظم اعلیٰ یا گورنر جنرل ہوتا تھا اور اس کی ماتحتی میں مختلف ولایتوں کے والی اپنے اپنے علاقوں کا نظم و نسق چلاتے تھے۔ شمال میں حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی اور جنوب میں حضرت معاذ بن جبل خزرجی گورنر جنرل تھے اور ان کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ مدینہ کے شمال میں ولایتوں کی کل تعداد آٹھ تھی۔ جبکہ جنوب میں دس تھی۔ اور باقی مرکزی اور مشرقی عرب میں واقع تھیں۔ عملاً گورنر آزاد و خود مختار ہوتا تھا۔ صرف اس کو ہدایات نبوی یا سنت اور کتاب کی پابندی کرنی لازمی ہوتی تھی۔ نئی صورتحال میں وہ اپنی رائے سے کام لینے کا مجاز تھا۔ قریش کے بطور قبیلہ ۱۲ والی تھے۔ جن میں سات اموی افراد تھے اور دو ان کے حلیف۔ مدنی قبیلوں میں خزرج کے چھ والی مقرر ہوئے تھے۔ بقیہ قبائل کی نمائندگی معمولی تھی۔ بلکہ مغربی قبائل تو اس سے بالکل محروم رہے تھے۔

مدینہ کی مرکزی حکومت اور ولایتوں کی صوبائی حکومتوں کے عوام الناس سے رابطہ کا کام مقامی منتظمین کرتے تھے۔ جو عموماً قبائل اور ان کے اہم بطنوں کے شیوخ اور سردار تھے۔ اس لحاظ سے ان کی تعداد بہت تھی۔ ماخذ میں ان کی بہت تھوڑی تعداد کے ناموں کا ذکر ملتا ہے۔ بہر حال ان شیوخ و سادات قبائل کو ان کے قبول اسلام کے بعد اسلامی ریاست ان کے عہدوں پر عموماً برقرار رکھتی تھی۔ شاذ و نادر ہی ان کو ہٹایا جاتا تھا۔ البتہ جن قبیلوں کے سردار اسلام قبول نہیں کرتے تھے اور ان کے خاصے افراد مسلمان ہو چکے تھے۔ اسلامی ریاست ان مسلمانوں کا سردار اپنی طرف سے مقرر کر دیتی تھی۔ مرکزی حکومت کا یہ اختیار اس کے روز افزوں اقتدار کا اور ساتھ ساتھ مرکزیت کی اندرون ملک میں توسیع کا بین ثبوت تھا۔ کیونکہ قبیلہ کی سرداری طے کرنا قبیلہ کا اندرونی معاملہ تھا جس میں کوئی خارجی عنصر دخل نہیں دے سکتا تھا۔ ان مقامی منتظمین کے عموماً انتظامی اور مالی اختیارات و فرائض تھے۔ امن و امان قائم رکھنا اور صدقات وصول کر کے مرکزی حکومت، صوبائی حکومت یا اس کے عاملین تک پہونچانا ان کا بنیادی فرض تھا۔ جہاں تک مدینہ منورہ کا تعلق تھا۔ اس کے دونوں قبیلوں کے بارہ سردار جو نقیب کہلاتے تھے۔ اپنے اپنے لوگوں اور علاقوں کے معاملات کے ذمہ دار تھے۔ نقیب ایک مذہبی اور انتظامی یا تنظیمی ادارہ تھا۔ جو یہودی اور عیسائی شریعتوں میں بھی موجود تھا۔ اور انہیں سے اسلام میں آیا تھا۔ یہ ادارہ پورے عہد نبوی میں موجود اور کام کرتا رہا تھا۔

عدل و انصاف اور قضا کے سب سے بڑے افسر خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ مگر آپ نے متعدد اصحاب سے خود اپنی موجودگی میں مقدمات فیصل کرائے تھے۔ اور ان کو پسند کیا تھا۔ خود مدینہ میں بعض مستقل قاضی تھے جو مقدمات فیصل کرتے تھے۔ ولایتوں میں یہ اختیار عموماً گورنروں اور والیوں کو حاصل ہوتا تھا۔ جیسا کہ حضرات معاذ بن جبل، ابو موسیٰ اشعری اور ابو عبیدہ بن جراح فہری کے معاملہ سے واضح ہوتا ہے۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ مقامی منتظمین کو بھی یہ اختیار محدود طور سے حاصل تھا۔ باقاعدہ قاضیوں کا تقرر بعد کے زمانے میں شروع ہوا تھا۔

اقتصادی معاملات میں بازاروں کا نظام خاصی اہمیت کا حامل تھا اور اخلاق اور اعمال کی درستگی کا بڑی حد تک انحصار اس کی صحیح کارکردگی پر تھا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اور دوسرے کاموں کی طرح بازاروں کی معاملات کی

دیکھ بھال کرتے رہتے تھے اور اقتصادی و تجارتی معاملات سے متعلق وقتاً فوقتاً احکام و فرامین جاری کرتے رہتے تھے اس کے علاوہ آپ نے مکہ اور مدینہ کے بازاروں کے دو مستقل افسر متقرر فرمائے تھے۔ جو بالترتیب حضرات سعید بن سعید اموی اور عمر بن خطاب عدوی تھے۔ دوسرے بازاروں یا تجارتی مراکز کے بارے میں اس قسم کی تقرریوں کا اگرچہ ثبوت نہیں ملتا۔ مگر یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے افسر ضرور مقرر کئے گئے تھے اور جہاں اس قسم کے افسر نہیں تھے۔ وہاں مقامی اور صوبائی منتظموں خاصکر والیوں کا یہ فریضہ تھا۔ کہ وہ بازاروں کے معاملات کی دیکھ بھال کریں۔

عہد نبوی کے شہری نظم و نسق میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلم طبقات اور علاقوں کو نمائندگی ضرور دی تھی۔ تاہم صرف یہی سیاسی عنصر تقرریوں کی اساس نہیں تھا اور نہ ہی قبائلی یا سماجی اسباب و عوامل اس کی اساس بنے تھے۔ بنیادی طور سے حکومتی مناصب کے لئے بنیادی اساس صرف صلاحیت و لیاقت تھی۔ باقی دوسرے عوامل ضمنی یا ثانوی تھے۔ چنانچہ سبقت اسلام ایک صفت حمیدہ تھی، تاہم وہ بھی انتظامی یا حکومتی مناصب میں ترجیح و تقرر کا ذریعہ نہیں بن سکی تھی۔ عہد نبوی کے نظام حکومت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بیشتر عمال و افسران حکومت نسبتاً نوجوان اور متاخر مسلمان تھے اور ان کو سابقین و اولین پر ترجیح دی گئی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں سبقت نہ وجہ تقرر تھی نہ وجہ ترجیح۔

اسلامی تعلیمات نے مذہبی اور سماجی اجتماعیت و مرکزیت کی مانند سیاسی مرکزیت کی بھی تبلیغ کی تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا مدینہ کی مرکزی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو پورے جزیرہ نمائے عرب میں تسلیم کیا جائے۔ آپ کے نظام حکومت نے عملاً اس مرکزیت کو شمال سے جنوب اور مغرب سے مشرق تک جاری و ساری کر دیا تھا۔ متعدد مرکزی، صوبائی اور مقامی افسران و عمال کے ذریعہ تمام علاقوں کو مدینہ منورہ کے مرکز سے جوڑ دیا گیا تھا اور ہر ایک علاقہ اور اس کے قبیلے اور ان کے لوگ اور افسر مرکزی حکومت کے ماتحت و تابع تھے۔ سیاسی مرکزیت کا یہ تصور و عمل اگرچہ عربوں کے لئے نیا تھا تاہم اسلام اور اسلامی ریاست کی قوت نے اس کو ذہنی اور عملی طور سے سب سے منوالیا تھا اور اس طرح اس نظام حکومت کی بدولت اسلامی حکومت میں وہ سیاسی استحکام پیدا ہوا تھا۔ جس نے مسلمانوں کو ایک قوت بنا دیا تھا۔ جس سے عصری طاقتیں صرف نظر نہیں کر سکتی تھیں۔ اور تاریخ نے ثابت کر دیا کہ جلد ہی وقت کی عظیم ترین سلطنتوں نے بھی اسلام کی سیاسی قوت و حشمت کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔

باب پنجم

اسلامی ریاست کا مالی نظام

اب یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ عہدِ نبوی میں اسلامی ریاست اپنے آغاز سے اوجِ کمال تک ارتقائی مراحل سے گزری تھی۔ اس عرصے میں اسلامی ریاست نے اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے خلاف متعدد عسکری اور نیم عسکری مہمیں ترتیب دی تھیں۔ ان کے نتیجے میں رفتہ رفتہ اس کا ایک عسکری نظام وجود میں آیا تھا۔ ایک اُمت اور اجتماعی اکائی کے بطور زندہ رہنے کے لیے مسلمانوں نے شہری نظم و نسق یا انتظامیہ کا ایک ڈھانچہ بھی کھڑا کیا تھا جو بعد میں اسلامی ریاست کی کارکردگی کا عملی پیکر بن گیا۔ انھوں نے پہلے اپنے تمام ہم وطنوں یعنی باشندگانِ عرب کو، اور پھر ساری دنیا کے لوگوں کو اسلامی اُمت کا رکن بنانا چاہا اور اس کے لیے پورا ایک مذہبی نظام وجود میں آیا۔ ان تمام حکومتی شعبوں اور ریاستی معاملات کے لیے اسلامی ریاست نے ایک مالی نظام بھی قائم کیا جو دوسرے شعبوں کی طرح اسلام کے معاشی و اقتصادی نظریات پر مبنی اور اس کا نمائندہ تھا۔ اب تک اسلام کے معاشی نظریات اور مالی اصولوں پر بہت کچھ وقیع اور علمی انداز میں لکھا جا چکا ہے اور خاص بحث اسلام کے زرعی، تجارتی، مالی اور دوسرے اقتصادی پہلوؤں سے متعلق نظام پر بھی کی جا چکی ہے لیکن وہ نظریاتی زیادہ ہے اور تاریخی کم۔[1] کم از کم اس میں تاریخی عوامل کا تجزیہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس بحث میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کے عملی اور حقیقی نظامِ مالیات سے اس طور سے بحث کی جائے کہ اس کے ہر پہلو کا تاریخی ارتقا واضح طور سے اُجاگر و نمایاں ہو سکے۔

۱۔ مسلمانوں کی اقتصادی حالت

تاریخی توقیت کا تقاضا ہے کہ اس بحث کا آغاز مسلمانوں کی عمومی اقتصادی حالت سے کیا جائے۔ اگرچہ اسلامی ریاست کے مالی نظام کا تعلق عہدِ نبوی کے زمانے سے ہے لیکن اس کا خاصا اہم تعلق مکی دور سے بھی ہے کہ مسلمانوں کا ایک خاصا بڑا طبقہ مکہ سے مہاجرت کر کے مدینہ پہنچا تھا۔ مکی مسلمانوں کی معیشت و اقتصادی حالت کے بارے میں قدیم و جدید، مسلم و غیر مسلم مورخین و سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ ان میں مالدار و متمول بھی تھے اور غریب و نادار بھی۔[2] مسلم مورخین اور علماء کا عموماً رجحان دولت کے جمع کرنے کے خلاف ہے اس لیے وہ نہ صرف فقر و فاقہ کی افضلیت کا دعویٰ کرتے ہیں بلکہ یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ اولین مسلمانوں کا تعلق زیادہ تر ناداروں اور معاشرتی اور اقتصادی لحاظ سے کمزوروں یا کمزور طبقات سے تھا۔[3] حالانکہ یہ قطعی صحیح نہیں ہے۔ تاریخی حقائق شہادت دیتے ہیں کہ مکی مسلمانوں کے اقتصادی لحاظ سے تین طبقے تھے۔ پہلا طبقہ خاصے متمول اور مالدار مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ اگرچہ یہ طبقہ مکی معیشت کے پس منظر میں تاجرانِ مکہ کی صفِ دوم میں آتا تھا تاہم وہ خاصا مالدار تھا۔ ان میں

حضرات عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبید اللہ، عبد الرحمٰن بن عوف، خدیجہ بنت خویلد، ابوبکر بن ابی قحافہ، عمر بن خطاب، عبد اللہ نحام وغیرہ شامل تھے یہ وُہ لوگ تھے جو مکّی اقتصاد اور معیشت میں اپنی تجارتی حیثیت بنا چکے تھے اور آزاد و خود مختار تاجر کی حیثیت سے اپنی چھاپ قائم کر چکے تھے۔[۴] مکّی مسلمانوں کے دوم طبقہ میں قریشی اشراف کے خاندانوں کے نوجوان فرزندانِ دل بند شامل تھے جو اپنی اقتصادی و تجارتی حیثیت کے لیے اپنے خاندانوں پر منحصر تھے اور ابھی تک اپنی آزاد تجارتی حیثیت نہیں قائم کر سکے تھے۔ وہ ابھی ابھرتے ہُوئے تاجر تھے جو دُنیائے تجارت میں اپنی پہچان قائم کرنے کی تگ و دَو میں لگے ہُوئے تھے۔ اقتصادی لحاظ سے اسی طبقہ میں وہ مکّی مسلمان بھی شامل تھے جو اگرچہ آزاد حرفت والے اور دستکار تھے۔ لیکن ان کی آمدنی اوسط درجہ کی تھی۔ مسلمانوں کے وُہ نوجوان تاجر بھی اسی طبقہ میں شمار کیے جانے چاہئیں جو درجہ اول کے مسلم تاجروں کے ساتھ شراکت کی بنیاد پر مکّی تجارت میں اپنی جگہ بنا رہے تھے۔[۵] اور تیسرا مسلم طبقہ ان اللہ والوں پر مشتمل تھا جو غلام تھے یا اجیر' یا ایسے لوگ جن کی آمدنی ان کے مصارف کی کفالت معمولی درجہ میں یا بقدرِ کفاف کر پاتی تھی۔[۶] یہی وہ نادار و مفلس مسلمان تھے جن کو سماجی لحاظ سے ضعفاء المسلمین میں سب سے اونچا مقام حاصل تھا۔

ظاہر ہے کہ مکّی سماج میں مسلم اجتماعی معیشت کی آزادی کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ مسلمانوں کا نہ کوئی مالی نظام تھا نہ کوئی اجتماعی اقتصادی تنظیم۔ لیکن سماجی اور مذہبی اجتماعیت اور اُمتِ مسلمہ واحدہ سے یکساں تعلق کے احساس نے مسلمانوں میں اقتصاد و معیشت کے میدان میں یہ شعور پیدا کر دیا تھا کہ ان کے مالداروں نے اپنے اقتصادی طور سے کمزور دینی بھائیوں کے لیے اپنے مال میں ان کا "حق" تسلیم کر لیا تھا اور حضرات ابوبکر و عثمان جیسے مسلمان اپنی دولت کا خاصا بڑا حصّہ اپنے دینی رفقا کی اقتصادی و معاشی ضروریات پر خرچ کیا کرتے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ بوقتِ اسلام حضرت ابوبکر صدیق کے پاس چالیس ہزار درہم نقد تھے لیکن تیرہ برس کے بعد یہ "اصل مال" گھٹ کر صرف چار ہزار درہم یا اس کے لگ بھگ رہ گیا تھا۔[۷] اور بیشتر مال مسلمانوں کی ضروریات پر صرف ہو چکا تھا۔ حضرت عثمان غنی مکہ کے مالدار ترین مسلمانوں میں بلکہ ایک حد تک مالدار ترین مکیوں میں شمار ہونے لگے تھے مگر ہجرتِ مدینہ کے وقت ان کے پاس صرف سات ہزار یا اس کے مساوی رقم رہ گئی تھی۔[۸] مکہ میں مسلمانوں کا اجتماعی اقتصادی نظام اگر کوئی تھا تو وہ امداد باہمی کے اصولوں یا طریقوں پر مبنی تھا۔

عہدِ نبوی کے مدنی دور میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت کے بارے میں سخت غلط فہمی عام ہو گئی ہے۔ مسلم مورخین نے اکثر و بیشتر یہ فرض کر لیا کہ قریشی اشراف و رؤساءِ مکہ کی روک ٹوک کے سبب مکہ کے مسلمان ہجرت کے وقت مکہ سے کچھ بھی ساتھ نہیں لے جا سکے تھے اور بالکل "بکھرے" مدینہ پہنچے تھے اس لئے ان کی معاشی ضروریات کی تکمیل و تسکین کُلی طور سے انصارِ مدینہ ——— اوس و خزرج ——— کے مسلمانوں کی فیاضی و سخاوت، مہمان نوازی و میزبانی اور مالی و اخلاقی نصرت و امداد کی مرہونِ منت تھی۔ ان مورخین کا یہ بھی خیال ہے کہ اسی فیاضی و سخاوت بلکہ دولت و جائداد میں شراکت کے سبب مکی مسلمانوں کو اقتصادی طور سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا موقعہ ملا اور بعد میں اموالِ غنیمت میں حاصل شدہ جائدادوں نے اور ان کی اپنی تجارت و زراعت نے نہ صرف مکی مسلمانوں کی اقتصادی حالت بہتر بنائی بلکہ مدینہ کی مسلم معیشت کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف مستشرقین کا خیال ہے کہ نادار و مفلس مکی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جب مدینہ پہنچی تو وہ مقامی معیشت کے لیے بوجھ بن گئی اور انصارِ مدینہ کی پہلے سے دگرگوں

معیشت نے بالآخر کچھ دنوں تک لڑکھڑانے کے بعد بالکل ہی دم توڑ دیا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا کہ وہ جاہلی عرب کے مسلمہ دستور کے مطابق مدینہ کے قریب سے گزرنے والے کاروانوں کی لوٹ مار کریں۔ مالا مال مکی تجارتی کاروانوں نے جو مکہ سے شام جاتے ہوئے مدینہ کے قریب سے گزرتے تھے "رزیہ" کی ترغیب دی اور بالآخر معاشی دباؤ اور اقتصادی مجبوریوں نے چھین جھپٹ کے تصور کو عملی جامہ پہنا دیا اور بدر سے پہلے کی تمام ابتدائی مہمیں اسی مقصد کے لیے وجود میں آئی تھیں۔ گویا کہ تمام غزوات وسرایائے نبوی عموماً اور ابتدائی مہمیں خصوصاً اسی لوٹ مار کا نتیجہ یا شاخسانہ قرار پائیں۔[9]

بوقتِ مہاجرت مسلم معاشی حالت اور مسلم معیشت میں اموالِ غنیمت کے تناسب پر مکمل بحث تو کہیں اور کی جا چکی ہے[10] جسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم یہاں توفیقی و تاریخی تقاضوں کی تسکین کی خاطر یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نہ مسلم مہاجرینِ مکہ بالکل نادار و مفلس اور خالی ہاتھ مدینہ پہنچے تھے اور نہ ہی مدنی مسلم معیشت اتنی دگرگوں تھی کہ مسلمانوں کو روزی روٹی چلانے کے لیے لوٹ مار کی حاجت ہوتی۔ مہاجرینِ مکہ میں متمول بھی تھے اور اوسط درجہ کے مالدار بھی اور نادار و مفلس بھی۔ دراصل مکی مسلم معیشت کے تینوں طبقات اپنی مکمل معاشی حالت کے ساتھ مدینہ پہنچے تھے۔ ان میں حضرات عمر فاروق، ابوبکر صدیق، عثمان غنی، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبید اللہؓ عبد الرحمٰن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص جیسے مالدار اشخاص کے علاوہ بنو مظعون، بنو غنم بن دودان اور بنو بکیر/کنانہ جیسے متمول خاندان بھی شامل تھے جو اپنی تمام منقولہ جائداد ——— نقد و اسباب ——— کے ساتھ مدینہ پہنچے تھے۔ بہت سے درجہ دوم کے مسلمانوں کو بھی اپنی دولت کا خاصا حصہ نئے وطن میں لانے کا موقعہ مل گیا تھا۔ انھیں میں سے کچھ بلکہ معدودے چند ایسے تھے جو سیاسی یا سماجی مجبوریوں کے تحت اپنی دولت یا تو بالکل نہیں لا سکے تھے یا اس کا محض ایک معمولی حصہ لائے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ جو مکہ میں نادار و مفلس تھے وہ مدینہ بھی نادار و مفلس پہنچے تھے لیکن وہ وہاں سب کے سب نادار و مفلس نہیں رہے تھے جیسا کہ غلط خیال لوگوں کے دماغ میں راسخ ہو گیا ہے۔ کچھ مدت کے بعد وہ نہ صرف اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے تھے بلکہ مدنی مسلم معیشت کے ارتقاء کا سبب بھی بنے تھے۔[11] البتہ ایک خاصا بڑا طبقہ مسلمانوں کا ایسا ہمیشہ رہا جو اقتصادی لحاظ سے نہ صرف کمزور رہا تھا بلکہ وہ مسلمانوں کا محتاج اور ان کی دولت پر منحصر تھا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو کسی سبب سے اپنا کوئی ذریعۂ آمدنی مستقل طور سے نہیں رکھتا تھا۔ ان میں اہلِ صُفّہ کے علاوہ بعض اجیر و مزدور بھی شامل تھے جو وقت کی آندھیوں میں پیٹ کا چراغ جلانے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔

ہجرتِ نبوی کے بعد جب مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت مسلمانوں کے دو سماجی طبقے ——— مہاجرین اور انصار ——— کے علاوہ یہودیوں پر مشتمل ایک اہم طبقہ بھی مدینہ کی آبادی کا ایک حصہ تھا۔ ان کے سوا چوتھا مختصر سا طبقہ اوس مناۃ کے غیر مسلموں کا تھا جو شرح یک اپنا آزاد وجود قائم رکھنے میں کامیاب رہا تھا اور بالآخر وہ مسلم طبقۂ انصار میں ضم ہو گیا تھا۔ جہاں تک اس طبقہ کی اقتصادی حالت کا تعلق تھا تو وہ انصار کے کسی خاندان کی مانند تھی البتہ یہودیوں کا طبقہ جو بیس سے اُوپر چھوٹے بڑے قبیلوں پر مشتمل تھا اقتصادی لحاظ سے نہ صرف خوشحال تھا بلکہ مدنی معیشت کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں تھی۔ ان میں بنو قینقاع اور کچھ دوسرے خاندان اور قبیلے تاجر اور دستکار تھے۔ وہ خاصے دولتمند لوگ تھے اور ان کا اپنا خاص بازار تھا جو غالباً شہر کا سب سے اہم بازار تھا۔ بلکہ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاصی بڑی تجارتی منڈی تھی۔[12] ان کے علاوہ بنو نضیر[13] اور

بنو قریظہ وغیرہ[۱۴] متعدد دوسرے یہودی قبیلے زراعت پیشہ تھے۔ اور ان کے مدینہ اور حوالی مدینہ میں کھجوروں اور پھلوں کے باغات اور کھیت تھے۔ ان کے یہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ چنانچہ وہ بڑی بڑی گڑھیوں میں جو قلعہ نما تھیں رہا کرتے تھے اور نقد و جنس ہر طرح کی جائدادوں کے مالک تھے۔ تجارت، زراعت اور دستکاری کے علاوہ مدنی یہودی خاصے بڑے مہاجن بھی تھے جو سُودی کاروبار کے ذریعے بے اندازہ دولت کماتے تھے۔[۱۵] ایک مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ وُہ پچاس فیصد سالانہ پر سُودی کاروبار کرتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ مدنی معیشت پر چھائے ہُوئے تھے اور اپنے بدنام زمانہ مہاجنی طور طریقوں کے سبب مدینہ کے انصار کے ایک خاصے بڑے طبقے کو اپنا دست نگر بنائے ہوئے تھے تاہم ایسا نہیں تھا کہ انصار پوری طرح سے اپنی معیشت کے لیے ان پر منحصر ہوں۔ تاریخی واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہود و انصار کے مخلوط طبقات سیاسی و سماجی اسباب کے علاوہ اقتصادی اسباب سے بھی ایّامِ جاہلیت میں باہم دست بگریباں رہے تھے بہرحال عہدِ نبوی میں مہاجرینِ مکہ کی مانند انصارِ مدینہ کے بھی اقتصادی لحاظ سے تین طبقے تھے۔ دونوں مسلم طبقات میں اگر کوئی اہم فرق تھا تو بس یہ کہ مکّی مسلمان زیادہ تر تجارتی پس منظر رکھتے تھے جبکہ ان کے مدنی بھائی زیادہ تر زراعت پیشہ تھے اور اس فرق کا بڑی حد تک ذمہ دار ان دونوں طبقات کا جغرافیائی پس منظر تھا۔[۱۶]

مہاجرینِ مکہ میں سے اکثر نے اپنے وطن ثانی میں قیام کے فوراً بعد اپنا آبائی پیشہ ——— تجارت ——— شروع کر دیا تھا جبکہ ان کے کچھ لوگ زراعت میں بھی لگ گئے تھے۔ مدینہ اور حوالی مدینہ میں افتادہ زمینوں کی کمی نہیں تھی۔ ان میں بعض اراضی انصار کی تھی جو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دی تھی اور کچھ اراضی بلا ملکیت تھی۔ چنانچہ ان تمام فاضل زمینوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکونت و زراعت کے لیے مہاجرین کو تقسیم کر دیا تھا۔ بعد میں کچھ اراضی مدینہ اور اس کے اطراف میں عسکری مہموں کے نتیجہ میں بطور اموال غنیمت ہاتھ آئی تھی اور وہ بھی زیادہ تر مہاجرین کے حصّے میں آئی تھی اور اس طرح مکی مہاجرین کے لیے نہ صرف سکونت کا مسئلہ حل ہو گیا تھا بلکہ زرعی زمینوں کی بدولت اقتصادی مسئلہ بھی کافی حد تک طے ہوا تھا۔ مہاجرین میں سے حضرات زبیر بن عوام، ابوبکر صدیق، عمر فاروق، سعد بن ابی وقاص وغیرہ متعدد اکابر صحابہ کا شمار ان لوگوں میں کیا جاتا ہے جو زرعی جائدادوں اور کاروبار کے مالک تھے۔[۱۷] اسی طرح مذکورہ بالا اکابر مہاجرین کے علاوہ حضرات عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ بن عبیداللہ، عثمان بن عفان وغیرہ متعدد بلکہ بیشتر مکی مسلمانوں نے تجارتی کاروبار بھی شروع کر دیا تھا۔[۱۸] یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ بہت سے مکی مسلمانوں نے بیک وقت زراعت اور تجارت دونوں میں دلچسپی لی تھی اور اس طرح انہوں نے مدنی اقتصاد و معیشت کے ارتقا میں دوہرا حصّہ لیا تھا۔

مدینہ منورہ کی مسلم معیشت کے مطالعے کے ضمن میں بعض ٹھوس تاریخی حقائق کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہوگا۔ ان سے نہ صرف مسلمانوں کی انفرادی دولت مندی اور تمول کا علم ہوگا بلکہ اجتماعی مسلم دولت کا بھی اندازہ لگ سکے گا۔ اگرچہ انصار و مہاجرین دونوں مسلم طبقات کی نقد و جنس دولت کے حوالے مآخذ میں بہت کم ہیں تاہم وہ عہد نبویؐ کی معاشی حالت کا ایک موٹا سا اندازہ دینے کے لیے کافی ہیں۔ قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ خاصے دولتمند آدمی تھے اور وہ کافی باغات اور زرعی زمینوں کے مالک تھے۔ ان کی دولتمندی کا اندازہ اسلامی ریاست کے لیے ان کے عطیات سے ہوتا ہے۔[۱۹] اسی طرح اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ مدینہ کے متمول ترین لوگوں میں سے تھے اور کافی جائداد کے مالک تھے۔[۲۰] میزبانِ رسولِ کریمؐ

حضرت ابو ایوب انصاری نہ صرف دو منزلہ پختہ مکان کے مالک تھے جو بذاتِ خود تموّل کی ایک نشانی تھی بلکہ متعدد کھجور کے باغات اور زرعی اراضی کے مالک تھے۔[۲۱] انصار میں حضرت عمارہ بن حزم کا شمار متمول لوگوں میں ہوتا تھا جبکہ حضرت سعد بن ربیع کافی بڑی جائدادوں کے مالک تھے۔[۲۲] ایک روایت کے مطابق ایک انصاری نے ایک موقعہ پر ریاستِ اسلامی کے ہنگامی مصارف کے لئے طلائی سکوں ـــ دینار ـــ کی اتنی بڑی اور بھاری تھیلی عطیہ میں دی تھی جس کو وہ بمشکل اٹھا پا رہے تھے۔[۲۳] بخاری کی ایک روایت کے مطابق حضرت جابر بن عبداللہ انصاری کا مدینہ میں کھجور کا ایک بڑا باغ تھا جس سے کافی آمدنی ہوتی تھی۔[۲۴] اس کے علاوہ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ اور حوالی مدینہ میں انصار کے بڑے بڑے کھیت تھے جہاں کافی غلہ پیدا ہوتا تھا۔[۲۵] زرعی جائدادوں کے علاوہ انصار میں مویشی خاص کر دودھاری جانور پالنے کا عام رواج تھا کیونکہ وہ دعربوں کا محبوب کھاجا تھا۔[۲۶] انصار کی دولتمندی کی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے ان کی معیشت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا ذکر ہمارے اگلے مباحث میں آتا رہے گا۔

جہاں تک مہاجرین کا تعلق ہے تو ذکر آچکا ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ نقد و جنس میں نہ صرف دولت ساتھ لائے تھے بلکہ انھوں نے تجارت کا بازار گرم کر دیا تھا۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی صحابہ تھے جو زراعت میں بھی لگ گئے تھے اور بعض غیر معمولی صلاحیتوں کے لوگوں نے دونوں پیشوں میں دلچسپی لی تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف جلد ہی مدینہ میں مالدار ترین تاجروں میں شمار ہونے لگے تھے کیونکہ انھوں نے مختلف اشیاء کی تجارت کا خداداد ملکہ پایا تھا۔[۲۷] اس طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مدینہ کے اطراف میں سنح کے مقام پر کپڑے سازی کا ایک چھوٹا موٹا کارخانہ لگا لیا تھا اور غالباً دوسرے اجیروں کی مدد سے وہ پیداوار کے ساتھ ساتھ تجارت بھی کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروق مقامی تجارت سے بڑھ کر بین الاقوامی تجارت میں حصہ لینے لگے تھے اور ان کی تجارت ایرانؑ شام تک وسیع ہو گئی تھی۔ حضرت عثمان غنی شروع میں بنو قینقاع کے بازار میں کھجوروں کا کاروبار کرتے تھے۔ بعد میں وہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف غلاموں کی تجارت میں دولت کمانے لگے تھے۔ اس کے علاوہ یہ دونوں مہاجر تاجر کپڑے، غلے وغیرہ دوسری اشیاء کی تجارت بھی کرتے تھے اور اپنے مکی عہد کے شراکت کے طریقے کو بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ یعنی وہ دوسروں کو اپنا مال تجارت کے لیے پچاس فیصدی نفع کی شرکت پر اُدھار دیتے تھے۔ اندازہ یہ ہے کہ مسلمان جزیرہ نمائے عرب کے تمام بازاروں میں اپنا سامانِ تجارت لے کر پہنچتے تھے۔[۲۸]

مسند احمد بن حنبل میں مدینہ اور اطراف مدینہ کے مختلف روزانہ اور ہفتہ واری بازاروں کا ذکر ملتا ہے جہاں مسلمانان مدینہ مختلف اشیائی کی تجارت کرتے تھے۔[۲۹] محمد بن حبیب بغدادی نے جزیرہ نمائے عرب کے تمام بازاروں کا ذکر کیا ہے جو سال بھر مختلف مقامات پر یکے بعد دیگرے اس طرح لگتے تھے کہ ان کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں پاتا تھا۔ ان میں سے عکاظ، مجنہ، ذوالمجاز، حباشہ، مشقر، دومۃ الجندل، ہجر وغیرہ اہم ترین تھے۔ ان میں سے سرحدی علاقوں کے بازار بین الاقوامی تجارت کی منڈیاں تھے جہاں شام، عراق، ایران حتیٰ کہ ہندوستان اور چین کے تاجر اپنے اسباب تجارت کے ساتھ پہنچتے تھے۔[۳۰] ان کے علاوہ حج کے زمانے میں لگنے والے مکہ، منیٰ اور عرفات وغیرہ کے بازار بھی تھے۔[۳۱] پھر وہ مقامی تجارت کے بازار تھے جہاں مسلمان اور دوسرے لوگ باقاعدہ پہنچا کرتے تھے۔ ان مقامی بازاروں میں مسلم تجارت خوب پھیلی پھولی تھی۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذی قعدہ سنہ ۲ھ/

اپریل ۶۲۶ء میں غزوہ بدر الموعد کے موقعہ پر مسلمان تاجر اور مجاہد اپنا تجارتی سامان بدر کے مقامی بازار میں لے کر گئے تھے جو اس ماہ کی پہلی تاریخ سے آٹھ تاریخ تک لگتا تھا۔ مسلمانوں نے اس موقعہ پر خوب نفع کمایا تھا اور حضرت عثمان بن عفان کے بارے میں تو آتا ہے کہ انھوں نے ایک دینار کے عوض ایک دینار یعنی سو فیصد نفع کمایا تھا۔[۳۲] یہ حقیقت بڑی اہم ہے کہ کیا مسلم اور کیا غیر مسلم عرب مثالی تاجر تھے اور وہ ہر موقع سے فائدہ اٹھاتے تھے[۳۳] چنانچہ عسکری مہموں کے دوران بھی ان کا معمول تھا کہ وہ اپنا تجارتی سامان ساتھ لاتے تھے اور موقعہ ملنے پر تجارت کا بازار بھی گرم کرتے تھے۔ غزوۂ بدرِ عظیم کے موقعہ پر کی فوج میں وہ عظیم و ماہر تاجرین تک شامل تھے جو کھالوں (ادم) وغیرہ پر مشتمل خاصا اسباب تجارت ساتھ لائے تھے۔[۳۴] اسی طرح مسلم تاجروں کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خیبر کے غزوہ کے دوران تجارت کی تھی اور بڑا نفع کمایا تھا۔[۳۵] غالباً انھوں نے دوسری مہموں کے دوران بھی اپنے اس معمول کو ترک نہیں کیا تھا۔

مدنی مسلمانوں نے دُور دراز کے مقامات کو بھی تجارتی کارواں بھیجے تھے۔ ۶ھ / ۶۲۸ء میں حضرت زید بن حارثہ کی قیادت میں ایک ایسا ہی تجارتی کارواں اصحاب رسولؐ کا سامان تجارت لے کر شام کے لیے گیا تھا مگر بدقسمتی سے وُہ وادی القریٰ کے علاقے میں بنو فزارہ کے ہاتھوں لُوٹا گیا۔[۳۶] اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہو گا کہ مدنی مسلمانوں کا یہ اکلوتا تجارتی کارواں تھا جو شام بھیجا گیا تھا اس قسم کے تجارتی کاروانوں کے متعدد حوالے مآخذ میں خاص کر حضرات عبد الرحمٰن بن عوف، عثمان بن عفان، طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن عوام وغیرہ جیسے تاجر صحابہ کرام کے تراجم میں ملتے ہیں۔[۳۷]

۲۔ اسلامی ریاست کی آمدنی کے ذرائع اور وسائل

اُمتِ مسلمہ کی عمومی اقتصادی حالت کے مختصر سے تجزیے کے بعد اسلامی ریاست کے مالی نظم و نسق کا مطالعہ زیادہ قابلِ فہم بھی ہو گا اور آسان بھی۔ گزشتہ مختلف ابواب میں ہم اسلامی ریاست کے بعض ذرائع آمدنی پر ضمناً اور مختصراً نظر ڈال چکے ہیں۔ ان میں نقد و جنس کی صورت میں اموالِ غنیمت، خمس، جزیہ اور صدقات کے کثیر حوالے آ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ عطیات اور چندوں کا ذکر اشارۃً آگیا ہے۔ اس بحث کا آغاز ہم اُمتِ اسلامی کے انفرادی اور اجتماعی عطیات سے کر رہے ہیں کہ تاریخی ترتیبِ واقعات کے لحاظ سے اسی ذریعۂ آمدنی کو اولیت کی فضیلت حاصل ہے۔

(۱) عطیات

انصارِ مدینہ کی مستقل سخاوت و فیاضی کے سوا وقتی اور ہنگامی انفرادی اور اجتماعی عطیات ہی مدینہ کی نوزائیدہ و نوخیز ریاست کے آمدنی کے ذرائع میں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے خاص کر اس کے ابتدائی اور مشکل زمانۂ ارتقاء میں اور بعد میں بھی جب اسلامی ریاست اپنے سیاسی اوجِ کمال کو پہنچ گئی تھی عطیات کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ مآخذ میں جا بجا بکھرے واقعات و شواہد عطیات پر ایک نظر سے اس تبصرہ کی صحت کی شہادت بخوبی مل جائے گی۔ ایک بار ایک مُجو کا شخص خدمتِ نبویؐ

میں حاضر ہوا۔ آپ نے حضرت ابو طلحہ کے سپرد ان کی میزبانی کر دی۔ انھوں نے جس مثالی انداز میں اپنے مہمان کی مہمان داری کی اس کی تحسین قرآن کریم نے کی۔[۳۸] اس قسم کی سخاوت و فیاضی کی متعدد مثالیں اصحابِ صُفّہ کے بیان کے ضمن میں ہمارے تمام مآخذ میں بھری پڑی ہیں۔[۳۹] ایک بار مسلم کی روایت کے مطابق ایک نو مسلم قبیلہ کی مالی ضروریات کے لیے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو عطیات کا حکم دیا۔ ہر شخص اس کارِ خیر کے لیے دوڑ پڑا اور ذرا ہی دیر میں خدمتِ نبویؐ میں کھانے، کپڑے اور اسباب کا ڈھیر لگ گیا۔ ایک انصاری نے اس موقعہ پر تو کافی بڑی رقم عطیہ میں دی۔[۴۰] یہ مشہور واقعہ ہے کہ اسیرانِ بدر کے قیام و طعام اور دوسری ضروریات کی تکمیل کلیتاً مسلمانوں کی دریا دلی کی مرہونِ منت تھی۔[۴۱] اسی طرح ہوازن کے چھ ہزار قیدیوں کے لیے کپڑے مسلمانوں کے عطیات ہی کے ذریعہ فراہم کیے گئے تھے۔[۴۲]

مہموں سے قبل یا ان کے دوران مخیر مسلمان بڑی فیاضی سے اجتماعی اخراجات کے لیے عطیات دیتے تھے۔ خندق کی مہم کے دوران حضرات سعد بن عبادہ، جابر بن عبداللہ اور متعدد دوسرے مالدار انصاریوں اور مہاجروں نے مسلم فوج کے لیے کھانے پینے کا سامان خاص کر کھجوریں فراہم کی تھیں۔[۴۳] بنو قریظہ کی مہم کے دوران حضرت سعد بن عبادہ نے مسلم سپاہ کے لیے کھجوروں کے ڈھیر کے ڈھیر بھیجے تھے۔[۴۴] اسی طرح صحابی موصوف نے ذی قرد کی مہم کے دوران اپنے صاحبزادے حضرت قیس بن سعد کے ہمراہ کھجوروں کے متعدد ڈھیروں کے علاوہ دس اونٹ (جزور) بطور غذا بھیجے تھے۔[۴۵] حضرت سعد بن عبادہ خزرجی کی اس قسم کی سخاوت کے متعدد واقعات کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے۔ رجب ۸ھ / نومبر ۶۲۹ء میں سیف البحر کی مہم کے زمانے میں قیس بن عبادہ خزرجی نے، جو مدینہ کے متمول ترین صحابہ میں شمار ہوتے تھے، مسلم سپاہیوں کے لیے تین دن متواتر اونٹ ذبح کیے تھے اور واپسی پر ان کے والد مکرم و مخیر نے ان کے اقدام کی زبردست تحسین و تعریف کی تھی۔[۴۶] صرف حضرت سعد بن عبادہ یا ان کے فرزند گرامی ہی نے اس قسم کی سخاوت و عطیات کا مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ متعدد صحابہ کرام نے مہموں کے دوران مسلم سپاہ کے لیے سامانِ رسد اور دوسرے اسباب کی فراہمی میں حصہ لیا تھا۔ ابو داؤد کی روایت ہے کہ غزوۂ خیبر کے دوران مسلم ضعیف عورتوں نے، جن کا کوئی خاص ذریعۂ آمدنی نہیں تھا، سوت کات اور بیچ کر رقم جمع کی تھی اور سخت محنت سے حاصل شدہ یہ رقم عطیہ میں دی تھی۔[۴۷] ایک موقعہ پر عورتوں نے اپنے زیورات تک عطیہ میں نذر کر دئے تھے۔

جنگی اور فوجی ضروریات کے لیے مسلم عطیات کی بہترین مثال کا تعلق غزوۂ تبوک سے ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عطیات کے لیے اعلان کرنا تھا کہ چند گھنٹوں کے اندر آپ کے سامنے ہر قسم کے سامان اور نقد کے انبار لگ گئے۔ حضرت ابو بکر نے اپنی کل دولت جو روایات کے مطابق چار ہزار درہم پر مشتمل تھی نذرِ رسول کر دی۔ حضرت عمر فاروق نے اپنی آدھی دولت جو کافی خطیر رقم تھی عطیہ میں دی تھی۔ دوسرے صحابہ کرام میں جنھوں نے "مال" (خطیر رقم) عطیہ میں دی تھی حضرات عباس بن عبد المطلب، طلحہ بن عبید اللہ تیمی، سعد بن عبادہ، محمد بن مسلمہ وغیرہ متعدد لوگ شامل تھے۔ روایت ہے کہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کا "مال" دو سو اوقیہ چاندی (آٹھ ہزار درہم) پر مشتمل تھا جبکہ حضرت عاصم بن عدی نے ۹۰ وسق (تقریباً ۹۰ کوئنٹل) کھجوریں فراہم کی تھیں۔ لیکن سب سے بڑا عطیہ حضرت عثمان بن عفان اُموی کا تھا جنھوں نے روایات کے مطابق

مسلم فوج کے ایک تہائی حصّہ کی ضروریات کے لیے سامان فراہم کیا تھا۔[٤٨] بلاذری کے مطابق رقم میں عثمانی عطیہ ستر ہزار درہم یا اس سے زیادہ کی خطیر رقم پر مشتمل تھا۔[٤٩] بہرحال اصل بات یہ ہے کہ جب کبھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ریاست یا امت کے لیے کسی قسم کی مالی ضرورت پیش آتی تھی آپ مسلمانوں سے عطیات کے لیے فرما دیتے تھے اور مسلمان اپنے محبوب رسول کے حکم کو اپنا فرض سمجھ کر دل کھول عطیے اور چندے دیتے تھے۔ یہ نفل صدقات تھے لیکن اجتماعی ضرورت نے ان کو مسلم عوام خاص کر دولتمند طبقہ کے لیے لازمی اور ناگزیر بنا دیا تھا۔ اس سلسلہ میں اسد الغابہ نے ایک دلچسپ تجزیہ کیا ہے جس کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے ان عطیات کی فہرست مرتب کی گئی ہے جو انھوں نے مختلف مہموں کے مواقع پر عہدِ نبویؐ میں نذرِ رسول کیے تھے۔[٥٠] مذکورہ بالا مثالوں کا تعلق دراصل نقد، جنس اور اسباب کی شکل میں مسلم عطیات سے تھا۔

اُمتِ اسلامی کے مختلف افراد نے جن میں انصار اور مہاجرین دونوں شامل تھے اراضی اور جائداد پختہ و خام کی شکل میں بھی عطیات دیئے تھے جن کی مثالیں مآخذ میں کافی ملتی ہیں۔ ذکر آچکا ہے کہ انصار نے مدینہ اور حوالیِ مدینہ میں اپنی افتادہ زمینوں کے علاوہ باغات اور اراضی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اجتماعی مقاصد کے لیے پیش کر دئے تھے اور آپ نے انھیں میں سے متعدد مسلمانوں کو قطائع عطا فرمائے تھے۔ اس پر بحث تفصیل کے ساتھ ذرا بعد میں کی جائے گی۔ ہجرت کے معاً بعد قبا کے زمانہ قیام میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اوّلین مسجدِ اسلام کی تعمیر کی تھی اس کے لیے زمین حضرت کلثوم بن ہدم نے فراہم کی تھی اور سامان تعمیر متعدد انصاری مسلمانوں نے مہیا کیا تھا۔[٥١] اس طرح مدینہ کی مسجد نبوی کی تعمیر کے لیے زمین کی قیمت حضرت ابو ایوب انصاری نے ادا کی تھی[٥٢] اور سامان غالباً اور لوگوں نے بھی فراہم کیا تھا۔ ایک انصاری خاتون حضرت ام انس نے اپنی کچھ جائداد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کی تھی جو آپ نے اپنی انا حضرت اُمّ ایمن کو بخش دی تھی۔[٥٣] حضرت حارثہ بن نعمان انصاری ایک مالدار ترین اور صاحبِ جائداد شخص تھے۔ انہوں نے متعدد مکانات، باغات اور کھیت خدمتِ نبوی میں نذر کیے تھے جن میں سے ایک آپ نے اپنی محبوب دختر حضرت فاطمہ کو ان کی شادی کے موقع پر ۲ھ / ۶۲۴ء میں عطا کیا تھا۔[٥٤] بنو نجار کے ایک گمنام مخیر انصاری نے ایک محل یا گڑھی (قصر) رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں غالباً اجتماعی معاملات کے لیے پیش کیا تھا۔[٥٥]

یہاں ایک نومسلم یہودی حضرت مخیریق نضری کے جائداد کے عطیات کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مآخذ کے مطابق وہ ایک مخلص نومسلم تھے اور بنو نضیر کے ایک متمول فرد۔ اُحد سے کچھ قبل اُنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور جہاد میں حصّہ لیا تھا۔ انھوں نے وصیّت کر دی تھی کہ ان کی شہادت کی صورت میں تمام جائداد غیر منقولہ و منقولہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت ہوگی۔ چنانچہ ان کی وفات کے بعد اُن کی کھجوروں کے باغات پر مشتمل کافی جائداد" آپ کو ملی جو ایک روایت کے مطابق سات باغوں (حوائط) پر مشتمل تھی۔ ابنِ اسحاق کا بیان ہے کہ" رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں جتنے بھی صدقات تقسیم فرماتے تھے وہ سب اسی موہوبہ جائداد سے آتے تھے"۔[٥٦] اسی طرح بعض دوسرے مدنی مسلمانوں اور مہاجرین کے اراضی کے صدقات کی بڑی دلچسپ مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں کنوؤں (بئر) کے صدقات بہت اہم تھے جو پیاسے عربوں کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ

سے کم نہ تھے۔ حضرت عثمان بن عفان اموی کے بارے میں روایت ہے کہ انھوں نے متعدد دوسرے کنوؤں کے علاوہ بئر رومہ جو مدینہ کے کنوؤں میں سب سے میٹھا پانی رکھتا تھا مسلمانوں کے لیے خرید کر وقف کر دیا تھا۔[۵۷] یہ امر قابلِ تصور اور قرینِ قیاس ہے کہ دوسرے مالدار اور مخیر مسلمانوں نے اس قسم کی جائدادوں کو عوامی ضرورت کے لیے ضرور وقف کیا تھا۔

(ب) اموالِ غنیمت : نقد و جنس

مہموں اور غزوات کے نتیجے میں ملنے والی غنیمت پر بہت زور دیا گیا ہے مگر ابھی تک مدنی مسلمانوں کی معیشت میں اس کے تناسب کا مکمل تجزیہ نہیں کیا گیا تھا۔ بہرحال اس کا سرِدست ہم سے تعلق نہیں تاہم بالواسطہ تعلق یُوں ہے کہ وہ کسی نہ کسی حد تک مسلم اقتصادی خوشحالی کا سبب بنی تھی جس سے مسلمانوں کو عطیات اور صدقات دینے کی صلاحیت ملی تھی اس لیے اس کا ایک تجزیہ ضروری ہے۔ مزید یہ کہ اس غنیمت کا خمس ($\frac{1}{5}$) اسلامی ریاست کا ایک اہم ذریعہ آمدنی تھا۔ اس کی تعیین و تشخیص و تخمینہ اس تجزیہ کے بغیر ناممکن ہے۔ تیسرے باب میں ہم مسلم ذخیرۂ حربی کے افزوں ارتقاء کے ضمن میں مہمات میں حاصل شدہ اسلحوں اور شہسوار فوج کے ارتقاء کے ضمن میں گھوڑوں کا جائزہ لے چکے ہیں جسے دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ہم دوسرے سامان اور نقد کا جائزہ لیں گے جو مختلف غزوات، سرایا اور مہموں کے نتیجے میں مسلمانوں کو ملا تھا۔

یہ حقیقت اب روشن ہو چکی ہے کہ بدر سے قبل کی تمام ابتدائی مہموں میں سوائے سریہ نخلہ کے مسلمانوں کو کوئی مالِ غنیمت نہیں ملا تھا۔ سریہ نخلہ میں مسلمانوں کو جب قریشی کارواں کی صورت میں جو مالِ غنیمت ملا تھا وہ شراب کے مشکیزوں، کھالوں (ادم) خشک کھجوروں (زبیب) اور بعض سامانِ تجارت کے علاوہ دو قیدیوں پر مشتمل تھا۔[۵۸] ان میں سے ایک قیدی مسلمان ہو گیا تھا[۵۹] اس لیے بلا زرِ فدیہ رہا کر دیا گیا تھا جبکہ دوسرے قیدی نے چالیس اوقیہ چاندی (سولہ سو درہم) ادا کر کے رہائی پائی تھی۔[۶۰] اسلامی ریاست کو اس مالِ غنیمت میں سے خمس ملا تھا۔ سرایا کی مانند ابتدائی غزوات میں بھی کوئی مالِ غنیمت نہیں ملا تھا۔ غزوۂ بدر پہلا تھا جس میں مسلمانوں کو کافی مالِ غنیمت ملا تھا۔ ہتھیاروں اور گھوڑوں کے سوا مسلمانوں کو خاصا مالِ غنیمت حاصل ہوا تھا جو اسباب روزمرہ (متاع) چرمی چٹائیوں (انطاع) کپڑوں (ثیاب) اور کھالوں (ادم) پر مشتمل تھا۔ مؤخر الذکر کافی تعداد میں تھیں کیونکہ وہ تجارت کی غرض سے ساتھ لائی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ ایک سو پچاس اونٹ بھی ملے تھے۔[۶۱] رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مال میں سے خمس[۶۲] کے علاوہ صفی بھی ملی تھی۔[۶۳] جبکہ مسلم سپاہ میں سے کچھ کو ایک اونٹ اور کچھ سامان (رِثّہ) اور کچھ کو دو اونٹ حصہ میں ملے تھے جبکہ باقی سپاہیوں کو صرف کھالیں ملی تھیں۔[۶۴] کل تین سو سترہ [۳۱۷] حصے لگے تھے، ۳۱۳ حصے مسلم سپاہیوں کے اور چار حصے دو گھوڑوں کے لیے۔ واقدی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان مجاہدین کی توقع سے مالِ غنیمت کافی کم تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مالِ غنیمت قیمت و کمیت کے لحاظ سے بھی کافی کم تھا۔[۶۵]

بہرحال اسیرانِ بدر سے مسلمانوں کو زرِ فدیہ کی شکل میں خاصی خطیر رقم ملی تھی۔ اس ذریعہ آمدنی کا مفصل تجزیہ دلچسپی کا سبب ہو گا۔ ابن اسحاق، ابنِ ہشام، واقدی، بلاذری اور طبری کے بیانات کا ایک جامع تجزیہ بتاتا ہے کہ بیس قیدیوں نے پچھتر ہزار

درہم کی رقم مجموعی طور سے ادا کی تھی ، اٹھارہ قیدیوں سنے فی کس چار ہزار درہم جبکہ باقی دو نے دو ہزار اور ایک ہزار درہم ادا کیے تھے۔ یہ اعداد و شمار ان اسیرانِ جنگ کے بارے میں ہیں جن کے سلسلہ میں مآخذ نے زرِ فدیہ کی صراحت کی ہے۔ دس اور قیدیوں کے بارے میں ذکر آیا ہے کہ انہوں نے زرِ فدیہ ادا کر کے رہائی پائی تھی۔ لیکن ان کے فدیہ کی رقم کی تعیین نہیں کی گئی ہے۔ اگر ان کے زرِ فدیہ کو بھی گراں ترین شرح یعنی چار ہزار درہم فی کس(۶۶) فرض کر لیا جائے تو ان کے زرِ فدیہ کی مجموعی رقم چالیس ہزار درہم اور مسلمانوں کو ملنے والی کل رقم ایک لاکھ پندرہ ہزار درہم ہو گی، جو خاصی بڑی رقم تھی۔ باقی اسیرانِ جنگ میں سے کچھ تو بلا فدیہ رہا کر دیئے گئے تھے، کچھ جنگی جرائم کی پاداش میں مقتول ہوئے تھے اور کچھ مسلمان ہو گئے تھے باقی کے بارے میں مآخذ خاموش ہیں۔

مشہور روایات کے مطابق اسیرانِ جنگِ بدر کی مجموعی تعداد ستر تھی۔ کچھ دوسری روایات میں ان کی تعداد کچھ کم بیان کی گئی ہے۔ بہر حال جن قیدیوں کے نام بنام ذکر مآخذ میں ملتا ہے ان کی تعداد واقدی کے مطابق صرف ۴۹ ہے(۶۷)۔ بہر حال مآخذ سے یہ صراحت تو ہوتی ہے کہ زرِ فدیہ قیدی کو گرفتار کرنے والے مسلمان مجاہد کو ملتا تھا(۶۸)۔ لیکن اس کی وضاحت نہیں ہوتی کہ ریاست اسلامی کو اس میں سے خمس ملتا تھا یا نہیں۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ خمس بھی نکالا جاتا تھا جیسا کہ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ اس صورت میں مسلم سپاہ کا ۱/۲ یا زیادہ سے زیادہ ۱/۴ حصہ اوسط درجہ میں فدیہ کی رقم کے ذریعہ مالدار ہوا تھا۔ جبکہ بدر کے دوسرے مجاہدین کو کافی کم مالِ غنیمت حاصل ہوا تھا۔ البتہ اسلامی ریاست کو اچھی خاصی رقم خمس کی صورت میں مل گئی تھی جو اس زمانۂ فقر میں کافی معاون ثابت ہوئی ہو گی۔

دوسری مہم جس میں مسلمانوں کو کچھ مالِ غنیمت ملا تھا مدینہ کے یہودی قبیلے بنو قینقاع کے خلاف غزوہ تھا۔ اس میں زیادہ تر غنیمت اسلحہ اور اوزاروں پر مشتمل تھی(۶۹)۔ یہ عجیب بات ہے کہ نہ تو مالِ غنیمت کی تقسیم کا ذکر ملتا ہے اور نہ خمس کا۔ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفی کا ذکر ملتا ہے(۷۰)۔ مشہور روایات کے مطابق مسلمانوں کو یہودی جائدادوں اور اراضی پر بھی قبضہ مل گیا تھا لیکن برکات احمد کی تحقیق کے مطابق مالِ غنیمت صرف ہتھیاروں اور زیادہ سے زیادہ اوزاروں پر مشتمل رہا تھا(۷۱)۔ نقد و جنس میں سے کچھ بھی ہاتھ نہیں لگا تھا۔ غزوۂ سویق میں مسلمانوں کو سویق (ستو) کی چند بوریاں ملی تھیں جو دو سو افراد پر مشتمل مکی فوج بھاگتے وقت اپنے اونٹوں کے کجاووں کو ہلکا کرنے کی خاطر پھینکتی گئی تھی(۷۲)۔ کدر کی مہم میں ایک روایت کے مطابق مالِ غنیمت پانچ سو اونٹوں (بعیر) پر مشتمل تھا جن میں سے خمس سو اونٹوں کا تھا جو اسلامی ریاست کی ملکیت میں آیا تھا۔ جبکہ بقایا چار سو اونٹ مسلمان مجاہدین میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ دوسری روایت کے مطابق مالِ غنیمت کے اونٹوں کی تعداد سو(۷۳) سو اسی تھی کیونکہ ہر مجاہد کو سات اونٹ ملے تھے اور خمس کے اونٹوں کی تعداد صرف دو سو اسی(۷۴) تھی۔ لیکن مورخین کا اصرار ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے(۷۵)۔ بہر حال دونوں صورتوں میں ہم کو یقینی طور سے خمس اور مسلمان مجاہدین کے حصوں کے بارے میں علم ہوتا ہے۔

سریہ قردہ میں، جو حضرت زید بن حارثہ کی ماتحتی میں بھیجا گیا تھا اور جس نے ایک مکی کاروانِ تجارت پر کامیاب چھاپہ مارا تھا کافی مالِ غنیمت نقد ملا تھا۔ اس کی کل مالیت ایک لاکھ درہم تھی "کیونکہ خمس کی ہی مالیت بیس ہزار درہم تھی"(۷۶)۔ جنگِ احد میں

مسلم مجاہدین کو فتح کے لمحات میں کافی مالِ غنیمت ہاتھ لگا تھا لیکن وہ سارے کا سارا عالمِ شکست میں کھو دیا گیا۔ ممکن ہے کہ بعض مجاہدین کے ہاتھ میں کچھ باقی رہ گیا ہو لیکن اس کی مالیت ناقابلِ توجہ تھی۔ بہرحال مسلمانوں کے اس "ممکنہ مالِ غنیمت" سے اسلامی ریاست کو کچھ بھی خمس نہیں ملا تھا۔ حضرت ابوسلمہ کے سریہ قطن میں جو ایک سو پچاس سپاہیوں پر مشتمل تھی فی کس سات اونٹ مالِ غنیمت میں ملے تھے۔[۷۵] اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل غنیمت بارہ سو ساٹھ اونٹوں پر مشتمل تھی اور خمس ریاست میں دو سو دس اونٹ پڑے تھے۔ چونکہ صفی کا ذکر نہیں مل سکا اس لئے امکان ہے کہ کل غنیمت کے اونٹوں کی تعداد کچھ زیادہ رہی ہو۔ یہودی قبیلہ بنو نضیر کے خلاف فوجی کارروائی کے نتیجے میں نقد و جنس کی صورت میں ہتھیاروں کے سوا اور کوئی مالِ غنیمت نہیں ملا تھا۔[۷۶] ربیع الاول ۵ھ / اگست، ستمبر ۶۲۶ء میں دومۃ الجندل کی مہم کے دوران جو در اصل عرب رہزنوں کی لوٹ مار سے تجارتی کارروانوں کو بچانے کے لیے بھیجی گئی تھی مسلمانوں کو مویشیوں کی صورت میں کچھ غنیمت ملی تھی جس کی مالیت و مقدار کا اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ ماخذ اس کے بارے میں بالکل خاموش ہیں۔[۷۷]

مریسیع کی مہم کے دوران بنو مصطلق سے مسلمانوں کو مویشیوں، قیدیوں اور شاید دوسرے اسباب اور نقد کی شکل میں خاصی غنیمت ملی تھی۔ اسلحہ اور سامان (رثہ و متاع) کے علاوہ جو ان کے کجاووں (رحال) میں پایا گیا تھا مالِ غنیمت دو ہزار اونٹوں (بعیر) اور پانچ ہزار بھیڑ بکریوں (شاۃ) پر مشتمل تھا۔ قیدیوں کی تعداد دو سو خاندانوں (رھط) پر مشتمل تھی۔ ان میں سے نصف قیدیوں کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کے سردار کی دختر حضرت جویریہ بنت حارث خزاعی سے شادی کے سبب[۷۸] بلا زرِ فدیہ آزاد کر دیا گیا تھا جبکہ باقی کو ان کے اعزہ نے فدیہ ادا کر کے رہا کرا لیا تھا۔[۷۹] ایک عورت اور اس کے بچوں پر مشتمل خاندان کے بارے میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا فدیہ چھ فرائض (اونٹ) تھے۔[۸۰] خود حضرت جویریہ کا معاملہ بڑا دلچسپ ہے۔ ان کی شادی سے قبل وہ قیدی کے بطور دو صحابیوں حضرت ثابت بن قیس اور ان کے عم زاد بھائی کے حصہ میں مشترکہ طور سے آئی تھیں۔ حضرت ثابت نے اپنے عم زاد کا حصہ مدینہ میں واقع ایک چھوٹے سے کھجوروں کے باغ (نخلہ) کے عوض خرید لیا تھا۔ بعد میں حضرت جویریہ نے حضرت ثابت کو ۹ اوقیہ سونے (تقریباً چار ہزار درہم) کے عوض اپنی رہائی کے لیے راضی کر لیا تھا۔ اسی رقمِ مکاتبت کا سوال لے کر وہ درِ نبویؐ پر پہنچی تھیں اور نبیِ رحمت نے ان کی مطلوبہ رقم ادا کر کے ان سے نکاح کر لیا تھا۔[۸۱] مویشیوں کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور پورے مالِ غنیمت کا خمس اور اپنی صفی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قبل وصول کر لی تھی۔[۸۲]

مدینہ منورہ کے آخری دشمن یہودی قبیلہ کے خلاف مہم میں مسلمانوں کو مشہور روایات کے مطابق ہتھیاروں کے علاوہ کافی مقدار میں اسباب (اثاث)، برتن (آنیۃ)، کپڑے (ثیاب) اور کافی تعداد میں عمدہ اونٹ اور مویشی ملے تھے۔ مسلمانوں کے حصّوں کے نکالنے کے بعد ریاست کو اس کا خمس ملا تھا۔ اگرچہ کافی بڑی تعداد میں شراب کے مٹکے بھی ملے تھے لیکن وہ توڑ دیے گئے تھے اور شراب بہا دی گئی تھی۔[۸۳] عورتوں اور بچوں پر مشتمل یہودی قیدیوں کو مختلف بازاروں میں بیچ دیا گیا تھا اور اس سے حاصل شدہ رقم کو گھوڑوں اور اسلحوں کی خرید پر صرف کیا گیا تھا۔[۸۴] لیکن بنو قریظہ کے تمام قیدیوں کو جن کی تعداد ایک ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے فروخت نہیں کیا گیا تھا۔ ان میں سے بہت سوں کو بلا شرط رہا کر دیا گیا تھا اور ان کی جائداد منقولہ اور غیر منقولہ ان کو واپس کر دی گئی تھی۔ دلچسپ بات ہے کہ ایسا بعض مسلمانوں جیسے حضرت ثابت بن قیسؓ[۸۵] اور حضرت ام منذرؓ[۸۶] وغیرہ کے

مشورہ اور سفارش پر کیا گیا تھا۔ اسی طرح خمس کے حصہ میں پڑنے والے قیدیوں کو بھی بلا شرط رہا کر دیا گیا تھا۔ حضرت محمد بن مسلمہ اوسی کے سند پر مروی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شہسوار مجاہد کا حصہ ۵۴ دینار تھا۔[۸۷] اس رقم میں ان کا سامان، نقد، غلاموں اور اراضی سب کا حصہ شامل تھا۔ گویا کہ یہ کل معیاری حصہ تھا۔[۸۸] اس شرح کے مطابق حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ کل غنیمت کی مالیت تقریباً ۵۰,۰۰۰ دینار ہوتی ہے جو تین ہزار مجاہدین اور ۳۶ گھوڑوں کے حصوں کے بشمول تھی۔ اس میں خمس بھی شامل تھا۔ بہرحال کل غنیمت کی مالیت کسی طور ساٹھ ہزار دینار سے زیادہ نہ تھی۔

ہجرت کا چھٹا برس (جون ۶۲۷ء تا مئی ۶۲۸ء) سرایا کا سال تھا۔ جہاں تک غنائم کا تعلق ہے اس برس کے ۲۱ غزوات و سرایا میں سے صرف سات سرایا میں تھوڑی بہت غنیمت ملی تھی۔ محرم میں حضرت محمد بن مسلمہ کی مہم قرطاء کے نتیجہ میں ایک سو پچاس اونٹ اور تین ہزار بھیڑ بکریاں حاصل ہوئی تھیں۔[۸۹] تین ماہ بعد حضرت عکاشہ بن محصن کے سریہ غمر کے دوران مال غنیمت صرف دو سو اونٹوں پر مشتمل تھا۔[۹۰] جبکہ حضرت ابو عبیدہ کے سریہ ذو القصہ کے نتیجہ میں کچھ مویشی اور مال ملا تھا جس کی مقدار و تعداد کی مآخذ میں صراحت نہیں کی گئی ہے۔[۹۱] البتہ حضرت زید بن حارثہ کی مہم العیص کے نتیجے میں مسلمانوں کو قریشی کارواں سے کافی مقدار میں خام چاندی اور کچھ اور اسبابِ تجارت کے علاوہ دو قیدی بھی ملے تھے لیکن ان میں حضرت ابو العاص بن ربیع کو جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے داماد تھے۔ ان کی اہلیہ کی سفارش پر مع ان کے سامان کے رہا کر دیا گیا تھا۔[۹۲] غالباً دوسرے قیدی نے زرِ فدیہ ادا کر کے رہائی پائی تھی اور یہی کل غنیمت اس مہم کی تھی۔ اس کے دوسرے ماہ میں حضرت زید نے اپنے سریہ طرف میں بیس اونٹ اور تقریباً ایک سو ستر بھیڑ بکریاں حاصل کی تھیں جبکہ ایک اور سریہ میں جو حسمیٰ کے علاقے میں گیا تھا انھوں نے تمام حاصل شدہ کثیر مالِ غنیمت واپس کر دیا تھا۔[۹۴] اس کے بعد حضرت علی کی مہمِ فدک میں پانچ سو اونٹوں اور دو ہزار بھیڑ بکریوں پر مشتمل غنیمت ملی تھی۔[۹۵] اس برس کی آخری مہم میں حضرت زید کو بنو فزارہ کی ایک باندی ام قرفہ حاصل ہوئی تھی جس کی ایک مسلمان سے شادی کر دی گئی تھی۔[۹۶]

ہجرت کے ساتویں برس کی اوّلین مہم غزوۂ خیبر تھا جس میں مسلمانوں کو کافی غنائم ملے تھے اور جو اموال منقولہ اور غیر منقولہ دونوں پر مشتمل تھے۔ اسلحہ کے علاوہ اموالِ غنیمت ہر طرح کے کھانے کی اشیاء (طعام)، گھریلو اسباب (اثاث) سونے چاندی وغیرہ دھات کے برتنوں (اوانی) کپڑوں خاص کر اعلیٰ سوتی اور ریشمی چادروں (بزو قطائف) کے علاوہ مویشیوں (گائے، بکری، اونٹ وغیرہ) چمڑے کی چٹائیوں، زیورات اور خزانوں پر مشتمل تھے۔ کھانے کی اشیاء، چمڑے کی کھالوں اور چارے (علف) کو تقسیم نہیں کیا گیا بلکہ اجتماعی ضرورت کے لیے عام کر دیا گیا تھا جس کو جتنی ضرورت ہوتی وہ آ کر لے لیتا تھا۔[۹۷] بعد میں مالِ غنیمت کو اسلامی قانون کے مطابق تقسیم کیا گیا تھا۔ پورے مالِ غنیمت کی مالیت کا صحیح تخمینہ لگانا مشکل ہے تاہم کچھ اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہودی محصورین نے اپنے دس ہزار سپاہیوں سمیت کل یہودی آبادی کے لیے سال بھر کا سامانِ رسد جمع کر لیا تھا۔ بہرحال واقدی کے ایک حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلم شہسوار کا حصۂ غنیمت ½ ۱۱ دینار تھا جبکہ پیادہ کو اس کا ایک تہائی یا نصف ملا تھا۔[۹۸] اس بنیاد پر کل مالیت صرف ۹,۵۰۰ دینار یا زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار دینار تھی جو خاصی کم تھی۔ بہرحال اس سے زیادہ قیمتی اموال یا جائدادوں پر مشتمل اراضی تھی جس پر بحث ہم کچھ دیر بعد کریں گے۔ فدک سے حاصل شدہ غنیمت بھی زمین پر مشتمل تھی۔[۹۹] وادی القریٰ کی مہم میں البتہ مسلمانوں کو کچھ سامان (اثاث، متاع) پر مشتمل غنیمت

ملی تھی لیکن اس کی صراحت نہیں کی گئی ہے۔[۱۰۰] وادی القریٰ اور تیماء کے یہودیوں نے بھی اپنی پیداوار کے نصف پر صلح کر لی تھی اگرچہ تیماء کے ضمن میں لفظ جزیہ ذکر کیا گیا ہے۔[۱۰۱]

اس برس کی دُوسری مہموں میں حضرت ابوبکرؓ کے سریہ نجد میں معمولی سا مالِ غنیمت ملا تھا۔[۱۰۲] حضرت غالب بن عبداللہ لیثی کے سریہ فدک کے نتیجے میں جو حضرت بشیر بن سعد خزرجی کے سریہ پر حملہ کا انتقام لینے کے لیے ترتیب دیا گیا تھا مسلمانوں کو مویشیوں کی شکل میں خاصا مالِ غنیمت ہاتھ لگا تھا۔ روایت کے مطابق اس فوج کے دو سو مجاہدین میں سے ہر شخص کو، اُونٹ یا اس کے مساوی بھیڑ بکری ملے تھے۔ گویا کہ کل مالِ غنیمت بشمول خمسِ رسول سترہ سو پچاس اونٹوں پر مشتمل تھا۔ حضرات غالب بن عبداللہ اور بشیر بن سعد کی باقی دو مہموں میں جو بالترتیب مَیفعہ اور جِناب کے علاقوں میں بھیجی گئی تھیں کافی مالِ غنیمت مویشیوں میں ملا تھا لیکن اس کی صحیح مالیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ ماٰخذ میں اس کا کوئی قرینہ نہیں ملتا۔[۱۰۳]

۸ھ / ۳۰-۶۲۹ء میں تقریباً بیس مہمیں پیش آئیں۔ صفر / جون میں حضرت غالب بن عبداللہ کی مہم کدید میں قیدیوں اور مویشیوں پر مشتمل تھوڑا سا مالِ غنیمت ملا تھا۔[۱۰۴] دُوسرے ماہ حضرت شجاع بن وہب کے سریہ سی نے روایت کے مطابق اتنے مویشی مالِ غنیمت کے بطور حاصل کیے تھے کہ ۲۴ مجاہدین پر مشتمل مسلم دستہ کو فی کس ۱۵ اُونٹ حصّہ میں پڑے تھے یا ان کے مساوی بھیڑ بکری ملے تھے (ایک اونٹ کے عوض دس بھیڑ بکریوں کی شرحِ تبادلہ معیاری سمجھی جاتی تھی)[۱۰۵] جنگِ موتہ اگرچہ کسی طور فتح کا عنوان نہ تھی تاہم بعض مجاہدین کو دشمنوں سے غنیمت حاصل کرنے میں کامیابی ملی تھی۔ غالباً یہ سلب کے بطور حاصل ہوئی تھی۔ اب تک معلوم شہادتوں کے مطابق ایک، مجاہد کو ایک انگوٹھی اور دوسرے مجاہد کو ایک ہیرا (یاقوتہ) ملا تھا جو ایک دشمن سپاہی کے خود میں جڑا ہوا تھا اور جس کی قیمت عہدِ فاروقی میں سو دینا یا ہزار بارہ سو درہم آنکی گئی تھی۔[۱۰۶] حضرت عمرو بن عاص کی مہم ذات السلاسل میں کچھ بھی مالِ غنیمت نہیں ملا تھا سوائے ان گنتی کے بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کے جو مسلم فوج کی لذتِ کام و دہن کے کام آتے تھے۔[۱۰۷]

حضرت ابو قتادہ بن ربعی کی مہم خَضِرہ کے نتیجے میں جو مالِ غنیمت ملا تھا دو سو اونٹوں اور ایک ہزار بھیڑ بکریوں پر مشتمل ہونے کے علاوہ کافی تعداد میں جنگی قیدیوں پر بھی مشتمل تھا مگر ان کی تعداد کا کوئی ذکر نہیں مل سکا ہے۔[۱۰۸] لیکن اس برس کے سب سے زیادہ مالیت کے غنائم غزوہ حنین میں حاصل ہوئے تھے۔ ان میں چھ ہزار جنگی قیدی، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زیادہ بھیڑ بکریاں (شاۃ) اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی۔ اموالِ غنیمت کی تقسیم اور عرضِ سپاہ کے افسر حضرت زید بن ثابت کے مطابق ہر پیادہ سپاہی کو چار اونٹ یا چالیس بھیڑ بکریاں حصّہ میں پڑی تھیں جبکہ ہر شہسوار مجاہد کا حصہ اس کا تین گنا تھا۔[۱۰۹] ظاہر ہے کہ کچھ کے حصّے میں چاندی یا دوسری اشیائے غنیمت (اگر کچھ تھیں) ملی تھیں جو مالیت میں اپنے اپنے طبقہ کے مجاہدین کے حصّہ کے مساوی تھیں۔ جیسا کہ معلوم و معروف ہے تمام جنگی قیدیوں کو ہوازن کے مسلم اور غالباً غیر مسلم سرداروں کی دردمندانہ درخواستوں پر بلاشرط رہا کر دیا گیا تھا۔[۱۱۰]

اگلے برس یعنی ۹ھ / ۳۱-۶۳۰ء کی کل نو مہموں میں ایک دو کے سوا سب میں مالِ غنیمت کم یا بیش مسلمان مجاہدین کے ہاتھ لگا تھا۔ تمیم کے خاندان بنو العنبر کے خلاف حضرت عُیَینہ بن حصن فزاری کی تعزیری مہم کے نتیجہ میں کچھ قیدی پکڑے گئے تھے اور

امکان ہے کہ کچھ سامان بھی ملا ہو لیکن اس کا صریح ذکر مآخذ میں نہیں ملتا ہے۔ بہرحال کچھ قیدیوں کو ازراہِ ترحم رہا کر دیا گیا تھا جب کہ بعض دُوسروں نے فدیہ ادا کر کے رہائی پائی تھی۔[111] دوسرے مہینے قبیلہ خثعم کے ایک خاندان کے خلاف تعزیری مہم کے دوران حضرت قطبہ بن عامر کے ۲۰ مجاہدوں پر مشتمل دستے میں سے فی کس چار اونٹ یا اس کے مساوی بھیڑ بکریوں پر مشتمل مالِ غنیمت ملا تھا۔ اس سے قبل اس کا خمس نکال لیا گیا تھا۔[112] اس برس کی پانچویں مہم حضرت علی بن ابی طالب کا سریہ فلس تھا جس میں مسلمانوں کو کافی تعداد میں مویشی، قیدی اور کچھ ہتھیار ملے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ ہتھیار قبیلہ طے کے صنم کدہ میں ملے تھے۔ اگرچہ خمس کے نکالنے اور صفی کے علیحدہ کرنے کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے مگر ان کی تعداد یا مقدار یا مالیت کا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے۔[113] غزوۂ تبوک کے دوران حضرت خالد بن ولید مخزومی دومۃ الجندل کی مملکت کے خلاف ایک مہم لے کر گئے تھے۔ اس کے عیسائی حکمران اُکیدر بن عبد الملک کندی نے حضرت خالد کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ایک معاہدۂ صلح کیا تھا جس کی رُو سے اس نے دو ہزار اونٹ، آٹھ سو گھوڑے (رأس)، چار سو ڈھالیں اور زرہ بکتر اور اتنے ہی نیزے ادا کیے تھے۔ بعد میں اکیدر نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر مستقل سالانہ جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔[114] حضرت خالد بن ولید کو جو "اموال" اکیدر نے ادا کئے تھے وہ تکنیکی لحاظ سے مالِ غنیمت میں نہیں آتے کیونکہ وہ صلح کے ایک معاہدہ کے نتیجے میں اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی کو قبول کرنے کی ایک علامت کے طور پر دئے گئے تھے۔

ہجرت کے دسویں برس یعنی ۳۲-۶۳۱ء میں صرف ایک مہم یعنی سریہ علی جانب یمن میں کچھ مال ملا تھا جو قیدیوں، مویشیوں اور کپڑوں پر مشتمل تھا۔ اس کا خمس یمنی کپڑوں اور مویشیوں پر مشتمل تھا۔ حضرت علی اس موقع پر مذحج وغیرہ کے مسلمانوں کے صدقات بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔[115]

عہدِ نبویؐ کی کل یہی مہمیں تھیں جن میں مسلمانوں کو مذکورہ بالا مالِ غنیمت ملا تھا۔ اس بحث کو ہم نے نقد و جنس پر مشتمل مالِ غنیمت تک محدود رکھا ہے۔ اگر ان تمام مہموں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام غزوات و سرایا میں سے صرف ایک تہائی سے کچھ زیادہ میں مالِ غنیمت دستیاب ہوا تھا اور اکثر مہموں میں وہ کافی حقیر تھا تاہم یہ حقیقت ہے کہ اموالِ غنیمت نے عام مسلمان مجاہدین کو اور ان کے ذریعہ مسلم اُمت کے مختلف طبقات کو کسی نہ کسی حد تک "مالدار" بنایا تھا جبکہ خمس اور صفی نے اسلامی ریاست کی ضروریات کی کفالت کی تھی۔ لیکن یہ "مالداری" اور "کفالت" کتنی تھی اس پر کہیں اور مفصل بحث کی جا چکی ہے اور وہ سردست ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ لیکن نقد و جنس میں حاصل شدہ اموالِ غنیمت مسلم معیشت اور اسلامی ریاست کے لیے اتنے اہم نہ تھے جتنے کہ جائدادوں اور اراضی پر مشتمل اموالِ غنیمت جن کو کبھی کبھی اصطلاح میں "فے" کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اگرچہ فے اموالِ غنیمت میں حاصل ہونے والی جائدادوں کی ایک مخصوص شکل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ بہرحال فی الحال ہماری اس سے کوئی بحث نہیں۔ ذیل میں ہم اموالِ غنیمت میں یا مہموں کے نتیجے میں حاصل ہونے والی اراضی سے بحث کر رہے ہیں کہ وہ مسلم معیشت کے لیے زیادہ مفید تھی۔

(ج) اموالِ غنیمت : جائداد مشتمل بہ اراضی

اگر محمد بن حبیب بغدادی کی روایت صحیح ہے تو پہلی اراضی (اموال) جو بطور مالِ غنیمت مسلمانوں کو حاصل ہوئی ہوگی وہ مدینہ سے جلا وطن کیے جانے والے پہلے یہودی قبیلہ / خاندان بنو فطیون کی تھی۔[116] مگر اس روایت کے سلسلے میں کئی اشکال ہیں،

اوّل یہ کہ بغدادی نے ان کے اخراج کا تو ذکر کیا ہے مگر دوسری تمام تفصیلات سے گریز کیا ہے۔ دوم یہ کہ ان کی جائداد رہائشی تھی یا پیداواری یا دونوں، یہ کہنا مشکل ہے کیونکہ ہم کو بنو فطیون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ اسی طرح بنو قینقاع کا معاملہ ہے۔ اگر مشہور روایات صحیح ہیں تو ان کے مدینہ سے جلا وطنی کے بعد ان کی جائدادیں ——— بازار، دکانیں، مکانات ——— مسلمانوں یا اسلامی ریاست کی ملکیت میں آ گئی تھیں[117] لیکن اگر حمید اللہ کی رائے اور برکات احمد کی مدلل بحث صحیح ہے تو ان کو ان کی جائدادوں اور اراضی پر بحال رکھا گیا تھا۔ بہر حال مآخذ کا یہ بیان ہے کہ ان کا بازار مدینہ کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا[118] جہاں ان کی مسقف و پختہ دکانیں تھیں۔[119] وہ اپنے رہائشی مکانات گڑھیوں (آطام) میں بناتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی زرعی جائدادیں یعنی باغات و کھیت وغیرہ نہیں تھے[120] کیونکہ وہ تجارت پیشہ اور دستکار تھے۔[121] ان کی جائدادوں کی مالیت کا اندازہ مشکل ہے مگر محال نہیں۔ روایات کے مطابق ان کے بالغ و جنگ کے قابل مردوں کی تعداد سات سو افراد پر مشتمل تھی[122] اور ان کی کل آبادی انھیں کے خاندانوں کی تھی جو ہمارے اندازے کے مطابق تقریباً چار پانچ ہزار افراد کے درمیان تھی۔ اسی سے ان کی جائدادوں کی مالیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال حتمی طور پر جو جائداد و اراضی ——— رہائشی و پیداواری دونوں ——— پہلی بار مسلمانوں کے قبضۂ تصرف میں بطور مالِ غنیمت آئی تھی وہ مدینہ کے مالدار یہودی قبیلہ بنو نضیر کی تھی جن کو معاہدہ توڑنے اور فساد فی الارض پھیلانے کے جرم میں مدینہ سے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ ان کی اراضی و جائداد (اموال) ان کے رہائشی مکانات جو گڑھیوں اور قلعوں (آطام) میں واقع تھے کے علاوہ باغات اور کھیتوں پر مشتمل تھی کیونکہ وہ زراعت پیشہ تھے۔[123] واقدی اور دوسرے متعدد مستند مصنفین کا بیان ہے کہ ان کے اموال میں کھجور کے باغات میں ہی اناج و سبزی وغیرہ کے کھیت ہوتے تھے جہاں خاصی بڑی مقدار میں (زرع کثیر) ہوتی تھی۔[124] بنو نضیر کا قبیلہ کم و بیش بنو قینقاع کی مانند یا اس سے بھی بڑا تھا لیکن ان کی جائدادوں کی مالیت کا صحیح تخمینہ کافی مشکل ہے۔ بہر حال کچھ اندازہ بعض قرینوں سے ہوتا ہے۔ روایت ہے کہ اموالِ بنی نضیر کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غریب مہاجرین اور دو انصاریوں حضرات سہل بن حُنیف اور ابو دجانہ کے درمیان تقسیم کر دیا تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کتنے مہاجرین کو اس سے فیض پہنچا تھا کیونکہ مآخذ اس نکتہ پر خاموش ہیں۔ بہر حال اس زرعی اراضی کی پیداواری صلاحیت کے بارے میں بعض بڑی دلچسپ روایات ملتی ہیں جن کا مطالعہ ہمارے لیے مفید ہوگا۔ واقدی اور ابنِ سعد وغیرہ نے حضرت عمر بن خطاب کی سند پر روایت بیان کی ہے کہ اموال بنی نضیر، فدک اور خیبر کے بعض اراضی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفی / صفایا میں شامل تھی[125] جس کو تکنیکی لحاظ سے فقہ میں فے بھی کہا جاتا ہے۔[126] بہر حال وہ مسلمانوں میں تقسیم کی گئی ہو یا اسلامی ریاست کی ملکیت میں بطور فے رہی ہو، یہ حتمی و ناقابلِ تردید

امر ہے کہ اس سے تمام اُمتِ مسلمہ یعنی مسلمانانِ مدینہ فیض یاب ہُوئے تھے۔ روایات کے مطابق رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سال بھر اموال بنی نضیر اور عطایائے حضرت مخیریق نضری کی پیداوار میں سے صدقات تقسیم کیا کرتے تھے۔[۱۲۷] ان کے علاوہ آپ اپنے خاندان بنی عبد المطلب کے متعدد افراد اور اپنی تمام ازواجِ مطہرات کو بھی انھیں جائدادوں سے اتنی پیداوار جو کھجور اور جَو پر عموماً مشتمل ہوتی تھی عطا فرمایا کرتے تھے جو ان کی ضروریات کے لیے سال بھر کافی ہوتی تھی۔ اور اس سے جو کچھ بچ رہتا تھا اس کو اسلحوں اور گھوڑوں کی خرید پر خرچ کیا کرتے تھے۔[۱۲۸] روایات کے مطابق آپ کے غلام حضرت ابو رافع اموالِ بنی نضیر کے مہتمم و نگران افسر تھے جو اس کے باغوں اور کھیتوں میں پیدا ہونے والی کھجور، اناج اور سبزیوں کی پہلی کھیپ (اُنبکرہ) آپ کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔[۱۲۹]

اموال بنی نضیر کی مالیت کا مزید اندازہ ان کی بعض جائدادوں کے تذکرہ سے بھی ہوتا ہے جو مسلم مجاہدین یا اراکین امت کو ملی تھی۔[۱۳۰] یحییٰ بن آدم کا بیان ہے کہ سات باغوں (حوائط) کے علاوہ تمام اموال بنی نضیر کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ سات باغ جو صفیِ رسول یا فے کے ضمن میں تھے ان باغات و کھیتوں کے علاوہ تھے جو بنو نضیر کے ایک مالدار مسلم حضرت مخیریق نے آپ کو ہبہ کیے تھے۔ واقدی نے اموال بنی نضیر کے بعض عطایائے نبوی کا ذکر بطورِ خاص کیا ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق حضرت ابو بکر صدیق کو بئر حجر ملا تھا جبکہ حضرت عمر فاروق کے حصے میں بئر جرم آیا تھا۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ دونوں بزرگوں کو دو کنوؤں کا عطیہ ملا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ ان کنوؤں کے ساتھ ان دونوں سابقین اولین کو ان کی ملحقہ اراضی بھی ملی ہو کیونکہ عرب میں اراضی عام طور سے اپنے علاقے میں واقع کنوؤں کے نام سے بھی موسوم ہو جاتی تھی۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف زہری کو "سُعالہ" نامی جائداد ملی تھی جو بعد میں "مال سُلیم" کے نام سے مشہور ہوئی تھی۔ حضرت صہیب بن سنان نمری کو "الضرطہ" نامی جائداد بلا شرکتِ غیرے عطا ہوئی تھی جبکہ حضرات زبیر بن عوام اور ابو سلمہ بن عبد الاسد کو "البویلہ" نامی جائداد مشترکہ طور پر ملی تھی حضرات ابو دجانہ اور سہل بن حُنَیف کو بھی مشترکہ جائداد ملی تھی جو عام طور سے "مال ابن خرشہ"[۱۳۱] کے نام سے مشہور تھی۔ واقدی کا بیان ہے کہ ان کے زمانے تک یہ تمام جائدادیں معلوم و معروف تھیں۔ لیکن بعد کے زمانے میں ان پہ وقت کی گرد جم گئی اور وہ "تاریخ کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئیں۔ ابنِ سعد نے اپنے استاد کی روایت پر یہ اضافہ کیا ہے کہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کو اموال بنی نضیر سے "کَیْدَمہ" نامی ایک جائداد ملی تھی جو بعد میں انہوں نے خلیفۂ وقت حضرت عثمان کے ہاتھوں چالیس ہزار دینار میں فروخت کر دی تھی۔[۱۳۲]

مدینہ کے چوتھے یہودی قبیلہ بنو قریظہ سے جو جائداد مسلمانوں کو ملی تھی اس کے بارے میں ہماری معلومات بہت ہی ناقص ہیں اور سوائے اس کے کہ وہ "آطام" میں رہتے تھے اور کھجوروں کے باغات اور اناج و سبزی کے کھیتوں کے مالک تھے[۱۳۳] ہم بہت کم جانتے ہیں۔ یحییٰ بن آدم کی کتاب الخراج میں ایک وادیٔ مہزور کے بارے میں حوالہ ملتا ہے کہ وہ حرّہ (لاوا کے علاقے) میں واقع تھی جہاں اناج کے بڑے بڑے کھیت اور باغات تھے۔[۱۳۴] قاضی ابو یوسف کا بیان ہے کہ بنو قریظہ کی اراضی مسلم مجاہدین میں نہیں تقسیم کی گئی تھی جبکہ واقدی اس کی تقسیم کے قائل ہیں۔[۱۳۵] قاضی موصوف کے مطابق وہ فے تھی اور اسلامی ریاست کی ملکیت تھی جبکہ واقدی نے کہا کہ وہ مالِ غنیمت کی مانند پانچ حصوں میں تقسیم کی گئی تھی اور صرف خمس اسلامی

ریاست کو ملا تھا اور چار حصے مسلم مجاہدین میں تقسیم کر دئے گئے تھے۔ پیادوں سے شہسواروں کو دوگنا حصہ ملا تھا۔ واقدی کے مطابق بنو عبد الاشہل، بنو ظفر، بنو حارثہ اور بنو معاویہ کے انصاری خاندانوں کو (جن کو عام طور سے بنو نابت کہا جاتا ہے) ایک خاص اراضی سے حصہ ملا تھا جبکہ بنو عمرو بن عوف اور بقیہ دُوسرے اوسی خاندانوں کو دوسرا حصہ ملا تھا۔ اسی طرح خزرج کے خاندان بنو نجار، بنو مازن، بنو مالک، بنو ذبیان اور بنو عدی کو ایک جائداد میں حصہ دار بنایا گیا تھا تو بنو سلمہ، بنو زریق اور بنو حارث کو دوسرے میں۔[۱۳۶] دل چسپ بات ہے کہ اموالِ بنی قریظہ میں سے کسی کا نام نہیں مذکور ہوا ہے سوائے وادیٔ مہروز کے جس کا ایک کافی وسیع حصہ حضرت زبیر بن عوام اسدی کو اور ان کے ایک گمنام پڑوسی کو جن کا تعلق انصار کے خاندان بنی امیہ سے تھا عطا کیا گیا تھا۔[۱۳۷] پہلے کسی باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ بعض قُرظی خاندانوں اور افراد کو نہ صرف معاف کر دیا گیا تھا بلکہ ان کی جائدادیں بھی ان کو واپس کر دی گئی تھیں۔ متعدد قرائن ایسے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ بنو قریظہ کے صرف مقتولین اور جلا وطن ہونے والوں کی جائدادیں جو کافی کم تھیں مسلمانوں میں تقسیم کی گئی تھیں۔

اگرچہ "اموالِ خیبر" کے بارے میں کافی معلومات ملتی ہیں تاہم ان کی نوعیت اور مالیت کا صحیح تخمینہ لگانے کے لیے وہ ناکافی ہیں۔[۱۳۸] دُوسری پیداواری اراضی کی مانند یہ یہودی اراضی بھی کھجوروں کے باغات اور اناج و سبزیوں کے کھیتوں پر مشتمل تھی۔ عرب دستور کے مطابق سبزیوں کے کھیت عموماً کھجوروں کے باغات میں ہی واقع ہوتے تھے جہاں ان کے زیر سایہ کاشت کی جاتی تھی۔[۱۳۹] بعض مآخذ کا دعویٰ ہے کہ اگرچہ خیبر کو مسلمانوں نے طاقت کے بل پر (عنوۃً) فتح کیا تھا اور اس لحاظ سے وُہ مالِ غنیمت تھا اور اس کو دوسرے غنائم کے مانند اسلامی قانون کے مطابق مسلم مجاہدین میں تقسیم کر دینا تھا لیکن اس کو فے یا صفی رسول قرار دیا گیا اور ان کے قلعوں، باغوں اور کھیتوں کو یہودی کاشت کاروں کے قبضہ میں چھوڑ دیا گیا اور صلح اس شرط پر کر لی گئی کہ مسلمان اور یہودِ خیبر ان زرعی زمینوں کی پیداوار کے نصف نصف کے مالک ہوں گے۔[۱۴۰] مآخذ میں اس طرح کی تقسیمِ پیداوار کو مُساقہ (بٹائی کا متناسب طریقہ) کہا جاتا ہے۔[۱۴۱] دوسری طرف قاضی ابو یوسف اور ان کے ہم خیال فقہا کا خیال ہے کہ امام کو اموالِ مفتوحہ کو تقسیم کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہے۔ وُہ اگر چاہے تو اسلامی اُمت و ریاست کے وسیع تر مفادات میں مفتوحہ اراضی کو مسلم مجاہدین میں تقسیم نہ کرے اور پُوری اُمت کے لیے وقف کر کے اس کی ملکیت اور پیداوار اپنے قبضۂ تصرف میں رکھے۔ چنانچہ انھیں اسباب سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر، بنو قریظہ کے علاوہ دُوسرے عرب قبائل کے مفتوحہ علاقوں کو فَے یا صفی رسول قرار دے کر تقسیم نہیں کیا تھا جبکہ اموالِ خیبر کو تقسیم کر دیا گیا تھا۔[۱۴۲] ابن واقد کا خیال ہے کہ اموالِ خیبر کو غنیمہ شمار کیا گیا تھا اور اس لحاظ سے مسلمانوں میں اس کو تقسیم کر دیا گیا تھا اور صرف خیبر کے خمس کو جو قلعہ کتیبہ پر مشتمل تھا اسلامی ریاست کا حق قرار دیا گیا تھا[۱۴۳] اور اسی سے آپ صدقات و عطایا دیا کرتے تھے۔[۱۴۴]

اس نظریہ کے مطابق قلعۂ کتیبہ کی کھجور کی کل پیداوار آٹھ ہزار وسق (تقریباً آٹھ ہزار کوئنٹل) سالانہ تھی جس میں سے نصف یہودیوں کو اور نصف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملتی تھی۔ کتیبہ کی جَو[۱۴۵] کی پیداوار تین ہزار صاع (تقریباً ساڑھے چار ہزار کلو) تھی۔ وہ بھی فریقین میں نصف نصف تقسیم ہو جاتی تھی۔ اس کی نویٰ (گٹھلی لغوی معنیٰ) کی پیداوار عام طور سے ایک ہزار



خانہ کعبہ کا منظر (دوسری منزل سے)

صاع تھی اور اس کا نصف حصۂ رسولِ کریم کا تھا۔ اسی سے اس نظریہ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو کھجور، اناج اور نوٹی کے صدقات وعطیات مسلمانوں کو عطا کرتے رہتے تھے۔ واقدی کے بیان کردہ اعداد و شمار کے مطابق خیبر کی کل زرعی پیداوار میں مسلم حصّہ حسبِ ذیل تھا:

۱۔ کھجور	۴۰،۰۰۰ وسق
۲۔ جَو	۱۵،۰۰۰ صاع
۳۔ نوٹی	۵،۰۰۰ صاع

اس کی مزید تصدیق واقدی ہی کی بیان کردہ ایک اور روایت میں ہوتی ہے جس کے مطابق ایک سال حضرت عبداللہ بن رواحہ نے خیبر کی کل کھجور کی پیداوار میں مسلم حصّہ چالیس ہزار وسق آنکا تھا۔[146]

سہامِ المسلمین (مسلمانوں کے حصہ) میں آنے والی زمینیں اور خمس کی اراضی کے انتظامات اور نگرانی کے لیے دو طرح کے افسروں کو مقرر کیا گیا تھا جن کو مآخذ میں رؤوس (رأس کی جمع بمعنی سردار) کہا گیا ہے۔ تمام اراضی پر یہودیوں کا قبضہ برقرار رہا تھا جو ان کو جوتتے، بوتے، سینچتے، فصل کاٹتے اور ان کی حفاظت کرتے تھے جیساکہ قاضی ابو یوسف نے اس کی توضیح کی ہے۔[147] جب فصلیں پکنے کے قریب ہوتیں تو مدینہ سے ان کے تخمینہ و تقسیم کے لیے خارص (افسرِ تخمینہ) بھیجے جاتے تھے۔ ابتدا میں یہ کارِ منصبی حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجی نے کچھ ایسی بے مثل دیانتداری، فرض شناسی اور لگن سے انجام دیا کہ عام تاثر یہ بن گیا کہ وہ تمام پیداوارِ خیبر کے تخمینہ و تقسیم کے افسر تھے[148] حالانکہ ابن اسحاق اور واقدی وغیرہ کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجی صرف ریاست اسلامی کے خمس کے افسر تھے یا مجموعی طور سے من جملہ اٹھارہ افسروں میں سے ایک تھے جو مسلم حصّوں کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ کتیبہ کی خمس اراضی کی پیداوار کے تخمینے کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ (اور بعد میں ان کے جانشین بھی) اس کو دو برابر برابر ڈھیروں میں بانٹ دیتے تھے اور یہودی کاشتکاروں کو اختیار دیتے تھے کہ وہ جو چاہیں وہ ڈھیر لے لیں۔[149] قاضی ابو یوسف کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات حضرت عبداللہ کھجوروں کی قیمت نقد طلب کرتے تھے اور اسے یہودی بخوشی قبول کر لیتے تھے۔[150] بدقسمتی سے ہم اس نرخ سے واقف نہیں ہو سکے جس پر کھجوروں کی پیداوار کی قیمت کو جنس سے نقد میں بدلا جاتا تھا ورنہ مسلم حصّہ کی مالیت اور اس کی بنا پر مسلم معیشت میں اس کی اصل حیثیت کو متعین کر لیا جاتا۔ بہرحال یہ اندازہ ہے کہ نقد میں جنس کی شرح تبادلہ یقینی طور سے رائج قیمتوں کی بنیاد پر رہی ہوگی اور جس سے یہودی کاشتکاروں کو فائدہ رہا ہوگا کہ انھوں نے زیادہ بہتر قیمت پر دوسرے صارفین کے ہاتھ اس کو بیچا ہوگا۔

جیساکہ حوالہ آ چکا ہے کہ مسلمانوں کے حصّوں کی نگرانی، تخمینے اور تقسیم وغیرہ کے معاملات اٹھارہ افسروں کے سپرد کر دئے گئے تھے۔ ہر افسر کل سو حصّوں (سہام) کا ذمہ دار تھا۔[151] ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے کل اٹھارہ سو حصّے لگائے گئے تھے اور ان کی حصّہ میں آنے والی اراضی نطاۃ اور شق نامی قلعوں کے مجموعہ میں واقع تھی۔ ابنِ اسحاق کا بیان ہے کہ نطاۃ میں کل پانچ مجموعی حصّے (پانچ سو حصّے) تھے جبکہ شق میں تیرہ مجموعی حصّے (تیرہ سو حصّے) تھے۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں

رہ جاتی کہ نطاۃ میں پانچ افسر تھے اور شق کے تیرہ افسر۔ یہ حقیقت ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ابنِ اسحاق اور واقدی وغیرہ نے جن اٹھارہ یا کچھ کم و بیش حصّوں کا ذکر کیا ہے وہ دراصل انھیں صحابہ کے حصّے (سہمان) نہیں تھے جن کے نام سے وہ موسوم ہیں دراصل یہ اٹھارہ مجموعی حصّے اپنے مشہور ترین حصّہ دار کے نام سے موسوم ہو گئے تھے۔[۱۵۲] ورنہ ان میں سے ہر ایک میں ننانوے اور حصّہ دار تھے۔ واقدی کا بیان مزید تشریح کرتا ہے کہ ہر سو آدمیوں / حصّہ داروں کا ایک رأس (سردار) ہوتا تھا جو ایک معروف شخصیت ہوتا تھا (یُعرَفُ) اور وہی اپنے تمام شرکاء کو "غلّہ" (پیداوار / اناج) تقسیم کیا کرتا تھا جو اس کے مجموعۂ حصص سے حاصل ہوتا تھا۔ واقدی نے رؤس (سرداران حصص) میں سے صرف گیارہ کے نام گنائے ہیں۔ یہ تھے حضرات:

۱۔ عاصم بن عدی	۲۔ علی بن ابی طالب
۳۔ عبدالرحمٰن بن عوف	۴۔ طلحہ بن عبیداللہ
۵۔ معاذ بن جبل	۶۔ اُسید بن حضیر
۷۔ عبداللہ بن رواحہ	۸۔ فروہ بن عمرو
۹۔ عمر بن خطاب	۱۰۔ سعد بن عبادہ
۱۱۔ بریدہ بن حصیب	

روایت کے بموجب موخر الذکر صحابی نے اوس کے ایک حصّہ کو خرید لیا تھا جس کو "سہم اللفیف" کہا جاتا تھا اور غالباً اسی بنا پر وہ "یکے از افسرانِ انتظام" بن گئے تھے۔[۱۵۳] ابنِ اسحاق نے اپنی فہرست میں حضرت زبیر بن عوام کو بھی "ایک افسرِ انتظامِ مال" بتایا ہے۔[۱۵۴] اس طرح کل بارہ حضرات کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔ بقیہ چھ افسروں کے نام پردۂ خفا میں ہیں۔ بہر حال موجودہ حقیقت کے مطابق چار افسروں کا تعلق قریش سے تھا، اتنے ہی افسروں کا تعلق خزرج سے تھا اور تین اوس سے متعلق تھے، جبکہ ایک بدوی قبیلہ اسلم کے ممتاز فرد تھے۔ یہ تقریباً یقینی ہے کہ ان افسروں کا تناسب حصّہ داروں کے تناسب کے مطابق تھا۔ یہاں اس امر کی طرف توجہ دلانا ازبس ضروری ہے کہ ابن اسحاق کے انگریزی مترجم مشہور مستشرق الفریڈ گلیوم نے اموالِ خیبر کے تقسیمِ حصص کے معاملہ کو بالکل نہیں سمجھا ہے اور ترجمہ میں خاصا خلط مبحث کیا ہے جس کے سبب ان کو پورا "بیان غیر منظم اور پیچیدہ" نظر آیا ہے۔[۱۵۵]

تقسیم اموالِ خیبر کے سلسلہ میں ایک روایت کا ذکر یہاں قابلِ توجہ معلوم ہوتا ہے جس سے مسلم مجاہدین کے ضبطِ نفس، ایمانداری، اتباعِ رسولؐ کے علاوہ اسلامی ریاست کی پالیسی بھی واضح ہوتی ہے۔ خیبر کی فتح اور یہودی کاشتکاروں سے نصف پیداوار کے بٹوارے (مساقہ) کے معاہدے کی انجام دہی کے معاً بعد بعض فتح سے سرشار مسلمان سپاہیوں نے ان کے کھیتوں میں اُگی فصلوں (الحرث) اور سبزیوں (البقل) کو لوٹنا شروع کر دیا۔ یہودیوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمان کے طرزِ عمل کی شکایت کی اور آپ نے مسلمانوں کو سختی سے منع فرماتے ہوئے کہا کہ "یہودیوں نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم نے ان کے کھیتوں (حضیر) کو تاراج کر دیا ہے۔ ہم نے ان کے خون، اموال اور ان کی تمام

اراضی کی جو ان کے قبضہ میں ہے حفاظت کی ضمانت دی ہے اور ہم نے ان سے ایک معاہدہ کیا ہے۔ بلاریب مُعَاہَدِیْن (عہد والے لوگوں) کے اموال میں سے صرف حق کے ساتھ کچھ لینے کی اجازت ہے۔" راوی کا تبصرہ ہے کہ اس تقریر نبوی کے بعد مسلمانوں نے یہودیوں سے سبزی وغیرہ ہمیشہ پیسے / قیمت (ثمن) دے کر خریدی۔[۱۵۶] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم فاتحین نے جو لُوٹ مار کی تھی وہ اس غلط تصوّر کے نتیجہ میں کی تھی کہ وہ معاہدے کے مطابق بھی نصف کے حقدار ہیں۔

تقریباً تمام مآخذ کا اتفاق ہے کہ خیبر کے اموال سے حاصل شدہ خمس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تین مصارف میں صرف کرتے تھے:

اوّل اپنے خاندان بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب کو ایک حصّہ عطا کرتے تھے،

دوسرا اپنے خاندان یعنی ازواجِ مطہرات پر صرف کرتے تھے،

اور تیسرا غریب مسلمانوں پر خرچ کرتے تھے۔[۱۵۷]

ابنِ اسحاق اور واقدی وغیرہ مستند مورخین نے ان تمام حضرات و خواتین کا خصوصی ذکر کیا ہے جن کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خمسِ خیبر میں سے کچھ بھی عطیہ دیا تھا۔[۱۵۸] عطایا میں تقسیم کردہ ایسے حصّوں کا میزان تین ہزار وسق بنتا تھا جیسا کہ ابنِ اسحاق نے بیان کیا ہے۔[۱۵۹] ان میں سے ازواجِ مطہرات کو فی کس اسّی یا سو وسق سالانہ عطیہ کی شرح سے کل عطیہ سات سو وسق تھا۔[۱۶۰]

فتح خیبر اور نصف پیداوار کے مساقہ (بٹوارے) کے معاہدہ کے بعد خیبر کی زرعی حالت انتظام کے بارے میں ایک دلچسپ اور اہم روایت ملی ہے جو ایک طرف مفتوح قوموں کی عمومی ذہنیت کی طرف عام طور سے اور یہودی مزاجِ شر و فساد کی طرف خاص طور سے اشارہ کرتی ہے۔ واقدی کا بیان ہے کہ اس معاہدہ کے بعد ہی پیداوار میں کافی گراوٹ آئی اور اس سال اتنی کم پیداوار ہوئی کہ خیبر کی زرعی دولت اور خوشحالی جس کے لیے وہ پُورے جزیرہ نمائے عرب میں معلوم و مشہور تھا' ماضی کی کہانی بن گئی۔[۱۶۱] مسلمان مورخین نے اس زرعی پیداوار کی کمی کا سبب تین چیزوں کو قرار دیا ہے۔ اوّل یہ کہ خیبر کے دولت مند اور صاحبِ ثروت کاشتکار لوگ جو دراصل مقامی طبقہ اشراف بھی تھا جلد ہی فنا ہو گیا اور وہ جو مال و دولت کاشتکاری میں لگاتے تھے وہ دستیاب نہ رہا۔ دوم یہ کہ باقی رہ جانے والے یہودی محض کاشتکار اور مزدور (عُمّال ایدیھم) رہ گئے جن کے پاس سرمایہ کاری کے ذرائع نہیں تھے۔ اور سوم یہ کہ یہودی کاشتکاروں نے عمداً مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی خاطر اپنی پیداواری صلاحیت کو مسلسل گھٹایا۔[۱۶۲] یہ مسلم تبصرہ حقیقت پر مبنی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم اُمت اور ریاست کو خیبر کی اصل پیداوار کا نصف ان مذکورہ بالا اسباب سے کبھی نہیں ملا۔ مذکورہ بالا پیداوار کے اعداد و شمار فتح خیبر کے سال کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد پیداوار کی شرح میں مسلسل کمی ہوتی رہی تھی۔

خیبر سے ملحق دُوسری یہودی بستی فدک بھی صلح کے ذریعہ مسلمانوں کے قبضہ میں آئی تھی اور اسی بنا پر اس کو بھی فے قرار دیا گیا تھا۔[۱۶۳] روایات کے مطابق حضرت محیصہ بن مسعود نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے اور سفیر کے فرائض انجام دئے تھے اور انھوں نے خیبر کی شرائط پر صلح کا معاہدہ کر لیا تھا۔ یعنی ان کو بھی اپنی تمام پیداوار کا نصف (نصف

الارض) مسلمانوں کو یا اسلامی ریاست کو سالانہ یا فصل کے موقع پر ادا کرتے رہنا تھا، جبکہ تمام اراضی ان کے قبضے ہی میں رہنے دی گئی تھی۔[۱۶۴] البتہ ملکیت ارض اسلامی ریاست کو منتقل ہو گئی تھی۔ فدک کے بارے میں ہماری معلومات بہت ہی ناقص ہیں نہ ہم ان کی اراضی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں نہ کل پیداوار یا اس میں مسلم حصہ کے بارے میں۔ البتہ یہ یقینی طور پر ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ فدک کی زمین بہت ہی زرخیز تھی اس کا ایک سبب یہ تھا کہ وہاں آبپاشی کا بہت اچھا نظام تھا۔[۱۶۵] عہدِ فاروقی میں کل اراضی کی مالیت ایک لاکھ درہم آنکی گئی تھی چنانچہ یہود حجاز کے جزیرہ نمائے عرب سے اخراج کے وقت یہود فدک کو ان کے نصف حصہ کی قیمت پچاس ہزار درہم ادا کی گئی تھی۔[۱۶۶] یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دس بارہ سال میں قیمتوں میں کافی فرق آگیا تھا اور عہد نبوی کے مقابلے میں عہدِ فاروقی یا عہدِ عثمانی میں اشیائے صرف یا جائدادوں کی قیمتیں کافی چڑھ گئی تھیں۔ اس کا ایک سبب غالباً افراطِ زر تھا جو عالمگیر فتوحات اور بین الاقوامی مسلم تجارت کے ضمن میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ غالباً یہ علاقہ قرئ عربیہ کے انتظامی علاقے (عمالہ) میں شامل رہا تھا[۱۶۷] اور وہاں کے گورنر حضرت عبداللہ بن سعید اموی فدک کی زمینوں کے انتظامات اور وہاں کے محاصل کی وصولیابی کے ذمہ دار رہے تھے۔ یہاں سے حاصل شدہ محاصل کے مصارف روایات کے مطابق رفاہ عام کے کام تھے خاص کر مسافروں (ابن السبیل) کی ضروریات پر ان کو خرچ کیا جاتا تھا۔[۱۶۸] کیونکہ روایات کے مطابق فدک فے اراضی تھی جس کے انتظام و انصرام کی کل ذمہ داری اسلامی ریاست کی تھی۔

اگرچہ اخراجِ یہود کا تعلق ہمارے موضوع سے نہیں ہے تاہم یہاں یہودِ حجاز کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کی شرائط کا ذکر کرنا کافی اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اس سے ایک طرف تو ہم کو یہودیوں سے مسلم معاہدہ کی صحیح نوعیت سمجھنے میں مدد ملے گی تو دوسری طرف عہد فاروقی میں جزیرہ نمائے عرب سے ان کے اخراج پر روشنی بھی پڑے گی۔ ابنِ اسحاق اور طبری کے مطابق معاہدۂ نبوی کی من جملہ شرائط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ "اگر ہم تم لوگوں کو جلا وطن کرنا چاہیں تو ہم ایسا کر سکیں گے۔"[۱۶۹] چنانچہ اس شرط کی روشنی میں حضرت عمر فاروق کا اقدام سنتِ نبوی کے خلاف یا معاہدہ شکنی کے مترادف نہیں تھا جیسا کہ مستشرقین اور بعض جدید مورخین دعویٰ کرتے ہیں۔ یہودیوں کی جلا وطنی کے اور بھی اسباب تھے لیکن معاہدہ نبوی کی اس شرط نے اس کی راہ ہموار کی تھی۔ خیال یہ ہے کہ خیبر کے یہود کے اخراج میں ان کی سازشی فطرت کے علاوہ ان کی زراعت کو عمداً نقصان پہنچانے کی مذموم حرکت نے بھی کافی اہم حصہ لیا تھا۔ یہاں یہ بھی ذکر کرنا ناگزیر ہے کہ تیما اور وادی القریٰ کے یہود کو ان کے وطن سے اس عہد میں بھی جلا وطن نہیں کیا گیا تھا کیونکہ وہ حجاز کے یہود میں شمار نہیں ہوتے تھے جیسا کہ واقدی کا خیال ہے۔[۱۷۰] ممکن ہے کہ ان علاقوں نے معاہدہ شکنی کا اور ریاست اسلامی کے مفادات کے خلاف کوئی ایسا اقدام نہ کیا ہو جو ان کے اخراج کا تقاضا کرتا لہٰذا وہ اپنے علاقوں میں حسبِ دستور سابق برقرار و بحال رکھے گئے۔

وادی القریٰ کی اراضی تھوڑے سے تصادم اور مزاحمت کے بعد (عنوۃً) فتح ہوئی تھی لہٰذا اس کو مالِ غنیمت تصور کیا گیا اور اسی لحاظ سے مسلمان مجاہدین میں اس کو تقسیم کر دیا گیا۔ اسلامی ریاست کے حصہ میں اس کا خمس آیا لیکن بعد میں اس علاقے کے یہودیوں نے خیبر اور فدک جیسی شرائط پر صلح کر لی لہٰذا ان کی اراضی ان کے قبضہ میں چھوڑ دی گئی اور اسلامی ریاست کو حقِ ملکیت

کے عوض اس کی نصف پیداوار بطور خراج[171] ہر فصل پر مستقل ملتی رہی۔ وادی القریٰ کی اراضی کی نوعیت، پیداوار، زرخیزی وغیرہ کی تمام تفصیلات مآخذ میں کہیں بھی مذکور نہیں ہیں۔

تیماء کے یہودیوں نے جب خیبر، فدک اور وادی القریٰ کے زوال کی خبریں سنیں تو انھوں نے از خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح کر لی اور جزیہ ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی[172]۔ عہد نبوی میں زمین پر محصول کے لیے جزیہ کی اصطلاح کا استعمال پہلی بار تیماء کے ہی معاملہ میں ہوا ہے۔ یہ امر بحث طلب ہے کہ یہ جزیہ محصول ذات (علی الرقاب، علیٰ انفسہم) تھا یا محصول زمین (علی الارض)[173]۔ ذات پر محصول کی مثالیں یعنی جزیہ کی صحیح تکنیکی نوعیت کی مثالیں ہم بنو کلب وغیرہ کے معاملہ میں دیکھ چکے ہیں۔ لیکن تیماءؑ کے ضمن میں قرائن یہ کہتے ہیں کہ محصول بر ذات نہیں تھا بلکہ محصول بر زمین تھا۔ کیونکہ جزیہ کی کسی شرح کا اول تو ذکر نہیں، دوسرے خیبر، فدک اور وادی القریٰ کے پس منظر میں یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ اس علاقہ کا بھی معاملہ دوسری پڑوسی یہودی بستیوں سے مختلف نہیں تھا۔ واقدی کی مذکورہ بالا روایت جس میں یہودِ حجاز کے اخراج اور یہودِ وادی القریٰ اور تیماءؑ کے عدم اخراج کا ذکر ہے بالواسطہ طور پر تصدیق کرتی ہے کہ ان کی زمینیں ان کے قبضۂ تصرف میں رہنے دی گئی تھیں اور وہ بھی دُوسری یہودی بستیوں کی مانند اپنی پیداوار پر پچاس فیصد "جزیہ" ادا کرتے تھے جو دراصل "جزیہ علی الارض" یا "خراج" تھا۔ تیماءؑ کے سلسلے میں بھی وادی القریٰ اور فدک کی مانند ہم کو نہ تو خارص (تخمینہ لگانے والے افسر) کا ذکر ملتا ہے نہ ہی دوسرے زرعی اور مالی افسران و عمال کا۔ لیکن اس کے گورنر (والی) کا صریح ذکر ملتا ہے۔[174] اس کا قوی امکان ہے کہ محاصل کی وصولیابی اور دوسرے مالی معاملات کی آخری ذمہ داری بہرحال گورنر کی تھی۔ جہشیاری کے اس تبصرہ سے کہ حجاز کی پیداوار کا حساب کتاب رکھنے کے لیے مرکز میں ایک افسر ہوتا تھا[175] اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ حجاز سے پرے واقع علاقوں کے محاصل کے انتظامات بھی کیے گئے ہوں گے اور بلا ریب تیماءؑ اور وادی القریٰ کے لیے عمال صدقات مقرر کیے گئے تھے خواہ ان کا تذکرہ مآخذ میں ملے یا نہ ملے۔

یہ بڑی دلچسپ اور اہم حقیقت ہے کہ مکہ مکرمہ کے سوا اور کسی عرب علاقے کو بزورِ شمشیر (عنوۃ) فتح نہیں کیا گیا تھا۔ تمام عرب علاقے جو اس کے بعد اسلامی ریاست کا حصہ بنے تھے وہ یا تو بلا استثناء صلح کر کے داخلِ ریاست اسلامی ہوئے تھے اور انھوں نے جزیہ ادا کرنے کا معاہدہ کیا تھا اور یا وہ اسلام قبول کر کے اسلامی امت میں ضم ہو گئے تھے اور اس حیثیت سے انھوں نے وہ صدقات ادا کیے تھے جو صرف مسلمانوں پر عائد ہوتے تھے۔

اس بحث کے آخر میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے اس ذریعۂ آمدنی —— خمس —— کے افسر جو "صاحب الخمس" کہلاتا تھا کے بارے میں بھی مختصراً مطالعہ کر لیں۔ گزشتہ اوراق میں اور بعض دوسرے مقامات پر بھی ہم نے غنیمت منقولہ اور غیر منقولہ دونوں کے بارے میں انتظامی افسروں کا مطالعہ ہم نے کر لیا ہے اور یہ دیکھ چکے ہیں کہ کبھی کبھی صاحب المغانم خُمس کے معاملات کو بھی دیکھتا تھا لیکن اکثر و بیشتر خمس کے لیے ایک خاص افسر متعین کیا جاتا تھا۔ مآخذ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمیہ بن جزءؓ زبیدی عہد نبوی میں خمس کے مستقل افسر تھے۔ واقدی، ابن سعد اور ابن اثیر وغیرہ جیسے مستند مورخین کے متعدد بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ خمس کے معاملات و انتظامات سنبھالے تھے۔ دلچسپ

امر یہ ہے کہ وُہ نہ صرف زمانۂ جنگ میں تقسیمِ اموالِ غنیمت کے وقت خمس کے نگراں ہوتے تھے بلکہ زمانۂ امن میں بھی اس مد میں جمع شدہ رقوم کے خرچ وغیرہ کے انتظامات کے ذمہ دار ہوتے تھے۔[۱۷۶]

(د) جزیہ[۱۷۷]

اسلامی ریاست کے کسی غیر مسلم طبقہ سے جزیہ وصول کرنے کی ایک مثال ہم تیماؔ کے یہود کے معاملے میں دیکھ چکے ہیں لیکن وہ نہ تو پہلی مثال تھی اور نہ ہی اصطلاحی جزیہ کی حقیقی وصولیابی۔ عہد نبوی میں اب تک جو ثبوت اور شہادتیں ملی ہیں ان کے مطابق جزیہ کی پہلی مثال کا تعلق حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کی مہم دومۃ الجندل سے ہے جو شعبان ۶ھ / دسمبر ۶۲۷ء میں پیش آئی تھی۔ گویا کہ تیماؔ کے بنو عادیا یہودیوں کے معاہدہ سے تقریباً چھ ماہ قبل دومۃ الجندل کے بنو کلب کے غیر مسلم طبقات نے جزیہ ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ ماخذ میں دومہ کے جزیہ کی رقم کی مقدار اور ادا کرنے والوں کی تعداد کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ ہی اور دوسری تفصیلات مل سکی ہیں۔ قیاس ہے جو صحیح ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ہی کلب کے غیر مسلموں سے جزیہ کی پہلی قسط وصول کرکے مدینہ لائے ہوں گے اور بعد میں اس کی وصولیابی کے دوسرے انتظامات کیے گئے ہوں گے۔ بہرحال عہد نبوی میں جزیہ کا لفظ دُوسری بار بنو عادیا کے لیے استعمال ہوا ہے۔ وہ جزیہ بھی ہو سکتا ہے اور خراج بھی۔ جیسا کہ ہم اوپر بحث کر چکے ہیں۔

جزیہ کی پہلی واضح مثال جو توقیتی لحاظ سے تیسری ہے اور جس کا تعلق ۸ھ / ۶۳۰ء سے ہے بحرین کے مجوسی طبقات سے متعلق ہے۔ وہاں کے مسلم مقامی منتظم اور سابق بادشاہ حضرت منذر بن ساویٰ نے اپنے مکتوب میں بحرین میں آباد مجوسی رعایا کے مقام وحیثیت و ذمہ داری کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا تھا اور آپ نے بشرط عہد شناسی و وفاداری فی کس ایک دینار معافری مقرر فرمایا تھا۔[۱۷۸] یہی جزیہ بحرین کے دوسرے غیر مسلم طبقات خاص کر یہودیوں پر بھی عائد کیا گیا تھا۔ ایک اور گرامی نامۂ نبوت میں جو مجموعۃ الوثائق میں محفوظ ہے حضرت منذر بن ساویٰ کو حکم دیتا ہے کہ وہ ہجر کے علاقے میں آباد مجوسیوں کے بے زمین بے ملک افراد سے فی کس چار درہم اور ایک قبا (عباءۃ) سالانہ وصول کریں۔[۱۷۹] ایک اور مکتوب نبوی میں غیر مسلم طبقات پر جزیہ کی شرط عائد کرنے کا ذکر ضرور ہے مگر اس کی تفصیلات نہیں۔ دی گئی ہیں البتہ ان کے پڑوس میں آباد مسلم طبقات پر بعض پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر ان مسلمانوں کے لیے غیر مسلم طبقات کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے شادی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔[۱۸۰] یہ بات بیان ہو چکی ہے اور یہاں پھر ذکر کے قابل ہے کہ حضرت منذر بن ساویٰ کی عملداری سے جزیہ کی رقوم وصول کر کے مدینہ پہنچانے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مخصوص عمّال حضرات ابوہریرہ دوسی اور قدامہ کو روانہ فرمایا تھا اور انھوں نے حکم نبوی کی بخوبی تعمیل کی تھی۔ اس سلسلہ میں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ مرکزی ہدایات کی تعمیل میں مقامی منتظم حضرت منذر بن ساویٰ اور مرکزی منتظم حضرت علاؔ بن حضرمی نے اپنا بھرپور تعاون دیا تھا۔[۱۸۱]

جزیہ کی ایک اہم ترین مثال کا تعلق نجران کے عیسائیوں سے ہے۔ یہ دراصل اس معاہدہ کا نتیجہ تھا جو اُنھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ۹ھ / ۶۳۱ء میں کیا تھا۔ خوش قسمتی سے اس معاہدہ کا مکمل متن محفوظ رہ گیا ہے اور اس سے نہ صرف

جزیہ کی ایک مخصوص نوعیت کا علم ہوتا ہے بلکہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم طبقات کے مقام و مرتبے کا بھی صحیح تعین ہوتا ہے۔ چنانچہ معاہدہ نبوی کے متن کا ترجمہ ذیل میں دیا جا رہا ہے:

"یہ پیغمبرِ خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ ہے جو انھوں نے اہلِ نجران سے کیا۔ آپ ہی کو ان کے تمام پھلوں اور زرد، سفید اور سیاہ تمام غلاموں پر اختیار و اقتدار حاصل ہے لیکن آپ نے از راہِ کرم یہ سب ان کے (اہلِ نجران کے) قبضہ میں اس شرط پر بحال رکھا کہ وہ دو سو جوڑے کپڑے (حُلّے) سالانہ آپ کو ادا کیا کریں گے۔ یہ حُلّے اواقی کے ہوں گے (یعنی ہر حلّہ ایک اوقیہ چاندی یا ۴۰ درہم کا ہوگا) اور وہ ہر سال رجب میں ایک ہزار اور صفر میں ایک ہزار (یعنی دو قسطوں میں) ادا کیے جائیں گے۔ اگر ان حُلّوں میں سے کسی کی مالیت ایک اوقیہ سے کم یا بیش ہوگی تو اس کا باقاعدہ حساب کر لیا جائے گا۔ اسی طرح ان سے جو بھی زرہ بکتر، گھوڑے، سواری کے اونٹ اور دوسرا سامان مستعار لیا جائے گا اس کا بھی حساب رکھا جائے گا۔ نجران کے لوگوں پر فرض ہوگا کہ وہ میرے فرستادوں (رسل) کی بیس دن یا اس سے کم دنوں کی مہمانی کریں گے لیکن ان کو (فرستادوں کو) کسی حال میں ایک ماہ سے زیادہ نہیں روکیں گے۔ یہ ان پر لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ میرے فرستادوں یا نمائندوں کو یمن میں جنگ یا ہنگامہ (کید) ہونے کی صورت میں ۳۰ زرہ بکتر، ۳۰ گھوڑے اور ۳۰ اُونٹ فراہم کریں گے۔ ان مستعار زرہ بکتروں، گھوڑوں اور اونٹوں میں سے جو کچھ بھی ضائع ہوگا میرے فرستادے ان کی قیمت ادا کر دیں گے۔ اہلِ نجران اور ان کے لواحقین کو اپنے نفوس کے لیے، اپنی زمین، سامان جو موجود ہے یا آئندہ حاصل ہو، گرجا گھروں اور ملازمتوں یا مذہبی عبادتوں کی آزادی حاصل ہوگی اور اس کے لیے ان کو خدا اور اس کے رسول محمد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذمہ حاصل ہے اور اس کے علاوہ ان کی تمام مملوکہ چھوٹی بڑی چیزوں کی حفاظت کی ضمانت دی جاتی ہے۔ کسی پادری کو اس کے عہدے سے معزول نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی کسی راہب کو اس کی خانقاہ سے اور نہ کسی افسرِ گرجا گھر کو اس کے منصب سے ہٹایا جائے گا۔ اہلِ نجران نہ تو سودی کاروبار لیں گے اور نہ ہی عہدِ جاہلیت کے انتقام لیں گے (لا دم الجاھلیۃ)۔ اگر ان میں سے کوئی صحیح راہ پر چلے گا تو اسے انصاف ملے گا۔ ان کا یہ بھی فرض ہوگا کہ وہ اپنے افراد کو غلط کاری سے روکیں۔ ان میں سے کسی پر نہ کوئی ظلم ہوگا اور نہ زیادتی۔ اگر اس کے بعد بھی ان میں سے کوئی سُود لے گا تو اسے میری ضمانت و حفاظت حاصل نہ ہوگی۔ ان میں سے کسی پر دوسرے کے جُرم و غلط کاری کا کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ ان شرائط پر جو اس صحیفہ میں بیان ہوئی ہیں خدا کی حفاظت (جوار) اور اس کے رسول کا "ذمہ" اہلِ نجران کو وفادار رہنے کی صورت میں برابر حاصل رہے گا بشرطیکہ وہ اپنے فرائض بھی برابر انجام دیتے رہیں اور کوئی غلط کام نہ کریں تا آنکہ خدا کا کوئی اور حکم آ جائے۔"[۱۸۴]

اس صحیفہ نبوی کی مزید تشریح و تعبیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ معاہدہ و مکتوب نبوی نہ صرف اہلِ نجران پر عائد کردہ

جزیہ کی رقم کو بیان کرتا ہے بلکہ ریاست اسلامی میں غیر مسلموں کے فرائض اور ان کے مرتبہ کو بھی واضح کرتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ نجران کے عیسائیوں سے نقد جزیہ کی رقم وصول کرنے کے بجائے ان سے جنس میں کپڑوں کا مطالبہ کیا گیا ہے اور شرط رکھی گئی ہے کہ ہر حُلہ کی قیمت ایک اوقیہ چاندی سے کم نہ ہو۔ اس کے علاوہ اسلامی لشکر کی مادی و فوجی معاونت اور فرستادگانِ نبوی کی میزبانی بھی ضروری قرار دی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان پر سود نہ لینے اور عہد جاہلیت کے انتقام نہ لینے کی بھی شرط عائد کی گئی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے دل چسپ نکتہ یہ ہے کہ نجران سے کل جزیہ کی رقم کا بھی علم ہوتا ہے جو اسّی ہزار درہم سالانہ یا دو ہزار اوقیہ چاندی بنتی ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نجران کی محصول ادا کرنے کے لائق کل آبادی لگ بھگ دو تین ہزار افراد رہی ہوگی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ جزیہ کی یہ مثال اجتماعی محصول کی تھی اور اندرونی طور پر اس کو جمع کرنے کی ذمہ داری اہلِ نجران کی اپنی تھی۔[۱۸۳] اسلامی ریاست کو کل جمع شدہ رقم یا اس کے مساوی کپڑوں کی ادائیگی سے غرض تھی۔

حضرت عمرو بن حزم کی بطور والیِ نجران روانگی سے قبل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ان کو نامۂ مبارک عطا فرمایا تھا اس میں بھی اس علاقہ کے عیسائیوں اور یہودیوں پر عائد کردہ جزیہ کا حوالہ موجود ہے۔ اس نامہ گرامی کے مطابق یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس خطہ کے ہر فرد و بشر کو خواہ وہ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت ایک دینار یا اس کی قیمت کے مساوی کپڑا بطور جزیہ اسلامی ریاست کو ادا کرنا تھا۔ تمام جزیہ ادا کرنے والوں کو اللہ اور اس کے رسول علیم کے ذمہ و حفاظت کی ضمانت دی گئی تھی بشرطیکہ وہ پابندی سے جزیہ ادا کرتے رہیں اور مرکز سے جاری ہونے والے احکام و ہدایات کی تعمیل میں کوتاہی نہ کریں۔[۱۸۴]

یمن کی تین چھوٹی چھوٹی مملکتوں رُعین، مُعافر اور ہمدان کے حکمرانوں حضرات حارث بن عبد کُلال، نُعیم بن عبد کلال اور نعمان بن عبد کلال کے خطوط و استفسارات کے جواب میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان علاقوں کے تمام غیر مسلم طبقات کے لیے بلا امتیاز فی کس ایک دینار مُعافری سالانہ یا اس کی قیمت کا مساوی کپڑا جزیہ میں مقرر کیا تھا۔[۱۸۵] یمن کے حکمراں حضرت زرعہ کے نام مکتوبِ نبوی کا ذکر اوپر بار بار آچکا ہے۔ اس کے مطابق حضرت زرعہ کو اپنی عمالہ یا مملکت سے تمام صدقات اور جزیہ اکٹھا کر کے مرکزی نمائندوں کے حوالے کرنے تھے جو ان کو مدینہ پہنچاتے۔[۱۸۶] مذکورہ بالا تاریخی شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی اور مشرقی خطوں میں آباد تمام غیر مسلموں کے لیے جزیہ کی شرح الگ الگ مقرر کی گئی تھی تاہم ایک دینار مُعافری عہدِ نبوی میں اس علاقہ کے لیے معیاری شرح معلوم ہوتی ہے۔

جنوبی اور مشرقی عرب کے علاوہ شمالی عرب میں بعض یہودی اور عیسائی قبائل اور طبقات بستے تھے جنہوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی قبول کی تھی۔ خیبر، فدک، تیماء، وادی القریٰ کے غیر مسلم طبقات کے اسلامی مملکت کے ساتھ معاہدات اور ان کے نتیجے میں ان کے تعلقات کی نوعیت پر ہم پہلے ہی بحث کر چکے ہیں۔ اسی دومۃ الجندل کے قبیلہ بنو کلب کے سنہ ۶ھ / سنہ ۶۲۷ء میں جزیہ ادا کرنے کا بھی حوالہ آچکا ہے۔ بہرحال یہاں دومۃ الجندل کی عیسائی مملکت کے حکمران اکیدر بن عبد الملک کندی کا اس عہد کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جس کے مطابق اس نے اپنے غیر مسلم طبقات کی جانب سے جزیہ ادا کرنے کا اقرار کیا تھا۔[۱۸۷] یہ معاہدہ غزوۂ تبوک کے تتمہ کے طور پر انجام پذیر ہوا تھا۔ اسی زمانے میں شمال بعید کی چار غیر مسلم بستیوں ایلہ، جرباء، مقنا اور اذرح نے بھی اپنے حکمرانوں کے ذریعہ جزیہ کی ادائیگی پر صلح کر لی تھی کیونکہ ان کو فوجی کارروائی کا خدشہ تھا

جس سے دومہ کے لوگ دوچار ہوئے تھے۔ ایلہ کے بارے میں واضح طور سے ذکر آتا ہے کہ اس کے تین سو بالغ و توانا مردوں نے سالانہ تین سو دینار جزیہ دینا شروع کیا تھا۔ واقدی کے مطابق یہی ایلہ کی کل مردانہ (رجال) آبادی تھی۔[۱۸۸] گویا کہ فی کس ایک دینار جزیہ مقرر ہوا تھا۔ جرباؑ اور اذرح کے لوگوں کو ہر سال رجب میں سو سو دینار ادا کرنے ہوتے تھے اور اس کے بدلہ میں ان کو خداوندِ کریم اور رسولِ عظیمؐ کی امان حاصل تھی۔[۱۸۹] لیکن مقناؑ اور اس علاقہ کے ایک قبیلہ بنو جبنہ کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ ان کو اپنی پھلوں اور کپڑوں (غزُول) کی پیداوار کا ایک چوتھائی حصہ (رُبع) بطور جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔[۱۹۰] اس کے بعد مکتوب نبویؐ نے ان کو ضمانت فراہم کی تھی کہ وہ "تمام قسم کے جزیہ اور سُخرہ (بیگار) سے آزاد ہوں گے اور ان پر سوائے ان کے اپنے لوگوں کے یا خاندانِ رسولِ عظیمؐ کے افراد کے اور کسی کو "امیر" مقرر نہیں کیا جائے گا۔"[۱۹۱]

ماٰخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مملکت کے مرکزی علاقوں میں یعنی حرمین شریفین کے اردگرد کے علاقوں میں جو حجاز و نجد کے وسیع خطوں پر محیط تھے متعدد غیر مسلم طبقات خاص کر یہودی اور عیسائی آباد تھے۔ ان کے مقام و مرتبے نیز جزیہ وغیرہ کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں جانتے سوائے متفرق معلومات کے۔ مثلاً یحییٰ بن آدم نے بیان کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں رہنے والے ایک عیسائی سے ایک دینار سالانہ جزیہ وصول کیا تھا۔[۱۹۲] ابن اثیر کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کے باسی ایک عیسائی کی نصف دولت کسی جرم کی پاداش میں ضبط کر لی گئی تھی۔ ان کے علاوہ ہماری معلومات غیر مسلم طبقات کے بارے میں ناقص ہیں۔ ہم ان یہودی قبیلوں اور طبقات کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے جو بنو قریظہ کے واقعہ کے بعد مدینہ میں سکونت پذیر رہے تھے۔ لیکن گزشتہ شواہد کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا جائز معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب اسلامی مملکت نے ملک گیر اور مرکزی مالی پالیسی اپنائی تھی تو مرکزی عرب کے تمام غیر مسلم طبقات کو بھی جزیہ ادا کرنا پڑا ہوگا اور یحییٰ بن آدم کے حوالے سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ ان علاقوں کے لیے بھی ایک دینار فی کس سالانہ جزیہ کی معیاری شرح رہی ہوگی۔ ممکن ہے کہ بعض دستکار یا زراعت پیشہ طبقات سے نقد کے بجائے کسی جنس میں جزیہ وصول کیا گیا ہو۔ جنس کی صورت میں جزیہ کی شرح معیاری ربع یا ۱/۴ معلوم ہوتی ہے۔ بعض حالات میں جزیہ کی رقم نقد اور جنس دونوں صورتوں میں لی جاسکتی تھی اور اس کی اقساط بھی کی جاسکتی تھیں اگر جزیہ اجتماعی طور سے وصول کیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کا مالی سال چھ چھ ماہ کے دو وقفوں میں منقسم تھا۔ پہلا وقفہ صفر اور رجب کے درمیان تھا اور دوسرا رجب تا محرم۔ رجب مالی سال کا آغاز معلوم ہوتا ہے جزیہ کی بروقت ادائیگی وفاداری کی علامت اور عدم ادائیگی یا کوتاہی عہد شکنی کے مترادف تھی۔ جزیہ ادا کرنے والوں کو اصطلاحاً ذمی یا اہل الذمہ کہا جاتا تھا کہ ان کی جانوں اور مالوں کی حفاظت کی ضمانت اسلامی ریاست کی ذمہ داری متصور ہوتی تھی۔

جہاں تک غیر مسلم طبقات سے جزیہ وصول کرنے کے مسئلہ کا تعلق ہے مذکورہ بالا بیان و مباحثہ کی بنیاد پر ہم ذرا قطعیت کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مقامی سردار و شیوخ یا حکمراں اور بادشاہ جیسا بھی علاقائی نظم و نسق ہو اپنے علاقے کے ذمیوں سے اس کی وصولیابی کے ذمہ دار ہوتے تھے اور جمع شدہ رقوم کو وہ اپنے علاقے میں تعینات مرکزی محصلین و عاملینِ صدقات یا مرکزی منتظمین کے حوالے کر دیتے تھے جو ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پہنچاتے تھے۔ ہم گزشتہ بحث

میں حضرات منذر بن ساوٰی اور جیفر و عبد کے بحرین و عمان کے علاقوں کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں۔ اسی طرح ہم نجران کے عیسائیوں، یمن کے حکمران حضرت زرعہ، حضرموت کے اقیال، یوحنا اور دوسرے سرداتِ ایلہ، دومہ کے اکیدر وغیرہ متعدد دوسرے مقامی حکمرانوں، شاہوں اور مقامی شیوخ کے اپنے غیر مسلم اور ذمی طبقات رعایا سے جزیہ کی وصولیابی اور پھر اس کی رقوم کی مرکزی منتظمین کے سپرد حوالگی کی تاریخی اور واقعاتی شہادتیں بھی دیکھ چکے ہیں۔ کتانی کا یہ بیان کہ حضرات معاذ بن جبل اور ابو عبیدہ بن جراح جزیہ کی وصولیابی کے ذمہ دار تھے جامع و مکمل نہیں ہے۔[۱۹۳] اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے اپنے علاقوں میں یہ دونوں افسرانِ حکومتِ نبوی مقامی منتظمین کی جمع کردہ رقوم کو وصول کرکے مدینہ روانہ کرتے تھے۔ ورنہ یہ حقیقت ظاہر و باہر ہے کہ صرف یہی دونوں مرکزی منتظمین نہیں تھے بلکہ ان کے علاوہ متعدد اور بھی تھے جو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف خطوں میں بکھرے ہوئے اپنے فرائض منصبی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔ ہم ان افسران و عمال حکومت الٰہی پر بحث کچھ دیر بعد ایک الگ فصل میں کریں گے۔

(س) صدقات

صدقات دراصل ایک وسیع ترعمومی اصطلاح ہے جو متعدد محاصلِ مذہبی کے مجموعہ کو محیط ہے۔ یہ تمام محاصل جیسے زکوٰۃ، عشر، نصف العشر، عشور وغیرہ مسلمان بطور ایک مذہبی فریضہ کے ادا کرتے تھے۔ صدقہ/صدقات میں لازمی اور نفلی دونوں طرح کے عطیات شامل تھے۔ قرآن کریم میں متعدد ایسی آیات ہیں جو صدقات اور زکوٰۃ کو بالترتیب مذہبی تقرب و مرضیِ الٰہی اور فریضۂ خداوندی کے بطور بیان کرتی ہیں۔ زکوٰۃ یعنی لازمی مالی فریضہ کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ قرآنِ کریم کی آیات عموماً نماز (صلوٰۃ) کے ساتھ زکوٰۃ کے حکم کو بھی حاوی ہیں۔[۱۹۴] پھر اسلامی تعلیمات محض مالی فریضہ کی ادائیگی پر ہی بس نہیں کرتیں بلکہ نفل صدقات پر بھی ابھارتی ہیں۔ اللہ کے راستے میں خرچ کرنا جو دراصل امتِ اسلامی کے مفاد میں اصلاً اور انسانیت کے مفاد میں ضمناً خرچ کرنا تھا اسلام میں ایک انتہائی پسندیدہ فعل ہے جس پر آخرت کے اجر و ثواب کے علاوہ دنیاوی فلاح و بہبود کا بھی وعدہ ہے۔ مسلم فقیہوں نے حدیث و تاریخ کی شہادتوں کی[۱۹۵] اساس پر بیان کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مرد و عورت مسلم پر جو آزاد، عاقل و بالغ اور مالکِ نصاب ہو اور جس کے مال پر سال گزر جائے زکوٰۃ کو بطور مالی فریضہ کے روشناس کیا تھا جس کی ادائیگی نماز یعنی بدنی عبادت و فریضہ کی مانند لازمی و ضروری تھی۔ زکوٰۃ نقد، زیور، مویشیوں اور پیداوار زمین پر مختلف شرحوں میں لی جاتی تھی۔ نقد بچت پر زکوٰۃ ۲ $\frac{1}{2}$ فیصد یا چالیسواں حصہ ($\frac{1}{40}$) ہے۔ جبکہ سونے اور چاندی پر مثقال کے اعتبار سے لی جانی چاہیے جو کہ عملاً اور شرح کے اعتبار سے نقد کے مانند ہے۔ البتہ مویشیوں پر زکوٰۃ ان کی جنس کے اعتبار سے مختلف ہے۔ ذیل میں پالتو مویشیوں پر زکوٰۃ کی مختلف شرحیں دی جا رہی ہیں جس سے یہ مسئلہ واضح ہو جائے گا۔

(۱) بھیڑ/بکری

نصاب	زکوٰۃ
۴۰ - ۱۲۰	ایک عدد بھیڑ / بکری
۱۲۱ - ۲۰۰	۲ 〃 〃
۲۰۱ - ۳۰۰	۳ 〃 〃
۳۰۰ کے بعد ہر سیکڑہ پر	۱ 〃 〃

(۲) اونٹ

نصاب		زکوٰۃ
۵ - ۱۰	۱	بھیڑ / بکری
۵ - ۱۵	۲	〃 〃
۱۵ - ۲۰	۳	〃 〃
۲۰ - ۲۴	۴	〃 〃
۲۵ - ۳۵	۱	نبت مخاض
۳۶ - ۴۵	۱	نبت لبون
۴۶ - ۶۰	۱	حقہ
۶۱ - ۷۵	۱	جزعہ
۷۶ - ۹۰	۲	نبت لبون
۹۱ - ۱۰۰	۲	حقہ
۱۲۰ کے بعد ہر ۵۰ پر	۱	حقہ
اور ہر ۴۰ پر	۱	نبت لبون

(۳) گائے

نصاب		زکوٰۃ
۳۰ گائیں	۱	جزع / جزعہ
۴۰ 〃	۱	مُسِنّہ (۱۹۶)

ظاہر ہے کہ مویشی پر یہ زکوٰۃ صرف ان جانوروں پر لگائی گئی تھی جو "تجارتی مقاصد" سے پالے جاتے تھے۔

زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ بیان کرتے ہوئے واقدی کہتے ہیں کہ وہ اراضی جس کی آب پاشی بہتے پانی (الغیل) سے کی جاتی تھی اس پر زکوٰۃ پیداوار کا دسواں حصہ ہوتا تھا جو اصطلاحاً "عُشر" کہلاتا تھا جبکہ ڈول / بالٹی (الغرب) سے سینچی جانے والی اراضی پر زکوٰۃ پانچ فیصد (۱/۲۰) ہوتی تھی جو "نصف العشر" کہلاتی تھی۔[۱۹۷] پیداوار کا نصاب کم از کم ۵ وسق ہوتا ہے جیسا کہ اکثر فقہاء کا خیال ہے۔[۱۹۸]

مذکورہ بالا پیداواری شرح زکوٰۃ نظریاتی یا اصولی ہے۔ واقدی کے بیان سے اس کی واقعاتی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یحییٰ بن آدم کی بیان کردہ دو روایتوں سے کسی حد تک مزید ثبوت ملتا ہے کہ عہدِ نبوی میں زکوٰۃ کی وصولیابی کا ایک باقاعدہ نظام تھا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت معاذ بن جبل کو جب یمن اور حضر موت وغیرہ کے شمالی خطوں کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا تھا تو ان کو ہدایت نبوی تھی کہ وہ گیہوں (الحنطة)، جَو (الشعیر)، کھجور (النخل) اور انگور (العنب) کی پیداوار سے "صدقہ" وصول کریں۔[۱۹۹] ایک دُوسری روایت کے مطابق (جو اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ وہ عہدِ نبویؐ کے ایک اہم واقعہ پر روشنی ڈالتی ہے اور جس کو عام طور سے شہرت حاصل نہیں ہے) حضرت معاذ بن جبل کو "قریٰ عربیہ" کے علاقے سے زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ (حظ الارض) وصول کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔[۲۰۰] بلاذری اور ابو داؤد کا متفقہ بیان ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عتاب بن اسید اُموی کو مکہ پر گورنر (والی) مقرر کرنے کے علاوہ ثقیف کے علاقوں سے ان کی (مکہ والوں کی) کھجور اور انگور کی پیداوار کے تخمینہ اور صدقات کا بھی عامل مقرر کیا تھا۔[۲۰۱] بلاذری کا مزید بیان ہے کہ مشہور مؤذنِ رسولؐ حضرت بلال حبشی پھلوں کی پیداوار پر وصول کئے گئے صدقات کے افسر تھے۔[۲۰۲] یہ چند مثالیں ہیں ان محاصل کے مجموعہ کی جو "صدقات" کی وسیع تر اصطلاح سے معروف تھے۔ ان کے علاوہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد گرامی ناموں میں زکوٰۃ، صدقہ / صدقات، عشر، عشور، نصف العشر وغیرہ کے حوالے بکثرت ملتے ہیں[۲۰۳] جیسا کہ ہم ابھی مطالعہ کریں گے۔

مستشرقین کے تصور و نظریۂ زکوٰۃ[۲۰۴] کے برخلاف ہم کو عہدِ نبویؐ میں زکوٰۃ کے ارتقاء اور تکمیل کے متعدد ثبوت متواتر ماخذ میں ملتے ہیں۔ دوسرے شواہد کے علاوہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرامی نامے بلاشک وشبہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ زکوٰۃ عہدِ نبویؐ میں ایک "قانونی مذہبی محصول" بن چکا تھا جو مالدار مسلمانوں کے لیے لازمی تھا۔ مکتوباتِ نبوی میں صرف زکوٰۃ کے لازمی ہونے کی شہادت نہیں ملتی بلکہ مسلم طبقات کے ایمان کی شہادت زکوٰۃ کی ادائیگی کو قرار دیا گیا ہے۔ اس قسم کے حوالے اور ہدایات حسب ذیل حکمرانوں اور منتظمین کے نام مکتوبات رسولؐ میں ملتے ہیں:

۱۔ حضرت فروہ بن عَمرو، عامل معن

۲۔ حضرت صیفی بن عامر سردار بنی ثعلبہ / غسان

۳۔ مسلمانانِ قبیلۂ بنی حدس / لخم

۴۔ مسلمانان و سرداران بنو الحارث / بنو نہد

۵۔ حضرات حارث، نُعیم اور نعمان جو یمن کی تین چھوٹی چھوٹی مملکتوں کے حکمران اور مقامی منتظم تھے۔

۶۔ قبیلۂ ازد کے متعدد مختلف طبقات

۷۔ قبیلۂ اسلم

۸۔ قبیلہ طے وغیرہ۔ [۲۰۵]

مستشرقین کے خیالِ خام کی تردید کے لیے وہ مکتوباتِ نبویؐ بڑے اہم ہیں جو نہ صرف زکوٰۃ کا لازمی فریضہ ہونا ثابت کرتے ہیں بلکہ زکوٰۃ، صدقہ، عشر اور نصف العشر کی مقرر کردہ شرحوں اور تناسب کا بھی برملا ذکر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مذکورہ بالا تین شاہانِ یمن کے خطوط کے جواب میں جو گرامی نامہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا تھا اس میں زمین کی پیداوار پر عشر اور نصف العشر کے علاوہ مویشیوں کی شرحیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ اسی ضمن میں حضرت زرعہ والیِ یزن کے نام مکتوب نبوی زیادہ اہم ہے کیونکہ وہ زکوٰۃ اور صدقہ سے متعلق بعض امور پر کافی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتا ہے۔ پہلے وہ حضرت زرعہ سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تمام جمع شدہ رقوم کو مدینہ بھیج دیں۔ پھر یہ بیان کرتا ہے کہ "صدقہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے خاندان والوں (اھل البیت) کے لیے جائز نہیں ہے' زکوٰۃ کو غریب مسلمانوں اور مسافروں میں تقسیم کرنا چاہیے۔"[۲۰۶] خثعم کے مسلمانوں کے نام مکتوب نبوی میں تحریر ہے کہ ان کے تمام مسلمان کاشتکاروں کو خواہ وہ نرم زمین (جناس) پر کاشت کرتے ہوں یا سخت زمین (عَزاز) پر، اپنی ان تمام فصلوں پر ۱/۱۰ (عشر) دینا ہے جو آبِ رواں (سیاح) سے سیراب کی گئی ہوں اور نصف العشر (۱/۲۰) دینا ہے جو ڈول / بالٹی (غراب) سے سینچی گئی ہوں۔[۲۰۷] اسی طرح عمان کے قبائل ثمالہ اور حدان سے بھی ان کی پیداوار پر عشر کا مطالبہ کیا گیا تھا۔[۲۰۸] ان کے معاملہ میں یہ امر بڑا اہم ہے کہ ان کو اپنی پیداوار میں دس وسق پر ایک وسق دینے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ یہ زکوٰۃِ ارض کا مقررہ تناسب تھا جو "قانونی زکوٰۃ" یا "لازمی مذہبی محصول" کا واضح ترین ثبوت تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ کا جو نصاب بعد کے فقہائے نے مقرر کیا تھا اس کی بنیاد بعد کے مسلم حکمرانوں کے عمل پر نہیں تھی بلکہ اس کی اساس سنتِ نبوی تھی۔ صدقہ اور عشور کے بارے میں حضرت منذر بن ساوٰی کے حوالے پہلے گزر چکے ہیں۔ یہاں اس مکتوب نبویؐ کا ذکر البتہ مناسب معلوم ہوتا ہے جس کے مطابق رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمان اور بحرین کے مسلمانوں سے ان کی کھجور کی پیداوار پر زکوٰۃ یعنی عشر اور ان کے اناج کی پیداوار پر نصف العشر کا مطالبہ کیا گیا تھا۔[۲۰۹] ایک اور گرامی نامہ میں بحرین کے طاقتور قبیلہ عبد القیس کو ممانعت کی گئی تھی کہ وہ اپنے پھلوں کی پیداوار (حریم الثمار) کو پک جانے کے بعد نہ روکا کریں۔[۲۱۰] اسی طرح حضرموت کے اقیال کو ان کی اراضی کی پیداوار پر عشر کی بلاتاخیر ادائیگی کا حکم دیا گیا تھا۔[۲۱۱]

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف گرامی ناموں، مراسلات اور معاہدات سے مسلمان طبقات پر ان کے مویشیوں میں متناسب قانونی محصول یا قانونی مذہبی زکوٰۃ کی فرضیت و ادائیگی کا ثبوت ملتا ہے۔ مذکورہ بالا معاہدات و رسالات نبوی کے علاوہ جن میں ضمناً مویشیوں پر "صدقہ" یا "زکوٰۃ" کا ذکر آیا ہے۔ ذیل میں ہم ان مکتوباتِ نبویؐ کا ذکر کرتے ہیں جن میں مویشیوں پر زکوٰۃ کی تفصیلات باقاعدہ ملتی ہیں۔ قبیلہ اسلم کے علاوہ متعدد دوسرے بدوی قبیلوں کے پاس جو ساحلی مقامات پر آباد تھے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط موجود تھے جن میں ان کے "مواشی" پر "صدقہ" یا "فرائض" (حصّوں) کا ذکر تھا۔[۲۱۲] قبیلہ باہلہ اور ان تمام لوگوں کو جو بیشہ نامی

علاقے میں آباد تھے حسب ذیل شرح سے جانوروں کی زکوٰۃ ادا کرنی تھی :

مویشیوں کی تعداد / نصاب	زکوٰۃ
۳۰ گائیں	ایک فارض (کافی عمر کی گائے)
۴۰ بھیڑ / بکری (الغنم)	ایک عُتُود (ایک عمر رسیدہ بکری / بھیڑ)
۵ اونٹ	ایک ساغیہ مسنہ (ایک معمر اونٹ) [۲۱۳]

دومہ اور کلب کے لوگوں کو اپنے مویشیوں پر یہی زکوٰۃ ادا کرنی تھی۔ اس کے علاوہ عُشر اور نصف عشر بھی اپنی پیداوار پر ادا کرنا تھا۔[۲۱۴] حضرت عمرو بن حزم کے نامۂ تقرر میں نجران کے قبیلہ بنو الحارث بن کعب کے مویشیوں اور اراضی کی پیداوار پر حسب ذیل قانونی واجب زکوٰۃ بیان کی گئی ہے :

۱۔ پیداوار (العقار) پر عشر بشرطیکہ چشموں اور بارش کے پانی (العین والسماء) سے سینچائی کی گئی ہو۔
۲۔ پیداوار پر نصف العشر بشرطیکہ بالٹیوں یا ڈولوں سے آبپاشی کی گئی ہو۔
۳۔ ہر دس اونٹوں پر ۲ بھیڑ / بکری، اور ہر بیس اونٹوں پر چار بھیڑ / بکری زکوٰۃ۔
۴۔ ہر چالیس سے زیادہ گایوں پر ایک گائے، جبکہ ہر تیس گایوں پر ایک تبیع / تبیعہ یا جزعہ۔
۵۔ ہر چالیس بھیڑ / بکریوں (الغنم) پر ایک بھیڑ / بکری۔[۲۱۵]

"یہ تمام صدقہ ان کے (مسلمانوں کے) مالوں پر خدا کی جانب سے فرض قرار دیا گیا ہے" جیسا کہ مکتوب نبوی میں آخر میں بیان ہے۔[۲۱۶] یہ اور ان جیسے متعدد دستاویزات سے جو مآخذ میں پائی جاتی ہیں یہ حتمی شہادت ملتی ہے کہ عہدِ نبوی ہی میں "صدقہ" یا "زکوٰۃ" کا تناسب اور شرح مقرر ہو چکی تھی اور اس کو ریاست اسلامی کے تمام مسلمانوں سے وصول بھی کیا جاتا تھا۔

عمال الصدقات (افسرانِ محصول)

صدقات اور جزیہ کی فرضیت کے بارے میں عام طور سے مسلم فقہاء اور علماء کا یہ خیال ہے کہ وہ فتح مکہ کے بعد کسی وقت روبہ عمل ہوئی تھی جب قرآن کریم کی متعلقہ آیت کریمہ کا نزول ہوا تھا جس کے مطابق خدائے ذوالجلال نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا تھا کہ "ان کے مالوں سے صدقہ لیجئے اور ان کو اس کے ذریعہ پاک و صاف کیجئے ....."۔[۲۱۷] طبری کا بیان ہے کہ یہ آیت کریمہ سنہ ۹ھ / سنہ ۶۳۰-۳۱ء میں کسی وقت نازل ہوئی تھی اور اسی بناء پر صدقہ "اس برس" فرض ہوا تھا۔[۲۱۸] تقریباً یہی دعویٰ جزیہ کی فرضیت کے بارے میں کیا جاتا ہے۔

لیکن تاریخی حقایق سے معلوم ہوتا ہے کہ محاصل کی فرضیت اور وصولیابی دونوں اس سے کئی برس قبل شروع ہو چکی تھیں۔ دومۃ الجندل کے علاقے میں آباد بنو کلب کے عیسائیوں نے سنہ ۶ھ / سنہ ۶۲۷ء میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو جزیہ ادا کیا تھا۔

۴ھ کے آغاز اور ۶۲۵ء کے وسط میں تیماء کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے یہودی کاشتکاروں نے "جزیہ" اسلامی ریاست کو دینا شروع کیا تھا جبکہ خیبر، فدک اور وادی القریٰ کے یہودی مزارعین نے اپنی پیداوار کا نصف جو اصطلاحاً اور معناً "خراج" تھا ادا کیا تھا۔ البتہ زکوٰۃ کی وصولیابی کی تاریخ مآخذ سے عملاً ثابت نہیں ہوتی اس لیے اس باب میں حتمی طور سے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ قرینہ یہی ہے کہ "صدقات" بھی لازمی طور سے فتح مکہ سے قبل وصول کیے جانے لگے تھے۔ اس سلسلہ میں چند مثالیں کافی ہوں گی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خیبر، فدک، وادی القریٰ اور تیماء کے علاوہ "قریٰ عربیہ" کے والی ۸ھ / ۶۲۹ء میں مقرر ہو چکے تھے ان کے من جملہ فرائض میں سے صدقات کی وصولیابی بھی تھی۔ حضرت ولید بن عقبہ اموی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ بنو مصطلق کے قبولِ اسلام کے "دو برس بعد" ان کو اس قبیلہ کا عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو مصطلق کا خاصا بڑا طبقہ (اگر اکثریت نہیں) ۵ھ میں اسلام قبول کر چکا تھا۔ اس لحاظ سے حضرت ولید اموی کی تقرری کا زمانہ ۷ھ / ۶۲۹ء بنتا ہے قریٰ عربیہ کے سلسلہ میں دلچسپ روایت یہ ہے کہ یمن جانے سے قبل حضرت معاذ بن جبل وہاں کے عامل صدقات مقرر کئے گئے تھے اور وہ حقیقتاً وہاں سے زمین کی پیداوار کی زکوٰۃ وصول کر کے لائے تھے اور یہ غالباً ۹ھ سے قبل کا واقعہ ہے۔ طبری کا حتمی بیان ہے کہ حضرت عمرو بن عاص سہمی کی عمان کو بطور عامل صدقات (مرکزی منتظم) روانگی ۸ھ / ۶۳۰ء میں فتح مکہ کے معاً بعد ہوئی تھی۔(۲۱۹) ان شواہد کی بنیاد پر یہ کہنا مناسب و جائز معلوم ہوتا ہے کہ صدقات کی بالعموم اور جزیہ و خراج کی بالخصوص وصولیابی ۴ھ کے آغاز / وسط ۶۲۵ء میں شروع ہو چکی تھی۔ اور اس طرح اسلامی ریاست نے اپنے باشندوں سے اپنے مصارف کے لیے محاصل وصول کرنے کی پالیسی کا آغاز کر دیا تھا۔

صدقات و محاصل کی وصولیابی کا گہرا تعلق وصولیابی کے افسروں کی تقرری کے نظام سے تھا۔ اگرچہ "ولایات" کے والی ان کی وصولیابی اور صدرِ مقامِ ریاستِ اسلامی کو روانگی کے ذمہ دار تھے تاہم ان کے جمع و وصول کا ایک الگ، مکمل اور جامع نظام تھا جو عہدِ نبوی میں وقوع پذیر ہوا اور رفتہ رفتہ تکمیل کے مدارج طے کرتا ہوا کمال کو پہنچا۔ محاصل ادا کرنے والوں سے صدقات اور جزیہ وصول کرنے کے لیے خاص افسر مقرر کیے جاتے تھے جن کے مختلف نام تھے۔ سب سے زیادہ معروف و عام لفظ "عامل" ہے اور قرآن کریم نے یہی لفظ استعمال کیا ہے۔ کبھی کبھی شبہ کے ازالہ اور مزید توضیح کے لیے مآخذ "عامل صدقات" یا "عمال الصدقات" یا "عاملین صدقات" یعنی صدقات کی اضافہ و اضافت کے ساتھ بھی استعمال کرتے ہیں کیونکہ لفظ عامل وسیع تر عمومی معنی میں استعمال ہوتا ہے جس سے مراد محاصل وصول کنندہ کے علاوہ گورنر، والی، منتظم، سرکاری افسر وغیرہ سبھی کچھ ہو سکتا ہے۔ تاریخی مآخذ میں مختلف اصطلاحیں اور الفاظ استعمال ہوتے ہیں جیسے مُصَدِّق (مُصَدِّقِین)، سَاعِیْ (سُعَاۃ)، جَابِی (جُبَاۃ) مُحَصِّلْ (محصلین) وغیرہ۔ ان کے علاوہ مخصوص اصطلاحات کا استعمال بھی مآخذ میں مفقود نہیں ہے جیسے صاحب العشور (عشر کا افسر)، ولاۃ علی الجزیۃ (جزیہ کے افسر)، صاحب الخراج (خراج کا افسر) وغیرہ۔(۲۲۰)

مآخذ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محاصل و صدقات کی وصولیابی کا نظام درجہ بندی پر مشتمل اور دوہرا تھا۔ ہر علاقے (ولایت) یا قبیلہ میں کچھ مقامی محصلین ہوتے تھے جو محاصل دہندوں سے براہِ راست صدقات و جزیہ وصول کرتے تھے۔

یہ مقامی افسرانِ صدقات ہوتے تھے۔ مرکزی سطح پر ریاستِ اسلامی کی نمائندگی کرنے والے افسرانِ صدقات ان مقامی افسروں سے جمع شدہ رقوم وصول کر کے مرکز پہنچاتے یا اس کی ہدایات کے مطابق صرف کرتے تھے۔ پہلے ہم مرکزی افسرانِ صدقات کے نظام سے بحث کریں گے۔

(۱) مرکزی عاملینِ صدقات

ایسے تمام عاملینِ صدقات جن کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم براہِ راست اس عہدہ پر مقرر کر کے مدینہ سے بھیجتے تھے اور ان کو مختلف علاقوں اور قبیلوں میں تعینات کرتے تھے اس زمرے میں آتے ہیں۔ عام طور سے ان مرکزی افسروں کا علاقائی یا قبائلی تعلق اپنی تقرری کے علاقوں سے نہیں ہوتا تھا۔ ان میں اور مقامی عاملینِ صدقات میں واضح امتیاز موجود ہوتا تھا۔ یہ مرکزی افسر اپنے اپنے علاقوں یا قبیلوں کے صدر مقام پر قیام پذیر رہتے تھے اور براہِ راست صدقات دہندوں سے رابطہ نہیں رکھتے تھے۔ وہ صرف مقامی افسرانِ صدقات سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسری جانب مقامی صدقات کے عاملین اپنے لوگوں سے صدقات وصول کرتے تھے اور ان کی مجموعی رقوم اپنے متعلقہ مرکزی افسروں کے حوالے کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی مقامی عاملینِ صدقات مرکزی افسروں کا کام کرتے تھے اور جمع شدہ رقوم خود لے کر مدینہ منورہ پہنچ جاتے تھے۔

تمام مرکزی عاملینِ صدقات کو (اور مقامی افسروں کو بھی) عام طور سے ایک پروانۂ تقرری ملتا تھا جس میں نہ صرف عاملین کے لیے ہدایات واحکام درج ہوتے تھے بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی ہدایات ہوتی تھیں جن کے پاس وہ بھیجے جاتے تھے۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مکتوب مشترکہ طور پر قضاعہ کے سعد ہذیم اور جذام کو عطا فرمایا تھا جس میں "صدقہ" کے فرائض بیان کیے گئے تھے اور ان سے یہ بھی مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنے تمام "صدقہ اور خمس" دو سفیران و افسرانِ نبوی حضرات ابی بن کعب اور عنبسہ کو ادا کر دیں۔[۲۲۱] اسی طرح کی ہدایات حضرات عمرو بن حزم اور وائل بن حجر حضرمی کے پروانوں میں تحریر تھیں۔ واضح رہے کہ یہ دونوں مذکورہ بالا افسر بالترتیب نجران اور حضر موت کے مرکزی اور مقامی عاملین بھی تھے۔ اسی طرح کی ہدایات نبوی متعدد دوسرے مراسلاتِ نبوی میں بھی مندرج تھیں جن میں کچھ کا مطالعہ ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ عاملینِ صدقات کو کچھ اخلاقی ہدایات بھی دی جاتی تھیں جو اسلامی مزاجِ حکومت کی بہتر نمائندگی کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر صدقات کے افسروں کو حکم تھا کہ وہ لوگوں کی دولت کا خواہ وہ مویشیوں کی شکل میں ہو یا نقد و جنس کی صورت میں، کا بہترین حصہ (کرائم اموالہم) صدقہ و جزیہ میں وصول نہ کیا کریں، ان پر ظلم و ستم نہ کریں، ان کا استحصال نہ کریں، واجب صدقہ/رقم/تعداد و مقدار سے زیادہ وصول نہ کریں یا ناجائز طریقے نہ اختیار کریں۔[۲۲۲] اسی طرح ان کو یہ بھی حکم تھا کہ وہ لوگوں کے چراگاہوں (مراعی) (اور گھروں سے) صدقہ وصول کریں۔[۲۲۳] اس کا مطلب یہ تھا کہ عاملینِ صدقات خود محاصل دہندوں کے پاس جایا کریں اور ان کو اپنے پاس اپنے پڑاؤ پر آنے کی زحمت نہ دیا کریں۔

یہ اور ایسی دوسری ہدایات نے فرض شناسی اور ایمان قلب کے جوہر کے ساتھ مل کر صدقات و جزیہ کی ادائیگی کو عوام کے لئے ایک خوشگوار فرض بنا دیا تھا جس میں تلخی سے زیادہ خوشدلی، بوجھ سے زیادہ تعاون اور کدورت سے زیادہ مسرت کا احساس

شامل تھا۔

یہ امر کہ عاملینِ صدقاتِ نبوی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی مکمل تعمیل کرتے تھے حدیث وسنت کے متعدد ماٰخذ کی روایات سے ثابت ہوتا ہے۔ نسائی نے حضرت سُوَید بن غفلہ کی روایت بیان کی ہے کہ ایک بار ان ـ کے پاس ایک مصدق آیا اور اس نے مویشیوں کی ان تمام اقسام کو بالتصریح بیان کیا جن کا صدقہ میں لینا ممنوع تھا۔ اسی موقعہ پر ایک صدقہ دہندہ ایک بہت عمدہ قسم کی اونٹنی صدقہ میں دینے کے لیے لایا مگر مصدق نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے بہترین" اموال" وصول کرنے سے احتراز کی ہدایت دی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک اوسط درجہ کا جانور قبول کیا۔[۲۲۴] اسی قسم کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ ایک بار دو عاملینِ صدقات ایک مسلمان کے پاس پہنچے جو اپنے جانور ایک چراگاہ میں چرا رہا تھا اور اس کے مویشیوں کا صدقہ اس سے طلب کیا۔ اس مسلمان نے ایک عمدہ دُودھاری بکری پیش کی مگر دونوں نے اس کو قبول کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ اعلیٰ نسل کی تھی۔ چنانچہ وہ ایک عام قسم کی بکری صدقہ میں لے کر چلے گئے۔[۲۲۵]

ماٰخذ سے واضح ہوتا ہے کہ مرکزی عاملینِ صدقات اکثر و بیشتر مستقل عہدہ دار ہوتے تھے۔ عام طور سے وہ ایک متعین علاقے میں یا متعین قبیلے کے افسرِ صدقات ہوتے تھے اور بعض حالات میں ان کے کام و کارکردگی کے علاقے بدل سکتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ اور منفرد معاملہ حضرت عمرو بن عاص سہمی کا ہے۔ فتح مکہ کے بعد ان کو عمان کا عاملِ صدقات بنا کر بھیجا گیا تھا (اور وہ مرکزی منتظم بھی تھے)۔ سنہ ۹ھ / سنہ ۶۳۰-۳۱ء میں ہم ان کو ہوازن کے علاقے سے صدقات وصول کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ اسی زمانے میں ایک اور روایت کے مطابق انہوں نے بنو فزارہ / غطفان کے صدقات بھی وصول کئے تھے۔ اس کے بعد ان کو قضاعہ کا عامل صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ ماٰخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافی عرصے تک اس علاقے میں مقیم اپنے فرائض انجام دیتے رہے تھے۔ پھر سنہ ۱۰ھ / سنہ ۶۳۱ء میں حجۃ الوداع کے بعد طبری کے بقول رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک بار پھر عمان روانہ کیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ فرائض کی انجام دہی کے بعد ان کو پھر ان کے پُرانے عہدے یعنی صدقاتِ قضاعہ کی افسری پر واپس بحال کر دیا جائے گا۔ اگرچہ عہدِ نبویؐ میں ان کی واپسی مدینہ منورہ نہیں ہو سکی تھی تاہم خلافتِ صدیقی کے اوائل میں وہ "صدقات عمان" لے کر مرکز پہنچے تھے اور خلیفۂ اوّل نے اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدہ کو شرطِ ایمان سمجھ کر وفا کیا تھا اور ان کو ان کے عہدۂ موعود پر بحال کر دیا تھا۔[۲۲۶] حضرت عمرو بن عاص سہمی کی مانند حضرات عنبسہ، عبّاد بن بشر، بُریدہ بن حصیب، رافع بن مکیث، ضحاک بن سفیان، عکرمہ بن ابی جہل، حُذَیفہ بن یمان، قُضاعی بن عمرو اور متعدد دوسرے ممتاز مرکزی عاملینِ صدقات تھے اور یہ تمام اپنے عہدوں پر مستقل طور سے وفاتِ نبویؐ کے وقت تک فائز رہے تھے۔[۲۲۷]

بعض مرکزی عاملوں کے معاملات میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے عارضی طور سے اسلامی ریاست کے شعبۂ مالیات میں کام کیا تھا۔ روایات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ انھوں نے ایک بار ہی صدقات کی وصولیابی کا کام کیا تھا۔ مثلاً حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی کو حضرموت کے قیل (شہزادے، حکمراں) حضرت وائل بن حُجر کے ساتھ ان کی مملکت میں بھیجا گیا تھا اور وہ وہاں کے صدقات وصول کر کے مدینہ واپس آ گئے تھے۔[۲۲۸] کسی بھی روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اُنھوں نے اس نوع کی اور کوئی خدمت کبھی اور انجام دی تھی۔

تاریخی مآخذ کا دعویٰ ہے کہ یمن کے قبیلۂ ازد کی ایک شاخ سے حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی نے صدقہ اور جزیہ وصول کر کے خدمت نبوی میں مکہ مکرمہ پہنچایا تھا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آخری حج کے لیے وہاں تشریف فرما تھے۔ فقہا و مورخین نے ایک "ہاشمی" کے صدقہ وصول کرنے کے "جواز" یا "صحت" پر کلام کیا ہے اور طرح طرح کی تاویلیں کی ہیں[۲۲۹]۔ حالانکہ حدیث و حکم نبوی کا منشا یہ ہے کہ کوئی ہاشمی "صدقہ" خود کھا نہیں سکتا مگر اس کی صرف وصولیابی میں کوئی قباحت نہیں۔ مزید برآں حضرت علی ہاشمی بطور مصدق بنیادی لحاظ سے یمن نہیں گئے تھے بلکہ وہ اصلاً معلّم و مبلّغ کی حیثیت سے گئے تھے اور واپسی میں ضمناً انھوں نے "صدقات" کے مرکز پہنچانے کا کام بھی انجام دے دیا تھا۔ جب تمیم کی ایک دشمن مدینہ شاخ نے خزاعہ کے خاندان بنو کعب سے صدقات وصول کرنے کی راہ میں حضرت بُسر بن سفیان کے لیے روڑے اٹکائے تھے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عُیینہ بن حصن فزاری کو مقرر کیا تھا اور انھوں نے نہ صرف "مانعین" کو سزا دی تھی بلکہ وفادار و مسلم خزاعیوں سے صدقات بھی وصول کر کے لائے تھے[۲۳۰]۔ ان مثالوں سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ عہدِ نبویؐ میں مرکزی عاملین صدقات کے دو طبقے تھے: ان میں سے اکثر و بیشتر مستقل عہدہ دار تھے جو برابر اپنے کام انجام دیتے رہتے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو عارضی طور سے صدقات کی وصولی کا کام بعض مخصوص سیاسی یا معاشی اسباب کی وجہ سے انجام دیتے تھے۔

مصدق یا عامل صدقات کے عہدہ پر تقرری کے لیے کچھ اوصاف درکار تھے اور کچھ شرائط کو پورا کرنا لازمی تھا۔ سب سے بڑا وصف تو بلا ریب صلاحیت و لیاقت تھی۔ علاقۂ تقرر کے جغرافیائی اور قبائلی حالات سے واقفیت بھی ایک اہم شرط ہو سکتی تھی اس کے علاوہ کسی حد تک اس علاقے کے لوگوں سے دوستی، تعارف اور قربت یا قرابت بھی اس عہدے پر تقرری کی سفارش کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ سب سے اہم شرط یہ تھی کہ کردار بیداغ، اخلاق بلند، حرص و طمع سے دور اور عہدے کے لالچ سے آزاد ہو۔ عاملِ صدقات ہونے کی ایک اہم شرط یہ بھی تھی کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان بنی ہاشم سے عہدہ دار یا امیدوار کا تعلق نہ ہو۔ چند مثالوں سے ان شرائط و اوصاف کا تاریخی ثبوت بھی مل جائے گا۔ ایک بار حضرت ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ دو شخص خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور اُنھوں نے آپ سے مصدق کے عہدے پر تقرری کی درخواست کی۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی اس باب میں رائے مانگی تو انھوں نے عرض کیا کہ وُہ نہیں جانتے تھے کہ وُہ دونوں حضرات اس نیت سے آپ کے پاس آئے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں امیدواروں کی درخواستِ تقرری رد کر دی اور فرمایا کہ "ہم ان لوگوں کو عُہدے نہیں دیتے جو ان کے طالب ہوتے ہیں۔" اس روایت کا دلچسپ حصّہ یہ ہے کہ کُچھ مدت کے بعد حضرت ابوموسیٰ اشعری کو بلا طلب یمن کے ایک بڑے علاقے کا والی مقرر کر دیا گیا جس کے فرائض میں صدقات کی وصولیابی بھی شامل تھی[۲۳۱]۔ ذکر آ چکا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رشتہ داروں کو مصدق کے عہدے پر مقرر کرنے کو غیر قانونی اور ناجائز قرار دے دیا تھا اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ پرمنفعت یا باتنخواہ عہدہ تھا اور اس کی تنخواہ دراصل صدقات ہی کا ایک حصّہ ہوتی تھی۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات کی رقم سے حاصل ہونے والی تنخواہ کو "وَنَس" (گندگی) اپنے خاندان والوں کے لیے اس لیے قرار نہیں دیا تھا کہ آپ ان کے لیے کسی امتیازی سماجی سلوک کے قائل تھے بلکہ اس کی اصل

حکمت یہ تھی کہ آپ اس "پرمنفعت عہدے" کا دروازہ اپنے خاندان والوں پر بند کرنا چاہتے تھے تاکہ آئندہ کی حکومتوں کو کان ہوجائیں اور دوسری جانب آپ کے خاندان والے (اھل البیت) مادی فوائد کے حصول کی خاطر حکومتی عہدوں کے پیچھے نہ بھاگیں۔ چنانچہ خیبر کی مہم کے دوران یا اس کے کچھ بعد واقدی کے بقول جب حضرات عبدالمطلب بن ربیعہ ہاشمی اور فضل بن عباس ہاشمی نے اپنے والدین کی خواہش و ہمت افزائی پر مصدق یا عامل صدقات کا عہدہ چاہا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست کو اس بنا پر ٹھکرا دیا کہ وہ "اہل بیت" میں سے تھے۔[۲۳۲] جہاں تک تقرری کے لیے دوسری صلاحیتوں، اوصاف اور شرائط کا تعلق تھا ان کا تصریحاً یا ضمناً ذکر پہلے بھی آچکا ہے اور بعد میں بھی مختلف مصدقین کے ذکر میں آتا رہے گا۔

عام طور پر مآخذ کا رجحان یہ ہے کہ وہ عہد نبوی میں عاملینِ صدقات کی تقرری کا زمانہ اور تاریخ یکم محرم ۹ھ / ۳۰ اپریل ۶۳۰ء بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس روزِ سعید کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ سے اپنی واپسی کے بعد جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لیے متعدد مرکزی عاملین صدقات روانہ فرمائے تھے۔[۲۳۳] لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عاملین صدقات کی یہ "پہلی تقرری" یا پہلی روانگی نہیں تھی۔ اور ظاہر ہے کہ وہ آخری تقرری بھی نہ تھی۔ مورخین نے اس سے عموماً یہ تاثر لیا ہے کہ محصلین کی یہ پہلی تقرری تھی ظاہر ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ تاثر یا دعویٰ غلط ہے کیونکہ اس تاریخ سے بہت پہلے صدقات کے افسر مقرر ہو چکے تھے۔ اس ضمن میں یہ تاریخی حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ مدنی حیات طیبہ کے دور دوم میں جب جب کوئی علاقہ یا قبیلہ اسلامی اُمت یا اسلامی ریاست کا حصہ بنا تب تب مرکزی اور مقامی عاملین صدقات کا تقرر عمل میں آیا تھا۔

اس خیال و حقیقت کی تصدیق طبری کے ایک بیان سے ہوتی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے امیروں اور صدقات کے عاملوں کو ان تمام علاقوں (اَلبُلدان) میں سے ہر ایک پر مقرر کیا تھا جو اسلام کے دائرۂ کار و حلقۂ اثر میں آگئے تھے (اَوطاہ الاسلام)۔[۲۳۴] ابن سعد اور ان کے استاد واقدی کی مرتب کردہ اس فہرستِ عاملینِ صدقات سے بھی اس کی ضمناً تائید ہوتی ہے جس کے مطابق محرم ۹ھ / اپریل ۶۳۰ء میں وہ بھیجے گئے تھے۔ واقدی کی روایت کے مطابق افسرانِ صدقات اور ان کے علاقے حسب ذیل تھے:[۲۳۵]

۱ - حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی	بنو اسلم اور بنو غفار
۲ - حضرت عباد بن بشر اشہلی	سلیم اور مزینہ
۳ - حضرت رافع بن مکیث جہنی	جہینہ
۴ - حضرت عمرو بن عاص سہمی	فزارہ
۵ - حضرت ضحاک بن سفیان کلابی	بنو کلاب وغیرہ
۶ - حضرت بسر بن سفیان کعبی	بنو کعب / خزاعہ
۷ - حضرت ابن اللتبیہ ازدی	بنو ذبیان
۸ - ایک نامعلوم صحابی (بنو سعد بن ہذیم کے فرد)	بنو سعد بن ہذیم

تاریخی ماخذ کا دعویٰ ہے کہ یمن کے قبیلۂ ازد کی ایک شاخ سے حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی نے صدقہ اور جزیہ وصول کر کے خدمت نبوی میں مکہ مکرمہ پہنچایا تھا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آخری حج کے لیے وہاں تشریف فرما تھے۔ فقہا و مورخین نے ایک "ہاشمی" کے صدقہ وصول کرنے کے "جواز" یا "صحت" پر کلام کیا ہے اور طرح طرح کی تاویلیں کی ہیں۔[۲۲۹] حالانکہ حدیث و حکم نبوی کا منشا یہ ہے کہ کوئی ہاشمی "صدقہ" خود کھا نہیں سکتا مگر اس کی صرف وصولیابی میں کوئی قباحت نہیں۔ مزید برآں حضرت علی ہاشمی بطور مصدق بنیادی لحاظ سے یمن نہیں گئے تھے بلکہ وہ اصلاً معلّم و مبلّغ کی حیثیت سے گئے تھے اور واپسی میں ضمناً انھوں نے "صدقات" کے مرکز پہنچانے کا کام بھی انجام دے دیا تھا۔ جب تمیم کی ایک دشمن مدینہ شاخ نے خزاعہ کے خاندان بنو کعب سے صدقات وصول کرنے کی راہ میں حضرت بُسر بن سفیان کے لیے روڑے اٹکائے تھے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عُیینہ بن حصن فزاری کو مقرر کیا تھا اور انھوں نے نہ صرف "مانعین" کو سزا دی تھی بلکہ وفادار و مسلم خزاعیوں سے صدقات بھی وصول کر کے لائے تھے۔[۲۳۰] ان مثالوں سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ عہدِ نبویؐ میں مرکزی عاملین صدقات کے دو طبقے تھے: ان میں سے اکثر و بیشتر مستقل عہدہ دار تھے جو برابر اپنے کام انجام دیتے رہتے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو عارضی طور سے صدقات کی وصولی کا کام بعض مخصوص سیاسی یا معاشی اسباب کی وجہ سے انجام دیتے تھے۔

مصدق یا عامل صدقات کے عہدہ پر تقرری کے لیے کچھ اوصاف درکار تھے اور کچھ شرائط کو پورا کرنا لازمی تھا۔ سب سے بڑا وصف تو بلاریب صلاحیت و لیاقت تھی۔ علاقۂ تقرر کے جغرافیائی اور قبائلی حالات سے واقفیت بھی ایک اہم شرط ہو سکتی تھی اس کے علاوہ کسی حد تک اس علاقے کے لوگوں سے دوستی، تعارف اور قربت یا قرابت بھی اس عہدے پر تقرری کی سفارش کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ سب سے اہم شرط یہ تھی کہ کردار بیداغ، اخلاق بلند، حرص و طمع سے دور اور عہدے کے لالچ سے آزاد ہو۔ عاملِ صدقات ہونے کی ایک اہم شرط یہ بھی تھی کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان بنی ہاشم سے عہدہ دار یا امیدوار کا تعلق نہ ہو۔ چند مثالوں سے ان شرائط و اوصاف کا تاریخی ثبوت بھی مل جائے گا۔ ایک بار حضرت ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ دو شخص خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور اُنھوں نے آپ سے مصدق کے عہدے پر تقرری کی درخواست کی۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی اس باب میں رائے مانگی تو انھوں نے عرض کیا کہ وُہ نہیں جانتے تھے کہ وُہ دونوں حضرات اس نیت سے آپ کے پاس آئے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں امیدواروں کی درخواستِ تقرری رد کر دی اور فرمایا کہ "ہم ان لوگوں کو عُہدے نہیں دیتے جو ان کے طالب ہوتے ہیں"۔ اس روایت کا دلچسپ حصہ یہ ہے کہ کُچھ مدت کے بعد حضرت ابوموسیٰ اشعری کو بلاطلب یمن کے ایک بڑے علاقے کا والی مقرر کر دیا گیا جس کے فرائض میں صدقات کی وصولیابی بھی شامل تھی۔[۲۳۱] ذکر آ چکا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رشتہ داروں کو مصدق کے عہدے پر مقرر کرنے کو غیر قانونی اور ناجائز قرار دے دیا تھا اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ پرمنفعت یا باتنخواہ عہدہ تھا اور اس کی تنخواہ دراصل صدقات ہی کا ایک حصہ ہوتی تھی۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات کی رقم سے حاصل ہونے والی تنخواہ کو "دَنَس" (گندگی) اپنے خاندان والوں کے لیے اس لیے قرار نہیں دیا تھا کہ آپ ان کے لیے کسی امتیازی سماجی سلوک کے قائل تھے بلکہ اس کی اصل

حکمت یہ تھی کہ آپ اس "پرمنفعت عہدے" کا دروازہ اپنے خاندان والوں پر بند کرنا چاہتے تھے تاکہ آئندہ کی حکومتوں کو کان ہوجائیں اور دوسری جانب آپ کے خاندان والے (اہل البیت) مادی فوائد کے حصول کی خاطر حکومتی عہدوں کے پیچھے نہ بھاگیں۔ چنانچہ خیبر کی مہم کے دوران یا اس کے کچھ بعد واقدی کے بقول جب حضرات عبدالمطلب بن ربیعہ ہاشمی اور فضل بن عباس ہاشمی نے اپنے والدین کی خواہش و ہمت افزائی پر مصدق یا عامل صدقات کا عہدہ چاہا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست کو اس بنا پر ٹھکرا دیا کہ وہ "اہل بیت" میں سے تھے۔[۲۳۲] جہاں تک تقرری کے لیے دوسری صلاحیتوں، اوصاف اور شرائط کا تعلق تھا ان کا تصریحاً یا ضمناً ذکر پہلے بھی آچکا ہے اور بعد میں بھی مختلف مصدقین کے ذکر میں آتا رہے گا۔

عام طور پر مآخذ کا رجحان یہ ہے کہ وہ عہد نبوی میں عاملینِ صدقات کی تقرری کا زمانہ اور تاریخ یکم محرم ۹ھ / ۳۰ اپریل ۶۳۰ء بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس روزِ سعید کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ سے اپنی واپسی کے بعد جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لیے متعدد مرکزی عاملین صدقات روانہ فرمائے تھے۔[۲۳۳] لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عاملین صدقات کی یہ "پہلی تقرری" یا پہلی روانگی نہیں تھی۔ اور ظاہر ہے کہ وہ آخری تقرری بھی نہ تھی۔ مورخین نے اس سے عموماً یہ تاثر لیا ہے کہ محصلین کی یہ پہلی تقرری تھی ظاہر ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ تاثر یا دعویٰ غلط ہے کیونکہ اس تاریخ سے بہت پہلے صدقات کے افسر مقرر ہو چکے تھے۔ اس ضمن میں یہ تاریخی حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ مدنی حیات طیبہ کے دور دوم میں جب جب کوئی علاقہ یا قبیلہ اسلامی اُمت یا اسلامی ریاست کا حصہ بنا تب تب مرکزی اور مقامی عاملین صدقات کا تقرر عمل میں آیا تھا۔

اس خیال و حقیقت کی تصدیق طبری کے ایک بیان سے ہوتی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے امیروں اور صدقات کے عاملوں کو ان تمام علاقوں (البُلدان) میں سے ہر ایک پر مقرر کیا تھا جو اسلام کے دائرۂ کار و حلقۂ اثر میں آگئے تھے (اَوْطاۃ الاسلام)۔[۲۳۴] ابن سعد اور ان کے استاد واقدی کی مرتب کردہ اس فہرستِ عاملینِ صدقات سے بھی اس کی ضمناً تائید ہوتی ہے جس کے مطابق محرم ۹ھ / اپریل ۶۳۰ء میں وہ بھیجے گئے تھے۔ واقدی کی روایت کے مطابق افسرانِ صدقات اور ان کے علاقے حسب ذیل تھے:[۲۳۵]

۱۔ حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی	بنو اسلم اور بنو غفار
۲۔ حضرت عباد بن بشر اشہلی	سلیم اور مزینہ
۳۔ حضرت رافع بن مکیث جہنی	جہینہ
۴۔ حضرت عمرو بن عاص سہمی	فزارہ
۵۔ حضرت ضحاک بن سفیان کلابی	بنو کلاب وغیرہ
۶۔ حضرت بسر بن سفیان کعبی	بنو کعب / خزاعہ
۷۔ حضرت ابن اللتبیہ ازدی	بنو ذبیان
۸۔ ایک نامعلوم صحابی (بنو سعد بن ہذیم کے فرد)	بنو سعد بن ہذیم

ابنِ سعد نے اپنے استاد کی مذکورہ بالا فہرست کی تائید کرتے ہوئے صرف ایک اور مصدق کا اضافہ کیا ہے۔ چنانچہ ان کے مطابق حضرت عُیینہ بن حصن فزاری کو بنو تمیم کے لیے اسی زمانہ بلکہ اسی دن روانہ کیا گیا تھا۔[۲۳۶] اس فہرست عاملین صدقات سے بعض بڑے دلچسپ نکات روشنی میں آتے ہیں۔ یہ کس قدر دلچسپ اور اہم حقیقت ہے کہ مذکورہ بالا تمام صدقات دہندہ قبیلوں کا تعلق اسلامی ریاست کے مرکزی علاقوں سے تھا۔ ان میں سے غالب اکثریت ان کی تھی جو قدیم مدنی دور کے مسلم تھے۔ اس کے علاوہ بیشتر عاملین صدقات کا تعلق انھیں صدقات دہندہ قبیلوں سے تھا، اگرچہ کچھ "آفاقی" یا "غیر ملکی" بھی تھے۔

طبری کی فہرستِ امیران و عاملینِ صدقاتِ عہدِ نبوی میں جن افسروں کے نام شامل تھے وہ اور ان کے علاقے حسب ذیل ہیں:

۱ - حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومی	صنعاء
۲ - حضرت زیاد بن لبید بیاضی	حضرموت
۳ - حضرت عدی بن حاتم طائی	طے اور اسد
۴ - حضرت مالک بن نویرہ تمیمی	بنو یربوع / تمیم
۵ - حضرت علاؔ بن حضرمی	بحرین
۶ - حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی	نجران
۷، ۸ - دو گمنام صحابہ کرام	بنو سعد[۲۳۷]

یہ فہرست نہ صرف یہ کہ بہت مختصر ہے بلکہ بعد کے زمانے کی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں گورنروں اور مبلغوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

عاملِ صدقات کی حیثیت سے حضرت ولید بن عقبہ اموی کے کردار، کارکردگی اور اسلام پر ماخذ میں بڑی بحث ملتی ہے اور اس کے نتیجے میں قدیم و جدید دونوں مورخین نے کافی غلطیاں کی ہیں۔ مفصل بحث تو کہیں اور کی جا چکی ہے[۲۳۸]، مگر یہاں عاملینِ صدقاتِ نبویؐ کے بیان کے ضمن میں ان کے صحیح تاریخی تناظر میں تقرری اور کارکردگی کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ماخذ کی روایات کا لبِ لباب یہ ہے کہ بنو مصطلق کے اسلام قبول کرنے کے دو سال بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ولید بن عقبہ اموی کو ان پر عاملِ صدقات مقرر کیا۔ ان کی آمد کی خبر جب بنو مصطلق نے سُنی تو وہ ان کے استقبال کے لیے اپنے علاقہ سے باہر نکلے لیکن حضرت ولید ان کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے اور واپس خدمت نبوی میں سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اُنھوں نے غالباً بنو مصطلق کے صدقات روک لینے کا خیال بھی ظاہر کیا تھا۔ ان کی خبر پر اعتماد کر کے مسلمانانِ مدینہ نے بنو مصطلق کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ بنو مصطلق کا وفد اپنی معروضات کے ساتھ مدینہ جا پہنچا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فریقین کے بیانات اور معروضات کو بالآخر قبول کر لیا اور پھر بنو مصطلق کی خواہش پر حضرت بشر بن عباد اوسی کو ان کا عاملِ صدقات مقرر کیا جو ان سے صدقات وصول کر کے لاتے بھی۔[۲۳۹] روایات میں حضرت ولید پر عمداً کذب و افترا کا الزام لگایا گیا ہے اور سورۂ حجرات کی آیت ۶ میں لفظ فاسق کا مصداق بھی بتایا گیا ہے۔ بنیادی طور سے یہ تمام الزامات تنقید و نقد کے معیار پر کھرے نہیں اُترتے۔ وہ سراسر بعد کی جھوٹی

افواہوں اور اموی دشمن رجحانات کے آئینہ دار ہیں[۲۴۰]۔ حضرت ولید بن عقبہ اموی عہدِ نبوی کے ایک معتمد، باکردار اور عظیم صحابیِ رسول ہونے کے علاوہ ایماندار عاملِ صدقات تھے اور ان کی صداقت و بلندیِ کردار کے لئے یہی ثبوت کافی ہے کہ انہوں نے اس واقعہ کے بعد عہدِ نبوی ہی میں "قضاعہ کے ایک نصف" پر عاملِ صدقات کے فرائض انجام دئے تھے اور بعد میں خلافتِ صدیقی اور عہدِ فاروقی میں اسی نوع کے عہدوں پر مسلسل کام کیا تھا[۲۴۱]۔

دوسرے ابتدائی مؤرخین و سیرت نگاروں میں بلاذری نے عہدِ نبوی کے عاملینِ صدقات کی جو فہرست دی ہے وہ کافی جامع ہے اگرچہ اس کو بھی کسی طرح سے مکمل نہیں کہا جاسکتا۔ بہرحال بلاذری کی روایت کے مطابق مصدقینِ رسول اور ان کے علاقے حسب ذیل تھے[۲۴۲]:

۱۔ حضرت بلال حبشی	مدینہ/اسلامی ریاست کے پھلوں کے صدقات
۲۔ حضرت عباد بن بشر اشہلی	بنو مصطلق/خزاعہ
۳۔ حضرت اقرع بن حابس تمیمی	بنو دارم بن مالک/تمیم
۴۔ حضرت زبرقان بن بدر تمیمی	عوف بن کعب، مقاعس بن عمرو بن کعب، اور الابناءؔ (بنو سعد بن زید مناۃ) نیز بنو کعب بن سعد اور بنو عمرو بن سعد۔
۵۔ حضرت مالک بن نویرہ یربوعی	بنو یربوع بن حنظلہ
۶۔ حضرت عدی بن حاتم طائی	طے اور اسد
۷۔ حضرت عیینہ بن حصن فزاری	فزارہ/غطفان
۸۔ حضرت حارث بن عوف مری	مرہ/غطفان
۹۔ حضرت نعیم بن مسعود اشجعی	اشجع/غطفان، انمار بن بغیض، عبس بن بغیض/غطفان
۱۰۔ حضرت مالک بن عوف نصری	عجز ہوازن (جشم، نصر، سعد بن بکر اور ثقیف بن منبہ)
۱۱۔ حضرت عباس بن مرداس سلمی	بنو سلیم اور بنو مازن
۱۲۔ حضرت عامر بن مالک بن جعفر	بنو عامر
۱۳۔ حضرت الاعجم بن سفیان بلوی	عذرہ، سلامان، بلی اور کلب (حدودِ شام کے قریب آباد قبیلہ)
۱۴۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری قرشی	بنو کلب (دُومۃ الجندل کے قریب آباد شاخ)
۱۵۔ حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی	اسلم، غفار اور جہینہ
۱۶۔ حضرت رافع بن مکیث جہنی	جہینہ
۱۷۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراح فہری قرشی	مزینہ، ہذیل اور کنانہ
۱۸۔ حضرت ضحاک بن سفیان کلابی	بنو کلاب

۱۹۔ حضرت قُرّہ بن ہبیرہ قشیری	بنو قُشَیر اور بنو جعدہ / عامر بن صعصعہ
۲۰۔ حضرت سالف بن عثمان بن معتب ثقفی	طائف اور احلاف (ثقیف کے دونوں گروہ)
۲۱۔ حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی	یمن کے علاقے میں (بطور امیر)

دوسرے مورخین کی فہرستوں کی مانند بلاذری کی فہرست بھی مرکزی اور مقامی عاملین کی مخلوط فہرست ہے صرف حضرت علی کے نام نامی کی شمولیت دُوسری نوعیت کی ہے۔ البتہ یہ نکتہ اہم ہے کہ بلاذری نے اس فہرست میں والیوں یا گورنروں کو شامل نہیں کیا ہے۔ صرف حقیقی عاملینِ صدقات کو ہی شامل کیا ہے۔

بہرحال مذکورہ بالا فہرستہائے عاملینِ صدقات کے علاوہ مآخذ کے صفحات میں دوسرے متعدد مرکزی مصدقینِ رسول کا ذکر جابجا بکھرا ہوا ہے۔ ابنِ سعد دو عمالِ صدقات کا ذکر کرتے ہیں جن کی تقرری ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں کسی وقت ہوئی تھی۔ ان کے نام تھے قضاعی بن عمرو عذری اور عکرمہ بن حفصہ۔ اول الذکر بنو الحارث کے صدقات وصول کرتے تھے اور مؤخر الذکر بُدَیل، بُسر اور ان کے حلیفوں کے لیے عاملِ صدقات تھے۔[۲۴۳] طبری کے مطابق حضرت عمرو بن عاص سہمی نے ۹ھ / ۶۳۰ء کے زمانے میں حنین کے علاقوں سے صدقات وصول کئے تھے اور اس کے بعد وُہ قضاعہ کے عاملِ صدقات مقرر ہوئے جو ان کی مستقل تقرری کا علاقہ تھا اور پھر اس کے بعد وہ عارضی طور سے عمان بھی بھیجے گئے تھے۔[۲۴۴] ان کے علاوہ حضرت سنان بن ابی سنان کو ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں کسی وقت بنو مالک کا عاملِ صدقات بھی مقرر کیا گیا تھا۔[۲۴۵]

مذکورہ بالا مصدقین کے علاوہ متعدد عاملین صدقات کا ذکر صرف اسد الغابہ میں ملتا ہے۔ ان میں سے کچھ کا ذکر ان کے اسمائے گرامی اور منازلِ تقرری کے ساتھ ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت کلاب بن امیہ لیثی کو ثقیف کے لوگوں سے ان کے اونٹوں کے عشور کی وصولیابی کے لیے بھیجا گیا تھا۔[۲۴۶] جبکہ حضرت عکرمہ بن ابی جہل مخزومی نے ہوازن کے مالوں پر قانونی و لازمی صدقات کی وصولیابی کی تھی۔[۲۴۷] حضرت ارقم بن ابی ارقم بھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مصدق تھے لیکن ان کے میدانِ عمل کا ذکر مآخذ میں نہیں کیا گیا ہے۔[۲۴۸] حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی کے بارے میں ابنِ اثیر کا اضافہ یہ ہے کہ صحابیِ موصوف نے نہ صرف حضرت وائل بن حجر سے بلکہ تمام اقیالِ حضرموت نے جو رقوم صدقات کی مد میں اپنے لوگوں سے جمع کی تھیں ان کے لانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔[۲۴۹] حضرات عبادہ بن صامت اور زیاد بن حنظلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو اور عاملینِ صدقات تھے مگر ان کے بھی میدانِ عمل کا کوئی ذکر یا حوالہ نہیں ہے۔[۲۵۰] ان کے علاوہ مآخذ میں دو ایسے افسرانِ صدقات کا بھی ذکر ملتا ہے جنہوں نے اسلامی ریاست کو اپنے ارتداد اور فرائض سے لاپروائی کر کے دھوکا دیا تھا اور بالآخر فتح مکہ کے دن اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے تھے۔[۲۵۱]

اسد الغابہ کی مانند اصابہ نے بھی بعض مرکزی اور مقامی عاملینِ صدقات کا ذکر کیا ہے۔ حضرت حنظلہ بن یمان غالباً مرکزی افسرِ صدقات تھے جن کو اپنے قبیلہ ـــ ازد ـــ سے صدقات وصول کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔[۲۵۲] کتانی نے کلاعی کی سیرۃ کی بنیاد پر دعویٰ کیا ہے کہ مدینہ منورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مصدق حضرت عمر بن خطاب عدوی تھے۔ محدث ابو داؤد کا خیال ہے کہ ان کو ان کی خدمات کے عوض کچھ تنخواہ یا معاوضہ (عمالۃ) ملتا تھا۔[۲۵۳] یہ تقریباً یقینی ہے کہ مذکورہ بالا

عاملینِ صدقات کے علاوہ اور بھی کافی تعداد میں مرکزی افسرانِ مالیات تھے کیونکہ مذکورہ بالا تعداد عرب کے قبائل/خاندانوں کی تعداد سے کہیں کم ہے۔ ابنِ قیم کا یہ تبصرہ دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی کہ ہر ایک خاندان/قبیلہ کے لیے ایک مصدق/گورنر/والی تھا۔ اسس لحاظ سے یہ موٹی سی حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ عہدِ نبوی میں عاملینِ صدقات کی تعداد اتنی تھی جتنی کہ عرب کے مسلم قبائل اور ان کے اہم خاندانوں کی تعداد تھی۔

جب عاملینِ صدقات اپنے اپنے علاقوں سے صدقات لے کر مدینہ منورہ پہنچتے تھے تو ان کا باقاعدہ "محاسبہ" ہوتا تھا۔ اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پورا حساب کتاب لیتے تھے۔ مسلم کی ایک حدیث کے مطابق حضرت ابن اللتبیہ ازدی کو بنو سلیم کا عامل مقرر کیا گیا تھا۔ جب وہ اپنے علاقہ کے صدقات لے کر مدینہ پہنچے تو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: "یہ آپ کے لیے ہے اور یہ مجھے تحفہ میں دیا گیا ہے۔" آپ نے ان کو سخت سرزنش کی اور فرمایا کہ "اگر تم ایمانداری سے کہو تو تم اپنے باپ کے گھر میں قیام پذیر رہتے اور تمہارا تحفہ تم تک از خود پہنچ جاتا۔" آپ کا مطلب صاف تھا کہ عامل موصوف کو جو کچھ "تحفہ" میں حاصل ہوا تھا وہ دراصل ان کے عہدے کے سبب تھا۔ اس موقع پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا تھا جس میں آپ نے تمام عاملینِ صدقات کو خاص کر اور دوسرے افسرانِ حکومت کو عام طور سے دورانِ تقرری یا عہدہ نوازی لوگوں سے تحائف وصول و قبول کرنے سے منع فرمایا تھا[٢٥٤] کہ اس سے رشوت کی بو آتی تھی۔ اسس بنا پر حافظ ابن قیم اور دوسرے فقہائے نے یہ نتیجہ بجا طور سے اخذ کیا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام عاملوں اور افسروں کی آمدنی اور مصارف کا باقاعدہ محاسبہ فرمایا کرتے تھے۔[٢٥٥]

عاملینِ صدقات کی بحث کے اسس موڑ پر ان کی تنخواہ کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جس کو "عمالہ" یا "رزق" کہا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بطور مصدق تنخواہ کا ذکر آ چکا ہے اگرچہ اس کی مقدار کا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے۔ محدثین و مورخین نے اسس موضوع پر پوری پوری فصلیں مخصوص کی ہیں۔ بہر حال اصولِ اسلامی یہ تھا کہ "جو کوئی ہمارے عامل کے بطور کام کرے اسس کو اجازت ہے کہ وہ اپنے اور اپنی بیوی کے مصارف کے لیے ضروری اور واجب رقم لے لے اور اگر وہ کوئی نوکر یا غلام رکھتا ہے تو اس کے اخراجات کے لیے بھی ضروری رقم لے سکتا ہے۔ اگر کسی کے پاسس مکان نہ ہو تو اس کے مصارف کے لیے بھی وہ رقم لے سکتا ہے۔ مگر جو کوئی اپنی جائز ضروریات سے زیادہ رقم لیتا ہے وہ غبن (غل) کا مرتکب ہوتا ہے۔"[٢٥٦] ذکر آ چکا ہے کہ قرآنِ کریم کی آیت[٢٥٧] کے مطابق عاملینِ صدقات کی تنخواہ کی ادائیگی صدقات کی جمع شدہ رقوم ہی سے کی جاتی تھی۔ بہر حال مآخذ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمال کی تنخواہ کے دو طریقے تھے، اول یہ کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس کسی عامل کو اس کی تنخواہ عطا فرماتے تھے جیسا کہ حضرت عمرؓ کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ عاملینِ صدقات کو اختیار تھا کہ وہ اپنی ضروریات کے لیے رقم خود لے لیں اور پھر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حساب پیش کر دیں۔ آپ اکثر تمام عاملین کے جائز اخراجات کی تصدیق و توثیق کر دیتے تھے مگر بعض معاملات میں جہاں آپ کو گمان ہوتا تھا کہ زاید از ضرورت صرف کیا گیا ہے ان کے مصارف کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے تھے جیسا کہ حضرت ابن اللتبیہ ازدی کے معاملہ سے واضح ہوتا ہے۔ ابنِ سعد نے بعض

مقامی منتظمین اور عاملینِ صدقات کے سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جوائز (انعامات) عطا فرمائے تھے۔ غالباً یہ انعامات ان کی خدمات کے عوضانہ تھے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو عاملینِ صدقات کی تنخواہوں کا ایک موٹا سا اندازہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت قیس بن حصین مذحجی کو ½ ۱۲ اوقیہ چاندی عطا کی گئی تھی[۲۵۸] جبکہ ایک دوسرے عامل کو جو نجران کے علاقے سے آئے تھے دس اوقیہ چاندی کا انعام ملا تھا۔ موصوف نے حضرت خالد بن ولید مخزومی کی یمن میں کافی معاونت کی تھی اور انھیں کے ساتھ مدینہ آنے پر ان کو انعام سے نوازا گیا تھا[۲۵۹]۔ جنوبی عرب کے ایک اور عاملِ صدقات حضرت فروہ بن مسیک مرادی کو جنہوں نے مراد، زبید بلکہ پورے قبیلہ مذحج سے صدقات وصول کرنے میں حضرت خالد بن سعید اموی کی مدد کی تھی بارہ اوقیہ چاندی کے علاوہ ایک عمدہ اونٹ اور ایک شاندار قبا بھی عطا کی گئی تھی۔[۲۶۰] ان ٹھوس مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مصدقین و عاملینِ صدقات کو ان کی خدمات کے عوض کافی انعام و اکرام اور تنخواہ سے نوازا جاتا تھا۔ بہرحال اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ وہ ریاست اسلامی کے باتنخواہ افسر تھے۔

معلوم و معروف مرکزی عاملینِ صدقات کے قبائلی تجزیے سے بعض اہم نکات روشنی میں آتے ہیں۔ ضمیمہ میں مذکورہ ۲۸ مرکزی عاملین صدقات میں سے ایک تہائی کا تعلق قریش کے مختلف خاندانوں سے تھا۔ ان قریشی عمالِ صدقات میں بلاریب حضرت عمرو بن عاص سہمی سب سے اہم اور ممتاز اور صاحبِ لیاقت و صلاحیت نظر آتے ہیں کہ انھوں نے ابتدائے تقرری سے وفات نبوی تک نہ صرف یہ کہ مستقل طور پر اس عہدے پر کام کیا تھا بلکہ مختلف علاقوں اور قبیلوں میں بڑی کامیابی سے صدقات وصول کئے تھے۔ قریش کے بعد خزرج کا درجہ ہے جس کے تین عاملین نے کارنامے انجام دئے تھے اور امتیاز حاصل کیا تھا۔ اگرچہ اوس کے صرف ایک مصدق حضرت عباد بن بشر کا نام نظر آتا ہے انہوں نے خاصے طویل عرصہ تک اور مختلف علاقوں میں اس عہدے پر کام کیا تھا۔ ازد کے سوا جس کے دو عاملوں کا ذکر ملا ہے باقی تمام قبائل میں سے صرف ایک ایک عامل تھا اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مرکزی عاملینِ صدقات میں سے اکثریت کا تعلق مرکزِ اسلام یعنی مدینہ منورہ سے تھا جو قطعی فطری تھا۔ جہاں تک علاقائی نمائندگی کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ نمائندگی مرکزی عرب کے علاقوں کو حاصل تھی ان کے بعد بالترتیب مشرقی اور مغربی قبائل کا درجہ تھا جو اتفاق سے مساوی تھا دوسرے علاقوں کے قبائل کی نمائندگی اس طبقۂ افسرانِ حکومتِ نبوی میں خاصی کم تھی۔ جہاں تک مرکزی عاملینِ صدقات کی سبقتِ اسلام کا تعلق ہے تو بیس فیصد اولین مسلم تھے، دوسرے بیس فیصد کے اسلام کا تعلق آخری مکی عہد یا ابتدائی مدنی زمانہ سے تھا جبکہ باقی ساٹھ فیصد عاملین کے اسلام کا زمانہ صلح حدیبیہ کے آس پاس کا ہے۔ ان تمام نکات کی مزید اور مکمل وضاحت کے لیے آخر میں ایک جدول دی جا رہی ہے:

علاقہ	قبیلہ/خاندان	تقرریاں	عاملین صدقات
مرکزی عرب	۱۔ قریش	۱۰	۹
	(ا) ہاشم	۱	۱
	(ب) امیہ	۲	۲

	(ج) مخزوم	۲	۲
	(د) عدی	۲	۲
	(ه) سہم	۲	۱
	(و) اورم	۱	۱
	۲۔ خزرج	۳	۳
	۳۔ اوس	۲	۱
شمالی عرب	۴۔ عذرہ	۱	۱
مشرقی عرب	۵۔ فزارہ/غطفان	۱	۱
	۶۔ کلاب	۱	۱
	۷۔ اسد	۱	۱
	۸۔ قیس عیلان	۱	۱
	۹۔ ثقیف	۱	۱
مغربی عرب	۱۰۔ کنانہ	۱	۱
	۱۱۔ خزاعہ	۱	۱
	۱۲۔ جُہَینہ	۱	۱
جنوبی عرب	۱۳۔ ازد	۲	۲
	۱۴۔ تمیم	۱	۱
میزان	۱۴ قبیلے/خاندان	۲۰	۲۵

(۲) مقامی عاملینِ صدقات

اس طبقے میں صرف ان عاملینِ صدقات کو شامل کیا گیا ہے جن کا میدانِ عمل اور دائرۂ کار ان کے اپنے قبیلوں تک محدود تھا عموماً یہ افسرانِ صدقات اپنے قبیلہ والوں سے خود صدقات وصول کر کے مرکزی عاملینِ صدقات کے حوالے کرتے تھے۔ لیکن اس امکان سے بھی قطعی طور پر قطع نظر نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مرکزی عمال کی صدقات کی براہِ راست وصولیابی میں مدد کرتے ہوں۔ مآخذ عموماً ان مقامی عاملین کے فرائض کی انجام دہی اور عہدے کے بیان کے لیے سکہ بند فقرہ علیٰ صدقاتِ قومہ (اپنی قوم کے صدقات پر مقرر کیے گئے تھے) استعمال کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ ان مقامی عاملین میں سے اکثر و بیشتر اپنے اپنے قبیلوں/خاندانوں کے سردار و شیوخ ہوتے تھے یا اپنے قبیلوں کے مسلمانوں کے مرکز کی جانب سے مقرر کردہ سردار

ہوتے تھے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر ان تمام افسروں کو بھی مقامی عاملینِ صدقات کے طبقہ میں شمار کرنا چاہیے جن کا ذکر ہم نے مقامی منتظمین میں کیا ہے کیونکہ ان کے من جملہ فرائض میں صدقات کی وصولیابی اور مرکزِ ریاستِ اسلامی کو ان کی ادائیگی بھی تھی۔ مرکزی منتظمین کی مانند مقامی عاملینِ صدقات بھی مستقل عہدہ دارانِ حکومت تھے۔ ان کی مدّتِ عہدہ تا حیات ہوتی تھی یا دوسرے الفاظ میں اس وقت تک ہوتی تھی جب تک ان کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی و اعتماد حاصل رہے۔ شاذ و نادر ہی کسی مصدق کو آپ نے اس کے عہدے سے برطرف کیا تھا۔

مآخذ تمام مقامی عاملینِ صدقات کا صریح ذکر نہیں کرتے ہیں تاہم ان میں اتنا اس موضوع پر مواد مل ہی جاتا ہے جس سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ صدقات و محاصل کی وصولیابی کے ضمن میں درجہ بند نظام موجود تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مطالعہ کو ہم علاقائی ترتیب سے کریں تاکہ ایک طرف تو ہم کو مقامی عاملینِ صدقات کی کارکردگی کا بھی بخوبی علم ہو تو دوسری جانب یہ حقیقت بھی اُجاگر ہو سکے کہ کس طرح تمام عرب قبائل اور خاندان اسلام اور اسلامی ریاست کے انتظامی اور مالی نظام کے دائرۂ کار میں لائے گئے تھے اگرچہ اس مطالعہ میں بعض مباحث کی تکرار اور بعض معاملات میں تبادل کا خطرہ بھی پایا جاتا ہے۔

خزاعہ کے تین قبیلے یا خاندان اپنے صدقات اپنے مرکزی اور مقامی عاملین کے توسط سے ادا کرتے تھے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی اسلم اور غفار کے قبیلوں کے صدقات وصول کر کے مدینہ پہنچاتے تھے۔ یہ حقیقت دلچسپ ہے کہ اسلم اگرچہ خزاعہ کا ایک حصہ تھا مگر غفار کا تعلق کنانہ سے تھا۔ ان دونوں کو ایک مالی نظام میں یا ایک مرکزی عاملِ صدقات کے دائرہ کار میں اس لیے شامل کیا گیا تھا کہ وہ دونوں نہ صرف یہ کہ اچھے اور قریبی پڑوسی تھے بلکہ حلف کے تعلقات زمانۂ قدیم سے رکھتے تھے۔ واقدی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلم کے ایک سربرآوردہ شخص نے غزوۂ حنین (بلکہ فتح مکہ) سے قبل اپنے تمام واجب الادا صدقات حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی کے حوالے کر دئے تھے۔ اور یہی اس کے ایمان کی دلیل ٹھہری تھی۔[۲۶۱] جہاں تک ٹھوس تاریخی مثال کا تعلق ہے تو اسلم کے صدقات ادا کرنے کی یہ اکلوتی مثال ہے جو اب تک دستیاب ہو سکی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ حضرت بریدہ بذاتِ خود یا اسلم کا کوئی اور شخص مقامی عامل بھی رہا ہو۔ اسی طرح بنو کعب کے مقامی عامل کا واضح ذکر نہیں ملتا حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ قریش / عدی کے حضرت بُسر بن سفیان ان کے صدقات بطور مرکزی عامل کے وصول کرتے تھے۔ خوش قسمتی سے بنو مصطلق کے بارے میں ہم مرکزی اور مقامی دونوں مصدقین کا واضح حوالہ پاتے ہیں۔ مآخذ کے مطابق حضرت عباد بن بشر ان کے مرکزی مصدق تھے اور حضرت حارث بن ضرار جو ان کے قبائلی سردار تھے ان کے مقامی عاملِ صدقات تھے اور وہ اپنے قبیلہ والوں سے صدقات وصول کر کے مرکزی عامل کے حوالے کرتے تھے۔ اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت حارث خزاعی نے زکوٰۃ سمیت تمام صدقات اپنے قبیلہ والوں سے وصول کر کے اپنے قبیلہ کے پہلے مرکزی عامل صدقات کے حوالے کرنے کی ذمہ داری لی تھی۔[۲۶۲] لیکن جب پہلے مصدقِ حضرت ولید بن عقبہ اموی مذکورہ بالا اسباب سے ان کے قبیلے تک نہیں پہنچ سکے تو حضرت عباد بن بشر نے ان سے صدقات وصول کئے تھے۔

جہاں تک معلومات ہو سکی ہیں کنانہ کے قبیلہ کے مقامی عاملینِ صدقات کا ذکر نہیں مل سکا ہے اگرچہ ہم کنانہ اور غفار دونوں

سے ایک مرکزی مصدق کے صدقات وصول کرنے سے واقف ہیں۔ بہرحال یہ فرض کرنا حقیقت کے خلاف ہرگز نہ ہوگا کہ کنانہ کے مختلف خاندان جیسے ضمرہ، لیث، دئل، مدلج، بکر بن عبد مناۃ اور حارث بن عبد مناۃ کے مقامی عاملین تھے جن کے ذریعہ وہ صدقات مرکزی عاملین کے حوالے کرتے تھے جیسا کہ حضرت عثمان بن عمرو دئلی کے واقعہ سے ثابت بھی ہوتا ہے۔[۲۶۳]

جُہینہ کے بارے میں ہم ذرا قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں مرکزی اور مقامی، دونوں عاملین صدقات تھے۔ روایات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو حقیقی بھائی حضرات رافع بن مکیث اور جندب بن مکیث بالترتیب مرکزی اور مقامی عامل تھے۔[۲۶۴] قبیلۂ مزینہ کے بارے میں روایت یہ ملتی ہے کہ وہ اپنے تمام صدقات مدینہ منورہ سے بھیجے گئے عاملِ صدقات کو ادا کرتا تھا۔ اس کے مقامی مصدقین کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ مآخذ قبیلہ ازد کے دو عاملینِ صدقات کا ذکر کرتے ہیں مگر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کا تعلق ازدِ شنوءہ سے تھا یا ازدِ یمن سے۔ بہرحال یہ قطعیت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت سعد بن ابی ذباب دوسی (جن کا تعلق حجاز کے دوسی بطن سے تھا) ایک مقامی مصدق تھے جو اپنے قبیلہ والوں کے صدقات وصول کرتے تھے اور ریاست اسلامی کے مرکز کو برابر پہنچاتے تھے انھوں نے یہ خدمت صرف عہدِ نبوی ہی میں نہیں انجام دی بلکہ حضرات ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کے زمانۂ خلافت میں بھی انجام دی تھی۔[۲۶۵]

طے کے مقامی عاملِ صدقات حضرت عدی بن حاتم طائی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم اور ممتاز عمال میں سے تھے۔ حضرت عدی اپنے اسلمی ہم عہدہ کی مانند اپنی قوم طے کے صدقات کے علاوہ اپنے قریبی پڑوسیوں بنو اسد/خزیمہ کے صدقات کے بھی عامل تھے۔[۲۶۶] اس لحاظ سے وہ مرکزی عاملِ صدقات بھی تھے۔ ابنِ اثیر کے مطابق انہوں نے خلافتِ فاروقی کے زمانے تک یہ خدمت شاندار طریقے سے انجام دی تھی۔ بنو اسد کے ایک اور عامل صدقات حضرت قضاعی بن عمرو تھے جو نہ صرف ان کے صدقات وصول کرتے تھے بلکہ ان کے علاقے میں مرکزی منتظم بھی تھے۔[۲۶۷] مآخذ کی ان شہادتوں سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ حضرت قضاعی بن عمرو مرکزی عامل تھے جبکہ حضرت عدی بن حاتم طائی مقامی مصدق تھے۔ کتانی نے ایک روایت بیان کی ہے کہ حضرت کافیر بن سبیع الاسدی اپنی قوم کے صدقات پر مقرر کیے گئے تھے۔[۲۶۸] مجموعۃ الوثائق میں ایک دستاویز ہے جس کے مطابق بلی کا ایک خاندان بنی جُعیل متعدد مشرقی قبیلوں جیسے نصر، سعد بن بکر، ثمالہ اور ہذیل کے سِعَایَۃ (صدقات کی وصولیابی) کا ذمہ دار بنایا گیا تھا۔ وہ حضرات جو ان کی وصولیابی اور اس کے نتیجہ میں اس سے مالی فائدہ کے مستحق تھے حسب ذیل تھے:

حضرات عاصم بن ابی صیفی، عمرو بن ابی صیفی، الاعجم بن سفیان اور علی بن سعد۔[۲۶۹]

ان میں سے حضرت الاعجم بن سفیان کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ یکے از عمالِ رسول تھے۔ کتانی نے ایک اور روایت اصابہ کی سند پر بیان کی ہے کہ حضرت کہل بن مالک ہذلی اپنے قبیلہ ہذیل کے صدقات کے عامل تھے۔[۲۷۰]

مشرقی قبیلوں میں ہوازن کی بعض اہم شاخوں جیسے فہم، ثمالہ، سلمہ وغیرہ جن کو عجز ہوازن بھی کہا جاتا تھا کے عامل صدقات حضرت مالک بن عوف نصری تھے جو ہوازن کے عظیم سرداروں میں سے ایک تھے۔ جہاں تک ہوازن کے اور بطون اور خاندانوں کا تعلق ہے تو ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ متعدد قبیلوں جیسے کلاب، عامر بن صعصعہ، ثقیف اور احلاف پر مرکزی عاملین صدقات

مقرر کئے گئے تھے اور قیاس یہ کہتا ہے کہ ان کے مقامی عاملین بھی تھے۔ کتانی کا بیان ہے کہ حضرات مرداس بن مالک اور خزیمہ بن عاصم کو بنوغنی / قیس عیلان اور الاحلاف کا مقامی عامل مقرر کیا گیا تھا۔[271] حضرت عباس بن مرداس سلمی کے علاوہ جو کہ مرکزی مصدق تھے حضرت ہیثم اسد الغابہ کے بیان کے مطابق سلیم کے مقامی مصدق تھے۔[272] قبیلۂ غطفان جو عددی لحاظ سے کافی بڑا اور طاقت ور قبیلہ تھا اپنے مختلف بطون اور خاندانوں کے لیے عمالِ صدقات کی ایک پوری جماعت رکھتا تھا چنانچہ اشجع، فزارہ، مُرّہ، ثعلبہ، انمار اور عبس و ذبیان وغیرہ کے متعدد مقامی عاملین صدقات تھے۔

شمالی قبائل عذرہ، سلامان، بلی اور کلب کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ اپنے صدقات مرکزی عاملین صدقات کو ادا کرتے تھے۔ یہی حال سعد ہذیم کا بھی تھا۔ جہاں تک ان کے مقامی مصدقین کا تعلق ہے تو ذکر ملتا ہے کہ عذرہ کے عامل حضرت ہوذہ بن نعمان اپنے قبیلہ کے مقامی افسر تھے اور ایک بار خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے قبیلہ کے صدقات لے کر مدینہ پہنچے تھے۔[273] سعد ہذیم کے دو مرکزی عاملین صدقات حضرات ابی بن کعب اور عنبسہ کا ذکر پہلے ہی آچکا ہے۔ یہ بھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری دومہ کے بنوکلب کے مرکزی عامل تھے تو ان کے شیخ قبیلہ حضرت امرؤ القیس جو ابن الاصبغ کلبی کے نام سے زیادہ معروف ہیں مقامی محصل تھے۔ موخر الذکر کے شرف کی بات ہے کہ انہوں نے نہ صرف عہدِ نبوی میں یہ خدمتِ عظیم انجام دی تھی بلکہ ردہ کے پُرآشوب و ابتلا کے زمانے میں بھی پوری ایمان داری سے صدقات وصول کر کے مدینہ منورہ پہنچاتے رہے تھے۔[274] اسد الغابہ کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد قبیلوں کے گروہِ قضاعہ کے لئے متعدد عمالِ صدقات کا تقرر کیا گیا تھا۔[275] اس خیال کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ قضاعہ کے ایک خاندان بنوقین کا مصدق حضرت عمرو بن حکمہ کو بتایا گیا ہے۔[276] مجموعۃ الوثائق کی ایک دستاویز کے مطابق لخم کے ایک خاندان حدس کو اپنی زکوٰۃ اور دوسرے محاصل کی رقوم کی ادائیگی کی ہدایت کی گئی تھی۔[277] ظاہر ہے کہ یہ ادائیگی ایک مقامی عاملِ صدقات کے ذریعہ ہوتی تھی۔ اسی طرح کا معاملہ غسان کے ایک خاندان بنوثعلبہ کے ساتھ کیا گیا تھا جب ان کو زکوٰۃ اور خمس وغیرہ کی ادائیگی کا حکم دیا گیا تھا۔[278] ان شہادتوں سے صراحتاً نہ سہی تو مضمراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان قبیلوں میں مقامی عاملینِ صدقات موجود تھے۔

جیسا کہ ہم گزشتہ بحث میں دیکھ چکے ہیں کہ جنوبی عرب کے لیے متعدد مرکزی عاملینِ صدقات مقرر کئے گئے تھے۔ عام طور سے وہ سب کے سب مختلف علاقوں اور ولایات کے والی اور مرکزی منتظمین تھے جن کے فرائض منصبی میں صدقات کی وصولیابی بھی شامل تھی۔ چنانچہ الجند، صنعاء، عک، اشعر، کندہ (سکاسک، سکون، معاویہ) نجران، جرشں، بنوحارث، زبید، رمع، عدن، ساحل مغرب اور حضرموت اور ان کے ماتحت علاقے اپنے اپنے مرکزی عاملین کو بالآخر صدقات ادا کرتے تھے لیکن یہ ادائیگی ان کے مقامی عاملوں کے ذریعہ ہوتی تھی اگرچہ زیادہ تر معاملات میں اس کا صریح ذکر نہیں ملتا ہے۔

دراصل تمام مقامی منتظمین اور قبائلی سردار مقامی مصدقین بھی ہوتے تھے جو اپنے اپنے لوگوں سے صدقات وصول کر کے مرکزی عاملین تک پہنچاتے تھے۔ جنوبی عرب کے ضمن میں یہ بیان اور بھی بجا طور پر منطبق ہوتا ہے۔ چنانچہ مقامی منتظمین پر گزشتہ بحث سے یہ امر کہ ان مقامی سرداروں کا سب سے اہم فریضہ صدقات کی اپنے علاقوں سے وصولیابی اور مرکزی نمائندوں کی ان کی

حوالگی تھا پوری طرح سے ثابت ہوتا ہے۔ یہاں صرف ان قبائل اور "اقوام" کے نام گنا دینا کافی ہوگا جن کے سرداروں کا ذکر صراحتاً ملتا ہے جو حسب ذیل تھے:

خولان، ازد جرش، بنو خارف/ ہمدان، بنو بُگیلہ/ ہمدان (اس بطن کو بنو ناعز بھی کہا جاتا تھا)، مراد، جرش، بنو حارث بن کعب/ مذحج، مرّان، حریم اور کُلاب اور ان کے "موالی"، بنو ارحب/ ہمدان، رُہا، صُداء، کندہ اور حضرموت۔

مجموعۃ الوثائق میں بعض بڑے دلچسپ خطوط و دستاویزات ہیں جو جنوبی عرب میں مقامی عاملینِ صدقات کی موجودگی پر کافی اہم روشنی ڈالتی ہیں۔ ایک دستاویز کے مطابق حضرت مطرف بن کاہن باہلی کو ان کے قبیلہ کی اس شاخ کا عامل مقرر کیا گیا تھا جو بیشہ نامی مقام پر آباد تھی۔[۲۷۹] ان کے لوگوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ مذکورہ بالا مصدق کو اپنے مویشیوں کی زکوٰۃ ادا کریں۔ حضرت نہشل بن مالک باہلی کے نام گرامی نامۂ نبوت میں صاف تصریح کی گئی ہے کہ ان کے قبیلہ والے اپنی زکوٰۃ اور خمس وغیرہ اپنے قبائلی عامل کے سپرد کر دیں۔[۲۸۰] بنو حارث اور بنو نہد کے لوگوں کو حضرت قیس بن حصین کے ذریعہ تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی بشرطیکہ وہ اپنے اموال میں زکوٰۃ وغیرہ صدقات وقت پر ادا کر دیا کریں۔[۲۸۱] اسی طرح حضرت طہفہ اور ان کی قوم کو جن کا تعلق نہد سے تھا زکوٰۃ اور دوسرے صدقات ادا کرنے کی ہدایت کی گئی تھی[۲۸۲] اور تمام معاملات میں مقامی مصدقین کی موجودگی اور کارکردگی سامنے کی بات ہے۔

خثعم کے بارے پہلے ہی یہ ذکر آ چکا ہے کہ وہ عشر اور نصف العشر ادا کیا کرتے تھے۔[۲۸۳] لیکن اس سے زیادہ نمائندہ اور دلچسپ معاملہ حضرت وائل بن حجر حضرمی کا ہے جو حضرموت کے اقیال (شہزادوں اور حکمرانوں) میں سے ایک تھے۔ مرکزی منتظم اور والی حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کے نام رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک گرامی نامہ میں حضرت وائل کی دوسرے اقیالِ حضرموت کے مقابلے میں حیثیت و مرتبہ کا تعین ملتا ہے۔ چنانچہ ان کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ دوسرے اقیال سے تمام صدقات وصول کر کے مرکزی منتظم کے حوالے کر دیں۔[۲۸۴] اس کی مزید تصدیق دوسرے دو خطوطِ نبوی سے ہوتی ہے جن میں ان کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اقیال سے زکوٰۃ، مویشیوں پر صدقہ، پیداوار پر عشر اور سیوب (پانی بہنے کی جگہیں) پر خمس (نصف العشر) وصول کر کے ایک اور مرکزی عامل حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی کے حوالے کریں جن کو خاص اسی مقصد سے مدینہ منورہ سے ان کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔[۲۸۵]

قبائل پراگندہ عرب میں تمیم کا معاملہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد بھی ہے اور نمائندہ بھی۔ اس کے کم از کم سات مختلف بطون/ خاندانوں کے مقامی عاملین صدقات کا ذکر ہم مآخذ میں پاتے ہیں۔ ان عاملین صدقات کے اسمائے گرامی مع ان کے میدان ہائے عمل کے یہ ہیں:

(۱) حضرت قیس بن عاصم بنو سعد/ تمیم کے لیے
(۲) حضرت زبرقان بن بدر بنو سعد کے ایک اور خاندان کے لیے
(۳) حضرت مالک بن نویرہ بنو حنظلہ کے لیے

(۴) حضرت سہل بن منجاب (۵) حضرت صفوان بن صفوان (۶) متمم بن نویرہ اور (۷) حضرت خاجزہ بن سمرہ بنو تمیم کے مختلف خاندانوں (اپنے اپنے بطون) کے لیے تھے۔[۲۸۶]

ایک اور مقامی عامل صدقات حضرت خزیمہ بن عاصم تھے جو اپنے قبیلہ بنو عوف / وائل بن بکر سے صدقات وصول کرتے تھے۔[۲۸۷] مجموعۃ الوثائق میں شامل ایک دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ عبد القیس کے ایک سردار حضرت اکبر بن عبد القیس اپنے قبیلہ کے علاوہ ازدِ عمان سے صدقات وصول کرکے مرکزی منتظم حضرت علاؑ بن حضرمی کے حوالے کرتے تھے۔[۲۸۸] اگرچہ مہرہ کے قبیلہ میں مقامی عاملین کا ذکر واضح طور سے نہیں ملتا ہے لیکن ان کی موجودگی کا پکا قرینہ اس ہدایت نبوی میں ملتا ہے جس نے اس قبیلہ کے لوگوں کو اسلام کے شرائع (قوانین) کی پابندی بشمول زکوٰۃ وصدقہ عمال کو ادائیگی کی تاکید کی تھی۔[۲۸۹] حضرت ثمامہ بن اثال حنفی کے زیرِ اقتدار بنو حنیفہ کے طبقات نے ان کے ذریعہ اپنے صدقات ادا کیے تھے جبکہ تغلب / بکر بن وائل کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوٰۃ (در اصل جزیہ) کا معاہدہ ایک معروف ومشہور حقیقت ہے۔

صدقات ومحاصل کی وصولیابی کے نظام کی بحث کے آخر میں یہ جاننا دلچسپی اور اہمیت کا حامل ہوگا کہ اسلامی ریاست کو مختلف ولایات، علاقوں اور قبیلوں سے کس قدر صدقات نقد یا جنس میں حاصل ہوتے تھے۔ بدقسمتی سے اکثر معاملات میں نقد یا جنس کی مجموعی رقم کا کوئی ذکر نہیں ملتا تاہم بعض معاملات میں صراحتاً اور کہیں کہیں مضمراً صدقات کی مالیت کا ذکر آیا ہے۔ بحرین کے بارے میں ذکر آیا ہے کہ اس کے مرکزی منتظم حضرت علاؑ بن حضرمی ایک سال یا ایک بار ستر ہزار درہم کی رقم لے کر مدینہ پہنچے تھے جو مال بحرین کہا گیا ہے۔[۲۹۰] دوسری صریح مثال تمیم کے قبیلہ بنو سعد کے نصف کے عامل حضرت زبرقان بن بدر کی ہے جو اپنی قوم کے صدقہ کے سات سو اونٹ لے کر ایک بار خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تھے۔[۲۹۱] نجران کے عیسائیوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو معاہدۂ صلح کیا تھا اس کی رُو سے ان کے جزیہ کی تخمینی رقم / مالیت تقریباً اسی ہزار درہم تھی۔ بظاہر اور اپنی جگہ یہ تمام خاصی خطیر رقمیں معلوم ہوتی ہیں لیکن جب ان کا موازنہ مسلمانوں کے عطیات سے کیا جاتا ہے جو در اصل مسلم معیشت کی پیمایش کا ایک پیمانہ بھی ہے تو ان کی اصل مالیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر حضرت عثمان غنی نے تنہا ستر ہزار درہم کی رقم عطیہ میں دی تھی جو حسنِ اتفاق سے بحرین کے وسیع صوبے اور مملکت کے صدقات کی رقم کے برابر تھی۔ اس موقعہ پر مسلمانوں کے عطیات کی کل رقم بلاذری کی روایت کے مطابق دو لاکھ دس ہزار درہم تھی کیونکہ حضرت عثمان کے عطیہ کو ثلث (⅓) کہا گیا ہے۔ اس موازنہ سے صدقاتِ ولایات کی مالیت کا مکمل نہ سہی ایک موٹا سا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔

(۳) صدقات کے کاتبین

ابنِ حزم کی جوامع السیرہ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت میں دوسرے شعبوں کی مانند مالی نظام کے مختلف محکموں کا حساب کتاب باقاعدہ رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت زبیر بن عوام اسلامی ریاست کے صدقات کے کاتب تھے اور وہی سارا حساب کتاب رکھا کرتے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں حضرات جہیم بن صلت اور حذیفہ بن الیمان صدقات کی آمدنی کو

"ان کے رجسٹروں میں لکھا کرتے تھے"۔ لیکن قضاعی کی روایت سے انتظامی امور کچھ مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کی روایت کے مطابق حضرات زبیر بن عوام اور جہیم بن صلت صدقات کی آمدنی کے کاتب تھے جبکہ حضرت حذیفہ بن الیمان کھجور کی پیداوار کے تخمینے سے متعلق امور کی کتابت و اندراج کیا کرتے تھے۔ ان روایات کو بیان کرنے کے بعد کتانی کا تبصرہ یہ ہے کہ اگر یہ روایات صحیح ہیں اور بظاہر ان کی صحت میں کوئی احتمال و کلام نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ دونوں دیوان (شعبے) عہدِ نبوی ہی میں قائم ہو چکے تھے[۲۹۲]

بہرحال سیرت نبوی کے مختلف مآخذ سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ انتظامی امور سے تمام معاملات و امور کا خواہ ان کا تعلق فوجی انتظامیہ سے ہو یا شہری نظم و نسق سے، مالی معاملات سے یا مذہبی امور کے نظام سے۔ ایک باقاعدہ تحریری ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ اس کی متعدد مثالیں گزشتہ مباحث میں گزر چکی ہیں اور کئی اور کا مطالعہ ہم آگے بھی کریں گے۔

(۴) خَرَص اور خارص (پیداوار کا تخمینہ اور اس کے افسر)

زمین کی پیداوار پر ہماری بحث میں ان افسرانِ حکومتِ نبوی کا حوالہ آچکا ہے جو خیبر اور دُوسری یہودی بستیوں کے باغات اور کھیتوں کی پیداوار کا تخمینہ لگاتے اور اس کو یہودی کاشتکاروں اور مسلم حصّہ داروں کے درمیان برابر برابر تقسیم کیا کرتے تھے۔ چونکہ عشر، نصف العشر، خراج اور جزیہ (جنس میں) وغیرہ تمام صدقات متناسب محاصل اور صدقات تھے، اس لیے تخمینہ (ASSESSMENT) ناگزیر ہو گیا تھا۔ ایسے پیداواری تخمینے کو مآخذ کی اصطلاح میں "خَرَص" کہا جاتا ہے اور اس کے افسر کو "خارص"۔ کتانی کی خرص کی بیان کردہ تعریف کہ اس سے مراد صرف کھجور کے باغوں (النخل) میں پختہ کھجور (الرُّطب) یا تحفظ یا اندازہ (حضر) تھا[۲۹۳] جزوی طور سے صحیح ہے کیونکہ وہ اس کے زمرہ سے تمام دُوسری فصلوں کو نکال باہر کرتی ہے۔ دوسری طرف خزاعی کا بیان ہے کہ عہدِ نبوی میں خرص کا تعلق صرف کھجوروں، انگوروں اور اناج کے دانوں (الحبوب) سے تھا اور انھیں پر تخمینہ کے اصول کا اطلاق ہوتا تھا۔[۲۹۴] لیکن یہ تعریف بھی مکمل طور سے صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ پیداوار کی تمام قسموں کا احاطہ نہیں کرتی ہے جبکہ عہدِ نبوی میں ہر وُہ پیداوار جو ایک خاص نصاب کو پہنچ جائے پیداواری زکوٰۃ یا محصول کے دائرہ میں آجاتی تھی اور اس لحاظ سے وہ خرص کے اصول اور خارص کے میدانِ عمل کی چیز تھی۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار جناب رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس ایک کھجور کے باغ کی پیداوار کا تخمینہ لگایا تھا۔ اس کا تعلق غزوۂ تبوک کے زمانے سے ہے۔ روایت کے مطابق جب آپ اپنے لشکر کے ساتھ وادی القریٰ کے علاقے میں پہنچے تو آپ کا گزر ایک مسلمان عورت کے ایک کھجور کے باغ پر ہوا۔ آپ نے اپنے بعض اصحاب سے اس کی پیداوار کا تخمینہ لگانے کو کہا اور خود آپ نے اس کا تخمینہ دس وسق لگایا جو بالکل صحیح تھا۔ بعد میں آپ نے اس کے مالکوں کو کھجور کے خوشوں کو شمار کرنے اور محفوظ رکھنے کی اپنی واپسی تک ہدایت دی۔[۲۹۵] روایت یہاں ختم ہو جاتی ہے لیکن اس کے بعد کے واقعات کو قیاس سے بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ قیاس یہ ہے کہ بعد میں ماہرینِ تخمینہ نے اس کی پیداوار کا اصلی تخمینہ لگایا ہوگا اور اس کی بنیاد پر اس کی زکوٰۃ وصول کی ہوگی۔ چنانچہ اس روایت کی بنیاد پر یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی مملکت کے

تمام مسلم اور غیر مسلم باشندوں کی قابلِ کاشت یا زیرِ کاشت اراضی خواہ باغ کی شکل میں ہو یا کھیت کی خرص کے اصول کے ماتحت تھی۔ اور اس اعتبار سے خارص کے دائرۂ کار اور محاصل کے حلقہ میں بھی تھی۔

ہر معیار اور اصول کے اعتبار سے حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجی ایک عظیم تخمینہ کار افسر (الخرّاص) تھے۔ وہ ہر فصل پر خیبر کی پیداوار کا تخمینہ لگایا کرتے تھے اور اپنے اس عہدۂ عظیم پر وہ غزوۂ موتہ میں اپنی شہادت تک فائز رہے تھے۔ ہمارے مستند مورخین کا اس بات پر اختلاف ہے کہ ان کا جانشین کون ہُوا تھا؟ کچھ کا خیال ہے کہ ان کے بعد خیبر کے خارص کے عہدہ پر حضرت ابوالہیثم بن التیہان اوسی کا تقرر ہوا تھا،[۲۹۶] جبکہ دُوسروں کا خیال ہے کہ حضرت جبّار بن صخر حضرت عبداللہ بن رواحہ کے جانشین بنے تھے۔[۲۹۷] دوسرے نقطۂ نظر کے مطابق حضرت جبّار بن صخر کے ساتھ خیبر کی پیداواروں کے تخمینے کے کام میں حضرت زید بن سلمہ خزرجی کو بھی کسی اعتبار سے شریک کیا گیا تھا۔[۲۹۸] اسد الغابہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرو بن سعید اموی کو خیبر کی پھلوں کی پیداوار کا "خارص" مقرر کیا گیا تھا۔[۲۹۹] اس علاقے کے لیے ایک اور تخمینہ کے افسر (خواص) کا ذکر ماخذ میں ملتا ہے۔ وُہ حضرت ابوحثمہ عامر بن ساعدہ خزرجی تھے جن کو عہدِ نبوی کے آخری زمانے میں اس منصب عظیم پر مقرر کیا گیا تھا اور ان کے سلسلے میں دلچسپ اور اہم امر یہ ہے کہ وہ اس عہدہ پر نہ صرف عہدِ نبوی ہی میں فائز رہے بلکہ پُوری خلافتِ راشدہ میں بھی اس پر قائم و دایم رہے اور حضرت علی کی خلافت کے اواخر میں غالباً اپنے انتقال کے سبب اس سے الگ ہوئے تھے۔[۳۰۰] ریاستی ملازمت میں مدت کے اعتبار سے یہ تقرری طویل ترین مثالوں میں سے ایک ہے جو تیس سال سے زیادہ مدت پر محیط ہے اور یقیناً وہ ایک عظیم انتظامی کارنامہ ہے۔ اس سے صحابی موصوف کی عظیم صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

اسلامی ریاست کے دُوسرے خطوں میں مدینہ منورہ کی زمین کی پیداوار کا حوالہ بھی ماخذ میں ملتا ہے جو ہمارے مطالعہ میں ایک دلچسپ عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسد الغابہ اور کتانی کے مطابق حضرت فروہ بن عمرو بیاضی خزرجی مدینہ منورہ کی پیداوار کا تخمینہ لگایا کرتے تھے۔ ان کا خاص میدان عمل کھجوروں کے باغ تھے اور دلچسپ امر یہ ہے کہ وُہ اس کے خوشوں کو گن کر پورے باغ کی پیداوار کا تخمینہ لگا لیتے تھے جو حقیقتاً بالکل صحیح ہوتا تھا۔ ماخذ کا دعوٰی ہے کہ وُہ اپنے کام میں اس قدر ماہر تھے کہ ان کا تخمینہ یا اندازہ (حساب) کبھی غلط نہیں ہوا۔[۳۰۱] اس تبصرہ سے مزید یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہدِ نبوی میں مدینہ کی پیداوار کے ایک مستقل خراص تھے ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سہل بن حثمہ بھی عہدِ نبوی کے خارصوں میں سے ایک تھے مگر ان کے بارے میں یہ ذکر نہیں مل سکا ہے کہ وُہ کہاں اور کیسے اپنے فرائض کو انجام دیتے تھے۔[۳۰۲]

محدث ابوداؤد نے اپنی ایک حدیث میں بیان کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عتاب بن اسید اموی کو مسلمانوں کی انگور کی پیداوار کے تخمینہ کا افسر مقرر کیا تھا۔ وہ کھجوروں کی پیداوار کو بھی ماپتے تھے اور ایک ہی اصول و ضابطہ کے مطابق انگوروں اور کھجوروں کی پیداوار کی زکوٰۃ وصول کرتے تھے۔[۳۰۳] اس روایت کی مزید تشریح بلاذری کی ایک روایت سے ہوتی ہے جس کا بیان ہے کہ صحابی موصوف طائف کے علاقے میں واقع بنو ثقیف کے انگور وغیرہ کے باغوں کی پیداوار کا تخمینہ لگاتے اور ان سے زکوٰۃ وصول کرتے تھے۔[۳۰۴] اس روایت کے مطابق یہ دلچسپ حقیقت ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ

حضرت عتاب اموی مکہ کے والی تھے لیکن وُہ اپنے پڑوسی علاقے کے خارص (افسرِ پیداوار و مصدق) بھی تھے۔ گویا کہ وہ اسلامی ریاست کے لیے بیک وقت دُہرا کام انجام دیتے تھے۔ لیکن تاریخی تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ بلاذری کو کچھ تسامح ہوا ہے۔ حضرت عتاب اموی یقیناً طائف اور اس کے مضافات میں واقع باغوں اور کھیتوں وغیرہ کی پیداوار کے افسر تھے مگر یہ پیداوار بنو ثقیف کی نہیں تھی بلکہ مکہ مکرمہ کے مالدار تاجر قریشیوں کی تھی جو اس علاقے میں بہت سی پیداواری زمین رکھتے تھے دراصل حضرت عتاب کا دائرۂ کار مکہ مکرمہ اور اس کے باشندوں کی جائدادیں تھیں خواہ وہ مکّہ کے حدود میں واقع ہوں یا طائف اور دُوسرے مضافات کے علاقے میں۔

مآخذ میں دُو اور "خارصوں" کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی تھے حضرات ابوزید بن الصلت اور الصلت بن معدی کرب۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں کا تعلق جنوبی عرب کے قبیلہ کندہ سے تھا۔(۴۰۵) غالباً دونوں اپنے اپنے مقامی علاقوں یا قبیلوں میں کام کرتے تھے کیونکہ مآخذ میں ان کے دائرۂ کار کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ جنوبی عرب میں زمین کی پیداوار کے تخمینہ اور اس کے افسروں (خارصوں) کے بارے میں ہماری معلومات کافی تشنہ ہیں لیکن مذکورہ بالا حقائق و شواہد اس نظریۂ خیال کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ اسلامی مملکت کے دوسرے خطّوں کی مانند جنوبی عرب میں بھی تمام قابلِ کاشت یا زیرِ کاشت اراضی کا تخمینہ لگایا جاتا تھا اور اس تخمینہ کی بنیاد پر پیداواری صدقات مقرر کیے جاتے تھے۔ اس فرض کی انجام وہی کے لیے یا تو مدینہ منورہ سے مرکزی افسرانِ خرص و تخمینہ روانہ کیے جاتے تھے یا مقامی "خارصین" کی تقرری کی جاتی تھی۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ جنوبی عرب کے مختلف علاقوں کے والی اپنے اپنے علاقوں کے لیے مقامی خارصین مقرر کرتے تھے اور انھیں کے ذریعہ پیداوار کا تخمینہ لگایا جاتا تھا اور پھر اس کی بنیاد پر صدقات وصول کیے جاتے تھے۔

مذکورہ بالا دس "خارصین" کی علاقائی و قبائلی تحلیل سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی غالب اکثریت یعنی تقریباً ساٹھ فیصد کا تعلق مدینہ کے انصاری قبیلہ خزرج سے تھا۔ اس سے یہ قیاس کرنا جائز ہو جاتا ہے کہ اس انصاری قبیلے کے لوگ اچھے کاشتکار اور ماہر تخمینہ کار تھے باقی پانچ میں سے دو کا تعلق قریش کے تاجر قبیلے سے تھا۔ اس حقیقت سے صحیح بخاری کی اس روایت کی مزید تصدیق ہوتی ہے جس کے مطابق مہاجرینِ مکّہ یعنی قریشِ مکّہ میں سے کافی تعداد میں لوگ زراعت میں لگ گئے تھے۔ دو اور کا تعلق قبیلہ کندہ سے تھا جو یمن کے زرخیز علاقہ میں آباد تھا جبکہ آخری خارص کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔ حضرت عمرو بن سعید اموی کے سوا جو ابتدائی مکی مسلم تھے باقی خارصین کا تعلقِ اسلام مکّہ کے آخری زمانے یا مدینہ کے زمانے سے تھا۔ آخر میں یہ اعتراف لازمی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے عہد نبوی میں خارصین کی جتنی حقیقی تعداد تھی اس کا عشر عشیر بھی مآخذ میں مذکور نہیں ہوا ہے۔ لہذا خارصین کی مذکورہ بالا تعداد کو ہی مکمل نہ سمجھا جائے۔ ان کی اصل تعداد بلا ریب اس سے کئی گنا زیادہ تھی۔

(۵) حمیٰ (چراگاہ) کا نظام اور اس کے افسر

زرعی نظام میں آخری طبقہ، عمالِ حکومتِ نبوی ان افسروں پر مشتمل تھا جو ریاستی چراگاہوں کے محافظ تھے۔ "حمیٰ" کے لفظی معنی محافظت، دفاع یا محفوظ علاقہ کے ہیں لیکن اصطلاحی معنی محفوظ چراگاہ کے آتے ہیں۔ غالباً یہ معنی اس سبب سے اس کے ہوئے کہ ہر قبیلہ/خاندان کی چراگاہ زمانۂ ما قبل اسلام میں محفوظ و مخصوص متصور ہوتی تھی۔ اس میں کسی "غیر" کا بلا اجازت داخلہ یا اس سے متعلق جاہلی روایات سے انحراف عام طور سے ایک جرمِ عظیم سمجھا جاتا تھا جو بسا اوقات متحارب و متخاصم فریقین کے بیچ مسلح ٹکراؤ کی صورت میں منتج ہوتا تھا اور اگر کبھی ایسا نہ ہُوا تو جنگ و جدال کا خدشہ ہمیشہ برقرار رہتا تھا۔ دراصل اس کے بعض اہم معاشی اسباب تھے۔ ریگستان میں سبزہ عارضی اور معمولی ہوتا تھا جو ایک قبیلہ/خاندان کی ضروریات کے لیے بھی کافی نہیں ہوتا تھا۔ نخلستان میں اگرچہ سبزہ مستقل ہوتا تھا اور نسبتاً زیادہ بھی۔ لیکن وُہ بھی مطلوبہ مقدار کی کفایت نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا یہ عربوں کے لیے فطری امر تھا کہ وہ اپنے اپنے سبزہ کی حفاظت کریں کہ ان کی زندگی کا بڑی حد تک انحصار اسی پر تھا۔ چنانچہ ہر قبیلہ اور خاندان خواہ وہ بدوی ہو یا شہری اپنے سبزہ اور چراگاہ کی زندگی کی مانند قدر کرتا تھا۔ جاہلی روایات نے تمام چراگاہوں کو چاہے وہ ریگستان میں ہوں یا نخلستان میں ان کے مخصوص قبیلوں اور خاندانوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا اور یہ روایات "اوّل قبضہ و تصرف اور اوّل و آخر مالک و حقدار" کے اصول پر مبنی تھیں۔ جاہلی عرب بھی ان روایات کا احترام عام طور سے کرتے تھے اور کبھی کبھی معاشی دباؤ سے تنگ آ کر ان چراگاہوں (حمیٰ) پر حملہ کرنے کے مرتکب بھی ہوتے تھے۔ عموماً یہ چراگاہیں واضح و صاف حدود رکھتی تھیں تاکہ غیروں کو اپنی آزادی کی حدود معلوم رہیں۔

اسلامی ریاست کے قیام سے پہلے مدینہ والوں کی اپنی چراگاہیں مدینہ کے مضافات میں تھیں اور ہجرت نبوی کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائلی روایات کے مطابق اسلامی ریاست کی مخصوص چراگاہیں بھی قایم کیں۔ مسلمانانِ مدینہ کی قبائلی یا اجتماعی چراگاہیں از خود ریاستی چراگاہوں میں تبدیل ہو گئیں جہاں مسلمانوں اور ریاست کے جانور چرا کرتے تھے بعد میں اسلامی ریاست کی خاص اپنی چراگاہیں بھی قائم کی گئیں جو مختلف علاقوں میں پھیلی ہُوئی تھیں۔ ان چراگاہوں کی حفاظت، وہاں چرنے والے مویشیوں کے تحفظ و نگرانی اور غیروں اور غارتگروں کے بلا اجازت داخلہ و غارتگری سے بچانے کی خاطر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم محافظوں کو باقاعدہ مقرر فرماتے تھے۔ مونٹگمری واٹ اور ان جیسے دوسرے مورخین نے اسلامی ریاست کے ان کارکنوں کو سماجی اور اقتصادی لحاظ سے کمزور اور فروتر اور ان کے کام کو "ادنیٰ و ذلیل" قرار دیا ہے۔ یہ دراصل عرب کے راعیانہ (PASTORAL) نظامِ معیشت سے نابلد ہونے کی دلیل ہے۔ عرب میں "راعی" (چرواہا) ہونا "ادنیٰ یا ذلیل" کام نہیں تھا۔ تاریخی شواہد اس کے بہت ہیں کہ قریش مکہ کے ممتاز خاندانوں کے نوجوان لڑکے لڑکیاں یہ کام بلا کسی عار و ننگ کے انجام دیا کرتے تھے کہ یہ ان کی معیشت کا ایک حصہ تھا۔ اسی طرح دُوسرے لوگ جو آمدنی کے ذرائع محدود رکھتے تھے اس پیشہ کو بلا تردد اپنا لیتے تھے اور محض اس پیشے کے سبب وہ عرب سماج میں حقارت کی نگاہ سے

نہیں دیکھے جاتے تھے۔ سماج میں اس پیشہ کے مقام و مرتبے کی مزید شہادتیں ہم کو اپنی اس موجودہ بحث میں آگے ملیں گی جن سے مستشرقین وجدید مورخین کے خیال کی خام کاری واضح ہو جائے گی۔

ماخذ کا بیان ہے کہ مدینہ منورہ کی چراگاہ (حمیٰ) جس مقام پر واقع تھی وہ "الجمّع" کہا جاتا تھا۔ شہرِ رسولِ اکرم سے تین میل کے فاصلہ پر ایک مضافاتی خطّہ تھا جو خاصا وسیع بھی تھا اور سرسبز و شاداب بھی۔ ہجرتِ نبوی کے محض ایک برس کے بعد ربیع الاول ۲ھ / ستمبر ۶۲۳ء میں مکہ کے ایک سردار کُرز بن جابر فہری نے اس پر حملہ کیا اور اسلامی ریاست کے کچھ جانوروں پر قبضہ کر کے ساتھ لے گئے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جوں ہی اس حملہ کی خبر ملی آپ نے حملہ آوروں کا تعاقب کیا لیکن وہ مسلمانوں کے کچھ مویشیوں کے ساتھ نکل بھاگنے میں کامیاب رہے۔[۳۰۶] رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور چراگاہ (حمیٰ) ایک مضافاتی مقام پر واقع تھی جس کو "ذوالجدر" کہا جاتا تھا اور وہاں آپ کے اونٹ بلکہ اونٹنیاں بھی (لقاح) چرا کرتی تھیں۔ واقدی کے مطابق یہ چراگاہ مدینے سے آٹھ میل دور واقع تھی جبکہ ابنِ سعد کا خیال ہے کہ وہ قبا کے نواح میں شہرِ نبی سے صرف چھ میل دُور تھی۔[۳۰۷] اس چراگاہ کے افسر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مولیٰ حضرت یسار تھے جو اپنے اصحاب کے ساتھ اس کی نگرانی کرتے تھے۔ شوال ۶ھ / فروری، مارچ ۶۲۸ء میں قبیلہ عُرینہ کے کچھ شرپسندوں نے دھوکا سے حضرت یسار کو قتل کر دیا اور ان کے زیرِ نگرانی مسلمانوں کے اونٹ (مسرح) پکڑ لے گئے مگر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بروقت اقدام نے حملہ آوروں اور غارت گردن کو ان کے انجام تک پہنچا دیا۔[۳۰۸]

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور چراگاہ جس کا ذکر ماخذ میں ملتا ہے الغابہ تھی۔ یہ دراصل ایک سرسبز و شاداب وادی تھی جو مدینہ اور مکّہ کے درمیان تجارتی شاہراہ کے قریب عسفان سے آٹھ میل پرے واقع تھی۔[۳۰۹] یہاں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ دُودھاری اونٹنیاں اور مسلمانوں کے جانور چرتے تھے۔ واقدی نے غزوۂ ذی قرد کے بیان میں ربذہ کی حمیٰ اور اس کے مضافاتی علاقہ البیضاء کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس چراگاہ میں اسلامی ریاست کے جانوروں کی چرائی وغیرہ کے انتظامات کی ذمہ داری حضرت ابو ذر غفاری کے ایک صاحبزادے جن کا نام "ذر" تھا اور جن کے نام صحابی موصوف کی کنیت بھی تھی۔ ادر کتانی کے بقول ایک اور صحابی حضرت عَریب المالکی جو ایک گمنام مسلم صحابی ہیں بھی ریاستی کارکن راعی تھے۔
بہرحال واقدی کے بیان سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ تمام مسلم مالکان نے اپنے اپنے مویشیوں کی دیکھ بھال کے لیے بھی اپنے آدمی رکھ چھوڑے تھے جو عام طور سے ان کے غلام تھے۔ ان میں حضرات مقداد بن عمرو، محمد بن مسلمہ اور عبدالرحمٰن بن عوف کے غلاموں کا ذکر صراحتاً کیا گیا ہے جو اپنے آقاؤں کے جانوروں کو وہاں چراتے تھے۔[۳۱۰] عام طور سے ہمارے سیرت نبوی کے ماخذ میں انہیں چراگاہوں کو اسلامی یا مسلم چراگاہوں کا درجہ دیا جاتا ہے اور بقیہ کا ذکر چھوڑ دیا جاتا ہے مگر ماخذ کے متفرق شواہد اور حوالوں سے بعض اور حمیٰ کا بھی ذکر ملتا ہے جو اسلامی ریاست نے جزیرہ نما کے مختلف علاقوں میں قائم کی تھیں۔

ایک بہت اہم شہادت واقدی کے بیان میں ملتی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی قطعۂ زمین کو کس طرح حمیٰ (چراگاہ) بنایا جاتا تھا اور کس طرح اس کی حد بندی کی جاتی تھی اور کیا اس کی حدود ہوتی تھیں۔ مورخ کا بیان ہے کہ

مریسیع کی مہم سے واپسی پر مسلم فوج کا گزر نقیع نامی ایک مقام سے ہوا جہاں متعدد تالاب (غدر) اور گھاس و سبزے (کلاء) کے خوب صورت قطعے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی خوب صورتی، وسعت اور سرسبزی سے بہت متاثر ہوئے۔ آپ نے وہاں قیام کیا اور اس علاقے کی آب و ہوا اور پانی کی فراہمی کے بارے میں معلومات و پوچھ تاچھ کی۔ آپ کو بتایا گیا کہ موسم گرما میں پانی کم ہو جاتا ہے کیونکہ تالاب سُوکھ جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ایک مشہور صحابی حاطب بن ابی بلتعہ کو وہاں ایک کنواں کھودنے کا حکم دیا جو ظاہر ہے کہ متعدد مسلمانوں کی مدد سے کھودا گیا۔ آپ نے پورے علاقہ نقیع کو محفوظ کرنے (یحمی) کا حکم دیا اور اعلان کیا کہ وہ پورا علاقہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی "حمیٰ" میں شامل کر لیا گیا ہے۔ پھر آپ نے مشہور صحابی اور قبیلہ مزینہ کے ایک سردار حضرت بلال بن حارث مزنی کو اس کا افسر مقرر کیا اور اس کی نگاہ و پرداخت کے لیے واضح ہدایات و احکام دیے۔ حضرت بلال مزنی نے دریافت کیا کہ اس کی حدود حفاظت و نگرانی کیا ہوں گی اور اس کی حفاظت و حد بندی کیونکر کی جائے؟ آپ نے حضرت بلال کو ہدایت کی کہ "ایک بلند آواز شخص سے کہو کہ صبح تڑکے ایک پہاڑی پر چڑھ کر اپنی آواز کی انتہائی قوت کے ساتھ پکارے اور وہ چاروں کونے جہاں تک اس کی آواز سنی جائے اس حمیٰ کی حدیں ہوں گی۔ اور یہ چراگاہ مسلمانوں اور اسلامی ریاست کے جنگی گھوڑوں اور اونٹوں کے لیے محفوظ ہو گی۔" ایک اہم اور دل چسپ بات اس چراگاہ کے ضمن میں یہ بھی ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اپنے جانوروں (صوائم) کی آزادی سے چرنے کی اس چراگاہ میں ممانعت کر دی تھی سوائے کسی مسلمان عورت یا کمزور و غریب مسلمانوں کے جانوروں کے اور ان کو بھی صرف اس صورت میں مستثنیٰ کیا گیا تھا کہ بشرطیکہ ان کے جانور بھٹک کر وہاں پہنچ گئے ہوں۔ روایت کا مزید بیان ہے کہ یہ چراگاہ ریاست کی ملکیت اور اس کے لیے مخصوص تھی اور عہدِ عثمانی تک اس کی یہی حالت رہی تھی۔[۳۱۱] نقیع کی ریاستی چراگاہ کے ایک اور افسرِ نگراں کا نام تھا حضرت عبید بن مُرودِج مزنی جو غالباً حضرت بلال مزنی کے جانشین یا ساتھی تھے۔[۳۱۲] یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ریاستی مویشیوں کی دیکھ بھال کے لیے مددگاروں کی ایک جماعت ان کارکنوں کے ساتھ رہتی تھی۔ ماخذ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ قبیلۂ مزینہ کے علاقے میں واقع تھا اور ان کے لوگوں سے اس کی حمایت و حفاظت کرائی جاتی تھی۔

طائف کے لوگوں کے قبولِ اسلام کے بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثقیف کے لوگوں کو جو نامۂ تحفظ دیا تھا اس میں یہ حکم بھی تھا کہ "وج" کا علاقہ ریاستی حمیٰ ہو گا۔[۳۱۳] یاقوت حموی کا خیال ہے کہ یہ طائف کا دوسرا نام تھا۔[۳۱۴] لیکن یہ کلی طور پر صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ پورے طائف کو حمیٰ بنانا ناممکن تھا البتہ یہ ممکن ہے کہ وہ طائف کے کسی مضافاتی علاقہ کا نام ہو۔ بہرحال یہ حمیٰ خالصتاً ریاستی مقاصد کے لیے مخصوص تھی اور اس کی لمبی خاردار جھاڑیوں (اضاح) اور شکار (صید) کو کاٹنا اور مارنا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ حکم عدولی کرنے والوں کو کوڑوں کی سزا دی جا سکتی تھی یا ان کے کپڑوں سے ان کو محروم کیا جا سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں سب سے دل چسپ حقیقت یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حمیٰ کا افسر مشہور صحابیِ رسول اور قریش کے ایک سربرآوردہ رکن حضرت سعد بن ابی وقاص زہری کو مقرر کیا تھا۔ حضرت سعد قریشی اور دوسرے سربرآوردہ مزنی صحابہ کی اس عہدہ پر تقرری سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک اہم عہدہ تھا اور اس سے محض "چرواہا" مراد لینا

غلط ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس عہدہ پر فائز ہونا کسی طرح سے "غربت و فروتر سماجی مقام" کی کسی طور علامت نہیں تھی، جیساکہ ہمارے بعض جدید مورخوں نے سمجھا ہے۔[315]

(۶) عہدِ نبوی میں نظامِ قطائع

اراضی پر مشتمل جائدادوں کی تقسیم ریاستوں اور مملکتوں کی ایک رسمِ قدیم ہے اور حکمراں و محکوم دونوں طبقات اس کو ریاستوں کا ایک قانونی اور دستوری حق تسلیم کرتے آئے ہیں۔ معاشرتی سطح پر حکمرانوں نے زمین کے چھوٹے بڑے ٹکڑے اپنی غریب اور ضرورت مند رعایا کے علاوہ مذہبی طبقات اور اداروں اور اپنے سیاسی وفاداروں کے درمیان ہمیشہ تقسیم کیا ہے۔ حکمرانی کے اس قدیم دستور کے مطابق اسلامی ریاست کے قیام کے بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے سیرت نگاروں اور مورخینِ اسلام کے بیان کے مطابق زمین کے چھوٹے بڑے ٹکڑے اور قطعے صحابہ کرام کے درمیان، خواہ وہ مہاجرین رہے ہوں یا انصار یا بدوی عرب قبائلی مسلمان، بانٹے تھے۔ تاریخِ اسلام میں ان موہوبہ اراضی کے قطعوں کو قطائع (واحد قطیعہ) کہا جاتا ہے جس کے لغوی معنے کاٹے ہوئے حصہ یا قطعہ کے ہوتے ہیں۔ بعد کی اسلامی حکومتوں کے زمانے میں یہ نظام "قطائع" اقطاع کے نام سے زیادہ مشہور ہوا اور مختلف اسلامی ممالک میں عمل پذیر بھی ہوا۔

اسلامی تاریخ میں اراضی پر مشتمل جائدادوں کی تقسیم بڑی دلچسپ اور اہم ہے۔ یہ اب ایک مسلّم حقیقت ہے کہ ہجرت کے معاً بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شہرِ رسول کا واحد حکمراں تسلیم کر لیا گیا تھا جس کو حکمرانی کے تمام اختیارات اور اقتدار کے سارے ذرائع حاصل تھے اور ان میں سے ایک قطائع تقسیم کرنے کا حق و اختیار بھی تھا۔ ابنِ سعد نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف اصحاب کے تراجم و سوانحی خاکوں میں عام طور سے ان قطائع کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کو دربارِ رسالت سے ملے تھے۔ ان بیانات سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ انصارِ مدینہ نے شہر اور اس کے مضافات کی تمام افتادہ زمینوں پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے الفاظ میں اسلامی ریاست کا حقِ ملکیت تسلیم کر لیا تھا۔ بلکہ فیاض انصار نے تو اپنی مملوکہ جائدادیں بھی آپ کے قدموں پر نچھاور کر دی تھیں۔ بہرحال ہجرت کے بعد مہاجرین کی سب سے بڑی ضرورت رہائش کی تھی۔ شروع کے زمانے میں وہ وسیع دل، کشادہ چشم اور سخی انصار کے گھروں میں ان کی بے مثل فیاضی و سخاوت و ضیافت کے مزے لوٹتے رہے۔ لیکن کچھ مدت بعد وہ اپنے مکانوں اور جھونپڑوں میں منتقل ہو گئے۔ یہ مکانات اور جھونپڑے ان قطائع پر بنائے گئے تھے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصارِ مدینہ کی موہوبہ اراضی یا افتادہ زمینوں سے عطا کیے تھے۔ جن صحابہ کرام کے بارے میں صراحتاً ذکر آتا ہے کہ ان کو رہائشی مکانات بنانے کے لیے قطائع نبوی ملے تھے ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں: حضرات عبیدہ بن حارث مُطّلبی اور ان کے دو بھائی طفیل اور حصین مُطّلبی،[316] عثمان بن عفان اموی،[317] زبیر بن عوام اسدی،[318] عبداللہ بن مسعود ہذلی،[319] سعد بن ابی وقاص زہری اور ان کے بھائی،[320] مقداد بن عمرو قضاعی،[321] ابوبکر تیمی،[322] طلحہ بن عبداللہ تیمی،[323] ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی،[324] ارقم بن ابی ارقم مخزومی،[325] عمار بن یاسر عنسی مذحجی،[326] عمر بن خطاب عدوی،[327] عثمان بن مظعون جمحی اور ان کے متعدد بھائی،[328] اور بہت سے دوسرے

مہاجرین۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ تمام بے گھر مہاجرین کو آباد کاری کے لیے رہائشی قطائع ملے تھے خواہ ان کے نام ماٰخذ میں مذکور ہوں یا نہ ہوں۔ کچھ ایسے بھی مکی مسلمان تھے جو اسلام سے قبل مکّہ کی سکونت ترک کر کے مدینہ آ بسے تھے اور وہاں انھوں نے جائدادیں بنالی تھیں۔ ان میں حضرت سعد بن ابی وقاص کے ایک بھائی حضرت عتبہ جیسے لوگ شامل تھے۔

بعد میں جوں جوں مسلمان مکہ یا دوسرے علاقے سے آتے گئے ان کو رہائشی مکانات کے لیے قطائع ملتے گئے جیسا کہ حضرات خالد بن ولید مخزومی[(۳۲۹)]، عباس بن عبد المطلب ہاشمی[(۳۳۰)] اور نوفل بن حارث ہاشمی[(۳۳۱)] وغیرہ متعدد مہاجرین کے معاملات سے واضح ہوتا ہے۔ اسلامی ریاست کے سیاسی اثر و نفوذ کے دائرہ میں وسعت و توسیع اور پھر بعد میں علاقائی مقبوضات کے حصول و حق ملکیت ارض کے اصول کے تسلیم کرنے کے بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قطائع تقسیم کرنے کے حق کو شہر مدینہ کی حدود کے باہر بھی تسلیم کر لیا گیا۔ چنانچہ روایت ہے کہ رمضان ۲ھ / مارچ ۶۲۴ء میں حضرت کشد جہنی کے ایک بھانجے کو ینبوع کے علاقے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک وسیع قطیعہ عطا فرمایا تھا۔ یہ واضح رہے کہ یہ قطیعہ اصلاً حضرت کشد جہنی کو ان کی خدمات کے عوض عطا کیا جا رہا تھا۔ لیکن بوڑھے چچا نے اپنی دراز عمری کے سبب اپنے بھانجے کو دلوا دیا تھا۔[(۳۳۲)] بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زبیر بن عوام اسدی اور حضرت خالد بن ولید مخزومی کو بالترتیب مدینہ کے یہودی قبیلہ بنو نضیر اور یہودِ خیبر کی اراضی سے قطائع عطا کئے گئے تھے۔[(۳۳۳)]

رہائشی مکانات کے لیے قطائع کے علاوہ متعدد قطائع زرعی اور تجارتی مقاصد سے بھی دئے گئے تھے۔ حضرت زبیر بن عوام کا بنو نضیر کی زمین کا قطیعہ جس کا ابھی ذکر ہوا اسی قسم اور زمرے میں بھی آتا ہے کیونکہ وہ ایک "بقیع" پر مشتمل تھا۔ "بقیع" اصطلاحی طور پر اس اراضی کو کہتے تھے جس میں کافی درخت ہوتے تھے۔ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قطیعہ کھجوروں اور دوسرے درختوں کے باغ پر بھی مشتمل تھا۔ اسی طرح حضرات ابوبکر اور ربیعہ بن اسلمی کو جو قطائع ملے تھے ان میں کھجور کے درخت بھی تھے۔[(۳۳۴)] حضرت عبد اللہ بن جحش اسدی کے ایک صاحبزادے حضرت محمد بن عبد اللہ اسدی کو جو قطیعہ عطا ہوا تھا وہ سوق الدقیق (آٹے کا بازار) میں واقع تھا[(۳۳۵)] اور غالباً کسی دکان وغیرہ پر مشتمل تھا۔ اور اگر نہیں بھی تھا تو اس کی تجارتی اہمیت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر برکات احمد وغیرہ کی دلیل کے مطابق بنو قینقاع کی اراضی اور بازار مسلمان مجاہدین میں تقسیم نہیں ہوا تھا تو کم از کم بنو نضیر کے باغات اور کھیت نیز بنو قریظہ کے مجرمین کی ضبط شدہ اراضی بھی زرعی مقاصد سے مسلمان مہاجرین اور انصار میں تقسیم کی گئی تھی۔ ہم پہلے ہی ان جائدادوں کی تقسیم پر بحث کر چکے ہیں اس لیے اسے دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمام مفتوحہ اراضی جو خیبر یا دوسرے شمالی علاقوں میں حاصل کی گئی تھی عام طور سے ان کے پرانے مالکوں کے قبضہ میں دی گئی تھی لیکن ان میں سے بھی بعض قطائع دئے گئے تھے۔ عام طور سے یہ قطائع ان زمینوں میں سے عطا کیے گئے تھے جو اسلامی ریاست کے حصہ ——— خمس ——— میں پڑی تھیں جیسا کہ حضرت ہذیم بن ماکولا جن کا تعلق بنو عبد مناف سے تھا، کے معاملہ سے ظاہر ہوتا ہے۔[(۳۳۶)]

مدنی لوگوں کے علاوہ جن لوگوں کو ابتدائی زمانے میں قطائع ملے تھے ان کا تعلق ان دو بدوی قبیلوں سے تھا جو

شہرِ رسول کے مغرب میں آباد تھے یعنی جہینہ اور مزینہ سے۔[۳۳۷] موخر الذکر کے ایک اہم فرد حضرت بلال بن حارث مزنی کے قطیعہ کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے۔ ماخذ کے مطابق رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فُرع کے علاقے میں اَلقبلیّۃ کی کانیں نیز قُدس کے علاقے کی قابلِ کاشت اراضی قطیعہ میں دی تھی۔ ان کا قطیعہ کافی وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا تھا جس میں کھجور کے باغ، پیداواری کھیت اور درخت تھے جن پر شہد کی مکھیوں کے چھتے بھی لگے تھے۔[۳۳۸] یحییٰ بن آدم کا خیال ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ قطیعہ ان کی درخواست پر دیا تھا۔[۳۳۹] دوسرے ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بلا مشروط تملیکِ ارض کا قطیعہ نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ یہ شرط بھی عاید کر دی گئی تھی کہ وہ کاشت کرتے رہیں گے۔ دُوسرے مزنی صحابی جن کے قطیعہ کا ماخذ میں صریح ذکر ملتا ہے حضرت معقل بن سنان ہیں۔[۳۴۰] لیکن اس کی نوعیت، مقام اور حدود وغیرہ کے بارے میں تفصیلات کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے اس لیے کچھ مزید کہنا مشکل ہے۔

قبیلہ جہینہ کے لوگوں کو اجتماعی طور سے بڑے قطائع دئے گئے تھے جو وسیع اراضی اور عریض وادیوں پر مشتمل تھے مگر ان پر یہ شرط عائد کر دی گئی تھی کہ اپنی زمینوں کی پیداوار پر خمس (۱/۵) ادا کرتے رہیں گے۔ اس کے بعد ان کو ان کے سبزہ اور پانی وغیرہ سے فائدہ اٹھانے کا پُورا حق حاصل ہوگا۔[۳۴۱] رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک گرامی نامے کے مطابق جہینہ کے ایک خاندان بنو شمخ کو شُفینہ نامی زمین میں سے وہ اراضی قطیعہ میں دے دی گئی تھی جس کو وہ زیرِ کاشت لے آئیں۔[۳۴۲] اسی طرح ایک جہنی سردار حضرت عوسجہ بن حرملہ کو ذی المروہ کے علاقے میں ایک وسیع قطیعہ عطا کیا گیا تھا اور اس کی حدود کو صاف صاف واضح کر دیا گیا تھا۔[۳۴۳]

دو غفاری صحابہ کرام حضرات نضلہ بن عمرو اور عُمیر کو بالترتیب الصفراء اور وادی القریٰ کے علاقوں میں کچھ زمین بطور قطیعہ دی گئی تھی جہاں وُہ دونوں رہتے بھی تھے،[۳۴۴] جبکہ قبیلہ اسلم کے ایک فرد حضرت حصین بن اوس کو اَلفرغَین اور ذات اَعشاح کے علاقے میں اراضی کا قطیعہ دیا گیا تھا۔[۳۴۵] غالباً یہ دونوں گاؤں تھے۔ روایت ہے کہ قبیلہ عُقیل بن کعب کے تین افراد کو وادی عقیق کا غالباً کچھ حصہ قطیعہ کے طور پر عطا کیا گیا تھا۔ ان کے قطائع میں چشمے اور کھجور کے باغات تھے۔ ان پر یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ وہ اسلامی ریاست کے ہمیشہ وفادار رہیں گے اور وقت پر نمازیں پڑھیں گے اور باقاعدہ زکوٰۃ ادا کیا کریں گے۔[۳۴۶]

قبیلہ بنو سلیم کے متعدد صحابہ کا ذکر ملتا ہے جن کو اسلامی ریاست کی جانب سے قطائع عطا کئے گئے تھے۔ سب سے اہم اور دلچسپ قطیعہ حضرت ہوذہ بن نبیشہ کا تھا جن کا قبائلی تعلق عُصیہ کے خاندان سے تھا۔ ان کو اتنی اراضی دی گئی تھی جو الجفر سے محیط تھی۔[۳۴۷] اسی طرح خاندانِ رِعل کے ایک صحابی حضرت سعید بن سفیان کو سورقیہ کے علاقے میں کھجوروں کا ایک باغ مع ایک محل (قصر) کے عطا ہوا تھا۔[۳۴۸] اسی طرح حضرت سلیمہ بن مالک، وقاص بن قدامہ اور ان کے بھائی عبداللہ، عباس بن مرداس سلمیٰ الاَجَبت، رشید بن عبدالرب اور ہرمی بن عوف کو بھی ایسے قطائع عطا کیے گئے تھے جن کے حدود پوری طرح واضح کر دیئے گئے تھے۔[۳۴۹] غالباً ان تمام حضرات کے قطائع ان کے روایتی علاقوں میں تھے جہاں بنو سلیم آباد تھے۔ لیکن حضرت سراج بن مجاعہ سلمی کو یمن کے ایک علاقے میں قطیعہ عطا ہوا تھا جس کا نام الغورہ تھا۔[۳۵۰] یہ حقیقت بھی دلچسپ ہے کہ حضرت عتبہ بن فرقد سُلمی کو اپنا مکان بنانے کے لیے ذی المروہ کے قریب مکہ میں اراضی عطا کی گئی تھی۔[۳۵۱] اسی طرح حضرات ابو ہوذہ عرض اور عمرو بن عامر بن

ربیعہ کو اپنے رہائشی مکانات بنانے کے لیے بعض مقامات پر اراضی کے قطیعے ملے تھے۔[۳۵۲]

ہوازن کے متعدد اشخاص کو بھی اپنے وطن کے قریبی علاقوں میں قطائع ملے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت ثور بن عروہ قشیری کو وادی عقیق میں دو قطیعے ملے تھے جن کا نام حمّام اور اَلسدّ تھے۔[۳۵۳] حضرت الرفاد بن ربیعہ کو جو قطیعہ ملا تھا اس کی تفصیلات مذکور نہیں ہیں۔[۳۵۴] حضرت ثمن بن عمرو بن حجر کا قطیعہ الرسلین اور الدرکاء نامی علاقوں کے بیچ میں آباد تھا۔[۳۵۵] حضرت حصین بن نضلہ' جن کا تعلق بنو اسد/خزیمہ سے تھا، کو جو قطیعہ ملا تھا اس کا نام ترمذ تھا؛[۳۵۶] جبکہ حضرت عداؑ بن خالد بن عمرو بن عکرمہ کو خزار نامی علاقے سے ایک وسیع اراضی بطور قطیعہ ملی تھی۔[۳۵۷]

ذکر آچکا ہے کہ بنو عذرہ کے ایک مسلم حضرت حمزہ بن نعمان جب اپنے لوگوں کے صدقات لے کر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تو غالباً ان کی شاندار خدمات اور اسلامی ریاست سے غیر متزلزل وفاداری کے سبب ان کو وادی القریٰ میں ایک وسیع رقبۂ اراضی پر مشتمل قطیعہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا تھا۔ ان کا قطیعہ اتنا وسیع و طویل تھا کہ جہاں ان کا گھوڑا دوڑ سکتا تھا اور وہ خود تیر اندازی کی مشق کر سکتے تھے۔[۳۵۸] عام طور پر یہ مبالغہ کیا جاتا ہے کہ جہاں تک صحابیٔ موصوف کا گھوڑا دوڑ سکا تھا وہاں تک کی زمین ان کو بطور قطیعہ عطا کر دی گئی تھی حالانکہ یہ تعبیر قیاس کے بھی خلاف ہے اور روایت کی منشا کے بھی۔ پھر ان کی تیر اندازی کی مشق کے لیے کافی زمین کا فقرہ بھی اس کی مناسب حد بندی کرتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان کو میلوں زمین عطا کر دی گئی تھی صحیح نہیں۔ البتہ وُہ اتنی وسیع و عریض ضرور تھی جہاں وہ تیر اندازی اور گھوڑ سواری کی مشق کر سکیں۔ بنو عذرہ کے ایک اور صحابی حضرت جمیل بن ردم کو زمین کا ایک قطعہ عطا کیا گیا تھا جو ردہ کہلاتا تھا۔[۳۵۹] قبیلہ جذام کے ایک خاندان بنو جفل بن ربیعہ کو اجتماعی طور سے جو قطیعہ دیا گیا تھا وہ اران کہلاتا تھا۔[۳۶۰] ان روایتوں کو جن کے مطابق قبیلہ لخم کے داری لوگوں کو عہد نبوی میں فتوحات سے قبل شام میں قطائع دئے جانے کا ذکر کیا گیا ہے قرونِ وسطیٰ کے مسلمان فقہاء اور جدید مورخوں اور مستشرقین نے یکساں طور سے غیر صحیح قرار دے کر مسترد کر دیا ہے اگرچہ دونوں کے دلائل الگ الگ ہیں۔[۳۶۱]

شمالی قبائل میں بنو الحارث کے متعدد لوگوں کو بھی باقاعدہ حد بند قطائع عطا کئے گئے تھے۔ یہ تمام قطائع مشروط تھے کیونکہ ان کے مالکوں سے نماز قایم کرنے کے علاوہ زکوٰۃ ادا کرنے، جہاد میں حصہ لینے، مشرکوں سے قطع تعلق کرنے اور تمام معاملات میں خدا اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و امور کو بلا کسی پس و پیش کے قبول کرنے کی شرائط عاید کی گئی تھیں۔[۳۶۲] یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ نہد کے خاندان بنو قرہ کو المنطلہ نامی علاقہ بطور حمیٰ عطا کیا گیا تھا تاکہ وہ وہاں اپنے مویشی چرا سکیں۔[۳۶۳] اسی طرح بنو سمعان کے ایک شخص حضرت ہلال کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثعلبہ نامی وادی بطور چراگاہ دی تھی۔[۳۶۴] دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ عطیہ صحابی موصوف کی درخواست پر دیا گیا تھا، جبکہ حضرت قرہ بن ربیعہ کو حضر موت کے علاقے میں ایک قطیعہ ملا تھا۔[۳۶۵]

مآخذ میں یمامہ کے بعض لوگوں کے قطائع دئے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت مجاعہ بن مرارہ کو الغورہ، الغربہ اور الحبل نامی تین اراضی عطا کی گئی تھیں۔[۳۶۶] اسد الغابہ میں حضرت حصین بن مشمت تمیمی کو ایک قطیعہ عطا کرنے کا دلچسپ

بیان ملتا ہے۔ اس کے مطابق ان کو ایک وسیع رقبہ عطا گیا تھا جس میں متعدد چشمے (میاہ) تھے۔ ان کے علاوہ گھاس کے تختے اور درخت بھی کافی تعداد میں تھے۔ ان پر یہ شرط بھی عائد کی گئی تھی کہ وہ نہ تو اس کے پانی سے کسی کو محروم کریں گے اور نہ ہی اس کی گھاس اور درختوں کو کاٹیں یا ضائع کریں گے۔[۳۶۷] حضرت مشمرج بن خالد سعدی کو جو قبیلہ عبد القیس کے وفد میں آئے تھے ان کے وطن کے میدانی علاقوں میں واقع ایک چشمہ بطور قطیعہ عطا گیا تھا۔[۳۶۸] غالباً اس چشمہ کے ساتھ کچھ اراضی بھی ملی تھی۔ دہناء کے علاقے میں حضرت قتادہ بن اعور تمیمی کو ایک گاؤں بطور قطیعہ ملا تھا جس کا نام شبکہ تھا۔[۳۶۹] اصابہ کے مطابق مشہور صحابیِ رسول حضرت فرات بن حیان عجلی کو یمامہ کے علاقے میں ایک اراضی پر مشتمل جائداد بطور قطیعہ عطا ہوئی تھی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی سالانہ آمدنی بیالیس ہزار درہم تھی۔[۳۷۰] غالباً یہ واحد قطیعہ ہے جس کی بالکل صحیح مالیت کا اندازہ ملتا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ نہ صرف منفرد بھی ہے بلکہ بے انتہا اہم تاریخی شہادت بھی۔

مذکورہ بالا قطائع کے علاوہ جو غالباً سب کے سب قابلِ کاشت اراضی پر مشتمل تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ مردہ زمینوں (ارض موات) بھی مختلف لوگوں کو بطور قطائع عطا فرمائی تھیں تاکہ ان پر کاشت کی جائے اور زراعت کو اس طرح ترقی دی جائے۔ اصطلاح میں ایسی زمین کو ارضِ احیاء کہا جاتا ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ مُردہ اور بے کاشت زمینوں کو زراعت کے قابل بنایا جائے۔ اس کا واضح سبب یہ تھا کہ زراعت کو ترقی دی جائے اور زمین کی پیداوار کو بڑھایا جائے جو عرب میں کافی کم تھی مگر حیاتِ انسانی کے لیے انتہائی ضروری اور مفید تھی۔ بیشہ کے باہلی باشندوں کو ایسی ہی زمین عطا کی گئی تھی۔[۳۷۱] دوسری زمین یا قطیعہ جو اس زمرہ میں آتا ہے پہلی کی مانند ذکر کی جا چکی ہے یعنی وہ سفینہ نامی زمین تھی جو جہینہ کے خاندان بنو شمخ کو عطا کی گئی تھی۔ اسی طرح ذکر آ چکا ہے کہ حضرت بلال مزنی کو بھی قطیعہ اسی شرط پر دیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں صحابیِ موصوف کے قطیعہ کا بیشتر حصہ واپس لے لیا تھا کیونکہ وہ اس پورے علاقہ یا رقبے کو زیرِ کاشت رکھنے میں ناکام رہے تھے۔[۳۷۲] یہی معاملہ جہینہ یا مزینہ کے لوگوں کے قطائع کے ساتھ ہُوا تھا جنھوں نے اپنی زمینوں کو مدتوں بلا کاشت کیے بیکار چھوڑے رکھا تھا۔[۳۷۳] اس کا مطلب یہ ہُوا کہ بلا کاشت اراضی عام طور سے اور قابلِ کاشت زمینیں خاص طور سے اس وقت قطائع پانے والوں کے قبضہ و تصرف میں رہ سکتی تھیں جب تک وُہ ان پر کاشت کرتے رہیں۔ کافی مدت تک ان کو بلا کاشت چھوڑنا در اصل ان پر اپنا حقِ ملکیت یا حقِ تصرف کھو دینے کے مترادف تھا۔

(ب) طُعمہ / طُعَم

قطائع کے علاوہ جن میں اراضی پر ملکیت حاصل ہو جاتی تھی اور اس کے نتیجے میں صاحبانِ قطائع اس کی پیداوار وغیرہ سے مستفید ہو سکتے تھے عطیہ کی ایک اور قسم کا بھی مآخذ میں ذکر ملتا ہے اس کو طُعمہ کہا جاتا ہے اس میں صاحبِ طُعمہ کو زمین کی پیداوار کے ایک حصہ سے مستفید ہونے کا حق مستقل یا عارضی طور پر مل جاتا تھا مگر ملکیت کے حقوق نہیں ملتے تھے۔ ایک لحاظ سے یہ بھی اقطاع یا قطائع کی ایک قسم تھی۔ اس قسم کے عطیہ کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ طُعمہ اور عطاءؑ ہیں اور عطاءؑ

کرنے کے فعل کے لیے لفظ اُطعَمَ (کھلایا) آتا ہے۔[۳۷۴] طُعمَہ کی اولین عطیات کا تعلق غالباً خیبر اور اس کی نواحی یہودی بستیوں کی زمینوں سے ہے جن سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد اصحاب کو طُعَم (جمع طُعمہ) عطا فرمائے تھے۔ واقدی کے مطابق یہ عطایا حسبِ ذیل تھے:

نمبر شمار	صاحبِ طعمہ	کھجوریں		جَو (شعیر)
۱	نو ازواج مطہرات میں سے ہر ایک	۸۰ وسق	+	۲۰ وسق
		کل ۷۲۰ وسق	+	۱۸۰ وسق
۲	حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمی	۲۰۰ وسق		۰
۳	حضرات علیؓ و فاطمہ ہاشمی	۲۱۵ وسق	+	۸۵ وسق[۳۷۵]
۴	حضرت اسامہ بن زید[۳۷۶]	۱۱۰ وسق	+	۴۰ وسق
۵	حضرت ام رمثہ بنت عمر بن ہاشم بن عبدالمطلب	۰		۵ وسق
۶	حضرت مقداد بن عمرو	۰		۱۵ وسق
	میزان	۱۳۴۵ وسق	+	۳۴۵ وسق

واقدی کے بیان کے مطابق موخر الذکر صحابی نے اپنا حصہ خلافت راشدہ میں کسی وقت ایک لاکھ درہم میں بیچ دیا تھا۔[۳۷۷] روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابی موصوف کے وارثوں نے حضرت معاویہ بن ابی سفیان کے ہاتھ ان کی خلافت کے زمانے میں یہ سودا کیا تھا۔ یہاں یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ خلافتِ راشدہ معاویہ میں قیمتوں میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا اور ان پر عہدِ نبوی کی قیمتوں کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ اس بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ صحابی موصوف کے حصہ کی اصل مالیت کیا تھی۔

واقدی کی ایک اور مفصل روایت کے مطابق حسب ذیل حضرات کو یہ حصے ملے تھے:

نمبر شمار	صاحبانِ طُعَم	کھجور/جَو وغیرہ
۱	حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ تیمی	۱۰۰ وسق
۲	حضرت عقیل بن ابی طالب ہاشمی	۱۴۰ وسق
۳	حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمی	۵۰ وسق
۴	حضرت ربیعہ بن حارث ہاشمی	۱۰۰ وسق
۵	حضرت ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب ہاشمی	۱۰۰ وسق
۶	حضرت صلت بن مخرمہ بن مطلب مطلبی	۳۰ وسق

۷	حضرت ابونبقہ	۵۰ وسق
۸	حضرت رکانہ بن عبد یزید	۵۰ وسق
۹	حضرت قاسم بن مخرمہ مطلبی	۵۰۰ وسق
۱۰	حضرت مسطح بن اثاثہ بن عباد اور ان کی بہن ہند	۳۰ وسق
۱۱	حضرت صفیہ بنت عبد المطلب ہاشمی	۴۰ وسق
۱۲	حضرت بحینہ بنت حارث بن مطلب	۳۰ وسق
۱۳	حضرت ضُباعہ بنت زبیر بن مطلب	۴۰ وسق
۱۴	حضرت حصین، خدیجہ اور ہند اولاد حضرت عبیدہ بن حارث	۱۰۰ وسق
۱۵	حضرت ام حکیم بنت زبیر بن عبد المطلب ہاشمی	۳۰ وسق
۱۶	حضرت ام ہانی بنت ابی طالب ہاشمی	۴۰ وسق
۱۷	حضرت جمانہ بنت ابی طالب ہاشمی	۳۰ وسق
۱۸	حضرت ام طالب بنت ابی طالب ہاشمی	۳۰ وسق
۱۹	حضرت قیس بن مخرمہ بن مطلب	۵۰ وسق
۲۰	حضرت ابو ارقم	۵۰ وسق
۲۱	حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر صدیق	۴۰ وسق
۲۲	حضرت ابو سبرہ	۴۰ وسق
۲۳	حضرت ابن ابی جبیش	۳۰ وسق
۲۴	حضرت عبداللہ بن وہب اور ان کے دو فرزند [۳۷۸]	۵۰ وسق
۲۵	حضرت نمیلہ کلبی	۵۰ وسق
۲۶	حضرت ملکان بن عبدہ	۳۰ وسق
۲۷	حضرت ام حبیبہ بنت جحش	۳۰ وسق
۲۸	حضرت محیصہ بن مسعود	۳۰ وسق
۲۹	رہاویون (قبیلہ رُہاء کے لوگ)	۱۰۰ وسق
۳۰	داریون (لخم کے خاندان کے لوگ جو دس تھے) [۳۷۹]	۱۰۰ وسق
۳۱	اشعریون (اشعر کے لوگ)	۱۰۰ وسق
	میزان	۱۷۴۰ وسق

ابنِ اسحاق کے بیان میں طعمہ پانے والوں کے نام اور ان کے حصے بھی کچھ مختلف ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق کل عطایا کا میزان ۲,۸۳۰ وسق کھجور اور ۳۲۵ وسق گیہوں (حنطہ) ہے، جبکہ واقدی کے یہاں وہ ۲۹۹۵ وسق کھجور رہے البتہ گیہوں کا میزان دونوں کا ایک ہے۔ یہاں ایک تبصرہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ طعمہ پانے والوں میں سے کچھ حضرات اور طبقات نے غزوہ خیبر کے فوراً بعد ہی اپنا حصہ نہیں پایا تھا بلکہ اسلام لانے کے بعد جب وہ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تھے تو ان کو عطایائے نبوی حاصل ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر افراد میں حضرت عقیل بن ابی طالب ہاشمی فتح مکہ کے مسلمان تھے اور اس کے بعد ہی ان کو طعمہ ملا تھا۔ طبقات میں اشعری تو خیبر کے زمانے میں ہی مدینہ پہنچ گئے تھے البتہ داری اور رہاوی حضرات تبوک کے زمانے میں یا اس کے بھی بعد آئے تھے۔ یہ لوگ جیسا کہ اُوپر ذکر آچکا ہے وفد کی صورت میں خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تھے اور بعد میں مدینہ اور اس کے مضافات میں ہی بس گئے تھے۔

دوسرے مسلمانوں میں جن کو اسلامی ریاست کے کسی اور علاقے کی زمین کی پیداوار سے طُعمہ عطا ہُوا تھا حضرت قیس الہمدانی نامی ایک جنوبی عرب کے مسلم کا ذکر مل سکا ہے جن کو ایک روایت کے مطابق تین سو فَرَق کا طُعمہ عطا ہوا۔ اس میں خیوان کی دو سو وسق زبیب (سوکھی کھجور) اور ذرہ شطران (شطران کا باجرا) اور سو فَرَق عمران الجوف کے علاقے کا گیہوں (بُرّ) شامل تھا لیکن دوسری روایت کے مطابق ان کا طعمہ یا قطیعہ نصر کے علاقہ کے دو سو صاع باجرے (ذرہ نصر) اور دو سو صاع زبیب خیوان (خیوان کی سُوکھی کھجوروں) پر مشتمل تھا۔[۳۸۰] اس اختلاف روایت کو حل کرنا ناممکن نظر آتا ہے کیونکہ قرائن و شواہد کچھ بھی نہیں ہیں۔ محض قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دُوسری روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ پہلی روایت کے مطابق طعمہ مقدار کے اعتبار سے بہت زیادہ تھا۔

لیکن سب سے دل چسپ اور ایک لحاظ سے اہم تر وُہ طعمہ تھا جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وادی القریٰ کے ایک یہودی خاندان بنو عُریض کو عطا کیا تھا۔ یہ دس وسق گیہوں (قمح)، دس وسق جَو (شعیر) فی فصل (حصد) اور پچاس وسق کھجور (تمر) فی سال مقرر ہوا تھا۔[۳۸۱] واقدی کی ایک روایت ہے کہ جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک جاتے ہوئے وادی القریٰ میں خیمہ زن ہُوئے اور عُریض یہودی کے فرزندوں نے آپ کی خدمتِ گرامی میں ہَرِیس (ایک میٹھا پکوان' جو میدے، مکھن اور شکر سے تیار کیا جاتا ہے) پیش کیا اور آپ نے اس کو نوش فرمایا۔ اس مہمان نوازی اور اخلاق کے عوض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چالیس وسق کا طُعمہ عطا فرمایا (اطعمہم)۔[۳۸۲] یہ عطیہ نبوی مستقل (جادیہ) تھا جو عباسیوں کے عہد تک جاری رہا۔[۳۸۳]

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ طُعمہ تمام معاملات میں ایک مستقل اور دوامی عطیہ تھا بالکل اُسی طرح جس طرح قطیعہ ہوتا تھا۔ قطیعہ بعد میں اقطاع تملیک کہا جانے لگا کیونکہ اس میں صاحبِ قطیعہ کو مالکانہ حقوق بھی حاصل ہوتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قطیعہ اور طُعمہ دونوں عملی لحاظ سے مِلک (مملوکہ جائداد/ حق) سمجھے جاتے تھے۔ اس کو منتقل کیا جاسکتا تھا، فروخت کیا جاسکتا تھا اور ترکہ میں دیا جاسکتا تھا جیسا کہ متعدد مثالوں سے ثابت ہوتا ہے۔ چند مثالیں کافی ہوں گی۔ حضرت مقداد

بن عمرو کے ورثہ کے اپنے جدامجد کے طُعمہ کو حضرت معاویہ کے ہاتھوں فروخت کیے جانے کا ذکر آچکا ہے۔ پھر واقدی کا واضح بیان ہے کہ طُعمہ پانے والوں (المُطْعَمِیْنْ) میں سے جو کوئی عہدِ نبوی اور خلافتِ صدیقی میں وفات پا جاتا تھا اسی کا طعمہ اس کے ورثہ پاتے تھے[۳۰۴] لیکن بعد میں خلیفہ اول نے اسلامی ریاست کے حق میں تمام طُعَم سوائے ازواجِ مطہرات کے واپس لے لیے تھے اور ان کی منتقلی، وراثت اور فروخت ممنوع قرار دے دی تھی۔[۳۰۵] لیکن یہ غالباً غیر مستقل طُعَم کے بارے میں پالیسی تھی بہر حال خلافتِ راشدہ کی پالیسی سے سرِدست ہمیں بحث نہیں۔

باب ششم

عہدِ نبویؐ کا مذہبی نظام

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد میمون و مبارک الفاظِ نبویؐ میں خیر القرون (بہترین زمانہ) تھا جب دین و ریاست، مذہب و حکومت اور اسلام و مملکت وہ ایسے لازم و ملزوم توام تھے جن کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک پیغمبر و مذہبی مصلح کی صفات اور ایک سربراہ مملکت و ریاست کے اختیارات کا وہ پاکیزہ اجتماع تھا جس کی مثال انسانی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام بنیادی طور سے مذہب اور حکومت میں کوئی خطِ تفریق یا حدِ فاصل نہیں کھینچتا اور نہ ہی ان دونوں کو ایک دوسرے کا متضاد و مخالف قرار دیتا ہے جیسا کہ جدید زمانے میں کلیسا اور حکومت کے درمیان قرونِ وسطیٰ میں ابھرنے والی چپقلش اور تصادم کے نتیجہ میں سیاسی نظریہ ابھرا ہے اور مختلف سیاسی اور اقتصادی وجوہ سے جس کی عام طور سے حمایت و تائید کی جاتی ہے۔ اسلام و اسلامی مفکرین کا روزِ اول سے دعویٰ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کو خواہ وہ سیاسی ہو یا سماجی یا اقتصادی، محیط و حاوی ہے اور اس کی گرفت سے انسان کا کوئی کام باہر نہیں ہے۔ یہی تصور و نظریہ تھا جس کے تحت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا وہ مذہبِ اسلام کا ایک حصہ بن گیا۔ آپؐ کے ارشادات (قول) اور اعمال ہی نہیں بلکہ آپؐ کی موجودگی میں کوئی بات کہی گئی یا کوئی عمل کیا گیا اور آپ نے اس پہ سکوت فرمایا (جس کو اصطلاح میں تقریر کہتے ہیں) تو یہ خاموش رضامندی بھی "سنّت نبویؐ" بن کر اسلام کا حصہ بن گئی۔ چنانچہ فقہاء اور محدثین کے نزدیک قرآن حکیم اور سنّتِ نبویؐ اسلام کی دو بنیادی اور الہامی یا ربّانی اساس ہیں۔ اور عہدِ نبویؐ میں انھیں دونوں پہ اسلام کی پوری عمارت قائم و استوار ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے حکومتِ نبویؐ کی خدمت دراصل اسلام کی خدمت تھی۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے جیسا کہ جدید زمانے میں بعض افراد اور جماعتوں نے سمجھ لیا ہے کہ اسلام کا بنیادی مقصد سیاسی اقتدار حاصل کرنا اور پھر حکومت قائم کرنا ہے اور اسلام بغیر حکومت کے پوری طرح سے نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل حکومت کا قیام اور سیاسی اقتدار کا حصول اسلام کے استحکام کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ حامل و سبب۔ یہ عہدِ نبویؐ میں اسلام اور اسلامی ریاست کے ارتقاء و استحکام کی تاریخ سے پوری طرح واضح ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصد اور اولین و آخرین عشق اسلام کو قائم و مستحکم کرنا تھا اور اس کے قیام و استحکام کے نتیجے میں حکومت و ریاست از خود قائم و دائم ہوتی ہے۔ مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کا قیام کسی سوچی سمجھی سیاسی پالیسی کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ہجرت کے بعد پیش آنے والے واقعات و حقائق کا ایک فطری نتیجہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار اور کارناموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کی شخصیت بنیادی طور سے ایک پیغمبر، مصلح اور فرستادۂ ربانی کی نظر آتی ہے اور باقی تمام دوسری حیثیتیں یا پہلو اس "نبوی شخصیت"

کے پرتو اور مظہر معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کے تمام کام خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی، اقتصادی ہوں یا فوجی، صرف مذہبی اسباب و عوامل کے نتیجہ میں ظہور میں آئے تھے۔ گویا کہ آپ کی اصل طاقت اور قوت مذہبی تھی جو دوسرے تمام کارناموں کو متعین و منظم کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ پھر آپ اپنے بنیادی کام یعنی تبلیغ اسلام اور تعلیم مذہب ربانی کے فرض کو کیونکر چھوڑ سکتے یا اس کی جانب سے ذرا بھی صرفِ نظر کر سکتے تھے۔ سیرت نبویؐ کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشاعتِ اسلام اور تبلیغ دین کا آپ کو اتنا خیال و فکر تھا کہ ہر لمحہ و ہر آن اسی کی دھن میں رہتے تھے، یہاں تک کہ جب آپ میدانِ جنگ میں دشمنانِ خدا کے سامنے صف آرا اور تلواروں کی چھاؤں میں معرکہ آرا تھے، یا اسلامی ریاست کی تعمیر و ترقی کے کام میں تن من سے مصروف تھے یا امت اسلامی کی تشکیل و تنظیم کے عمل میں ہمہ تن مصروف تھے غرض کہ کسی حال میں آپ نے تبلیغ و تعلیم سے صرفِ نظر نہیں کیا۔ صرف یہی نہیں کہ آپ نے ان لوگوں کو دعوتِ دین حق جو آپ کے رابطہ و تعلق میں ارادتاً یا غیر ارادی طور سے آگئے، بلکہ آپ نے اشاعتِ دین اور دعوتِ حق کی خاطر تبلیغی جماعتیں منظم کیں اور ان کو مختلف علاقوں میں بھیجا۔ یہ جماعتیں کبھی دوسروں کی درخواست و مطالبہ پر بھیجی گئیں اور کبھی آپ نے از خود ان کی ضرورت محسوس کی۔ تاریخ شاہد ہے کہ بسا اوقات ان تبلیغی کاوشوں کا زمانہ سراسر پُر از خطر تھا اور کبھی کبھی تو مبلغین کے سر سے جوئے خون گذر گئی جیسے کہ واقعاتِ بئر معونہ اور رجیع کے بارے میں سب کو علم ہے۔ ان کے علاوہ متعدد تبلیغی جماعتیں ایسی ہیں جن کو بدقسمتی سے جدید و قدیم مورخین نے "فوجی مہم" بنا دیا ہے۔ پھر خالص فوجی مہموں کے دَوران بھی آپ نے اور آپ کے صحابہ نے دعوتِ دین کے فرض کو نہیں بھلایا۔ گذشتہ اوراق میں متعدد ایسے واقعاتِ قبول اسلام کا ذکر آچکا ہے جو مہموں کے دوران ہی پیش آئے تھے۔ جنوبی عرب کو بھیجی گئی تقریباً تمام مہمیں (سرایا) مذہبی اور دعوتی مشن تھے جن کا اولیں مقصد تبلیغ دینِ حق تھا۔

ان تبلیغی کوششوں اور کاوشوں کے علاوہ تمام صحابہ کرام خاص کر اور دوسرے معاصر مسلمان عام طور سے اپنی اپنی جگہ مبلغِ دین تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے افسروں اور حکومتی کارکنوں کے دل و دماغ میں یہ بات اچھی طرح بٹھا دی تھی کہ اسلام یا دین سب سے اہم و افضل چیز ہے جس کی لوگوں کو ہر آن دعوت دینی ہے چنانچہ سالاران و سپاہِ فوج ہوں یا شہری نظم و نسق کے افسر، یا صدقات کے وصول کرنے والے عاملین ہوں سب کا اولین فرض تھا کہ وہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت اور مسلمانوں کو دین کی تعلیم دیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حکومتی کارکنوں کو اس کی صرف زبانی ہدایت ہی نہیں فرمائی بلکہ مسلسل اپنے خطوط و فرامین میں بھی اس کی طرف توجہ دلاتے رہے چنانچہ متعدد افسرانِ حکومتِ نبویؐ جیسے حضرات معاذ بن جبلؓ عمرو بن حزمؓ، علی بن ابی طالبؓ، خالد بن ولیدؓ اور بہت سے دوسروں کے نام آپ کے گرامی ناموں میں اس کے ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہیں۔ ان کو واضح اور غیر مبہم الفاظ میں یہ بتا دیا گیا تھا کہ ان کو لوگوں پر حاکم بنا کر نہیں بنا کر بھیجا جا رہا ہے بلکہ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ سیاست کے دروازے سے لوگوں کو دین میں داخل کریں۔ یہاں سیاست دین کی خادم تھی نہ کہ دین کی حاکم۔ اور تاریخ اسلامی شاہد ہے کہ حکومتِ نبویؐ کے تمام افسروں، سالاروں اور عاملوں نے تبلیغِ دین اور تعلیمِ اسلام کا فریضہ مثالی انداز سے انجام دیا تھا اور جس نے اس میں نادانستگی یا دانستگی میں ذرا بھی کوتاہی کی تھی اس کو سخت سرزنش کی گئی تھی۔ بہرحال اس لحاظ سے تمام مرکزی اور مقامی منتظمین اور دوسرے تمام سیاسی، انتظامی اور فوجی افسران و کارکنانِ حکومت کو بھی مبلغین و معلمینِ اسلام میں

شمار کرنا چاہیے اور تاریخی واقعات اس کے شاہد ہیں کہ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف خطوں کے لوگ چاہے وہ دور کے باسی ہوں یا گھر کے پچھواڑے آباد ہوں انھیں افسران و منتظمین حکومت کی تبلیغی کوششوں کے سبب دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے اور انھیں کی تعلیمی کاوشوں کے نتیجے میں پکے اور راسخ العقیدہ مسلمان بنے تھے۔

دوسرا باب قبائلِ عرب کے اسلام قبول کرنے کے نہج، رفتار اور انداز سے بحث کرتا ہے اور اس کے ضمن میں بالواسطہ ہی مبلغین اور معلمین پر بھی بحث آچکی ہے جس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ کی تبلیغی اور تعلیمی سرگرمیوں پر روشنی پڑتی ہے تاہم یہاں ایک مختلف زاویہ سے اس موضوع پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ بعض جدید مورخین نے دانستہ یا نادانستہ طور سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدنی دور میں تبلیغی کارناموں کو گھٹا کر بیان کیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ آپؐ کی سیرت اور کردار کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کی ہیں۔

۱۔ دعوت اور دُعاۃ

مکی اور مدنی دونوں عہد میں تبلیغِ دین کے دو منبع تھے۔ ایک تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ انور تھی اور دوسرے صحابہ کرام کی مقدس ہستیاں تھیں۔ ان دونوں سطحوں پر دعوت کا کام ہوتا تھا۔ ایک طرح سے ہم ان کو مرکزی اور علاقائی تبلیغ و دعوت کی سطحیں کہہ سکتے ہیں۔ جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات کا تعلق تھا آپ ہر لمحہ، ہر مقام اور ہر موقع پر دعوت کا کام کرتے رہتے تھے۔ جب بھی اور جہاں بھی لوگوں سے رابطہ میں آتے سب سے پہلے ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں جیسا کہ ذکر آچکا ہے ابھی تک کچھ افراد و طبقات دائرہ اسلام سے خارج تھے اور اپنے پرانے ادیان شرک یہودیت یا عیسائیت پر قائم تھے۔ آپ نے پہلے موقعہ پر ہی ان کو اسلام کی دعوت دی اور آپ کی دعوت پر کچھ یہودی اور غیر مسلم عرب جلد ہی اسلام لے آئے اور کچھ نے دو چار برس کے بعد دعوت قبول کی۔ دراصل مدنی لوگوں کی غالب اکثریت کے قبولِ اسلام کا شرف حضرت مصعب بن عمیرؓ کو جاتا ہے جن کو ہجرت سے کچھ قبل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مبلغ، معلّم اور مقری (استاد) بنا کر مدینہ بھیجا تھا[۱]۔ ان کے دعوتی کام میں حضرات اسعد بن زرارہ اور ان کے دوسرے مدنی ساتھیوں نے بھرپور مدد کی تھی[۲]۔

بہرحال اس دوران رسول اکرمؐ نے اپنی ذاتی حیثیت اور مرکزی سطح پر یہ دعوتی کام برابر جاری رکھا اور ہر اس فرد و بشر کو اسلام کی دعوت دی جو آپؐ کے رابطہ میں آیا۔ چنانچہ مہم نخلہ کے نتیجے میں جب ایک مکی قیدی الحکم بن کیسان مدینہ لائے گئے تو آپؐ نے ان کو اسلام کی دعوت دی جو انھوں نے بڑی دلچسپی سے قبول کر لی[۳]۔ اسی طرح بدر کے اسیروں کو بھی آپؐ نے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی اور ان میں سے کئی نے اسے قبول بھی کر لیا تھا جس کے نتیجے میں ان کو بلا فدیہ رہائی ملی تھی[۴]۔

یہ معمول نبویؐ بلکہ آپؐ کی سرکاری حکمتِ عملی بھی تھی کہ آپؐ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے سامنے جنگ شروع ہونے سے قبل میدانِ جنگ میں یا مہموں کے دوران حملہ سے قبل اسلام کی دعوت سب سے پہلے دیتے تھے۔ اور اسی طرح

سے قیدیوں اور اسیروں کو بھی دعوت دیا کرتے تھے[۵]

آپ نے ان دشمنوں اور مخالفوں کو بھی ہمیشہ دعوتِ حق پہلے دی جن کا مقصدِ حیات ہی اسلام اور اسلامی ریاست کی مخالفت کرنا تھا حتّٰی کہ مختلف سیاسی اور مذہبی جرائم کے مرتکب مجرمین اور مخالفین کا اسلام بھی آپ نے قبول کر لیا جیسا کہ فتح مکہ کے بعد اس شہر معمورہ کے عظیم قریشی سرداروں کے قبولِ اسلام کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے[۶] اس کے بعد جب عام الوفود کے دوران تمام قبائل عرب کے نمائندے مدینہ پہونچ رہے تھے آپؐ نے ان کے سامنے سب سے پہلے اسلام ہی پیش کیا تھا[۷] حیاتِ ارضی کے آخری دنوں میں جب آپ اپنے آخری حج پر گئے، تو آپ کو سب سے زیادہ فکر کتاب و سنہ کے ساتھ وابستگی (اعتصام) کے ساتھ تبلیغ اسلام ہی کی تھی[۸] اور بالکل آخری لمحات میں اسلام ہی کا نام لب مبارک پر تھا۔

ہمارے مستند مؤرخین میں سے ایک سے زیادہ کا بیان ہے کہ آپ اپنے تمام سالارانِ سرایا اور امرأ فوج کو ہدایت کرتے تھے کہ وہ لوگوں کو سب سے پہلے اسلام کی دعوت دیں اور اگر وہ اسے قبول نہ کریں تو ان سے صلح و دوستی کا معاہدہ کریں اور ان کو اسلامی ریاست کا ذمی بنائیں۔ تلوار تو فتنہ و فساد کچلنے کا آخری حربہ تھا ہدایت نبوی کے مطابق مسلم فوجیں ہمیشہ رات کو سفر کرتی اور صبح سویرے منزل پر پہونچتی تھیں تاکہ فجر کی اذان سے معلوم ہو جائے کہ اسلام اس مقام تک پہونچ چکا ہے یا نہیں[۹]۔ یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ اسلام ابھی تک وہاں سعادت اخروی کے برگ و بار نہیں لایا ہے مسلمان امیر و سالار لازمی طور سے اس علاقے کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیا کرتا تھا اور اس وقت تلوار سے کام نہیں لیا جاتا تھا جب تک زبان کے ذریعہ قبولِ اسلام یا قبول صلح کا اقرار نہ ہو جاتا[۱۰]۔ اسی حقیقت کا صریحی بیان حضرات عبدالرحمٰن بن عوف، خالد بن ولید، علی ابن ابی طالب اور اسامہ بن زید وغیرہ کی مہموں کے ضمن میں ملتا ہے اور دلچسپ بات ہے کہ اس حکمت عملی کے نتیجے میں متعدد قبائل عرب پورے کے پورے اور بعض کے معتدبہ لوگ یا اکثریت نے اسلام قبول کر لیا تھا[۱۱]۔

مکی دورِ حیاتِ نبوی کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ آپ نے تبلیغی جماعتیں اور وفود نہیں بھیجے تھے مگر یہ تاثر غلط ہے متعدد صحابہ کرام کی کاوشوں کا دائرۂ کار محض مکہ کی حدود تک محدود نہیں تھا۔ پھر حدودِ حرم میں بھی صحابہ کرام کی تبلیغی کوششوں کو کسی طرح تبلیغی اور مذہبی جماعتوں سے کم نہیں سمجھا جا سکتا۔ جہاں تک بیرونِ حرم مکہ کی تبلیغی جماعتوں کا تعلق ہے تو وہ حضرات معتب ثقفی، ابو موسیٰ اشعری، طفیل بن عمرو دوسی ابوذر غفاری وغیرہ متعدد صحابہ کرامؓ کی مذہبی سرگرمیوں سے ظاہر ہوتا ہے[۱۲]۔

مختلف قبائل عرب کے نمائندہ مسلمانوں کو اپنے اپنے علاقے اور قبیلے میں واپس بھیجنے کی حکمت یہی تھی کہ وہ وہاں جا کر دعوت کا کام کریں گے۔ اور یہی تبلیغی جماعتیں تھیں اور انھیں مبلغین کی کوششیں تھیں جنھوں نے چار دانگ عرب میں اسلام کے پودے کی آبیاری کی تھی۔ مکی دورِ حیات کی مانند مدنی دورِ حیات میں بھی رسول اکرمؐ نے متعدد تبلیغی جماعتیں منظم کی تھیں اور ان جماعتوں یا انفرادی مبلغوں کو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں بلکہ اس کے باہر دوسرے ملکوں میں بھی بھیجا تھا۔ توقیتی اعتبار سے ایسی پہلی جماعت جس کا باقاعدہ واضح ذکر ماخذ میں آتا ہے صفر ۴ھ / جولائی ۶۲۵ء میں منظم کی گئی تھی۔

"ابو براء عامر بن مالک کلابی مدینہ میں خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوا اور آپ سے درخواست کی کہ آپ اپنے صحابہ میں سے کچھ لوگوں کو بھیج دیں تاکہ وہ نجد کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں۔"

چنانچہ آپؐ نے حضرت منذر بن عمرو ساعدی کے ساتھ چالیس مبلغین پر مشتمل ایک جماعت بھیجی جو آپؐ کے بہترین مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ لیکن ان سب کو بئر معونہ کے مقام پر بے رحمی سے قتل کر ڈالا گیا۔[۱۳] اسی قسم کے ایک اور المیہ میں مسلم مبلغین کی ایک اور جماعت کو رجیع کے مقام پر اسی زمانے میں شہید کیا گیا تھا۔ موخرالذکر جماعت عضل اور قارہ کے لوگوں کی درخواست پر بھیجی گئی تھی۔[۱۴] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دو المناک واقعات کے بعد رسول اکرمؐ نے اپنے صحابہؓ کو باہر بھیجنا پسند نہیں کیا تھا تا آنکہ آپ کو ان کی حفاظت کا مکمل یقین نہ ہو جاتا۔ دوسری مذہبی جماعتوں کے عدم ذکر اور واقعاتِ بئر معونہ اور رجیع کے مفصل ذکر کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد تبلیغی جماعتیں نہیں بھیجی تھیں یا صرف یہی دو تبلیغی جماعتیں بھیجی گئی تھیں جو ناکام رہیں۔ متعدد مذہبی مہمیں اور تبلیغی جماعتیں اس کے بعد بھی گئی تھیں ان میں بیشتر سرایا اور غزوات شامل تھے۔ ۶ھ کے اوائل میں آپ نے متعدد غیر ملکی حکمرانوں جیسے شاہانِ روم، ایران، مصر، عراق، شام اور حبشہ وغیرہ کے پاس مبلغین بھیجے تھے اور پھر متعدد و مختلف اوقات میں جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں اور مملکتوں میں بھی تبلیغی مہمیں بھیجی تھیں۔ تفصیل کے لیے باب اول و دوم خاص کر اور باب چہارم میں سفیرانِ نبویؐ پر بحث کے مطالعہ کی سفارش کی جاتی ہے۔ یہاں ایک نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس زمانے کی تبلیغی جماعتوں میں مبلغین کی تعداد بہت کافی نظر آتی ہے۔ اس کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں: اول یہ کہ مبلغین کی جسمانی حفاظت مقصود تھی کہ اگر اچانک کوئی غیر معمولی صورت پیدا ہو جائے تو وہ اپنی حفاظت کر سکیں اور فتنہ جو اور مخالف لوگوں کو کسی قسم کی جرأت بے جا کی اجازت نہ دیں۔ دوم یہ کہ ابتدائی زمانے میں مسلم مبلغین کو کافی بڑے دائرۂ کار میں کام کرنا تھا جس کے لئے زیادہ افراد کی ضرورت تھی۔

فتح مکہ کے بعد رسول اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ دونوں کی تبلیغی سرگرمیوں میں زبردست اضافہ ہوا اور تقریباً جزیرہ نما عرب کے ہر کونے اور گوشے میں مبلغین پہونچے۔ اس زمانے میں چونکہ اسلامی ریاست ایک ایسی سیاسی اور فوجی طاقت بن چکی تھی جس کی مخالفت یقینی نقصان کا موجب اور موافقت عملی فوائد کا باعث بن سکتی تھی اس لیے اشاعت اسلام کی رفتار میں تیزی بھی آئی اور ساتھ ہی مسلم جماعتوں اور مبلغوں کے لئے کوئی خاص خطرہ بھی نہیں رہا۔ چنانچہ بعض اوقات بہت مختصر جماعتیں بھی بھیجی گئیں جو بئر معونہ اور رجیع کے صدمات سے محفوظ رہیں۔ خاص طور سے مختلف قبائل عرب کے اصنام شکنی کی مہمیں جو محض ایک دو نفروں یا زیادہ سے زیادہ چند افراد پر مشتمل تھیں۔[۱۵] اس دور کی اہم ترین پہلی دو مہمیں یا تبلیغی جماعتیں حضرات علاء بن حضرمی اور عمرو بن عاص سہمی کی تھیں جو بالترتیب بحرین اور عمان کی مملکتوں میں بھیجی گئی تھیں اور مکمل طور سے کامیاب رہی تھیں۔[۱۶] حضرت خالد بن ولید مخزومی نے بنو الحارث بن کعب کے لوگوں میں اشاعت دین کا کام پوری کامیابی کے ساتھ کیا تھا۔[۱۷] اس سے قبل انہوں نے بنو جذیمہ کے لوگوں کے درمیان دعوت کا کام کیا تھا۔ اسی طرح حضرت علی بن ابی طالب نے رسول اللہ کے ارشاد گرامی کے مطابق ہمدان اور مذحج کے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا تھا۔[۱۸] طبری کا بیان ہے کہ حیات طیبہ کے آخری دنوں میں رسول اکرمؐ نے جزیرہ نما کے مختلف علاقوں میں کم و بیش آٹھ مبلغوں کو اشاعت دین کی خاطر بھیجا تھا۔ ان کے علاوہ متعدد اور مبلغین اور داعی تھے جو تبلیغ و دعوت کا کام مختلف علاقوں میں پوری تندہی اور جوش کے ساتھ کر رہے تھے اس سلسلے میں رسول اللہ کے اہم سفیروں کا ذکر کرنا

ضروری معلوم ہوتا ہے جن کو آپ نے مختلف مقامی سرداروں اور منتظمین کے پاس بھیجا تھا۔

جیسا کہ کہیں اور مفصل ذکر کیا جا چکا ہے[۲۰] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر (رسل) دو قسم کے تھے۔ ایک تو وہ سفراء تھے جن کو غیر ملکی حکمرانوں اور شہزادوں کے درباروں میں بھیجا گیا تھا اور دوسرے وہ تھے جن کو مقامی سرداروں اور عرب قبائل کے شیوخ کے پاس روانہ کیا گیا تھا۔ ان میں سے اکثر سفارتوں کے پس پشت جو حکمت عملی کارفرما تھی، وہ اصلاً مذہبی تھی کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے گرامی ناموں کے متون دستیاب ہوئے ہیں ان میں علانیہ اور غیر مبہم انداز میں مکتوب الیہم کو اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر تمام غیر ملکی حکمرانوں جیسے حبشہ کے نجاشی، بازنطین کے ہرقل غسان کے حارث بن شمر، مصر کے مقوقس، ایران کے کسریٰ اور اس کے ایک ماتحت حکمران ہرمزان وغیرہ کو اسلامی امت کا رکن بننے کی دعوت دی ہے[۲۱]۔ اسی طرح ملکی حکمرانوں میں بحرین کے منذر بن ساوی، عمان کے جیفر وعبد اور یمن و حضرموت کے متعدد حکمرانوں کے نام خطوط نبوی کا معاملہ ہے۔ دوسرے قبائل عرب کا سرداروں مثلاً یمامہ کے ہوذہ بن علی، نجران کے بشپ ضغاطر، ایلہ کے بشپ حکمران، مقنا وغیرہ شمالی بستیوں کے فرمانرواؤں، بنو حنیفہ اور یمامہ کے سرداروں مسیلمہ اور ثمامہ بن اثال اور جنوبی عرب کے متعدد دوسروں کے نام خطوط نبوی میں اسلام کی دعوت ہی کا مضمون ملتا ہے[۲۲]۔

اس لحاظ سے ان تمام خطوط کے حاملین اور سفارتوں کے سفراء کرام بھی مذہبی مبلغین اور داعی تھے جنہوں نے صرف خطوط نبوی اور پیغام الٰہی کو پہونچانے کا ہی کام نہیں کیا تھا بلکہ اپنے ایمان، کردار و عمل کے ذریعے اسلام کی سچی تصویر کشی بھی کی تھی اور کم از کم ملکی حکمرانوں اور سرداروں کی حد تک وہ مکمل طور سے کامیاب رہے تھے جبکہ غیر ملکی حکمرانوں کے درباروں میں جزوی کامیابی کے علاوہ انہوں نے اسلام کے اچھے اور دل نشین نقوش چھوڑے تھے۔

جہاں تک مقامی سرداروں اور انتظامیہ کے افسروں کے تبلیغ واشاعتِ دین میں حصہ لینے کا معاملہ ہے تو کسی حد تک اس کا ذکر یا کم از کم اشارہ باب دوم اور چہارم میں آچکا ہے۔ یہاں ان کے مذہبی فرائض کی انجام دہی کی جانب مختصر سا حوالہ کافی ہوگا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ مختلف اوقات میں مختلف سرداروں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور پھر خود بھی اسلام کے مبلغ بن گئے تھے اور انہوں نے اپنے علاقوں یا پڑوسیوں میں بھی تبلیغ کی تھی۔ مثال کے طور پر حضرات جرثوم بن ناشیم خشنی / قضاعہ، عبادہ بن اشیب عنزی / بنو وائل، عمرو بن مرہ جہنی وغیرہ کے علاوہ بہت سے شیوخ قبیلہ تھے جنہوں نے اپنے قبیلوں کے لوگوں کو اسلام کے دائرہ میں داخل کیا تھا۔ اسد الغابہ کے مطابق ان سب کو دعوت دین کا کام کرنے کا حکم رسول کریم نے دیا تھا[۲۳]۔

اسی طرح مرکزی منتظمین کو بھی اپنے اپنے علاقوں میں اسلامی دعوت پھیلانے اور لوگوں کو اسلام سکھانے کا ذمہ دار بنایا گیا تھا۔ حضرت معاذ بن جبل کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ جنوبی عرب کے وسیع خطے کے گورنر جنرل ہونے کے علاوہ معلم اور مبلغ بھی تھے اور بقول طبری "ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں جاتے رہتے تھے اور خلقِ خدا میں پیغام ربانی کو پھیلاتے رہتے تھے"۔[۲۴]

حضرت عمرو بن حزم کو بطورِ گورنر نجران مفصل ہدایات ملی تھیں لیکن ان میں سب سے زیادہ زور خدا کے دین کو اس کی

مخلوق تک پہونچانے پر تھا۔[۲۵] تبلیغ و اشاعتِ دین پر اسی قسم کی تاکید دوسرے گورنروں، عاملوں اور افسروں کے نام خطوطِ نبوی میں ملتی ہے۔[۲۶] حکمتِ نبوی کی بنیاد در اصل اس عقیدے پر تھی کہ محض اشاعتِ دین ہی اسلامی ریاست کی لقا اور استحکام کی ضمانت دے سکتی ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ نہ صرف اسلامی ریاست کے کارکن بلکہ ہر مسلمان اپنی جگہ ایک داعی / ایک مبلغ تھا۔ اس کے سوا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی لوگوں کو دعوتِ حق دی تھی اور مبلغین اور دعاۃ کی جماعتیں بھی جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں میں بھیجی تھیں اور اسی طرح اسلام کے مبلغوں اور داعیوں کا اسلامی ریاست کی توسیع اور استحکام میں خاصا مثبت اور عملی حصہ تھا۔[۲۷]

۲ - معلّمین

محض اسلام کی تبلیغ سے نہ تو سرزمین عرب پر ریاست اسلامی کی توسیع و استحکام کا عمل پورا ہو سکتا تھا اور نہ ہی خارجی دنیا میں اس کی طاقت کو محسوس کیا جاسکتا تھا جب تک کہ نومسلموں کے دلوں کی گہرائیوں میں اسلامی تعلیمات اور قرآنی احکام کو جاگزیں نہ کر دیا جاتا۔ اسی بنا پر قرآن کریم کا حکم ہے کہ :

"اور ایسے تو نہیں مسلمان کہ سارے کوچ میں نکلیں، سو کیوں نہ نکلے ہر فرقے میں سے ان کے ایک حصہ
تا سمجھ پیدا کریں دین میں اور تا خبر پہونچا دیں اپنی قوم کو جب پھر آویں ان کی طرف . . . . ."[۲۸]

تعلیمِ دین و اسلام کی اہمیت کا احساس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے کار سے تھا چنانچہ آپ نے نومسلموں کی تعلیم کا اہتمام بڑی محنت و عنایت سے کیا تھا۔ اس تعلیم کے حصول کے بعد ایمان میں پختگی اور مذہب کی سمجھ آتی تھی جس کو اسلامی اصطلاح میں "تفقہ فی الدین" کہا جاتا ہے اور در اصل اسلام اور ایمان میں جو فرق قرآن کریم نے کیا ہے[۲۹] وہ ایک لحاظ سے تبلیغ و تعلیم کا فرق ہے اور یہ دونوں سچے مسلمان کے لازم و ملزوم ہیں۔

عہد نبوی میں نومسلموں میں تعلیم کی متعدد مثالیں ہم گذشتہ ابواب میں خاص کر باب دوم میں دیکھ چکے ہیں۔ مگر اس بحث میں ان پر ایک نئے زاویہ سے مجموعی طور پر دیکھنا مفید ہوگا کیوں کہ اس سے رسول کریم کے نظامِ تعلیم و تربیت کا صحیح علم ہو سکے گا۔ یہ نکتہ ذہن نشین رکھنے کا ہے کہ ہر اصلاحی تحریک اور مذہب کی مانند رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے عظیم اور اوّل معلم تھے اور ابتداءً میں آپ نے ہی تمام مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ نے ابتدا ہی سے اپنے قابل اصحاب کو اس طرح سے تعلیم و تربیت دی تھی کہ وہ دوسروں کے لیے معلم اور مشعل راہ بن سکیں تاکہ چراغ سے چراغ جلتے رہیں۔ مکی عہد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کو براہ راست تعلیم دی تھی ان میں عبدالقیس کے سردار الاشج کے بھتیجے کی تعلیم کا واقعہ دل چسپ ہے جو ہم دیکھ چکے ہیں۔ آپ کے اجل اصحاب نے اس دور میں معلمِ ثانی کا فریضہ انجام دیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ نومسلموں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ آپ اپنے اصحاب میں سے کسی کے سپرد کر دیتے تھے۔ ہجرت کے زمانے تک قابل معلمین کی تعداد معتدبہ ہو چکی تھی۔ بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ مکی عہد میں جن صحابہ کرام نے بھی آپ کی صحبت کا فیض کچھ مدت تک اٹھایا تھا وہ کندن بن گیا تھا۔

چنانچہ ہجرت مدینہ سے ذرا قبل جب اہلِ مدینہ کی تعلیم و تربیت کے لئے کسی معلم کی ضرورت پڑی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ انتخاب عبدالدار / قریش کے ایک نوجوان، صالح و قابل صحابی حضرت مصعب بن عمیرؓ پر پڑی اور آپ نے ان کو مدینہ بھیج دیا۔ اس سے قبل اہلِ مدینہ کی تعلیم کا فریضہ حضرت اسعد بن زرارہؓ، نقیب النقباء کیا کرتے تھے۔ مأخذ کا بیان ہے کہ تمام مدنی مسلمان ان کے گھر یا اس کے پہلو میں آباد مسجد خانہ میں جمع ہو جاتے تھے اور حضرت اسعد بن زرارہؓ ان کو مذہبی تعلیم دیا کرتے تھے۔[۳۰] یہاں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کی مدینہ آمد سے قبل خدانخواستہ مدنی مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام ناقص تھا یا حضرت اسعدؓ اچھے معلم نہ تھے۔ بلکہ اصل بات یہ تھی کہ مسلمانانِ مدینہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ و تربیت کردہ صحابی سے تعلیم و تربیت کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ دوسرا نکتہ یہ بھی ہے کہ اکثر و بیشتر مبلغین ہی معلمین کے فرائض انجام دیتے تھے کیونکہ معلم کی صلاحیتوں سے مالا مال ہوتے تھے۔ لیکن مخصوص حالات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاص کر نئے مسلمانوں کے لئے "معلمین" کا تقرر فرماتے تھے۔ اس بحث میں ہم ایسے ہی معلمین کا ذکر بطورِ خاص کریں گے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے ایک اور معلم حضرت ابن ام مکتومؓ بھی تھے۔ حضرت براء بن عازبؓ کی روایت ہے کہ ہجرت سے قبل حضرت مصعب بن عمیرؓ اور حضرت ابن ام مکتومؓ لوگوں کو قرآنِ کریم پڑھاتے تھے اور خود راوئ حدیث نے جو اس وقت چھوٹی عمر کے تھے مفصل سورتوں میں سورہ الاعلیٰ حضرت ابن ام مکتومؓ سے سیکھی تھی۔ بلاشبہ ہجرت کے بعد بھی حضرت ابن ام مکتومؓ معلم کے فرائض بدستور سابق انجام دیتے رہے تھے کیونکہ وہ حضرت مصعبؓ کے بعد ہی مدینہ پہونچے تھے۔[۳۱] عین ممکن ہے کہ ان کی ہجرت میں سبقت کے پیچھے اشارۂ نبویؐ رہا ہو۔ بہر حال یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہجرت کے بعد رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم معلم اوّل رہے تھے اور تمام مسلمانوں کی تعلیم و تربیت فرماتے تھے۔ لیکن آپ کے علاوہ ایک پوری پوری جماعتیں معلمین کی بن گئی تھیں۔ ان میں سے ایک غریب مسلمانوں کی جماعت تھی جو کہ عام طور سے "اہل الصفہ" کے نام سے مشہور ہے۔ وہ مستقل خدمتِ نبویؐ میں حاضر رہتے تھے اور دن رات اسلام اور دین کے احکام و اصول و حقائق سیکھتے رہتے تھے، جبکہ دوسرے مسلمان دنیاوی مشاغل جیسے کھیتی باڑی، تجارت یا محنت مزدوری میں مشغول رہتے تھے اور بوقت ضرورت ہی حاضر ہو جاتے تھے۔ ایسا نہیں گمان کرنا چاہیے کہ صرف اصحابِ صفہ ہی معلم و حامل علم تھے۔

اجل اصحاب نبیؐ میں سے بہت سے ایسے تھے جن کا درجہ و معیار و مبلغِ علم صرف معلم اول کے بعد ہی تھا اور ان میں سے متعدد تو ان اصحاب صفہ کے بھی استاد تھے۔ چنانچہ ابو داؤد کی ایک روایت کے مطابق حضرت عبادہ بن صامتؓ بہت سے اصحابِ صفہ کو قرآن حکیم اور لکھنے پڑھنے کی تعلیم اپنے گھر پر دیا کرتے تھے۔[۳۲]

ابن حنبل نے حضرت انسؓ بن مالک کی سند پہ روایت بیان کی ہے کہ "اصحابِ صفہ میں سے ستر اشخاص مدینہ کے ایک معلم کے گھر رات کو پڑھنے جاتے تھے اور وہاں فجر تک علم کا بازار گرم رکھتے تھے۔"[۳۳] اس "مرکز علم و دانش" سے بہرہ ور ہونے والے

طالبانِ علم ایک دن خود بھی مسندِ تعلیم و معلم پر فائز ہو گئے تھے۔ تقریباً اسی مبلغین و معلمین جو بئرِ معونہ اور رجیع کے المیوں میں شہادت کے درجہ پر فائز ہوتے اسی مدرسہ علم کے فارغین اور اسی دانشکدہ کے معلمین تھے۔[۳۴] بعد کے زمانے میں احادیثِ نبویؐ کے ایک بڑے راوی اور عالم حضرت ابوہریرہ دوسیؓ معلمین کے اسی طبقۂ ممتاز سے تعلق رکھتے تھے۔[۳۵]

اصحابِ صفہ کے علاوہ متعدد دوسرے اساتذہ و معلمین کا ذکر ماخذ میں ملتا ہے۔ ان میں سے وہ ممتاز ترین تھے جن سے قرآنِ حکیم وغیرہ کا علم حاصل کرنے کا حکم خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ چنانچہ بخاری کی ایک روایت ہے کہ آپ مسلمانوں کو اپنے چار اصحاب حضرات عبداللہ بن مسعودؓ، سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ، ابی بن کعبؓ اور معاذ بن جبلؓ سے قرآنِ کریم پڑھنے اور اسلام سیکھنے کا حکم دیا کرتے تھے۔[۳۶] اصابہ کا بیان ہے کہ ایک نومسلم حضرت وردانؓ جو بعد کی ایک مشہور شخصیت فرات بن یزید کے دادا تھے قرآنِ حکیم کی تعلیم کے لیے حضرت ابان بن سعید امویؓ کے حوالے کئے گئے تھے اور یہ کام کسی اور نے نہیں بلکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس کیا تھا۔[۳۷] اسی طرح "کنز العمال" کی ایک روایت کے مطابق رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نومسلم حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ کو حضرت ابو عبیدہ بن جراح فہریؓ کے دامنِ تربیت میں دیا تھا اور فرمایا تھا کہ "میں نے تم کو ایک ایسے شخص کے حوالے کیا ہے جو تم کو اچھی تربیت دے گا اور ادب سکھائے گا۔"[۳۸]

قریش کے خاندان سعیدی کے حضرت عبداللہ بن سعیدؓ اموی اسلام لائے تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مسلمانانِ مدینہ کے لیے معلم مقرر کیا تاکہ وہ ان کو قرآنِ حکیم اور لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیں۔[۳۹] عہدِ نبویؐ میں قرآنِ حکیم کو جمع کرنے والے صحابہ کرام (جماع القرآن) کے بارے میں محمد بن حبیب بغدادیؒ نے ایک علٰحدہ اور مکمل فصل باندھی ہے جس میں انہوں نے چھ (۶) اصحاب کو جامع و حافظ قرآن بتایا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ تھے:

۱۔ سعد بن عبیدؓ، بنو عمرو بن عوف / اوس
۲۔ ابوالدرداء عویمر بن زیدؓ، بنو عدی بن کعب / خزرج
۳۔ معاذ بن جبل، بنو جشم / خزرج
۴۔ ثابت بن زید، بنو ثعلبہ بن کعب / خزرج
۵۔ ابی بن کعب
۶۔ زید بن ثابت / بنو مالک بن نجار / خزرج۔[۴۰]

ابن سعد نے ایک اور انصاری صحابی کا نام قرآن مجید کے جامعین میں شمار کیا ہے۔ وہ حضرت قیس بن سکنؓ تھے جو بدری صحابی تھے اور خزرج کے خاندان نجار کے بطن بنو غنم بن عدی سے تعلق رکھتے تھے۔[۴۱] اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے جیسا کہ کتانی نے بھی اس نوع کی حدیثوں اور روایتوں کی تشریح میں واضح کیا ہے کہ صرف مذکورہ بالا اصحاب ہی قرآن کریم کے جامع اور حافظ نہیں تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے تھے۔ مثال کے طور پر اوپر حضرات عبداللہ بن مسعودؓ اور سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ کا ذکر نہیں آیا ہے۔ حالانکہ ان سے قرآن سیکھنے کی ہدایت خود زبانِ رسالتؐ اور حاملِ وحی سے ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ مذکورہ بالا چھ سات جامع القرآن میں سب کے سب انصاری صحابہ ہیں اور مہاجرین میں سے کسی کا نام نہیں لیا گیا ہے جبکہ یہ ناقابلِ یقین امر ہے کہ موخر الذکر طبقہ میں کوئی حافظ و جامع قرآن عہدِ نبوی میں تھا ہی نہیں۔ دراصل اس قسم کی روایات مختلف طبقاتِ حفاظ و جماع کو بیان کرتی ہیں نہ کہ ان کی تحدید و تحصیر کرتی ہیں۔

دوسرے مآخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام اکابر صحابہ قرآن کریم کے جمع و حفظ کرنے والے تھے اور بہت سے ایسے بھی تھے جو نسبتاً آج کم معروف ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں خواتین کی بھی ایک معتدبہ تعداد شامل تھی جن کو عام طور سے ہمارے مآخذ اور مورخین دونوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس طبقۂ حفاظ میں حسب ذیل اصحاب کو بھی شامل کرنا چاہیے:

"حضرات ابوبکر صدیق رضؓ، عمر فاروق رضؓ، عثمان غنی رضؓ، علی مرتضیٰ رضؓ، طلحہ بن عبید اللہ تیمی رضؓ، سعد بن ابی وقاص رضؓ، حذیفہ امولیٰ سالم رضؓ، ابوہریرہ رضؓ، عبداللہ بن سائب رضؓ، عبداللہ بن عمر رضؓ، عبداللہ بن عباس رضؓ، عبداللہ بن عمرو بن عاص رضؓ، معاویہ بن ابی سفیان رضؓ، ابو زید انصاری رضؓ، تمیم داری، عبادہ بن صامت رضؓ، ابوایوب انصاری رضؓ۔" ان کے علاوہ خواتین میں حضرت ام ورقہ بنت عبداللہ بن حارث انصاری رضؓ کا نام نامی قرآن کے حافظوں میں بیان ہوا ہے۔[۴۲] بیشتر ازواج مطہرات خاص کر حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کو اسی زمرہ میں شمار کیا جانا چاہیے۔

بہرحال یہ یقینی ہے کہ ان مذکورہ بالا حضرات و خواتین کی تعداد سے کئی گنا زیادہ حفاظ قرآن عہد نبوی میں تھے۔ اور یہ سب کے سب معلم بھی تھے جو دوسروں تک علم و دانش کی روشنی پہونچاتے تھے۔ اس طرح مآخذ سے کافی شہادت اس بات کی ملتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں جو اسلام اور اسلامی ریاست کا مرکز تھا مسلمانوں کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے خاص انتظامات فرمائے تھے۔

مدینہ کے دانشکدۂ علم و عرفان سے صرف مسلمانان شہر ہی مستفیض نہیں ہوتے تھے بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو آنے والے دوسرے طالبان حق بھی فیضیاب ہوتے تھے لیکن اس سلسلے میں دو مشکلیں تھیں: اول یہ کہ باہر سے آنے والے خاص کر دور دراز کے مسلمان مدینہ میں زیادہ قیام نہیں کر سکتے تھے اور دوم یہ کہ تمام مسلمانان عرب مرکز آ بھی نہیں سکتے تھے۔ نہ ہی سب کے سب ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں مستقل سکونت اختیار کر سکتے تھے۔ اسلئے جزیرہ نما کے مختلف علاقوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کے لیے ان کے اپنے وطن میں مقامی سطح پر انتظامات ناگزیر تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مجبوریوں کو مدنظر رکھا تھا اور ان پر پورا دھیان بھی دیا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات جاننی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ نومسلموں کے چھوٹے بڑے گروہ مدینہ منورہ زیارت رسول کریم کے لیے آتے تھے اور مختصر سے عرصے کے لئے وہاں قیام بھی کرتے تھے۔ آپ نے اسی مختصر مدت میں ان کی بنیادی تعلیم کا انتظام بھی کر دیا تھا تاکہ وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقف ہو جائیں۔ تفسیر خازن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کی سند پر ایک روایت یہ بیان ہوئی ہے کہ تمام مسلم قبائل عرب میں سے ہر ایک سے ایک نمائندہ گروہ (عصبۃ) خدمت نبوی میں حاضر ہوتا تھا اور آپ سے اپنے دین و مذہب کے بارے میں جو چاہتا تھا پوچھتا تھا اور اس طرح دین کی سمجھ اور اس سے واقفیت پیدا کرتا تھا۔"[۴۳] اس روایت یا عمومی تبصرہ کی تصدیق تاریخی واقعات سے بھی ہوتی ہے۔ بخاری کی روایت ہے کہ حضرت مالک بن حویرث اپنی قوم کے وفد میں مدینہ منورہ آئے جہاں وہ بیس دنوں تک مقیم رہے اور اس دوران وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات حاصل کرتے رہے۔ اپنے وطن کو جب وہ جانے لگے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی موصوف اور ان کے ساتھیوں کو یاد دہانی اور تاکید کی کہ جو کچھ انہوں نے اپنے مدینہ کے قیام میں سیکھا ہے اسے جا کر اپنی قوم کو سکھائیں اور اس میں ذرا کوتاہی نہ کریں۔[۴۴] اسی طرح قبیلہ عبدالقیس کے حضرت عمرو بن عبدقیس نے جو تعلیم مکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

سے حاصل کی تھی اس کو اپنی واپسی پر اپنی قوم میں پھیلایا تھا۔[۴۵] اس لحاظ سے وفودِ عرب میں جو مسلمان مدینہ آئے یا جہاد میں شرکت کے لیے پہونچے یا حج و زیارت کے سلسلہ میں حاضر خدمت اقدس ہوئے غرضکہ کسی سبب سے وہ مدینہ پہونچے وہ سب کے سب مدینہ علم سے دینی تعلیم و تربیت لے کر نکلے اور اپنی قوم اور اپنے علاقے کے لئے معلم و مربی بن کر لوٹے۔[۴۶]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "بیعت ہجرت" اور "بیعت عربیت" میں جو فرق روا رکھا تھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ نو مسلم بدوی عربوں کو مناسب تعلیم و تربیت کے ذریعے اسلامی امت کا ایک پکا رکن اور اسلام کا صحیح علمبردار بنا دیا جائے کیونکہ انھیں بدو اور گنوار عربوں کو ایک دن دنیا کی امامت و سیادت کرنی تھی۔ جو لوگ بیعت ہجرت کو ترجیح دیتے تھے وہ ترک سکونتِ وطن کر کے مدینہ آ بستے تھے اور اسلامی امت کے "طبقہ خیر" میں ضم ہو جاتے تھے اور ہمہ وقت وہ اسلامی ریاست اور اسلام کی گوناگوں خدمات کے لئے دستیاب ہوتے تھے، جبکہ وہ لوگ جو "بیعت عربیت" کو پسند کرتے تھے وہ مختصر مدت کے لئے مدینہ آتے، اسلامی تعلیمات حاصل کرتے، دین میں تفقہ حاصل کرتے اور اپنے گھروں کو مبلغ اور معلم بن کر لوٹتے تھے۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بیعت ہجرت ان کمزور عرب قبیلوں کے نو مسلموں سے طلب کی جاتی تھی جن کے اسلام کے لیے اندرونی یا بیرونی خطرات ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد بیعتِ ہجرت باقی نہیں رہی تھی کیونکہ اب بادِ مخالفت اتنی طاقت ور نہیں رہ گئی تھی کہ نو مسلموں پر وہ کسی قسم کا منفی دباؤ ڈال سکتی۔ بعض بدوی قبائل جیسے خزاعہ، اسلم اور مزینہ (اور غالباً متعدد دوسروں) کو "مہاجر" کا مرتبہ و مقام ترک سکونت وطن اور قیام مدینہ کے بغیر بھی عطا کیا جاتا اس سبب سے نہیں تھا کہ اسلامی امت میں مہاجرین کو کوئی خاص مراعات اور حقوق حاصل تھے جو دوسرے مسلم طبقات کو نہیں ملتے تھے جیسا کہ بعض مستشرقین نے ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔[۴۷] بلکہ اس بنا پر تھا کہ وہ اپنے ایمان میں پختہ تھے اور دین کی سمجھ رکھتے تھے۔ بہرحال ان تمام شواہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان قبیلوں کی دینی تعلیم و تربیت کے لئے ان کے اپنے علاقوں میں موزوں انتظامات کئے گئے تھے۔

اب ہمارے لیے اس مسئلہ کا مطالعہ کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ جو عرب قبائل مدینہ نہیں آ سکتے تھے ان کی مذہبی تعلیم و تربیت کے لیے عہد نبوی میں کیا انتظام تھا؟ ایک روایت کا حوالہ گذر چکا ہے کہ قبائل عرب کے لوگ مدینہ آتے تھے اور اسلامی تعلیمات سیکھ کر اپنے لوگوں کو جا کر سکھاتے تھے۔ اس کی مزید تائید بخاری کی ایک اور روایت سے ہوتی ہے جو عمرو بن سلمہ کی سند پر بیان ہوئی ہے۔ اس کے مطابق مدینہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خبر سے قبائل عرب میں خاصی ہلچل پیدا ہو گئی تھی اور ان کے قافلے (رُکبان) جوق در جوق اور شوق بر شوق خدمت اقدس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اس حدیث کے راوی کا بیان ہے کہ ان کا قبیلہ بنو جرم قافلوں کی آمد و رفت کے راستے پر واقع تھا اور وہ آنے جانے والوں سے آپ کے اور آپ کے صحابہ کرام کے بارے میں پوچھا کرتے تھے۔ حضرت عمرو بن سلمہ ان قافلہ والوں سے قرآن سن سن کر یاد کر لیا کرتے تھے حالانکہ وہ خاصے کمسن تھے اور مکہ کی فتح کے زمانے تک ان کو اتنا قرآن یاد ہو گیا تھا کہ وہ اپنے قبیلہ کے سب سے بڑے حافظ سمجھے جاتے تھے۔ یہ سارا قرآن انہوں نے اسی طرح پوچھ پوچھ کر یاد کیا تھا۔[۴۸]

طبری کا بیان ہے کہ بنو حنیفہ کے ایک نو مسلم نے خدمت نبوی میں حاضری دی، کچھ مدت تک رہ کر دین کی سمجھ پیدا کی اور اپنے وطن یمامہ کو جب ان کی واپسی ہوئی تو وہ معلم بن چکے تھے اور وہاں پہونچ کر انہوں نے اپنی قوم میں تبلیغ و تعلیم پھیلائی۔[۴۹]

جب کہ فتح ہوا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وطن مالوف کے لوگوں کی دینی تعلیم و تربیت کی فکر دامنگیر ہوئی۔ تمام مآخذ کا متفقہ بیان ہے کہ آپ نے مکہ کے نو مسلموں کو قرآن حکیم سکھانے اور اسلام کی بنیادی تعلیمات بتانے کی خاطر اپنے دو عظیم صحابیوں حضرات معاذ بن جبل خزرجی اور ابو موسیٰ اشعری کو بطور معلم وہاں چھوڑا تھا اور انہوں نے خاصی مدت تک یہ فرض خوش گوارانجام دیا تھا۔[۵۰]

اسی طرح طائف کے محاصرے کے دوران ثقیف کے جن غلاموں نے اپنے آقاؤں کا ساتھ چھوڑ کر اسلام کے دامن میں پناہ لی تھی آپ نے ان کو مختلف صحابہ کرام کے دامن تربیت سے وابستہ کر دیا تھا تاکہ ان کی صحیح اور مناسب دینی تعلیم و مذہبی تربیت ہو سکے۔ اس ضمن میں جن معلمین کے نام نامی مذکور ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ حضرت عمرو بن سعید اموی رضؓ ۲۔ حضرت خالد بن سعید اموی رضؓ ۳۔ حضرت ابان بن سعید اموی رضؓ
۴۔ حضرت عثمان بن عفان اموی رضؓ ۵۔ حضرت سعد بن عبادہ خزرجی رضؓ ۶۔ حضرت اسید بن حضیر اوسی رضؓ[۵۱]

یہ دلچسپ اور اہم حقیقت ہے کہ مہاجرین میں سب کا تعلق بنو امیہ کے دو خاندانوں سے تھا اور حضرت عثمان کے سوا بقیہ کا سعیدی گھرانے سے جبکہ انصاری معلمین میں سے ایک ایک کا تعلق مدینہ کے دونوں قبیلوں سے تھا۔ بالواسطہ سہی، لیکن اس سے عہد نبوی میں بنو امیہ کے علم و فضل اور اسلام میں پختگی کا پورا ثبوت ملتا ہے جو اموی مخالف نگاہوں کو نہیں دکھائی دیتا۔

اسلامی ریاست کے دوسرے علاقوں میں والی / گورنر، مرکزی اور مقامی منتظمین حتیٰ کہ فوجی سالار اور صدقات کے عاملین بھی اپنے اپنے علاقہ کے مذہبی اور دینی تقاضوں کی تسکین کے ذمہ دار تھے۔ جنوبی عرب کے گورنر جنرل حضرت معاذ بن جبل، ذبید، رمع، عدن اور سواحل کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعری، نجران کے گورنر حضرت عمرو بن حزم عمان کے گورنر حضرت عمرو بن عاص، بحرین کے گورنر حضرت علاءؓ بن حضرمی اور صنعاء کے گورنر حضرت خالد بن سعید کے بارے میں واضح طور سے ذکر ملتا ہے کہ وہ اپنے علاقوں کے لوگوں کی دینی اور مذہبی تربیت بھی کرتے تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے متعدد گورنروں اور والیوں کے بارے میں مضمراً بیان ملتا ہے[۵۲]، حضرت معاذ بن جبل کے بارے میں لفظ "معلم" کا اطلاق طبری نے بار بار کیا ہے۔ سالاران فوج میں حضرت خالد بن ولید مخزومی کی تعلیمی اور تبلیغی کارناموں کا ذکر کئی مقام پر ملتا ہے[۵۳]۔ اسی طرح حضرت علی بن ابی طالب کے قبیلہ ہمدان میں تعلیم قرآن و اسلام کا حوالہ وضاحت سے آتا ہے۔[۵۴]
دوسرے سالاروں میں حضرات عبدالرحمٰن بن عوف، عمرو بن عاص وغیرہ کے بارے میں مضمراً اور سب سے بڑھ کر سالارِ اعظم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صراحتاً متعدد بیانات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام سالاران فوج اور ان کے اہل علم سپاہی بھی تلوار و تبر کے علاوہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ بھی اسلامی ریاست کی خدمت انجام دیا کرتے تھے۔

جہاں تک عاملین صدقات کے اشاعت علم و تبلیغ و تربیت میں حصہ لینے کا تعلق ہے تو حضرت عباد بن بشر انصاری کے بارے میں تمام مآخذ نے دلچسپ بیان کیا ہے ۔ اس کے مطابق صدقات کی وصولی کے بعد بھی حضرت عباد بنو مصطلق میں دس دنوں تک مقیم رہے تھے اور اس دوران ان کو اسلام کی بنیادی باتوں کی تعلیم دیتے رہے تھے اور تربیت کے ذریعہ ان کو پاکیزگی بخشتے رہے تھے ۔(۵۵) ان کے علاوہ تقریباً تمام عاملین صدقات کو بھی معلین وقت میں شمار کرنا چاہیئے ۔ کیونکہ وہ اپنے قول و فعل سے ہی نہیں بلکہ باقاعدہ لوگوں کو اسلام کے مبادی سے روشناس کراتے تھے ۔ ذکر آ چکا ہے کہ کس طرح دو گمنام عاملوں نے صدقات میں بہترین جانور قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور صدقات ادا کرنے والوں کو ان کے حقوق اور صدقات کے جانوروں کے بارے میں بتایا تھا ۔(۵۶) اس بحث کے آخر میں بہر حال ان دو مثالوں کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے جن سے ایک طرف تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ذریعے اور درس گاہ سے علم حاصل کرنے کی فکر و احساس کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف مذہب کے دفاع کے عظیم احساس و طاقت کا ادراک کیا جا سکتا ہے ۔ پہلی مثال کا تعلق اس نادر مگر مشہور واقعہ سے ہے جس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیران بدر میں سے اہل علم کو صرف اس شرط پر رہا کر دیا تھا کہ وہ فی کس مدینہ کے دس مسلم بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں ۔(۵۷)

دوسری مثال کا تعلق ۴ھ / ۶۲۶ء سے ہے جب آپ نے حضرت زید بن ثابت انصاری کو عبرانی زبان اور سابق سماوی کتب کا علم حاصل کرنے کا حکم دیا تھا اور بعض روایات کے مطابق حضرت زید نے اور کئی زبانیں بھی سیکھی تھیں ۔(۵۸) ظاہر ہے کہ کتب سماوی کا یہ علم یا مختلف زبانوں سے واقفیت حضرت زید بن ثابتؓ تک ہی محدود نہیں رہی ہوگی ۔ بہر حال یہ محض مفروضہ و قیاس نہیں ہے بلکہ تاریخی شہادت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے معاصر مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے بہترین انتظامات کئے تھے اور بہترین معلین کو اس خدمت کے لئے مقرر کیا تھا ۔ اس سے بڑھ کر اور کیا واقعاتی شہادت ہو سکتی ہے کہ عہد نبوی میں بھی اور اس کے معاً بعد خاص کر یہی صحبت نبوی کے فیض یافتہ عرب معلین پوری دنیا کو دین ، اسلام ، اخلاق اور پاکیزگی کا سبق سکھانے نکلے تھے اور اقوام عالم کے اولین مسلم اساتذہ تھے ۔

۳ ۔ افتاء اور مفتی

ایک لحاظ سے عہد نبوی کے مفتیانِ دین متین اساتذہ اور معلین ہی کی فہرست میں آتے ہیں کیونکہ وہ بھی بنیادی طور سے مسلمانوں کو اسرار و رموزِ دین و ایمان سے آگہی بخشتے تھے ۔ بہر حال متعدد مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں کم از کم مدینہ میں متعدد مفتی تھے جو دین سے متعلق امور پر اپنی رائے دیتے تھے یا اسلامی احکام کی صحیح تعبیر و تشریح کرتے تھے ۔(۵۹) یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک انتہائی دور اندیشی پر مبنی اور عملی حکمت تھی کہ آپ نے اپنی موجودگی ہی میں کتاب و سنت کے ایسے عالم و شارح پیدا کر دیئے تھے جو آپ کے بعد بھی اسلام کی امامت و سیادت کا کام بخوبی کر سکتے تھے ۔ خاص طور پر دوسرے ملکوں اور بدلے ہونے حالات میں دین کی نئی اور مناسب تشریح ضروری تھی اور اس کے لیے "تفقہ فی الدین" لازمی

مشروط تھی اور آپؐ نے اسی تقاضے کے تحت اپنے بعض صحابہ کی جن میں جوہر قابل تھا خصوصی تربیت فرمائی تھی تاکہ چراغ سے چراغ جلتے رہیں اور پورا عالم انسانی اسلام کے نور سے مستفیض ہو سکے۔ یہ خیال کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف ملکوں اور کرۂ ارض کے متعدد خطوں میں اسلام کی اشاعت و استحکام کا اپنی حیات طیبہ ہی میں ادراک کر لیا تھا محض ایک مفروضہ اور اٹکل نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے جس پر سب سے بڑی شہادت قرآن کریم کی ہے کہ اسلام ایک عالمی مذہب ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے آخری رسولؐ ہیں۔ چنانچہ آپ نے اپنے صحابہ کو نئے حالات میں اور نئے لوگوں کی ضرورتوں کے مطابق دین کی تشریح و تعبیر کا کام کرنے کے "قابل بنانے کے لیے متعدد صحابہ کی ٹھوس تربیت کی۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کی وہ حدیث جس میں انہوں نے قرآن حکیم اور سنت نبویؐ کے بعد اپنی رائے پر عمل کرنے کا اظہار کیا تھا اس تربیت نبویؐ کے فیضان کا اظہار تھا۔(۶۰)

اسی طرح آپؐ نے اپنی موجودگی میں بعض صحابہ کرام سے دینی امور اور مذہبی مسائل پر فیصلے کرائے تھے ظاہر ہے کہ اس عہد مبارک و میمون میں تین اصول پوری طرح ظہور و عمل میں آچکے تھے اول یہ کہ معاملات زیر بحث کو قرآن حکیم کی روشنی میں حل کیا جائے اور وہاں کوئی ہدایت نہ مل سکے تو سنت کی روشنی میں فیصلہ کیا جائے لیکن ان دونوں سے بھی اگر کسی خاص معاملہ پر روشنی نہ مل سکے تو اس "رائے" اور "خیال" پر اعتماد کیا جائے جو کتاب و سنت کی فہم کا زائدہ و بایدہ ہے۔ حضرت معاذ بن جبل کا واقعہ تنہا نہیں ہے۔ بلکہ وہ نمائندگی کرتا ہے اس امر واقعی کی کہ تمام مرکزی منتظمین اور ان کے ماتحت عامل کارکنان مذہبی و دینی معاملات کی تشریح و تعبیر کرنے کی نہ صرف پوری صلاحیت رکھتے تھے بلکہ عملاً انہوں نے ایسا کیا بھی تھا۔ اگر کسی معاملہ پر ان کو پورا شرح صدر نہیں ہوتا تھا تو وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کر لیتے تھے کہ آپ ہی شارع اول و مفتی اعظم تھے۔ بہرحال آپؐ کے بعد عموماً صحابہ کرام اپنی ذاتی آراء و خیالات پر اعتماد کرتے تھے۔ البتہ بعض امور میں وہ خلیفۂ وقت سے بھی مشورہ کر لیا کرتے تھے کہ وہ ان سے زیادہ اہل علم اور تجربہ کار تھے۔

بہرحال ابن سعد نے اپنی مختلف روایتوں میں عہد نبوی کے مدینہ منورہ کے کم از کم آٹھ صحابہ کرام کو مفتیان وقت میں شمار کیا ہے۔ ان میں سے پانچ کا تعلق مہاجرین قریش سے تھا اور باقی تین کا انصار کے قبیلہ خزرج سے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ تھے:

۱۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ ۲۔ حضرت عمر فاروقؓ ۳۔ حضرت عثمان بن عفانؓ ۴۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ
۵۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ۶۔ حضرت معاذ بن جبلؓ ۷۔ حضرت ابی بن کعبؓ اور ۸۔ حضرت زید بن ثابتؓ۔(۶۱)

ابن جوزی نے عہد نبویؐ کے مفتیوں کی تعداد تیرہ بتائی ہے اور مذکورہ بالا صحابہ کرام کے علاوہ حضرات عبداللہ بن مسعودؓ، حذیفہ بن یمانؓ ابوالدرداءؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ اور سلمان فارسیؓ کے اسمائے گرامی کا اضافہ کیا ہے(۶۲)۔ ایک اور ماخذ کے مطابق کم از کم چودہ پندرہ صحابہ کرام فتویٰ دینے کے مجاز تھے۔ ان میں سے نئے نام یہ ہیں: حضرات عبداللہ بن عباسؓ، ابوہریرہؓ، انس بن مالک اور زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ صدیقہؓ ایک اور ماخذ میں حضرت عمار بن یاسرؓ کا نام بھی افقہ اہل علم میں شمار کیا گیا ہے۔(۶۳)

جلال الدین سیوطیؒ نے جو فہرست دی ہے اس میں پچیس صحابہ کے نام گنائے گئے ہیں اور دعویٰ کیا ہے کہ ان میں بعض کے

فتاویٰ کو متعدد ضخیم جلدوں میں مدون کیا جا سکتا ہے۔ اس فہرست میں جو نئے نام ہیں وہ یہ ہیں: حضرات عبداللہ بن عمر، سعد بن ابی وقاصؓ، عبداللہ بن عمرو بن عاص، جابر بن عبداللہ، ابوسعید خدری، زبیر بن عوام، عمران بن حصین، ابوبکرہ، عبادہ بن صامت، معاویہ بن ابی سفیان، عبداللہ بن زبیر اور زوجہ مطہرہ حضرت ام سلمہ[۶۴]۔ یہ یقینی ہے کہ عہد نبوی میں مفتی بننے کے اہل صحابہ کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی اور ایک روایت جو ان کی تعداد ایک سو بیس بتاتی ہے بالکل قرین قیاس ہے۔[۶۵] اس سلسلہ میں یہ حقیقت یاد رکھنے کے لائق ہے کہ تمام صحابہ کرام جو اہلِ علم تھے اور کچھ مدت تک صحبت نبوی سے فیضیاب بھی ہوئے تھے "افتا" کے اہل تھے اور حقیقتاً "فتاویٰ" دیتے بھی تھے۔ لیکن عہد نبوی کے مفتیوں میں ایسے صحابہ کرام کو جو اس وقت محض خورد سال تھے جیسے حضرات عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر اور انس بن مالک وغیرہ شمار نہیں کرنا چاہئے۔ ان حضرات نے عہد نبوی کے بعد یہ خدمت انجام دی تھی اور خوب خوب انجام دی تھی۔

۴۔ ائمہ مساجد

اللہ تعالیٰ کے آخری رسول و پیغمبر ہونے کی وجہ سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باجماعت نمازوں کی امامت فرماتے تھے اور آپ کی موجودگی میں اصولی یا عملی طور سے کوئی اور نہ صرف یہ کہ نمازوں میں امامت نہیں کر سکتا تھا بلکہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں بھی کسی طرح کی قیادت کا حق دار نہیں بن سکتا تھا تاآنکہ آپ اس کو اپنا اختیار عارضی یا مستقل طور سے منتقل نہ کر دیں۔ چنانچہ مکی دورِ حیات میں صرف آپ ہی کی امامت کی مثالیں ملتی ہیں البتہ آپ کی غیر حاضری میں کوئی صالح مسلمان امامت کے فرائض انجام دے سکتا تھا۔ اور عموماً آپ خود ایسے اماموں کا تقرر فرما دیتے تھے۔ مدینہ منورہ میں آپ کی آمد سے قبل مختلف مواقع پر مختلف اماموں کا ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ ابن سعد کا بیان ہے کہ انصار مدینہ کے نقیب النقباء حضرت اسعد بن زرارہ نمازوں میں مسلمانان مدینہ کی امامت کیا کرتے تھے۔[۶۶] اور کچھ مدت بعد جب حضرت مصعب بن عمیر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ و فرستادہ کی حیثیت سے آ گئے تھے تو وہ ان کی جگہ مدینہ کے امام نماز بن گئے تھے۔[۶۷] پھر جب حضرت مصعب ملاقات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مکہ گئے تو ان کی جگہ امامت کا فریضہ حضرت اسعد بن زرارہ انجام دینے لگے تھے۔[۶۸] اسد الغابہ کا بیان ہے کہ قبا کی مسجد میں جو اسلام میں پہلی مسجد تھی حضرت حنظلہ بن ابی حنظلہ امامت کیا کرتے تھے۔[۶۹]

بخاری، ابوداؤد، ابن اسحاق اور ابن ہشام وغیرہ کی متعدد روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے پہلے مدینہ کے مسلمانوں کے دو امام نماز ہوا کرتے تھے: ایک حضرت مصعب بن عمیر عبدری تھے جو انصار کے امام تھے اور دوسرے حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ تھے جو مہاجرین کی امامت کیا کرتے تھے۔[۷۰] اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مدینہ میں دو مسجدیں تھیں اور ان کے علاوہ قبا کی مسجد تیسری تھی۔ ہجرت نبوی کے بعد مدنی مسلمانوں کے امام خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہو گئے تھے۔

جوں جوں اسلام کی اشاعت اور اسلامی ریاست کے اثر و نفوذ کا دائرہ وسیع ہوا توں توں مسجدوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور جزیرہ نمائے عرب کے تقریباً تمام قبیلوں اور ان کے خاندانوں میں مسجدیں تعمیر ہو گئیں۔ کیونکہ نماز (الصلوٰۃ) دین کا سب سے اہم رکن

ہے۔ دراصل یہ مسجدیں محض عبادت گاہیں نہیں تھیں بلکہ مقامی مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، تنظیمی اور تہذیبی مراکز تھے جہاں امت اسلامیہ کا شیرازہ مجتمع کیا جاتا تھا۔ خود اسلامی ریاست کے صدر مقام مدینہ منورہ میں متعدد مسجدیں بن گئی تھیں کیونکہ وہاں مسلم آبادی اتنی زیادہ تھی کہ مسجد نبوی تمام مدنی مسلمانوں کے لیے کفایت نہیں کر سکتی تھی۔ صحیح بخاری کی متعدد روایات مدینہ منورہ کی مختلف مساجد کی طرف اشارہ کرتی ہیں جہاں پابندی کے ساتھ نماز بجماعت ادا کی جایا کرتی تھی۔ مدینہ اور قبا کی دو مسجدوں کے علاوہ جو عام طور پر معروف ہیں امام بخاری نے دو اور مسجدوں کا ذکر کیا ہے جو دو انصاری خاندانوں یعنی بنو زریق[41] اور بنو عمرو بن عوف کی مسجد[42] کے نام سے مشہور تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان تمام مساجد میں نمازوں کے امام مقرر تھے اور جن کی تقرری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہوئی تھی[43]۔

ایک اور روایت کا بیان ہے کہ حضرت عتبان بن مالک انصاری اپنی قوم کے امام تھے اور ان کی باجماعت نمازوں میں امامت کیا کرتے تھے اگرچہ اس روایت سے ان کے قبیلہ یا خاندان کا نام نہیں معلوم ہوتا ہے[44]۔ بہرحال اسد الغابہ کی روایت سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ وہ خاندان بنی سالم کے جو خزرج کا ایک اہم بطن تھا امام تھے اور انہوں نے اپنے نابینا ہونے تک امامت کا فریضہ انجام دیا تھا اور اس کے بعد انہوں نے ایک خانہ مسجد بنالی تھی جہاں یاد خدا کیا کرتے تھے[45]۔ اسی ماخذ کا بیان ہے کہ انصار کے قبیلہ اوس کے ایک خاندان بنو خطمہ نے بھی اپنی ایک مسجد بنالی تھی جس کے امام حضرت عبداللہ بن عمیر خطمی تھے[46]۔ حضرت معاذ بن جبل کے بارے میں روایت آتی ہے کہ وہ اپنی قوم یعنی بنو جشم خزرج کے امام تھے، اور مسجد نبوی میں نماز عشا پڑھنے کے باوجود اپنی قوم کی مسجد میں لوگوں کی امامت کیا کرتے تھے[47]۔

سنن ابی داؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اوس کے خاندان بنو عبد الاشہل کے ممتاز صحابی اور سردار حضرت اسید بن حضیر اپنی قوم کے امام مسجد تھے[48]۔

محدث ابو داؤد نے اپنی سنن ہی کے ایک الگ باب میں جس کو انہوں نے "کتاب المراسیل" کا عنوان دیا ہے مدینہ کی کم از کم نو مسجدوں کا ذکر کیا ہے جن میں عہد نبوی میں باقاعدہ جماعت کے ساتھ نمازیں ان کے اپنے اماموں کی امامت میں ادا کی جاتی تھیں۔ یہ تمام مسجدیں مختلف انصاری اور بدوی مہاجر قبیلوں کے نام سے منسوب تھیں۔ چنانچہ بنو عمرو، بنو ساعدہ، بنو عبید، بنو سلمہ، بنو رباح، بنو زریق، بنو غفار، بنو اسلم اور بنو جہینہ کی مساجد کا ذکر ملتا ہے[49]۔ موخر الذکر مسجد کا حوالہ ابن سعد نے بھی دیا ہے[50]۔

صحیح بخاری کی شرح عینی کے ایک موضوع پر بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا نو مسجدوں کے علاوہ مدینہ منورہ اور اس کے نواحی علاقوں میں کم و بیش بائیس[51] اور مسجدیں تھیں جہاں پابندی کے ساتھ جماعت پنجگانہ ادا کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان نمازوں کی امامت کے لیے مستقل امام مقرر کیے گئے تھے۔ ان مساجد کے نام تھے:

مسجد بنو خدرہ، مسجد بنو امیہ، مسجد بنو بیاضہ، مسجد بنو حبلیٰ، مسجد بنو عصیہ، مسجد بنو ابی فیصلہ، مسجد بنو دینار، مسجد ابی بن کعب، مسجد نابغہ، مسجد ابن عدی، مسجد بنی الحارث (خزرج)، مسجد بنی خطمہ، مسجد الفضیخ، مسجد بنی حارثہ،

مسجد بنی ظفر ، مسجد بنی عبد الاشہل ، مسجد وقیم ، مسجد بنی معاویہ ، مسجد عاتکہ ، مسجد بنی قریظہ ، مسجد بنی وائل اور مسجد الشجرہ[۸۱] - یہ تمام مساجد یا تو انصار کے خاندانوں کی طرف منسوب تھیں یا ان کے بعض اہم افراد کی طرف ۔ ایک دو کا انتساب مقامات کی طرف بھی تھا ۔ بہرحال اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان میں ایک مسجد مشہور یہودی قبیلہ بنی قریظہ کے نام سے بھی موسوم تھی ۔ اگرچہ اس کی تاریخی اور سماجی اہمیت پر بحث کا یہ موزوں مقام نہیں ہے تاہم یہ عرفات اور برکات احمد کی تحقیقات کی بالواسطہ تصدیق کرتی ہے کہ بنی قریظہ کا قتل عام نہیں کیا گیا تھا ۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ ایک خاصی بڑی بستی تھی جہاں کافی مسلم آبادی تھی اور تقریباً اوس و خزرج کے تمام بڑے بڑے خاندانوں کی اپنی مسجدیں تھیں ۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے مہاجر یا مقامی باشندوں کے طبقات کی بھی مساجد تھیں اور ان کی تعداد کافی تھی ۔ ان تمام مساجد میں مستقل امام تھے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ تھے ۔

اسلامی ریاست کے صدر مقام مدینہ منورہ کے باہر جزیرہ نمائے عرب کے ہر گوشے میں جہاں مسلمان بستے تھے بلکہ ہر قبیلہ اور ہر خاندان (البطن) کے بیچ ایک یا اس سے زیادہ مساجد موجود تھیں[۸۲] اوپر حوالہ آچکا ہے کہ بحرین کے قبیلہ عبد القیس کی ایک مسجد جواثی نامی مقام پر تھی جہاں مسجد نبوی کے بعد پورے عرب میں سب سے پہلا جمعہ قائم کیا گیا تھا[۸۳] ۔ ظاہر ہے کہ بحرین میں صرف یہی ایک مسجد نہ تھی ، روایات میں آتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی وہاں متعدد مسجدیں تھیں ۔ خانہ کعبہ اور اس کے گرد مسجد حرام مکہ مکرمہ کی مسجد جامع تھی جس کے امام وہاں کے گورنر حضرت عتاب بن اسید اموی تھے[۸۴] ۔

اگرچہ مکہ کی اور کسی مسجد کا ذکر نہیں ملتا لیکن یہ قرین قیاس ہی نہیں بلکہ یقینی امر ہے کہ اس کے علاوہ بھی وہاں متعدد مساجد تھیں ۔ مکہ کی قریبی بستی طائف میں اس کے گورنر حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی نمازوں کے امام بھی تھے[۸۵] اور ظاہر ہے کہ دوسری مساجد بھی طائف اور ثقیف کے علاقے میں تھیں جہاں مستقل ائمہ کام کرتے تھے ۔ جب حضرت عمرو بن العاص سہمی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمان کا گورنر بنا کر بھیجا تھا تو ان کے ساتھ حضرت ابو زید انصاری کو اس علاقے کا پیش امام[۸۶] مقرر فرما کر ساتھ روانہ کیا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمان کے لیے ایک مخصوص انتظام تھا ورنہ عام طور سے علاقوں اور ولایات کے مرکزی منتظمین یا والی ہی ان کے امام بھی ہوتے تھے ۔ جیسا کہ مکہ ، طائف ، جنوبی عرب ، اور اس کے ماتحت مختلف ولایات سے معلوم ہوتا ہے[۸۷] ۔

مرکزی منتظمین یا والی تو عام طور سے ولایات کے صدر مقام پر سکونت پذیر رہتے تھے اس لیے وہ وہاں کی جامع مسجد ہی کے امام ہو سکتے تھے اور ظاہر ہے کہ پورے شہر میں صرف ایک ہی مسجد نہیں ہوتی تھی بلکہ محلہ محلہ میں مسجدیں ہوتی تھیں جیسی کہ آج کل ہوتی ہیں اور ان مسجدوں میں مقامی لوگ ہی خاص کر مقامی سربرآوردہ لوگ یا منتظمین ہی امام ہوتے تھے بشرطیکہ ان کو قرآن کریم کا مناسب علم ہو اور مسائل سے ضروری واقفیت ہو ۔ چنانچہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شداد بن ثمامہ کو جو بنو کعب بن اوس کے سردار تھے اپنی قوم کا امام مقرر کیا گیا تھا کیونکہ وہ اس منصب کے پوری طرح اہل تھے[۸۸] ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امام نماز کے لیے اوصاف اور شرائط مقرر کر دی تھیں چنانچہ صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق "جو لوگ قرآن کے سب سے زیادہ حافظ (اور عالم) ہوں وہ امامت کے سب سے زیادہ اہل ہیں ۔ اگر تمام نمازی اس میں مساوی ہوں تو وہ شخص جو سنت کا سب

زیادہ علم رکھتا ہے۔ اگر اس میں بھی سب برابر ہوں تو سب سے قدیم مہاجر اور اگر اس میں بھی سب مساوی ہوں تو سب سے زیادہ معمر آدمی امام بنے گا۔" (۸۹)

حضرت عثمان بن ابی العاص اور عمرو بن سلمہ کا بنو ثقیف اور بنو جرم کا امام مقرر کیا جانا اسی اصول کی بنا پر تھا حالانکہ یہ دونوں نسبتاً بہت کمسن تھے۔ مگر چونکہ وہ اپنے قبیلوں میں سب سے زیادہ قرآن جانتے تھے اس لئے ان کو دوسروں پہ ترجیح دی گئی تھی۔

واقدی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کثیر آبادی والے عرب قبیلوں اور خاندانوں کی اپنے اپنے علاقوں میں متعدد مسجدیں ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر بنو جذیمہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے کھیتوں، میدانوں یا صحنوں (ساحاتہم) میں متعدد مسجدیں تھیں۔(۹۰) اسی طرح بنو مصطلق نے اپنے کھلے میدانوں میں کئی مسجدیں (مساجد) بنائی تھیں۔(۹۱) یہاں عہد نبوی کے تمام اماموں یا ان کی مسجدوں کا ذکر مقصود نہیں ہے بلکہ یہ ثابت کرنا مطلوب ہے کہ جہاں جہاں معتدبہ مسلم آبادی تھی وہاں ان کی تعداد کی مناسبت سے مسجدیں آباد ہو گئی تھیں اور جہاں پنج وقتہ نمازیں ادا کی جاتی تھیں وہاں امام نماز تھے۔ ان ائمہ مساجد کا تقرر یا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود فرمایا تھا یا قبیلہ / خاندان کے مسلمانوں نے منتخب کر لیا تھا اور ان کی تقرری کو خاموش اجازت نبوی حاصل تھی۔

غیر معمولی حالات میں مسجد نبوی میں یا کسی دوسری جگہ صحابہ کرام میں کوئی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ مسلمانوں کی نماز میں امامت کر سکتا تھا۔ چنانچہ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ مدینہ منورہ سے آپؐ کی غیر حاضری کے زمانے میں نائبین رسولؐ مسجد نبوی میں مسلمانانِ مدینہ کی امامت کیا کرتے تھے۔ یہ بھی حوالہ گذر چکا ہے جیسا کہ واقدی اور ابن سعد کے متفقہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے زمانے میں جب عظیم اسلامی لشکر شمالی سرحدوں کی طرف رواں دواں تھا تو اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک حصہ کی امامت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اور دوسرے کی حضرت ابوبکر صدیقؓ۔(۹۲) یہاں یہ بھی بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کارکنان ریاست جیسے والی، گورنر اور سالار وغیرہ بھی مستقل امام نماز ہوا کرتے تھے، سالاروں کے سلسلہ میں حضرت عمرو بن عاص سہمی کی امامت نماز کا واقعہ بڑا دلچسپ بھی ہے اور اہم(۹۳) بھی۔ غزوۂ تبوک کے دوران ایک موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے امامت کی تھی۔ یہ واقعہ ماخذ میں بڑے دلچسپ انداز سے بیان ہوا ہے:

روایت کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی ضرورت سے تھوڑی دیر کے لئے لشکر گاہ سے کہیں چلے گئے۔ اسی دوران نماز کا وقت آ گیا (بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت تنگ ہونے لگا اور خدشہ پیدا ہوا کہ نماز قضا نہ ہو جائے)۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے نماز پڑھانے کو کہا۔ ان کو تردد تھا لیکن قضا ہونے کے خوف سے انہوں نے نماز شروع کر دی۔ ایک رکعت ہو چکی تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے آپ کو دیکھ کر پیچھے ہٹنا چاہا مگر آپ نے ان کو اشارہ سے نماز مکمل کرنے کی ہدایت کی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ اپنی نماز ان کی امامت میں پوری کی بلکہ بعد میں ان کے اقدام کی تعریف و تحسین فرمائی کہ "تم نے خوب کیا۔ کسی نبی نے اس وقت تک وفات نہیں پائی

جب تک کہ اس کے صحابہ میں سے کسی نیک آدمی کی امامت میں اس نے نماز نہ پڑھ لی۔"[۹۴]

یہ واقعہ تو بہت مشہور ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت میں روایات کے مطابق حضرت ابوبکر صدیق نے سترہ نمازیں پڑھائی تھیں اور ایک بار آپ خود بھی اس میں شریک ہوئے تھے۔[۹۵] علماء وفقہاء کا خیال ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رض اس وقت امام نہیں رہے تھے بلکہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرتے تھے اور ان کی اقتدا تمام مسلمان کرتے تھے۔ مگر یہ دور کی اور غیر معقول دلیل اور تاویل ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رض کی امامت میں آپ کے نماز پڑھنے کی روایت اگر صحیح ہے (اور اس کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں)، تو پھر حضرت ابوبکر صدیق رض کی امامت میں آپ کا نماز پڑھنا کیوں مشتبہ سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال مذکورہ بالا بحث سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے اس اولین رکن کی ادائیگی کے لیے آپ نے مستقل ائمہ مساجد کا تقرر کیا تھا جو دن رات پانچ وقت اللہ کی عظمت کے گن گاتے تھے۔

۵۔ مؤذنین رسولؐ

اذان نماز کو قائم کرنے کی ایک لازمی اور منطقی شرط ہے کہ میں مسلمانوں کو باقاعدہ اعلان کرکے نماز کے لیے جمع کرنا مختلف وجوہ سے ناممکن تھا۔ ہجرت نبوی کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو جماعت پنجگانہ کے لئے کیونکر اکٹھا کیا جائے۔ اس سے پہلے مدنی مسلمان ایک مقررہ وقت پر جمع ہوجایا کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں اذان کی ابتدا کا دلچسپ واقعہ نقل ہوا ہے۔ اس کے مطابق تمام مسلمان مسجد میں جمع ہوئے اور یہ بحث ہوئی کہ نماز کے لیے مسلمانوں کو اکٹھا کرنے کا بہتر طریقہ کیا ہے۔ مختلف تجاویز پیش کی گئیں مگر ان میں سے کوئی بھی باب رسالت سے منظور نہ ہوئی۔ بالآخر حضرت عمر بن خطاب نے "اذان" کا طریقہ تجویز کیا[۹۶] جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پسند آیا۔ بہرحال اسی پر عمل درآمد شروع ہوا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال حبشی کو اسلام میں پہلا مؤذن مقرر فرمایا۔[۹۷] وہ جماعت پنجگانہ کے لیے مسجد نبوی سے مسلمانوں کو خدا کی بارگاہ میں حاضری کے لیے بلاتے تھے۔[۹۸] روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد میں روزوں کی فرضیت کے بعد رمضان میں وقت سحری کے شروع ہونے کا اعلان اپنی اذان سے کرتے تھے۔[۹۹] مآخذ کے متفقہ بیانات کے مطابق حضرت بلال حبشی رض نے حیات نبوی کے آخری لمحہ تک خواہ آپ سفر میں ہوں یا حضر میں مؤذن رسولؐ ہونے کی سعادت پائی تھی اور بلا ریب اس میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا، نہ شریک وسہیم۔[۱۰۰]

ابن سعد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تین موذن تھے: حضرت بلال حبشی رض، حضرت ابو محذورہ رض جن کا اصلی نام اوس بن معیر جمحی تھا اور حضرت عمرو بن ام مکتوم عامری رض۔ اس روایت کے مطابق حضرت بلال رض کی غیر حاضری میں حضرت ابو محذورہ اذان دیتے تھے اور حضرت ابو محذورہ کی عدم موجودگی میں حضرت ابن ام مکتوم۔[۱۰۱]

لیکن ابن سعد کی اس روایت کا آخری حصہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ بلاشبہ یہ تینوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن تھے مگر حضرت ابن ام مکتوم رض کے بارے میں اب تک جتنی روایات مل سکی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رمضان میں سحری کے ختم ہونے کے اعلان کی اذان دیتے تھے۔[۱۰۲] اور غیبت نبوی میں امام نماز ہوتے تھے نہ کہ مؤذن۔ جہاں تک حضرت ابو محذورہ کا تعلق ہے۔

انہوں نے عہد نبوی میں ہمیشہ مکہ مکرمہ کے خانہ کعبہ میں اذان دی۔ انہوں نے مدینہ میں کبھی اذان نہیں دی۔ روایات کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ حضرت ابو محذورہ جمحی فتح مکہ کے دن اسلام لائے تھے اور ان کی شیریں آواز اور دل سوز انداز کی بنا پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خانہ کعبہ یا حرم مکہ کا مؤذن مقرر کر دیا تھا۔[103] یہ خدمت نبوی ان کو ایسی راس آئی کہ ان کی حیات کے بعد حرم کعبہ میں اذان کی سعادت ان ہی کے خاندان میں نسل در نسل منتقل ہوتی رہی تھی[104]

اسد الغابہ کا بیان ہے کہ حضرت سعد بن عائذ کو جو سعد القرظ کے نام سے زیادہ مشہور ہیں، مسجد قبا کا مؤذن مقرر کیا گیا تھا لیکن اس روایت کے مطابق وہ حضرت بلال حبشی کی عدم موجودگی میں مدینہ میں بھی اذان دیتے تھے[105] اس روایت کا بھی آخری حصہ صحیح نہیں ہے۔ ابن قتیبہ دینوری کا واضح اور صریح بیان ہے کہ صحابی موصوف حضرت ابو بکر صدیق رض کی خلافت کے آخر تک مسجد قبا ہی کے مؤذن رہے تھے۔ جب حضرت عمر بن خطاب رض خلیفہ ہوئے اور حضرت بلال رض حبشی ان کی اجازت سے شام چلے گئے تو خلیفہ دوم ان کو مدینہ کی مسجد نبوی میں لے آئے تھے[106]

بہر حال صحابی موصوف عہد صدیقی رض میں مدینہ آئے ہوں یا عہد فاروقی رض میں یہ امر اپنی جگہ مسلم ہے کہ وہ عہد نبوی میں مسجد قباہی کے مؤذن رہے تھے۔ اور ابن قتیبہ کے مطابق حضرت سعد القرظ کے جانشین مؤذنین ان کے اپنے خاندان والے تھے جو ابن قتیبہ کے زمانے میں بھی اپنے عہدے پر برقرار رہے تھے۔

اسد الغابہ کے ایک بیان کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور مؤذن کا نام حضرت عبدالعزیز بن اصم تھا۔ اس روایت میں اس کے علاوہ اور کچھ مذکور نہیں ہے[107] بہر حال کتانی کا خیال ہے کہ صحابی موصوف نے صرف ایک بار عہد نبوی میں اذان دی تھی[108] مؤخر الذکر مصنف کا مزید بیان ہے کہ حضرت زید بن حارث الصدائی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مؤذن تھے[109] مصنف عبدالرزاق کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور مؤذن کا نام حضرت ثوبان تھا جو آپ کے موالی تھے اور جنہوں نے صرف ایک بار یہ خدمت انجام دی تھی[110] مقریزی کی خطط کی بنیاد پر کتانی کا مزید بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آٹھویں مؤذن اور کوئی نہیں جناب عثمان بن عفان اموی تھے جو منبر رسول ص کے پاس اذان دیا کرتے تھے[111] غالباً اس سے مراد جمعہ کی دوسری اذان ہے جو خطبہ کے شروع ہونے سے قبل امام کے سامنے دی جاتی ہے۔ مآخذ میں عام طور سے مؤذنین رسول ص کے بارے میں یہ سکہ بند فقرہ ملتا ہے کہ "وہ حضرت بلال رض کے جانشین مؤذن تھے"۔ عموماً اس تبصرہ کا سبب مورخین یا راویوں کی یہ غلط فہمی معلوم ہوتی ہے کہ وہ مسجد نبوی کو جہاں حضرت بلال رض اذان دیتے تھے مدینہ کی صرف ایک مسجد تصور کر لیتے ہیں۔ بہر حال دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ کبھی کبھی حضرت بلال حبشی کی غیر حاضری میں کسی اور نے بھی ضرور اذان دی ہوگی

اسد الغابہ میں ایک خبر واحد سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اوقات مختلف قبائل عرب کے لیے بھی ائمہ کی مانند مؤذنوں کا بھی تقرر کیا تھا۔ روایت کے مطابق حضرت سفیان بن قیس رض کندی کو جو کندہ کے وفد میں حضرت اشعث بن قیس رض کے ساتھ آئے تھے اور ان کے حقیقی بھائی بھی تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے قبیلہ کے لیے مؤذن مقرر کیا تھا۔[112] بہر حال یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف خطوں میں بکھری ہوئی مسجدوں میں مؤذنین بھی تھے۔ خواہ ان کی تقرری رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے براہِ راست کی ہو یا بالواسطہ۔ دونوں صورتوں میں وہ عہدِ نبوی کے مذہبی نظام کا ایک حصہ تھے۔ کیونکہ اذان نماز کے قائم کرنے کے لیے ایک ضروری بلکہ ناگزیر شرط بن گئی تھی۔

بعض اوقات جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان کو بعض اہم سیاسی اور سماجی امور پر بحث کرنے کی خاطر مسلمانوں کو اکٹھا کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ جب کبھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی اہم اور غیر معمولی مسئلہ پر بحث مباحثہ کے لیے مسلمانوں کو جمع کرنا چاہتے تھے تو حضرت بلال حبشی یا اور کوئی موذن اذان دیتا تھا یا مدینہ کی گلیوں میں الصلوٰۃ جامعۃ (نماز جمع کرنے والی ہے) کی صدائیں دیتا گذرتا تھا اور لوگ مسجد میں جمع ہو جاتے تھے۔ لیکن اس کام کے لیے بھی اکثر اذان کا ہی استعمال کیا جاتا تھا۔

۶۔ امورِ حج کی تنظیم

حج اسلام کا چوتھا رکن ہے اور ان تمام مسلمانوں پر جو اس کے اخراجات برداشت کر سکتے ہوں فرض ہے۔ اسلامی اصولوں کے مطابق حج کا قیام اور ادائیگی صرف اسلامی حکومت کی نگرانی میں ہو سکتی ہے۔ اسی بنا پر مسلمانوں نے فتح مکہ سے قبل خانہ کعبہ کا حج نہیں کیا تھا، حالانکہ صلح حدیبیہ کے بعد وہ عمرہ کے لیے انفرادی طور سے اور باجماعت جاتے رہے تھے۔ اسی بنا پر اسلام میں پہلے حج کے سوال پر مؤرخین اور محدثین کے نزدیک اختلاف بھی ہے کہ وہ کب اور کس کی زیرِ نگرانی ہوا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے تقریباً تین ماہ بعد مسلمانوں نے پہلی بار حج مکہ کے اموی گورنر حضرت عتاب بن اسیدؓ کی نگرانی و امارت میں ادا کیا تھا۔ بعض علما کا خیال ہے کہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی موصوف کو امیر حج مقرر نہیں کیا تھا تاہم انہوں نے یہ فریضہ اپنی امارتِ بلد (شہر کے گورنر ہونے) کے سبب ادا کرایا تھا۔[113] لیکن دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دربارِ رسالت سے ان کو باقاعدہ امیرِ حج مقرر کیا گیا تھا۔[114] بہر حال اس اختلافِ روایات سے قطع نظر کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس حیثیت سے تقرری صراحتاً کی تھی یا محض آپ کی خاموش رضا حاصل تھی یہ امر مسلم ہے کہ اسلام میں اول حج ان کی امارت میں ادا ہوا تھا۔

بہر حال دوسرے برس جیسا کہ تمام روایات کا اتفاق ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سب سے عظیم صحابی حضرت ابوبکر صدیقؓ کو باقاعدہ "امیرِ حج" مقرر کر کے مدینہ سے روانہ کیا تھا۔[115] یہ تقرری اس حقیقت کی علامت تھی کہ آئندہ سے حج کے فریضہ کی ادائیگی اسلامی ریاست کی زیرِ نگرانی ہوا کرے گی بہر حال اس برس غیر مسلم عربوں کو بھی حج میں شرکت کی اجازت دے دی گئی تھی لیکن اسی موقعہ پر یہ اعلان بھی کر دیا گیا تھا کہ اگلے برس سے غیر مسلموں کو نہ تو حج میں شرکت کی اجازت ہو گی اور نہ مکہ مکرمہ میں داخلے کی۔ اس اہم اعلان کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو اپنا خصوصی ایلچی بنا کر حضرت ابوبکر صدیق کی روانگی کے بعد مکہ بھیجا تھا۔[116] جہاں انہوں نے سورہ توبہ کی متعلقہ آیات[117] لوگوں تک پہونچائی تھیں۔ عہد نبوی کا آخری حج جنابِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی امارتِ خاص میں ادا کیا گیا تھا۔[118] حقیقت میں یہ آپ کی عوامی زندگی اور عہدۂ رسالت کا نقطۂ عروج تھا کہ جب آپ نے انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کے سامنے جن کی تعداد ایک لاکھ ساٹھ ہزار بتائی جاتی ہے۔[119] اللہ تبارک تعالیٰ کا آخری پیغام پہنچایا تھا اور اسلام کی تکمیل کی تھی۔ اسی مبارک موقع پر آپ نے مسلمانوں کو ہدایت کی تھی کہ ان کے حاضر (شاہد) لوگ اپنے پیچھے رہ جانے والے بھائیوں (غائب) کو اللہ کا پیغام پہونچا دیں۔ گویا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کا اعلان

خفی اور مسلمانوں کو "کارِ نبوی" کا حامل ہونے کا اظہار برملا کر دیا تھا۔[۱۲۰]

ابن اسحاق اور طبری کے بیانات کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر اپنی آواز دوسروں تک پہونچانے کے لئے حضرت ربیعہ بن امیہ بن خلف کو اپنا منادی اور اعلان کو دہرانے والا (الذی یصرخ فی الناس) مقرر کیا تھا۔ چنانچہ وہ آپ کے فقرے اور جملے اپنی غیر معمولی بلند آواز میں دہراتے رہتے تھے[۱۲۱] اسی طرح بخاری اور مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری حج کے دوران متعدد مواقع پر ایک اور صحابی حضرت جریر بن عبداللہ بجلی نے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی کا کام کیا تھا۔[۱۲۲]

یہ عین ممکن اور قرین قیاس ہے کہ اس عظیم اجتماع کے موقع پر جب قرون وسطیٰ کے معیار کے مطابق بہت بڑا مجمع تھا متعدد صحابہ مختلف مواقع پر آپ کے فقروں، جملوں اور خطبات کو دہراتے رہے ہوں تاکہ تمام سننے والوں تک آپ کا پیغام پہنچ جائے۔ اسی ضمن میں یہ بھی بیان کر دیا جائے کہ ۹ھ / ۶۳۱ء کے حج کے موقعہ پر حضرت اوس بن حدثان کو جن کا تعلق قبیلہ ہوازن سے تھا منیٰ میں ایک مذہبی اعلان کرنے کے لئے مدینہ سے روانہ کیا گیا تھا۔[۱۲۳]

عہد نبوی کے مذہبی نظام میں حج کے سلسلہ میں جن افسروں اور کارکنوں کو مقرر کیا گیا تھا ان میں ایک اہم افسر وہ ہوتا تھا جو عمرہ یا حج کے مواقع پر قربانی کے جانوروں کا نگراں ہوتا تھا۔ ایسے جانوروں کو ھَدْی کہا جاتا ہے اور افسر کو صاحبِ الْھَدْی۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۶ھ / ۶۲۸ء سے جب آپ پہلی بار عمرہ کے لیے تشریف لے گئے تھے اور جس موقع پر صلح حدیبیہ ہوئی تھی آخری حج کے زمانے تک یا تو بنفسِ نفیس قربانی کے جانور ساتھ لے جاتے تھے یا ان کو کسی صحابی کے ساتھ روانہ فرماتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے زمانے میں آپ کی ھدی کے نگراں افسر حضرت ناجیہ بن جندب اسلمی تھے۔[۱۲۴]

مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس "منصب" پر مستقل طور سے فائز تھے کیونکہ وہ اس کے بعد تمام مواقع حج اور عمرہ پر "ھدی رسول" لے کر مکہ جاتے رہے تھے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ، عمرۃ القضیہ، حج ابی بکر اور حجۃ الوداع کے دوران ان کے اس فریضہ کا ذکر ملتا ہے۔[۱۲۵]

بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار حضرت علی بن ابی طالبؓ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ھدی لے کر مکہ گئے تھے۔[۱۲۶] لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ صحابی موصوف نے کس موقع پر یہ فریضہ انجام دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی عمرہ کے سفر کے دوران یہ ھدی رسول لے کر گئے تھے۔ اسی طرح اسد الغابہ کی دو روایات دو اور صحابیوں حضرات ذویب بن طلحہ کعبی خزاعیؓ اور عمرو بن ثمالی / ہوازن کا بھی بطور صاحبانِ ھدی رسول ذکر کرتی ہیں لیکن وہ بھی مواقع یا زمانے کا کوئی حوالہ نہیں دیتی ہیں۔[۱۲۷] قیاس یہی ہوتا ہے کہ مختلف عمروں کے زمانے میں یہ تقرری ہوئی ہوگی۔ اس کے علاوہ ابن حزم نے بھی ایک جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صاحب الھدی کا ذکر کیا ہے جن کا اسم گرامی خالد بن یسار غفاریؓ تھا۔[۱۲۸]
یہ ممکن ہے کہ بعض دوسرے صحابہ کرام نے بھی وقتاً فوقتاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا اسلامی ریاست کے لیے یہ فریضہ انجام دیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک یا دو مواقع پر ہی متعدد لوگوں نے یہ خدمت انجام دی ہو۔

خانہ کعبہ کی دیکھ بھال اور تولیت ایک اہم مذہبی ذمہ داری تھی۔ اسی طرح حرم مکہ کے حدود کی تعیین کی بھی دینی اہمیت تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے منصب انتظامات فرمائے تھے۔ یہ مشہور حقیقت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب کو بدستور عہدہ سقایہ (حجاج کو پانی پلانے کی ذمہ داری) پر بحال کیا تھا[۱۲۹] جو انہیں (بہ اختلاف روایات ان کے والد ماجد عبدالمطلب یا بھائی ابو طالب سے زمانہ جاہلیت میں ملا تھا۔[۱۳۰] اسی موقعہ پر آپ نے تولیت کعبہ کے عہدہ پر جس کو قدیم زمانے سے حجابہ کہا جاتا تھا حضرت عثمان بن طلحہ عبدری کو بدستور سابق بحال رکھا تھا۔[۱۳۱] جن کے خاندان میں یہ منصب بانی شہر مکہ قصی بن کلاب کے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔[۱۳۲] روایت ہے کہ اسی موقع پر آپ نے حضرت تمیم بن اسید خزاعی کو حرم مکہ کے حدود کی از سر نو تنصیب اور تعیین کے لیے مامور کیا تھا۔[۱۳۳] قبیلہ خزاعہ کے ایک شخص کو اس خدمت کے لئے غالباً اس لئے منتخب کیا گیا تھا کہ یہ قبیلہ حرم اور کعبہ کے معاملات کا آشنا و عارف تھا اور مدتوں ان سے وابستہ رہا تھا۔[۱۳۴]